

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۴۴۴/۷۷ | سالانہ : ۳۰۰ [illegible]

[illegible] | [illegible] ۱۲۰ ڈالر [illegible]

اس شمارے کی قیمت [illegible]

۱۹۹۳ء

[illegible]

فہرست

مخطوطات شناسی

مخدوم منیریؒ

جہان آزاد

ممالک اسلامیہ کے سفرنامے

جہان پریم چند

تموز

اردو دنیا

مراسلات

اشاریے

مشاہیر کے احوال کے چند اہم مآخذ — صوفیہ

جہان سرسید

[illegible]

کے

چند قصیدے

مرتبہ

جناب علی احمد جلیلی

مقدمہ

اردو زبان کو پروان چڑھانے میں شاہوں اور شاہی درباروں نے جو حصہ لیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا
لطین نے نہ صرف اپنی شاعری اور شعری تخلیقات سے زبان کی خدمت کی بلکہ اپنے دور کے شاعروں کی سرپرستی بھی
شاعروں کو اپنا استاد بنایا، اپنے دربار میں جگہ دی انھوں نے اپنے محسن بادشاہوں اور امرائے دولت کی تعریف
ں جو کچھ لکھا وہ اردو کلاسیکس کا بڑا سرمایہ ہیں۔

یہ سلسلہ دکن کے قطب شاہی سلاطین سے شروع ہو کر شاہانِ مغلیہ، نوابانِ اودھ، تاجداران رامپور اور نواب
خاں کے دربار پر ختم ہوتا ہے۔ بقول مولانا سلیمان ندوی:

"ہنرور شاعر اور ہنر پرور بادشاہ میں جو تلازم عہد عباسیہ سے شروع ہوا تھا اس کو
حضرت جلیل اور میر عثمان علی خاں پر اب تمام سمجھیے۔"

فصاحت جنگ جلیل مانکپوری اپنے دور کے بہت بڑے غزل گو تھے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک
صیدہ گو بھی تھے۔ جلیل نے دو حکمرانوں میر محبوب علی خاں آصف اور میر عثمان علی خاں والیانِ دکن کے دور کو دیکھا
ن بادشاہوں کے استاد رہے جیسا کہ شاہ عثمان کے ایک فرمان سے ظاہر ہوتا ہے۔

"فصاحت جنگ جلیل میرے استاد ہیں جن کو میں فی زماننا امام الفن سمجھتا ہوں۔ ان سے
میرے والد مرحوم نے بھی اصلاح لی تھی بعد وفات فصیح الملک داغ دہلوی۔"

استاد شاہ بننے سے پہلے ہی جلیل مانکپوری کی قصیدہ گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۳۱۸ھ میں جب امیر مینائی نے
آباد کا قصد کیا تو ان کے ہمراہ ان کے فرزند لطیف احمد اختر مینائی اور جلیل حسن جلیل بھی تھے۔ جناب امیر نے قبلاً
دستہ بنام سے "نظم امیر" میر محبوب علی خاں آصف کو پیش کرنے کے لیے مرتب کیا تھا۔ جو تیرہ اختر اور جلیل کے تین
یدوں پر مشتمل تھا۔ اسے جلیل کا پہلا قصیدہ سمجھنا چاہیے:

آنکھوں میں آج اک صنم خوش جمال ہے   کس سے مثال دوں کہ عدیم المثال ہے

۱۳۲۳ھ میں شاہ آصف کے جشن جوبلی کے موقع پر مہاراجہ کرشن پرشاد شاد نے ایک قصیدہ کی محفل
کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں مولانا حالی بھی موجود تھے اور خود اعلیٰحضرت رونق افروز تھے۔ اس مشاعرہ میں جلیل نے
شان کا قصیدہ پیش کیا:

جشن شاہی میں عجب رنگ اچھلتے دیکھا ساغر عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا

اس جشن کے سلسلے میں بعد ازاں ایک اور قصیدہ بھی موزوں کیا گیا:

مزے کی آج جشن سالگرہ میں مدح خوانی ہے اِدھر ہے گلفشانی ہے اُدھر ہے زرفشانی ہے

یہ زمانہ جلیل کی امیدواری کا زمانہ تھا کیونکہ جناب داغ کا انتقال ہو چکا تھا اور شاہ آصف کو اپنے
استادِ سخن کا انتخاب کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جلیل نے یکے بعد دیگرے کئی قصائد موزوں کیے:

کوئی شاہِ دکن کا آج ہمتا ہو نہیں سکتا یہ شوکت ہو نہیں سکتی یہ شہرا ہو نہیں سکتا

۱۳۲۶ھ میں جناب جلیل نے اپنی پہلی ادبی تصنیف تذکیر و تانیث گزرانی تو شاہ آصف نے کتاب
فرما کر یہ مصرع ارشاد فرمایا:

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

اس لقب کی سرفرازی پر جلیل نے اسی زمین میں ایک طویل قصیدہ لکھ کر گزرانا:

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا یہ وہ مصرع ہے جس پر چاہیے صد مرحبا کہنا

اسی زمانے کا ایک اور قابلِ ذکر قصیدہ دربار دہلی کے موقع پر کہا گیا جب جناب جلیل ملک معظم
ہفتم کے دربار تاجپوشی کے جشن میں شرکت کے لیے مہاراجہ شاد کی سرپرستی میں شاہی اسٹاف کے ساتھ دہلی
اس طویل قصیدہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

دے رہی ہے کیا مزہ آنکھوں میں نیند آئی ہوئی واہ رے ہم پہ بے پئے مستی سی ہے چھائی ہوئی

۱۳۲۷ھ سے حقیقی درباری شاعری کا آغاز ہوتا ہے جب شاہ آصف نے ایک فرمان کے ذریعہ جلیل
کو اپنے مصاحبین میں داخل کیا اور استادِ شاہ کا منصب عطا کیا:

اس سرفرازی کے موقع پر جلیل نے وہ زبردست قصیدہ پیش کیا جو قصائد کی تاریخ میں ایک نئے
کا اضافہ ہے:

جو دن پھرتے ہیں تو سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے شبِ غم لاکھ طولانی ہو ترکا ہو ہی جاتا ہے

حضرت جلیل کی قصیدہ نگاری کا پہلا دور یہاں ختم ہوتا ہے کیونکہ ۱۹۰۰ء میں جب شاہ آصف نے وفات پائی اور نواب میر عثمان علی خاں تخت نشیں ہوئے تو انھوں نے بھی جلیل کے منصب استادی کو اسی طرح برقرار رکھا۔ تخت نشینی کے موقع پر جلیل نے آصف سابع شاہ عثمان کی بارگاہ میں اپنا پہلا قصیدہ گزرانا۔

بزمِ عشرت میں نئے رنگ کا ساماں دیکھا   حالتِ وجد میں سازِ رگِ جاں کو بھی رقصاں دیکھا

ساتھ ہی ایک اور مدحیہ قصیدہ موزوں کیا گیا۔

مدح گوئی فخر ہے طبعِ رسا کے واسطے   دل دعا کے واسطے، لب ہیں ثنا کے واسطے

۱۹۱۱ء میں ملک معظم جارج پنجم کے جشنِ تاجپوشی کا دربار دہلی میں منعقد ہوا تو شاہی اسٹاف کے ساتھ جلیل بھی گئے۔ اس موقع پر "دربارِ دہلی" کے نام سے ایک طویل قصیدہ لکھا۔

غلغلہ آج ہے دربار کا دنیا بھر میں   یہی چرچا ہے زباں پر یہی سودا سر میں

بعد میں ان قصائد کی جگہ قطعاتِ تہنیت نے لے لی۔ اُن کے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ قصائد مجموعے کے آخر میں یہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھیں مختصر قصیدہ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

ان قصائد پر بحیثیت مجموعی جب ہم تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں جلیل نے روایتی طور پر قصیدہ نگاری کا اسلوب وہی رکھا جو اساتذۂ سخن کا تھا لیکن ان میں اجتہاد سے بھی کام لیا۔ لوازمات قصیدہ کی پابندی ملتی ہے۔ تشبیب کے موضوعات عام رواج کے مطابق موسمِ بہار، وارداتِ حسن و عشق، خواب کا بیان اور آمدِ ایام وغیرہ ہیں۔ گریز کے لیے کہیں ایک شعر اور کہیں ایک سے زیادہ اشعار استعمال کیے ہیں۔ مدح میں حسبِ تعلقات ممدوح کے رتبہ کی مناسبت سے جاہ و حشم، مال و دولت، عدل و انصاف، جود و سخا اور خلق و مروت کے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ جس کا اختتام دعائیہ اشعار پر ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک قصیدہ کے کچھ اشعار اختصار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ اس قصیدہ کی تشبیب کا موضوع وارداتِ حسن و عشق سے ہوتا ہے۔ ان لوازمات کی پابندی کے باوجود اجتہاد یہ ہے کہ تفصیلات و جزئیات سے گریز کیا ہے۔

تشبیب۔ آنکھوں میں آج اک صنمِ خوش جمال ہے   کس سے مثال دوں کہ عدیم المثال ہے

صانع کی یاد آتی ہے صنعت کو دیکھ کر   اللہ کیا جمال ہے، کیا خط و خال ہے

ہے وہ گلاب جس سے تراوش نگاہ میں   ہے وہ نہال جس سے کلیجا نہال ہے

زلفوں کے دام پر تو ہے صیاد کا گماں　　آنکھیں یہ کہتی ہیں کوئی بچہ غزال ہے
اس سادگی پہ انکو تکلف نثار ہوں　　مہندی نہیں لگائی مگر ہاتھ لال ہے
گریز۔ تو کون ہے خدا کے لیے اے بت حسیں　　جاتے رہے حواس یہ کیا جمال ہے
جنت کی حور ہے کہ پرستان کی پری　　سچ سچ بتا تجھے قسم ذوالجلال ہے
نام و نشاں سے تیرے مجھے بھی ہو آگہی　　خواہش مری یہی ہے یہی دل کا سوال ہے
دیکھا جو اضطراب مرا اس نے یہ کہا　　اتنی سی بات کے لیے تیرا یہ حال ہے
میں سلطنت ہوں اس شہ گردوں سریر کی　　جو نیر منور اوج کمال ہے
باغ دکن میں جلوہ نما وہ بہار عیش　　باغ سخن میں طوطی شیریں مقال ہے
محبوب ہے علی کا وہ مطلوب جان و دل　　ظل خدائے ذوالکرم و ذوالجلال ہے
مدح۔ تیرا جلال شان جمالی لیے ہوئے　　تیرا جمال تیری جلالت پہ دال ہے
عادل وہ ہے کہ آب و ہوا میں ہے اعتدال　　باذل وہ ہے کہ داد و دہش الحوال ہے
دکھلا رہی ہے شان تری بندہ پروری　　اک دل ہے اور سارے جہاں کا خیال ہے
وصف حضور کیا ہو رقم کیا بیان ہو　　خامہ مرا قلم ہے زباں میری لال ہے
دعا۔ افزوں ہو عمر و جاہ بڑھے حشمت و سپاہ　　جب تک شمار روز و شب و ماہ و سال ہے

آخری دور کے قصائد میں یہ پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ قصیدے بغیر تمہید کے راست مدحیہ اشعار شروع ہونے لگے۔ مثلاً

کوئی شاہ دکن کا آج ہمتا ہو نہیں سکتا　　یہ شوکت ہو نہیں سکتی یہ شہرا ہو نہیں سکتا
خدا شاہد حکومت شاہ کی ہے کشور دل میں　　یہ وہ رتبہ ہے جس سے بڑھ کے رتبا ہو نہیں سکتا
شہ والا کے ہیں احسان اتنے جاں نثاروں پر　　کہ سر بھی نذر دے کر کوئی ہلکا ہو نہیں سکتا

یا ایک اور قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:

مدح گوئی فخر ہے طبع رسا کے واسطے　　دل دعا کے واسطے لب ہیں ثنا کے واسطے
کون وہ بحر عطا، کان سخا، حاجت روا　　جو خدا کا فضل ہے خلق خدا کے واسطے
میر عثمان علی خاں خسرو ملک دکن　　مایۂ ناز و طرب ارض و سما کے واسطے

طرزِ انداز میں تمہیدی قصیدوں کی جگہ خطابیہ قصیدوں نے لے لی۔

بحیثیت مجموعی حضرت جلیل نے بحیثیت مجموعی کام لے کر روایتی انداز کو بدلا۔ بحث کی جگہ سادگی و متانت نے لی۔ انھوں نے نہ تو اپنی طبیعت کا اظہار کیا نہ صنعت گری کی نہ مختلف علوم کی اصطلاحات کو اپنے قصیدوں میں بھرا۔ تاہم مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ انھوں نے قصیدہ نگاری کی خاطر شعریت کا خون نہیں کیا بلکہ قصیدہ نگاری میں شعریت کو داخل کیا۔ یہ قصائد تغزل اور قصیدہ کا ایک ایسا سنگم ہیں جہاں طویل قصائد کی بوریت خوشگوار شعریت میں ڈھل جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بنیادی رنگ بھی یہی تھا۔

ان قصائد کے مسودات والد مرحوم کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ میں جا بجا بکھرے پڑے تھے۔ میں نے ان کو سنہ وار ترتیب دے کر یکجا کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ایک دو قصائد اس دور کے جرائد میں چھپے ہوں لیکن ان معنوں میں غیر مطبوعہ ہیں کہ پہلی مرتبہ مجموعۂ قصائد کی صورت میں منظر عام پر آ رہے ہیں۔

علی احمد جلیلی

در مدح اعلیٰحضرت میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس سلطانِ دکن

آنکھوں میں آج اک صنمِ خوش جمال ہے
کیسے مثال دوں کہ عدیم المثال ہے

صانع کی یاد آتی ہے صنعت کو دیکھ کر
اللہ کیا جمال ہے کیا خط و خال ہے

ہے وہ گلاب جس سے تراوٹ نگاہ میں
ہے وہ نہال جس سے کلیجا نہال ہے

زلفوں کے دام پر تو ہے صیاد کا گمان
آنکھیں یہ کہتی ہیں کوئی رعنا غزال ہے

پانی میں جیسے پھول کنول کا کھلا ہوا
یوں دیدۂ پر آب میں وہ نونہال ہے

معشوق پن لیے ہوئے شرمیلی چتونیں
دل جس پہ لوٹ پوٹ ہو وہ چال ڈھال ہے

آنکھوں کے ڈورے دیکھیے پھندے بلا کے ہیں
قدرت کا جال ہے یہ محبت کا جال ہے

اس سادگی پہ لاکھ تکلف نثار ہوں
مہندی نہیں لگائی مگر ہاتھ لال ہے

بڑھ بڑھ کے کہ رہا ہے یہ عالم شباب کا
بچپن سے مجھ کو حسن میں حاصل کمال ہے

کیا چودھویں کا چاند کرے گا برابری
دو روز میں ہلال کا پھر وہ ہلال ہے

قدرت خدا کی ایک کلی سے چمن کھلے
جھڑتے ہیں پھول منہ سے عجب بول چال ہے

آنکھیں لڑا کے ہم تو مصیبت میں پڑ گئے
پلکوں کی ہر زبان پہ دل کا سوال ہے

تو کون ہے خدا کے لیے اے بتِ حسیں
جاتے رہے حواس یہ کیسا جمال ہے

جنت کی حور ہے کہ پرستان کی پری
سچ سچ بتا تجھے قسمِ ذوالجلال ہے

یہ نازِ دلفریب یہ اندازِ دلربا
تیری ثنا بشر سے ادا ہو محال ہے

نام و نشاں سے تیرے مجھے بھی ہو آگہی
خواہش یہی مری یہی میرا سوال ہے

دیکھا جو اضطراب مرا اس نے یہ کہا
اتنی سی بات کے لیے تیرا یہ حال ہے

آگاہ ہو کہ میں نہ پری ہوں نہ حور ہوں
بیجا ہے یہ گمان، غلط احتمال ہے

کہتے ہیں جس کو حیدر وہ ہے وہ اک ادا مری — جس کا پری کہے ہے نام مری ایک چال ہے
ہیں سلطنت پہ ہوں اس شہِ گردوں سریر کی — جو تیرِ شعلۂ اوجِ کمال ہے
سلطان شیر صولت و خاقان کج کلاہ — جمشید اقتدار و سلیماں جلال ہے
عنوانِ سروری و نشانِ دلاوری — ابرِ کرم ہے خسروِ دریا نوال ہے
رفعت میں آسمان، شرافت میں آفتاب — صورت جو اس کی دیکھیے یوسف جمال ہے
دیباچۂ مروت و سر دفترِ وقار — پایا ہے وہ مزاج کہ قدسی خصال ہے
فہم و ذکا میں کہتے ہیں لقمان صفت اسے — جود و سخا میں آپ ہی اپنی مثال ہے
باغِ دکن میں جلوہ نما وہ بہارِ عیش — باغِ سخن میں طوطیِ شیریں مقال ہے
محبوب ہے علی کا وہ مطلوب جان و دل — ظلِ خدائے ذو الکرم و ذو الجلال ہے
آصف لقب ہے اس شہِ والا شکوہ کا — فیاض ہے، کریم ہے، عالی خیال ہے
نامِ حضور سن کے مجھے وجد آگیا — مطلع کہا جو ہدیۂ اربابِ حال ہے

مطلع

ساقی پیے بغیر مرا غیر حال ہے — اب کیوں ہے کال مے کا ارے برشگال ہے
فتویٰ دیا ہے مفتیِ ابرِ بہار نے — توبہ کا خون بادہ کشوں کو حلال ہے
کیا لطف دے رہا ہے یہ برسات کا سماں — کالی گھٹا ہے اس پہ دھنک لال لال ہے
سبزے کا فرش چار طرف ہے بچھا ہوا — مرغِ نگاہ کے لیے یہ سبز جال ہے
عکسِ شفق سے ابر کا عالم نہ پوچھیے — گویا صنم کے ہوے منھ پہ گلال ہے
نکلے ہیں سبزہ روند کے گل پیرہن حسیں — کوئی ہے مہ لقا کوئی زہرہ جمال ہے
تولے ہوئے ہے تیغِ ادا کوئی حور زاد — کھولے ہوئے پری کوئی چوٹی کے بال ہے
تانیں جو لے رہے ہیں جوانانِ خوش گلو — پہلو میں اپنے دل کا ٹھہرنا محال ہے
چھیڑے ہوئے ملار کوئی ہے کوئی بہار — لب پر کسی کے یہ غزلِ بے مثال ہے

غزل

دیدار کی ہوس ہے نہ شوقِ وصال ہے — آزاد ہر خیال سے مست خیال ہے

جائے کبھی نہ دل سے وہ تیرا خیال ہے
آئے کبھی نہ دل میں وہ تیری مثال ہے

رسوائیوں کے خوف سے چھپا وبال ہے
اپنا نہیں خیال تمہارا خیال ہے

تم خود نہ ہو اسیر کہیں مجھ کو پھانس کر
دل میں سما کے دل سے نکلنا محال ہے

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال
مر مر کے ہجرِ یار میں جینا کمال ہے

آنکھیں بتا رہی ہیں کہ جاگے ہو رات کو
ان ساغروں میں بوئے شرابِ وصال ہے

کیونکر نباہ تجھ سے ہو اے دشمنِ آشنا
تیرا خیال کچھ ہے مرا کچھ خیال ہے

یہ اشک خون نہیں جو ٹپکتے ہیں آنکھ سے
کچھ ماجرا جگر کا ہے کچھ دل کا حال ہے

رحمت کا جس نے حشر میں دریا بہا دیا
وہ ایک قطرۂ عرقِ انفعال ہے

ان گلرخوں سے دل کے ہوا کون سرخرو
ہم ہاتھ مل رہے ہیں حنا پائمال ہے

برساؤ مجھ پہ تیر مگر اتنا جان لو
پہلو میں دل ہے دل میں تمہارا خیال ہے

تم کو اٹھا کے رکھ لوں کلیجے میں آنکھ میں
لیکن تمہارے ناز اٹھانا محال ہے

پھندوں میں وہ پھنسا گئی دیکھ زبانِ وصل
اک دل ہے اور لاکھ طرح کا خیال ہے

بنتے ہیں اپنے منہ سے مسیحا بنا کریں
روشن ہے خلق پر جو مریضوں کا حال ہے

دنیا کی کیا خبر مجھے اپنی خبر نہیں
یہ بھی کمال ہے کہ تمہارا خیال ہے

میں دامنِ نیاز میں اشکِ چکیدہ ہوں
کوئی اٹھا کے دیکھ لے اٹھنا محال ہے

اچھا ہوا رقیب کو تم چاہنے لگے
اب جان لو گے خود مرے دل کا جو حال ہے

بت کہہ دیا جو میں نے تو اب بولتے نہیں
اتنی سی بات کا تمہیں اتنا ملال ہے

حاجت سوال کی نہیں مشتاقِ وصل کو
تم دیکھ لو فقیر کی صورت سوال ہے

کیا بیخودی ہے وصل میں قربان جائیے
اتنا نہیں خیال کہ کس کا خیال ہے

مدح حضور سے ہوئی شہرت جلیل کی
کہتے ہیں سب کہ شاعرِ عالی خیال ہے

ساقی خدا کے واسطے لا جام جلد لا
یہ سین ہو جو سامنے تقویٰ محال ہے

اب سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا
اک اک گھڑی مرے لیے اک اک سال ہے

ہلتا ہے ڈنک آگے بڑھ کر خدا بچائے
ملک لگی ہے ایسی کہ بچنا محال ہے

کیوں کر نہ بجھے گی دل کی لگی بے پیے ہوئے ۔ اس جام سے ذرا سے کہ طبیعت نڈھال ہے
مجھ کو پلا وہ بادۂ بے دُرد ساقیا ۔ دھو جائے صاف دل میں جو گردِ ملال ہے
فکرِ وطن سے چھوٹ کے فکرِ سخن کروں ۔ مدحِ شہِ نظام کا مجھ کو خیال ہے
کہہ کر پڑھوں وہ نور کا مطلع حضور میں ۔ سن کر کہیں سب اہلِ سخن بے مثال ہے

مطلع

شاہا ریاضِ دہر میں تو وہ نہال ہے ۔ سائے میں جس کے سارا زمانہ نہال ہے
اچھا کیا ہے نرگسِ بیمار کا علاج ۔ سنبھلا ہوا مزاج ہے چہرہ بحال ہے
سنبل نے بال کھولے ہیں زینت کے واسطے ۔ افواہ یہ غلط ہے کہ آشفتہ حال ہے
سروِ چمن کو بے ثمری کا گلہ نہیں ۔ وہ تازگی ملی کہ ہمیشہ نہال ہے
اس دور میں خزاں کو جو کھٹکا نہیں رہا ۔ چہرہ گلوں کا جوشِ مسرت سے لال ہے
سبزہ کا ہے یہ حال کہ لاکھوں زبان ہے ۔ تسبیح خوانِ بارگہِ ذوالجلال ہے
خارِ چمن سے نوک پلک ہے بہار کی ۔ لالے کا داغ روئے گلستاں کا خال ہے
آصف کو ہو نصیب سلیماں کا مرتبہ ۔ دیتا صدا یہ ہدہدِ فرخندہ فال ہے
عمرِ دراز باد کہ تیرے وجود سے ۔ جو سال ہے جہاں کے لیے نیک سال ہے
تو غمگسارِ امتِ مرحومۂ رسول ۔ تو جاں نثارِ احمد و اصحاب و آل ہے
تیرا جلال شانِ جلالی لیے ہوئے ۔ تیرا جمال تیری جلالت پہ دال ہے
گھر گھر ہو جن کا ذکر وہ اوصاف ہیں ترے ۔ جس کو کہیں نہ پائیں وہ تیری مثال ہے
بیمار کے لیے ہے مسیحا تری نظر ۔ مرہم ہے اس کے واسطے جو خستہ حال ہے
سایہ ترا ہے دامنِ رحمت ہر ایک کو ۔ کمبل فقیر کا ہے امیروں کی شال ہے
حاکم کیا ہے جب سے تجھے کردگار نے ۔ ظالم کی ہے پکار کہ جینا وبال ہے
اندازِ عزل و نصب زمانے سے ہے جدا ۔ معزول ہے عتاب ترحم بحال ہے
عادل وہ ہے کہ آب و ہوا میں ہے اعتدال ۔ باذل وہ ہے کہ داد و دہش کا سوال ہے
پھندے ستم کے کٹ گئے تیرے عدل سے ۔ صیاد اسیرِ حلقۂ چشمِ غزال ہے

سب جانتے ہیں مایۂ نازش کمال کو — کامل وہ ہیں حضور کہ نازاں کمال ہے

یاں خلق شاہ نافہ کشا ہے جنوب میں — واں مشک میں بسی ہوئی باد شمال ہے

دکھلا رہی ہے شان تری بندہ پروری — اک دل ہے اور سارے جہاں کا خیال ہے

یوں اتحاد ظاہر و باطن میں چاہیے — جو قال ہے زباں کا وہی دل کا حال ہے

صاحبدلوں کے دل پہ ہو قبضہ تو ہے نصیب — دولت وہ ہاتھ آئی ہے وہ لازوال ہے

وصف حضور کیا ہو رقم کیا بیان ہو — خامہ مرا قلم ہے زباں میری لال ہے

افزوں ہو عمر و جاہ بڑھے حشمت و سپاہ — جب تک شمار روز و شب و ماہ و سال ہے

۳۶۸

در مدح اعلیحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطانِ دکن

دے رہی ہے کیا مزہ آنکھوں میں نیند آئی ہوئی
واہ رے ہم نے پیئے مستی سی ہے چھائی ہوئی

یار ہیں اغیار ہیں سب ہیں مگر اب ہم کہاں
نیند کے ہاتھوں بھری محفل میں تنہائی ہوئی

بند آنکھیں کیا ہوئیں کچھ اور آنکھیں کھل گئیں
ہو کے روشن چشمِ دل چشمِ تماشائی ہوئی

خواب میں ہم دیکھتے کیا ہیں کہ ہے وقتِ سحر
فرش سے تا عرش اک تنویر ہے چھائی ہوئی

پردۂ شب اٹھ رہا ہے بچھ رہا ہے فرشِ نور
دن کی آمد ہے صبا پھرتی ہے اترائی ہوئی

صبح نے چہرے سے اپنے کو الٹ دی ہے نقاب
پر ادا وہ ہے دلہن جیسے ہو شرمائی ہوئی

شکل و صورت زیب و زینت دیکھ کر کہتی ہے خلق
حورِ جنت ہے پری ہے قاف سے آئی ہوئی

سونے والے اٹھے ہیں انگڑائیاں لیتے ہوئے
زلفیں کچھ شانے پہ ہیں کچھ رخ پہ بل کھائی ہوئی

پاؤں کی آہٹ سے کھلتی جاتی ہے غنچوں کی آنکھ
ہے غضب بادِ سحر کی چال اٹھلائی ہوئی

طائرانِ صبح کے دلکش ترانے ہائے ہائے
وقت ٹھنڈا اور پھر آواز گرمائی ہوئی

جھونک کھا کھا کر سنبھلنا شاخِ گل کا بار بار
جس طرح نازک کمر سیدھی ہو بل کھائی ہوئی

برگِ گل پہ کیا بھلی لگتی ہیں بوندیں اوس کی
موتیوں سے دامنِ گلشن کی زیبائی ہوئی

گدگدایا ہے کسی نے پیاری کلیوں کو ابھی
کہہ رہی ہے صاف ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی

آمد آمد شاہِ خاور کی ہوئی غل مچ گیا
آنکھ سب کی محوِ رنگِ چرخِ مینائی ہوئی

چشمِ بد دور آج تو کچھ اور ہی سامان ہے
یہ نئی صورت نرالی جلوہ آرائی ہوئی

روز تو تنہا نکلتا تھا فلک پر آفتاب
آج شانِ حسن برقِ جانِ تنہائی ہوئی

انجمن کا انجمن لشکر کا لشکر ساتھ ہے
شور عالم میں ہے اچھی عالم آرائی ہوئی

سیکڑوں روشن ستارے بزم افروزِ جمال
جن کی شانِ حسن پر قربان رعنائی ہوئی

چودھویں کا چاند بھی ہے اور ماہِ نو بھی ہے
پڑ رہی ہے آنکھ مشتاقوں کی للچائی ہوئی

وہ ہے حسنِ چمن میں سجے سب رونق فزا
حبذا کس شان کی دربار آرائی ہوئی

کیسے مل بیٹھے ہیں باہم چاند، تارے، آفتاب
اس سے اس کی زینت اس کی اُس کی زیبائی ہوئی

شاہِ خاور بیچ میں سارے ستارے اس پاس
پہلوئے خور میں قمر کی رونق افزائی ہوئی

چاند ہے جس جا اسی جا چاند کا ٹکڑا بھی ہے
نور کے گلشن میں ہے دوہری بہار آئی ہوئی

لیں نگاہوں نے بلائیں خوشنما دربار کی
آنکھیں صدقے، دل فدائی، جان شیدائی ہوئی

یہ سماں پیشِ نظر تھا کھل گئی اتنے میں آنکھ
ہوش کا آنا تھا بھاگی نیند گھبرائی ہوئی

جاگ کر دیکھا وہی دیکھا تھا جو کچھ خواب میں
جانی کیونکر دولتِ بیدار ہاتھ آئی ہوئی

صبحدم کا خواب تھا فوراً ہوا اس کا ظہور
دیکھتے ہیں آج عالم میں بہار آئی ہوئی

آسماں دیکھا تھا جس کو وہ زمینِ ہند ہے
جس پہ ہے عیش و مسرت کی گھٹا چھائی ہوئی

انجمن دیکھا تھا جس کو قیصری دربار ہے
جس کے شوقِ دید میں مخلوق سودائی ہوئی

مہر دیکھا تھا جسے ہیں لارڈ کرزن ویسرائے
آج جس سے مسندِ شاہی کی زیبائی ہوئی

بدر دیکھا تھا جنہیں وہ ہیں دکن کے تاجدار
جن کی خاکِ آستاں وقفِ جبیں سائی ہوئی

ماہِ نو دیکھا تھا جن کو ہیں ولیعہدِ نظام
جن سے جاہ و تمکنت کی عزت افزائی ہوئی

جن کو دیکھا تھا ستارے والیانِ ملک ہیں
ہند میں ان سب کے دم سے ملک آرائی ہوئی

اے جلیلؔ خوش بیاں یہ ہے مقامِ امتحاں
ہاں دکھا اپنی طبیعت جوش پر آئی ہوئی

سنتے تھے بچپن سے یہ فقرہ کہ دلی دور ہے
آج دلی ہے کہ چشم و دل پہ ہے چھائی ہوئی

طبع کو لازم ہے کھل کھیلے کھلے میدان میں
ہاتھ سے جانے نہ پائے بات ہاتھ آئی ہوئی

لطف تو جب ہے کہ لڑ جائے طبیعت اس طرح
بزم آرا کو گماں ہو رزم آرائی ہوئی

ہوں وہی تیغِ زباں کے وار جو رکتے نہیں
ہوں وہی چوٹیں جو ہیں حساد کی کھائی ہوئی

شوخیٔ معنی نگاہِ ناز کا عالم دکھائے
لوٹ جائے وہ طبیعت ہو جو ترسائی ہوئی

فکرِ رنگیں سے کھلے اک تر و تازہ چمن
جس چمن میں ہو نہ اک پتی بھی مرجھائی ہوئی

وجد کرتے ہوں عنادل غنچہ و گل دیکھ کر
اور گلچیں کی نظر پڑتی ہو للچائی ہوئی

مطلع

ہند میں ہے کیا بہار آئی ہوئی — کھل گئی ہیں وہ بھی کلیاں تھیں جو مرجھائی ہوئی

ل ہی کی آرائش پہ کیا موقوف ہے — ہتی ہتی بلا کی خود آرائی ہوئی

یش تاجپوشی مقتیں ایڈورڈ کا — عید بھی سب سے گلے ملنے کو ہے آئی ہوئی

نقش دل ہو کر رہے گا یادگار — جس کی ہر شکل آفت جان شکیبائی ہوئی

ں کا یہاں کیا دیکھ لینا عمر بھر — دے گی لذت اس گلستاں کی ہوا کھائی ہوئی

ہند آج نازاں ہو تو نازیبا نہیں — کب کسی اقلیم کو حاصل یہ زیبائی ہوئی

لے دل نے سر سے چڑھا رنگ شباب — ہائے یہ صورت یہ رنگت نکھری نکھرائی ہوئی

ام ہے کر آیا ہے وہ آنکھیں سینکنے — تیرے جلوے کی ہے ساری آگ بھڑکائی ہوئی

ن آراستہ ہے یا چمن پیراستہ — وہ چمن ہر شاخ جس کی پھول پھل لائی ہوئی

رح سینے میں دل آنکھوں میں پتلی ہے عزیز — ہند میں دلی کی یوں ہی قدر افزائی ہوئی

نہ ہو یہ تخت گاہ خسروان ہند ہے — عزت دربار ہے میراث میں آئی ہوئی

یں جس پر ہوں محبوب الٰہی کے قدم — ہے بجا گر اپنے جوبن پہ ہے اترائی ہوئی

اب سیر دربار معلّٰی کیجیے — مدتوں سے ہیں نگاہیں تری ترسائی ہوئی

لیں آنکھیں مزے نظارۂ دربار کے — پھر کہاں یہ ہے دولت کی گھٹا چھائی ہوئی

سہانا وقت ہے کیا رنگ ہے کیا جشن ہے — اور کچھ کہتی ہے اب دل میں امنگ آئی ہوئی

ل خوانی بھی اس موقع پہ ہونی چاہیے — سرد آہ ہونے نہ پائے طبع گرمائی ہوئی

ں کا شعر ہم کو تو مزے سے کام ہے — ے مطلب ہے وہ چاہے جس کی ہو آئی ہوئی

غزل

لا ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی — ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی — میر تقی

اے ادا ستاد سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی — [illegible]

سے گل سے ہے اک طرف بیتاب دل — اس طرف فرط حیا سے آنکھ شرمائی ہوئی — [illegible]

ہے باد صبا شاید پیام وصل یار — کیوں مسرت آج دل پہ ہے مرے چھائی ہوئی • •

شورِ محشر نے کیا بے چین مجھ کو قبر میں
آنکھ اک دم کھل گئی جب نیند سی آئی ہوئی — جلال شاد

ہجر کی شب کوئی میرا پوچھنے والا نہ تھا
بیکسی میں میری مونس میری تنہائی ہوئی ، ،

وصل کی شب درد دل لے شاد دونا ہو گیا
چارہ سازی یہ ہوئی اور یہ مسیحائی ہوئی ، ،

سادگی کی قدر کچھ عہد جوانی نے نہ کی
جامہ سنگ آئی طرفدار خود آرائی ہوئی — حسن کاکوروی

گھر گیا غم میں ہمارا دل تو وہ کہنے لگے
قبلہ رخ کیا لطف دیتی ہے گھٹا چھائی ہوئی ، ،

میں نہیں قائل کہ تم جاگے کہیں شب بھر مگر
کچھ پتہ کی کہہ رہی ہے آنکھ شرمائی ہوئی — نسیم لکھنوی

پھانس ہوتی ہے دل عاشق کی کیا کمبخت پھانس
رہ گئی تو جان لی، نکلی تو رسوائی ہوئی — جعفر لکھنوی

آئی جب صبح شب وصلت مقدر نے کہا
رات بھر جاگا ہوں میں اب نیند ہے آئی ہوئی — نجم [illegible]

آئینے میں دیر تک سیر بہارِ حسن کی
آنکھ اسکی آپ ہی اپنی تماشائی ہوئی — افضل [illegible]

اس سے کہتی ہے نزاکت وقت آرائش قمر
جان پریاں بن گئی اچھی خود آرائی ہوئی — قمر تلمیذ امیر

دل شگفتہ ہو تو اختر سیر گلشن کیجیے
اک کلی قسمت سے پائی وہ بھی مرجھائی ہوئی — اختر تلمیذ [illegible]

ہلنے کیا چھٹ پٹ قفس میں بال و پر پیدا کیے
جب سنا ہم نے کہ جاتی ہے بہار آئی ہوئی — [illegible]

کہتی ہے شوخی نظر گہری پڑے عشاق پر
شرم سکھلاتی ہے چتون اور شرمائی ہوئی — [illegible] تلمیذ امیر

کیا غضب ہے آج بھی واعظ وہی ہے تشنہ لب
دیکھ ظالم سبزہ زاروں میں گھٹا چھائی ہوئی — [illegible]

دفن کرنے اپنے کشتے کو نہ آئے اور کہتا
مٹی ہو جائے گی مہندی میری پسائی ہوئی — وسیم [illegible]

دل لیے لیتی ہوں میں ہاں مسکرائے جاؤ تم
ان بھووں سے کہتی ہے وہ آنکھ شرمائی ہوئی — [illegible]

غیر ہو یا رب کہیں وہ خود نہ بن جائے رقیب
پڑ رہی ہے آئینہ پر آنکھ للچائی ہوئی — [illegible]

والیان ملک کے مجمع آج دیکھا چاہیے
شان و شوکت بہر استقبال ہے آئی ہوئی

کیسے کیسے نیر تابندۂ اقبال ہیں
سرزمین ہند انہیں سب کی ہے چھائی ہوئی

دیکھیے وہ ہیں خدا رکھے رئیس رامپور
نو عروس ارجمندی جن کی شیدائی ہوئی

آپ کا دم یادگار حضرت خلد آشیاں
آپکے ہاتھوں ریاست اوج پر آئی ہوئی

مرحبا عز و شرف فرمانروائے ٹونک کا
ساتھ رعنائی کے ان پر ختم دانائی ہوئی

حبذا بھوپال کی سرکار کا عز و وقار
ایک ہی ہے یہ ریاست منزلت پائی ہوئی

اے خوشا شان ریاست والیٔ اسعد کی — بانکپن کی شان ادا ٹھٹے میں چھائی ہوئی
آسماں رفعت مہاراجہ بہادر سندھیا — ان کے بل پہ ہے حکومت آج اترائی ہوئی
اور کتنے راجہ و مہراجہ و نواب ہیں — باعثِ تنویر جن کی جلوہ فرمائی ہوئی
ایک سے ہے ایک اعلیٰ ایک سے ایک آفتاب — جن کے آگے آسماں کی آنکھ شرمائی ہوئی
ہو کہاں تک سب کے اسمائے گرامی کا شمار — طول کا موقع نہیں مخل ہے اکتائی ہوئی
ہاں ذرا اب آنکھ اٹھا کر دیکھیے سوئے دکن — یہ سواری ہے کہ شوکت کی گھٹا چھائی ہوئی
آصفی لشکر کا اللہ رے شکوہ و کر و فر — چشمِ گردوں بھی تحیر سے تماشائی ہوئی
کثرتِ افواج نے باندھی ہے کچھ ایسی ہوا — ہوش اڑتے ہیں ہوا چلتی ہے کترائی ہوئی
حسن ترتیب اور سونے پر (کذا) سہاگہ ہو گیا — موتیوں کی اک لڑی ہے تازہ گندھوائی ہوئی
کون ہیں یہ غالب الملک انتخاب الملک ہیں — اہل دانش میں مسلّم ان کی دانائی ہوئی
کون ہیں یہ دیکھو راجہ رائے رایاں ہیں یہی — طرۂ ان کی مایۂ صد بزم آرائی ہوئی
کون ہیں یہ دیکھو دنپرتی کے راجہ ہیں یہی — خاص لطفِ شہ سے ان کی قدر افزائی ہوئی
کون ہیں یہ راجہ مرلی منوہر خوش صفات — مال والوں میں ہے عزت ان کے ہاتھ آئی ہوئی
کون ہیں یہ ذی حشم نواب فخر الملک ہیں — آپ کے دم سے دکن میں ہے بہار آئی ہوئی
کون ہیں یہ خانخانانِ بہادر ذی وقار — آپ سے عزت کی گویا عزت افزائی ہوئی
کون ہیں یہ خوش سیر عالی گہر خورشید ملک — آپ کے ہاتھوں امارت چمکی چمکائی ہوئی
کون ہیں یہ دیکھو آصف یاور الملک آپ ہیں — آپ سے بزمِ شرف کی جلوہ افزائی ہوئی
کون ہیں یہ سر مہاراجہ کشن پرشاد ہیں — شاہ آصف کی وزارت جن کی شیدائی ہوئی
ذی فراست ذی مروت با کمال و خوش خصال — ہر پسندیدہ صفت حصے میں ہے آئی ہوئی
لطفِ آصف جدِ آصف کے نہوں کیوں مستحق — حبِ آصف آپ کی رگ رگ میں ہے چھائی ہوئی
آپ کے اقبال سے چمکا نصیبا ملک کا — آپ کے دم سے حکومت کو توانائی ہوئی
شاد رکھ آباد رکھ یا رب جنابِ شاد کو — تیری رحمت کی گھٹا سر پر ہے چھائی ہوئی
لیجیے وہ خاص سلطانی سواری آ گئی — تھی نظر جس کے لیے آنکھوں میں گھبرائی ہوئی

پڑ گئی ہے کیسی ہلچل سی خجستہ بنیاد میں
جس طرح دریا میں سطحِ آب لہرائی ہوئی

شور ہے ہر سو وہ دیکھو چاند نکلا عید کا
روشنی جس کی چراغ افروزِ بینائی ہوئی

سامنے ظلِ خدا ہے اس طرف خلقِ خدا
رعب ادھر چھایا ہوا سطوت ادھر چھائی ہوئی

دلِ شاہی نے پکارا ہاں مؤدب دور باش
شاہِ اسلامی رخ نے تعظیم پیرائی ہوئی

بخت نے چومے قدم اقبال نے تھامی رکاب
گرد پھر پھر کر تصدق شانِ یکتائی ہوئی

کیوں نہ ہو پھر کو دبیں یہ شاہ آصفجاہ ہیں
وہ سکندر ہیں کہ ان کے در سے دارائی ہوئی

میر محبوب علی خان بہادر ہیں یہی
ہے انہیں کے ساتھ تائیدِ علیؑ آئی ہوئی

ہمتِ حاتم انہیں ہاتھوں سے حاجتمندِ فیض
دولتِ قاروں انہیں قدموں کی ٹھکرائی ہوئی

اس سرِ اقدس پہ افسر سربلندی کا کھلا
چست اس قد پر قبائے صدر آرائی ہوئی

رستمِ دوراں انہیں ان کی شجاعت نے کیا
نام سے ہے روحِ سام و زال تھرائی ہوئی

تیغ زن ناوک فگن ضیغم شکار و صف شکن
بازوؤں میں قوتِ خیبر شکن آئی ہوئی

رائے وہ صائب کہ جس کے سامنے خم چرخِ پیر
فکر وہ موزوں کہ دنیا جس کی شیدائی ہوئی

وہ ذکاوت جو فلاطونِ زماں کو چاہیے
وہ ذہانت جو سبق آموزِ دانائی ہوئی

یہ وہ سلطاں ہیں کہ انکے عہدِ دولت مہد میں
نام عزت کا ہوا ذلت کی رسوائی ہوئی

بارشِ ابرِ کرم سے کشتِ عالم ہے نہال
دامنِ دولت میں خلقت پرورش پائی ہوئی

ہے کمال شاہ آصف کا یہ ادنیٰ سا اثر
پوری ہو جاتی ہے قدموں کی قسم کھائی ہوئی

شاہ کے ہمراہ ہیں شہزادۂ والا تبار
بارک اللہ نور میں کیا نور افزائی ہوئی

شاہزادے کی مدد پر ہیں جو عثمانؓ و علیؓ
حشمت و اجلال کو دونی توانائی ہوئی

شاہ کے اسٹاف میں ہیں کیسے کیسے ذی کمال
فیضِ سلطانی سے جس کی قدر افزائی ہوئی

کوئی نعمانِ جہاں کوئی فصیح نکتہ داں
ذات جن کی عزت و نام آوری پائی ہوئی

یہ ہیں افضل وہ ہیں افسر یا اسد وہ ہیں حکیم
مختلف اوصاف کی کیا خوب یکجائی ہوئی

قائم و دائم رہیں شہزادہ و شاہ نظام
بڑھتی ہی جائے حکومت اوج پر آئی ہوئی

بول بالا لارڈ کرزن کا جو ہیں بالا نشیں
مثلِ خورشید ان سے عالم کو شناسائی ہوئی

پ نے اس سرزمین ہند کو زندہ کیا — آپ سے اس جسم بے جاں کی مسیحائی ہوئی
ر سکی جھک جو صفات حالی کا شمار — لکے اس موقع پہ عاجز اپنی گویائی ہوئی
کہ یہ مسجا ہی پڑھ لینا ہو کافی اس جگہ — ساتھ دولہا کے جو ہے ساری برات آئی ہوئی
ر و دولت میں ترقی ہو شہ ایڈورڈ کی — تاجپوشی جن کی وجہ عالم آرائی ہوئی
یہ قصیدہ پڑھ کے تو نے کر دیا بیخود جلیل — اے جزاک اللہ ابھی بادہ پیمائی ہوئی
ک وہ پیدا ہوا سب کو مزہ آ ہی گیا — صرف محفل میں شراب جام مینائی ہوئی
پنے ہم مشرب تھے جتنے ہو گئے اس کے پہ لوٹ — داد دی حالی نے صدقے روح صہبائی ہوئی

۱۳۲۱ھ

در مدح اعلیحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطان دکن

مزے کی آج جشن آصفی میں مدح خوانی ہے ۔ ادھر سے گلفشانی ہے ادھر سے زرفشانی ہے

اِدھر جوشِ عقیدت سے مبارکباد ہے لب پر ۔ اُدھر جوشِ عطا ہے مرحمت ہے قدردانی ہے

اِدھر آثار خوشنودی اُدھر آثار خوش بختی ۔ اِدھر بھی شادمانی ہے اُدھر بھی شادمانی ہے

اِدھر دستِ ادب میں نذر ہے اخلاص مندی کی ۔ اُدھر کھولے ہوئے آغوش چشم مہربانی ہے

خدائی دین ہے ظلِ خدا کا مہرباں ہونا ۔ یہ پابوسی کی عزت سرفرازی کی نشانی ہے

بھلا ہو جشن کا جس نے نکالے حوصلے دل کے ۔ خوشی اس جشن کی سب سے سوا ہم کو منانی ہے

بہت سے جشن دیکھے ہیں بہت خوشیاں منائی ہیں ۔ مگر اس جشن کے آگے وہ سب قصہ کہانی ہے

نہ کیوں بے مثل ہو یہ جشن ہے اس شاہ ذیشاں کا ۔ جو اپنا آپ ہمسر ہے جو اپنا آپ ثانی ہے

یہ ہم بھی جانتے ہیں جشن کا دعویٰ ہے فارس کو ۔ یہ ہم بھی جانتے ہیں جشن کا جمشید بانی ہے

مگر اس جشن کی غایت فقط ذاتی مسرت تھی ۔ یہاں اقلیم کی اقلیم محوِ شادمانی ہے

وہاں یہ ربطِ روحانی کہاں تھا ملک و مالک میں ۔ یہاں ملکی خوشی کا نام شاہی کامرانی ہے

کہاں ہیں خسرو و دارا کہاں ہیں قیصر و کسریٰ ۔ کہاں وہ شوکتِ ساسانی و شانِ کیانی ہے

ادھر آئیں ذرا دیکھیں دکن کی شان و شوکت کو ۔ یہی کہتے بنے گی ہاں یہ جشنِ خسروانی ہے

بہارِ باغِ جنت کی بڑی تعریف ہے لیکن ۔ وہ جنت نقشِ اول ہے یہ جنت نقشِ ثانی ہے

زمانے کو سنوارا ہے کسی نے دستِ نازک سے ۔ اگر دن ہے تو پیارا ہے اگر شب ہے سہانی ہے

فلک کہتا ہے میرے سر پہ سہرا ارجمندی کا ۔ زمیں کہتی ہے میرے با معراجِ آسمانی ہے

مدد اے طبعِ عالی الدد فکرِ فلک پیما ۔ مجھے تصویر دربارِ معلّیٰ کی دکھانی ہے

مطلع

غ عام ہے یا نوعروس کامرانی ہے
وہ عالم ہے کہ ہر غنچے کے لب پر لن ترانی ہے

لیے وہ نقشہ آج دربار ہمایوں نے
ادھر بہزاد کو سکتہ اُدھر تصویر مانی ہے

یاوٹ منتظر ہے خوشنمائی دوڑنے والی
سلیقہ انتظامی ادب کی پاسبانی ہے

ال ہے کہ رونق بڑھ کے لے ہر آنے والے کو
بٹھانے پر مقرر دلکشی ہے دلستانی ہے

ب درجے نے وسعت پائی ہے اخلاق شاہی کی
ہر اک فانوس میں روشن چراغ زندگانی ہے

ل صحن پر قربان ہو طالع کی ہماری
در و دیوار پر چھائی خدا کی مہربانی ہے

شتی بن کے رحمت کرتی ہے چھڑکاؤ پانی کا
بچائے کس لیے دامن کوئی کوثر کا پانی ہے

س خاص شاہی کا مکاں ہے دیکھنے قابل
یہ کوئی خلد ہے یا جلوہ گاہ خسروانی ہے

دی اس مکاں کی گھر کیے لیتی ہے آنکھوں میں
کسی سیارۂ نوخیز کی اٹھتی جوانی ہے

س دربار والوں کی ہیں یا موتی کی لڑیاں ہیں
کوئی محو نظارہ کوئی گرم خوش بیانی ہے

ہے شور سلطانِ زمن کی آمد آمد کا
وہ سلطاں جس کی مٹھی میں فتوحِ آسمانی ہے

سلامی سر جھکی تو شاہ والا کے قدم آئے
جلو میں شان و شوکت سر پہ چتر کامرانی ہے

یرانِ دکن نکلے ہیں شہ کی پیشوائی کو
ہر اک کے حال پر مبذول لطفِ خسروانی ہے

ہ دیکھو سامنے شہزادۂ والا مناقب ہیں
خدا رکھے عیاں تیور سے شانِ کامرانی ہے

یز جان و دل ہیں یوسفِ مصر سعادت ہیں
نمو کے دن ہیں جوش من ہے چڑھتی جوانی ہے

ہ دیکھو سرکہ مدار السلطنت دستورِ اعظم ہیں
یہ وہ ہیں جاں نثاری جن کی خود آمنے ثانی ہے

وہ آصف یاور الملک انتخاب اہلِ رفعت کیا
وقار و تمکنت ہے آپ میں معجز بیانی ہے

وہ دیکھو رونق افزا خانخاناں بہادر ہیں
یہی صورت امیرانِ سلف کی اک نشانی ہے

وہ فخر الملک ہیں فخر امارت صاحب حشمت
یہ وہ ہیں ذات جن کی رنگ بیٹے حکمرانی ہے

وہ دیکھو ہیں ظفر جنگ آفتابِ اوجِ سرداری
ظفر قبضے میں ہے چہرے پہ رنگِ شادمانی ہے

وہ ہیں سلطان ملک اقبال کی تصویرِ ثانی
جمال و دولت و اعزاز میں کون ان کا ثانی ہے

وہ ہیں دیکھو ولی الدین خاں اقبال کے افسر
خدا ہے بانکپن ان پر گلے ملتی جوانی ہے

وہ دیکھو ہیں معین الدین خاں سرمایۂ نازش
نمایاں چشم و ابرو سے نشانِ کامرانی ہے

وہ ہیں سالار جنگ اور صاف آبائی ہے جنکو
شہ آصف کی ان پر بھی نگاہِ مہربانی ہے

شہ آصف سر کرسی زریں جلوہ فرما ہیں
جبیں سے نور افشاں کوکبِ صاحبقرانی ہے

جو کرسی دوسری ہے اسکو شہزادے نے [illegible]
تجلی آج مہر و ماہ کو ملکر دکھانی ہے

مناسب ہے کہ اس موقع پہ ہو مطلع نیا موزوں
طبیعت دیر سے آمادۂ گوہر فشانی ہے

مطلع

شہ آصف پہ کیا موزوں قبائے خسروانی ہے
بلائیں لیتی ہے دولت تصدق کامرانی ہے

تعالی اللہ ہیں دربارِ آرا ظلِ سبحانی
کبھو سر سے قدم لیں جنکو قسمت آزمانی ہے

وہ چشم فیض ہے جس سے رواں ہیں سیکڑوں چشمے
وہ چشم غیظ ہے جس سے جگر شیروں کا پانی ہے

دکن کی سلطنت میں لطف دیکھا فیض جاری کا
یہی ہے وہ سمندر جس میں دریا کی روانی ہے

عروس سلطنت کا رنگ و روپ اللہ کی قدرت
نہ ڈھلی ہے نہ پیری ہے جوانی ہی جوانی ہے

انھیں ہم صحبتوں میں رات دن شہ کو بسر کرنا
کرم ہے، خلق ہے، انصاف ہے، راحت رسانی ہے

فلک پھرتا ہے اپنی چال پر الٹا سمجھ رکھے
کہ آصف جاہ والا منزلت کی حکمرانی ہے

عدو کے ساتھ ہیں کیا کیا کرشمے سیف آصف کے
جلا دینے کو شعلہ ہے ڈبو دینے کو پانی ہے

دکن کی شام کو دیکھا، دکن کی صبح بھی دیکھی
وہ شام نوجوانی ہے، یہ صبح زندگانی ہے

مکانوں کی ہو کیا توصیف چشم و دل کا ہے عالم
مکینوں کی ہو کیا تعریف گھر گھر شادمانی ہے

مساجد کے لیے اطوار صرف زیب و زینت ہیں
مسافر کے لیے آرام وقف میزبانی ہے

وہ زنجیر عدالت جس میں کڑیاں ہیں شریعت کی
نیا نوشیرواں ہے اب نئی نوشیروانی ہے

جفاکاری گئی گذری ستمگاری پہ قہر آیا
وفاداری کا سکہ ہے وفا کی قدردانی ہے

مٹا رکھا ہے دورِ ظلم کو دورِ سیاست نے
اٹھے کیونکر کوئی فتنہ کہ مانع ناتوانی ہے

نہ ہے دریا دلی پیاسا کوئی رہنے نہیں پاتا
گلوئے خشکِ دشمن کے لیے خنجر کا پانی ہے

عقیدت نے یہ فتویٰ دے دیا ہے جاں نثاروں کو
تصدق شاہ پہ ہونا حیاتِ جاودانی ہے

کوئی بھی سر زمیں چھوٹی نہیں سیراب ہونے سے
زمین شعر کو دیکھو یہاں بھی گلفشانی ہے

...گر تشنہ لب سیراب ہو جائیں ‏ ‏ زباں میں ہا لکھ اعجازِ مسیحا کی سی ... ہے

...ت وہ کہ جس پہ جان دیتی ہے سیاہی ‏ ‏ حلاوت وہ کہ جس سے آبِ حیواں پانی پانی ہے

...ہے ملیح ایسا کہ اس پہلو شوخیٔ حسن ‏ ‏ دلوں پہ چھا گئی ہے اس پہ تیری خوش بیانی ہے

ہر لفظ دلکش ہے مہ جبیناں حسن پرور کی ‏ ‏ غرض ہر مصرع معنوں پہ سرو بوستانی ہے

...سنا ہم نے بلبل کو کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں ‏ ‏ مگر آصف کے آگے اعتراف بے زبانی ہے

...ہو سے جمیل اپنی خدا نے بندہ پرور سے ‏ ‏ کہ جب تک بحر میں پانی ہے پانی میں روانی ہے

...بہاری سے آصف کے فیضِ وجود کی اثر ہیں ‏ ‏ کہیں سب کیا پھلا پھولا یہ ان کی حکمرانی ہے

...ے دولت بڑھے پایہ بڑھے عمر گراں مایہ ‏ ‏ کہیں سب کیا خدا کا فضل ہے کیا مہربانی ہے

...یں سب لکھنو والے ملک و ملک کی سلامت آصف ‏ ‏ نہ اس کا کوئی ہمسر ہے نہ اس کا کوئی ثانی ہے

۱۳۲۲ھ

در مدح اعلیحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطانِ دکن

جشنِ شاہی میں عجب رنگ اچھلتے دیکھا
ساغرِ عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا

وہ چمن آج مقدر نے دکھایا ہمکو
نخلِ امید جہاں پھولتے پھلتے دیکھا

گھر سے نکلے سبھی اس جشن کے نظارے کو
ایک اک دل سے تمنا کو نکلتے دیکھا

رحمت اللہ کی آئی پئے حسنِ دربار
غازۂ نور ہر اک چہرے پہ ملتے دیکھا

رونق افروزیٔ سرکار کا مژدہ سنکر
نگہِ شوق کو آنکھوں میں مچلتے دیکھا

اس خبر سے کہ سرِ شام سجے گا دربار
ہم نے ڈوبے ہوئے تاروں کو نکلتے دیکھا

بخت و دولت کو بھی آتی ہے خوشامد کیسی
ہم نے آنکھیں قدمِ شاہ پہ ملتے دیکھا

کون وہ شاہ خدا رکھے حضور آصفجاہ
نام سے جن کے مریضوں کو سنبھلتے دیکھا

ہوشمندی میں ارسطو سے فلاطوں سے سوا
فتحمندی میں سکندر سے نکلتے دیکھا

ہمسری کرکے سزا مہرِ فلک نے پائی
وہ لگی آگ کہ دن بھر اسے جلتے دیکھا

شکر اکر جسے دیکھا وہ ہوا مالا مال
پھول جس نخل میں آئے اسے پھلتے دیکھا

لاکھوں دیتے ہیں خزانہ نہیں ہوتا خالی
یہ وہ چشمہ ہے سدا جس کو ابلتے دیکھا

اور اللہ کرے دامنِ دولت ہو وسیع
ایک عالم کو اس آغوش میں پلتے دیکھا

اے خوشا بخت کہ نظارہ ہوا قدموں کا
یہ قدم دیکھ کے ارماں کو نکلتے دیکھا

سیر گاہیں ہیں نرالی شہِ والا کے لیے
کبھی آنکھوں میں کبھی دل میں ٹہلتے دیکھا

تابعِ حکم ہے آصف کا زمانہ ایسا
کہ اشارے پہ شب و روز کو چلتے دیکھا

دستِ انصاف سے سرکش کی ہوئی پامالی
دستِ الطاف سے گرتے کو سنبھلتے دیکھا

واہ کیا آن ہے کیا شان ہے کیا سطوت ہے
شیر تھرا گئے تیور جو بدلتے دیکھا

...میں رہ گئے وہ نکلے تھے جو
تیغ شہ کو جب انداز سے چلتے دیکھا

...اسے کرتا ہے غضب کا گرنا
ٹھوکریں کھا کے دو دشمن کو سنبھلتے دیکھا

...سب ہے یہ ملک دکن شام و سحر
چاند سورج کو اسی سانچے میں ڈھلتے دیکھا

...زمانے میں وہ آرام کا سامان ہوا
کہ زمانے کو بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا

...فتنہ و شر سے ہوئے تائب ایسے
عطر فتنہ بھی نہ پوشاک پہ ملتے دیکھا

...شوق میں بھی اب نہ رہی بیدردی
شمع کے سوگ میں پروانے کو جلتے دیکھا

...عمرِ خضر ہو شہِ آصف کو نصیب
اس دعا کو دلِ عالم سے نکلتے دیکھا

مدح آصف میں یہ رنگیں سخنی واہ جلیل
آج تو ہم نے تجھے لعل اگلتے دیکھا

۱۳۲۳ھ

در مدح میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس سلطانِ دکن

کوئی شاہِ دکن کا ہمتا ہو نہیں سکتا
یہ شوکت ہو نہیں سکتی یہ شہرہ ہو نہیں سکتا

یہ حضرت ہی کا پرتو ہے جو سب کے دل ہیں نورانی
اگر سورج نہ ہو گھر گھر اجالا ہو نہیں سکتا

بڑا اقبال سہی کوئی بہت کامل سہی کوئی
جسے اچھا نہ سمجھیں آپ اچھا ہو نہیں سکتا

خدا شاہد حکومت شاہ کی ہے کشورِ دل میں
یہ وہ رتبہ ہے جس سے بڑھ کے رتبہ ہو نہیں سکتا

لبِ جاں بخش آصف نے ہزاروں کو جلایا ہے
غلط کہتے ہیں اب کوئی مسیحا ہو نہیں سکتا

کہاں الطافِ شاہانہ کہاں حاتم کی فیاضی
سمندر کے مقابل کوئی دریا ہو نہیں سکتا

ستا سکتا نہیں کوئی کسی کو دورِ آصف میں
فلک سن لے ترا ارمان پورا ہو نہیں سکتا

کسی کے لب پہ آجائے شکایت غیر ممکن ہے
کسی کے دل میں رہ جائے تمنا ہو نہیں سکتا

شہِ والا کے ہیں احسان اتنے جاں نثاروں پر
کہ سر بھی نذر دے کر کوئی بدلا ہو نہیں سکتا

کسی مجرم کے حق میں جب سزا کا حکم ہوتا ہے
نگاہِ لطف کہتی ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا

بڑا عادل سہی لیکن برابر شاہِ آصف کے
اگر انصاف سے پوچھو تو کسریٰ ہو نہیں سکتا

سلایا ہے اسے تلوار کے سائے میں حضرت نے
قیامت تک تو اب بیدار فتنہ ہو نہیں سکتا

مزے کی بات تو یہ ہے کہ رعبِ شاہِ عادل سے
حسینوں کی دل آزاری کا چسکا ہو نہیں سکتا

بتوں نے توبہ کر لی عاشقوں کے دل دکھانے سے
یہ کہتے ہیں کہ پھر ہم سے کلیجا ہو نہیں سکتا

زمانہ وہ گیا جب فتنہ قد فتنے اٹھاتے تھے
کسی کی چال سے اب حشر برپا ہو نہیں سکتا

کریں ہر چند شاہانِ جہاں تقلید حضرت کی
مگر یہ بانکپن یہ رعب پیدا ہو نہیں سکتا

رخِ شہ دیکھ کر فق ہو گیا مہتاب کا چہرہ
گماں اس کو تھا کوئی مجھ سے اچھا ہو نہیں سکتا

کلامِ شاہ نے اعجاز کی تاثیر پیدا کی
کسی کو اب سخن گوئی کا دعویٰ ہو نہیں سکتا

سب بچا ہوا پھندا ہو فکرِ شاہ عالی کا — ہزاروں ڈھنگ کوئی مضموں ہو حق ادا ہو نہیں سکتا
کہیں ملنے پہ سر پا تضمیں انکی تشبیہ تو جائیں — اشارہ شہ کا ہو جائے تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
نہیں کیا خوف جو ہیں دامنِ دولت سے لپٹے ہیں — مخالف آسماں دشمن زمانہ ہو نہیں سکتا
رہیں یارب سلامت شاہ آصف اور ولیعہد — کبھی فارغ دعا سے دل ہمارا ہو نہیں سکتا
جلیل اک شعر بھی گر شاہ والا کو پسند آئے — تو کہہ سکتے ہو تم ایسا قصیدہ ہو نہیں سکتا
مناسب ہے کہ اب کوئی پھڑکتی سی غزل کہہ دو — بغیر اسکے سخن کا لطف پورا ہو نہیں سکتا

غزل

چھری میرے گلے پر پھیر دو کیا ہو نہیں سکتا — اب ایسے تم ہو نازک تم سے اتنا ہو نہیں سکتا
لبِ جاں بخش پہ مرتے ہوئے لاکھوں کو دیکھا ہے — مسیحا کہنے سے قائل مسیحا ہو نہیں سکتا
انہیں دیکھو کہ وہ دل لیکے ہم سے زبردستی — ہمیں دیکھو کہ اب ہم سے تقاضا ہو نہیں سکتا
کیا ہے وعدۂ فردا الٰہی کیا قیامت ہے — وہ ہیں بے فکر مجھ سے صبر اتنا ہو نہیں سکتا
نگاہوں سے تو چھپتے ہیں مگر آنکھوں میں پھرتے ہیں — اسی کا نام پردہ ہے تو پردا ہو نہیں سکتا
تمہیں پر کیا ہے جیسے ہوں ہزاروں چاہنے والے — وہ پیدا قول کا وعدے کا سچا ہو نہیں سکتا
وہی اب بے وفا کہلاتے ہیں جو ہم سے کہتے تھے — تم ایسے ہو تو ممکن ہے میں ایسا ہو نہیں سکتا
کبھی دل لو کبھی پھیر دو کبھی خوش ہو کبھی روٹھو — تمہیں تو کھیل ہے مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا
قیامت میں بڑا مجمع سہی پہچان ہی لیں گے — انہیں ہو جائے دھوکا ہم کو دھوکا ہو نہیں سکتا
جو حالت دیکھتے ہیں جا کے اُن بیدردوں کے گھر میں — ہمارے دوستوں سے جائے اتنا ہو نہیں سکتا

جلیل خستہ جاں کو تم کہاں تک آزماؤ گے
تمہارا ہے تمہارا اب کسی کا ہو نہیں سکتا

۱۳۲۴ھ

در مدحِ اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس سلطانِ دکن

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا
یہ وہ مصرع ہے جس پر چاہیے صد مرحبا کہنا

جلیل زار کو آصف جلیل القدر فرمائیں
یہ وہ عزت ہے جس کو چاہیے فضلِ خدا کہنا

سوئے احباب جانا ہو جو اے بادِ صبا تیرا
ہماری سرفرازی کا ہر اک سے ماجرا کہنا

شرف ایسا خطاب ایسا کسی نے بھی نہیں پایا
یہ دعویٰ ہے بجا دعویٰ یہ کہنا ہے بجا کہنا

حقیقت میں شہِ آصف کی یہ ذرہ نوازی ہے
جو ہو ذرہ سے کم خورشید سا اسکو سوا کہنا

نہیں ممکن ادا ہو شکر اس اعزاز بخشی کا
سوا مدح و ثنا کے اور اب ہو سکتا ہے کیا کہنا

جدا ہے شان سلطانِ دکن کی سب سلاطیں سے
قصیدہ بھی ہوا لازم ہمیں سب سے جدا کہنا

شہِ آصف سا ظلِ اللہ دیکھا ہے کہیں تو نے
قسم ہے اے فلک تجھ کو خدا لگتی ذرا کہنا

فقیروں کا اگر ملجا کہیں تو بات ہی کیا ہے
امیروں کے لیے ہے فخر اس در کا گدا کہنا

مرے ممدوح کی نسبت یہی معمول ہے سب کا
مہِ اوجِ شرف کہنا شہِ کشور کشا کہنا

مسیحا میں جو کہتا ہوں لب جاں بخش آصف کو
نگاہیں کہتی ہیں ہم کو بھی خضرِ رہنما کہنا

عقیدت پر نظر کر کے مناسب بلکہ واجب ہے
فدائے مصطفیٰ دلدادۂ غوث الوریٰ کہنا

مزاجِ شاہِ والا بے طلب دینے کا خوگر ہے
عبث ہے کچھ طلب کرنا خطا ہے مدعا کہنا

انھیں باتوں سے بیڑا پار ہوتا ہے غریبوں کا
بجا ہے کشتیِ عالم کا تم کو ناخدا کہنا

لٹائے جاتے ہیں جب لعل و گوہر پیہم غلط کیا ہے
تمہیں کانِ سخا کہنا تمہیں بحرِ عطا کہنا

کسی پر کھل نہیں سکتا کہ منشائے دلی کیا ہے
اسے بھی ہے مناسب ایک شاہانہ ادا کہنا

وفا کا دور دورہ ہے وفاداری کا چرچا ہے
جفا کرنا کجا اب ظلم ہے لفظِ جفا کہنا

کہاں اب کوئی کہتا ہے تمہارے ستمگر کو — اسیر زلف جاناں کو گرفتار بلا کہنا

نہیں کچھ شک کہ حضرت فرد ہیں جوہر شناسی میں — وہ آکر دیکھ لے جسکو نہ باور ہو مرا کہنا

نظر چن لیتی ہے اس شعر کو جو شعر ہوتا ہے — کہ چھپ سکتا نہیں نقاد سے اچھا برا کہنا

دعا جو شہ کے حق میں خلق کے دل سے نکلتی ہے — وہ کہتی ہے مجھے زیبا ہے تیر بے خطا کہنا

جلیل اچھے کہے اشعار مدح شاہ آصف میں
جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

۱۳۲۶ھ

در مدح اعلیحضرت میر محبوب علی خان آصفجاہ سادس سلطان دکن

جو دن پھرتے ہیں تو سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے
شبِ غم لاکھ طولانی ہو تڑکا ہو ہی جاتا ہے

چمن میں پھولنے پھلنے کی نوبت آہی جاتی ہے
وہ گلشن میں بار ورِ نخلِ تمنا ہو ہی جاتا ہے

رہا جوش کی تعدادوں میں ترقی اسکو لازم ہے
ملادیئے جو قطرہ وہ دریا ہو ہی جاتا ہے

چمک ذرے میں سورج کی کرن سے آہی جاتی ہے
درِ شہ کا گدا ادنیٰ سے اعلیٰ ہو ہی جاتا ہے

توجہ چاہیے تھوڑی سی شاہِ بندہ پرور کی
فقیرِ دل کا جہاں میں بول بالا ہو ہی جاتا ہے

جو دل سے ہو رہا حضرت کا سہرا اسکو بھی کیا ہے
موافق آسماں تابع زمانہ ہو ہی جاتا ہے

مرے گلزار میں رنگِ خزاں کب تک جما رہتا
کہ اک دن فصلِ گل کا دور دورہ ہو ہی جاتا ہے

توقع شاہ سے رکھنا کبھی خالی نہیں جاتا
یہ دیکھا ہے کہ فضلِ حق تعالیٰ ہو ہی جاتا ہے

اشارہ چاہیے ہر مشکل آساں ہو ہی جاتی ہے
سہارا چاہیے ہر بوجھ ہلکا ہو ہی جاتا ہے

کسی کا درد دل ہو بے اثر یہ غیر ممکن ہے
مریضوں پر کرم فرما مسیحا ہو ہی جاتا ہے

مسیحا جب کرم فرما ہوا پھر پوچھنا کیا ہے
دوا ہو یا نہ ہو بیمار اچھا ہو ہی جاتا ہے

تجسس شاہدِ مقصود کا ضائع نہیں جاتا
وہ اک دن زیبِ آغوشِ تمنا ہو ہی جاتا ہے

حقیقت جب ہوئی پوری تو کیسا پردۂ دوری
رخِ محبوب دل میں جلوہ آرا ہو ہی جاتا ہے

بجا ہے اب عروسِ شاعری کا دعویٰ کی لینا
شباب آتا ہے تو جوبن دوبالا ہو ہی جاتا ہے

گلِ مضمون جو کل خشک تھے اس کا تعجب کیا
خزاں کے دور میں ہر پھول کانٹا ہو ہی جاتا ہے

نہ میں اچھا نہ میرے شعر اچھے بات اتنی ہے
جسے اچھا کہیں سرکار اچھا ہو ہی جاتا ہے

جلیلِ زار کو دیکھو جلیل القدر کو دیکھو
لقب جو شاہ سے ملتا ہے زیبا ہو ہی جاتا ہے

تعجب کیوں کسی کو ہو ہماری سرفرازی پر
خدا کا فضل ہوتا ہے تو ایسا ہو ہی جاتا ہے

یہ ایسی سرفرازی ہو یہ وہ قدر افزائی ہو
دکھا کے عکس لڑکوں میں چھپا ہو ہی جاتا ہو

حسد کوئی کرے کیوں واسطہ سب پہ پیدا ہو
کہ جو قسمت کا لکھا ہو وہ پورا ہو ہی جاتا ہو

لکھوں اب شکر یہ کیسا تو کہو مدح شہ والا
کہ اس موقع پہ دلچسپ جوش پیدا ہو ہی جاتا ہو

یہ مدح شاہ وہ مطلب ہے جسکے نظم کرنے کو
ارادہ میں نہیں کرتا ارادہ ہو ہی جاتا ہے

مطلع

کمالِ شاہ پر انسان شیدا ہو ہی جاتا ہے
جمالِ شاہ کو دیکھو تو سکتا ہو ہی جاتا ہے

نظر جس کی پڑی آئینہ روئے مبارک پر
نصیب اس کو سکندر کا نصیبا ہو ہی جاتا ہے

سواری کا سماں سو بار دیکھا ہے مگر پھر بھی
سلیماں کا شہ آصف پہ دھوکا ہو ہی جاتا ہے

نہ ہے ہر دلعزیزی بخت و دولت بھی کچھ ایں
تمہیں جو دیکھ لیتا ہے تمہارا ہو ہی جاتا ہے

خدا رکھے شہ جم جاہ کا عہد عجب دلبیا
کسی کا بخت بگڑا ہو تو سیدھا ہو ہی جاتا ہے

تجلی مو کر دیتی ہے ایوانِ مصطفےٰ کی
دریشہ کا تماشائی تماشا ہو ہی جاتا ہے

کسی آزاد کی اس حد پہ آزادی نہیں چلتی
کرم کا خلق کا احساں کا بندا ہو ہی جاتا ہے

بہت دور آپ کو کھینچے جو کوئی فائدہ کیا ہے
خدنگ لطفِ شاہی کا نشانا ہو ہی جاتا ہے

دلوں پر کیوں نہ ہو قبضہ کہ دل کو شاد کرتی ہیں
یہ وہ جادو ہے جس سے فریفتا ہو ہی جاتا ہے

مثال ماہ تاباں انجمن آرا جو ہوتے ہیں
تو شاہان جہاں کا حلقہ ہالا ہو ہی جاتا ہے

کمالِ شاہ کا اللہ اکبر کیا تصرف ہے
کوئی انساں ہو دم بھر میں پتلا ہو ہی جاتا ہے

جہاں مجرم کوئی پھنس کر ہوا سائل رہائی کا
مروت آہی جاتی ہے اشارا ہو ہی جاتا ہے

عتابِ شاہ بھی خالی نہیں شانِ ترحم سے
ہوا جو برطرف اس کا وظیفا ہو ہی جاتا ہے

نکل جاتی ہے خدمت ہاتھ سے روزی نہیں جاتی
یہی وہ بات ہے دل جس پہ شیدا ہو ہی جاتا ہے

سزا کے واسطے دل میں کوئی پہلو نہیں آتا
عطا کے واسطے کوئی بہانا ہو ہی جاتا ہے

مرے شہ کی سخاوت مشک کی تاثیر رکھتی ہے
چھپا کر لاکھ دیں عالم میں شہرا ہو ہی جاتا ہے

ہمیشہ فیض جاری ہے ہمیشہ خیر جاری ہے
لٹاتا ہے جو موتی دل کا دریا ہو ہی جاتا ہے

عجب عہد مبارک ہے کہ جب چاہو جہاں چاہو
خوشی کا عیش کا ساماں مہیا ہو ہی جاتا ہے

رکو سفر میں دھوپ کی ایذا نہیں ہوتی ۔ کہ سر پر دامنِ دولت کا سایا ہو ہی جاتا ہے
ددہ پر تو پھل ملتا ہے نخلِ خاکساری کا ۔ جو قد موزوں ہے جھکا سر اس کا اونچا ہو ہی جاتا ہے
آئینہ ہے اور اس میں خواہش جامِ خسرو ہے ۔ کسی کا رازِ دل ہو آشکارا ہو ہی جاتا ہے
ق دیتے ہیں لقماں کو فلاطون ذہن ہو کر ۔ ہوا جو بندۂ بیدام دانا ہو ہی جاتا ہے
ہ تیر اگر کچھ نکلے نہ نکلے تیر چشمک سے ۔ دلِ صیاد میں خونِ تمنا ہو ہی جاتا ہے
م خسروی کیونکر نہ دنیا سے نرالا ہو ۔ شہِ یکتا کا ہر مضمون یکتا ہو ہی جاتا ہے
ارکھے جہاں دو گل کھلائے طبعِ رنگیں نے ۔ گلستاں بوستاں کا رنگ پھیکا ہو ہی جاتا ہے
باں پہ طوطیِ ہندوستاں کو وجد آتا ہے ۔ بیاں پر بلبلِ شیراز شیدا ہو ہی جاتا ہے
لق کو داغ آتش کو جلن جامی کی بیہوشی ۔ صبا کو بیکلی سودا کو سودا ہو ہی جاتا ہے
بجا ہے سامعیں کا مثلِ قمری نعرہ زن ہونا ۔ کہ اک اک شعر موزوں سروِ رعنا ہو ہی جاتا ہے
زمینِ سخت میں بھی معنیِ روشن نکلتے ہیں ۔ صدف میں دُر حجر میں لعل پیدا ہو ہی جاتا ہے
بناوٹ کی ضرورت کیا تصنع کی ہے حاجت کیا ۔ طبیعت ہو جو بانکی شعر بانکا ہو ہی جاتا ہے
دیے ہیں شاہ کو خالق نے کیا کیا چاند سے ٹکڑے ۔ قمر جب دیکھتا ہے گھٹ کے آدھا ہو ہی جاتا ہے
نہ کیوں روشن ہوں سب کے دیدہ و دل شاہزادوں سے ۔ کہ مہر و ماہ سے گھر گھر اجالا ہو ہی جاتا ہے
مجھے دعویٰ نہیں لیکن ثناے شہ کی لکھتا ہوں ۔ سخن کو اپنی یکتائی کا دعویٰ ہو ہی جاتا ہے
کوئی مانے نہ مانے میں تو ہوں اس فیض کا قائل ۔ زمیں مشکل سے مشکل ہو قصیدہ ہو ہی جاتا ہے

جلیلِ آصفی کے حق میں جو دعا دل سے نکلتی ہے
اثر فضلِ خدا سے اس میں پیدا ہو ہی جاتا ہے

۱۳۲۷ھ

در مدح اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطان دکن

بزمِ عشرت میں نئے رنگ کا ساماں دیکھا
حالتِ وجد میں ساغر کو بھی رقصاں دیکھا

پھول مسند کے کھلے ہیں تو شگوفے دل کے
جو دیکھا تھا کبھی وہ چمنستاں دیکھا

غنچۂ گل سے بھلا ضبطِ خوشی کیا ہوتی
ہنس پڑے وہ بھی جو سرکار کو خنداں دیکھا

ہر شجر ہے شجرِ طور سے بڑھ کر روشن
ہر شگوفہ کو چراغِ تہِ داماں دیکھا

تھی نسیمِ سحر آگاہ کہ ہے وقتِ خوشی
کر گئی شمع کو خاموش جو گریاں دیکھا

ایک اک گھر پہ برستی ہوئی رحمت دیکھی
ایک اک دل سے نکلتا ہوا ارماں دیکھا

تخت کے تاج کے مالک ہیں سرکار ہوئے
تخت کو تاج کو تقدیر پہ نازاں دیکھا

للہ الحمد کہ اورنگ نشینِ اقبال
بعدِ آصف تجھے عثمان علی خاں دیکھا

للہ الحمد کہ خدّام وفا پرور نے
تجھے آقا تجھے والی تجھے سلطاں دیکھا

دیکھنا اس کو مسرت کا اثر کہتے ہیں
دشمنوں کے دہنِ زخم کو خنداں دیکھا

ایک عالم ہے کہ مدہوش نظر آتا ہے
یہ نہ پوچھ کہ شاہاں کے فرماں دیکھا

ابرِ رحمت کی طرح خلقِ خدا کے سر پر
سایہ افگن تجھے اے سایۂ یزداں دیکھا

دوست دشمن پہ رعایا پہ زمانے بھر پر
تری شفقت تری بخشش ترا احساں دیکھا

لوحش اللہ تجھے لاکھوں میں یگانہ پایا
بارک اللہ تجھے سرِ حلقۂ شاہاں دیکھا

حبذا ساتھ ترے نصرتِ باری دیکھی
مرحبا ہاتھ ترے فتح کا میداں دیکھا

کان سے وصفِ سکندر جو سنا تھا پہلے
آنکھ سے آج وہ اے خسروِ ذیشاں دیکھا

کبھی چھپتے نہیں اوصاف جو آبائی ہیں
آصفی شان کو تجھ سے نمایاں دیکھا

روئے رنگیں پہ پسینے کا عجب عالم ہے
آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھا

چھدری چھدری جو نظر شہ کی طرف جاتی ہے
رعبِ دربار یہ کہتا ہے کہ ہاں ہاں دیکھا

عہد دولت میں ترے رنج ہوا گم مراد
دورِ راحت میں ترے درد کو درماں دیکھا

نہ غمِ دزد، نہ رہزن کا کسی کو کھٹکا
رعبِ شاہی کو رعایا کا نگہباں دیکھا

بخت و دولت کو حکومت کو جہانداری کو
تیرے اقبال ترے اوج ترے شایاں دیکھا

جس طرح ابر کے ٹکڑے سے ہو بارش برپا
دستِ فیاض سے یوں ہی گہر افشاں دیکھا

دو نہیں چار نہیں سو نہیں سو لاکھ نہیں
سارے عالم کو ترا بندۂ احساں دیکھا

دولت و جاہ و حشم کو ہے عقیدت کیسی
اسے شیدا اسے صدقے اسے قرباں دیکھا

جس نے دربار ترا دیکھ لیا پھر اس نے
آنکھ اٹھا کر نہ کبھی سوئے گلستاں دیکھا

سچ ہے نظارۂ دربار کچھ آسان نہیں
جس کو دیکھا صفت آئینہ حیراں دیکھا

اس نظر میں اثر اکسیر کا آجاتا ہے
جس نظر نے تجھے محسنِ دوراں دیکھا

یوں ہی دیکھیں فلک پیر کو ہم لاکھ برس
جس طرح آج ترا تابع فرماں دیکھا

ایک تجھ پر نہیں موقوف زمانے کو جلیل
میر عثمان علی خاں کا ثنا خواں دیکھا

۱۳۲۹ھ

در مدح اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں آصفجاہ سابع سلطانِ دکن

مدح کوئی فخر ہے طبعِ رسا کے واسطے
دل دعا کے واسطے لب ہیں ثنا کے واسطے

گوہرِ معنی نکالے ہیں اسی مقصود سے
ارمغاں ہوں تا کسی بحرِ عطا کے واسطے

لعل پارے ہیں یہ مصرع رنگ میں ڈوبے ہوئے
کیا مناسب نذر ہے کانِ سخا کے واسطے

گرچہ مدحت پر نہیں حاجت روائی منحصر
پھر بھی حیلہ چاہیے حاجت روا کے واسطے

کون وہ بحرِ عطا کانِ سخا حاجت روا
جو خدا کا فضل ہے خلقِ خدا کے واسطے

میر عثمان علی خاں خسروِ ملکِ دکن
مایۂ ناز و طرب ارض و سما کے واسطے

بجا ہی ہے اسی شاہ ملک فر کے لیے
بادشاہی ہے اسی ظلِ خدا کے واسطے

حبذا اے تاجدار ذی کرم والا ہمم
ہے عطا تیرے لیے تو ہے عطا کے واسطے

ملک کے حق میں ہیں ایسے تیرے انفاسِ لطیف
بات جو گلشن میں ہے بادِ صبا کے واسطے

یہ تجھی کو ہم نے دیکھا یہ ترا ہی خلق ہے
کام تو کرتا ہے بندوں کا خدا کے واسطے

تجھ کو دیتے ہیں دعا آرام سے بیٹھے ہوئے
دارِ راحت ہے ترا در ہر گدا کے واسطے

طبعِ عالی کے لیے ہے دانش و تدبیر و رائے
ذہنِ موزوں ہے ترا فہم و ذکا کے واسطے

یہ ترا عہدِ مسرت ہے کہاں اب رنج و غم
چشم و لب ترسا کریں آہ و بکا کے واسطے

سن لے تو بھی اے فلک ہے آصفِ سابع کا دور
ساقی کا حکم ہے ہر کج ادا کے واسطے

طالعِ روشن سے یہ مضمون ہے روشن کہ ہے
فتح و نصرت آصفِ کشور کشا کے واسطے

شکوۂ معشوق کیوں آئے لبِ عشاق پر
اب کوئی موقع نہیں جور و جفا کے واسطے

ہاتھ سے تیرے ملی ساری کدورت خاک میں
سینہ و دل گھر ہے صدق و صفا کے واسطے

دامنِ عالم سے دھبا بے وفائی کا مٹا
گود پھیلاتے ہیں اب مہر و وفا کے واسطے

حکم یہ ہے ہاتھ سے جانے نہ پائے چھوٹ کر
یہ بھی گویا قید ہے دزدِ حنا کے واسطے

گر سیاست ہے تو ہے شانِ ریاست بھی عجب
ہے یہاں عفو و عطا سہو و خطا کے واسطے

بعد حاتم مل گیا اے شاہ تیرا دستِ فیض
پھر ٹھکانا ہو گیا جود و سخا کے واسطے

اس قدر اوصاف ہیں ممکن نہیں جن کا شمار
سخت مشکل ہے یہاں مدحت سرا کے واسطے

خلق سے تیرے گلستاں کے گلستاں کھل گئے
تو نے کچھ چھوڑا نہیں بادِ صبا کے واسطے

گل سراپا گوش ہیں سننے کو تیری گفتگو
لب شگوفوں کے کھلے ہیں مرحبا کے واسطے

کیا مروت ہے ادھر تعجیل ہے بہرِ عطا
اور ادھر تاخیر ہوتی ہے سزا کے واسطے

بندھ گئی ہے ایسی استغنا کی عالم میں ہوا
راہ آنے کی نہیں حرص و ہوا کے واسطے

نام لے کر شاہ کا پاتے ہیں راحت دردمند
یہ دوا اکسیر دیکھی ہے شفا کے واسطے

چارہ سازی اس کو کہتے ہیں کہ دورِ شاہ میں
درد ڈھونڈے سے نہیں ملتا دوا کے واسطے

اونچے اونچوں کی ہے تیری ذاتِ عالی ہیچ
آسماں بھی جھک رہا ہے التجا کے واسطے

آتے جاتے آنکھ اٹھ جاتی ہے تیری جس طرف
ہاتھ اٹھ جاتے ہیں لاکھوں کی دعا کے واسطے

قہر تیرا دشمنانِ بے مروت کے لیے
لطف تیرا دوستانِ بے ریا کے واسطے

مدعا سارے زمانے کا تو خود پورا کرے
ملتجی حق سے ہو اپنے مدعا کے واسطے

ہے یہی اک در جہاں ملتی ہے منہ مانگی مراد
ہے یہی اک گھر غریب و بے نوا کے واسطے

جو ہمارا درد ہے روشن ہے وہ سرکار پر
جائیں کیوں پیشِ اطبا ہم دوا کے واسطے

سلطنت پائی جو پایا دامنِ دولت ترا
کیوں پھریں ہم سایۂ بالِ ہما کے واسطے

بس کہاں تک شہ کے اوصاف لکھو گے جلیل
ہاتھ اٹھاؤ لب قلم رکھ کر دعا کے واسطے

یا خدا تیری عنایت سے رہے شام و سحر
فتح و نصرت آصفِ کشور کشا کے واسطے

چار دانگ دہر میں ہو بول بالا شاہ کا
یا الٰہی چار یارِ باصفا کے واسطے

بہرِ عثمانؓ شاہ عثمان پہ رہے رحمت تری
مشکلیں آساں ہوں مشکل کشا کے واسطے

۱۳۶۹ھ

در مدحِ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطانِ دکن

کس قدر سالگرہ روح فزا ہوتی ہے
وجد میں ساری خدائی بخدا ہوتی ہے

دلِ عادل کے شگوفے کی جگہ کھلتے ہیں
آج کل اور ہی گلشن کی ہوا ہوتی ہے

دمِ عیسیٰ ہے نسیمِ سحری کا جھونکا
آج کل درد میں تاثیر دوا ہوتی ہے

سبز پوشاک پہنتے ہیں جوانانِ چمن
سرخرو رنگ مسرت سے حنا ہوتی ہے

بیل بوٹے میں عجب حسن نظر آتا ہے
پتی پتی میں عجب شانِ خدا ہوتی ہے

نرگسِ باغ کی آنکھوں میں ہے مستی کا وہ رنگ
جیسے ساغر میں مے ہوش ربا ہوتی ہے

جابجا سنبلِ پیچاں کا وہ عالم دیکھا
جیسے بل کھاتی ہوئی زلفِ دوتا ہوتی ہے

دیکھیے سیر تو آنکھوں میں سرور آتا ہے
سونگھیے پھول تو بو روح فزا ہوتی ہے

بچے بچے کو عقیدت ہے شہِ والا سے
غنچے غنچے میں یہاں بوئے وفا ہوتی ہے

جانِ مشتاق کو سوجھی ہے یہ تدبیر اچھی
نام سرکار کا لے لے کے فنا ہوتی ہے

ایسے فیاض زمانے میں کہاں ہوتے ہیں
عرض ہوتی نہیں حاجت کہ روا ہوتی ہے

رحم کے ہاتھ سے ہوتا ہے گرفتار رہا
عدل کے ہاتھ سے ظالم کو سزا ہوتی ہے

جان جاتے ہیں جو ہوتا ہے کوئی رازِ نہاں
تاڑ جاتے ہیں کسی سے جو خطا ہوتی ہے

ہاتھ دینے سے کبھی روک لیں ممکن ہی نہیں
بادشاہوں سے جو ہوتی ہے سخا ہوتی ہے

خاکِ پا جیسی ہے ایسی کوئی اکسیر نہیں
ایک چٹکی سے ہزاروں کو شفا ہوتی ہے

بات حکمت کی جو آتی ہے زبانِ شہ پر
حکمرانوں کے لیے راہ نما ہوتی ہے

خلق شہ نے وہ دیا ہے سبق دلسوزی
شمع محفل کی ہوا خواہ صبا ہوتی ہے

بانکپن کا کوئی موقع جو نکل آتا ہے
قابلِ دید وہ شاہانہ ادا ہوتی ہے

نوک کی بات جو سن لے تو عدو کٹ جائے
تیر سے، تیغ سے، خنجر سے سوا ہوتی ہے

قصد ہوتا ہے چمن کا تو نچھاور کے لیے
پھول دامن میں لیے بادِ صبا ہوتی ہے

چتر ہو ساتھ سواری کے ضرورت کیا ہے
سر پہ چھائی ہوئی رحمت کی گھٹا ہوتی ہے

خشک پتوں کی طرح اڑتے ہیں سر اعدا کے
تیغ سرکار کی چلنے میں ہوا ہوتی ہے

دوستوں کے لیے فرمانِ ظفر بنتی ہے
دشمنوں کے لیے پیغامِ قضا ہوتی ہے

تن کے چلتی ہے تو بن جاتی ہے طاؤس چمن
قتل کرنے میں حسینوں کی ادا ہوتی ہے

اور خدمت تو کوئی ہو نہیں سکتی ہم سے
عمر و دولت کی شب و روز دعا ہوتی ہے

شاہ شہزادے سلامت رہیں یارب جن سے
محفلِ عیش و طرب روز بپا ہوتی ہے

اب مناسب ہے کہ اک تازہ غزل بھی پڑھ دوں
رونقِ بزمِ سخن اس سے سوا ہوتی ہے

غزل

توبہ جب توڑیے پیدا یہ صدا ہوتی ہے
ہائے کیا چیز مئے ہوش رُبا ہوتی ہے

یوں تو اس کی ہر ادا ہوش رُبا ہوتی ہے
جو ذرا شوخ نکلتی ہے قضا ہوتی ہے

روئے معشوق سے ہے اس کا اٹھانا دشوار
لاکھ پردوں کا جو اک پردۂ حیا ہوتی ہے

رنگ چہرے کا اڑا خواب اڑا آنکھوں سے
کوچۂ عشق میں کیا تیز ہوا ہوتی ہے

دل جو لینا ہو کسی کا تو نگہ ہو کہ ادا
ایک سے ایک لگاوٹ میں سوا ہوتی ہے

آرزوئے خلد کی حوروں کی تمنا زاہد
ایسے دل میں بھی کہیں یادِ خدا ہوتی ہے

باغ میں شوخیٔ رفتار کا موقع کیا ہے
دیکھیے دیکھیے پامال حنا ہوتی ہے

پینے والوں سے نہیں ہوش سنبھالا جاتا
مفت بدنام مئے ہوش رُبا ہوتی ہے

خاک میں چرخ ملاتا ہے ملانے دو جلیل
اور بھی آئینۂ دل کی جلا ہوتی ہے

در مدح اعلیحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطان دکن

غلغلہ آج ہے دربار کا دنیا بھر میں / یہی چرچا ہے زباں پر یہی سودا سر میں

دیکھ لو دیکھو اِدھر ہو گا نہ ایسا دربار / کسی اقلیم کسی ملک کسی کشور میں

لوگ ہر سمت سے دلی میں کھنچے آتے ہیں / دلبری ایسی تو ہو گی نہ کسی دلبر میں

کون دربار کے نشہ میں نہیں متوالا / چرخ کہتا ہے کہ میں بھی ہوں اسی چکر میں

نکل جاتی ہے نظر آنکھ سے ارماں دل سے / آج ٹھہرا نہیں جاتا ہے کسی سے گھر میں

آج آغوش میں بچوں کا یہ عالم دیکھا / آرزو جیسے مچلتی ہو دلِ مضطر میں

دخترِ رز سے بھی نیچے نہیں بیٹھا جاتا / ابھی شیشے میں نظر آئی ابھی ساغر میں

شوقِ نظارۂ دربار نے سب کو کھینچا / شیخ مسجد میں نہ برہمن نہ رہا مندر میں

ہر طرف عیش کا سامان نظر آتا ہے / شہر میں عید اِدھر جشن اُدھر لشکر میں

قابلِ دید ہے دربار کا ایوانِ بلند / پردۂ دیدۂ مشتاق ہیں اک اک در میں

تاجپوشی کے لیے قیصرِ ہند آئے ہیں / جارج پنجم جو ہیں موجود زمانے بھر میں

یہ برآمد ہوئے مغرب سے تو وہ مشرق سے / ہے یہی فرق شہِ ہند و شہِ خاور میں

چرخِ چارم پہ ہے گوشہ کلہِ قیصر کا / یہ بلندی تھی کہاں طالعِ اسکندر میں

سالہاسال سرِ شہ پہ مگس رانی کی / جب سعادت کی صفت آئی ہما کے پر میں

آپ چاہیں تو گدا ہمسرِ سلطاں ہو جائے / چار دن میں نہیں دو دن میں نہیں دم بھر میں

کام چلتا ہے اشاروں میں جہانداری کا / ہیں نظر میں وہی اوصاف جو ہوں اکبر میں

دیدنی آج ہے سارے رؤسا کا مجمع / کوئی شوکت میں ہے نامی کوئی مال و زر میں

جلوہ گر یوں بصد اعزاز ہے ایک ایک نگیں / جیسے جڑتے ہیں نگیں حلقۂ انگشتر میں

بالخصوص آصف سابع چمن آرائے دکن
ستا سیارہ بھی ہیں جس کے لیے چکر میں

میر عثمان علی خان بہادر جمجاہ
کب ندے ہے یہ مرقوم ہر یک دفتر میں

دیکھو دیکھو وہ ہیں سلطان دکن جلوہ فروز
کس قدر چست حکومت کی قبا ہے بر میں

کوئی کس آنکھ سے سرکار کا جلوہ دیکھے
اشک شادی تو بھرے آتے ہیں چشم تر میں

مایۂ ناز ہے انساں کے لیے ایک کمال
آپ ماہر ہیں ہر اک فن میں ہر اک جوہر میں

آصفی شان پہ سب لوٹ ہوئے جاتے ہیں
بانکپن کی جو ادا دیکھتے ہیں تیور میں

سادہ پوشاک کا عالم یہ کہے دیتا ہے
سادگی میں ہے جو زینت وہ کہاں زیور میں

صفت ہمت و مردانگی وصف شکن
آئی عثمان علی خاں میں جو تھی حیدر میں

بانکپن میں ہیں جو مشہور انہیں سے پوچھو
وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نوک کہاں خنجر میں

جوش زن آج جو دل میں ہے خوشی کا دریا
نور بن بن کے نکھر آیا ہے رخ انور میں

کہتی ہیں دیکھنے والوں سے حیا والی آنکھیں
سنگریزہ ہے اگر آب نہ ہو گوہر میں

وسعت اتنی ہے کہ پلتی ہیں کروڑوں جانیں
دامن دولت سلطان جہاں پرور میں

خلق ایسا ہے کہ مخلوق مسخر ہو جائے
بات ایسی ہے کہ تاثیر کرے پتھر میں

باتوں باتوں میں کمال اپنا دکھا دیتے ہیں
جیسے دل چھین لے ساحر کوئی دو اکھر میں

خوبیاں اتنی اگر ہوں تو بتا دو ہم کو
کسی ہمپایہ و ہم مرتبہ و ہمسر میں

بارش ابر کرم کی نہ رہی حد کوئی
ہو گئی غرق جہاں قلزم سیم و زر میں

بندگی ہے تیغ دو سر جیب کمر حضرت میں
درد دیتا ہے خبر اٹھ کے معرکے سر میں

یہ وہ تلوار ہے گھمسان میں جب چلتی ہو
فرق کر دیتی ہے پیدا رہ خیر و شر میں

جس کے قبضے میں ہو وہ فاتح و منصور رہے
خاص جوہر ہے یہ شمشیر ظفر پیکر میں

تیز چلنے میں قیامت ہے یہ شاہی تلوار
دے سکے ساتھ بھلا دم یہ کہاں صرصر میں

ہم رکاب آپکے جتنے ہیں وزیر و امرا
فرد ہیں دولت و جاہ ہنر و جوہر میں

ایک سے ایک ہے اوصاف میں لائق فائق
ایک سے ایک ہے جانباز و جری لشکر میں

سارے اوصاف بیاں ہوں یہ کہاں ممکن ہے
کیجئے سیر کو دربار ضیا گستر میں

کس قدر آج سلامی کی ہے آواز بلند | توپ چلتی ہے دھمک ہوتی ہے گوش کر میں
ہے سلاطینِ خلیفہ کا نظر میں دربار | فرق رکھتا نہیں کچھ شوکت و کر و فر میں
وہی دہلی ہے وہی انجمن آرائی ہے | وہی گل لالہ کھلا ہے چمنِ اکبر میں
وہی شوکت وہی حشمت وہی شاہانہ جلوس | وہی دربار ہوا جس کی بھری ہے سر میں
ایسے موقع پہ مراعات کیا کرتے تھے | وہ سلاطین جو تھے زر و گوہر میں
انہیں الطاف کی امید ہے قیصر سے ہمیں | وہی الفت ہے رعایا کی دلِ قیصر میں
رؤسا پائیں ثمر نخلِ وفاداری کا | ان کا اعزاز بڑھے جان پڑے کشور میں
منتخب کوئی بطے آصفِ ہفتم کو خطاب | یہی اعلیٰ ہیں رئیسان وفا پرور میں
یہی اس شان کے شایاں ہیں خدا شاہد ہے | ظلِ داور یہی کہلاتے ہیں دنیا بھر میں
ہو مبارک تجھے اے ہند یہ جشنِ شاہی | آج چھلکے گی مے عیش ترے ساغر میں
مٹ گیا اب تری بے بال و پری کا شکوہ | آگئی قوتِ پرواز شکستہ پر میں
وقت آیا ہے کہ ابرِ کرم شہ برسے | خون سیروں ہی بڑھے تیرے تنِ لاغر میں
وقت آیا ہے کہ اب اوجِ قسمت آجائے | دیر ہوتی نہیں فضل و کرم داور میں
تو سہی ایسے ہوں فرمانِ عنایت جاری | گند افلاس کا پھر ہو نہ کسی کے گھر میں
ملک آباد رہے شاد رہیں دل سب کے | نام ہوتا ہے انہیں باتوں سے دنیا بھر میں
حالتِ ہند بیاں کرنے کی حاجت کیا ہے | کہ ہے سب کچھ نظرِ شاہ جہاں پرور میں

بارک اللہ بہت خوب کہا تو نے جلیل
اس زباں میں جو مزہ ہے وہ نہیں کوثر میں

۱۳۳۰ھ

در مدح اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطان دکن

بارک اللہ آج گلشن کی ہوا کچھ اور ہے
ہے وہی بلبل کا نغمہ پر مزا کچھ اور ہے

رنگ و بو میں تازگی ایسی خدا کی شان ہے
بوئے گل کچھ اور ہے رنگ حنا کچھ اور ہے

ناز سے رکنا کبھی شوخی سے بڑھ چلنا کہیں
آج تیری چال اے بادِ صبا کچھ اور ہے

یوں تو جلسے عیش کے ہر روز ہوتے ہیں یہاں
آج کے جلسے کا چرچا جا بجا کچھ اور ہے

آج سینے میں مسرت سے ہے دل بے اختیار
آج کانوں میں نوید جانفزا کچھ اور ہے

آج بے مانگے مرادیں مل رہی ہیں غیب سے
آج گلیوں میں فقیروں کی صدا کچھ اور ہے

ہو مبارک یہ گرہ کا جشن آصفجاہ کو
آج شانِ آصفی نام خدا کچھ اور ہے

مرحبا کیا ٹھاٹھ ہیں، کیا رعب ہے کیا آن بان
کہتے ہیں تیور یہ شاہانہ ادا کچھ اور ہے

آنکھ پڑتی ہے جو شہ پر دل سے آتی ہے صدا
میں تصدق یہ جمال دلربا کچھ اور ہے

سیر گل سے قلب کو تفریح ہوتی ہے مگر
روئے رنگیں کی بہار جانفزا کچھ اور ہے

جلوہ آرا ہے جو خورشید سپہر سروری
چشم بد دور آج آنکھوں میں ضیا کچھ اور ہے

ان کے سائے میں رعایا پھولتی پھلتی رہے
جن کے دم سے باغِ عالم کی فضا کچھ اور ہے

سایۂ بالِ ہما ہے قدر کے قابل مگر
حق تو یہ ہے سایۂ ظلِ خدا کچھ اور ہے

دست ہمت سے عطا کرتے ہیں جب گنج مراد
پوچھ لیتی ہیں نگاہیں مدعا کچھ اور ہے

تھے جو حاتم کے ثنا خواں وہ بھی کہتے تھے یہی
یہ عطا، یہ فیض، یہ جود و سخا کچھ اور ہے

ابر دامانِ کرم برسا رہا ہے سیم و زر
ہم نے دیکھی ہیں گھٹائیں یہ گھٹا کچھ اور ہے

طبع روشن پہ ہے آئینہ ہر اک رازِ نہاں
یہ صفائی، یہ لطافت، یہ جلا کچھ اور ہے

آصف سابع کو عمر خضر ہو یارب نصیب
اس سے بڑھ کر کیا دعا گو کی دعا کچھ اور ہے

تجھ سے ممکن ہے کہاں مدح و ثنا لکھنا جلیل
شاہ آصفجاہ کی مدح و ثنا کچھ اور ہے

۱۳۳۸ھ

در مدحِ اعلیحضرت میر عثمان علی خاں آصف سابع سلطان دکن

جشنِ سیمیں میں عجب شوکت و رفعت دیکھی / اور کیا کہیے بس اللہ کی رحمت دیکھی
رنگ وہ ہے کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھا / چشمِ بد دور مسرت ہی مسرت دیکھی
جوبلی اور بھی شاہوں نے منائی ہوگی / کس نے اس طرح کہیں شوکت و عظمت دیکھی
شاہ کے خاص ندیموں میں ترنم دیکھا / شاہ کی خاص کنیزوں میں سخاوت دیکھی
شہ کی مٹھی میں فتوحات سکندر دیکھے / شہ کے حصے میں غلاموں کی فراست دیکھی
شاہ کے عہد میں پھلتے ہوئے نخلِ امید / شاہ کے سایے میں بڑھتی ہوئی دولت دیکھی
آنکھ جب لگ گئی تقدیر کو دیکھا بیدار / آنکھ جب کھل گئی اقبال کی صورت دیکھی
عدلِ کسریٰ کو فسانہ ہی فسانہ سمجھا / جس نے اس خسروِ عادل کی عدالت دیکھی
صاف دل رکھتے ہیں سب مذہب و ملت والے / آئنہ میں نہ کہیں گرد کدورت دیکھی
دستِ فیاض کو سرچشمۂ رحمت پایا / ذات عالی ہمہ تن چشمِ مروت دیکھی
رعب ایسا کہ شجاعوں کا کلیجہ پانی / تیور ایسے کہ عیاں شیر کی صولت دیکھی
فکرِ عالی میں بلندی و فلک پیمائی / نطق میں سحر و فسوں طبع میں جودت دیکھی
ملک میں ہیں یہ ترقی کے مہیا اسباب / کہیں ثروت کہیں دولت کہیں حشمت دیکھی
تشنہ کامانِ جہاں ہوتے ہیں سیرابِ کرم / موجِ رحمت نگہِ لطف و عنایت دیکھی
جس طرح عام ہو خورشیدِ جہانتاب کا فیض / سب پہ یکساں شہِ والا کی عطوفت دیکھی
جیسے ماں باپ کو الفت ہو جگر پاروں سے / شاہ کی یوں ہی رعایا سے محبت دیکھی
کودک و پیر و جواں اہلِ عمل جتنے ہیں / دل میں ہر ایک کے آصف سے عقیدت دیکھی
فی الحقیقت یہی سلطان ہیں سلطانِ علوم / دولتِ علم و ہنر جن کی بدولت دیکھی

کرتی بزم سے جلتا نہیں پیمانہ کوئی
جشن سیمیں کی یہ آنکھوں سے کرامت دیکھی

اہل صنعت کو اسی دور میں بڑھتے دیکھا
باکمالوں کی اسی عہد میں کثرت دیکھی

شاہ کے ساتھ ہر اک وقت ہر اک حالت میں
مصطفیٰ کی مدد اللہ کی نصرت دیکھی

شہ کا اقبال بڑھے عمر بڑھے جاہ بڑھے
خلق پر جن کی سدا چشم عنایت دیکھی

شاہ کے زیر نگیں قاف سے تا قاف رہے
باعث امن و اماں جن کی حکومت دیکھی

مدح سلطاں سے ہے یہ رنگ قصیدے کا جلیل
حسن ہر لفظ میں ہر شعر میں جدت دیکھی

۱۳۵۵ھ

قطعاتِ تاریخ

جلیل مانکپوری

مرتبہ

جناب علی احمد جلیلی

مقدمہ

غزل کے کلاسیکی روایات کے محافظین میں جو نئے دور کی نئی تحریکات کے مقابلہ میں غزل کو اس کا مقام دلانے میں حریفانہ آئے ان میں فصاحت جنگ جلیل مانکپوری سرفہرست ہیں۔ وہ قدیم سلسلۂ تلمذ کے خاتم اور لکھنوی شاعری کا ابرو تھے۔ بحیثیت شاگرد و جانشیں امیر مینائی نہ صرف روایات کے پابند تھے بلکہ دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر بھی۔ نیاز فتحپوری نے جناب جلیل کی زندگی ہی میں ان کے تعلق سے لکھا تھا کہ جلیل امیر مینائی کے شاگرد و جانشیں ہیں اور ایسے شاگرد جانشیں کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو وہ خود ان کے حق میں غزلگوئی سے دستبردار ہو جاتے۔

استادی و شاگردی کی روایت کا جو سلسلہ میر و مرزا سے شروع ہوا تھا جلیل مانکپوری پر ختم ہو گیا۔ وہ اس سلسلے کی آخری یادگار تھے۔ انھیں دہلی و لکھنؤ دبستان کا آخری نام لیوا بھی کہا جا سکتا ہے۔

جلیل حسن جلیل ۱۸۶۳ء میں یو۔پی کے ضلع پرتاپ گڑھ میں بمقام مانکپور پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے جلیل مانکپوری کے نام سے شہرت پائی۔ بائیس سال کی عمر میں امیر مینائی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے جو اس وقت استاد والی رام پور تھے۔ رام پور میں جب دفتر امیر اللغات قائم ہوا تو جناب امیر نے مانکپور سے طلب کر کے انھیں اس کا سکریٹری بنا دیا (۱۸۹۵ء)۔ پانچ سال بعد امیر اللغات کا دفتر بند ہو جانے کے بعد حضرت امیر مینائی نے حیدرآباد کا رخ کیا تو جناب جلیل کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے (۱۹۰۰ء)۔ جناب امیر یہاں آتے ہی انتقال فرما گئے اور جلیل مہاراجہ بہادر شاد کی سرپرستی میں وہیں رہ گئے۔ اس وقت میر محبوب علی خاں آصف والی دکن تھے اور جناب داغ دہلوی کو ان کی استادی کا شرف حاصل تھا۔ ۱۳۲۲ھ میں داغ دہلوی انتقال فرما گئے تو شاہ آصف نے ان کی جگہ جلیل مانکپوری کو دی۔ ۱۹۰۹ء میں ایک فرمان کے ذریعہ استاد شاہ بن گئے۔ دو سال بعد شاہ آصف نے رحلت پائی تو ان کے جانشیں میر عثمان علی خاں نے جلیل کے منصب استادی کو برقرار رکھا۔ تادم آخر دربار سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔

حضرت جلیل نے کم و بیش جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر فطری مناسبت کے سبب زیادہ توجہ غزل پر مرکوز رکھی۔ تاہم دوسرے میدانوں میں بھی اپنی فکر کے جوہر دکھائے جن میں تاریخ گوئی بطور خاص قابل ذکر ہے۔

جلیل کے زمانے سے قبل اور خود ان کے دور میں بھی فن تاریخ گوئی کو بڑی وسیع تعریف سے دیکھا جاتا تھا اور اشعار کے لیے اس فن سے واقفیت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اساتذۂ سخن میں سے زیادہ تر نے روایتاً اس صنف کو اپنایا ہے اور اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

لفظ یا الفاظ یا شعر کے کسی جزو سے مروجہ سنین میں سے کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ کو حساب جمل کے لحاظ سے قلمبند کرنے کو فن تاریخ گوئی کہتے ہیں۔ اس فن کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ کسی واقعہ کے ظہور میں آنے کی تاریخ کو مستقلاً محفوظ کر لینے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاریخ گوئی ایک فن ہے جو تخصیص چاہتا ہے۔ اس میں شاعر کا کام واقعہ کے اظہار کے لیے دانستہ اور شعوری طور پر ایک لفظی پیرایہ فراہم کرنا ہوتا ہے جس کے حروف کی عددی قیمت واقعہ کے سنہ تاریخی کے برابر ہو۔

تاریخ گوئی کے یوں تو کئی اقسام ہیں لیکن ان میں تین صورتیں بہت عام ہیں۔

صوری :- یہ ایک ایسا اسلوب تاریخ گوئی ہے جس میں مطلوبہ تاریخ یا سال کو واضح الفاظ کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہو۔ حرفوں کے اعداد محسوب کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً میر امن نے 'باغ و بہار' کا سنہ اشاعت یوں نکالا تھا۔

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار ۔۔۔ تھا سن بارہ سو سترہ کا شمار

اس قسم کا استعمال تاریخ گوئی میں بہت کم ہے۔ یہی حال ایک اور قسم صوری و معنوی کا ہے لیکن ان کا استعمال تاریخ میں بہت کم ہے۔ چنانچہ جناب جلیل نے بھی ان پیچیدہ قسموں سے خود کو دور رکھا ہے۔

معنوی :- یہ قسم عام اور مروج ہے۔ اساتذۂ سخن اور جلیل نے بھی اپنا زور قلم اسی میں دکھایا ہے۔ اہل جمل کے نزدیک تاریخ معنوی مصرع کے لفظ یا الفاظ کا نام ہے جن کے اعداد جمل کے مجموعہ سے سنہ مطلوب حاصل ہو۔

جلیل کے یہاں معنوی کی تین صورتیں ملتی ہیں۔

مطلق یا سالم الاعداد :- یہ تاریخ معنوی کی وہ صورت عام ہے جو اپنی جگہ مکمل اعداد رکھتی ہو یعنی تاریخ کے الفاظ میں بغیر کسی کمی بیشی کے کل حروف کے اعداد جمع کرنے سے تاریخ کا سال نکل آئے۔ تاریخ گوئی کی سب سے بہتر صورت سمجھی جاتی ہے کیونکہ یہ اپنی جگہ مکمل اعداد رکھتی ہے۔ جلیل کے یہاں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ مثلاً

فصیح الملک داغ دہلوی کی وفات کی تاریخ یہ ہے

ہے مصرع سال رحلت داغ ۔۔۔ صد حیف وہ دل کو دے گیے داغ
۱۳۲۲ھ

ریاض خیرآبادی کی تاریخ وفات کا مصرع بھی سالم الاعداد ہے۔

چمن خلد ہے مقام ریاض   کہہ گیا یہ چھلک کے جام ریاض

۱۹۲۴ء

دوسرے زمرہ میں وہ تاریخیں آتی ہیں جو بلا تخرجہ مکمل نہیں ہوتیں۔ جن میں اعداد کی کمی یا بیشی کر کے تدخلہ یا تخرجہ کا عمل کیا جاتا ہے۔ اگر مادہ تاریخ میں اعداد کی کمی ہو تو اس میں بھرتی کا عمل تدخلہ کہلاتا ہے اور اعداد کی زیادتی ہو تو اس میں کمی کا عمل تخرجہ ہوگا۔

جلیل کے یہاں تخرجہ کی نئی نئی صورتیں ملتی ہیں۔ مثلاً

جلیل مصرع تاریخ بے بہا نکلا   کہ آئی شادی سے ملنے کو بنکے رحمت عید

۱۳۸۳ھ

مادہ تاریخ کے اعداد ۱۳۹۱ ہوتے ہیں اور سنہ مطلوب ۱۳۸۳ ہے اس لیے بے بہا کہہ کر بہا کے (۸) عدد کو خارج کر دیا گیا ہے۔

دوسری مثال سالگرہ کی مبارکباد ہے۔

ادا نکلتی ہے تاریخ میں یہ خوب جلیل   بہارِ گلشنِ جاں ہے یہ شہ کی سالگرہ

۱۳۳۷ھ

مصرع تاریخ میں (۶) عدد کی زیادتی تھی۔ ادا یعنی (۶) عدد کے نکلنے سے مطلوبہ سنہ حاصل ہو گیا۔

صنعت تخرجہ کی ایک نادر مثال آصف سابع کی تخت نشینی کا قطعہ تاریخ ہے جس میں (۷) عدد کا تخرجہ اس حسن سے کیا گیا ہے کہ اس کا جواب دنیائے تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ سات شعر کے قطعہ تاریخ میں (۶) سلاطین آصفی کا ذکر نام بنام کیا گیا ہے۔ ساتویں شعر میں (۶) کے تخرجہ کے ساتھ آصف سابع کی تخت نشینی کا سال یوں نکالا گیا ہے۔

اٹھ گئے چھ تو بفرمان خداوند جلیل   میر عثمان علی خاں ہوئے سلطان دکن

۱۹۱۱ء

یہ تخرجہ ایسا ہے جس کے سامنے سالم الاعداد تاریخ بھی سرخم کرتی ہے۔

اسی طرح جلیل نے تعمیہ کی دوسری صورت یعنی تخرجہ سے بھی کام لیا ہے۔ یعنی کمی کو پورا کرنے کی مختلف صورتیں نکالی ہیں۔ مثلاً

آ گیا لب پہ ایک مصرع سال   دوسرا شیر بھی شکار ہوا

۱۳۳۳ھ

مادہ میں ایک عدد کی کمی کو لفظ ایک یعنی ایک عدد کے جمع سے پورا کیا گیا ہے۔ ایک اور دوسرا میں جو معنوی رعایت ہے وہ اس مادہ تاریخ کا حسن ہے۔

پڑھو جلیل بہ آواز مصرع تاریخ   الٰہی تا بہ ابد ہو شمار سالگرہ

۱۳۳۹ھ

مادہ تاریخ میں (۱۵) اعداد کی کمی تھی۔ آواز کی عددی قیمت (۱۵) سے تدخلہ کا کام لیا گیا ہے۔

حیدرآباد کے قدیم نظام ساگر کی تعمیر کی تاریخ تدخلہ کی ایک نادر مثال ہے جو فارسی میں ہے:

آبِ در جو آمد و تاریخ گفتم اے جلیل — در دکن آورد عثماں چشمۂ آبِ حیات
۱۹۳۲ء

اس تاریخ کے اعداد میں (۱۲) عدد کی کمی ہے۔ آب کی عددی قیمت (۳) اور جو کی (۹) ہے۔ یہ دونوں مل کر (۱۲) عدد کی تکمیل کرتے ہیں۔

جلیل نے اگرچہ تاریخ کی دیگر صنعتوں کی طرف توجہ نہیں دی ہے تاہم کچھ جدتوں اور صنعتوں کے نمونے مل جاتے ہیں۔ چنانچہ سالم الاعداد تاریخوں میں ایسی تاریخیں بھی ہیں جہاں انھوں نے مکمل مصرعوں کے بجائے مصرعے کے کسی جز سے تاریخ برآمد کی ہے۔ مثلاً

تاریخ تذکرہ خمخانۂ جاوید

فکرِ سال طبع کرتا ہوں تو کہتا ہے جلیل — فکر ہے کیوں سال کی یہ تذکرہ خود سال ہے
۱۳۲۵ھ

تاریخ وفات امیر مینائی

گئے جو خلد بریں کو تو انکی تربت پر — جلیل نے یہ لکھا۔ روضۂ جناب امیر
۱۳۱۸ھ

جلیل کے یہاں صنعت منقوط میں بھی کئی تاریخیں ملتی ہیں۔ اس صنعتِ منقوط میں حروفِ مہملہ کو چھوڑ کر صرف حروف معجمہ سے تاریخ نکالی جاتی ہے۔

حرف منقوط میں تاریخ کہی میں نے جلیل — چھپ گیا شام کو خورشید علی کا صد حیف
۱۳۲۵ھ

اس تاریخ میں بھی نقطہ دار حروف کے اعداد سے مطلوبہ سنہ برآمد ہوتا ہے۔

چو کردم فکر تاریخش بہ منقوط — ندا آمد۔ خوشا دیوان ناظم
۱۹۱۰ء

تاریخ گوئی کی ایک صنعت صنعت تضاعف بھی ہے۔ اس صنعت میں تاریخ کے الفاظ کو دہرانے یا دوچند کرنے سے مقصد حاصل ہوتا ہے۔

مطلوب جو تاریخ ہو دیوان کی جلیل — دو بار کہو۔ ہے نعت گوئی اعجاز
۶۶۳

نعت گوئی اعجاز کے تاریخی اعداد (۶۶۳) ہیں۔ اس عدد کو دوچند کرنے سے ۱۳۲۶ھ حاصل ہوتے ہیں۔

تاریخ گوئی میں صنعت توشیح بہت کم استعمال ہوتی ہے۔ جلیل کے یہاں ایک ہی تاریخ اس صنعت میں ملتی ہے۔ اس صنعت میں ہر مصرع کے پہلے حرف کے اعداد کی جمع سے اور اسی طرح ہر مصرع کے آخری حرف کے اعداد کی جمع سے دو تاریخیں نکلتی ہیں۔ جلیل نے کمال یہ دکھایا ہے کہ آخری مصرع سے بھی تاریخ نکلتی ہے۔

صنعتِ توشیح سے نکالی ہوئی تاریخ آخری صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

دورِ عثمانی میں سرکاری و حکومتی سطح پر عمارات، مساجد، تالاب اور پل وغیرہ کی تعمیر پر تاریخیں نکلوا کر کتبہ
میں لگائی جاتی تھیں تاکہ سنہ تعمیر کی یاد باقی رہے۔ یہ تاریخیں عثمان ساگر، نظام ساگر اور جوبلی ہال وغیرہ مختلف
نظام حیدرآباد کے حکم سے کندہ ہو کر نصب کی گئی ہیں۔ یہ سب اس کتاب میں شامل ہیں۔
یہ مجموعۂ تواریخ ان سارے قطعاتِ تاریخ پر مشتمل ہے جو جلیل مانکپوری کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے موضوعات
وفات، اشاعتِ دواوین و کتب، عمارتوں، تالابوں اور پلوں کی تعمیر، شادی اور دیگر تقریبات وغیرہ ہیں۔
دوست احباب اور اعیان سلطنت کی فرمائشوں پر نکالی گئی ہیں۔ یہ مختلف مسودات میں میرے یہاں بکھری
میں نے منظم طور پر انھیں ترتیب دیا ہے اور سنہ واری ترتیب کے بجائے مختلف عنوانات کے تحت ان کو
دیا ہے تاکہ ایک ہی نوعیت کی تاریخوں کا تقابلی مطالعہ بھی ہو سکے۔ اس کام کی طرف اردو ریسرچ سنٹر کے جلب
خاں صاحب نے توجہ دلائی میں ان کا شکر گزار ہوں۔
پہلی تاریخ کا سنہ ۱۳۰۰ھ ہے۔ آخری تاریخ ۱۳۶۴ھ میں نکالی گئی۔ اس طرح یہ تاریخیں جلیل کی شاعرانہ
کے ۶۴ سال کی طویل مدت کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہ تعداد میں (۲۳۹) ہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہے اساتذۂ فن
کے یہاں تواریخ کا اتنا عظیم ذخیرہ نہیں۔

علی احمد جلیلی

تاریخہائے پیدائش

پ۔ فرزند خورشید حسن برادر زادۂ مصنف:

آئی یہ صدائے ہاتف غیب   نو بادۂ باغ آرزو ہے
۱۳۰۰ھ

پ۔ نواب احمد علی خاں بہادر فرزند نواب محمد علی خاں:

عیاں اس سے ہے نام سالِ ولادت   جگر پارہ نواب احمد علی خاں
۱۳۰۴ھ

پ۔ محمد کاظم خلف سید عبدالستار صاحب جونپوری:

میں نے کیا خوب یہ لکھی تاریخ   جلوۂ نورِ چشم راحتِ جاں
۱۳۰۶ھ

پ۔ انیس الرحمان فرزند ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب پھلواری شریف:

خوش بود سالِ ولادت بہ انیس الرحمٰن   مونس جاں بصد اقبال سلامت باشد
۱۳۰۹

ولادت کی تاریخ لکھو جلیلؔ   یہ نخل تمنا کا پھولا ہے پھول
۱۳۰۹ھ

پ۔ رشید احمد فرزند خورشید احمد صاحب مینائی لکھنوی:

اس کے لیے تاریخِ ولادت یہ ہوئی نظم   خورشید کے گھر جلوۂ ماہ مدنی ہے
۱۳۱۴ھ

پ۔ فرزند میاں لطیف احمد صاحب مجددی رامپوری:

ہاتف نے مجھے یہ دی بشارت   نکلا ہے ستارۂ سعادت
۱۳۱۷ھ

پ۔ حامد مرزا فرزند مولوی عزیز مرزا صاحب:

بہ فکر رفتہ و گفتہ جلیل ایں تاریخ   عزیز خاطر دیوسف لقائے مایۂ ناز
۱۳۲۱ھ

پ۔ محمد خورشید علی خاں فرزند حکیم نظیر علی خاں:

ہوئی جو سالِ ولادت کی فکر مجھکو جلیلؔ   ندا یہ غیب سے آئی بن نظیر علی
۱۳۲۲ھ

پ۔ محمود شاہ خلف میاں حامد شاہ محدث رامپوری:

جلیلؔ ابھی کہی تاریخ یہ منقوط میں تم نے   چراغ کعبۂ علم و عمل محمود شاہ آئے
۲۵

پ۔ مرزا اسد اللہ بیگ فرزند مرزا احمد اللہ بیگ :

مصرعِ سالِ ولادت ہے یہ کیا خوب جلیلؔ دیکھیے دولتِ اقبال کا تارا چمکا
۱۳۲۶ھ

پ۔ دختر دختر سر مہاراجہ بہادر وزارت پناہ بالقابہ :

مصرعِ تاریخ پڑھ جدّ آ گیا روشنی آنکھوں کی قوت دل کی ہے
۱۳۲۶ھ

پ۔ مظفر علی فرزند عابد علی :

رقم کرد سالِ ولادت جلیلؔ کہ طفل جواں بخت نیکو نہاد
۱۳۲۷ھ

پ۔ نونہالِ چمن مراد راجہ آصف پرشاد :

مجھکو ہوئی جو فکر ولادت کے سال کی آئی ندا کہ یہ گلِ باغِ مراد ہے
۱۳۲۸ھ

پ۔ فرزند احمد اللہ بیگ :

تاریخ جلیلؔ نے یہ لکھی چمکا خورشید اوجِ اقبال
۱۳۲۸ھ

پ۔ شہزادہ نواب میر کاظم علی خاں بہادر :

نذر دے یہ مصرعِ تاریخ لکھ کر اے جلیلؔ خسرو والا گہر کا ہے یہ لعلِ بے بہا
۱۳۳۰ھ

پ۔ شہزادی بلند اقبال طال عمرہا و زاد اقبالہا :

جلیلؔ مدح گو کی ہے یہ تاریخ یہ شہزادی تجھے شاہا مبارک
۱۳۳۰ھ

پ۔ شہزادۂ بلند اقبال زاد عمرہٗ و اقبالہٗ :

مصرعِ تاریخ بھی نکلا چمک کر اے جلیلؔ ہو مبارک پانچواں شہزادۂ روشن جبیں
۱۳۳۰ھ

پ۔ شہزادہ نواب میر عابد علی خاں بہادر :

مل گیا اک مصرعِ تاریخ مجھکو اے جلیلؔ تاجِ آصف کا گہر شہزادۂ عابد علی
۱۳۳۱ھ

خوب روشن ہے یہ تاریخ اے جلیلؔ شاہ آصفجاہ کا نورِ نظر
۱۹۱۲ء

ڈوب کر تاریخ یہ میں نے نکالی اے جلیلؔ آصف بحرِ مروت کا دُرِ نایاب ہے
۱۳۳۱ھ

پ۔ شہزادہ نواب میر حشمت علی خاں بہادر :

ایک عالم ہے کہ شیدا ہے زلیخا کی طرح حبذا کیا یوسفِ مصرِ دکن پیدا ہوا
۱۳۳۱ھ

ڈسل کے تکلیف کے سانپ ہیں یہ تاریخ بھی
کیا منور مہ شاہی کا قمر پیدا ہوا
۱۳۳۱ھ

پ۔ شہزادہ نواب تقی علی خاں بہادر :

تاریخ کا مصرع بھی عجب نورفشاں ہے
یہ آنکھ کا تارا ہو مبارک شہ والا
۱۳۳۱ھ

نذر دے یہ مصرع تاریخ لکھ کر اے جلیل
ہو مبارک آصف سابع کا سالخ نور چشم
۱۳۳۱ھ

پ۔ شہزادہ نواب میر افتخار علی خاں بہادر :

فکر تاریخ کی جو میں نے جلیل
مایۂ افتخار سال ہوا
۱۳۳۸ھ

پ۔ رضی الدین (پہلی بعیت) :

جلیل اک تو بھی لکھ سالِ ولادت
کھلا پھول آج باغِ آرزو کا
۱۳۳۱ھ

پ۔ فرزند سید ابوالبرکات صاحب انور :

خوب روشن ہے یہ تاریخ جلیل
حبذا اک قمر انور ہے
۱۳۴۴ھ

پ۔ فرزند محمود احمد انور مینائی :

جلیل اس کی تاریخ ہے کیا درخشاں
یہ ہے چشم بد دور آنکھوں کا تارا
۱۳۴۴ھ

پ۔ فرزند عبداللطیف اڈیٹر آزاد ہند مدراس :

گل کھلا تاریخ کا طبع شگفتہ ہے جلیل
گلشن اقبال کا زیبا ثمر پیدا ہوا
۱۳۴۴ھ

پ۔ فرزند نفیس بنگلوری :

مرصع اس کی ہے تاریخ یک لخت
مہ کامل ہے یہ طفل جواں بخت
۱۳۴۶ھ

پ۔ فرزند محمود احمد مینائی انور :

دیکھنا سال ولادت ہو اگر
دیکھئے اختر اقبال آیا
۱۳۴۶ھ

پ۔ فرزند سید احمد شاہ ابن میاں محمد شاہ محدث رامپوری :

جلیل اکنوں بگو سالِ ولادت
کہ یکتا گوہر بحر سیادت
۱۳۴۶ھ

پ۔ عزیز الدین فرزند احمد الدین سابق داروغہ باغ عام :

مصرع سال ہے کیسا جامع
کہ ہوا مہر شرافت طالع
۱۳۴۸ھ

پ۔ فرزند حافظ عبداللہ صاحب مانکپوری؛

جلیلؔ نے یہ چمکتی ہوئی لکھی تاریخ کہ طالع آج ستارہ ہوا سعادت کا
۱۳۴۸ھ

پ۔ فرزند عبدالغنی صاحب؛

جب منور شاں ہے ولادت کا سال یہ خورشید اقبال چمکا ہے آج
۱۳۵۲ھ

پ۔ مصطفیٰ احمد فرزند مونس احمد فرزند مصنف؛

جلیلؔ اس کے لیے میں نے جو کی فکر سنہ پری دیا ہاتف نے یہ مژدہ سکندر بخت آج آیا
۱۳۵۲ھ

پ۔ فرزند محمد یوسف شرفی بنگلوری؛

لکھی یہ جلیلؔ آپ نے کس چاؤ سے تاریخ یوسف کو دیا حق نے پسر یوسف ثانی
۱۳۵۳ھ

تاریخہائے وفات

م۔ عبدالعلیم خاں گوتنی (اودھ)؛

جلیلؔ ایک عالم کی ہے یہ زباں پر جوانی میں ہے ہے دیا داغ کیا
۱۳۱۱ھ

م۔ حافظ محمد غوث خاں حیدرآباد؛

لکھو یہ جلیلؔ سالِ رحلت دے جنت انھیں خدائے باقی
۱۳۱۱ھ

م۔ حضرت استاذی امیر مینائی لکھنوی؛

پڑھا جواب میں اٹھ کر یہ ایک نے مصرع امیر کشورِ معنی امیر مینائی
۱۳۱۸ھ
گئے جو خلد بریں کو تو ان کی تربت پر جلیلؔ نے یہ لکھا روضۂ جناب امیر
۱۳۱۸ھ

م۔ شیخ غضنفر علی جگوری؛

جس وقت جلیلؔ کو وہ یاد آتے ہیں کہتا ہے ہائے شیخ صاحب مرحوم
۱۳۲۱ھ

م۔ شوقؔ نیموی؛

جلیلؔ خستہ سے تاریخ جب پوچھی کہا اس نے کہ تاریخ وفات شوقؔ ہے شوقِ سخنور ہیں
۱۳۲۲ھ

م۔ داغؔ دہلوی؛

ہے مصرعِ سالِ رحلتِ داغؔ صد حیف وہ دل کو دے گئے داغؔ
۱۳۲۲ھ

م۔ مسعود احمد خلف خان بہادر محمد صدیق :

لکھو تاریخ یہ بالائے لحد　　داغ کیا دے گئے مسعود احمد
۱۳۲۲ھ

م۔ داروغہ منشی محمد اشرف :

مل گیا ایک مصرع تاریخ　　خوابگاہ محمد اشرف ہے
۱۳۲۴ھ

م۔ مولوی خورشید علی کاکوروی :

تاریخ ہو مطلوب اگر تم کو جلیل　　تحریر کرو ۔ یغفر اللہ تربت پر
۱۳۲۵ھ

حرفِ منقوط میں تاریخ کہی ہے جلیل　　چھپ گیا شام کو خورشید علی کا مصحف
۱۳۲۵ھ

م۔ حضرت شاہ التفات احمد سجادہ نشین ردولی شریف :

اے جلیل این مصرع تاریخ آمد حسب حال　　اللہ اللہ آں دلی گفت و فنا فی اللہ شد
۱۳۲۶ھ

م۔ دختر عبدالرحیم صاحب حسب فرمائش شفیع محمد صاحب مدراسی :

بس اور اب بجز سال رحلت نہ کہیے　　یہ پھولوں کی ہے سیج تربت نہ کہیے
۱۳۲۴ھ

م۔ خورشید حسین پرتاپ گڑھ :

تاریخ بہ برکت احد ہے　　خورشید حسین کی لحد ہے
۱۳۲۶ھ = ۱۳۲۵ + ۱

جلیل آواز ہاتف آرہی ہے　　نگہ سے چھپ گیا خورشید ہے ہے
۱۳۲۶ھ

م۔ اہلیہ مرزا اکبر بیگ صاحب دہلوی :

بہر لوح تربتش زیبا ست تاریخ جلیل　　بیگم والا حسب زیب النساء خلد آشیاں
۱۳۲۷ھ

م۔ مرزا سلامت اللہ بیگ دہلوی :

جلیل مصرع تاریخ نقش تربت ہو　　یہ خواب گاہ ہے دیکھو سلامت اللہ کی
۱۳۲۷ھ

م۔ حاجی محمد یعقوب حیدرآبادی :

جلیل آکر دیا مژدہ صبا نے　　جگہ دی ان کو جنت میں خدا نے
۱۳۲۷ھ

م۔ محمد شاہ صاحب قبلہ محدث رامپوری :

ثبت بر لوح مزارش کن جلیل　　وارث دینِ رسول دوسرا
۱۳۲۸ھ

م ۔ مولوی مظفر کریم لکھنوی :

ہے دعا بھی سال رحلت بھی جلیل — خلد میں اب انکو گھر دے یا کریم

۱۳۳۹ھ

م ۔ عبدالکریم فرزند محمد غوث مدراسی :

جلیل اس لحد پر یہ تاریخ لکھو — کہ مرقد میں ہے ہائے ٹکڑا جگر کا

۱۳۴۰ھ

م ۔ سلطان مرزا صاحب رامپوری :

مصرع تاریخ رضواں کی زبانی ہے جلیل — قصر جنت آج ہے سلطان مرزا کیلیے

۱۳۴۰ھ

م ۔ میاں عید و فتحپوری (ہسوہ) :

سال رحلت ہے دعا پر شامل — داخل خلد الٰہی ہو جائے

۱۳۴۰ھ

م ۔ سید فخر اللہ الہ آبادی :

ہاتف کی جلیل ہے ندا آج — فخر احباب اٹھ گیا آج

۱۳۴۱ھ

م ۔ قاضی حمید الدین صاحب دہلوی :

مصرع تاریخ لکھو لوح تربت پر جلیل — ہے یہ اس مرحوم کا مرقد کہ جنت کا چمن

۱۳۴۲ھ

م ۔ نواب عزیز جنگ بہادر ولا :

سر مزار رقم کن جلیل ایں تاریخ — بیا و بیں کہ ہمیں است خوابگاہ ولا

۱۳۴۳ھ

م ۔ اہلیہ تجمل حسین صاحب حیدرآبادی :

مصرع تاریخ لکھو لوح تربت پہ جلیل — لو عزیزو تربت محبوب بیگم دیکھ لو

۱۳۴۲ھ

م ۔ زوجہ شاہ نظام الدین واعظ جمجھری :

تاریخ کی تھی فکر یہ آئی ندا جلیل — پایا بہشت شاد عزیز النسا ہوئیں

۱۳۴۳ھ

م ۔ محمود احمد صاحب میرٹھی :

بہر تاریخش یکے آمد بروں از غیب گفت — از طفیل سرور دیں عاقبت محمود باد

۱۳۴۴ھ

م ۔ علی الدین حسن مرحوم :

مصرع تاریخ لکھو لوح تربت پر جلیل — فاتحہ پڑھ لو علی الدین حسن کا ہے مزار

۱۳۴۴ھ

م ۔ شاہ نظام الدین واعظ :

جلیل سنگِ لحد پر لکھو یہ سالِ وفات　　　کہ آہ کعبۂ دیں مولوی نظام الدین
۱۳۴۵ھ

م ۔ اعتبار الملک سید افتخار حسین مضطر خیرآبادی :

جلیل اس سانحہ کی ہے یہ تاریخ　　　اٹھا آج اعتبار ملک سے سی
۱۳۴۵ھ

م ۔ سید شاہ عبدالہادی فتحپوری :

فکر تھی تاریخ کی آواز غیب آئی جلیل　　　قصرِ جنت میں مکیں ہیں آج وہ قطبِ کمال
۱۳۴۵ھ

م ۔ حاجی عبدالرزاق عاصی وکیل :

لوحِ تربت پر لکھو تاریخ رحلت اے جلیل　　　خلد کا ہے گلشن جاوید عاصی کے لیے
۱۳۴۵ھ

م ۔ حکیم امتیاز الدین حسین افسر الاطبا حیدرآباد :

بہرِ نقش تربتش تاریخِ یکتا یافتم　　　مرقدِ شاہ اطبا امتیاز الدین حسین
۱۳۴۶ھ

م ۔ اہلیہ حبیب محسن میجر افواج حیدرآباد :

جلیل آ رہی ہے یہ آواز ہاتف　　　جگہ ان کو جنت میں دی اب خدا نے
۱۳۴۶ھ

م ۔ خاتون شفیع محمد میونسپل کونسلر مدراس :

جلیل سنگِ لحد پر یہ نقش ہو تاریخ　　　بہشت پاک عزیز النسا کا مرقد ہے
۱۳۴۶ھ

م ۔ اہلیہ سید محمد صاحب پیر بغدادی :

مصرعِ تاریخ لکھو لوحِ تربت پر جلیل　　　خلد میں ہیں آج وہ مرحومۂ قدسی نہاد
۱۳۴۷ھ

م ۔ میر ریاض الدین صاحب لکھنوی :

نقش کن بر تربتش سالِ وفات　　　واصلِ حق گشتہ آں عالی گہر
۱۳۴۷ھ

م ۔ سید شاہ حسین مدراسی :

واصلِ حق گشت و گفتم بہرِ تاریخش جلیل　　　پاک باطن محرم اسرار سید شاہ حسین
۱۳۴۷ھ

م ۔ سید محمد نوح صاحب شہیر (مچھلی شہری) :

جلیل خستہ نے تاریخ لکھی لوحِ تربت پر　　　شہیر نامور والا نسب کا آہ مرقد ہے
۱۳۴۸ھ

م ـ والدۂ ڈاکٹر عزیز حسن کاکوروی :

گئیں دارِ فانی سے آئی ندا
وہ مرحومہ جنت کے ہیں قصر میں
۱۳۴۸ھ

م ـ اہلیہ نہال احمد فرزندِ مصنف :

گئی جہاں سے یہ لکھی جلیلؔ نے تاریخ
کہ آج خلد میں جاکر بسی ہے مرحومہ
۱۳۴۸ھ

م ـ سید فضل الرحمٰن وکیل کانپوری :

نقش کر تاریخِ رحلت لوحِ تربت پر جلیلؔ
قصرِ جنت میں مکیں ہیں سید نیکو نہاد
۱۳۴۸ھ

م ـ احمد اللہ خاں خلف حشمت اللہ خاں :

مل گیا اک مصرعِ تاریخِ رحلت اے جلیلؔ
احمد اللہ خاں نے پایا آج گلزارِ ارم
۱۳۴۸ھ

م ـ طاہرہ بیگم امروہہ :

سالِ رحلت ہے یہ موزوں اے جلیلؔ
طاہرہ ہیں قصرِ جنت میں مکیں
۱۳۴۸ھ

م ـ فرید حسین مرحوم :

جلیلؔ نے یہ لکھا سال ان کی رحلت کا
گئے بہشتِ معلیٰ کو اب فرید حسین
۱۳۴۸ھ

م ـ علامہ سراج الحسین :

سالِ رحلت نوشت کلکِ جلیلؔ
شد سوئے خلد آں یگانۂ دہر
۱۳۵۰ھ

م ـ مختار بیگم :

قضا کر گئیں سال لکھو جلیلؔ
سوئے خلد مختار بیگم گئیں
۱۳۵۰ھ (‎[illegible])

م ـ اہلیہ شاہ فصیح اللہ صاحب :

تاریخ لکھو جلیلؔ کہ خوش دل ہوں سب حبیب
یارب پئے بتول ہو جنت اسے نصیب
۱۳۵۰ھ

م ـ اہلیہ محمد حنیف صاحب متو آئمہ :

لکھو جلیلؔ یہ سالِ وصالِ مرحومہ
کہ ہے بہشت بریں میں وہ آج معصومہ
۱۳۵۰ھ

م ـ فضل الرحمٰن وکیل کانپوری :

لکھ سرِ مرقد یہ تاریخ اے جلیلؔ
خواب گاہِ سید والا تبار
۱۳۵۰ھ

م۔ اہلیہ محی الدین احمد نائب ناظم :

جلیل اچھا یہ نکلا ایک مصرع سال رحلت کا — مزار فاطمہ بیگم پہ رحمت سایہ افگن ہے
١٣٥١ھ

م۔ زوجہ محمد احمد صاحب ناظم پٹنہ :

جلیل سال یہ رحلت کا ایک نکلا ہے — انیس فاطمہ جنت میں اوس رفیق دلہن
١٣٥٢ھ

م۔ مرزا محمد عباس بیگ نقشبندی :

مصرع تاریخ لکھو لوح تربت پہ جلیل — الفراق اے میرزا عباس بیگ نقشبند
١٣٥٢ھ

م۔ عمدۃ النسا بیگم :

نوشت مصرع سال وفات کلک جلیل — شدہ بہ دار بقا عمدۃ النسا بیگم
١٣٥٢ھ

م۔ اہلیہ غازی الدین احمد :

لکھ سے ایک ملا مصرع تاریخ جلیل — خالق پاک سے واصل ہوئیں انور بیگم
١٣٥٢ھ

م۔ محمد احمد صبر مینائی فرزند امیر مینائی :

ایک نکلا لکھ سے تاریخ کا مصرع جلیل — مدفن منشی محمد احمد جنت مقام
١٣٥٢ھ

م۔ جناب صادق قریشی :

سال رحلت ایک ہاتھ آیا جلیل — یار صادق تھے وہ جنت کو گئے
١٣٥٢ھ

م۔ اہلیہ حماد حسن :

سال وفات انکا یہ لکھا جلیل نے — معصومہ فاطمہ گئی خلد بریں کو آج
١٣٥٢ھ

م۔ مولوی امام الدین :

لکھی جلیل نے تاریخ رحلت مرحوم — مقیم خلد ہیں مقبول حق امام الدین
١٣٥٢ھ

م۔ خاتون حبیب خاں کلکتہ :

لکھو تم جلیل ان کی تاریخ رحلت — کہے آہ یہ تربت نیک بانو
١٣٥٣ھ

م۔ آفاق بنارسی :

جلیل لکھو سر تربت یہ مصرع تاریخ — مقیم خلد بریں جا کے ہو گئے آفاق
١٣٥٣ھ

م۔ منیرالزماں خاں والد صدیق الزماں مینائی:

جلیل اب جو تاریخ حسبِ رواج　　منیرالزماں خاں جناں میں ہیں آج
۱۳۵۳ھ

تاریخہائے دواوین، رسائل، لغات وغیرہ

رسالہ مظہر الاسلام مولفہ مذاق تعلقدار بیاداں اودھ:

جلیل میں نے یہ تالیف کی لکھی تاریخ　　درود پڑھنے کے لائق ہے جو روایت ہے
۱۳۰۸ھ

دیوان مہتاب داغ فصیح الملک داغ دہلوی:

مطلع نور ہے یہ مصرعِ سال　　کیا نیا چاند ہے کہ داغ نہیں
۱۳۱۰ھ

ناول تصویر جناب ریاض خیرآبادی:

ہٹتی نہیں آنکھ میں سما کر یہ جلیل　　تصویر ہے یا آنکھ کی یہ پتلی ہے
۱۳۱۰ھ

کیا کہوں جادو کہ جادو خود یہ کہتا ہے جلیل　　صدقے جادو ایسی جیتی جاگتی تصویر کے
۱۸۹۳ء

تاریخ الانبیاء جناب فیروز رامپوری:

راحت جاں شدہ ایں مصرع تاریخ اذو　　راحت دل سیر پاک بنی اسرائیل
۱۳۱۰ھ

دیوان جناب تشنہ:

جلیل از بہر تاریخش رقم زد　　چہ دیواں چشمۂ آب حیات است
۱۳۱۰ھ

دیوان اول نواب سید بنیاد حسین خاں تلمیذ امیر:

کہی اس کی تاریخ میں نے جلیل　　اسے کہیے فیضِ جناب امیر
۱۳۱۲ھ

دیوان صنمخانۂ عشق امیر مینائی:

خوب دیکھا تو صنم خانہ کو　　پایا بتخانۂ آذر کا جواب
۱۳۱۳ھ

کہف المتین حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی مجددی:

پا کے خوشبو میں نے حسرت سے گلوں کی جلیل　　خوب ہی کھینچا ہے یہ عطر آپ نے اوراد کا
۱۳۱۷ھ

بوسہ دینے سے تو ہوئی نہیں لیکن جلیل　　دل میں رکھ لینے کے قابل ہے کتاب معصوم
۱۳۱۷ھ

دیوان صغیر حیدرآبادی تلمیذ امیر مینائی :

یہ خنجر اور نشتر جس نے دیکھے
کہا کیا بات اس بانکے سخن کی
۱۳۱۸ھ

دیوان میکش تھانوی :

میں نے بھی کہی ڈوب کے تاریخ اس کی
ہے دارو بیخودی کلام میکش
۱۳۱۸ھ

داسوخت مختار شاہ جہاں پوری :

جس نے یہ داسوخت دیکھا کہہ اٹھا وہ اے جلیل
گرمیٔ اشعار نے پھونکے دل و جان و جگر
۱۳۱۸ھ

دیوانِ برق :

کہہ رہا ہے خود یہ دیوان اے جلیل
دیکھنا ہیں برق کے اشعار گرم
۱۳۱۹ھ

ناول چنچل نار مہاراجہ بہادر شاد :

ختم ناول کی کہی تاریخ میں نے اے جلیل
کتنی پاکیزہ زباں ہے صاف ہے کتنا بیاں
۱۳۲۰ھ

میں نے بھی جلیل اس ناول کی تاریخ کہی کیا گرم
اک برق جفا اک سوزِ نہاں پرکالا آتش چنچل نار
۱۹۰۳ء

دیوان دوم جناب جاہ تلمیذ حضرت امیر مینائی :

بولا یہ جلیل سن کے سب کی
واللہ ہے خاص امیر کا رنگ
۱۳۲۰ھ

کلیات سحر رئیس محمود آباد :

طبع دیوان شد و گفتم تاریخ
سحر آمیز سخنہائے سحر
۱۳۲۰ھ

دیوان کوثر ساکن بمبئی :

کہتے ہیں یہ سب مصرع تر اس کے جلیل
دیوان نہیں دیکھو چشمۂ کوثر ہے
۱۳۲۰ھ

کتاب دربار دہلی فیروز الدین :

ایک نکلا ہے یہ مصرع سال کا
قیصری دربار کا نقشہ کھنچا
۱۳۲۱ھ

تاریخ تیموری :

ہوئی تاریخ کی جب فکر مجھ کو
ندا آئی ۔ نظام ملک گیری
۱۳۲۱ھ

تزکِ محبوبیہ :

جلیل اچھی کہی تاریخ تم نے
مرقع ہے یہ اخوان الصفا کا
۱۳۲۱ھ

دیوان سراج بادشاہ قادری :

جلیلؔ آنکھیں ہوں روشن وہ لکھو تاریخ نورانی　　کلام صاحب عرفاں سراج بزم عرفاں ہے
۱۳۲۲ھ

طبع دیوان مولانا شہیر تعلقدار مچھلی شہر :

جلیلؔ اچھی کہی تاریخ تم نے اس کے چھپنے کی　　کہ یہ دیوان گنجینہ مضموں ہائے عالی کا
۱۳۲۳ھ

دیوان فیاض موسوم بہ ثمرۂ حیات :

جلیلؔ پیش نظر ہے کلام تازہ و تر　　دل آج اٹھائے مزے ثمرۂ فصاحت سے
۱۹۰۷ء

دیوان نعت مفتی سید اعظم شائق :

اس سخن کے لیے موزوں ہے یہ تاریخ جلیلؔ　　ذکر محبوب کا ہے کیوں نہ ہو محبوب بیاں
۱۳۲۴ھ

غرائب الجمل مولفہ جناب ولاؔ :

سال جو تالیف کا پوچھے کہو اس سے جلیلؔ　　بے بہا آئینہ تاریخ گوئی سال ہے
۱۳۲۵ھ

خمخانۂ جاوید تذکرۃ الشعرا :

فکر سال طبع کرتا ہوں تو کہتا ہے جلیلؔ　　فکر ہے کیوں سال کی یہ تذکرہ خود سال ہے
۱۳۲۵ھ

مصرع تاریخ لکھ کر داد دیتا ہے جلیلؔ　　ایضاً اشاعت　　یہ کھنچا ہے یا مرقع شاعران دہر کا
۱۳۲۶ھ

دیوان نعتیہ موسوم بہ ہدیۂ شادؔ (مہاراجہ شادؔ) :

جلیلؔ عرش سے آیا ہے مصرع تاریخ　　درود پڑھنے کے قابل ہیں نعت پاک کے پھول
۱۳۲۵ھ

دعا بھی ہے یہی تاریخ طبع بھی ہے یہی　　قبول خاطر محبوب رب کلام یہ ہو
۱۳۲۵ھ

جب یہ کہہ لو تو سر پہ تاریخ　　مدح پیغمبر محبانہ کہو
۱۳۲۵ھ

مطلب جو تاریخ ہو دیوان کی جلیلؔ　　دو بار کہو ہے نعت گوئی اعجاز
۱۳۲۶ھ

مجموعۂ رباعیات شفق رامپوری :

مصرع تاریخ تم لکھو جلیلؔ　　ہر رباعی تازگی میں فرد ہے
۱۳۲۵ھ

دیوان عبداللہ خاں شاعر لکھنوی :

چھپ کے جو ہوا شائع اشعار کا مجموعہ　　تاریخ کہی میں نے دیکھو سخن شاعر
۱۳۲۶ھ

دیوان صمیم:

جلیل مصرع تاریخ گفت دگوہر سفت — بہیں کلام صمیم سخن طراز ہیں
۱۳۲۶ھ

دیوان مضطر دہلوی:

صبا سے چھپنے کا سن کے مژدہ ہوئے ہزاروں کے دل شگفتہ — جلیل نے سال طبع اس کا لکھا کلام فصیح مضطر
۱۳۲۸ھ

دیوان نواب ناظم:

چو کردم فکر تاریخش بہ منقوط — ندا آمد خوشا دیوان ناظم
۱۹۱۰ء

دیوان نواب عزیز جنگ بہادر ولا:

ایں مصرع گفت جلیل از پے سالش — دیوان گہر ریزہ دگہر بیز ہمیں ست
۱۳۲۸ھ

دیوان صغیر:

بنوشت جلیل مصرع سال — دیوان صغیر نکتہ دانے
۱۹۱۱ء

دیوان وفا:

یہ تاریخ چھپنے کی لکھدو جلیل — فصیح و دل آویز نظم وفا
۱۳۲۹ھ

رسالہ المعابن شعلہ:

جلیل اچھی ہوئی تاریخ اسکی — یہ اک گلدستۂ بزم سخن ہے
۱۳۲۹ھ

خمخانۂ جاوید:

پے سال طبعش رقم زد جلیل — زمانہ بود مست خمخانہ
۱۹۱۱ء

دیوان ضیا دہلوی:

طبع دیوان کی خوب ہے تاریخ — مونس جاں ہے یہ کلام ضیا
۱۳۳۲ھ

دیوان صحو حضرت آغا داؤد:

کیا خوب جلیل آپ نے تاریخ نکالی — یہ صحو کا دیواں ہے کہ اک دفتر عرفاں
۱۳۳۲ھ

دیوان شمشیر لال خاں صاحب کوتوال بلدہ حیدرآباد:

مصرع تاریخ بھی ہے خوب موزوں لے جلیل — آج کیا شمشیر کے جوہر نمایاں ہوگئے
۱۳۳۲

دیوان نواب عزیز جنگ ولاؔ :

مصرع تاریخ موزوں ہے جلیلؔ
شعر ہیں دلچسپ شاعر لاجواب
۱۳۲۸ھ

دیوان سید مومن فریاد ملائے بریلی :

مصرع تاریخ نکلا فکر دوش سے جلیلؔ
ہوگئی کیا گرم بزم شاعری فریاد سے
۱۳۲۷ھ

دیوان نواب عزیز جنگ ولاؔ :

طبع کی تاریخ لکھو تو بھی جلیل
ایک دلبر ہے یہ نیرنگ سخن
۱۳۳۷ھ

کلامِ نعت عزیز جنگ بہادر ولاؔ :

جلیل اس حلیہ منظوم کی تاریخ لکھ تو بھی
سراپا ئے رسول پاک دیکھو کتنا پیارا ہے
۱۳۳۸ھ

دیوان حبیب الرحمٰن معلیٰ حیدرآبادی :

جلیلؔ ایں چنیں گفت تاریخ طبعش
کہ الہام غیبی کلامِ معلیٰ
۱۳۴۰ھ

دیوان حبیب اللہ عشق مدراسی :

طبع کا سال بھی موزوں ہے جلیلؔ
دفتر عشق یہ دیواں نکلا
۱۳۴۱ھ

کتاب گنجینۂ سلیمانی مظفر حسین بھوپالی :

جلیلؔ اس کے لیے تاریخ بھی کیسی ہری نکلی
یہ ہے اک نسخۂ اکسیر یا گنج سلیمانی
۱۳۴۲ھ

دیوان نواب فصیح یار جنگ بہادر علامی :

بگو جلیل پے طبع سال دیوانش
فصیح و دلکش و نیکو کلام علامی ست
۱۳۴۲ھ

رسالہ قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی :

بے بہا تاریخ نکلی اس کے چھپنے کی جلیلؔ
کیا رفیق و رہنما ہے ناظم اسرار ہے
۱۳۴۳ھ

دیوان سید عباس حسن فصاحت لکھنوی :

جلیلؔ اچھی کہی تاریخ رنگیں طبع دیواں کی
کھلے ہیں روح افزا پھول گلزار فصاحت کے
۱۳۴۳ھ

دیوان سید شاہ یحییٰ عالم قادری سجادہ نشیں :

کہی جلیلؔ نے تاریخ طبع "جلوۂ طور"
کلام میں ہے یہ شوخی زبان موسیٰ کی
۱۳۴۳ھ

دیوان محمود شاگرد ظہیر دہلوی :

طبع دیواں کی کہی تاریخ یہ میں نے جلیل — لائق صد آفریں محمود کے ہیں شعر آج
۱۳۴۲ھ

طبع دیوان جناب آفاق بنارسی :

یہ تاریخ بھی کیا نزاکت بھری ہے — عروس سخن کیا ہے آج اک پری ہے
۱۳۴۴ھ
جس جگہ دو دل سے کر بیٹھے ہیں یہ کہتے ہیں جلیل — چھا گئے ہیں شعر سب آفاق کے آفاق پر
۱۳۴۴ھ

دیوان مظفر حسین خاں سلیمانی شاہ آبادی :

مصرع سال ہے حقیقت حال — یہ ہی دیکھا ہے بے نظیر چمن
۱۳۴۵ھ

طبع دیوان مرزا بہادر یاور :

ہے لاجواب مصرع تاریخ بھی جلیل — یاور کے شعر موجۂ آب حیات ہیں
۱۳۴۶ھ

نور اللغات نیر کاکوری :

تاریخ یگانہ ہے تو یہ ہے — اردو کا خزانہ ہے تو یہ ہے
۱۳۴۶ھ

کتاب تقریب المراد :

مصرع تاریخ لکھ روشن جلیل — ہے سراج دیں یہ تقریب المراد
۱۳۴۶ھ

طبع دیوان ارمغان صمیم :

طبع کا سال بھی ہے خوب جلیل — بے بہا ارمغان زیبا ہے
۱۳۴۷ھ

دیوان ظہور الحسن ناظم :

اشاعت کی تاریخ پیاری ہے یہ — کہ ناظم کی جادو نگاری ہے یہ
۱۳۴۸ھ

طبع دیوان اشرف :

طبع کی تاریخ اچھی ہے جلیل — چشم بد دور اشرف و اعلیٰ کلام
۱۳۴۸ھ

کتاب محبوب حضرت ناظم :

طبع جس دم ہوئی تاریخ کہی میں نے جلیل — کہ یہ ہے صل علیٰ خوب کتاب محبو
۱۳۴۹

دیوان طوفان حیدرآبادی :

طبع کی تاریخ تم لکھو جلیل — بے بہا ہے مثل نعت مصطفےٰ
۱۳۵۱ھ

رسالہ المحبوب مدیر حامد میاں :

طبع کا سال اشاعت نذر دے لکھ کر جلیل — تحفۂ محبوب المحبوب ہے نام خدا
۱۳۵۱ھ

کلامِ واصف :

طبع کا سال ایک نکلا ہے جلیل — دلکش و نادر ہے کیلا ہے خیال
۱۳۵۱ھ

دیوان قربان :

تاریخ طبع دیواں تم بھی جلیل لکھو — جو شعر ہم نے دیکھا قند و نبات پایا
۱۳۵۱ھ

کتاب معین الشعرا آفاق بنارسی :

جلیل اس کی تصنیف کا سال لکھو — کہ تالیف بھی نسخۂ کیمیا بھی
۱۳۵۲ھ

تاریخہائے شادی

کتخدائی نواب فرخندہ حسین خاں :

جلیل اس جشن کی تاریخ ہجری — یہ لکھدو شادی فرخندہ بنیاد
۱۳۲۱ھ

کتخدائی دختر احمد حسین صاحب معتمد پیشی حضور پرنور :

سال لکھا یہ بصد زینت و زین — ہذا ہے یہ قران السعدین
۱۳۱۷ف

کتخدائی ہمشیرۂ والیٔ دکن :

مصرعِ تاریخ بھی ہے خوب روشن اے جلیل — بارک اللہ دو ستارے جلوہ گر ہیں ایکجا
۱۳۴۴ھ

شادی نواب غلام محمد نور اللہ (مدراس) :

جلیل اس خوشی کی یہ تاریخ لکھئے — مبارک ہو یا رب انھیں عقد ثانی
۱۳۳۸ھ

شادی شفیع محمد صاحب (مدراس کونسلر) :

مطلع انوار ہے تاریخ کا مصرع جلیل — ہو گیا اچھا قران آفتاب و ماہتاب
۱۳۴۲ھ

کتخدائی سیّد ابو البرکات انور :

چرخ سے آواز آتی ہے جلیل — مرحبا اک جا ہیں ماہ و مشتری
۱۳۴۲ھ

کتخدائی شاہ نظام الدین خلف متاع الدین :

جلیل اس کتخدائی کی کہی تاریخ یہ میں نے — کرے اللہ مبارک اب ہو شادی خانہ آبادی
۱۳۴۳ھ

کتخدائی ایس۔ اے شفیع محمد (مدراس):

ہاتف غیبی یہ دیتا ہے صدا ہم جلیل — آؤ اب دیکھو قران آفتاب و ماہتاب
۱۳۴۵ھ

شادی نواب محمد علی خاں فرزند نواب مظفر یار جنگ:

جلیل سخنور نے تاریخ لکھی — کہ ہو آپ کو کتخدائی مبارک
۱۳۴۸ھ

عقد عبداللطیف فاروقی:

عقد کا سال خوب ہے یہ جلیل — مہ و خورشید مل گئے ہیں آج
۱۳۵۰ھ

تحفہ نادر ہے اس موقع پہ تاریخ جلیل — فانکحوا ما طاب کی تفسیر یہ شادی ہوئی
۱۳۵۰

تاریخہائے تہنیت

عید سعید بہ پیشگاہ سلطان دکن میر محبوب علی خاں:

کہتی ہے خوشی آج گلے مل مل کر — ہو شاہ کو یا خدا مبارک یہ عید
۱۳۲۱ھ

تہنیت عید اضحیٰ سلطان دکن میر عثمان علی خاں:

عید اضحیٰ ہو مبارک اے شہ عالی تبار — عید قرباں ہو مبارک اے شہ دریا نوال
۱۹۱۱ء — ۱۳۲۹ھ

جشن سالگرہ مبارک:

تاریخ کا مصرع ہے جلیل اپنی زباں پہ — کیا عیش فزا عقدہ کشا سالگرہ ہے
۱۳۳۰ھ

تہنیت جشن عید اضحیٰ:

نذر دے تاریخ کا مصرع جلیل — عید قرباں بھی ہے قرباں شاہ پہ
۱۳۳۰ھ

جشن سالگرہ مبارک:

زباں پر مصرع تاریخ بے بہا آیا — مبارک اے شہ عالی وقار سالگرہ
۱۳۳۲ھ

جشن سالگرہ مبارک:

اٹھا جو دست دعا ہاتھ آگئی تاریخ — کلید گنج سعادت ہے شہ کی سالگرہ
۱۳۳۴ھ

جشن عید سعید:

اے جلیل اک مصرع تاریخ نکلا لاجواب — شاہ عثماں سے گلے ملنے کو عید آئی ہے آج
۱۳۳۴

ن عیداضحیٰ :

عمدنے یہ سال عید نکالا ہے بے بہا — ہر شب شب برات ہو ہر روز عید ہو
۱۹۱۶ء

ن سالگرہ مبارک :

ادا کے ساتھ ہوئی جلوہ گر نئی تاریخ — بہار عیش ہے شاہ دکن کی سالگرہ
۱۳۳۵ھ

ن سالگرہ مبارک :

جلیلؔ مصرع تاریخ بے بدل نکلا — نئی بہار دکھاتی ہے شہ کی سالگرہ
۱۳۳۶ھ

ن سالگرہ مبارک :

ادا نکلی ہے تاریخ میں بھی خوب جلیلؔ — بہار گلشن جاں ہے یہ شہ کی سالگرہ
۱۳۳۷ھ

ن سالگرہ مبارک :

پڑھو جلیلؔ بآواز مصرع تاریخ — الٰہی تا بہ ابد ہو شمار سالگرہ
۱۳۳۷ھ

ن سالگرہ مبارک :

جلیلؔ مصرع تاریخ کیا ملازیبا — ہزاروں سال ہو پر ودگار سالگرہ
۱۳۴۰ھ

ن سالگرہ مبارک :

نذر دے دے جلیلؔ مصرع سال — شاہ عثماں کی ہے یہ سالگرہ
۱۳۴۳ھ

الگرہ سید گل محمد یحییٰ سہروردی :

جلیلؔ مصرع تاریخ خوب معذوق ہے — خدا کی شان نئی عید عید میں آئی
۱۳۴۵ھ

ہنیت عید صیام بخدمت مہاراجہ شادؔ :

بارگاہ حق میں ہو مقبول تاریخ جلیلؔ — شاد کے گھر روز یارب نو بہار عید ہو
۱۳۴۵ھ

ہنیت عیداضحیٰ بخدمت مہاراجہ بہادر شادؔ :

جلیلؔ اچھی تاریخ تم نے نکالی — ہوئی شاد پر عید قرباں بھی قرباں
۱۳۴۵ھ

ہنیت عیداضحیٰ بہ عالیجناب مہاراجہ شادؔ :

شرف یہ خاص ہے دربار شاد ہی کا — کہ جام بادۂ توحید لے کے عید آئی
۱۳۴۶ھ

تہنیت عید صیام مہاراجہ بہادر شاد :

اچھا نکلا جلیل یہ سال — دن عید شب برات شب ہو
۱۳۳۶ھ

تاریخہائے عطایا

عطائے شمشیر :

لکھ چکی ہوئی تاریخ جلیل — آج شمشیر عطا کی شہ نے
۱۳۲۹ھ

عطائے انگشتری :

کی عطا انگشتری تاریخ نکل اے جلیل — دی شہ یکتا نے یہ مہر سلیمانی مجھے
۱۳۲۹ھ

عطائے گھڑی، توڑا، بٹن :

کہی تاریخ ایسی جو ہے آب زر سے لکھنے کی — گھڑی توڑا بٹن سونے کے اپنے شاہ سے پائے
۱۹۱۲ء

عطائے انگشتری :

نذر دے تاریخ یہ لکھ کر جلیل — ایک انگوٹھی ہاتھ آئی شاہ سے
۱۳۳۱ھ

عطائے جامہ دار :

باادب کر عرض یہ مصرع جلیل — شاہ نے تشریف دولت کی عطا
۱۹۱۳ء

عطائے کمخواب :

سال ایں لطف و عطا کز شاہ شد — داد خلعت آصف جمجاہ شد
۱۳۳۲ھ

عطائے شملہ :

مصرع تاریخ لکھ کر پیش کرتا ہے جلیل — سرفراز آصف نے مجھکو ایک شملے سے کیا
۱۳۳۲ھ

عطائے جامہ دار :

فرد نکلا یہ مصرع تاریخ — اے خوشا جامہ دار سلطانی
۱۳۳۲ھ

عطائے کمخواب :

تاریخ ہے اس خلعت شاہی کی جلیل — سرکار نے کمخواب عطا کی ہے آج
۱۳۳۴ھ

تاریخہائے تعمیر عمارات تالاب مساجد وغیرہ

…واب محمد علی خاں بہادر موسوم بہ خواجہ گلشن :

جلیل اچھا کہا ہے تم نے یہ تاریخ کا مصرع ‎ ‎ ‎ ہوا ہے خواجۂ گلشن مسیحا جان کی دل کی

۱۳۱۹ھ

…اغ وغیرہ منیر الزماں خاں تحصیلدار :

تاریخ چاہتے ہیں اگر آپ اے جلیل ‎ ‎ ‎ کہیے منیر باغ بھی جنّت کا ہے چمن

۱۹۰۲ء

…ال مدرسہ آصفیہ حیدر آباد :

ان کے حق میں ہے دعا تاریخ کا مصرع جلیل ‎ ‎ ‎ دے جزا اس کی تمہیں پروردگارِ دوجہاں

۱۳۲۳ھ

…نہ واقع صمد آباد ضلع پرتاب گڑھ (اودھ) :

سال ہجری کے لیے کہتا ہے یہ زار و نحیف ‎ ‎ ‎ چشمۂ کوثر کا ہمپایہ ہے یہ چاہِ لطیف

۱۳۲۶ھ

…ی تعمیر اتالیق منزل محمد کامل صاحب :

لکھی اس کی تاریخ میں نے جلیل ‎ ‎ ‎ یہ بے مثل اتالیق منزل بنی

۱۳۲۸ھ

…ل واقع کاکوری :

نور کے خط میں لکھو مصرع تاریخ جلیل ‎ ‎ ‎ چشم بد دور بنا نور محل منزل نور

۱۳۲۹ھ

…ساگر :

سنگِ بنیاد کی تاریخ یہ اچھی ہے جلیل ‎ ‎ ‎ موجزن چشمۂ فیض شہِ دریا دل ہے

سنگِ بنیاد جو رکھا تو ندا یہ آئی ‎ ‎ ‎ دیکھنا چشمۂ رحمت یہ ہوا جاری آج

۱۳۳۱ھ

…نقار خانہ عثمانی درگاہ اجمیر شریف :

جلیل مصرعِ تاریخ ایں چنیں گفتہ ‎ ‎ ‎ بہ پائداری نقار خانہ عثمانی

۱۹۱۴ء

جلیل نذر شہ دیں پناہ کر تاریخ ‎ ‎ ‎ عجب وسیع ہے نقار خانہ عثمانی

۱۹۱۴ء

…ع خلوت مبارک (دیوان دربار) :

باادب کر عرض یہ تاریخ کا مصرع جلیل ‎ ‎ ‎ کیا نیا ہے قصر شاہی کیا نیا دربار ہے

۱۳۳۲ھ

تعمیر یادگار زیب النساء بیگم بنت شاہ اورنگ زیب عالمگیر:

مصرع تاریخ نقش منوّر عالم ہے
یادگار بنت عالمگیر دارالے جہاں
۱۳۳۴ھ

تعمیر دربار ہال واقع باغ عام:

موزوں ہے خوب مصرع تاریخ اے جلیل
ایوان جشن سالگرہ بے مثال ہے
۱۳۳۵ھ

تعمیر کورہ تالاب خلد آباد:

جلیل از بہر تاریخش رقم زد
کہ ایں ہم چشمۂ آب حیات است
۱۳۳۶ھ

تعمیر تالاب شاہ خاکسار خلد آباد:

مصرع تاریخ ہے موزوں جلیل
بحر مواج فیوض آصفی
۱۳۳۷ھ

جامن تالاب خلد آباد:

کس قدر صاف ہے یہ مصرع تاریخ جلیل
خلد آباد کا تالاب مصفا ہے یہ
۱۳۳۸ھ

تعمیر چاہ تعمیر کردہ نصیر الدین تحصیلدار:

لکھ یہ تاریخ آبدار جلیل
چشمۂ فیض ہے یہ چاہ نیا
۱۳۳۸ھ

تالاب شاہ درہ ضلع اورنگ آباد:

جلیل اس آب شیریں کی ہے تاریخ
کہ گویا چشمۂ کوثر ہے جاری
۱۳۴۰ھ

تالاب قتلغ خان ضلع اورنگ آباد:

مصرع تاریخ ہے شامل دعا پائے جلیل
بحر رحمت ہو یہی سارے جہاں کے واسطے
۱۳۴۰ھ

مدینہ مسجد واقع نلکنڈہ:

جلیل تاریخ ایسی لکھیے کہ صوفیوں کو بھی وجد آئے
حرم ہے یہ مسجد مقدس پڑھیں مصلی نماز آکر
۱۳۴۵ھ

تعمیر نظام ساگر حیدرآباد دکن:

سال ہجری گفت با من ہاتف غیبی جلیل
کل شئی حی من الماء قال رحمن النصیر
۱۳۵۰ھ

آب در جو آمد و تاریخ گفتم اے جلیل
در دکن آورد عثماں چشمۂ آب حیات
۱۹۳۲ء

پل گوداوری:

اے جلیل اس جسر کی تاریخ ہے کیا آبدار
عہد عثماں میں بنا یہ پل جواب کہکشاں

واپسی علاقہ ریذیڈنسی :

جلیلؔ اک مصرعِ تاریخ تو بھی نذر دے لکھ کر — رزیڈنسی لی اب نذ کھلا مقصد بہ آذری کا
۱۳۵۴ھ

فرش سنگ مرمر بمسجد عثمانیہ سلطان بازار :

جلیلؔ اس حسن خدمت کی لکھو تاریخ ہجری یں — بچھایا اک محمد کے ولی نے فرش مرمر کا
۱۳۵۴ھ

واپسی سکندر آباد :

ہوئی تاریخ بامداد الٰہی یہ جلیل — پایا اسکندر ثانی سے سکندر آباد
۱۳۶۴ھ

تاریخہائے متفرقہ

رونق افروزی والیٔ رامپور از سفر یورپ :

میں نے برجستہ کہا مصرعِ تاریخ جلیلؔ — غل یہ ہے مصر سے یوسف سوئے کنعاں آئے
۱۸۹۴ء

سکوں دیدہ و دل کو حاصل ہوا — جلیلؔ اب قدم لو حضور آ گئے
۱۳۱۱ھ

در تہنیت جشن مسند آرائی والیٔ رامپور :

جلیلؔ آورد ایں مصرع پئے نذر — جواں دولت جواں قسمت جواں سال
۱۳۱۱ھ

عید سعید بہ پیشگاہ اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس :

کہتی ہے خوشی آج گلے مل مل کر — ہو شاہ کو یا خدا مبارک یہ عید
۱۳۲۱ھ

تمغۂ قیصری مولوی محمد عزیز مرزا صاحب :

مصرعِ تاریخ کہتا ہے جلیل — تمغۂ قیصر ہے زیبا آپ کو
۱۹۰۹ء

تخت نشینی میر عثمان علی خاں والیٔ دکن :

اٹھ گئے چہ تو بفرمان خداوند جلیل — میر عثمان علی خاں ہوئے سلطان دکن
۱۹۱۱ء

جلیلؔ اس جشن کی تاریخ تم نے خوب موزوں کی — مبارک ہو یہ دور عدل آصفجاہ ہفتم کا
۱۳۲۹ھ

شکار شیر آصف سابع والیٔ دکن :

اک ملا تاریخ کا مصرع جلیل — شیر افگن نے کیا پہلا شکار
۱۳۲۲ھ کذا

نذر دے تاریخ لکھ کر لے جلیلؔ — شیر مارا شاہ نیک اقبال نے
۱۳۳۲ھ

آگیا ایک لب پہ مصرعِ سال — دوسرا شعر بھی شگفتہ ہوا
۱۳۳۲ھ

تہنیت دربار یادگار جلوس آصف سابع:

جلیلؔ اس جشن کی تاریخ کیا نایاب نکلی ہے — یہ آصف جاہ سابع تا مدار ہفت کشور ہو
۱۹۱۱ء

عطائے خطاب نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شروانی:

تاریخ اس خطاب کی ہے ہدیۂ جلیلؔ — علامۂ ورشید زمن صدر یار جنگ
۱۳۴۱ھ

سرفرازیٔ وزارت مہاراجہ سر کشن پرشاد شادؔ:

مل گیا سال یہ تائیدِ الٰہی سے جلیلؔ — شاد کو شاد کیا شہ نے وزارت دیکر
۱۳۴۳ھ

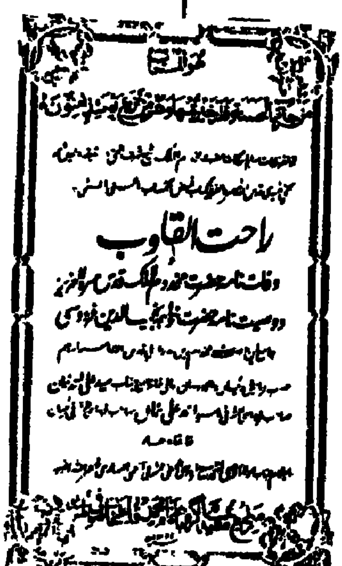
عطائے عہدۂ نظامت پٹہ خانہ محمد احمد صاحب:

مصرعِ سال تم لکھو یہ جلیلؔ — لطفِ حق سے وہ ہو گئے ناظم
۱۳۵۰ھ

ولادت محمد کاظم خلف سید عبدالستار صاحب خونپوری:

۳۰۰	شکر صد شکر خالقِ یزداں	۵۰
۲۰	کہ ہوئی پوری آرزوئے جہاں	۵۰
۲۰	کاظم نیک طالع و خوش رو	۶
۵۰	نام پر جس کے جان و دل قرباں	۵۰
۶۰۰	خوب پیدا ہوا مبارک فال	۳۰
۵	ہو گئی سبز کشت زارِ جہاں	۵۰
۷۰۰	ذکر مولود سے جہاں ہے خوش	۳۰۰
۷۰	عید کا ہر مکاں میں ہے ساماں	۵۰
۸۰	فیض دیدار حسن صورت سے	۱۰
۱	آنکھ روشن ہے اور دل شاداں	۵۰
۴۰	میں نے کیا خوب یہ لکھی تاریخ	۶۰۰
۳	جلوۂ نور چشم۔ راحتِ جاں	۵۰
۱۸۸۹ء	۱۳۰۶ھ	۱۲۹۶ف

راحت القلوب


راحت القلوب

جامع

زین بدر عربی

بسم الله الرحمن الرحیم

راحت القلوب

حمد بیحد و بیقیاس مر حضرت خداوندے را که صور انسانی از کتم عدم بوجود آورده بدرجهٔ کمال رسانده
که اصلا فلک و ملک پیرامون ادراک و حوالی اطلاع آن گرد نتوان یافت اما بعد این کلمات
وحل بعضی مشکلات کہ از لسان گوہرفشان پیر روشن ضمیر خود و شیخ نامدار مقبول حضرت پروردگار
پیر دستگیر طریقت و دُر دریاے کرامت گوہر یکتاے سلامت دیباچهٔ عنوان محبت خواجهٔ دیوان
مودت سلطان العاشقین برہان العارفین الصالحین حجة الدین علی جمیع المسلمین بندگی حضرت
شاه شرف الدین احمد یحیی منیری نور الله مرقده در سمع این قاصر و فہم این ناقص آنچه مسموع و مفہوم و فرا
خاطر گشته بجنبش قلم در آورده شد تا سالکان راه الله و محققان درگاه شہنشاه را مطالعهٔ این مجموعه
مرغوب که مسمّی به راحت القلوب است قوة یقین و شوق در سیر و سلوک دین حاصل
گردد — آنانرا که بجال افراط و تفریط متضمن اند جمعیت دینی و علم یقینی ارزانی کناد بالنبی و آله الامجاد

مجلس اول بعد از نماز جمعه معارف شہر از شغل داران حاضر بودند مثل ملک محمود متصرف و ملک
نصیر الدین قلمنانی و بعضے یاران از اہل تصوف نیز حاضر بودند که شخصے از اہل تصرف تحفی صاحب

طالب حق بر خلق با ادعیان آورده که رضاے حق بوده کمال کے حاصل شود بندگی مخدوم ادام
فرمود که چون طالب حق بدین مقام رسد هر بلاے و محنتی که بوے نازل باشد ملول خاطر
بلکه صابر و شاکر باشد چنانکه اهل سلوک میگویند که خلوت یحیی پیغامبر علیه السلام آن روز بود که
سر بریدند و خلوت خلیل الله پیغامبر علیه السلام هم روزے بود که کافران براے امتحان در منجنیق کرده
انداختند و خلوت زکریا پیغامبر علیه السلام هم روزے بود که اره بر سر وے راندند میگویند که چون اره بر
سر وے نهادند کسے پرسید که این ساعت چه می خواهی گفت میخواهم تا نیمے از من در مشرق
افتد و نیمے در مغرب تا جهانیان دانند که راه دوست راهیست که جز عاشقان راه حضرت الله
نپویند چون بندگی مخدوم ادام الله عظمته بدینجا رسید بطریق وعظ مر حاضران را فرمود که تا طالب
در فرمانبرداری حضرت باری عز اسمه کمر توجه بکمال استوار نه بندد هرگز راه نپوید اصلا محبت
طلب نجوید مطابق همین حکایتے فرمود میگویند که چون خلیل علیه السلام کارد بر حلقوم اسمعیل
علیه السلام نهاد حقتعالی حجابها از میان دور افگند و فرمود که اے فرشتگان در بن پدر و پسر
بنگرید که در فرمانبرداری من چگونه اطاعت می نمایند روز اول به طعن میگفتید اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ
يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ امروز به بینید که خون فرزند دلبند خویش در طلب و رضاے
من چگونه میریزد اے جبرئیل مر ملائکه را فرمان برسان که بنگرند اسمعیل بر گردن اے خود نهاده از براے
رضاے او بزمین برند جبرئیل ع گفت خداوندا هٰذِهٖ كَرَامَةٌ عَظِيْمَةٌ این کرامت بزرگ است
که فداے او بر گردن فرشتگان مقرب نهند حقتعالی فرمود سوگند بعزت و جلال خود اگر همه فرشتگان
آسمان و زمین فداے اسمعیل را بر اعناق خود نهاده چندین برند تا مکافات آن یک سخن او نباشد که
در جواب پدر گفت يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ نظیر این آنست که چون روز قیامت شود و سرکان
طباق این هفت طاق زنگاری بلکه جگیان این رواق زنگاری بفرمان باری جل و علا صف
صف گشته خطاب مستطاب حضرت رب الارباب مسبب الاسباب جل و علا در رسد
كَذٰلِكَ اَنْزِلُوْا عِبَادِيَ الْمُوَحِّدِيْنَ فِيْ جَنَّاتٍ وَّعَمِّرُوْا لَهُمْ قُصُوْرًا وَّحُوْرًا حِسَانًا

یعنی ای فرشتگان فرود آرید بندگان واحد واندگان مرا در بوستانهای بهشت ما و لبشان بنمائید
مر ایشان را قصور و منازل و حور آنها پس گوید جل و علا که ای فرشتگان سوگند بعزت و جلال
خود که اگر همه بهشت ها را با آنچه در وی است باین خاکیان کرم نمایم هنوز مکافات آن یک
کلمه بلی که در جواب اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ گفته اند نشود تا بآن وقت که بدولت مشاهده جمال خود مشرف
گردانم شاید که مکافات آن تواند بود والله اعلم بالصواب **مجلس دوم** روزی چند کس
مسافر از زمره اهل صفه حاضر آمده مسکینی بمیان ایشان از حال مبدا و معاد و از طریق معرفت این
استفسار نمود بندگی مخدوم دام ظله بسوی حاضران آورده بتصریح و تشریح این معنی مشغول
شده اند و فرمودند که سعادت عظمی و مرتبه اعلی مر نفس ناطقه را معرفت الهیت و معرفت مبدأ و
معاد است لیکن طریق معرفت این هر دو وجه است یکی از این هر دو وجه
طریقه اهل نظر و استدلال است دوم وجه ثانی طریقه اهل ریاضت و مجاهده است و سالکان مر طریقه
اول اگر ملازم گرفته اند ملتی از ملل انبیا علیهم السلام پس اینها را متکلمین نامند و اگر ملتی از ملل
انبیا علیهم السلام لازم نه گرفته اند پس اینها را حکمای مشائین نامند و سالکان مر طریقه ثانی اگر موافقت
کرده اند در ریاضت خود با احکام شریعت را پس اینها را صوفی متشرع نامند و اگر موافقت نکرده اند
در ریاضت خود با احکام شریعت را پس اینها را حکمای اشراقین نامند پس مر هر طریق را دو طریق
است چنانچه نزدیک متأملان پوشیده نیست لیکن حاصل طریقه اول استکمال بقوت نظریست
و آن عقل مستفاد است یعنی مشاهده کردن نظریات را و محصول طریقه ثانی استکمال بقوت
عمل است و ترقی در درجات آن و درجه ثالث از قوت عملی فیضان کردن بر نفس صور معلومات
را بر سبیل مشاهده چنانچه در عقل مستفاد لیکن این درجه اکمل و اقوی است از مستفاد چراکه چیزیکه
فایض است بر نفس در دو درجه ثالث می باشد صور کشفی و مستعد میباشد نفس بصفای خود از کدورات
و از صیقل کردن آن نفس را از زنگار تعلقات و آلایش دنیاوی آنرا که فیضان شود آن صور بر آن نفس
چنانچه آئینه که از صیقل صاف کرده شده و آنچه مقابل آن آئینه کرده شود در وجه کمال محسوس شود و اکمله فیضان

شود نفس در عقل مستفاد و آن علوم است که مناسب شود آن علوم را مبادی آنکه ترتیب
داده شده است از برای رسانیدن بسوی مجهول چنانچه آئینه که اندک صیقل کرده شود پس چیزیکه
مقابل او خواهد بود محسوس بوده کمال نخواهد شد مگر شئ قلیل همدرین میان شخصی مسافر از طرف بجای
رسید و ارادت بیعت آورد بندگی حضرت مخدوم قبول فرموده بیعت و حلق نموده طاقیه عطا فرمود
همدرین میان حاضرے عرضداشت که در عهد رسول صلی الله علیه وسلم هم بیعت و قصر بود بندگی
مخدوم عظمه الله فرمود صحبت بود و خرقه پس چرا که رسول علیه السلام خرقهٔ مبارک خود بر خواجه اویس
قرنی رحمة الله عطا فرموده دیگر خیر لیکن قصر و حلق و بیعت گفته اند که در عهد خواجه جنید و بایزید جاری گشت
حکمش تا بحدیست که اگر بیعت بکنند و دست بر دست ننهند هرگز حکم پیری و مریدی نکنند بعده عطا
این حکایت نقل فرمود که شیخ احمد بر شیخ نظام الدین رحمة الله رفت و طاقیه التماس نمود شیخ
طاقیه عطا فرمودند لیکن بیعت و قصر در میان نبود که نظام الدین رحمه در دار البقا نقل فرمود آخر الامر
شیخ احمد از شیخ محمود التماس بیعت نمود شیخ محمود گفت که ارادت به کسے داری یا نه گفت طاقیه
از حضرت شیخ نظام الدین رحمة الله گرفته ام دیگر بس لیکن دست بر دست و بیعت هیچ نبود شیخ محمود در
جوابش گفت که الحال حاجت نیست همون بیعت است صوفی دران مجلس حاضر بود گفت که طاقیه
محض تبرک بود بیعت چگونه همان باشد بعد ازان شیخ محمود متامل شده شیخ احمد را گفتند که بعد تحقیق
این مقدمه آنچه خواهد انجامید گفته خواهد شد بعد ازان این واقعه را بر مشائخان آن عصر فرستاده که واقعه
چنین پیدا شده است چه باید کرد آخر اتفاق جمله مشائخان و درویشان آن زمان برین افتاده که طاقیه
تبرک بود بیعت نبود شما بیعت بکنید بعده بندگی حضرت مخدوم فرمود که غرض ازین حکایت آنست
که تا دست بر دست و مقراض نباشد حکم پیری و مریدی نکنند هم ازینجاست که قول جمله مشائخان اهل سلوک
درین باب وارد است که اَلْمُرِیْدُ لَا یَکُوْنُ مُرِیْدًا حَتّٰی یَاْخُذَ الشَّیْخُ شَعْرَ رَاْسِهٖ یعنی مرید نمی باشد هرگز
تا آنکه بگیرد شیخ موی سر او والله اعلم بالصواب مجلس سوم روزی چند مسافران از زمرهٔ اهل تصوف و مشائخان از شغل
و وطن جائیکه بندگی مخدوم اشرف جلوس فرموده بودند رسیدند یکی از جماعت ایشان ذکر خواجه اویس قرنی رحمة الله علیه

ا مده که فردای قیامت حضرت عزت ده هزار فرشته بر صورت اویس ره در وجود آورد که تا اویس
ن ایشان شده در عرصات در آید لیکن موجب این چیست و حکمت معلوم نیست که درین
ستر لیست بندگی مخدوم دام شرفه رو سوی حاضران آورده فرمود چنان معلوم می شود که
درین این حکمت تواند بود که در دنیا خدای تعالی را در قبهٔ تواری پرستیده است و او را آنجا جز
تعالی کسی دیگر نشناخت پس مناسب آنست که آن روز نیز او را جز خدای تعالی کسی دیگر
ناسد چنین گویند که فردای قیامت خواجه علیه الصلوٰة والسلام از کوشک خود بیرون آید چنانچه
ے مر کسی را طلب کند خطاب از حضرت رب الارباب آید که را میطلبی خواجه علیه السلام گوید که
یس رح را میطلبم باز خطاب در جواب خواجه علیه السلام فرود آید که چنانچه اویس رح را در دنیا ندیدی
ا هم نه بینی بعده خواجه علیه السلام گوید که الٰهی او کجاست فرمان آید فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ
یکٍ مُقْتَدِرٍ ۞ یعنی در محل صدق نزدیک پادشاه قادر بعده خواجه علیه السلام گوید چو لست
ز می بینم که مردم در عرصات موجود اند و تفحص و طلب اند امروز او را من میخواهم که ببینم و او مرا نمی بیند
ن در رسد که ای محمد صلی الله علیه وسلم آنها که محتاج دیدار تو اند محض واسطهٔ من و کسانیکه بی تو
توانند که مرا ببینند پس محتاج تو چون شوند دیدن او شما چه سود کند و دیدن ما تو چنین یان دار چه
گی مخدوم دام شرفه بدینجا رسید رو سوی حاضران آورده فرمود سبحان الله چه مرتبه و کمال
جلال بجال خواجه اویس قرنی رحمة الله خدای تعالی عطا فرموده که در روز رستخیز خواجه
زین صلی الله علیه وسلم بطلب او بیرون آید و او حاجت بشفاعت حضرت رسالت پناه
لی الله علیه وسلم در آن روز نشاید چه درین میان مولانا آمون عرضداشت که خواجه اویس قرنی
ة الله مرقع مبارک حضرت رسالت پناه صلی الله علیه وسلم بحسب اشارت آن سرور انبیا
لم رسیده بود یا که باتفاق تابعین رضوان الله علیهم اجمعین - بندگی مخدوم عظمه الله فرمود که
سب اشارت حضرت رسالت پناه صلی الله علیه وسلم سپرده بود علمای دین باب چنان گفته
چون خواجه علیه الصلوٰة والسلام از عالم الفناء بعالم العلیاء تحویل میفرمود وصیت کرد که مرقع مبارک من به

نموده بود که با ایشان بعد انتقال آن خواجه علیه السلام بموجب فرمان عمر و علی رضی الله عنهما مرقع
مبارک گرفته بطلب خواجه اویس رحمة الله بیرون آمدند نشانها و علامتهای خواجه رحمة الله
از هر یک می پرسیدند لیکن همه همین میگفتند که او شتربانیست اشتران مردمان می چراند وقتی از قبیلها
میل به آبادانی نمی آمد بعد طلب بسیار او را دریافتند مرقع مترفع بموجب امر محمد مصطفی صلی الله
علیه وسلم دادند و گفتند که فرمان حضرت پیغامبر صلی الله علیه وسلم چنین رفته است که وقت پوشیدن
این مرقع امتان مرا هرگز فراموش نکنی بعد ازان خواجه رحمة الله مرقع مبارک بستد و در گوشه
رفت و میگفت بارخدایا هرگز این مرقع نپوشم تا که محمد مصطفی صلی الله علیه وسلم را تمام امت نه بخشی
در سر او فرو خواندند که بعضی را بتو بخشیدم گفت تمام میخواهم در همین گفتگو بود که عمر خطاب و علی رضی الله
عنهما نزدیک او رفتند و گفتند کسی باید دید که او در آن گوشه چه میکند و بچه مشغول است چون نظر خواجه
رحمة الله برایشان افتاد گفت افسوس صد افسوس که تعجیل کردید و مرا از وقت خاص بیوقت
نمودید وگرنه این مرقع مترفع محمد مصطفی صلی الله علیه وسلم هرگز در بر نمیکردم تا که تمامی امت بخشش
رسول الله صلی الله علیه وسلم بمن نمی دادند چون امیر المومنین عمر خطاب و علی رضی الله عنهما تمام
باطن عظمت زنده را دیدند با یک دیگر متحیر ماندند و گفتند که ای اویس تو چرا بقرب نیامدی در رسول
علیه السلام را ندیدی گفت که شما دیده بودید گفتند که ای اویس خواجه چگونه میفرمائی که ما یان همه
وقت در آنحضرت بودیم گفت که دندان مبارک حضرت رسالت پناه صلی الله علیه وسلم خسته
شده بود دیده بودید یا نه گفتند که دیده بودیم گفت حیف صد حیف پس با وجود دیدن چرا دندان
خود را سالم گذاشتید بعد ازان دندانهای خود نمود که سی و دو دندان بموجب متابعت حضرت
رسالت پناه صلی الله علیه وسلم شکسته شده بود مولانا آمون استفسار نمود که همه دندانهای
مبارک حضرت رسالت پناه صلی الله علیه وسلم خسته شده بود یا نه مخدوم عظمه الله فرمود که یک
دندان خسته شده بود مولانا آمون باز عرضداشت که پس چرا خواجه اویس رحمة الله همه دندان
خود را شکست ساخت فرمود که بدین معنی که آن دندان مبارک معین بر خواجه معلوم نبود

هم را شکست ساخت که تا آن دندان مبارک شکسته است داخل بود پس عمر گفت رضی الله عنه مرا
دعاے بکن گفت که در تشهد اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ میگویم درین دعا
تو هم داخل می شوی چون زمانے بگذشت ایشان را معذرت کرد و گفت که باز گردید قیامت نزدیک
است من به ساختن زاد آخرت مشغول هستم والله اعلم بالصواب **مجلس چهارم** روزے بعد
نماز بامداد بندگی حضرت مخدوم دام عظمته الله جلوس فرموده بودند که حاضرے از حاضران مجلس
روسوے بندگی حضرت مخدوم دام عظمته آورده عرضداشت نمود که آن روز که فرمان حضرت عزت
درباب سجده آدم صفی الله اُسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ در آمد جمله
ملائکان مقرب بارگاه بموجب امر الٰهی مر آدم را سجده کردند مگر ابلیس انکار کرد و از تکبرے که با ما
بوده ام گفت با آنکه سرشتش از خاک است سر سجده خواهم برد و عرض داشت که چنین کسے
را که از ریاضت و مجاهدات بدرجه کمال رسیده باشد چنین کس این قدر کلام نالایق نمی سز
بعده بندگی مخدوم عظمه الله فرمود که آرے شاسیده جواب به چنین مردے کامل اصلا نمی ز
لیکن موافق مشیت حق هر چیز که نسبت انجام میگردد و این را با این بهانه مرتد عالم ساخت
و بدرگاه کبریاے داناے از تکبرے مطلق درست نیست إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُتَكَبِّرِينَ
بدرستیکه الله تعالی دوست نمیدارد تکبر کنندگان را. بعد از آن حکایتے فرمود که روزے عزاز
بدر بهشت نظر کرد چه میبیند که دبیر قضا بخامه اقتضا از براے نظاره اهل غیرت این کلمه
حکمت نوشته بود که مارا بنده از بندها است که او را بانواع انعام و اکرام مکرم گردانیده ام از زمین تا آسما
برم و از آسمان بجنان رسانم بعد از آن او را بامرے از امور خود دلالت کنم و او مخالفت فرما
کند عزازیل چون این کلمات را مطالعه کرد هزار سال طاعت و اوراد خود بگذاشت و متصد
برین بنده نافرمان همان لعنت میگو و این نمیدانست که آن لعنت محض بر خود است و همچنا
چنین آمده که چون عزازیل در لوح محفوظ نگاه کرد و دید نوشته أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
گفت خداوندا این شیطان رجیم کیست ندا آمد که بنده از بندگان من که بعنوان نعم کر

رواهم بعد ازان تا فرمانی کشنا خرمن اودا خوار و نگونسار گردانم لعنت الٰہی او را همین نماسے تا بہا کش
رواهم فرمود که منسوخ قراۃ یعنی زنده باشند او بیبی مجلس تخمیم روزے بندگی حضرت مخدوم
الم الله عظمته بعد نماز بامداد او را درس مشغول شدند در سبق قاضی احمد ذکر وحدانیت باریتعالیٰ
ده بود قاضی احمد استفسار آن نمود بعده بندگی حضرت مخدوم جہان بوجه احسن بالتفصیل
بیان فرمودند که حضرت باریتعالیٰ صانع العالم واحد است یعنی کاریگر عالم یکیست لقوله تعالیٰ قُلْ
هُوَ اللهُ اَحَدٌ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا یعنی اگر بودے درآن
آسمان و زمین خدایان او را سوے آن هر آئینه فساد می شد درآن آسمان و زمین ـ بیت

اگر بودے ازیکے خدا افزون ‌‌ ‌ تا نماندی جہان بدین قانون

یعنی چون بنده بلاغت رسد عاقل و ممیز شود اول چیزے که بروا از راه شرع فرض گردد
ایمان آوردن است بخدائے عزوجل وآن آنست که خدائے را یگانه و بے همتا داند و از شرک
و جفت و زن و فرزند چنانچه مذہب بعضی است و از همه صفات ناسزا چون عجز و نقصان
و جہل پاک و منزه شناسد و همه صفات ثبوتے چنانکه دانائے همه چیز و توانائے بهمه چیز و
بے نیازی از همه موصوف داند و بدل اعتقاد بنده و بزبان اقرار کند که هُوَ حَيٌّ عَالِمٌ قَادِرٌ سَمِيْعٌ
بَصِيْرٌ مُّدَبِّرٌ اِلٰى غَيْرِ ذٰلِكَ یعنی او تعالیٰ زنده است و داننده است و بر هر شے قادر است
و شنونده است و بیننده است و تدبیر کننده است ـ تا غیر این ـ وَمُتَكَلِّمٌ بِكَلَامٍ وَّاحِدٍ
اَزَلِيٍّ قَائِمٍ بِذَاتِهٖ لَيْسَ مِنْ جِنْسِ الْحُرُوْفِ وَالْاَصْوَاتِ یعنی گوینده است بکلام واحد
همچو واحد یکه ازلی است قائم بذات خود و او نیست از جنس حروف و صوت بلکه مضمون است
کقوله علیه السلام كَلَامُ اللهِ تَعَالٰى غَيْرُ مَخْلُوْقٍ یعنی کلام خدا پیدا کرده خدا نیست ـ جبرئیل
علیه السلام که بر محمد مصطفےٰ صلی الله علیه وسلم قرآن آورد مضمون بود که حروف تہجی و عبارت
و صوت این همه را حضرت جبرئیل علیه السلام بعقل و دانش خود جمع کرده اند آیات و سورهاے
متفرقه که جبرئیل علیه السلام آورده هر چہار یاران جمع کردند

ا جمع نموده حضرت عثمان است و قرآن را فرقان برای همین گویند که در و متفرقه است وان
جبرئیل نظر فی اللوح المحفوظ و جاء بالقرآن من اللوح بحکم الله تعالی
الی محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم یعنی بدرستیکه جبرئیل علیه السلام
نظر کرد در لوح محفوظ و آورد قرآن را از لوح محفوظ بحکم الله تعالی بسوی محمد رسول الله صلی الله علیه
وسلم بیت

گرچه قرآن از لب پیغمبر ست		هر که گوید حق نگفت او کافر ست	

و صفات الله تعالی نه همه او ست و نه جدا از و ست الله علم مذهب الا صحیح اسم
ذاتی که مستجمع بجمیع الاسماء و الصفات است - باقی همه صفات او ست و تا کسی بر وحدانیت
باری تعالی دلیل و حجج نداند مقلد بود و تقلید آن است بدانچه خلق را بیند و تمیز بر آن باشد
دلیل و حجت خود نداند این چنین کسی نزدیک بعضی مسلمان نیست نزدیک اهل سنت و جماعت
چون مقلد را تصدیق بود مومن است و نزدیک معتزله و اشعریه مومن نیست تا که همه مسائل اعتقادی
بدلیل نشناسد بر وجهی که ممکن بود مر دفع شبهات او را و نزدیک کرامیه هر که گوید لا اله الا الله و
خداوند را نه شناخت و صانع از مصنوع نداند و بوی اعتقاد نکند مومن بود و این تقلید محض است
و از ینجا است که فقهای ما از اهل سنت و جماعت میگویند که قول خود ایمان نیست یعنی تقلید محض ایمان نیست مقلد که مومن
بود جائیست که مراد وی را تصدیق بود اما قول مجرد بی تصدیق ایمان نیست چنانچه از مردمان شنید
لا اله الا الله او نیز گفت لا اله الا الله اگر او را بپرسند که این چه گفتی گوید از مردمان
شنیدم من نیز گفتم نمیدانم که چیست مومن نبود اما اگر گوید از مردمان شنیدم و دانستم که گفتن
این حق و درست است یعنی اعتقاد برین کردم مومن بود فضیل رحمه الله فرموده است که چون
بنده بشناخت که ورا صانع است از حکم تقلید بیرون آمد صورت مسئله چنان بود که چون کسی را
پرسند که ترا که آفرید در جواب گوید خدای تعالی باید بدین نهج جواب گوید که کسی که آسمان و زمین آفریده
است مرا و ترا آفریده است پس وی مقلد نبود ایمان وی درست بود اگر گوید نمیدانم

این هم گوید لا اله الا الله مومن نبود چون بندگی مخدوم عظمه الله بدین بار رسید ترغیباً للحاضرین
بود که بنده مومن را واجب است که در شناختن هستی خدای عزوجل عزم بالجزم کند که این
موجودات بخودی خود نشده است زیرا که امر محال است شدن چیزی بخودی خود کار بی کاریگر قطعاً
صورت نه بندد چنانکه کتاب بی کاتب اصلا در وجود خود به خود نه آید همچنین کارهای دیگر را قیاس
این باید کرد پس لازم می آید که کار را البته کاریگری باید وگرنه کار بیکاریگر بود و آن محال است
پس ثابت شد که کار بی کاریگر هرگز در وجود نه آید و این کاریگر باید که واجب الوجود بود یعنی هستی
بخودی خود بود نه بغیر خود وگرنه او هم محتاج بدیگری بود و آن دیگر به دیگری تا حد بی نهایت
و این در عقل باطل است هرگز نزدیک اهل فراست مجوز العقل نیست چون هستی خداوند تعالی
بدلائل و حجج ثابت گشت پس هر مومن را ثبوت یگانگی باری نیز واجب است و آن آنست که
اگر خدا دو بودی اصلا هیچ کاری راست نامدی زیرا که اگر یکی خواستی که چیزی را هست کند
و آن دیگری خواستی که همون چیز را نیست کند پس برین تقدیر خواست هر دو تمام بودی و آن
محال است چرا که لازم می آید که آن چیز هست باشد بمقتضای یکی و هم نیست باشد بمقتضای
دیگری در یک حال و این محال است قطعاً - چنانچه لازم محال بلزوم نیز محال یا خواست هر دو
ناتمام بودی و آن هم محال است چرا که برین تقدیر لازم می آید که هر دو عاجز و ناقص باشند و
عاجزی و ناقصی خدا را نشاید و نباید یا که خواست یکی تمام بودی و خواست دیگری ناتمام پس
برین تقدیر دومی عاجز و ناقص می باشد و این هر دو خدائی را نشاید و اگر کسی از روی منازعت
در پیش آید بدین وجه که یکی مر دیگری را در هر کار در هر چیز موافقت و متابعت کردی پس در جوابش
به چنین وجه گوئیم که این نیز محال است از آنکه کار هر یکی موقوف است بموافقت دیگری یا موقوف
نیست اگر موقوف است پس هر یکی ناقص می باشد و اگر موقوف نیست دویی باطل می شود که
بوجه هیچ کار بسته نیست بودن و نابودن وی برابر است چون بدین دلیل و حجت دویی باطل شد
یگانگی یعنی وحدت قطعاً ثابت گشت چنانچه نزدیک بعضی اهل عقل مخفی و محتجب نیست و چون

شده پس وجهت که صدر مذکور شد باطل گشت زیاده بودن از دو بطریق اولی باطل و محال بود چنانچه
دقیق تامل روشن گردد والله اعلم بالصواب **مجلس ششم** روزے بندگی حضرت مخدوم
م شرفه بعد فراغ نماز بامداد بتلاوت قرآن مجید و فرقان حمید مشغول بودند که شخصے از ساکنان بخارا
مد و سلام گفت بندگی مخدوم عظمه الله جواب سلام او داده لیکن تعظیم نکرده بعد تلاوت قرآن مجید
مگی حضرت مخدوم جهان جهت تسکین خاطر آن شخص مسافر و ترغیباً للحاضرین بر لفظ مبارک راندند
ه از کتب مطول چنان معلوم گشته که بوقت تلاوت سخن نه گوید و شنونده قرآن هم باید که سخن
گوید و در حال تلاوت قرآن تعظیم هیچ کسی نکند مگر تعظیم بادشاه عادل و مادر و پدر و استاد - و درین
اختلاف روایت است نزدیک بعضے استاد مطلق هر چیزے که باو خوانده باشد و نزدیک
بعضے تخصیص است که تعظیم استادیکه باو فقه خوانده باشد بکند بعده همون شخص بخارا استفسار
نمود که فرق در میان قرآن بیاد خواندن و دیده خواندن چیزے هست یا نه بندگی حضرت مخدوم
جهان فرمود آرے فرق این قدر است کسیکه قرآن یاد می خواند پس گوئی حق تعالی باوے
سخن میگوید و کسیکه دیده میخواند پس چنین است که گوئی که او با حق تعالی در سخن است باید که
معنی قرآن بغیر از تفسیر هرگز یاد نباید گفت - بقوله علیه السلام مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْيِهٖ فَقَدْ
كَفَرَ یعنی کسی که معنی بگوید قرآن را از عقل خود پس تحقیق او کافر است و مس نکند قرآن را حالیکه
جنب باشد و بے وضو هم از دست نگیرد قرآن را مگر به غلاف - همدرین میان ذکرے در نسب
رسول علیه السلام در پیش آمده بود بندگی حضرت مخدوم جهان دام شرفه بر لفظ مبارک راندند که
ان نبینا و رسولنا محمد مصطفے صلی الله علیه وسلم بن عبد الله بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف
بن قصی بن کلاب بن مره بن کعب بن لوے بن غالب بن فهر بن مالک بن نضر بن کنانه بن خزیمه
بن مدرکه بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن اُد بن اُدد بن همیسع بن عامر بن سلامان
بن ثابت بن حمل بن قیدار بن اسمعیل ذبیح الله بن ابراهیم خلیل الله بن آذر بن ناحور بن شارخ
بن ارغو بن فالغ بن غابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح پیغامبر علیه السلام بن المک بن متو

پیغامبر علیه السلام بن مهلائیل بن متوشلخ بن اخنوخ که ادریس است پیغامبر علیه السلام بن یارد
بن قینان بن انوش بن شیث علیه السلام بن آدم صفی الله صلوٰة الله علیه وسلامه . انّ
النَّبِیَّ عَلَیْهِ السَّلَامُ ادَّعٰی نُبُوَّتَهٗ وَاَظْهَرَ الْمُعْجِزَاتِ عَلٰی یَدَیْهِ کَانْشِقَاقِ الْقَمَرِ وَ
اِنْجِذَابِ الشَّجَرِ وَتَسْلِیْمِ الْحَجَرِ وَنَبْعِ الْمَاءِ مِنْ بَیْنِ اَصَابِعِهٖ وَتَسْبِیْحِ الْخَشَبِ وَ
شِکَایَةِ النَّاقَةِ وَشَهَادَةِ الشَّاةِ الْمَصْلِیَّةِ وَشُرْبِ الْکَثِیْرِ مِنَ الْبَشَرِ قَلِیْلًا
مِنَ الْمَاءِ یعنی بدستیکه نبی علیه السلام دعوی کرد نبوت را و ظاهر کرد معجزات را بر دستهای خود
چنان دو پاره ساختن ماهتاب را و کشیدن بسوی خود درخت را و سلام گفتن سنگ
و روان شدن آب از میان انگشتهای آن سرور کائنات صلعم و تسبیح خواندن چوب و شکایت
کردن شتر ماده و گواهی دادن گوسپند کوهی و نوشانیدن از آب اندک مردمان کثیر را معجزات
که از محمد مصطفی صلی الله علیه وسلم ظاهر آمده از تفسیر مفسران و از روایت راویان چنین معلوم
گشته که قبل از تولد حضرت عبد الله بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف کافران از علم نجوم
میگفتند که در سال فلان آن شخص در جهان پیدا خواهد شد که از روی پیغامبر آخر زمان متولد
خواهد شد اما این جبه صوف قطره خون خواهد چکید آخر الامر چون تولد حضرت عبد الله گشت
از جبه صوف که مر کافران را بود قطره های خون چکید در میان کافران غوغا افتاده که آن
شخص که از روی پیغامبر آخر الزمان پیدا خواهد بود متولد شد آخر کافران علیهم اللعنة با یکدیگر
خودها مصلحت برین مستحکم کردند که بهتر آنست که همین شخص را بالفعل از جهان ناپیدا باید کرد اگر این
را خواهیم گذاشت تا آخر از روی پیغامبر آخر الزمان پیدا خواهد شد و او دین اسلام را بر دین ها
غالب خواهد کرد بعده عزم جزم بکشتن حضرت عبد الله کرده روانه شدند لیکن کافران هر چند
حتی المقدور در کشتن حضرت عبد الله دریغ نه کردند لیکن بسبب نور محمدی و بحفظ حافظ حقیقی موی
از تن هرگز جدا کردن نتوانستند در پرورش عبد الله عبد المطلب کوشش ابویه و احتیاط
از حد زیاده میکردند چون به عمر پنج و شش سالگی رسید راویان چنین روایت میکنند که حضرت عبد الله

روزے بہ طرف صحرائے سیر رفت کہ ماہتاب تا آسمان جدا گشتہ در گریبان حضرت عبداللہ در
آمد بعد ازان دو پارہ گشتہ بمنزل خود رفت حضرت عبداللہ این معاملہ را دیدہ و بحیرت افتادہ
این حقیقت واقعی را پیش حضرت عبدالمطلب یک یک اظہار ساخت حضرت عبدالمطلب این واقعہ
را شنیدہ و در دل خود گفت کہ از ہمین شخص پیغامبر آخر زمان تولد خواہد شد آن ماہتاب کہ در گریبان
عبداللہ در آمد در حقیقت نور محمدی بود کہ می شتافت ازان روز محافظت عبداللہ از حد زیادہ
میکردند و بسبب نور محمدی این چنین جمال و حسن و کمال بر عبداللہ ایزد لایزال ارزانی داشتہ
بود کہ سودائے محبت عبداللہ در دل جمیع خلق اللہ از حد زیادہ تر بود از انجملہ در آن عصر یک دختر
بادشاہ بود کہ او بقوت علم خویش میدانست کہ پیغمبر آخر زمان از عبداللہ پیدا خواہد شد ازین جہت
آرزوے تمام میداشت کہ اگر عبداللہ از من ہم صحبت شود تا این نعمت علیا یعنی پیدا بودن پیغمبر
آخر الزمان بہ نصیبۂ من شود در تجسس و تفحص عبداللہ می بود اتفاقاً روزے حضرت عبداللہ بعزم
شکار طرف وادی رفتہ بود آن روز کافران نیز بقصد ہلاکی عبداللہ بہ مقامے خفتہ بودند کہ یک شیر
نزدیک عبداللہ آمدہ۔ ہر چند قصد میکرد کہ بضرب پنجہ ہلاک کردہ طعمۂ خود نماید لیکن از انجا جنبش نتوانست
کرد کافران اینچنین حال بدیدند و با یکدگر میگفتند کہ درباب کسیکہ خداے تعالیٰ این چنین رحم و عنایت
خود مرحمت کردہ است کہ شیر ہرگز طاقت نمے یابد کہ ہلاک کند پس از ما یان چہ خواہد شد شرمندہ
گشتہ ہر یک باز رفتند شخصے از عاملان حضرت عبداللہ نیز در شکار رفتہ بود آن شخص این معاملہ
را دیدہ در دل خود یقین آورد کہ این محض تصرف کرامت است کہ شیر حیوان بودہ قصد ہلاک میکند
لیکن نمے تواند کہ از جاے خود مقدار موے جنبد آخر الامر آن شخص چون بخانۂ خود آمد پیش
زن خود واقعہ عبداللہ کہ از شیر روے دادہ بود یک یک بیان نمود و گفت کہ او بخانۂ عبدالمطلب
بر دو بجے کہ باشد منت و الحاح کردہ دختر خود را بعبداللہ دہ آخر الامر زن آن شخص بخانۂ عبدالمطلب
آمدہ بمنت تمام اظہار ساخت کہ دختر خود را بہ عبداللہ می سپارم ہر چند میگفت حضرت عبدالمطلب
قبول نمیکردند آخر بعد الحاح و منت بسیار قبول کردند آنچہ مرکز خداے تعالیٰ در آن زمان بود بیا—

روه عقد بستند چون نور محمدی صلی الله علیه وسلم از پشت عبدالله در رحم مادر محمد مصطفی صلی الله
علیه وسلم که آمنه نام بود نزول کرد نوریکه بر چهرهٔ عبدالله می تافت در زوال شد روزی
عبدالله بطریق سیر طرفی میرفت همون دختر بادشاه که آرزوی کمال میداشت میرفت اصلا توجه
ان دختر طرف عبدالله نبود حضرت عبدالله در دل خود گفتند که چون قبل ازین این دختر
بادشاه مرا میدید بتواضع و تعظیم از حد زیاده بخدمتگاری می در آمد الحال موجب چیست که نظر
هم نمی کند حضرت عبدالله آن دختر بادشاه گفت که ای فلان این چه حال است که قبل ازین
آرزوی دیدن ما از حد زیاده تر بود الحال چیست دختر بادشاه جواب داده آرزوی چیزی که
میداشتم آن چیز بمقام خود رسید و قرار گرفت بوی برفت و گل بماند گل برفت و خار ماند گنج
بردند مار ماند مجلس هفتم روزی بعد نماز جمعه بندگی حضرت مخدوم جهان نور الله ضریحه
بی نظیر همچو قمر منیر جلوس بجامع مسجد فرموده بودند طالبان دین و محققان اهل یقین که همچو هاله نشسته
بذکر کلام دینی مشغول بودند اندرین میان مولانا آمون عرضداشت که در ادای نماز جمعه میان
علما اختلاف واقع است چنانچه پوشیده نیست لیکن به مذهب اهل سنت نماز جمعه بچه نوع
آمده است بندگی حضرت مخدوم عظمه الله بزبان گوهرفشان فرمود که طریق نماز جمعه بهتر آنست
که جمله شانزده رکعت بگذارد اول چهار رکعت سنت صلوة الجمعه خواند بعده دو رکعت فرض صلوة
الجمعه بجماعت بگذارد و بعده چهار رکعت سنت خواند لیکن درین سنت ظهر و جمعه یکی هم نگوید
بلکه اربع رکعات صلوة سنت هذا الوقت بگوید بعد ازان چهار رکعت فرض خواند نیت بدین نوع کند
نویت ان اصلی لله تعالی اربع رکعات صلوة آخر الظهر ادرکت وقته متوجها
الی جهة الکعبة الشریفة الله اکبر - و در هر چهار رکعت سوره فاتحه ضم کند لیکن در دو رکعت
اخیر سورتین با فاتحه ضم کنند بعد ازان دو رکعت سنت بکنند - جلدر یاصین نزدیک بود از غایت
مطلوب برکشید و مولانا آمون فرمود که ترغیبا للحاضرین بآواز بلند بخوانید چیزیکه بندگی حضرت
مخدوم مقبول کونین بزبان گوهرفشان در جواب مولانا آمون فرموده بودند مطابق عبارت

بامین آمد بعد ازان فصل طریق نماز تهجد نیز مسطور بود خواندن فرمود به مضمون آنکه دوازده رکعت
یعنی دوگانه سنت بگزارد نیت هر دوگانه آنکه نویت ان اصلی لله تعالیٰ رکعتی صلوٰة
تهجد سنت رسول الله تعالیٰ متوجها الی جهة الکعبة الشریفة الله
اکبر در دوگانه اول در رکعت اول بعد سوره فاتحه دوازده مرتبه قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ و در
رکعت دوم بعد سوره فاتحه یازده مرتبه قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ بخواند بعد تحیات و درود خوانده
سلام دهد و صد بار یا وهاب بخواند و پنج مرتبه اسم الله حاضری الله ناظری
الله شاهدی الله ناصری الله معی - خوانده از جلسه برخیزد دوگانه دیگر شروع
کند در هر رکعت یک یک مرتبه قل هو الله احد کم کند چنانچه در ششمین دوگانه آخر رکعت
بعد فاتحه یک مرتبه قل هو الله احد خواند نماز تهجد تمام کند لیکن بعد سلام در دوگانه اول همان
اسم خواند که در صدر مسطور است و بعد سلام در دوگانه دوم صد مرتبه یَا فَتَّاحُ و پنج اسم
مذکور خواند - و بعد سلام در دوگانه سوم صد بار یا غفار و پنج مرتبه اسم مذکور خواند و در دوگانه چهارم
بعد سلام صد مرتبه یا کریم و پنج مرتبه اسم مرقوم خواند و در دوگانه پنجم بعد سلام صد بار یا عزیز
و پنج مرتبه اسم مسطور خواند و در دوگانه ششم بعد سلام صد مرتبه یا بدوح و پنج مرتبه
اسم مذکور خوانده سر به سجده برده آنچه خواهش قلبی داشته باشد از ایزد واهب العطایا
دعا بخواهد - و از نماز تهجد فارغ شود بدین طریق نماز تهجد دوازده رکعت ادا کرده اند بعد ازان اندکے
در خواب روند چون آخر پاس شب از پاس کم باند آن زمان برخیزد و از تجدید وضو دوگانه شکرانه بگزارد و بعد
این دعا ملکوتی چندانکه تواند بخواند و آن اینست سبحان الملك الجبار سبحان العزیز الغفار
سبحان الواحد القهار سبحان الکبیر المتعال سبحان الکریم الستار سبحان
الخالق اللیل و النهار سبحان الذی لم یزل ولا یزال مجلس ششم روز عاشوره
بود که بندگی حضرت مخدوم اعظم اسد جلوس فرموده بودند ذکرے در فضیلت روزه
روز عاشوره در میان آمد بندگی حضرت مخدوم جهان بر لفظ مبارک خود راندند که ابو هریره رضی الله عنه

ایت کرد که پیغامبر صلی الله علیه وسلم فرمود که اگر موئے پشیزے به صدقه کند فضل روزه
شوره دریابد و هر که روز عاشوره روزه دارد هشت درهاے بهشت بروے کشاده گردد در آید
رو در یکه خواهد ابن عباس رضی الله عنه گفت که پیغامبر فرمود صلی الله علیه وسلم که روزه عاشوره
روزه دارد پس مر آن بنده را بهر ساعتے شب و روز آن یوم عاشوره که بست و چهار ساعت بود برانگیزد
الله تعالی بسوی آن بنده هفت لک فرشته که خوانند مر آن بنده را آمرزش تا روز قیامت و برانگیزد خداے تعالی در بهشت
هفت لک فرشته تا بنا کنند قصرها و شهرها بنشانند درختان و دعا کنند حتی اگر بمیرد در آن روز شهید مرده باشد ابن
عباس گفت رضی الله عنهما که هر که عاشوره روزه دارد داده شود مر آن بنده را اجر هر چیزے که در توریت و انجیل و زبور و قرآن
است نیکی - و در شب عاشوره صد رکعت بگزارد و بخواند در هر رکعت بعد از فاتحه سه بار قل
هو الله احد - چون از نماز فارغ شود هفتاد بار بگوید سبحان الله والحمد لله ولا اله
الا الله والله اکبر ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم و در روز عاشوره شش
رکعت نماز بگزارد و بخواند بعد از فاتحه والشمس یکبار و الضحی ایک بار و انا انزلناه یکبار - و اذا زلزلت
الارض یکبار و معوذتین یگان بار - چون از نماز فارغ شود سر به سجده برد و قل یا ایها الکفرون بخواند
و حاجت خود خواهد روا گردد مجلس نهم روزے بندگی حضرت مخدوم عظمه الله به جمیع طالبان دین و محققان
اهل الیقین جلوس فرموده بودند از میان ایشان مولانا آمون عرضداشت که بعضے اهل متصوفان اند که
ایشان هرگاه که بدرجه کمال رسند عبادت کردن بر وے فرض نیست حکم نفی عبادت این ها البته
بدلیل و سند خواهد بود پس آن دلائل و سند ایشان کدام است که بروے تکیه گرفته مستقل بر
منع عبادت بوده اند بندگی مخدوم عظمه الله فرمودند که دلائل و سند متصوفین در منع عبادت
این آیت کریمه است وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ پس بر تقدیر مذهب بعضے از اهل
تصوف صفت حکم لفظ حتی که در آیت مذکوره واقع است از براے نهایت است پس معنی
چنان میشود که عبادت بکن پروردگار خود را تا که آید ترا الیقین - لیکن محققان شرع بر آن اند که لفظ
حتی از براے غایت نیست بلکه از براے علت است چنانچه میگویند اَسْلِمْ حَتّٰی

ستاده که خوردن چون روا باشد یانه بندگی حضرت مخدوم جهان در جواب فرمود که آن صدف استخوان
برم است که آب مقامگاه اوست چون در آتش سوخته شود خوردن او روا باشد در پیولا به
تقاضای خلق عالم آنوقت در خدمت کرام بندگی مخدوم مقبول الانام به آرزوی تمام التجا برین آورده
که قدرے زمین نذر مخدوم جهان آورده ام بکار فقیران خواهد آمد چنانچه بندگی حضرت مخدوم
عظمه الله حضور خواجه مذکور از روے نوازش خاص مولانا آمون را به خطاب اسم چهار قسم شیخ
آمون - بهائی آمون - مولانا آمون - مقبول عالم آمون ممتاز کرده زمین نذر خود عطای بمولانا
آمون فرمود چنانچه مولانا مذکور قبول نموده تکیه و آرام گاه خود ساخت از انوقت
رباب نوازش مولانا آمون اکثر آمد و رفت ظاهری بندگی مخدوم جهان در آن سرزمین بود بلکه
یک گلچکان ابتدأ و تبرکاً از دست مبارک خود نصب کرده سیراب از شیر و شکر ساخت و
بنصب درختان دیگر مولانا شیخ آمون را حکم فرمود که چون آباد خواهد بود آرامگاه فقیران و
مسکین و وابستگان است بموجب حکم حضرت مخدوم مولانا شیخ آمون همچنان کردند
والله اعلم بالصواب

رساله وفات نامه

هو المستعان

رساله وفات نامه

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الحق

والحقیقت والدین احمد یحیی منیری قدس الله سره العزیز

در مطبع [illegible] [illegible] طبع شد

سنه [illegible] هجری

جامع

زین بدر عربی

بسم الله الرحمن الرحیم

حمد و ستایش فراوان مر حضرت پاک خداوند پاک را که ارواح پاک انبیا و اولیا را از عالم پاک بلطف و فضل برای کسب کمالات ایشان و ارشاد و هدایت خلق در دنیا به ظهور آورده بعد از کسب و کمالات به عالم پاک برد اری کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِهٖ برین معنی است وَمِنْهُ یَبْدَاُ وَاِلَیْهِ یَعُوْدُ ره اشارت برین واردات است و درود بے پایان بر سرور عاشقان و تاج سر محبان محمد رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم که اصل همه خلائق از انس و ملائک است اگر او نبودی نه عالم بودے و نه آدم والنبی الامی سوید این رمز است و بعده نفحات تسلیمات بر آل و اهل بیت او و یاران او و علمای طریقت و بنای حقیقت که هر یکے خلفای او بودند در میان علم شریعت و احکام طریقت و اسرار حقیقت خصوصاً بر خلیفه عصرنا و مقتدای دهرنا مولانا و مخدومنا و استادنا و شیخنا و مرشدنا الخلق الی الحق قطب العارفین و برهان العاشقین شیخ شرف الحق والحقیقت والهدیٰ والدین احمد بن یحییٰ منیری قدس سره العزیز باد اما بعد میگوید بنده ضعیف زین بدر عربی که بعضے یاران در وقت رحلت حاضر بودند برین حقیر اشارت کردند که آنچه خدمت حضرت شیخ الاسلام والمسلمین قدس الله سره العزیز در وقت وداع هر کسے را فرموده اند و وصیت کرده اند درکاغذے جمع کن تا غائبان را ازان حظے و نصیبے باشد بنابران این حقیر آنچه حقیقت حضرت شیخ الاسلام بوقت رحلت از وصایات و ادعیه و بشارت ها در حق بعضے که حاضر بودند بر سبیل مفصل و در حق بعضے که غائب بودند بر سبیل اجمال استماع افتاده بود در این اوراق جمع آورده بخدمت یاران که حاضر بودند تصحیح کردم روز چهارشنبه پنجم ماه شوال سنه ۷۸۲ اثنی و ثمانین و سبعمایة سعادت قدمبوس بلب و دل حاصل آمده بیت

سال هجرت بود کاندر هفتصد و هشتاد و دو	اینچنین گنج معانی شد به خاک اندر نهان

بعد از نماز بامداد بندگی مخدوم جهان قدس الله سره العزیز در رواق که ملک الشرق ملک نظام الدوله والدین خواجه ملک مکنه الله و عمره بنا کرده بود بر سر سجاده تکیه فرموده بودند و خدمت شیخ جلیل الملة والدین برادر حقیقی و خادم خاص دام جلالته علی اسند التقوی و بعضی یاران و خدمتگاران که چند شب بدولت موافقت پیوسته بیدار می بودند چنانکه قاضی شمس الدین دام تقواه و مولانا شهاب الدین خواهرزاده خواجه مینا و مولانا ابراهیم و مولانا امون و قاضی میان و بلال و عقیق و عزیزان دیگر که حاضر بودند خدمت حضرت مخدوم قدس الله سره العزیز بر زبان مبارک راند لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ بعده روی مبارک بر ایشان آورده فرمودند شما هم بگوئید بحکم فرمان همه موافقت نمودند لا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم بگفتند بعده تبسم کنان بطریق تعجب فرمودند که سبحان الله آن ملعون درین محل در مسئله توحید به چیزی میخواهد که به جنباند از فضل خدای تعالی چه التفات لا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم گفتن گرفت و حاضران را نیز فرمودند که شما هم گوئید بعد گفتن لا حول ولا قوة در ادعیه و وظائف مشغول شد تا چاشت فارغ شد بعده بعد زمانی زبان مبارک به تحمید خداوند بگشاد بلند آغاز کرد الحمد لله خدا کرم کرد المنة لله المنة لله چند کرت به خوشی دل و فرحت باطن بار بار همین اعادت می نمود و فرمود الحمد لله الحمد لله المنة لله المنة لله بعد ازان بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز از رواق در صحن رواق آمد تکیه فرمود بعد زمانی دست مبارک فراز کرده بطریق مصافحه دست قاضی شمس الدین دام تقواه بگرفت زمانی گرفته بود و گذاشت آغاز وداع هم از ایشان بود بعده دست قاضی زاهد دام الله ... دو دستی بگرفت بر سینه مبارک داشت و فرمود ما هم انیم ما هم انیم باز فرمود ما جهان دیوانگانیم ما جهان دیوانگانیم باز در مقام تواضع نزول فرمود بر لفظ مبارک راند ما بکه خاک کفش دیوانگانیم بعده هر یکی را اشارت بالغا ما بلغ ارزانی فرمود دست و ریش هر یک به بوسید و امیدوار رحمت پروردگار عز و جل و مغفرت او گردانید و این آیت بلند برخواند لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ

الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا این بیت بزبان مبارک شکرافشان بارزانی داشت بیت

خدایا رحمتت دریاے عام است	ازانجا قطرۂ بر ما تمام است

بعده روے مبارک بسوے حاضران آورده فرمود که اگر فردا شمارا بپرسند که چه آورده اید بگوئید لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ آورده ایم و فرمود قدس الله سره العزیز اگر مرا خواهند پرسید من همین خواهم گفت بعده کلمۂ شهادت بلند گفتن گرفت اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ و این دعا نیز خواند رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيًّا وَّبِالْقُرْاٰنِ اِمَامًا وَّبِالْكَعْبَةِ قِبْلَةً وَّبِالْمُؤْمِنِيْنَ اِخْوَانًا وَّبِالْجَنَّةِ ثَوَابًا وَّبِالنَّارِ عَذَابًا ۔ بعده قدس الله سره العزیز روے مبارک به جانب مولنا تقی الدین و الملة و دهی دام تقواه آورده دست مبارک فراز کرده گرفت و فرمود [illegible] بخیر باد و کرم و رحمت بسیار ارزانی داشت بعده بر زبان مبارک رفت امون مولانا امون نزدیک در درونی رواق بود شنید لبیک گویان دویده پیش آمد و شرف پابوس مشرف گشت دست او بگرفت و بر روے و بر سینه مبارک مالیدن گرفت و فرمود بسیار محنت کردی ترا نخواهم گذاشت خاطر جمع دار یکجا خواهیم بود و اگر روز خواست بپرسند که چه آورده گوئی لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اگر مرا خواهند پرسید من هم همین خواهم گفت و یاران را بگوے که خاطر جمع دارند اگر مرا آبرو خواهد بود من هیچ کس را نخواهم گذاشت بعده روے مبارک بهلال و عقیق آورده فرمود قدس سره العزیز تو مرا بسیار خوش داشتۂ بسیار خدمت کردۂ چنانچه من از تو خوش بوده ام تو هم خوش خواهی بود و خوش خواهی ماند دست کرت دست مبارک بر پشت هلال نهاده آورده باز فرمود بامراد خواهی ماند و هر دو قدم مبارک در کنار هلال بود که این شفقت و رحمت بجا ارزانی فرموده بعده مولنا

شهاب الدین ناگوری دام تقواه بیامد چندگاه بعد بوسه میداد بر رخساره و ریش و دست او بوسه
داد چنانکه روی مبارک و لب مبارک قدس الله سره العزیز بر وی میسود بر سینه و کله او
کنان الحمد لله الحمد لله گویان دست مبارک بر وی زده آورده و بر وی میفرستاد و مولانا
شهاب الدین جمال مخدوم با کمال نظر میکرد و دورود میفرمود بعده مولانا شهاب الدین دام تقواه
خواهرزاده مینا را فرمود قدس الله سره العزیز تو مرا بسیار خدمت کرده با من بسیار موافقت
نموده و بحسن خلقی که با من داشتی ملازمت بجا کرده عاقبت بخیر باد همدرین محل مولانا شهاب الدین
خدمت مولانا مظفر بلخی آبادی و مولانا نصیر الدین جونپوری دام تقواهما را یاد دهانیدند و عرضداشتند
که حضرت مخدوم صاحب مولانا مظفر و مولانا نصیر الدین چه فرمان میشود بندگی مخدوم قدس الله
سره العزیز با خوشی تمام بر لفظ مبارک راندند تبسم کنان فرمودند باشارت جمیع انگشتان بجانب
سینه مبارک خود که مظفر جان من است و جانان من است و مولانا نصیر الدین هم همچنین فرمود
آنچه خلافت و مقتدای را میباید در ایشان موجود است آنکه گفتم آن مسکینان را از فتنه خلق
باز داشتم درین محل مولانا شهاب الدین بعد لفظ مذکور آمده بشرف پابوس مشرف گردانید
و عرضداشت خدمت مخدوم این را قبول فرمایند فرمود قدس الله سره العزیز قبول کردم این
چه باشد من خانه تو تمام قبول کردم بعده برادر حقیقی ارزانی داشت و بالتماس تجدید بیعت نمود که مخدوم تجدید
بیعت این بنده مشرف گردانند بر لفظ مبارک فرمود من هم تجدید قبول کردم بعده قاضی مینا دام علمه
بیامد پایهای مبارک بوسید ملال تعریف داد که قاضی مینا است فرمود قدس الله سره العزیز
قاضی مینا قاضی لبیک عرضداشت و بر کف دست مبارک بوسه داد و بندگی مخدوم عالم
قدس الله سره العزیز دست مبارک بر روی و ریش و رخساره او فرود می آورد و میفرمود خدای
بر تو رحمت کند و بر زبان مبارک ارزانی میداشت که با ایمان باشی و با ایمان بروی و این شفقت
هم ارزانی فرمود که مینا از آن من بود و مولانا ابراهیم دام تقواه آمد بشرف پایبوس مشرف شد
دست راست بر ریش مولانا ابراهیم فرود آورده فرمود که خدمت مرا نیکو کرده و موافقت تمام

نموده با آبرو خواهی بود مولانا ابراهیم عرضداشت که مخدوم صحّح البیاض از من خوشنود هستند فرمود ما از همه
خوشنود هستیم بایدکه شما از ما خوشنود باشید هرچه هست از جانب من است بعده قاضی نورالدین برادر قاضی
شمس الدین نور الله قلبهما بنور العلم والادب بیآمد و بسعادت دست بوس و قدم بوس مشرف شد بندگی مخدوم
جهان قدس الله سره العزیز دست قاضی نورالدین بگرفت و بشفقت تمام بر ریش و روے و رخساره و دست
آه آه کنان چندکرت بوسه داد چنانکه روی مبارک سلطان العارفین بر روے و رخساره قاضی نورالدین رسید
فرمود تو در صحبت من بسیار بودۀ و خدمت بسیار کردۀ من از تو خوشنودم ان شاء الله تعالی فردا
یکجا خواهم بود بعده مولانا نظام الدین دهی کوهی بقدمبوس مشرف شد فرمود قدس الله سره العزیز
بیچاره از آنجاکه قصد کرده بود و بجا را آمده بود و طاقیه از سر مبارک کشیده بود و داد و انعام کرد و دعا
عاقبت در باب او در کار داشت و فرمود حق تعالی ترا به مقصود رساند و همه غریبان را معذرت کرد
و فرمود یاران را برید غم ایمان و دین خود بخورید و مشغول بدان شوید بعده بیچاره یعنی زین بدر عربی
سر بر زمین نهاد ترسان و لرزان نیت تجدید بیعت و توبه از گناه نمود دست مبارک سلطان العارفین
قدس الله سره العزیز بگرفت بوسید و بر چشم و سر و مردمک دیده فرود آورد و فرمان شد کیست این
عرضداشت که بیچاره سگ گرگین آستانه علیا توبه میکند و خواستم که عرضداشت کنم بندگی مخدوم
قدس الله سره العزیز به تجدید قبول فرمایند از آنجاکه نور باطن همه وقت در اشراق است بر حکم
اشراق دریافت بر فور بر زبان مبارک ارزانی داشت برو ترا قبول کردم و خانه ترا تمام قبول کردم
و خیلخانه تو تمام بر من بسته اند همه را قبول کرده ام خاطر جمع دار اگر ترا آبروے خواهد بود من هیچکس
را نگذاشتنی نام بیچاره عرضداشت که مخدوم بندگان مخدوم را آبرو است فرمود امید ما است
قدس الله سره العزیز قاضی شمس الدین دام تقواه بیامد بپهلوی بندگی حضرت مخدوم قدس الله سره
العزیز بنشست مولانا شهاب الدین و بلال عقیق عرضداشت مخدوم در باب قاضی شمس الدین
چه فرمان میشود فرمود قدس الله سره العزیز قاضی شمس الدین را چه خواهم فرمود
و قاضی شمس الدین فرزند من است چندین جاے فرزند نبشته ام در مکتوب
برادر من نوشته ام و بسبب اظهار علم و درویشی آزاد شده است و بواسطه او چندین گفتن و نوشتن

پیش آمده است و گریستن گرفت بعده خدمت شیخ جلیل الملة والدین برادر خادم خاص داعی الله در
پهلوے مخدوم قدس الله سره العزیز نشسته بود دست مبارک مخدوم گرفته دست مبارک بجانب
شیخ جلیل الملة والدین دراز کرد فرمود جلیل خاطر جمع دار تا علاء الدین ایشان نخواهند گذاشت ملک نظام
الدولة والدین خواجه ملک خواجها آمد سلام و دعا از من برسانی و معذرت بسیار کنی و بگوے
که من از تو خوشنودم و خوشنود میروم و تو هم خوش خواهی بود و فرمود که تا ملک نظام الدین
نخواهد گذاشت شیخ جلیل الملة والدین به شکستگی تمام از آنجا که بعد برادری است بوقت دیدار پیش آب در دیده کردن گرفت
مخدوم قدس الله سره العزیز چون شکستگی دل ایشان معاینه کرد بشفقت تمام فرمود که خاطر جمع
دار دل قوی دار بعده فرمود قدس الله سره العزیز کیست هلال عرضداشت که مولانا محمود صوفی است
بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز بر طریق تاسف بلیغ بر زبان مبارک ارزانی داشت بیچاره
غریب است عزم از زمین می آید بیچاره کس ندارد و بعده دعاء عاقبت بخیر او کرد داشت بعد از آن قاضی خان
خلیل بشرف پاے بوس مشرف شد فرمود بیچاره قاضی خان یار قدیم است بسیار در صحبت من
بود حق تعالی ثواب بدهد و عاقبت بخیر گرداند فرزندان او هم دوستان من اند عاقبت بخیر باد و از
دوزخ حق تعالی خلاص دهد بعده خدمت خواجه معز الدین آمد و قدم بوس کرد عرض داشت فرمود
عاقبت بخیر باد و بعده مولانا فضل الله آمد و پاے مبارک مخدوم قدس الله سره العزیز بوسه داد
فرمود بهله بهله خداے تعالی عاقبت بخیر کناد بعده فتح سلطنی خاص عتیق خدمت مخدوم قدس
الله سره العزیز بطور ضجه گریه کنان آمده پاے مبارک افتاد فرمود بیچاره فتوحا بود چنانکه بود
از آن من باد و دعاے عاقبت صواب او در حمت فرمود بعده مولانا شهاب الدین زرین بشرف
پابوس مشرف شد هلال تعریف داد مولانا شهاب الدین برادر حاجی رکن الدین است فرمود عاقبت
بخیر باد بر لفظ مبارک ارزانی داشت عزم ایمان بتجدید داسید دار رحمت حق گردانیده برخواند
لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا بعد از زمانے نزدیک نماز
پیشین خدمت سید نصیر الدین با پسر عم و ام سیادت که بشرف ملاقات مشرف شد خدمت حضرت

مخدوم قدس الله سره العزیز سید ظهیر الدین را کنار گرفت بلطف و شفقت تمام فرمود سید تو نیکه سگفتستم
عاقبت این عاقبت است و در مقام تواضع نزول فرمود دعا باز سه کرت در کنار گرفت و آخر این آیت
برخواند لا تقنطوا من رحمة الله ان الله یغفر الذنوب جمیعا و حاضران را امیدوار
رحمت و مغفرت خداوند گردانید بعده سید ظهیر الدین را اجازت فرمود و از پیش برخاست هم در رواق
درونی بنشست بعده سلطان شهر پرگنه دار راجگیر با پسر بشرف پابوس مشرف گشت روغن باد
شکن در آن محل آورده بود بزبان مبارک فرمود که مولانا نظام الدین هم آورده اند بعده شربت
تنبول رسانید و معذرت کرد و بعده منور برادر خلیل گفت بشرف توبه و بیعت میخواهد که مشرف شود
فرمان شد بیا که دست مبارک بجانب او فراز کرد و قرین توبه و بیعت مشرف گردانید مقراض راند و طاقیه
پوشانید و فرمود برو دوگانه بگذار بعده پسر او را بیعت کرد و کلاه پوشانید گفت برو دوگانه بگذار بیعت
توبه هم بر ایشان ختم بود بعده قاضی عالم احمد مفتی برادر مولانا نظام الدین مفتی که یکی از مریدان
خاص است دام علمه و حکمته بشرف پای بوس مشرف شد و بزانوی ادب مقابل روی مبارک
مخدوم جهان قدس الله سره العزیز بنشست هم در آن محل امیر شهاب الدین برادر ملک حسام الدین
با پسر بیامد بشرف قدم بوس مشرف شد و بنشست و نظر مبارک مخدوم قدس الله سره العزیز بر پسر او
افتاده فرمود پنج آیت خواهی خواند حاضران مجلس علیا عرضداشتند که خورد است بعده پسر سید
ظهیر الدین مفتی حاضر بود هلال چون رغبت استماع کلام ربانی از جانب مخدوم قدس الله سره العزیز دید پسر
ظهیر الدین را طلب کرد برای پنج آیت خواندن خدمت ظهیر الدین هم چون رغبت معاینه کرد پسر را اشارت
کرد برو پنج آیت پیش مخدوم جهان پسر سید ظهیر الدین پیش رفت و باادب بنشست و این آیت معظم
خواندن در گرفت که محمد رسول الله والذین معه خدمت مخدوم قدس الله سره العزیز تکیه
فرموده بود برخاست و باادب زانو بر طریق قدیم بحضور تمام استماع کردن گرفت چون در این محل
در تلاوت رسید که سیماهم فی وجوههم من اثر السجود بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز درین
محل رسید لیغیظ بهم الکفار دهشت خورده ماند بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز بر زبان

مبارک تلقین کرد و یاد دهانید بعده چون این آیت تمام خواندند فرمود او اخو بیا میکند ولی در بهشت میخورد
بعده درین محل ذکر درویش مغربی کرد که او القرآن خواندن گاهی خوش آمدی وگاهی شنیدی و وقت
از وقت شنیدی و وقت از وقت نشنیدی بعده قاضی عالم الشریعت و تقبیل دادن قرآن
و معذرت کرد و پیراهن از وجود مبارک کشیدن گرفت و برای وضو آب طلبید و آستین مبارک
گردآورد و مسواک نیز طلبید و تسمیه بلند برخواندند و وضو آغاز کردند و ادعیه در هر محلی میخوانند و هر وقت دست
شست تا آرنج و در شستن روی مبارک سهو افتاد و خدمت جلیل الملة والدین علم جلالته یاد داد
که بندگی مخدوم روی مبارک نشسته اند بعده بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز وضو کرد
از سر نوع اعادت نمود و تسمیه و ادعیه چنانکه آمده است در هر محلی میخواند با احتیاط اتمام چنانکه
سید ظهیر الدین و المله مفتی و حاضران مجلس معاینه میکردند و متعجب میشدند و هر یکی میگفت
که در این چنین حالت این احتیاط قاضی زاهد دامن بره و درع قصد در شستن پای مبارک
دست دراز کرد و خواست که یاری نماید مخدوم قدس الله سره العزیز دست قاضی زاهد باز داشت
و فرمود بایستید بعده هم از خود وضو تمام کرد و بعد از تمام وضو شانه طلب کرد و در محاسن مبارک
شانه کشید بعده مصلا طلبید نماز شروع کرد و بعد دو رکعت سلام داد و بعد زمانی جهت سستی
قالب مبارک استراحت فرمود بعده شیخ جلیل الملة والدین عرضداشت که مخدوم سلامت
در رواق شوند که وقت سرد شده است بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز برخاست کفش در پای مبارک
کرد و روان شد یک دست مبارک خود بر گردن مولانا زاهد و دوم دست مبارک بر گردن مولانا شهاب الدین
به سلامت در درون رواق شد و هم بدین بالای نطع چرم شیر آسایش فرمود بعده
برادر خلیل بزرگ است بشرف نیت بیعت توبه میخواهد که مشرف شود فرمان شد بیاید الغرض
بجانب او فراز کرده شرف توبه و بیعت مشرف گردانید و مقراض [illegible] هر دو جانب [illegible]
و فرمود بر [illegible] دوگانه بگذارد و بیعت و توبه بر ایشان ختم بود و بدین محل عورتی یاد و لیس بیم ولی
پای بوس حاصل کرد و باز گشت بعد از نماز دیگر نزدیک نماز شام یاران عرضداشتند که مخ

با دولت بالاے کهت شوند بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز بالاے کهت شدند و استراحت
میفرمودند بعد از گذاردن نماز شام شیخ جلیل الملة والدین و قاضی شمس الدین و مولانا شهاب الدین
و قاضی نور الدین و جلال عقیق و بعضے یاران دیگر و خدمت گاران که خدمت و ملازمت داشتند
گرد بگرد کهت مبارک نشسته بودند بندگی مخدوم قدس الله سره العزیز بعد از آن تسمیه بلند آغاز کرد
چند کرت تسمیه بارها عادت میفرمود بعد تسمیه این تسبیح میخواند لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ
مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ بعده بار بار بسم الله الرحمن الرحیم بآواز بلند گفته کلمه شهادت برخواند اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ بعده بر لفظ مبارک لَا حَوْلَ
وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ و کلمه شهادت نیز برین طریق بر زبان مبارک جاری میداشت
بسم الله الرحمن الرحیم لا اله الا الله محمد رسول الله چند کرت این کلمه بر زبان مبارک راند بعد گفتن
کلمه با حضور بلیغ و با قوت دل و با شتیاق تمام چند کرت همچنین بر زبان مبارک راند محمد محمد محمد و بعده
درود گفت اللهم صل علی محمد و علی آل محمد الی آخره و این آیت برخواند رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ
السَّمَآءِ تا آخر و این دعا نیز خواندن گرفت رَضِیْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ
عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَبِیًّا الی آخره بعده سه کرت کلمه طیبه بر زبان مبارک تمام ارزانی داشت لَا اِلٰهَ اِلَّا
اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بعده دست مبارک سوے آسمان دراز کرد با شوق تمام بر طریق مناجات
این دعا خواندن آغاز کرد اللهم اصلح امة محمد اللهم ارحم امة محمد اللهم اغفر امة محمد
اللهم تجاوز عن امة محمد اللهم اغث امة محمد اللهم انصر من نصر دین محمد اللهم فرج علی امة محمد
اللهم فرجا عاجلا اللهم اخذل من خذل دین محمد برحمتك یا ارحم الراحمین بعد
دعا امت محمد صلی الله علیه وسلم سخن مبارک ساکت شد این آیت مسموع میشد که بر زبان مبارک ارزانی
داشت لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پس لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پس بسم الله
الرحمن الرحیم گفت و جان بحق تسلیم کرد و از دار دنیا بدار عقبی رحلت فرمود و از حجاب بیرون آمد و بحضرت
دوست به پیوست بحکم اینکه اَلْمَوْتُ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ از سراے فانی بسراے باقی

ر رحمت حق نقل کرد برقضیه الا ان اولیاء الله لا یموتون بل ینقلون من دار الی دار
بحکم این آیت لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله امواتا بل احیاء عند ربهم یرزقون فرحین
بما آتاهم الله شب پنجشنبه ششم شوال سنه ۷۸۲ اثنی وثمانین وسبعمائة بوقت نماز
تن نقل سلطان العارفین بود روز پنجشنبه بوقت نماز چاشت تدفین برهان المحققین واقع شد
شد وفات نامه قدوة السالکین زبدة العارفین سراج الملة والدین پیر دستگیر حضرت مخدوم
شرف الحق والحقیقة والهدی والدین احمد بن یحیی منیری قدس الله سره العزیز

۲۷ ربیع الاول روز چهارشنبه ۱۳۲۱ھ

اخوان الصفا

دار المصنفین

دو یار زیرک و ، ار بادۂ کہن دومنی
فراغتی ، و کتابی ، وگوشۂ چمنی
من ایں مقام بدنیاؤ عاقبت نہ دہم
اگر چہ در پیم اُفتند حلق انجمنی !
(لسان الغیب)

ذیل میں شمس العلما مولانا شبلي . نعماني کي ایک تحریر درج کي جاتي ہے -

جو تجویز پیش کي گئي ہے وہ برسوں سے پیش نظر ہے - بارہا اس بارے میں مشورے ہوے اور نقش امید کے بہت سے خاکے بنائے گئے :

یک " کاشکے " بگو کہ بصد جا نوشتہ ایم !!

مولانا کا خیال تھا کہ دار العلوم ندوہ کے ساتھ ایک مخصوص عمارت اُن مہاجرین علم کی بھی ہوگی جو علم و پرستاری علم کی خاطر اپنے تئیں علم زندگی سے الگ کر لینگے - اور اسکا انتظام کچھ مشکل نہ تھا - لیکن اب تو خود دار العلوم ندوہ ھی کا قیام مشکل ہو گیا ہے :

او خویشتن گم ست کرا رہبری کند ؟

فی الحقیقت یہ ایک نہایت ھی اہم تجویز ہے جو اگر پوری ہوگئی تو موجودہ سنین عمل کا ایک عظیم الشان کام ہوگا - یہ بڑی ھی غم کرنے کی بات ہے کہ ہم میں بہت سے کثیر المصارف کام ہو رہے ہیں اور بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کر دی گئی ہیں ' مگر ابتک تمام قوم ایک چھوٹا سا جھونپڑا بھی ایسا نہ بنا سکی جو علم اور مشاغل علمیہ کیلیے مخصوص ہو اور جہاں عشاق علم و شیفتگان فن جمع ہوکر شب و روز تحقیق و مطالعہ اور تصنیف و تالیف پر مشغول رہتے ہوں :

فراغتی و کتابی و گوشۂ چمنی !

بڑی مصیبت یہ ہے کہ جسقدر قابلیتیں موجود ہیں ' فقدان اسباب و صحبت کی وجہ سے ضائع جارھی ہیں ' اور نئی قابلیت پیدا نہیں ہوتی - علم کیلیے پہلی چیز صحبت و اجتماع ہے -

چوتھی صدی ھجری میں متوکل عباسی کی بد مذاقی اور تشدد و تعصب نے علماے بغداد کو ترک وطن پر مجبور کیا - مورخین نے اس عہد کو " ھجرت علم " کے لقب سے یاد کیا ہے کہ مشرق سے تمام اھل علم مغرب (اندلس و افریقہ) کی طرف چلے گئے - اسی زمانے میں بعض علما و حکما کی ایک خفیہ مجلس اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ علوم حکمیہ و الہیہ میں ایسے رسائل مدون کر دیے جائیں ' جنکی وجہ سے وہ علوم محفوظ

رهیں - "اخوان الصفا" اس مجلس کا نام تها ' اور اسکے رسالے موجود هیں -

آج بهي ضرورت هے که ایک مجلس "اخوان الصفا" قائم هو - همارے سرزمین سے علم هجرت کرچکا هے - اب دوبارہ اُسے دعوۃ دیکر بلانا چاهیے :

هزار بار برو صد هزار بار بیا !

پچهلے دنوں کسي ایسي صحبت کا خیال هوا تها اور اسي لیے "اخوان الصفا" لکهوا کر اسکا بلاک بهي بنا لیا تها - جناب مولانا کي تجویز اسي کے ذیل میں شائع کر دیتا هوں - اگر قابل اطمینان صورت اختیار کرلے تو میں اپنا پرائیوٹ کتب خانہ جسمیں تقریباً اکثر علوم اسلامیہ و عربیه کا ذخیرہ هے اور جسکی قیمت سات آٹهہ هزار روپیه سے کسي طرح کم نهوگي ' دار المصنفین کیلیے وقف کر دینے کیلیے طیار هوں -

تقریباً هر ماہ اسمیں کتابوں کا اضافه هوتا رهتا هے -

پانچ سو روپیه کا ایک نیا ذخیرہ مطبوعات یورپ کا عنقریب پہنچنے والا هے - اس طرح ممکن هے که پیشکش کے وقت اُسکي حیثیت موجودہ حالت سے المضاعف هو -

افسوس کے نقد اعانة سے مجبور هوں ورنه مولانا کا اتباع کرتا -

ایک اهم تجویز

خدا کا شکر هے که ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پهیلتا جاتا هے اور قابل قدر ارباب قلم پیدا هوتے جاتے هیں ' لیکن با ایں همه اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کي هے جنکو مصنف کے بجاے مضمون نگار یا انشا پرداز کہنا زیادہ موزوں هوگا ' کیونکه ان کي مستقل تصنیفیں نہیں هیں ' بلکه معمولي رسالے یا مضامین هیں -

اسکي وجه یه نہیں هے کہ ان کو اعلیٰ درجه کي تصنیف کي قابلیت نہیں، بلکه اصل وجه یه هے که اعلیٰ درجه کي تصنیف کے لیے جو سامان درکار هے وه مہیا نہیں هے - ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں ، جو انتخاب اور استنباط و اقتباس کے کام آسے - اتفاق سے اگر کوئي مقامي کتب خانه موجود هے تو دل جمعي کے اسباب نہیں که اطمینان سے چند روز وهاں رهکر کتابوں کا مطالعه اور اس سے استفاده اور نقل وانتخاب کرسکیں - ان باتوں کے ساتھه کوئي علمي مجمع بھي نہیں که ایک دوسرے سے مشوره اور مبادله خیالات هوسکے -

ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کي ترقي کے لیے ضرور هے که ایک وسیع دار التصنیف اصول ذیل کے موافق قایم کیا جاسے :

(۱) ایک عمده عمارت " دار التصنیف " کے نام سے قایم کي جاسے جسمیں ایک وسیع هال کتبخانه کے لیے هو اور جسکے حوالي میں ان لوگوں کے قیام کے لیے کمرے هوں جو یہاں ره کر کتابخانه سے فائده اٹھانا اور تصنیف و تالیف میں مشغول رهنا چاهتے هوں -

(۲) یه کمرے خوبصورت اور خوش وضع هوں ، اور اُن مشہور مصنفین کے نام سے موسوم هوں جو تصنیف کي کسي خاص شاخ کي موجد اور باني فن هیں -

(۳) ایک عمده کتب خانه فراهم کیا جاسے جس میں کثرت تعداد هي پر نظر نہو بلکه یه امر بھي ملحوظ رهے که جس فن کي کتاب هو، نادر اور کامیاب هو -

(۴) تصنیفي وظایف قائم کیسے جائیں اور وظیفه عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جاسے ، یه وظایف یا ماهوار هونگے یا کسي تصنیف و تالیف کے صله کے طور پر دیے جائینگے -

(۵) جو لوگ کم ازکم پانسو روپیه یکمشت عطا فرمائینگے ان کے نام اس عمارت پر کنده کیسے جائینگے - میں یه تجویز بالکل ایک سرسري صورت میں پیش کرتا هوں ، اور چاهتا هوں که سررشته

محض ایک خاکہ کے طور پر اسکی بنیاد قائم ہو جاے جو رفتہ رفتہ خود بخود وسعت حاصل کرتی جائیگی - اس بات کا مجھکو اطمینان ہے کہ ریاست ہائے اسلامی سے اس کے لیے ماہواریں مقرر ہوسکینگی - سردست ہم کو صرف دس ہزار روپیہ درکار ہے جس سے ایک مختصر تعمیر کی بنیاد ڈال دی جاے - اصلی فنڈ کیلیے پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ کیا گیا ہے -

(۹) دس ہزار کی رقم میں ، میں سردست ایک ہزار روپیہ اپنا پیش کرتا ہوں - اور میں اسبات کا بھی مستدعی ہوں کہ جن بزرگوں کو میری تجویز سے دلچسپی ہو مجھہ سے خط و کتابت فرمائیں ، اور مناسب مشورہ سے میری ہمت افزائی کریں - نیز ایڈیٹران ہمدرد ، وطن ، پیسہ اخبار ، مشرق ، البشیر ، وکیل ، وغیرہ سے درخواست ہے کہ اس تجویز کو اپنے اخباروں میں شائع فرمادیں -

(شبلی نعمانی - لکھنؤ)

الهلال

۱۰ - جمادی الآخر ۱۳۳۲ ھ

اسئلة واجوبتها

بعض احادیث مشہورہ

موضوعات کی اشاعت

احادیث مندرجہ احیاء العلوم

حضرت مولانا - السلام علیکم - چند احادیث کی صحت و عدم صحت کے متعلق بعض علما سے دریافت کیا لیکن مختلف اور متضاد باتیں کہی گئیں - یعنی اکثر نے تو صحیح کہا اور بعض نے ضعیف - یہ حدیثیں حضرۃ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء العلوم میں میں نے پڑھی ہیں' اور اکثر واعظان دین نے بھی بیان کیا ہے - اب جناب سے ملتمس ہوں کہ انکی نسبت محققانہ جواب مرحمت ہو - کیونکہ بعض علما فرماتے ہیں کہ بڑی بڑی مشہور کتابوں میں یہ حدیثیں موجود ہیں جو تمہاری نظر سے نہیں گذریں - آپ جو کچھہ فرمائینگے اس پر سب سے زیادہ مجھے اعتماد ہے - (اسکے بعد وہ احادیث نقل کی ہیں اور بعض کا صرف مطلب لکھدیا ہے - چونکہ جواب میں وہ سب آجائینگی اسلیے یہاں مکرر نقل نہیں کی گئیں - الہلال)

خاکسار محمد علی پیش امام و خطیب - از بہاؤ نگر

الهلال:

احادیث کی صحت و عدم صحت کا معاملہ بہت نازک اور محتاج علم و نظر ہے - جب تک اس فن عظیم و مقدس سے واقفیت نہو، اور تمام علوم متعلقۂ حدیث پر نظر نہو، نیز تمام کتب معتبرۂ قوم و طبقات محدثین و رواۃ پیش نظر، تصریحات ائمۂ فن و طرائق تخریج و نقد و درایت کی پوری پوری من الباب الی المحراب خبر نہو، اس وقت تک کچھہ پتہ نہیں چلتا - محض چند کتب حدیث کا سامنے رکھہ لینا اس بارے مفید نہیں -

آجکل بڑی مصیبت یہ ہے کہ علم و جہل میں کچھہ تمیز نہیں رہی - ہر واعظ محدث اور ہر خواندہ زبان محقق ہے - نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں اس کثرت سے موضوع و بے اصل حدیثیں مشہور ہو گئی ہیں کہ اگر ان سب کو جمع کیا جاے تو ایک نئی کتاب الموضوعات لکھنی پڑے - یہ ایک بڑی آفت ہے اور قوم کی ضلالت دینی کا بہت بڑا سبب قوی - پھر اس سے بھی بڑھکر آفت یہ ہے کہ ہر عربی کا جملہ جو کسی واعظ کی زبان سے نکل جاے اور اس نے کتب مواعظ و قصص میں پڑھہ لیا ہو، بدرجۂ اسم الحدیث اور کالوحی و القرآن سمجھا جاتا ہے، اور انکو بے اصل کہیے تو لوگ جنگ و جدل کیلیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں !

(قصاص و واعظین)

یہ قصاص و وعاظ کئی صدیوں سے مسلمانوں کیلیے سب سے بڑی مصیبت ہیں اور موجودہ عصر جہل نے اس مصیبت کو اور زیادہ عام و شدید کر دیا ہے - نہ تو آلودہ قرآن کی خبر ہے نہ

حدیث و آثار کی - نہ کتابیں پڑھی ہیں اور نہ علم و فن کی صورت دیکھی ہے - صرف چند قصے اور اشعار یاد کرلیے ہیں جو یا تو اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں یا کسی وعظ کی کتاب میں دیکھ لیے ہیں!

وعظ کی اصلی قوت دماغ کی جگہ انکے گلے میں ہوتی ہے. ایک مطرب و مغنی کی طرح گانا شروع کر دیتے ہیں، اور پھر عربی کا ہر غلط سلط جملہ جو انکی زبان سے نکل سکتا ہے، بے تکلف اور بے خوف "حدیث" کے لقب سے بیان کردیا جاتا ہے. غریب سننے والے جو موسیقی کے قدرتی تاثر سے پہلے ہی مرعوب ہوچکے ہیں، شوق اور عقیدت سے سنتے ہیں، اور انکی تمام خرافات کو حدیث رسول یقین کر لیتے ہیں! نعوذ باللہ من شر الجہل و الفساد!

آج اصلی مصیبت یہی ہے کہ قران و حدیث ہی، اسلامی تعلیم کا اصلی سر چشمہ ہیں مگر انکی صحیح و حقیقی معلومات حاصل کرنے کا عوام بیچاروں کے پاس کوئی وسیلہ نہیں - واعظین جاہلین اور قصاص دجالین نے ہر طرف سے انکا محاصرہ کر لیا ہے - علماء حق اول تو قلیل ہیں، پھر جتنے بھی ہیں، اصلاح عوام کی اصلی تدابیر سے بے پروا:

کار از دوا گذشتہ و افسوں نکردہ کس!

(احادیث احیاء)

آپنے حضرۃ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی احیاء علوم الدین کا ذکر کیا ہے، اور اُن احادیث کی نسبت خاص طور پر پوچھا ہے جو بکثرت اسمیں درج کی گئی ہیں - احیاء العلوم ایک ایسی کتاب جلیل و عظیم ہے کہ اگر تاریخ اسلام کی تمام تصنیفات سے صرف اعلی ترین کتابوں کی ایک چھوٹی سی منتخب فہرست بنائی جاے، تو بلا شبہ احیاء العلوم ان سب میں ایک خاص ممتاز کتاب ہوگی -

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر عالم و مصنف کی حیثیت

کا ایک خاص دائرہ ہوتا ہے اور اس سے باہر اسکی وہ حیثیت
نہیں رہتی - امام مالک محدث تھے اور فقیہ ' لیکن مورخ نہ
س تاریخ میں انکا قول بمقابلہ مورخ کے ارجح نہوگا - اسی
ابن خلدون بہت بڑا مورخ ہے' لیکن اگر حدیث و فقہ میں
سند دی جاے تو اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کریگا'
لدون نے مقدمہ میں لکھدیا ہے کہ حضرة امام ابو حنیفہ کو
سترہ حدیثیں معلوم تھیں مگر آپ اسے تسلیم نہیں کرسکتے'
اپنی بحث و نظر کیلیے ایک خاص جماعت رکھتا ہے اور
خاص خاص اصول ہیں - فن تاریخ کی بحث ہو تو مورخین
سند لائیے - ادب کے مسائل ہوں تو ائمۂ ادب کی طرف رجوع
یے - یہ نہ کیجیے کہ بحث تو فقہ کی ہو' لیکن معتبر سمجھیں
سائی اور سیبویہ کو کیونکہ وہ فن نحو میں امام تھے ا اکثر لوگ
نکتے کو بھول جاتے ہیں اور سخت ٹھوکر کھاتے ہیں -
حضرة امام غزالی فلسفۂ و کلام کے ماہر' منقول و معقول میں
ق دینے والے' تصرف و سلوک کے سب سے بڑے اور سب سے
معبر و ترجمان' اور علم اسرار الدین کے بہترین ذخیرہ کے جامع
' مگر محدث نہیں ہیں - محدثین و ارباب نقد نے صاف صاف
ہے کہ احیاء العلوم میں اکثر حدیثیں ضعیف' اور بہت زیادہ
صل و سند ہیں - اسی لیے شارحین احیاء نے ان احادیث کی
ع میں بڑی محنت اٹھائی' اور صحیح کو ضعیف سے اور
ث کو غیر حدیث سے الگ کرنا چاہا - علامۂ ابن تیمیہ کا یہ
احیاء کی نسبت مشہور ہے :

فی الاحیاء غالبه جید
فیه اربع مواد فاسدة :
فلسفیه و مادة کلامیه
ات الصوفیه و الاحادیث
الموضوعة -

امام غزالی کا اکثر بیان احیاء العلوم
میں عمدہ اور معتبر ہے الا چار
باتیں جو بطور مواد فاسد کے
اسمیں شامل ہوگئی ہیں :
فلسفیانہ مطالب' کلامیہ انداز'
صوفیہ' اور موضوع حدیثیں -

علامۂ موصوف کو مسلمان فلسفیوں اور متکلموں کے گروہ سے سخت نفرت تھی، اور انکی غیرت شریعت بعض متصوفوں کے ترہات و شطحیات کی سماعت کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اسلیے انھوں نے ابتدائی تین چیزوں کو بھی احیاء کا مواد فاسد قرار دیا، مگر درحقیقت یہ ذرا سے زیادتی سے خالی نہیں - البتہ آخری چیز یقیناً قابل ذکر ہے، یعنی نقل احادیث میں بے احتیاطی - حضرت امام ہی پر موقوف نہیں - عموماً صوفیاء کرام نے نقل احادیث میں بڑی بد احتیاطیاں کی ہیں، اور یہی سبب ہے کہ انکے مخالفین کو تشدد و تعصب کا زیادہ موقع ملگیا ہے، اور حق یہ ہے کہ محدثین کرام اپنے اس تشدد میں حق بجانب ہیں -

(کتب موضوعات)

پس آپ احیاء العلوم وغیرہ پر اس بارے میں اعتماد نہ کریں، اور اولاً بعض کتب موضوعات ضرور پیش نظر رکھہ لیں - حضرۃ شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں طبقات حدیث و محدثین پر جو کچھہ لکھا ہے بہت نافع ہے - محدث ابن جوزی، حافظ سیوطی، ملا علی قاری، اور امام شوکانی کی کتب موضوعات چھپ گئی ہیں، اور ان میں عام زبانوں پر چڑھی ہوئی حدیثوں کا تذکرہ آگیا ہے - صاحب سفر السعادۃ کے تشدد کی اس بارے میں شکایت کی جاتی ہے مگر حقیقت اسکے خلاف ہے - شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی شرح سفر السعادۃ منگوا لیجیے - مع رد کے اسکا خاتمہ نظر سے گذر جائیگا اور فائدہ بخشے گا - شیخ عبد الرحمن ابن علی شیبانی کی " التمیز فی ما یدور علی السنۃ الناس من الحدیث " بھی چھپ گئی ہے، اور اسمیں تمام مشہور حدیثوں کی کامل طریقہ پر تخریج کی گئی ہے - علامۂ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصنیفات میں بھی اسکا مواد بہت ہے - علی الخصوص مجمع الفتاوی اور مجموعۂ رسائل جلد اول و دوم میں جو حال میں مصر میں چھپ گئے ہیں -

امام شوکانی کی موضوعات میں قدما کی تمام کتابوں کو

انہیں وامثال کے ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی ہے - اگر اسے
آپ دیکھ لیں تو علم و مشہور احادیث کے متعلق بھی بصیرت
حاصل ہو جائیگی -

(احادیث مسئولہ عنہا)

اب میں فرداً فرداً آپکی تحقیق کردہ احادیث کی نسبت
عرض کرتا ہوں :

(۱) حب الدنیا راس کل خطیئة - یعنی دنیا کی محبت
تمام خطاؤں کی جڑ ہے -

بیہقی نے شعب الایمان میں حسن بصری سے روایت کی ہے -
ابو نعیم حلیۃ الاولیاء میں اسے حضرت عیسی کا قول کہتے ہیں
(دیکھو حلیہ ترجمۂ ابو سفیان) مالک ابن دینار کی طرف بھی
منسوب ہے - علامۂ ابن تیمیہ نے اسے جندب البجلی کا قول کہا ہے -
بہر حال یہ جملہ معناً تو بالکل صحیح ہے ' مگر لفظاً حدیث
نہیں ہے -

(۲) ما وسعني ارضي و لا سمائي و لكن وسعني قلب عبدي
المومن - یعنی خدا کہتا ہے کہ نہ تو مجھے زمین اٹھا سکی نہ
آسمان ' مگر میرے مومن بندے کے دل میں میں سما گیا :

در دلِ مومن بگنجم اے عجب
گر مرا جوئی درآں دلہا طلب

معناً یہ جملہ بہت صحیح اور قرآن کریم کی اس آیت کا بیان
ہے : انا عرضنا الامانة على السموت و الارض و الجبال فابين ان
يحملنها و اشفقن منها و حملها الانسان - لیکن حدیث نہیں ہے - کسی
کا قول ہے - محدثین نے تو اسے اسرائیلیات میں سے شمار کیا ہے -

(۳) " گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھانے کی ممانعت "
غالباً آپ کا مقصود اس حدیث سے ہوگا : لا تقطعوا اللحم بالسكين
فان ذلك من صنيع الاعاجم - یعنی گوشت کو چھری سے کاٹ کر
نہ کھاؤ کیونکہ یہ عجمیوں کی ایجاد ہے -

بیہقی نے شعب الایمان میں اسے روایت کیا ہے - ابو داؤد نے مسلن میں ، لیکن امام شوکانی لکھتے ہیں :

قال احمد : لیس بصحیح و قد کان النبی یحتز من لحم الشاۃ

امام احمد کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ آنحضرا کا بکری کے گوشت کاٹنا ثابت ہے -

پھر اس کی روایت میں ابو معشر ہے اور امام احمد کہتے ہیں کہ " لیس بشي " وہ کوئی چیز نہیں -

(۴) العلم علمان . علم الابدان و علم الادیان - علم دو ہیں : ایک وہ علم جس سے بدن انسانی کا تعلق ہے یعنی فن طب اور ایک وہ جو شریعتوں اور دینوں کا علم ہے -

اسکی بھی کوئی اصلیت نہیں - ضعیف سے ضعیف سند سے بھی کسی نے روایت نہیں کیا - تعجب ہے کہ کیونکر یہ جملہ حدیث مشہور ہوگیا ؟

(۵) " رجب خدا کا مہینہ ہے اور شعبان پیغمبر کا اور رمضان میری امت کا "

فضائل ایام و شہور میں موضوعات کا بڑا ذخیرہ ہے - غالباً اُنکا مقصد اس حدیث سے ہوگا : رجب شھر اللہ و شعبان شھری و رمضان شھر امتی . فمن صام فی رجب یومین فلہ من الاجر ضعفان الخ -

لیکن محققین و ثقات فن نے اسے موضوع قرار دیا ہے - اسکے اسناد میں ابوبکر ابن الحسن النقاش ہے جو متہم ہے - اور کسائی نامی بھی ایک راوی ہے جو مجہول ہے -

(صلـــوٰۃ التسبیـــح)

(۶) " صلوٰۃ التسبیح اور اسکے فضائل "

" صلوٰۃ التسبیح " سے مقصود ایک خاص نماز نفل ہے جو چار رکعات میں ختم ہوتی ہے - ہر رکعت میں فاتحہ اور سورہ

کے بعد "سبحان اللہ " و الحمد للہ" و لا الہ الا اللہ " و اللہ اکبر" پندرہ پندرہ مرتبہ پڑھتے ہیں - پھر رکوع اور قومہ اور دونوں سجدوں میں بھی دس دس مرتبہ یہی کلمات پڑھے جاتے ہیں - اس طرح ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ کلمۂ تسبیح پڑھا جاتا ہے -

اس نماز کے متعلق متعدد طرق سے حدیث مروی ہے - سب سے زیادہ مشہور دو طریقہ ہیں : ایک حضرت ابن عباس کی روایت ہے، دوسرا ابی رافع کی روایت ہے - پہلی روایت کو ابو داؤد، ابن ماجہ، اور حاکم نے درج کیا ہے - دوسری ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے - دار قطنی نے بھی حضرۃ عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے -

لیکن اس حدیث کے متعلق محققین فن میں اختلاف ہے - محدث ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے - حافظ ابن حجر اسکا رد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ابن عباس والی روایت مضبوط اور شرط حسن پر ہے - نیز ابن داؤد نے اسے اسناد " لا باس" بہ سے روایت کیا ہے، اور فضل بن عباس، ابن عمر، علی ابن ابی طالب، جعفر ابن ابی طالب، ام سلمہ، ان سب سے روایتیں موجود ہیں - ایسی حالت میں ابن جوزی کا موضوع کہنا کس قدر زیادتی کی بات ہے ؟ چنانچہ لکھا ہے کہ " و قد اساء ابن الجوزی بذکرہ فی الموضوعات "

علاوہ حافظ ابن حجر کے ابن مندہ، خطیب، ابن الصلاح، اور نووی نے بھی اسے صحیح یا حسن قرار دیا ہے اور اسکی تصریح کی ہے - تاہم ایک بڑی جماعت محدثین کی اسے ضعیف بھی کہتی ہے، اور موضوع کہنے والوں میں ابن جوزی کے علاوہ عقیلی بھی ہیں :

و قال العقیلی : لیس فی صلوٰۃ التسبیح حدیث یثبت - و قال ابن العربی : لیس فیہا حدیث صحیح و لا حسن

اور عقیلی نے کہا کہ صلوٰۃ تسبیح کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں - نیز ابن عربی کہتے ہیں کہ اس بارے میں

(الفوائد المجموعه للشوكاني) ترکوئی حدیث مفہوم مروی ہے اور نہ حسن-

حتی کہ حافظ سیوطی اللآلی میں لکھتے ہیں:

و الحق ان طرقه كلها ضعيفة و ان حديث ابن عباس يقرب من شرط الحسن الا انه شاذ لشدة الفردية فيه و عدم المتابع و الشاهد من وجه معتبر، و مخالفة هيئتها لهيئة باقي الصلوة -

" اور حق یہ ہے کہ اس حدیث کے تمام طریقے ضعیف ہیں - ابن عباس والی حدیث البتہ شرط حسن کے قریب پہنچتی ہے مگر اسمیں بھی یہ کمی ہے کہ شاذ ہے، کیونکہ کمال درجہ اپنے بیان میں فرد ہے، اور اسکا تابع اور شاهد کوئی نہیں جو کوئی وجہ معتبر رکھتا ہو - نیز یہ بات بھی ہے کہ جس نماز کی اسمیں ترکیب بتلائی گئی ہے اسکی صورت باقی نمازوں کے مخالف ہے"

حافظ موصوف کا قول اس حدیث کیلیے سب سے بہتر اور معتدل قول فیصل ہے - اسی سے آپ رائے قائم کرلیں - رہا صلوۃ تسبیح کا حکم اور فضائل، تو وہ بہرحال ایک نفل نماز ہے اور اس طریق تسبیح سے عبادت کرنا کسی دوسرے نص کا معارض بھی نہیں - مختصر یہ کہ اسپر عمل کرنا قابل اعتراض نہیں ہوسکتا! و هذا هو الحق عندي-

(بعض دیگر موضوعات مشہورۃ)

(۷) " حب الوطن من الایمان " محبت وطن کی ایمان میں سے ہے -

یہ ایک اچھا اور صحیح جملہ ہے، مگر اسے حدیث کہنا بالکل کذب و افترا ہے - کسی غیر معروف سند سے بھی مروی نہیں -

(۸) " علماء امتي كانبياء بني اسرائيل " میری امت کے علماء ایسے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے نبی -

بالکل بے اصل ہے - حافظ ابن حجر نے صاف لکھ دیا ہے کہ " لا اصل له " البتہ " العلماء ورثة الانبياء " کو احمد اور ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے -

سفرنامہ حجاز

مولانا مولوی ظفر احمد عثمانی
(تصنیف ۔ ۱۳۵۲ھ)

تھانہ بھون کے ظفر احمد عثمانی جو رنگون کے مدرسہ
محمدیہ میں پڑھاتے تھے، ۳۰ شوال ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۵ فروری
۱۹۳۴ء بروز جمعرات براہ کراچی حجاز کے لیے روانہ ہوئے۔
یہ ان کا تیسرا سفر تھا۔ قبلاً یہ عہد عثمانیہ میں ۱۹۱۲ء میں اور پھر
عہد شریف حسین میں ۱۹۲۲ء میں بھی آچکے تھے۔

[illegible]

بیت اللہ شریف کی زیارت ... سال

سفرنامہ حجاز

و زیارت حرمین شریفین

جس میں

استاد العلماء حضرت مولانا مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی مدظلہم العالی
نے اپنے سفر حج ... کے متعلق حالات مع فوائد حاجیوں کیلئے نہایت
مفید باتیں اور ... کا ذکر مع ... فرمانے کے بہت سی ایسی ہدایات فرمائی
ہیں جن کا مطالعہ عام مسلمانوں کے علاوہ آئندہ سفر کرنیوالوں کیلئے

نہایت مفید ہے

باہتمام مولوی ... مالک کتب خانہ امداد الغرباء سہارنپور سے شائع ہوا

بمطبع ... خواہ سرکار ... پریس ... میں طبع ہوا

سفر حجاز و زیارت حرمین شریفین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

اللہ تعالیٰ شانہ کا ذکر کس زبان سے ادا کروں اور کہاں سے اس کیلئے الفاظ لاؤں کہ باوجود میری نااہلی کے حضرت حق کی طرف سے انعامات کی ایسی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے کہ عقل بعض دفعہ دنگ ہو جاتی ہے۔ کہ ایک نالائق غلام پر یہ لطف و کرم ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

دسمبر ۱۹۳۳ء میں بندہ نے مدرسہ محمدیہ ماندیریہ (رنگون) سے ۶ ماہ کی رخصت اس خیال سے لی تھی کہ رخصت کا زمانہ وطن مالوف میں حضرت سیدی حکیم الامۃ دامت کاتہم کے سایۂ عاطفت میں گذاروں گا۔ ہاں تمنا کے درجہ میں جو ہر قلب مسلم میں ہمیشہ رہتی ہے یہ خیال بھی آتا تھا کہ اگر اسباب مہیا ہو گئے تو اسی زمانہ میں زیارت حرمین سے مشرف ہونے کی بھی کوشش کروں گا۔ مگر یہ خیال تمنا ہی کے درجہ میں آیا اور سینہ میں نہاں ہو گیا۔ کیونکہ بظاہر اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی نہ اسباب

وطن سے روانگی

مہیا تھے۔ مگر رمضان کے بعد جبکہ دو ماہ سے زیادہ وطن میں قیام ہو چکا دفعۃً غیب سے سامان ہوا اور حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم کی عنایات و توجہات کے ساتھ میں اپنی بھتیجی کو ہمراہ لیکر جس پر حج فرض تھا۔ ۳ شوال ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۵۔ فروری ۱۹۳۴ء بروز جمعرات بارادۂ

حج بیت اللہ وزیارت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھانہ بھون سے بماہ رمضان ۔۔ کراچی کو روانہ ہوا۔ اور بھی چند احباب مع چند مستورات کے ہمراہ ہو گئے تھے کراچی تک یہ قافلہ ۱۴۔۱۵ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ تھانہ بھون سے سہارنپور تک حضرت سیدی ۔۔۔لعلم الامت دامت برکاتہم ہم لوگوں کی مشایعت کیلئے تشریف لائے تھے۔ حضرت کی ہمراہ خانقاہ امدادیہ کے چند ذاکرین شاغلین اور اہلِ قرابت میں سے بھی متعدد افراد تھے۔ سہارنپور پہنچتے ہی حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر بجلی کی طرح شہر میں پہنچ گئی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم صاحب اور شیخ الحدیث اور صدر مدرس اور بہت سے طلبا اور عمائد شہر اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ ۸ ½ بجے شب کے ٹرین روانہ ہوئی اور سب حضرات نے دعائیں دیتے ہوئے ہمیں الوداع کیا۔ صبح کو ۹ بجے گاڑی لاہور پہنچی۔ میرے محترم دوست حافظ سخاوت علی صاحب منیجر یو۔ پی سوڈا واٹر فیکٹری لاہور اور ڈاکٹر عزیز احمد جلال الدین دندان ساز لاہور مع چند احباب کے پلیٹ فارم پر تشریف فرما تھے وہ اپنی موٹر میں لاہور لیگئے۔ جمعہ کی نماز شہر کی مسجد شیرانوالہ میں جس کے پیش امام مولانا احمد علی صاحب ہیں پڑھی اور نماز کے بعد مولانا کے اصرار پر کچھ بیان بھی کیا۔ عشا کے بعد بھی ایک مسجد میں احباب کی درخواست پر بیان کرنا پڑا۔ ان سب بیانات کا موضوع حج اور اس کی فرضیت اور مسلمانوں کو ادائے حج کی ترغیب تھا۔ شنبہ کی صبح کو بتاریخ ۱۰ فروری کراچی میل میں سوار ہو کر ۱۱ فروری کراچی پہنچا۔ یہاں بھی بعض مخلصین اسٹیشن پر موجود تھے۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ حکیم مولوی عبدالحق صاحب فتحپوری کا سب سے زیادہ شکر گذار ہوں کہ آپ سکھر سندھ سے ایک دن پہلے ہی ہمارے استقبال کو کراچی پہنچ گئے تھے۔ شیخ عبدالکریم صاحب کمشن حج سکھر سندھ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ مولانا موصوف کو جناب ہی نے تحائف کے ساتھ کراچی بھیجا۔ ان کی ہمراہ حاجی عبدالغنی صاحب چیرمین حج کمیٹی کراچی کے مکان پر پہنچا۔ حاجی بہت ہی شریف۔ اخلاق اور بہترین عادت کے سچے مسلمان اور خادم حجاج ہیں۔ مجھے اس کے پہلے آپ سے ملاقات کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر یہ ہم

سنتے ہی کہ میرا قافلہ کراچی پہنچنے والا ہے۔ آپ نے اپنے صاحبزادہ کو اسٹیشن پر بھیجا اور اپنے مکان کا ایک قطعہ میرے قافلہ کیلئے مخصوص کرکے ایک ملازم کو ہماری خدمت

کراچی کا قیام

پر مامور فرما دیا۔ جہاز کی روانگی میں ۵۔۶ دن کی دیر تھی۔ اس لئے کراچی میں بھی بہت سے احباب و زنانہ ملتے رہے۔ ایک رات بعد عشا کے بیان بھی کیا اور حاجی عبد الغنی صاحب کی وجہ سے یہ قیام ذرا بار خاطر نہوا۔ حاجی صاحب موصوف کی ذات سے کراچی میں حجاج کو عام طور پر جس قدر راحت پہنچتی ہے وہ اُن تکالیف کا پورا کفارہ ہے جو کلکتہ اور بمبئی کے حاجیوں کو پہنچا کرتی ہیں۔ جس دن حاجی جہاز پر سوار ہوتے ہیں وہ دن اُن کیلئے قیامت صغریٰ سے کم نہیں ہوتا۔ ادھر اُدھر دھکے کھاتے پھرنا گھنٹوں تمازت آفتاب سے پسینہ میں شرابور ہو جانا اُس دن کے لوازمات میں سے ہے۔ مگر کراچی میں

جہاز پر سوار ہونا

ان تکالیف کا نام بھی نہیں تھا۔ ہمنے صبح ہی ایک آدمی کے ہاتھ اپنا تمام سامان جہاز پر بھیجدیا۔ وہ قلی کے حوالہ کرکے اُس کا نمبر نوٹ کرکے ۹ بجے واپس آگیا۔ ناشتہ اور کھانے سے فراغت پاکر ۱۲ بجے ہمنے جہاز پر چلنے کا تہیہ کیا۔ سوا بارہ بجے جٹی پر پہنچے تو سب حاجیوں کو ایک وسیع ہوا دار سقف ہال میں بٹھلا دیا گیا۔ عورتوں کیلئے اسی قسم کا پردہ دار ہال جُدا تھا۔ اُسی وقت حج کمیٹی کے رضا کاروں نے حاجیوں کے سامنے چائے پیش کی۔ چائے پی چکے تو شمار کرنے والے آئے اور گنتی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر آیا اور سب کے سینہ پر ہاتھ رکھتا ہوا۔ چہرہ کا معائنہ کرتا ہوا پاسپورٹ پر مہر لگانے لگا۔ اس سے فراغت ہوتے ہی سب کو جہاز پر جانے کی اجازت دی گئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ میں یہ سب مراحل آرام کے ساتھ طے ہو گئے اور ۲ بجے ہم جہانگیر جہاز پر اپنی جگہ پہنچ گئے جہاں پہلے ہی سے قلی نے سامان کو ترتیب سے لگا رکھا تھا۔

سفر جہاز

جہانگیر جہاز بہت بڑا نہیں مگر پھر بھی گیارہ سو حاجی اس پر سوار تھے۔ بعض لوگ جگہ کی قلت سے تکلیف میں تھے میں حکومت ہند سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حاجیوں کے جہاز میں تھرڈ کلاس والوں کیلئے بھی سیکنڈ کلاس کا

بنا پائیں یا ایک سیٹ اتنی بڑی ہو جس پر اوسط درجہ کا بستر آجائے۔ تھرڈ جہاز پر بستر
کر حاجیوں کا لیٹنا اور ان کی صحت کو بھی خراب کرتا ہے اور جگہ بھی بعضوں کے قبضہ میں زیادہ
جاتی ہے۔ آجکل ہر شخص کو ٹکٹ کے ساتھ کم از کم ایک وقت کی معاوضہ خوراک کی قیمت
قہ ادا کرنا بھی لازمی ہے۔ کیونکہ حاجیوں کو جہاز میں کھانا پکانے کی بالکل ممانعت کر دی
گئی ہے۔ جہاز میں ایک ہندوستانی ہوٹل بھی تھا جس کے سب ملازم مسلمان تھے۔
جو لوگ صرف ایک وقت کی خوراک ٹکٹ کیا ساتھ لئے ہوئے تھے وہ دوسرے وقت
ہوٹل سے کھانا خرید لیتے تھے۔ حجاج کو عام طور پر یہ شکایت تھی کہ دس آنے میں جو خوراک
ان کو جبراً دی جاتی ہے۔ اس سے عمدہ اور لذیذ تر خوراک ۵ میں ہوٹل سے مل جاتی تھی
فیہ کی پلیٹ ۳ میں ایسی لذیذ ملتی تھی کہ جہاز کا سالن اس کے سامنے ہرگز کسی قابل نہ تھا
میں نے دوسروں کی زبانی یہ شکایت روزانہ سنی۔ مگر خود اس شکایت میں شریک
نہیں ہوں۔ کیونکہ مجھے ہوٹل کا کھانا جہازی کھانے سے بہت زیادہ اچھا معلوم نہ ہوتا تھا

۲۴۔ فروری کو ۲½ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا۔ دو روز ہوا کی تیزی سے جہاز کو
زیادہ حرکت رہی جس کی وجہ سے بعض لوگ چکر اور استفراغ کی شکایت میں مبتلا رہے
تیسرے روز عام طور سے سب لوگ اچھے خاصے خوش و خرم نظر آتے تھے اس جہاز میں
بمبئی سے مولانا محمد شفیع صاحب بجنوری بھی سوار ہوئے تھے۔ جو حضرت مولانا فضل الرحمن
صاحب گنج مرادآبادی قدس سرہ کے خاص خدام میں سے ہیں اور جذب کی ایک خاص
شان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کو کسی طرح میری خبر لگ گئی۔ تلاش کرتے کرتے تیسرے
دن میرے پاس پہنچے۔ مولانا سے مل کر بہت ہی خوش ہوا کیونکہ میں ان کو ایک بابرکت
بزرگ سمجھتا ہوں۔ پھر میں بھی مولانا کی قیامگاہ پر گیا اور مولانا کے اصرار سے حج اور آداب
زیارت رسول پر دو گھنٹے تک تقریر کی جس سے عام طور پر سب حاجی بہت محظوظ ہوئے
اس کے بعد جہاز ہی میں احکام حج و اسرار حج پر مجھے متعدد بیان کرنا پڑے۔

یہ سفر بہت پر لطف رہا سمندر میں بھی سکون تھا اور حجاج میں بھی سکون تھا کسی طرف
سے لڑنے جھگڑنے کی آواز مطلق نہ آتی تھی جو ایسی پر حالی جہاز میں روزانہ کانوں کو تکلیف

دیا کرتی تھی۔

باب مکہ جدہ

۴۔ مارچ کو ہمارا جہاز کامران پہنچا۔ اور دو تین گھنٹے ٹھیرا رہا ڈاکٹر نے جہاز کا اور حاجیوں کی صحت کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد آگے جانے کی اجازت دی گئی جو لوگ پہلے مدینے جانیوالے تھے اُنہوں نے احرام نہیں باندھا۔ جو پہلے مکہ جانیوالے تھے اُنہوں نے کامران ہی میں یا اس سے نکل کر احرام باندھ لیا۔ اس وقت جہاز کے گوشہ گوشہ سے لبیک اللھم لبیک کی دلکش صدائیں جاری تھی۔ اور روح کو مست بادۂ الست بنا رہی تھی۔ میں نے اور میرے رفقار نے پہلے مدینۃ الرسول کی حاضری کا ارادہ کیا تھا۔ اس لئے ہم ابھی محرم نہ ہوئے تھے۔

۵ر مارچ کو دس بجے دن کے قریب ہمارا جہاز ساحل جدہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس وقت کی خوشی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس منظر کا نظارہ کر رہے تھے ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک   آتشِ شوق تیز تر گردد

۱۱ بجے کے درمیان ہم جہاز سے اُتر کر ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہوئے جس میں صرف میرے رفقار ہی تھے۔ دوسرا کوئی نہ تھا۔ کنارہ پر پہنچ کر ہم ایک دروازہ سے داخل ہوئے اور کشتی مع سامان کے دوسری طرف کسی قدر فاصلہ سے کنارہ پر کھڑی ہو گئی۔ معلم کا نام پوچھا گیا۔ ہم نے اپنے معلم کا نام یحییٰ محبوب بتلا دیا تو ٹکٹ اور پاسپورٹ ہم سے لے لیا گیا۔ اور معلم کے وکیل نے اپنی ساتھ لیکر سامان کے پاس پہنچا دیا مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ سامان کے ساتھ ہم سے کوئی بھی نہ تھا مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ گاڑی کرایہ کر کے وکیل نے مع سامان کے ایک مکان پر پہنچا دیا۔ وہاں مستورات نے ظہر کی نماز پڑھی۔ ہم ساحل ہی پر نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ جدہ میں داخل ہو کر میں نے محسوس کیا کہ اس وقت پہلے سے زیادہ رونق اور آبادی ہے۔ دو بار اس سے پہلے بھی میں اس مبارک سرزمین میں حاضر ہو چکا تھا۔ اُس وقت اس قدر رونق اور آبادی نہ تھی۔ ہاں ترکی زمانہ میں لوگ عام طور سے خوش حال نظر آتے تھے اور اس وقت زیادہ تر مفلوک الحال تھے۔ لیکن بازاروں میں چہل پہل پہلے سے کم نہ تھی ◆

لیل جدہ نے ٹیلیفون پر معلوم کر کے ہماری اطلاع کر دی تھی دوسرے روز معلم صاحب
شریف لے آئے اور بہت تپاک سے ملے حجاز کی اقتصادیات پر دیر تک گفتگو
ہوتی رہی پھر وہ ہمارے لئے روانگی مدینہ کے واسطے موٹر لاری کا بندوبست کرنے چلے گئے

مدینہ منورہ کا سفر

۱۰ مارچ کو بعد ظہر کے جدہ سے مدینہ کی طرف لاری روانہ ہوئی ظہر کی نماز جدہ سے باہر نکل کر پڑھی
راستہ میں منزل دعبان پھر منزل طوال آئی۔ یہاں عصر کی نماز پڑھی گئی، پھر روانہ
ہوئے تو منزل سے پہلے ہی مغرب کا وقت آگیا۔ میں نے ڈرائیور سے جس کا نام
علی جاوی تھا کہا کہ نماز کیلئے موٹر روک دے۔ وہ چونکہ شافعی المذہب تھا کہنے لگا
مغرب وعشا دونوں جمع کر لینا۔ میں نے کہا میرے مذہب میں اسکی اجازت نہیں کہنے
لگا آج مذہب شافعی پر عمل کرلو۔ کیونکہ مذاہب سب برحق ہیں۔ اس کا میں نے
کچھ جواب نہ دیا۔ مگر تھوڑی دور چلکر موٹر خراب ہوگیا اور ڈرائیور خود ہی کہنے لگا کہ
آپ مغرب کی نماز پڑھ لیں۔ موٹر ابھی نہیں چل سکتا۔ ہم نے فراغت کے ساتھ
مغرب کی نماز ادا کی تھوڑی دیر میں ایک خالی لاری آئی جس میں موٹر کے پرزے
پیٹرول کا ذخیرہ اور ایک مہندس (موٹر بنانے والا) موجود تھا تحقیق سے معلوم
ہوا کہ حکومت کی طرف سے یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ لاریوں کے قافلہ کے پیچھے ایک
خالی لاری مکمل سامان کے ساتھ رہے۔ تاکہ راستہ میں کوئی موٹر خراب ہو جائے
یا پٹرول ختم ہو جائے۔ تو اس کو امداد دی جائے۔ اور کسی کی کوئی چیز گر پڑے تو اٹھالی
جائے۔ غرضا اس لاری کے آنے سے ہمارا موٹر درست ہو کر اس تیزی سے چلا

منزل رابغ

کہ عشا کے وقت رابغ پہنچ گیا۔ موٹروں کے اڈے پر مسقف قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں مسافروں کیلئے پلنگ بچھے
ہوتے اور کھانے پینے کا سامان۔ روٹی۔ سالن۔ چائے وغیرہ دوکان پر موجود تھی
قیمت دیکر جو چاہو خریدو۔ اور کھا پی کر آرام کرو۔ پہلے زمانہ میں منازل پر یہ سامان نہ
تھا۔ آسمان کے نیچے سونا پڑتا اور خود کھانا پکانا پڑتا تھا، ہم لوگ قہوہ خانہ میں پہنچے۔

تو معلوم ہوا کہ مستورات کیلئے پردہ دار کمرے الگ بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ مستورات نے پردہ کے مکان میں اتر کر اطمینان سے نماز ادا کی اور غسل کے بعد روٹی کھا کر چائے پی کر سب نے آرام کیا۔ ہمارا سامان موٹر پر لدا ہوا تھا جس کا کسی قدر فکر تھا۔ مگر قہوہ خانہ والے نے اطمینان دلایا کہ آپ کی کوئی چیز ضائع نہ ہوگی۔ بے فکر سو جائیے سامان کا میں ذمہ دار ہوں۔ مجھے اس بات سے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ پہلے کسی کی مجال نہ تھی کہ اس جرأت کے ساتھ سامان کی ذمہ داری لیکر حاجیوں کو مطمئن کر دیتا۔ ہم بے فکر سو گئے اور سامان موٹر ہی میں رہا۔ الحمد للہ کوئی چیز ضائع نہیں ہوئی +

حکومت کا انتظام

میں نے عموماً حجاج کو راستے کے امن و آسایش کی تعریف کرتے ہوئے اور انتظام حفاظت پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے پایا۔ جو درحقیقت حکومت عربیہ سعودیہ کا نمایاں کارنامہ ہے۔ رابغ سے نماز فجر کے بعد ناشتہ کر کے موٹر پر سوار ہوئے۔ اور دو تین گھنٹے میں منزل مستورہ پر پہنچے وہاں پندرہ منٹ کیلئے قیام ہوا کسی نے پانی پیا کسی نے چائے نوشی کی۔ جدہ سے رابغ تک راستہ بہت اچھا تھا۔ ساحل بحر کے قریب سے زمین نرم ہے اور موٹروں کے چلنے سے راستہ ہموار بھی ہو گیا۔ رابغ سے مستورہ تک بھی

رابغ سے مدینہ تک

راستہ اچھا ہے۔ مگر کہیں کہیں ریتلا میدان بھی آجاتا ہے۔ مستورہ سے منزل بنی الحصان تک ریت بہت زیادہ ہے۔ اور ریت کے نیچے پتھر بھی دبے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے موٹر زیادہ اچھلتا ہے، جو لوگ لاری کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوتے ہیں ان کو تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ کاش حکومت سعودیہ اس قطعہ کی درستی کر دے۔ تو حجاج کو بڑا آرام ہو جائے۔ مستورہ سے ۸ بجے روانہ ہو کر ایک بجے منزل بنی الحصان میں پہنچے وہاں ۲ گھنٹہ قیام ہوا کیونکہ کھانے کا بھی وقت تھا اور ظہر کی نماز کا بھی۔ مستورات کیلئے یہاں بھی پردہ دار کمرے قہوہ خانے میں موجود تھے۔ پلنگ اور بوریئے بچھے ہوئے تھے سب نے اطمینان سے کھانا کھایا۔ ظہر کی نماز پڑھی آرام کیا پھر موٹر میں سوار ہوئے اس مقام پر

حکومت سعودیہ کے اس انتظام کی داد نہ دینا انصاف کا خون کرنا ہے کہ آج کل تقریباً ہر منزل پر پولیس کی چوکی اور حکومت کا دفتر بنا ہوا ہے جس حاجی کو جو شکایت ہو وہ محکمہ پولیس سے رپورٹ کر کے اپنی شکایت کا ازالہ کر سکتا ہے۔ پہلے یہ انتظام نہ تھا بلکہ جدہ سے مدینہ تک سب حاجی بدوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔ بنی الحصان سے مدینہ منورہ تک راستہ کے دونوں طرف مسلسل پہاڑ ہیں راستہ پختہ ہے جو موٹر کیلئے بہت موزوں ہے مگر صفائی اور مرمت کی ضرورت ہے۔ اگر راستہ سے بڑے پتھروں کو ہٹا دیا جائے اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کو کٹوا دیا جائے۔ تو معمولی خرچ میں سڑک بہت عمدہ ہو جائیگی۔

مدینہ کے پہاڑ

حجاج اس راستہ میں شروع ہی سے درود شریف کی کثرت رکھتے ہیں۔ مگر منزل بنی الحصان سے روانہ ہو کر یہ ورد ترقی پذیر ہو جاتا ہے دونوں طرف پہاڑ ایسے خوشنما نظر آتے ہیں کہ دل بیتاب ہو جاتا اور کشش باطنی کو خاص طور پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اللہ اللہ اس راستے کے انوار و برکات کا کیا کہنا جس میں کبھی نور مجسم صلے اللہ علیہ وسلم نے ناقہ قصوا پر سوار ہو کر سفر کیا اور اپنی نظر انور سے ان پہاڑوں کو مشرف فرمایا تھا آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی نظر انور کے انوار و برکات ان پہاڑوں میں نمایاں اور عشاق کے دلوں کو بیتاب کرنے کیلئے کافی سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اللھم صل وسلم و بارک علیہ و علی آلہ بقدر حسنہ و جمالہ

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

؎

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد — با خاک آستانش دارم مرحبائے

منزل بنی الحصان کے بعد فریشہ پھر شیبہ پھر بیر عباس پھر ابیار علی چند منازل آتی ہیں جہاں تھوڑی تھوڑی دیر موٹر ٹھہرتا ہے تاکہ حجاج ضروریات سے فارغ ہو سکیں اور نماز کا وقت ہو تو نماز پڑھ لیں۔ اکثر منازل پر پولیس کی چوکی بھی خوبصورت بنی ہوئی ہے جہاں ڈرائیور کو اپنا پاس دکھلانا اور آگے جانے کیلئے دوسرا پاس لینا ہوتا ہے۔ ایک آدمی

سواریوں کو شمار بھی کرتا ہے تاکہ لاریاں قانون کے خلاف زیادہ سواریاں نہ سوار کر سکیں

منزل بیر علی

منزل ابیار علی کا قدیم نام ذوالحلیفہ ہے۔ اسی جگہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا تھا اور آج بھی اسی مقام پر مسجد بنی ہوئی ہے۔ جہاں حضور نے احرام کی دو رکعتیں پڑھکر لبیک کی صدا بلند فرمائی تھی۔ یہاں سے مدینہ منورہ یعنی طیبہ مدینۃ الرسول ۶۔ ۷ میل کے قریب ہی۔ جب ہماری لاری اس منزل سے گذری ہی تو دل کی جو حالت تھی زبان قلم اُس کو بیان نہیں کر سکتی۔ کوئی درود شریف پڑھ رہا تھا۔ کوئی غلبۂ شوق میں اشعار نعتیہ پڑھ رہا تھا۔ کوئی ہیبت وجلال وکمال و جمال کی تجلی سے بیساختہ رو رہا تھا۔ کوئی عربی بارگاہ نبوی سے اس طرح عرض معروض کر رہا تھا ؎

یا خیر من دفنت بالقاع اعظمہ	فطاب من طیبہن القاع والاکم
نفسی الفداء بقبر انت ساکنہ	فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم
انت الحبیب الذی ترجی شفاعتہ	عند الصراط اذا ما زلت القدم

؎

امر علی الدیار دیار لیلی	اقبل ذا الجدار وذا الجدارا
وما حب الدیار شغفن قلبی	ولکن حب من سکن الدیارا

لوگ اپنے ولولہ اور شوق وذوق میں مست تھے اور موٹر اپنی برقی روشنی سے راستہ کو روشن کرتا ہوا تیزی کے ساتھ فراٹے بھر رہا تھا کہ عشا کے وقت دیار حبیب کی روشنی نے آنکھوں کو منور۔ دلوں کو مجلا ومطہر اور عقول کو حیرت زدہ بنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے

مدینہ منورہ میں داخلہ

مدینے منورہ کا دروازہ باب العنبریہ سامنے آگیا۔ اور ہم سب موٹر سے اُتر کر پیادہ پا ہوگئے کہ اس مقدس سرزمین میں سوار ہو کر چلنا خلاف ادب تھا۔ حق تو یہ تھا کہ سر کے بل چلتے اور آنکھوں کو فرش راہ بنا دیتے۔ مگر اللہ کی عنایت ورحمت کہ امت کے غلاموں کو پیادہ پا چلنے کی بھی اجازت دیدی گئی ؎

ان جینگہ قاصید اسی علی بھر گ	لہ قفص حتا داؤ الحق ادیت

واقعہ قدم قدم پر یہ خیال آ کر یہاں کسی وقت حضور کے قدم مبارک پڑے تھے اپ
مبارک سرزمین میں آمد و رفت رکھتے تھے بدن میں سنسناہٹ محل جاتا تھا کہ ہم اس مقدس
زمین پر کیونکر پیر رکھیں اور کس طرح چلیں ؎

بتا میکہ نشان کف پائے تو بود	سالہا سجدۂ صاحب نظران خواہد بود

باب العنبر پر حجاز ریلوے کا خوشنما خوبصورت اسٹیشن بنا ہوا ہے جو تنگی کو
یاد دلوں میں تازہ کر کے چٹکیاں لیتا رہتا ہے۔ کیونکہ اب نہ وہ ریل ہی ہے نہ اس کی آمد و
رفت ہے۔ صرف اسٹیشن باقی ہے ؎

یہاں موٹر پہنچا ہی تھا کہ مزورین نے اور ان کے آدمیوں نے حجاج کا استقبال
کیا ہمارے مزور شیخ احمد تواب تھے۔ ان کے آدمی ہماری پیشوائی کو آئے ہوئے تھے۔
مستورات اور سامان کے لئے ایک گاڑی کرایہ کر کے ان کو سوار کر دیا گیا اور ہم سب
پیادہ پا درود شریف پڑھتے ہوئے مدینۃ الرسول میں داخل ہو کر اس مقدس سرزمین میں پہنچ
گئے۔ جہاں ساڑھے تیرہ سو سال پہلے نور مجسم نور من انوار اللہ کا داخلہ ہوا تھا تو مدینہ کے
در و دیوار چمک اٹھے تھے اور ننھے ننھے بچوں کے دلوں میں مسرت و محبت کی ایسی موجیں
لہریں مارنے لگی تھیں کہ چہروں سے خوشی کے پھول جھڑنے اور منہ سے یہ اشعار موتیوں کی
طرح بکھرنے لگے تھے ؎

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع	وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

ایھا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

اور بچیوں کی زبان پر یہ ترانہ تھا ؎

نحن جوار من بنی النجار یا حبذا محمد من جار۔ اللھم صل وسلم و بارک علی ھذا
النبی الکریم و علی آلہ و اصحابہ ازکی صلوۃ و افضل تسلیم۔

ہم کسی خیال میں مست چلے جاتے تھے۔ کبھی اپنی قسمت پر ناز کرتے کہ کہاں سے
کہاں پہنچے۔ کبھی ہیبت و جلال سے لرزنے لگتے کہ یہ وہ بارگاہ ہے جس کے خادم بڑے بڑے

فرشتے ہیں۔ یہ وہ دربار ہے جس کی غلامی کی آرزو بڑے بڑے انبیاء علیہم السلام کو تھی نہے نصیب ہم مسلمانوں کا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حضور کے غلاموں میں داخل اور آپ کی امت میں شامل فرمادیا ہے

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا		من العنایۃ رکناً غیر منہدم	؎
چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیباں		چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں	

راستہ میں ایک مزدور سے میں نے دریافت کیا کہ مدینہ والوں کی آجکل کیا حالت ہے؟

مزدور۔ کیا آپ نے اس سے پہلے بھی مدینہ کی زیارت کی ہے؟

میں۔ ہاں! میں ایک بار ۱۳۲۲ھ میں حاضر ہوا ہوں جبکہ یہاں ترکی حکومت تھی اور دوبارہ ۱۳۳۶ھ میں حاضر ہوا ہوں جبکہ شریف حسین خود مختار بنے ہوئے تھے۔

مزدور۔ آبدیدہ ہوکر! اگر آج ترکی حکومت یہاں ہوتی تو میں آپکے ساتھ پیادہ دوڑا نہ ہوتا۔ بلکہ میرے پاس اور ہر متوسط الحال کے پاس ایک ایک موٹر ہوتا۔ آپ خود مشاہدہ کریں گے کہ مدینہ میں اس وقت کس قدر افلاس ہے۔ مگر بہرحال ہم شاکر و صابر ہیں اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے زندہ نظر آتے ہیں۔

مجھ پر اس تقریر کا جو کچھ اثر ہوا اس کو میرا دل ہی جانتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ اور مضافات مدینہ میں افلاس بہت زیادہ ہے۔ میں نے خود دیکھا کہ حجاج کھانا کھاتے ہوئے جس ہڈی کو پھینک دیتے تھے غریب بچے اس کو اٹھا لیتے اور صاف کرکے چوسنے لگتے تھے۔ ایک ایک لقمہ کے لئے وہ ترستے ہیں مگر صبر و شکر کا یہ حال ہے کہ ایک بچہ سے جس کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی میں نے کہا تم ہندوستان چلو تو تم کو کھانا کپڑا بھی دیں گے اور ماہوار وظیفہ بھی مقرر کردیں گے۔ اُس نے بیساختہ جواب دیا کہ یہ تو ناممکن ہے جس مقدس سرزمین میں ہزاروں روپے جمع کرکے تم آتے ہو ہم اُس کو چھوڑ کر باہر نہیں جاسکتے۔

میں اسباب افلاس کے متعلق اپنا خیال آئندہ اوراق میں ظاہر کروں گا۔ اس وقت واقعات کے ضمن میں اجمالی تذکرہ ہی کافی ہے۔

مسجد نبوی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم باب مجیدی پر پہنچے جو مسجد نبوی کا عالیشان صدر

یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ عشا کی نماز ہو چکی اور مسجد کے دروازے بھی بند ہو گئے ہیں
لئے یہ رائے قرار پائی کہ پہلے جائے قیام تجویز کر لی جائے مستورات اور سامان کو وہاں
ر اطمینان سے مکان ہی پر عشاء کی نماز جماعت سے ادا کر لی جائے۔ چنانچہ مولانا
حمد صاحب فیض آبادی مہتمم مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ کو اطلاع دی گئی۔ مولانا تشریف
ے اور چند مکانات مجھے دکھلائے جو حرم نبوی سے متصل تھے میں نے ایک مکان کو جو
النساء کے قریب اور مدرسہ شرعیہ سے ملا ہوا تھا پسند کیا۔ مولانا سید احمد صاحب ہنسکر
نے لگے کہ میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ تم اپنے مرشد کے مکان کو چھوڑنے والے نہیں ہو
لوم کرکے میری خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی کہ جس مکان کو میں نے پسند کیا تھا وہی میرے
شد حضرت سیدی مولائی مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ مہاجر مدنی شارح ابوداؤد
قیامگاہ اور جس کمرہ کو میں نے اختیار کیا تھا وہی کمرہ مولانا کی آرامگاہ تھا۔ اسی میں
لانا نے اپنی عمر کی آخری گھڑیاں تمام کی ہیں۔ چنانچہ فوراً مستورات کو وہاں اتارا گیا۔
ہر کے کمروں میں مردوں نے قیام کیا اور وضو و غسل سے فراغت کرکے نماز عشا جماعت
ے ساتھ ادا کی۔ اسی وقت مولانا سید احمد صاحب کے گھر سے ہم سب لوگوں کیلئے کھانا آگیا۔
ھانے سے فراغت کرکے تھوڑی دیر کیلئے سوئے اور صبح سے پہلے ہی دربار نبوی میں

بارگاہ رسالت میں حاضری

صلوۃ و سلام عرض کرنے کیلئے جاگ اٹھے کیونکہ
مسجد نبوی کے دروازے تہجد کے وقت کھل جاتے
ہیں جس وقت مسجد نبوی میں قدم رکھا ہے تو دل پر جو حالت و کیفیت گذری۔ وہ زبان
قلم سے بیان نہیں ہو سکتی، تحیۃ المسجد ادا کرکے مواجہہ شریف میں صلوۃ و سلام عرض کرنے
کیلئے کھڑا ہوا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے احسانات و انعامات کو یاد کرکے بیساختہ آنکھوں
سے آنسو بہنے اور زبان سے یہ کلمات جاری ہونے لگے ؂

الصلوۃ والسلام علیک یا نبی اللہ الصلوۃ والسلام علیک یا صفوۃ
اللہ الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ والحمد للہ الذی ھدانا بک من
ضلالۃ۔ وانقذنا بک من الشرک والجھالۃ الصلوۃ والسلام علیک یا

یا حبیب اللہ الصلوۃ والسلام علیک یا خیر خلق اللہ الصلوۃ والسلام
علیک یا خاتم النبیین الصلوۃ والسلام علیک یا شفیع المذنبین الصلوۃ
والسلام علیک یا رحمۃ للعلمین الصلوۃ والسلام علیک یا قائد الغر المحجلین
یا سید المرسلین الصلوۃ والسلام علیک یا سید الخلق اجمعین الصلوۃ والسلام
علیک وعلی آلک واہل بیتک الطیبین الطاہرین وعلی ازواجک
وذریتک واصحابک واولیاءک اجمعین وعلی سائر الانبیاء والمرسلین
وعلی جمیع عباد اللہ الصالحین جزاک اللہ عنا یا رسول اللہ افضل
ما جزی بہ نبیا عن قومہ ورسولا عن امتہ وصلی علیک کلما ذکرک
الذاکرون وغفل عن ذکرک الغافلون افضل واکمل ما صلی علی احد
من الخلق اجمعین اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشہد
انک عبدہ ورسولہ وخیرتہ من خلقہ واشہد انک قد بلغت
الرسالۃ وادیت الامانۃ ونصحت الامۃ وکشفت الغمۃ وجاہدت
فی اللہ حق جہادہ فالحمد للہ الذی ہدانا بک من الضلالۃ وانقذنا
بک من الشرک والجہالۃ ونور قلوبنا بک من انوار التوحید وشرفنا بک
وکرمنا ووعدنا المزید ونجانا بک من النار والخزی والعار ومن کل
بلاء الدنیا والآخرۃ یا رسول اللہ ان اللہ تعالی یقول ولو انہم اذ ظلموا
انفسہم جاؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لہم الرسول لوجدوا اللہ
توابا رحیما فجئتک یا رسول اللہ وقد ظلمت نفسی واستغفر اللہ و
اتوب الیہ بین یدیک فاستغفر لی اللہ واسئلہ ان یغفرلی ذنبی
کلہ دقہ وجلہ ویتوب علی ویرضی عنی رضا لا یسخط بعدہ ابدا

یا خاتم الانبیاء جئتک قاصدا   ارجو رضاک واحتمی بجنابک

الا یا رسول اللہ کنت رجاءنا   وکنت بنا برا ولم تک جافیا

وکنت رحیما ما دیا و معلما	لیبك علیك الیوم من كان باكیا
فلو ان رب الناس ابقی نبینا	سعدنا و لكن امرہ كان ماضیا

یا خیر من دفنت بالقاع اعظمه	فطاب من طیبهن القاع والاكم
نفسی الفداء لقبر انت ساكنه	فیه العفاف وفیه الجود والكرم
انت الحبیب الذی ترجی شفاعته	عند الصراط اذا ما زلت القدم

یا رسول اللہ اسألك الشفاعة یا رسول اللہ اسألك الشفاعة یا ... اللہ اسألك الشفاعة لی ولاھلی واولادی وآبائی وامھاتی و... نی واخوانی واعمامی وعماتی واخوالی وخالاتی ولعشیرتی وقرابتی ... شایخی واساتذتی ولاحبابی واصحابی ولكل من سألنی الدعاء له ... میع المؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات اللھم آت سیدنا ... الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته وارزقنا ... عته وآته نهایة ما ینبغی ان یسأله السائلون اللھم صل علی سیدنا ... نبیك ورسولك النبی الامی وعلی آل سیدنا محمد وازواجه و... یته كما صلیت علی سیدنا ابراهیم وعلی آل سیدنا ابراهیم فی ... لمین انك حمید مجید۔

صلوۃ وسلام کے وہ صیغے جو اس وقت زبان سے نکلے تھے بیساختہ قلم سے نکل ... بس نے قلم کو اس واسطے نہ روکا کہ زبان سے نکلا ہوا جلد فنا ہو جاتا ہے اور قلم کا لکھا ... تک قائم رہتا ہے تو جبتک یہ الفاظ کاغذ میں لکھے رہیں گے انشاء اللہ مجھے برابر اس ... کا ثواب ملتا رہیگا۔

پھر حضرات شیخین کی خدمت میں سلام عرض کیا اور اس سے فارغ ہو کر قبر شریف ... سرہانے قبلہ رخ ہو کر اپنے لئے اور اپنے گھر والوں اور دوستوں اور ملنے والوں ... سب اگلوں پچھلوں کیلئے دل سے دعائیں کیں اسلام اور مسلمانوں کی عزت و ترقی و

صلاح و فلاح کیلئے بھی بہت دعا کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں روزانہ عرض کرتا رہا کہ امت مرحومہ بہت کچھ پستی اور ذلت کا مزا چکھ چکی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ اب اُس کے دن پھیر دے اور اپنے دین کی محبت والفت دلوں میں ڈال کر مسلمانوں کو پھر وہی عروج عطا فرمایئے جو سلف صالحین کو عطا فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید قوی ہے کہ یہ دعائیں قبول ہوگئی ہیں کیونکہ اس مقدس دربار میں دعاؤں کو رد ہوتے نہیں دیکھا

مواجہ شریفہ میں سپاہیوں کا تعین

مواجہ شریفہ میں حکومت کی طرف سے دو نجدی سپاہی ہر وقت تعینات رہتے ہیں تاکہ کوئی دیواروں اور جالیوں کو ہاتھ لگانے و بوسہ دینے یا سجدہ وغیرہ کرنے کی جرأت کرے کہ یہ سب امور شرعاً ممنوع ہیں۔ حکومت کے اس اقدام کو ضرور مستحسن کہا جائے مگر بعض دفعہ یہ سپاہی بہت سختی سے کام لیتے ہیں۔ ایک بار میرے سامنے ایک معمر عورت نے مقدس جالیوں کو ہاتھ لگا دیا تھا۔ نجدی سپاہی نے اس زور سے اُس کو دیا کہ چاروں خانے چت گری اور درد سے بیتاب ہوگئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مواجہ میں اس قدر سختی سے کام لینا ہرگز بہتر نہیں ہے۔ جاہلوں کو نرمی سے سمجھا دینا شور و شغب اور ضرب و قماع سے اس مقام پر احتراز کرنا چاہیئے! خصوصاً جبکہ مسئلہ مختلف ہے۔ اور بعض علما نے قبر شریف کو چھونے کی اجازت دی ہے۔ گو اُن کا قول ضعیف ہو۔ البتہ سجدہ کرنے والوں کو سختی سے روک دینے کا مضائقہ نہیں۔ مگر سجدہ وہاں کون

مدرسہ شرعیہ کا معائنہ

نماز اشراق سے فارغ ہو کر بدون کسی کی طلب کے خود مدرسہ شرعیہ کا معائنہ کیا جس کے بانی اور مہتمم مولا سید احمد صاحب فیض آبادی برادر بزرگ مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ ہیں مدرسہ کی اور تعلیمی حالت بہت اچھی ہے۔ جس سے دل خوش ہوا ایک عمارت بہت عالیشان زیر تعمیر ہے اُسکے مکمل ہو جانیکے بعد مدرسہ میں بہت وسعت ہو جائیگی اور تنگی مکان سے اس وقت جو دشواریاں پیش آتی ہیں ایک حد تک رفع ہو جائیں گی اس حد تک

امداد کرنا سب مسلمانوں پر لازم ہے تاکہ منبع علم و حکمت کے ہمسایہ اس دولت سے محروم نہ رہیں۔ مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں تعلیم پانے والے زیادہ تر مدینہ اور مکہ کے شہری بچے ہیں۔ جو اکثر مہاجرین کی اولاد ہیں، خالص عربی خاندانوں کے بچے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اور یہ دونوں مدرسے تمام آبادی کیلئے کافی بھی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دیہات اور منازل مدینہ میں بھی مدارس قائم کئے جائیں جن میں بدوؤں

بدوؤں کو تعلیم یافتہ بنانے کی ضرورت

کی اولاد کی تعلیم کا انتظام ہو جبتک بدوؤں کی اولاد تعلیم یافتہ نہ ہوگی اس وقت تک عرب کو ترقی نہ ہوسکیگی، نیز مکہ، مدینہ اور جدہ و طائف میں شبینہ مدارس قائم کرنے کی بھی ضرورت ہے جن میں مزدور پیشہ جماعت کے جوانوں اور بوڑھوں کو اسلامی تعلیم و تہذیب سے آراستہ کیا جائے۔ یہ منظر کس قدر افسوسناک ہے کہ جدہ وغیرہ میں حوض کے کنارہ پر ایک شخص وضو کر رہا ہے۔ اور اُس کے پاس ہی دوسرا حوض کی نالی میں پیشاب کر رہا ہے۔ جس قوم نے تمام دنیا کو علم و تمدن و تہذیب کا درس دیا تھا۔ آج وہ تہذیب و علم سے اتنی دور ہو جائے تو رونے کی جگہ ہے یا نہیں؟ میں حکومت سعودیہ کو بہت زور کے

حکومت سعودیہ کو مشورہ

ساتھ مشورہ دیتا ہوں کہ اہل عرب کے افلاس کو اگر وہ دور نہیں کر سکتی تو کم از کم اس جہل ہی کو دور کر دے جس نے قوم عرب کو حضیض ذلت میں دھکیل دیا ہے۔

اہل خیر ہندوستانیوں کو مشورہ

ہندوستان کے اہل خیر حضرات کو بھی میں یہی مشورہ دونگا اہل حجاز کی مالی امداد سے زیادہ ضروری اور مقدم اُنکی علمی امداد ہے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ ہر گاؤں میں ایک مکتب قائم کر دیا جائے اور ابتداء میں ہندوستان سے عربی جاننے والے مخلص علماء بھیجے جائیں۔ یا مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی کے ذریعہ سے ان مدارس کا انتظام کیا جائے ایک مکتب کا سالانہ خرچ بارہ سو روپے سے زائد نہ ہوگا پچیس ہزار سالانہ سے بیس مدرسے دیہات میں قائم ہو سکتے ہیں مجھے یقین ہے کہ پانچ سال کے اندر اہل عرب کی ایسی اصلاح ہو جائیگی کہ مسلمانوں کا دل اُسے دیکھ کر خوش ہو گا اور انشاء اللہ تعالیٰ افلاس بھی دور ہو جائیگا کیونکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم رکھنے والا بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا۔

عصر کے بعد جنت البقیع کی زیارت کی۔ یہاں پہلے بہت قبے بنے ہوئے تھے۔ اب کسی قبر کا نام و نشان باقی نہیں البتہ اجلہ صحابہ و اہلبیت کی قبروں کا استھان تعالم اور شرخ سنگریزے بچھا کر قبروں کا نشان اب بھی موجود رکھا گیا ہے۔ بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ازواج مطہرات اور امام حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے جد امجد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزارات پر سلام عرض کر کے فاتحہ پڑھ کر حضرت مرشدی سیدی مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ کے مزار پر حاضر ہوا مولانا کی قبر کا نشان ایک سفید پتھر سے بعض احباب نے قائم کر لیا ہے۔ ورنہ قبر زمین کے برابر ہی ہے۔ اور پاس ہی حضرت کی اہلیہ مرحومہ بھی مدفون ہیں۔ جنت البقیع میں بھی حکومت کی طرف سے دو تین سپاہی تعینات ہیں جو زائرین کو تقبیل و سجدہ وغیرہ بدعات سے روکتے رہتے ہیں۔ یہ سپاہی کسی سے کچھ سوال نہیں کرتے لیکن اگر کوئی کچھ دینا چاہے تو لیتے ہیں وہ بھی اس وجہ سے کہ سنا گیا کہ دس بارہ مہینے کی تنخواہیں حکومت کی طرف سے ان کو نہیں ملیں۔ کیونکہ جنگ نجد و یمن کی وجہ سے حکومت سرحدی استحکامات میں مشغول ہے فوجی رسد اور اسلحہ کی فراہمی میں بہت روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔" اس جگہ نجدی قوم کی اس وفاداری کی داد دینا چاہیئے کہ باوجود مدت سے تنخواہ نہ ملنے کے ہر سپاہی اپنے کام پر موجود اور فرائض منصبی میں مستعد تھا۔ نجدی قوم اطاعت سلطان کو ایسا ہی سمجھتی ہے جیسا دیگر فرائض شرعیہ کو۔ نجدی قوم کا اتحاد و اتفاق بھی اہل حجاز کو مسلم ہے اور جس قوم میں باہم اتحاد و اتفاق اور بادشاہ کے ساتھ وفاداری و اطاعت کا

حکومت سعودیہ کے سپاہی

...ہو گا وہ علی رغم الحسود ترقی اور کامیابی حاصل کرکے رہیگی۔ اللھم ایدہ وایدنا
...ساکرہ وکن اللھم حامیہ وحافظہ وناصرہ۔

مسجد نبوی میں ہر نماز کے وقت آجکل ایک ہی جماعت ہوتی ہے پہلے کی طرح متعدد
...عتیں نہیں۔ امام صاحب مدینہ منورہ کے رہنے والے ایک بزرگ عالم ہیں جو مذہباً حنبلی
...اور تمام مذاہب کا پورا احترام کرتے ہیں۔ اُن کے چہرہ پر خاص انوار نظر آتے ہیں بہت
...وادر پابند معمولات ہیں۔

...م نبوی کا ایک واقعہ

ہمارے مدینہ پہنچنے سے دو دن پہلے یہ قصہ پیش آیا
کہ ایک ہندوستانی غیر مقلد صاحب نے جو
...بت کی اجازت سے مسجد نبوی میں بزبان اردو وعظ کہا کرتے ہیں یہ مسئلہ بیان کیا
...ینہ آنے والوں کو صرف زیارت مسجد کی نیت کرنا چاہیئے۔ زیارت رسول یا زیارت
رسول کی نیت نہ کرنا چاہیئے۔ اس مسئلہ کی تقریر میں کوئی لفظ بارگاہ رسالت کی
...ن کے خلاف اُن کی زبان سے نکل گیا۔ تو سرحدیوں افغانیوں۔ ہندوستانیوں نے
...اُن کو خوب پیٹا۔ نجدی سپاہیوں نے اردو وعظ تو سمجھا نہیں۔ صرف یہ دیکھ لیا کہ
...عظ کو سامعین پیٹ رہے ہیں۔ اُنہوں نے بیتوں سے لوگوں کو مار مار کر ہٹایا۔ واعظ
...حب کو تو بچا کر عدالت میں لیگئے۔ اور چند آدمیوں کو گرفتار کرکے حوالات بھیجا۔ حکومت
...چار پانچ آدمیوں کو سزا سے قید کی اور سپاہیوں کو دھمکایا کہ تم نے مسجد کے اندر
...ن پر ہاتھ کیوں اُٹھایا۔ تم کو لازم تھا کہ ان سب کو مسجد سے باہر نکال کر لاتے جو مجرم
...اُس کو سزا دیتے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر واعظ صاحب سے کچھ بازپرس نہوئی۔ وہ اپنے
...سے پھر اگلے دن وعظ کہنے لگے۔"

...کومت سعودیہ کو مشورہ

میں اس مقام پر حکومت نجد کو مطلع کر دینا چاہتا ہوں
کہ بعض مسلمانان ہندوستان کو اُنکی طرف سے
...لمانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُس نے اپنے یہاں ہندوستانی غیر مقلدین کو جو
...پنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں زیادہ دخل دے رکھا ہے۔ حکومت نجد اُن کو اپنا

جیسا اہل حدیث سمجھتی ہی مگر واقعہ اس کے خلاف ہے۔" ہندوستان کے اکثر غیر مقلدین جنہوں نے اپنا امام المحدیث رکھ لیا ہے آئمہ اربعہ کی ویسی عظمت نہیں کرتے جیسی حکومت نجد کرتی ہے۔ اور امام مالکؒ امام شافعی و امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی شان اقدس ہیں۔ بالخصوص امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں تو یہ لوگ اس طرح زبان طعن دراز کرتے ہیں کہ حکومت نجد و علمار نجد اس کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ تقلید آئمہ کو شرک قرار دیتے ہیں اور حنفیوں کی نماز کو اس لئے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے بالکل باطل اور کالعدم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حکومت نجد اور علمار نجد اور امام احمد بن حنبلؒ ایسا نہیں سمجھتے۔ وہ تقلید کو لازم اور کم از کم مستحسن سمجھتے اور اپنے کو امام احمد بن حنبل کا مقلد کہتے ہیں۔ ہندوستانی غیر مقلدین تقلید کا جوا گردن سے اُتار کر ایسے آزاد مجتہد بنے ہیں کہ اُن سے ایک بہت بڑے عالم نے مسلمانوں کیلئے ۱۸ عورتوں سے نکاح جائز کر دیا اور ایک مجتہد نے کافر کے پیچھے نماز صحیح ہونے کا فتویٰ دیدیا ان لوگوں کی اسی آزادی اور بیباکی اور گستاخی نے ہندوستان کے اندر عام مسلمانوں کی نظروں میں ان کو بہت خطرناک بنا دیا ہے۔ اور اسی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت ان کو وہابی کے لقب سے یاد کرتی اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے" اب جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نجد کے دربار میں ان لوگوں کا بہت زیادہ رسوخ ہے تو وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ حکومت نجد اور اس کی رعایا اور اُس کے علمار بھی ایسے ہی وہابی ہیں۔ جیسے یہ ہندی وہابی۔ پس اگر حکومت نجد عام مسلمانوں کے دلوں سے اُس نفرت کو نکالنا چاہتی ہے جس کا اُسے خود بھی احساس ہے تو ان لوگوں کو اپنے دربار اور اپنی ادارات میں اسقدر رسوخ نہ دے جس سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہونے لگے کہ ہندوستانی غیر مقلدین اور حکومت نجد باہم شیر و شکر ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے غیر مقلد گستاخ اور بے باک ہی ہوتے ہیں۔ نہیں نہیں ان میں بعضے اہل انصاف اور باادب بھی ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اکثریت ایسے ہی افراد کی ہے۔ جیسے وہ حضرت واعظ صاحب تھے جنہوں نے حرم نبوی میں بیٹھ کر مسئلہ شد رحال پر تقریر کی اور ایسے عنوان سے تقریر کی جس سے

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص شان مترشح ہوتی تھی۔

…ومت سعودیہ کو مشورہ

حکومت نجد کو میں یہ مشورہ بھی دونگا کہ وہ مسئلہ توسل اور
مسئلہ شد رحال پر تقریر عام کرنے کی بالکل ممانعت کر دے
…نکہ یہ مسائل ایسے ہیں جن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے زمانے سے علماء میں اختلاف چلا آرہا
…ما در حقیقت میں یہ صرف نزاع لفظی ہے جس توسل کو شیخ الاسلام حرام فرماتے ہیں کہ وسیلہ کو
فرما اور با اختیار سمجھا جائے اُس کو کوئی جائز نہیں کہتا اور جو توسل علماء اہل سنت کے نزدیک
…نہ ہے یعنی کسی نبی یا ولی پر اللہ تعالیٰ کی جو نظر عنایت و محبت ہے اُس کو وسیلہ قرار دینا اسکو
…الاسلام کسی دلیل سے حرام نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نظر
…یت و محبت کو وسیلہ بنایا گیا ہے نہ غیر خدا کو پس جیسا دوسرے مختلف فیہ مسائل میں
…ست جملہ مذاہب کو برحق سمجھتی ہے اور کسی کے مذہب کی تنقیص نہیں کرتی اسی طرح
مسئلہ شد رحال اور مسئلہ توسل کو بھی سمجھنا چاہیئے اور واعظین کو ان مسائل پر تقریر کرنے
…ے بالکل روک دینا چاہیئے کہ اس کا نتیجہ بجز فتنہ و فساد اور حکومت نجد کی طرف سے
…الی پھیلنے کے اور کچھ نہیں۔

…لالۃ الملک کی تواضع اور حق شناسی

مدینہ منورہ میں میرے ایک دوست
مولوی محمد موسیٰ صاحب پانچ چھ
…ل سے مقیم ہیں وہ کہتے تھے کہ جلالۃ الملک سلطان ابن سعود خلد اللہ ملکہ سے جب میں پہلی بار ملا تو سلطان
…نے مجھ سے فرمایا کہ اگر میرے عمل میں کوئی بات خلاف سنت آپکو معلوم ہوتی ہو تو بے تکلف مطلع فرمایئے"
…میں نے کہا کہ خلاف سنت تو آپ بہت کام کرتے ہیں ایک ادنیٰ بات تو یہی ہے کہ آپ موٹر پر سوار ہو کر پولن
…ن کرتے ہوئے روضہ اقدس نبوی پر حاضر ہوتے ہیں کیا ادب کا یہی طریقہ ہے؟ وہ کہتے تھے کہ سلطان نے
…س بات کو سنکر فرمایا کہ مولانا در حقیقت تم لوگ سچے موحد ہو اور ہمارے عمل ر تو نام کے موحد ہیں کسی
…نے آجتک مجھے اس بدعت پر متنبہ نہیں کیا۔ آج سے انشاء اللہ میں ایسا نہیں کروں گا" یہ واقعہ اگر صحیح ہے
…ر یقیناً صحیح ہے تو اس سے سلطان کی انصاف پسندی تواضع اور سلامت طبع کا جسقدر ظہور ہو رہا ہے
…لے بیان کی حاجت نہیں مجھے امید ہے کہ اسی انصاف کیساتھ میری معروضات پر بھی توجہ کی جائیگی۔

مسجد نبوی میں درس بخاری شریف

مسجد نبوی میں شیخ عبدالرؤف آفندی مصری بخاری شریف کا درس دیتے ہیں اور بہت فصیح عربی بولتے اور اچھا درس دیتے ہیں ایک دوبار مجھے اُن کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا جس کے لطف کو ابتک محسوس کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اُنکے علم وعمل میں ترقی عطا فرمائے۔

افلاس کا جانکاہ نظارہ

مسجد نبوی میں یہ نظارہ بہت جانکاہ تھا کہ بھیک مانگنے والے بکثرت نظر آتے تھے جو بعض دفعہ لوگوں کی تلاوت قرآن اور نمازیں بھی حارج ہوتے تھے، حکومت حجاز ونجد کو اس طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے جبتک اہل مدینہ واہل مکہ کی تکالیف کا ازالہ نہوگا حکومت کو راحت واطمینان نصیب نہوگا اور سب سے مقدم جبریہ تعلیم کا اجراء ہے تاکہ اہل حرمین قرآن وحدیث کی دولت سے مالا مال ہوکر دنیا سے مستغنی ہوجائیں۔

اس مرتبہ ۲۴ ذی قعدہ کو ہمارا قافلہ مدینہ منورہ پہنچا تھا اس لئے حجاج کا ہجوم زیادہ نہ تھا کیونکہ قرب حج کی وجہ سے زیادہ تر مکہ معظمہ جاچکے تھے اس لیے محراب نبوی اور مصلے نبوی میں نماز کا اتفاق بکثرت اتفاق ہوا میں اس جگہ کے انوار کو کن لفظوں میں بیان کروں یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

مصلے نبوی کے انوار وبرکات

مگر غالباً اتنی بات تو سب کی سمجھ میں آجائے گی کہ اُن مقامات پر جتنی نمازیں پڑھی گئیں وساوس سے بالکل پاک تھیں اور میں محسوس کرتا تھا کہ قصد وارادہ کے ساتھ بھی اس مقام وسوسہ لانے کی گنجائش نہیں۔ اللہ اللہ! ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی جس مجسم کی محراب ومصلے میں اس قدر انوار ہیں کہ وہاں غیر اللہ کا وسوسہ بھی دل میں نہ آسکتا تو خود اُس نور مجسم کی صحبت میں بیٹھنے والوں کا کیا حال ہوا ہوگا خود حضور کے قلب انور واطہر کی کیا حالت ہوگی ؎

ساقی تراؔ مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تونے یہ مے شاہا شیشہ میں بھری ہوگی

۔۔۔دقبا ۔۔۔دن جمعہ کا تھا۔ اگلے دن سنیچر کو مسجد قبا کی زیارت کے لئے صبح
۔۔۔رفقاء کے گیا۔ کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سنیچر کے دن
۔۔۔ا تشریف لیجایا کرتے تھے اور یہ وہ متبرک مقام ہے۔ جہاں پر ہجرت کے موقع پر
۔۔۔ل اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے چودہ دن یا چار دن
۔۔۔فرمایا تھا اور اپنے دست مبارک سے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی جو اسلام میں سب سے
۔۔۔مسجد ہے جس کی کرامت و بزرگی کو اللہ تعالے نے قرآن شریف میں بھی بیان فرمایا ہے۔
۔۔۔جد اسّس علی التقویٰ من اول یوم احق ان تقوم فیہ ؕ فیہ رجال یحبون
۔۔۔یتطہروا واللہ یحب المطہرین ؕ

۔۔۔ضرت سیدنا حمزہ کی زیارت اس سے پہلے جمعرات کے دن حضرت سیدنا
حمزہ رضی اللہ عنہ اور شہداء احد کی زیارت کو
۔۔۔ا ہوا تھا۔ ان دونوں مقامات نے ابتدائے عروج اسلام کی تصویر نگاہوں کے سامنے
۔۔۔ی۔ حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر قبہ تو نہیں ہے مگر قبر ہنوز پختہ ہے
۔۔۔نہ معلوم حکومت سعودیہ کے ہاتھوں سے کیونکر بچ گئی۔ ہم لوگ جمعہ کے روز عشاء کے
۔۔۔ر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تھے۔ سنیچر کو پورے آٹھ دن ہو گئے اور اتوار کے دن مکہ
۔۔۔نظمہ کی طرف روانگی طے پائی۔

۔۔۔دینے سے مکہ کو روانگی مزور نے خبر دی کہ موٹر صبح ہی کو روانہ ہو جائے گا۔
اس لئے رات ہی سے سامان باندھ دیا گیا۔ صبح کی
۔۔۔ماز کے بعد دربار نبویہ میں رخصتی سلام عرض کرنے کیلئے حاضر ہوئے اسوقت مسلمانوں
۔۔۔ل جو کیفیت ہوتی ہے۔ اس کو دیکھنے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ آٹھ دن ایسے گذر گئے۔ کہ
۔۔۔معلوم بھی نہ ہوئے۔ اب رخصتی سلام کا وقت آیا تو حسرت بھرے دل سے سلام عرض کیا
۔۔۔ور دوبارہ توفیق حاضری کے لئے بہت بہت دعائیں کیں اور جو کچھ مانگنا تھا مانگ لیا

۔۔۔ا ؎ اگرچہ اس وقت مدینہ میں اسلام پھیل چکا تھا اور قبیلہ اوس و خزرج کے اکثر افراد حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے
۔۔۔مگر پھر بھی کچھ لوگ کفر و شرک پر قائم تھے اور یہودی قبائل کی بھی مدینہ میں خاصی تعداد تھی اس لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
۔۔۔نے دفعتہً مدینہ میں داخل ہونا پسند نہ فرمایا کہ مبادا مشرکین اور یہود کچھ فساد برپا کریں بلکہ پہلے متصل قبا میں جہاں بنی عمرو
۔۔۔[illegible] چند روز قیام فرمایا۔ تاکہ مشرکین یا یہود مدینہ کی حالت کا پتا معلوم ہو جائے۔ چنانچہ [illegible]
۔۔۔[illegible] کی حالت [illegible] اس وقت حضور [illegible] داخل ہونے کی تیاری کی۔ حضور کی ہمراہی
[illegible] کہ [illegible] جس کو [illegible] ضرورت ہے ۱۲۰

الحمد للہ کہ اس وقت بھی احباب و اصحاب کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لئے فلاح دارین اور شفاعت کی دعائیں کی گئیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ پھر "نودعک یا رسول اللہ غیر مودع ولا سراضین بغلا قلت" کہتے ہوئے چشم گریاں و سینہ بریاں کیساتھ مدینے کی گلیوں کو پیادہ پا طے کرتے ہوئے نو بجے باب العنبریہ پہنچے۔ جہاں موٹر ہم سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ یہاں کئی گھنٹے ٹھیرنا پڑا۔ کیونکہ سب موٹروں کو ساتھ روانہ ہونا تھا۔ یہ چند گھنٹے کا قیام اس لئے گراں نہ ہوا کہ مدینے سے نکلنے کو کسی کا جی ہی نہ چاہتا تھا۔ قبہ خضرا سامنے تھا۔ جس کو دیکھ دیکھ کر دل اُمڈا چلا آتا تھا۔ اور یہ تصور سوہان روح ہو رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں یہ بھی نظروں سے اوجھل ہو جاویگا۔ گھڑی میں بارہ بجے اور موٹر یکے بعد دیگرے روانہ ہونے لگے۔ میں اس وقت بیر سقیا کی زیارت کر رہا تھا۔ جو باب العنبریہ کے متصل ہی مدینے سے باہر ایک کنواں ہے۔ جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اکثر تشریف لایا کرتے اور اس کا پانی پیا کرتے تھے۔ جب موٹر روانہ ہونے لگے تو میں بھی سوار ہو اور ساڑھے بارہ بجے کے قریب مدینے سے باہر سنگستانی میدان میں موٹر تیزی کیساتھ چلنے لگا۔ اس وقت بے ساختہ زبان پر یہ اشعار آگئے۔

لو کنت ساعة بیننا ما بیننا	ورأیت کیف نکرر التودیعا
لعلمت ان من الدموع محدثا	وعلمت ان من الحدیث دموعا

ه

وکنت اظن ان القرب یطفی	لھیب الشوق فازداد اللہ

پندرہ بیس منٹ کے بعد مدینے کے در و دیوار آنکھوں سے اوجھل ہو گئے صرف مدینے کے پہاڑ اور وادی عقیق کا میدان دل کی تسلی کے لئے باقی ر

ذو الحلیفہ پر احرام باندھنا

گھنٹہ بھر میں منزل ابیار علی پر پہنچے جس کا قدیم نام ذو الحلیفہ ہے موٹر تھوڑی دیر ٹھیرا۔ یہاں سے وہ جگہ ذرا فاصلہ پر تھی جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا تھا اور یادگار کے طور پر اس جگہ مسجد بنا دی گئی ہے اکثر حجاج

...کی موجود تھی اور جن کو خبر تھی وہ بھی فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے سستی کر گئے
...لئے تقریباً تمام لوگوں نے قہوہ خانہ ہی میں ظہر کی نماز پڑھکر احرام باندھ لیا مگر خدا
...کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے رفقاء نے جن میں مستورات بھی تھیں سستی سے کام
...نہ لیا بلکہ سب کے سب اُس مسجد میں پہنچے جہاں سے حضور نے حجۃ الوداع میں
...احرام باندھا تھا۔ مسجد کے قریب ہی گیہوں اور جو کے کھیت تھے جن میں پانی دینے کیلئے
...ڈول چل رہا تھا۔ سب نے پانی کی گول پر وضو کیا۔ شیریں پانی تھا۔ پیاس لگ رہی
...تھی۔ وضو کرکے پانی خوب پیا۔ پھر ظہر کی نماز جماعت سے پڑھ کر احرام قرآن کی نیت کی
...اور لبیک بحجۃ و عمرۃ لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک
والملک لا شریک لک بلند آواز سے کہکر محرم بن گئے میرے ہمراہی سب کے سب قارن
تھے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال رہا کہ اس سفر میں بھی سنتوں پر عمل ہو گیا۔ اب دستِ...
...لبیک کا ورد تھا اور حاضری حرم کا اشتیاق لبیک پڑھتے ہی اُس بے چینی میں سکون
کی شان پیدا ہونے لگی ہے جو مفارقت مدینہ سے ہوئی تھی۔

موٹر کمپنی کا وکیل

آج ہمارے موٹر میں موٹر کمپنی کا وکیل بھی سوار تھا۔ اس لئے رفتار بہت تیز تھی۔ عصر اور مغرب کی نماز میں راستہ میں ادا ہوئیں...خیال تھا کہ نماز عشا منزل پر پڑھکر سو رہیں گے مگر وکیل صاحب نے نہ مانا۔ انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ منزل مستورہ اور رابغ کا درمیانی حصہ جو بہت زیادہ ریگستانی ہے راتہی میں طے کر دیا جائے تاکہ دن میں تمازت آفتاب سے تپتے ہوئے ریگستان میں سفر کرنے کی زحمت نہ ہو۔ رائے تو معقول تھی مگر موٹر میں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں درد کرنے لگیں اور جی گھبرا گیا تھا۔

...اس مقام پر اگر حکومت سعودیہ کے انتظام کی داد نہ دیجائے تو سخت بے انصافی ہوگی کیونکہ پہلے تمام قافلے قفلے سے علیحدہ ہونا سخت خطرہ کا سبب تھا مگر اس وقت ہمکو قافلے سے الگ کرکے فی الحفیظ تک جانے میں کسی خطرہ کا وسوسہ بھی نہیں گیا۔ نہ یہ وہم ہوا کہ موٹر میں سارا سامان چھوڑ کر تنہا ہیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں سامان کا کیا ...ہوگا۔ اس قسم کے خطرات کا اب کلی انسداد ہو گیا ہے کسی کی مجال نہیں کہ حاجی کو یا اُس کے سامان کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ ۱۲ منہ

میں نے بھی سے زبردستی آدھ گھنٹہ کے لئے مستورہ میں موٹر لیا اور اطمینان سے نو دو گھنٹے ٹھہرے
بجے پل - پھر سوار ہوئے عشا کے ایک گھنٹہ بعد رابغ پہنچے اور پہنچتے ہی قہوہ خانہ کی چارپائی
پر قبضہ کرکے بستر بچھا دیئے - بستر پر سر رکھنا تھا کہ ایسے سوئے جیسے سوداگر گھوڑے بیچ کر سوتا ہے
مگر حکومت سعودیہ کے انتظام کی داد دینا چاہئے کہ حجاج تو ایسی غفلت کی نیند میں مست تھے وہاں
سے لدے ہوئے موٹر قہوہ خانہ کے باہر کھڑے تھے - مگر کیا مجال کہ ایک چیز کو بھی کوئی ہاتھ
لگا لے "

اُمید نہ تھی کہ آج وقت پر آنکھ کھلے گی - مگر آفرین ہو بعض شب بیدار رفقاء کی ہمت پر کہ
اندھیری شب میں اُٹھ ہی بیٹھے اُن کی دیکھا دیکھی میں بھی اٹھا تہجد سے فارغ ہوکر صبح کی نماز پڑھی - پھر
اس خیال سے کہ شاید موٹر جلدی ہی روانہ ہو جائیگا ناشتہ کی فکر ہوئی کچھ سامان ساتھ تھا اُسے
قہوہ خانہ کی دوکان پر گرم کیا - روٹی گرم گرم خریدی ناشتہ کرکے چارپائی بستر پر لیٹے اور موٹر کی
روانگی کا انتظار کرنے لگے معلوم ہوا کہ ابھی روانگی میں دیر ہے - کیونکہ راستہ میں ایک موٹر
خراب ہوگیا ہے -

رابغ میں ۵ گھنٹہ قیام

کمپنی کا وکیل جو ہمارے موٹر میں دھرا ہوا تھا مندس
دمستری کو ساتھ لیکر اُسے درست کرانے لانے گیا ہے -
جبتک وہ واپس نہ آئیگا یہ موٹر بھی نہ چل سکیگا - میں نے پوچھا کہ آخر تخمیناً کتنی دیر کا کام ہے
کہا گیا یہی ایک دو گھنٹہ کا - مگر وہ ایک دو گھنٹہ اس بلا کے تھے کہ آفتاب نکلا بھی بلند بھی ہوا
سر پر بھی آگیا ظہر کی نماز بھی پڑھ لی - عصر کا وقت بھی قریب آگیا - دو گھنٹے پورے نہ ہوئے

رئیس محکمہ سے گفتگو

یہ صورت حال دیکھ کر مجھے تکلیف محسوس ہوئی تو سیدھا رئیس
محکمہ تفتیش کے دفتر میں پہنچا جو قہوہ خانہ کے قریب ہی ایک معمولی
سے مکان میں تھا مگر دروازہ پر سائن بورڈ لگا ہوا اور ایک سنتری دروازہ پر بندوق لئے ہوئے
کھڑا تھا - میں نے اُس سے کہا کہ مجھے رئیس محکمہ سے ملنا ہے - اُس نے اطلاع کی تو بجائے
بلانے کے رئیس صاحب خود ہی باہر تشریف لائے اور سلام و مصافحہ کے بعد عربی میں اس طرح
گفتگو ہونے لگی -

ں - جناب والا میں آپ سے اس تکلیف کی شکایت کرنے آیا ہوں کہ ہمارا موٹر بس یہاں پہ
ل ابھی سوا رہ سات عشا کے بعد یہاں پہنچ گیا تھا اور ہمکو امید تھی کہ کل عصر کے وقت تک
حلہ پہنچ جائیں گے - مگر افسوس کہ راستہ میں عصر کا وقت ہو گیا - اور موٹر ڈرائیور رستہ کا نام
الیتا - حج کا وقت قریب ہے - گو سردی اچھی ہے پھر بھی اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے
یں - غالباً آپ اُس موٹر کے سوار ہیں جس میں بہت سے عجمی لوگ ہیں -
ں - جناب ہم عجمی نہیں - میں عثمانی ہوں - میرے بعض رفقا علوی ہیں بعضے صدیقی
ں - ہاں یہ خطا ضرور ہے کہ ہم ہندوستان میں کسی وقت جا بسے تھے
ئیس - ہنس کر معاف کیجئے گا میری مراد عجمی سے عجمی النسل نہ تھی بلکہ عجمی السکونت
تھی
ں - تو جناب کو عجمی کی جگہ ہندی فرمانا چاہئے تھا - بیشک میں اُسی موٹر کا ایک سوار ہوں
س میں بہت سے ہندی ہیں
ئیس - غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک موٹر راستہ میں خراب ہو گیا ہے اور کمپنی کے وکیل کا
ض ہے کہ اُس کی سواریوں کو اپنے ساتھ لیجائے - اس لئے وہ موٹر درست کرنے اور
اُس کی سواریوں کو ساتھ لانے گیا ہے - کیونکہ وہ لوگ آپ سے زیادہ تکلیف میں ہیں -
یں - بیشک وکیل کا فرض ہے کہ حجاج کی راحت رسانی کی فکر کرے مگر اس کی دوسری صورت
بھی ہو سکتی تھی - جس میں ہمکو بھی تکلیف کا سامنا نہ ہوتا -
رئیس - وہ صورت کیا تھی -
یں - وکیل صاحب کسی دوسری موٹر کار میں اُن کے ساتھ آجاتے اور ہماری موٹر کو اپنی آمد
تک محبوس نہ کرتے -
رئیس غالباً وکیل کو یہ خبر نہ تھی کہ اُس لاری کی مرمت میں اتنی دیر ہو جائیگی کہ آپ کو یہاں عصر
کا وقت ہو جائے گا - بہت اچھا میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ آپ کی موٹر روانہ ہو جائے - وکیل کسی
دوسری موٹر میں آ جائیگا -
اس گفتگو کے بعد رئیس صاحب کا شکریہ ادا کرکے میں دفتر سے باہر نکلا اور عصر کی

رکابند و بست کر رہے تھے تو ڈرائیور دوڑتا ہوا آیا کہ جلد سوار ہو جائیے اب ہم دیر نہیں کرسکتا۔ میں نے کہا کہ عصر کا وقت آگیا ہے ہم رکعتیں پڑھ کر سوار ہوں گا۔ ڈرائیور نے کہا کہ آپ یہاں سے باہر نکل کر بھی عصر پڑھ سکتے ہیں۔ اب تاخیر کرتے ہیں مجھے خطرہ ہے سمجھ گیا کہ رئیس نے میرے پیچھے پیچھے یہ حکم بھیج دیا ہے۔ اس لئے ڈرائیور کے حواس بجا نہیں رہے۔ مگر میں نے سہولت اسی میں دیکھی کہ عصر کی نماز پڑھ کر سوار ہوں۔ اس نے اس کے تقاضے کی پرواہ نہ کر کے جماعت کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی مستورات نے بھی اپنے گھروں میں نماز پڑھی اور سوار ہو گئے۔ اس وقت ڈرائیور نے مجھے اپنے پاس جگہ دی جہاں کمپنی کا وکیل پہلے بیٹھا تھا۔ اس واقعہ سے غالباً ناظرین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ حکومت سعودیہ نے حجاج کی راحت کا کیسا عمدہ انتظام کیا ہے اور ان کی ذرا ذرا سی شکایت پر سعودی حکام کس قدر توجہ کرتے ہیں۔ غرض مغرب کے وقت منزل طوال میں پہنچے اور عشاء کے وقت ذہبان میں آئے۔ اس وقت رفقاء میں اختلاف رائے ہوا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر اسی جگہ آرام کریں یا جدہ پہنچ کر رات گذاریں کثرت رائے اس طرف ہوئی کہ جدہ پہنچنے پر اگر دروازۂ شہر کھلا ہوا نہ ملا تو بہت تکلیف ہوگی۔ اس لئے صبح کی نماز پڑھ کر یہاں سے روانہ ہونا چاہئے میں ابتدا میں بتلانا بھول گیا کہ مدینے اور منازل مدینہ میں سردی کے موسم میں سخت سردی ہوتی ہے چنانچہ مدینہ میں سخت سردی کا سامنا ہوا مگر بحمد اللہ سامان کافی تھا۔ اس لئے کوئی تکلیف نہیں ہوئی البتہ جن حضرات نے مدینہ کو مکہ پر قیاس کر کے گرم ملک سمجھ لیا اور سردی کا سامان کافی نہ لیا تھا ان کو تکالیف کا سامنا ہوا۔ مدینہ سے واپسی پر راستہ میں بھی بہت سردی ملی۔ چنانچہ ذہبان میں تو ایسی سردی تھی کہ کمبل وغیرہ سے بھی گرمی پیدا نہ ہوئی۔

جدہ میں یادِ حسنہ اور علماء کرام سے ملاقات

صبح کی نماز پڑھ کر معمولی ناشتہ کیا چائے پی اور جدہ کو روانہ ہو گئے۔ دو گھنٹے کے بعد جدہ پہنچ گیا۔ ہم اپنے وکیل عبدالکریم بخش کے مکان پر پہنچے تاکہ مدینے کے تبرکات اس کے گھر پر چھوڑ دیں اور ہلکے ہو کر مکہ معظمہ چلے جائیں۔ ہم وکیل کے مکان پر پہنچے ہی تھے کہ اس کے ملازم نے خبر دی کہ

ہندستان کے بعض علماء تمہاری تلاش میں ہیں جن میں سے ان کے نام دریافت کئے تو ایک تو مولانا مرغوب احمد صاحب ہیں جو رنگون سے آئے ہیں اور ایک مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب دیوبندی ہیں۔ ایک مولوی عرفان صاحب ہیں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اول مولانا مرغوب احمد صاحب سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے پھر مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب بھی تشریف لے آئے۔ سب حضرات سے مل کر جی خوش ہوا اور معلوم ہوا کہ آپ کل ہی رضوانی جہاز سے جدہ اُترے ہیں اور آج ہی مکہ معظمہ جانیوالے ہیں۔ میں نے کہا میں بھی ایک دو گھنٹہ کیلئے جدہ میں ٹھہرا ہوں۔ ابھی جانیوالا ہوں۔ پھر ہم سب اسباب کی درستی میں لگے۔ جو سامان یہاں چھوڑنا تھا چھوڑ دیا۔ باقی کو موٹر میں رکھنے کے لئے الگ کر لیا۔ اس سے فراغت ہو کر کھانے کا انتظام کیا۔ مستورات تو موٹر سے اُترتے ہی وکیل کے مکان میں پہنچ کر آرام کر رہی تھیں ہم نے اُن کو بازار سے کھانا لا کر دیا اور خود بھی کھایا۔

جدہ سے مکہ کو روانگی

اتنے ہی میں موٹر تیار ہو کر آ گیا۔ اور ۱۲ بجے سوار ہو کر جدہ سے روانہ ہو گئے۔ آج منگل کا دن تھا اور ذی الحجہ کی چار تاریخ تھی۔ جدہ سے ایک منزل تک راستہ بہت اچھا ہے جو موٹر کیلئے موزوں ہے ظہر کی نماز منزل بحیرہ پر پڑھی۔ یہاں سے چار پانچ میل تک راستہ بہت ریگستانی تھا جہاں موٹر کا چلنا اس مقدس زمین کی کرامت ہی سمجھنا چاہیے۔ مولانا مرغوب احمد صاحب اور ان کے رفقاء کی لاری ہم سے پہلے روانہ ہو چکی تھی۔ مگر راستہ میں فیل ہو کر پیچھے ہو گئی۔ ہماری موٹر کو بھی ریتلے میدان میں دقت کا سامنا ہوا۔ مگر فیل نہیں ہوئی۔ ریگستانی میدان ختم ہوتے ہی اعلام یعنی حد حرم کے نشان نظر آنے لگے۔ جن کو دیکھ کر دل کی جو کچھ کیفیت ہوئی زبان قلم اس کے بیان سے عاجز ہے۔ دل میں یہ خیالات موجزن تھے کہ اب ہم اللہ کی پناہ میں یعنی حرم میں داخل ہونے والے ہیں۔ جس کی بابت قرآن میں فرمایا گیا ہے و من دخلہ کان آمناً۔ بیساختہ زبان سے لبیک اللّٰھم لبیک نکلا اور دل کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ موٹر ریتلے میدان سے نکل کر تیزی کے ساتھ ہوا سے باتیں کر رہا تھا کہ اعلام حرم پر پہنچے

ڈرائیور نے بلند آواز سے کہا ھذا الاعلام اعلام الحرم اور ہم نے اس کے جواب میں
... اللھم لبیک کا نعرہ بلند کیا۔ اس کے بعد منزل شمیشیہ آئی جس کا قدیم نام حدیبیہ
... جدہ سے نیت باندھ کر چلے تھے کہ حدیبیہ میں اُتر کر دو رکعت نفل پڑھیں گے اور
... کنویں سے جس کا پانی غزوۂ حدیبیہ میں لشکر اسلام کیلئے ناکافی ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر اُس میں گڑوا دیا تھا جس سے دفعۃً پانی جوش مارنے
اور تمام لشکر کو کافی ہو گیا تھا۔ پانی پئیں گے۔ مگر حدیبیہ کے آتے ہی مستورات نے پیاس
... کہنا شروع کیا اور قہوہ خانے والے ٹھنڈے پانی کی صراحیاں سامنے لے آئے اُن کے
... دینے اور مستورات کو پانی پلانے میں اتنی دیر لگ گئی کہ موٹر کے قیام کا وقت ختم ہو گیا کیونکہ
... دس بارہ منٹ سے زیادہ وقفہ نہیں ہوتا۔ تھوڑی دور موٹر چلا تھا کہ سامنے جبل النور
نظر آنے لگا جس کا قدیم نام جبل حرا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدت تک خلوت نشینی
اختیار کی تھی اس کو دیکھ کر ابتداءِ نبوت کا منظر نگاہوں میں پھرنے لگا اور بے اختیار
درود شریف زبان پر جاری ہو گیا۔ اللھم صل وسلم وبارک علی سیدنا محمد
النبی الامی وعلی آلہ واصحابہ کما تحب وترضیٰ" ۴ بجے کے قریب جبل جرول سامنے
آیا جس کے پیچھے مکہ معظمہ آباد ہے۔ اس پہاڑ کی چڑھائی پر موٹر کا چلنا بھی ایک کرامت ہے

مکہ معظمہ کا داخلہ

اس سے اُترتے ہی پولیس کی چوکی پر موٹر ٹھیرا جہاں حجاج کی شمار
کی گئی اور اسی جگہ معلم کے آدمی ہمارے استقبال کو آگئے۔ حاجی عبدالستار ہمارے رفیق
سفر بھی یہیں ملے جو ہم سے پہلے مکہ معظمہ آگئے تھے اور خرچ کی کمی کی وجہ سے مدینہ منورہ
جا سکے تھے مستورات کو موٹر سے اُتار کر گھوڑا گاڑی میں سوار کیا گیا۔ گاڑی کے ساتھ
حاجی عبدالستار کو روانہ کیا تاکہ مستورات کو اُس مکان میں اُتار دیں جو معلم نے ہمارے واسطے
حرم کے متصل باب الزیادہ پر پہلے سے تجویز کر رکھا تھا اور ہم سب رفقاء پیادہ پا مکہ میں داخل
ہوئے۔ مکہ معظمہ کی آبادی بھی اس وقت شریف حسین کے زمانہ سے زیادہ معلوم ہوئی اور

مسجد الحرام اور بیت اللہ کی زیارت

رونق بھی بہت تھی تقریباً آدھ گھنٹہ میں ہم مسجد الحرام کے دروازہ پر
پہنچے بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی سفر کا تمام تکان جاتا رہا۔ اور

اللّٰھم زد بیتک ھذا تشریفاً و تعظیماً و تکریماً و مھابۃ وزد من شرفہ و عظمہ
ممن حجہ او اعتمرہ تشریفاً و تعظیماً و مھابۃ و برّاً لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر

طواف قدوم

ے نکلے پھر قریب جا کر حجر اسود کا استلام کیا۔ اور طواف قدوم شروع کر دیا۔ جس میں داہنا شانہ کھول کر تین شوط دوڑتے ہوئے پورے کیے اور چار آہستہ آہستہ۔ اس وقت کی حالت کا موازنہ وہی کر سکتا ہے جس نے یہ منظر اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں۔ اور دل کسی کے مشاہدہ میں محو ہوتا ہے اور جب بے شمار مخلوق کو جس میں امیر بھی ہوتے ہیں غریب بھی۔ بوڑھے بھی جوان بھی بچے بھی۔ عورتیں بھی۔ عربی بھی۔ عجمی بھی۔ مصری بھی۔ ہندی بھی۔ جاوی بھی سندھی بھی۔ ترکی بھی۔ افریقی بھی۔ گورے بھی کالے بھی۔ بیت اللہ کے گرد گھومتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔ تو بے ساختہ حافظ شیرازی کے یہ اشعار زبان پر آجاتے ہیں۔

غلام نرگس مست تو تاجدارانند — خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند
نہ من بر آن گل عارض غزل سرایم و بس — کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارانند

طواف قدوم کے بعد دو رکعتیں پڑھی گئیں۔ پھر دعا مانگ کر عصر کی نماز رفقاء کے ساتھ جماعت سے ادا کی۔ اس کے بعد سعی کا ارادہ ہوا مگر وقت کی قلت کی وجہ سے سعی کو مغرب کے بعد پر ملتوی کیا گیا۔ اب ہم حرم ہی میں بیٹھے ہوئے بیت اللہ کے نظارے سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو راحت و سکون پہنچاتے رہے۔ تھوڑی دیر میں مغرب کی اذان ہوئی۔ امام حرم کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر سنتیں پڑھ کر سعی کے واسطے روانہ ہوگئے اوّل جبل صفا پر پہنچے اور حدیث کی دعائیں پڑھ کر سعی شروع کی میلین اخضرین کے درمیان رب اغفر وارحم انت الاعز الاکرم کہتے ہوئے تیزی کے ساتھ دوڑ لگائی یہ عمل حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی سنت اور ان کی یادگار ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حق تعالیٰ کے حکم سے ان کو اس سرزمین مقدس میں جو اس وقت بے آب و گیاہ تھا۔ اکیلی تنہا چھوڑ گئے انکی گود میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شیر خوار بچہ بھی تھے چند روز میں پانی کا مشکیزہ خالی ہو گیا۔ کھجوریں ختم ہو گئیں دودھ خشک ہو گیا تو حضرت اسمٰعیل بھوک و

پیاس میں ایڑیاں رگڑنے لگے۔ اور حضرت ہاجرہ کا کلیجہ اپنے بچہ کی بے تابی دیکھ کر منہ کو
آنے لگا۔ تو وہ پانی کی تلاش میں اوّل صفا پہاڑ پر چڑھیں وہاں پانی کا نشان نہ ملا تو مروہ
کی طرف چلیں۔ کچھ حصۂ زمین نشیب میں واقع تھا۔ جس میں چلتے ہوئے بچہ نگاہ سے اوجھل
ہو جاتا تھا تو وہ اس حصہ کو دوڑ کر طے کرتی تھیں۔ مروہ پر بھی پانی نہ ملا تو پھر گھبرا کر صفا پر آئیں
اسی طرح سات چکر لگائے حق تعالیٰ کو اُن کی یہ ادا پسند آگئی تو قیامت کیلئے صفا مروہ
کی سعی تمام مخلوق پر لازم کر دی گئی۔ تاکہ سوچنے والے سوچیں۔ سمجھنے والے سمجھیں کہ ایک
عورت ذات نے خدا کی اطاعت اور اُس کی رضا میں کیسی جوانمردی اور ثبات قدمی
وصبر و استقلال کا ثبوت دیا تھا۔ مردوں کو اس سے سبق لینا چاہیے اور عورتوں کو
اُن کے اتباع کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سعی سے فارغ ہو کر مکان پر گیا۔ کھانا کھایا۔
جو معلم صاحب کے مکان سے بطور ضیافت کے آیا تھا۔ پھر نماز عشا ادا کی اور عشا کے بعد
دوسرا طواف عمرہ کیلئے کیا۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک قارن پر دو طواف اور دو سعی
لازم ہیں۔

سلطان کا طواف اور سعی کیلئے تشریف لانا

طواف سے فارغ ہو کر سعی کرنے گیا تو صفا سے مروہ تک
راستہ کے دونوں طرف نجدی سپاہیوں کا سنگین
پہرہ تھا کیونکہ جلالۃ الملک سلطان ابن سعود بھی آج ہی نجد
سے تشریف لائے اور عشا کے بعد طواف وسعی کرنے بیت اللہ میں آئے تھے جس وقت
میں طواف کر رہا تھا اُس وقت تک کسی کو مطاف سے باہر نہیں نکالا گیا تھا۔ مگر تھوڑی دیر
بعد ہی مطاف کو سلطان اور اُن کے رفقاء کیلئے خالی

مطاف وسعی کو خالی کرانے پر اعتراض

کرا دیا گیا۔ اور علماء خصوصاً علماء ہند نے سلطان کے
اس فعل کو بنظر کراہت دیکھا۔ کیونکہ سیدنا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اپنے واسطے کبھی مطاف کو خالی نہیں کرایا
بلکہ ہمیشہ سب کی ساتھ مل جل کر طواف کیا ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد بھی کسی خلیفۂ وقت
کیلئے تاریخ میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ پس یقیناً یہ فعل سنت کے خلاف ہے اور

بدعت میں داخل ہو ممکن ہے یہ کہا جائے کہ سلطان کو سب کے ساتھ طواف کرنے میں کچھ خطرہ ہوگا۔ مگر یہ تاویل اس لئے غلط ہے کہ مسجد حرام سے زیادہ مجمع عرفات کی مسجد نمرہ میں ہوتا ہے اور سلطان صرف پانچ چھ سپاہیوں کے سنگین پہرہ میں وہاں تشریف لائے اور مسجد کو خالی نہیں کرایا گیا اور اگر فرض کر لیا جائے کہ سلطان کو سب کے ساتھ طواف کرنے میں خطرہ ہے تو اس صورت میں آپ کو ہر سال طواف غسل کعبہ کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ فریضہ حج تو ادا کر چکے ہیں۔ صرف حج نفل کیلئے اس بدعت کے ارتکاب کی کوئی ضرورت نہیں جو ہر سال دنیا کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔ اور اگر ایسی ہی ضرورت ہو تو آدھی رات کو بھیس بدل ایسے وقت بھی وہ طواف کر سکتے ہیں جب حرم میں ان پانچ غریبوں کے سوا کوئی نہ ہو اور اس صورت سے کر سکتے ہیں کہ کسی اُن کی اطلاع ہی نہ ہو۔

اُمید ہے کہ جلالۃ الملک سلطان ابن سعود خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ میری اس خیر خواہانہ گذارش پر پوری توجہ فرمائیں گے چونکہ جلالۃ الملک کو اتباع سنت کا بہت خیال ہے اس لئے دل چاہتا ہے کہ آپ کی کوئی ادا ایسی نہ ہو جو سنت نبویہ سے واقف کار نظروں میں منکر و بدعت ہو کر ظاہر ہو۔

شاہی ضیافت میں شرکت

۵۔ ذی الحج کو جلالۃ الملک سلطان کی طرف سے دعوتی خط موصول ہوا جس میں ۶۔ ذی الحجہ کو عصر کے بعد قصر شاہی میں تناول طعام اور تقریر شاہی سننے کیلئے بلایا گیا تھا۔ سلطان کی عادت ہے کہ ہر سال عمائد حجاج کو قصر شاہی میں مدعو فرمایا کرتے ہیں اور عمائد کا علم معلمین و مطوفین کے ذریعہ سے انکو ہوتا ہے معلمین اپنے حاجیوں میں جس کو علم یا دولت میں بڑھا ہوا دیکھتے ہیں اس کا نام سلطان کے سکرٹری کے پاس بھیج دیتے ہیں سلطان کی طرف سے اُسکے نام دعوتی خط معلم کے ذریعہ سے پہنچ جاتا ہے۔ میرے معلم نے میرا نام بھی بھیج دیا تھا اس لئے مجھے بھی شاہی مہمان بننے کی عزت حاصل ہوئی۔

سلطان قصر شاہی میں

یہاں اس بات کا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ نجدی قوم جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کو قصر شاہی سے باہر تو سلطان

کی شان میں ظاہر کرتی ہو کہ اوّل رستہ کے دونوں طرف سنگین پہرہ ہو جاتا ہے موٹروں کا ایک سلسلہ بندھ جاتا ہے۔ جن میں بڑے بڑے افسر یکے بعد دیگرے آتے ہیں پھر سلطان کا موٹر آتا ہے اور تمام افسر اور فوجی سرو قد ہو جاتے ہیں مگر گھر کے اندر وہ سلطان سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جیسا گاؤں کے کاشتکار اپنے زمیندار یا چودھری سے کیا کرتے ہیں دیکھنے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں بادشاہ کون ہے اور وزیر کون؟ اور خادم کون ممکن ہے کہ کسی کو یہ طرز ناپسند ہوا ہو اور میں دیکھ رہا تھا کہ بعض ہندوستانی بات بات پر اعتراض کر رہے تھے۔ مگر میں دل سے اسی کا خواہاں تھا اس لئے مجھے اس سے مسرت ہوئی کہ سلطان بھی اپنی رعایا کی طرح ایک آدمی ہے۔ بس اتنا فرق تھا کہ دوسرے معمولی آدمی تھے اور سلطان ایک خاص درجے کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں غرض اسلامی مساوات کی ایک نمایاں جھلک نظر آتی تھی جس سے مجھے خاص حظ حاصل ہوا۔

حمیدیہ میں اجتماع

عصر کے بعد تمام مہمانوں کو اوّل حمیدیہ میں جمع کیا گیا جو کسی زمانہ میں ترکی عدالت تھی اور اب بھی اُس کا نام ترکوں کی یاد کو تازہ کر دیتا ہے۔ یہ عمارت مسجد حرام سے ملی ہوئی بڑی عالیشان ہے وسیع وسیع کمرے بنے ہوئے ہیں مگر سامان زینت و آرائش زیادہ نہیں ہے سادگی برتی ہے۔ تقریباً ۴۵ منٹ تک ہم یہاں بیٹھے رہے پھر سلطانی موٹریں مہمانوں کو لینے کیلئے آئیں اور یکے بعد دیگرے ایک ایک موٹر روانہ ہوئی

قصر شاہی میں داخلہ

مغرب کے قریب ہم قصر شاہی میں پہنچے۔ دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ تھا اور ایک نقیب بھی کھڑا ہوا تھا۔ جو ہر مہمان سے دعوت نامہ طلب کرتا اور دستخط کر کے اندر جانے کی اجازت دیتا تھا۔ بہت سے مہمان احرام باندھے ہوئے ننگے سر لنگی اور چادر پہنے ہوئے تھے اُن کو ایسی حالت سے اندر جانے کی اجازت دیدی گئی۔ جو بغیر احرام کے تھے وہ پورا لباس پہنے ہوئے سر پر عمامہ یا ترکی ٹوپی رکھے ہوئے قصر شاہی میں داخل ہونے کے بعد ایک پر فضا باغیچہ نظر پڑا جو سرزمین حجاز میں نئی چیز تھی گملوں میں بھی قسم قسم کے پھول لگے ہوئے تھے اس باغیچہ سے گذرتے ہوئے ایک زینہ پر چڑھے جس کی سیڑھیوں پر قیمتی مخملی قالین بندھی

ہوئی اور محل کی سلاخوں سے جھانک رہی تھی منزل پر خلاف شرع بڑے بڑے مکرے تھے جن میں جانے کیلئے کرسیاں بچھی ہوئی اور قیمتی مخملی قالین جوتوں کے تلے تھے۔ یہ تکلف اور سامان زینت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا اگر رعایا کے حجاز میں افلاس کا غلبہ نہ ہوتا تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ آج کل شان سلطانی لوازمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قیمتی مخملی قالین جوتوں میں روندے جائیں مگر جس ملک کی رعایا ایسی مفلس ہو کہ حاجیوں کی چوسی ہوئی پھینکی ہوئی ہڈیوں پر بھی گرتی پڑتی ہو۔ فاقے پر فاقے کرتی ہو۔ بدن چھپانے کیلئے کپڑا میسر نہ ہو اس کا بادشاہ اپنے محل کی سیڑھیوں اور فرش پر مخملی قالین کا غلاف چڑھائے۔ جائے حیرت ہے

علمائے نجد کو مشورہ نہ معلوم علماء نجد نے سارا اتباع سنت مسئلہ شد رحال اور مسئلہ توسل اور ہدم بناء علی القبور ہی میں کیوں منحصر کر دیا۔ کیا یہ عجمی تکلفات اور اسرافات اتباع سنت کیخلاف نہیں۔ اگر حکومت سعودیہ کتاب اللہ اور سنت رسول پر واقعی چلنا چاہتی ہے تو اس کو ان تکلفات سے یکلخت الگ ہو جانا چاہیے اور ان قالینوں کو فروخت کر کے حجاز کی مفلس رعایا میں روپیہ تقسیم کر دینا چاہیے"۔

جلالۃ الملک سلطان سے معروض جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کو حضرت سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد کرنا چاہیے۔ کہ جس وقت حجاز میں سخت قحط اور افلاس رونما ہوا تو آپ نے گھی کو چھوڑ کر زیتون کا تیل کھانا اختیار فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ تیل کے استعمال سے آپ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا اور غذا اتنی کم کر دی تھی کہ دیکھنے والوں کو آپ پر رحم آتا تھا۔ رعایا کی بدحالی اور مفلسی کے زمانہ میں سلطان اسلام کو ایسا ہی کرنا چاہیے"۔

میں نے سنا ہے کہ آجکل پائے تخت ریاض میں بھی عالیشان عمارتوں کی تیاری پر بینظیر روپیہ صرف کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو میں اس پر بھی اپنے دلی رنج و افسوس کا اظہار کئے بغیر نہ رہوں گا۔ جلالۃ الملک کو عالیشان قصر و محل کی اصلا ضرورت نہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ ضرورت رعایا کی اقتصادی حالت سنبھالنے کی ہے تاکہ قلوب علماء سلطان کی محبت سے پیوستہ ہو جائے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک اہل حجاز کے

داری میں جلالۃ الملک کی ہمت نے گھر نہیں کیا۔ حجاز میں دس سال سے زیادہ مدت اُن کی حکومت کو ہو گئی ہے۔ اور اس کے اسباب میں دوسری وجوہ کیساتھ اس کو بھی بڑا دخل ہے کہ رعایا پروری اور تالیفِ قلوب کے اُصول سے کام نہیں لیا گیا۔ اہلِ حجاز کے قلوب پر رعبِ حکومت کا سکہ تو خوب جما ہوا ہے مگر محبت والفت کی مہر نہیں لگی۔ حالانکہ استحکام و استقلالِ سلطنت کیلئے دونوں کی ضرورت ہے۔"

قہوہ کا دور

مغرب سے پہلے ایک دور قہوہ کا چلا میں نے اور میرے ہمراہی علماء نے تو نہیں پیا کیونکہ ہمیں اس کی عادت نہیں باقی اکثر لوگوں نے پیا اس کے بعد محل شاہی میں سے اذان کی سنائی دی اور سب مہمان قصر شاہی کے بالائی حصہ پر پہنچ گئے

قصر شاہی میں جماعت مغرب

جہاں کھلی ہوئی چھت پر جانمازیں بچھی ہوئی تھیں۔ اذان ختم ہونے کے بعد سلطان اپنے ایڈیکانگ کے ساتھ چند سپاہیوں کے درمیان تشریف لائے۔ صف اول میں کھڑے ہو گئے۔ امام آگے بڑھا اور نماز شروع ہو گئی۔ نماز کے بعد سلطان نے سنتیں ادا کیں۔ میں نے خوب غور سے دیکھا کہ آپ نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ نماز

سلطان کی نماز

پڑھ رہے تھے لباس سادہ تھا۔ اور خالص عربی۔ ایک مشجر نجد کا بنا ہوا پہنے تھے جس کی گردن پر تین اُنگل چوڑا زردوزی کام تھا۔ سر پر عقال تھا کسی قسم کا تکلف لباس میں نہ تھا۔ میرے دل پر سلطان کی سادگی اور باخشوع نماز نے گہرا اثر کیا۔ سنتوں سے فراغت کے بعد سب مہمانوں نے سلطان سے مصافحہ کیا۔

جلالۃ الملک سے مصافحہ اور ملاقات

میں بھی آگے بڑھا اور السلام علیک یا سلطان المسلمین کہکر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھائے اس وقت سلطان کے چہرہ پر تبسم آمیز بشاشت جلوہ گر تھی آپ کا قد لمبا ہے۔ چہرہ رعب دار نہیں۔ مگر دلوں کو اپنی طرف کشش کرنے والا ہے۔ مہمانوں سے ملاقات فرما کر سلطان ایک کمرہ میں تناول طعام کیلئے تشریف

کھانا

لیگئے اور مہمانوں نے دوسرے کمروں میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے میں ترکی تمدن کا اتباع کیا گیا تھا۔ میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں کھانا

سادہ چھری کانٹا بھی رکھا ہوا تھا۔ اور خالی پلیٹیں بھی۔ غنیمت ہوا کہ ہم لوگوں کو چھری کانٹے کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ سلطانی میزبان ہر چیز اپنے ہاتھ سے کاٹ کاٹ کر ہمارے سامنے رکھتا جا رہا تھا کھانا بہت عمدہ تھا اور مختلف الانواع و اقسام پر مشتمل تھا شاید میوے بھی اسی قسم کے تھے۔ ہاں سالن میں مرچ کا نام نہ تھا مجھے اس بات سے افسوس ہوا کہ عربی و اسلامی تمدن چھوڑ کر ترکی تمدن اختیار کیا گیا تھا۔ میں امید کرتا ہوں کہ سلطان آئندہ اپنے تمام کاموں میں اسلامی سادگی اختیار فرمایا کریں گے۔ کہ خیر و برکت اور کامیابی و کامرانی اسی میں مضمر ہے۔

کھانے سے فراغت پا کر ہم سب اسی بالائی حصہ پر جہاں نماز مغرب ادا کی تھی پہنچ گئے۔ کیونکہ سلطان کی تقریر ہونے والی تھی۔ یہاں اب جانمازوں کی جگہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن پر مہمانوں نے قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ ایک تخت پر سلطان کیلئے بلند کرسی رکھی ہوئی تھی تاکہ آسانی سے سب کو آواز پہنچ سکے۔

تقریر سلطانی کا نظارہ

دس پندرہ منٹ کے بعد سلطان تشریف لائے۔ اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے، اس وقت اگر سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے تو سب کو اچھی طرح آواز پہنچ جاتی۔ مگر سلطان کے تشریف لاتے ہی لوگوں نے قریب پہنچنے کی کوشش کی کوئی کرسی آگے بڑھانے لگا۔ کوئی آگے بڑھکر کھڑا ہو گیا۔ کوئی کرسی ہی پر کھڑا ہو گیا، غرض مجلس کا نظام ایسا مختل ہوا کہ سلطانی تقریر مسلسل سننے میں نہ آئی کوئی بات سنائی دی تو کوئی رہ گئی، اس لئے میں اس مقام پر اپنی یاد سے تقریر سلطانی کا جو خلاصہ لکھونگا وہ مسلسل تقریر کا خلاصہ نہیں ہے بلکہ جس قدر سنا تھا اسی کا ماحصل ہے۔ یہ تقریر ام القری میں بزبان عربی شائع ہو چکی ہے اگر میرے بیان میں کوئی بات اس کے خلاف ہو تو ام القری ہی کے بیان پر اعتماد کرنا چاہئے کیونکہ اس میں سلطانی ذمہ داری کے ساتھ تقریرات شائع کی جاتی ہے جلالۃ الملک سلطان ابن سعود بہت اعلیٰ درجہ کے مقرر ہیں، جوش کے ساتھ آپکی تقریر جذبات سے بھی لبریز ہوتی ہے بڑی روانی اور سلاست بیانی کے ساتھ آپ خطبہ دیتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی

جلالۃ الملک عربی شجاعت کیساتھ عربی فصاحت کے بھی جامع اور صاحب اللسان ہونے
ساتھ اعلیٰ درجہ کے صاحب اللسان بھی ہیں۔ خواہ کوئی کچھ ہی کہے۔ مگر میں تو سلطان
اس وقت جتنے سلطان سمجھتا ہوں۔ جلالۃ الملک میں وہ سب باتیں موجود ہیں۔ جو
سلطان اسلام کی شایان شان ہیں۔ کاش اُن کے مشیر اور وزراء بھی اُن ہی جیسے
دیندار اور مدبر و شجاع ہوں تو پھر سلطنت سعودیہ کی طاقت کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ اس
تمہید کے بعد سلطانی تقریر کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔

تقریر سلطانی کا خلاصہ

سلطان نے حمد و صلوٰۃ کے بعد ارشاد فرمایا کہ دنیا کو
بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے مسلم ہوں پھر عربی ہوں مجھے
اپنے عربی ہونے پر کچھ فخر نہیں بلکہ اس پر فخر ہے کہ میں مسلمان ہوں عربی اور عجمی سب
انسان ہی ہیں۔ اگر عربی کو عجمی پر فضیلت ہو سکتی ہے تو اُسی وقت جبکہ وہ مسلم اور متقی ہو
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ میرے اندر عربی خون ہے عربی
حمیت و غیرت ہے۔ مگر یہ سب باتیں اسلام اور صرف اسلام کی وجہ سے موجب عزت ہیں
ورنہ اس میں کچھ بھی عزت نہ تھی، میں سب مسلمانوں کو اپنا بھائی اور دست و بازو سمجھتا ہوں
کسی کو اپنے سے کم نہیں سمجھتا، یہ حکومت اور سلطنت جو میرے پاس ہے محض خدا کی دی
ہوئی ہے کسی دوسرے کو اس میں اصلاً دخل نہیں۔ میرے ایک ہاتھ میں کتاب اللہ ہے۔
دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اس لئے خدا کی مدد اور طاقت میرے ساتھ ہے اور اسی کی
برکت سے مجھے یہ سلطنت ملی ہے اور جب تک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم میرے نصب العین ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خدا میرے ساتھ ہے اور خدا کی طاقت اور
مدد میری پشت پناہ ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ دو چیزیں میرے نصب العین نہ رہیں تو پھر
ایک ادنیٰ غلام بھی مجھے اپنا غلام بنا سکتا ہے[1] میں اہل بیت نبوت کا احترام کرتا ہوں
اُن کی عزت و تعظیم کو اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں مگر اسی وقت تک جبتک وہ اپنے
جد امجد سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور شریعت کا احترام کرتے ہیں اور

---

[1] غالباً امام یحییٰ سلطان یمن کی طرف اشارہ تھا۔ ۱۲

...ہ باوجود اطاعت رسول ہونے کے اپنے آباء و اجداد کی سنت و شریعت کو ٹھکرائیں تو میں ...
...کو دوسروں سے زیادہ موردِ ملامت اور قابلِ تعزیر سمجھتا ہوں۔ یہ کتاب اللہ اور سنت ...
...ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ بیت نبوت سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اپنا احترام
...تی ہے۔ کیونکہ اُن کے گھر میں یہ دولت نازل ہوئی ہے۔ اگر وہی اس کی بے قدری
...نے لگیں تو اُن سے بڑھکر کون ظالم ہوگا۔ بعض لوگوں کو ہمارے مسلک پر کچھ اعتراضات
...ں۔ میں اُن سے کہدینا چاہتا ہوں کہ ہمارا مسلک کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ
...یہ وسلم پر عمل کرنا ہے۔ میں کسی خاص مذہب کا پابند نہیں ہوں۔ اگر مجھے کسی مذہب کی
...ئی بات کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے زیادہ موافق معلوم ہوتی ہے تو بے تکلف
...ے لیتا ہوں؛

میں مذاہب اربعہ میں سے ہر مذہب کا احترام کرتا ہوں؛ و باوجودیکہ ہم حنبلی ہیں۔ مگر ہم نے
...نصاب تعلیم میں عقیدۃ الطحاوی کو داخل کیا ہے۔ حالانکہ اُس کے مصنف بھی حنفی ہیں
...شارح بھی؛ مگر ہم نے اس کتاب کو قرآن و حدیث کے موافق پایا تو بے تکلف نصاب تعلیم
...ں داخل کر دیا۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے اُمیدوار اور اُس پر عقیدہ
...ازم رکھتے ہیں؛ مجھے اُس شخص کے ایمان ہی میں کلام ہے جو شفاعت محمدیہ کا منکر ہے۔
...ں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص باوجود دعویٰ اسلام کے شفاعت کا انکار کیونکر کر سکتا ہے
...ن مسائل میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے۔ اُن میں جس قول کو ہم کتاب اللہ اور سنت رسول
...کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں اُس کو اختیار کر لیتے ہیں چنانچہ تارک صلوٰۃ کے متعلق ہم نے
...م احمد بن حنبل کا یہ قول اختیار کر لیا ہے کہ تارک صلوٰۃ گو کافر نہیں مگر واجب القتل
...ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں کوئی بھی تارک صلوٰۃ نہیں ہو سکتا۔ میں مسلمانوں
...رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرنے کی وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ
...ں خیر خواہی کرو۔ رسول کی خیر خواہی کرو۔ اور ائمہ اسلام کی خیر خواہی کرو۔ کتاب اللہ کی
...خواہی یہ ہے کہ اس کو گھر میں بند کر کے نہ رکھو بلکہ پڑھو اور اُس کے معانی و حقائق کو سمجھو
...ں کے اوامر و نواہی پر کان لگاؤ۔ جن کاموں کا قرآن میں حکم ہے اُن کو بجا لاؤ جن کاموں سے

سنے کیا گیا ہے۔ اُن سے بتا جاؤ۔ رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ اُس کی سنت کو زندہ کرو سنت کی اشاعت کرو، بدعات کو عالم سے مٹا دو۔ کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں جھونکنے والی ہے، ائمۂ اسلام دو قسم کے ہیں۔ ایک صحابہ و تابعین، مجتہدین و علمائے کرام ان کی خیر خواہی یہ ہے ..... کہ اُن کا احترام کرو اور شریعت اسلامیہ کے جو مسائل و احکام انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول ..... سے استنباط کر کے بیان فرمائے ہیں اُن کو اپنا دستور العمل بناؤ۔ اپنی فہم کو اُن کی فہم سے اعلیٰ نہ سمجھو اپنی رائے کو اُن کی حکمت کے برابر نہ قرار دو کیونکہ سلف صالحین اتباع نفس و اتباع ہویٰ سے پاک تھے اور ہم ہوائے نفس کے غلام ہیں۔ ہماری فہم ہماری عقل میں اُن کی برابر نور کہاں، وہ خیر القرون میں تھے ہم شر القرون میں ہیں، ائمۂ اسلام کی دوسری قسم وہ سلاطین و حکام اسلام ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں دین اسلام کی محافظت کرتے اُس کا بول بالا کرتے اور حدود و احکام کا اجراء کرتے ہیں۔ اُن کی خیر خواہی یہ ہے کہ اُن کی اطاعت کرو۔ جبتک وہ اللہ و رسول کی اطاعت کرتے رہیں، ان کی بیعت کو پورا کرو اور جبتک وہ کھلم کھلا شریعت کی مخالفت پر آمادہ نہ ہو جائیں اُن سے بغاوت نہ کرو۔ اُن کے احکام کی تحقیر و توہین نہ کرو۔

تقریر سلطانی کے خاتمہ پر یحییٰ جلالۃ الملک السلطان عبد العزیز آل سعود (زندہ باد جلالۃ الملک سلطان ابن سعود) کے نعرے بلند ہوئے۔ اور ایک شامی یا مصری نوجوان نے کھڑے ہو کر سلطان کے اُن کارناموں کا شکریہ ادا کیا جو خدمت اسلام و مسلمین میں اُنھوں نے انجام دیے ہیں اور بہت کچھ مدح سرائی کے بعد جنگ نجد و یمن کے متعلق اسی قسم کے الفاظ کہے کہ عالم اسلامی اس جنگ کی وجہ سے بہت متفکر ہے اور منتظر ہے اس کے نتیجہ کا۔ خیر ہو گئی ہو اللہ تعالیٰ انجام بخیر فرمائے اور جلالۃ الملک کو اپنے مقاصد میں کامیاب بنائے۔“

اس فقرہ کو سُنکر سلطان نے دوبارہ تقریر شروع فرمائی جس کا ماحصل یہ تھا۔ ”میں نے بعض مصالح کی بنا پر اس وقت نجد و یمن کی آویزش کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ مگر میرے ایک بھائی نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے تو اب اس کے متعلق بھی کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں“

ے نجد و یمن کے
ق سلطانی ارشاد

حقیقت یہ ہے کہ یحییٰ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور میرے دل میں
اُن کی محبت و حرمت موجود ہے اور میں اُن کے لئے وہی
چاہتا ہوں جو اپنے لئے چاہتا ہوں۔ مگر افسوس یحییٰ نے مجھے
بھائی اور دوست نہ سمجھا۔ ہم نے اس قرطاس اخضر (سبز کتاب) کی اشاعت کا حکم
دیا ہے جس میں وہ تمام مکاتبات و مکالمات درج ہیں جو ہمارے اور یحییٰ کے درمیان
ہوئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہر شخص کو اندازہ ہو جائیگا کہ ظلم و تعدی کی ابتداء کس کی
طرف سے ہوئی ہے۔ اس نزاع کی ابتداء قضیۂ نجران سے ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ نجران
ان کا ہے اور میں کہتا ہوں کہ ہمارا ہے۔ میرے آباؤ اجداد کی یہاں حکومت تھی اور اُن کے
عمال وہاں ہمیشہ سے کام کرتے رہے ہیں۔ یحییٰ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نجران کی
اکثر رعایا یمنی ہے اس لئے وہ یمن کا جزو ہے۔ بھلا کسی ملک میں اگر دوسرے ملک
کی رعایا آکر آباد ہو جاوے تو کیا یہ ملک اس اکثریت کے ملک کا جزو ہو جائیگا۔ فرض کرو
مکہ مدینہ میں یمن کے باشندے زیادہ مقیم ہو جائیں تو کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ اس سے
مکہ یا مدینہ یمن کا جزو بن جائے گا۔ میں نے یحییٰ کو بہت سمجھایا کہ جنگ کے ارادہ سے باز
آؤ اور انصاف کے ساتھ اس نزاع کا فیصلہ کرو۔ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا
تمہارا ملک دبانا چاہتا ہوں۔ یحییٰ اس کے جواب میں کید اور خداع سے اپنی خلوص نیت
محبت و مودت کا اظہار کرتے رہے۔ اور لکھا کہ میں اس سے بالکل بے خبر ہوں کہ نجران کی
طرف یمنی افواج پیش قدمی کر رہے ہیں۔ میں اپنے ولی عہد کو اس سے روک دونگا اور صلح و
مصالحت سے اس نزاع کا فیصلہ کر لوں گا۔ آپ مطمئن رہیں میری طرف سے اخوت و محبت
کے سوا کچھ ظاہر نہ ہوگا۔

ہم سے تو یہ باتیں کی جاتی تھیں۔ مگر افواج یمن برابر بڑھتی چلی جاتی تھیں۔ میں نے
یحییٰ کو پھر لکھا کہ آپ کی فوج کس لئے میری حدود میں بڑھ رہی ہے۔ حالانکہ آپ مصالحانہ
گفتگو پر آمادہ ہیں۔ اس کا جواب بھی یہی دیا گیا کہ میں نے افواج کو پیش قدمی سے روک دیا
ہے۔ آپ مطمئن رہیں میری طرف سے جنگی اقدام نہ ہوگا۔

قول یہ تھا اور عمل یہ کہ فوجیں برابر بڑھ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ نجران پر بھی قبضہ کرلیا گیا اور چند پہاڑی علاقوں پر بھی۔ لیکن میں نے اپنی فوجوں کو حملے سے روک رکھا تھا۔ اور کہدیا تھا کہ بدون میری اجازت کے ہرگز حملہ نہ کیا جائے۔ جب میں نے دیکھا کہ یحییٰ کا قول کچھ ہے اور عمل کچھ تو اُن کو پھر سختی سے لکھا کہ اب میں مدافعت پر مجبور ہوں ورنہ جلد اس نزاع کا فیصلہ ہونا چاہئے۔ میں نے یہاں تک لکھدیا کہ میں مسلمانوں کی خونریزی سے بچنے کے لئے اس پر بھی راضی ہوں کہ نجران کو آزاد علاقہ قرار دیا جائے نہ اُس پر میرا قبضہ ہو نہ آپ کا۔ اس کے جواب میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا اور لکھا گیا کہ آپ جلد مقام نہم میں اپنا ایک وفد بھیجدیں۔ میں بھی اپنا وفد بھیجونگا۔ دونوں ملکر شرائط صلح طے کرلیں گے۔ میں نے اس کے جواب میں فوراً اپنا وفد بھیجدیا۔ مگر جو کچھ اس وفد کا انجام ہوا دنیا کو معلوم ہے کہ اس وفد کو گرفتار کرلیا گیا۔ چنانچہ اس مجلس میں بھی رئیس وفد موجود ہے جو بڑی دقت اور حیلہ و تدبیر کے ساتھ یمن کی قید سے نکل کر آیا ہے۔ میرے وفد نے جب یحییٰ کو وہ معاہدات یاد دلائے جو اُن کے اور ہمارے درمیان پہلے سے قائم تھے تو صاف جواب دیا گیا کہ یہ معاہدات کاغذ کے اوراق میں ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کچھ قیمت نہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ یحییٰ کو نہ معاہدات کا پاس ہے نہ اپنے قول و قرار کا، اور اُس نے میرے وفد کو بھی گرفتار کرلیا جس کا گرفتار کرنا شریعت اور عقل اور تہذیب کے سراسر خلاف تھا۔ اور میں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا کہ وہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ نہیں۔ اور مصالحت کی تمام کوششیں بیکار ہوچکی ہیں تو مجبور ہوکر میں نے اپنے ولی عہد کو پیش قدمی کا حکم دیا کہ جو علاقے ہمارے قبضہ سے نکل چکے ہیں اُن کو واپس لینے کی کوشش کی جائے۔ میں نے دس مہینے تک یحییٰ کو ڈھیل دی اور جنگ کو ٹالتا رہا۔ حالانکہ میرا اس میں مالی اور سیاسی بڑا نقصان ہوا۔ مگر میں نے صرف اس لئے ایسا کیا کہ یحییٰ ایک سلطنت سے اپنے بعض مقامات کے متعلق گفت و شنید کررہے اور اپنے مقبوضات کے استرداد و استخلاص کی کوشش کررہے تھے۔ اگر میں اس وقت اُن کے ساتھ جنگ شروع کردیتا تو وہ ایک کافر سلطنت سے اپنے مقبوضات کی واپسی میں ناکام ہوجاتے جس کو میں نے گوارا نہ کیا۔ مگر یحییٰ ادھر تو

کو دھوکہ دیتے رہے اور محبت و مودت کا اظہار کرکے ٹالتے رہو اُدھر اپنے مقاصد میں
میاب ہوتے رہے جب یہ گفت و شنید تمام ہو چکی اور وہ اپنے مقاصد میں کسی حد تک کامیاب
گئے تو اب ہم سے بیرخی اختیار کی اور تمام معاہدات کو پس پشت ڈال کر فوجوں کو پیش قدمی
کا حکم دیدیا۔ اس حالت میں میری عربی حمیت اور شریفانہ غیرت ہرگز ذلت و عار کو گوارا
نہ کرسکتی تھی اس لئے میں نے اللہ کی مدد پر بھروسہ کرکے اپنی تلوار اور اپنی قوم کی بے پناہ
طاقت کو میدان میں لانے کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا اور اب تلوار ہی اس نزاع کا فیصلہ کریگی
چونکہ میں ظلم و تعدی کا بانی نہیں ہوں۔ میری حیثیت صرف مدافعانہ ہے اس لئے
مجھے اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ میں ناکام نہ ہونگا کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة
باذن الله۔ لیکن پھر بھی میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میرا ہاتھ صلح کے لئے ہر وقت بڑھا رہیگا
بشرطیکہ دوسری طرف سے بھی خلوص نیت کیساتھ جذبۂ مصالحت کا اظہار کیا جائے اور
کسی کو اپنی طاقت پر ناز ہے تو میں اس کے جواب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتا
کہ نجد کا بچہ بچہ جنگ کیلئے بیتاب اور جوش جہاد میں بھرا ہوا ہے جبتک ایک شخص بھی باقی
رہیگا میدان سے ہٹنے کا نام نہ لیگا اور تکبر و غرور کرنے والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔

میرے پاس اس قسم کی بہت درخواستیں آرہی ہیں کہ جنگ کو ٹالا جائے اور جہانتک
ہوسکے مصالحت و افہام و تفہیم سے کام نکالا جائے۔ مگر یہ سب باتیں مجھی سے کہی جاتی
ہیں یحیٰی سے کوئی کچھ نہیں کہتا"

مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس معاملہ میں سلاطین اسلام اور مسلمانوں کی بااثر جماعتوں
میں سے کسی ایک نے بھی درمیان میں پڑکر حق و باطل کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا کی
اور نہ اس نزاع کو حق کے موافق فیصل کرنے کی سعی کی زبانی تمناؤں کا اظہار کیا گیا مگر
زبانی تمنا سے کیا ہوسکتا ہے۔ جبکہ حق و باطل کی تحقیق کرکے یہ نہ معلوم کیا جائے کہ تعدی
کس کی طرف سے ہے اور جس کی طرف سے تعدی ہو اس پر زور نہ ڈالا جائے۔ اب معاملہ
حد سے بڑھ گیا ہے اور میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرکے اپنی فوجوں کو حرکت کرنے کا
حکم دیدیا ہے۔ بس اب تلوار ہی سے اس نزاع کا فیصلہ ہوگا۔ لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ

اس صورت کو میں نے راضی ہو کر اختیار نہیں کیا بلکہ میں اس پر مجبور ہو گیا ہوں تاہم اگر اب بھی صلح کی کوئی صورت ہو جائے تو میں ہر وقت اس کے لئے تیار ہوں۔"

جلالۃ الملک کی یہ تقریر بہت پرجوش اور پُر درد تھی اور اس کے بعض فقرات ایسے بھی تھے جن کا عام مجمع کے سامنے بیان کرنا مصالح سیاسیہ کے خلاف تھا اور اسی لئے سلطان نے اولاً اس بحث کو تقریر میں لانے سے قصداً اجتناب فرمایا تھا مگر ایک لیکچرار نے اس قضیہ کی طرف اشارہ کر کے عالم اسلامی کا تفکر و اضطراب ظاہر کیا تو مجبوراً سلطان کو اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا پڑی۔ اس لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جلالۃ الملک فی نفسہ بے نظیر سلطان ہیں۔ کاش ان کے مشیر بھی ان کے شایان شان ہوتے۔

مجلس شاہی میں چیئرز

افسوس ہے کہ تقریر سلطانی کے درمیان میں بعض فقرات پر بڑے زور سے چیئرز بھی ہوتا تھا۔ شاید جلالۃ الملک نے اس مسئلہ پر شرعی حیثیت سے ہنوز توجہ نہیں فرمائی۔ اس لئے میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ طرز کفار سے لیا گیا ہے اور شریعت اسلامیہ کا حکم اس کے متعلق وہ ہے جو صحیحین کی حدیث میں صاف موجود ہے انما التسبیح للرجال والتصفیق للنساء کہ ضرورت کے موقع پر مردوں کو سبحان اللہ کہنا چاہئے اور تالیاں بجانا عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ سلطان کی دوسری تقریر کے بعد پھر ایک شامی یا مصری لیڈر کھڑے ہوئے اور انہوں نے سلطان کی مدح میں قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ عشاء کی اذان ہو چکی تھی اس لئے میں تو اپنے چند رفقاء کے ساتھ اٹھ کر چلا آیا اور سلطانی موٹر میں بیٹھ کر مسجد حرام میں پہنچا۔ جماعت سے نماز ادا کر کے اپنے قیامگاہ پر آگیا۔ بقیہ مہمان عشاء کی نماز سلطان کے ساتھ قصر شاہی میں پڑھ کر واپس ہوئے۔ صبح کو باہم تبادلہ خیال ہوا تو اس پر سب متفق تھے کہ سلطان کی تقریر بڑی زبردست تھی۔ ایسا بولنے والا کم دیکھا گیا ہے۔ مگر مشیران دولت کے اکثر لوگ شامی ہیں۔

مکہ میں جمعہ کی نماز

آج ۶۔ ذی الحجہ جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ کی نماز کیلئے ہر طرف تیاری ہو رہی ہے۔ کیونکہ مکہ معظمہ حجاج سے بھرا ہوا ہے اور بیا

یہ السلام کے سوا کسی مسجد میں جمعہ نہیں ہوتا۔ اندیشہ تھا کہ اگر دیر سے پہنچیں گے تو امام کے
یب سایہ میں جگہ نہ ملیگی۔ مگر جلدی کرنے سے بھی یہ مدعا حاصل نہ ہوا کیونکہ امام کے
یب سایہ دار جگہ بہت کم تھی۔ جو ہم سے پہلے ہی بھر چکی تھی۔ اس لئے چھتری کھول کر
طاف میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تو دھوپ سے تکلیف ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بادل
بھیجا ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور بہت آرام کے ساتھ خطبہ سُنا گیا نماز کے بعد
خوب زور سے بارش ہوئی۔ مسجد حرام کا خطیب خطبہ بہت زور سے دیتا ہے آواز بھی
بہت بلند اور دلکش ہے اور الفاظ بھی بہت زوردار تھے جنکے اثر سے بہت لوگ رو دیے تھے

خطبہ میں سلطان کا نام نہ تھا

مجھے دوسرے خطبہ میں سلطان کے نام کا انتظار تھا۔ مگر یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سلطان کا
نام نہیں لیا گیا۔ اس سے پہلے مدینہ میں بھی ایک جمعہ پڑھا تھا۔ وہاں بھی خطبہ میں سلطان
کا نام نہیں سُنا تھا۔ حالانکہ یمن میں امام یحییٰ کا نام خطبہ جمعہ کے اندر بڑی شان سے لیا
جاتا ہے۔ اُن کو امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے اور تماشا یہ
خلفائے راشدین میں سے حضرت علی کے سوا کسی کا بھی نام نہیں لیا جاتا۔ حضرت علی کے
بعد حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور حضرت سیدتنا فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نام آتا ہے
پھر امام زید بن علی کا اور اُن کے بعد معًا امام یحییٰ کا۔ یہ اس بات کا اثر ہے کہ امام یحییٰ
زیدی شیعہ ہیں جن کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ تبرائی نہیں ہوتے۔ حضرات شیخین
اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو بُرا نہیں کہتے مگر خطبہ جمعہ کی صورت شکر سلام جو انتقاماً ...ے
بحث نہ کرنے میں وہی تبرائی شیعہ کے موافق ہیں جیسا متعہ وغیرہ کو حلال سمجھنے میں انکی ساتھ ہیں

میں نے مکہ مدینہ میں بعض احباب سے دریافت کیا کہ سلطان کا نام خطبہ میں
کیوں نہیں لیا جاتا تو مجھ سے کہا گیا کہ خطبا نے تو نام لینا چاہا تھا۔ مگر سلطان نے
یہ کہکر منع فرما دیا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ میرا نام منبر رسول پر یا بیت اللہ کے سامنے
خطبہ میں لیا جائے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس سے سلطان کی شان تواضع کا پورا
ظہور ہوتا ہے۔

مسجد الحرام کے امام

آجکل یہ عذر ہیں چار جماعتیں نہیں ہوتیں صرف ایک ہی جماعت ہوتی ہے۔ امام اکثر حنبلی ہوتا ہے کبھی حنفی شافعی یا مالکی بھی ہو جاتا ہے۔ حنبلی امام غالباً مصری ہیں۔ نماز میں قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ جس کی اکثر لوگ تعریف کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

منیٰ کو روانگی

سنیچر کو ۸۔ ذی الحجہ تھی۔ صبح ہی سے منیٰ کی طرف روانگی کی تیاری ہونے لگی۔ مکہ کی گلیاں اور بازار اونٹوں کی قطاروں سے بھرے ہوئے تھے ہم نے بھی منیٰ عرفات کیلئے اونٹ کرایہ لے لئے تھے مگر بستی کے اندر عورتوں کو اونٹوں پر سوار کرنے میں اندیشہ تھا کہ ہجوم کی وجہ سے شغدف ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے تو زحمت کا سامنا ہوگا۔ اس لئے میں مستورات کو ساتھ لیکر پیادہ پا چلا اور مکہ سے باہر ایک قہوہ خانہ میں ٹھہر گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مولانا محمد شفیع صاحب مجذوبانہ شان میں سامنے سے تشریف لاتے ہوئے نظر پڑے میں نے استقبال کیا دونوں طرف سے لبیک اللھم لبیک کی صدا بلند ہوئی معانقہ اور مصافحہ کے ساتھ مولانا نے حج مقبول کی بشارت سنائی اور پیادہ پا منیٰ کو تشریف لے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہاں اونٹ پہنچے تو ہم سوار ہوئے۔ ہمارے رفقاء میں سے چار مرد منیٰ و عرفات تک اونٹوں کی ساتھ پیدل ہی چلتے رہے۔ تاکہ راستہ میں شغدفوں کو لڑنے سے بچا لیا جائے۔ اس مقام پر یہ بتلا دینا ضروری ہے

حکومت سعودیہ کو مشورہ

کہ آجکل منیٰ و عرفات کی طرف موٹر لاریاں بھی بکثرت جاتی ہیں جن کی آواز سے بعض دفعہ اونٹ بھڑک جاتا اور شغدفوں کے باہم لڑنے کا خطرہ رہتا ہے اور شغدف جہاں ایک دوسرے سے لڑا پھر زمین ہی پر آکر رہتا ہے جس سے سوار کو تکلیف ہوتی اور اکثر چوٹ بھی لگ جاتی ہے۔ حکومت سعودیہ کو اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے یا تو موٹروں یا اونٹوں کا راستہ بدل دینا چاہیے، یا موٹروں کو اونٹوں سے پہلے روانہ کرنا چاہیے۔ دونوں کا ساتھ چلنا بہت خطرناک ہے۔ نو بجے سے پہلے ہم منیٰ پہنچ گئے۔ اور ایک مکان میں جو کرایہ پر لیلیا گیا تھا اتر پڑے۔

آجکل مکہ اور منیٰ کے درمیان جا بجا قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ جہاں ٹھنڈا پانی اور چائے وغیرہ ہر وقت تیار مل جاتی ہے۔ اور حج کے موسم میں منیٰ تو تماشا شہر بن جاتا ہے بازار میں ہر قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ برف اور لیمن کی بوتلیں بھی دوکانوں پر رکھی ہوتی ہیں۔

حکومت سعودیہ کا کارنامہ

پہلے منیٰ میں پانی کا قحط ہو جاتا تھا۔ ایک کنستر پانی سو سوا سو میں ملتا تھا اب پانی کی بہت افراط ہے۔ ایک آنہ میں کنستر ملتا تھا۔ اور غریبوں کے لئے تو سلطان کی طرف سے پانی کی سبیل لگی ہوئی ہے۔ جہاں سے وہ مفت پانی بھر لاتے ہیں۔ امیروں کو بھی ممانعت نہیں ہے۔

عرفات کی طرف کوچ

منیٰ میں پانچ نمازیں پڑھ کر اگلی صبح کو آفتاب نکلنے کے بعد میدان عرفات کی طرف کوچ ہوا۔ ظہر سے پہلے عرفات پہنچ گئے۔ راستہ میں جا بجا دوکانیں اور قہوہ خانے موجود تھے پینے کیلئے پانی کی ایک صراحی دو پیسے میں ملی تھی، عرفات پہنچ کر غسل مسنون کا ارادہ ہوا۔ مگر فکر تھا کہ اتنا پانی کہاں سے آئیگا۔ دوستوں نے کہا اس حکومت میں پانی کا کیا فکر؟ چنانچہ اسی وقت پانی والے ایک آنہ مشک دیتے ہوئے نظر آئے ہم نے کئی مشکیزے خرید لئے اور تمام رفقاء نے غسل کر لیا

عرفات میں ظہر وعصر کو اکٹھا پڑھنا

پھر مسجد نمرہ میں پہنچے جہاں ظہر وعصر کو جمع کرکے ظہر ہی کے وقت پڑھا جاتا ہے اُس دن دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا سب آئمہ کے نزدیک مسنون ہے۔ مگر اس کیلئے کچھ شرائط بھی ہیں۔ جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ ہاں اس جگہ ایک بات پر متنبہ کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ ہمارے نزدیک اگر امام موسم حج مقیم ہو تو عرفات میں اُس کو ظہر وعصر کی چار رکعتیں پڑھانا چاہئیں اور اگر مسافر ہو تو دو رکعت پڑھے اور مقتدی مقیم سلام کے بعد اپنی دو رکعتیں پوری کرے۔ مگر نجدیوں کے نزدیک عرفات میں امام کو بہر حال ظہر اور عصر کی دو رکعتیں پڑھانا چاہئیں خواہ مسافر ہو یا مقیم ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ امام احمد بن حنبل کا یہی مذہب ہے۔ یا اہل ظاہر کے قول پر نجدیوں نے عمل کیا ہے؟ اب اگر امام مسافر نہ ہوا اور اس نے باوجود مقیم ہونے کے ظہر وعصر کی دو دو رکعتیں پڑھائی تو حنفیہ کے نزدیک کسی کا فرض ادا

میں ہوا، امام کا نہ مقتدیوں کا۔ اسی وجہ سے میرے بعض احباب علماء کی یہ رائے تھی کہ مسجد نمرہ میں امام کی ساتھ نماز نہ پڑھی جائے۔ بلکہ اپنے خیمہ میں جماعت کر لیجائے مگر میں نے اس صورت کو پسند نہیں کیا بلکہ مسجد میں امام کے ساتھ بھی نماز ادا کی اور خیمہ میں واپس آکر دوبارہ اعادہ بھی کیا۔ احباب نے بھی میری اس رائے کو پسند کیا۔ مگر ظاہر ہے کہ تمام لوگوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ عموماً سب نے امام کی ساتھ جو نماز پڑھی تھی اُسی پر اکتفا کیا۔

حکومت سعودیہ کو مشورہ

حکومت سعودیہ کو اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ میں تمام مذاہب کی رعایت نہ کرنے سے بہت لوگوں کی نماز اُن کے مذہب کے اعتبار سے باطل ہوتی ہے اور یہ سخت افسوسناک صورت ہے کہ عین حج کے موقعہ پر لوگوں کی نماز میں اختلال واقع ہو۔

گرمی اور دھوپ کیوقت سلطان کا مسجد میں آنا

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ باوجود سخت دھوپ اور گرمی کے جلالۃ الملک سلطان ابن سعود مسجد نمرہ میں تشریف لائے اور جماعت سے نماز ادا کی۔ سلطان کو حالت احرام میں ننگے سر ایک لنگی ایک چادر میں دیکھکر قلوب پر جو اثر ہوا اُس کا اندازہ دیکھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ذات ہمایونی کو اس دینداری اور پابندی مذہب کے ساتھ تا دیر سلامت رکھے اور آپ کی ظاہری و باطنی دینی اور دنیوی کامیابیوں میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

جلالۃ الملک سے گذارش

اس موقع پر سلطان سے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ امام حرم کو تاکید فرمادیں۔ کہ اگر کبھی وقوف عرفات کی نماز میں ایسا سہو ہو جاوے جس سے نماز باطل ہو مثلاً سجدہ سہو لازم آتا ہو تو سجدہ سہو جیسی صورت میں نہ کیا جاوے۔ حنفیہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور جناب ائمہ نے اپنی

ن کی موافقت کی ہے۔ کیونکہ جمع کثیر کے ساتھ سجدہ سہو کرنے سے دور والے ایسی گھبرا کر
تے ہیں کہ نماز بالکل باطل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سال مسجد نمرہ میں ظہر کی نماز پڑھاتے ہوئے
ام کو سہو ہوا اور اُس نے قعدۂ تشہد کے بعد سجدۂ سہو کیا تو بہت لوگ یہ سمجھے کہ عصر کی نما
شروع ہو گئی اُنہوں نے ظہر کی نماز ختم کر کے عصر کی نیت باندھ لی جب امام نے سجدۂ سہو
کے بعد سلام پھیرا تو اب نمازیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ سجدۂ سہو جبر نقصان
کے لئے ہے۔ مگر جب جبر نقصان فساد صلوٰۃ کا سبب ہو جائے تو جبر کی حاجت نہیں۔

نماز ظہر کے بعد متصلاً عصر کی نماز ادا کی گئی پھر ہم سب اپنے خیموں کی طرف چلے۔ مگر
میدان عرفات میں خیمہ کا ملنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ بڑی دیر تک ہم کو ادھر اُدھر پریشان
پھرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے معلم مل گیا تو اُس نے خیمہ تک پہنچایا۔ اور یہ وقت میدان عرفات میں
ہر سال پیش آتی ہے اور ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے۔"

حکومت سعودیہ کو مشورہ

کاش حکومت سعودیہ جس نے حجاج کی بہت سی اُلجھنوں
کا انتظام کیا ہے۔ اس تکلیف کا ازالہ بھی کر دے
اور کوئی ایسی صورت نکالے جس سے ہر معلم کا حاجی اپنے خیمہ تک آسانی سے پہنچ جایا کرے

اس دشواری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر حجاج جبل رحمت پر سلطان کے ساتھ وقوف
نہیں کر سکتے نہ اُن کا خطبہ سُن سکتے ہیں۔ کیونکہ خطبہ سُن کر وقوف سے فارغ ہو کر اپنے خیمہ
تک پہنچ جانا محال نہیں تو قریب بہ محال ضرور ہے اس لئے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ نماز سے
فارغ ہو کر لوگ اپنے اپنے خیموں میں وقوف کرتے اور اسی جگہ دعا وغیرہ میں لگے رہتے ہیں۔
چنانچہ مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔

وقوف عرفہ

جس وقت میں اپنے شغدف میں پہنچا۔ تو میری بھتیجی اپنے شغدف
میں بیٹھی ہوئی تلاوت قرآن کر رہی تھی میں بھی تلاوت اور دعا میں مشغول
ہو گیا۔ مجھے فکر یہ ہوا کہ بھتیجی کی خیر خواہ کی ہنسیدہ خاتون سلمہا نے اگر رونا شروع کر دیا تو آج
عرفات کے میدان میں دعا بھی اچھی طرح نہ ہو سکے گی مگر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ایسا شامل
حال ہوا کہ بچی نے رونے کا نام نہیں لیا وہ الگ بیٹھی ہوئی اپنے کھلونوں سے کھیلتی رہی

ہماری تلاوت اور دعا و مناجات کو سن کر ہنستی رہی۔ دو گھنٹہ کے بعد ہم نے عصر کی نماز جماعت سے دوبارہ ادا کی اور پھر درود شریف اور دعا میں لگ گئے۔ جب غروب آفتاب قریب ہوا تو ہم نے اپنے سب رفقاء کو جمع کر کے دعا کی۔ اس وقت قلوب کی عجیب حالت تھی یہ تصور کر کے کہ اسی میدان عرفات میں ہم سے عہد الست لیا گیا تھا وہ بھی کیسا وقت تھا کہ اللہ تعالیٰ شانہ ہم سے ہمکلام ہوئے تھے اور ہم نے الست بربکم کے جواب میں بلیٰ شہدنا کہا تھا۔ آج ہزاروں برس کے بعد ہم پھر اسی مقام پر دوسری حالت میں اقرار وحدانیت واعتراف عبودیت اور تجدید عہد اور اظہار بندگی کے لئے حاضر ہوئے ہیں روح پر ایک عالم وجد طاری تھا۔ کوئی سکتہ میں تھا۔ کوئی بیقرار ہو کر رو رہا تھا۔ کوئی نعرہ مستانہ لگا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور یہ بابرکت اور دلفریب و دلکش محفل ختم ہوئی۔ حجاج نے ایک دوسرے کو حج مبارک ہونے کی خوشخبری دی اور حسرت بھری نگاہوں سے میدان عرفات کو دیکھتے ہوئے جبل رحمت کو جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وقوف فرمایا تھا اور جس مقدس مقام پر اللہ تعالیٰ نے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا کا مژدہ امت محمدیہ کو اپنے مقدس رسول کی زبانی سنایا تھا تکتے ہوئے مڑ مڑ کر بار بار تکتے ہوئے روانہ ہوئے

وقوف مزدلفہ

اور عشاء کے وقت مزدلفہ پہنچے یہاں مغرب وعشاء کو ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ جماعت کیساتھ جمع کیا پھر کھانے کا انتظام کر کے سو رہے اور پچھلی شب صبح سے پہلے بیدار ہو گئے تہجد پڑھی پھر صبح کی نماز اول وقت ادا کر کے کھڑے ہو کر خشوع وخضوع کے ساتھ دعا میں مشغول ہو گئے۔ آفتاب نکلنے سے کچھ پہلے دعا ختم کر کے یہاں سے بھی کوچ کیا دو گھنٹہ یا کچھ زیادہ میں منیٰ پہنچے، ہم نے دیکھا کہ یہاں اونٹوں کا بہت ازدحام ہے اور شغدفوں کو لڑنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے دروازۂ منیٰ پر ہی مستورات کو اونٹ سے اتار لیا۔ اور پیادہ پا راستہ کے کنارے ہم مکان پر پہنچ گئے جو ہمارے کرایہ میں تھا۔ اونٹ سامان کو لیکر کچھ دیر کے بعد پہنچے اس وقت معلوم ہوا کہ ہماری مستورات کو اونٹ سے اترتا ہوا دیکھ کر قافلہ کی دوسری مستورات

ی اُترنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر اُن کے مردوں نے منع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ شغدف آپس میں
ٹے اور ایک شغدف زمین پر گرا اُس میں ایک ستورات تھی اُس کے سر میں ایسی چوٹ آئی
دس گھنٹہ تک بیہوش رہی اُس کا خاوند میرے پاس آیا میں نے مشورہ دیا کہ اسی وقت
سلطانی اسپتال میں لیجاؤ جو منیٰ کے اندر ہی موجود ہے۔ چنانچہ لیگئے اور ڈاکٹری دوا سے
ں کو افاقہ ہو گیا۔

منیٰ کا قیام

منیٰ میں اول جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماریں پھر قربانی کی پھر سر منڈایا غسل
کیا۔ احرام کھول کر سلے ہوئے کپڑے پہن لئے اور اب مکہ جانے کی
یاری کی تاکہ طواف زیارت آج ہی کر لیا جائے۔

طواف زیارت

گو اس کا وقت ۱۲۔ ذی الحجہ تک ہے۔ مگر افضل دس ذی الحجہ ہی
کو ہے۔ میں کپڑے بدل کر تیار ہوا۔ تو مولوی عتیق الرحمن صاحب
یوبندی بولے۔ کیا مکہ کی تیاری ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے سواری تو کوئی نہیں
لتی۔ میں نے کئی آدمی بھیجے۔ یہی جواب آیا کہ سواری کوئی نہیں۔ میں نے کہا مولانا ہمارے
پیر تو سلامت ہیں۔ مکہ یہاں سے دور ہی کتنا ہے صرف تین میل کا فاصلہ ہے کہنے لگے
ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اُن کو دیکھ کر چار پانچ آدمی اور ساتھ
ہو گئے۔ خدا کی قدرت ہم منیٰ کے بازار ہی میں پہنچے تھے کہ ایک لاری تیار مل گئی ایک
روپیہ فی کس کرایہ تھا فوراً بیٹھ گئے اور ۱۵ منٹ میں مکہ معظمہ کے اندر داخل ہوئے جاتے
ہی طواف زیارت کیا اور طواف کی رکعتیں پڑھ کر عصر کی نماز جماعت سے ادا کی پھر منیٰ کو
واپس ہوئے اس وقت کوئی لاری نہیں ملی اونٹ کرایہ کیا گیا جس کا کرایہ ۳ر تھا مغرب
منیٰ کی حد میں پڑھی اور مکان پر پہنچکر عشا پڑھی مستورات کا طواف زیارت ۱۲ ذی الحجہ پر
موقوف رکھا گیا۔ منیٰ کا قیام بہت پر لطف تھا اور سرکاری انتظام بھی اعلےٰ درجہ کا
تھا بازار روشن تھے اور گلی کوچوں میں سپاہی برابر کھڑے ہوئے تھے تاکہ کسی کو تکلیف
نہ ہو۔ ۱۱۔ ذی الحجہ کو میں نے نائد قربانیاں کیں ۱۰ بکرے تو ذبح ہی میں فقراء کو دیدے
ایک دُنبہ صاف کراکر مزدور کے سر پر رکھواکر مکان پر لا رہا تھا کہ بازار کے ہجوم پہنچکر

ور ہماری نگاہ سے اوجھل ہوگیا۔ پھر اُس کا پتہ ہی نہ چلا۔ میں نے سپاہی سے شکایت اُس نے پوچھا مزدور کا نام اور اُس کی زنبیل کا نمبر یاد ہے؟ میں نے کہا یہ تو ہم دریافت نہیں کیا تھا۔ کہا منی میں ہر مزدور کی زنبیل پر نمبر لگا ہوا ہے اگر نمبر نوٹ کر یتے تو ابھی پتہ لگ جاتا۔ پھر بھی سپاہی نے ایک دو مزدوروں کو ٹوکا مگر جب ہم نے کہا کہ یہ وہ مزدور نہیں ہے تو چھوڑ دیا۔ تمام سفر حجاز میں ہمارا صرف یہی ایک نقصان ہوا وہ بھی اپنی غفلت کی وجہ سے کہ قلی کا نمبر نوٹ نہیں کیا تھا۔

مزدلفہ اور منیٰ میں حکومت کا انتظام

یہ بھی سنا گیا کہ مزدلفہ میں بعض حاجیوں کے ہینڈ بیگ چوری ہوگئے جن میں بہت رقم تھی۔ مگر منی پہنچنے تک سپاہیوں نے چوروں کو گرفتار کرلیا جس پر قاعدہ شرعی کے موافق ثبوت ہوگیا۔ اُس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ جو منی کے بازار میں جمرۂ وسطی کے متصل منظر عام پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اور جن پر کافی ثبوت نہیں ہوا اُن کے فوٹو لیے گئے اور سپاہیوں کو دیے گئے۔ کہ یہ لوگ آئندہ سرزمین حجاز میں داخل نہ ہوسکیں۔ اس سے زیادہ بہتر اور کیا انتظام ہوگا؟ یہ بھی معلوم ہوا کہ جن حضرات کا مال چوری ہوا تھا۔ اُن کا مال زیادہ تر وصول ہوگیا۔

ام القری میں ہفتہ وار لقطات (گری پڑی چیزوں) کی فہرست شائع کی جاتی ہے کہ محکمہ لقطات میں اتنی چیزیں محفوظ ہیں۔ جس کی جو چیز ہو علامت بتلا کر لیجائے۔

یہ بات عجیب تھی کہ منی میں جہاں کسی وقت پانی کا قحط رہتا تھا آجکل موٹر لاری کے ذریعہ صبح وشام چھڑکاؤ ہوتا تھا کہ گرد جم جائے اور حجاج کو غبار سے تکلیف نہ ہو۔ مسجد خیف کے قریب سرکاری شفاخانہ بھی تھا جہاں بیماروں کا مفت علاج ہوتا تھا۔ حج کے ہفتہ میں مکہ اور منی میں بہت زیادہ اجتماع ہوتا ہے۔ مگر ام القری کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس ہفتہ میں کل بیمار ۱۸۴ تھے جن میں زیادہ تر معمولی بخار وغیرہ کے مریض تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے چوٹ لگ گئی تھی۔ ۱۸۴ میں سے اس ہفتہ میں کل ۱۰۔۱۲ اموات ہوئیں قیام منی میں ہم نے اپنے خیمہ ہی میں نمازیں جماعت سے ادا کیں۔ کیونکہ مسجد خیف ہماری

نگامے ہو رہی تھی۔

مسجد خیف کی زیارت

ایک روز عصر کے بعد مسجد کی زیارت کو گئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں نماز پڑھی ہے اور ستر انبیاء علیہم السلام وہاں مدفون ہیں۔ مسجد کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ جا بجا جوتے پڑے ہوئے اور ہانڈیاں پک رہی تھیں!

حکومت سعودیہ کو مشورہ

حکومت سعودیہ نے سب کچھ کیا مگر مسجد کا انتظام کچھ نہ کیا آئندہ اس کا انتظام کافی کرنا چاہیئے کہ مسجد میں کوئی کھانا نہ پکا سکے اور مسجد کے قریب کوئی بول و براز بھی نہ کر سکے۔

مسجد عقبہ کی زیارت

۱۲۔ ذی الحجہ کی صبح کو مسجد عقبہ کی زیارت کی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ سے حمایت اشاعت اسلام پر جان و مال فدا کرنے کی بیعت لی تھی اور پہلی مرتبہ چھ انصاریوں نے اور دوسرے سال ستر نے اس کام کیلئے تمام عالم سے مقابلہ کرنیکا بیڑا اٹھایا تھا۔ ساڑھے تیرہ سو برس گذر جانیکے بعد بھی اس مسجد پر ایسے انوار برستے ہیں کہ وہاں جا کر پھر نکلنے کو جی نہیں چاہتا اطمینان اور سکینہ و انشراح قلب کے الفاظ سنے ہوئے تو پہلے بھی تھے۔ مگر ان کی حقیقت مسجد عقبہ میں جا کر معلوم ہوئی۔ اللہ اللہ پہاڑیوں کے دامن میں آبادی سے الگ ایک گوشہ میں چھپی ہوئی کیسی بابرکت مقدس جگہ ہے۔ جس کی یاد ہمیشہ دل کو تڑپاتی رہتی ہے۔

منحر اسمٰعیل کی زیارت

پھر منحر اسمٰعیل کی زیارت کو گئے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے محبوب بیٹے کے گلے پر خدا کے حکم کی تعمیل میں چھری رکھدی تھی۔ اس مقام کی پہلے اور صورت تھی مگر اب حکومت سعودیہ نے توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا ہے۔ کیونکہ عوام وہاں جا کر بدعات کا ارتکاب کرتے تھے۔ اور اب بھی بہت لوگ تین چار پتھر اوپر تلے وہاں رکھ آتے ہیں کہ یہ قیامت میں ہماری گواہی دیں گے۔ اس سال کسی مقام پر زیارت کیلئے جانے کی بندش نہ تھی ہاں سپاہی ہر جگہ تعینات تھے تاکہ لوگ شرک و بدعت کا ارتکاب نہ کریں۔

مکہ کو واپسی

۱۲- ذی الحجہ کو بعد ظہر کے رمی جمار سے فارغ ہوکر مکہ معظمہ کا ارادہ کیا میں نے دیکھا کہ اس وقت بھی اونٹوں کا ہجوم زیادہ ہے اور شغدفوں کے لڑنے کا خطرہ ہے اس لئے اونٹوں کو خالی چھوڑ کر اور چند رفقاء کو حفاظت سامان کے لئے انکی ہمراہ کرکے مستورات کو گھوڑا گاڑی میں سوار کیا جس کا کرایہ منیٰ سے مکہ تک چھ ریال فی کس تھا۔ ایک گھنٹہ سے کچھ زیادہ میں مکہ پہنچے اور فوراً ہی مستورات کو طواف زیارت کرایا۔ پھر عصر کی نماز جماعت سے ادا کی۔

جنۃ المعلیٰ

اگلے دن ۱۳- ذی الحجہ کو جنۃ المعلیٰ کی زیارت کی یہاں قبے تو سب گرے ہوئے تھے ہی مگر کسی قبر کا نشان بھی نہ تھا۔ قبوں کے گرانے سے اینٹوں اور پتھروں کا جو ڈھیر لگ گیا تھا وہ بدستور اپنی حالت پر تھا۔ اس منظر سے بہت لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگتی تھی اور عام طور پر لوگوں کو شبہ ہوتا تھا کہ حکومت سعودیہ کے دل میں حضرت صحابہ و تابعین کا احترام نہیں ہے۔ ورنہ قبروں کے اوپر سے پتھر کی چٹانوں کو ہٹا کر کچا نشان ہی بنا دیا جاتا۔ جیسا مدینہ میں جنۃ البقیع کی قبروں کا نشان قائم کر دیا گیا ہے۔

حکومت سعودیہ کو مشورہ

میں یہ تو نہ کہونگا کہ حکومت سعودیہ کے دل میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور اجلۂ صحابہ و تابعین کا احترام نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ جنت المعلیٰ کی صفائی سے غفلت برتی گئی ہے ضرورت ہے کہ بہت جلد یہاں بھی جنۃ البقیع کی طرح پتھر کی چٹانوں کو الگ کرکے اجلۂ صحابہ و تابعین کی قبروں کو سرخ کنکریاں بچھا کر محفوظ کر دیا جائے میرے جدِ روحانی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ کا مزار بھی اسی متبرک قبرستان میں ہے مگر بے نشان ہے۔ بعض احباب نے خاص علامت سے اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ جو انہیں کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ایک واقف کار میرے ساتھ تھے اس لئے پتہ چل گیا۔ ورنہ پتہ ملنا دشوار تھا۔ ۱۴- ذی الحجہ کو عمرہ کیلئے تنعیم پہنچے وہاں میں گدھا کرایہ کیا اور دو ڈھائی گھنٹہ میں فارغ ہوکر کپڑے بدل لئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لاری بھی ۸ فی کس کرایہ لیتی ہے مگر ہم کو گدھے کی سواری ہی میں لطف آیا۔ کیونکہ ساتھیوں میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میرا گدھا اپنے ساتھی سے آگے رہتا تھا۔ تو

ست خوشی ہوئی تھی۔ آج جمعہ تھا خطیب نے بہت پُر زور خطبہ دیا جس میں حجاج کو نصیحت کی گئی
ں کہ جس دولت سے تمکو اللہ تعالیٰ نے سرفراز کیا ہے اُس کی لاج رکھنا اور عمر بھر اس دولت کے
شکریہ میں اعمال صالحہ سے اپنے کو مزین اور گناہوں سے پاک رکھنے کا اہتمام کرتے رہنا پھر جہاد
کی ترغیب دی گئی تھی جس کا سبب غالباً نجد و یمن کی آویزش تھی جہاد کا بیان بہت پُر جوش تھا
جس کے اثر سے نجدی سپاہیوں کے چہرے جوش میں سُرخ ہو رہے تھے سمجھنے والے ہندی
بھی بہت متاثر تھے۔

اُسی روز شام کو مولانا محمد شفیع الدین صاحب سے اُن کے مکان پر ملنے گیا۔ نذر بھی پیش کی
جو میری بھتیجی نے بھیجی تھی۔ چونکہ ۱۶۔ ذی الحجہ کو ہماری روانگی طے پائی تھی اس لئے ۱۵۔ ذی الحجہ
طواف اور عبادت کیلئے مخصوص کر لیا گیا۔ ہمارے بعض رفقاء نے رات بھر طواف کیا مستورات
بھی رات کے زیادہ حصہ میں طواف کرتی رہیں ۱۶۔ ذی الحجہ کی صبح کو نماز کے بعد سامان باندھ کر
تیار کر دیا گیا کیونکہ ہندوستانی قائم سے دس بجے موٹر لاری کے آنے کی خبر تھی۔

طواف الوداع

سامان سے فارغ ہوئے تو طواف الوداع کیلئے حرم میں حاضر ہوئے
اس وقت کی کیفیت نہ پوچھئے طواف الوداع کرتے ہوئے
سنگدل سے سنگدل بھی پانی ہو جاتا ہے۔ بیت اللہ سے مفارقت کے تصور ہی سے کلیجہ
منہ کو آنے لگتا ہے۔ طواف سے فارغ ہو کر ملتزم پر آئے۔ دروازہ کعبہ سے رخسارے ملے
آنکھوں سے غلاف کو لگایا اور جو کچھ مانگنا تھا مانگا۔ میزاب رحمت پر گئے مقام ابراہیم و حجر اسود
پر پہنچے حطیم میں نمازیں پڑھیں۔ زمزم سے سیراب ہوئے۔ پھر گھر پر آئے۔ موٹر آنے کا وقت
ہو گیا تھا مگر نہ آیا۔ دس کے بعد بارہ بجے ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ حرم میں نماز پڑھی
نفلی طواف بھی کیا۔ پھر عصر کی نماز پڑھی۔ مگر موٹر کا پتہ نہ تھا۔ چونکہ اسباب بالائی منزل
سے اُتار کر نیچے دروازہ میں جمع کر دیا گیا تھا۔ اُس حفاظت کا بھی خیال تھا اور حرم میں
حاضر رہنے کو بھی دل چاہتا تھا کہ جتنی دیر تک بیت اللہ سامنے ہو غنیمت ہے۔

مکہ سے جدہ کو روانگی

مغرب کے وقت خبر آئی کہ موٹر آگیا ہے۔ مغرب کی نماز پڑھکر
مکان پر آیا تو رفقاء نے مجھ سے پہلے ہی تمام سامان موٹر پر

لادو دیا تھا میں نے مستورات کو سوار کیا اور معلم سے باز پرس کی کہ صبح دس بجے کا وقت بتلایا گیا تھا اتنی دیر تک ہمکو کیوں پریشان کیا گیا معلم نے جواب دیا کہ جس کمپنی کا موٹر آپ کیلئے معین تھا وہ صبح ہی جدہ سے روانہ ہو چکا تھا اگر راستہ میں فیل نہ ہو جاتا تو دس بجے ضرور پہنچ جاتا جب ۱۲ بجے تک بھی نہ پہنچا۔ تو میں سلطان سے شکایت کرنے گیا۔ سلطان سو رہے تھے ظہر کے بعد گیا تو سلطان نے اپنے موٹروں میں سے ایک

سلطانی عنایات

موٹر آپ کیلئے روانہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ وہ حاضر ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ واقعی معلم کا بیان صحیح ہے۔ کیونکہ موٹر بہت بڑا تھا۔ کمپنی کے موٹر ۱۵ سواریوں کیلئے اتنے بڑے نہیں ہوتے۔ یہ موٹر ۱۵ سواریوں کیلئے بھیجا گیا تھا مگر اس میں ۲۰ کی گنجایش تھی اور دونوں سیٹوں کے درمیان سامان کیلئے بہت وسیع جگہ تھی میں نے چاہا کہ اندر سیٹ پر سات آدمی فراغت سے بیٹھ جائیں اور میں ڈرائیور کے پاس آگے بیٹھ جاوں مگر ڈرائیور نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ موٹر بہت بڑا ہے آپ اندر ہی بیٹھے رہیں۔ باب الزیادۃ کے پاس سے موٹر روانہ ہونیکو تھا۔ کہ مولوی اسمٰعیل صاحب ملیح آبادی سے جو مدرسہ جامع العلوم کانپور میں میرے سامنے تعلیم حاصل کرتے تھے اور آجکل مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مددگار مہتمم اور ایک عطارہ کی دوکان کے مالک ہیں دوکان ہی پر ملاقات ہوئی۔ دیکھکر لپٹ گئے۔ زمانۂ طالب علمی کے احباب جب کبھی مل جاتے ہیں روح کو بہت مسرت و انبساط حاصل ہوتا ہے۔ کچھ دیر اُن سے باتیں ہوتی رہیں مجھے زکام کھانسی کی شکایت تھی اُنھوں نے فوراً اپنی دوکان سے گولیاں نکال کر دیں پھر معلم صاحب سے آخری مصافحہ ہوا اُن کی عنایات کا شکریہ ادا کیا اور ڈرائیور کو موٹر چلانے کی اجازت دی موٹر روانہ ہوا تو یہ تصور سوہان روح بنا ہوا تھا کہ اب زمین حرم چھوٹتی ہے مکہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے دیکھئے پھر بھی یہاں آنا مقدر میں ہے یا نہیں۔

حکومت کا انتظام

چند منٹ میں موٹر مکہ کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ جہاں پولیس کی چوکی تھی، اور سواریوں کو شمار کیا جاتا ہے، شمار کرنیوالے نے جب یہ دیکھا کہ موٹر کی ایک سیٹ پر آٹھ آدمی اور ایک پر سات ہیں تو کمپ سے

ڈرائیور سے کہا کہ یہ صورت عدل کے خلاف ہے ہر سیٹ پر برابر آدمی ہونے چاہئیں اور ایک آدمی تمہارے پاس باہر ہونا چاہیئے" اب ڈرائیور مجبور ہو کر کہنے لگا کہ وہ شیخ کون ہیں جو باہر میرے پاس بیٹھنا چاہتے تھے وہ باہر آجائیں چنانچہ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس آبیٹھا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ میں منزل شمیسیہ آئی اور وہاں سے روانہ ہو کر اعلام الحرم حرم کی حدود کے نشانات نظر آئے اُس وقت بیاختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کہ اب ہم حد حرم سے باہر ہوئے جاتے ہیں ؎

سلامٌ علی ارض و من حل بالارض وان کان تسلیمی من البعد لا یجدی

بل انشاء اللہ یجدی زبان سے نکلا"

اب چاند نکل آیا تھا اور چاندنی رات میں مکہ کی پہاڑیاں عجب لطف دے رہی تھیں اس کے بعد منزل بحیرہ آئی اور یہاں ہم نے عشا کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد چائے پی۔ تو قہوہ خانہ میں صالح سے ملاقات ہوئی جو مدینہ جاتے ہوئے ڈرئیور کا معاون تھا بہت محبت سے ملا اور حج کی مبارک باد دیکر چائے کی پیالی پیش کی"۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو موٹر نے بہت تیزی کے ساتھ چلنا شروع کیا راستہ میں بہت لوگ اونٹوں پر۔ گدھوں پر اور کچھ پیادہ چلتے ہوئے نظر آئے۔ وہ بھی جدہ جا رہے تھے۔ تقریباً بارہ بجے جدہ پہنچے۔ مگر ڈرائیور کو مکان معلوم نہ تھا۔ اُس لئے گھنٹہ بھر تک جدہ کی گلیوں میں ادہر سے اُدہر چکر لگانا پڑا۔ بڑی دقت سے مکان ملا تو وکیل جدہ نے ہمارا استقبال کیا۔ مستورات کو سب سے پہلے اُتارا پھر سامان اوپر پہنچایا۔ اُسی وقت وکیل نے پاسپورٹ ہم سے مانگا اور

جہاز کا انتظام

بتلایا کہ سب سے پہلا جہاز کراچی جانیوالا خسرو ہے وہ تو بھر چکا اُس میں مطلق گنجایش نہیں اب یا تو آپ جہانگیر میں بمبئی کو جائیں یا رحمانی میں کراچی کو۔ ہمنے کہا کہ جانا تو کراچی کو ہے اگر خسرو میں جگہ مل جائے اچھا ہے ورنہ رحمانی ہی میں جائیں گے ہم اتوار کی رات کو جدہ پہنچے۔ خسرو بدھ کو روانہ ہونیوالا تھا اور رحمانی جمعرات کو۔ اس لئے ہمنے رحمانی ہی کو اختیار کیا۔ خسرو میں جگہ نہ مل سکنے کا کچھ افسوس بھی ہوا۔ مگر ہندوستان پہنچکر معلوم ہوا کہ اس میں نہ آنا ہی اچھا ہوا کیونکہ خسرو

راستہ میں چار پانچ دن تک سخت طوفان کا سا جسنار ہا جس سے حاجیوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ اور رحمانی جہاز کو سمندر ایسا ساکن ملا جیسا تالاب ہوتا ہے کہ پانی میں لہر تک بھی نہ تھی جمعرات کی صبح کو نماز سویرے سے پڑھ کر سامان گاڑی پر لاد کر مستورات کو ساتھ لیکر جہاز پر

جہاز پر سوار ہونا

سوار ہونے چلے۔ جبی پر معلوم ہوا کہ کنارہ پر پہنچنے کیلئے صرف ایک دروازہ رکھا گیا ہے۔ جس میں سے سب حجاج کا نکلنا بڑی زحمت کا سبب ہوگا چنانچہ زحمت کا سامنا ہوا اور بدقت تمام کنارہ پر پہنچے۔ جہاں بہت سی کشتیاں حکومت کی طرف سے کھڑی ہوئی تھیں، مگر ہم نے ایک موٹر لانچ کو اختیار کیا تاکہ جہاز پر جلدی پہنچ جائیں جو کنارہ سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر کھڑا تھا، جس موٹر لانچ میں ہم سوار ہوئے وہ کسی حاجی نے سالم کرایہ کرلیا تھا۔ اُس کی مستورات بھی اُس میں موجود تھیں۔ ہم نے قدم ہی رکھا تھا کہ مردوں نے ہمارے مردوں کو اور عورتوں نے ہماری عورتوں کو دھکے دینا شروع کئے کہ یہ تو سالم ہمارے کرایہ میں ہے تم کہاں سے آگھسے، اس تو تو میں میں کی مجھے اصلا خبر نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر خود بخود میرے دل نے اس لانچ کو ناپسند کیا کیونکہ تنگی بہت تھی میں نے فوراً دوسری لانچ والے کو آواز دی وہ فوراً اپنی موٹر لانچ کو ہمارے قریب لایا اور ہم جلدی سے اُس میں سوار ہوگئے۔ مستورات کچھ مجھ سے پہلے سوار ہوگئیں میں سمجھا کہ بھتیجی بھی سوار ہوگئی ہوگی کیونکہ وہ دوسری مستورات سے زیادہ تیز اور چست تھی اُس کی بچی منیفہ پہلے سے میری گود میں تھی مگر جب لانچ روانہ ہوگئی تو دیکھا کہ میری بھتیجی پہلی لانچ میں رہ گئی ہے۔ میں نے دوسری لانچ کے ڈرائیور کو سختی سے روکا کہ جلد پیچھے لوٹو میری بھتیجی پہلی لانچ میں رہ گئی ہے۔ وہ بیچارا فوراً واپس ہوا۔ اور جب بھتیجی کو میں نے اپنے پاس بٹھلا لیا تب اطمینان سے روانہ ہوئے۔ آدھ گھنٹہ میں جہاز پر پہنچے۔ اُس وقت جہاز بالکل خالی تھا اچھی جگہ مل گئی اور ہم نے قبضہ جمالیا۔ سامان ہمارے ساتھ نہ آیا تھا وہ پیچھے دو آدمیوں کے ہمراہ تھا۔ جو سرکاری کشتی میں بعد کو پہنچا۔ جہاز میں جگہ پر قبضہ کرکے اب یہ فکر ہوا کہ مستورات نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔ گو دا بچی بھی بھوکی ہے۔ کھانے پینے کا سامان دیر میں پہنچے گا ناشتہ کی کیا سبیل کی جائے

جہاز میں ہوٹل اور کھانے کا انتظام

فوراً خیال آیا کہ جہاز میں ہوٹل ہو وہاں سے کچھ خریدنا چاہئے۔ چنانچہ ہوٹل والے سے مستورات کیلئے چار پیالہ چائے اور چار بسکٹ پہنچانے کو کہا وہ بیچارہ اسی وقت ایک سینی میں چائے کے پیالے اور بسکٹ رکھکر لایا سب نے اطمینان سے ناشتہ کیا اس وقت مجھے جہاز میں ہوٹل قائم کرنے والوں کی قدر ہوئی کیونکہ اگر پہلے کی طرح حاجی خود اپنی خوراک کے ذمہ دار ہوتے تو ہمکو آج دن بھر بھوکا رہنا پڑتا۔ شام کو مغرب کے وقت کھانا نصیب ہوتا۔ مگر اب ناشتہ تو فوراً ہی ہوٹل سے مل گیا۔ اور گیارہ بجے جہاز کے ملازموں نے کھانا تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ میں تو اس انتظام سے بہت خوش ہوں۔ گو کھانا گھر جیسا ہمارے مذاق کے موافق نہیں تھا۔ مگر ایسا خراب بھی نہ تھا کہ اس کی مذمت میں اخبارات کے کالم سیاہ کئے جائیں۔ تنوری روٹی تھی۔ دنبہ کا گوشت تھا گھی رنا صا تھا۔ ہاں آب و نمک ہمارے مذاق کا نہ تھا۔ جہاز کے چھوٹنے کا وقت ۹ بجے سنا گیا تھا۔ مگر روانہ نہ ہو سکا کیونکہ جہاز پر آدھے ہی آدمی پہنچے تھے کہ ساحل جدہ پر ہوا کا طوفان بہت زور سے آیا جس کی وجہ سے سعودی سپاہیوں نے کشتیوں کی روانگی بند کر دی۔ ورنہ کشتیوں کے ٹوٹنے اور آدمیوں کے غرق ہو جانے کا خطرہ تھا۔ خدا خدا کر کے عصر کے بعد طوفان باد کم ہوا تو کشتیاں چھوڑی گئیں اور مغرب کے بعد تک سب حاجی جہاز پر آگئے جن کی تعداد چودہ سو کے قریب تھی۔ مگر رحمانی جہاز بڑا تھا اس لئے کچھ تنگی محسوس نہیں ہوئی۔"

ساحل جدہ سے جہاز کا لنگر اٹھانا

صبح کو نماز فجر کے بعد جہاز نے لنگر اٹھایا۔ اور ہم نے جدہ اور زمین عرب کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا ؎

الا یا صبا نجد متی ہجت من نجد — فقد زادنی مسراک وجدا علی وجد
وقد زعموا ان المحب اذا دنا — یمل وان النأی یشفی من الوجد
بکل تداوینا فلم یشف ما بنا — علی ان قرب الدار خیر من البعد

خدا وہ دن پھر نصیب کرے کہ اس مقدس سرزمین کی دوبارہ زیارت ہو اور

دل کے ارمان پورے ہوں۔ آمین۔

رحمانی جہاز کی کیفیت

رحمانی جہاز کراچی کو جا رہا ہے۔ اس لئے اُس میں افغانی اور سرحدی بہت ہیں۔ جو آپس میں بھی لڑتے ہیں اور جہاز والوں سے بھی۔ مگر ہمارے قریب جتنے افغانی تھے سب بہت مہذب تھے اُن میں ایک دو عالم بھی تھے۔ مولانا گل دوست خاں صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے فارغ التحصیل اور حضرت سیدی و مرشدی مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ اور مولانا ثابت علی صاحب مرحوم اور مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر علوم کے شاگرد ہیں۔ آپ کا زمانہ تحصیل وہی تھا جبکہ یہ ناچیز مدرسہ مظاہر علوم میں مدرس تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پہچان گئے اور بہت محبت سے ملے اور تمام سفر جہاز میں برابر ملتے رہے۔ بحمد اللہ ہمکو دریا بہت ساکن ملا کسی کو چکر وغیرہ نہیں آیا۔ البتہ میری بھتیجی کو دو روز کے بعد بخار ہو گیا اتفاق سے حکیم نذیر احمد صاحب خورجوی جہاز میں موجود تھے اُنہوں نے نبض دیکھ کر دوا تجویز کی اور بہت جلد آرام ہو گیا۔ مگر دو دن کے بخار نے اُسکو اتنا کمزور کر دیا کہ جہاز کا سفر اُسکو گراں ہونے لگا حکیم صاحب نے فرما دیا تھا کہ جہاز کا پانی اس کو نہ دیا جائے اس لئے دونوں وقت برف میں ٹھنڈی کی ہوئی لیمن کی بوتل دی جاتی جو اتفاق سے رحمانی جہاز میں ۳ر کو مل جاتی تھی۔ اکثر جہازوں میں برف نہیں ہوتا تو گرم پانی پی کر طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ رحمانی جہاز جمعہ کے دن ۵ر اپریل کو جدہ سے چلا تھا قاعدہ سے ۱۴ر اپریل کو کراچی پہنچنا چاہئے تھا۔ مگر جہاز میں بہت لوگ بیمار تھے اس لئے کپتان نے رفتار کم کر رکھی تھی۔ کپتان بہت خلیق تھا۔ روزانہ حاجیوں کو دیکھنے آتا تو ہاتھ کے اشارہ سے سلام کرتا۔ مزاج پرسی کرتا اور میری نواسی کو گود میں لیکر پیار کرتا تھا۔ یہ بچی ماشاء اللہ ایسی ہنس مکھ ہے کہ ہر شخص کو دیکھ کر ہنستی اور تماشے کرتی ہے۔ اس لئے ہر شخص کو اس پر پیار آتا ہے۔ کپتان بھی اس کو گود میں لیلیتا تھا اور جہاز میں جو لڑکی سامنے سے گذرتی وہ اس کے ساتھ کچھ دیر کھیلتی اور ہنستی رہتی تھی۔ ایک افغانی لڑکی کو اس سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اپنے باپ کو بلا کر لائی کہ دیکھو یہ بچی کیسی اچھی ہے۔ اُس کے باپ نے اس کو

شامل کردی۔ مدینہ منورہ میں ایک مصری لڑکی کو اس سے بہت محبت ہو گئی تھی وہ گود میں لیکر گھنٹوں اسے کھلاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا کہ اس شیر خوار بچی کو سارے سفر میں کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھے زیادہ تر اسی کا فکر تھا کہ خدا کرے یہ خیریت سے گھر پہنچ جائے اور اسی لئے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں جی بھر کر قیام نہ کرسکا۔ الحمد للہ بچی اور اس کی والدہ اور سب رفقاء اچھے رہے۔

کراچی پہنچنا

۱۶۔ اپریل کو ہم کراچی پہنچے۔ دس بجے جہاز کنارہ لگا۔ حاجی عبد الغنی صاحب چیرمین حج کمیٹی جہاز ہی پر آگئے تھے۔ انہوں نے تاکید کی کہ اترنے میں جلدی نہ کرو ہجوم کم ہونے دو۔ چنانچہ ہم سب سے اخیر میں مستورات کو لیکر اترے کنارہ پر پہنچکر دیکھا کہ حاجی اسپیشل ٹرین اسی جگہ جہاز کے متصل کھڑی ہے ہم نے حاجی صاحب سے کہا کہ کسٹم والوں سے جلد نجات دلائیے اور ٹکٹ کا بندوبست کر دیجئے حاجی صاحب موصوف نے فوراً ایک انگریز کو بلا کر ہمارا سامان پاس کرادیا اور اسی وقت سہارنپور کے ٹکٹ بھی خود ہی لادیے۔ حاجی صاحب کیلئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسے ہی چیرمین حج کمیٹی اور پیدا کریں تو حجاج کو سفر حج آسان ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے مدارج میں رفعت اور تجارت میں برکت اور دنیا و آخرت میں روزافزوں ترقی عطا فرمائیں۔ آمین۔ اب ہم نے اسی جگہ سامان کو وزن کرا کر بک کرایا کچھ اپنے ساتھ رکھا کچھ برگ میں دیدیا۔ ۱۲ بجے حاجی اسپیشل ٹرین میں سوار ہوئے۔ اس ریل میں ہوٹل بھی تھا۔ اور کنارہ پر حج کمیٹی کی طرف سے برف کے پانی کا انتظام تھا جو حاجیوں کو مفت دیا جارہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھکر ہم نے ہوٹل سے کھانا خریدا۔ ظہر کی نماز پڑھی ۲ ½ بجے گاڑی روانہ ہوئی۔ کراچی اسٹیشن پر پہنچکر ہم نے اس گاڑی کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ یہ پسنجر ٹرین تھی جو دیر میں سہارنپور پہنچنے والی تھی ہم نے کراچی میل کو لیا۔ جو رات کو ۸ بجے روانہ ہوا۔ اگلے دن ۸ بجے رات کو لاہور پہنچے اسی وقت فرنٹیر میل تیار تھا۔ اس میں سوار ہوگئے۔ چونکہ میری بھتیجی جہاز کی دو روزہ علالت سے کمزور ہوگئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ جلد گھر پہنچو۔ اس لئے سکھر سندھ۔ اور لاہور کے احباب کو اطلاع نہ کرسکا جس کیلئے میں ان سے معافی کا طالب ہوں۔ کراچی سے سہارنپور تک تھانہ بھون۔

کیرانہ کو تار دیدیا تھا۔ فرنٹیر میل رات کے ۲ بجے سہارنپور پہنچا۔ اسٹیشن پر برخوردار عمر احمد سلمہ مولوی محمود رنگونی سلمہ اور اُن کے بھائی عزیزم حافظ سلیمان سلمہ اور مولوی جمیل احمد سلمہ مولوی ظہور الحسن صاحب سلمہ اور بہت سے احباب موجود تھے۔ تھانہ بھون سے حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم کی اہلیہ صغریٰ۔ میری بھتیجی کی والدہ اور مولوی عمر احمد سلمہ کی والدہ اور اُن کے ماموں حافظ ناظر حسن صاحب سلمہ اور بہت سے عزیز آگئے تھے۔ یہ بھی سب اسٹیشن ہی پر موجود تھے میرا چھوٹا بچہ برخوردار قمر احمد سلمہ اور اُس کی چھوٹی بہن منجھلی بہن بڑی بہن بھی اسٹیشن پر تھی۔ غرض سہارنپور ہی میں سارے گھر والے مل لئے۔ اب اسٹیشن سے بابو عبد العزیز صاحب کے مکان پر گئے جو اسٹیشن سے ملا ہوا ہے اور اُنہی کے مکان پر ہمارے گھر والے تھانہ بھون سے آکر ٹھیرے ہوئے تھے کیونکہ بابو صاحب اور اُن کی اہلیہ حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم کے مخلص خدام میں سے ہیں ابھی تک صبح نہ ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے تہجد کی نماز پوری کی۔ سامان کو دیکھ بھال کر رکھا۔ پھر احباب نے دعا کی درخواست کی تو سب حاجیوں نے اُن کیلئے دعا کی۔ اتنے میں صبح کی اذان ہوگئی۔ اسٹیشن ایس ایس ریلوے کی مسجد میں نماز پڑھی۔ نماز کے وقت تک اور بھی احباب ملنے آگئے تھے دعا کی پھر درخواست کی گئی جس کو پورا کیا گیا۔ نماز کے بعد مولانا عبد الرحمن صاحب کاملپوری صدر مدرس مظاہر علوم مولانا عبد الشکور صاحب اور بعض دیگر احباب ملنے آگئے۔ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب ناظم مظاہر علوم سے ملنے کیلئے میں خود مدرسہ میں گیا مولانا اس وقت حدیث کا درس دے رہے تھے۔ مولانا بڑی محبت اور عنایت سے ملے۔ پھر فرمایا میں تو خود اسٹیشن پر آنے کو تھا مگر یہ ارادہ کر رہا تھا کہ حدیث کا سبق پڑھا کر چلوں گا۔ پھر مولانا کے ارشاد سے طلبۂ حدیث کیلئے بھی دعا کی گئی ایک گھنٹہ کے بعد اسٹیشن پر واپس آگیا بابو عبد العزیز صاحب نے کھانا تیار کرا لیا تھا کھانا کھا کر ایس ایس ریلوے کا ٹکٹ خریدا اور ریل میں سوار ہو کر تھانہ بھون کا قصد کیا۔ گیارہ بجے گاڑی اسٹیشن تھانہ بھون پر پہنچی پلیٹ فارم پر حضرت حکیم الامت دام مجدہم مع جماعت خانقاہ کے تشریف فرما تھے جن میں مولوی شبیر علی صاحب مدیر النور اور خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب مولوی ظہور الحسن صاحب وغیرہم بہت احباب شامل تھے۔ بہت سے اعزہ پلیٹ فارم پر موجود تھے۔

سب سے پہلے حضرت حکیم الامت سے معانقہ ومصافحہ ہوا۔ حضرت اس وقت بہت زیادہ
مسرور تھے اور خاص توجہ ہمارے حال پر فرما رہے تھے۔ اسٹیشن تھانہ بھون کے زنانہ
مسافرخانہ میں بہت سی مستورات بھی میری بھتیجی کے استقبال کو موجود تھیں۔ تھوڑی دیر
مسافرخانہ میں ٹھیرے اور یہاں بھی سب حاجیوں نے ملکر سب کیلئے دعا کی پھر گاڑیوں
میں مستورات کو سوار کر کے مکان پر پہنچے اعزہ و احباب دیر تک ملنے کو آتے رہے۔ آج ۱۰
اپریل تھی اور بدھ کا دن تھا۔ تمام سفر میں تکان کا احساس نہ ہوا تھا۔ مگر گھر پر پہنچکر تکان محسوس ہوا
بدن میں درد یا دکھن تو نہ تھی ہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم گویا ہے ہی نہیں۔ صرف روح کام
کر رہی ہے، کئی روز تک یہی حالت رہی، ۲۲ اپریل کو علماء سہارنپور اور علماء دیوبند اور حافظ
ہدایت حسین صاحب کانپوری۔ نواب جمشید علی خاں صاحب رئیس باغپت ممبران کونسل یوپی
اور حاجی وجیہ الدین صاحب ممبر اسمبلی شیخ رشید احمد صاحب تاجر اسلحہ دہلی تھانہ بھون میں
مسودہ وقف بل پر غور کرنے کے لئے مجتمع ہوئے۔ احقر بھی اس مجلس میں شریک ہوا۔ ۲۲
اپریل کو کیرانہ مع اہل وعیال کے پہنچا۔ یہاں بھی اعزہ اقربا اور بہت سے احباب ملنے آئے
۸ مئی کو تھانہ بھون واپس آیا۔ ایک دن ٹھیر کر ۹ مئی کی شام کو سہارنپور پہنچا۔ سات کو دیوبند اور
مظفرنگر سے قاری حفظ الرحمن صاحب سابق خطیب سورتی جامع مسجد رنگون اور قاری
آل احمد صاحب مدرس تجوید مدرسہ نذیریہ رنگون تشریف لائے۔ قاری حفظ الرحمن صاحب
سے مل کر دل بہت خوش ہوا موصوف نے عجب لطف کی طبیعت پائی ہے۔ حضرت ناظم صاحب
مظاہر علوم سہارنپور کے ارشاد پر ۱۰ مئی کی شب کو جامع مسجد سہارنپور میں بعد عشاء کے بیان
کیا جس میں حضرات صحابہ کرام اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے فضائل بیان کرتے ہوئے
اُن اعتراضات کا رد کیا گیا تھا جو شیعہ کی جانب سے کئے جاتے ہیں ۱۱ اپریل کی صبح کو لاہور
ہاوڑہ اکسپریس میں کلکتہ کا ٹکٹ لیکر ہمراہی قاری آل احمد صاحب سوار ہوا۔ شام کو جون پور
ایک دن کیلئے اُتر گیا کیونکہ وہاں میرے ہم زلف سید علی سجاد صاحب آجکل ڈپٹی کلکٹر ہیں انکے
بچوں سے اور اپنی ہمشیرہ سے ملکر بہت ہی خوش ہوا۔ ڈپٹی صاحب باوجود حاکم ضلع ہونے
کے ایسے سادہ واقع ہوئے ہیں کہ صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ۱۲

اپریل کی شام کو جونپور سے روانہ ہو کر کلکتہ پہنچا اور ۱۳ ء کی صبح کو انگا جہاز پر سوار ہو کر ۱۵ کو بعد ظہر رنگون پہنچا، جیٹی پر جناب مولانا عبد الخالق صاحب ناظم جمعیت العلماء برما، جناب سید عنایت حسین صاحب پرنسپل راندیریہ ہائی سکول مع اسٹاف اور جناب آسمعیل محمد یوسف صاحب محمد یوسف کمپنی مرچنٹ اسٹریٹ اور بہت سے احباب تشریف لائے تھے۔

الحمد للہ کہ دو ماہ اور تین دن میں سفر حجاز بخیر و خوبی تمام ہوا۔ ۶ ماہ کی رخصت تمام ہونے میں ابھی ۲۰ دن باقی تھے کہ میں اپنے کام پر رنگون واپس آگیا۔"

فالحمد للہ الذی بنعمۃ وجلالہ تتم الصلحت والصلوۃ والسلام علی سید الکائنات سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ صلوۃ تسبق الغایات۔"

سفر نامہ تو ختم ہوا اب چند باتیں متفرق طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

متفرقات

اہل حجاز کے افلاس کا سبب

(۱) اُن اوقاف کا بند ہو جانا جو حرمین کے واسطے مصر، شام، الجزائر، تیونس، ٹرکی وغیرہ میں ہیں۔ صرف مصر کا وقف اتنا بڑا ہے کہ اگر اُس کی پوری آمدنی حرمین کیلئے ہر سال آتی رہے تو مکہ مدینہ میں افلاس کا نام نہ رہے۔ اور اگر شام، الجزائر، ٹیونس، ٹرکی کے اوقاف بھی پہنچ جایا کریں تو اہل حجاز مالا مال ہو جائیں۔ اور یہ اوقاف اس لئے کئے گئے تھے کہ حجاز وادی غیر ذی ذرع (بے آب وگیاہ) ملک ہے۔ اُس کے باشندوں کو باہر سے خام پیداوار حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس اس وقت مسلمانوں نے حرمین کی طرف سے کچھ ایسی غفلت برتی ہے کہ حرمین کے اوقاف بھی بند کر دیئے۔

(۲) حجاج کا کم ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ حجاج کی جس قدر کثرت ہوگی اُسی قدر اہل حرمین کی تجارت اور کرایہ مکانات اور کرایہ حیوانات کو فروغ ہوگا۔ دیہات والے ترکاری میوہ جات اور اپنی مصنوعات بیچ کر فائدہ اُٹھائیں گے۔

(۳) حجاز ریلوے کا بند ہو جانا۔ کیونکہ اس ریلوے کے ذریعہ سے شام اور

حجاز کے درمیان تجارت کو بہت فروغ ہو گیا تھا۔ بدوؤں کے لئے ملازمت کا دروازہ بھی کھل گیا تھا۔

(۴) موٹروں کی کثرت سے اونٹوں کے کرایہ کا کم ہو جانا۔ اس کا اثر بدوؤں پر بہت زیادہ ہوا ہے کیونکہ اُن کی گذر اوقات زیادہ تر اونٹوں کے کرایہ پر تھی اس میں شک نہیں کہ موٹروں کی کثرت سے موٹر کمپنیوں کو۔ حکومت سعودیہ کو بہت نفع ہوا ہے اور حجاج کو بھی آرام ہو گیا ہے کہ مدینہ کے سفر میں بارہ دن جانے اور بارہ دن آنے کی طوالت سے بچ گئے۔ مگر بدوؤں کا تو خاتمہ ہو گیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ موٹروں کے کرایہ میں سے کچھ حصہ بدوؤں کو بھی دیا جائے۔ یا اُن کے گذارہ کی کوئی اور سبیل نکالی جائے، اگر کوئی صورت نہ ہو سکے تو کم از کم اُن کو فوج ہی میں بھرتی کر دیا جائے۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ موٹروں سے حکومت سعودیہ کو اتنا نفع نہیں ہوتا۔ جتنا پٹرول اور موٹر لاریوں کے خریدنے میں امریکہ اور یورپ کو نفع ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ خود حجاز میں پٹرول کے چشمے دریافت کئے جائیں۔ تاکہ گھر کی دولت باہر نہ جائے۔

(۵) تعلیم کا فقدان اور جہل کا غلبہ۔ کیونکہ تعلیم یافتہ آدمی اپنی روزی حاصل کرنے کا کچھ نہ کچھ راستہ نکال لیتا ہے۔ خصوصاً علم دین کا تو خاصہ ہے۔ کہ اس سے افلاس زائل ہو جاتا ہے

حجاز میں امن اور جلالۃ الملک سے گذارش

آج کل حجاز میں ایسا امن ہے کہ اس کی نظیر کسی جگہ نہیں مل سکتی۔ باوجود یمن کے ساتھ جنگ چھڑ جانے کے انتظام میں کوئی خلل نہ تھا۔ بارہا مشاہدہ ہوا ہے کہ ایک موٹر لاری سے کسی کا سامان گر گیا۔ تو منزل پر پہنچ کر دوسری موٹر کے ڈرائیور نے مالک کو سامان پہنچا دیا۔

مسجد نبوی اور مسجد حرام کے سامنے ممالک غیر کا سکہ اور نوٹ خریدنے والے ہزاروں کی مالیت کے نوٹ اور گنیاں لئے بیٹھے رہتے ہیں اور جہاں اذان کی آواز سنی اسی وقت وہ دکان پر کپڑا ڈال کر نماز کو چل دیئے۔ پھر کیا مجال کہ کوئی کپڑا اٹھا کر دیکھ بھی سکے

کہ اس کے نیچے کیا ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ جلالۃ الملک نے حدود شرعی کا اجرا کر دیا گو حدود شرعیہ دیکھنے میں تو سخت معلوم ہوتی ہیں۔ مگر جرائم کا انسداد انہی سے ہوتا ہے۔ متمدن حکومتوں نے جو سزائیں مقرر کر رکھی ہیں اُن سے جرائم کا انسداد نہیں ہوتا۔ حکومت سعودیہ نے اپنی دس سالہ سلطنت میں حجاز کے اندر چودہ پندرہ آدمیوں ہی کے ہاتھ کاٹے ہوں گے مگر وہ جرائم پیشہ قوم جو حرامی اور چور ڈاکو کے لقب سے یاد کی جاتی تھی دفعۃً درست ہو گئی اور اب وہاں شاذ و نادر ہی سرقہ کا وقوع ہوتا ہے۔ ڈاکہ و قتل کا تو نام و نشان تک نہیں رہا۔ اس کے مقابلہ میں متمدن حکومتوں کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہاں روز بروز جرائم میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ حجاج کیلئے تو حکومت سعودیہ ایک رحمت آلہیہ ہے مگر اہلِ حجاز کے حق میں اُس کا رحمت ہونا ابھی تک نمایاں نہیں ہوا جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ حکومت کے کارکن زیادہ تر شامی اور نجدی ہیں اور یہ دونوں اہلِ حجاز کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی تالیف قلب نہیں کرتے۔ اہلِ حجاز سلطان کی ذات کے بڑے مداح ہیں۔ مگر ارکان سلطنت و حکام زیردست کے عموماً شاکی ہیں اُمید ہے کہ جلالۃ الملک اس مسئلہ پر توجہ فرمائیں گے۔

مصارفِ سفر میں نے اور میرے رفقاء نے ریل اور جہاز میں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا اور جدہ سے مدینے اور مدینے سے مکے کا سفر موٹر لاری میں کیا۔ عرفات کیلئے شغدف کرایہ کیا۔ اور مکے سے جدہ کی واپسی موٹر لاری میں ہوئی۔ اس حالت میں ہمارا خرچ فی کس ساڑھے چھ سو روپے ہوا۔ بعض رفقا کا اس سے بھی کم ہوا۔ اگر مکہ مدینہ اور جدہ کا سفر اونٹ پر کیا جائے تو اس میں سے ڈیڑھ سو روپے کم ہو کر پانچسو روپے میں بخوبی حج اور زیارت مدینے سے فراغت ہو جائیگی۔ اور یہ مقدار کچھ زیادہ نہیں ہو۔ زمانہ شریف حسین میں بھی فی کس پانچسو روپے خرچ ہوتا تھا۔ اور اگر کسی کے پاس مدینے جانے کیلئے رقم نہ ہو تو۔ صرف حج کیلئے ساڑھے تین سو روپے کافی ہیں۔ جس شخص کے پاس ساڑھے تین سو روپے حوائج ضروریہ اور

نقد اہل و عیال سے فاضل ہو اُس پر حج فرض ہو" مدینے جانا فرض نہیں اور اس کے انتظار میں حج کو موخر کرنا بھی جائز نہیں۔ ہاں جس کے پاس مدینے جانے کے لئے رقم کافی ہو اُسکو مدینے جانا ضروری ہے۔ کیونکہ بعض علماء نے زیارت قبر رسول کو اہل وسعت پر واجب کیا ہے۔

اس سال گذشتہ سال سے نسبتہً کچھ حاجی زیادہ تھے۔ مگر حقیقت میں زیادہ نہ تھے بحری راستہ سے چھبیس ہزار آدمی پہنچے تھے۔ اور خشکی کے راستہ سے اور مکہ مدینہ و قرب و جوار کے سب حاجی ملاکر سوالاکھ کے قریب ہونگے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ اس فریضہ کی رغبت اور شوق اُن کے دلوں میں پیدا ہو کہ ایمان کی تکمیل حج ہی سے ہوتی ہے۔

اسباب راحت

سفر حج میں زیادہ دشواری زبان کی ناواقفی سے پیش آتی ہے۔ جو شخص عربی زبان جانتا ہو یا جاننے والے کے ساتھ ہو اُس کو بہت راحت ملتی ہے۔ اسی طرح جو شخص سفر میں بخل سے کام لیگا اُسکو بھی تکالیف کا سامنا ہوگا۔ سفر حجاز میں اعتدال سے کام لینا چاہیئے۔ نہ اسراف کرے نہ بخل۔ اور جہاں تک ہو سکے سامان ساتھ کم ہونا چاہیئے۔ ہر جگہ ہر چیز میسر آجاتی ہے۔ زیادہ بوجھ لادنے سے خواہ مخواہ تکلیف ہوتی ہے۔

تبرکات

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ حجاج تبرکات میں بہت رقم خرچ کر دیتے ہیں اور اس کو بھی مصارف حج میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ تبرکات کا لانا شرعاً کچھ ضروری نہیں۔ اور اس کے ساتھ ضروری کا معاملہ کرنا حد سے تجاوز اور بدعت میں داخل ہے۔!

اگر تبرکات لائے جائیں تو سب سے بہتر زمزم اور مدینے کی کھجور ہے۔ یہ تو اصل تبرک ہے جس کا لانا اور لیجانا سلف سے منقول ہے۔ خاک شفار کا لانا بھی کسی قدر ثابت ہے۔ باقی اور تبرکات کا لانا فضیلت میں داخل نہیں۔ ہاں جائز ہے جیسے تسبیح رومال جانمازیں اور مسواک ہندی۔ اشنان وغیرہ اور اگر ان چیزوں کے خریدنے میں امداد

اہلِ اسلام کی نیت کی جائے تو ثواب بھی ہوگا۔ البتہ غلاف کعبہ اور بیت اللہ یا روضۂ نبویہ کی موم بتیاں لانے کے متعلق کسی عالمِ محقق سے جو قافلہ میں موجود ہو فتویٰ پوچھ لینا چاہئے کیونکہ بعض دفعہ یہ چیزیں خدام حرم کی ملک کر دی جاتی ہیں اور بعض دفعہ ملک نہیں کی جاتیں۔ اور کبھی یہ اشیاء مال وقف سے تیار ہوتی ہیں۔ کبھی سلطان کی رقم سے اسلئے اُن کے متعلق ہمیشہ ایک فتویٰ نہ ہوگا۔

اسماءِ رفقاء

میری ہمراہ ایک تو میری بھتیجی تھی جو برادرم مرحوم مولانا سعید احمد صاحب غفرلہ کی ایک ہی لڑکی ہے اور گود میں شیر خوار بچی بعیدہ خاتون سلمہا تھی جو اس وقت سات مہینے کی ہے۔ اس سے بڑی بچی عبیدہ خاتون سلمہا اس وقت تین سال کی ہے وہ حج میں ہمراہ نہ تھی بلکہ اپنی نانی صاحبہ کے پاس وطن ہی میں رہی۔ میں نے اس سال اپنے بھائی صاحب مرحوم کی طرف سے حج کیا ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ دوسرے منشی لئیق احمد صاحب کیرانوی برادر زادۂ مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی تھے بہت اچھے محاسب ہیں اور بڑے منتظم، آپ سے حساب و انتظام میں مجھکو بہت مدد ملی۔ تیسرے حافظ عبد الستار صاحب اعظم گڈھی تھے۔ جو حضرت حکیم الامت کے خادم ہیں اور اس سے پہلے سات دفعہ حج کر چکے ہیں۔ ذمہ داری کے سارے کام وہی انجام دیتے تھے۔ چوتھے شیخ عابد حسین صاحب تاجر چوب اجمیری دروازہ دہلی تھے۔ آپ بہت با اوقات اور مخلص رفیق تھے۔ پانچویں عزیزم نعمت اللہ خاں پندرہ سالہ نوجوان مع اپنی والدہ کے تھے، اس نوجوان بچہ کی طرف سے فکر تھا کہ اتنا لمبا سفر کیونکر کرے گا مگر ماشاء اللہ اس نے ہر جگہ بہت ہمت اور پھرتی سے کام لیا۔ کبھی گھبرایا نہیں۔ ایک ساتھ ہمارے وطن کے پاس کی اور تھیں جو میری بھتیجی کی خدمت وغیرہ کیلئے ساتھ ہو گئی تھیں۔ میرے ہموطن مولوی افضل صاحب نبیرۂ مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانہ بھون مع اپنی دو خالہ اور ایک خالو اور ایک خالہ زاد بہن کے بھی جاتے ہوئے کراچی اور جہاز میں ساتھ رہے پھر ہم مدینے چلے گئے وہ مکہ چلے گئے۔ منشی فیاض احمد صاحب تھانوی ایڈیٹر اخبار کشاف مظفر نگر (جو عرصہ ہوا بند ہو چکا ہے) بھی جاتے ہوئے کراچی اور جہاز تک ہمارے ہمراہ رہے

سفرنامۂ حجاز

سید زاہد حسین

(تصنیف - ۱۹۳۲ء)

یہ ۱۹۳۱ء کا حجاز کا سفرنامہ ہے، جو ۱۹۳۲ء
میں 'پاپولر پرنٹنگ پریس' الہ آباد میں چھپا۔ ۱۹۳۲ء
کی ایک تصویر بھی سفرنامہ میں شامل ہے، جس سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔
یہ سیّد زاہد حسین کا سفرنامۂ حج
ہے، جو الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ حج کے
وقت ان کی عمر تقریباً ۵۶ سال کی تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حج کا شوق مجھکو دراصل بہت بچپن سے تھا۔ میری والدہ جنت نصیب بڑی عابدہ تھیں۔ اور جب میں اور میرے اور میرے بڑے بھائی سید شوکت حسین صاحب قبلہ بہت چھوٹے چھوٹے تھے اوسوقت وہ رات کو بجائے کہانی کہنے کے بزرگان دین کے حالات خاصکر اُن کے اکل حلال اور صدق مقال کے متعلق سنایا کرتی تھیں۔ حج کرنے کا اونکو بہت ارمان تھا اور اس کے فضائل وہ بہت بیان کیا کرتی تھیں۔ مجھکو خوب یاد ہے کہ اونکی باتیں سنکر بچپنا ہی میں سفر حج کی اُمنگ دل میں پیدا ہوا کرتی تھی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو انگریزی تعلیم اور ڈاکٹری تعلیم میں مصروف رہے۔ تیس سال ملازمت کی اور بچپن کا شوق دل سے قریباً محو ہوگیا۔ سنہ ۲۵ء میں پنشن لینے کے بعد قرآن مجید کو سمجھکر پڑھنے کا شوق جو ایک مدت سے تھا دل کو بہت بے چین کرنے لگا۔ کئی مرتبہ بطور خود مختلف ترجمے اور تفسیریں شروع کی گئیں۔ لیکن بجائے اطمینان حاصل ہونے کے ایک عجیب بے چینی قلب میں پیدا ہوتی تھی اور مطالعہ کا سلسلہ ترک ہوجاتا تھا۔ سنہ ۴۲ء میں ایک روز اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں ان کی چند تصانیف پیشتر بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ یہ عربی اور سنسکرت کے بڑے ماہر ہیں اور قرآن مجید کی تحقیق و تحصیل میں اُنھوں نے ہندوستان۔ جرمنی اور انگلستان میں عمر کا بہترین حصہ صرف کیا ہے اور اب تک اُسی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان سے ایک سوال قرآن مجید کی کسی آیت کے بارے میں کیا۔ اُنھوں نے فوراً قرآن مجید منگوایا اور اسطرح میرے سوال کو حل کیا کہ مجھکو نہایت درجہ اطمینان حاصل ہوا۔ اوسی وقت چند اور سوالات کئے گئے اور اُنھوں نے براہ کرم سب کے جوابات اس خوش اسلوبی سے دیئے کہ میرے سمجھ میں بخوبی آگئے اور سچ تو یہ ہے کہ ایمان تازہ ہوگیا۔ میں نے ان سے اصرار شروع کیا کہ خدا کے لئے مجھکو قرآن مجید سبقاً سبقاً اور سلسلہ وار سمجھا کر پڑھا دیجئے

اُنھوں نے میری درخواست منظور کی مگر بوجہ کثرت مشاغل طرفین کے نوبت نشست
بمشکل ہفتہ میں دوبار آتی تھی اور ایک سال میں چھیا سٹھ سورتیں ختم ہوئیں۔ بیان
کے سلسلہ میں حضرت رسول کریم کے متعلق میرے مخدوم مولانا پر ایک خاص کیفیت طاری
ہو جاتی تھی۔ اونکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کے حالات بیان کرنے لگتے تھے پھر تو اونکو کوئی احساس وقت کا بھی باقی نہیں
تھا اور گھنٹوں یہی ذکر خیر جاری رہتا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے ختم ہوتے ہوتے دل کی کچھ
کیفیت ہوگئی کہ اسکا لکھنا محال ہے۔ ہر وقت دیار رسول کریم کی زیارت کا اشتیاق
بڑھنے لگا۔ بچپن میں جو کچھ والدہ معظمہ مرحومہ سے سنا کرتا تھا وہ سب تذکرے یاد آ
لگے اور جو شوق زمانہ طفلی سے دل میں دبا ہوا تھا اُس نے ایکبارگی ایک تلاطم
کر دیا۔ راتوں کو اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا پلنگ زمین پر نہیں ہے بلکہ
پر رکھا ہوا ہے اور اُس میں ایک خفیف سی جنبش ہے۔

غرضکہ ۱۹۳۱ء میں میں نے حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسول اللہ کا مصمم ارادہ
کر لیا۔ میری راہ میں بہت سی رکاوٹیں بھی تھیں۔ شاہد سلمہ بہت کم سن اور اسکی پرورش
تعلیم میرے ذمہ۔ ظہیر سلمہ اور بشیر سلمہ دونوں کی صحت خراب اور دونوں زیر تعلیم
لیکن زمانہ حج جسقدر قریب آتا جاتا تھا میری حالت بے اختیاری کی بڑھتی جاتی
یہانتک کہ میں نے ۷ مارچ ۱۹۳۱ء اپنے سفر کی تاریخ مقرر کر دی۔ ڈاکٹر سید اسرار
صاحب سے ذکر آیا وہ بھی تیار ہو گئے اور اونکی معیت میں اونکے خویش شاہ محمد
بھی آمادہ ہو گئے۔ سفر سے صرف تین دن قبل بشیر حسین سلمہ نے بھائی صاحب
مولوی سید شوکت حسین صاحب کو تار دیا کہ حج کا ارادہ ہو تو انتظام کیا جائے
تار آمادگی کا آیا اور دوسرے ہی دن رام پور سے وہ بھی باوجود صحت اچھی
کے آگئے۔ اونکا پاس پورٹ بھی فوراً حاصل کیا گیا۔

ساتویں مارچ ۱۹۳۱ء۔ گھر میں اعزا کا مجمع تھا۔ میری دونوں لڑکیاں
روتے روتے شرخ لال کی طرح ہو گئیں تھیں۔ بشیر سلمہ پر خاصکر ایک ایسی

طاری تھی کہ ہاتھ پیر ٹھنڈے اور بدن بے قابو تھا۔ میں نے کہا کہ اگر تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے تو میں سفر ملتوی کرتا ہوں۔ اسپر وہ بھی دل مضبوط کرکے اُٹھ کھڑی ہوئیں میں نے دو رکعت نماز ادا کی۔ دعا پڑھی اُس کا ترجمہ اُردو میں بہ آواز بلند پڑھتا گیا اور شاہد سلمہ آمین آمین کہتا رہا۔ دعا ختم ہوتے ہی تمام اعزا اور لڑکیوں کو آبدیدہ چھوڑ کر دن کے قریب تین بجے گھر سے روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر احباب اور اعزاء کا ہجوم تھا سان سب سے رخصت ہوتے وقت دل کی جو کیفیت تھی بیان نہیں ہو سکتی۔ تاہم باوجود محبت اولاد اور الفت احباب وطن کے ایک قوی تر کشش اپنی جانب دوسری طرف کھینچ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بچوں کو گریاں و پریشان چھوڑ کر منزل مقصود کی جانب ان سب سے رخصت ہوا۔ اپنے سب سے چھوٹے لڑکے شاہد کی بھولی بھالی صورت اور اسکا معصومانہ تبسم اور بہادرانہ استقلال۔ کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آنا کبھی مجکو دیکھکر بھیر بشاش ہو جانا دل میں عجب کیفیت پیدا کرتا رہا اور اسٹیشن سے گاڑی چھوٹنے کے بعد دیر تک مجھپر ایک عجیب عالم طاری رہا۔

گاڑی کے جس حصہ پر ہم لوگوں نے الہ آباد میں قبضہ کرلیا تھا وہ راستہ بھر ہم لوگوں کے تصرف میں بلا شرکت غیرے رہا۔ رات کو نیند بہت کم آئی۔ دو مضبوط مقناطیس تھے ایک عرب میں اور ایک الہ آباد میں۔ دونوں کی کشش میرے ناتواں دل پر اپنا اثر دکھلا رہی تھی

۸ مارچ ۱۹۳۱ء — بہت تڑکے گاڑی اٹارسی پہنچی اور سہ پہر تک اگت پوری اسٹیشن آگیا یہاں سے لوکوموٹیو انجن ٹرین سے علحدہ کر دیا گیا اُس کے بجاے بجلی کی قوت سے ٹرین چلی۔ اس کی حالت بجنسہ ٹریموے کی طرح تھی۔ انجن کی جگہ جو مشین سامنے لگائی جاتی ہے اُس پر چرخیاں لگی ہوتی ہیں جنکا تعلق اوپر کے تار سے مثل ٹریموے کے ہوتا ہے بمبئی تک یہ سفر اسی طرح طے ہوتا ہے۔ چار بجے کے قریب تنگ و تاریک ٹنل ملنے شروع ہوئے۔ کُل نو ٹنل ملے۔ بعض چھوٹے اور تین اچھے خاصے لانبے جنمیں کئی کئی منٹ قطعی اندھیرا رہا اور گاڑی کے اندر برقی بلب روشن کر دیئے گئے۔ ساڑھے چھ بجے مع الخیر ہماری پاسنگ اسٹیشن وکٹوریا ٹرمینس پر پہنچی۔ اسباب کے اُتارنے اور

اُس کے جائے قیام تک روانگی وغیرہ میں قریب ایک گھنٹہ کے صرف ہوا۔ وکٹوریا ٹرمنس سے ذرا قبل بمبئی کا بھاؤ کلہ اسٹیشن ملتا ہے۔ اس اسٹیشن پر حج کے ایام میں معلم اور انکے ایجنٹ جمع رہتے ہیں اور حجاج کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ بجز انکے اور سب معلم قابل اعتبار نہ ہونگے لہذا انھیں کو معلم کرنا چاہئے۔ ہم لوگوں نے باتیں تو سب کی سنیں مگر زبان کسی کو سے نہیں ہارے۔ ہم لوگ اسٹیشن سے بذریعہ ٹیکسی مسافرخانہ حاجی صابو صدیق پہنچے دوسری منزل پر ایک کمرہ ہمارے لئے محفوظ تھا۔ کیونکہ میں نے اپنی آمد کی خبر پیشتر سے بذریعہ ڈاک منیجر صاحب مسافرخانہ کو کردی تھی۔

یہ مسافرخانہ ایک پنج منزلہ وسیع خوش قطع عمارت ہے۔ کمرے کشادہ ہوادار ہیں فرش ہر منزل پر ٹائیلز کا ہے۔ پاخانہ اور غسل خانہ میں عمدہ ٹائیلز لگے ہیں لیکن انکا برتنے کے لئے عموماً لوگوں کو تمیز نہیں ہے اس وجہ سے اکثر گندگی نظر آئی۔ ۸ر مارچ شب سے ۱۲ر مارچ کی سہ پہر تک ہم لوگ یہاں مقیم رہے۔ ہم لوگوں نے یہاں مچھر اور مکھی کا نشان تک نہ پایا۔ اگرچہ صفائی کی حالت بوجہ اژدحام خلقت اچھی نہ پائی تھی اور کھانے پینے کی چیزیں اور مٹھائیاں بکثرت جابجا کھلی ہوئی پڑی رہتی تھیں ہمارے کمرے کے نیچے گنے کے رس کی مشین والا آیا کرتا تھا۔ کئی کئی گھنٹہ تک آ... رس نکالنے اور لوگوں کے پینے کا سلسلہ جاری رہتا تھا مگر کبھی کوئی مکھی اُس مشین یا اُس کے قریب نظر نہ آئی۔ مجھکو اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو مکھی اور ... کی عدم موجودگی پر تعجب رہا۔ کوئی وجہ بخوبی سمجھ میں نہیں آئی۔

۹ر مارچ ۱۹۳۱ء سابق رفیق سفر سے عباس حافظ ابراہیم معلم کی بہت تعریف اور حسن اتفاق سے عباس ابن حافظ ابراہیم سے آج ملاقات بھی ہوگئی۔ جسوقت اُن سے ملاقات ہوئی انکی وجہ سے جو جو آرام ملا اُس کی تفصیل محال ہے۔ مختصر یہ کہ یہ اپنے حاجیوں کے آرام کا بے انتہا خیال رکھتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں اور سواری کا انتظام کرنا تو ایک معمولی بات ہے لیکن بمبئی سے روانگی ایک امر ہے اگر معلم اچھا نہ ہو۔ بفضلہ عباس اس صفت میں بے نظیر آدمی ہیں۔ ۱۲ ما...

جہاز سرو ستان سے ہم لوگوں کی روانگی قرار پائی۔ چنانچہ اُس سے ایک روز قبل سے
انھوں نے طرح طرح کی چیزیں خود فراہم کرنا شروع کیں۔ انڈے۔ مرغیاں
انگور۔ لوکی۔ شلغم۔ ٹماٹو۔ بھنڈی۔ پودینہ۔ لیموں کاغذی۔ سنگترے وغیرہ وغیرہ سب
چیزیں بافراط ہم لوگوں کے ساتھ ہیں جو عباس نے خود خریدی ہیں۔ وہ صبح سے شام
تک کھانے پینے وغیرہ کا انتظام اور خیال رکھتے ہیں۔

آج محافظ حجاج کے دفتر گئے۔ اونکے مہتمم صاحب سے ملے۔ بھائی جان کو عباس
صاحب اپنے ہمراہ لیجا کر ٹیکہ دلا لائے۔ جہاز کے دفتر میں میرے ہمراہ گئے۔ ٹکٹ کا
روپیہ داخل ہوا۔ رسید عباس کے حوالہ کی۔ دوسرے روز ٹکٹ کا لانا۔ پاس پورٹ
کا مکمل کرانا۔ ٹیکہ کا سارٹیفکٹ لانا یہ سب عباس صاحب نے کیا۔ اگرچہ پہلے میں نے
درجہ اول میں سفر کرنے کا قصد کیا لیکن حاجیوں کی ضروریات اور تکلیفوں کا اندازہ
کرنے کے خیال سے میں نے اپنی رائے بدل دی اور تیسرے درجہ کا ٹکٹ خریدا۔

۱۰ و ۱۱ مارچ ۱۹۳۱ء۔ آج اعلان کیا گیا کہ ۱۱ کو دوپہر کے وقت حاجی اپنا اپنا سامان
بجز بستروں کے سب جہاز پر بھیج دیں۔ یہ ایک نہایت اہم اور دشوار ترین کام ہے
جو معلموں اور اُن کے ملازمین کی امداد کے بغیر قریب قریب محال ہے۔ صبح ہی سے
اُن لوگوں کی پھرتی اور سرگرمی قابل دید ہوتی ہے۔ مسافر خانہ کے پھاٹک پر کم از کم ایک سو
بیل گاڑیاں لاکر جمع کی گئیں اور ٹھیک بارہ بجے دن کو اُنپر اسباب لدنا شروع ہوا۔ معلموں
کے آدمی اور قلی کئی کئی من کے صندوق سر پر اٹھا کر تین چار پانچ منزل کے کمروں سے
اسطرح اترتے تھے کہ گویا وزن کا اونکو کوئی حس نہیں ہے۔ پھر ہر ایک قلی کو سیکڑوں
چکر پڑ گئے۔ ہمارا قلی جو عباس صاحب کا خاص آدمی تھا نہایت جفاکش اور مضبوط
آدمی تھا۔ اوسکی مستعدی اور جانفشانی قابل دید تھی۔ غرضکہ آناً فاناً سب بیل گاڑیاں
بار کردی گئیں اور معلموں کی نگرانی میں جہاز کے اشٹیشن پر روانہ کردی گئیں۔ اسکے
بعد حجاج اپنی جگہ تجویز کرنے اور اسباب جہاز پر مناسب مقام پر رکھوانے کے لئے
حسب اعلان بارہ بجے روانہ ہوئے۔ اب ڈاک یارڈ میں پہنچنے کے بعد کس مپرسی کا عالم

قابل دید تھا۔ اپنی پارٹی کی طرف سے میرا اور شاہ محمد سلیم کا انتخاب اس کام کے لیے ہوا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ پلیٹ فارم پر اور تمام حجاج کی طرح پریشان اور سرگرداں پھرتے رہے۔ دھوپ اور گرمی اور اژدحام کا کیا بیان کیا جائے۔ ان سب پر بالا انتظار کی تکلیف اور معلموں اور انکے آدمیوں کے لیئے یہ دن بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ جہاز کی سیڑھی قریب ۲½ فیٹ چوڑی ہوتی ہے اُس کے قریب سیکڑوں آدمیوں کا ہجوم ہوتا ہے اور یہ کوشش ہوتی ہے کہ جب جہاز پر آنے کی اجازت کا سگنل ہو تو سب سے پہلے ہیں داخل ہوں۔ چنانچہ اس بھیڑ اور جدوجہد کا ہم لوگ نظارہ کرتے رہے سیڑھی پر کانسٹبل کھڑے تھے جو معلموں کے آدمیوں اور قلیوں کو سیڑھی چھونے تک نہیں دیتے تھے۔ اسی کشمکش میں یہ لوگ دو گھنٹہ سے زیادہ کھڑے رہے۔ بعد تین بجنے کے یکایک اشارہ کیا گیا اور اُس وقت جو حملہ سیڑھی پر ہوا ہے وہ خطرہ سے خالی نہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی دب کر یا گر کر مر جائیگا۔ مگر بجز خفیف چوٹوں کے اور کوئی مجروح نہیں ہوا۔ ذرا دیر میں اسباب کا معائنہ شروع ہوا۔ ہماری پیٹیاں اور صندوق کھلوائے گئے اور سرسری معائنہ ہوا۔ اس کے بعد ہم لوگ حسب ہدایت عباس صاحب جہاز پر گئے۔ عباس صاحب نے نہایت موزوں مقام پر قبضہ جما لیا تھا۔ ایک فرش اُنھوں نے یہاں پر بچھا رکھا تھا جس پر ہمارا اسباب لاکر رکھ دیا گیا۔ زمین سے جہاز پر اسباب عموماً بذریعہ جر ثقیل کے اُٹھایا جاتا ہے۔ خاص لوگ قلی کر لیتے ہیں تاکہ حفاظت کے ساتھ اسباب بار ہو جائے۔ عباس صاحب کا قلی ان تھک آدمی تھا بلا مبالغہ پچاس مرتبہ یہ شخص جہاز سے نیچے گیا ہوگا اور بھاری بھاری سامان لیکر چشم زدن میں اوپر آتا تھا۔ پلیٹ فارم سے بالائی ڈاک کی بلندی اندازاً چالیس فیٹ سے کم نہیں ہے۔

۵ بجے کے بعد ہملوگ اپنے جائے قیام پر آئے۔ اب ہمارے پاس بجز بستر کے کوئی سامان نہ تھا۔ جو تکلیف آج عام طور پر لوگوں کو جہاز پر جانے اور اسباب کھولنے میں ہوئی وہ بآسانی منتظمان کی توجہ سے اصلاح پذیر ہو سکتی ہے یعنی بارہ بجے جب

اب پلیٹ فارم پہنچے اوسیوقت معائنہ کنندہ افسر موجود ہے اوسکے بعد دیگرے معائنہ کے
اجازت لوگوں کو جگہ انتخاب کرنے اور اسباب رکھوانے کی ملتی جاتی ہے۔ کوئی فرصت نہیں
کہ اسقدر عرصہ تک لوگ پریشان حال پھرتے رہیں۔

۱۲ر مارچ ۱۹۳۱ء کو حسب اعلان ہم لوگوں کا بستر بھاپ کے مقام پر روانہ کیا گیا اور
سب ایک بجنے کے ہم لوگ معائنہ ڈاکٹری کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک ہزار حاجی اسوقت
ز پر ہیں۔ یہ سب معائنہ کے کمرہ کے باہر جمع ہوئے۔ برآمدہ جہاں ہم لوگ کھڑے تھے
شکل سے بارہ فیٹ چوڑا اور ساٹھ فیٹ لانبا ہوگا۔ اوسکے پھاٹک پر جو بھیڑ ہوئی خدا
پناہ۔ بعد انتظار بسیار پھاٹک کھلا اور ایکبارگی ہمارے پیچھے سے ایک ایسا زبردست
ریلا سے فروں کا ہوا کہ ہم لوگ گویا شکنجہ میں دبنے لگے۔ دونوں ہاتھوں کو قدرے پھیلا کر
بمشکل بھائی صاحب کو اپنے حلقے کے اندر لیا کیونکہ سخت اندیشہ تھا کہ اونکو خدا نخواستہ
چوٹ ضرور پہونچیگی۔ غرضکہ دبتے اور پستے ہوئے ہم لوگ معائنہ کے ہال میں کسیطرح داخل
ہو گئے۔ میں نہیں جانتا کہ منتظمان حج کمیٹی اس تکلیف کو کیوں روا رکھتے ہیں۔ اس کا
علاج بہت آسان ہے۔ بارہ یا ایک بجے دن سے معائنہ کا دفتر کھلا رہے۔ چار بجے
شام تک جیسے جیسے حجاج آتے جائیں معائنہ ہوتا جائے اور انکو فراغت کر دیا جائے
یہ دو تین گھنٹہ انتظار کرانا اور اس کے لئے کوئی انتظام قیام نہ رکھنا سخت تکلیف دہ
اور خطرناک ہے۔ معائنہ کا ہال نہایت وسیع ہے۔ بجلی کے پنکھے لگے ہوئے ہیں بھائی
جان نے وہاں پہنچکر پاتابے اتارے اور جلد ترو تازہ ہو گئے۔ معائنہ کے وقت پاسپورٹ
اور گودنے کا سارٹیفکٹ دیکھا گیا اور کپڑے ہٹا کر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ڈاکٹر نے دیکھا
کہ تلی تو نہیں بڑھی ہے اور بخار تو نہیں ہے۔ اس معائنہ میں کوئی امر قابل اعتراض نہیں
ہم لوگ یہاں سے ایک گھنٹہ کے اندر فارغ ہو کر سیدھے جہاز کی طرف روانہ کئے گئے۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب اور بھائی صاحب مقام منتخب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے
یہ مقام بالائی ڈاک پر بہترین موقع پر ہے۔ سامنے سمندر ہے۔ سایہ دار ہوا دار پاخانہ
قریب۔ باورچی خانہ قریب۔ چھ بجے شام کو دو چھوٹے چھوٹے جہاز ہمارے بڑے جہاز کو

کھینچ کر ڈاک یارڈ کے باہر لے چلے۔ سات بجے جہاز ڈاک یارڈ سے باہر آگیا اور بمبئی کا دلکش بندرگاہ بخوبی پیش نظر ہوکر رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہوگیا۔

۱۳ مارچ ۱۹۳۱ء۔ بہت تڑکے ہم لوگ اٹھے۔ نماز سے فراغت کی۔ ڈاکٹر سراج الحسن و بھائی جان نہایت خوش ہیں۔ ہمارے پلنگ کے سامنے ایک جگہ مثل دالان کے ہے آگے سمندر کا منظر نہایت دل فریب ہے۔ تر و تازہ ہوا نہایت فرحت بخش ہے۔

تیسرے پہر سے ہوا تند ہوئی اور یکایک بہت تیز ہوگئی۔ کریج کی چھت میں ہوا بھر گئی۔ دفعتہً کل چھت کھولدی گئی۔ اب ہم لوگ زیر آسمان تھے۔ ہوا میں بہت نمی اور سرد اور تیزی تھی۔ بھائی جان اور ڈاکٹر سراج الحسن کا زیر آسمان اس سردی میں ہونا خطرناک معلوم ہوا۔ عباس سے میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس نے فوراً اس سے زیریں منزل پر بھائی جان کے لئے دوسرا پلنگ فراہم کیا اور انکا بچھونا خود لیجاکر بچھایا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کے قریب ہی جگہ مل گئی یہ دونوں آدمی آرام سے سوئے۔ مجھے اس کھلے مقام میں خوب گہری نیند آئی۔ ۳ بجے سویرے آنکھ کھلی۔ وضو کرکے یاد خدا میں مصروف ہو

۱۴ مارچ ۱۹۳۱ء۔ دن بھر بھائی جان اور ڈاکٹر صاحب اوپر ہمارے پاس رہے شام کو ہوا کا رخ پھر خراب نظر آیا چنانچہ ان دونوں کو پھر نیچے بھیجدیا گیا۔ ساڑھے گیارہ رات کو مجھے نیند آئی اور ساڑھے بارہ بجے آنکھ کھلی ایک عجیب عالم تھا کریج کی چھت معلوم ہوتا تھا کہ پاش پاش ہوکر اڑ جائے گی۔ کڑیاں اور بلیاں بید کی طرح کانپ رہی تھیں جہاز کروٹیں لے رہا تھا سمندر کی لہر اور اس کا شور مہیب تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اور پانی اور بجلی کی چمک اور بادل کی گرج شروع ہوئی۔ چار بجے صبح تک یہ طوفانی کیفیت رہی اوپر کے ڈک پر تقریباً چار سو آدمی ہیں۔ ہر طرف چیخ پکار مچی رہی۔ صبح ہوتے ہوا خاموش ہوئی۔ مطلع صاف ہوا اور ٹھیک ساڑھے چار بجے صبح کو بندرگاہ کراچی بحمداللہ ہم لوگ خیریت سے پہونچ گئے۔ بھائی جان اور ڈاکٹر صاحب کو زیریں منزل کوئی احساس ان حالات کا نہیں ہوا سوتے رہے۔ اب ہم لوگ خاص بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر لنگر انداز ہیں۔ یہاں معائنہ ڈاکٹری جہاز کا ہونے کے بعد دو چھو

جہاز اس جہاز کو کھینچ کر کراچی کے اندر لیجائینگے۔ یہاں پانچسو حاجی اور سوار ہوں گے۔
انشاء اللہ آج شام کو یہاں سے ہم لوگ عدن کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ مختصر یہ ہے
کہ سفر نہایت پر لطف اور صحت بخش معلوم ہوتا ہے۔ سے اور قیمان کا پتہ نہیں۔ مرغ
کا قورمہ اور طرح طرح کے فواکہات روز کھاتے ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں۔

۱۵ مارچ ۱۹۳۱ء۔ علی الصبح ۵ بجے جہاز بندرگاہ سے بذریعہ دو چھوٹے جہازوں کے
کھینچ کر بندرگاہ کراچی کے اندر لایا گیا۔ بندرگاہ کراچی خوبصورت اور کشادہ ہے جہاز کے
پلیٹ فارم پر ریل کی لائن بھی ہے۔ حجاج کا ہجوم سامنے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ جہاز کو
دیکھ کر نعرۂ اللہ اکبر بلند کیا۔ جہاز والوں نے اللہ اکبر کہکر جواب دیا۔ اسی طرح دیر تک
تکرار "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی ہوا کی پھر معلموں نے جہاز پر سے پلیٹ فارم کے لوگوں او
دیگر معلموں سے چیخ چیخ کر بات چیت شروع کی کوئی حاجی جہاز سے اتر کر پلیٹ فارم پر
نہیں جانے پایا دریافت سے معلوم ہوا کہ پورٹ کے افسران کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی
حاجی جہاز سے اتر سکے یہ عجیب قانون ہے۔ اس جہاز کے کل مسافر ہندوستان کے ہیں
اور بمبئی سے آرہے ہیں۔ کراچی بھی ہندوستان کا بندرگاہ ہے کیا وجہ ہے کہ انکو کم از کم
ڈاک یارڈ میں اترنے کی اجازت نہ دی جائے آخر الہ آباد میں ہندوستان کے ہر گوشہ سے
سالانہ ہزاروں بلکہ لاکھوں جاتری تیرتھ کے لئے آتے ہیں اور تمام شہر میں گھومتے خرید
و فروخت کرتے ہیں۔ مقیم رہتے ہیں اور کوئی ممانعت نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستان
کے مسافر بمبئی سے چلکر ہندوستان کے دوسرے بندرگاہ میں نہ اترنے پائیں خاصکر ایسی
صورت میں جبکہ تمام جہاز میں ایک مسافر بھی کسی عارضہ وبائی یا غیر وبائی میں مبتلا نہیں
اور اگر یہی مسافر بذریعہ ریل بمبئی سے کراچی آتے تو کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ خاصکر بندرگاہ
کے حدود کے اندر اترنے کی ممانعت ہونے سے سخت تکلیف حجاج کو ہوئی۔

پلیٹ فارم پر دوکاندار طرح طرح کی اشیاء ضروری فروخت کرنے کے لئے مستعد تھے
خریداری عجیب طور پر ہوئی۔ ٹوکریاں رسی سے باندھ کر جہاز سے لٹکا دی گئیں اور اس
قیمت رکھ دی گئی دوکانداروں نے اشیاء مطلوبہ اوسمیں رکھدیں خریدار نے اوپر

ٹوکری کھینچ لی۔ اسی طریق پر خرید و فروخت کا سلسلہ تمام دن جاری رہا۔ مچھلیاں بکثرت خریدی گئیں۔ ایک آنہ سیر چھوٹی مچھلی۔ بڑی مچھلی قریباً تین سیر کی چار آنہ کی۔ ایک آنہ کا ایک انار۔ دو پیسہ کا ایک سنگترہ۔ غرض کہ سب چیزیں ارزاں ہیں۔ تھوڑی دیر میں جہاز کے ہر گوشہ میں خریدی ہوئی مچھلیوں کا ڈھیر نظر آنے لگا۔ ساڑھے سات بجے صبح ڈاکیہ نے عزیز از جان سید بشیر حسین سلمہ کا جوابی تار جہاز کے اندر لاکر دیا۔ سب کی خیریت معلوم ہو کر اطمینان ہوا۔ اُس کا جواب لکھکر میں آفیسر انچارج جہاز کے پاس لے گیا۔ اُنھوں نے کہا کہ میری ذمہ داری پر آپ یہ کاغذ مجھکو دیدیجئے میں تار دیدونگا اور شام کو رسید دے دونگا۔ چنانچہ اُنھوں نے تار دیدیا۔ اسی آفیسر کی معرفت میں نے اپنے خط ڈاک میں ڈالنے کے لئے بھیجے۔ اب ہم لوگوں نے یہ انتظار شروع کیا کہ حجاج ترکے سے جہاز کے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں انکو کس وقت جہاز کے اندر آنے کی اجازت ہوتی ہے اسی انتظار میں تمام دن گزر گیا اور وہ بیچارے اُسی طرح انتظار کی تکلیف برداشت کرتے رہے۔ غروب آفتاب کے قریب خدا خدا کر کے اونکو جہاز کے اندر آنے کی اجازت ملی اور اُن کے عزیز اقارب۔ دوست آشنا جو رخصت کرنے آئے تھے چراغ روشن ہونے کے وقت ایک الوداعی نظارہ کے بعد واپس ہوئے اور پونے سات بجے جہاز بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ یہ قانون اور یہ عمل سخت اعتراض کے قابل ہے۔ بہت آسانی سے ممکن تھا کہ صبح حجاج کا معائنہ ڈاکٹری ہو جاتا۔ اون کا اسباب ملاحظہ ہو جاتا اسبہ کو بھاپ دیدی جاتی اور وہ دوپہر تک جہاز پر سوار ہو جاتے۔ پانسو آدمی کے قریب کراچی سے سوار ہوئے۔ اُونکو دوپہر تک فارغ کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

۱۶ / مارچ ۱۹۳۱ء۔ سمندر کی سطح نہایت ہموار ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چارخانہ کا ایک وسیع فرش بچھا ہوا ہے۔ جہاز کو ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی۔ ہم لوگ صبح کو جہاز کی سیر کو نکلے۔ وایر لس کیبن کی سیر کیلئے گئے۔ آفیسر انچارج سے ملاقات کی۔ معلوم ہوا کہ اس جہاز رستان کا وزن ۱۴۱۷ ٹن ہے۔ اس کی لمبائی چارسو پچاس فیٹ اور چوڑائی ستاون فیٹ ہے۔ بمبئی سے ایک ہزار سینتالیس حاجی اور کراچی سے پانچسو اٹھ

ل (۱۵۸۵) ایک ہزار پانچسو پچاسی حاجی سوار ہیں اور یہی اُسکی پوری تعداد ہے۔
آفیسر انچارج کے کمرہ سے نکل کر بالائی منزل پر کپتان کے کیبن کی طرف جا رہے تھے
دس بجے دن کا وقت تھا کہ یکایک عباس معلم نے پکارا ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب
ئیے ایک آدمی جہاز سے سمندر میں گر پڑا۔ جہاز فوراً روکا گیا۔ چھوٹی کشتی فوراً لگائی
جہاز کو گھما کر کپتان نے دوربین سے دیر تک سمندر پر چاروں طرف دیکھا مگر افسوس
پتہ نہ چلا اور دیر تک جستجو کرنے کے بعد جہاز پھر روانہ ہوگیا۔ حافظ عبداللطیف
کرالہ آباد۔ سہ پہر کو ہم سے ملنے آئے۔ اُنھوں نے کہا کہ جس مقام پر انکا بستر ہے
قریب ہی ایک شخص منزل بالا سے گرا اور اُسکا ہاتھ کھڑکی پر پڑا اُس نے کھڑکی کو
اور یہ بھی کہا کہ سمندر سے پانی بھر رہا تھا کر پڑا۔ جب تک لوگ دوڑیں اور اُسکا
پکڑیں وہ سمندر میں گر گیا۔ عموماً لوگ اس واقعہ سے دن بھر نہایت افسردہ رہے
بھر اُڑتی ہوئی مچھلیاں بکثرت نظر آئیں۔ رات کو سمندر کا منظر بہت دلچسپ تھا۔
سے کٹتے ہوئے پانی پر ایک عجیب وغریب روشنی پیدا ہوتی تھی اور اسی طرح دور
تک دیکھا گیا جہاں کوئی مچھلی یا جانور سطح پر آیا اور ایک روشنی پیدا ہوئی۔

ا/ مارچ ۱۹۳۱ء۔ دو تین روز سے جہاز کے اندر ہیضہ کا ٹیکہ لگایا جا رہا ہے۔ معلوم
۔ پارسال کچھ مسافر ہیضہ سے ضایع ہوئے تھے اسلئے یہ قاعدہ کردیا گیا کہ ہیضہ
۔ لازمی ہے۔ اس حکم سے عام طور پر نہایت بددلی ہے۔ اس حکم کا اعلان نہیں ہوا
ال کے حاجیوں سے دریافت کیا گیا۔ اُنھوں نے کہا کہ بجز چیچک کے ٹیکہ کے اور
ٹیکہ نہیں لگایا گیا۔ امسال بمبئی میں صرف یہ اعلان کیا گیا کہ جن کے چیچک کا ٹیکہ
لگا اون کو ٹکٹ نہ ملے گا چنانچہ جس کو ضرورت تھی سب نے چیچک کا ٹیکہ لے لیا
بھی کوئی اعلان ہیضہ کے ٹیکہ کا نہیں کیا گیا، یہاں اکثر مسافر ایسے ہیں جن کے بازو
کے ٹیکہ سے آماسیدہ اور زخمی ہیں اوپر سے ہیضہ کا ٹیکہ اور ایک طرہ ہے۔ میں نے
ڈاکٹر سراج الحسن صاحب نے جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو آمادہ بھی کیا اور آج میں نے
اہ محمد سلیم اور مسز عبدالرحمن خاں نے ڈاکٹر کے پاس جاکر ٹیکہ لیا۔ دو روز بعد جب

ہم لوگوں کی حرارت وغیرہ جو عموماً ٹیکہ کے بعد ہوتی ہے رفع ہو جائے گی تو ڈاکٹر [illegible]
صاحب اور جناب بھائی مولوی سید شوکت حسین صاحب قبلہ کو ٹیکہ ہیضہ کا بھی [illegible]
بھائی صاحب پر چیچک کے ٹیکہ کا اچھا خاصا اثر ہوا ہے بایاں بازو سوجا ہوا ہے۔ [illegible]
کے تینوں دانے خوب اُٹھے ہوئے ہیں۔

منتظمان جہاز اور پروٹیکٹر آف پلگرمز کو لازم ہے اس امر کا خوب اعلان کر دیں کہ [illegible]
کا ٹیکہ بھی حجاج اپنے وطن سے لے کر چلا کریں۔

جہاں پر میرا بستر ہے اُس کے قریب ایک پاخانہ ہے جس کے ایک دروازہ پر "عورتوں
کا سنڈاس" لکھا ہوا ہے اور عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے اور اسی پاخانہ کی دوسری [illegible]
"مردانہ سنڈاس" لکھا ہوا ہے اور مرد کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اندر سے کل پاخانہ [illegible]
کوئی تقسیم مردانہ اور زنانہ حد کے مابین نہیں ہے اس کمی کی وجہ سے نہایت ناگوار [illegible]
پیش آتی رہتی ہیں۔ اس قسم کا مشترک پاخانہ ہرگز نہ رکھنا چاہیئے۔

۱۸ و ۱۹ مارچ ۱۹۳۱ء۔ جہاز دس گیارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا جا رہا ہے مگر
صبح کو اُٹھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں پر شام کو تھے اُسی مقام پر موجود ہیں منظر
نہیں ہوتا۔ ہر چہار طرف وہی نیلا پانی وہی نیلا آسمان۔

کراچی میں بندرگاہ کی گھڑی سے جو گھڑیاں ملالی گئی تھیں اُن کے حساب سے آج
آفتاب آٹھ بجکر تیرہ منٹ پر ہوا۔ کل شام کو آٹھ بجکر دس منٹ پر غروب ہوا تھا یعنی
وقت الہ آباد میں رات کا کھانا کھا کر سونے کی تیاری ہوتی ہوگی اسوقت یہاں خوب [illegible]
رہتی ہے۔

۲۰ مارچ ۱۹۳۱ء۔ عرب کے ساحل کی زمین اور پہاڑ دور اُفق پر بادل کی طرح
آ گئے۔ دو تین گھنٹہ بعد پھر وہی پانی وہی آسمان۔ آج گرمی اچھی طرح محسوس
ہے۔ ٹمپریچر ۸۰ ہے آج عورتوں اور مردوں کے پاخانہ کی تفریق بذریعہ ایک [illegible]
پردہ کے کر دی گئی جو حد فاصل اگرچہ مستقل نہیں ہے مگر سر دست شکایت رفع ہو گئی

۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء۔ کل سے برابر سرزمین عرب کا ساحل اور اُس کے پہاڑ دور۔

رہے ہیں بعض مقامات پر آبی چڑیاں ہزاروں کی تعداد میں جہاز کے قریب نظر آتی ہیں
کبھی کبھی جہاز پر بیٹھ جاتی ہیں۔ پانی پر بلا تکلف تیرتی ہیں۔ ان کے پنجے کھلے ہوئے ہیں
چونچ خفیف سی ٹیڑھی ہے رنگ سفید بازو اور پشت پر خفیف سیاہی قد میں بطخ کے برابر

سمندر آج لہریں مار رہا ہے۔ جہاز میں قدرے جنبش ہے۔ بعض بعض مسافر دوران سر
و غثیان میں مبتلا ہیں۔ ہماری پارٹی پر ہنوز کوئی اثر نہیں ہے

۲۲ و ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء۔ کل غروب آفتاب الٰہ آبادی گھڑی کے حساب سے پونے نو
بجے ہوا۔ مغرب کی نماز سے ہم لوگ نو بجے فارغ ہوئے۔ شب کو دس بجے بندرگاہ عدن
سے ہم لوگ گزرے۔ یہاں جہاز روکا نہیں گیا۔ دور سے بجلی کی روشنی سے بندرگاہ اور
شہر وغیرہ کا منظر دلچسپ تھا۔ اب تھوڑی دیر میں آبنائے باب المندب میں جہاز داخل ہوگا
کل شب سے حاجیوں پر سی سکنس کا اثر ہے۔ رات بھر قے کرنے کی آوازیں آتیں
اکثر لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ الحمد للہ کہ ہماری پارٹی کا کوئی شخص اب تک اس سے
متاثر نہیں ہوا۔ گیارہ بجے جہاز آبنائے باب المندب سے گزرا۔ داہنی جانب عرب
کے پہاڑ بائیں جانب افریقہ کے ساحل اور درمیان میں ایک چھوٹا سا جزیرہ پیرم ہے
یہ جزیرہ برٹش گورنمنٹ کا ہے۔ اس پر ایک مکان لائٹ ہوس کا بشکل قلعہ دور سے
نظر آتا ہے اور کچھ بارکیں۔ کل صبح انشاءاللہ ہم لوگ کامران پہنچ جائینگے۔

۲۴ مارچ ۱۹۳۱ء۔ آٹھ بجے صبح جہاز کامران پہنچ گیا۔ ہمارے جہاز سے کامران کا جزیرہ
قریب ایک فرلانگ کے ہے۔ جہاز نے لنگر ڈالا۔ سیٹی دی۔ اور آن کی آن میں ایک
نہایت خوبصورت سفید رنگ کا چھوٹا سا اسٹیمر کامران سے روانہ ہو کر ہمارے جہاز
کے پاس آگیا اور بذریعہ جہاز کی سیڑھی کے انگریز ڈاکٹر جہاز پر آیا۔ تمام جہاز پر اس نے
ایک دورہ کیا۔ جہاز کے ڈاکٹر اور کپتان نے یہ رپورٹ دی کہ جہاز کے کل مسافروں
کو ہیضہ کا ٹیکہ لگا دیا گیا ہے اور کوئی مرض وبائی مسافروں میں نہیں ہے۔ لہذا
اس نے قرنطینہ کرانا غیر ضروری خیال کیا۔ چنانچہ بہت جلد اس کا اعلان ہوا کہ جہاز
دو گھنٹے کے اندر پھر روانہ ہو جائیگا۔ تمام حجاج اس خبر سے بہت خوش ہوئے

اگر حاجی اپنے وطن سے ٹیکہ ہیضہ اور چیچک کا لے کر چلا کریں تو وہ قرنطینہ کی زحمت سے بچ جائینگے۔ جہاز سے اُتر کر جزیرہ پر جانا۔ وہاں دوا کے پانی سے غسل کرنا اسباب کو بھاپ دلانا۔ وہاں کا قیام اور وہاں سے واپس ہو کر اپنے مقام تک پہنچنا یہ نہایت سخت تکلیف دہ اُمور ہیں۔ میں نے کامران کے ڈاکٹر صاحب کپتان کے کیبن میں جا کر ملاقات کی اور کہا کہ یہاں سے ایک تار ہندوستان بھیجنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں سے ٹیلیگرام کا سلسلہ نہیں ہے۔ وائرلیس بلا تار کا پیغام جا سکتا ہے جس کا محصول اوسی قدر ہے جیسا کہ جہاز کے وائرلیس ہے اسوجہ سے اونکی معرفت کوئی ٹیلیگرام نہیں روانہ کیا۔ البتہ چونکہ یہاں سے ہندوستان تک ڈاک کا محصول معمولی ... فی لفافہ ہے لہذا میں نے بہت سے خطا پنے ... اور اعزا کے نام جو راستہ میں لکھے تھے اونکے حوالے کئے۔

کامران میں جہاز کے پہنچتے ہی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہر چہار طرف سے آ کر ... کے چاروں طرف جمع ہو گئیں اور مچھلی بازار قائم ہو گیا۔ حاجیوں نے اسقدر ... خریدی کہ اُس کی بو تمام جہاز کے اندر دو روز گونجی رہی۔ مچھلیاں بہت عمدہ نہایت ارزاں تھیں۔ انھیں کشتیوں پر سے سیکڑوں لڑکے اور جوان اور بوڑھے ... پر کود پڑے اور شور کرنا شروع کیا کہ پیسہ پھینکو۔ چنانچہ حاجیوں نے پیسے پھینکنا شروع کئے اور یہ لوگ نہایت آسانی سے سمندر کے اندر سے پیسے نکال لاتے اور حاجیو ں کو دکھلا کر رکھ لیتے تھے۔ یہ تماشا ایسا دلچسپ تھا کہ جب تک جہاز روانہ نہیں ہوا اور اکنیاں اور چاندی کی چھوٹی دوانیاں برابر جہاز پر سے برس رہی تھیں اور یہ غوطہ خور فوراً پانی کے اندر سے لا کر دکھلاتے اور اپنے پاس رکھتے جاتے تھے۔ اسی تماشا کے دیکھتے دیکھتے جہاز نے سیٹی دی اور روانہ ہو گیا۔

بحر قلزم میں جہاز کو ہمیشہ کم و بیش جنبش ہوتی ہے۔ کامران سے آگے بڑھ کر بہت ناہموار ملتا ہے۔ جہاز آج بہت رول کر رہا ہے۔ جہاز کے تختہ پر ایک قدم چلنا دشوار ہے۔ سب کے سر میں چکر اور اکثر مسافروں کو استفراغ ہو رہا ہے۔ مجھکو

تلی ہے نہ چلنا پھرنا دشوار ہے۔ خفیف اثر سر کے اندر اس طرح کا ہے جیسا کہ
گنے سے ہو۔

آج نماز ظہر پڑھ کر ہم لوگوں نے احرام بہ نیت عمرہ باندھ لیا۔ یعنی اب انشاءاللہ
رہ سے سیدھے مکہ معظمہ جائیں گے وہاں عمرہ ادا کریں گے یعنی طواف کعبہ اور صفا
روہ دوڑنے کے بعد احرام کھول دینگے اور دو چار روز قیام مکہ معظمہ کے بعد مدینہ منورہ
وانہ ہونگے۔ آج رات میں ہمارا جہاز یلملم پہاڑ کے محاذی گذرے گا۔

ساڑھے نو بجے۔ ہملوگ نماز عشاء سے فارغ ہو کر ابھی لیٹے تھے کہ جہاز نے بہت زور کی
سیٹی دی۔ ایسے زور کی سیٹی ہم نے کسی انجن کی نہیں سنی تھی۔ جو لوگ سو رہے تھے اسکی
وازسے جاگ پڑے۔ معلوم ہوا کہ یہ سیٹی اس امر کا اعلان ہے کہ جہاز یلملم پہاڑ کے
حاذی آگیا۔ سب حاجی کھڑا کر اٹھ بیٹھے۔ لبیک لبیک کی صدا سے سارا جہاز گونج اٹھا
ن لوگوں نے دن کو احرام نہیں باندھا تھا جلد جلد احرام باندھا۔ دعا پڑھی اور دو گھنٹہ
کے لئے ایک نئی زندگی جہاز میں پیدا ہو گئی۔ اسوقت ہوا نہایت زناٹے کی چل رہی
ہے۔ خنکی بھی بہت پر لطف ہے اور صبح جدہ پہنچنے کی خبر مسرت اثر سے ہر ایک کے
دل میں ایک عجیب گدگدی ہے۔ غرضکہ رات عجیب عالم اضطراب اور انتظار اور
اشتیاق میں گذری۔

۲۵ مارچ ۱۹۳۱ء۔ صبح نور کے تڑکے نماز فجر ادا کرتے ہی ہملوگ ڈک کے کنارے
کھڑے ہو گئے۔ عجیب سماں تھا عجیب منظر تھا۔ سمندر کا رنگ یہاں پر عجیب و غریب ہے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاز سے لیکر سمندر کے کنارے تک ایک ہفت رنگ تقریباً چار
میل چوڑی اور سیکڑوں میل لانبی ایک جا جم بچھی ہوئی ہے۔ سمندر خاموش ہے اور
اسپر لانبی دھاریاں پڑی ہوئی ہیں۔ سرخ۔ سبز۔ اودی۔ آسمانی۔ بنفشی۔ نارنجی
زرد رنگ کی دھاریاں یکے بعد دیگرے پانی کی سطح پر عجیب و غریب منظر پیدا کر رہی
ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں پر یہ رنگ مستقل رہتا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ اسی خصوصیت
کی وجہ سے اس بحر کا نام بحر قلزم پڑا ہو۔ پو پھٹتے ہی جدہ کا عالیشان بندرگاہ

نظر پڑا۔ آن کی آن میں بندرگاہ جدّہ کے سامنے جہاز پہنچا۔ جہاز نے سیٹی دی
پھریرا بلند کیا اور لنگر ڈالدیا۔
سب سے پہلی چیز جو ہمارے جہاز کے متصل نظر پڑی وہ ایک جلا ہوا جہاز تھا
گذشتہ سال حج سے واپسی کے سفر میں یہ جہاز حاجیوں سے بھرا ہوا تھا اور غالباً
مصر کی طرف جا رہا تھا کہ اسمیں آگ لگ گئی۔ سیکڑوں جانیں جلکر ضایع ہوئیں۔ ا
بہشت نصیب مسافران وطن کی مصیبت کا نقشہ آنکھوں تلے پھر گیا۔ لیکن جس بے
پرواہی سے مسافر جہاز کے اندر آگ سلگاتے اور کھانا پکاتے ہیں۔ اسپر نظر کرتے ہو
یہی تعجب ہوتا ہے کہ ہر جہاز میں آگ کیوں نہیں لگ جاتی۔ جہاز کے ڈک پر آ
کوئی مصیبت ہے تو وہ دھوئیں اور آگ کی ہے۔ اسقدر دھواں ہوتا ہے کہ سانس
لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ تمام مسافروں کی آنکھیں سُرخ اور آنکھوں سے پانی جار
رہتا ہے۔ دس بجے رات تک ایک عجیب آفت رہتی ہے۔ بعض مسافر اسقدر بے
پرواہ ہوتے ہیں کہ آگ کی چنگاریاں اڑتی رہتی ہیں اور ہرگز احتیاط کو دخل نہیں
دیتے میری رائے میں بجائے لکڑی کے مسافروں کو کوئلہ ملنا چاہئے۔ خواہ اسکے
میں کرایہ جہاز میں قدرے اضافہ کر دیا جائے۔ ہم لوگوں نے ایک بورہ کوئلہ بمبئی
اپنے ساتھ رکھوا لیا تھا۔ اس سے بہت آرام رہا۔
جہاز کے رُکتے ہی ہی بندرگاہ کیطرف سے ایک بہت بڑا لشکر کشتیوں کا متحرک
ان کشتیوں کے سپید بادبان ہوا میں لہلہاتے ہوئے بہت بھلے معلوم ہو رہے
بات کی بات میں کشتیاں قریب آگئیں اور اب معلوم ہوا کہ قد قامت میں یہ کشتیاں
بڑی ہیں۔ اور ہر کشتی کے درمیانی حصہ میں ایک بلند مستول تھا۔ ان کشتیوں میں
کا ایک بڑا غول تھا جنھوں نے کشتیوں کے قریب آتے ہی جہاز کو ٹیڑی دل
طرح گھیر لیا۔ اُنکی پھرتی اور مضبوطی حیرتناک تھی۔ یہ ایک معمولی رسی کے سہا
بلا تکلف قریب چالیس فیٹ کی بلندی پر کشتیوں کے اندر سے جہاز کے اوپر آ
عباس ابراہیم نے اپنے حاجیوں کے لئے قلی مقرر کئے اور خود بھی تمام عباس

ایک تہہ باندھ لی اور قلیوں سے ہلوگوں کا اسباب اترنا شروع کیا۔ اسوقت جہاز کے اندر ایک عجیب ہل چل تھی۔ اوپر کا ترپال دوہ کردیا گیا تھا۔ ہم لوگ دھوپ میں چھاتہ لگائے بیٹھے تھے اور محو تماشا تھے۔ قلیوں نے حاجیوں کا اسباب اٹھا اٹھا کر دھڑام دھڑام نیچے کشتیوں میں پھینکنا شروع کیا اور کیا مجال کہ اسباب سیدھا کشتی میں نہ گرے۔ صندوق اور ٹرنک وغیرہ رسیوں میں باندھ کر لٹکا دیئے جاتے تھے کشتی والا اونکو کھول لیتا تھا۔ ایک طرف جرثقیل کی مشین بھی نہایت سرعت سے اسباب اتار رہی تھی۔ اسکا تماشہ بھی قابل دید تھا۔ یعنی ایک بڑا جالدار ٹاٹ نیچے بچھا کر اوس پر اسباب خوب لاد دیا۔ پھر اُس کے چاروں کونے جرثقیل کے کانٹے میں پھنسا دیئے۔ اب جرثقیل نے اوس بڑے جھولے کو بند کرکے جہاز کے باہر کیا اور پھر نیچے کرتے کرتے کشتی تک لے گیا۔ کشتی والوں نے ٹاٹ کے جال کے تین کونے تو اُس کے کانٹے سے نکال لئے اور ایک کونہ اوسی کانٹے کے اندر پھنسا ہوا رہنے دیا اور زنجیر کو بند کرنے کا اشارہ کیا۔ اب وہ ایک کونہ جال کا لیکر بلند ہو چلی اور تین کونے کھلجانے کی وجہ سے اسباب اس ٹاٹ کے جال سے دھڑام دھڑام کشتی میں گرنا شروع ہوا۔ کوئی دو فیٹ سے کوئی چار فیٹ سے۔ کوئی آٹھ دس فیٹ بلند ہونے کے بعد۔ یہانتک کہ ٹاٹ خالی اوپر چلا گیا۔ اور پھر وہ بدستور سابق اسباب سے بھرا گیا اور اسباب اُسی ترکیب سے کشتی میں اتارا گیا۔ مال اور اسباب کا بڑا حصہ اسی مشین کے ذریعہ سے اتارا گیا۔

عباس ابراہیم اپنے حاجیوں کا اسباب اتارتے ہی فوراً جہاز کے نیچے گیا اور ایک موٹر بوٹ ہلوگوں کے لئے ٹھہرا کر علیحدہ کرلی۔ اب اُس نے وہاں سے پکارنا شروع کیا۔ ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب۔ جلدی اترئیے۔ جلدی اترئیے۔ ادھر یہ حالت کہ اس تنگ راستے میں جہاں سیڑھی تھی قدم رکھنا دشوار تھا۔ اوسپر طرہ یہ کہ ایک اسٹیم پائپ کا جوڑ ڈھیلا تھا اور عین راستہ پر نہایت گرم اسٹیم اور گرم پانی کے قطرات اوپر سے ٹپک ٹپک کر بدن جھلسائے دیتے تھے۔ غرض کہ عباس ابراہیم موٹر بوٹ سے پھر اوپر آیا۔ اور ہم لوگوں کو بعد راستہ کے کسیقدر صاف ہونے کے نیچے لے گیا۔ جہاز کی سیڑھی پر اوترنا

کمزور آدمی کے لئے ایک کارِ عظیم اور دشوار ہے خاصکر جب سیڑھی ختم ہوتی ہے
ایک قدم آگے بڑھا کر کشتی پر رکھنا ہوتا ہے۔ ادھر سیڑھی جھومتی معلوم ہوتی ہے
اُدھر کشتی ڈگمگ کر رہی ہے۔ اوپر سے مسافروں کا ریلا آرہا ہے۔ سامنے سے عباس
ابراہیم ہاتھ کھینچ رہا ہے اور ڈانٹ رہا ہے ڈرو مت۔ ڈرو مت۔ آگے قدم بڑھاؤ جلدی
کرو۔ بھائی صاحب اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو خاصکر بہت دقت ہوئی بہرحال
ہم سب لوگ سیڑھی سے ایک کشتی پر آئے اوس کے متصل دوسری کشتی تھی۔ اس پر
آئے اور اسیطرح تین چار کشتیوں پر ہوکر کودتے پھاندتے اپنے موٹر بوٹ تک
پہونچے جو ان کشتیوں کے بعد کھڑا تھا۔ موٹر بوٹ فوراً نہایت تیزی سے بندرگاہ
طرف روانہ ہوا۔ یہاں سے بندرگاہ قریب تین میل کے ہے ایک میل آگے چلکر ہمارے
اسباب کی کشتی جسپر اور مسافر بھی لدے ہوئے تھے۔ ملگئی۔ عباس ابراہیم نے اوس
کشتی کو بھی ہماری موٹر بوٹ سے بندھوالیا اور ہم سب لوگ تمام حاجیوں سے
قریب نصف گھنٹہ قبل ساحل پر پہنچ گئے۔ جو کشتیاں ایک گھنٹہ قبل روانہ ہوئی تھیں
وہ نصف راستہ پر ملیں۔ ہملوگوں نے مقدس سرزمین پر قدم رکھا۔ پچاس قدم آگے
بڑھے ہونگے کہ ایک دروازہ ملا جس میں ایک لکڑی کا اڑ گڑا لگا ہوا تھا۔ اوس طرف
پانچ سات عرب کھڑے تھے۔ سامنا ہوتے ہی اُنھوں نے باواز بلند ڈیڑھ روپیہ
ڈیڑھ روپیہ کا نعرہ بلند کیا۔ عباس ابراہیم نے کہا کہ یہاں فی حاجی عبور محصول
لیا جاتا ہے۔ اتنا دریافت کرنے کا کس کو حواس تھا کہ یہ کیسا محصول ہے؟
جلد جلد محصول ادا کیا گیا۔ اڑ گڑا ہٹا ہم لوگ اندر گئے۔ دوسرے قدم پر سوال
کیا: معلم؟ معلم؟ حافظ ابراہیم۔ حافظ ابراہیم کہتے ہوئے ہم لوگ آگے بڑھے
سوال ہوا۔ وکیل؟ وکیل۔ البوزید۔ البوزید جواب دیا گیا۔ ان دونوں ناموں
سمسم کے آخری دروازہ کا طلسم توڑا اور ہم لوگ ایک بڑے پلیٹ فارم پر
ہوئے وہاں ایک مرد متین یعنی البوزید صاحب وکیل جدہ جلوہ فرما تھے۔ انہوں
نے صاحب سلامت کی مصافحہ کیا اور یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ اُنھوں

تبسم کے ساتھ مخاطب کیا۔ فوراً ایک سینی سامنے آئی۔ اوس میں سبز رنگ کی برفی نما مٹھائی تھی۔ ہم لوگوں نے اس کو منجانب وکیل صاحب تواضع سمجھا اور خوش تھے صرف ایک چھوٹی ڈلی اوٹھا کر منہ میں رکھی کہ ایک ایک گلاس نہایت سرخ رنگ کا شربت سامنے پیش کیا گیا۔ اوسکو بھی چکھا۔ مٹھائی پھیکی۔ شربت میٹھا۔ مگر ہنوز گھونٹ حلق سے اترا نہ تھا کہ دو دو آنہ فی کس فی ڈلی مٹھائی اور فی گلاس طلب کیا گیا۔ اب ہم سمجھے کہ یہ خوانچے والے تھے۔ فوراً قیمت ادا کی گئی۔ ابھی پانچ منٹ یہاں دم نہیں لینے پائے تھے کہ عباس ابراہیم ہم لوگوں کو پھر سمندر کے پلیٹ فارم پر لے گیا۔ یہ دوسرا پلیٹ فارم تھا۔ جہاں کشتیوں سے اسباب اتار کر جمع کیا گیا تھا ہم لوگوں کو ہدایت ہوئی کہ اپنا اپنا اسباب ڈھونڈو اور جلد علیحدہ کرو۔ اب یہاں کا ہنگامہ بیان کے قابل نہیں ہے۔ ڈیڑھ ہزار آدمی اسی پلیٹ فارم پر جمع تھے اور اسباب کا وہ انبار کہ خدا کی پناہ۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ خدایا کیا کریں اور اسباب کہاں سے نکالیں۔ ڈاکٹر صاحب اور بھائی صاحب کو ایک کھمبے کے قریب کھڑا کیا اور جو رفیق عورتیں ہمسفر تھیں اونکی نگرانی میں دی گئیں میں اور شاہ محمد سلیم اسباب ڈھونڈنے لگے۔ بہزار دقت اور سرگردانی ایک طرف ہم لوگوں کا اسباب سیکڑوں بنڈل اور صندوق کے ڈھیر میں خلط ملط نظر پڑا ہم دونوں آدمیوں نے اوسکو الگ کیا اور اپنے ساتھیوں کو وہاں پر لا کر بیٹھے۔ تکان سفر اور جسمانی محنت سے کافی طور پر تھک چکے تھے مگر بندرگاہ کی تعمیر پر بھی نظر تھی۔ یہاں کا بندرگاہ جہاز پر سے نہایت خوشنما نظر آتا تھا مگر یہاں کچھ اور ہی عالم تھا۔ زمین پر سنگریزے بچھے ہوئے اوپر لکڑی کے تختوں کا سائبان۔ تختے ایک دوسرے سے کئی کئی انچ دور سامنے خوبصورت سمندر لہریں مار رہا ہے۔ بندرگاہ سے ملحق سیکڑوں کشتیاں لگی ہوئی ہیں پانی یہاں پر اسقدر کم ہے کہ جہاز تین چار میل دور کھڑا ہوتا ہے۔ ابھی ہم لوگ دس منٹ دم نہ لینے پائے تھے کہ عباس ابراہیم تین چار قلی لے کر پہنچے۔ ہم لوگوں نے اسباب لدوایا۔ ایک ایک قلی اپنی پیٹھ پر اتنا اسباب لدواتا ہے کہ الہ آباد کے ایک

یکہ پراوتنا اسباب لادنا ناممکن ہے۔ ان کے پاس ایک رسی ہوتی ہے جسکا حلقہ بنا
وہ اپنی پیٹھ کی طرف ڈالدیتا ہے اور اس کا دوسرا حصہ اپنی پیشانی پر لگا لیتا ہے
اس رسی کے حلقہ کے اندر تین پاسٹیل بکس اور دو بستر بلا تکلف رکھ دیئے جاتے ہیں
اور وہ بلا تکلف اُسکو لاد کر چلدیتا ہے۔ غرضکہ قلیوں کے پیچھے پیچھے ہم لوگ بھی
اور ایک دوسرے پھاٹک سے نکل کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں پھر سب کا اسباب
مذ پڑا ہے یعنی قلیوں نے پلیٹ فارم سے اسباب اُٹھا کر یہاں لاکر جمع کر
اب پھر یہاں وہی مصیبت کہ اپنا اپنا اسباب جلد علیحدہ کرو۔ معائنہ ہوگا بیزار
پھر ٹرنک اور بستر وغیرہ ایک طرف کیا کہ معائنہ کرنے والے سر پر آگئے۔ ہیٹی کھو
ہیٹی کھولو کی صدا بلند ہوئی۔ خیر میں نے اپنے ٹرنک کھولے۔ شاہ سلیم کو دیکھا
تو بدحواس۔ میں نے پوچھا کیوں خیر تو ہے۔ بولے کہ کنجیوں کا گچھا گر گیا۔ اب ا
ہنگامے میں دوڑ دھوپ شروع ہوئی مگر کنجیاں کہاں ملتی تھیں۔ ہملوگ اسد
...ث کے پھاٹک کے باہر تانگہ والے قلیوں نے ڈاکٹر صاحب کا بند صندوق
پہنچا دیا اور وہ مصیبت سر سے ٹلی لیکن ڈاکٹر صاحب کا ایک چھوٹا بنڈل جس میں ...
وغیرہ تھیں کسی معائنہ کنندہ کے نظر پڑ گیا اوس نے اسکو دوسرے افسر کے
پہنچا دیا۔ وہاں یہ حکم ہوا کہ بعد معائنہ پھر حکم دیا جاے گا۔ غرضکہ اب ہم لوگ ح
پلیٹ فارم سے باہر آئے اور عباس ابراہیم کے ساتھ ساتھ چلے۔ دو فرلانگ پر
کہ ہمارا قیام گاہ یعنی رباط یا مسافرخانہ آگیا۔ یہ مسافرخانہ ابو زید وکیل کا ہے۔
پھاٹک کے ذریعہ سے ہملوگ داخل ہوئے۔ اندر بہت وسیع صحن ہے۔ ادھر
سامنے لکڑی کے تختوں سے گھرا ہوا اور لکڑی کے تختوں سے چھایا ہوا مسافر
یعنی تین چار کمرے ہیں۔ زمین بھی ناہموار ہے اور اسقدر ناہموار ہے کہ کوئی دو
مربع جگہ اوس کی برابر نہیں ہے زمین پر کھجور کی چٹائی بچھی ہوتی ہے اسی کے آ
میں عباس ابراہیم ہم لوگوں کو لے گئے اور یہی ہمارا قیام گاہ بتلایا گیا۔ اوپر نظر
کے تختے ایک دوسرے سے بخوبی فاصلہ پر تھے۔ آسمان بخوبی نظر آرہا تھا اسکو دیکھ

وحشت ہوئی لیکن اطمینان یہ تھا کہ یہ مجلس بہت تھوڑی دیر کا ہے کل انشاء اللہ یہاں سے کوچ ہے۔ اب ہم لوگوں کو پھر اپنے اسباب کی فکر ہوئی۔ کیونکہ سیکڑوں حاجیوں کا اسباب مسافر خانہ کے صحن میں لاکر انبار کر دیا گیا تھا اور سب مسافر اپنے اپنے اسباب کی تلاش کر رہے تھے۔ میں اور شاہ محمد سلیم پھر اس کام پر تعینات ہوئے۔ بہزار خرابی اپنے ٹرنک اور بستہ وغیرہ تلاش کرکے اپنے کمرے تک بھجوایا اب معلوم ہوا کہ ایک ٹرنک اور بورا نہیں ہے۔ بہزار تلاش کی گئی نہیں ملا۔ عباس ابراہیم سے کہا۔ وہ بولے کچھ فکر نہیں چلئے دوسرے رباط میں پہنچ گیا ہوگا۔ غرضکہ اگرچہ تکان کیوجہ سے قدم اٹھانا دشوار تھا مگر ان کے ساتھ دوسرے محلہ میں گیا اور وہاں بھی صحن میں ایک انبار سامان کا نظر پڑا۔ اس میں تلاش کرنے سے میرا سامان ملگیا اور میں قلی کے ذریعہ سے اسکو اپنے مسافر خانہ تک لایا۔

اب شام ہوگئی ہے اور صبح سے اسوقت تک دم لینے کی فرصت نہیں ملی ہے۔ مسافر خانہ میں پانچ منٹ بھی نہیں بیٹھے تھے کہ پھر ڈاکخانہ گئے وہاں ایک خط بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کیا۔ ہندوستان میں نو آنے محصول ادا کرنا ہوتا ہے یہاں ۱۴ آنہ لیا گیا۔ رسید مانگی نہیں ملی ڈاک کے محرر نے کہا کہ ایسے ہی ڈاک میں ڈالدو۔ مجبوراً ایسا ہی کیا پھر تار گھر گیا۔ صرف اسقدر مضمون بذریعہ تار کے روانہ کیا "بخیریت پہنچ گئے" اسکا آٹھ روپیہ محصول دینا ہوا۔ یہاں سے واپس آتے آتے دن ختم ہو چکا تھا۔ مسافر خانہ کے صحن میں ہمارے ہمراہ جو پلنگ آئے تھے ان پر ہملوگ بیدم ہو کر پڑ گئے۔ اسیوقت الوزیر وکیل کے آدمی وکیل صاحب کی فیس بحساب پانچ روپیہ فی مسافر تحصیل کرنے کے لئے پہنچے۔ ہملوگوں نے فوراً اپنی اپنی فیس ادا کی اسکے بعد عباس ابراہیم نے کہا کہ آپ لوگ جلد مکہ جانا مانگتا ہے تو چودہ روپیہ فی کس محصول لاری اسیوقت جمع کر دیجئے۔ اسکی بھی تعمیل فوراً کیگئی۔ رات کو بازار کا کھانا کھایا۔ یہاں چپاتی کا پتہ نہیں۔ تنوری روٹیاں مختلف نمونہ کی ملتی ہیں۔ مزہ انکا بوجہ کثرت خمیر کے نہایت کھٹا ہوتا ہے۔ گوشت بلا نمک مصالحہ کا۔ گوشت سے ہملوگوں نے

پرہیز کرنے کا ارادہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ دال ایک عجیب نمونہ کی مل گئی دو تولہ سے
قریب کھائی گئی۔ بڑے بڑے سیم کے بیج کی طرح یہ دال ہوتی ہے۔ مصر سے آتی ہے
پھول کہتے ہیں۔ پانی بدمزہ تھا۔ کچھ کھاری کچھ سیٹھا۔ کچھ عجیب قسم کی ہیک یا بد
اس میں تھی۔ ڈر کے مارے صرف دو چار گھونٹ پیا۔ اللہ کا نام لے کر صحن میں سو
اگرچہ شبنم خوب تھی۔ اور مضرت کا اندیشہ تھا مگر اس مجلس میں جس کا نام کمرہ تھا جا
کی ہمت نہیں پڑی۔

۲۶ مارچ ۱۹۳۱ء۔ صبح بہت تڑکے قبل نماز فجر آنکھ کھل گئی۔ بدن میں درد تھا ا
کا زیادہ حصہ جاگتے گذرا تھا۔ احاطہ کے اندر جو مسجد ہے اس میں میں نے اور شاہ محمد سـ
نے نماز با جماعت ادا کی۔ اس وقت نمازیں قریب سو آدمی کے تھے۔ نماز کے ارکان
کچھ فرق محسوس ہوا جس میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ قریب نصف نمازیوں نے
سورہ فاتحہ کے بعد آمین با آواز بلند کہتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنے خوابگاہ پر آ
اب اور رفیق بھی بیدار ہو چلے تھے۔ سب ضرورتوں سے فارغ ہوئے اور ہنوز آفتاب
نکلا تھا کہ حضرت حوا کے مزار کی زیارت کو چلے۔ یہاں سے مزار قریب ایک میل
فاصلہ پر شہر سے باہر ہے۔ پیادہ پا گئے۔ کیونکہ یہاں کوئی سواری یکہ یا تانگہ کی
نہیں ہوتی۔ یہاں کا عربیہ بالکل الہ آباد کے ٹھیلہ کا نمونہ ہوتا ہے البتہ اس سے
بہت بڑا اور بجائے دو پہیوں کے اس میں چار پہیہ ہوتے ہیں اور اس میں خچر یا
جوتے جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت بھاری اور بھدی چیز ہے۔ صرف اسباب لادنے
کام آتا ہے۔ اس میں اتنا اسباب لادا جاتا ہے کہ الہ آباد کے تین ٹھیلوں پر ہرگز نہ سما
خچر کے منہ میں لگام نہیں ہوتی۔ چمڑے کا تسمہ منہ کے باہر بندھا رہتا ہے۔ اس
سے ایک رسی بندھی ہوتی ہے جو ہانکنے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہانکنے
عموماً خچر کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا چلتا ہے۔ غرضکہ ہم لوگ پیادہ پا روانہ ہوئے
کے باہر پہونچے۔ دور سے حضرت حوا کے مزار کا احاطہ نظر پڑا۔ قریب پہونچے
تین چار سو قدم باقی رہے ہونگے کہ وہاں پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ سرکاری سپ

بیدلئے موجود تھے۔ کسی کو علم آگے بڑھنے کا نہ تھا۔ ہم لوگ سب سے پیچھے کھڑے ہوگئے احاطہ کیطرف دیکھا تو اُس کا پھاٹک پتھر سے چنا ہوا تھا اندر جانا یوں بھی ناممکن تھا اور سرکاری پہرے نے قریب جانا بھی ناممکن کردیا۔ ہملوگ مایوس واپس ہوئے۔ راستہ میں آمدرفت کے وقت جس قدر بچے عورتیں اور مرد بھیک مانگتے نظر پڑے اونکی تعداد ہزار سے کم نہ ہوگی۔ یہ لوگ راستہ چلنا دشوار کردیتے ہیں۔ ہاتھ پکڑ کر بلاتے ہیں آگے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اگر دو چار کو کچھ دیا گیا تو پچاسوں آکر اسطرح چھینک لیتے ہیں کہ جانبری مشکل ہو جاتی ہے۔ غرضکہ کچھ خیرات دیتے ہوئے اور کچھ جان بچاتے ہوئے مسافرخانہ واپس آئے۔ اب دو گھنٹہ دن چڑھ گیا تھا۔

مسافرخانہ پہنچتے ہی عباس دو جمال یعنی اونٹ والوں کو ہمراہ لائے۔ ہملوگوں کا اسباب دو اونٹ کا بوجھ قرار پایا۔ بحساب چودہ روپیہ فی اونٹ کرایہ طے ہوا اور بجز بستر اور ناشتہ دان وغیرہ کے کل اسباب اونٹ والوں کے حوالہ کیا گیا یہ اسباب تین روز بعد مکہ معظمہ پہونچے گا۔ ابھی ناشتہ بھی نہیں کرنے پائے تھے کہ عباس نے کہا کہ دونوں ڈاکٹر صاحبان کو قونسل دفتر چلنا چاہیئے۔ وہاں پاس پورٹ داخل ہوگا اور مکہ جانیکی اجازت ملے گی۔ اب میں اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب قونسل آفس روانہ ہوئے ہمارے مسافرخانہ سے اور دیگر مسافرخانوں سے پچاسوں آدمی ہم لوگوں کے ہمراہ تھے۔ دو میل چلنے کے بعد قونسل کا دفتر ملا۔ یہ ایک سہ منزلہ بڑی عمارت سمندر کے قریب جدہ کے مغربی کنارے پر ہے۔ اُس کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ وہاں پچاسوں مسافر ہم سے پیشتر سے جمع تھے۔ عباس ہمراہ نہیں آئے تھے۔ کوئی اتنا بتلانے والا نہ تھا کہ اب ہملوگ کہاں جائیں اور کیا کریں۔ غرضکہ کچھ لوگوں کو اندر باہر آتے جاتے دیکھکر ہم لوگ بھی اندر داخل ہوئے اور ایک زینہ کے ذریعہ سے دوسری منزل پر پہونچے وہاں ایک کمرہ دفتر کا مثل ٹکٹ گھر کے تھا۔ اوسمیں مجمع کثیر جمع تھا۔ عباس نے کہدیا تھا کہ ابوزید وکیل کا آدمی وہاں ہے وہ بہت مدد دے گا۔ مگر اول تو وہ آدمی ملا نہیں اور جب بہزار جستجو ملا تو بالکل مخاطب نہیں ہوا۔ اوس نے صرف اتنا کہا کہ

اصبر اصبر - یعنی صبر کئے چپ چاپ بیٹھے رہو - اس دفتر کے قریب ایک خالی کو
اُس کی کھڑکیوں پر ہم لوگ جاکر بیٹھ گئے - بیٹھے بیٹھے دو تین گھنٹہ گزر گیا - کوئی
لینے والا نہ ملا - جب ٹکٹ گھر کے کمرہ میں جائیں تو وہی مجمع کثیر - اوس کی چھوٹی چھ
کھڑکیاں تھیں جسکے اُدھر کچھ عرب محرر جمع تھے جو اپنے کام میں نہایت سست معلو
ہوتے تھے - اتنی دیر میں دس مسافر بھی نہ نبٹے - میں نے ہندوستان سے ایک خ
مولوی احسان اللہ صاحب وائس کونسل کے پاس روانہ کیا تھا - میرا خیال ہوا
اُن سے ملوں - معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہیں - اسی اثنا میں اتفاقیہ معلوم ہوا کہ
کی منزل میں گورنمنٹ ہند کا ایک شفاخانہ ہے - اسکو سنتے ہی میں نیچے گیا - وہا
ڈاکٹر عبدالحمید صاحب میڈیکل آفیسر کام میں مصروف تھے - چند منٹ بعد میں نے ا
مخاطب کیا - جب اونکو معلوم ہوا کہ میں بھی ڈاکٹر ہوں تو بہت تپاک سے اور محبت
سے ملے - شام کے کھانے پر بلایا - میں نے معذرت کی - اُنھوں نے بمشکل معاف
کیا - تمام دواخانہ کی سیر کرائی - میں نے ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو بلواکر ا
ملوایا - اور اپنی دقت بیان کی - اُنھوں نے کہا کہ آپ اوپر چلئے میں ابھی آکر
ٹھیک کردونگا - اب ہم لوگ پھر اوپر گئے اور انتظار شروع کیا - کوئی ڈیڑھ گھ
بعد ڈاکٹر صاحب آئے تو اُنھوں نے سب پاس پورٹ لیکر داخل کرائے اور
اپنے ایک ہمسفر ڈاکٹر عبداللطیف کے متعلق یہ کام کیا کہ وہ رسید وغیرہ جو کچھ
خود لے لینگے - اب ہم میں تاب انتظار اور بھوک پیاس کی نہ تھی - ڈاکٹر لطیف
نے منظور کیا - ہم لوگ واپس ہوئے - راستہ میں دو چار جگہ بھٹکنے کے بعد ہندوستا
کے حساب سے قریب ایک بجے دن کے اور عرب کے حساب سے قریب آٹھ بجے
کے اپنے جائے قیام پر بحالت تباہ پہونچے - وہی ناہموار زمین جس سے آتے
تھی بہت آرام دہ معلوم ہوئی - ذرا دم لیکر کچھ کھانا کھایا اور فوراً مکہ روانہ ہو
کی تیاری شروع ہوئی -

مسافر خانہ کے باہر موٹر لاریاں آگئیں - عباس نے عجلت شروع کی تین بجے

لوگوں نے لاریوں پر اپنا سامان بھجوا دیا۔ مسافر خانہ کے ملازمان جنھوں نے
بزحمت دینے کے ذرا بھی ہمدردی نہیں کی تھی بخشش لینے کے لئے آکھڑے
ہوئے۔ سب کو کچھ نہ کچھ بخشش دی گئی اور ہم لوگ لاریوں پر سوار ہوئے۔ شاید
کہ لاریوں پر بیٹھنے کے بعد روانگی جلد ہو جائے گی مگر عرب میں ایسا نہیں ہوتا
سات لاریاں مسافروں سے لدی ہوئی دھوپ میں کھڑی تھیں۔ سیکڑوں بھیک مانگنے
والے جنمیں بچے۔ بوڑھے۔ جوان مرد عورتیں سب موجود تھے لاریوں کے چاروں طرف
جمع ہو گئے۔ اگر ایک کو کچھ دیا گیا تو بیس اور آ گئے اور انھوں نے ہاتھ پکڑ پکڑ کر
ہلانا شروع کیا۔ اگر ان کی طرف نظر نہ کیجائے تو پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ کندھا پکڑ
کر ہلاتے ہیں۔ غرضکہ دو گھنٹہ تک یہی فضیحت رہی۔ خدا خدا کر کے لاری چلی ہم لوگوں
نے سمجھا کہ اب روانگی ہوئی۔ لیکن دو فرلانگ چلکر جدہ کی شہر پناہ کے پھاٹک کے
سامنے لاریاں روک دی گئیں۔ معلوم ہوا کہ اب یہاں پر پروانہ راہداری ملے گا۔
اس کا انتظار کرتے کرتے دن ڈوب گیا۔ کبھی کبھی کوئی عرب پولیس والا آتا تھا
اور مسافروں کو گنتا تھا مگر شائد کوئی بھی ایسا نہیں آیا کہ جس نے پورے طور پر
گنتی گنی ہو۔ واحد۔ اثنین۔ ثلاثہ۔ اربع۔ خمسہ۔ ستہ کر کر کے سب چلے جاتے تھے
اب سب مسافر گھبرا اٹھے اور کچھ چاہتے تھے کہ لاریوں سے نکلکر باہر کھڑے ہوں
لیکن اس کا حکم نہیں۔ سب مسافر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں تاکہ ناخواندہ مطوفوں
کو گننے میں آسانی ہو۔ خدا خدا کر کے چراغ جلنے کے بعد لاریاں روانہ ہوئیں نصف
فرلانگ کے بعد پھر رکیں۔ یا اللہ اب کیا معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں پٹرول لیا
جائیگا۔ خیر وہ بھی ضرورت پوری ہوئی اور مکہ معظمہ کی روانگی شروع ہوئی۔
جدہ سے مکہ معظمہ کا فاصلہ ۴۸ میل ہے۔ راستہ تھوڑی دور پتھریلا ہے جس پر
بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے ہیں لاریوں کے مسافر مثل گیند کے اوچھلتے جاتے ہیں
ہماری لاری بہت پرانی ہے۔ پرزے ڈھیلے ہیں۔ اگر کسی جوڑ کے قریب ہاتھ رکھیئے
تو لکڑیوں کے بیچ میں گوشت پس گیا۔ دو مرتبہ یہ اتفاق مجھکو پیش آیا۔ انجن پرانا

ہے۔ بار بار پانی اُبلنے لگتا ہے۔ شوفر انجن کی ٹوپی کھول کر دور بھاگتا ہے۔ پانی
فیٹ اونچا فوارے کی طرح اڑتا ہے۔ انجن کے اندر سے ایسی ہولناک آواز آتی
کہ معلوم ہوتا ہے کہ اب انجن پھٹا۔ اگر ایک قطرہ انجن کے پانی کا کسی پر پڑ جاتا
تو آبلہ اُٹھے بغیر نہیں رہتا۔ دوسرا پانی ڈالا جاتا ہے۔ لاری پھر چلتی ہے۔ تھ
دور جا کر پھر کھڑی ہوتی ہے۔ یہی تماشہ راستہ بھر رہا۔ راہ میں چار جگہ اسٹیشن
پڑاؤ ملتے ہیں۔ یعنی کھجور کے پتوں سے چھائی ہوئی چند دوکانیں ہیں۔ جہاں
چار اور کچھ کھانے کی چیزیں ملجاتی ہیں۔ ہر پڑاؤ پر لاریوں کا کھڑا ہونا لازم نہیں
نصف راستہ طے کرنے کے بعد ایک منزل پر ٹیلیفون بھی ہے۔ عباس نے
ٹیلیفون اپنے گھر پر ہم لوگوں کی آمد کی اطلاع کی قریب آدھ گھنٹہ بعد پہنچ
ہوئی۔ جدّہ سے تین چار میل چلنے کے بعد پتھریلا راستہ ختم ہوجاتا ہے۔ ریت
شروع ہوجاتا ہے جو نصف راستہ طے کرنے کے بعد ایسا ہے کہ اکثر و بیشتر
کو وہی مصیبت پیش آتی ہے جو ہم لوگوں کو ہوئی۔ یعنی قریب دس بجے را
لاری بہت تیزی سے چلی جارہی تھی۔ کہ اکبارگی اُس کے پہیے کمانی تک با
اندر دھنس گئے۔ انجن ہزار زور کرتا ہے۔ جنبش نہیں ہوتی۔ ہملوگ اُتار
جیک کے ذریعہ سے پہیے اُٹھائے گئے۔ نیچے پتھر چُن چُن کر رکھے گئے۔ ذرا
ہوئی کہ پھر انجن رکا۔ اب سب عورتیں پیادہ پا۔ ڈاکٹر سراج الحسن اور
صاحب لاری کے اندر اور باقی سب مسافر لاری ٹھیلنے پر تعینات ہوئے
اور شاہ محمد سلیم اور میرے ذمہ خاصکر یہ مشقت تجویز کی گئی۔ شکر ہے کہ
چاندنی رات تھی۔ اُس لق و دق ریگستان میں ماہ تاباں عجیب پُر لطف تھا
ٹھنڈی ہوا جس کے لئے صحرائے عرب کی شب مشہور ہے چل رہی تھی
میں شوق و ذوق کا وفور تھا۔ غرضکہ خوب خوب زور لگائے گئے اور لاری
ایک فرلانگ کے دھکیل لے گئے۔

جس قدر خوش دلی اور جوش کے ساتھ یہ محنت برداشت کی گئی قابل

ں ہے۔ عباس اور شوفر اور غلامی تو چیتا چیا نکر زور لگاتے تھے۔ شاہ سلیم
پسینہ سے ہم لوگوں کی طرح بلکہ باعتبار جسامت ہم سے زیادہ تر بتر تھے لیکن
یت خلوص کے ساتھ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور کوئی دعا بھی پڑھتے
تے تھے۔ مجھ کو حافظ کے دو شعر یاد آرہے تھے جن کو اپنی بھدی آواز میں
الاپتا جاتا تھا۔ وہ شعر یہ ہیں۔

در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم — سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور
گرچہ منزل بس خطرناک است و مقصد ناپدید — ہیچ راہے نیست کو را نیست پایاں غم مخور

ضکہ اس خشک دلدل سے جب ہمارا مرکب یعنی موٹر نکلا تو ہم لوگ پھر سوار ہوئے
قریب ساڑھے گیارہ بجے شب کے مکہ معظمہ کے دروازہ پر جا پہنچے۔ یہاں معلوم
اکہ شہر کے اندر موٹر جانیکا حکم نہیں ہے۔ صرف سرکاری موٹر جاتے ہیں غریب
جی بیرون شہر اوتار دئے جاتے ہیں۔ دوسری غلطی عباس نے کی کہ موٹر کے پڑاؤ
اپنے گھر تک کے فاصلے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لاری سے اتر کر اس نے قلیوں پر
سباب لدوایا اور اپنے دو بھائیوں کو ہم لوگوں سے ملوایا جو ہمارے خیر مقدم کیلئے
ں پیشتر سے موجود تھے اور ہم لوگ پیادہ پا عباس کے گھر کیطرف چلے۔ ڈاکٹر
سراج الحسن صاحب نے بعذر ضعف بصارت میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا لیکن
ی سو قدم بھی نہ چلے ہونگے کہ انکے ہاتھ کا بوجھ کندھے پر گراں معلوم ہونے لگا
ہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا جسقدر بوجھ لاد سکتے تھے میرے کندھے پر لادا
ماں خود ہی ایک ایک قدم اوٹھانا مشکل ہو رہا تھا کہ اونکے بوجھ نے تمام بدن
ر بیرون کو اور بھی شل کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے کراہنا شروع کیا
ر جھکتے جھکتے بالکل دوتا ہوگئے اور راستہ تھا کہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا نصف
ستہ کے قریب شاہ سلیم نے ڈاکٹر صاحب کے بار گراں کو اپنے کندھے پر سنبھالا اور
مجھ کو سبکدوش کیا مگر راستہ بھر یہ معلوم ہوتا رہا کہ بایاں کندھا جس پر ڈاکٹر صاحب
ہاتھ رکھا تھا کوئی دبائے دیتا ہے۔ غرضکہ قریب ڈیڑھ میل چلنے کے بعد عباس کا

گھر قریب ساڑھے بارہ بجے رات کو پہنچے۔ یہ مکان محلہ مسفلہ میں ایک کوچہ سربستہ
اندر واقع ہے۔ دروازے پر ایک بڑے ہنڈے کی روشنی ہو رہی تھی۔ تمام گلی
اری تھی دروازہ پر حافظ محمد ابراہیم صاحب جو اصل معلم ہیں یعنی عباس کے
ر ماجد اور عباس کے بھائی حسن۔ حسین۔ احمد۔ اسحاق اور دیگر چند افراد ہمارا
تقدم کرنے کے لئے موجود تھے۔ نہایت محبت اور تپاک سے مصافحہ اور معانقہ
بعد ہم لوگ عربی کرسیوں پر بیٹھے۔ عرب کی کرسی ہندوستان کے ایک بڑے
دار بنچ کے مشابہ ہوتی ہے۔ پائے بہت اونچے۔ چوڑائی قریب دو فیٹ کے
ت کیطرف لکڑی کا چوکھٹا اور بناوٹ کھجور کے بان کی۔ اسی کو یہاں عموماً کرسی
ہیں جو ہر عرب کے دروازہ پر اور ہر دوکان کے سامنے اور ہر قہوہ خانہ میں کثرت
ساتھ بچھی رہتی ہیں۔ کرسی پر بیٹھتے ہی پیر زمین سے اٹھ جاتے ہیں۔ ایک کرسی
ین چار آدمی بہ آسانی بیٹھ سکتے ہیں۔ رات کو جو عرب گھر کے باہر سوتے ہیں
انھیں کرسیوں پر سوتے ہیں اور میں نے جا بجا ان کرسیوں پر لوگوں کو نماز
ھتے بھی دیکھا۔ حافظ ابراہیم صاحب کی عمر چوراسی سال کی بتلائی گئی۔ ابھی
مبوط ہیں۔ اچھی طرح میلوں پیادہ پا چلتے ہیں۔ آنکھوں سے قدرے معذور
چلے ہیں۔ ابھی دو برس ہوئے پہلی تین بیویوں کے یکے بعد دیگرے انتقال کے
ر چوتھا نکاح کیا ہے۔ اس بی بی کی حافظ صاحب نے وقتاً فوقتاً نہایت تعریف
اور بیان کیا کہ اس ضعیفی میں جو تندرستی ایسی اچھی ہے اس کی زیادہ تر وجہ
ہے کہ بیوی نہایت خدمت گذار نیک دل اور خدا ترس عورت ہے۔ حافظ ابراہیم
احب نے رائے دی کہ طواف کعبہ اور صفا مروے اسی وقت فراغت کر لینا بہتر
ہ صبح کو دھوپ ہو جائے گی اور نہایت تکلیف ہوگی۔ سب رفقا نے اتفاق
ا اور ہم لوگ وضو سے فراغت کر کے عباس کے بھائی حسن ابراہیم کے ساتھ
م شریف کی طرف روانہ ہوئے۔ حرم شریف عباس کے مکان سے بہت قریب
ہے۔ آہستہ آہستہ چلکر سات آٹھ منٹ میں پیادہ ہم لوگ وہاں پہونچ گئے۔ راستہ میں

حسن ابراہیم لبیک پڑھتے جاتے تھے ہم لوگ بھی اون کی تقلید کرتے جاتے تھے۔ بہ آواز بلند دعائے حج و زیارت و توفیق نیک کی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کہتے جاتے تھے۔ ہم لوگ ان کو دہراتے جاتے تھے۔ باب السلام سے ہم لوگ داخل ہوئے۔ بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی تمام بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بدن میں جنبش ہونے لگی۔ اعمال بد کی یاد نے بدن کو پسینہ پسینہ کر دیا۔ دل کی جو حالت ہوئی بیان کے قابل نہیں۔ ایک محویت کا عالم طاری ہوگیا۔ حسن ابراہیم نے بہ آواز بلند کہا کہ آپ لوگ دو رکعت نماز تحیۃ مسجد ادا کریں ہم لوگوں نے تعمیل کی اور نماز عشا جو اسوقت تک نہیں پڑھ سکے تھے باجماعت ادا کی شاہ محمد سلیم صاحب نے نماز پڑھائی۔ بعد ہم لوگ بیت اللہ کے قریب حاضر ہوئے مقام ابراہیم کے قریب جہاں بیشتر کسی زمانہ میں باب السلام کا پھاٹک تھا اور جہاں اب بھی ایک محراب باب السلام بنا ہوا ہے اسی باب السلام سے داہنا قدم آگے رکھ کر آگے بڑھے۔ یہاں سے سنگ مرمر کا فرش ہے پہلے مقام ابراہیم تک آئے پھر اور آگے بڑھے اور دس بارہ قدم بڑھے ہونگے کہ ہم لوگ بیت اللہ کے سامنے حاضر تھے۔ سنگ اسود کو بوسہ دیا۔ پیچھے ہٹے اور حسن ابراہیم کی تقلید میں سات طواف کئے۔ پھر در بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر بہ تقلید حسن ابراہیم دعا پڑھی۔ کوئی شخص ہمارے رفقا میں سے ایسا نہ تھا کہ جس پر گریہ طاری نہ تھا اور جو لرزاں اور ترساں نہ تھا۔ بعد فراغت طواف بیت اللہ سے باہر آئے اور صفا مروہ کے مابین سات مرتبہ دوڑے۔ صفا مروہ دو پہاڑیاں بیت اللہ کے قریب ہی ہیں۔ دونوں کے مابین کا راستہ بیت اللہ کے دو تین پھاٹکوں کے سامنے ہی سے گذرتا ہے۔ دونوں پہاڑیوں کے مابین کا فاصلہ کم از کم ایک فرلانگ ہے اب صرف پہاڑیوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ دونوں پہاڑیوں پر عمارتیں ہیں اور راستہ میں نہایت عمدہ عمدہ دکانیں سوداگروں کی ہیں اور مکہ کا بہترین بازار صفا و مروہ کا بازار ہے۔ ہم لوگوں کو حسن ابراہیم نے اپنے ایک نائب کے سپرد کر دیا جس نے یہ رکن بھی ادا کرایا۔ ہر مرتبہ کچھ دور دوڑ کر چلنا ہوتا ہے بقیہ راستہ معمولی چال سے

کرنا ہوتا ہے۔
معظم یا اُوسکا نائب دُعا پڑھواتا جاتا ہے مقلدین وہی الفاظ دُہراتے جاتے
اس رکن کے ادا کرتے کرتے ہملوگ تھک کر چور ہو گئے۔ مجھپر تکان سفر
وسیہ گناہوں کا بوجھ اور اس سے زیادہ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کے ہاتھ
بوجھ تھا لیکن اس بوجھ کو شاہ سلیم صاحب اپنے کندھوں پر کبھی کبھی لے لیتے
غرضکہ یہاں سے فارغ ہو کر ہملوگ گرتے پڑتے گھر پہنچے۔ اب ہندوستان
حساب سے رات کے دو بج چکے تھے۔ عباس وغیرہ جاگ رہے تھے اور ہملوگوں
منتظر تھے۔ کھانا تیار تھا۔ عباس اور ان کے بھائیوں نے نہایت مدارات سے
نا کھلایا اور ہملوگ زمین کے فرش پر دراز ہو کر فوراً سو گئے۔
مہر مارچ سے ۵ اپریل ۱۹۳۱ء تک ہم لوگ مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ جہاں تک ممکن ہوا
یں بیت اللہ کے اندر ادا کرتے رہے۔ روزمرہ کئی کئی مرتبہ طواف کعبہ کرتے تھے
م کے وقت اکثر عصر کے وقت کی نماز سے عشاء کی نماز کے بعد تک صحن بیت اللہ
بسر کرتے۔ خانہ کعبہ کی زیارت میں محو رہتے۔ اگر کوئی چیز اس میں مخل ہوا کرتی
تو وہ بھیک مانگنے والے بچوں - لڑکیوں عورتوں اور مردوں کا گروہ ہوتا تھا
ں سے کسی کو اگر کسی نے ایک قروش یعنی ایک آنہ یا ایک حلالہ یعنی ایک پیسہ
، دیا تو پھر اس پر چاروں طرف سے ایسا نرغہ ہوتا تھا کہ جان بچانا مشکل ہوتا
۔ اگر ان سے تنگ آکر کوئی کمزور حاجی بھاگتا تو یہ سب اُس پر دوڑتے اور اُسکو
کا دیکر گرا دیتے لیکن لوٹ مار کی نوبت نہیں آنے پاتی تھی کیونکہ سرکاری سپاہی
ثرت سے اِدھر اُدھر موجود رہتے ہیں فوراً بید لیکر دوڑتے اور اُن پر اچھی طرح
رصاف کرکے اونکو منتشر کرکے غریب حاجی کی جانبری کرتے۔ لیکن اس حد تک
بت کم پہنچتی تھی۔ اکثر بھیک منگنے والیاں دست طلب دراز کرتیں اور جہاں اللہ
م اللہ کریم کہا وہ خاموشی سے آگے بڑھ جاتیں۔ اگر کوئی شخص مراقبہ میں ہے
عا میں مشغول ہے تو یہ بھیک مانگنے والے بلا تکلف اُس کا ہاتھ یا شانہ پکڑکر

تے اور پیسہ مانگتے تھے۔
ایک روز ہم لوگوں کی موجودگی میں داخلہ کے لئے خانہ کعبہ کا دروازہ کھلا تھا۔ کو بھی داخلہ کا موقع مل گیا جس کی کیفیت بیت اللہ کے حالات کے ضمن میں ان کی گئی ہے۔
بیت اللہ کے اندر جب تک قیام رہتا زمزمی برابر چھوٹے چھوٹے کٹورے اور ٹی صراحیاں لئے ہوئے سامنے سے گذرتے۔ آب زمزم پیش کرتے اور ہم لوگ ب سیر ہو ہو کر پیتے۔
حجر اسود کے بوسہ کا موقع کم ملتا تھا۔ حاجیوں کی کثرت اُوس جگہ پر اتنی ہوتی ہے کہ دو سپاہی بید لئے تیار رہتے ہیں اور بید کا استعمال حجر اسود کے بوسہ کے شائقین ہستہ آہستہ برابر ہوتا رہتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو حجاج کشمکش سے باخود با ب چوٹیں کھائیں۔ ہم لوگ اسی وجہ سے ہر طواف کے بعد دور ہی سے ہاتھ اشارہ پر اکتفا کرتے تھے۔
ایک روز ہمارا قافلہ جنت المعالی کی زیارت کے لئے گیا۔ یہ مقام حضرت رسول کریمؐ کے نہ مبارک میں بھی قبرستان تھا جیسا کہ اب تک ہے۔ وہاں جا کر بہت افسوس ہوا واریں شکستہ۔ قبریں منہدم۔ کوڑہ کرکٹ اور مزاروں کے ٹوٹے ہوئے روڑوں ے زمیں نہایت ناہموار۔ اسی کے احاطہ سے قریب دامن کوہ پر حضرت خدیجۃ کبریٰ کا مزار مبارک اور مقبرہ تھا۔ مقبرہ کی عمارت کھود ڈالی گئی ہے اور اسطرف نے کی ممانعت ہے۔ دور سے فاتحہ پڑھی اور ہم لوگ نہایت افسردہ خاطر یہاں سے پس ہوئے۔
مکہ معظمہ کے شہر کے قریباً وسط میں مولد النبی تھا یعنی وہ مکان جہاں حضرت سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی۔ اس مکان کے حالات میں نے فرناموں میں دیکھے تھے۔ لوگ اس مقام کی زیارت کو عین سعادت سمجھتے تھے س کے اندر دو رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے۔ اس مکان کے اندر اسقدر عود سلگایا

تا تھا اور اتنا عطر چھڑکا جاتا تھا کہ اُسکی خوشبو ہوا کے ساتھ مکہ معظمہ کے بازار
ں دور دور تک پہونچتی تھی۔ ہم لوگ جنت المعالی سے سیدھے مولدالنبی کی طرف
انہ ہوئے۔ جو حال وہاں کا دیکھا قابل بیان نہیں۔ مکان کھود ڈالا گیا ہے۔ اسکے
جود کا صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ دو ایک جگہ بنیاد کے منہدم نشانات موجود ہیں
قی عملہ اینٹیں لکڑیاں وغیرہ کھود وا کر کہیں دور پھنکوا دیا گیا ہے۔ ایک مربع
طعہ زمین کا قریبًا ساٹھ فیٹ لانبا اور پچاس فیٹ چوڑا باقی ہے۔ جس پر خردہ فروش
کاندار اپنی چھوٹی چھوٹی دکانیں لئے بیٹھے تھے باقی تمام حصہ پر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا
ھا۔ قریب کے مکانوں کا سایہ جس حصہ پر تھا وہاں دو ایک گدھے اور دو تین
ٹے آرام کر رہے تھے۔ اب ضبط کی طاقت کس کے دل میں باقی تھی۔ کوئی ایسا
تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ جاری ہوں۔ معلوم ہوا کہ اسی مقام کے قریب
مولد علی" بھی ہے اوس کی بھی یہی حالت ہے لیکن اب کس کے پیروں میں طاقت
ور دل میں سکت باقی تھی جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقام ولادت کو بھی
یسی حالت میں جا کر دیکھتا۔ ہملوگ سیدھے عباس ابراہیم کے مکان کی طرف
اپس ہوئے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور سب پہ مُہر خاموشی لگی ہوئی تھی
استہ بھر کوئی گفتگو آپس میں بھی نہیں ہوئی۔

دوسرے روز مکہ معظمہ کے شہر اور بازار گھومنے کے لئے گئے۔ یہاں سڑکیں عمومًا
نگ ہیں۔ آمنے سامنے کی دکانوں کا فاصلہ اسقدر کم ہے کہ اس پر کھجور کی چٹائیں
ور پتے اور لکڑی کے تختے رکھ کر سایہ دار کر دیا گیا ہے۔ صفا مروہ کا بازار بھی اسیطرح
سایہ دار ہے لیکن یہاں پر سڑک بہت کشادہ اور چوڑی ہے یعنی قریبًا چالیس فیٹ
ی چوڑائی اس سڑک کی کوہ صفا سے کوہ مروہ تک ہے۔ صفا مروہ دوڑنے کے وقت
ی معلوم ہوتا ہے کہ ایک اچھے آباد گنجان شہر کے اندر ہملوگ دوڑ رہے ہیں۔ اسکے
ونوں جانب نہایت عمدہ دکانیں سوداگروں کی ہیں اور حج کے دنوں میں یہاں تجارت
ا بازار خوب گرم رہتا ہے کپڑے۔ برتن۔ پھل۔ ترکاریاں۔ تسبیح۔ ملاحی سامان

بانڈیاں - چائے کے برتن - وغیرہ وغیرہ نہایت عمدہ اور کثرت سے ہر جانب بجے رہتے ہیں - ایک دوکان یہاں انگریزی دواخانہ کی بھی ہے - بڑے بازار کی سڑک خوب چوڑی اور کشادہ ہے یہاں پر شام کو میں نے بذریعہ موٹر لاری کے آبپاشی ہوتے دیکھا اور یہ آبپاشی کی مشین نہایت عمدہ حالت میں تھی اور اس سے اس زور سے پانی کی دھاریں نکلتی تھیں کہ کل سڑک جو چالیس فیٹ سے کم چوڑی نہ تھی ایک ہی مرتبہ میں تر ہو جاتی تھی -

مکہ معظمہ کے مکانات عموماً چار منزلہ ہوتے ہیں - کمروں کے اوپر کمرے بناتے ہیں - بالائی منزل پر صحن ہوتا ہے - کمروں کے سامنے خوبصورت چھجہ یا بالکونی ایک ضروری جزو ہر مکان کا ہوتا ہے -

آجکل یہاں بازار میں گاجر ۱۰ سیر - مولی پیسہ کی دو - خرفہ ۲ سیر - ولایتی بینگن ۴ سیر اور قریب قریب کل ترکاریاں ہندوستان کی قریبًا اسی نرخ سے ملتی ہیں - ارہر کی دال یہاں نہیں ملتی - آٹا عموماً مشین کا پسا ہوا ملتا ہے - یہاں بازار کی روٹی کھانے کا عام رواج ہے - زیادتی خمیر کی وجہ سے یہ کھٹی ہوتی ہے اور اندر سے کچی بھی ہوتی ہے -

سڑی ہوئی اور سوکھی مچھلیاں بازاروں میں بکثرت بکتی ہیں - سڑکوں اور دکانوں پر سوکھی ہوئی بودار مچھلیوں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے جس کے قریب سے گذرنا مشکل ہوتا ہے - عرب اس کو شوق سے کھاتے ہیں یہی حال مدینہ کا ہے اور درمیانی منزلوں پر بودار مچھلیاں بکثرت ملتی ہیں - سوکھی مچھلیوں کو پہلے تھوڑی دیر کے لئے پانی میں ڈوبا دیتے ہیں - جب وہ کچھ پھول جاتی ہے تو انکو پکا کر کھاتے ہیں -

عورتوں میں پردہ کا رواج اسی قدر ہے کہ وہ برقع پہنکر باہر نکلتی ہیں - برقعہ میں علاوہ آنکھ کے سب حصہ بند ہوتا ہے -

مرد یہاں کے ایک بڑے لمبے کرتہ کے اوپر ایک چھوٹا کوٹ جو انگریزی کوٹ

سے بہت مشابہ ہوتا ہے پہنتے ہیں معلوم نہیں یہ فیشن یہاں کب اور کس طرح آیا
نجد کے لوگ اور سرکاری ملازم سر پر ایک رومال رکھ کر اس کے کونے ادھر ادھر
شانوں پر لٹکائے رہتے ہیں اور اس کو سر پر ایک گول موٹے ریشم یا سوتی رسی
باندھ کر قائم رکھتے ہیں۔ پولیس کی وردی قریباً ہندوستانی پولیس کی وردی کی طرح
ہے لیکن ان کے سر پر ڈوپٹہ یا رومال رسی سے بندھا ہوا بُرا معلوم ہوتا ہے
خاصکر اسو جہسے کہ ماتھے پر ایک ذرا سا گھونگھٹ بھی نکالے رہتے ہیں اور پولیس
کے کام میں بجائے چاق وچوبند ہونے کے یہ گھونگھٹ مخل بھی ہوتا ہے۔
یہاں صفائی کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ مکانوں میں سنڈاس بنے ہوئے ہو
ہیں جو سال دو سال بعد صاف کئے جاتے ہیں۔ ان سنڈاسوں کے اندر مچھر در
کی کان ہوتی ہے جورات کو سنڈاسوں سے نکل کر انسانوں پر حملہ کرتے ہیں۔ میر
نے یہاں اکثر مریض بخار کے دیکھے جن کی تلحال بڑھی ہوئی تھی اور جن کے خو
کی سُرخی بہت کم ہوگئی تھی۔ یہ سب میری رائے میں ملیریا کے مریض تھے حاج
کو یہاں اکثر پیچش کی شکایت ہو جاتی ہے۔ عرب چائے بہت پیتے ہیں اور سگر
ہر وقت پیتے رہتے ہیں۔ تمباکو اور چائے یہاں عموماً عدن سے لائے جاتے ہیں
سگریٹ عام طور پر خود بنا کر پیتے ہیں۔ بنے ہوئے سگریٹ مصر سے آتے ہیں۔ تمبا
اور چائے کی کاشت کیطرف یہاں توجہ نہیں کیجاتی ورنہ بہت نفع ہو۔ ترکاریاں سب
پیدا ہو سکتی ہیں مگر توجہ اسطرف نہیں ہے۔ سنڈاسوں کی کھاد جب سال دو سا
بعد نکالی جاتی ہے تو شہر کے باہر دور پھینک دی جاتی ہے۔ کاشتکاری کے کا
میں نہیں لائی جاتی۔
ہم لوگوں نے غار حرا وغیرہ جانا چاہا مگر معلوم ہوا کہ وہاں جانے کی ممانعت
ہے۔ ہمارے معلم نے ۲۰ مارچ کو ہر ایک حاجی سے دو سو چودہ روپیہ وصول کر
تھا۔ یعنی ایکسو ساٹھ روپیہ کرایہ موٹر آمد و رفت مدینہ منورہ اور چوان روپیہ فیس
اس روپیہ کی کوئی رسید نہیں دیگئی نہ تفصیل بتلائی گئی۔ بعد میں رفتہ رفتہ معلو

اس چون روپیہ میں کرایہ مکان اور کرایہ اُس سے کا فاصل ہے جو سفر وفات
ل لے ۴- معلم صاحب نے ہم سے بتلایا کہ کرایہ موٹر حکومت کے دفتر میں جمع
ردیا گیا- جس تاریخ کو اجازت ملے گی اوسی تاریخ کو ہم لوگ روانہ ہو سکیں گے
ور جس کمپنی کو حکم ہو گا اوسی کمپنی کے موٹروں پر ہم لوگ روانہ ہونگے- کرایہ موٹر
ا خل کرنے کے دو تین روز بعد ہم لوگ روانگی مدینہ طیبہ کے لئے بہت بیقرار ہوئے
ہر شام ہمارے معلم صاحب کا آدمی دفتر جاتا اور واپس آکر کہتا کہ آج حکم نہیں
ہے- انشاء اللہ کل ضرور مل جاے گا-

۴ اپریل کی صبح کو نہایت انتظار اور اشتیاق بلکہ بے صبری کے عالم میں ہم لوگ
بیٹھے تھے کہ حسن ابراہیم نے آکر اطلاع دی کہ الحمد للہ مدینہ جانے کا حکم
نافذ ہو گیا- ہم لوگ علی جان کمپنی کے ذریعہ سے کل صبح مدینہ روانہ ہو جائیں گے
اسوقت کی خوشی کا عالم قابل تحریر نہیں- فوراً ہمارے سب رفیق تیاری سفر میں
مشغول ہوئے- میں اور شاہ سلیم اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب دفتر علی جان موٹر
کمپنی جس کا نام "الجنہ سیارہ" ہے گئے- وہاں کے منیجر صاحب سے ملاقات کی-
آدمی بہت خلیق تھے- ہم نے درخواست کی کہ ہمکو موٹر مضبوط دیا جاے تا کہ
راستہ کے حوادثات سے محفوظ رہیں- انھوں نے اطمینان دلایا- انکی عمر قریب
پینتالیس سال کی تھی- اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ ان کے اعزا دہلی سے آئے
تھے- اور لوگ کبھی کبھی ہندوستان آتے جاتے رہتے ہیں- مگر انھوں نے ابتک
سمندر اور جہاز نہیں دیکھا- یعنی دن رات انکے موٹر جدہ جاتے رہتے ہیں اور صرف
چار پانچ گھنٹہ کا سفر ہے مگر اب تک انکو جدہ جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا- ہم لوگ
شام تک مکہ معظمہ کی سیر میں مصروف رہے- عصر مغرب اور عشاء کی نمازیں حرم شریف
میں پڑھیں- شب میں ایک رفیق سفر نے راستہ کے لئے ناشتہ پراٹھے اور حلوہ وغیرہ
تیار کیا- اس کے بعد ہم لوگ حسین ابراہیم کے مکان پر سونے کے لئے گئے- یہ
مکان مسفلہ محلہ میں عباس کے مکان سے بہت فاصلہ پر تھا- لیکن عباس کے

مکان پر مچھروں نے سونا ناممکن کردیا تھا۔ کئی شبیں جاگتے گذری ہیں۔ اس لئے عباس نے اپنے بھائی حسین کے گھر پر ہم لوگوں کے سونے کا انتظام کردیا تھا۔ اس مکان میں بڑا صحن تھا جو مکہ معظمہ کے لئے ایک غیر معمولی بات ہے۔ ہم لوگ اس صحن میں کمبل اوڑھ کر سوتے تھے۔ اسوجہ سے مچھروں سے بہت کچھ پناہ ملتی تھی۔ غرضکہ قریب بارہ بجے رات کے یہاں پہنچے۔ ایک ہلکی نیند لی۔ صبح تڑکے مکان پر پہنچے اور (۵ اپریل ۱۹۳۱ء) فوراً عربیہ پر بیٹھ کر مکہ گیٹ روانہ ہوئے۔ یہاں طلوع آفتاب کے وقت ہم لوگ پہنچ گئے۔ یہاں سات موٹر موجود تھے۔ جو موٹر لاری ہمارے قافلہ کو دیگئی وہ نہایت عمدہ اور بالکل نئی تھی۔ اسکا شوفر مکی نامی اپنے فن میں بہت ہوشیار تھا۔ تیرہ آدمی اس پر بیٹھے۔ اسیطرح چھ دیگر لاریاں لدیں اور ایک موٹر خالی اسباب مرمت موٹر سے لدا ہوا تھا جس پر ایک مہندس یعنی موٹر مستری ہمراہ جانے کے لئے موجود تھا۔ قریب ایک گھنٹہ دن چڑھے سب لاریاں روانہ ہوئیں۔ پہلی چوکی جہاں مسافر جانچے جاتے تھے مکہ گیٹ سے بہت قریب یعنی قریباً دو فرلانگ فاصلہ پر ہے۔ یہاں سب موٹر روکے گئے۔ حسب دستور نہایت توقف ہوا۔ ایک شخص آیا۔ مسافروں کو گن کر چلا گیا۔ دوسرا آیا گن کر چلا گیا۔ قریب دو گھنٹہ بعد خدا خدا کرکے پروانہ روانگی ملا۔ پانچ موٹر آگے ہوئے۔ چھٹا نمبر ہمارے موٹر کا تھا کیونکہ مکی بہت ہوشیار ڈرائیور اور مستری تھا۔ اگر کوئی موٹر راہ میں بگڑتا تو یہ اوسکی مرمت میں مدد دیتا۔ ہمارے پیچھے خالی موٹر اسباب سے لدا ہوا تھا۔ مکہ سے جدہ تک کا راستہ بلا زیادہ دقت کے طے ہوا۔ ہم لوگ ۱۱ بجے دن کے قریب جدہ پہنچے۔ یہاں الجنہ کمپنی کے دفتر کے سامنے سب لاریاں روک دی گئیں۔ عباس ہمارے ہمراہ تھے۔ یہ اور مکی ناشتہ وغیرہ کے لئے کہیں چلدیئے۔ ہم لوگوں کو تاکید کر گئے کہ کہیں کوئی چلا نہ جائے بہت جلد روانگی ہوگی۔ اب پھر انتظار شروع ہوا تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر سراج الحسن کو ضرورت بیت الخلا کی ہوئی۔ بڑی دقت سے ایک بہت تنگ اور کثیف گوشہ نصیب ہوا۔ انھوں نے اپنی ضرورت رفع کی سب

مسافر پیاسے ہوئے۔ پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ تھوڑا تھوڑا پانی ہمراہ تھا وہ
کام آیا۔ غرضکہ انتظار رہائی کرتے کرتے عصر کا وقت ہو گیا۔ اس وقت عباس احمد
کی نظر آئے اور دیگر موٹروں کے ڈرائیور بھی آئے۔ یہاں سے روانہ ہوئے سیتہ
گیٹ پر پہنچکر سب موٹر پھر روک دیئے گئے۔ یہاں پر پھر نہایت توقف جانچ پڑتال
میں ہوا۔ مغرب کے قریب مدینہ طیبہ کی طرف روانگی ہوئی۔ جدہ سے مدینہ
طیبہ کی طرف بحر قلزم کے کنارے کنارے موٹر کا راستہ ہے۔ سمندر کا منظر قیام کے
وقت نہایت دلچسپ اور پُر لطف تھا۔ راستہ نہایت ہموار اور زمین قدرتی نمک
کی وجہ سے میلوں تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی چھڑکا گیا ہے۔ زمین نہایت
ہموار اور باریک باریک چکنے پتھر کے ٹکڑے بجری کی طرح بچھے ہوئے۔ قریب بیس
میل کے بعد ریگستان شروع ہوا۔ لق و دق میدان اور ریت کے ٹیلے اور پہاڑیاں
ہر طرف نظر آنے لگیں۔ ریگستان میں دو ایک پرانی شکستہ لاریاں ملیں جو اتفاق سے
یہاں ٹوٹ کر پڑی رہ گئیں تھیں۔ الہ آباد کے حساب سے قریب پانچ بجے شام کے
جدہ سے روانہ ہو کر برابر نہایت تیزی سے لاریاں دوڑتی رہیں۔ رات کا بڑا حصہ
گذرنے کے بعد مسافر نیند سے جھومنے لگے جب آنکھ کھلتی تو دیکھتے کہ لاریاں اسی
تیزی سے چلی جا رہی ہیں۔ غرضکہ تین بجے صبح کے قریب رابق کی منزل پر پہنچے یہاں
لاریاں رکیں۔ رابق کی منزل مثل دیگر منازل کے جنگلی لکڑی کے ستونوں پر کھجور
کے پتوں کا چھپر ہے۔ آرام کے لئے کھجور کے بنے ہوئے بنچ جنکو یہاں کرسی کہتے
کہتے ہیں بچھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ نیند کے متوالے تکان سفر سے چور ان کرسیوں پر
جا پڑے اور نیند نے فرشتہ رحمت کا کام کیا۔ ابھی نیند پوری کیا بلکہ دھوئی
بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس رباط کے بھٹیارے نے جگا دیا اور حسب معمول کرسی کا طلب
کیا۔ نیند تو فوراً کافور ہوگئی لیکن بدن کا درد اور تکان سفر دوگنا ہو گیا۔ ایک پیالی
(۶ر اپریل ۱۹۳۱ء) چائے پی۔ دو انڈے کھائے۔ صبح کی نماز پڑھی اور موٹر پر جا بیٹھے
آفتاب نکلتے نکلتے موٹر روانہ ہوئے۔ اب اصلی ریگستان شروع ہوا۔ اکثر موٹر بار

بار رکنے لگے۔ کسی کا کوئی پرزہ بگڑا افندی نے اس کو ٹھیک کیا۔ کسی کے پہیے بالو میں
دھنسے اور بدقت تمام موٹر اُٹھایا گیا۔ برابر یہی عمل جاری تھا کہ ظہر کے وقت الہ آباد
کے حساب سے ٹھیک ایک بجے دن کے وقت میری موٹر کے پہیے بھی ایکبارگی بالو
میں دھنس گئے۔ بجز بھائی صاحب کے ہم سب لوگ موٹر سے اُترے دیکھا تو
مڈگارڈ تک بالو آگیا ہے۔ جیک پر موٹر اٹھایا گیا۔ نیچے پتھر رکھے گئے۔ موٹر بدقت
تمام اُبھرا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ قریب ایک فرلانگ کے ہم لوگوں کو پیادہ
پا چلنا پڑا۔ اوسوقت کی دھوپ اور جلتے ہوئے بالو میں چلنا پڑا۔ تب اندازہ
اُن غریبوں کی محنت اور عقیدت کا ہوا جو پیادہ پا اس سفر کو طے کرتے ہیں۔ راستہ
میں ملتے ہیں۔ تمام سفر میں صرف یہ ایک واقعہ تھا کہ ہم لوگوں کو بوجہ خرابی راستہ
کے موٹر سے اوترنا پڑا۔ اور سب موٹروں کو پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ یہ واقعہ پیش
آیا۔ غرضکہ ہم لوگ تمام دن سفر کرتے رہے۔ رات کے وقت جب الہ آباد میں دس
بجے شب کا وقت ہوگا ہملوگ منزل پر پہنچے۔ اس منزل کا نام علی بیر ہے۔ تکان
سفر سے ہر شخص چور چور تھا۔ بعد فراغت احتیاج ضروری اور نماز عشاء کرسی پر
لیٹے اور ایک ہی نیند میں رات گذر گئی۔

مدینہ طیبہ کے سفر میں نہایت دردناک وہ منظر ہوتا ہے جو یہاں کے غرباء اور
گداگروں کا ہے۔ یہ غریب ہر پڑاؤ پر اور راستہ میں پہاڑیوں پر جابجا دو رویہ
دست سوال دراز کئے کھڑے رہتے ہیں۔ انکی غربت کا یہ عالم ہے کہ کسی کے بدن پر
کپڑا ثابت نہیں ہوتا۔ اکثر لڑکیاں دس گیارہ برس کی عمر کی اونٹوں کے بالوں کی جھالر
بنا کر کمر پر لپیٹے تھیں اور اسطرح اپنی ستر پوشی کئے ہوئے تھیں۔ ایک ٹکڑا روٹی کا
پھینک دیا جاتا تو اُسپر جھنڈ کے جھنڈ بچے اور عورتیں ٹوٹ پڑتے۔ تربوز کھا کر اوسکا
چھلکا پھینک دیا جاتا تو اُسپر بدحواس ہو کر گرتے اور جس کے ہاتھ لگ جاتا وہ لیکر
بھاگتا اور بہت شوق سے کھاتا۔ چلتی ہوئی موٹر پر سے روٹی کے ٹکڑے پھینکے جاتے
تو اُن کو اپنی جان کا ڈر نہ ہوتا فوراً اوس کے لوٹنے کے لئے موٹر کے سامنے آجاتے

راکثر مجھکو اندیشہ ہوا کہ کوئی نہ کوئی دب کر مرجائے گا۔ کسی پڑاؤ پر اگر کوئی کچھ
شتہ کرنے بیٹھتا تو یہ غریب ہزاروں دعائیں دیتے اور ایک نوالہ کی امید پر کھانے
لے کے چاروں طرف حلقہ کئے رہتے۔

آج کی تاریخ کا سفر بالکل ریگستان میں گذرا۔ دوپہر کے وقت جب ہوا زور
سے چلتی اور بالو کا غبار بلند ہوتا۔ خواجہ آتش کی ایک غزل مجھکو بے اختیار یاد
تی اور اس کے حسب ذیل اشعار زبان پر جاری ہو جاتے تھے۔ درمیانی شعر کچھ
میم یعنی ایجاد بندہ کر کے حسب حال کر لیا گیا تھا ؎

گدا نواز کوئی شہسوار راہ میں ہے ۔۔۔ بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے
ہزاروں ٹھوکریں کھلوائیگا حضور کا عشق ۔۔۔ سفر مدینہ کا ہے کوہسار راہ میں ہے
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ رک آتش ۔۔۔ گل مراد ہے منزل پہ خار راہ میں ہے

۲ اپریل ۱۹۱۲ء۔ صبح تڑکے تڑکے پھر روانہ ہوئے۔ تیسرے روز کا راستہ بالکل
پہاڑی تھا۔ اس ناہموار پہاڑی زمین پر پتھر کے ٹکڑے چھوٹے بڑے برابر اس طرح
بچھے ہوئے تھے کہ زمین نظر نہیں آسکتی تھی۔ اسی سنگلاخ پہاڑیوں پر حیرت ناک
تیزی سے موٹر برابر دوڑے جا رہے تھے۔ اور مسافروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی
اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ سب کے سب تھالی کے بینگن کی طرح خودبخود
اچھلتے چلے جا رہے تھے۔ پہیے کے نیچے ایک بڑا پتھر آیا۔ موٹر نے دھکا کھایا اور
آدمی اپنی نشست سے اچھلا۔ سر کو ایک ٹکر موٹر کی چھت سے لگی اور فوراً اپنی جگہ
پر یا اپنے برابر والے کے کسی حصۂ جسم پر دھڑ سے گرا۔ ہنوز اپنی جگہ پہ سنبھلنے نہ پایا
تھا کہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ کہیں کہیں پر ایسے منظر بھی نظر پڑے جو چڑھاؤ اتار
کے اعتبار سے نینی تال کے سفر سے کسیقدر مشابہ تھے۔ قریب دس بجے دن کے
ہم لوگ پہاڑیوں کے اوتار کی جانب پہنچے۔ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ پہاڑی
ندیاں ملنی شروع ہوئیں اور یکے بعد دیگرے آٹھ ندیاں ملیں جن میں پانی نہایت
تیز دھارے سے بہہ رہا تھا۔ عبور کے مقام پر کسی میں تین فیٹ گہرائی تھی کسی میں

اس سے کچھ کم۔ ہمارا موٹر تو ہر ندی کو بلا تکان پار کرتا ہوا نکل گیا لیکن اور تمام موٹر
بیچ دہارے میں رُک گئے اور ان سے مسافر اُتارے گئے اور نہایت دقت اور توقف
کے ساتھ موٹر کھینچ کھینچ کر ندیوں سے نکالے گئے۔ جب آخری ندی ملی تو بجائے
اور موٹروں کی تقلید کرنے کے کمی ڈرائیور نے موٹر روکا تھوڑی دیر غور کرتا رہا اور
یکایک ندی کے عبور کا خیال چھوڑ کر بائیں جانب کی پہاڑی پر موٹر چڑھانے لگا
قریب بیس فیٹ بلندی پر جا کر ایک کھڈ بائیں جانب ایسا ملا کہ اُس کے قریب سے
موٹر کے نکلتے وقت مشکل سے دو انچہ کا فاصلہ رہ گیا۔ بہت سے مسافروں کو تو اس
خطرہ کا پتہ بھی نہیں چلا لیکن میری نظر اس کھڈ پر پڑی اور جی سن سے ہو گیا۔ لیکن
خدا نے بڑا فضل کیا کہ سلامتی سے موٹر آگے نکل گیا۔ کچھ اور بلندی پر جا کر کمی نے
موٹر کو پھر پہاڑی سے اتارنا شروع کیا۔ جب موٹر نیچے اُترا تو وہی ندی جس کو
چھوڑ کر ابھی آئے تھے یہاں بھی بڑے زور شور سے بہ رہی تھی۔ لیکن یہاں کمی
نے کچھ تردد نہیں کیا اور فوراً موٹر اُس پار نکال لے گیا۔ کمی کو پانی کی
گہرائی کا خوب اندازہ تھا کیونکہ اُس پار پہونچکر معلوم ہوا کہ اور سب موٹر تو اس
پہاڑی پر سے نہیں آئے اور براہ راست ندی پار کرنے کی غرض سے آگے بڑھائے
گئے تھے وہ بیچ دہارے میں رُک گئے تھے۔ مسافر سب اُتار دئے گئے تھے اور
موٹر یکے بعد دیگرے کھینچ کھینچ کر نکالے گئے۔ کمی بھی ان موٹروں کے عبور کرانے
میں مصروف ہو گیا تھا اس وجہ سے قریب ایک گھنٹہ کے ہم کو بھی توقف کرنا پڑا
ٹھیک دوپہر کے وقت جب سب مسافر اپنے اپنے موٹروں پر بیٹھ گئے تو سامنے
والی پہاڑی پر موٹر چڑھائے گئے اُسکی بلندی پر پہونچتے ہی سامنے گنبد خضرا
نظر پڑا۔ اب کیا تھا۔ تمام تکان سفر دور ہو گیا۔ ہر شخص پر ایک وجد کا عالم تھا
کون شخص تھا جو آبدیدہ نہ تھا کون زبان تھی جس پر نعرۂ صلوٰۃ و سلام جاری
نہیں تھا۔ چشم زدن میں موٹر نے مدینہ طیبہ کے پھاٹک پہ آ کر دم لیا۔ یہاں پر جو
چیز پہلے نظر پڑی وہ ترکوں کا بنایا ہوا عالیشان ریلوے اسٹیشن۔ ریلوے لائن

سرگزشت اپنی حال سے زبان سامان سب یہ تھے۔ انجن اور گاڑیاں ریل پلٹی
پر عریبہ لوگ ہم اترکر سے موٹر تھے۔ رہے کر بیان افسانہ کا پہل چہل گذشتہ
کے نبوی مسجد لوگ ہم گیا۔ کیا سپرد کے مدینہ صاحب معلم کو اسباب گئے۔
ٹھیک کے السلام باب اور اترے سے عریبہ پر وہاں بجے میدان سا ذرا ۔۔۔ ت
ہیچکر یہاں ہوئے۔ مقیم پر مکان کے معلم صاحب ابو سعود میں گلی ایک ث
کی۔ تیاری کی ہونے حاضر پر مبارک آستانہ کر بدل کپڑے کے کر غسل پھر لیا۔ دم
ہمارے لئے کے پڑھانے سلام کو مدنی نوجوان ایک نے معلم صاحب ابو سعود
کے رستے کا راستہ منٹ دو اور گیا۔ کیا نذر کے ان روپیہ ایک ایک تھا۔ دیا کر مقرر
ہو ذہن اس کبھی میں زمانہ دلپذیر جو حال وہاں ہوئے۔ حاضر پر مبارک آستانہ
کے کسی بیان میرا نہ ہے۔ میں امکان میرے کرنا بیان کا اس نہ ہوں سکتا
آسکتا ہے۔ سمجھ
مسجد نبوی کی مختصر تاریخ اور اس کی موجودہ کیفیت میں نے علیحدہ قلمبند کی
ہے۔ اس مقام پر اتنا لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعد ہر نماز تمام زائرین حضور
سرور کائنات اور حضرت خلیفۂ اول اور دوم پر سلام پڑھتے ہیں اور اسکا طریقہ یہ ہے
کہ ہر ایک معلم یا اون کے نائب اپنے اپنے زائرین کو اپنے ساتھ لیکر حلقہ بنا کر زور
زور سے سلام پڑھتے ہیں اور اونکے ہر جملہ کو تمام زائرین بہ آواز بلند دہراتے جاتے
ہیں۔ اور اس پختہ عمارت میں آواز اسطرح گونجتی ہے کہ ایک شور عظیم برپا ہوتا ہے
تھوڑی سی جگہ میں سب لوگوں کے سمٹ کر کھڑے ہونے اور زور زور سے چیخ کر
سلام پڑھنے کی وجہ سے غشی کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور اسقدر شور وغل پاس
ادب کے بھی خلاف معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص اسبات پر نظر کرتے ہوئے کہ ہمارے
سرکار کو شور وغل نہایت ناپسند تھا۔ اسوجہ سے میری رائے ہے کہ سلام کے طریقہ
میں یہ ترمیم کیجائے کہ بعد نماز امام یا کوئی اور بآواز بلند سلام پڑھے اور کل مقتدی
آہستہ آہستہ اس کو دہراتے جائیں۔ اس طریقہ میں صرف اتنا نقص معلوم ہوتا ہے

کہ معلم صاحبان کی آمدنی میں کچھ فرق پڑ جائے گا۔ لیکن اگر سلام کا حق فیس معلم
میں بڑھا دیا جائے تو پھر کوئی وجہ اعتراض کی نہیں معلوم ہوتی۔

آجکل مدینہ کی آب وہوا نہایت خوشگوار ہے۔ ہملوگ کمرہ کے اندر کمبل اوڑھکر
سوتے ہیں۔ صبح حرم شریف جاتے وقت اچھی خاصی سردی محسوس ہوتی ہے
مچھروں کا یہاں پتہ نہیں ہے کھانے کا انتظام ابو سعود صاحب کے سپرد ہے۔
نہایت آرام سے یہاں مقیم ہیں۔ مدینہ کے مکانات کی قطع مکہ مکرمہ کی طرح ہے
گلیاں عموماً تنگ ہیں۔ صفائی کا انتظام اچھا نہیں ہے گلیاں مرطوب اور کوڑا کرکٹ
ہٹانے کا کوئی عمدہ انتظام نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں مکانات کے اندر کنوئیں ہیں جنکا
پانی شیریں ہے۔ سڑکوں پر پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔ بارش کے پانی کو قریب کے
پہاڑوں کے نیچے بند بنا کر روکا گیا ہے وہی ذخیرہ ہے جہاں سے نل شروع ہوتے
ہیں۔ میں نے اکثر مقامات پر دیکھا کہ نل کھلے رہتے ہیں کوئی توجہ اسپر نہیں ہے کہ
پانی لینے کے بعد نل بند کر دیئے جائیں۔ مدینہ طیبہ کے گرد و نواح میں ترکاریاں بکثرت
بوئی جاتی ہیں۔ یہاں کی زمین بہت سر سبز ہے ہر قسم کی ترکاریاں بازار میں بکثرت
ملتی ہیں۔

۱۰ اپریل ۱۹۳۱ء۔ ہملوگ آج معلم صاحب کے نائب کے ہمراہ جنت البقیع گئے۔ یہ
مقام شہر کے قریب مگر شہر سے باہر ہے۔ ایک معمولی دروازہ کے ذریعہ سے احاطہ
کے اندر گئے۔ وہاں کا نظارہ قابل بیان نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی زمین کھود کر
ہل چلا دیا گیا ہے مٹی کے تودے کنکر پتھر کا انبار ہر طرف دیکھ کر نہایت قلق ہوا۔ چونکہ
ہم لوگوں کے آنے سے تین دن قبل یہاں بارش ہوئی ہے۔ اسوجہ سے بہت سی قبریں
بیٹھی ہوئی نظر آئیں۔ نائب معلم ہم کو اس احاطہ کے مشرقی اور شمالی گوشہ کیطرف
لے گیا۔ وہاں ایک منہدم قبر دکھلا کر بتلایا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مزار ہے
وہاں ہم لوگوں کو سلام پڑھوایا گیا۔ وہاں سے واپسی کے وقت حضرت رسول کریم
کے صاحبزادہ قاسم رضہ کا چھوٹا سا مزار ملا اوسپر سلام اور فاتحہ پڑھنے کے بعد

احاطہ کے جنوب کی طرف گئے۔ نائب معلم نے دست بتلایا کہ سرھانے جو مزار ہے وہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ہے۔ اس کے جنوب کی طرف قریب چار پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر جو مزار ہے وہ جناب سیدہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا ہے اور حضرت امام حسن کے مزار کے پائنتی حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ حضرت امام جعفر صادق رض اور حضرت امام باقر رض اور حضرت امام تقی رض کے مزار ہیں۔ قریب پہنچکر دیکھا کہ ان مزارات کے چاروں طرف کا کوڑہ کرکٹ اور پتھر کنکر تین چار ہاتھ کے حاشیہ میں صاف ہے۔ مزار موجود ہیں مگر انکا پلاسٹر اور کہیں کہیں پتھر کی جڑائی نکلی ہوئی ہے۔ یہاں پر ہم لوگوں کو سلام اور فاتحہ پڑھوایا گیا۔ جسوقت سے ہم لوگ جنت البقیع کے احاطہ میں داخل ہوئے تھے کسی کی آنکھوں سے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے لیکن یہاں پہونچکر ضبط کی تاب کسی میں نہ رہی۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب ہم سب میں کمزور تھے۔ وہ حضرت امام حسن رض کے مزار کے قریب زمین پر بیٹھ گئے اور مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ ہر مزار کو علیحدہ علیحدہ بتلاؤ کہ کون کسکا ہے۔ ابھی انکو بیٹھے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ سعودی سپاہی بجلی کی طرح کڑک کر اونپر آیا اور زور سے بازو تھام کر اٹھا دیا۔ یہ بیچارے سہم گئے کہ آخر کیا قصور سرزد ہوا میں نے کہا کہ اس کو خیال ہوا کہ شاید آپ مزار کو مس کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مزار پر اور اہلبیت کے مزار پر نہایت عمدہ مقبرے صدیوں کے بنے ہوئے تھے۔ انکے فرش۔ جالیوں اور نقش ونگار کی نہایت تعریف کیجاتی ہے۔ ابھی تین چار برس ہوئے حکومت موجودہ نے سب کھدوا ڈالا اور جنت البقیع کے احاطہ کے اندر کے تمام مزارات کے متعلق جسقدر عمارتیں تھیں کسی کا نشان باقی نہ رہا۔ میری رائے میں حکومت حجاز نے عمارتوں کے کھدوانے میں سخت غلطی کی اول تو یہ کہ اسکی طرف سے تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل کو صدمہ پہنچا۔ وہابیوں کا یہ اعتراض ہے کہ لوگ یہاں آکر منتیں مانگتے تھے سجدہ کرتے تھے۔ بدعتیں کرتے تھے۔ اسلئے عمارتیں کھدوڈالی گئیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو لوگ ایسا

کرتے بھی تھے وہ بھی اس بلڈنگ کی وجہ سے وہاں سجدہ نہ کرتے تھے۔ منتیں مانگتے
تھے۔ وہ لوگ آج بھی اوس خاک کے ڈھیر پر جہاں اُن کے بزرگوں کے مدفن کا
نشان ہو یہ سب کرنے کو تیار ہیں اور باوجود عمدہ عمدہ عمارتوں کے کھود ڈالنے
کے لوگ جوق جوق وہاں جاتے ہیں اور ان کو بدعت کرنے سے روکنے کیلئے
حکومت کو سپاہی رکھنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ جنت البقیع کے دروازہ پر ایک گارڈ
اسی لئے تعینات رہتا ہے۔ پس بلا عمارتوں کے کھودنے کے بھی گارڈ موجودہ
لوگوں کو ان بیجا حرکتوں سے باز رکھ سکتا تھا۔ اس سے کیا فائدہ ہوا کہ ایک
صاف ستھری اور خوشنما جگہ کو مسمار کردیا اور عمدہ عمارتیں کھود ڈالیں۔ آخر رسول
کریم کے روضہ مبارک کی جالیوں پر سپاہیوں کا پہرا رہتا ہے اور کوئی زائر جالیوں
کو مس بھی نہیں کرنے پاتا۔ اسیطرح یہاں بھی ہو سکتا تھا۔ یہی غلطی مکہ معظمہ میں
جنت المعالی کے قبرستان۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مقبرہ اور حضرت رسول
کریم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ولادت گاہوں کے کھودنے میں حکومت
کی طرف سے ہوئی۔ اس عمل سے اسقدر ناراضی ہے کہ اکثر ایسے اشخاص جو حج اور
زیارات کے لئے جاتے اب انھوں نے ارادہ ملتوی کردیا ہے۔ میری آواز اگر
حکومت کے ارباب حل وعقد کے کانوں تک پہنچ سکے اور اسپر کچھ توجہ کی امید ہو
تو میں نہایت خلوص اور ادب سے لیکن نہایت بلیغ اصرار سے ضرور یہ عرض کرونگا
کہ ان تمام عمارتوں کو فی الفور بہ حیثیت قدیم بنوادیا جائے اور امید ہے کہ اس
کام کے لئے مسلمان نہایت فراخ دلی سے چندہ دینے کے لئے تیار ہوجائینگے
ہاں موجودہ انتظام لوگوں کو بدعتوں سے روکنے کے لئے قائم رکھا جائے اسپر
کوئی اعتراض نہیں کرسکتا۔ غرض کہ قریب ایک گھنٹہ کے ہم لوگ جنت البقیع
میں رہنے کے بعد اپنے مسکن کو نہایت ملول اور پریشان خاطر واپس آئے۔
۲۳ر اپریل سنہ۱۹۳۱ء۔ آج ہم لوگ کوہ اُحد کی طرف بذریعہ سواری عربیہ روانہ ہوئے
کلہ ہم لوگوں نے جنت البقیع سے کوہ اُحد کی طرف دیکھا تو معلوم ہوتا تھا کہ شاید

مشکل سے دو فرلانگ ہوگا۔ آج تانگہ پر بیٹھ کر آئے تو دوری کا صحیح اندازہ ہوا
یہ مقام مدینہ طیبہ سے قریب چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ راستہ نہایت ناہموار ہے یہاں
بھی تانگہ کے گھوڑوں کے منہ میں لگام نہیں دیجاتی۔ صرف قزبی لگائے رہتے
ہیں۔ اس میں ایک رسی بندھی تھی جس کو تانگہ والا ہاتھ میں لئے ہوئے زمین پر
دوڑتا ہوا اور تانگہ کو کھینچتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک ناہموار جگہ پر ایک طرف کا پہیہ اتنا
اُٹھا اور ایسا دھکہ لگا کہ میں نے سمجھا کہ تانگہ الٹا۔ خیر تانگہ تو بچ گیا لیکن تانگہ
والے کے ایسی ٹھوکر لگی کہ پہیہ کے آگے چاروں شانہ چت دھڑام سے گرا میں
تو سمجھا کہ یہ مرا۔ لیکن پہیہ اُس کے جسم پر گذرنے ہی کو تھا کہ وہ بجلی کی طرح کود
کر ایک طرف کھڑا ہوگیا اور فوراً رسی ہاتھ میں لے کر گھوڑے کی پیٹھ پر تین چار
ڈنڈے کس کس کر رسید کئے۔ ہم لوگ قریب پون گھنٹہ میں میدان جنگ اُحد
میں پہونچ گئے جو کوہ اُحد کے دامن میں ہے لیکن پہاڑ کے عین نیچے ایک ندی
بہت زور شور سے رواں تھی جس کا پاٹ قریب پچاس فٹ کے تھا۔ لشرزائرین
اسمیں سے ہوکر اُس پار جارہے تھے کمر تک پانی تھا۔ میں نے اس پانی میں
ہاتھ ڈالا نہایت ٹھنڈا تھا۔ ایک زائر کو میں نے دیکھا کہ ایک قلی کی پیٹھ پر بیٹھکر
اُس پار جارہا تھا۔ بیچ دریا میں قلی نے ٹھوکر کھائی اور دونوں پانی کے اندر گرے
میرے دو ساتھی بہت کمزور تھے بھائی شوکت حسین صاحب قبلہ اور ڈاکٹر
سراج الحسن صاحب۔ ان کے خیال سے ہم لوگوں نے عبور کا قصد نہیں کیا
چشمہ کے اسی طرف کھڑے ہوکر نائب معلم نے سلام اور فاتحہ پڑھوا دیا۔ اُس پار
نہ جاسکنے کی وجہ سے حضرت سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری کا موقع
نہیں ملا۔ اسیطرف سے اُن کے حضور میں بھی سلام اور فاتحہ عرض کیا گیا۔ حضرت
امیر حمزہ رضؓ کا مقبرہ بھی حکومت موجودہ نے کھدوا ڈالا ہے۔

قریب دو گھنٹہ کے ہم لوگ اس میدان میں حاضر رہنے کے بعد واپس ہوئے
راستہ میں دور سے داہنی جانب مسجد قبلتین کی زیارت کی یہی وہ مسجد ہے جہاں حضرت

رسول کریم نے بجائے آتر بیخ نماز پڑھانے کے ایک روز یکایک دکھن جانب یعنی رو بقبلہ ہوکر نماز جماعت ادا فرمائی۔ اور اُسی وقت سے نماز رو بقبلہ ادا کیجاتی ہے

۳ اپریل ۱۹۳۶ء۔ آج ہم لوگوں کو مکہ معظمہ واپس جانا ہے۔ بہت تڑکے نذیر سے اٹھکر آستانہ مبارک پر حاضر ہوئے۔ نماز ادا کی سلام عرض کیا اور چشم پُرآب رخصت ہوکر مکان پر واپس آئے۔ ابو سعود صاحب کی خدمت میں آٹھ روز کا سولہ روپیہ کرایہ مکان پیش کیا۔ جس کو انھوں نے نہایت کشادہ پیشانی سے قبول کیا کھانے پینے کا خرچ ہم لوگ دوسرے تیسرے ادا کرتے جاتے تھے معلم کی فیس کے بارے میں معلوم ہوا کہ ابو سعود صاحب پر کئی سال سے ایک دعویٰ فیس کی آمدنی اور تقسیم کے متعلق دائر ہے جو ابتک طے نہیں ہوا۔ لہٰذا فیس ایک کمیٹی کے پاس جمع کی جاتی ہے۔ اس کمیٹی کی طرف سے ایک صاحب تشریف لائے۔ پانچ روپیہ ان کی نذر کیا لیکن انھوں نے بہت ہاتھ پیر پھیلائے۔ دو روپیہ اور پیش کیا تو خوش ہوئے۔ مدینہ گیٹ تک ہم لوگ آٹھ بجے صبح کے وقت پیادہ پا آئے۔ یہاں ہمارا اسباب دوسرے موٹر پر رکھ دیا گیا تھا۔ ہمارے موٹر پر اور لوگ قبضہ کئے ہوئے تھے۔ عباس کی مدد سے اپنے موٹر پر قبضہ کیا اور اپنا اسباب اپنے موٹر سے بندھوایا۔ تھوڑی دیر بعد موٹر روانہ ہوکر شہر پناہ کے پھاٹک کے سامنے روکے گئے۔ یہاں حسب دستور شمار کرنے اور پرچہ روانگی دینے میں نہایت توقف ہوا۔ قریب دو گھنٹہ بعد روانگی ہوئی۔ واپسی کے وقت کوئی ندی یا چشمہ نہیں ملا بارش کی وجہ سے عارضی ندیاں چند روز طغیانی پر رہ کر بہت جلد ان کا پانی بہجاتا ہے۔ ہمارے ساتھ کے ساتوں موٹر قریب چھ گھنٹہ چلنے کے بعد قریب سہ پہر کے رابق پہنچے۔ یہاں تھوڑی دیر کے لئے موٹر روکے گئے۔ ہم لوگوں نے وضو کیا نماز ادا کی۔ دو رکعت نماز بہ نیت عمرہ ادا کی۔ احرام باندھا اور پھر اپنی اپنی جگہ پر موٹروں میں جا بیٹھے۔ یہاں سے روانہ ہوکر قریب بارہ بجے رات کے ایک چھوٹے سے پڑاؤ پر موٹر روک دیئے گئے۔ زمین پر چٹائیاں بچھا کر رات بسر کی۔

اپریل ١٩٣١ء صبح کو تھانا کی چائے پی۔ تربوز خریدے پانچ آنہ کا ایک اچھا تربوز ہم نے خریدا ایک
ہ کا نمک خریدا آدھ سیر سے زیادہ ملا۔ یہاں سے قریب ایک گھنٹہ دن چڑھے
لوگ پھر روانہ ہوئے۔ دن بھر برابر موٹر نہایت تیزی سے چلتے رہے سوا ستہ
ں بجز ہمارے موٹر کے اور سب موٹر بگڑے اور انکی مرمت کی گئی یکی نے سب
مرمت کی ایک موٹر کا لوہا ایسا ٹوٹا کہ اس کی مرمت میں قریب دو گھنٹہ صرف
ا۔ قریب غروب جدہ پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ جدہ میں پڑاؤ نہ کیا جائیگا۔ ایک
ھنٹہ قیام کے بعد مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ قریب پانچ گھنٹہ رات گذرے
گیٹ پر پہونچے۔ یہاں روشنی کا انتظام بہت خراب تھا۔ اسباب ڈیرہ پر ....
ار دیئے گئے۔ سب کے اسباب مخلوط ہو گئے۔ بھائی شوکت حسین صاحب قبلہ
لٹر سراج الحسن صاحب تو معذور تھے۔ منشی بیٹھ گئے اور شاہد سلمہ بھی نا ....
وئے۔ مجبوراً میں نے اور ایک رفیق سفر نے سب اسباب علیحدہ ....
ے پھر دیکھ۔ تانگوں پر بیٹھکر مکان پہنچے۔ رات ہی کو خانہ کعبہ میں حاضر ہوئے
نہ پڑھی طواف کیا۔ صفا مروہ دوڑے۔ مکان آکر کھانا کھایا۔ اسی وقت عباس
ے ایک تار بشیر سلمہ کا لاکر دیا جو یہاں میری عدم موجودگی میں آیا تھا اور رکھا
وا تھا۔ اس سے سب کی خیریت معلوم ہوکر نہایت اطمینان ہوا سجدۂ شکر ادا کیا
ار مارچ کو ہم لوگ الہ آباد سے چلے تھے اس تار سے قبل کوئی خبر گھر کی نہیں ملی تھی
سی کا کوئی خط اسوقت تک آیا ہے۔ رات قریب ڈھائی گھنٹہ کے باقی تھی اسوقت
ہ لوگ لیٹے۔ نیند تو گویا پیشوائی کے لئے کھڑی تھی پڑتے ہی سوگئے۔

١٧ اپریل ١٩٣١ء۔ آج تڑکے حرم شریف سے واپس آنے کے بعد حجامت بنوائی
سل کیا۔ عمرہ کے کل ارکان ادا کرنے کے بعد احرام دور کیا۔ معمولی کپڑے پہن لئے
یح عباس صاحب نے ایک خط عبدالرحمن صاحب کا لاکر دیا جو اُنھوں نے بذریعہ
ہوائی جہاز اپنی بیوی کے نام روانہ کیا تھا۔ اس سے بھی سب کی خیریت معلوم ہوئی
٢٠ اپریل ١٩٣١ء۔ آج میری چھوٹی لڑکی انیس فاطمہ عرف چھٹن سلمہا کا خط ملا۔

یہ پہلا خط ہے جو اس وقت تک ہندوستان سے موصول ہوا ہے۔ آج یہاں بقرعید کی تیسری تاریخ ہے۔ بھائی شوکت حسین صاحب قبلہ اور شاہ محمد سلیم صاحب مدیر صوفتیہ کے جلسہ سالانہ میں شرکت کے لئے گئے اور دونوں نے کچھ کچھ چندہ دیا ہے۔ کو بھائی صاحب نے بخار کی شکایت کی۔ آناً فاناً بخار نے بہت تیزی اختیار کی۔ فوراً دوا شروع کی گئی۔ رات بھر میں جاگتا رہا۔ دوسرے روز بغل کا ٹمپریچر ۱۰۴ تھا۔ کوئی غذا نہیں ہوئی۔ سر پر گل روغن۔ سرکہ پانی برابر رکھا گیا۔

۲۱ و ۲۲ اپریل ۱۹۳۱ء۔ ۴ ذی الحجہ۔ تمام رات بیخوابی۔ ہذیان۔ متلی۔ قے۔ بار بار دست اور پیشاب۔ کھانسی۔ کھانسی میں خون۔ تیمار داری کے لئے ایک میں اور ایک رفیق سفر دو حضرات مریض کے پاس سے نہیں ہٹتے ہیں نے خود حرم شریف کی حاضری ملتوی کر دی ہے۔

مکہ میں ایک گورنمنٹ ہند کا شفا خانہ حاجیوں کے لئے ہے۔ وہاں جا کر ڈاکٹر صاحب سے ملا۔ انکا نام محمد خاں ہے۔ مدراس کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے گھر پر آکر بہت توجہ سے دیکھا اور جب تک ہم لوگ حج کے لئے روانہ نہیں ہوئے روز آتے تھے۔

۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء۔ ۵ ذی الحجہ کو حالت اور خراب ہوئی حسب مشورہ عباس ابراہیم مکہ معظمہ کے صدر شفا خانہ میں گیا۔ شفا خانہ کی عمارت حرم شریف کے قریب ہی ہے اور اچھی عمارت ہے۔ دوائیں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ متعدد ڈاکٹر ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر ہندوستانی زبان نہیں بول سکتا۔ اور صرف ایک ڈاکٹر ہے جو انگریزی جانتا ہے۔ میں اُن سے ملا۔ انکا نام ڈاکٹر حسنی الطاہر ہے۔ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ بہت مفصل گفتگو ہوئی۔ جب اونکو معلوم ہوا کہ میں بھی ڈاکٹر ہوں تو پھر مصافحہ کیا اور دیگر ڈاکٹروں سے ملوایا۔ پھر فوراً میرے ہمراہ مکان پر آکر نہایت غور سے بھائی صاحب کو دیکھا۔ انکو پندرہ روپیہ فیس پیش کی گئی۔ نہایت اصرار کیا گیا مگر یہ آزردہ ہو کر کہنے لگے کہ میں اپنے ایک بڑے بھائی سے فیس لے کر اپنے دل میں اپنی اس حرکت کو کسقدر حقارت کی نظر سے دیکھوں گا۔ غرضکہ

کسی طرح فیس نہیں لی۔ دوائیں بنواکر بھیجیں۔
۵ر ذی الحجہ آج بادشاہ ابن سعود کا نویدی کارڈ میرے اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کے نام آیا۔ ۶ر ذی الحجہ کو رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر سال منتخب حاجیوں کی دعوت سلطان ابن سعود کرتے ہیں۔ کارڈ نہایت اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر چھپا ہوا ہے۔ عبارت یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رئیس الدیوان العالی یتشرف بان یدعو حضرتکم للحضور الی

القصر العالی الملوکی بالمعابدۃ عقب صلاۃ مغرب یوم الجمعۃ

الموافق ۶ الجاری لتناول طعام العشاء علی المائدۃ الملوکیۃ علی

ان یکون الاجتماع قبیل المغرب المذکور بدار الحکومۃ السنیۃ حیث

اعدت سیارات لنقل المدعوین الی القصر العالی واللہ یحفظکم ۔

۱۳۴۹/۱۲/۵

ترجمہ۔ رئیس دیوان عالی اس بات کا شرف حاصل کرتا ہے کہ آپ کو قصر عالی شاہانہ میں نماز مغرب کے بعد جمعہ کے روز مطابق تاریخ ۶ ماہ رواں کے شاہانہ دسترخوان پر رات کے کھانا کھانے کے لئے مدعو کرے۔ اجتماع قبل مغرب دار الحکومت شریفہ میں ہوگا جہاں مدعو صاحبان کو قصر عالی تک لیجانے کے واسطے موٹر تیار ملیں گے اللہ آپ کی حفاظت کرے۔ ۵ر ذی الحجہ

۲۴ر اپریل ۱۹۳۱ء ۶ر ذی الحجہ تمام دن اور تمام رات حالت بدستور رہی۔ ہاتھ پیر پٹکنا۔ بخار ۱۰۵ درجہ۔ ہذیان مسلسل۔ کھانسی۔ کھانسی میں خون۔ بیخوابی وغیرہ وغیرہ سب حالتیں کل سے بھی زیادہ خراب ہیں۔

اب مجھ کو سخت تشویش ہوئی کہ سفر حج میں انکو کسطرح ہمراہ لیجاؤں اور کسطرح اور کس پر مکہ میں چھوڑدوں۔ پرسوں تڑکے اونٹ کی سواری پر ڈیڑھ دن کا مسلسل سفر ہے۔ میرے ایک رفیق سفر نے اس معاملہ میں ایسی متانت اور پختگی سے رائے

دی کہ دل کو بڑی تقویت ہوگئی۔ ہوس نے کہا کہ انکا حج اب ملتوی نہیں ہو سکتا اسیطرح ہمراہ لے کر جیئں گے۔ انکی زندگی ہے تو حج کرکے صحیح سلامت واپس آئیں گے ورنہ جو خدا کو منظور رہو گا ہو گا۔

آج بادشاہ ابن سعود کی دعوت میں جانا ہے۔ میرا ارادہ بوجہ علالت بھائی صاحب قبلہ کے شرکت دعوت کا نہ تھا۔ مگر عباس صاحب نے بہت اصرار سے کہا کہ جانا ضروری ہے۔ ضرور جائیے۔ آپ کی عدم موجودگی میں بھائی صاحب کے پاس سے نہ ہٹوں گا اور میرا خدمتگذار رفیق بھی مصر ہوا غرضکہ شام کو ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کے ہمراہ حرم شریف میں حاضر ہوئے۔ نماز مغرب ادا کرنے کے بعد حکومت کے دفتر میں جو حرم شریف سے متصل ہے حاضر ہوئے۔ یہاں اور مہمان بھی جمع تھے۔ بعد مغرب سرکاری موٹروں پر سب لوگ سوار ہو کر قصر شاہی تک پہنچے۔ یہ مقام مکہ کی آبادی سے ملا ہوا ہے۔ یہ ایک بہت شاندار بلند عمارت ہے۔ پھاٹک کے اندر ایک چھوٹا صحن اس میں چمن لگا ہوا ہے۔ اس چمن میں چند درخت نیم کے بہت تکلف سے لگائے ہیں۔ درخت ابھی چھوٹے ہیں بانس کی کھپاچیوں سے سنبھال کر باندھ دئے گئے ہیں اسی صحن سے زینہ ملتا ہے جس کے ذریعہ سے دوسری منزل پر گئے۔ یہاں ایک دالان سے ہو کر ایک بہت وسیع لق و دق ہال میں داخل ہوئے۔ عرب کے دستور کے مطابق دیواروں سے ملے ہوئے بلند گدے دار کوچ بچھے ہوئے تھے ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کا بوجھل ہاتھ میرے کندھے پر تھا انھوں نے باہر جو آتا دیا اور میں انکو گھسیٹتا ہوا ہال کے انتہائی داہنے گوشہ تک لیجا کر ایک کوچ پر بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں تمام ہال مہمانوں سے بھر گیا۔ پھر اور لوگ آئے تو درمیان خالی جگہ میں جہاں بہت خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا اسپر کرسیاں رکھی گئیں جب سب لوگ بیٹھ چکے تو میرے متصل اور ملحق جو کوچ اسوقت تک خالی تھا بادشاہ ابن سعود آکر بیٹھے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور تھے جو غالباً بڑے شاہزادے تھے۔ انکے ساتھ ساتھ آٹھ دس سپاہی تلواریں نیام سے

جو لوگ ادھر ادھر کھڑے ہوگئے سامنے کے کوچ کے آکران لٹکائے میں تھوں
دونش بادشاہ ۔تھے سکتے دیکھ نہیں سے وجہ کی رکاوٹ اس کو بادشاہ وہ تھے دور
شانہ یا گال کے اُن اور کرنا مصافحہ سے ان آکر نے لوگوں ۔گئے ہو کھڑے کر بیٹھ
اپنا بادشاہ کرتا رُخ طرف کی چہرہ کے اُن شخص جو ۔کیا شروع دینا بوسہ پر ہاتھ یا
یہ تک دیر تھوڑی ۔تھا جاتا ہٹ پیچھے لیکر بوسہ شخص وہ اور تھے دیتے جھکا منہ
ہاتھ نے بادشاہ ۔بڑھا آگے قدم ایک بھی میں بعد کے دیکھنے ساتھ کے دلچسپی منظر
اکتفا کیا۔ پر مصافحہ صرف نے میں بعد دیا۔
اس رسم کے بعد بادشاہ بیٹھ گئے اور ایک اسپیچ عربی زبان میں دی۔ اونکی آواز
نہایت بلند تھی اور تلفظ بہت صاف تھا۔ بادشاہ کی اسپیچ ختم ہوتے ہی ایک صاحب
ہندوستانی ملازم بادشاہ کے کھڑے ہوئے اور بادشاہ کی اسپیچ کا خلاصہ اردو میں
تشون نے بیان کیا۔ اس اسپیچ کا مضمون مختصر طور پر یہ تھا کہ میں آپ سب
صاحبان سے ملکر بہت خوش ہوا۔ مسلمانوں کو رسول کریم کے قدم بقدم چلنا چاہئے
اگر کوئی عرب طریق رسول پر نہیں ہے تو وہ میرے لئے بیگانہ اور اگر کوئی ہندی یا
افغانی یا مصری رسول اللہ کی پیروی کرتا ہے تو وہ میرے لئے بہترین انسان اور
میرا پیارا بھائی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو علوم اور فنون میں ترقی کرنے کا
حوصلہ دلایا تھا۔ اور یورپ کی ترقی علم و ہنر کی مثال پیش کی ان صاحب کے
بیٹھنے کے بعد میں فوراً کھڑا ہوا اور میں نے اردو میں اجازت چاہی کہ میں بھی کچھ عرض
کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے اشارہ بولنے کا کیا۔ میں نے پہلے اونکی دعوت کا
شکریہ ہندوستانی حاجیوں کی طرف سے ادا کیا۔ پھر یہ کہا کہ حج کا سفر ہمیشہ نہایت
خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان سے جو حاجی آتے تھے ان کے عزیز انکے مال
اور انکی جان کو صبر کر لیتے تھے۔ لیکن حکومت موجودہ بہت تعریف کی مستحق ہے
کہ مدینہ منورہ کی آمد و رفت میں کوئی کھٹکا جان و مال کا باقی نہیں رہا اور اس
سفر کو بےخطر بنا دینے میں حکومت موجودہ ہم سب حاجیوں کے نہایت شکریہ کی

مستحق ہے۔اس کے بعد دو چار منٹ اور بول کر میں بیٹھ گیا۔جب تک میں تقریر کر
رہا ایک مترجم بادشاہ کے قریب کھڑا ہو کر بہت آہستہ آہستہ عربی میں ترجمہ کر
جاتا تھا۔بعد ختم تقریر بادشاہ نے بنظر لطف میری طرف دیکھا۔اور میرے بیٹھ
ہی بادشاہ اور ان کے ساتھ ہم سب لوگ کمرہ سے باہر نکلے۔اس کمرہ میں قر
ایک ہزار آدمی کے تھے۔اندازاً قریب پانچسو کے حاجی ممالک غیر کے تھے اور
عرب اور افسران سرکاری تھے۔اس نشست میں ایک امر بہت نمایاں یہ تھا
کوئی جگہ کسی کے لئے مخصوص نہ تھی اگر ایسا ہوتا تو مجھکو اور ڈاکٹر سراج الحسن
بادشاہ سے ملے ہوئے کوچ پر بیٹھنے کا موقع نہ ملتا۔اسیطرح کھانے پر جس
جہاں جگہ ملی بیٹھا کوئی تفریق نہیں رکھی گئی۔کمرہ سے نکلتے وقت میں اور ڈا
سراج الحسن بادشاہ سے بہت دور ہو گئے۔اسوجہ سے کہ ڈاکٹر صاحب نے جوتہ غلط
سے کمرہ کے باہر اُتار دیا تھا۔وہ ٹھوکریں کھاتا ہوا بہت دور چلا گیا تھا بمشکل
سرکاری ملازم کی مدد سے ملا۔کھانے سے قبل ہاتھ دھلائے گئے۔اس کے
عمدہ صابون بہت صاف تولیے اور بڑی بڑی سلفچیاں عمدہ قلعی کی ہوئی رکھی تھیں
بادشاہ کے ملازم ہاتھ دہلاتے تھے۔کھانے سمت لانبی لانبی میزوں پر چنے ہوئے
تھے۔نشست کے لئے کرسیاں تھیں۔کُل چار صفیں تھیں۔کھانے کے کمرہ میں داخل
ہوتے ہی کچھ عجیب نقشہ پیش نظر ہوا۔پچاسوں مُسلّم دنبے آنکھیں ثابت۔دانت
مُسلّم منہ پھاڑے ہوئے بڑے بڑے قابوں میں بریانی کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔
عرب اور مصری نہایت ذوق شوق سے اوسکو اُڑا رہے تھے۔ہم لوگوں کو اس میں
کوئی مزہ نہیں ملا۔اسوجہ سے کہ نمک بالکل نہ تھا اور گھی کی خوشبو کے بجائے کچھ
ہیک چربی کی سی آتی تھی۔میٹھے چاول اچھے تھے۔کباب پھیکے۔مٹر کی پھلیاں بہت
بڑی بڑی جو یہاں کم نظر آتی ہیں۔جیلی نہایت خوشرنگ برف پر لگی ہوئی ہمارے
دوست ڈاکٹر سراج الحسن کو یہی چیز سب سے زیادہ پسند آئی۔جو عرب کھانا کھلا
تھا اوسکی طرف اشارہ کیا۔اوس نے کل کشتی سامنے رکھ دی۔ڈاکٹر صاحب نے

مسودہ ہوکر نوش فرمایا۔ پانی نہایت سرد تھا اوسمیں برف بکثرت پڑی ہوئی
مکہ معظمہ میں آجکل برف بکثرت ملتی ہے۔ عموماً ۳ ر سیر نرخ رہتا ہے۔ غرضکہ
لوگ کھانا کر فارغ ہوئے تو پھر دربار کے بڑے کمرے میں جمع ہوئے۔ ہم
ہم لوگ بادشاہ سے چار پانچ گز کے فاصلہ سے تھے۔ سب کے بیٹھتے ہی
قصیدہ خوانی شروع ہوئی۔ یہاں کے شعراء اپنے قصائد ہمراہ لائے تھے۔ عمدہ مضمون
پر تالیاں بجا کر دیجاتی تھی۔ اسی درمیان میں کئی آدمی قہوہ پلا رہے تھے۔ قہوہ
بہت گرم اور بہت سخت اور بہت تیز تھا۔ سنہرے ظروف میں جو آفتابہ کی شکل کے
قہوہ بھرا ہوا تھا۔ اور بہت چھوٹی چھوٹی چینی کی پیالیوں میں قریب تین تولہ
ایک مرتبہ میں دیا جاتا تھا مگر بار بار قہوہ پلانے والے آتے تھے اور اگر پلانے
والوں کے بعجلت ایک پیالی پی جاتی تو تین پیالیاں فی کس پی سکتا تھا۔ عرب
شعری خوب پی رہے تھے۔ مگر ہندوستانیوں نے ایک پیالی کے بعد دوسرے
قبول نہیں کیا۔ مزہ اس کا تلخی مائل اور ترخت تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عود دان
گردش کر رہا تھا۔ اس میں آگ رکھی ہوئی تھی عود سلگ رہا تھا اور اس کی خوشبو سے
کمرہ بلکہ کل ایوان شاہی معطر تھا۔ ہر ایک مہمان کے قریب عود دان لایا جاتا تھا
لوگوں نے صرف ہاتھ بڑھا کر اوس کے دھوئیں کو اپنے قریب کیا۔ عرب اپنی عبا
ہلا دیتے تھے۔ عود دان اوس کے اندر کر دیا جاتا تھا اور اس کا دھواں انکے تمام
لباس میں بھر جاتا تھا۔ قریب ایک گھنٹہ تک قصیدہ خوانی اور قہوہ نوشی کی مجلس
قائم رہی۔ اوس کے بعد بادشاہ کھڑے ہوئے اور سب لوگ رخصت ہوئے۔ واپسی
کے لئے موٹر موجود تھے۔ ہندوستان کے حساب سے قریب دس بجے رات کے
ہم لوگ عباس کے مکان پر واپس آئے۔

۷ ر ذی الحجہ۔ آج صبح کو میں ڈاکٹر حسنی الطاہر سے ملا۔ انھوں نے مجھکو دیکھتے
ہی میری اسپیچ کی تعریف کی۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ پھر میں نے بھائی صاحب کے
متعلق مشورہ کیا۔ انھوں نے بہت ہمت بڑھائی۔ کہا کہ آپ کے بھائی صاحب کو

ں سرکاری موٹر پہلے چلوںگا۔ آپ بھی اور ایک خدمتی آدمی بھی اوسی موٹر پر چل
ہیں اور یہ بھی کہا کہ برف کا انتظام میرے ساتھ رہے گا۔ انکے سر پر برابر برف
ی جاے گی اور دو سرکاری تیمار دار ہر وقت انکی خدمت کریں گے۔ عباس بھی
اہ تھے اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ موٹر عرفات تک بڑی مشکل سے جاتے ہیں۔
ستہ بہت ناہموار ہے۔ مسافروں کو بہت دھکے برداشت کرنے پڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ
ملنے ڈاکٹر طاہر سے ان دقتوں کو بیان کیا اُنھوں نے اتفاق راے کیا کہ اونٹ
سفر ایسے راستہ میں بہتر ہے۔ غرضکہ آج تیسرے پہر کو ہم لوگوں نے احرام بہ نیت
باندھا۔ ایک شبری میں لٹا کر جو بجنسہ مثل تابوت کے ہوتی ہے۔ قلیوں پر اٹھوا کر
اس کی ہمراہی میں بھائی صاحب کو طواف خانہ کعبہ کرایا گیا۔ ہم لوگوں نے بھی
واف بہ نیت حج کیا۔ تمام رات تیمارداری میں مصروف رہے آج پانچواں روز ہے
سی رات کو سونا نصیب نہیں ہوا۔ مریض کا جو عالم ہو۔ میری تو یہ کیفیت ہے کہ پیر
یوں پر سیدھے نہیں پڑتے۔ شب و روز جاگتے جاگتے۔ دماغ معطل ہو گیا ہے۔
۸ ذی الحجہ۔ صبح نور کے تڑکے اونٹوں پر اسباب لادا گیا۔ گود میں بھائی صاحب
لے کر شغدف میں لٹایا گیا۔ دوسری طرف میں بیٹھا۔ یہ معلوم ہوا کہ میری طرف
غدف الٹا آتا ہے۔ کچھ بھاری بھاری چیزیں بھائی صاحب کی طرف رکھ کر میزان
ابر کی گئی۔ قافلہ روانہ ہوا۔ ہم لوگ دوپہر کے قریب منے پہنچے۔ منےٰ ایک قصبہ ہے
بادی اس کی قریب دو ہزار کے ہے۔ صدر سڑک پر تین چار منزل کی عمارتیں مکہ
معظمہ اور مدینہ طیبہ کے نمونہ کی ہیں۔ آبادی کو طے کرنے کے بعد بڑی مسجد ملتی ہے
سکا صحن بہت وسیع ہے اس کے وسط میں ایک قبہ ہے۔ جہاں خیمہ حضور سرور
ائنات کا نصب ہوا تھا اور اسی مقام پر سورۃ والصافات نازل ہوئی تھی۔ مسجد
کے سامنے بہت وسیع میدان ہے۔ اسی میدان میں حافظ ابراہیم کے خیمے استادہ
تھے۔ ہم لوگ اونٹوں سے اتر کر خیمے میں مقیم ہوئے۔ اس میدان کے ہر دو جانب
پہاڑ ہیں اور میدان کی وسعت میں خیموں کا ایک بہت بڑا شہر آباد تھا۔ شام تک

ائی صاحب کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ بخار تیز چڑھا ہوا تھا۔ سر پر برف
ر روغن گل برابر رکھے جاتے تھے۔ عصر اور مغرب کی نماز بڑی مسجد میں پڑھی ہاں
سجد کے دروازے پر دور تک حاجیوں نے بول و براز کرکے آمد و رفت کا راستہ
راب کر رکھا تھا۔ مسجد کے اندر کم از کم دو ہزار حاجی ٹھہرے ہوئے تھے۔ پکتر کے
ڑے ہونے کی جگہ پر میں نے نماز ادا کی۔ مغرب کے وقت یہاں سے روانگی ہوئی قریب
ین گھنٹہ رات گذرے ہملوگ مزدلفہ کے مقام سے گذرے۔ اس سے ذرا آگے بڑھ
کر حافظ ابراہیم صاحب معلم نے فرمایا کہ اسی مقام پر اصحاب فیل کا لشکر جو مکہ معظمہ پر
ملہ کرنے جا رہا تھا تباہ ہوا تھا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر مجھ کو نیند آگئی اور ایسی گہری
یند آئی کہ شائد عمر میں اس سے قبل کبھی نہیں آئی۔ نہ شغدف کی میزان کا خیال رہا
نہ بھائی صاحب کی تیمارداری کا۔ جب قافلہ آدھی رات کے بعد عرفات کے میدان
میں پہنچا تو عباس نے اور میرے رفقا نے مجھ کو پکارنا شروع کیا۔ کئی آوازوں کے
بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ بایاں گھٹنا شغدف کے رستے سے چپک گیا ہے اوسکے
علیحدہ کرنے میں سخت درد ہوا۔ بمشکل اپنا پیر علیحدہ کرکے اونٹ سے اتر کر گھٹنہ دیکھ
تو ایک روپیہ کے برابر گھٹنہ کی کھال چھل گئی تھی۔ خون نکل رہا تھا۔ اسی وجہ سے
گھٹنا رستے سے چپک گیا تھا۔ اسقدر گہری نیند پر تعجب ہوا۔ بھائی جان پر ہاتھ
رکھ کر دیکھا بے حس و حرکت تھے۔ میں بہت ڈرا۔ نبض دیکھی تو کمزور ضرور تھی مگر
بخار کا پتہ بھی نہ تھا۔ سجدہ شکر بجا لایا۔ شغدفوں کی قطار بنائی گئی۔ اوسکے سامنے
خیمے نصب کئے گئے اونمیں ہم لوگ مقیم ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے تمام میدان عرفات
میں خیموں کا ایک بڑا شہر آباد ہو گیا۔ یہاں پر کیمپ کسی خاص نقشے کے مطابق
نہیں بنائے جاتے۔ درمیان میں باقاعدہ راستے اور چوراہے نہیں قائم کئے جاتے
ہزاروں خیمے ایک نمونہ کے نصب ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے
اگر کوئی حاجی اپنے خیمہ سے ذرا فاصلہ پر گیا تو پھر لوٹ کر اسی خیمہ میں آنا محال
ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ مشہور ہے کہ عرفات کا بھولا واپسی پر منیٰ میں ملتا ہے۔

۲۸ اپریل ۱۹۳۱ء۔ صبح نو بجے کے قریب سامنے عرفات کا بلند پہاڑ نظر پڑا اور اسکے
دامن میں ایک پلیٹ فارم پر ایک پتھر کا کھمبا چونے سے رنگا ہوا نظر آیا۔ یہی وہ مقام
ہے جہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ فرماتے تھے۔ اس مقام کو
دیکھ کر دل نہایت بےچین ہوا۔ افسوس صد افسوس کہ اب کوئی ایسا نہیں ہے جو
مسلمانوں کی رہبری اور فلاح وبہبودی کا وعظ موجودہ ضروریات کے مطابق
اس مقام پر دے اور یہاں سے بذریعہ براڈکاسٹ کے وہ خطبہ تمام دنیا میں
سنا جائے اور اوس سے فائدہ دین و دنیا کا حاصل ہو۔ تمام دن حاجی اپنے کھانے
پینے کے سامان میں مصروف نظر آئے۔ سیکڑوں دنبے کاٹے گئے۔ مزے مزے کے
کھانے پکتے رہے خوب ذوق شوق سے کھانے کھائے گئے۔ آپس میں خوب گپیں
رہیں اور باتوں باتوں میں اکثر تکرار لفظی کی نوبت پہنچتی۔ خاص خاص ہستیاں
ایسی ضرور تھیں کہ وہ تسبیح خوانی میں مصروف نظر آئیں اور بہت کم ایسی ہستیاں تھیں
جن کے سامنے اسلام کا گذشتہ موجودہ اور آئندہ مرقع موجود تھا۔ بہرکیف عصر کے
قریب ہمارے معلم صاحب نے دعاے توبہ پڑھوائی۔ برائیوں سے بچنے کی نصیحت کی
دل سے بغض و عداوت دور کرنے کا حکم دیا۔ بعد ختم دعا ہم لوگ خوب روئے اور
آپس میں گلے ملے یا مصافحہ کیا اور ایمان تازہ کرکے واپسی کے لئے تیار ہوئے مغرب
سے ذرا قبل عرفات کے پہاڑ اور منبر نبوی پر ہزاروں حسرت کے ساتھ نگاہ ڈالتے
ہوئے عرفات کے میدان سے واپس ہوئے۔

عرفات سے واپسی کے وقت جو ہل چل مچتی ہے۔ اس کا اندازہ بہت محال ہے
اونٹوں کی سیکڑوں قطاریں۔ پیادہ اور خچر سوار آدمیوں کی کثرت شغدفوں
کا ایک دوسرے سے ٹکرانا۔ ہر قدم پر اُلٹنے کا اندیشہ۔ چوٹ کا ڈر۔ گرد و غبار سے
سانس کا رکنا۔ غرضکہ اسی عالم میں آدھی رات کے قریب مزدلفہ پہنچے اور ایک نہایت
ناہموار کنکریلے مقام پر ہمارا قافلہ اُترا اور آن کی آن میں اس گھاٹی میں قدم رکھنے کی
جگہ باقی نہ رہی۔ ایک مختصر جگہ میں ہم لوگوں نے آدھی رات کے وقت نماز مغرب و

...ادا کی اور کنکریاں چننے میں مصروف ہوئے۔ ادنچاس کنکری اپنے لئے اچھایاں ...ی صاحب کے لئے چنکر احرام کے کونہ میں احتیاط سے باندھا کیونکہ ڈاکٹر ...اج الحسن نے یہ مسئلہ بتلایا کہ اگر کنکریاں کم ہوں گی تو پھر اسی مقام پر اگر اور ...ریاں لیجانا پڑیں گی اور اگر زیادہ ہوں گی تو پھر یہاں واپس آکر اسی مقام پر ...پھینکنا پڑے گا۔ غرضکہ بمشکل دو گھنٹہ آرام کے بعد پھر روانگی کے لئے ہل چل مچی صبح ...نماز کی تیاری شروع ہوئی۔ نماز صبح اول وقت پڑھ کر ہم غفر منیٰ کی طرف ...روانہ ہوا۔ دو گھنٹہ دن چڑھے بقرعید کے روز منیٰ کے قریب کی گھاٹی میں پہنچے ...یہاں پر شغدفوں کا ٹکرانا اور چوٹیں آنا ایک معمولی بات ہے۔ ہم لوگ بفضلہ محفوظ ...ہے لیکن بہت سہمے ہوئے تھے۔ دو ایک حاجیوں کی نسبت سنا گیا کہ گرے اور ...سخت چوٹیں آئیں۔

۲۶ اپریل ۱۹۳۰ء۔ قریب ڈھائی گھنٹہ دن چڑھے منیٰ میں پہنچ گئے۔ وہ میدان ...یہاں پہلے قیام ہوا تھا۔ اب خالی نہ تھا۔ اوس سے ملا ہوا ایک پختہ تالاب ترکوں ...نے بنوایا ہوا ہے اوسی کی دوسری جانب ہم لوگ خیمہ زن ہوئے۔ اس تالاب میں پہلے ...کے وقت میں پانی بھرا رہتا تھا اور نہایت کارآمد تھا اب یہ بالکل خشک ہے اور اسکے ...اندر اور اطراف میں بول و براز سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ اسکے متصل ایک کنواں ہے ...اسکا پانی بہت اچھا ہے مگر کوئی حاجی ڈول رسی سے خود پانی نہیں بھر سکتا کنوئیں ...کے مالک کا پہرہ ہے وہ مزاحم ہوتا ہے یا قیمت پانی کی لیتا ہے۔ ایک کنستر پانی کی ...قیمت ۳ سے ۱۲ قرش تک ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امسال پانی بہت ارزاں ہے۔ ہم لوگ ...منیٰ میں اترتے ہی شیطان پر کنکریاں مارنے کے لئے روانہ ہوئے۔ پہلے روز بڑے ...شیطان پر سات کنکریاں۔ دوسرے روز بڑے شیطان اور دو اور چھوٹے شیطانوں ...پر سات سات کنکریاں یعنی کل اکیس کنکریاں اور اسیطرح تیسرے روز اکیس کنکریاں ...ماری جاتی ہیں۔ کنکریاں مارنے کا نظارہ بھی قابل دید ہوتا ہے۔ خاصکر جب کوئی ...کنکری کسی حاجی کے سر پر پڑتی ہے۔ جہانتک یاد ہے ایک کنکری ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کے بھی پڑی تھی

شیطان نام ہے دیوار کے ایک حصہ یا ایک پتھر کے ستون کا جس پر کنکریاں مارتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم کو شیطان بہکانا چاہتا تھا۔ اور انھوں نے کنکریاں اس پر ماریں تھیں۔ حضرت ابراہیم نے منےٰ کی کنکریاں ماری تھیں یا مزدلفہ سے کنکریاں لا کر منےٰ میں شیطان پر ماری تھیں۔ اسکا حال نہیں معلوم ہو سکا یہ تینوں شیطان منےٰ کی صدر سڑک پر واقع ہیں۔

پہلے ہی روز کنکریاں مارنے کے بعد ہملوگ حجامت بنوا کر غسل کر کے احرام سے باہر ہوئے۔ عباس اور حسن ابراہیم نے آکر قربانی اور دم کے واسطے۔ جانوروں کی قیمت اپنے حاجیوں سے وصول کی بعض حاجی خود قربانی کی مقررہ جگہ پر جا کر اپنے ہاتھ سے قربانی کرتے ہیں اور بہت سے اپنا اپنا نام اور ولدیت لکھوا دیتے ہیں اور معلم صاحب اونکی طرف سے قربانی کر دیتے ہیں۔ قربانی کے بعد جب کیمپ کی طرف نظر پڑتی ہے گوشت اور کلیجی پکانے میں تمام حاجی اور معلم صاحبان مصروف نظر آتے ہیں اور بڑا حصہ گوشت کا معلم صاحبان اپنے گھر والوں کے خرچ کے لئے مکہ معظمہ روانہ کر دیتے ہیں

منےٰ میں دن کے وقت خیمہ کے نیچے جو گرمی ہوتی ہے اوس کا اندازہ مشکل ہے اسیطرح شام ہوتے ہی جیسی عمدہ خوشگوار اور خنک ہوا شروع ہوتی ہے اور رات بھر چلا کرتی ہے وہ کہیں اور نصیب ہونا محال ہے۔

۳۰ اپریل ۱۹۳۱ء۔ بقر عید کے دوسرے روز سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ ہملوگ شیطانوں کو کنکریاں مارنے گئے۔ وہاں سے آکر پھر قربانی کا سلسلہ جاری ہوا اوس کے بعد اوس لو اور دھوپ میں گوشت اور کلیجی پکنے کی بہار قابل دید تھی عین ظہر کے وقت جب گرمی کی شدت سے ہملوگ تلملا رہے تھے ایکبارگی ہوا کا ایسا تیز جھونکا آیا کہ ہمارا خیمہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر معہ چوب اور ستر میخوں کے دور جا پڑا اور یکایک ہملوگ چٹیل میدان کی تیز دھوپ میں بیٹھے نظر آئے۔ سخت حیرت ہوئی کہ خیمہ کیا ہو گیا۔ ذرا حواس بجا ہوئے تو دیکھا ہمارا خیمہ کچھ دور کے فاصلہ

پر پڑا ہوا ہے۔ ہمارے معلم صاحب کے صاحبزادے اور ملازمین دوڑے اونھوں
نے فوراً اس کو بدستور سابق نصب کر دیا۔ خیمہ کا درمیانی چوب قریباً بارہ فیٹ
اونچا تھا اور اوس کی لکڑی کا قطر ۴ انچ سے کم نہ تھا اللہ نے بڑا فضل کیا کہ ہم لوگوں
میں سے کسی کے چوٹ نہیں لگی۔

منٰی کے قیام میں ایک نظارہ بہت دلسوز نظر آتا ہے وہ یہ کہ دن بھر کچھ کچھ
وقفہ کے بعد حاجیوں کی میت سامنے سے گذرتی ہے ایک تابوت پہ سرخ کپڑا
سرکاری پڑا ہوا جس کے سرھانے اور پائنتی کی طرف سے میلا کفن نظر آتا ہے
صرف دو قلی سرکاری اپنے سر پر تابوت رکھے ہوئے تیزی سے چلے جاتے ہیں
نہ کوئی حاجی میت کے ساتھ ہوتا ہے نہ کوئی شخص کندھا دیتا ہے۔ یہی مزدور
مقام مقررہ پر لیجا کر اوسکا گور گڑھا کر دیتے ہیں۔ جب مقام پہ ہزاروں آدمی اپنا
اپنا ایمان تازہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہوں وہاں مسلمان حاجی کی میت اس شان سے
اُٹھنا ایک عبرتناک منظر ہے۔

یکم مئی ۱۹۳۱ء۔ بقر عید کے تیسرے دن صبح تڑکے شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے
بعد مکہ معظمہ کی طرف روانگی شروع ہو جاتی ہے کیونکہ اسی روز عصر کے وقت تک طواف
کعبہ اور صفا مروا دوڑنا لازمی ہے۔ یہ وقت بھی منٰے میں بڑی ہل چل کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر
سراج الحسن اور چند رفقاء کنکریاں مارکر واپس نہیں ہوئے تھے کہ ہمارے اونٹ
سے روانہ کر دیئے گئے اور پروگرام یہ طے پایا کہ بڑے شیطان سے آگے بڑھ کر اونٹ
روکے جائیں گے اور سب حاجی اپنے اپنے اونٹ پر آکر سوار ہو کر مکہ معظمہ روانہ ہو
ہمارے قافلہ کے اونٹ جس راہ سے گذرے وہ تنگ تھی۔ اوس کے ایک جانب
موٹر کار سرکاری رکے ہوئے تھے دوسری جانب دیگر قافلوں کے اونٹ کھڑے
تھے۔ جیسے ہی ہمارے اونٹ موٹروں کے پاس سے گذرے کہ ایک موٹر والے
اپنے موٹر کا ہارن بجایا۔ اس کی ہولناک آواز سے اونٹ ایسے بچکے اور اسطرح کود
اور اُچکنے لگے کہ سخت چوٹ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ علی ملازم معلم صاحب میرے شغدف

ما اُس کو ہر چند آوازدی مگر اوس کا پتہ بھی نہ تھا۔ میں تو منزہ کو دیکھتا لیکن
احب جو دوسرے شغدف کے اندر انتہائی ضعف اور پریشانی کے عالم میں
نے تھے انکا خیال میرے کو دلنے کا مانع رہا۔ غرضکہ قریب پندرہ منٹ
اس خطرہ کے مقام سے قافلہ آگے بڑھا اور مقررہ مقام پر پہونچکر اونٹ
لئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر سراج الحسن صاحب اور دیگر رفقاء سفر آپہونچے
ے آنے پہ معلوم ہوا کہ دو اونٹ کم ہیں یعنی موٹر سے بھڑکنے کے وقت وہ پیل
معہ اسباب نہ معلوم کس طرف روانہ ہوگئے۔ یہ دونوں اونٹ الہ آباد اور رام پور
زں کے تھے۔ وہ بیچاریاں اوسی جگہ بٹھلائی گئیں اور اسحاق ابراہیم اپنے گدھے
م صاحب کے ملازمین منے کی طرف معہ ایک اونٹ والے کے تلاش میں روانہ
اور سب حاجی اپنے اپنے اونٹوں پہ بیٹھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب اپنے
پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کا ہینڈ بیگ بھی اوسی ہل چل کے وقت گرگیا عباس
نے اسکی تلاش کے لئے بھی آدمی روانہ کئے مگر ہینڈ بیگ آجتک نہیں ملا ہر چند
نظمہ پہونچکر اونٹ والوں کے چودھری پہ بہت تاکید کیگئی اور ڈاکٹر صاحب
م صاحب کی معرفت حکومت میں اس کی رپورٹ بھی لکھوائی۔
نکہ ہم لوگ قریب دوپہر کے اپنے گھر پہنچے بھائی جان کو گود میں کرکے اپنے کمرہ تک
اور ذرا دم لے کر خانہ کعبہ کے طواف کے لئے گئے۔ اوس سے فارغ ہوکر صفا مروا
۔ شام کو قبل عصر شبری کے اندر لٹا کر بھائی صاحب کو طواف کرایا گیا اور اسیطرح
روا دوڑا گیا۔ ہملوگ کل ارکان حج سے بحمداللہ فارغ ہوگئے۔
کے مجمع کے متعلق کوئی صحیح تعداد دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جہازوں کے
ور حرم شریف کے اندر جمعہ کی نماز میں حج سے تین چار روز قبل اور عرفات اور
ں جو اندازہ میں نے کیا اوس سے میری رائے میں بیس پچیس ہزار آدمی سے زیادہ
تھے۔ جاوہ کے مسلمان بہت آتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جب تک حج سے فارغ نہ
ں ان کی شادی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ قدوقامت میں عموماً بہت مختصر اور ہلکے

چھلکے ہوتے ہیں۔ ان کے کپڑے اور سامان عموماً بہت صاف ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کم سخن ہوتے ہیں۔ تعداد ان کی قریب سات ہزار کے تھی۔
مصری مسلمان نہایت تنومند۔ صاف ستھرے۔ کم سخن مگر اشتعال پذیر گوسے چڑھے ہوتے ہیں۔ عورتیں ان کی گراں ڈیل۔ ہاتھوں اور چہرے پہ گدنا گدائے ہوئے ہوتی ہیں۔ تعداد اونکی قریباً چار ہزار۔ مراکو کے مسلمانوں کو یہاں مغربی کہتے ہیں مصریوں سے مشابہ مگر لباس نیز کچھ مختلف۔ ان کی تعداد مشکل سے ایک ہزار ہوگی ہندوستانی مسلمان قریب آٹھ ہزار کے ہونگے۔ انمیں بنگالی مسلمان عموماً اوس نسبت کے ہوتے ہیں جو بہت میلے اور لڑاکا اور ضدی ہوتے ہیں۔ سندھی مسلمان زیادہ نیک معلوم ہوتے ہیں۔ افغانی قریب پانسو کے ہوں گے۔ یہ لوگ شور غل بہت مچاتے ہیں۔ لباس بہت کثیف پہنتے ہیں۔
بخاری جن میں تاشقند اور یارقند کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ شکل صورت میں افغانیوں سے مشابہ لیکن ان سے کچھ زیادہ مہذب اور صاف ہوتے ہیں۔ باقی تعداد زیادہ تر قرب و جوار کے غریب عربوں کی تھی۔ یہ لوگ انتہائی غربت کی حالت میں نظر آتے تھے۔ شامیوں اور ترکوں کا کوئی قافلہ باضابطہ جیسے کہ آتا تھا نہیں آیا۔ لیکن شامی اور ترک اکثر نظر آئے۔ مرد عورتیں نہایت سرخ سپید اور صاف ستھرے تھے۔
<u>۲ مئی سے ۶ مئی ۱۹۳۱ء تک</u>۔ ۱۳ سے ۱۸ ذی الحجہ۔ اب ہم لوگ مکہ کی سیر۔ تحائف اور تبرکات کے خریدنے اور اوقات مقررہ پر حرم شریف میں نماز ادا کرنے اور طواف کعبہ میں معروف ہیں اور ہر وقت عباس اور حسن ابراہیم سے تقاضا ہے کہ جدہ کی روانگی کی فکر کریں۔ منشی احسان اللہ صاحب نائب کونسل جدہ پہلی مرتبہ قبل حج جب مکہ معظمہ آئے تھے تو اونسے بھی میں ملا تھا۔ نہایت تپاک اور اخلاق سے پیش آئے تھے۔ انھوں نے بھی عباس سے تاکید کردی تھی کہ ڈاکٹر صاحب بعد حج جلد جدہ روانہ کر دینا۔ غرضکہ ۵ مئی کو معلوم ہوا کہ ہم لوگ کل جدہ روا

وستھے۔ بھائی صاحب کی انتہائی کمزوری کی وجہ سے مجھکو فکر ہوئی کہ مدکیٹ تک بھائی صاحب
دعویہ پر جانے اور وہاں گھنٹوں قیام اور انتظار کرنے میں سخت تکلیف ہوگی اگر خلاف
اعدہ عام مجھ کو خاص طور پر اجازت ملجاتی تو ایک عمدہ چھوٹا موٹر میں اپنے مکان سے
بھائی صاحب کو سوار کراکر جدہ لیجاتا۔ چنانچہ اسی خیال سے میں ڈاکٹر حسنی الطاہر کے
پاس گیا۔ بہت تپاک سے ملے۔ معانقہ کیا۔ فرمانے لگے کہ عرفہ کے میدان میں بہت دو
ر آپ کو تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔ کہیں پتہ نہ چلا۔ بہت سی برف بھائی شوکت حسین
کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھے رکھا۔ اونکی طرف سے اتنا اندیشہ تھا کہ جب کوئی رلوہ
فوتی کی ہوتی تو میں غور سے نام پڑھ لیتا تھا کہ کہیں آپ کے بھائی کے انتقال کی
خبر نہ ہو الحمدللہ کہ وہ بخیریت واپس آئے۔ اب کیسے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت اچھے
ہیں۔ لیکن کمزور ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے موٹر کے لئے خاص اجازت ہو جائے
کہ مکان تک آکر ہم کو سوار کر کے جدہ لیجائے۔ انھوں نے فوراً سپرنٹنڈنٹ پولیس
نام خط لکھکر مجھکو دیا اور کہا کہ باہر تک پہنچانے کے لئے آئے اور بہت محبت او
دلسوزی کے ساتھ رخصت کیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا خط لیکر سپرنٹنڈنٹ پولیس
کے دفتر گیا۔ انھوں نے فوراً ایک دستی تحریر اجازت موٹر کی نسبت لکھ کر مجھ کو دی
یہ سرٹیفکٹ عباس کی معرفت موٹر والے کے پاس بھیجدیا گیا۔ مکان آکر جو سامان
موٹر پر لیجانے کے قابل نہ تھا۔ دوسرے حاجیوں کے سامان کے ہمراہ اونٹوں
جدہ روانہ کیا گیا اور مختصر سامان کے ساتھ ہم لوگوں نے رات بسر کی۔

۶ رمئی ۱۹۳۱ء۔ بہت سویرے حرم شریف میں حاضر ہوئے۔ نماز پڑھی طواف ال
سے فارغ ہوئے۔ خانہ کعبہ اور کل حرم شریف پر حسرت اور ارمان کی نظر ڈالتے ہوئے
اور الوداع کہتے ہوئے الٹے پیروں باب الوداع تک آئے۔ پھر اپنے گھر ہو کر
ناشتہ کیا۔ ہمارے ساتھی سب لاریوں پر سوار ہونے کے لئے مدکیٹ کی طرف ٹانگ
روانہ ہوئے۔ ہمارا موٹر دروازہ پر آلگا۔ حافظ ابراہیم صاحب معلم سے رخصت ہ
ہو کر اور بھائی صاحب اور مسٹر عبدالرحمن اور ایک رفیق سفر موٹر میں بیٹھ کر رخصت

گیٹ پر عباس اور ان کے سب بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب ہم لوگوں کو
مت کرنے کے لئے یہاں تک آئے تھے۔ عباس اور حسن ڈاکٹر سراج الحسن صاحب
قافلہ کے ساتھ جدہ تک چلیں گے۔ ہمارا موٹر چند منٹ قیام کے بعد روانہ ہوا
پہلی چوکی پر جانچ پڑتال میں قریب بیس منٹ کے صرف ہوا۔ یہاں سے جدہ
کا راستہ نہایت سہولت اور تیزی سے طے ہوا۔ موٹر نہایت عمدہ اور نیا تھا کئی
ریاں ریگستان میں پھنسی ہوئی ملیں مگر ہمارا موٹر بہت آسانی سے گذرتا ہوا قریب
گھنٹہ دن چڑھے جدہ پہنچ گیا۔ یہاں مین بازار میں ہم لوگ موٹر سے اتر کر ایک
روپیہ کرکے کرایہ کے مکان کی تلاش میں نکلے کیونکہ مسافر خانہ حاجیوں سے بھرا
ہوا تھا اور آتے وقت یہاں پر قیام کرنے میں جس قدر تکلیف ہوئی تھی اس کو پھر
برداشت کرنا منظور نہ تھا۔ مجتبے شلبی کے مکان پر ہم لوگ تین روپیہ روزانہ کرایہ پر ٹھہرے
یہاں سے سمندر نظر آتا ہے۔ اس مکان میں ایک چھت ہے۔ جہاں رات کو ہم لوگ
آرام سے سوتے ہیں۔ دس بجے رات کو ڈاکٹر سراج الحسن صاحب بہمراہی عباس
پہنچے۔ چونکہ ہمارا کمرہ مختصر تھا لہذا انھوں نے دوسرا کمرہ لے لیا۔ جدہ میں پانچ روز
تمام قیام رہا۔ مجتبے شلبی ایک غریب آدمی ہے۔ ٹھیلہ چلاتا ہے۔ مگر اس کے مکان کا
کمرہ جس میں ہم لوگ ٹھہرے تھے ایسا ستھرا اور آراستہ تھا کہ یہاں عموماً سو روپیہ مہینہ
پانے والے کا بھی نہیں ہوتا۔ اس کے دو بیویاں تھیں اور اس قدر میل و محبت سے رہتی
تھیں کہ اسکی نظیر ہندوستان میں ملنا محال ہے۔

۱۰ مئی ۱۹۳۱ء کو معلوم ہوا کہ جہاز سروستان کل روانہ ہوگا۔ ہم لوگوں نے رات کو
اسباب ٹھیک کرنے کے بعد ذرا آرام کیا۔ آفتاب نکلنے سے دو گھنٹہ قبل مسافر خانہ
۱۱ مئی ۱۹۳۱ء پہنچے وہاں ڈاکٹر سراج الحسن اور دیگر ہمراہیوں کو بیدار کیا۔ عباس
نے اسباب بندرگاہ پر روانہ کیا۔ ہم لوگ آفتاب نکلنے سے قبل ایک موٹر بوٹ پر بیٹھے
عباس ہم لوگوں سے رخصت ہوتے وقت بہت آبدیدہ ہوا۔ آفتاب نکلتے نکلتے موٹر
بوٹ روانہ ہوا۔ ہم لوگ آناً فاناً جہاز سروستان پر پہنچ گئے۔ بھائی جان اب لیف

کچھ کچھ اپنے پیروں میں چل پھر لیتے ہیں وجہاز پر اُن کے آرام کا انتظام کر کے اسباب کی کشتی کا انتظار کرتے رہے۔ قریب ۵ گھنٹہ دن چڑھے اسباب کی کشتی پہونچی اور دیگر رفقائے سفر بھی اسی کشتی پر آ گئے۔ شام تک دھوپ میں جز ثقیل کے پاس کھڑے ہو کر اپنے اسباب کے انتظار اور اس کے نکالنے میں معروف رہے بمشکل نشست کی جگہ محفوظ کی۔ ہمارے چاروں طرف افغانی اور بخاری حاجیوں کی اتنی کثرت تھی کہ واپسی کے سفر میں کپتان صاحب کا روزانہ گشت جو معمولاً ہر طرف ہوتا تھا۔ ادھر اتفاق سے بھی نہیں ہوا۔ جن لوگوں کو سب لوگ بخاری کہتے ہیں یہ عموماً چینی ترکستان یعنی یارقند اور تاشقند کے باشندے ہوتے ہیں۔

روانگی جدہ سے دوسرے روز جہاز کے خلاصی دو تین پیچھے کشتی کے ہماری نشست کے قریب بھیلے سے چھوڑ گئے تھے اسی پر ایک پنجابی مسلمان حاجی آکر کھڑا ہوا۔ یہ بیچارہ بہت علیل تھا اور اس کو سلسل بول کا مرض تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے پیشاب کیا اور کشتی کے پیچھے پیشاب سے تر ہو گئے۔ لوگوں نے اس کو پیشاب کرتے دیکھا تو اس مقام سے کھینچتے ہوئے دور لیجا کر چھوڑ آئے۔ ایک بخاری صاحب اپنی جگہ سے اٹھے۔ کشتی کے پچھوں کو لپیٹا اور ... بیچ جھول کر اپنے کپڑوں کے اندر اس کو احتیاط سے رکھ لیا۔ اس منظر سے سخت عبرت ہوئی۔ یہ شخص ابھی حج کر کے آ رہا ہے اور نیت کا یہ حال ہے۔

آمد کے وقت حاجی زیادہ تر مرض ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور چار پانچ موتیں روز ہونے لگیں۔ ایک بڑھیا ہیضہ سے قریب المرگ تھی۔ میں نے چار روز برابر ایمی ٹین کا انجکشن دیا مرض جاتا رہا۔ ایک افغانی بوڑھا آدمی بہت بیمار تھا اس کے رفیق اسکو جہاز کے اسپتال میں پہنچا آئے تیسرے روز ہم لوگوں نے دیکھا کہ اسپتال کے قلی اس کو افغانی قافلہ کے درمیان لٹا کر چلے گئے۔ اس کی حالت نہایت خراب تھی سسک رہا تھا۔ اس کے رفیق اس کے قریب بیٹھکر قرآن پڑھنے لگے۔ قریب شام اس کا انتقال ہوا۔ افغانیوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ نماز میں ہم لوگ بھی شریک

ہوئے۔ جہاز سے کفن ملا۔ اوس کو جنازہ تختہ پر رکھ کر سمندر کے نذر کیا گیا۔
شام کو ڈاکٹر صاحب جہاز سے ملاقات ہوئی میں نے بہت اعتراض کیا کہ ایسی حالت
میں مریض اسپتال سے کیوں نکالا گیا۔ کوئی معقول جواب نہ ملا۔ ہر روز صبح کو بیماروں
کا مجمع میرے قریب ہوجاتا تھا اور میں اپنے پاس سے دوائیں تقسیم کرتا تھا۔ ایک
بخاری کو یرقان ہوا میں نے دوا دی تیسرے روز اسکو افاقہ ہوا۔ اُس کے ساتھ
ایک ضعیف العمر آدمی تھا۔ اوس نے پانچ روپیہ نذر کئے میں نے شکریہ کے ساتھ
واپس کیا اور کہا کہ صرف دعاے خیر چاہتا ہوں اس جملہ کا میرے منہ سے نکلنا تھا
کہ وہ بوڑھا اور اسکے ساتھ سب بخاری کھڑے ہوگئے اور ہاتھ اٹھا کر میرے لئے
دعا کرنے لگے۔ دو تین منٹ بعد دعا ختم کی اور بیٹھ کر سب نے مصافحہ کیا اور شکریہ
ادا کیا۔

ہمارے قافلہ میں اسبارہ میں اختلاف راے تھی کہ ہم لوگ کراچی میں جہاز سے
اُتریں یا بمبئی چلیں۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کو زیادہ اصرار بمبئی چلنے کا تھا
اور وجہ اُس کی یہ تھی کہ انھوں نے بمبئی میں ایک دوکان پر اپنا پنکھا کای کو مرمت
کے لئے دیا تھا۔ اوسکو خود دیکھ کر اور امتحان کرکے واپس لینا منظور تھا۔ لیکن
اتفاق ایسا ہوا کہ اٹھارہ مئی کو چار گھنٹہ رات گذرے ایک ایسا طوفانی جھونکا
آیا کہ سارے مسافر سہم گئے۔ بجائے پہلوی حرکت کے جہاز آگے پیچھے جھونکے
کھانے لگے۔ کھانا پکانے کے برتن اودھر اودھر گرنے لگے۔ غرضکہ خدا خدا کرکے
تھوڑی دیر میں یہ طوفان پسپا ہوا۔ اب کراچی اوترنے کے لئے سب لوگ بدل
وجان راضی ہوگئے کہ خدا رات بھر کی خیر رکھے تو صبح کراچی ضرور اُتر جائیں گے
رات کو نیند بہت کم آئی۔

۱۹ مئی ۱۹۳۳ء۔ بہت تڑکے اوٹھ کر دیکھا۔ کراچی کے بندرگاہ کے سامنے ہمارا جہاز
رکا ہوا تھا۔ میں نے فوراً غسل کیا۔ نماز پڑھی۔ اسباب ٹھیک کیا۔ قریب سات
بجے صبح کے مسافر جہاز سے اوترنے لگے۔ ہم لوگوں نے اسباب قلیوں کے ذریعے

نیچے بھیجا۔ یہاں قلی نے فلعہ چار روپیہ اُجرت لی۔ آتے وقت بمبئی میں اسی اسباب کی مزدوری نو روپیہ دیگئی تھی۔
کراچی میں حج کمیٹی کا انتظام نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے اور اُن کے ممبروں کا اخلاق اور برتاؤ حاجیوں کے ساتھ نہایت ہمدردی کا ہے۔ جہاز کے پلیٹ فارم پر بہت تڑکے سے ایک بڑا مجمع اُون نیکبخت مردوں اور عورتوں کا موجود تھا جو حاجیوں کے لئے آتے تھے۔ عورتیں عورتوں کے اوتارنے میں مدد دیتی تھیں۔ ہر ایک سے مصافحہ کرتی تھیں۔ اور مرد عموماً کمزور اور ناتواں مردوں کی دستگیری کرتے تھے۔ ہم لوگ نہایت آرام سے بھیڑ کم ہونے کے بعد جہاز سے اوترے اور تلاش کرتے ہوئے اپنے اسباب تک پہونچے۔ یہاں ایک طرف حاجیوں کے لئے بہت بڑا دسترخوان بچھا ہوا تھا جہاں سیکڑوں حاجی جی کھول کر کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ہم لوگوں نے دسترخوان کی جانب بیٹھے قدمی نہیں کی مگر ہماری جگہ پر ایک سینی بھر کر نہایت عمدہ بریانی ایک صاحب لے آئے۔ اوس میں کچھ مرچ زیادہ ہو گئی اس لئے میں نے دو ہی چار لقمہ کے بعد ہاتھ کھینچ لیا لیکن اور سب ساتھی خاصکر ڈاکٹر سراج الحسن صاحب بہت دیر تک کھانے میں مصروف رہے۔ اس کے بعد برف کا پانی آیا۔ ہم لوگوں نے خوب آسودہ ہوکر پیا۔ یہ سب انتظام یہاں کے فراخ حوصلہ مسلمان حاجیوں کے ہر جہاز کے لئے کرتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں ریل کا ٹکٹ لینے کے لئے گیا۔ پندرہ منٹ بعد آیا تو دیکھا یہاں کے کسٹم آفس کا ایک انگریز ڈاکٹر سراج الحسن صاحب کی دواؤں کے بکس کا جائزہ لے رہا ہے اور دواؤں کی فہرست سے دوائیں ملا رہا ہے۔ میں نے پہونچتے ہی اوس سے انگریزی میں بیان کیا کہ ہم لوگ ڈاکٹر ہیں یہ دوائیں اپنی اور دیگر مسافروں کی ضرورت کے خیال سے ساتھ لے لی گئیں تھیں اسمیں کوکین وغیرہ نہیں ہے۔ اسپر وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا اور کل اسباب پر نشان پاس کا ڈالا گیا۔ اب میں سب اسباب اٹھوا کر ترازو پر لوالے گیا۔ وہاں اسباب تولا گیا

قریب ستر روپیہ کے محصول ادا کیا۔ اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ سامنے پلیٹ فارم پر
جو ٹرین کھڑی ہے یہی حاجیوں کی اسپشل ٹرین ہے اور ابھی فوراً روانہ ہونیوالی ہے
فوراً اس کی خبر اپنے رفقاء کے پاس بھیجی وہ گاڑی تک پہنچ گئے میں نے بعجلت
تمام اسباب درجہ تک روانہ کیا اور ہم سب لوگ فراغت سے ایک بڑے درجہ میں
بیٹھ گئے۔ اس درجہ میں بجز میرے ساتھیوں کے اور کوئی مسافر نہیں بٹھلایا گیا
کراچی میں جو انتظام حاجیوں کے اسپشل کا ہے۔ شاید اُس کی نظیر دوسری جگہ
موجود نہیں ہے۔ یعنی اس گاڑی پر بجز حاجیوں کے عام مسافر کہیں نہیں بٹھلائے
جاتے۔ ایک درجہ میں باورچی خانہ ہوتا ہے اوسمیں تازہ کھانا شوربہ دال چاول
پلاؤ وغیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ ایک درجہ میں برف سادہ پانی اور لوٹوں کے
پانی رہتے ہیں۔ ہر مقام پر جہاں گاڑی ٹھہرتی ہے اپنے اپنے درجہ میں حاجی اپنا
کھانا منگواکر کھاتے ہیں۔ قیمت نہایت معمولی رکھی گئی ہے۔ کراچی سے کئی اسٹیشن
تک دودھ کا شربت برف پڑا ہوا ہر درجہ میں لایا جاتا ہے۔ اور حاجیوں کو باصرار
اور بلا قیمت پلایا جاتا ہے۔ اس گاڑی کی رفتار مثل ڈاک گاڑی ہے۔ صرف بڑے
اسٹیشنوں پر روکی جاتی ہے اور وقت اس عمدگی سے مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ وقت
عموماً نماز کا ہوتا ہے مگر میں نے کسی پلیٹ فارم پر نماز باجماعت ہوتے نہیں دیکھی
مسافروں کے بٹھلانے میں یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ لاہور کی طرف جانے والے
حاجی ٹرین کے اگلے نصف حصہ میں بٹھلائے جاتے ہیں اور دہلی کی طرف جانے
والے مسافر پچھلے حصہ میں بٹھلائے جاتے ہیں۔

۱۰ مئی ۱۹۱۲ء۔ کمشا جنکشن پر پہونچکر لاہور کا حصہ دوسری ٹرین میں اور
بقیہ نصف حصہ دہلی کی ٹرین سے لگا دیا گیا۔ لیکن پھر بھی دہلی تک ان درجوں
میں کوئی اور مسافر بیٹھنے نہیں پاتا۔ کیونکہ ہر درجہ کے باہر حاجی اسپشل لکھا ہوا
ہے۔ کراچی سے کچھ آگے بڑھ کر ریگستان مثل عرب کے ریگستان کے ملتا ہے۔ کراچی
کے قریب بوجہ قرب سمندر کے ہوا نہایت خوشگوار تھی۔ لیکن جیسے جیسے سمندر

وتا گیا گرمی بڑھتی گئی۔ دوپہر کے بعد درجہ کے اندر کا ٹمپریچر غالباً ۱۱۸ تک ہوگیا
و گا باہر سے اسقدر ریگ اوڑ اوڑ کر درجہ کے اندر آتی تھی کہ بستر کے اوپر ایک تہ ریگ
ا جمع ہوگئی تھی۔ کسیطرح دن تمازات آئی اور سفر آرام سے طے ہونے لگا۔
۱۲ مئی ۱۹۳۱ء۔ آٹھ بجے صبح کے قریب ہم لوگ آرام سے دہلی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ
۔آباد کا اکسپریس دوسرے پلیٹ فارم پر موجود ہے۔ فوراً اسباب اتروا کر اکسپریس
پلاسٹ۔ میں نے اور ڈاکٹر سراج الحسن صاحب نے اور دو ایک ساتھیوں نے اپنے
مرول پر ارجنٹ ٹیلیگرام پہنچنے کی اطلاع کا دیا۔ دہلی سے گاڑی چھوٹی غازی آباد
کے اسٹیشن پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ دو آدمی ہمارے درجہ میں آنے کی ضد کرنے
لگے۔ ہملوگ ان کو معمولی مسافر سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن صاحب بہت کچھ
سمجھاتے رہے کہ یہاں جگہ نہیں ہے۔ ہملوگ حاجی ہیں وغیرہ وغیرہ مگر وہ لوگ
ندر گھس آئے اور فوراً میرے صندوق پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اسکو کھولو اس میں کوکین
کا شبہ ہے۔ مجبوراً صندوق کھولا۔ مگر انھوں نے کوئی چیز نہیں دیکھی صرف اپنی ضد
پوری کرتے فوراً اتر گئے۔ الہ آباد پہونچکر میں نے کمشنر صاحب بہادر اکسائز کو اطلاع
دی۔ اون کا جواب آیا کہ اس تکلیف کا افسوس ہے مگر غلط فہمی نیک نیتی کیساتھ تھی۔
ساڑھے سات بجے شام کو گاڑی فتح پور پہنچی۔ یہاں عزیز از جان مولوی انوار الحق
صاحب میرے خویش اور لخت جگر شاہد سلمہ اور میرا نواسہ انوار مصطفےٰ عرف مجن
سلمہ اور مکرمی خان بہادر عبد القیوم خاں صاحب اور مکرمی عبد الرحمن خاں
صاحب ہم لوگوں کی پیشوائی کے لئے موجود تھے۔ نہایت گرمجوشی سے معانقہ اور
مصافحہ ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ وطن میں پہنچ گئے۔ بات چیت میں راستہ کا پتہ اور بھی
نہ چلا۔ قریب دس بجے رات کے الہ آباد اسٹیشن پر گاڑی پہنچی۔ یہاں پر اعزا اور
احباب کا مجمع سیکڑوں کی تعداد میں خیر مقدم کے لئے موجود تھا۔ ٹرین کے
پلیٹ فارم کے اندر داخل ہوتے ہی اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے۔ مشکل سے
ٹرین رکنے پائی تھی کہ معانقے ہونے لگے۔ اسباب کا خیال تک باقی نہ رہا۔ اگر عزیزی

لوی انوار الحق نہ ہوتے تو میرے انگریزی پلنگ اور ہاتھ کی چھڑی کی طرح
اسباب ریل کے اندر چھوٹ جاتا۔ پھولوں کے اسقدر ہار پہنائے گئے اور
سقدر معانقے ہوئے کہ میرے حواس بجا نہ رہے۔ مکرمی خان بہادر اکرام حسین
احب کو اس کا احساس ہوا۔ انھوں نے اشارہ کیا کہ ان کو جلد اسٹیشن کے
ہر لے چلو ورنہ بیہوش ہو جائیں گے۔ عزیز مکرم ضرغام صاحب پنکھا جھلتے
ہوئے اور لخت جگر بشیر سلمہ اور ظہیر سلمہ اور سب احباب باہر تک آئے یہاں
موٹر موجود تھے اور سب بیٹھکر گھر پہنچے۔ جو عزیز عورتیں روانگی کے وقت تھیں تقریبا
وہ سب موجود تھیں۔ دونوں لڑکیوں اور سب بچوں کو گلے سے لگایا اور سجدہ شکر
خدائے پاک ذوالجلال والاکرام کا بجا لایا۔

شکر صد شکر ٹھکانے لگی محنت میری
طے ہوئی آج کی منزل میں مسافت میری

مسئلہ بقاء و اصلاح ندوہ

جناب ایڈیٹر صاحب اخبار الہلال - تسلیم !

معاملات ندوہ کے متعلق آجکل تقریباً کل اسلامی اخباروں میں جو بحث جاری ہے باوجود دیگر مشاغل ' راقم حروف نے بڑی دلچسپی کے ساتھہ مطالعہ کیا - میں اس موقعہ پر علامہ شبلی یا انکے مخالف گروہ کی تائید یا تردید کرنا نہیں چاہتا ' لیکن سلسلۂ بحث میں دو ایک باتیں ایسی پیش آگئی ہیں جنکی نسبت چند کلمے عرض کرنا ضروری معلوم ہوتے ہیں - کیونکہ انکے متعلق میرے خیال میں اسوقت تک کسی نے بے لاگ راے قائم نہیں کی ہے -

مثلاً مولوی عبد السلام صاحب ندوی نے اپنے ایک خط میں طلباے ندوہ کو اسٹرائک کرنے کی جو تحریک کی ہے اُسے تمام لوگوں نے ' عام اس سے کہ وہ مولوی شبلی صاحب کے موافق ہوں یا مخالف ' حد درجہ مذموم اور قابل ملامت فعل قرار دیا ہے - اور الہلال نے بھی سخت ملامت کی ہے -

مجھکو چونکہ بفضلہ تعالے کسی گروہ سے تعلق نہیں ہے اسلیے بلا خوف تردید و لومۃ لائم اس راے کا ظاہر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تحریک اسٹرائک کو علامۂ شبلی کے ایما سے منسوب کرنے کے سوا باقی اورکوئی بات مولوی عبد السلام صاحب کے خط میں قابل اعتراض نہیں ہے -

جو لوگ انکی تحریر کو جلوس، شکایت، یا فلسفہ پردازی قرار دیتے ہیں، انہیں پہلے یہ بات ثابت کرنا چاہیے کہ بحالت مجبوری اسٹرائک کرنا یا اسکی تحریک کرنا کوئی نامعقول فعل ہے - ہم کہتے ہیں کہ زبردست کے مقابلے میں کمزوروں کا اسٹرائک کرنا انکا ایک قدرتی حق ہے جسکو بلا دلیل ناجائز قرار دینے کا کسی شخص کو کوئی منصب حاصل نہیں - اگر کسی کو اس بات کا دعوی ہو تو وہ آگے پیش کرے - اسکا مسکت جواب دیا جائیگا - انشاء اللہ تعالے -

مولوی عبد السلام صاحب نے اسٹرائک کی جو تحریک کی تھی وہ بالکل صحیح تھی ، اور اگر وہ پختہ کار یا صاحب استقلال ہوتے تو اپنی تحریر پر اطمینان اور صداقت کے ساتھہ قائم رہ سکتے تھے - لیکن افسوس کہ اعتراض کی کثرت سے گھبرا کر انہوں نے خود ہی اپنے ایک بالکل جائز فعل کو ناروا تسلیم کرلیا - تحریک اسٹرائک کو مولوی شبلی صاحب کے نام سے منسوب کرنے کو ہم اچھا نہیں کہتے ، لیکن وہ بھی کوئی اسدرجہ مذموم فعل نہیں ہے کہ اسکی بنا پر مولوی عبد السلام صاحب پر گالیوں کی بوچھاڑ کردی جاے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اسٹرائک کے متعلق مولوی شبلی صاحب نے کوئی علانیہ ایما نہ کیا ہوگا ، لیکن فحواے کلام سے ایسا ضرور دریافت ہوسکتا ہوگا کہ مولانا اس تحریک کو قابل اعتراض نہیں سمجھتے ، جیسا کہ اب بھی انکی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بحالت مجبوری اسٹرائک کو جائز قرار دیتے ہیں - پس ایسی حالت میں اپنی تحریک کو پرزور بنانے کے لیے علامۂ شبلی کے نام کا حوالہ دے دینا گناہ کبیرہ یا کفر کی حد تک نہیں پہنچتا -

بلکہ میرا گمان تو یہ ہے کہ جو لوگ مولوی عبد السلام صاحب کو محض اس بنا پر گالیاں دے رہے ہیں وہ خود اس قسم کے گناہونکا ارتکاب بارہا کرچکے ہونگے ، اور میرا دعوی ہے کہ غالباً آیندہ

بھی ضرور کرینگے - مثال کے لیے دھلی مسلم ڈیپوٹیشن کا واقعہ کافي ہے - میں سمجھتا ہوں کہ مختلف الخیال لوگوں کو شمول ڈیپوٹیشن کي ترغیب و تحریص میں جو پرائیوٹ خطوط لکھے گئے ہونگے یا زباني گفتگو کي گئي ہوگي' اُسمیں اس سے زیادہ دروغ مصلحت آمیز حرف پیش آیا ہوگا - اور یقیناً یہ ظاہر کیا گیا ہوگا کہ خود وائسرائے کا منشا ہے کہ ایک ایسا ڈیپوٹیشن آئے' یا سر علي امام کي گفتگو سے معلوم ہوا کہ وائسرائے کي یہ خواہش ہے - وقس علی ھذا -

اصل یہ ہے کہ ہم لوگ دوسروں کي اخلاقي کمزوریوں پر طعن کرنے میں بہت بے باک ہیں لیکن خود اُسي قسم کي کمزوریوں میں مبتلا ہوجانے کیلیے بادنی تحریک آمادہ رہتے ہیں - مثلاً کیا یہ واقعہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ نواب صاحب رامپور کے ڈیپوٹیشن کے متعلق جن جن باتوں پر سنگین سے سنگین اعتراض کیے جاتے تھے' بعینہ اُسي قسم کي باتوں کي تائید میں اب جدید دھلي ڈیپوٹیشن کے ضمن میں قوي سے قوي دلائل پیش کیے جا رہے ہیں؟

اللہ تعالے مسلمانوں کو حق کي اعانت اور اسپر استقلال کي توفیق اور تلون سے احتراز کا حوصلہ عطا فرماے -

●●

ماخذ: الہلال

۱۰ جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ

نواب رائے

رہنمایانِ ہند

رہنمایانِ ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے مجھکو وہ از منہ قدیم یاد آتے ہین جنکی یادگارین تاریخ نے نہین قائم کین - اور وقتیکہ سلف کے تاریک پردہ سے واقعات کیا ہر لانیکی کوشش کرتی ہین - اور کامیاب نہین ہوتین - ایسے بزرگون کی تعداد ہمارے ملک مین بیشمار ہے - کیونکہ قدیم سے ہمارے دیس کی خاک پاک سے اہل کمال پیدا ہوتے چلے آئے ہین - اسلئے ہم انہین سے چند ایسے ممتاز مہاتماؤن کے حالات بیان کرینگے جنہون نے وقت کے صفحہ پر اپنی مہرین ثبت کردی ہین - سب سے پہلے ہم اپنی قدیم کتابون کے متعلق چند باتین کہنا ہین - ہماری کتابون مین صداقت کے دو معیار پائے جاتے ہین - اوّل جسے ازلی کہتے ہین اور جو زمان اور مکان کی قید سے آزاد - اور دوسرا اگرچہ ایسا اہم نہین ہے - مگر خاص خاص حالتون اور زمانون مین ویسا ہی حکم رکھتا ہے - قسم اوّل کی صداقتین جو اور پرماتما کی ماہیت - اور آتما اور پرماتما کے درمیان تعلقات بحث کرتی ہین وہ شرتیون مین درج ہین جنہین وید کہتے ہین - دوئم کو سمرتی کہتے ہین - جسکی تفصیل منو - یاگ بلک اور دوسرے رشیون کی تصانیف مین پائی جاتی ہے - حیاتِ انسانی کے آغاز و انجام کے بنیادی اصول ویدون مین بیان کر دئے گئے ہین

اور انکی تشریح و تفصیل سمرتیون اور پرانون کے لئے چھوڑ دی گئی
ہے۔ زندگی کے لئے عام اصول شرتیون مین کافی طور پر موجود
ہین۔ روحانیت کے متعلق وید سے زیادہ کوئی کیا کہہ سکتا ہے وہ
دیا جا سکتا ہے۔ وہ تمام ہدایتین جو روح کو عرفان تک پہونچانے
کے لئے لازم ہین شرتیون مین تکمیل کو پہونچا دی گئی ہین صرف تفصیلین
باقی رہ گئی تھین۔ اور یہ کمی وقتاً فوقتاً سمرتیون کے ذریعے سے
پوری ہوتی رہتی ہے۔ دوسری خصوصیت شرتیون کی یہ ہے
کہ جن ارباب کمال نے اُسے جامہ وجود پہنایا انکا کہین کہین ذکر
نہین آتا۔ انمین سے بیشتر مرد اور بعض عورتین بھی ہین مگر انکی
ذاتیات۔ انکی پیدائش اور سوانح پردۂ خفا مین مستور ہین لیکن
انکے بہترین گوہر خیالات۔ انکی بہترین تحقیقاتین سب ہمارے مقدس
ویدون مین محفوظ ہین۔ اسکے برعکس سمرتیون مین شخصیتین زیادہ
نمایان ہین۔ بڑے بڑے اہل کمال جو اپنی طاقت سے دُنیا کو ہلا
سکتے تھے۔ اور قوانین فطرت کو بھی پلٹ دیتے تھے۔ وہ پہلی
بار ہماری نگاہون کے سامنے آتے ہین۔ انکے ذاتی فضائل بعض
اوقات انکی تلقینات پر بھی غالب آجاتے ہین۔

ہمارے مذہب مین نرگن پرماتما اور سگن پرماتما کی یکسان
تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن شرتیان جو ہمارے مذہب کی دیوارین ہین
شخصیت سے پاک ہین یعنی وہ نرگن پرماتما کی تعلیم دیتی ہین۔ دیوتا
اور اوتار اور رشی ہمکو سمرتیون اور پرانون ہی مین نظر آتے ہین
اور یہ بھی واضح رہے کہ سوا ہمارے مذہب کے دُنیا کے کل دیگر
مذاہب اپنے بانی یا بانیون کی ذات اور شخصیت پر قائم ہین۔ ..

....

.... اسکالازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان مذاہب مین انکے
بانیون کے ذاتیات اور سوانحات کے متعلق تاریخی شہادتین
پر موجب جنگین ہوتی ہین۔ اگر کسی وقت یہ تاریخی شہادتین کمزور پڑ جائین
ان مذاہب کی ساری عمارت معرض خطر مین آجائیگی۔ ہم ا
خطرون سے آزاد ہین۔ ہمارا راستہ ان خندقون اور غارون
پاک ہے۔ کیونکہ ہمارا مذہب شخصون پر نہین بلکہ اصولون
پر ہے۔ ہم اپنے مذہب کی پیروی اسلئے نہین کرتے کہ اسکا بانی
رشی یا کوئی اوتار ہے۔ سری کرشن ویدون کی سند نہین ہین۔ بلکہ
انکی سند وید ہین۔ انکی عظمت صرف اسلئے ہے کہ وہ وید کی تعلیم
دینے والے تمام رشیون مین سب سے زیادہ ممتاز
دوسرے اوتارون اور رشیون کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارا ایمان
یہ ہے کہ انسان کی تکمیل اور تزئین۔ اور حصول نجات کے لئے
ہدایات کی ضرورت ہے وہ سب ویدون مین موجود ہین۔ ا
ایزاد یا اضافہ کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ مذہبی تعلیم
وہ جو انتہا کو پہونچ گئی جب ویدون نے مسئلۂ وحدت تو ہم اسی
ذات سب صرف انسان کو وقتاً فوقتاً زمان و مکان حالات
کے مطابق رہنمائی کرنے کی ضرورت باقی رہگئی۔ یہ بڑے بڑے
کمال رشی اسی لئے مبعوث ہوئے کہ انسان کو قدیم راستہ سے منحرف
ہونے دین۔ اور بھولے بھٹکون کو سیدھے راستے پر لگائین۔ اسی
نکتہ کو سری کرشن بھگوان نے بھگوت گیتا مین بڑی صفائی سے بیان
فرمایا ہے۔

• جب نیکی کا زوال ہوتا ہے۔ اور بدی غالب آجاتی ہے تو مین
نیکی کی حفاظت کے لئے اوتار لیتا ہون "

پس ایک طرف تو یہ ازلی اصول ہین۔ جنکی بنیادین پہاڑون
سے زیادہ مستحکم ہین۔ اور جنہین کسی رشی کی خواہ وہ کیسا ہی کامل
ہو۔ یا کسی اوتار کی خواہ وہ کیسا ہی عظیم الشان ہو۔ سہارے کی
مطلق ضرورت نہین۔ حتی کہ وہ دلیل اور مباحث کے قیود سے

بھی آزاد ہیں۔ اسی بنیاد پر ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف ویدانت ہی دنیا کا عالم مذہب ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس وقت بھی اُسے یہ فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ اصولوں کی تعلیم دیتا ہے۔ دُوسرے شخصوں کی کوئی مذہب جسکی بنیاد شخصیت پر قائم ہو کُل اقوام دنیا میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک ہی شہر کے باشندے وقت کے سربرآوردگان میں مختلف اشخاص سے عقیدت رکھتے ہیں پھر کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی شخص یا ایک ہی پیغمبر کے ساتھ ساری دُنیا کو عقیدت ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ اخلاق اور معاشرت پر اُسی ایک شخص کا قول سند سمجھا جاوے۔ ہمارے ویدانت مت کے لئے اپنے شخصی شہادت کی مطلق ضرورت نہیں جسکی سند انسان کی فطرت ہے۔ اور اُسکے اخلاقی اصول انسان کی روحانی حقیقت پر مبنی ہیں۔

مگر اسکے ساتھ ہی زمانۂ قدیم سے ہمارے رشیوں پر یہ امر روشن تھا کہ بنی نوع انسان کے ایک معتدبہ حصہ کے لئے شخصیت کی ضرورت ہے۔ اُنکے لئے کسی نہ کسی صورت میں سگن پرماتما کا ہونا ضروری ہے۔ خود بُدھ بھگوان کو جنہوں نے سگن پرماتما کے وجود سے انکار کر دیا تھا اُنکے عقیدتمندوں نے اُنکی وفات کے پچاس ہی برس بعد سگن ایشور مان لیا۔ اس سے واضح ہوا کہ دنیا میں سگن پرماتما کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مگر ایسے پرماتما کا خیالی معیار قائم کرنا انسان کے دائرہ تخیل سے بہت ارفع ہے۔ ہاں کبھی کبھی اس دُنیا میں ایسی پاک روحیں پیدا ہو جاتی ہیں جنکی عظمت کو پہنچنا ہمارے خیالی معیاروں کے لئے غیر ممکن ہے۔ یہ لوگ بمقابلہ کسی فرضی یا خیالی پرماتما کے جسے ہمارے تخیل نے بنایا ہو بدرجہا قابل پرستش ہوتے ہیں۔ سری کرشن بھگوان پرماتما کے اس خیالی معیار سے کہیں زیادہ بزرگ اور برتر ہیں جو ہم یا آپ قائم کر سکتے ہیں۔ بُدھ بھگوان اُن بلندیوں سے بدرجہا عالی اور برتر ہیں جہاں تک ہمارا طائر فکر پہنچ سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کے روبرو ساری دُنیا سر عقیدت خم کرتی ہے ہمارے رشیوں کو یہ فطرت انسانی معلوم تھا۔ اور اسی لئے اُنہوں نے بھگوان پاک روحوں کی پرستش کرنے کی پوری آزادی دیدی کرشن بھگوان خود فرماتے ہیں۔

"جب کبھی کسی ہستی میں غیر معمولی روحانی طاقت کا جلوہ دیکھو تو یقین کر لو کہ میں وہاں موجود ہوں۔ وہ طاقت میرے ہی وجود کا مظہر ہے۔"

اس لحاظ سے ہندو دُنیا کے سب اوتاروں کی پرستش کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ ہندو دنیا کے ہر ایک نبی اور ہر ایک پیغمبر کی پرستش کر سکتا ہے۔ ہمارا مذہب عام ہے۔ وہ اسقدر جامع اور وسیع ہے کہ اُسمیں عظمت کے سبھی معیار شامل ہیں۔ ویدانت کے سینۂ بے پایاں میں دنیا کے تمام موجودہ مذاہب کے لئے جگہ موجود ہے۔ اور آیندہ بھی جو مذاہب وجود پذیر ہونگے اُنہیں بھی اپنا جزو بنانے کے لئے ویدانت تیار رہیگا۔

دُنیا کی ارواح عالیہ۔ یا پرماتما کے اوتاروں کے متعلق میرے یہی خیال ہیں۔ ان اوتاروں کے علاوہ درجہ دوم کے بزرگ بھی ہوتے آئے ہیں۔ انہیں رشی کہتے ہیں۔ ہمکو ویدوں میں لفظ "رشی" باربار ملتا ہے۔ اور آجکل یہ بہت ہی عام لفظ ہو گیا ہے۔ "رشی" کے معنی ہیں خیالات کا جاننے والا۔ روشن ضمیر۔ عالم اسباب ہمکو روح اور پرماتما کے وجود۔ حیات ابدی یعنی مقصد زندگی اور ایسے ہی دیگر مسائل کے متعلق کچھ نہیں بتلا سکتا۔ وہ ہمیشہ حالت تغیر میں رہتا ہے۔ وہ محدود۔ اور اجزا میں منقسم ہے پس وہ غیر فانی۔ ازلی پرماتما سے کیونکر بحث کر سکتا ہے یہ امر نا ممکن

ایسی حالت مین دوست گیان جس سے وید لبریز ہو رہے
دنگر پیدا ہوا - جواب یہ ہے کہ رشیون کی برکت اور دیئے ہے۔
حواس ظاہر مین منحصر نہین ہے - بلکہ وجود انسانی کی علت غائی
واس ظاہر ہرگز انسان کا جوہر نہین - ہماری ہی زندگی مین جب
آنکھون کے سامنے ہمارا کوئی عزیز اس جہان سے اٹھ
ہے - یا جب ہمارے دل پر اور کوئی آفت نازل ہوتی
تو ہمارے دلون پر ایک عالم سکوت طاری ہو جاتا ہے۔
ہی اور بھی موقع آتے ہین جبکہ ہمارا دل ایک لہر کے سے
کیفیت محسوس کرتا ہے - اور اُسے نور تجلی کی ایک جھلک
نظر آجاتی ہے - رشی کا درجہ حاصل کرنے کے لیے انہین مسلسل
ریاضت اور تکمیل کی ضرورت ہے - ہندوؤن کو زمانہ قدیم سے
معلوم تھا کہ روح حواس ظاہر یا ادراک کے احاطہ مین محدود نہین
ہے ہمارے وجود کے سلسلۂ بے پایان کی ایک کڑی ہے
ہماری ہستی کا ایک جزو ضعیف ہے - اسباب کمال میدان
سے آگے بڑھنے کے لئے کمر ہمت باندھتے ہین - ادراک
حواس ظاہر کے حلقہ مین گھرا ہوا ہے - انسان کو حقائق معرفت
حاصل کرنے کے لئے اس عالم ادراک - اس احاطہ حواس
سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے - اور ہند مین آج بھی ایسے
موجود ہین جو حواس کے گھیرے سے باہر نکلنے مین کامیاب
ہوتے ہین - انہین کو رشی کہتے ہین - کیونکہ وہ روحانی حقائق
چشم باطن سے دیکھتے ہین۔

ہندوستان کی خاک سے بڑے بڑے رشی اور مہاتما
اوتار اُٹھ چکے ہین - جنمین بالخصوص دو اوتارون کی گھر گھر
پرستش کی جاتی ہے - رام اور کرشن - رام جو صداقت اور اخلاق
کے پتلے - جو بیٹے - شوہر - باپ - اور فرمانروائے قوم کے اعلیٰ نمونہ
اور بہترین مثال تھے - انکے گن رشی والمیک نے گائے ہین - جس سے
زیادہ پاکیزہ اور روشن - فصیح اور سلیس کوئی انداز بیان نہین ہو سکتا
جو اس شاعر شیرین زبان نے سری رام کے بھینٹ کیا ہے - اور
مہارانی سیتا کا کن الفاظ مین ذکر کیا جائے - ساری رامائن کی
داستان اسے پڑھ کا مطالعہ کر جاؤ - مگر تمہین دوسری سیتا ہرگز
نہ ملیگی - اور مین تمہین یقین دلاتا ہون کہ آئندہ زمانہ مین
بھی شعرا کے دماغ اور قلم تمہارے سامنے کوئی ایسی مثال ہرگز
نہ پیش کر سکینگے - سیتا یگانۂ روزگار ہے - رام شاید کئی ہو گزرے
ہین - مگر سیتا واحد ہے - اسکا کوئی جواب نہین - ایک کامل
ہندوستانی عورت مین جو اوصاف ہونے چاہئین وہ سب
سیتا کی ذات مین مجتمع ہو گئے ہین - اور سارے بھارت ورش
مین آج ہزارون برسون سے اس دیوی کی ہر فرد زن اور
بچہ پرستش کرتا چلا آتا ہے - یہ شاندار سیتا - یہ پاکیزگی سے
بھی زیادہ پاک سیتا - یہ صبر اور علم کی مورت ہمیشہ ہماری دیوی
بنی رہیگی - وہ جسنے زندگی کی کڑی مصیبتین جھیلین - اور چہرہ پر
میل نہ آنے دیا - وہ عفت اور عصمت کی تصویر - وہ خلق اللہ
کی دیوی - وہ دیوتاؤن کی ماتا - اسے ہم ابد تک اپنی قومی دیوی
مانتے رہینگے - اُنکے کمالات سے ہم سب واقف ہین - اور اُنکے
اعادہ کی یہان ضرورت نہین ہے - ہماری تمام پرانی کتابین مٹ
جائین - ہماری وید صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائین - اور سنسکرت
زبان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے - لیکن جبتک دنیا مین
پانچ ذی روح بھی ہندوؤن کے نام لیوا باقی رہینگے اسوقت
تک مہارانی سیتا کا نام برقرار رہیگا۔

اب ہم اُس مہاتما کا ذکر کرتے ہین جسکی اُپاسنا ممکن ہے گھر گھر
مین کیجاتی ہے - جو ہر مرد و زن اور برنا و پیر کا پیارا دیوتا ہے

میرا مطلب اس بزرگ سے ہے جنکی نسبت سری بیاس جی فرماتے ہین" دوسرے اوتارون مین پرماتما کے کچھ انش پائے جاتے ہین - مگر مہاراج سری کرشن شاکشات ایشور تھے" انکے کمالات کی وسعت ہماری عقل کو حیرت مین ڈالدیتی ہے - وہ اعلیٰ درجہ کے سنیاسی - اور اسی کے ساتھ اپنے فرائض کے پابند گرہست بھی تھے - انکی ذات مین بے انتہا مادی قوت کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز ترک اور استغنا کا اتصال ہوگیا تھا - انکے حالات کی حقیقت ہماری سمجھ مین نہین آسکتی تاوقتیکہ ہم بھگوت گیتا کے رموز ونکات کو بخوبی نہ سمجھ جائین - کیونکہ وہ اپنی ہی تلقینات کی شکل مجسم تھے - انہین اپنی ہدایات کا زندہ مثال کہہ سکتے ہین - ترک کی اس سے اعلیٰ مثال نہین ملسکتی - کیسا عجیب دل ہے جو حق کو تخت اور تاج بانٹتا پھرتا ہے - مگر خود اسکی مطلق ہوس نہین - وہ جنکے ابرو کے اشارے سے سلطنتین بنتی اور بگڑتی تھین خود وہی آزادہ بے لوث اور غریب کرشن ہین جو گوپیون سے پیار کیا کرتے تھے - غور کیجئے - انکی زندگی کا کیسا حیرت انگیز پہلو ہے - جہان ہم ضعیف انسانون کی سمجھ نہین پہونچ سکتی - اور جسے سمجھنے کی کوشش کرنا ہمارے لئے بالکل بیکار ہے جبتک کہ ہم کامل طور پر پاک اور صاف نہ ہوجائین - وہ مجرد کامل محبت کی کتھا - اور وسیع پریم کی کہانی - وہ بندرابن کی گلیون اور لب جمنا کے کنجون اور سایہ دار درختون کے جھگڑے ہماری سمجھ مین نہین آسکتے جبتک کہ ہم شراب محبت سے متوالے نہ ہوجائین کون گوپیون کے ہجر ومفارقت کے صدمہ کا اندازہ کرسکتا ہے - محبت انکی جان وایمان تھی - وہ محبت جو کسی چیز کی محتاج نہین - وہ محبت جو بہشت کی بھی پرواہ نہین کرتی - وہ محبت جو کونین کی نعمتون سے مستغنی ہے - انہین اسکی مطلق پرواہ نہین کہ کرشن خالق کونین ہین - وہ صرف اتنا جانتی ہین کہ انکی ذات محبت بے پایان ہے - وہ کرشن کو بندرابن کے کھلاڑی کرشن کے سوا اور کچھ نہین سمجھتین - حکمران جوا جرن کے مہاراج - اور فوجون کے سردار تھے - وہ گوپیا کی نگاہ مین سدا گوالے ہی بنے رہے - یہ محبت کا اعلیٰ معیار - محبت صرف محبت کی غرض سے - کام صرف کام کی غرض سے فرض صرف فرض کی غرض سے - پہلی بار ایشور کے سب سے بڑے اوتار مہاراج کرشن کی زبان سے سرزمین ہند مین پیدا ہوا - اور اُسے دنیا کی تاریخ مذاہب مین ایک قابل یادگار واقعہ سمجھنا چاہئے اس معیار نے خوف اور دھمکیون کے مذہب کا خاتمہ کردیا - کیسی عالمگیر - کیسی مجرد کامل محبت ہے - مین ابھی کہہ چکا ہون کہ گوپیون کی محبت کی تہ تک پہونچنا بہت مشکل ہے - اور ہم مین ایسے بیخبرون کی کمی نہین ہے جو اس حیرت انگیز داستان الفت کے معنی اور اسرار سمجھنے سے قاصر ہین - بلکہ ہم مین کچھ ایسی پلید روحین بھی ہین جو انہین کچھ اور ہی معنی پہنا کر اپنی روحانی غلاظت کا ثبوت دیتی ہین - ان لوگون سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ پہلے اپنے نفس کو پاک کرو - اور یاد رکھو کہ جسنے یہ پریم کہانی لکھی ہے وہ بیاس رشی کا فرزند شکدیو ہے - جسکی ذات دنیا کی تحریصات سے پاک تھی - اور جسکے دل پر گناہ کا کبھی اثر نہین ہوا - جبتک کہ تمہارے دل مین غرض کی بو موجود ہے تم پرماتما سے لو نہین لگا سکتے - غرضمندانہ عبادت ذلیل دین ہے - جبتک ہمارے دل مین غرضمندانہ خیالات بھرے ہون کیونکر ممکن ہے کہ ہم گوپیون کی دیوانگی اور مدہوشی کے معنی سمجھ سکین - پہلے پہلے مال وزر - نام ونمود اور دنیا کا خیال دل سے نکال ڈالو تب گوپیون کا عشق تمہارے سمجھ مین آئیگا - وہ عشق اتنا لطیف تھا کہ تم بغیر دنیا سے دل ہٹائے اسکا لطف نہین اٹھا سکتے

ورمیا پاکیزہ کر دیگا۔ آئینہ دل پاک ہو جائے خیال میں بھی نہیں
سکتا۔ یہ مسلم ہے کہ وہ لوگ جنکے دل حرص اور ہوس سے تر ہیں عشق
بنے ہوئے ہیں گوپیوں کے پریم کو بھکتی اور اسمیں حق جتانے کی
کوشش کرتے ہیں۔ یہی پریم کرشن کے اوتار کا زیور اور سنگار ہے
اس مدہوشی کے مقابلہ میں گیتا کی تلقینات بھی نہیں بہترین گیتا
میں جگیا سو کو منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ بتلایا گیا ہے۔
لیکن وہ مدہوشی۔ وہ محبت کی دیوانگی جہاں گرو اور شاگرد عالم
اور علم سب ایک ہو جاتے ہیں۔ بجائے خود منزل مقصود ہے
جہاں عذاب و ثواب۔ نیک و بد کسی کا وجود نہیں باقی رہتا۔ سب
حس و خیال مٹ جاتا ہے اور صرف بیخبری باقی رہجاتی ہے۔
جب عاشق پر مستی۔ اور خود فراموشی کی کیفیت آجاتی ہے
تب اُسے ہر چہار طرف کرشن ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسکی صورت
کرشن سے مل جاتی ہے۔ اور اُسکی آتما کرشن کے رنگ میں رنگ
جاتی ہے۔ یہ مہاتما کرشن کی عظمت ہے۔ خدا ذرا سی باتوں پر
تضیع اوقات مت کرو۔ بلکہ زندگی کے اصول اور اسکے جوہر
باطنی پر نگاہ رکھو۔

ممکن ہے کہ کرشن کے حالات میں ہمکو بہت سی باتیں
قرین قیاس نہ معلوم ہوں۔ اور شاید تاریخی شبہات بھی کہیں کہیں
پیدا ہوں۔ مگر مذہب اور زندگی کے اس نئے معیار کی کوئی نہ
کوئی بنیاد ضرور ہوگی۔ کسی مصر سے پیغمبر یا نبی کی زندگی کا مطالعہ
کیجئے۔ وہ اپنے زمانہ کے خیالات و تمدن کا مظہر نظر آتا ہے۔
اور انہیں خیالات کی اشاعت کرتا ہے جو اسکے ملک میں اُس وقت
عوام کے دلوں میں پیدا ہونے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اس نبی یا پیغمبر
کے وجود پر بھی شک کرنیوالے لوگ نکل آتے ہیں۔ لیکن کون
ایسا شخص ہے جو انکار کر سکے کہ زندگی اور مذہب کا یہ نیا معیار

یعنی کام کام کی غرض سے۔ محبت محبت کی غرض سے۔ فرض فرض
کی غرض سے کرشن کی ذات پاک سے وجود میں مسیں
آئے۔ انکا سرچشمہ مزید کوئی نہ کوئی ہوگا۔ کرشن کے زمانہ طفولیت
تکمیہ میاد زندگی صفحۂ دنیا پر معدوم تھا۔ مہاراج کرشن نے
پہلی بار انکی تلقین کی۔ اور انکے شاگرد بیاس رشی نے ان خیالات
کو دنیا پر روشن کر دیا۔ بندرابن کے گوال جس والے کرشن گوپیوں
کے ساتھ پھرنیوالے کرشن اس اوتار کی سطح میں جب وہ چیز
ہمیں طاری ہو جائیگی۔ جب ہم مبارک گوپیوں کے راز الفت سمجھ
جائینگے۔ تب محبت کی حقیقت ہم پر روشن ہوگی۔ جب تمہاری
نظروں میں ساری دنیا مٹ جائیگی۔ جب تمہارا باطن صاف اور
بے غرض ہو جائیگا۔ حتیٰ کہ تمکو تلاش حقیقت کی بھی خبر نہ رہیگی
تب اور تب ہی تم پر اس محبت کی دیوانگی کا غلبہ ہوگا۔

اب اس سے کمتر درجہ کے گیتا والے کرشن کو لیجئے۔
ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کرشن کا گوپیوں کے
عشق میں سرشار ہونا کسقدر معیوب سا معلوم ہوتا ہے۔ اور
علمائے یورپ اسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے
ڈاکٹر فلاں اور فلاں نے اسپر اعتراض کیا ہے۔ اسلئے گوپیوں
کا ذکر نہ کیجئے۔ بغیر یورپین علما کی سند کے ہم اس واقعہ کو کیونکر
صحیح تسلیم کر سکتے ہیں۔ مہابھارت میں بجز دو ایک موقعوں کے
گوپیوں کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ اور وہ بھی واضح طور پر نہیں۔ مہابھارت
کی پارتھنا میں چند الفاظ میں بندرابن کا ذکر آگیا ہے۔ اور
ششپال کی تقریر میں بھی ایک جگہ بندرابن کا نام ملتا ہے مگر
یقیناً یہ سب مرتبوں کی کارستانیاں ہیں۔ جو فضلائے یورپ
نہیں مانتے۔ اسکی قطع و برید کر دینا چاہیئے۔ حیف ہے کہ جو
لوگ جو یورپ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جنکا معیار مذہب بھی

نجات کے واسطے مخصوص نہیں ہے۔ جو اس دنیا میں نیک کام کر کے بہشت میں جانیکی آرزو رکھتے ہیں وہ گوپیوں کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس بحث کو کرشن سے قطع نظر کر کے ہم گیتا کے مصنف کرشن کیطرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس حیثیت میں بھی وہ ذات عالی انتہائے کمال پر پہونچی ہوئی ہے۔ گیتا سے بہتر اسرار حقیقت کی تصنیف نہیں کی گئی۔ اور نہ کیجا سکتی ہے۔ شرتیون اور اُپنشدون کے مفسر اس کثرت سے گذرے ہیں کہ پردۂ اسرار میں آفتاب تک نگاہ کا پہونچنا غیر ممکن سا ہو گیا ہے۔ ہر مفسر اپنے ہی خیالات کے موافق تفسیر کرتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ ذات برحق جسکے گنون کا وجود ہو اور خود گیتا کے معلم کی حیثیت سے دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اور اصلی معنی پھر روشن کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ زمانۂ حال کے مفسر بھی گیتا کی تشریح کر نہیں اکثر اسکے مفہوم اور موضوع تک نہیں پہونچ سکتے۔ گیتا میں کچھ اور لکھا ہے۔ اور یہ زمانۂ حال کے ٹیکاکار کچھ اور کہتے ہیں۔ ایک "ادویت" مت کا پیرو کسی اُپنشد کی تشریح کرنے بیٹھتا ہے۔ اور اُسے جتنے اشلوک "دویت" خیال کے ملتے ہیں۔ ان سبھون کو توڑ مروڑ کر اپنے ہی خیال کے موافق معنی نکال لیتا ہے۔ علیٰ ہذا "دویت" عقیدہ کا عالم ادویت خیال کے اشلوکونکو مسخ کر کے اپنے رنگ میں ڈھال لیتا ہے۔ مگر گیتا میں سارے نکتے آئینے کی طرح روشن کر دئے گئے ہیں۔ اور اُسکا لب لباب چند الفاظ میں یہ ہے کہ روح انسانی بتدریج قدم بقدم کثیف سے لطیف۔ اور لطیف سے لطیف تر مدارج پر پہونچتی ہوئی بالآخر ذات مطلق میں واصل ہو جاتی ہے۔ کرم علم کا ذریعے بھی بحث کی گئی ہے۔ اور ثابت کیا گیا ہے کہ بلا خلوص قلب کے وہ ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ مورتی پوجن۔ اور مراسم دینی جائز تسلیم کئے گئے ہیں صرف صفائی قلب درکار ہے۔ عبادت اُسی حالت میں دلپذیر ہو سکتی ہے جبکہ باطن صداقت سے معمور۔ اور دل کثافت سے پاک ہو۔ عبادت کے مختلف طریقے۔ مختلف اُپاسنائیں بھی ضروری ہیں ورنہ اُنکا وجود ہی نہ ہوتا۔ ہماری نئی روشنی کے اکثر نوجوان خیال کرتے ہیں کہ یہ مختلف فرقے اور مذاہب خود غرضوں اور مکارون نے دنیا کمانے کے لئے بنا رکھے ہیں۔ اُنکا یہ خیال بادی النظر میں کیسا ہی صحیح نظر آتا ہو مگر واقعیت کے برعکس ہے فرقے اور مذاہب کی ابتدا یون نہیں ہوئی۔ وہ سب روح انسانی کے رجحانات کے نتیجے ہیں۔ وہ سب دنیا کے مختلف طبائع کی تسکین و تشفی کرنیوالے ہیں۔ اور ہمیں ان میں عیب جوئی کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرنی چاہئے۔ جس دن اُنکی ضرورت باقی نہ رہیگی وہ خود بخود صفحۂ ہستی سے مٹ جائینگے۔ مگر جبتک اُنکی ضرورت رہیگی وہ ضرور قائم رہینگے۔ خواہ تم اُنکی کتنی ہی مخالفت کرو۔ اور کتنے ہی عیوب نکالو۔ توپین اور بندوقیں مُنہ سے آگ برسائیں۔ تلوارون سے خون کی ندیاں بہیں۔ مگر جبتک ان مورتیون اور فرقون کی ضرورت موجود رہیگی۔ انہیں کوئی مٹا نہیں سکتا۔ اور بھگوان سری کرشن نے صاف صاف فرمایا ہے کہ اُنکا قائم رہنا برحق اور لازم ہے۔

اب تاریخ ہند کا ایک افسوسناک زمانہ آتا ہے۔ فرقون کے عناد و فساد اور شور و شر کی آوازیں گیتا ہی میں آنے لگی تھیں۔ مہاراج کرشن کی وفات سے پہلے ہی عنصر فساد نے پھر زور پکڑ لیا تھا۔ اور اسکے ملک پر جو طوفان آیا وہ مذہب کی بنیاد پر نہ تھا۔ بلکہ ذات پانت کی تفریق پر۔ برہمن اور چھ

ملہ۔ ریاضت۔

جو ہندو سماج کے دور کی ظلم میں اپنے اپنے اعادے قدم باہر نکالنے لگے۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو ایسی حالتوں میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ تقریباً ایک ہزار برس کے طوفان اور سیلاب کے بعد ایک اور جلسے مہاتما کا جنم ہوتا ہے۔ اور یہ گوتم شاکیہ منی ہیں۔ آپ کی انکی تعلیم اور تلقین سے واقف ہیں۔ ہم انکو ایشور کا اوتار مانتے ہیں۔ حسن اخلاق اور رحم کا جیسا اعلیٰ معیار اُنھوں نے قائم کیا وہ پردۂ دنیا پر اور کہیں نظر نہیں آسکتا۔ وہ زبردست کرم یوگی تھے۔ گویا خود مہاراج سری کرشن اپنے اصولوں پر عمل کرنے کے لئے اپنے ہی شاگرد بنکر دنیا میں آئے۔ ایک بار پھر وہی پُر زور۔ الوہیت سے لبریز آواز سنائی دی جسنے گیتا میں کہا تھا ”عورتیں۔ اور ویش اور شودر سب اپنے اپنے کرموں کے مطابق نجات حاصل کرتے ہیں“ گویا گیتا کی تلقینات کی زندہ مثال پیش کرنے کے لئے۔ گویا اُسے عملی صورت میں لانے کے لئے۔ گرو نے نیا سروپ دھارن کیا۔ اور یہ شاکیہ مُنی تھے جنکا مقصد پامال قوموں کو سُدھارنا تھا۔ جنہوں نے دیوتاؤں کی زبان کو خیرباد کہدیا۔ تاکہ عوام کی زبان میں تعلیم دیکر اُنکے دلوں تک پہونچ سکیں۔ جنہوں نے درویشوں اور بینواؤں کے لئے شاہی تخت اور تاج کو ترک کر دیا۔ اور جو سری رامچندر کیطرح شودروں کو بھی چھاتی سے لگاتے تھے۔ آپ لوگ اُنکے عظیم بالشان کام اور اُنکے اوصاف بالذات بخوبی واقف ہیں۔ لیکن اُنکے مشن میں ایک نقص تھا۔ جسکا خمیازہ ہم ابتک اٹھا رہے ہیں۔ وہ ذات بابرکات اس نقص کے لئے جوابدہ نہیں کہی جاسکتی۔ مگر بدقسمتی سے وہ غیر مہذب اور نیم وحشی قومیں جو آریوں کے حلقۂ اثر میں آگئی تھیں مذہب کے ایسے اعلیٰ معیار پر عمل نہ کرسکیں۔ یہ قومیں جنکے توہمات اور عبادت کے طریقے بجا بجا لاتے آریوں کے حلقہ میں آگھسیں۔ اور کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوا کہ انکی خو بو تبدیل ہوگئی ہے۔ مگر ایک صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ انہوں نے وہ بھوت اور پریت اور سانپ بچھو اور لکڑی پتھر پوجنے شروع کئے جو انکے بزرگ پوجتے آئے تھے۔ اور اصلی سارا ہندوستان توہمات اور جہالت کے ایک سیلاب میں غرق ہوگیا۔ ابتداً بودھوں نے جیو ہتیا کے جوش میں ہوموں کی بھی مخالفت کر دی تھی۔ اُسوقت تک گھر گھر بخورات جلائے جاتے تھے۔ اگنی کنڈ میں آگ جلتی رہتی تھی۔ اور اسکے سوا پرستش کے اور لوازمات رائج نہ تھے۔ مگر بودھوں نے یہ رواج مٹاکر انکی جگہ عالیشان مندر۔ اور نمائشی طریق عبادت۔ اور زاہدانہ طمطراق۔ اور عالی شان خانقاہوں کا رسم پھیلایا۔ جنکے بچے کھچے اثرات اب بھی موجود ہیں۔ جب میں آجکل کے مصنفین کو جنہیں زیادہ تحقیق سے کام لینا چاہئے تھا، لکھتے ہوئے پاتا ہوں کہ بودھوں نے برہمنوں کی بت پرستی کا خاتمہ کردیا تو مجھے ہنسی سی آتی ہے۔ انہیں اسکی مطلق خبر نہیں کہ بودھ مت ہی نے ہندوستان میں بت پرستی کی بنیاد ڈالی۔ جگن ناتھ کا مندر بودھوں کا ایک پرانا مندر ہے۔ ہمنے اسپر اور اسکے ساتھ اور بھی کتنے ہی مندروں پر دوبارہ ہندوپن کی قلعی کی خیر۔ باوجود اہنسا کی تعلیم کے۔ باوجود رفیع اخلاقی معیار کے۔ باوجود اُن موشگافیوں کے جو پرماتما کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ہوتی رہتی تھی بودھ مت کی عالیشان عمارت منہدم ہوگئی۔ اور اُسکے در و دیوار شکستہ کی جیسی مٹی پلید ہوئی اسکا ذکر فضول ہے۔ انتادھرجہ کا کراہیت آمیز طریق پرستش۔ انتادھرجہ کی فحش کتابیں۔ اور مذہب کے پردہ میں انتادھرجہ کی خلیفانہ حرکتیں۔ یہ سب بودھ مت کے زوال کے تبرکات ہیں۔

لیکن بھارت ورش کو دنیا مین ابتک قائم رہنا تھا۔ او ایشور نے پھر اوتار لیا۔ وہ جسے فرمایا تھا کہ جب کبھی نیکی کمزور ہوتا ہے تو مین دنیا مین آتا ہون۔ پھر آیا۔ اسکا ظہور جنوبی ہند کو حاصل ہوا۔ وہ نوجوان برہمن جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ سولہوین سال مین اسکی تمام اعجاز نما تصنیفین مکمل ہو گئی تھیں جنوبی افق سے آفتاب درخشان بنکر نکلا۔ یہ تصنیفات آجتک عجائب روزگار ہین۔ سری شنکراچاریہ کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کو اس اخلاقی رتبہ پر پہنچائین جہان وہ ابتدائے آفرینش مین تھا۔ خیال کیجئے کیسی نظر وسیع اور ہمت بلند تھی۔ مین نے اُس وقت کی حالت کا چند فقرون مین ذکر کیا ہے۔ یہ تمام نقائص تمدن اور معاشرت جنہین کہ ہم اور آپ دائرۂ اصلاح مین لانا چاہتے ہین اسی اخلاقی ادبار کے زمانہ کے آثار ہین۔ بلوچی، تاتاری اور دُنیا کی دوسری قومین ہندوستان مین آئین اور بودھ مذہب مین داخل ہو کر ہمارے ساتھ رہنے سہنے لگین۔ اُنکے مراسم اور معاشرت کا اثر ہمارے طرز تمدن پر اس حد تک پہنچا کر ہماری قومی زندگی کروہ ترین حرکات و خیالات کا ایک صفحۂ عظیم بنگئی۔ قوم کی یہ حالت گویا نوجوان شنکر کو دھون سے نذر کر دی گئی۔ اور ویدانت آج تک اسی زمانہ کے بوئے ہوئے کانٹے کاٹ رہا ہے۔ شنکر نے اپنے زبردست فلسفہ کے زور سے ثابت کر دکھایا کہ ویدانت اور بودھ مت کی حقیقتون مین بہت زیادہ اختلاف نہین ہے۔ لیکن شاگردون نے اُستاد کا مطلب نہ سمجھا۔ اور آتما و پرماتما کے وجود سے منکر ہوگئے یہ تھا سری شنکر کی تعلیم کا ماحصل۔ اور بودھ لوگ اپنے پرانے مت مین پھر آنے لگے۔

تب سری رامانج نے جنم لیا۔ شاید سری شنکر باوجود پیچ گیر نیچی ذاتون کے ایسی وسیع نگاہ رکھتے تھے۔ رامانج کا دل زیادہ فراخ تھا۔ نیچ ذاتون کے درد سے اُنکا سینہ لبریز تھا۔ انھون نے طریق عبادت کے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اور خود نواندکو خلع کر کے اُنکے بجائے نئے نئے مراسم جاری کئے۔ کیونکہ قوم کا جذبہ بلا ظاہری مراسم کے نہ رہ سکتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اُنھون نے روحانی عبادت کا دروازہ برہمن اور شودر سب کے لئے کھول دیا۔ یہ تھا سری رامانج کا مشن۔ اور اس مشن کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے شمال تک جا پہنچا۔ وہان کے چند بزرگون نے اسکی اعانت کی۔ اور رامانج کے زمانہ سے روحانیت کے معبد کو ہر خاص و عام بنانے کی مسلسل کوششین ہوتی آئی ہین۔ جتنے اولیا اور رشی سری رامانج کے بعد آئے اُن سبھون نے یہی رویہ اختیار کیا۔ میری سمجھ مین نہین آتا کہ شنکر پر کیون نیچ ذاتون کو علیحدہ رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مجھے اُنکی تمام تصانیف مین اس الزام کی تائید نہین ملتی۔ غالباً اسکا سبب یہ ہے کہ بدھ بھگوان کے پیروؤن کی طرح سری شنکر کے معتقدون نے بھی اُنکا مطلب نہ سمجھا۔

اب مین شمالی ہندوستان کے اُس تقدس مآب ہستی عشق پیا کا تذکرہ کر کے تقریر کا خاتمہ کرتا ہون جو سری رامانج کے پیرو مانی تھے۔ وہ خود ذات کے برہمن تھے۔ علما کے گھرانے مین پیدا ہوئے۔ اور منطقی مباحث مین اپنا وقت صرف کرنے لگے یہی اُنکی زندگی کا شعار تھا۔ مگر یکایک کسی رشی کی دعا نے اُنکی زندگی کی رفتار پلٹ دی۔ اُنھون نے منطقی مباحث سے کنارہ کیا۔ اور بھگتی کے اعلیٰ درجہ کے گرویدہ بنگئے۔ اُنہین لوگ دیوانہ چیتن کہا کرتے تھے۔ وہ گوپیون کی دیوانگی کے عاشق تھے اُنکی بھگتی کی لہر بنگال مین شرق سے غرب تک پھیل گئی۔ اُن کا جذبۂ محبت وسیع تھا۔ اُسکی کوئی انتہا نہ تھی۔ نیک اور بد۔ ہندو و

سلمان۔ اونچ اور نیچ سبھی اُنکی محبت اور ہمدردی میں شریک تھے۔ اور آج بھی اگرچہ اُنکا جسد دُنیا کی ہر شے کیطرح ابتری کیحالت میں آگیا ہے۔ تاہم ابھی تک کتنے ہی بے ذات ہندو قوم کے عظیم آدمی اُنکے نام لیوا باقی ہیں۔

سری شنکر اچاریہ کا دماغ وسیع تھا اور سری چیتنیہ کا دل مگر اب ایک ایسے رشی کے جنم لینا کا وقت آگیا ہے جسکا دل و دماغ دونوں وسیع ہوں۔ جو ایک ہی قالب میں شنکر کا دماغ اور چیتن کا غیر محدود دل رکھتا ہو۔ جو ہر ایک فرقہ میں ایک ہی پرماتما کی قدرت کا جلوہ دیکھے۔ جسکی آنکھیں غربا اور مساکین مظلوم اور خستہ حال آدمیوں کی حالت پر آنسو بہائیں۔ جسے ہر فرد بشر سے خواہ ہندوستانی ہو یا غیر ہندوستانی یکسان ہمدردی ہو۔ اور جسکی طبع عالی ایسے بلند خیالات کا منبع ہو جو تمام متضاد فرقوں اور ذاتوں کو صلح اور محبت کے رشتہ میں منسلک کرے۔ اور ایک ایسا مذہب وجود میں لائے جو دل و دماغ دونوں کیلئے باعث تقویت ہو۔ وہ نفس عالی ہندوستان کی خاک پاک سے اُٹھا۔ اور مجھے اُسکی صحبت سے فیض اُٹھانیکا عرصہ تک شرف حاصل رہا۔ اُسکی زندگی کا کام ایک ایسی سرزمین میں شروع ہوا جو مغربی روش پر فریفتہ ہو رہی تھی۔ جہان کا ہر شخص مغربی خیالات کے پیچھے دیوانہ بنا ہوا تھا۔ جو ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں یورپ کا جادو زیادہ اثر کر گیا تھا۔ یہ مرد کامل اُمّی محض تھا۔ اُسے اپنا نام لکھنے کی بھی قابلیت نہ تھی مگر یونیورسٹی کے بڑے بڑے علما اور پروفیسر اُسکی وسعت معلومات پر حیران ہو جاتے تھے۔ وہ عجیب و غریب آدمی تھے۔ اُنکے سوانح زندگی بہت طول ہیں۔ اور مجھے آج اتنی فرصت نہیں کہ اُنکا ذکر کروں۔ سری رام کرشن کا نام آج آفتاب کیطرح چمک رہا ہے۔ اور غور کیجیے کہ کتنی زبردست روحانی طاقت اُنکے ذریعہ سے اپنا کرشمہ دکھا رہی ہے۔ ایک مفلس پجاری کا لڑکا جو ایک آبادی سے دُور کے گاؤں میں پیدا ہوا آج یورپ اور امریکہ میں ہزاروں آدمیوں کا معبود بنا ہوا ہے۔ اور کل لاکھوں اُسکے نام پر عقیدت سے سر جھکائینگے۔ اگر وقت آیا اور موقع ملا تو میں اپنے مرشد کا تذکرہ آپ لوگوں سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کرونگا۔ اسوقت صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ اگر میری زبان سے ایک لفظ بھی صداقت کا نکلا ہے تو اُسی ذات پاک کی فیضان صحبت کا اثر ہے۔

(ترجمہ از سوامی ویویکانند)

نواں باب

ہندو فنِ حکمت

(ماخوذ از "ہندو سپیریارٹی" مصنفہ پنڈت ہربلاس سارڈا)

ہندو قوم نے دیگر علوم مثل ہیئت، ریاضی اور صرف و نحو کی طرح فنِ طبابت کو بھی درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اُن میں قوت مشاہدہ بہت زبردست تھی۔ استقلال، ریاضت شاقہ، اور غور و خوض میں وہ بے عدیل تھے۔ ان قابلیتوں نے ہندوستان جیسے مُلک میں جہاں انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں اُنھیں علم حکمت کی تحقیق و تدقیق اور نشوونما میں ایک خاص حیثیت دے رکھی تھی۔ مگر سنسکرت لٹریچر کے ایک بڑے حصے کے تلف ہو جانے کے باعث ہندوؤں کے فنی کمال کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفہ اور ادب میں اب تک زمانۂ قدیم کی تصانیف موجود ہیں۔ مگر فنِ حکمت چونکہ عملی سائنس ہے اور مختلف اسباب نے عرصہ دراز سے اسے گمنامی میں پڑا رہنے دیا اس لئے اس فن کی بے شمار تصانیف زائل ہو گئیں۔ تاہم جو چند کتب اب تک موجود ہیں وہ بھی اُس ترقی کا پتہ دیتی ہیں جس سے زمانۂ حال کی ترقیاں سبقت لے جانے کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ اُنکے مطالعہ سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ دیگر علوم کی طرح یہ علم بھی ہندو کے دماغ سے پیدا ہوا۔ اور دنیا کی دیگر قومیں اس لحاظ سے بھی ہماری ممنونِ منت ہیں۔

لارڈ ایمپتھل نے جو چند سال گزرے صوبہ مدراس کے گورنر تھے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:-

اب ہم پر یہ حقیقت کھلنے لگی ہے کہ ہندو شاستروں میں بھی قوانینِ صحت موجود ہیں، جو زمانۂ حال کے قوانین کی طرح پختہ اصولوں پر مبنی ہیں اور ہندو قوم کا شیرازہ بندِ منو حفظانِ صحت کے اصول و قواعد کا بہت بڑا عالم تھا۔

پروفیسر ولسن فرماتے ہیں۔

بلاد قدیم کے ہندوؤں نے علم حکمت اور جراحی میں بہت دستگاہ حاصل کی تھی۔ اور یہ ایک قدرتی بات تھی کیونکہ انکی طبعی فراست و ذکاوت اور عبرت آمیز محویت نے ان کی قوت مشاہدہ کو بہت تیز کر دیا تھا اور اُن کے ملک کی وسعت اور زرخیزی نے انکے مطالعہ اور تحقیقات کے لئے گوناگوں اسباب مہیا کر دیئے تھے۔ وہ تشخیص بیماری اور علاجات کی تمیز بہت صحت کے ساتھ کرتے تھے۔ اور ان کا طبی مبلغ علم بہت وسیع تھا۔

ہندوستان کا مشہور انگریز مورخ سر ولیم ہنٹر لکھتا ہے۔

ہندوؤں نے فن حکمت کی پوری وسعت کا احاطہ کر لیا تھا انکی قدیم تصانیف میں اجسام کی ترکیب، اعضا، اعصاب، رگ و پٹھے، اور شریانیں کا تحقیق کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

ہندو ادویات میں بیشمار اجزا شامل ہیں جو موالید ثلاثہ کے ہر ایک رکن سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اور جن میں سے اکثر ادویات اب یورپین اطبا بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ اُن تصانیف میں مرکبات تیار کرنے کے بہت جدت آمیز طریقے بتلائے گئے ہیں اور خوراک اور حفظ کے متعلق جامع ہدایتیں کی گئی ہیں۔

دھنونتری ہندوؤں کے فن طبابت کا آفتاب تھا۔ اُس نے اپنے شاگرد سشرت کو اس فن کی تعلیم دی۔ چرک کہتا ہے کہ مجھے اگنی ویش رشی نے یہ فن سکھایا۔ سشرت اور چرک یہ دونوں ہند حکمت کی زندہ جاوید تصانیف ہیں جو اپنے مصنفین کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں نے ممکن ہے فن ادویہ میں دسترس بہم پہنچایا ہو۔ مگر فن جراحی یورپین ڈاکٹروں کا معترف ہے گرویل کے اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ علم اور تشریح بدنی میں بھی ہندوؤں نے وہ فضیلت حاصل کی تھی جو موجودہ فن جراحی کے لئے حقارت نہیں بلکہ فخر کا باعث ہے۔

مسز ویبر رقمطراز ہیں۔

فن جراحی میں بھی ہندوؤں نے مہارت تامہ حاصل کی تھی۔ اس صیغہ میں یورپین جراح اور ڈاکٹر اس زمانہ میں بھی اُن سے کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اور فی الواقع انہوں نے ناک اور کان بنانے کا ڈھنگ ہندوؤں ہی سے سیکھا ہے۔

مشہور انگریزی مورخ الفنسٹن لکھتا ہے:-

ہندوؤں کا فن جراحی اتنا ہی مکمل ہے جتنا کہ ان کا فن طب۔

مسز میننگ جو سنسکرت لٹریچر سے کامل واقفیت رکھتی ہیں فرماتی ہیں ہندوؤں کے آلات جراحی بہت تیز اور باریک ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ بال کو طولاً چیر سکتے تھے!

ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر فرماتے ہیں:-

ہندو فن جراحی میں حسن عمل اور جدت دونوں باتیں موجود تھیں۔ وہ بلا خون ضائع کئے ہوئے اعضا کی قطع برید کر سکتے تھے۔ معدہ اور نرخرہ میں نشتر لگا سکتے تھے۔ بواسیر کو دور کر سکتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ سکتے تھے اور جسم سے خارجی مادات کو نکالنے میں ہوشیار تھے۔ جراحی کا ایک خاص صیغہ ناک اور کان کے لئے وقف تھا۔ وہ بدنما اور بھدے کان اور ناک کی اصلاح کرتے تھے اور بسا اوقات نئی ناک اور نئے کان

...اپنے سلسلے میں ... پچھلے ہزاروں سال سے ... سے جاتا
...ے۔ شفیقہ کا علاج آجکل ہندوستان کے اچھی طرح پایا جاتا ہے یہاں تک
... ذکر کیا جاتا ہے۔ قدیم ہندوؤں نے بھی اس کا ...
... ذکر کیا ہے۔ وہ ... کے آلات ... سے ... بہت
... صفائی سے کام لیتے تھے۔ اور علاوہ ازیں کا ... علم
... کرانے کے لئے موم کو ... کے ... تاثرات سے ...
... جاتا ہے ... کے جسم سے کام لیا جاتا تھا ...
... جراح فن جراحی کے اُستاد تھے۔ اور نہایت پیچیدہ
اور نازک عملیات کو سرانجام دیتے تھے۔ ... اور
... کے علاوہ ... نے ... حاصل کی تھی ...
... ہاتھی گھوڑے وغیرہ جانوروں کے علاج کے متعلق
ابتک تصانیف موجود ہیں

... لارڈ ایمپتھل فرماتے ہیں۔

یہ شاید عام طور پر معلوم نہیں ہے کہ علم طبابت نے ہندوستان ہی میں جنم لیا۔ بیشک یہ فخر ہندوستان کو حاصل ہے۔ یہ علم اول یہاں سے عرب پہنچا اور عرب سے یورپ میں داخل ہوا۔ سترھویں صدی کے آخر تک یورپین اطبا اس فن کو عرب کے طبی تصانیف سے حاصل کرتے تھے۔ مگر عرب کے حکماء نے ہزاروں برس پہلے یہ فن ہندوستان کے مشہور حکما مثلاً دھنونتری یا چرک یا سشرت کے تصانیف سے حاصل کیا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دنیا کی ترقی کا ... مشرق سے مغرب کی سمت چلا۔ اور ایسا غائب ہوا کہ مشرق میں اپنے وجود سابقہ کے نشانات ... باقی رکھے۔

سر ولیم ہنٹر لکھتے ہیں۔

عربی فن طب سنسکرت تصانیف کے تراجم پر قائم کیا گیا ہے جو خلفاء بغداد کے زمانہ میں کئے گئے ... اور ... کے حکما سترھویں صدی کے آخر تک عربی حکمت کے دست نگر رہے۔ اور ابن سینا اور ابو سرابی کے تصانیف میں چرک کا نام بار بار واقع ہوتا ہے

ممکن ہے اشتباہ پیدا ہو کہ اہل عرب اپنے فن حکمت کے ہندوؤں کے ممنون نہیں۔ ذیل کی تاریخی شہادتوں سے غالباً یہ شک رفع ہو جائے گا۔

خلیفہ المنصور نے ۷۵۳ء اور ۷۷۴ء کے درمیان دمشق کو چھوڑ کر بغداد کو اپنا مستقر بنایا۔ اُس نے سنسکرت کے طبی اور علمی تصانیف کے ترجمے کرائے۔ جن میں ایک نسخہ ترجمہ کے متعلق شناک (یعنی چرک) کا لکھا ہوا اور ایک کتاب حکمت کی سسرود (یعنی سشرت) کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔

مسٹر رائل اپنی کتاب "ہندوؤں کا قدیم فن حکمت" میں لکھتے ہیں "ابو سرابی نے جو عرب کا مشہور حکیم تھا چرک کا ذکر کیا ہے۔ اور اُسے اس فن میں سند مانا ہے"

ابو رازی نے جو ابو سرابی سے فن حکمت میں سبقت لے گیا تھا اور المنصور کے دربار کا ایک رکن تھا دو موقعوں پر بہ ندو چرک کو اپنے بیانات کی تائید میں بطور سند کے پیش کیا ہے۔

شیخ الرئیس بو علی سینا حکما عرب کا سرتاج تھا جو کہ ... کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے سشرت کی بتلائی ہوئی جونکوں کا اعادہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ نام بھی وہی رکھ دیئے ہیں۔

میکس مور صاحب لکھتے ہیں "فیروز شاہ نے نگر کوٹ

فتح کرنے کے بعد سنسکرت طبی تصانیف کو ابازالدین خالد سے عربی میں ترجمہ کرایا۔"

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد سلطنت میں اہل عرب ہندو ادویات کو صرف استعمال ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہندو حکما بغداد میں مدعو کئے جاتے تھے اور دربار شاہی میں اعزاز کی جگہ پاتے تھے۔ ابو عصیبہ بیان کرتا ہے کہ منکا ایک ہندو تھا جو فن طب میں ماہر اور سنسکرت زبان کا عالم تھا۔ وہ ہندوستان سے عراق آیا۔ خلیفہ ہارون رشید کو ایک مرض سے نجات دی۔ زہر کے متعلق چرک کی ایک کتاب کو فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانہ میں اور کئی ہندو حکیموں کے بغداد میں رہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔"

ہندو کیمسٹری کا عالم مورخ لکھتا ہے "رس رتن سمچیہ ہندو فن حکمت اور ادویات کی ایک جامع تصنیف ہے۔ اس کے مضامین کی عالمانہ ترتیب، اور حسن اسلوب پر کسی زمانہ حال کی تصنیف کو بھی فخر ہو سکتا ہے۔"

ناگ ارجن بودھ زمانہ کا ایک بڑا مشہور علم کیمیا کا ماہر ہوگزرا ہے۔ اس صنعت میں اس نے ایک بیش قدر تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک ایسا مرکب تیار کیا تھا جس کے استعمال سے انسان کئی صدیوں تک زندہ رہ سکتا تھا عمر کا دل و دماغ اور جسم پر کچھ اثر ہوسکتا تھا۔ ڈاکٹر رے فرماتے ہیں "ہم نے جو شہادتیں پیش کی ہیں ان سے اس امر کے متعلق کوئی شک نہیں باقی رہ سکتا کہ پارہ کو بطور دوا کے استعمال کرنے کی خصوصیت حاصل کرنے میں ہندو مقدم تھے۔ معدنیات کا اندرونی استعمال انہیں کی ذات سے عام ہوا، اور وہ اس لحاظ سے موجد کہلائے جائینگے دعویٰ کر سکتے ہیں۔ چرک اور سشرت نے معدنیات کے فوائد خوب دل کھول کر بیان کئے ہیں"

یونان میں پلاٹنی کے زمانہ تک پارہ کا استعمال غیر معلوم تھا۔ پلاٹنی نے خود پارہ کو زہر بتلایا ہے۔ معدنیات میں معالجانہ خصوصیات کی تحقیق اور ان کا استعمال ہندو کمال فن کی زبردست دلیل ہے۔

مورخ الفنسٹن کہتا ہے "ہندو وہ پہلی قوم تھے جنہوں نے معدنیات کا اندرونی استعمال ایجاد کیا۔ وہ لوگ صرف پارہ ہی نہیں، بلکہ بعض حالتوں میں سنکھیا بھی تجویز کیا کرتے تھے۔ انکی کتابوں میں ۱۲۷ آلات جراحی کے نام دئے گئے ہیں۔"

مسز اینی بی سنٹ نے جنوری [illegible] میں بمقام کلکتہ اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

طبی اور کیمیائی علوم میں تم لوگوں نے (یعنی ہندوؤں نے) بہت ترقی کی تھی۔ علم شفا میں تم نے اور بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ہندوستانی ادویات، خواہ وہ یونانی ہوں یا مصری، مغرب کے فن حکمت پر فضیلت رکھتی ہیں۔

ہندو فن حکمت کی داد جس کشادہ دلی سے لارڈ ایمپتھل نے دی ہے اُس کا یہاں اعادہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ علم حکمت کا بہت کچھ حصہ ہندوستان میں واپس آیا جو صدیوں پہلے اس ملک سے نکل چکا تھا۔ اب انگریز لوگ اس علم کا اور بھی زیادہ حصہ واپس لا رہے ہیں۔ جب ہم آب رسانی کی تجویزیں کرتے ہیں، جب ہم شفاخانے قائم کرتے ہیں، اور طبی مدرسے کھولتے ہیں، جب ہم پلیگ کے انسداد کے لئے قوانین بناتے ہیں، اور جب ہم صحت عامہ کی نگرانی رکھنے کے لئے حکام کو تاکید کرتے

ہیں تو ہم کوئی نئی انوکھی بات نہیں کہتے۔ ہم صرف وہی کرتے ہیں جو ہزاروں برس پہلے کیا جاتا تھا۔ اور جسے اب ہم موّرخ اور ماہرین آثار قدیمہ کے مدد سے زیرِ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

چیچک کے ٹیکا لگانے کا رواج یورپ میں ڈاکٹر جینر نے ڈالا۔ وہ اس کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کا کامل ثبوت موجود ہے کہ ٹیکا لگانے کا رواج ہندوستان میں ہزاروں برس پہلے سے تھا۔ ہند و حکمت کے خداوند دھنونتری نے صاف الفاظ میں کہا ہے۔

گائے کے تھن پر کی پھنسیوں کا مواد ایک نشتر کے نوک پر لے لو۔ اور اس نشتر کو کندھے اور کہنی کے درمیان بازو میں چبھا دو۔ یہاں تک کہ خون نکل آئے۔ تب اس مواد کے خون میں ملنے سے چیچک کا بخار آجائے گا۔

یہ اگر چیچک کا ٹیکا نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح اور کتنی ہی علمی اور عملی حقیقتیں جنہیں اہل یورپ اپنا ایجاد کئے بیٹھے ہیں فی الواقع بازیافت ہیں۔

لارڈ کارمائیکل ممدوح نے اپنی اسی تقریر میں آگے چل کر فرمایا۔

میں یہاں ایک تازہ تحقیقات کا تذکرہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا اور وہ یہ ہے کہ طاعون کے زمانہ میں مکان کو خالی کر دینا اور کیمیائی طریق سے اس کی صفائی کرانا اُن ہدایتوں سے مطلق مختلف نہیں ہے جو ہند و شاستروں میں کی گئی ہیں۔

ہندوستان میں اُردو انصاف طلب ہے

اردو بولنے والوں نے جن کی تعداد اُس زمانہ میں تقریباً پانچ کروڑ تھی، کانگریس کے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کے بعد مسز گاندھی کے منتخب پینل کے وجود میں ایک نئی امید قائم کی تھی۔ "اردو کے ساتھ انصاف" کے مطالبہ پر کئی ہزار لوگوں نے دستخط کیے تھے اور اس کو ۱۹۶۹ء کے بمبئی کے تاریخی اجلاس کے موقع پر ایک بڑی تعداد میں پیش کیا تھا۔ اس مطالبہ کے ذریعہ مسز گاندھی کی توجہ کو اس زبان کی سقیم حالت کی جانب مبذول کرایا گیا تھا۔ اس موقع پر جو لفظ استعمال کیا گیا تھا وہ "بڑا المیہ" تھا۔

مسز گاندھی کا جواب تشفی بخش تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس زبان کو مکمل طور پر نافذ کریں گی جس نے آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ بعد میں انھوں نے انتخابی منشور مرتب کرنے والی کمیٹی کو ہدایت کر دی کہ وہ اردو کی حیثیت کے بارے میں ایک پیراگراف کا اضافہ کرے۔ لیکن کمیٹی نے محتاط رہ کر صرف اتنا کہا کہ "اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے گا"۔ اردو بولنے والے جو بڑی تعداد میں انتخابی مہم میں مسز گاندھی کی حمایت کر رہے تھے، ردعمل کے طور پر بے دلی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

لیکن مسز گاندھی اپنے وعدہ میں مخلص تھیں۔ ایک نجی گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے کہا کہ ایسی کارروائیوں کو ٹالا جائے۔ وزارت اطلاعات میں اس معاہدہ کو ختم کرنے کے لیے اقدام کریں گی۔ میں نے اس بلیک لسٹ کو منسوخ کرنے کی ہدایات دیں جو مستقل طور پر تمام اردو اخباروں اور رسالوں پر نافذ تھی جس کی وجہ سوائے تعصب اور اس زبان سے ان کی ناواقفیت

کے سوا اور کچھ درج تھا لیکن مخالفت ضعیف سی تھی۔ بعض دوررس تدابیر کو بحث سے نکالنے یا آغاز کرنے سے زیادہ پروفیسر نورالحسن نے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے اور احتیاط اور سست روی کے پیش نظر سفارش کی کہ اس کے لیے ایک بااختیار کمیٹی مقرر کر دی جائے۔"

ابتداءً کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے چھ ماہ کی مہلت دی گئی تھی لیکن چونکہ اس کو مسئلے کے بہت سے پہلوؤں کا جائزہ لینا تھا اور کام اس سے زیادہ پھیلا ہوا ثابت ہو جانے کی توقع تھی۔ نتیجتاً ایک مفصل رپورٹ مئی ۱۹۷۵ء میں پیش کی گئی اور اس کے ساتھ ہی اس افسانوی داستان کا پہلا مرحلہ اختتام کو پہنچا۔

اب یہ کوئی راز کی بات نہیں رہی ہے اور میرے لیے کھلے طور پر یہ انکشاف کرنا جائز ہو گیا ہے کہ چند ماہ کی تاخیر کے بعد رپورٹ بالآخر کیبنٹ کو پیش کر دی گئی۔ اور ذمہ دار ایمرجنسی کے شروع کے مہینوں کا تھا۔ مسز گاندھی خواہش مند تھیں کہ رپورٹ پوری کی پوری منظور کر لی جائے اور اس کا نفاذ ہو جائے۔ ان کی اس دلچسپی کا سبب کسی حد تک سیاسی تھا۔ ایمرجنسی کی زیادتیاں مسلمانوں اور ان کے قائدین کے گروہ بند دانشوروں کو منحرف کر رہی تھیں۔

مسز گاندھی کو تعجب ہوا اور میری بہت الجھن کہ جگ جیون رام نے توقعات کے برخلاف اس کی پُرزور مخالفت کی۔ ان کو کسی مخصوص سفارش سے اختلاف نہیں تھا۔ وہ سرے سے رپورٹ ہی کو دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا "آپ لوگ چور دروازے سے اردو کو منہ کے بل باہر لانا چاہتے ہیں۔" پروفیسر نورالحسن اور میں، یعنی ہم دونوں نے کہا کہ ہم پرانے تنازعہ کو پھر سے زندہ کرنے کی کسی طرح کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے برخلاف اراکین نے اپنے فائق رجحانات کے سبب بہت ہوشیاری سے کسی ایسے مسئلہ سے اجتناب برتا ہے جو فراموش شدہ تنازعات کو از سرِ نو زندہ کرے لیکن بابو جی متشددانہ انداز سے اور پوری قوت سے گویا ہوئے، "نہیں! نہیں!!" جب کہ دوسروں نے اس موقع پر سکوت اختیار کیا۔

مسز گاندھی نے خاموشی سے اس منظر کو دیکھا۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ وہ حضرت مجھے پریشان کرنے کے لیے ایک بہانہ تلاش کر رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے احتیاط کو ترجیح مصلحت جانا کہ اس بحث کو ختم کر دیا جائے۔ پروفیسر نورالحسن اور مجھ سے کہنے لگیں "ہم اس معاملہ پر پھر غور کریں گے۔"

یہ ایک پریشان کن موقع تھا۔ خاص طور پر اس لیے کہ میں نے مسز گاندھی سے پیشگی منظوری حاصل کر لی تھی اور رپورٹ پر دستخط ہونے سے پہلے دوسرے اراکین کو پہنچا دی تھی۔ مسز گاندھی نے مجھ سے میٹنگ کے بعد کہا "ہاں! لیکن تم نے بابو جی کا رویہ ملاحظہ کیا۔ تم نے ان کو راغب کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" یہ خطرناک قیاس تھا۔ انھوں نے بے جا طور پر میرے بارے میں شبہ کر لیا تھا کہ میں جگ جیون رام کا ساتھ دے رہا ہوں۔ اس وقت میری کوئی بھی کوشش ان کو جو باہر تھے سیاسی طور پر آمادہ کر سکتی تھی۔

تھوڑے عرصہ بعد مجھے اس کو بھیج دیا گیا اور پھر اس رپورٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ ضابطہ پرست حاکموں نے یقینی کر لیا تھا کہ تمام نقلیں واپس لے لی گئی ہیں۔ کمیٹی کے ارکان تک کے پاس بھی کوئی نقل نہیں چھوڑی گئی تھی لیکن پارلیمنٹ کے بعض بیدار مغز اراکین، بالخصوص سکندر علی وجد مرحوم وغیرہ صاحبان، پروفیسر نورالحسن کو لکھتے رہے کہ وہ واضح جواب حاصل کریں۔ "رپورٹ زیر غور ہے۔"

جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات نے سیاسی حالات کو کلی طور پر بدل دیا تو جنتا کے دور میں بھی اردو کے ساتھ کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ نئے وزیر تعلیم ڈاکٹر پی سی چندر نے اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دی اور رپورٹ کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ ایک دن قدرت مہربان ہوا کہ اس وقت کی حزب اختلاف جماعت کے صدر مسٹر چندر شیکھر نے اپنی حکومت سے اس موضوع پر بحث کر لی اور اس رپورٹ کو اخبارات میں اشاعت کے لیے دے دیا۔

اس واقعہ نے سنسنی پیدا کر دی۔ ایک حیران و پریشان وزیر کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اسمبلی کو پارلیمنٹ کے فیصلے کی سرکلر کی نہ انہوں نے اسے چھپوایا اور نہ دیکھا وہ مشتبہ کیا۔ صرف چند ماتحت کلرک کی ہوئی نقلیں گشت کرا دی۔ لیکن معاملہ کی کوئی پیروی نہیں کی گئی۔

اس کے بعد ۱۹۵۷ء کے انتخابات آ گئے۔ ابھی تک جتنا حکومت نے مسلمانوں اور ان کی پالیسیوں کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ مسلمانوں نے کانگریس اور بیجے کا مقصد وعدہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جو مقصد کہ انہوں نے ایک جنسی زبان و تہذیب کے سلسلے میں کیا۔ مارکانگریس نے ایک مرتبہ پھر اردو زبان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا وعدہ کر لیا۔ منشور میں یو۔ پی کا نفاذ شدہ رپورٹ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس طرح کے وعدے بہت پہلے چوڑے کر دیے کہ اردو کو ہندی علاقہ میں دوسری زبان ہو جیسا چاہتے تھا مگر اس کے لئے کوئی قابل اعتماد قدم نہیں اٹھائے گئے۔

اس دوران بہار کے پرجوش وزیر اعلیٰ مسٹر جگن ناتھ مشرا جو اپنی کرسی کو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ حزب خلاف اور داخلی جماعت کے مخالفین کے، جن کے دہلی میں صاحب اختیار حلیف موجود تھے، دباؤ میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک حد تک ریاست کے بعض اضلاع میں اردو کو ثانوی زبان بنانے کا حکم جاری کر دیا۔

اس اعلان نے مسٹر مشرا کو سیاسی طور پر سہارا دیا لیکن اس نے اردو والوں کے حلقوں کو دو لخت کر دیا۔ بعض نے اس کو سیاسی فتح قرار دیا جب کہ بعض نے سمجھا کہ اگر ایک طرف اس سے خفیف سا فائدہ ہوگا تو دوسری جانب اس سے دبی ہوئی عداوتیں اور نزاعیں تازہ ہو جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جلد ہی ریاست کے بعض حصوں اور شہروں میں مخالف اردو ہنگامے شروع ہو گئے۔

اس وقت کے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر وی پی سنگھ نے دیکھا کہ مسٹر مشرا نے دو طرفہ خیر دو کی جیت لی انہوں نے بھی انتخابات میں حامیان اردو کو خوش کرنے کے لیے ایک آرڈیننس جاری کر دیا کہ مغربی اتر پردیش میں اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت حاصل ہوگی۔ لیکن نہ وہ خود اور نہ ان کے بعد میں آنے والے وزرائے اعلیٰ اس آرڈیننس کو قانون کی شکل دے سکے۔

خود کانگریس پارٹی اندرونی طور پر اس معاملے میں بٹی ہوئی تھی۔ اور اس میں بعض نہایت با اختیار عناصر موجود تھے۔ اسی طرح پارٹی سے باہر شاونیت پسند اردو کو ذلیل و پست رکھنے کی جانب مائل تھے۔ آرڈیننس جاری ہونے کے بعد سے اتر پردیش میں کئی اردو کے خلاف ہنگامے اور مظاہرے ہو چکے ہیں۔ اب بھی حالت نازک اور پریشان کن ہے۔

ابتداً لسانی تعصبات اور متقابل مفادات جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے کمیٹی نے مصلحت اندیشی کو کام میں لا کر ثانوی زبان کے درجہ کے تنازعہ سے اجتناب برتا۔

دستور میں کیا کہا گیا تھا؟ اس میں پہلے زبان کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو اور ہندی کے درمیان فصل پیدا کیا۔ اور جب کبھی موقع ملا رقابتوں اور دشمنیوں کو ابھارا۔

حقیقی طور پر دینی معاشرے کا ڈھانچہ تیار کرنے کی جدوجہد دشوار ہے۔ اردو اور ہندی دونوں ایک متحدہ کلچر کی دین ہیں اس لیے ضروری ہے کہ دونوں کی اس طرح پرداخت کی جائے کہ وہ اپنا اپنا مخصوص رول ہماری قومی زندگی میں ادا کر سکیں یہ تھا خیال۔

ہندی کو مختلف النوع کلچروں کو متحد کرنے کے لیے بطور دفتری اور رابطہ کی زبان تسلیم کر لیا گیا اور صحیح تسلیم کیا گیا۔

آئین کا فقرہ ۳۵۰ اس چیز کو با اختیار حکم نامہ کی شکل دے دیتا ہے کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ اس کے بعد جب کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کا پرائمری اسکول کسی ایسے گاؤں یا میونسپل وارڈ میں کھول

دیا جائے جہاں اردو بولنے والوں کا تناسب آبادی میں دس فیصد ہو۔ یہ بھی سفارش کرنے کے خواہش مند تھے کہ اس قسم کی سہولت ملنی چاہیے لیکن کمیٹی جہاں تک ممکن تھا علیحدہ اسکول کھولنے کی مخالف تھی۔ ایسی جماعتوں اور اسکولوں کا اضافہ ان مقامات پر اچھا ہوتا جہاں دونوں زبانیں جاننے والے اساتذہ موجود ہوں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ موجودہ افراد کو اردو رسم الخط سیکھنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ یہ بھی مفید ہوتا اگر درسی کتب مشترک ہوتیں، صرف رسم الخط کو الگ الگ رکھنے کی ضرورت تھی۔

کمیٹی اس بات کی آرزومند تھی کہ سہ لسانی فارمولا ہندی بولنے والی ریاستوں میں قابل عمل بنایا جائے۔ اس کا مطلب ہوگا ہندی (ثانوی کی سطح پر سنسکرت کو ہندی کے ایک جز کی حیثیت سے شامل کیا جا سکتا تھا) اردو یا کوئی دوسری جدید ہندستانی زبان تا کہ اس علاقے کی دوسری لسانی اقلیت کی ضرورت کو پورا کیا جا سکے اور انگریزی یا مغرب کی کوئی دوسری جدید زبان۔ غیر ہندی ریاستوں میں اردو بولنے والوں کے لیے سہ لسانی فارمولا چار لسانی فارمولا بن جائے گا۔ جو برابر محنت کرتے رہے ہیں کہ ان کی خواہش ہے کہ ان کے بچے اردو سیکھیں ان کو ہندی، انگریزی اور علاقائی زبان سیکھنی پڑے گی۔ یہ ان کی شدید خواہش کا ایک خوش آئند اظہار تھا کہ انھوں نے قومی معیار شامل کیا۔

کمیٹی سے کہا گیا کہ اتر پردیش اور بہار میں سہ لسانی فارمولے سے متعلق پارلیمنٹری ہدایت کو مسخ کر دیا گیا ہے جہاں اردو کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ ہریانہ کے علاقہ میو میں میو قوم کی معقول آبادی ہے جو اردو بولتی ہے۔ وہاں تعلیمی پالیسی یہ ہے کہ ہندی، اردو اور تیلگو پڑھائی جائے۔

مسلمان والدین بالخصوص متوسط طبقے میں جو اس بات کے خواہش مند ہیں کہ وہ ثقافتی ترکہ اردو کی شکل میں منتقل کریں، ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں بھیجیں جن کا انتظام مذہبی طبقے کے ہاتھ میں ہے اور جہاں ان کو تقلید پسندی اور علیحدگی کی تربیت دی جائے۔ کمیٹی نے بڑی حد تک تشویش کے ساتھ سنا کہ تقسیم ملک کے بعد سے ان اداروں کی تعداد سیکڑوں گنا زیادہ ہو گئی ہے۔

اتر پردیش، بہار، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں تعلیمی سہولتوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس سیاق میں آندھرا پردیش نے نظام کے ابتدائی دور کی روایت کو قائم رکھا ہے۔ یہ چیز مفید رہے گی کہ تحقیق اور ڈاکٹریٹ کی سطح پر پوسٹ گریجویٹ کام کے لیے دو بڑے مراکز قائم کیے جائیں۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ اس قسم کا ایک مرکز شمال میں، دوسرا جنوب میں۔ ترجیحاً حیدرآباد میں قائم کیا جائے۔

امتیاز کو دور یا کم کرنے والا خاص علاقہ انتظامیہ کے دائرے میں ہے۔ ایک صحیح جمہوری حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد قوم کے ساتھ ایک ایسی زبان میں رابطہ قائم کرے جس کو وہ سمجھتے ہوں۔ اس لیے کمیٹی نے یہ بات سمجھ لی کہ مقامی افسران کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ اردو سیکھیں تاکہ اردو بولنے والوں سے ان ہی کی زبان میں معاملہ کیا جا سکے۔

اسی طرح یونین اور ریاستوں کی حکومتوں کے لیے یہ مفید رہے گا کہ وہ اپنے سرکاری خبرنامے، اردو اخبارات اور جریدوں کو اردو میں بھیجیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کو اردو بولنے والوں کی ثقافتی ضروریات کا مناسب خیال رکھنا چاہیے اور اس کے مطابق وقت دینا چاہیے۔

رپورٹ بہت جامع ہے اور اگرچہ دوسرے مختلف پہلوؤں کی جانب اتفاق کے مطابق دھیان دینا چاہیے جو اردو بولنے والی اقلیت کو قومی معیار کے ساتھ جوڑنے میں ممد و معاون ہوں گے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے پھر بھی قیادت کو چاہیے کہ وہ یہ دیکھنے کے لیے مناسب قدم اٹھائے کہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کو مساوات اور عزت و وقار کی بنیاد پر متحد کیا جا رہا ہے۔ اور انتہائی توجہ کی مستحق ہے۔

●●

وائی ۔ دی ۔ گنکووسکی

رُوس میں اردو زبان اور ادب کا مطالعہ

روس میں ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ ۱۸ ویں صدی کے اختتام پر شروع ہوا ۔ اس سلسلہ میں لیبدیف نے (۱۸۱۷ - ۱۷۴۹ء) سب سے پہلے ۱۸۰۱ء میں "دیسی و مخلوط ہندوستانی بولیوں کی قواعد" لکھی کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں شائع کی گئی تھی اس میں اردو کے بارے میں چند جملے اور اردو گرامر کے متعلق بیش بہا معلومات بہم کی گئی ہیں ۔

۱۹ویں صدی کے آخر میں شمالی ہندوستان کی بولیوں کے موضوع پر روس میں ۲۰ ہاں مقالہ شائع کیا گیا ۔ اسے ماسکو یونیورسٹی کے مشہور مستشرق پروفیسر پتروف نے قلمبند کیا تھا ۔ اس میں اردو زبان کے آغاز کے مسئلہ پر بحث کی گئی ۔ اس کے قواعد میں اردو زبان و ادب پر غیر ملکی مصنفوں کی تصنیفات کا ایک جائزہ بھی شامل ہے اس جائزہ میں پتروف نے اردو ادب کی اہمیت کا پوری طرح احساس کیا ۔ ۱۸۷۰ء میں روسی علم الہند اسکول کے بانی میناییف نے "سیلون اور ہندوستان کے مضامین" کے زیرعنوان ایک کتاب لکھی ۔ اس میں میناییف نے اردو زبان و ادب کے متعلق بیش بہا سائنسی معلومات تحریر کی ہیں ۔

۲۰ویں صدی کے آغاز میں روس میں اردو زبان کی قواعد پر کئی کتابیں شائع ہوئیں ۔ جسے ورگینکو، گلفرڈنگ اور کیلو نے مرتب کیا تھا ۱۸۹۹ء میں گلفرڈنگ نے حیدر بخش حیدری کی مشہور تصنیف "طوطا کہانی" اور دیگر نصابی کتب کو روسی زبان میں پیش کیا ۔ روسی قارئین کی آسانی کے لئے "طوطا کہانی" کے ساتھ ایک مختصر و جامع لغت بھی منسلک تھا جس میں اردو کے مشکل الفاظ کو روسی زبان میں واضح کیا گیا تھا ۔

لیکن ۱۹۱۷ء سے پہلے اردو زبان و ادب کا روس میں مطالعہ ایک شوقیہ نوعیت کا تھا ۔ اکتوبر انقلاب کے بعد اس کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا گیا اور پچھلے ۴۱ برسوں کے دوران میں ایشیائی زبانوں اور ادب سے سوویت یونین کی دلچسپی کافی حد تک بڑھی ۔ ان زبانوں میں اردو بھی شامل ہے ۔

۱۹۲۰ء میں ماسکو اور پیتروگراد (اب ماسکو) میں جدید مشرقی زبانوں کا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا ۔ اور سوویت ماہرین علم الہند بہترین روایات کو فروغ دینے کی پوری کوشش کر رہے ہیں ۔

۱۹۲۲ء میں کلیاگن کی تصنیف "اردو قواعد" ماسکو سے شائع ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں غالب کی غزلوں کا پہلا روسی ترجمہ شائع کیا گیا۔ اکادیمیشین برانیکوف جو ہندوستانی زبانوں کے انتہائی ممتاز عالم تھے، انہوں نے تقریباً دو سو کتابیں تصنیف کیں، جن میں کئی تصانیف اردو زبان و ادب کے متعلق ہیں۔ انہوں نے ۱۹۲۶ء میں لینن گراد سے ہندوستانی کی جامع قواعد (اردو) شائع کی اور ۱۹۳۰ء میں اردو زبان و ادب کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ ۱۹۲۴ء میں پہلی ہندوستانی (اردو، ہندی) نصابی کتاب طبع ہوئی جو آج بھی ہندی اور اردو کے عالموں کی دلچسپی کا سبب ہے۔ اسی سال برانیکوف نے پریم چند کے شاہکار افسانوں کا ایک مطالعہ شائع کیا تھا۔ برانیکوف کے ساتھ ہی اردو مطالعے کے میدان میں ممتاز ترین ماہرِ زبان جیسے کلیاگینا، سوتیکوف، بیکروتی اور دیگر افراد تخلیقی کاموں میں مصروف رہے ہیں۔

اس صدی کی تیسری دہائی میں برانیکوف کی ہدایت کے تحت بیکروتی اور کراسنودبسکی نے اردو۔ روسی لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ جسے ۱۹۵۱ء میں شائع کر دیا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں روسی، اردو لغت جاری کیا گیا جس کی ترتیب تیاری میں کئی اسکالروں نے حصہ لیا۔ اردو بیشٹ نے اس کے لئے قواعد پر ایک مضمون تحریر کر کے شامل کرایا تھا۔ برانیکوف کے رفیق بیکروتی، شیرنیف، سوتیکوف اور زوگراف نے اردو زبان و ادب کے مطالعہ میں قابل قدر اضافہ کیا۔ زوگراف کی تصانیف ہیں: "۱۹ویں صدی کی اردو نثر کی خصوصیات" (۱۹۵۱ء) "۱۸ویں صدی کے آخر اور ۱۹ویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی" (۱۹۶۱ء) "اردو کی تشکیل کے مسائل" (۱۹۵۹ء) اور "ہندی اردو، ہندوستانی" مستند مطالعے ہیں۔ علاوہ ازیں زوگراف اردو ادب کے کلاسکی سرمائے کو روسی زبان میں ترجمہ کے کام میں بھی لگے رہے۔ انہوں نے میر امن کی لافانی تصنیف "باغ و بہار" کو تبصرے اور حواشی کے ساتھ روسی زبان میں پیش کیا۔ اس ابتدائیہ میں ۱۸ویں صدی کے آخر اور ۱۹ویں صدی کے آغاز میں اردو ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا کی تصنیف "امراؤ جان ادا" کو بڑے اہتمام و اہمیت کے ساتھ روسی میں شائع کیا گیا۔ اس کے ابتدائیہ میں ۱۹ویں صدی میں اردو نثر کے ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی۔ ان شاہکاروں کے علاوہ ۱۹۵۵ میں "آج کل کی ہندوستانی میں پیچیدہ افعال" ۱۹۶۰ء میں "آج کل کی اردو میں سیاسی اصطلاحات" از سوتیکوف اور ایسی ہی کئی تصنیفیں تیار کی گئیں۔ ان کے علاوہ حال ہی میں نوجوان سوویت اسکالروں نے "پریم چند اردو نثر کا ارتقاء بالخصوص نذیر احمد کی نثر کا جائزہ" شائع ہوا ہے۔ پولاثوا اور غفاروف نے مرزا کی شاعری پر اور لیبوف نے نظیر اکبرآبادی پر مطالعہ پیش کیا۔ رنبیر وہرا نے کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک پر مقالے لکھے اور اسپاہانس نے سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر مضمون تحریر کیا۔

سوویت قارئین کو اردو ادب کے متعلق زیادہ گہری معلومات بہم پہنچانے کے لئے ترقیاتی اشاعت گھر کی طرف سے ہندوستانی نقادوں کی تصانیف کا روسی ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ان میں سید احتشام حسین کی "اردو ادب کی تاریخ" اور سجاد ظہیر کی "روشنائی" کا ذکر خصوصاً ہو سکتا ہے۔ "روشنائی" میں ہندوستانی انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل اور ابتدائی اقدامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو زبان و ادب کے سائنسی مطالعہ کے ساتھ ہی اردو ادیبوں، شاعروں، نقادوں، اور صحافیوں کی تخلیقات کو روسی زبان میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اب تک سوویت زبانوں میں یہ تراجم کئے گئے ہیں۔ اس سرگرمی کا کسی حد تک اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان اردو کی ۹۰ کتابوں کا ترجمہ کیا گیا اور ۲۳ لاکھ ۱۲ ہزار جلدیں مجموعی طور پر شائع کی گئیں۔ ان سے ۲۳ کتب کے روسی تراجم اور ۶۷ دیگر کتابیں سوویت یونین کے دوسری زبانوں میں ترجمہ و شائع کی گئیں۔ مرزا غالب، میر امن اور محمد اقبال کی تخلیقات کے تراجم کے ذریعے سوویت یونین کے پڑھنے والوں کو اردو کے کلاسکی ادب سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ پریم چند کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں کو روسی اور دوسری سوویت زبانوں میں شائع کیا جا چکا ہے۔ مثلاً گئودان وغیرہ۔

کرشن چندر سوویت قارئین میں بہت مقبول ہیں۔ ان کے معاصر ادیبوں کے مقابلے میں ان کی تخلیقات کے تراجم زیادہ اور کئی زبانوں میں چھاپے گئے ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔ "آگ اور پھول" (۱۹۵۲ء) "انتخاب" (۱۹۵۳ء) "پانی کا درخت" (۱۹۵۵ء) "چور"، (۱۹۶۲ء) "جب کھیت جاگے" (۱۹۵۳ء) "آسمان روشن ہے" ۱۹۶۰ء "شکست" (۱۹۵۸ء) "ایک عورت ہزار دیوانے" (۱۹۶۲ء)۔ خواجہ احمد عباس کے ناول "بھارت کا لال" "گیہوں اور گلاب" "باپ بیٹے" کم مقبول نہیں۔

راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، منٹو، جلیس، حاجرہ مسرور، صدیقہ بیگم کی کہانیاں سوویت عوام میں ہردلعزیز ہیں۔

شعری ادب میں فیض احمد فیض، سردار جعفری، احسان دانش وغیرہ کی نظمیں اور غزلیں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ بعض روسی شاہکار مطبوعات کو اردو میں منتقل کرنے کا کام بھی ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان ۸۲ کتابیں اردو میں چھاپی گئیں۔ اس کے علاوہ "سوویت یونین" میگزین اردو میں شائع ہوتا ہے۔

(ماخوذ قومی زبان کراچی، ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۳ء)

مراسلات:

فرخ جلالی
پٹنہ، ۳ مارچ ۱۹۹۳ء

فارسی ادب کی شخصیات۔ ایک مطالعہ

آپ نے رات کو پڑھنے کے لیے جو دیا اس میں ایک تازہ کتاب "فارسی ادب کی شخصیات" بھی شامل تھی مصنف ہمارے دوست ولی الحق انصاری فرنگی محلی لکھنوی کے شاگرد ہیں اور شاید لکھنو وطن ہے گمان ہے کہ یونیورسٹی میں لکچرر ہوں گے۔ ان کے استاد گرامی جب عرفی پر تحقیق کر رہے تھے تب وہ علی گڑھ آتے اور بندہ بے عرفی کے عالم میں بھی ان کی خدمت کرتا۔ بندہ کے کتاب خانہ کے نہایت اجامع دیوان عرفی قلمی او قصاید عرفی (قلمی) سے ان کا استفادہ جاری رہتا۔

کتاب کھولتے ہی ایک نسب نامہ پر نظر پڑی معلوم ہوا کہ مصنف یک جدی نکلے۔ حضرت علی کے والد کا نام ابو طالب حسب معمول دیا ہے یہ ابو کسی عرب کا نام نہیں ہو سکتا ان کا نام مغیرہ بتایا گیا ہے۔ حضرت زید شہید کے تین بیٹے تھے چھوٹے بیٹے موسیٰ موتم الاشبال کی اولاد میں سادات بلگرام مہارہرہ کو اتمہ رہا اور سادات بارہہ میں حضرت زید کے بڑے بیٹے حسین ذی الدمعہ ہیں جو میرے اور مصنف کے جد ہیں ہندستان میں ان کی اولاد کہیں کہیں ہے تیموری مغلوں کے دفتر میں ہم سادات رسولدار کہلاتے ہیں سید حسین ذی الدمعہ کو افغانستان کے افغان بعد مرگ افغانستان لے آئے اور وہیں دفن کیا قبر مع کتبہ کے موجود ہے یہ پٹھانوں کی پرانی عادت ہے سادات کے ساتھ۔ یہ سید کا لفظ بعد میں اضافہ کیا ہوگا۔ ورنہ بنی فاطمہ کو عرب میں شریف کہتے ہیں شجرہ میں نام کافی غلط ہیں خیر!

پہلا مضمون امان اللہ حسینی پر ہے ان کی کتابیں آپ کے یہاں ہیں یہ مہابت خاں کے بیٹے تھے [illegible] وطن تھا [illegible] والا تھا شیراز کا [illegible]

جب خسرو نے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو مہابت خان کا بھائی خسرو کا شریک تھا۔
مہابت خان نے جہانگیر کو خوش کرنے کے لیے بھائی کی گردن اتاری یہ اس کے ترک (مغل) ہونے کی پہچان تھی۔

مصنف نے اپنے طرز تحقیق میں امان اللہ کی ولادت کی بحث اس وقت سے شروع کی ہے جب اس کا
دادا تیمور بیگ طفل نادان ہوگا۔ ہماری قوم (تحقیق کرنے والے) ایسے ہی حرف ناشناس افراد کی وجہ سے انگشت...

مضمون کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ولی انصاری صاحب کے پاس ایک دیوان امانی ہے ویسے امانی کا
دیوان لندن میں بھی ہے۔

غلام علی آزاد کی تاریخ تولی پر ایک مضمون ہے جس میں مرزا امید قزلباش کا تعارف موجود ہے وفات
انکی ۱۱۵۹ھ کی بتائی ہے اور یہ بھی لکھا ہے "کہ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہندستان آئے"۔

دیکھیے ان کی عادت ہے کہ لکڑ پوتے کو لکڑ دادا سے پہلے پیدا کرتے ہیں۔ میں یا آپ کیا کر سکتے ہیں۔

ہائے نواب ناظم رامپوری کی غزل جس کی ردیف "ہے" غلط ہے اور قافیہ کس قدر غلط ہے اس غلطی کی وجہ
ہوتی ہے جہاں سوجھتا نہیں۔ اورنگ زیب کا زمانہ شاہزادگی میں نام مثل دارا شکوہ کے اورنگ زیب بہادر تھا
(بہادر چنگیز خانی فوج کے ایک عہدہ کا نام تھا) عالمگیر اورنگ زیب بہادر کے بڑے بیٹے قطب الدین جب
تخت نشین ہوئے تو ان کا نام قطب الدین بہادر شاہ عالم مشہور ہوا۔ مرزا امید قزلباش انہی بہادر شاہ عالم
کے زمانے کے ہیں ایک دوار دو شعر کے بھی مالک ہیں ویسے فارسی کے شاعر ہیں اب ان کی امید کا حال یہ ہوا کہ
۱۹۹۲ء میں وہ بہادر شاہ ظفر کے عہد کے ہو گئے۔

سید برکت اللہ عشقی بلگرامی مارہروی پر ایک نوٹ اسی مضمون میں ہے انکو اکبرآباد آگرہ میں مصنف
نے دفن کر دیا۔

سید برکت اللہ عشقی پیمی کا فارسی دیوان شاہ میاں احسن مارہروی نے نوے برس پہلے شائع
کر دیا ہندی کلام بھی چھپ چکا ہے۔ حضرت صاحب عالم ان کے پڑپوتے تھے مارہرہ میں ہر سال ان کا
عرس ہوتا ہے۔

حضرت صاحب عالم کی تحریر غالب بھی نہ پڑھ پاتے تھے۔ لہٰذا میں نے ان کا نام لے دیا
یہ کتاب تو اب تاریخ دلی الحق ہے۔

۱۴۱۲ھ۔

ڈاکٹر رحمت علی خاں
سالار جنگ میوزیم
حیدرآباد
۲۷-۴-۹۴

> خدابخش لائبریری کے ایک استفسار کے جواب میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، رضا لائبریری اور سالار جنگ میوزیم کو لکھا گیا۔
> کہ کسی فرمان میں کہیں 'ز' کے بجائے 'غازی' کو 'ذ' سے لکھا دیکھا گیا ہے:
> کم سے کم ایک جواب آیا جو درج ذیل ہے۔ (ادارہ)

لفظ غازی / غاذی کے بارے میں

ویسے تو سالار جنگ میوزیم میں بابر کے سکے اور مخطوطات وغیرہ نہیں ہیں لیکن میری تحقیق کے مطابق لفظ غاذی مندرجہ ذیل تواریخ اور دستاویزات پر دستیاب ہے:

۱۔ بابر نامہ تحت واقعات ۹۳۳ھ، ۲۔ نفائس المآثر از علاء الدولہ کا ۳۔ مرحوم پروفیسر شیروانی حیدرآباد کے پاس بابر کے ایک وصیت نامے کی کاپی ہے جس پر بابر کی مہر لگی ہوئی ہے اور غاذی کندہ ہے۔ ۴۔ نیشنل میوزیم، دہلی میں جو مغلیہ سکے ہیں ان پر بھی غاذی کندہ ہے۔ اکثر غازی "ذ" سے لکھا گیا ہے۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

●●

از کلکتہ
ریاض الرحمٰن قدوائی
لکھنؤ

ایک روزنامچہ کے بارے میں

میرے پاس ایک ڈائری ہے اس کے مؤلف جناب پنڈت دھرم نرائن بکھر (بکسر) تھے جو کہ اندور میں ریزیڈنٹ جنرل کے میر منشی تھے۔ یہ انگریز حاکم کے ساتھ تقریب ہر سال پورے مدھیہ پردیش کا دورہ کرتے تھے۔ اسطرح سے ہر مقام پر مقام کی تفصیل لکھتے تھے۔ ایک اور دورے میں وہ ریزیڈنٹ کے ساتھ دہلی گئے وہاں دربار ہوئے تھے ان کا تفصیلی حال درج ہے۔ پھر حاکمان مدھیہ پردیش کے خطاب اور سلامی وغیرہ کی تفصیلات ہیں۔ اس کی صرف دو جلدیں ہیں ایک تو یکم نومبر ۱۸۷۶ سے لیکر فروری ۱۸۷۸ تک ہے۔ دوسری جلدیں فروری ۱۸۷۸ سے لیکر اکتوبر ۱۸۸۵ تک ہے۔

مخطوط میں کئی جگہ سے عبارت خط ذرا ناقص ہیں۔

ایک نادر روزنامچہ

فہرستِ موضوعات/عنوانات

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے ہماری گذارش پر مولوی سید منظر علی سندیلوی (م ۱۹۱۱ء) کے ۲۵ ضخیم جلدوں والے روزنامچے کا ایک ملخص تیار کیا تھا جو ۱۹۹۰ء میں لائبریری نے شایع کیا تھا۔
ہاشمی صاحب نے اب بہ کمالِ مہربانی اس روزنامچہ کا ایک تفصیلی انڈکس تیار کر دیا ہے۔ ہم اس کے لیے ان کا شکرگزار ہیں۔ (مرتب)

از

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

فہرست عنوانات ایک نادر روزنامچہ

باب اوّل۔ واقعات ہند:

باب دوم:

باب سوم:

باب چہارم:

باب پنجم:

مشاہیر کے احوال کیلئے اہم مآخذ

صوفیہ

- تذکرۃ الاولیا ——— فریدالدین عطار
- سیر الاولیا ——— میر خورد کرمانی
- اخبار الاخیار ——— عبدالحق محدث دہلوی
- تاریخ سلسلہ فردوسیہ ——— معین الدین دردائی

فهرست اسامی های بزرگان کتاب تذکرة الاولیا

	در ذکر جعفر صادق رض	۲۱۱	در ذکر ابو سلیمان دارانی رح	۲۴۴	در ذکر [illegible] رح	[illegible]	در ذکر ابو بکر واسطی رح
	در ذکر اویس قرنی رض	۲۱۸	در ذکر محمد سماک رح	۲۴۳	در ذکر ابو عبدالله [illegible] رح	[illegible]	در ذکر ابو عمرو نجید رح
	در ذکر حسن بصری رح	۲۲۴	در ذکر محمد بن اسلم الطوسی رح	[illegible]	در ذکر ابو محمد رویم رح	۲۶۰	در ذکر جعفر خلدی رح
	در ذکر مالک دینار رح	۲۳۳	در ذکر احمد حرب رح	۲۴۵	در ذکر ابن عطا رح	[illegible]	در ذکر ابو الخیر اقطع رح
	در ذکر محمد واسع رح	[illegible]	در ذکر حاتم اصم رح	[illegible]	در ذکر ابراهیم داود رقی رح	[illegible]	در ذکر ابو عبدالله رح
	در ذکر حبیب عجمی رح	۲۳۶	در ذکر سهل بن عبدالله تستری رح	[illegible]	در ذکر یوسف اسباط رح	[illegible]	در ذکر ابی اسحق ابراهیم رح
	در ذکر ابو حازم مکی رح	۲۴۰	در ذکر معروف کرخی رح	۲۸۰	در ذکر ابو یعقوب رح	[illegible]	در ذکر ابو الحسن خرقانی رح
	در ذکر عتبة بن الغلام رح	۲۴۳	در ذکر سری سقطی رح	۲۹۰	در ذکر سمنون محب رح	[illegible]	در ذکر ابو بکر شبلی
	در ذکر رابعه العدویه رح	۲۶۲	در ذکر فتح موصلی رح	۲۹۳	در ذکر ابو محمد مرتعش رح	۴۴۱	در ذکر ابو نصر سراج رح
	در ذکر فضیل عیاض رح	۲۶۳	در ذکر احمد حواری رح	۲۹۵	در ذکر ابو عبدالله بن محمد [illegible]	۴۴۳	در ذکر ابو العباس رح
	در ذکر ابراهیم ادهم رح	۲۶۶	در ذکر احمد خضرویه رح	۲۹۷	در ذکر ابو الحسن بوشنجی رح	۵۴۳	در ذکر ابو اسحق رح
	در ذکر بشر حافی رح	۲۷۴	در ذکر ابو تراب نخشبی رح	۲۹۸	در ذکر محمد علی حکیم الترمذی رح	۵۴۳	در ذکر محمد [illegible] الدینوری
۱	در ذکر ذوالنون مصری رح	۲۷۶	در ذکر یحیی معاذ رح	۳۰۲	در ذکر ابو بکر وراق رح	۵۵۲	در ذکر ابو اسحق ابراهیم رح
۱	در ذکر ابا یزید بسطامی رح	۲۸۹	در ذکر شاه کرمانی رح	۳۱۰	در ذکر عبدالله منازل رح	۵۵۹	در ذکر ابو بکر صیدلانی رح
۱۱	معراج بایزید بسطامی رح	۱۹۲	در ذکر یوسف بن الحسین رح	۳۱۳	در ذکر علی سهل اصفهانی رح	۵۶۰	در ذکر ابو حمزه رح
۱	مناجات بایزید بسطامی رح	۱۹۹	در ذکر ابو حفص حداد رح	۳۱۴	در ذکر شیخ خیر نساج رح	۵۶۱	در ذکر ابو علی الدقاق رح
۱۶	در ذکر عبدالله بن مبارک رح	۲۰۰	در ذکر حمدون قصار رح	۳۱۶	در ذکر ابو حمزه خراسانی رح	۵۷۱	در ذکر ابو علی محمد رح
۱۷	در ذکر سفیان ثوری رح	۲۱۰	در ذکر منصور عمار رح	۳۱۸	در ذکر احمد مسروق رح	۵۷۳	در ذکر ابو علی احمد رح
۱۸	در ذکر شقیق بلخی رح	۲۱۲	در ذکر احمد بن عاصم رح	۳۱۹	در ذکر احمد [illegible] رح	۵۷۵	در ذکر ابو الحسن [illegible]
۱۰	در ذکر امام اعظم رح	۲۱۶	در ذکر عبدالله خبیق رح	۳۲۱	در ذکر ابو علی الجوزجانی رح	۵۸۶	در ذکر ابو الحسن [illegible] رح
۱۹۱	در ذکر امام شافعی رح	۲۲۰	در ذکر جنید بغدادی رح	۳۲۲	در ذکر ابو بکر کتانی رح	۵۹۳	در ذکر ابو العباس [illegible]
۱۹	در ذکر امام احمد حنبل رح	۲۲۸	در ذکر عمرو بن عثمان مکی رح	۳۲۷	در ذکر عبدالله خفیف رح	۵۹۴	در ذکر ابو عمرو ابراهیم رح
۲۰۱	در ذکر داود طائی رح	۲۳۱	در ذکر ابو سعید خراز رح	۳۳۲	در ذکر ابو محمد جریری رح	۵۹۵	در ذکر ابو الحسن [illegible] رح

سیر الاولیاء (مشائخ چشت)

میر خورد (کرمانی)

فہرست مطالب

عبدالحق محدث دہلوی

فہرست منقول حکایات اخبار الاخیار فی اسرار الابرار

تاریخ سلسلۂ فردوسیہ

معین الدین دردائی

فہرست مضامین

بنام مولوی امجد علی

(علی گڑھ میگزین ، جلد ۳۲ ، نمبر ۱ ، ص ۲۱۸)

مولوی امجد علی ایم۔اے ، مولانا یحییٰ علی خاں ساکن صادق پور (پٹنہ) کے فرزند تھے ۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نمایاں حصہ لینے کے جرم میں مولانا یحییٰ خاں کو انگریز کی عدالت نے عبور دریائے شور کی سزا دی ۔ چنانچہ مولانا کا انتقال اسی قید فرنگ میں بمقام پورٹ بلیر ۱۸۶۸ء میں ہوگیا ۔ اُن کے دو بیٹے محمد عیسیٰ اور عبد القدیر تھے ۔ محمد عیسیٰ نے اس خیال سے کہ مبادا پھر کوئی آفت آ جائے اور یحییٰ علی کا بیٹا سمجھ کر مجھے پھانسی دے دی جائے ، اپنا نام بدل کر امجد علی رکھ لیا ، اور ایم ۔ اے کرنے کے بعد بنارس ، علی گڑھ اور الہ آباد میں پروفیسر رہے ۔ اپنے وقت میں آپ کا شمار عربی زبان کے بڑے فاضلوں میں ہوتا تھا ۔ ۱۹۲۱ء آپ کا سالِ وفات ہے ۔ مگر جب تک زندہ رہے غریب الوطنی میں فاضل باپ کی لاچاری کی موت سے نہایت درجہ غمگین اور دل گیر رہے ۔

(۱)

جناب مولانا مولوی سید امجد علی صاحب ایم ۔ اے !

آپ کا عنایت نامہ اگرچہ دل خراش تھا ۔ جو کچھ مصائب و ترددات و پریشانی فرماویں بجا ہے ۔ بہرحال ''از تن برضائے قضا دادن چارہ نیست ۔'' قبل آنے عنایت نامے آپ کے تاریخ . . .۱ مقرر ہو چکی ہے . . .۱ ۲۱ جولائی

۱۔ ان دونوں جگہوں سے کاغذ کو کیڑے نے کھا لیا تھا اس لیے الفاظ نہیں پڑھے جا سکے ۔

روز یکشنبہ ۔ معلوم نہیں آپ کی حالت کے مناسب ہے یا نہیں ؟ بہرحال یہ تاریخ مقرر ہو گئی ہے ۔ کاغذاتِ معمولی چھپ گئے ہیں ۔ دو تین روز میں روانہ ہوں گے ۔ والسلام

خاکسار ، سید احمد

علی گڑھ ، ۸ جون ۱۸۹۵ء

محمد موسیٰ کا حال معلوم نہیں کس طرح ہے اور آپ کے پاس ہیں یا نہیں ۔

(۲)

مخدومی و مکرمی مولوی سید محمد امجد علی صاحب !

۲۱ جولائی کو . . . ۱ کا اجلاس ہوگا ۔ اُمید کہ آپ اس میں شریک ہوں گے ۔ مگر اب تک آپ نے اطلاع نہیں دی کہ کس وقت اور کس تاریخ آپ تشریف فرما ہوں گے ۔ اگرچہ وقتِ اجلاس گیارہ بجے لکھا گیا ہے مگر ہم ساڑھے بارہ بجے تک انتظار کریں گے تاکہ دہلی سے جو لوگ آنے والے ہیں وہ بھی آ جاویں ۔ والسلام

خاکسار ، سید احمد

علی گڑھ ، ۱۷ جولائی ۱۸۹۵ء

(۳)

مخدومی و مکرمی مولوی سید امجد علی ایم ۔ اے !

میری چٹھی پہنچنے کے بعد مسٹر تھیوبالڈ پرنسپل کالج نے کیا کہا ؟ میری رائے جو اُردو میں چھپی ہوئی ہے اُس کو کسی سے سنا اور مطالعہ فرمایا یا یونہی ڈال دی ؟ اگر آپ از راہِ مہربانی سو روپیہ اپنی بخشش کے اسی مہینے میں بھیج دیں گے تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا ۔ والسلام

خاکسار ، سید احمد

علی گڑھ ، ۴ ۔ اکتوبر ۱۸۹۶ء

---

۱ ۔ ۔ ۔ عبارت دیمک نے کھا لی ہے ۔

LXXX.

ARTICLES NOT YET COLLECTED IN ANY BOOK

* KNOWLEDGE & SELF-KNOWLEDGE : Presidential address at Bihar students conference, Patna, Sep. 21, 1930. 13 p.

—Reprint from Calcutta Review

* SOME PAGES FROM DIARY OF AN INDIAN STUDE[
Modern Review, Aug. 1909, pp 135-141

—On Indian Muslims.

* SAIFUDDIN BAKHARZI : ZDMG, 1905: pp. 345-354

—Ruba'iyat of Bakharzi, (with a brief introduction), fro[
Ms preserved in Khuda Bakhsh Library.

* THE ORGANISM OF THE MUSLIM STATE UNDER T[
CALIPHATE: Annals of Bhandarkar Oritental Research Institu[
1920-21, pp. 129-141

* MOMIN HUSAIN OF YAZD: ZDMG, 1907. pp. 129-41

* A STUDY OF ISLAMIC UNITY :Visva Bharat i quarterly, 1926-[
pp. 370-80.

* ARABIAN POETRY: Visva Bharti quarterly 1923-24, pp. 296-302.

'MOHAMMEDAN VIEW OF ISLAM & CHRISTIANITY;
Muslim World, 1920, pp. 365-77

* * * *

LXXIX.

Savant — Theology — The schools of Jurisprudence — The Qadi — Philology — Literature — Geography — Religion — Manners and Moral —The Standard of Living — Municipal organization — The Festivals — Land products — Industry — Trade — Inland Navigation — Communication by road — Marine Navigation.

"My brother, Salahuddin, began his last work on Islamic studies — a tranlation of Professor A. Mez, "*Die renaissance des Islams*" from German into English on the 16th of July, 1927. He completed twenty three and a half out of the twenty-nine chapters by July 1931, when unfortunately he was taken ill and died on the 9th of August, 1931 The translation of the last five and a half chapters, which he left unfinished, was very kindly done by Dr. Margoliouth Professor of Arabic in the University of Oxford, who had taught my brother Arabic when the latter was a student at oxford in the late nineties. The first seventeen chapters of the book as well as chapters 23 to 29 were published in the magzine "Islamic Culture" at Hyderabad between the years 1928 and 1933 After my retirement from the Indian police service in August, 1934 I went to England. There, my sister-in-law, Mrs Evelyn Khuda Bakhsh, told me that she had carefully preserved the unpublished translation of the Renaissance of Islam by her husband, and that she desired to have the entire work published in the form of a book . . .

(From 'foreword', by Shahabuddin Khuda Bakhsh)

Of the total 517 pages, Salahuddin translated 439 pages and rest of the (439 – 517 =) 79 pages were done by Margoliouth.

Adam Mez, the author, was born in 1862 & died in 1917.

LXXVIII.

THE ORIENT UNDER CALIPHS. Calcutta University Press, 1920
470 p.

"In 1920 the University of Calcutta published my English translation of the first volume of Von Kremer's *Culturgeschichte des Orients*"

(From : 'Foreword' to *Studies : Indian & Islamic*)

(The book is not available in the Library, or elsewhere.)

STUDIES: INDIAN & ISLAMIC, (first edition 1927) ;
Reprinted, Delhi, Idarah-i-Adabiyat 1978. 275 p.

Contents: Foreword—Mohamed: The Prophet of God—Arabian poetry — The new world of Islam — Islamic Regeneration — The Arab Kingdom & its fall —The Book trade under the Caliphate — Islamica — A defence of Islam — The tales of Nasr-ed-din Khoja— The Shahnamah of Firdausi — The tragedy of Kerbala – My critics — Marriage & Family life among the Arabs — Social & political conditions under the Caliphate — Literary & Scientific activites under the Caliphate — The Caliphate: Its decline & fall — Just Human — Withered leaves – Impressions of Simla — Impressions of Darjeeling — Mahatma Gandhi — Sir Asutosh Mookerjee — C.R Das – Baba Frawn — Hindu-Muslim pact.

CONTRIBUTIONS TO THE HISTORY OF ISLAMIC CIVILIZATION Vol. 2 University of Calcutta, 1930. 303 p.

Contents: The origin and character of Islamic civilization — slam as a problem — The Muslim world of today — Education: Its cops and aims — Islam and the modern world — Persian poetry — The wakening of Islam — Harun ar - Rashid — The Arab Academies nd their Professors – The Kharijites under the first Omayyads — Ibn haldun and his history of Islamic civilization — The educatonal system the Muslims in the Middle Ages.

HE RENAISSANCE OF ISLAM translated from the German of iam Mez) Patna Jubilee printing & publishing house, 1937. 517 p.

Contents: The Empire — The Caliphs — The Princes of the npire – Christians & Jews – Shi'ah — The Administration — The zir — Finances — The Court — The Nobility — The Slaves — The

LXXVII.

MAXIMS & REFLECTIONS, London J.M. Dentt & Sons, 1916. 86p.
—Translated from the Persian

" It was the merest accident two years ago which took me, one fine January morning, to an old bookstall. Among the stock for sale I found a neglected heap, dusty and battered by the shocks of time. I cut the string, and lighted upon an exquisitely written Persian manuscript. It was not very old. In fact it looked quite modern. It was a collection of sayings—prose, poems were* perhaps a more appropriate description. It promised to be very interesting, and that promise it amply fulfilled. It bore no name, and the provokingly brief autobiography which preceded the text threw but scant and insufficient light upon its authorship."

(From 'foreword')

LOVE OFFERINGS, Calcutta, Art Press, 1923 66 p

" In this little book I have collected the 'prose Poems', or the 'Love offerings', which were published from time to time in the Calcutta Review ' 'If I may say so they are memories of a dead past. In revising the proofs lying before me, I have experienced a pleasure not unmingled with pain. Every one, or almost every one, of these little pieces has a story of its own . . . Like *Maxims and reflections*, these too are a blend of East and West'. They are meant for those who, with advancing years and maturing experience, realize that human society is compacted of tragedies."

(From 'foreword')

POLITICS IN ISLAM; Calcutta, Baptist Mission Press, 1920;
(4; 145 to 243=) 103 p
— Reprint from the Sir Asutosh Mookerjee Silver Jubilee Volume.

"It would be inaccurate to describe the pages lying before us as a mere translation of the *Staadsidee des Islams*, in von Kremer's *Gechichte der herschenden Ideen des Islams,* for I have incorporated into it the researches of Wellhausen, Goldziher and other English and continental scholars. It is Von Kremer enlarged, amplified"

(— foreword)

LXXVI.

THE WORKS OF S. KHUDA BAKHSH

BIBLIOGRAPHY of the Books & articles of S. Khuda Bakhsh (Salahuddin Khuda Bakhsh) M. A., B. C. L. (Oxon), Bar - at - Law ; Fellow of the Calcutta University ; Lecturer in History of Islam; Professor of the University Law College, Calcutta. (born 1875, died Aug. 9, 1931).

CONTRIBUTIONS TO THE HISTORY OF ISLAMIC CIVILIZATIO Vol I : (containing a translation of Von Kremer's *Culturegschichtl'ch Streifzuου auf dem Gebiete de Islams), 1905, 297 + xxv p.*

Contents : Translator's Introduction (41 p.)

Von Kremer's translation (pp. 43–118).

Salahuddin's addition : (pp. 119–297+35) :- The Arab before Islam–The Medieval conception of Islam — The Seljuke befor the crusades — The Omayyads and the Eastern Empire — A Christia Missionary — The Wizarat and Governorship under the Caliphate — Historical sketch of Muslim learning — Extracts from Ibn - Hazm' Jamharatu-n-Nasab: Khuda Bakhsh Library MS. — Appendices.

ESSAYS INDIAN & ISLAMIC. (First published, 1912). Reprinted Delhi, Idarah-i Adabiyat, 1977. 295p.

Contents : The Spirit of Islam — The Islamic conception o Sovereignty — The Shu'ubiyyah Movement in Islam its origin, it growth, and its results—Ghalib : an appreciation—My father : his life and reminiscences — Hindustani Literature — Thoughts on the presen situation.

HISTORY OF THE ISLAMIC PEOPLES : Translated from th German of Dr. Weil's *Geschichteder Islamiscchen Volker* ; Universit f Calcutta. 1914. 170+ viip.

Contents · Introduction (by Translator) — Mohamed & th ur'an — The Qur'an — The Elective Caliphate in Medina — Th mayyads in Damascus.

LXXV.

This writer, but the mouthpiece of the Indian Muslim bourgeoisie, is with them wherever they go, he and his scholarship. Even in his temporary lapse with them into radicalism, he never got ahead of them

— *Wilfred Cantwell Smith*

III

Mr. Salahuddin Khuda Bakhsh, who had studied at the University of Oxford, in his busy life as barrister and Professor at the University of Calcutta, found time to produce numerous original works connected with Islam and its history, and to give English dress to important German treatises dealing with these subjects, enriching them with his own observation — thus Von Kremer's brochure *Culturgeschichtliche Streifzuge*, in the second edition of the translation, is swollen into two stout volumes (Islamic civilization, Calcutta 1905, 1930). Since his Oxford days he had maintained regular correspondence with the present writer, and when he undertook to translate the *Renaissance* for Hyderabad Magazine Islamic Culture, asked me to peruse and make observations on the typescript before sending it to press, which I was very willing to do The last batch of typescript was returned to me by post, marked "Addressee Dead", a great shock and grief to me, thus learning that I had lost a valued friend of long standing, while the world had lost a man peculiarly well qualified to interpret East to West and West to East, owing to the variety of his attainments and the width of his sympathies. How wide they were was apparent to anyone who visited his overflowing library, bequeathed, I understand, to that which bears the name of his family at Bankipore (Patna).

— *D. S. Margoliouth*
Oxford, July 1937

LXXIV.

"... a wonderful phenomenon—undreamed of, unimagined, unhoped by the wildest hopes of man ... May the Muslim solidarity—for purposes Islamic—be merged into the higher, nobler, Indian solidarity—mightily single, splendidly whole". The whole article The New World of Islam (inspired by Lothrop Stoddard's book of that name), shows a vigorous and optimistic zeal for the renascence of Islam and Islamic society. The article Mahatma Gandhi is an idolization of that man and his programme, and an unrestrained admiration for "the spirit of justice, honour, righteousness" that he has infused.

All these political attitudes have their counterpart in his cultural interests. Previously his ambition had been hardly more than for Muslims to become English gentlemen; now he can say: "Orientals we are, and Orientals we must remain; and European culture can never be for the majority of us more than an incidental and subsidiary acquisition". The appearance of the new German orientalist review Islamica, which he cannot but praise, gives occasion for an impassioned plea for Easterners to undertake Eastern scholarship, not to remain for ever subservient to the West; and in Islamic Regeneration he pleads for the revival of Arabic, Persian and Hindustani education. This last item is of course the cultural aspect of Hindu-Muslim concurrence in the Non-co-operation movement.

But meanwhile the years were passing; the nationalist revolt collapsed for the nonce, and the Muslim bourgeoisie was betaking itself to isolation and a defensive alliance with the British. The Professor can then describe the Hindu-Muslim Pact as a sublime folly, denounce the Congress as a wanderer in rapturous dreams of unreality, and in his reaction despair of Islam and its culture in an independent India. "It is idle ... to look to Swaraj for the cure of our present ills, and equally idle ... to look to it for a reign of ... righteousness ... It will divide Indian humanity into two great unequal halves — Heaven for one and Hell for the other".

In fine, he is not a creative thinker. There was but one contribution that he could make ; and this he did make, assiduously, in spite of the bitter opposition that he met in his determination to spread modern ideas about Islam. This contribution was to those of his fellows (and they were not few) who wanted to be good bourgeois capitalists, but might have some doubts about its being hardly the right, the Muslim, thing to do. He would happily remove all their misgivings.

Such is Khuda Bakhsh. We cannot leave him without pointing out the hearty reception which his thinking received in the West. One after another of the Western writers on modern Islam (and not least the missionaries) have welcomed him as the last word in Muslim modernisation, and have praised his liberalism to the skies. Therein they but betray to what class they themselves belong.

In 1927 he published a new collection of essays written during the preceding decade or so and showing how that decade had affected a Muslim of his standing. On going through the book, one notices at once that the author has advanced far from the position that he held before the war. His spirit is still not especially religious (one finds no prominent note of either reverence or moral fervour in his writings), but from the placid scholar content with the broad outlines of his environment, he has become actively aware of the problems that have become painfully critical in the new decade. Exclamation marks now abound. His previous aloof disdain of politics has given way to an energetic and partisan discussion of contemporary affairs. The developing crisis within that Indian capitalism which was encouraged during the war and was by now in conflict with the parent British imperialism, is mirrored in the professor's ardent nationalism. He who in 1912 was wholeheartedly loyal to the Empire and called for governmental repression of Indian 'sedition', is now enthusiastically an Indian. "The Europeans' claim to superiority is now a myth, ... a relic of bygone days". "Let us stand on our own strength, fight our own battle. He speaks sympathetically of "political combination, strikes, non-co-operation"; uses phrases like "... the way to bring the bureaucracy to its knees "; and sees the programme of the New Muslim world as including "the eviction of Western capital". It is the days of the Hindu-Muslim Pact and he expresses the enthusiasm for Indian unity:

attempt to discriminate between good and bad in the new culture. When once he comes near to doing so, it is to complain that Indians have copied Western ways of spending money, but not of earning it. "We have developed expensive habits ; we are imitating luxurious modes of living, but we have not succeeded in learning that supremest of practical lessons—viz.. the lesson of making money". Politically, his support of the British conquest is equally wholehearted: "... the Empire to which we have the honour to belong ..."

Thus, while he advocates progress over against those behind the time who oppose the new society, he wants no further social change. Although he is in one respect consciously innovating, from feudal to bourgeois order, he is in another respect the rigid conservative : he is half-conscious that a still newer society is adumbrated, and he is against it. He, whose appointed task was to cry out against that religious conservatism which tended to preserve one form of society against progress to the next, now would have religion assist in keeping the present society from being superseded. In true conservative style, he regards religion as a social check, one 'far more effective than ... the Indian Penal Code", without which society would crumble.

This inner contradiction leads him to many positions where he must vacillate, and to inconsistencies. In berating the toadying and office-grabbing of the new condition, he is forced into lauding "the old system" which "with all its faults, had many redeeming virtues"; and frequently he must appear for all the world like numberless early-bourgeois fathers lecturing their children on the dissoluteness of the modern day. Fresh from demolishing the Islamic reverence for tradition, he warns that there must be respect for law and order, for one's betters, even respect for age. He protests against the present neglect of Arabic". And so on. But the most important evidence of this vacillating position is the general indecisiveness of all his writing. He can analyse the faults of the past, and sweep them away; but of the present he can do so to only the slightest extent; and he has nothing really positive and new to offer as a constructive suggestion for the future. In so far as he is able to see the problems in the present new culture, rather than solving them in tomorrow's way he is driven back in fear to the past which he has otherwise rejected.

The new Islām that he envisages is indeed simple. He readily says that it is indistinguishable from all true religions, and especially Christianity, which he frequently praises It consists in little more than the spirit of charity — of course on the part of the more fortunate members of society. It is clear throughout that he is writing with this class in mind; the very fact that he writes in English shows this, but also he repeatedly refers to situations in which only the middle classes ever find themselves (for instance, when he urges young Muslims to choose their careers in trade rather than government service). There is practically nothing in his morality that would have any application to the life of the dispossessed.

He is, then, a bourgeois, and he has thoroughly absorbed the bourgeois ideology. There is, of course, philosophic idealism : "We believe ... that opinion, and nothing but opinion, can effect great permanent changes"—hence, we must combat social evils not by political action but by education. By freedom, he means freedom of thought. There is the well-known bourgeois statement that religion should keep out of politics; and the well-known bourgeois meaning of the statement that it should support the status quo. "I have ... kept aloof from ... Indian politics"—actually he had been staunchly pro-British—; two pages later, "We must actively support the Government in destroying sedition and anarchy"; immediately afterwards, but this time referring to social reform, "We must, for the present, banish politics from the programme of our activity". Furthermore, there is gradualism: "Let us proceed, but with slow, cautious steps". But most telling is his list of virtues, without change those of early capitalism : thrift, hard work, temperance, education and the like. Of "the most glaring and the most obvious" vices from which Muslim society is suffering, idleness is ranked first and the neglect of trade and commerce second He writes against polygamy and the seclusion of women; we must be *modern*.

His acceptance of Western civilization is complete; he sees nothing immoral, nothing un-Islamic, in industrial capitalism. "There is nothing in its" (i.e Islam's) "teachings which conflicts with or militates against modern civilization". He makes no criticisms of slums, exploitation (or interest), wars; not to mention the more subtle bourgeois faults, acquisitiveness, frustration, and the like. He makes no

reflects faithfully the thinking of his class; and secondly, because he has attracted very much attention in the West. We shall study him again later, for the former reason : whatever were the new developments in Indian middle-class Islam, his attitude changed to meet them. Meanwhile we shall analyse his early position, as seen in two essays. *The Spirit of Islam* and *Thoughts on the Present Situation*, published in 1912. Such an analysis will repay us with an insight into the culmination of the religion of the group that he represents.

His was not a deeply religious spirit. Nevertheless, he was deeply interested in his religion; as a factor in the society to which he belonged, and he wanted to see it reformed, Like the others of this school, he saw the customs and superstitions of the old Islam as not intrinsic, but the expression of the decadent socity to which they belonged. Using the results of Western scholarship he would analyse them out of Islam He did not, however, adopt the theory that he was but restoring Islam to its pristine purity, rather he innovated consciously, striving for a modern religion "It would be the merest affectation to contend that religious and social systems, bequeathed to us thirteen hundred years ago, should now be adopted in their entirety without the slightest change or alteration", and he explicitly rejects even from the Qur'an the lega matter and social customs : "The Qur'an, rightly understood .. is a spiritual guide ... putting forward ideals to be followed — rather than a *corpus juris civilis* to be accepted for all time". On examination the reform that he advocated appears to be like Sir Sayyid's but more explicitly, mostly negative. He wanted Islam to get rid of all those aspects which hinder a full acceptance of modren bourgeois culture : "Is Islam hostile to progress? I will emphatically answer this question in the negative. Islam, stripped of its theology, is a perfectly simple religion. Its cardinal principle is belief in one God and belief in Mohamed as his apostle. The rest is mere accretion, superfluity. The requirements of Islam are at once easy and simple, and leave scope to Muslims to take part in their duties as subjects or citizens, to attend to their religious obligation without sacrificing their worldly prosperity, and to adopt whatever is good in any community or civilization without any interference on the part of their

argument is sound Admitting that the Mohammedans came to India as foreign conquerors, as utterly different to the Hindus as the British are different to us both. we cannot forget that for many centuries they have lived side by side, freely mixing with the people of the land, mutually influencing each other, taking Indian women as their wives, adopting local customs and local usages; in fine, permeated and pervaded through and through by local characteristics and local peculiarities. The most infallible proof of this we find in the marriage ceremonies, which are entirely Hindu ceremonies in the customs of the women-folk – such as the use of the vermilion mark, the symbol and token of wedded life, the restrictions imposed upon the dress and diet of widows, the disapproval, nay, condemnation, of widow marriages—and, indeed, in a thousand little practices behind the *zenana*. All this indicates somewhat more than mere superficial connexion between the two communities which mainly divide the Indian population. A yet clearer proof is the unity of language, and the similarity of dress. Moreover, say what we will. a large number, in fact the largest portion of the Mohammedan population, are Hindu converts to Islam. It rests upon no unwarranted assumption, but upon well ascertained facts, that Hinduism and Mohammedanism have acted and reacted upon each other: influencing social institutions, colouring religious thoughts with their mutual typical, and religious hues;" these, being "conspicuous illustrations of the union of the two streams of Hinduism and Islam which, since the Muslim conquest, have flowed side by side in India." So thought and wrote Salah-ud-din. India badly needs many more of her sons to represent the type which he did, both in the spheres of religion and politics.

— *Sachchidananda Sinha*

II

The class content of the new religious position comes to its fullest expression in the writings of Professor Salah-ud-din Khuda Bakhsh, of Calcutta. He was not unusually influential (though he did a good deal to introduce the scholarship of Western Orientalism into Indian Islam). But he is important for two reasons : first, because he

and distinct Such was the case at Rome, and such has been the case at Makka."

"All respect and honour is due to the law laid down by Mohamed, but the very fact that Muslim jurisprudence grew into a stupendous fabric within an incredibly short time, partly by interpretation and partly by adoption of foreign rules, unmistakably proves that the legislation of the Prophet of Arabia made no claim to finality. It shows beyond doubt or cavil, that the law of the Prophet was neither wide, nor comprehensive enough to cover the newly-arisen conditions of life in which Muslims (Arabs) found themselves after their brillant and extensive conquests".

These few extracts from Salah-ud-din's writings and passages declaring similar sentiments could easily be multiplied, picked out, from his collections of essays, mentioned above — clearly establish that he was a liberal interpreter of Islam, and a rationalistic (as opposed to a dogmastic) expositor of his religion. As such, he was much in advance of his time, in this country.

Salah-ud-din deserves high appreciation for his work in seeking to widen our mental horizon especially in a dogma-ridden land like India. In his essays dealing with Islamic subjects, Salah-ud-din takes the right rationalistic attitude, and just the point of view now needed for the pro ress of Indian Muslims. He adopts that outlook with a sort of tender pride in the past, coupled with a bitter revulsion from priest-craft and the accretions of ritual and dogma, which are now-a-days the bane of India, equally for the Muslims and the Hindus. As such, I maintain that Salah-ud-din rendered great and valuable services to the religious and social advancement of Indian Muslims.

Lastly, Salah-ud-din was not only liberal and progressive in the interpretation of religion, but also in the sphere of politics, as would be evidenced by the views he expressed on this subject. 'We are constantly told that Mohammedans are a distinct people, as unlike the Hindus as the Semite is unlike the Aryan: that there are differences penetrating to the very root of life, differences of habit, temperament, social customs, racial type; that these differences are so vital and so enormous that the fusion between the two is a hopeless, impossibility, an impracticable dream. Now I am not at all sure that this

was hereditary, for the son of the founder of the world-renowned Oriental Library could not be expected to be without that particular trait in him. By his premature death, in 1931, at the age of fifty six, the cultural life of India in general, and Bihar in particular, suffered a very serious loss. A man of erudition and culture, he possessed, in an extraordinary measure, what Matthew Arnold called "sweetness and light"

Of the principal works, in English, standing to the credit of Salah-ud-din, by far the larger number are translations of standard German histories of Arabian civilization and culture—the well-known works of Von Kremer, Wustenfeld, Becker, Weil, Brunow Wellhausen, Adam Mez, and Joseph Hell. Thus, only three original works can be placed to his credit, and these are the two collections of essays both published in, London in 1912, and 1927, and designated respectively: *Essays — Indian and Islamic*, and *Studies — Indian and Islamic*; and also the second volume (published by the University of Calcutta, in 1930) of his *Contributions to the History of Islamic Civilization*, the first volume of which contained a translation of Von Kremer's *History*. The second volume contains both translation and also a few original essays by Salah-ud-din. It is mainly on these three books that his reputation as a critic, expositor, and thinker, stands.

O

"It was never the intention of the Prophet—and no enlightened Muslim believes that it ever was — to lay down immutable rules, or to set up a system of law which was to be binding upon humanity apart from considerations of time and place, and the growing necessities arising from changed conditions. True, for the purposes of order and security and the preservation and maintenance of the new society created by Islam; he laid down rules regulating marriage, inheritance, and so forth, but these rules were mostly of a very elementary character and were intended to meet the existing conditions of things The position of Mohamed, indeed, was that of a spiritual teacher, a prophet, and not that of a legislator. In the infancy of human society there is but a faint line of demarcation between law and religion, the two being inseperably connected with each other. With advancing civilization, the law becomes clearer and sharper, and religion and law become separate.

LXVI.

ABOUT
SALAHUDDIN KHUDA BAKHSH

I

Salah-ud-din, who was born at Patna in 1875, and was the eldest son of Khuda Bakhsh, the Indian Bodley, was a distinguished scholar, of the modern type, and a great intellectual force amongst the Muslims in India. His was a vivacious and interesting personality, and a striking figure, for about a quarter of a century, in the intellectual world of Upper India. He was a scholar not only of English, but also of German, Arabic, Iranian, and Hindustani. His life was one sustained devotion to the great ideals of advancement of learning, which he had imbibed at Oxford and which he made his own by his assiduous studies in Islamic literature. But though of Oxford, there was nothing Oxfordy about him. He was undoubtedly one of the ablest and most erudite Muslim scholars and writers of modern India. His fame was not confined to India alone, but had crossed the seas, and he was acknowledged even in Western Europe, as a pre-eminently liberal expositor of Islamic literature, and Muslim history — the latter mainly non-Indian. He was also an educationist of no mean repute, and his connexion with the Calcutta University, as a Senator as well as a teacher, was an asset to it.

Salah-ud-din was the author of some useful and informative books, and also a translator (from German) of a number of standard historical works on Arabian civilization, which were appreciatively acknowledged in cultured circles. Above all, he was a genial friend, equally popular with all, by reason of his freedom from communal or racial bias, He married a talented English woman, and his married life was quite happy His witty remarks and recitations of Iranian and Hindustani verses were always appreciated by his hearers. In addition to his professional and social pursuits, he found time to write articles in various journals, which were always eagerly looked for by his admirers. He was, so to say, by inherited temperament, a great lover of books, and his library (consisting of several thousand volumes, and some hundreds of manuscripts) was a valuable collection. The instinct

About S. Khuda Bakhsh

by

I. Dr.Sachchidananda Sinha
II. Wilfred Contwell Smith
III. D.S.Margoliouth
IV. A.R.B.

Judge not by appearances, for only too often they blind us to realities."

* * *

From the moorings of the past thou must loose—nay, sometimes sever thyself; from thy lethargy thou must needs shake thyself; to thy sense of responsibility thou must fully awaken; to useful labour thou must steadfastly set thy hand—these thou must do, O East, if thou art ever to enter upon thy heritage of yore and have again what once was thine: leadership in sphere intellectual; sovereignty in sphere Divine.

●●

The Temple Press Letchworth England

of departed sires; there the loving heart feels the invisible but none the less caressing touch of vanished hands.

* * *

Wealth and Poverty—they try the character and reveal the breed of man.

* * *

I saw a little child fondling and caressing a doll—fondling and caressing it with all the ardent glow of unselfish love; with all the warmth of intense passionate joy. In that simple act of the child I saw the glories of womanhood shine in radiant splendour—its unselfish love, its unfailing devotion; its noble self-surrender, its unshrinking self-sacrifice.

* * *

"Who art thou, thou that never leavest me—cruel, unwelcome companion? Who art thou?" "Fate. I am Fate—no escape hast thou from me. I lead humanity by the nose. My rule none can question; my decrees none can avert; my will none can thwart and all must obey. I am heedless of human suffering and indifferent to human tears. 'My will must be done'—that is the inscription my shield beareth, and that is what every human being only too well knoweth."

* * *

"Here in this garden where I have built my nest," said the nightingale, "and which to the casual visitor is but a vision of loveliness; here, for me, the very perfume of the flowers is laden with sadness; for do I not daily see the flowers bloom and fade? Here, my very own nest, built oft and built anew, stands for an emblem of our vain and fruitless strivings; here what they call my song is naught but lamentations over the uncertainty and instability of all things earthly. Wrongly, wrongly do men call me happy, for I, too, am sore and sick at heart; I, too, long for release from my captivity as anxiously as does the most weary man on earth.

right opportunities, as in appreciating our powers and understanding our limitations.

* * *

Without freedom, truth, like honour, is in bondage. Both bear the shackles of servitude, for both exist to serve other than their own legitimate ends.

* * *

We resent a false accusation, but we love false praise. We condemn falsehood, but we act the lie from sunrise to sundown. Does not life offer strange contrasts?

* * *

The Prophet of God has said that love of children is the surest sign of a heart overflowing with mercy, tenderness, and compassion.

* * *

Popular opinion is rarely right, for it is more often factitious than genuine.

* * *

With man it is the reason, with woman it is the instinct that rules—both err in their judgment, but woman less frequently than man.

* * *

"The fool's judgment thou wilt hear"—thou that incessantly toilest; thou that sheddest thy blood; thou that bringest light and wisdom; thou that softenest the burden of man—thou, each and all—"the fool's judgment thou wilt hear."

* * *

The insolence of power is trying enough, but the insolence of wealth is beyond endurance.

* * *

It has been said that a home represents the rule of the dead, and, indeed, it verily does so if it is a home in any true sense of the word, for everything there—the merest trifle—evokes some memory, calls to mind some dear tradition, or summons up some delightful vision of the past. There the present and the past stand indissolubly linked together; there the discerning eye sees the impalpable but none the less effective influence

grave? What boots it if monuments are erected to my memory? What does anything matter to the dead, flowers or prayers or tears, censures, reproaches, or tirades? Nothing then cheers or saddens; nothing then affects or hurts—enfolded in the bosom of Earth, we sleep the eternal sleep of death. Healer and Comforter; Annihilator of cares and woes to some; Respecter of none; greatest and truest of Levellers; master of all—Death!—irresistible is thy power; wondrous thy ways.

* * *

Painful to the eyes that have witnessed the luxuriant bloom of the Spring is the desolation of Autumn—its barren trees, its russet leaves, its prevailing gloom. How much more painful must it be to watch the ruin of a great mind; the end of a fondly-cherished dream; the final severance of life-long ties! What flotsam and jetsam strew the tide of human life!

* * *

Weep no more! Let tears dry; for one relief we shall surely have—that which is obtained at the hand of Death.

* * *

Reality is Dreamland's inveterate foe, and Despair is Hope's inheritor by right divine.

* * *

The Bore, I suppose, hath existed in every age. How insufferable he is! Never hath he aught to say: yet doth he ever insist on saying it.

* * *

Adversity affects different people differently. Some it shatters; some it embitters; some it softens; but upon all it leaves its ineffaceable imprint.

* * *

A mother's love! A brother's hate! One as deep as the sea; the other as fierce as the flames of hell.

* * *

The secret of success lies, not so much in using the

wrong whereby he measures humanity and judges the world.

* * *

Vice carries its own punishment. Is there anything more appallingly terrible than the rebukes of conscience or the agony of remorse?

* * *

The royal seal of Persia bore an inscription than which it is impossible to imagine aught more charming—"Love and humility." This is all we need in life, for love illumines human nature and humility sanctifies human virtues.

* * *

The most fleeting of all earthly things is popular applause. It is as unstable as water; as variable as the wind.

* * *

Unbidden flow the tears when memory takes wing and flies into the dim regions of the past. Truly hath the poet sung: "A sorrow's crown of sorrow is remembering happier things."

* * *

Is that Faith worth a dirham which shrinks from the touchstone of trial; which fears the fire of temptation; which falters beneath the weight of suffering?

* * *

What heavy penalties do our vanity and pride exact! And yet we would rather pay those penalties than let our vanity or our pride abate.

* * *

Does civilisation really make us free, or does it forge for us a thousand fetters as galling as any servitude under the sun? "Which is it, O Heaven?" cried the weary man of the world.

* * *

"It is not the shackle on the wrist that constitutes a slave—but the loss of self-respect." Words of profoundest wisdom; food for deepest thought!

* * *

What [illegible]

from the consciousness of wrong. It conjures up a thousand unpleasant phantoms which worry the mind and ruffle the soul.

* * *

Hidden, unseen, ah! what grim tragedies are oft enacted from hour to hour in the awful silence of the heart—tragedies too terrible for expression in words; too stunning for relief in tears. What torments and tortures have the gods devised for man; and all in that brief span which we call "life"!

* * *

In my long experience of the world nothing has struck me as more curious than man's inability to understand his fellow-man; nay, his remarkable ability to misunderstand him.

* * *

One assurance, however oft repeated, is ever fresh and ever new—the assurance of love.

* * *

Old age would have Youth made vicariously wise; but Youth, proud, heedless ever, flings such wisdom aside.

* * *

Possession destroys illusion. It puts a period to romance.

* * *

Be not envious of others; for many, as a matter of fact, are envious of thee.

* * *

Our most fondly cherished hope faileth. We grieve for the moment, and then, in the engrossing occupations of the day, we forget it. Years after we realise that what happened was really for the best. Can mortal vision pierce the veil of futurity; can human wisdom successfully direct the course of events?

* * *

Man is an egoist *par excellence*. He parades his virtues, palliates his faults, magnifies his misfortunes, [illegible] up his own arbitrary standard of right and

LVIII.

Crown of thorns for the wise, crown of glory for the fool—such has been the popular award since the world began.

* * *

In the temple of my faith, love is the presiding priest; charity the ministering angel; humble thanksgiving the only recognised form of worship.

* * *

With mankind the fear of God has never been so great a deterrent as the fear of scandal and exposure; for God is full of mercy, but man is pitiless and full of scorn.

* * *

Some strive for power; some fret for fame; some seek riches; and some invent new and ever new methods of strife and of courting peril: none seems wholly at ease; for none is really blessed with peace.

* * *

It is success which dazzles the world—no matter how that success has been attained.

* * *

When the Prophet of God declared the *equality* of all Muslims, he manifestly misinterpreted the instincts of the human race which point to *inequality* as the universal law of life. And the result was, as might have been foreseen, that this precept of *equality* soon became a painful unreality, a hateful fiction—the prolific parent of fierce civic strife.

* * *

Whether borne on the flood-tide of prosperity or prostrate at the feet of despair—be what it may—it is soon, very soon, over.

* * *

Nothing amuses me more than the spectacle of power in the hand of a *parvenu*, or of wealth in the possession of one "lowly born"; for both betray themselves—one by his insufferable pride, the other by his ostentatious display.

* * *

The acutest infliction is always that which arises

LVII.

Everything has its price—goodness, wisdom, even the Paradise of the Faithful. For some things we pay in coin of the realm, for others with agony of our soul.

* * *

The most intense yearning of the human heart is the yearning for immortality. Hence the magical sway of religion, since it assures us, at least, of the immortality of soul, if it assures us of nothing else. Yet must we *have* a soul before even religion can assure us regarding it.

* * *

The Earth is reclad and rejuvenated! Spring—what a vision of splendour and loveliness dost thou unfold to weary eyes! Fill full the cup, O Saqi, and bid the sorrowing heart rejoice while it may. For alas! not even thy bewitching blandishments and sparkling cup will induce Time to slacken his hurrying steps.

* * *

What imagination can picture the struggle, the sweat, the shedding of life-blood which existence means to the greater portion of humanity! I have no faith in the goodness of man; and as to the wisdom of Providence, it exceeds my understanding.

* * *

Life is an unresting march to an ever-receding goal.

* * *

It is not the law but the spirit in which the law is administered that matters. Absence of law may be tolerated and endured, but abuse of law, never.

* * *

The rich are the hardest, the poor the easiest to please. A nod, a smile, a kindly word, a warm hand-shake, anything which smacks of sympathy or savours of love, the poor receive with grateful joy. Not so the rich, who receive all that life can give, or love can bestow, either as their inalienable birth-right or as a becoming tribute to their importance.

* * *

always, always accurately draw the line which divides Poesy from Truth?

* * *

God has created woman to humble the pride of man.

* * *

It was past midnight. I sat in the silence of my study musing over life and its vicissitudes. I felt as though a figure, a sheeted spectre, stood before me. "And who mayest thou be?" said I. "A former occupant of this very room which thou callest thine to-night," was the clear, deep-toned answer. And it continued: "Like thee, I, too, called many things mine which really were not mine at all. Like thee, I, too, foolishly sought solution of the mysteries of life and death. Like thee, I, too, fought with shadows and fretted over airy nothings. Like thee, I, too, was a dupe of life, and a victim of many sorrows, mostly of my own making. Like thee, I, too, was a slave of ambition; and like thee, I, too, was chained to a thousand earthly ties. Ah! but death has dissolved the dreams and destroyed the illusions. And here I am free as the air, and as happy as the nightingale." This pretty little speech was concluded by loud, mocking laughter which aroused me from my trance.

* * *

Every one who has read much, thought much, felt much, and has seen the seamy side of life, oft seeks solace and shelter in that loving and confiding companionship which, founded in harmony of taste and identity of pursuit, softens the sorrows and heightens the joys of life a thousand-fold. But like all the good things of this world, it is more often dreamed of than realised.

* * *

Flattery is as varied in form as human nature is rich in types. But the form of flattery that is swiftest and surest of result is the flattery which, assuming our magnanimity, appeals to our compassion.

* * *

witnessed love's exulting joy. And I have also seen, alas, love's glowing fire slowly die. Sweet is the love which fancy fashions—sweeter still the love which cares for no return.

* * *

"What ails thee, dearest? What makes thee shed such bitter tears? Dost thou distrust my love, or in the midst of our joys is there aught thou dreadest?" "I neither doubt thy love nor cherish any fears," said the lover. "But the rapid flight of time—it is this that afflicts and grieves my heart."

* * *

On the tablet of my heart I have inscribed my father's loving counsel: Scoff not at, and treat not with thoughtless unconcern, the advice of thine elders: for, seated on life's exalted dais, they see far—much beyond *thy* limited ken. Spare pain, at least, if thou desirest not to bring happiness to thy fellow creatures. Ever set high ideals before thee, and ever pursue noble aims. Seek not the aid of man, but His alone who neither dieth nor sleepeth, nor faileth those who repose their faith in Him.

* * *

The savage still lurks beneath Civilisation's specious garb, and Barbarism still shows its cloven foot amidst our vaunted order, law, and decorum. Can the muse of history tell us where Barbarism ends and Civilisation begins?

* * *

The Gods of yesterday are but the forlorn and forsaken Idols of to-day.

* * *

True generosity consists in remembering the claims of those that are absent or far away; for every tree sheds its blossom or showers its fruit upon those who seek the shelter of its boughs.

* * *

Seen through the mist of years, do not many, many episodes in life appear like beautiful dreams? And who [illegible] whether they were really dreams? For can we

LIV.

Upon the gate of the pleasure garden of the Sassanides of Persia I found this beautifully pathetic inscription, engraved in letters of gold:

Restore, O God, the dreams of youth, and fulfil a tithe of them!

* * *

Some have described life as the merest illusion; others as the veriest puppet-show. But to me it seems not unlike a Fancy-Fête, where every one tries to disguise himself as best he can.

* * *

Only too often, indeed, is repentance the starting point of fresh sins.

* * *

Nothing grieves me more than the frittering away of time in uncongenial occupations and useless pursuits. I mourn the death of days and lament over the futility of my existence.

* * *

Mankind has always knelt in trembling adoration before Power, and it will continue to do so ever.

* * *

The most opportune moment to attack an enemy is when he is in the wrong; for he can always successfully defend himself when he is in the right.

* * *

What troubles my little tongue has brought upon me! What woeful troubles! And yet it will not learn wisdom and cease to wag.

* * *

I have found envy in the congratulations of friends, want of charity in the judgment of men, treason and betrayal at the shrine of love.

* * *

It is so easy to make friends. It is so difficult to keep up friendship.

* * *

I have heard love's passionate pleadings; I have

enjoyed the blessings of wealth and endured the stress of poverty.

* * *

To husbands women give their hand; to lovers their heart.

* * *

"Father," said a ten-year-old child, in a pleading voice; "father, wilt thou not take me to the annual fair to which all our townsfolk look forward with such eager, expectant delight?" "No, no, child of mine! custom bars thy way, and society fetters thy movements." The child heaved a sigh and said: "Am I, then, for ever bereft of my freedom? Am I, then, for ever doomed to barren, cheerless days? Never more am I to see the sky and the sunlight except through barred windows; never more am I to tread the smiling fields and sweetly-perfumed gardens except as a life-long captive? Never am I to see the world and its wondrous beauty except through veiled eyes? Is this the cruel doom which I must now share with womankind? Is this a divine decree, or the selfish verdict of man?"

* * *

To wear out life in efforts to attain a perchance useless goal, and in the end to perish in a fierce, futile struggle—is not this the lame and impotent conclusion of many a promising manhood?

* * *

I do not know how others feel but I do know this, that at times, for reasons which I am wholly unable to account for, I feel unutterably, supremely sad. Is it the memory of some unrequited love or some demolished hope? Is it the presentiment of some impending sorrow? Or is it the occasional up-surge of the *Weltschmerz* which engulfs man and the world alike in its stupendous, irresistible swell? What is it which, at intervals, so agitates and so agonises the soul? Man, the greatest mystery of creation, is a mystery not only to others but also to himself.

and wrong ?

* * *

" Repent," said the priest, to the dying poet ; " repent, for thine hour has struck !" "Begone," said the poet : " begone ! I have yet to see whether my sins are great or His Mercy greater ! "

* * *

Religion deals with man in relation to God and humanity—laws only with man in relation to humanity. One merely touches the fringe of life ; the other rules it from cradle to grave—and beyond !

* * *

With tearful eyes and mournful voice the Saqi (cupbearer) sang : " Trust not thy secrets and expose not *thy grief to others, for nothing endures here ; nothing,* neither love, nor faith, nor friendship. The autumn follows only too closely on the heels of spring, and lo, in a trice, the bloom and the blossom change into the sear and yellow leaf. And so with all things earthly : A joyous season of love and laughter, and then gloom and darkness for evermore."

* * *

One loss we never fail to feel ; one loss we never cease to mourn. 'Tis the loss of youth, that golden period of life when the world lies stretched for conquest at our feet, when hopes are without end and possibilities beyond calculation.

* * *

Hope ! It is the one gift for which we can never be too thankful. It is the one gift for which nothing on earth or in heaven can ever be a substitute or an equivalent. It is the last refuge ; the only sheet-anchor of sorrowing humanity.

* * *

We never know life until we have borne its trials and hardships. We never know our power until we are tried and tested. We never know humanity—until we have

consummation when Good will be the final goal of Ill?

* * *

Seldom do we realise how rare are happy days in life.

* * *

Imru-ul-Qais has sung of the joys which a rainy day brings unto lovers; but is there anything to compare with the glories of a moonlight night? It inspires sweet melancholy in the old, ardent passion in the young. And who has not, once at least in life, felt its peerless beauty, its intoxicating rapture? With the Queen of thy Heart by thy side, amidst enchanted nature, basking in the tender effulgence of the moon; with the dark velvety sky overhead, spangled with stars, like so many fairy lamps, apparently, to celebrate Love's Carnival; with no thoughts, other than those of love, to mar Love's banquet; with no sound other than the music of *her* voice, to disturb Love's Litany—there, in that garden of Bliss, Fancy weaves her choicest chaplets, and Love dreams his fondest dreams. But soon, too soon, alas, comes the end! The night advances, the stars become dim, the moon grows pale and sickly and retires to rest and there comes the bitter, cruel parting—the sweet, sad farewell! Could that scene, those hours—be renewed? Could that joy again be ours? Never: once and once only the curtain lifts, and once and once only we obtain a fugitive glimpse of the Paradise which awaits the Faithful after death!

* * *

I have long, long ceased to pray, for why need we pray to Him who knoweth our wants, forgiveth our imperfections, standeth above our flattery?

* * *

Truth, application, rectitude of conduct—these are the paths which lead to the sunlit heights of fame.

* * *

What is the history of humanity but the constant adjustment and re-adjustment of the standard of right

sovereign.

* * *

Sobered, saddened, covered with the dust of life, the Shaikh proclaimed: "Wealth has many friends, poverty none."

* * *

With a sweet, passionate caress the lover said: "Thy very own shadow, Beloved, even thy very own shadow arouseth love's unreasoning fears and exciteth love's unsleeping jealousy. For doth not love a thousand misgivings incite?"

* * *

Dost thou go to Mekka to seek thy God, to atone for thy sins? Fool! Dost thou travel so far to seek Him who is nearer to thee than thy shadow? Dost thou undertake so long a journey for that which lieth within thyself? Would'st thou find God? Search thine own heart. For either He or *Shaitan* dwelleth there.

* * *

Veiled in Piety's deceptive mask, the hypocrite defileth the very sanctuary of faith and yet retaineth public esteem; but I the shaft of public scorn endure since I adore the Liquid Ruby.

* * *

"O Prophet of God!" said an inquiring woman, "hast thou not taught that God loveth human beings more than a woman loveth her new-born babe? Then, pray, explain: How can He condemn human beings to the everlasting torture of *Gehenna*?" The messenger of God sat speechless, tears trickled down his cheeks, no answer left his lips. And we—we, with our boasted knowledge and light—what explanation can we offer of those hideous exhibitions of lust, rapine, and destruction which daily and hourly disgrace and desecrate the fairest realms of Civilisation, and convert this beautiful Earth of ours into the veriest Hell? Should we say with the philosopher: Whatever is, is right? Or, with the poet, should we look eagerly forward to that glowing

fruitless all—Fate laughs at our supplications and Death at our despair.

* * *

What is our educational system but a gigantic farce—a body without a soul, a show without substance! We load the mind with exploded learning, or crush it beneath the weight of new but useless lore. We turn out neither useful citizens nor sound scholars. Political trimmers and intellectual flirts—these are the products of our thrice-blessed educational system. Training of character and thoroughness of study—it is these that we want; but it is just these that we never find. Let us have less sham, and more real worth.

* * *

The West believes in the freedom, the East in the seclusion of woman; but, curiously enough, both the East and the West doubt and distrust her. The East openly avows its distrust, the West seeks to conceal it in furtive whispers.

* * *

Ah! the irony of a social order which receives the erring brother with open arms, but condemns the fallen sister to an everlasting infamy.

* * *

What man can even vie with—much less outdo—a woman in cruelty, heartlessness, cunning, and vindictiveness? She can reduce cruelty to a fine art; she can act a lie with perfect self-composure, she can betray with the sweetest of smiles, a burning kiss, an enchanting caress. "Venus! lovely Venus! thou art but a she-devil." Sweetest of Israelites, Heinrich Heine, thou didst not exaggerate when thou penned'st those immortal words.

* * *

The West maintains the majesty of law, the East the majesty of the ruler. In the West the sovereign is the creature of law, in the East law is the creature of the

XLVIII.

I consider all religions equally good, for they all teach the very same truth, and point to the very same goal—the spiritual regeneration of man. The method of worship is the least important part of a religion. It is the spirit that I value. It is the spiritual force of a religion which counts; its power to uplift the soul, to transform the man.

* * *

How glorious is life, how charming are its accompaniments! but, alas, how soon do they all end! Death is ever knocking at the door with his imperious, inexorable, irresistible summons.

* * *

In the mosque I witnessed the futile wrangles of high-turbaned divines; in the tavern I listened to the ceaseless chatter of merry wine-bibbers; in the streets I met surging streams of humanity astir with hopes and fears. Storm, stress, strife, these I encountered wherever I went in the land of the living. But how different was the hope of the dead, with its perfect peace and unbroken repose! There, there the once trudging pilgrims, released from the fears of the morrow, immune from the weariness of life, rest "unmoved unblest by worldly change." Nothing disturbs their solemn silence, unless it be the tender whispers of the breeze, the adorable confidences of the birds, the grief-stricken voices of the mourners, or the melancholy benediction of the priest. A few more years and the earth will be our vesture too at the last!

* * *

There is a great deal in life crueller and uglier than hell.

* * *

We should neither set too great a trust in friendship nor make too great a demand upon life; for everything falls far, far below our expectations.

* * *

What is writ is writ. Nothing avails against Fate;

only is ours. The past is wholly beyond recall, and the future absolutely out of control.

* * *

True wisdom consists in setting a limit to our hopes, and in fearlessly accepting the realities of life.

* * *

Here, on this Earth, there is very little worth a sigh; certainly there is nothing worth a tear.

* * *

There is nothing in life more beautiful, more sacred, more sublime than a woman's love. No sacrifice is too great for it; no ordeal too heavy; no trial too terrible. Torture and torment and agony and death—it tramples them all underfoot and laughs them all to scorn.

* * *

The greatest fault of bureaucracy is its over-weening self-confidence and its want of confidence in the people.

* * *

We hear of towns captured and countries conquered, but we forget that conquest of countries does not necessarily mean the conquest of heart and soul. And yet what conquest is worth two dirhams which only holds the conquered at bay either at the point of the sword or by fear of the gallows? True conquest is the conquest of the heart—the fruit and flower of which are love and loyalty; love and loyalty which will shrink not and fail not at the imperious call of duty. But, of a verity, that true conquest is never secured by the roar of cannon, nor by the use of high explosives. It is the outcome of mutual forbearance and mutual sympathy mellowing and ripening, year by year, into that perfect oneness of purpose between the rulers and the ruled which all governments devoutly aspire to, but only a few attain. The sword perishes, but love endures.

* * *

Amiel's Journal—it is the cry of a soul, smitten with despair, at the utter hopelessness of ever realising the cherished ideals of life.

XLVI.

This truth was forcibly borne in upon me the other day when I witnessed a religious procession, which I was wont to do with a friend now no more. With what fond love we used to look forward to the day! What joy was ours! What dear delights! What exuberant, overflowing enthusiasm! Was it the procession or the loving companionship which called forth those emotions? Not the procession, to be sure, for the procession was as gorgeous and as spectacular as ever. The sun shone as splendidly this time as it had ever shone of yore. The crowd was as gay and jubilant as ever, and the show not a whit inferior in its glorious display to what it had always been in the past; but alas! to me it was not the same, by a long, long way. The seething mass around me were full of joy, warmth, and sprightliness, but my heart froze within me. The past rose before my vision. The dear figure of my departed friend floated before my mind's eye—a thousand little incidents came crowding into my memory. I felt a mist rising over my eyes. Tears fell one by one—those sacred tears which well from a despairing heart, and which are the only true comfort and consolation of our frail humanity. And there, what I saw through the lens of tears was not the actual, stirring scene around me, but the dim, faded portrait of the past. I felt then as I feel now—the heart-ache which that loss has caused, and the sense of forlornness which that loss has meant. Beloved memory—how I greet thee and kiss thee—for thou, and thou alone, canst repair the loss which life and death daily inflict upon us, and thou alone canst bring up before our vision the days that are no more!

* * *

Flowers fade and mind decays; beauty dies and love grows dim, and we feel, as we grow older and older, the tyrannous stamp of mortality. Ah! even the meridian splendour of the sun sets—and all too soon!

* * *

Unspeakable folly it is to wear out life with past regrets or future cares. The present, the living present

there, but in her age-long traditions, in her own light and leading.

* * *

The rose and the tulip give us but an earnest of the priceless treasures secreted in the earth below. Whose dust and ashes are these that have blossomed forth into a sweet-scented rose, or a crimson-clad tulip? Perchance a king's, or a queen's, or a prophet's, or those of some unhappy lover of yore who bled and died and was born again, no longer to shed tears or to endure agonies, but to mock at earthly glory and human splendour, and to whisper in the silence of the garden to the moon and the stars its tragedy of love. Yes, whose dust and ashes are these that have been fashioned thus with fairy hands, and have been touched thus with divine breath? Whose? Who can say?

* * *

Every human life, however humble, is a study, an intensely fascinating study, revealing the strange ways in which life shapes itself and destiny works out its end.

* * *

It has been said "revenge is sweet"; but we believe no more in the gospel of retaliation. Its reign has ended, and in its place a more just, a more humane, a more generous gospel has been enthroned, which inculcates the return of good for evil and which emphasises the necessity for kindness, forgiveness, and charity. And, forsooth, what punishment is heavier or bitterer than that which leads the evil-doer to remorse and repentance? Repay, therefore, an evil-doer with kindness, and shame his wrong with a generous magnanimity.

* * *

No one is necessary in this world—no, not one. The world goes its accustomed ways and men pursue their usual vocations—death notwithstanding. And yet what man has walked the Earth who has not felt at least one loss as a loss that has marred for him the charms of existence; that has caused a gap never to be filled up; that has bruised or broken the heart beyond repair?

XLIV.

Men rarely forgive, women never. To forgive requires the conquest of passion, self-control, and a spirit of charity which are seldom found united in any mortal compact of common clay. And it is precisely because it is so hard to be completely generous in forgiveness that mankind have looked upon "forgiveness" as the distinctive attribute, nay, the very essence of Divinity.

* * *

Women fight and subdue us with tears; those welling, gleaming, streaming but at times false tears which are so pitiful, and are yet so powerful in their effect.

* * *

A cloudy day is a day most suited to my melancholy temperament. The sunshine never or rarely cheers me. In fact, it tends to depress me to an extraordinary degree, since I regard it as an emblem of the transitoriness of all things terrestrial. But the rain and the clouds —oh, how I love them. They are symbolic of life. The one represents the gloom and the misery and the darkness of the world; while the other stands for the sob and the wail and the tears of humanity.

* * *

Man is a hypocrite of the most consummate type. Even his sympathy is not always free from alloy. Sometimes it is even a poisoned arrow, wherewith he attacks all the more effectively him whom he cannot, or perhaps will not, openly assail. Nay, ofttimes his sympathy with one is but criticism of another.

* * *

In the wave of materialism which, in recent times, has swept over the East, the East has lost everything that was distinctive in her. She has lost her lofty ideals, her spiritual calling, her intellectual ardour. She has become, in fine, a moral bankrupt, with her sun of glory set, and the garnered hopes of ages gone. Can she thrive and win back her lost heritage? Yea, verily; but not by sedulously playing ape to the West. No, not in that direction does her path of glory lie; not

the mind which passively accepts things on trust and which shrinks from sifting and testing them in the light of reason. Was it not an ancient sage who said, "An unexamined life is not worth living"?

* * *

A relic, a memento, a friend seen after years of absence, a beloved spot revisited, any one of these might set aflame the smouldering ashes of memory. What conflicting emotions of joy and sorrow they evoke! With what suddenness and swiftness the past flits across the mind! In a moment we traverse years, and, in a flash, as it were, a thousand scenes from the closed chapter of life unroll themselves; "rapid, vivid, dumb like a dream." Who can unlock the secrets of the human heart, or explain the mystery of the human mind?

* * *

Time takes the flavour out of everything. Nothing remains the same in life. The pleasures of yesterday fall flat to-day, and all the beauteous things once so dearly loved suffer, and suffer grievously, from the process of decline and decay.

* * *

What fascinates and finally conquers mankind is the unshaken strength of purpose and calm unflinching courage which, rejecting compromises, secures the triumph of their cause.

* * *

To me the 'Id is a day of intense grief. It is on that day, more than any other day in the year, that I feel and realise with bitter regret the ravages wrought by Time, the havoc played by Death, that "great spoiler of life's feast," the difference between hopes cherished and hopes fulfilled. The day of the 'Id to me is a day of stock-taking, and therefore a day of deep dissatisfaction, intense mental pain, and sorrowful recollections.

* * *

In practical life we are standing witnesses to the falsity and hollowness of our faith and profession.

* * *

Its soil is more congenial to the birth of prophets and reformers than is that of the West. Hence it is that all founders of religions have come from the East. The West fashions political theories, busies itself with the art of government, strives to perfect material resources, and cheerfully looks forward to the future; religion is but a distraction to vary the monotony of its daily or weekly routine. The East concentrates its attention mainly upon the life to come. It looks upon this life as a vanity, a mere moment in annihilation's waste, a thing too transitory and contemptible to think or worry about. It cares not for law, or constitution, or material progress, all of which it regards as wearisome necessities.

Should we find fault with the splendid simplicity of faith which seeks to propitiate the Deity through the intervention of departed saints? Should we condemn the custodians of temples and the guardians of tombs who unblushingly trade upon the credulity of the masses? Should we hold up to scorn and derision those quaintest of superstitions and those oddest of crudities which flourish here with such tropical luxuriance? No, we should not lay our hands on beliefs and practices and traditions consecrated by time. Let everything continue, but let the claims of the present be acknowledged and its dues paid. The prizes of this world are as much worth striving for, and indeed are as much worth winning, as are the prizes of the world to come. Let us have prayers and fasts and vigils and banquets in honour of the dead. Yes, let us have them, by all means, but let us have along with them that true worship, the worship of God, which finds expression in the discharge of our duties, in the fulfilment of our trust to this generation and the generations to come, in lightening the burdens of sorrowing humanity, in alleviating the miseries of life, in charity, good-will, and love unto mankind.

* * *

Nothing is more contemptible than that attitude of

XLI.

Freedom is an exacting goddess, with sword in one hand and the scales of justice in the other. She reddens her path with streams of blood and records her triumphs in letters of fire. She enlarges the legitimate sphere of the liberty of man, and restrains his wild, selfish impulses. She never can subsist without the spirit of obedience and forbearance—the two highest spiritual lessons which only centuries of careful training and severe discipline inculcate and enforce. The highest state of freedom will mean the completest restraint upon the savage, brutal instincts of man.

* * *

The greatest pleasure is always the pleasure derived from half-satisfied or unattained delights. The greatest joy is always the joy which the anticipation of the joy brings. The brightest hope is always the hope which never is, but ever *is to be* fulfilled. Satisfaction, realisation, fulfilment, these always reduce the ideal to the level of the commonplace. Reality never has any charm. It is in the world of imagination that the paradise of milk and honey lies. "A book of verse, a jug of wine, and thou!" I doubt if even these things would long continue to afford relief against the weariness, ennui, and unloveliness of this world.

* * *

We are more charitable to the dead than to the living. The dead will not tread on our corns, the living may.

* * *

I love the East, the sunny land of implicit faith and charming credulity, the land where conventionality has not yet acquired the force which it wields in the West, and where, therefore, the most diverse and contradictory types of humanity live and thrive, side by side, undisturbed and undismayed. No, we shall never have here the conventional uniformity of the West. The East is unconventional, and therein lies its greatest charm. It is disdainful of the present. It thinks little of this but much of the other world, the world beyond the grave.

yet what man who has read thee aright has failed to read in thee the eternal note of sadness, "sadness at the doubtful doom of human-kind," and has not been stirred to fiercest wrath against the wearisome wrangles which religion, stripped of its beneficent influences, invariably provokes? Thy piercing and critical eye detected and exposed false traditions and impossible loyalties. To thee 'twas given to feel and to express, in bold and fiery language, the salutary spirit of revolt which, together with the spirit of obedience and reverence for constituted authority and time-honoured institutions, forms the life of humanity, and the constant clash of which marks its various stages of growth and development. The conflict between these two opposite forces can never cease until the end of time. And thou, O Omar! Thou wilt for ever live enthroned in the hearts of humanity as the warrior and knight who fought, and fought successfully, against the forces of darkness and the demon of ignorance.

* * *

As we grow older and older our faith in the goodness of man is shaken more and more. We discover pride among the preachers of humility; vice in the sanctuaries of faith; fraud and deception in the ostensible homes of truth and piety; and alas, malice and ill-will where naught but love, virtue, and purity should have reigned.

* * *

Ideas which enrich and broaden and illumine the mind are, in the nature of things, slow to grow, and slower still to mature. They are, so to speak, the torch by which the Almighty guides the groping steps of humanity. But what a toll they exact; what sacrifices they involve, before they become living, moving, palpable realities!

* * *

Only too often, alas, the measure of our love is the extent of our self-interest.

* * *

most of our fond schemes and plans and calculations—apparently so well founded, yet founded on sand!

* * *

"Call no man happy until he is dead." How pregnant with truth is this saying! At no period of life are we really, positively happy: in childhood tears; in manhood soul-destroying cares and inexpressible anguish; in old age infirmity and settled regret!

* * *

Seldom are we ready to admit our faults, or to acknowledge our mistakes; especially so, if they are incurable or beyond redemption. Admission would be but a confession of our guilt, or at least of our folly, and such an admission is never really acceptable.

* * *

We sat face to face. We talked of days gone by. We embraced with a sigh. We parted with tears. To share a common joy is delightful. To share a pleasant memory is more delightful still. And yet one is full of laughter, while the other may be full of tears!

* * *

Thou prince of poets! Shall I say of philosophers too? O, Omar of Nishapur, to thee I bring my humble tribute, and my own little offerings. Thou hast wrested a laurel crown and adoring admiration from the two hemispheres. Wherein lie thy unfading glory, thy unfailing source of strength? What is the secret of thy conquest? Is it the grace or elegance of thy language, or the sweetness of thy thought, or some ineffable aroma which hangs over thy Quatrains? No! Sweeter melodies, deeper thoughts, more soul-stirring songs the world has known. But to thee 'twas given, as to few others, to look beneath the surface of things and to appraise them at their true worth. Thy Rubāʻiyāt sparkle with wit and humour, and sting, at times, with the sharp bitterness of truth. They breathe an air of ease and gaiety, and seemingly suggest contempt for and disregard of the vexing problems of life and death. And

thy worshippers stilled; for thine is the altar which is most sought after. Thy sway on Earth is unquestioned. What will humanity not do for thee? For thee it barters away its soul; for thee it surrenders its body to infamous thraldom; for thee it uproots and effaces life's deepest, holiest ties. Thee it worships, for with thy aid it unlocks the iron-barred gates of life which lead to the terrestrial paradise and the land of perpetual sunshine. O Dispenser of Pleasure, what is the nature of thy power? Is it divine, or diabolic? Tell us, O tell us, the secret of thy power!

* * *

Why need we fear death? Is it not a happy release from the bondage of life; from the weariness of the flesh? It is surely the end of one, and the beginning of another, career — a career possibly brighter, more spiritual, less tainted by sin, or less disfigured by sorrow. And if that be not so, it is unquestionably an eternal sleep; free from dreams, and beyond the possibility of a rude awakening. We should rather welcome than dread death; for at least it sets a limit to our unhappiness if it does not open for us the prospect of endless joy.

* * *

The world has no charm and life has no joy for me. I am weary and footsore, and long for rest; but rest I do not find. The sun shines, but only to scorch my wounds. The moon sheds its soft and gentle gleams, but only to emphasise my wretchedness. The stars, in their resplendent repose, do but smile at my fretful, feverish, ineffectual struggles. Out of tune I feel, with man and nature alike.

* * *

I planted some precious cuttings. I looked forward to their bloom. They rapidly grew, but when they had almost reached flowering-time, I had to transplant them. Their petals dropped one by one. They lost their emerald cloak. They became bare and bald. The long-looked-for bloom [illegible]

XXXVII.

I often wonder what purpose I was meant to serve, what destiny I was intended to fulfil. Why was I brought into this world? Why? Since I have sown nothing but furrow after furrow of sin, I have reaped nothing but a harvest of woe. I have contributed to the happiness of none, though I have inflicted pain upon many. A wholly useless existence has been mine—an existence without aim and without purpose. Fate plays with human life as children play with toys.

* * *

Broken health and more than an ordinary mortal's share of suffering—that is all the dower that heaven has been pleased to bestow upon me.

* * *

Unmoved by tears, heedless of prayer, severe and pitiless, the years go by, leaving behind a hecatomb of hopes blighted, friendships betrayed, love unrequited, hearts broken.

* * *

We discuss, we ponder over matters of trifling concern; but almost invariably we are thoughtless and reckless when confronted with the momentous issues of life. Hence so much misery, so much sorrow. And O, how quick we are to fasten upon Heaven the consequences of our own sin and folly!

* * *

We forgive, nay, sometimes admire, the faults of the rich, but we condemn the very virtues of the poor; for "indigence is the death of the soul." What atoning power does wealth not possess? What force, what magnetism, what permeating influence? It invests its owner with a robe of shining glory. It makes him an object of grovelling devotion and stridently vocal laudation. Thrice-blessed Mammon! What mysterious fascination, what esoteric attraction is thine! Before thee humanity unceasingly bows down; at thy shrine it offers its whole-hearted devotion. Ever-ascending is the incense there burnt; never are the whispers of

is our permanent possession, and their memory our joy for ever?

* * *

Not very long ago I visited a Muslim Library. What mournful reflections it evoked! It brought before me a vision of the past in all its radiant splendour. There, so to speak, the history of Islam unrolled itself before my dazzled eyes. There I saw its culture, its civilisation; beautiful, brilliant, and many-sided. There I realised the strength and the weakness of the Muslim empire; and there I saw, as nowhere else, the wrecks left by the tides of time. As I gazed upon the treasures spread out before me, I reflected upon the varied vicissitudes that must have been theirs. How many hands had they passed through? What wondrous tales could they not tell if only they had tongues? Where were the emperors, the rulers, the dignified courtiers who at one time owned them, and gloried in them? Where the palaces which frowned majestically upon the passer-by? Where *now* their pomp and politics? What availed *now* their lordly halls, their crowded ante-chambers, their buzzing corridors, and all their apparatus of rank and riches? Their power is laid in the dust, and their glory has sunk in deep decay! And what has survived? Naught save the intellectual achievements of the Muslims. Those who confronted the blows of destiny; those who fought against poverty and distress; those who suffered sorrow and neglect; it is they and their work that now command our allegiance and receive our loyalty; allegiance and loyalty the like of which never fell to the lot of their patrons or the scoffers of their day. Those dead and sceptred sovereigns of the mind—it is to them we offer our homage at a Library.

* * *

The secret of the best friendship, as of the most enduring attachment, lies in that sweetness of disposition which, avoiding conflict and collision, gives way at the right moment to the wishes of others.

of Alexander Severus are the truest commentary on life.

* * *

Discontent—I regard discontent as a healthy, hopeful sign of national progress. Absolute acquiescence in or unquestioning acceptance of existing circumstances means not only the death of hope but it also means the death of national life. Discontent indicates impatience with the existing order of things and points to a desire to approximate to a higher and yet higher ideal. Was it not an English philosopher who said: "A pig dissatisfied is better than a man satisfied"?

* * *

Envy is the poison of the Soul.

* * *

The greatest benefactors of humanity have been the most daring rebels against the enslaving conventions and inherited social and religious laws of the day. Acquiescence is the lot of the majority; defiance ever the glory of the chosen few. Was it not this very spirit of intense, passionate revolt which broke out at Mount Sinai; which shone at Calvary; which set Kaba ablaze? Never will this light be extinguished, never will this spirit die, while Time endures.

* * *

Truth is eternal. It never loses its freshness. It will bear iteration and reiteration.

* * *

How difficult it is to shake off an idea, however unreasonable, when once it becomes fixed in the mind.

* * *

It is the sense of righteousness, and righteousness alone, which freshens the weary path of life.

* * *

What other gift than tears, bitter, passionate, burning tears, visible tokens of grief, wrung from the heart; what other gift than tears can we make to those who have passed beyond the gates of Time, but whose love

tragedy; heroic self-sacrifice and incredible pettiness.

* * *

Human foresight has never changed the course of destiny.

* * *

"What is hell, O Shaikh?" I asked. "It is what we make it," said he. "It is the storm, stress, and strife of life with their usual concomitants: disillusionment, disappointment, despair. And Heaven," he added, "none other than sweet, joyous contentment with our lot."

* * *

I have witnessed the sunrise and sunset of hope. I have known the agonies of a soul in the grip of despair. I have tossed through sleepless nights and struggled through cheerless days. I have known, in fact, suffering in all its various hues. And I am all the wiser and better for them. Life is an education, a period of probation, a preparation for a higher and nobler existence; and through the portals of suffering must we needs pass, ere we reach the goal for which we are destined.

* * *

"More light!" These are the words, the last solemn words, of a great Western sage. Yes, more light! More light for evermore! We can never have enough of light; and what is the progress of humanity but the breaking of fresh light, full light, and yet fuller light, on the doubts, difficulties, perplexities, and obscurities of yesterday and the day before?

* * *

Would you have proof of the falseness and fickleness of Fate? Look, then, at the royal palace, and count on your fingers its various occupants and their varying tenures. Tenancy-at-will—a mere tenancy-at-will—liable to be determined at any moment; that is all our life is worth, and nothing more!

* * *

"*Omnia fui, nihil expedit.*" These melancholy words

to the interests of a larger whole—these necessarily imply an immunity from a two-fold yoke which the East has never wholly escaped : sacerdotal tyranny and royal despotism. The accepted political doctrines of the West have never been aught but treason in the East; the searching, questioning spirit of the West has never been aught but audacious impiety in the East. Kings claim our body, and gods our soul.

* * *

We all possess a reserve of strength and fortitude of which we are rarely conscious. It comes into play in the enduring of a sudden reverse of fortune, or in fighting a long, lingering illness. We are always better for experiences of that nature. We rise from the one as from the other—exalted, chastened, purified. Our sympathies are enlarged; our sense of other people's sufferings is quickened; our own littleness is emphasised and our small social circle is tried and tested.

* * *

To expect is to court disappointment. Expect not, and you will not grieve. Take things as they come, and pursue the path of life with steady, unfaltering steps. Transient are Spring and Autumn alike. In one the flowers bloom and fade; in the other the leaves wither and fall.

* * *

Down, down the vale of years we descend, with sighs and regrets and tears over time wasted, opportunities lost, work undone, and ideals shattered!

* * *

The mightiest passion subsides and dies when it has to contend against continued or prolonged absence, neglect, or indifference.

* * *

We grow older and older year by year, but our hearts never lose their buoyant hope or their youthful freshness.

* * *

Every human life—carefully scrutinised—will reveal a marvellous compound of lofty romance and despicable

of prejudice, it is *her* triumph, that proclaims at every step.

* * *

Women are more obstinate than men, because they are less amenable to reason, and more inclined to folly.

* * *

Assess the worth of a man and treat him accordingly.

* * *

Does not life teach us the short-sightedness of our vision and the worthlessness of our wisdom?

* * *

Full speed ahead in season fair, dead stop in weather foul—sport of destiny—what pranks she plays with the tiny barque of my life! She shortens the days of joy. She lengthens the hour of woe.

* * *

Life without love is as a day without sunshine.

* * *

Though I only too often assume the mask of happiness, I am never truly happy except when I am absolutely oblivious of my existence; that is, when I am either absorbed in a book, steeped in an idea, or lost in a dream!

* * *

There are certain confessions which can never be made; there are certain secrets which can never be revealed. Prudence sets her seal upon them, and we can only break it at our peril.

* * *

People accustomed to freedom will find nothing more striking in the East than the utter absence in the Oriental of that burning love for country and its true interests which is the distinctive greatness of the West. I doubt if, in the East, the idea of a common purpose has ever progressed beyond a very rudimentary stage. Never, perhaps, apart from religion. The love of country—pure and simple; the love of freedom for freedom's sake; the voluntary surrender of individual interests

right'—in these words the entire philosophy of honest-living and right-thinking is truly, pithily, forcibly summed up."

* * *

How shadowy and illusive is our quest for happiness! We never find it by mere seeking—seek as assiduously as we will. It comes without our invitation, and goes against our will. It gilds the cottage, and fills the palace with its sunshine. But oh, how provokingly brief and transient is that ineffable light!

* * *

The older I grow the more clearly do I realise the two central facts of life: the futility of our efforts, and the tender and loving watchfulness of Providence.

* * *

Years ago when the weight of sin did not press upon me as heavily as it does now, I visited a great Shaikh celebrated alike for piety and learning. I went to him with a two-fold purpose, to obtain his blessing, and to receive his guidance along the thorny path of life. And the advice that he gave me was this: Take the joys and sorrows of life with an imperturbable calm. Let not prosperity turn your head nor adversity crush your spirit.

* * *

Love—'tis the efflorescence of our best passions. 'Tis a vision divine, seen once and once only in life.

* * *

Nowhere have I found greater comfort and truer consolation against the ills that chequer existence than in the company of books. They put my sorrows to sleep, they detach me from my sordid surroundings, and lift me out of myself. I would love to be buried under the shadow of a great library.

* * *

Prejudice—what a tremendous force it is in life! How it shapes and alters and deflects our judgment! How contemptuous of reason and common sense is the ordinary man when prejudice enters into competition with reason and common sense! It is the triumph

perience, and knowledge of humankind. They .. dently ignored the varying temperament of man and the shifting ideals of the successive phases of life. They have made their own standard the standard for all times and for all peoples. Ah, the short-sightedness of the prophetic vision; the folly of our would-be architects!

* * *

Baqr 'Id! What a carnival of blood! What a revelry of sacrificial rites! Surely, surely, the great God—the loving and merciful God—cares not now, if He ever did in ages past, for those streams of blood, or the inexpressible sufferings of those groaning victims! Atonement! No longer need we atone for our sins by sacrifices; for God and man alike have changed with the changing wheels of time. No atonement, in sooth, can be of any worth which involves pain or suffering to the least of sentient beings. The only real atonement is one that takes place in *one's own* heart—a change in *our attitude towards life*. The religion of the future will discard crude and cruel methods of atonement. It will look with pitying contempt upon the days when sacrifice was always the sacrifice of something, of some one, *other than one's self!* It will inculcate atonement by repentance of the heart and mind; for does not true repentance cleanse the body, purify the mind, and carry the penitent nearer and nearer to that supreme goal to which humanity is painfully but surely moving—the spiritual perfection of man?

* * *

"Teach me, O Shaikh, that philosophy which will banish fear and cure the ills of life." "It is our mental attitude," rejoined the sage, "which makes us masters or slaves; lords or serfs of existence. Passion, covetousness, lust of power—these degrade and dishonour us. Subdue and conquer them, and you will have no fears to make you weep; no qualms of conscience to disturb your inward peace; no dark forebodings to [illegible]

a faithful transcript of nature. In Eastern literature man appears either at the shrine of love or at the altar of divinity. Mist and darkness beyond. The greatest debt which the East owes to the West is the awakening of the critical spirit in the Eastern mind. It has brought with it, indeed, unrest and discontent, but it has opened up boundless prospects and unlimited hopes for the future. O dawning Spirit of Enquiry and Criticism, I salute thee and welcome thee! It is thou that leadest humanity on and on in the paths of progress, freedom, and enlightenment. What is the civilisation of Europe but thy very own flower and fruit? What is the stagnation of the East but thy neglect and indifference?

* * *

I sat in the garden, surrounded by smiling flowers and dancing leaves. Not a voice was there to jar upon the ear; not a footstep to disturb the stillness of that solemn eventide. I sat in solitude, thoughtlessly watching the birds that soared overhead, the clouds that rested along the horizon; enjoying the soft, rapturous caresses of the evening breeze, until darkness deepened and deepened into the blackness of night. To be out in the country and away from the strife of the world; to be at a spot where innocence dwells, and where vice stands rebuked; to be in the embrace of nature, and at a distance from the haunts of men consumed by mean ambitions and fevered with the lust of power—Ah, what heavenly peace, what vision-feast, what spiritual experience, and what joy divine!

* * *

I have a horror of paradise, a genuine horror indeed. And who would feel otherwise for a place peopled by sexless *huris*, disfigured divines, emaciated hermits, and howling dervishes? Allah be praised! It would be more like a madhouse or a menagerie than a haven of rest or an abode of everlasting bliss. The makers of paradise were lamentably lacking in imagination, ex-

the spirit of compromise, and that supremest of all lessons—the spirit of resistance to all demands inconsistent with the dignity of man.

* * *

Why does goodness suffer and wickedness thrive if there really is the rule of right? Goodness is merely tried and tested and purified by suffering in order that it may shine with all the greater brilliance and proclaim with all the greater force its fadeless, ageless, deathless glory. But wickedness bears not the light of day. Its reign is shortlived. Its day of reckoning is ever close at hand. It is merely a moment's flash, and then darkness utter and absolute. Goodness, on the other hand, is not unlike sunlight, gilding the heaven and brightening the earth with its genial, joyous warmth and light.

* * *

Ah, the bitterness of vain regret, and the restlessness of hopeless longing!

* * *

I never can understand the pride and insolence of man; for what is man but a handful of dust and ashes? What are his powers but a derision to heaven? What is his greatness but an illusion and mockery? Let us be kind and forgiving, for the world is full of gall and bitterness.

* * *

Ever in thrall to soul-cramping traditions, the Eastern mind has never developed critical power to any serious extent. Of this fact its literature offers a striking illustration. There, you have wealth of imagination, splendour of word-painting, gorgeous flow of language, glory of sustained eloquence, delicacy and subtlety of thought; but never by any chance have you that mature vintage of experience—the criticism of life and its thousand and one ramifications, never have you anything approaching that critical literature which is the pride and possession of the West alone. Never have
[illegible]

the learned but the never-ending pursuit of an ever-receding goal? Humanity never will be satisfied; never, give or take away what you will.

* * *

We are always the wiser and the richer for our experience; for every experience is a fresh lesson learnt in the school of life, either exposing some falsehood or correcting some error of judgment.

* * *

We are ever longing for a change, even though it be for the worse. Such is the perversity of human nature!

* * *

A woman's life—it is generally made up of toilet, gossip, fault-finding, or love-making.

* * *

Pride, Jealousy, Covetousness—these not only mar the happiness of life, but also arrest the spiritual growth of man.

* * *

Wherein lies the superiority of the West over the East? Surely in its strength of moral purpose, in its unflinching sense of duty, in its recognition of the claims of country and humanity, in its altruistic conceptions. Life in the East is too self-centred, too narrowly circumscribed. Self and the family absorb and exhaust Eastern sympathy. Beyond self and the family there is no duty to discharge, no obligation to incur.

The East has never known disinterested sympathy and broad-based toleration. She has never nourished high-souled patriots, or divinely-inspired martyrs for a political ideal. She has never conceived, nor could she ever conceive (as things have stood with her), the parliament of man, the federation of the world. She has always, always raised up social walls, splitting humanity into fragments. The East has much to teach, but she has also much to learn, and much more to unlearn. As a return for her spiritual gifts and religious [illegible] the West the art of living.

the Earth and bringest unto them rest, sleep, peace of mind, tranquillity serene,—thou, sweet Comforter, what hast thou brought unto me? Any cure for my pain; any consolation for my sorrow; any hope to my deathless gloom? No, thou hast ever brought unto me food for melancholy thoughts, and with it bitter tears to shed. These and these only have been thy bounteous gifts unto me.

* * *

In the throes of a crisis; during the struggle against adversity; in the hour of peril, or in the moment of despair—what fervent prayers, what pious vows, what stern resolutions, in short, what good intentions are ours! But no sooner does the cloud roll away and the sunshine return than we revert to the old familiar ways, the apparently unforgettable ways—the ways of sin and folly.

* * *

Life is full of perplexing riddles. Some we solve, some we only half solve, and some we carry unsolved to our grave.

* * *

A great passion consumes everything, even itself.

* * *

At times a sense of impatience with existence, a longing for the end, comes over us. Then, indeed, our hopes centre no longer on anything that life can promise, and our thoughts are irrevocably fixed upon death—the only solution of life's insoluble problems.

* * *

Jealousy is the cruellest weapon forged by the devil for the destruction of the human soul.

* * *

I envy the ignorant; I envy their confidence, their faith, their simplicity, even their very ignorance. I envy the poor; I envy their limited wants, their capacity for endurance, their touching resignation. What have the rich but gilded chains and [illegible]

apprenticeship is the lesson :

Vanitas Vanitatum, nil nisi Vanitas.

* * *

Social inequalities always weigh heaviest, because they assail us at every step of life. Political disabilities may be overlooked and even at times justified, but social inequalities, never.

* * *

There is no such thing as absolute despotism. The greatest despot can only go up to a certain point. Beyond that, resistance, rebellion, anarchy stare him in the face.

* * *

It is astonishing how easily we accommodate ourselves to circumstances and become reconciled to our fate. How quickly, for example, do tears dry up, and wounds caused by bereavements heal ? Nothingness and Oblivion—the two words which contain world-wisdom—should be written in letters of gold.

* * *

The evening of life is almost invariably a satire on the eager, brilliant hopes of dawning manhood.

* * *

Those dwellers in the quiet valleys of existence—peace be on them !—what sweet reasonableness, genuine affection, unpretentious piety, what a spirit of self-sacrifice have I found among them ! What a strange and striking contrast do the mansions of the rich offer ! We behold in the one the strength of religion ; in the other we see the temptations of wealth, and the fall consequent upon those temptations.

* * *

In my Utopia only those will administer Justice who have no interest to serve ; no prospects to mar ; no account to render, except at the bar of conscience ; no homage to pay, except at the altar of righteousness.

* * *

Thou, the healer of aching hearts, the confidant of lovers' inexhaustible secrets ; thou, O Night, who in

how to get ahead of each other? Competition and rivalry—these are the two articles of modern faith.

* * *

In childhood's innocent days I frequently heard that Justice was blind, and that she was no respecter of persons. In the Palace of Justice I found her cured of blindness, nay, possessed of a remarkably keen vision—specially so as regards the dignity of the *Muhtasib* [1] and the prestige of the *Shah*. I even saw the thrice-blessed Goddess of the Mint near her exalted throne, with her wonted witchery and caresses. In short, I found Justice, as administered, very different from Justice as conceived and described in legends and fairy-tales.

* * *

We condemn in others what we ourselves do every day of our lives. Such is the splendid hypocrisy of man—patent, unabashed, unblushing!

* * *

The goodness that I value is the goodness of the heart—not the counterfeit goodness which flutters on the lips.

* * *

Alone and aloof from the excitements of the world, I stand sorrowing, watching things profane and things divine. I seek to read some meaning into life, but my quest is wholly vain. Life seems to be a cruel chaos, a blundering chance. Laughter is but the precursor of tears, and joy a harbinger of sorrow. Everything appears to be misplaced or out of place. Learning never, or if ever, then only rarely, is conjoined in amity with wealth, power with sympathy, and principle with practice. Fools adorn the courts of princes, rogues those of the *Kādi*, and eunuchs feast on the charms of the *Harem*. It is a huge tragi-comedy this life of ours.

* * *

I betook myself to the sages, both ancient and modern, and at their feet I amassed learning and gathered wisdom, and the net result of many years of laborious study and

aywardness to scorn.

* * *

Our ideals soon vanish when they come into contact ith clay and mortality.

* * *

Self-satisfaction is the surest sign of degeneration. is the restless and dissatisfied spirit which moves iward on the path of progress as a pioneer in the alm of thought and in the sphere of action.

* * *

The greatest conquest is the conquest of self.

* * *

The majority of mankind pass through life without inking. For them life is a mere routine, a daily round business which they get through mechanically, or of leasure in which they riot. Thinking is too painful an peration for them. They shrink from it, and passion-ely cling to the traditions, beliefs, and faiths of their refathers. To strike out a new path is the privilege id prerogative of the few, and they are the heralds and ioneers who hold aloft the torch for the benefit and uidance of their fellow-men. All honour and glory to iem, for they fertilise the earth with their blood and inctify it with their sufferings.

* * *

The Middle Ages believed in the Wager of Battle as ne of the approved methods of establishing innocence t a criminal trial. The modern world has rejected that elief. It has found that the mediæval faith in a merciful 'rovidence, who would never see anything but truth riumph and falsehood laid low, was an untested and nverified piece of optimism, contradicted and wholly emolished by its own riper experiences, which point to ie conclusion that it is not might that is right, but that night should ever maintain the right.

* * *

The glowing vision of universal peace is too brilliant ver to be realised on this Earth, where the most vital

imparting confidence.

* * *

Be not eager for anything in life, for there is nothing certain here except death.

* * *

Trust in God is the one true support against the evils and afflictions of life. It is the one belief which makes life bearable and possible.

* * *

The majority ever lend a willing ear to ugly rumours. Not so with good reports. There is a secret and malicious delight in hearing of the misfortunes of others. An unmistakable proof that goodness is not a natural but an acquired virtue.

* * *

No wrong ever goes unavenged. Punishment may be slow in coming but it is ever on its way.

* * *

Nothing is more chilling than a weary succession of days cheerless and barren of hope.

* * *

Life's deepest lesson is vanity. Life's most precious gift is the memory of a great joy.

* * *

Nothing wears out life more than the anticipation of trouble.

* * *

Life is but a series of irremediable blunders. Success hides them, failure reveals them.

* * *

We are so optimistic by nature that even when sunk in the deepest slough of despond, we never, or at least rarely, lose hope. We anxiously await a turn in the wheel of fortune, but how often in vain!

* * *

Naught but a true religious spirit can give us that

the past and heedless of the future. The man of imagination has three-fold sufferings to face and endure: the sufferings of the present, of the past, and of the future. But the worst fears, like the best hopes, never or rarely come to pass. They flit across our path terrorising and perchance paralysing us.

* * *

Freedom of thought is the starting-point of human progress. Once thought is free, human progress is assured.

* * *

Expectation—there is a curious intermingling of hope, doubt, and despair in it.

* * *

We rarely get, at the right moment, what we fondly wish for. In many cases it never comes at all; and, even if it does, 'tis at a time when much of our joy therein has vanished.

* * *

It is the unexpected which always happens. It is chance, rather than design, which shapes and guides our lives.

* * *

Life seems to be a perpetual round of anxieties. How destructive are they of intellectual work; and yet ease and comfort seem to be equally so. Poverty and the struggle for existence may sometimes quench intellectual ardour, but wealth invariably does so. The most suitable condition for a scholarly life is one above want—not exactly affluence, but immunity from the petty worries of life, security against the uncertainty of the morrow.

* * *

There are certain periods in life when everything goes wrong; when all efforts are unavailing; when nothing succeeds, and when our best-calculated hopes deceive us. They come at appointed intervals.

* * *

Be slow in making friends, and still more slow in

XX.

Superstition is too deeply ingrained in human nature to be altogether eradicable by culture or illumination.

* * *

How lovingly we hug and how painfully we part with a day which grants us respite from worry and weariness —the ordinary condition of mortal life!

* * *

Nothing is softer and sweeter than the unspoken words which lovers read in each other's eyes.

* * *

Even a life-time would seem but a day to youthful, ardent love.

* * *

There are moments when the stoutest heart melts and seeks relief in tears. There are sorrows which are a trifle too much even for the sternness of stoical breeding.

* * *

Farewell! What an agonising torture to utter that word! The heart well-nigh breaks at the thought that the haunts of childhood and the familiar scenes of growing manhood may never more be seen. Nature, indifferent to the sorrows and afflictions of the Children of Men, inexorably observes her immutable, eternal laws. The sun still shines; the sky still wears its spotless cloak of sapphire-like brilliance; the leaves of the trees still whisper to each other their unknown secrets; the breeze still blows, diffusing freshness and fragrance over the weary Earth; but nevertheless, there is one heart which is out of tune with all this wealth of joy; one heart which, despite the encircling warmth and sunshine and cheerfulness, beats sad and sorrowing. It is mine. To feel is to suffer. How terrible it is to compare the ugliness of the reality with the splendour of the ideal! Dissension, division, disappointment, disenchantment—what a hideous tragedy is life! The ordinary man is essentially unimaginative. He receives and endures the buffets of life, staggers for a moment, then composes himself and goes his way, oblivious of

XIX.

Who would care or dare to speak the whole truth about himself?

* * *

Success in life is rarely due to merit or intrinsic worth. It is generally the outcome of some felicitous conjunction of favourable circumstances coupled with daring and impudence.

* * *

Know a man's weak point, and you have him in the hollow of your hand.

* * *

How persistently does the mind revert to vanished days! How it invests them with a halo of romance! They were probably not better or happier than the present, but we love them and cherish them simply because they are no more.

* * *

Our nearest relatives are always the most envious of our good fortune. Our success intensifies their misfortune, our good luck accentuates their reverses.

* * *

Women never forgive their detractors. Both in love and hatred they go to extremes.

* * *

We are always most generous where our interests are not affected.

* * *

Friendship, to be lasting, must be pure and disinterested. The worldly-wise rarely make true friends. Childhood and youth are the seasons when we form friendships and forge attachments. They are the seed-time of life's choicest fruits.

* * *

✓ Prayers and tears are the usual accompaniments of old age. Why? Because then the shadows of death begin to thicken, and the fear of the unknown to press with an uncomfortable insistence.

* * *

XVIII.

Contempt for death is often due to one of three causes: a great grief; a grievous disappointment; a deep religious conviction.

* * *

There is a touch of sadness in everything connected with us. It lurks beneath the festive board. It nestles round our dearest joys. It casts a shadow over our proudest successes. But it is only in the evening of life that this truth is borne in upon us, because it is then that we are freest of illusions and fullest of experience.

* * *

Childhood! Who does not envy its irrepressible laughter, its unalloyed joys, its absolute freedom from care; even its not unfrequent tears — brilliant as diamonds, and fleeting as the morning dews?

* * *

At times nothing seems to bring relief to an afflicted heart. Even the beauty and harmony of nature—its vastness, its majesty, its tranquil repose—fail to communicate their ineffable charms. To be sure, it is the inward peace which casts the glamour of beauty on physical conditions. It is our own mental attitude which creates both Heaven and Hell.

* * *

Hope defies reason. It lives longer.

* * *

Happiness is the gift which Heaven confers upon the ignorant. Sorrow is the heritage of the wise.

* * *

Youth is over-confident. Old age distrustful.

* * *

Truth, Justice, Love—cardinal principles of life—loudly proclaimed in theory, lightly violated in practice.

* * *

Whenever carefully examined, we shall detect in every human action, however disinterested in outer seeming, vanity or self-interest as its direct cause.

* * *

the tiger and the ape will be at once let loose in him.

* * *

The worst calamity in life is to be torn between two contending passions.

* * *

Life is too fragile and too uncertain for us to be constantly worrying. I never can understand that calculating attitude of the mind which persistently looks ahead with a view to controlling the course of events, or strives to erect safeguards against possible mishaps. To me that is the summit of human folly. Foresight and forethought are both unavailing against Fate. I love to float on the tide of Destiny, leaving my little barque entirely in her custody, to be wrecked or saved as it pleases her capricious mood.

* * *

Some natures are more sensitive to unkindness than others; but the unkindness which stabs deeper than a thorn is that which comes from a friendly quarter. It leaves a smart which never wholly subsides.

* * *

What embitters and poisons the springs of life is ofttimes the viperous sting of memory.

* * *

There are moments when a mere look, a mere act, or a lightly-spoken word—any one of these—is enough to wreck a life-long friendship, or to crush the fragrance out of a most endearing relationship.

* * *

The daily experiences of life ofttimes not only break one's heart, but turn it to stone.

* * *

We fear death, not only because of the darkness and the uncertainty which lie beyond the grave, but also—and perchance the more—because of the wrench that it involves from the attachments of this life.

* *

XVI.

MAXIMS AND REFLECTIONS

LIFE—it is a series of disenchantments.

* * *

Toleration—how rare in life! Every one tries to play the tyrant in his own small sphere.

* * *

The great names of to-day—I wonder how many will be thought of five years hence by heedless humanity!

* * *

I loathe a large gathering! To me it is an exhibition of all that is petty and repulsive in life. I see there the arrogance of power; the insolence of wealth; the crawling, furtive meanness of the masses. Only here and there, like lonely wild-flowers in a meadow, are the worthy.

* * *

The difference between a saint and a sinner consists merely in their power of resistance. One has more than the other.

* * *

A sycophant is always after something. His flattery begins and ends with expectation.

* * *

The price we pay for the company of the worldly-great is, indeed, tremendous. It is nothing less than the entire surrender of our individuality, and the absolute sacrifice of our private judgment.

* * *

What a passion the ordinary man has for display: display of power, display of wealth, display even of his eccentricities!

* * *

With the generality of mankind religion is more a form than a reality; a habit rather than a sustaining, fertilising principle of life.

* * *

of my translation; to Mr. H. B. Hannah, of the Calcutta Bar, for his kindness and courtesy in not merely revising but offering most useful suggestions which have considerably improved the translation; and lastly to Professor Margoliouth for revising the final proofs.

S. K. B.

KHUDA BUKHSH'S LIBRARY,
BANKIPORE, 1916.

ness, of a childlike purity, have been raised ere now by anguish upon anguish, woe after woe, to a height of holiness which we may believe they could have reached by no other road. Why should it not be so? Since there is no limit to the soul's possible elevation, why should her purifying trials have any assignable bound? She is of a metal which can grow for ever brighter in the fiercening flame."

These sayings breathe of sorrow and sadness, of a sense of hollowness and unreality of life, of a feeling of lofty contempt for the world and its coveted prizes, and lovingly dwell upon the certainty of death. Does the author not say, "Be not eager for anything in life, for there is nothing certain here except death"? The mysteries of life and death will never cease to interest mankind. Each individual approaches them from his own standpoint and each individual solves them in his own way. But whatever may be the divergencies in detail, the broad features are always the same. Love, friendship, hatred, jealousy, hope, aspiration, ambition, and disappointment have ruled and coloured human life, and will continue to do so to the end of time. They will never grow stale or out of date. And it is precisely for this reason that books dealing with life, or maxims illustrating the ordinary incidents of mortality, never lose their charm or freshness for man. Age does not affect them; for the questions that they deal with are questions which will never and can never be shelved or cast aside. They add to our joy. They bring relief to our sorrow, for do they not teach that sorrow is but a necessary step towards the ascent of man?

In these sayings we have our own moods reflected; our own thoughts expressed, our own sorrow made articulate, and our vain strivings held up to scorn and derision.

It is my pleasant duty now to offer my most grateful thanks to Mr. H. I. Philby, I.C.S., for [illegible]

mism. They unite the temper of the visionary with that of the man of the world. They are redolent not only of the cloister, but also of the market-place. They represent life in its manifold phases—its brilliant sunshine, its weeping gloom. The author himself says that he has seen the various phases of life; and that he must have done; for none, without worldly experience, acquired first-hand, could have penned the truths that lie scattered in this book;—truths that penetrate to the very core of the heart. There are sayings here which nothing but the sadness of despair could have evoked. They are bitter and piercing in their truth and poignancy. These sayings are only too full of the disenchantments and disappointments which life brings in its train. And who has not felt the heavy hand of Fate or has not suffered from its cruel ravages? But, as the writer has very truly said, these sayings are the records of an unhappy life. But in spite of the atmosphere of gloom which hangs over them they are most delightful reading. They may be out of place, perhaps, at a festive board, or at a carousing banquet, but life is neither one nor the other.

"Happiness [1] with honour was the ideal of Solon; is it also ours? To us, perhaps, in estimating the fortune of any one whom we hold dear, it may seem more needful to inquire, not whether he has had enough of joy, but whether he has experienced a sufficiency of sorrow; whether the blows of circumstances have wholly shaped his character from the rock; whether the soul has taken lustre and purity in the refiner's fire. Nor is it only (as some might say) for violent and faulty natures that sorrow is the best. It is true that by sorrow only can the headstrong and presumptuous spirit be shamed into gentleness and solemnized into humility. But sorrow is also used by the power above us in cases where we men would have shrunk in horror from so rough a touch. Natures that were already of a heroic unselfish-

flower and fruit of many years of silent study and quiet meditation. I have not attempted to put them in order or cast them into shape. I have left them just as they were written. I would not destroy whatever charm attaches to their spontaneity. Moreover, many of them are associated with events and incidents which I hold dear; and to me, therefore, they represent not merely general truths, but closed chapters of my life. Here is no system of philosophy; no code of morals; no coherent, consistent view of life—no, there is no such thing here. It is merely the cry of the heart, uttered and expressed in the language of truth, and nothing but the truth.

"Farewell, my book of 'Maxims and Reflections'! Farewell, my loving companion, my trusty confidant of years! May the fates be kind and the world just to thee!"

این نسخهٔ بی‌ربط که دیوان فقیر است • مجموعهٔ احوال پریشان فقیر است

از سوز و گدازی که شد دل روشن • هر مصرع آن شمع شبستان فقیر است

هرچند که صد رنگ غم و درد دران هست • کفران نکنم نعمت الوان فقیر است

گر هست پریشان سخنم عذر بزیدند • زلفی معنی سلسله جنبان فقیر است

یعقوبم و این غمکده کنعان محبت • هر بیت دران کلبهٔ احزان فقیر است

زنهار که شیرازهٔ آن نگسلی از هم • در وی نخ چندی رگ جان فقیر است

III

This autobiographical sketch does not offer more information than do the "Maxims and Reflections" themselves. No one reading the MS. can fail to notice that the author was fairly well acquainted with European literature. We hear in some of these sayings distant echoes of Goethe and Schiller, La Rochefoucauld and La Bruyère. We find in them actual quotations from Tennyson and Swinburne, Pushkin and Gissing. But what will probably prove their most attractive feature is the blend therein of Orient and Occident.

sought in no other spirit than that of mean trade and sordid gain. It was regarded as a mere commodity, with a market value attached to it. Everywhere, wheresoever I turned my attention, I was confronted with sham and counterfeit, fraud and imposture. In religion, I found a set of forms, a congeries of traditions, a mere shadow of a shade. In social life I either found wicked lies in fullest bloom, or hideous anachronisms supported by all the strength of enthusiastic ignorance.

"I was sick of everything around me. Nor were my experiences in other spheres calculated to inspire in me either love for the world or admiration for mankind. I saw very little fair play in life. It was nepotism and jobbery everywhere. I reposed trust only to be betrayed. I fought for truth, only to feel that truth's right to victory is rarely acknowledged. I was frank and outspoken, only to find that duplicity and hypocrisy win the day. I found that it was not love but self-interest that was the motive power in this world; that it was not virtue or wisdom but wealth which ruled mankind; that it was not personal merit but the gentle art of flattery which made or unmade the individual fortune.

"Experiences such as these do not make for cheerfulness, and hence this little book of mine breathes of sadness, and palpitates with grief. Let not those who have never known sorrow or suffering, or those who have never tossed through restless nights or passed through cheerless days, or those, again, who have never bled under the lashes of disappointment — let none of them look at these pages, dreary and dismal and steeped as they are in deep, unrelieved melancholy. These maxims do not and cannot lay any claim to originality, for such a claim would be an idle one. Is there aught original under the sun but truth? That can never grow stale or insipid. It always has, it always will have, virginal freshness. It will bear iteration and reiteration. These 'Maxims and Reflections' are

love of his country, and teaches him the meaning of life. It brings home to him the dignity of man and the boundless possibilities of his advancement in the scale of civilisation, and it makes him feel, not without a tinge of shame and sorrow, how far, far behind is his own country in all things that make life honourable; nay, in many things that make life worth living.

"I was away from home for seven years—years full of hope, of laborious studies, of novel experiences. Oh, that Allah would give back to me even though it were but one of those swift-fleeting years spent in Europe! But no, that were a vain longing, a futile prayer, a never-to-be-fulfilled hope. When we bid adieu to the university, we generally, with that, sigh forth a last farewell to all the fairest dreams of life; for then we are launched on our respective careers, no longer to indulge in dreams, but to fight the realities of life.

"And realities—how undeceiving they are! I had to select a career for myself, and as all other avenues of advancement are either closed against us, or offer but meagre prospects, or are even held in disfavour, I, like the majority of my countrymen, took to the study and eventually to the practice of Law. To the observant Law is a profession which reflects more of life and reveals more of human nature than does any other profession. It shows the reverse side of the medal—the baseness, the ugliness, the horror of actual life; nay more, it brings home to one the ignoble uses whereto is not seldom put that divinest of all human institutions—the Administration of Justice—and it forces upon one the melancholy reflection that in actual life things are not generally what they pretend to be.

"I secured first-hand experience not only of law but also of the educational institutions of my country, and I must confess that there too I found things very different from what appeared on the surface. What struck me most forcibly was the painful lack of zest and zeal shown everywhere in the pursuit of learning. [illegible]

its walls, and the nobler ones that lie buried there. City of Peace, Culture, and Refinement—my dearly beloved Nishapur—never shall I think of thee—wherever I may chance to be—except with fondest love and deepest affection. It is not my intention to inflict an autobiography upon the reader; for what interest has the world in the prosaic, unstirring, uneventful life of one to whose credit stands neither a dazzling deed nor a great literary achievement? I shall therefore say as little as I can—avoiding all details—and that little only to enable the reader to form some idea of the training and the surroundings of the author of these 'Maxims and Reflections'—the child of fancy, fed on tears, and nourished by the author's very life-blood. Belonging, as I do, to a family of book-lovers—my native town possesses a noble monument of my parent's piety and love of learning—I was brought up, so to speak, in the purest atmosphere of learning. Since my earliest youth books were my delight, my one absorbing passion. With a passion for books I developed a love of solitude. But this was not without its drawbacks, which I perceived and from which I suffered in after-life. It entirely unfitted me for the rough-and-ready ways of the world. It gave me a visionary rather than a practical turn of mind. It inspired in me a distrust of my own powers, a shyness as regards society, a longing for peace and quiet. My father, not satisfied with the education which my native town could give, decided to send me to an Occidental seat of learning, and thus before I was fifteen years of age I was sent away from Nishapur to Europe, to learn the languages and to study the thought of the western world. What a contrast Europe offers to the East! What deep, abiding impressions it makes upon the youthful oriental mind! The merest visit to Europe—not to speak of residence at a university—is an education, and an education of an enlightening kind. It broadens one's mind: it widens his outlook: it inspires in him

FOREWORD

"There is nothing worth thinking but it has been thought before; we must only try to think it again."—GOETHE.

I

IT was the merest accident two years ago which took me, one fine January morning, to an old bookstall. I am a frequenter of bookshops—a virtue or a vice which has run for three generations in our family. Among the stock for sale I found a neglected heap, dusty and battered by the shocks of time. I have a weakness for old books, and this forlorn-looking parcel at once attracted and riveted my attention. I cut the string, and lighted upon an exquisitely written Persian manuscript. It was not very old. In fact it looked quite modern. It was a collection of sayings—prose-poems were perhaps a more appropriate description. It promised to be very interesting, and that promise it amply fulfilled. It bore no name, and the provokingly brief autobiography which preceded the text threw but scant and insufficient light upon its authorship. That autobiography, brief though it is, will not be without interest to the reader.

II

It begins thus: "I was born at Nishapur, that famous city which has become still more famous by the recent favours conferred upon it by our beloved Shah. May his shadow never grow less, and may my beloved city never lose its lustre! May it never yield in rank and importance to any other City of Fars! Such is my fervent wish, my whole-hearted prayer. I thrill with pride when I think of the noble souls that reside within

To

THE BELOVED MEMORY OF THE LATE

BABU DHANNU LAL AGARWALLA,

FRIEND AND BENEFACTOR, WHOSE PREMATURE DEATH I SHALL NEVER CEASE TO MOURN AND WHOSE MEMORY I SHALL NEVER CEASE TO CHERISH, I DEDICATE THE FOLLOWING PAGES

That virtue of originality that men so strain after is not newness, as they vainly think (there is nothing new) it is only genuineness. John Ruskin

MAXIMS AND REFLECTIONS

Men know neither from God, nor from Nature, nor from their fellows, how to receive with gratitude what is valuable beyond attainment. Goethe (apud Morley's Diderot p. 8 Vol I)

* All they can see & meet with in actual experience so contradicts the high vision they once had — and with the increase of their experience, they are often tempted to despair. Shairp's Aspects of Poetry p. 463. One thing only can save them from this temptation — the entrance into their hearts of the consoling light that comes from above. p. 464.

V.

Canon Liddon has somewhere asked, 'How is a man likely to look upon his existence? Is existence a happiness or a misery, a blessing or a curse?' And he replies, 'This question will, probably, be answered in accordance with deep-rooted tendencies of individual temperament; but these tendencies, when prolonged and emphasised, become systems of doctrine — or, as we call them, philosophies. And so it is that there are two main ways of looking at human life and its surrounding liabilities, which are called optimism and pessimism.' There is a whole order of minds, and these sometimes the most thoughtful and deep, on whom the sad side of things and the dark enigmas of existence weigh so heavily, that the brighter side seems as though it were not. Those especially who enter on life with a high ideal, whether a merely aesthetic, or a moral and spiritual ideal, get it sorely tried by their intercourse with the world. ∴

IV.

* در ازل می رفت چون تخمیر ما *
* جمع کردند ار پی تعمیر ما *

* آب اشکِ بلبلِ دیوانهٔ *
* آتش دودی، زخود بیگانهٔ *

* خاک از خاکسترِ پروانهٔ *
* باد آهِ قمری مستانهٔ *

* این عناصر را بهم آمیختند *
* تا چو منِ دیوانه را انگیختند *

III.

MAXIMS AND REFLECTIONS

(TRANSLATED FROM THE PERSIAN)

BY

S. KHUDA BUKHSH, M.A., B.C.L. (Oxon.)

Barrister-at-Law; Fellow of the Calcutta University; Lecturer in History of Islam; Professor at the University Law College, Calcutta; Author of "Islamic Civilisation"; of "The History of Islamic Peoples"; of "Orient under the Caliphs"; and of "Essays: Indian and Islamic"

LONDON, PARIS AND TORONTO

J. M. DENT & SONS LIMITED

1916

Maxims
&
Reflections

by
S. Khudabakhsh

may be completely right in thinking that *I* acted wrongly. Only I would say this, that Maulana Sahib thinks too much in individual terms, sometimes, and could have made a difference but sometimes individuals are only symbols of forces at work."[4]

Now Azad speaks.

1. Michael Brecher, *Nehru, A Political Biography* (New York: Oxford University Press, 1959).
2 Pyarelal, *Mahatma Gandhi: The Last Phase* (Ahmedabad, India: Navajivan Publishing House), II, 78.
3. Ibid., p. 153.
4. *Official transcript, Prime Minister* Nehru's Press Conference, pp. 7-9.

facts were the situation itself and the bitterness and conflicts that were growing in the communal field and the feeling that even if some arrangement could be arrived at to prevent partition, those conflicts and inner disruptions would continue, and might come in the way of any marked progress of the economy of the country later. Because, we were anxious naturally to make good, after Independence, in the political and the economic spheres and other—planning and all that—and we felt that if there was some kind of a compulsory union carried on, it would prevent progress—all our energies would be spent in these inner tugs of war. Whether that was a right analysis or a wrong analysis, I cannot say. I am only saying that it had a powerful effect on our thinking. And even in the course of the Interim Government, we had proposed the appointment of a Planning Commission. It had been opposed by the Muslim League representatives: So that, in every such matter where economic considerations and planning came in, we were likely to come up against inner pulls in different directions. That was. I think—this overwhelming sensation that any kind of a union, if it came about, would first of all not put an end to these inner pulls, secondly, it would leave the Federal Government so weak—with the transfer of power to its various constituent units—the Central Federation would be so weak, that it would not be able to act properly or adopt any effective economic measures. These were the real reasons which ultimately induced us to agree. It was a very, very difficult choice—you can well imagine—and it is frightfully difficult to say now what one could do if one had the same choice. It is very difficult to say; it is very difficult because of what happened subsequently—the terrible things that happened—because when we decided on partition, I do not think any of us ever thought that there would be this terror of mutual killing after the partition. It was in a sense to avoid that, that we decided on partition. So we paid a double price for it, first, you might say, politically, ideologically, second, the actual thing happened that we tried to avoid.

"So, how can I judge how far I was responsible? Mine was certainly part of the responsibility, and Maulana Sabib

fetched three to four times the published price. Everybody, of course, eagerly awaited Nehru's reaction to Azad's statements and inevitably the matter was brought up at the Prime Minister's press conference. Nehru manifested his customary magnificent magnanimity. He had read the book in manuscript with great care and even made a few minor corrections, one regarding the place where Chiang Kai-shek had stayed in India. Otherwise he insisted on the book's appearing without change, just as it had come from Azad's hand. (The title is Nehru's own formulation.)

An Indian journalist then asked: "Do you think that partition could have been avoided if the proposals brought by Lord Mountbatten could have been brought by some other viceroy? We want to know the exact personal influence which he exercised over your mind."

The Prime Minister replied: "First of all, Maulana Azad has referred to what I said at a press conference. Now, I am sorry to confess that I have no very clear ideas of the day-to-day occurrences in those days; it was a great burden on all of us—a burden of decision, a burden of occurrences, events, happenings, all over, and the tremendous strain under which we were functioning in that Interim Government as it was called, inside the Government, I mean, apart from occurrences outside, because the Muslim League Party were out, as they openly said, to prevent us from functioning satisfactorily. During the period of the Interim Government, I think in the first few weeks, I was constantly going to Lord Wavell and telling him that I had had enough of it. I must have done so—I do not know—four or five times in the course of the next two or three months, that is, verbally resigning not actually writing, but saying that I wanted to get out. He said, 'wait and see' or something like that. So that it is a little difficult to reply on one's memory of a thing that happened 12 years ago when one was under great strain, in difficulty—not I alone, but all of us. And it is quite conceivable for people to have different recollections as to who influenced whom or what. The real fact is, I think, that personal influences count. How am I to say how I was influenced? I cannot judge. But I think the real

Thereafter, on each of my visits to India, he would offer a spread of western food for the spoiled palate of the American and, with none present except Humayun Kabir, his friend and political associate, himself a thoughtful author (now Minister for Cultural Affairs in Nehru's Government), and K. R. Kripalani or another secretary, the luncheon conversation—never a sentence of small talk—would proceed meaningfully for two or three hours. If the question required an indiscreet reply about a Cabinet colleague or a government policy, he would indicate agreement by smiling and saying, "You know my views". On one occasion he asked me, "What is India's moral standing abroad?" Nothing more was needed to indicate his displeasure with either the programme or, more likely, its spokesman at foreign forums. Usually it was he who cross-examined me—on Soviet diplomacy and conditions, Germany, Indonesia, United States policy towards China, yes, even about India. I last broke bread with him a few weeks before his death, when illness had painfully bent his body but left untouched the keen edge of his mind. As ever, he cared for humanity in his own country and in the world. But it was not a cold concern for "masses" or classes. He had warmth, a heart for friendship and an eye for the personal side of politics. His bond with Nehru, his reverence of Gandhi, suffuse the pages of his autobiography. He paints little word pictures of Sir Stafford Cripps, Mountbatten and other British leaders. How does the heat of India's dry plains affect talks on the fate of nations? How did the British arrest respected Indian leaders? What did Azad and Nehru do together in jail? How does it feel to be in prison when your wife dies and not to attend the funeral, yet to go from prison to the Viceroy's palace for negotiations about independence? Threaded between resolutions and texts are delightful human sketches revealing the man and his fellow men. The fight for freedom, under moral leadership, breeds giants. The task of governing, through compromise, cuts them down to normal size.

When Maulana Azad's book appeared in India it was a political sensation and immediately became a best seller. Indeed it sold so fast that between printings it occasionally

countenance internecine slaughter on a grand scale. Every fibre of his being rebelled against bloodshed. He advanced the slogan, "Peace before Pakistan". But Mountbatten had persuaded Nehru and Patel that there could be no peace without Pakistan. 'I felt," Patel explained later, "that if we did not accept partition India would be split into many bits and would be completely ruined."[8]

The fact is that Congress no longer supported Gandhi on the integrity of India. "Mr. Gandhi," Lord Mountbatten said to the Mahatma in one of their six talks, "today Congress is with me"

"But India," Gandhi replied, "is with me today."

He was wrong. India was about to burst into flames which would burn hundreds of thousands of all races and religions to death. Then a young Hindu shot Gandhi for being pro-Muslim, and India, torn in twain—torn in three really, for there are two Pakistans, one in the east and a second in the west—entered the Nehru era. It has been a difficult, sometimes desperate, period in which the cost of partition multiplied the cost of the country must pay for five centuries of stagnation.

What happened was many times worse than that which Nehru and Patel thought they could prevent by bowing to Jinnah—partition. In New York on October 16, 1949, Prime Minister Nehru declared that he would have fought to the end against the establishment of Pakistan had he foreseen the dire consequences that flowed from it. Azad foresaw and warned and yet remained by Nehru's side, a trusted friend during the ten troubled years between independence-plus-partition and his death on February 22, 1958.

Azad was noble and brilliant. His integrity, a stern master, did not prevent him from being generous and gracious. I first met him in Gandhi's ashram in June 1942. Azad understood English perfectly and could have spoken it, but to avoid misunderstandings he availed himself of an interpreter. On that first occasion Nehru translated. I asked the Maulana about partition. He said he did not believe in "divorce before marriage". Indians must begin by living in wedlock. If it did not work, they could get a divorce.

Minister[1]. The biography is laudatory, at times worshipful ("Nehru," Brecher says, "is a giant both as a man and statesman") but never starry-eyed. Commenting on Nehru's approval of partition, he declares, "For those who have been in opposition most of their political lives, the prize of power is tempting. The Congress leaders had already tasted its fruits (in the Interim Government) and were naturally reluctant to part with it at the moment of triumph"—at the moment when the British announced their readiness to free India. "This," Brecher continues, "applies to Nehru as well." But he sought power primarily to translate his ideals into reality.

Azad had his own views on why Nehru accepted partition and they will give no comfort to the doctrinaire and indoctrinated who believe that men—and women—do not make history. Nehru, Azad says, "is also impulsive and amenable to personal influence". The details fascinate.

There was another factor. Nehru and Krishna Menon told me in India in 1946 that the British were not leaving the country. I found in Indonesia that the nationalist leaders had the same kind of doubts about Holland's final—1949—decision to quit the Indies. It is extremely difficult for minds conditioned by the prolonged domination of their native land by a powerful imperialism to accept its imminent departure as a reality. When Mountbatten made it clear that, given partition, Britain would indeed leave, Nehru and others eagerly seized the offer lest (who knows?) it be withdrawn.

Azad would have been patient and taken nothing less than an India united as a confederation. Mahatma Gandhi hoped to achieve this by a simple formula. "Hand over power to Mr. Jinnah," he advised Mountbatten in effect at their first meeting.[2] Since the British could not allow the Muslim minority to rule India, however, they would have to stay until Congress accepted power. But the British had decided not to stay. Therefore they would have to yield to the Congress party's condition: no Pakistan

Mountbatten escaped from this logical pincer by convincing Nehru and Patel that civil war impended and partition was the only way to avoid it. Nor could Gandhi himself

Prime Minister Attlee now sent Lord Mountbatten to "sell" partition to the Indian leaders. After the task had been accomplished he told the Royal Empire Society in London on October 6, 1948, how he did it. "Personally," Mountbatten stated on that occasion, "I was convinced that the right solution for then and still would be to keep a United India" under the Cabinet Mission's plan. But "Mr. Jinnah made it abundantly clear from the first moment that so long as he lived he would never accept a United India. He demanded partition, he insisted on Pakistan." The Congress party, on the other hand, preferred India whole. Its leaders would, however, accept partition to avoid civil war Mountbatten "was convinced that the Muslim League would have fought".

But the Congress party refused to let large non-Muslim areas go to Pakistan. "This automatically meant," Mountbatten explained at the Royal Empire Society, "a partition of the great provinces of the Punjab and Bengal," which had millions of Hindu and Sikh inhabitants, and more millions of Muslims. "When I told Mr. Jinnah that I had their (the Congress party leaders) provisional agreement to partition he was overjoyed. When I said it logically followed that this would involve partition of the Punjab and Bengal he was horrified. He produced the strongest arguments why these provinces should not be partitioned. He said that they had national characteristics and that partition would be disastrous. I agreed, but I said how much more must I now feel that the same consideration applied to the partitioning of the whole of India. He did not like that, and started explaining why India had to be partitioned, and so we went round and round the mulberry bush until he finally realised that either he could have a United India with an unpartitioned Punjab and Bengal or a divided India with a partitioned Punjab and Bengal and he finally accepted the latter solution."

It is not startling that Jinnah agreed to partition. He wanted his Pakistan. But how did Mountbatten win over Nehru and Patel and Gandhi—never Azad? "The crucial role in the great decision" to partition India was Nehru's, writes Michael Brecher, professor at Canada's McGill University, in the latest and best biography of the Indian Prime

between them, each with its own constitution—which the British Cabinet Mission proposed on May 16, 1946, and which Maulana Azad favoured from that date to his dying day.

Nehru, according to Azad, sank the plan in an historic press conference. The Cabinet Mission had considered the advisability of partition and rejected it. The creation of Pakistan would require the splitting of two giant provinces, the Punjab and Bengal, "contrary to the wishes of a very large percentage of the inhabitants.... Finally there is the geographical fact that the two halves of the proposed Pakistan state are separated by some 700 miles" of Indian territory. "We are therefore unable to advise the British Government," the Mission announced, "that the power which at present resides in British hands should be handed over to two entirely separate sovereign states." Lord Wavell, the British Viceroy, took the same position.

Thwarted, seeing no alternative, Jinnah accepted the Mission's confederation scheme. "Now happened one of those unfortunate events which changed the course of history," Azad writes. The event was a Nehru press interview in Bombay. I attended that fateful question-and-answer period and when it ended I said to Nehru in the presence of Mrs. Vijayalakshmi Pandit, his sister, "You have changed the entire basis of the agreement with England."

He smiled and replied, "I am fully aware of that."

Nehru had told the assembled journalists that the Congress party, of which he, Gandhi, Azad and Patel were the leaders, would not be bound by the Cabinet Mission's confederation plan. Actually the All-India Congress Committee had met in the same city of Bombay only two days earlier under Nehru's chairmanship and in Gandhi's presence and voted for the plan. This is fully documented in the minutes; Azad, who participated in the discussions, bears witness to it.

Jinnah read Nehru's press conference statement as the Congress party's withdrawal from the Cabinet Mission's scheme. He accordingly withdrew his approval too. There followed most cruel, widespread violence, Muslim League intransigence, Congress party despair, and, finally, the British Labour Government decision to partition India while unshackling her.

dedicated, with permission, "For Jawaharlal Nehru, Friend and Comrade". Azad wrote it while Minister of Education in Nehru's Cabinet. He could not have known at the time that he would die before the day of publication. It took courage to blame Nehru, in considerable part, for the partition which Azad opposed from first to last. Courage and honesty are the outstanding characteristics of this book as they were of the man.

An Arabic scholar renowned throughout the Islamic world, Azad was an Indian nationalist eager to found a free India undiminished by a Muslim state of Pakistan. For him the vivisection of India was a public calamity and a personal tragedy. It shattered his entire lifework for an independent country whose unifying nationhood would bridge the religious differences between Hindu and Muslim communities. His heartache was understandable and so, too, the bitterness against those he holds responsible. He waited ten years to let his emotion cool and then dictated these memoirs.

It is the irony of fickle politics that Nehru, least Hindu of Hindus, the westernized agnostic born in the United Provinces (now Uttar Pradesh), where Muslims and Hindus always coexisted in friendly affinity, should have acquiesced in the bisection of his beloved India on religious lines. He did so because he came to the conclusion, as the very Hindu Patel had a bit earlier in 1947, that it would be impossible to govern free India if the obstructionist Muslim Leaguers, under Mohammed Ali Jinnah's vengeful inspiration, refused to collaborate. Better to stand divided than fall united.

Nehru oday regrets the mistake. "Twenty years ago," he told C. L. Sulzberger in an interview published by the *New York Times* on March 2, 1957, "I would have said that certainly we should have some kind of confederation—not federation—independendent states with common defence and economic politics. The difficulty now is if we talk about it. This upsets our neighbours (Pakistan) because we are so much bigger. Nevertheless, of course this remains the logical future path—confederation with each member nation maintaining its independence intact."

Such, roughly, was the plan—a confederation consisting of three regional groupings of autonomous provinces: two Muslim regions in West and East India, a predominantly Hindu region

Giants and Men

by

LOUIS FISCHER*

آج صبح آپ سے ٹیلفون پر کئے گئے وعدے کے مطابق "انڈیا ونس فریڈم" کے ۱۹۶۰ء میں شائع شدہ امریکن ایڈیشن میں شامل لوئی فیشر کا دیباچہ بعنوان GIANTS AND MEN کی فوٹو کاپی منسلک کر رہا ہوں۔ یہ "انڈیا ونس فریڈم" کے جولائی ۱۹۷۸ء کے ایڈیشن میں شامل تھا۔ اب جو مکمل ایڈیشن ۱۹۸۸ء سے آرہا ہے اس میں یہ شامل نہیں ہے۔ شائد پسند آئے۔

محمد امین مسعود صدیقی

۱۰ دسمبر ۱۹۹۴ء

Unlike the thirteen American colonies, India won national independence not in a revolutionary war but through negotiation. The way to the conference table was prepared by three decades of the Gandhi-led, nonviolent struggle for freedom, and by the five and a half years of Britain's valiant and victorious battle with Hitler, Italy and Japan. The fighting finished, England faced pressing business at home: tending her wounds and mending her economic fences. She had neither the mood nor the might to frustrate India's will to liberty. Within nine months—a very short time—after the end of the global war, therefore, an influential Cabinet Mission, sent by the Attlee Labour government, was in India deliberating with Mahatma Gandhi, Jawaharlal Nehru, Vallabhbhai Patel and Maulana Azad on the terms of Britain's departure. How independence was negotiated and who was responsible for the simultaneous disaster of partition is told in this autobiography of one of the Big Four: Maulana Azad.

Rarely has an insider written with such frankness about events hitherto unrevealed or merely rumoured. Nehru and Azad were personally close and politically kin. This book is

*Reproduced from *India Wins Freedom* (New York : Longmans, Green & Co., Inc , 1960).

representatives and one Sikh to London. Jinnah immediately accepted the invitation but Congress had at first refused it. It was only on a personal call from Attlee that Nehru agreed to go to London.

Wavell, Jinnah, Liaquat Ali, Nehru and Baldeo Singh, the Sikh representative, flew to London. The Conference did not, however, produce any helpful positive results. Nehru did not accept the grouping of Provinces. The Conference thus broke down, and Nehru and Baldeo Singh left London on the morning of 7th December to arrive in India in time for the opening of the Constituent Assembly on 9th December. The Assembly met with all the Muslim League representatives absent.

"The Congress does not challenge and accepts that the Muslim League now is the authoritative representative body of an overwhelming majority of the Muslims of India. As such and in accordance with democratic principles, they alone have today an unquestionable right to represent the Muslims of India. But the Congress cannot agree that any restriction or limitation should be put upon the Congress to choose such representatives as they think proper from among the members of the Congress as their representatives".

To Congress leaders it represented such a dramatic departure from their long-held position, that they could not accept it. They repudiated Gandhiji.

Nehru wrote to Jinnah on 6th October: "We feel that the formula is not happily worded. We are willing, as a result of the elections, to accept the Muslim League as the authoritative organisation of an overwhelming majority of Muslims of India and that as such and in accordance with democratic principles, they have today the unquestionable right to represent the Muslims of India, provided that for identical reasons the League recognises the Congress as an authoritative organisation representing all non-Muslims and such Muslims as have thrown in their lot with the Congress. The Congress cannot agree to any restriction or limitations to be put upon it in choosing such representatives as they think proper amongst the members of the Congress. We would suggest, therefore, that no formula is necessary and each organisation may stand on its merits".

Gandhiji accepted this repudiation without protest as later at a prayer meeting he said he had been guilty of acting without closely .ading it.

The correspondence further disclosed Jinnah's determination to prevent anything arising which would prejudice his intention of achieving Pakistan.

To make matters worse, Dr. Bardoloi, Chief Minister of Assam, was opposed to the grouping of Bengal with Assam. Nehru and Azad did not approve of this as these groupings were a cardinal point with Jinnah. But, Gandhiji sided with Dr. Bardoloi and Nehru was helpless.

This gave Jinnah the opportunity finally to decide on the boycott of the Constituent Assembly.

It was at this stage that Attlee stepped into the breach to prevent the final break-down. On 26th November, the British Cabinet invited the Viceroy and five Members of the Interim

of the Muslim League members in the Interim Government and reiterated the fact that the only solution of the Indian problem was Pakistan, which, until absolutely achieved, there was no possibility of an end to India's civil strife.

Nehru, in an outspoken declaration at the Congress Subjects Committee at Meerut stated on 21st November 1946 that the atmosphere in the new Central Government after the League's entry, had become so strained that Congress members had twice threatened to resign. "Our patience is fast reaching the limit", and added, "If these things continue, a struggle on a large scale was inevitable". He also charged the Viceroy with failure to carry on Government in the spirit in which it had started.

Jinnah, in a statement, on 21st November declared that no representative of the Muslim League would participate in the Constituent Assembly and the Bombay Resolution of the Muslim League Council stood. He further accused the Viceroy and His Majesty's Government of "playing into the hands of the Congress" and maintained that "by forcing this meeting of the Constituent Assembly, a situation had been created which would lead to serious consequences".

During the last six months of 1946, correspondence between Nehru, Jinnah, Wavell and Gandhiji was carried on vehemently. It is neither necessary nor possible to quote from or summarise all the correspondence which created bitterness and confusion and which was responsible for further antagonism between the Congress and the Muslim League.

It is pertinent, however, to give a short account of the developments which led to this bitterness and confusion.

Disclosure in formal correspondence that Gandhiji agreed to a formula which permitted the Muslim League to claim that it was the sole representative of Muslims in India was made by Jinnah. The correspondence disclosed also that Nehru and other members of the Interim Cabinet refused to consider this proposition as binding upon them because it restricted the right of the Congress to speak for those Indian Muslims who did not follow the Muslim League leadership.

Release of the correspondence came as an anti-climax to the days of negotiations which ended with the League's announcement that it was coming into the Government without any agreement with the Congress on how to proceed after the new Government was formed. There was little in the correspondence that had not become known to the public during the negotiations. First, Jinnah and Gandhiji had their conversation at which they agreed on the following formula:

Choudhari Mohamed Ali then an official working in the Government of India, privately told Jinnah that Finance was the most important Department which could control the working of the whole Government. Jinnah and Liaquat Ali accepted this point of view and Liaquat Ali became the Finance Minister. The procedure to hold the informal meetings of the Cabinet before the formal meeting with the Viceroy as President, was given up as Liaquat and his colleagues refused to attend the informal meetings. This led to trouble as no joint action was possible.

Nehru, Patel, Liaquat and Nishtar went to Calcutta for a peace effort and issued a joint appeal for the cessation of violence and a return to the methods of peace. Just then, Bihar retaliated against the Muslims. Terrible violence followed. Nehru and Nishtar, accompanied by Anugraha Narayan Sinha, the Finance Minister, and Abdul Bari, President of the Bihar Provincial Congress Committee and certain Muslim League Leaders, visited Bihar.

Nehru addressing a public meeting said: "If you want to kill a Muslim, you must kill me first and proceed to do whatever you choose after marching over my dead body".

Nehru chastised the people for resorting to acts of lawlessness and told them they were seriously mistaken if they had thought that Swaraj meant the freedom to cut the throats of the people with whom they disagreed. He made pointed reference to the Majority (Hindu) community in the Province and said that shouts of Mahatma Gandhi Ki Jai or Pandit Jawaharlal Ki Jai did not sound pleasing to his ears when he knew that they had indulged in acts of violence instead of sacrificing their lives to protect their Muslim brethren. By these acts they had proved traitors to the country and placed serious obstacles on the path of Swaraj.

Gandhiji on 5th November threatened to go on a fast unto death unless the communal riots in Bihar stopped within 24 hours, but the disturbances flared up and hundreds were killed. The reason for this retaliation was that in Calcutta, Hindus including Biharees, were victims of Muslim brutalities including murder. The Biharees had to leave Calcutta and escaped to Patna, Bhagalpur and other places in Bihar, where Muslims were in a minority. Jinnah told me in London on 12th December that 30,000 Muslims were killed in Bihar. This was an exaggeration but there is no doubt that events in Bihar made Jinnah sad, bitter and unforgiving. He became more obstinate.

Gandhiji started on his peace mission to Noakhali on 9th November.

followed it up by seeing Jinnah in Bombay. But Jinnah once again rejected the proposal as he did not agree to the appointment of a non-League Muslim in the Government even out of the Congress quota.

A pertinent question may be asked: If Nehru had not in his Press Statement early in July expressed himself so strongly, which put Jinnah's back up, would Jinnah have taken a less truculent attitude towards Nehru's offer of co-operation with the new Interim Government? Was this not one of the last opportunities which Congress let slip out of its hands to win Jinnah's co-operation?

The "Direct Action Day" was fixed for August 16. Constitutional agitation was to be given up. In Bengal, the results were disastrous. "Direct Action" in Calcutta and other places was merely a camouflage for an organised anti-Hindu campaign of loot, arson and indiscriminate murder of men, women and children in broad daylight with impunity. In Calcutta, the "Direct Action Day" was declared a public holiday. The Police were conspicuous by their absence owing to the deliberate inaction of the Government. The estimate is that between 5,000 to 10,000 people were killed during the four days of indiscriminate looting of shops and murders. It has now been proved beyond all doubt that this great killing and outrage were deliberately organised beforehand with the active support of the League Government.

Azad writes: "Throughout Calcutta, the Military and the Police were standing by, but remained inactive while innocent men and women were being killed".

The Hindus not getting any protection from Government, organised themselves and retaliated. A civil war for the next few days followed. Then only did the Government intervene.

On 2nd September, Nehru formed the Provisional Interim Government but as Jinnah had refused co-operation, there were no representatives of the Muslim League. Neither the Viceroy nor Nehru and his colleagues were happy about this. The Viceroy saw Jinnah and eventually Jinnah agreed to nominate Muslim League representatives to the Interim Government. The immediate problem was about the allocation of portfolios. The Finance Ministership and the Home Ministership were to be shared between the Congress and the Muslim League. As Patel refused to give up the Home Ministership, Liaquat became the Finance Minister. It was considered that the Home Ministership was the most important portfolio. When Wavell first offered Finance to the Muslim League, Jinnah had hesitated. But then,

Azad, the retiring Congress President referred with perfect justification to Nehru's Press Conference as "one of those unfortunate events which change the course of history" and categorically stated that "it was not correct to say (as Nehru did) that Congress was free to modify the (Cabinet Mission) Plan as it pleased".

Azad further said:

"Jinnah had accepted the Cabinet Missic Plan as there was no alternative. Jawaharlal's statement came to him as a bombshell. Jinnah issued a statement that the Muslim League had accepted the Plan as it was assured that the Congress had also accepted the scheme and that the Plan would be the basis of the future constitution of India. Now that the Congress President had declared that the Congress could change the scheme through its majority in the Constituent Assembly, this would mean that the minorities were placed at the mercy of the majority".

The Working Committee at its meeting held on 8th August made no reference to Nehru's unhelpful Press Conference as it would have been awkward to criticise the new President. It, therefore, re-affirmed the decision of the A. I. C. C. accepting the scheme in its entirety thus indirectly repudiating Nehru's statement.

On 18th July, Pethick-Lawrence and Cripps in Parliament unequivocally assured Jinnah that the Government would stick to the Cabinet Mission Plan of 16th May as it stood.

Jinnah, however, remained unreconciled and was not willing to accept Pethick-Lawrence's and Cripps' pacifying statements and asked what assurance could the minorities have that once the British left, Congress would not again change and go back to the position taken up in Jawaharlal's statement. Jinnah was furious and bitter and in his opening speech at the meeting of the Muslim League Council in Bombay held on 27th July, he reiterated the demand for Pakistan. The Council rejected the Cabinet Mission Plan and decided to resort to "Direct Action" for the achievement of Pakistan.

The Council called upon the Working Committee to prepare a programme of direct action.

The Viceroy renewed his offer for the appointment of an Interim Government. Jinnah immediately rejected it.

The British Government refused to allow Jinnah to exercise his power of veto.

Nehru who was asked by the Viceroy to submit proposals for the new Government, was authorised by the Working Committee to do so. Nehru wrote to Jinnah offering five seats out of four-

in appointing a Caretaker Government of officials was that in view of the fact that the second part of the Mission's proposals viz. the election to the Constituent Assembly was to be taken in hand, it was considered necessary to postpone the appointment of a political Interim Government. In his letter to the Viceroy, dated 27th June, Jinnah said that in view of this new development, the elections to the Constituent Assembly should also be postponed....., "the long-term plan and the formation of the Interim Government formed one whole, each constituting an integral part of the whole scheme. It is, therefore, undesirable to proceed with one part i.e. elections to the Constituent Assembly and to postpone the other".

Nehru took over as Congress President from Azad and at the first Press Conference he held then, he made a tactless and harmful statement, further antagonising Jinnah. He said that he would have no treaty with the British Government, if they sought to impose anything upon India; as for the minorities, it was a domestic problem and "we shall no doubt succeed in solving it. We accept no outsider's interference in it, certainly not the British Government's interference, and, therefore, these two limiting factors to the sovereignty of the Constituent Assembly are not accepted by us". He also opposed the grouping of Provinces. Nehru further enlarged the scope of the three Central subjects. He said that Defence and Communications would embrace a large number of industries necessary for their support. "Foreign Affairs" would include foreign trade policy. The Union must also provide itself with the necessary finances by taxation and not from any contribution by Provinces. Currency and Credit must also be included in the Central subjects and the Centre must have an over-all authority to settle inter-provincial disputes and to deal with administrative or economic breakdowns.

These statements made Jinnah more suspicious of Congress intentions and more obstinate in his opposition to any effort for co-operation with Congress.

Jinnah had supported a weak centre and the grouping of Provinces with residuary powers. He had accepted the British plans on these points: Nehru's statements went directly against the spirit of the British Mission's plan.

Nehru did not realise that there was much to be gained by silence and this false move upset any prospects of rapprochment with Jinnah. This was one of the most fiery, provocative and uncalled for statements in his long public life.

It was not for Nehru to alter an agreed plan unilaterally at a later stage

Moghal Empire might have survived even though there had been Aurangzebs on the throne but for the folly of weakening the Centre. Similarly, the Marathas lost their Empire because the Peshwa created three hereditary Viceroys — Gwalior, Baroda and Holkar — and the Centre was thus weakened. I do not approach the question at all from a communal point of view. Indeed left to myself I should be glad if some Ministers were Muslims. I have no horror of Mohamedans or Islam and indeed my Hindu friends look upon me more as a Muslim than as a Hindu; but I am definitely of the opinion that the division of India will mean disaster to India.

"I very well remember 1916 and 1917 when you and I were working hand in hand with Mrs. Besant and I know what keen interest you took in the Indian Home Rule".

On 15th March, Prime Minister Attlee said in the House of Commons:

"It is not good applying the formula of the past to the present position.' The temperature of 1946 is not the temperature of 1920, 1930 or even 1942. The slogans of earlier days have been discarded. Sometimes, words that seemed at that time to Indians to express the height of their aspiration are now set aside and other words and ideas thrust forward.... We cannot allow a minority to place their veto on the advance of a majority".

On 16th March, Nehru welcomed the "Change in tone and approach" in Attlee's Speech.

On 24th March the Cabinet Mission arrived in New Delhi and immediately started talks with the Viceroy and the officials.

The Cabinet Mission and the Viceroy announced that a temporary care-taker Government of officials would be set up and the negotiations to form a representative Government would be adjourned for a short interval while the elections to the Constituent Assembly took place. The statement said: "The Cabinet Mission and the Viceroy are glad that Constitution-making could now proceed with the consent of the two major parties and of the States".

Jinnah objected to the formation of this Caretaker Government which he thought was contrary to what the Viceroy had promised him. The Viceroy had said that he would go ahead with the formation of the provisional Government consisting of representatives of political parties. The Viceroy's point of view

to judge him by his speeches on public platforms or by constant references to the favourite phrase "Quit India" or to his attacks on the bureaucracy. To know his real views you must discuss things across the table with him. He is an ardent believer in unqualified freedom, but he is the one man who can influence thought among the rank and file and I should like this Mission to tackle him tactfully. He happens to be a friend of Cripps and I think the two can get on with each other. Gandhiji too should prove a moderating influence. He should on no account be ignored. It is true that at times he uses language which is too metaphysical for the Western mind. Indeed at times it is too metaphysical for me also, but with all these peculiarities I shall say that he is essentially a man of peace and can think on a higher level than many others. The problem before this Mission will be mainly psychological and they can succeed only if they can create a feeling of confidence amongst those who will come into touch with them. I think we may then look forward to happy results. They will have difficulties with the Sikhs, the Depressed Classes and particularly with Jinnah. As you know Jinnah and I worked hand in hand for nearly 35 years of our life but he is a different man altogether now. Whatever else I may swallow, I cannot as a U. P. and a Delhiman, swallow Jinnah's theory of two nations. I am opposed to Pakistan mainly because from an international point of view it would be most unfortunate to divide India. A divided India will be an easier morsel for Russia to swallow and I confess that I am not free from considerable doubts as to the attitude and bonafides of Russia. Further, you may be sure that Pakistan in the sense in which Jinnah wants it established, a reunion movement will spring up within 24 hours. Instead of doing constructive work for the benefit of the country we shall be wasting our time in fomenting intrigues against each other. If, therefore, the Mission can do anything to solve this problem it will be doing a lasting service to the country. I am all for the protection of the ministries but the one condition which I consider to be absolutely indispensable is that there should be one Centre even though it may be of a limited scope.. The history of India of the 18th Century should be a warning to every one. The Moghal Emperor created three hereditary Viceroys in Hyderabad, Bengal and Oudh, which weakened [illegible]

STRUGGLE TO AVOID PARTITION

SIR TEJ BAHADUR SAPRU wrote to Graham Pole on 25th February, 1946:

February, 1946:

"I am glad that Lord Pethick Lawrence, Sir Stafford Cripps and Mr. Alexander are coming out as a Mission on behalf of the Cabinet to help us in the solution of constitutional questions. Why don't they bring you out with them? You can be a very effective liaison between them and Indian politicians. It would be a great mistake on their part to depend upon the bureaucracy at Delhi to serve as a bridge between them and Indian politicians.... In my opinion a Mission like this should have come out long ago but it was idle to expect anything like this in the time of Lord Linlithgow or Mr. Amery. They were adamant. They considered it a heresy to depart by a hair's breadth from their favourite formula about agreement between the principal elements of Indian public life.... I am not opposed to giving the amplest and most effective guarantees and securities to the ministries in respect of their cultural, religious and economic rights. On the contrary I have always been an advocate of such protrction: but to tell any section of community in India that nothing will be done without their consent means inviting trouble. I personally think that on the constitutional side the Mission should not experience much difficulty. There will be some controversy as to whether the Constitution should be one based on Dominion Status or Independence. Personally, I am not attracted by mere phrases and as you know, I should like in some shape or other the Indo-British connection to continue as in spite of our political grievances, and they are genuine — I feel that within the social and cultural sphere our contact with England has been to our advantage.

"Ever since the release of Jawaharlal Nehru from his internment at Ahmednagar he has met and dined with me several times. To my agreeable surprise, I find that he has developed a very constructive and thoughtful mentality. He is [illegible] than he was before and socially

solution for the formation of an Interim Ministry, consisting of the representatives of both the Congress and the Muslim League. Vallabhbhai Patel was optimistic and he told me in reply to my anxious enquiries that before I left India on my long sea-voyage to the United States, the problem of India would be satisfactorily settled. Patel added that after the return of the Cabinet Mission from Simla the Mission would ask the Congress and the Muslim League to form an Interim National Government at the Centre. The Congress would agree to do so but if Jinnah refused, even then the Government would go ahead with their intention without getting Jinnah's help and co-operation. I asked Patel on what terms he would settle with Jinnah, and I would go to Jinnah and meet him without any previous appointment just as I had gone to meet Patel that morning. He said there was nothing more to settle with Jinnah. He added: "Go and tell Jinnah that the British and the Congress having come to terms, there was no place for Jinnah in India and ask him to go to America with you". This was said of course as a joke but it indicated Patel's mentality that once the Congress came to terms with the British, we need not worry about getting Jinnah's and the Muslim League's co operation.

dressed at Chowpatty a public meeting on the lines suggested by Patel, he left for Allahabad the same night. Thereupon, the R. I. N. revolt collapsed.

Colville had felt most uncomfortable over this revolt and he admitted privately that but for Patel, the Government would have found themselves in a much more difficult situation.

This revolt was a matter of touch and go for India. The slightest indiscretion or hasty unguarded words on the part of Nehru or Patel would have resulted in wholesale bloodshed and terrible catastrophe. This was one of the Sardar's great acts of wisdom. Even before a settlement with the British was in sight, he foresaw that any disruptive tendency would spoil all chances for victory and peace.

The Cabinet Mission arrived in New Delhi on 24th March, 1946. The Congress asked for Independence and a Constitution making body to determine the future Consututuon. In the intervening penod, there should be an Interim Government at the Centre which would be responsible for all subsequent stages including the setting up of the Constitution making body.

On 4th April, 1946, a great opportunity for study and service came to me. I received a letter from my good friend, Howard Donovan, Consul-General for U. S in Bombay, intimating to me that the U. S. Government had invited me for a stay of six months as their guest for the purpose of studying labour problems, and further saying that this would mean my tourıng round different States in the U. S. I was asked to keep ready as early as possible as the transport facilities soon after the end of the war had not returned to normal and that arrangements would be made for my voyage by an American cargo freighter. This invitation extended to me was in my personal capacity.

Things had to move fast and, luckily for me, they did. In a few days, I was in New Delhi and met the Secretaries of the Labour and Finance Ministries. They helped me tremendously. The Labour Ministry gave me all the labour literature that had not yet been published in regard to the Rege Labour Investigation Committee and the 37 Reports made by the Sub-Committee of the Rege Committee in regard to the different industries in India. The Finance Ministry gave me all the dollar exchange they thought I would need. As a matter of fact they gave me more dollars than I had asked for. I went to Patel on 18th April in the morning at six to say good-bye, just a day before the Cabinet Mission consisting of Lord Pethick-Lawrence, A. V. Alexander

are not with him are against him. That is his attitude. He is too impassioned and shoots at random. To make matters worse, he is conceited and fond of popular demonstrations. He has often given way to Gandhiji and Vallabhbhai. He gave way to Gandhiji and Vallabhbhai in July/August, 1942 with disastrous results, but he and Vallabhbhai will work together. Jawaharlal is a great gentleman, a loveable personality, liked and respected by those who come into contact with him and by millions in this country. The British Government should make friends with him and Vallabhbhai. Jawaharlal could have made himself much more useful to the country by taking up a non-party line.

"Jinnah — I found Jinnah on the 5th November better in health and in spirit than I found him during the last six years. In October, 1944, I found him peevish, sick and depressed. This month I found him healthy and cheerful. The Congress treated him very badly. Linlithgow and the British Government pampered him too much. In July, the British Government made the mistake of letting him decide what they were to do for India. This success has made him still more obstinate.

"Now Wavell—In 1942 when Wavell was Commander-in-Chief, an American Journalist who saw him found that he had already passed the best time of his life so far as his intelligence was concerned. Wavell was then a defeated and disappointed General. Wavell admitted that he was caught napping in Lybia and in Singapore and other places and thus brought down the British prestige to less than zero.

....

Sardar Patel stepped into the breach to stop the riot. He told the Socialist leaders that at a time when there were prospects of a friendly settlement with the British, he would not tolerate any disruptive activities and that he would not let them succeed, through this strike of the R. I. N., in creating panic and confusion in the country. Mrs. Aruna Asaf Ali wired to Nehru to come to Bombay to help the revolt. Nehru took the first train to Bombay. Vallabhbhai sent a special messenger to Dedar and asked Nehru to see him at once and not proceed to the Victoria Terminus where a huge crowd was waiting to receive him. Patel spoke strongly to Nehru and told him of the folly of helping the rioters. Nehru persuaded himself to be converted to Patel's point of view.

I ended the *Memorandum* by referring to the five men who counted most in India and could help or hinder a settlement:

Gandhiji
Wavell
Vallabhbhai Patel
Jawaharlal Nehru
Jinnah

I wrote: "Gandhiji, I think, will not take any active part in shaping in detail the policy of the Congress; but my feeling is that he would be for avoiding trouble and for peace. So long as he is alive, he would exert some influence on the policy of the Congress.

"The two most active members of the Congress Working Committee who count and who will count most in the near and distant future are Vallabhbhai and Nehru. No secret is made of the fact that they do not like each other and that their policies differ. But they have a common ground to work on—to win freedom and a senior friend to protect and keep them together—Gandhiji. It will be wrong to imagine that Vallabhbhai and Nehru will split either before or after Gandhiji's death. Whatever their personal differences, they will stick to each other and the Congress policy will be decided by these two working together. These are the two men in India who can deliver the goods and the British Government should make the earliest possible efforts to make contacts with them and come to terms with them. Both, as I have said, have become anti-Jinnah and have given up non-violence.

"Vallabhbhai is a sick man and will have to undergo an operation at an early date. He is postponing it because of the heavy political work. He is the one man who knows his mind and who can get things done. He is strong, well-informed and exerts the most powerful influence on the country next to Gandhiji. Knowing him as I do, I am confident that if the British Government left aside a bit of their unjustifiable prestige and contacted him, they would not be wasting their time. He belongs to the right-wing of the Congress and is practical minded. He is a bitter enemy of the Communists. He will come to terms with the British if the British are in a mood to settle.

undisputed leader of the Muslim League and that he represented the Muslims and that Congress had no hold over them.

On the other hand, the Congress secured all the open seats, other than Muslim; the Hindu Maha Sabha and the Independents were wiped off.

The Provincial elections took place between December, 1945 and February, 1946.

The Congress election propaganda and tactics made further estrangement between the Congress and the Muslim League. Nehru and Vallabhbhai said that the Congress would not take any initiative in negotiating a settlement with the Muslim League and that if the Muslim League wanted a settlement, it would have to come to the Congress! Jinnah told me that the Congress would go to him after six months when the election results were known and Jinnah had succeeded in the Muslim provinces.

I told Vallabhbhai in October that the speeches made by the Congress leaders were inciting violence and the Congressmen were talking of blood and thunder. I pointed out that Vallabhbhai also spoke in the same vein! Vallabhbhai replied to me: "Don't worry about the speeches. You just wait. As soon as I form my ministries, I shall put everything in order and you will have no reason to grumble". He knew my opinion and he knew my politics. He knew I was opposed to all kinds of fireworks and that I was in favour of making the best possible use of the opportunities. Vallabhbhai asked me not to worry. This meant that he would follow the policy of the Congress Ministries of 1937.

On the very morning of the day I saw Vallabhbhai, I had a forty-five minute talk with the Bombay Governor—Colville. I discussed with him politics. I put it to Colville that Wavell and the Government of India and the Governor were making a serious mistake in not contacting and coming to terms with the Congress. I told him that the good work done at Simla in July was discontinued and forgotten by the water-tight compartments in which Wavell, Colville and others on one side and the Congress leaders on the other, had put themselves.

At the Simla Conference, Congress had decided to nominate Azad, Nehru and Patel as its representatives on the Executive Council. But for the general elections later in the year, the Congress put up its second rank of leaders and even more junior workers as its candidates. The Congress had approached some prominent non-party men to stand for the Assembly but insisted on their signing the Congress pledge of complete obedience etc.

On Diwali day 1945 (5th November) my son and I called on Jinnah—without appointment—to give him our Diwali Greetings. He immediately called us to the first floor of his newly built house. I wanted to ask if Jinnah wanted Pakistan and if he thought he would win it, how was it that he spent lakhs and lakhs of rupees to re-build completely his old house during the early forties. In March, 1934, just before he fell seriously ill, he told me that he wanted to sell his bunglow. He did not do so because he did not get the price he required. But this rebuilding of the big house was a pointer that he could never have thought that his demand for Pakistan would be conceded. In November, 1945. he had no idea whatsoever of giving up his Bombay home and settling down in Karachi.

I had an interesting talk with Jinnah that day. I asked him if he had heard that Motilal Setalvad, (till recently Attorney General of India), had accepted the Congress invitation to stand for one of the two seats from Bombay for the Legislative Assembly, but that his name was dropped because Motilal was not agreeable to sign the Congress membership pledge. Jinnah said he knew about this and added: "It would have been a pleasure to work with Motilal". Once again, did this mean that Jinnah was keen on Pakistan?

Then he complained that he knew that the Congress was spending lakhs of rupees to get elected to the Central and Provincial Legislatures those who styled themselves as Nationalist Muslims but who were not genuine. The Congress would not get a single Nationalist Muslim returned to the Legislatures, Jinnah told me, and that every seat would go to the Muslim League and this was what happened. Jinnah further complained that in all their election speeches, Jawaharlal Nehru and Vallabhbhai Patel were using foul and insulting language about him. [illegible]

Government's position in the international world would be weakened after the war and that they would not be in a position to hold India.

I again asked: "What next?". He said: "Educate, educate". I asked: "Educate whom?" He replied: "Educate first the Hindus and then the British". So I said: "Oh you mean you want to get world opinion in your favour. You want the world including America to see the justness of your Pakistan cause". Jinnah replied he did not care for America. It was enough for him if he got the Hindus and the British to understand his point of view.

I put it to him that sooner or later this problem would be solved to the satisfaction of both parties and asked him whether he did not agree. Jinnah said: "Yes, but you do not realise the factor of time. In between you do not realise how much bitterness is being created. Reconciliation may come sooner or later, but if it does not come in good time, bitterness will remain and the Hindus and the Musalmans even though working together would not be good friends if the settlement is not brought about quickly". He added: "Look at U.S.A. The Americans still dislike and distrust the British and there is all the time friction and criticism between the two, the reason being that the British did not give way in good time to America's demand for independence and America had to fight for it and in spite of the lapse of time the Americans do not like and will never like the British".

Jinnah said that the Congress August 1942 Resolution gave he Musalmans more than what Gandhiji was offering now. said that the August, 1942 Resolution was giving the Musalmans s much as they wanted and if instead of merely passing the esolution, Jawaharlal had gone to Jinnah with that offer, with light modifications, the offer would have been accepted by Jinnah nd his friends, who knows? It will be remembered that in the ongress 1942 Resolution, the Congress was giving the provinces l the residuary powers. This was one of the demands of the te Sir Fazle Hussein, leader of the Punjab Muslims and Memr of the Viceroy's Executive Council. He wanted the provinces be strong and the Congress, Sapru and other Hindus thought at this was an attempt on the part of the Musalmans to weaken Centre".

were discussed. I wanted to know what the reaction on Jinnah was, how he was taking the failure of the talks, what his next step was likely to be and what his attitude towards the British Government was.

Jinnah started talking. He had now developed a new habit of twisting and pinching his lower lip, a sign of loneliness and nervousness. I was sitting about two feet away from him and I had to strain my ears to follow what he was saying. He was speaking very low, almost to himself, just whispering, looking not at me whilst talking, but starting in front of him.

That Jinnah had gained nothing by the failure of the talks, was clear from the atmosphere of gloom and depression round about him and the anxious strain that one saw on his face. He had recovered from his recent illness of influenza and he looked well but he told me that he was extremely weak. He had gone very thin. As he was talking, I went on butting in, which he did not mind, to ask him questions carefully worded, as I did not want to make him feel that I was trying to cross-examine him or to hurt his feelings. I think I am one of the very few people who can still make friendly contacts with Jinnah on equal terms. Other friends have fallen off, given him offence by their attitude or are too angry with him to see him any more.

Jinnah went on whispering, "Why did Gandhi come to see me if he had nothing to offer me?" He repeated this question to himself at least ten times. I asked him: "Tell me, do you think Gandhiji was practising cunning on you? Did he come with the intention of not arriving at a settlement? Did he come with a view to put you in the wrong and with a view to create public opinion against you?" Jinnah replied quietly and in a deliberate manner: "No, no, no. I would not say that. Gandhi talked frankly and I have nothing so far as that is concerned against him".

I asked Jinnah, "What next" and I said that before he would answer my question, I wanted to put it to him that the British Government would take the utmost possible advantage of the failure of the talks, would gloat over them, would misrepresent India in foreign countries and would use the failure of the talks as an excuse for continuing their maladministration of India. I asked Jinnah if he did not agree. He said: "Yes, I do; what did you expect me to do? Because the British Government were going to take advantage of the situation did you expect me to commit suicide? I should rather die fighting than commit suicide". I put it gently to him that there was no suggestion of his committ-

telling me that what you wanted mainly was a gesture on the part of the Hindus and you told me that the rest was easy; the details could be filled up. That gesture has now been made by Gandhiji and I feel confident that in spite of the grumblings of Malaviya, Sastri and others and the angry protests of the Congress Socialists supported by the "*Free Press Journal*", Gandhiji will stick to his word. It is more than possible that you will have to carry him through, as the present opportunity should not be lost. I am not saying anything new when I suggest that you are as big a freedom-loving patriot in India's cause as the staunchest of the Congressmen presumes to be. You also realise, as you have said it in so many words, that the Britishers are taking advantage of the present impasse between Hindus and Muslims and they will not like any political alliance between the two great communities. The point is this: that before the war ends in Europe, we must be in a position to assert ourselves: otherwise England will again be able to take advantage of our weakness and disunity. My best wishes are with you.

"There is another matter to which I would like to draw your attention. Some days back I read in the "*Hindu*" a review of your biography in which it is suggested that as a result of your marriage in 1918 with Ruttie, you got a dowry of Rs. 30 lakhs. This is an absurd and incorrect statement and I think a contradiction may be sent to the "*Hindu*" and to the author."

Gandhiji and Jinnah met for talks in the last week of September and the first week of October. The correspondence published between Gandhiji and Jinnah clearly showed that there was no justification for Gandhiji to carry on these talks for three weeks and raise false hopes in the minds of the country. The very first day's talk should have made Gandhiji realise that there was no chance of succeeding and coming to a settlement. And so, at last when the results were announced, a wave of depression set in, which spread over the whole country and lasted for several months. In this atmosphere of depression, caused by the failure of the talks over the communal problem, the political problem was forgotten. Gandhiji went back to Wardha and the reports of friends who visited him in November/December were alarming.

The following are extracts from my Note of my talk with Jinnah on 17th October, 1944:

that Jinnah did not want a settlement of any kind and C.R. had to publish the correspondence in order to invite the public to decide on the issue. I felt then and I still feel that if Gandhiji and C. R. had not rushed into print about the C. R. Formula, the political proposals would have had some chance of fair discussions. The country's attention was diverted from the political demands to the communal question, which held the field right till the end of October, when the Jinnah-Gandhi conversations failed to bring about a settlement of the communal problem.

Jinnah had a bad time in May, 1944, over the Muslim League-Unions controversy in the Punjab. Shaukat, son of Sir Sikandar Hyat Khan, a Muslim League Minister, was dismissed by Glancy, the Punjab Governor; Khizar Hyat Khan, the Punjab Premier, under order from Glancy, refused to fall in line with Jinnah, and in the first round, Jinnah had to go under. Jinnah was perhaps smarting under this grievance, when Gandhiji and C. R. gave him an opportunity not only to stage a comeback but also made it possible for him to make a united front against the Congress. Though I have criticised C. R. for this untimely publication of his correspondence with Jinnah, I was a strong and enthusiastic supporter of his efforts at coming to terms with Jinnah, because I felt that he was working on the right lines.

I met Jinnah quite frequently. If the Congress had backed up C. R.'s efforts which, in its unwisdom it did not, C. R. would have succeeded in bringing about communal and political peace and harmony in India.

The Congress was perturbed at Gandhiji's having given way to C. R. and in private conversations, Congress leaders made their opposition to the C. R. Formula quite clear. They accused C. R. of having bamboozled Gandhiji but they could not speak openly against Gandhiji's accepting the C. R. Formula. They hoped, however, that the conversations between Gandhiji and Jinnah would fail.

The Gandhi-Jinnah talks were to be held late in August but they were postponed owing to Jinnah's illness. I wrote to Jinnah on 16th August :

> "On the eve of your meeting Gandhiji I should like to send you my very very best wishes for the success of the great mission of Hindu-Muslim unity and bringing freedom to this country.
>
> "I very well remember the talk I had with you last January and I have ever since been telling my friends that so

indifference to Gandhiji's move.

"Now when I am writing in 1957 and looking at events in retrospect, I cannot refrain from saying that there was an astonishing transformation in the attitude of some of his closest followers on the question of violence *versus* non-violence. Sardar Patel, Dr. Rajendra Prasad, Acharya Kripalani and Dr. Prafulla Ghosh had wanted to resign from the Working Committee when the Congress passed a resolution that it would support the war effort if the British declared India free. They then wrote to me that for them non-violence was a creed and even more important than Indian independence. When, however, India did become free in 1947 not one of them said that the Indian army should be disbanded. On the contrary, they insisted that the Indian army should be partitioned and brought under the immediate control of the Government of India. This was contrary to the proposal made by the Commander-in-Chief of the time. The Commander-in-Chief had suggested that for three years there should be a joint army and a joint command but they would not agree. If non-violence was really their creed, how was it possible for them to take responsibility in a Government, which spent over a hundred crores a year on the army? In fact some of them wanted to increase.

"Jawaharlal was the only member of the Working Committee who fully shared my views."

On 27th July, Gandhiji wrote to Wavell to the effect that he was prepared to advise the Working Committee to renounce mass civil disobedience and to give full co-operation in the war effort, if a declaration of immediate Indian independence were made and a national government responsible to the Central Assembly were formed, subject to the proviso that during the pendency of the war, military operations should continue as at present, but without financial burden upon India. Wavell turned down Gandhiji's request for an interview. Amery said in the House of Commons that Gandhiji's proposals did not form even the starting-point for a profitable discussion. What little chance Gandhiji's proposals had of being judged on their own merits disappeared by the mixing up of issues on the publication of the Jinnah-C.R. correspondence about Gandhiji accepting C.R.'s Pakistan Formula.

After a talk with H. V. R. Iengar, I met Rajaji on 12th July in Poona. I told him that it was a [illegible]

Gandhiji whittled down his demands. He gave up all talk of 'Quit India,' 'Non-Violence' and 'Civil Disobedience'. By this interview, Gandhiji conveyed his new policy to the Viceroy. It was his purpose, said he, not to hinder but to help the war effort! He had no intention of offering civil disobedience. History could never be repeated; he could not take the country back to 1942. The world had moved on during the last two years and the whole situation had to be reviewed *de novo.* Today he would be satisfied with a national Government in full control of civil administration and would advise the Congress to participate in such a government if formed. Gandhiji promised full co-operation in the war effort. He asked for an all-Indian Executive Council, and if his terms had been accepted, provincial governments would have been automatically restored which too would have been pledged to full co-operation in the war effort. Unfortunately, Gelder's ignorance of the Indian problem was responsible for Gandhiji's statement not being worded properly. Any sensible Government would have jumped at this offer of Gandhiji, but Churchill, Amery and Wavell turned a deaf ear to Gandhiji's proposals.

Maulana Abul Kalam Azad's remarks are pertinent and should be fully reproduced :

> "It will be recalled that when hostilities began, I had tried hard to persuade the Congress to take a realistic and positive attitude towards the war. Gandhiji had at that time taken the stand that political independence of India was no doubt important but adherence to non-violence was even more important. His declared policy was that if the only way of achieving Indian independence was to participate in the war, he for one would not adopt it. Now he said that Congress would co-operate with the British if India was declared free. This was a complete reversal of his earlier views and caused misunderstanding in India and abroad. The Indians were confused, while the impression created in Britain was still more unhappy. Many Englishmen thought that Gandhiji had refrained from helping the British when the issue of war was in doubt. In this, however, they were wrong, for the issue of the war had no influence on Gandhiji's views. They, therefore, interpreted his present offer of support as an attempt to gain British sympathy now that the victory of the Allies was assured. In consequence they did not pay attention to his offer which he had expected. Besides, the British were no longer

GANDHI-JINNAH MEETING—September 1944.

On 5th June, 1944, came the Second Front Day—the landing of the Allied troops in Normandy. A journalist friend told me on that day "My dear chap, you can now whistle for India. The Second Front news will hold the field for the next six months".

Gandhiji was obsessed by two things. He did not like the idea of being called a pro-Jap. He also resented the suggestion that he and the members of the Working Committee and the leaders of the Congress were in any way responsible, directly or indirectly, for the movement of violence and sabotage between August, 1942 and 1944. All his mind, energy and attention concentrated on these two topics.

In June 1944, Bhulabhai Desai told me very frankly that Gandhiji and Vallabhbhai had miscalculated in 1942 the strength of the British and the Americans. Gandhiji thought England would not win the war, not realising how strong the Americans were. Now the Allies were winning the war with the help of the United States and India had to pay the penalty of wrong judgment on the part of Gandhiji and Vallabhbhai.

In June, in Poona, instead of a straightforward withdrawal of the civil disodedience part of the 1942 Resolution, Gandhiji quibbled about the legal position of the Resolution and said that he could not withdraw civil disobedience. He was unhappy about the non-release of his colleagues of the Working Committee. He was overwhelmed with grief over the stories of violence and sabotage during the two years of his incarceration in the Aga Khan Palace. Many underground workers of the sabotage movement wanted by the Police, saw Gandhiji in Poona. Gandhiji advised them to surrender to the Government. His advice was not accepted by them.

I was holidaying in Poona early in July. Steward Gelder of *The News Chronicle* came to meet me. He and I went to Panchgani. He wanted to interview Gandhiji but he had no appointment to meet him. However he was confident that Gandhiji would give him the interview. I told him that Gandhiji had definitely said that without prior consultation with his Ahmednagar colleagues, he would not make a policy statement.

Curiously enough, Gandhiji gave him an interview. With Gandhiji were staying Rajaji, Dr. Sushila Nayyar who was nursing Gandhiji during ...

non-congress friends meant absolutely nothing. It appeared, therefore, that the good feeling created by the release of Gandhiji would evaporate because of inaction on both sides. Efforts had to be made to take full advantage of the situation as a result of Gandhiji's release.

I was hoping that the good atmosphere created by the release of Gandhiji would help in the solution of the difficult Indian problem and I wrote to the Governor of Bombay, Sir John Colville, suggesting that he should call on Gandhiji to inquire after his health. I received a formal ackowledgement but my suggestion was not carried out. Due to Gandhiji's weakness and bad health it would not be possible for him to make any move towards reconciliation and I was told that he would not do so without prior consultation with his colleagues who were still in the Ahmednagar Fort.

Mrs. Naidu kindly arranged a ten minute talk for me with Gandhiji on 10th June, 1944, the idea being that I should do all the talking. The following are extracts of my note dated the 20th June, 1944.

"Prior to seeing Gandhiji, I had sent to Mrs. Naidu my notes on my talks with Jinnah in January and Colville in February. When I met Gandhiji on Saturday, the 10th June at 4 p.m., he told me that he had his watch in his hand and he would throw me out as soon as my ten minutes were over. I told him that I had made a slip of the tongue in telling Mrs. Naidu that I wanted a ten-minute talk. I really meant ten hours. I added that I had two political nick-names, "encyclopaedia", given to me by the late Sir Ibrahim Rahimtoola, and "Narad" given to me by my mother. I said that it would be an exaggerated claim if I called myself "encyclopaedia", but I accepted the name of "Narad" in its true and real sense, meaning thereby—possession of a sense of humour and an intense desire to put matters right, but not the popular interpretation of "Naradism" namely making people fight and enjoying their quarrels.

ful music, sung by two girls from Gandhiji's Ashram. At a particular part of the song, Gandhiji jerked his head. The words beautifully set to music, which thus affected him were:

"May God protect the faith and reputation of the blind". The music stopped. The prayers were over. Bowls were then taken round for collection of money for Gandhiji's Harijan Fund.

I went near Gandhiji. He greeted me in a friendly way. He was observing his silence imposed on him by his doctors for a fortnight, and he talked to me by gestures, enquiring after Sir C. P.

In January, 1937, I had a long talk with Gandhiji in Trivandrum on the futility of the prayers for crowds, in which he was indulging and told him that they did more harm than good, as they set a prémium on laziness and hypocrisy, and made superstition, bad as it was in this country, much worse because of the support he gave to such prayers. I told him then that his idea of prayers and the crowd's idea of prayers were two different things and he was rendering a disservice to humanity by strengthening superstition. He said he did not agree with me.

Gandhiji was very very ill, Mrs. Naidu told me. She told me that Gandhiji was not getting enough rest. There were too many people to harass him for interviews in spite of her best efforts and Gandhiji was no better today than he was when he arrived in Bombay ten days ago. She was feeling anxious about Gandhiji. It was in spite of her very strong protest that Gandhiji toured the explosion area in the Bombay Docks and later saw in Juhu the film "Mission To Moscow". Gandhiji sat through the two hours of the picture. The film distressed him very much because of the pathos and the scenes of drudgery and slavery that depicted the lives of the common Russian.

Soon after the prayers I asked Mrs. Pandit what place this kind of prayers would have in the Kingdom of Jawaharlal. First she gave a vague and evasive reply but when I persisted she said: "This prayer is a farce and I do not believe in it. I only attend it out of my respect for Gandhiji".

The Press had not rendered any service to Gandhiji by indulging in the luxury of kite-flying as regards his intentions and movements. He had not said anything to anybody. He had not disclosed his plans, if he had any. I was afraid he was too ill to have any definite plans in his mind for the moment.

All this meant that the next step, the first step being Government's release of Gandhiji on medical grounds, was not with

with Gandhiji and Nehru, tell them how the situation had developed during the last 18 months and between them they could make further suggestions. I thought this would help in easing the political situation.

The Governor told me that he found my talk interesting. He said he was not accustomed to getting such views as I had frankly expressed and they helped him as they brought a fresh point of view and stimulated his mind. He then discussed the Tata Plan for economic development.

Colville said that he had received fullest co-operation from the people of Bombay Presidency and because of this co-operation the rationing scheme had proved successful. I told him that the rationing scheme was successful not only because the people co-operated, but also because such co-operation was made possible by the Bombay Secretariat. I mentioned particularly Iengar, Barve, Bakhle, M. J. Desai and Gorwalla.

Colville asked me why Jawaharlal had yielded to Gandhiji. I said firstly personal affection and respect for Gandhiji. Secondly, Jawaharlal was the weaker and younger man of the two and Gandhiji was, therefore, able to control him. Further Jawaharlal knew that he would lose his popularity and political position if he opposed Gandhiji.

It was fortunate for Bombay that Colville was, like his predecessor, Sir Roger Lumley (later Lord Scarborough) a man of understanding and sympathy.

Gandhiji was released from the Aga Khan Palace on account of his serious illness in the second week of May, 1944. Dr. Sushila Nayyar writes in her story of the Aga Khan Palace that she had been watching Gandhiji from the time the Inspector-General of Prisons informed Gandhiji that he was to be released the next day. Gandhiji felt more and more depressed. In the evening, Sushila Nayyar asked him why he was feeling so depressed. Gandhiji said he was scared to death; what would he do after he was released ! Gandhiji had gone to stay at Juhu to recoup his health. I met him at Juhu on 17th May, 1944, after the evening prayers. I recorded:

"I sat through the prayer quietly, next to Mrs. Pandit. Gandhiji walked up to his dias, looked very ill and thoroughly exhausted. As soon as he took his seat, the three or four minutes silent meditation began. Gandhiji went straight into deep meditation. His mind was all alert and during the meditation, he was completely immersed in it. The 'slokas' from the Gita were then chanted;

I had one more complaint — it was about the snobbish and rrogant attitude and behaviour of the British Community in India particularly their women-folk.

I asked the Governor if he knew the number of advisers appointed by the Government of India under the guise of experts. I objected to British experts because we distrusted British bona-fides and, therefore, our suspicions got still worse when Britain forced her experts on us. The British Government had floated and financed the U. K. C. C. (The United Kingdom Commercial Corporation) which was to control and monopolise in British hands the imports and exports from and to India, during and after the war. This was thus no indication that British wanted to transfer political power to India after the war was won.

I told Colville that I considered it a mistake on the part of the Congress not to have come to terms with Cripps. Cripp's proposals — (a) the transitional period to end with the hostilities, (b) Dominion Status or Independence after the war.

Our people thought that they could safely ignore (a) as they had done so far and when the war ended, they could cash on (b) that is, take up Dominion Status or Independence. That attitude, I thought, was wrong.

Colville asked me for more suggestions. I replied: "Release Gandhiji and his friends unconditionally. Put them out of jail". I said I was afraid that Government would not follow this advice. I, therefore, made another suggestion. "Take Gandhiji to Ahmednagar and let him meet his friends of the Working Committee. Let them consult together". I told Colville how difficult it was for a man to know through the papers what was really happening in the country when he was deprived of all opportunities of human contact and consultation and discussion with his colleagues. I put it to Colville that it was impossible for Gandhiji to visualise the events in India of the last 18 months because of his lack of contact. Government's remaining stubborn on this matter made one feel that Government gloated over the continuation of the present deadlock and that they did not want any way out. So my first suggestion was that Gandhiji and Nehru and the other members of the Working Committee should meet at Ahmednagar.

I further suggested that Gandhiji's meeting with his friends at Ahmednagar should be followed by Government selecting a few men, among them, Rajaji, Liaquat Ali, C. P. Ramaswamy Aiyer, G. D. Birla and Sir Francis Low, to meet the detained Congress leaders. All these men were known to the Government and could be trusted. They could be trusted to have a [illegible]

friends.

"You will have by this time seen the plan for the economic development of India published by Tatas. I am sending you herewith Sir M. Vishweshwaraiya's two pamphlets "Prosperity Through Industry" and "District Industrialisation Drive".

I sent to Sir John Colville (then Governor of Bombay) my notes of my talks with Jinnah on 14th January and met him on 4th February. Colville said that he found my note on Jinnah interesting and was glad to find that I thought that a settlement with Jinnah was possible.

Colville asked me many questions. He said — I am quoting from note — "So far as the Hindu-Muslim trouble was concerned, he knew that some of his own people were anxious that the trouble should continue and that no settlement should be arrived at because then they thought they would be free from any responsibility and could let the present dead-lock continue". Colville added: "But I am not one of those people who want the trouble to continue. I want a settlement and I think that the responsibility of the continuance of the impass is on us. It is one against us that no settlement has so far been arrived at".

Colville asked me what I thought of the present situation and how I thought the solution should be brought about and he asked me to make constructive suggestions.

I told him that it was not correct to say that Wavell was not interested in politics. It was alright in the first two or three months of his coming to India to say that he wanted to win the war and to solve the food problem. Wavell, and the British Government, not doing anything helpful exasperated us, and we, non-Congress people, more than distrusted the bonafides of the British.

I told Colville that Churchill was a sick man and he had no fresh mind to bring on the Indian problem. He had made up his mind long before 1935 and whilst he was a great War Minister, on the problem of India, he had a closed mind. Colville thought that as soon as the War ended, Churchill would give up. Churchill, being the stronger of the two, had a hold on Roosevelt. But at the Peace Conference, I felt Russia would give trouble to England and England's difficulties would be India's opportunity. It was in England's interest to settle the political problem with India before the Peace Conference.

I told Colville that I had met at least six people who had talks with Wavell recently in Bombay and Delhi. They told me that Wavell just listened but did not disclose his own mind. Apparently, he had not made up his mind.

Pakistan. N. P. A. Smith, Inspector-General of Police, formerly in the Intelligence Department of the Government of India and in 1939 when the War started Dy. Commissioner of Police, told me soon after the Congress gave up the Ministries in the Provinces that Congress would make a great mistake in not coming to terms immediately with Jinnah, as in six months' time, it would be too late to come to an agreement. I did not realise then that he was anticipating what he must have known was coming — the Pakistan Resolution of Lahore, 1940.

Jinnah told me that Rajaji was decent, genuine, well-meaning and honest, but he wanted Rajaji to be a little stronger to fight it out with Gandhiji. Jinnah added: "Rajaji is a dear fellow. I like him very much and I am sorry for him". Jinnah felt that it would be less difficult to come to terms with Nehru than with Gandhiji.

I then mentioned to Jinnah the other point made by the personal opponents of Jinnah, viz. that a conflict had already arisen in the Muslim League between the Muslim Zamindars and the other less fortunately placed younger generation of the Muslims, the peasant class. I referred Jinnah to the Punjab and Karachi. Jinnah replied: "You have known me for so many years. Have I ever cared for vested interests? Did you think I cared the slightest bit for these wretched Zamindars? Take it from me, there is no conflict in the Muslim League and the Muslim youth is not going to revolt against me. This was more than wishful thinking. Our opponents want to weaken the League by spreading such rumours but you can take it from me that they would not succeed. They were only making themselves ridiculous by spreading such false rumours which would not help them at all".

Jinnah said that many prominent Hindus were going to him day after day and they were telling him that they agreed that the Congress was all in the wrong, but that they had no courage to come out publicly to say so. Jinnah further said that it was not too late yet to come to a settlement and that there were enough Hindu Congress leaders left outside the jail who should take the lead in coming to terms with the Muslim League. All that was needed was courage to oppose Gandhiji with whom in their heart of hearts they did not agree.

Jinnah then came back to where I started and asked me to send him as much information as I could get together regarding the industrialisation schemes that were being prepared".

I wrote to Jinnah on 4th February, 1944:

"I am grateful to you for the talk I had with you on the 14th January. My reactions are that if Gandhiji and Nehru want a settlement with you, they can have it. I am saying this to my

[illegible] work for Gandhiji's release. But Gandhiji wanted to take advantage of my honest offer and I refused to get caught by him". Jinnah said that he was mainly responsible for getting Gandhiji released in 1924. I added to this that he was also responsible for the release from internment of Mrs. Besant in September, 1917. "But, of course", Jinnah stated, "Mrs. Besant was my leader and I was only her lieutenant and it was my duty as her lieutenant to get her back in our midst and to continue the work under her leadership. She was a great leader and it was a pleasure and a privilege to work under her."

Jinnah was still proud of his work with Mrs. Besant and other colleagues and nobody worked more for the political, economical and spiritual unity of India than Mrs. Besant. Jinnah looked back to the past with pride and pleasure and he had not forgotten her work for India.

To get back to Jinnah's questions: "What did I want? What was it in my demand that was unreasonable? I was asking for Pakistan, mind you, it was only the *principle* that I was asking for, *principle* of Pakistan. What wrong had I done? Did not the Hindus and the Hindu Congress realise that if we and they joined hands together we should get rid of our common enemy? Once we agreed on this point and working together we were able to throw out the British we could adjust our details and bring about an arrangement for fullest possible co-operation".

Jinnah then referred to his talks with Bhulabhai Desai, Satyamurti and Gobind Ballabh Pant in 1936 who were then prominent members of the Congress Party in the Central Legislature. In 1936, Jinnah said that he came to terms with these three Hindu leaders on the lines that whilst they all disliked the Communal Award and were, therefore, making efforts to improve upon it and make an agreed settlement which would be more fair to the Hindus and the Muslims and would bring about more unity in future action amongst the two major communities, they were prepared to work together till such an agreement was arrived at on the basis of the already existing Communal Award. Bhulabhai, Satyamurti and Pant went to the Working Committee for the endorsement of this arrangement, but Gandhiji and Nehru would not hear of it.

In passing it must be mentioned that in March 1937 when Kher refused to form the Congress Ministry and in July when a Congress Ministry was formed, Jinnah played the game and was willing to co-operate with the Congress on honourable lines.

Even in 1939 after the War started, the Congress could have come to terms with the Muslim League without any talk of

where there was no question of a dividing line between Pakistan and India. Jinnah agreed with this point of view but he did not know anything about these plans. He knew nothing of the Conference that Tatas held six months ago. He told me that he would be grateful if I could send him some literature and some information and he would study it. I suggested his getting in touch with J. R. D. Tata. He said he would".

Jinnah saw clearly what I meant to convey to him without saying it in so many words that his talk of partitioning India would turn into empty nothings the moment one thought of working out the details of such a partition. This oneness of the whole country from the economic and individual point of view put me on the next important point which has been debated every time Pakistan was discussed. I threw it at Jinnah. What would the foreign policy of Pakistan be in matter of defence or outside attack? He repeated to me what he told me six months ago. There would be one common policy for India and Pakistan.

Jinnah asked me in agonised tones: "My dear Kanji, what has Jinnah done to deserve all this vituperation, misinterpretation and this misunderstanding? Why is the Hindu Press after me? Why are your Hindu friends attributing motives to me and calling me a traitor? Why were they forgetting my past record of work? Why were they thinking that I was such a fool as to play into the hands of the British Government and be their tool to keep freedom away from this sub-continent?"

Jinnah then referred in detail to Gandhiji's letter to him of last year. He said that the Government of India had written to him long before their communique was published telling him of Gandhiji's letter to him and their decision not to forward it to Jinnah. Jinnah said: 'Government of India showed me this courtesy of informing me beforehand, not because they had any love for me which they have never shown in the past, but they wanted to make sure that I would not be caught in the trap and I would not rush into print without due thought if I read for the first time in the papers that Gandhiji had written some letter to me and Government had refused to forward it to me. Naturally, therefore, I had more time to think carefully of the implications of Gandhiji's letter".

Jinnah then read extracts from his Presidential Address to the Muslim League Conference of April, 1943. "Yes", he said "I did want a letter from Gandhiji and I had asked for it in my speech, but not the kind of letter that Gandhiji wrote. You see, I was really working for Gandhiji's release when I made that speech. If only Gandhiji had written a more detailed letter on the lines indicated by me in my speech, it would have given me a handle

put in writing. Besides it was not possible to give practical shape to this direct approach because the Congress leaders including Gandhiji were in jail and, therefore, no discussions could be held with them.

At the end of 1943, the whole political horizon was dark. There was not even the proverbial silver lining. Churchill had stood against all reforms. The communal problem could not be solved because the Congress leaders were in jail. It was at this time (27th November, 1943), that Sir B. Narsing Rau told me in New Delhi that to overcome British opposition the Congress would do well to concede to Jinnah the principle of Pakistan and agree to have a ten year interim Government consisting of the Congress and the Muslim League. This ten year period would be utilised to set up commissions to fix boundaries between India and Pakistan and for the friendly exchange of population. Foreign policy, defence and communications would be common subjects of the two countries. Ten years of working together in an Interim Government would make the parting at the end friendly and peace would prevail between the two parts of India.

Could politics ever be discussed in such an objective, dispassionate manner as to have made Narsing Rau's suggestion feasible?

In my long letter to the Indian Social Reformer (8th January, 1944) I *inter alia* wrote :

"Politically we are back in the 1860s and our leaders are still indulging in the luxury of quiet jail life and the rest of them who are out, go on making speeches, making the situation worse every time they open their mouths".

The following are extracts of the records of my talk with Jinnah:

"I had an hour and forty-five minutes' friendly and cordial talk with Jinnah on Friday, the 14th January, 1944. I set the ball rolling by referring to the Tata Plan for the economic development for India. I gave Jinnah some idea of Sir M. Vishweshwaraiya's plan and of Dr. John Mathai's "Astronomical Figure Schemes" for the whole country.

"I told Jinnah that I had read his recent speeches in Karachi and other places where he talked of making schemes and programmes for the economic uplift of the Muslims and of his appointing a Committee of Action. I mentioned the two pamphlets by Sir M. Vishweshwaraiya on "Prosperity Through Industry" and "District Industrialisation Drive". I asked Jinnah how and where he would fit in with these new schemes of industrialisation. I told him that he would be interested in the schemes as he would be able to find employment for Muslims in all the provinces. I [illegible] the fact that here was our programme for all India

Gandhiji's passing away. They had even arranged for sandalwood for his cremation inside the Aga Khan Palace!

Government permitted Dr. B. C. Roy and other physicians to stay with Gandhiji. Dr. Gilder was already there. Other friends, including Rajaji, hurried up to Gandhiji's bed-side. One afternoon, I telephoned to H. V. R. Iengar, the Home Secretary, for permission to go and meet Gandhiji. He said it was too late. Gandhiji was in a state of coma and was not expected to live for more than a few hours. The miracle happened and Gandhiji survived the fast.

During his period of convalascence, Rajaji discussed with Gandhiji the question of a fresh approach to Jinnah to settle the communal problem. Gandhiji was agreeable to this on the basis of Rajaji's formula.

Jinnah in his Presidential Address at the Annual Session of the Muslim League at New Delhi on 24th April, 1943, said that he would welcome it if Gandhiji was now really willing to come to a settlement with the Muslim League; and he suggested that just as Gandhiji was writing to the Viceroy, he could as well write to Jinnah. In response to this, Gandhiji wrote to Jinnah and asked Government to re-direct the letter to him. Government informed Jinnah about this but did not forward the letter to him.

In the autumn of 1943, I met Jinnah after he returned from New Delhi : I told him that the Congress had gone completely negative and the country's interests were suffering for want of any strong effort to win Swaraj and he should resume his all India leadership not only of the Muslims but all the other communities as well. I added that he was an all-India leader of the Home Rule League days and he would be able to gather together a big non-Congress political party of Hindus, Muslims and other communities and I said that actually Hindus were looking up to him for such a leadership. He said he had noticed a change for the better in the Hindu feeling and it was friendly to him. And then he told me that Rajaji, G. D. Birla, Lala Sri Ram and Sir Purshottamdas Thakurdas had met him in New Delhi and suggested that all of them should work together and as a beginning they were willing to concede the principle of Pakistan. Jinnah said this was a welcome sign and if only these leaders would put down this proposal in writing he would welcome their co-operation and they would all work together and he would like something to this effect in writing so that he could act on the basis of their suggestions.

The next day I met Sir Purshottamdas and G. D. Birla separately. They were both surprised that I should know about their meeting Jinnah. They said that such matters could not be

TALKS WITH JINNAH AND COLVILLE, 1943
GANDHIJI'S RELEASE AND TALKS WITH GANDHIJI

THE COUNTRY-WIDE disturbances which followed the passing of the "Quit India" Resolution were interpreted by the bureaucracy for the benefit of the Allied Nations, particularly America, as a deliberate interference with the organisation of offensive operations against Japan, with India as its main base and source of supply. For four months this criticism went on to influence the world and to discredit Gandhiji. Gandhiji felt extremely grieved at this misinterpretation of his philosophy of non-violence. He wrote to Lord Linlithgow, protesting against this official propaganda, asking to be convinced by proofs of the complicity of the Congress with the violence that the arrest of Congress leaders had precipitated. He assured the Viceroy that he would make 'ample amends' if the official charge-sheet could be brought home to him. This letter made no impression on the Viceroy.

On 29th January, 1943, Gandhiji, from the Aga Khan Palace, wrote to the Viceroy that he would undertake a fast for twenty-one days, beginning from 9th February, describing it as a fast for self-purification. Maulana Azad in his *India Wins Freedom* wrote:

> "I was convinced that Gandhiji was prompted to take this step for two main reasons. He had not expected that Government would arrest the Congress leaders so suddenly on 9th August, 1942. He had also hoped to develop the movement on non-violent lines according to his own ideas. Both his hopes had been shattered. He accepted the responsibility for what had happened and as was usual with him, he was planning to undergo the fast as an expiation for the situation. I could not see any sense in his fast or any other hypothesis".

The Government, however, took a different point of view. Government thought that Gandhiji could not at 73 with his bad health stand a three-week fast. They further felt that to go on fast under these circumstances was courting certain death. They thought that this was Gandhiji's intention and Gandhiji wanted the Government to be held responsible for his death. It was later learnt that Government had made all the arrangements in the event of

I put more questions to Jinnah asking for details about his Pakistan. He answered by pleading: "My dear Kanji, one gesture, one friendly gesture was all that I was asking for and it was not forthcoming from the Congress. If the Congress would make this gesture, the whole problem would not be difficult to solve."

Jinnah was feeling extremely weak and shaky and was, I felt, in a mood to settle with the Congress on reasonable terms. But the Congress leaders were in jail and there was nobody from the Congress for the next three years to initiate helpful discussions. This period gave Jinnah time to organise his strength. The imprisonment of the Congress leaders left the field open to Jinnah and gave him a welcome opportunity to dominate the political scene and to make good use of and exploit the official exasperation with the Congress, for consolidating the position of his party in the Provinces.

The Congress had gone far deep into a blind alley and it could not extricate itself. The Government had also gone into a blind alley. They held that unless the Congress categorically withdrew the "Quit India" Movement, the Government could not release the leaders nor could it take the initiative for talks on further reforms. The situation created by the underground Congress Socialists, with their violent and sabotage movements, was mainly responsible for the continuation of the impasse. And so, 1942 rolled on to its disastrous end.

Jinnah spurned down the offer. He wanted executive action from the Governors on his one-sided attack.

Gandhiji's idea was to meet and negotiate with the Viceroy after the passing of the 8th August Resolution! And Nehru was to have met Jinnah.

On 28th August, I had a 90 minutes' friendly and frank talk with Jinnah. I asked him what justification he had for taking up a recalcitrant attitude, simply because he thought the Congress was in the wrong. I told him that friends like me expected Jinnah to take up a helpful attitude. Jinnah complained that the Congress had sent a political nonentity to negotiate with him, with Gandhiji's authorisation. Jinnah further complained that the mentality of the Congress was all wrong. By not understanding the realities of the situation, the Congress made it possible for the common enemy, the British, to continue its rule over India. Jinnah emphasised that he was as much for Independence as anybody else and he blamed the Congress for keeping the country under British rule. Jinnah said that the present attitude of the Congress would either keep the British or bring the Japanese here.

Jinnah told me that Rajaji had met him in New Delhi about three months ago. He said Rajaji was one of the best men of the Congress — A man with brains, capacity and service behind him who did his utmost to bring about a settlement. What did the Congress do for him, asked Jinnah — it threw him out.

Rajaji went to Wardha feeling hopeful that Gandhiji would accept Jinnah's terms, but Gandhiji turned them down.

Jinnah asserted that Pakistan did not mean a Pan-Islam movement. It would be confined within the geographical limits of India. As regards foreign policy, India and Pakistan would work together.

Jinnah said that he would be in a minority in the Bombay Presidency and would have no place in the government unless the Hindus who wanted to take advantage of his knowledge, experience and study invited him to join them in government. Jinnah was not thinking in terms of Pakistan nor did he think of becoming the Head of a new State of Pakistan. In fact Jinnah never imagined that Pakistan would ever come into being.

I found Jinnah depressed and with a feeling of terrible loneliness. I appreciated Jinnah's frank talk with me and asked him if he met other friends like the non-official British community in Bombay. Jinnah replied that nobody came to meet him; he was not in touch with non-official Europeans nor Government members. I could detect that he was unhappy at being so lonely and

gress regime. I trust that all public meetings will be conducted in an orderly manner and with all due sense of humility, and nothing should be done which will cause offence to any other community, because it is the High Command of the Congress that is primarily responsible for the wrongs that have been done to the Mussalmans and other minorities.

"Resolution: This public meeting of the Mussalmans records its opinion that the Congress Ministry has conclusively demonstrated and provided the falsehood of the Congress claim that it represents all interests justly and fairly by its decidedly anti-Muslim policy. It is considered opinion of this meeting that the Congress Ministry has failed to safeguard the rights and interests of the Mussalmans and other minorities and interests.

"That the Congress Ministry both in the discharge of their duties of the administration and in the Legislature have done their best to flout the Muslim opinion, to destroy Muslim culture, and have interfered with their religious and social life, and trampled upon their economic and political rights, that in matters of differences and disputes, the Congress Ministry invariably have sided with, supported and advanced the cause of the Hindus in total disregard and to the prejudice of the Muslim interests.

"The Congress Government constantly interfered with the legitimate and routine duties of District Officers even in petty matters to the serious detriment of the Mussalmans, and thereby created an atmosphere which spread the belief amongst the Hindu public that there was established a Hindu Raj, and emboldened the Hindus, mostly Congressmen, to ill-treat Muslims at various places and interfere with their elementary rights of freedom. This meeting, therefore, expresses its deep sense of relief at the termination of the Congress regime in various Provinces and rejoices in observing this day as the 'Day of Deliverance' from tyranny, oppression and injustice during the last two-and-a-half years, and prays to God to grant such strength, discipline and organisation to Muslim India as to successfully prevent the advent of such a Ministry again and to establish a truly popular ministry which would do even justice to all communities and interests".

These were wild and dangerous charges and there was no element of truth in them. The Governors under Section 93 who were directly responsible for the maintenance of the rights of minorities, took no notice of these charges. Babu [illegible] [illegible]

The Viceroy made a broadcast talk expressing his disappointment over the rejection of his proposals but hoped that those differences would be resolved "only by negotiations, carried out in a spirit of mutual accommodation and trust and with a firm resolve to succeed." He promised to continue his efforts at a settlement.

In spite of the failure of the talks with the Viceroy, Jinnah broadcast the following Id message on 13th November, 1939. Jinnah after preaching love and harmony with the other communities, said:

"It is not great speeches and big conferences that make politics. Several young men have been coming to me to know how they could serve their country.

"Well, young friends, if I touch upon politics to-night, it is only to tell you, as a word of advice that we have our rights and our claims in a future India. But we shall not be obstinate about them, for obstinacy will be the negation of that spirit of love and toleration which should fall upon us on Id day and whose blessings the Prophet commands us to communicate to others. But each one of us can serve our country by disciplining himself and discipline is the essence of this holy period.

"Is one regular in one's habits?, Does one sleep at the proper time? Does one keep to the left of the road or abstain from throwing litter on the road? Is one honest and sincere in one's work? Does one render such help as one can to others? Is one tolerant? These may seem small matters but in them is the nucleus of a self-discipline which will be of immense value in the combined efforts of all communities and all creeds towards greater India. This will be a service to our country which may not bring you into the limelight of policies but it will assure you a lasting peace in your heart in the knowledge that you have contributed your share to making the politicians' task easier."

Jinnah, however, did not translate his Id message into practice. He followed this up on 2nd December with his announcement to observe the exit of the Bombay Congress Government by observing the "Day of Deliverance" on 22nd December:

"I wish the Mussalmans all over India to observe Friday the 22nd December as 'the Day of Deliverance' and thanksgiving as a mark of relief that the Congress regime has at last ceased to function. I hope that the Provincial, District and Primary Muslim League all over India will hold public meetings and pass the following resolution and after Jumma prayers offer prayers by way of thanksgiving for being delivered from the unjust Con-

was required as was remarked in the course of the discussion was a degree of agreement in respect of the provinces, such as to make it possible for my visitors and the organisations which they represented to put forward a scheme which could be considered for the Centre.

"I added, in regard to any arrangement at the Centre:— Firstly, that one would hope that it might be found practicable to include also one or possibly more representatives of other important groups, and that was a question on which I should value your advice when we came to grapple with details. Secondly, that the arrangement which I invited you to consider for the Centre would be an *ad hoc* arrangement for the period of war and would be quite distinct from the much wider question of constitutional reform at the end of the war.

"This would be a make-shift arrangement under the existing law."

In his statement, on 17th October, 1939, Viceroy had said:

"I have in what I have just said, made clear that the intention and the anxiety of His Majesty's Government is, as is stated in the Instrument of Instructions to the Governor-General to further the partnership between India and the United Kingdom within the Empire, to the end that India may attain her due place among the great Dominions".

Gandhiji and Rajendra Prasad met Jinnah. They could not come to any agreement. Rajendra Prasad replied to the Viceroy on 3rd November, rejecting the Viceroy's offer as both Gandhiji and he missed at the interview any reference to the main and moral issue raised by the Congress about the clarification of the war aims without which it was impossible for the Congress to consider any subsidiary proposal. Rajendra Prasad objected to India being declared a belligerent country without the consent of the Indian people. Rajendra Prasad further said:

"The Congress Working Committee, as you are aware, issued a lengthy statement on September 14, in which they invited the British Government to declare their war aims and in particular how these aims were going to apply to India and to be given effect to in the present. It was further stated that the Indian people must have the right of self-determination by framing their own constitution through a Constituent Assembly without external interference and should guide their own policy".

Rajendra Prasad resented the "communal questions being dragged in this connection".

Jinnah wrote to the Viceroy on 11th November turning down the Viceroy's proposals.

me that this chastened attitude of those mischief-makers would give the right-wing Congress Government a good innings of ten years to consolidate its position and then it would be too strong for anybody to shake!

The next three or four months saw nothing but a policy of drift both among the Congress and the Government. No definite action was taken by either to contact each other in spite of the probability of a war breaking out in Europe. On September 3rd, England and France declared war against Germany. This was followed by an immediate action unilaterally taken by the Government of India to join the war against Hitler. This was the first wrong step taken by the British Government and the Viceroy. The Viceroy could have, instead sent for and consulted Jinnah, the leader of the Muslim League, and Rajendra Prasad, the President of the Congress and Bhulabhai Desai, the leader of the Opposition in the Legislative Assembly. This omission on the part of the Viceroy was resented by the whole country. The Viceroy saw Gandhiji on 5th September. Gandhiji said he could not speak for the Congress but on his own behalf, he would offer unconditional co-operation to the Government of India. Within the next five or six weeks, the Viceroy met as many as 52 'leaders' of the majority and minority communities, including the Congress leaders Gandhiji, President Rajendra Prasad, Vallabhbhai and Abul Kalam Azad and Jinnah. This was followed by the Viceroy's statement issued on 17th October, 1939. The statement was most disappointing and unsatisfactory. Federation was scrapped and no definite promise for the future was given. The Congress strongly protested and called upon the Provincial Congress Ministers to resign with implied threats that civil disobedience might be started. The Viceroy once again jointly met Gandhiji, Rajendra Prasad and Jinnah and followed it up with a letter to them on 2nd November:

"The proposition which I invited you and the other gentlemen present to consider as leaders of the Congress and Muslim League was that, given the great importance of ensuring harmonious working at the Centre, you should enter upon discussions between yourselves with a view to discovering whether you could reach a basis of agreement between yourselves in the provincial field, consequent on which you could let me have proposals which would result in representatives of your two organisations immediately participating in the Central Government as members of my Executive Council. I brought out too that in my judgment it ought not to be necessary absolutely to resolve every detail of such differences as may exist in the provinces. What

where everyone has the feeling that he is living in a transitional phase and where no one knows who will be his next master. There is a good deal of sitting on the fence and playing for time. The files move through the offices more slowly than ever. Meanwhile the Congress appears to be steadily increasing its hold in the provinces, and may eventually arrive at a position when it can dictate to the British Government terms much more favourable to itself than those it would be willing to accept today. Mahatma Gandhi, while he lives, has tremendous power, and is exerting that power in favour of moderation. It is possible to seek through him a kind of compromise solution that would be spurned by Jawaharlal Nehru or Vallabhbhai Patel or Subhas Bose or Abul Kalam Azad or any other political leader of the Congress. The moderate Congressmen all say privately, 'Gandhiji is your best friend; act while he is still alive and is still ready for compromise'.

"These are the arguments for rapid action. But they do not seem to be conclusive. Against the moderation of the Mahatma may be set the fact that his existence makes the all Indian politics unnatural. There is no figure to compare with him, and the scene may change radically after his disappearance. Why try to build on such insecure foundations? His personality more than anything else serves to maintain the unity of the Congress.

. . . .

In Bengal, there was labour unrest due to left-wing Socialist and Communist activities, aided and abetted by Subhas because of Communist money coming from abroad. Further, the Fazlul Huq Government was weak, the reactionary and conservative employers — British and Indian — had no sympathetic understanding and imagination about the labour problems and the conditions of work in the labour world were inhuman.

On the other hand, in Bombay, the labour situation was quiet and the left-wing mischief-makers showed no fight. [illegible]

British point of view only if we insist on having, so to speak, a solid Tory bloc readymade in any federal constitution for India. If, on the other hand, that objective — so prominent in the Round Table Conference — has now been given up, then the refusal will amount to nothing; whereas they now have a chance of deciding the terms on which they will share its life. Provided the British Government is prepared to use the leverage of a possible British Indian federation, resistance from the Princes' side is not likely to cause really serious trouble.

"One cannot be so sure about the Muslims. Both Jinnah and Sir Sikandar Hyat Khan told me that the Muslims would 'fight' rather than accept a 'Hindu Raj'. It is, however, difficult to see on what front and with what weapons they would fight, except it be by mutiny in the Army. That does not seem very probable. On the whole one is bound to conclude that the Muslims' bark is likely to prove worse than their bite. By setting up a 'Hindu Raj', however, have we not committed a breach of faith towards them? People talk about 'letting the Muslims down', or 'selling them down the river'. Surely there is no justification for such terms. We propose to set up a constitution by which, throughout India, Muslims will be more strongly represented than their members justify. On what better terms can they expect self-government for India? The Muslim leaders demand self-government just as loudly as the Congress. They promise us nothing in exchange for our support of their minority position. Apart from a certain amount of cupboard love (particularly in connection with the army), the Muslims are just as 'anti-British' as the Hindus. The idea of a community of loyal Muslims, contrasting with the seditious Hindus, is a pure myth. Nevertheless while the communal problem remains as bitter as it now is, we must take into account that the establishment of what the Muslims would regard as a Hindu Raj would be fraught with danger. We must also reckon with the possibility that in the long run the unity of India may prove impossible under domestic conditions and that a Muslim north-west may split off and seek its destiny in association with other Muslim countries rather than with South and Central India.

"The strong objection to any present proposed solution of the constitutional problem would seem to point to a policy of caution and delay. The great argument against this is the gradual deterioration of government at the centre. Provincial parliaments and governments, being responsible, attract more and more of the prestige, public interest, and political talent that should belong to the government and parliament of all-India. [illegible] in the Civil Service

effort to see, as he is everywhere regarded as a light-weight, a useful man to put up to deny that the Congress will ever touch anything less than complete Independence with the end of a ten-foot pole, while the real strings are being pulled quite differently behind his back.

"I was disappointed to have only a few minutes with Jawaharlal Nehru; an appointment to have a longer talk with him fell through because he had 'flu'. All I can record is that I was constantly told that he had moved distinctly to the right of late. There are two opposing views of his future. Non-Congress conservatives like Sapru say that the mantle of Gandhi will surely fall on him, and that the Congress after the Mahatma's death will not so much split into left and right groups as become a revolutionary left-wing organisation. On the other hand, Congress conservatives like Munshi pooh-pooh the idea of Jawaharlal Nehru's becoming the dictatorial leader of the Congress. He can do nothing now but make speeches about Spain, they say.

"I did however, see other representatives of the Congress Left, like Masani and Purushottam Trikumdas, prominent members of the Congress Socialist Party; these are the Stafford Cripps of Indian politics, the well-to-do intellectual socialists, not men of the people. The strength of their movement appears to lie in Bihar and the U.P. a fact that illustrates its primarily agrarian nature. Those provinces are also the home of the Kisan Sabha (Peasant League), of whose leaders I saw only Professor Ranga, another of the intelligensia, full of words and enthusiasm. Dr. Ambedkar, the leader of the untouchables and of the Independent Labour Party, gave me a very different view, as he is strongly anti-Congress, regarding it as at heart an upper-class, caste Hindu organisation (in which he is of course quite right).

"Of the Muslim League, apart from provincial Ministers, I saw Jinnah, a conceited person afraid that events may lose him the power that he craves.

....

The resistance of the States would not, I believe, be a serious matter. Either they would acquiesce in the grant of those terms to the Congress — they might indeed be a party to them — or they would have the alternative of standing aside and refusing to come in. This refusal is dangerous from the

SIR HARRY HODGSON'S REPORT

Sir Harry Hodgson of the Round Table spent a month in India in December-January 1938-39, and he submitted his confidential report to the Round Table on 6th January, 1939. His report gave an excellent background and penetrating analysis of India and is worthwhile reproducing in full. His report is important because he later came to New Delhi as Special Official to the Viceroy and Governor-General on Reforms :

"After a month in India I cannot pose as an expert on its problems but I used that month to fairly good advantage in learning what I could from spokesmen of different groups and interests. I spent some days in each of the three provinces of Bengal, Punjab and Bombay, and over a week in Delhi and I had a day in Baroda State on my way from Delhi to Bombay. The Viceroy was inaccessible on a winter tour to Nepal and elsewhere, but I made a special journey to Wardha to see that other Governor-General of India, Mahatma Gandhiji in his Ashram at Shegaon.

"In each of the three provinces that I visited I saw several Ministers, of whom the most notable were Sir Sikandar Hyat Khan, the premier of the Punjab, probably the most powerful and certainly, by all my direct and indirect evidence, the most common-sensible of the Muslim leaders, head of the only steady and substantial anti-Congress provincial government in the country; and Mr. K. M. Munshi, Home Member in Bombay, a prime example of a thief set to catch a thief, since even Tory Europeans speak with admiring awe of his repressive handling of Communists and the like agitators. Of the National Congress leaders I saw, among others, Vallabhbhai Patel, who is generally regarded as driving his authority mainly from the influence he has with Gandhi; Bhulabhai Desai, another suggested candidate for the Federal Prime-ministership (he hinted enough for me to realise that he has allowed himself to conceive that ambition), Satyamurti, a good representative of the Right-wing Congressmen, anxious to see a competent job of Governmentdom, within the limits of his nationalism and his class outlook, and of course his caste and communal outlook also. Subhas Bose, the present President of the Congress, I made no special

correspondence with Jinnah. On April 6, 1938, he wrote to Jinnah:

"Obviously, the Muslim League is an important communal organisation and we deal with it as such." But Nehru was not prepared to treat the Muslim League as the sole representative of the Muslims.

A week later, Jinnah replied: "It seems to me that you cannot even accurately understand my letter ... Your tone and language again display the same arrogance and militant spirit, as if the Congress is the sovereign power ... I may add that, in my opinion, as I have publicly stated so often, unless the Congress recognises the Muslim League on a footing of complete equality and is prepared as such to negotiate for a Hindu-Muslim settlement, we shall have to wait and depend upon our 'inherent strength' which will 'determine the measure of importance or distinction' it possesses. Having regard to your mentality, it is really difficult for me to make you understand the position any further."

Thus Jinnah and Nehru carried on an acrimonious correspondence leading to nowhere and same can be said about the equally acrimonious correspondence between Gandhiji and Jinnah. It was all beating the air.

In order to find out exactly what was passing in Jinnah's mind I went to meet him and asked him what he thought of the political situation. His answer was amazing. He said "What do you mean? How can you ask me such a question? Do you mean to say that when the British Prime Minister is sitting in his room, a French man or a German or a Russian could just walk in and ask him, "What do you think of the political situation and do you mean to say the British Prime Ministers would reply to that question?" I told Jinnah that I had not come as a leader or representative of the Hindus or even as a Hindu. I was just talking to him informally as an old friend and saw no harm in both of us thinking aloud. To this Jinnah said that he refused to discuss the political situation with any Hindu. I suggested his talking to Sir Purushottamdas. He said he would not, because Sir Purushottamdas had no influence on the Hindu opinion. He said that neither Jawaharlal nor Subhas Bose had any influence but that Gandhiji and Vallabhbhai had a negative influence in the sense that they could do harm and could not and would not do any good. Evidently all was not well with Jinnah and I told him that bitterness would not help anybody or any cause. The Congress had rubbed him the wrong way and he would never forgive them for this. I felt very sorry for Jinnah. He was a sick and unhappy man, completely isolated and friendless.

"The Congress has rejected the new constitution and declared that a constitution for India which can be accepted by the people, must be based on independence and can only be framed by the people themselves by means of a Constituent Assembly, without interference by a foreign authority. Adhering to this policy of rejection, the Congress has, however, permitted the formation in provinces of Congress Ministries with a view to strengthen the nation in its struggle for independence. In regard to the proposed Federation, no such considerations apply even provisionally or for a period, and the imposition of this Federation will do grave injury to India and tighten the bonds which hold her in subjection to imperialist domination. This scheme of Federation excludes from the sphere of responsibility vital functions of government.

The Congress is not opposed to the idea of Federation but a real Federation must, even apart from the question of responsibility, consist of free units enjoying more or less the same measure of freedom and civil liberty and representation by the democratic process of election. The Indian States participating in the Federation should approximate to the provinces in the establishment of representative institutions and responsible government, civil liberties and method of election to the Federal Houses. Otherwise, the Federation as it is now contemplated, will instead of building up Indian unity, encourage separatist tendencies and involve the States in internal and external conflicts.

"The Congress, therefore, reiterates its condemnation of the proposed Federal scheme and calls upon the provincial and local Congress Committees and the people generally, as well as the Provincial Governments and Ministries to prevent its inauguration. In the event of an attempt being made to impose it, despite the declared will of the people such an attempt must be combated in every way and the Provincial Governments and Ministries must refuse to co-operate with it. In case such a contingency arises, the All India Congress Committee is authorised and directed to determine the line of action to be pursued in this regard." ([illegible])

[illegible] Haripura, Nehru carried on on behalf of the Congress.

CONTENTS

1993

Price Rs. 75/-

Printed by Liberty Art Press (Proprieters Maktaba Jamia Ltd.) 1528 Pataudi House, Daryaganj, New Delhi and published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna.

87 - 89

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

Patna

خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ

۹۰-۹۲

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۲۳۴۳۴/۷۷ | سالانہ: ۳۰۰ روپے

شمارہ: ۸۲ نوٹ۔ بالائے | ۶۰ ڈالر ایشیا ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

اس شمارہ کی قیمت ۱۲۵ روپے

۱۹۹۳ء

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پرودپا پرنٹرز) کمپنی، دریا گنج، دہلی میں چھپواکر خدابخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

حصہ انگریزی:

اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں

نصف اوّل

پیشگفتار

خدابخش لائبریری میں اردو کے قدیم رسائل کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ان تمام قدیم رسائل کی فہرست ماہ و سال کی تفصیلات کے ساتھ جلد ہی شائع کی جا رہی ہے۔

خدابخش میں محفوظ سارے قدیم رسائل کے مشمولات کے اشاریے بھی بنا دیے گئے ہیں۔ جن رسالوں کے اشاریے مکمل ہو چکے ہیں ان کی تعداد چھ سو کے قریب ہے۔ اب ان سب کے اندراجات کو موضوع وار بانٹا جا رہا ہے تاکہ ایک موضوع پر رسائل میں چھپی پوری دولت سے اردو ادب کے طالب علم بیک نظر بہ سہولت مستفیض ہو سکیں۔ موضوع وار اشاریے تقریباً پچاس جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

● اس صدی کے آخری ربع میں اردو رسائل میں کیا اہم تحریریں آتی رہیں، ۱۹۷۶ء سے اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ ایسی تمام تحریروں کے اشاریے بنائے جاتے رہیں۔ ایک سال کا ایک ایسا ہی خدابخش اشاریہ مکتبہ جامعہ نے مدت ہوئی شائع کر دیا تھا۔ اب دس سالہ اشاریہ اشاعت کے لیے پریس جا رہا ہے۔ جو صدی کے آخری ربع کے پہلے دس سال کے رسائل کے مشمولات کا انڈکس ہے۔

صدی تقریبات کا زمانہ گزر رہا تھا کہ ایک خیال یہ بھی آیا کہ خدابخش صدی تقریبات کے بعد اردو رسائل کی کیا صورت حال ہے، ۱۹۹۲ء میں کون کون سے رسالے نکل رہے ہیں، اس کا ایک ایسا اشاریہ بن جائے جو ہر رسالے کے پورے کردار کو روشناس کرا دے، چنانچہ "اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں" کے تحت سارے ماہنامے، سہ ماہی اور سالنامے جو لائبریری میں آتے ہیں، بغیر کسی امتیاز کے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی، متعلقہ صفحات کا عکس لے لیا گیا۔ ساتھ ہی ان رسالوں میں جو اہم تحریریں شائع ہوئیں ان میں کا ایک حصہ اس پیشکش میں ضمیمے کے طور سے شامل کیا گیا۔

اردو میں اس وقت ڈھائی تین سو کے قریب ایسے رسائل نکل رہے ہیں ان میں ۱۹۹۲ء کے جو پرچے ہمیں میسر آ سکے ان کی تعداد دو سو سے زیادہ نکلی۔ ان رسالوں میں شمع، بیسویں صدی جیسے رسائل بھی شامل ہیں؛ چہار رنگ، خاتون مشرق جیسے بھی؛ اور معارف، غالب نامہ، افکار، نقوش اور فنون بھی۔ کچھ رسالے ہمیں نہ مل سکے مثلاً ابتدائی تعلیم (لاہور)، تعلیمی نا دیے (لاہور)، مغربی بنگال، ہلال، البشریٰ، سرخ، نامہ بر، خبر نامہ، سہ ماہی ادارہ اردو اکیڈمی، ادارہ اسلام اور عصر جدید وغیرہ۔ ان کا ہمیں افسوس ہے۔ امید تھی ۱۹۹۲ء کے رسائل کا احاطہ کرتے کرتے ان میں سے بھی کچھ مل جائیں گے۔ کچھ نہ کچھ مل بھی گئے!

'اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں' کی اشاعت کے بعد 'اردو رسائل ۱۹۹۳ء میں' پیش خدمت ہے۔ ۱۹۹۲ء کی یہ پیشکش دو حصوں میں ہوئی۔ پہلے حصے میں جنوری۔ جون' اور' دوسرے میں جولائی۔ دسمبر کے رسائل شامل کیے گئے ہیں

۱۹۹۲ء کے رسائل کیلیے ایسا کیا گیا تھا کہ جتنے پرچے بھی برصغیر یا کہیں باہر سے ہمیں میسر آئے یا جن کے بارے میں ہمیں اطلاع مل سکی، ایک بھرپور فہرست بنانے کے لیے ہم نے اُن سب کے ایک/دو/تین متعلقہ صفحات لے لیے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد دو سو سے کچھ اوپر تھی۔ اب ۱۹۹۲ء کے ایسے پرچے جو اُس وقت ہمیں نہیں مل پائے تھے بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس درجے کے ہیں ہم نے انہیں پیش نظر ۱۹۹۳ء کی فہرست میں بطور تتمہ شامل کرلیا ہے۔ ان میں سے کچھ ۱۹۹۲ء کے ہیں جو ہمیں اس وقت میسر نہ آسکے تھے اور کچھ ایسے ہیں جو ہیں تو ۱۹۹۲ء کے' لیکن شائع ہوئے ۱۹۹۳ء میں۔ اس طرح ۱۹۹۲ء میں اردو رسائل کی تعداد دو سو پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ یہ وہ پرچے ہیں جو ہمیں میسر آسکے۔ (۱۹۹۲ء میں یہ تعداد ۲۰۴ تھی)۔

ریکارڈ کو مکمل کرنے کے لیے، خاص کر اس واسطے کہ پیش نظر جلد کے قاری کو بھی ایک مکمل فہرست فوری طور سے دستیاب رہے، ہم نے مناسب سمجھا کہ ۱۹۹۲ء کی مکمل فہرست کو اس جلد میں دوہرا دیا جائے۔ یہ آخر میں لگائی جا رہی ہے۔

۱۹۹۳ء میں جن رسائل کو علمی ادبی ریسرچ کے سلسلے میں زیادہ کارآمد پایا گیا ان کی مکمل فہرستیں دی جا رہی ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں محض کسی ایک مہینے کے شمارے کی فہرست دیدی گئی تھی، لیکن اب اہم رسائل کے تمام شماروں کی فہرستیں دی گئی ہیں۔

ترتیب کے آخر میں تین ضمیمے ہیں:

ضمیمہ ۱ کے تحت کچھ مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں اس بات کا التزام نہیں رکھا گیا ہے کہ یہ مضامین انہیں مجلات سے ماخوذ ہوں جن کی مکمل فہرستیں دینا ہم نے ضروری سمجھا ہے۔

ضمیمہ ۲ میں کچھ منتخب مضامین کی ایک فہرست دی گئی ہے، اس کا مقصد ان مضامین سے محض روشناس کرانا ہے، تاکہ دلچسپی رکھنے والوں کو اس کی اطلاع ہو جائے اور اگر وہ ان تحریروں سے استفادہ کرنا چاہیں تو شماروں کے حوالے سے ان تک پہنچ سکیں۔

ضمیمہ ۳ کے طور سے ۱۹۹۲ء کے رسائل کی فہرست دی جا رہی ہے تاکہ ۱۹۹۳ء کے قاری کے سامنے پوری تصویر رہے۔

فہرست

تتمہ

وہ رسائل جو ۱۹۹۲ء کی فہرست میں شامل نہ ہو پائے

ضمیمہ۔۱

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء

شخصیات (۱)

شخصیات (۲)

اقبال

تذکرہ شعرا (ادب و صحافت)

کتابیں / مخطوطات

ترتیب

ترتیب

ترتیب

آثار جدید (مئو) جون ۱۹۹۳ء

ترتیب

آج کراچی

بہار ١٩٩٣



ترتیب : اجمل کمال

خصوصی شمارہ : عربی کہانیاں

توفیق الحکیم   عبدالسّلام العُجیلی   زکریا تامر   محمد برادا
علیفہ رفعت   حنان شیخ   بہاء طاہر   محمود دیاب
ابراہیم الکونی   یوسف ادریس   یوسف شارونی   ادوَرد الخرّاط
طیّب صالح   نبیل جورجی   محمد خضیّر   غسّان کنفانی

آج کی کتابیں

ترتیب

آج کل

جنوری ۱۹۹۳ء

ترتیب

فروری ۱۹۹۳ء

ترتیب

فہرست

مارچ ۱۹۹۳ء

ترتیب

اپریل ۱۹۹۳ء

مئی ۱۹۹۳ء

فہرست

جون ۱۹۹۳ء

فہرست

جنوری ۱۹۹۳ء

لوحِ آگہی

آموزگار

جلد ۱۲، جنوری ۱۹۹۳ء، شمارہ ۱

ماہنامہ آموزگار جلگاؤں

جلد ۱۲ — شمارہ ۲
فروری ۱۹۹۳ء

فہرست

ماہنامہ آموزگار جلگاؤں

جلد ۱۲ شمارہ ۳
مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست

[illegible]

آموزگار (جلگاؤں) جون ۱۹۹۳ء

[illegible]

اخبار اردو (اسلام آباد)

جلد ۱۰: شمارہ ۱

جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست

فروری ۱۹۹۳ء

جلد ۱۰

شمارہ ۲

فہرست

مارچ ۱۹۹۳ء

جلد ۱۰

شمارہ ۳

فہرست

اپریل ۱۹۹۳ء
جلد: ۱۰
شمارہ: ۴

فہرست

جلد: ۱۰
شمارہ: ۵
مئی ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد: ۱۰
شمارہ: ۶
جون ۱۹۹۳ء

فہرست

ادبیات ۔ اسلام آباد ۲۴ بہار ۱۹۹۳ء

فہرست

ادارہ

حسن عابد
واحد بشیر
فقیر محمد لاشاری
راحت سعید

معاونین

نوشابہ زبیری   زیبا علوی

مجلس مشاورت

پروفیسر ممتاز حسین   فارغ بخاری   عبداللہ ملک   عبداللہ جان جمالدینی
رضا ہمدانی   جعفر اچکزئی   خالد علیگ   محمد علی صدیقی   اسلم رسولپوری
عبدالرحمٰن نقاش   شاہد نقوی

علمی ادبی کتابی سلسلہ نمبر ۸

پہلا ایڈیشن	فروری [illegible]
تعداد	ایک ہزار
سرورق	انور سیج
مطبع	رنگین پریس۔ اقبال سینٹر۔ ایم اے جناح روڈ۔ کراچی
ناشر	ارتقاء مطبوعات A/10 والاسعد آ، نمبر ۲ کشمیر روڈ۔ کراچی ۔ ۲
قیمت	۳۰/- روپے
زرسالانہ	پاکستان: سو روپے؛ بیرونی ممالک: پندرہ امریکی ڈالر
دائمی خریداری	پاکستان: ایک ہزار روپے؛ بیرونی ممالک: ایک سو پچاس امریکی ڈالر

تقسیم کار
وکس بک سنٹر
۱۰۹ بمبئی ہوٹل۔ آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

ارتقاء

فہرست

URDU INTERNATIONAL

بابری مسجد کی شہادت

ترتیب

اس شمارے میں

بابل کی غیر مقدس جنگ

دنیا کی آخری جنگ

فرمان

ایک صدی کی داستان

اس شمارے میں

کینسر

حضرت لوط علیہ السلام

گیلی پولی کا تاریخی معرکہ

آشوری حکومت کا شیطان

اس شمارے میں

شہرت کی دلنواز شہرت

فطرت کی بیٹی

پیشگوئیاں شاہ نعمت کی

اس شمارے میں

پاکستان میں حکومتوں کی تبدیلیاں

جلد ۱ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۹۳ء

مدیر اعلیٰ وصی سلیمان ندوی

مطابق رجب ۱۴۱۳ھ

ارمغان شاہ ولی اللہ

مجلس مشاورت

○ مولانا محمد کلیم صدیقی ناظم کل ہند جمعیۃ شاہ ولی اللہ

○ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

○ مولانا رضی الدین قاسمی پھلتی

○ مولانا عبد الحبیب ندوی

زر تعاون

فی شمارہ ۔۔۔۔۔ ۳ روپے

سالانہ ۔۔۔۔۔ ۳۰ روپے

بیرونی ممالک سے ۵۰ ڈالر

خط وکتابت کا پتہ

دفتر ارمغان

پھلت ضلع مظفرنگر

یوپی ۲۵۱۲۰۱

پرنٹر پبلشر محمد ادریس قریشی نے رستی زن پریس سروٹ گیٹ مظفرنگر سے چھپوا کر جمعیۃ ولی اللہ پھلت کیلئے شائع کیا۔

فہرست عنوان

اسباق (پونہ)، فروری تا اپریل ۱۹۹۳ء

شمارہ کار

اسباق (پونہ)، مئی ۱۹۹۳ء، جنوری ۱۹۹۴ء

شمارۂ کلنہ

غزلیں

- فضا ابن فیضی • مظفر حنفی • اکبر حمیدی • مدحت الاختر • سید معراج جامی
- سہیل غازی پوری • عمرت گلابی • ظفر اقبال ظفر • منور رانا • شاہد کلیم
- محمد ذاکی • دیپک کمر • فرحت شہزاد • ساز علی شہاری • عظمت قیصم الیٰ
- ساجد • مصحف گوہری • مقبول منظر • ماجد سرنگلوری • انیس احمد خان • قمرام

- ایمن رضا • شاہد عمر • سلیم فرآدی • وہاب دانش • فاروق پرتاپ نگری • عادل حسن سرور
- مارٹر پر کچھ نظم — ذاکر حسین — حمید پاشا
- تبصرے • خطوط

اشراق

جلد ۵ شمارہ ۱
جنوری ۱۹۹۳
رجب ۱۴۱۳

جلد ۵ شمارہ ۲
فروری ۱۹۹۳
شعبان ۱۴۱۳

جلد ۵ شمارہ ۳
مارچ ۱۹۹۳
رمضان ۱۴۱۳

جلد ۵ شمارہ ۴
اپریل ۱۹۹۳ء
شوال ۱۴۱۳ھ

جلد ۵ شمارہ ۵
مئی ۱۹۹۳
ذوالقعدہ ۱۴۱۳

جلد ۵ شمارہ ۶
جون ۱۹۹۳ء
ذوالحجہ ۱۴۱۳ھ

جنوری ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

سرورق: [illegible]

مہمان مدیر ۱۳ — [illegible] اداریہ

ادبی البم ۱۵ — [illegible]

خود نوشت ۱۰ — [illegible]

خاکہ ۲۵ — [illegible]

نئی نظم

۲۹ [illegible]
۳۰ [illegible]
۳۱ [illegible]
۳۲ [illegible]
۳۳ [illegible]
۳۴ [illegible]
۳۵ [illegible]
۳۶ [illegible]

نئی غزل ۳۵ تا ۴۶ — [illegible]

نیا افسانہ، طنز و مزاح

۴۷ [illegible]
۵۳ [illegible]
۵۷ [illegible]
۶۱ [illegible]
۶۸ [illegible]
۷۱ [illegible]

نئی کتابیں ۷۵ — [illegible]

محفل ۸۰ — [illegible]

فروری ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

سرورق: [illegible]

مہمان مدیر ۱۳ — [illegible] اداریہ

ادبی البم ۱۵ — [illegible]

خود نوشت ۱۵ — [illegible]

ادبی حقائق ۲۶ — [illegible]

نئی نظم

۲۹ [illegible]
۳۰ [illegible]
۳۱ [illegible]
۳۲ [illegible]
۳۳ [illegible]
۳۴ [illegible]
۳۵ [illegible]
۳۶ [illegible]

نئی غزل ۳۹ تا ۴۰ — [illegible]

نیا افسانہ، انشائیہ

۴۷ [illegible]
۵۰ [illegible]
۵۴ [illegible]
۶۴ [illegible]
۶۹ [illegible]
۷۸ [illegible]

نئی کتابیں ۸۲ — [illegible]

محفل ۸۸ — [illegible]

مارچ ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

سرورق: [illegible]

ادبی البم ۱۳ — [illegible]

خود نوشت ۱۵ — [illegible]

جائزہ ۲۳ — [illegible]

نئی نظم

۲۹ [illegible]
۳۰ [illegible]
۳۱ [illegible]
۳۲ [illegible]
۳۳ [illegible]
۳۴ [illegible]
۳۵ [illegible]
۳۶ [illegible]

نئی غزل ۳۱ تا ۴۰ — [illegible]

نیا افسانہ

۴۸ [illegible]
۵۳ [illegible]
۵۸ [illegible]
۶۳ [illegible]

نئی کتابیں ۶۳ — [illegible]

محفل ۶۵ — [illegible]

اپریل ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

مہمانِ مدیر

ادبی البم

خود نوشت

اقبالیات

نئی نظم کی بشارتیں

نئی غزل

نیا افسانہ

نئی کتابیں

محفل

[illegible]

مئی ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

مہمانِ مدیر

ادبی البم

خود نوشت

نئی طویل و مختصر نظم

نئی غزل

نیا افسانہ

نئی کتابیں

محفل

[illegible]

جون ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

مہمانِ مدیر

ادبی البم

خود نوشت

نئی نظم

نئی غزل

نیا افسانہ

نئی کتابیں

محفل

[illegible]

اقبال

مدیر اعزازی:
ڈاکٹر وحید قریشی

بزم اقبال ○ کلب روڈ ○ لاہور

مجلہ اقبال

مجلہ اقبال کا مقصد علامہ اقبال کی زندگی ، شاعری ، افکار اور علوم و فنون کے ان شعبوں کا تحقیقی مطالعہ ہے جن سے انہیں گہری دلچسپی تھی ، مثلاً اسلامیات ، فلسفہ ، عمرانیات ، مذہب ، ادب ، فن وغیرہ ۔

ترسیل مضامین برائے اشاعت ، رسالہ جات برائے تبادلہ اور مطبوعات برائے تبصرہ (دو جلدیں) بنام مدیر اقبال ۔ ترسیل زر اور کاروباری خط و کتابت بنام معتمد ، بزم اقبال ، ۲ ۔ کلب روڈ ، لاہور ۔

سوائے ان مضامین کے جن پر وضاحت کی گئی ہو کہ ان کے حقوق صاحب مضمون کے ہیں ، مجلہ "اقبال" میں مطبوعہ مضامین کے حقوق محفوظ ہیں ۔ نقل کی اجازت کے لیے مدیر اقبال سے رجوع کریں ۔

مضمون نگار حضرات کے افکار و آرا کی ذمہ داری مدیران یا بزم اقبال پر عاید نہیں ہوتی ۔

اگر کسی مضمون کے ہمراہ لفافہ اور ٹکٹ نہ بھیجے جائیں تو اسے واپس نہیں کیا جاتا ۔

سالانہ چندہ : ۱۰۰ روپے /۲۵ ڈالر /۱۲ پونڈ
قیمت فی شمارہ : ۲۵ روپے / ۸ ڈالر /۵ پونڈ
موجودہ شمارہ : ۶۰ روپے

○

ناشر ۔ ڈاکٹر وحید قریشی
مدیر اعزازی
بزم اقبال ۲ کلب روڈ ، لاہور

طابع ۔ ایس ایم اظہر رضوی
مطبع ۔ اظہر سنز پرنٹرز ،
۱۰۸ ، نشتر روڈ لاہور

فہرست

"اقبال" لاہور (ادبیات اردو نمبر) اپریل/جولائی ۱۹۹۲ء

فہرست

"اقبال" لاہور۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء۔ جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست

"اقبال" لاہور۔ اپریل ۱۹۹۳ء

فہرست

اقبالیات

(مجلۂ اقبال انسٹی ٹیوٹ)

۵

مدیر

ڈاکٹر محمد امین اندرابی

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

۳

ترتیب

- شمارہ — ۵
- ناشر — ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ
- تعداد — پانچ سو
- سنہ اشاعت — اپریل ۱۹۸۹ء
- مطبع — [illegible] پریس سری نگر
- کتابت — [illegible]
- قیمت — بیس روپے

IQBALIYAT

-6-

اقبالیات ۶

Edited by

Dr. M.A. Andrabi

۱۹۹۱ء

IQBAL INSTITUTE
UNIVERSITY OF KASHMIR,
SRINAGAR HAZRATBAL

Price Rs. 30.00

Published by the Director, Iqbal Institute University of Kashmir and printed by him at Shalimar Art Press, Srinagar.

CONTENTS

اتر پردیش اردو اکادمی کا علمی و ادبی مجلہ

جگر مرادآبادی نمبر

دو ماہی **اکادمی** لکھنؤ

جلد ۱۱	جنوری تا جون ۱۹۹۲ء	شمارہ ۶،۵۲

ایڈیٹر
ڈاکٹر عزیز الرحمٰن

ترتیب

اتر پردیش اردو اکادمی کا علمی و ادبی مجلہ

افسانہ نمبر

دو ماہی **اکادمی** لکھنؤ

جلد ۱۲	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۲	شمارہ ۳،۴

ایڈیٹر
ڈاکٹر عزیز الرحمٰن

ترتیب

اتر پردیش اردو اکادمی کا علمی و ادبی مجلہ

دو ماہی **اکادمی** لکھنؤ

جلد ۱۳	جنوری تا جون ۱۹۹۳ء	شمارہ ۵۳

ایڈیٹر
محمود الٰہی

ترتیب

سہ ماہی العلم کراچی — فروری، اپریل، جون ۱۹۹۳ء

العلم

سہ ماہی اشاعت
فروری، اپریل، جون
اگست، اکتوبر، دسمبر

ترسیل زر کا پتہ	زر شراکت	ترسیل خط و کتابت
[illegible]	فی شمارہ ۱ صفحہ	[illegible]
[illegible]	فی سال ۳۱ صفحہ	[illegible]
[illegible]	سالانہ ۵ صفحہ	[illegible]
	بیرون ملک ۱۵ ڈالر	

جلد ۲۱ / شمارہ ۲ : فروری ۱۹۹۳ء

"العلم" [illegible]

ترتیب

ہمارے لکھنے والے

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

جلد ۲۱ / شمارہ ۳ ، اپریل ۱۹۹۳ء

ترتیب

ہمارے لکھنے والے

- علی جواد زیدی [illegible]
- جناب سید سبط محمد نقوی [illegible]
- جناب کالیداس گپتا رضا [illegible]
- پروفیسر اکبر حیدری کشمیری [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

جلد ۲۱ / شمارہ ۳ ، جون ۱۹۹۳ء

مرثیہ و سلام نمبر

مقالات

باب ہفتم

باب ہشتم

باب نہم

العلم بمبئی | العلم کراچی جنوری تا جون ۱۹۹۳ء

ریاض العلم بمبئی جون ۱۹۹۳ء

العلم کراچی اپریل ۔ جون ۱۹۹۳ء

مندرجات

مندرجات

الفرقان

الفرقان (لکھنؤ) ۶۱ (۱-۲) جنوری و فروری ۹۳ء

فہرست مضامین

الفرقان (لکھنؤ) اپریل و مئی ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

الفرقان لکھنؤ، مارچ ۱۹۹۳ء، ۶۱ (۳)

فہرست مضامین

الفرقان (لکھنؤ) جون ۱۹۹۳ء

۲

فہرست مضامین

الفلاح بھیکم پور

دسمبر ۹۲ء جنوری ۱۹۹۳ء – جون ۱۹۹۳ء

۲

عکس ہائے

موضوعات	شعاعیں	کہکشائیں	صفحہ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

فروری ۱۹۹۳ء — ۲ — الفلاح بھیکم پور

موضوعات	شعاعیں	کہکشائیں	صفحہ
کتاب	ایمان کے بعض تقاضے	ابو جابر سلفی	۳
السنۃ	رفع اختلافات کے رہنما اصول	ابو جابر سلفی	۵
[illegible]	دائرۂ ادب	مدیر	۶
[illegible]	فلسفۂ توحید	خواجہ حسن ... مرحوم	۸
[illegible]	عقیدۂ توحید اور [illegible]	مولانا کمال الدین [illegible]	۱۱
[illegible]	کیا درود ... ؟	شیخ [illegible]	۱۳
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱۹
[illegible]	[illegible]	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	۲۹
[illegible]	جواب [illegible]	مولانا عبد الواحد مدنی	۳۲
[illegible]	غزل	[illegible]	۳۳
[illegible]	غزل	ذکی [illegible]	۱۸
[illegible]	غزل	[illegible]	۲۸
[illegible]	المرکز الثقافی الاسلامی بھیکم پور	(ادارہ)	۳۹
[illegible]	مرکز [illegible]	(ادارہ)	۴۷
[illegible]	[illegible]	(ادارہ)	۴۸
[illegible]	المرکز الثقافی الاسلامی بھیکم پور	(ادارہ)	۴۹

"الفلاح" بھیکم پور، مارچ تا جون ۱۹۹۳ء

موضوعات	عناوین	قلم کار	صفحہ
آغاز	علم اور مشیت الٰہیہ	ابو عبد اللہ [illegible]	۳
السنۃ	علم کا زوال	ابو جابر سلفی	۵
[illegible]	[illegible]	مدیر	۶
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۹
	[illegible]	[illegible]	۱۰
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱۹
[illegible]	[illegible] اسلام	[illegible]	۲۲
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۲۹
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۰
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۲
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۶
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۷
[illegible]	آیت [illegible] کی تفسیر	[illegible]	۴۸
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۹
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۵۳
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۵۴
[illegible]	مرکز کی سرگرمیاں	[illegible]	۵۵

المعارف (لاہور)

ترتیب

جلد ۲۶	جنوری ۱۹۹۳ء ـــــ رجب ۱۴۱۳ھ	شمارہ ۱

المعارف (لاہور)

ترتیب

جلد ۲۶	فروری، مارچ ۱۹۹۳ء ـــــ شعبان، رمضان ۱۴۱۳ھ	شمارہ ۲، ۳

المعارف (لاہور)

ترتیب

جلد ۲۶	اپریل ۱۹۹۳ء ـــــ شوال ۱۴۱۳ھ	شمارہ ۴

ترتیب

جلد ۲۶	مئی، جون ۱۹۹۳ء ـــــ ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ	شمارہ ۵، ۶

اوراق (شمارہ [illegible]) مئی جون ۱۹۹۳ء

ترتیب اوراق

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر
ایس۔ اشتیاق عابدی
مخمور سعیدی

جلد ۶ — شمارہ: ۹ — جنوری ۱۹۹۳ء

فروری ۱۹۹۳ء

مارچ ۱۹۹۳ء

اپریل ۱۹۹۳ء

مئی ۱۹۹۳ء

ماہنامہ ایوان اردو دہلی — جون ۱۹۹۳ء

● جون ۱۹۹۳ء ●

فہرست

بازیافت سرینگر — جلد ۹ شمارہ ۱۳، ۱۴ — ۱۹۹۲

مجلس مشاورت

- ڈاکٹر قدوس جاوید
- ڈاکٹر ... احمد ...
- ڈاکٹر ... وانی
- ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

نگران مدیر اعلیٰ

پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ

مدیر

ڈاکٹر مجید مضمر

جلد ۹	۱۹۹۲ء	شمارہ ۱۳، ۱۴

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سرینگر

گوشۂ محی الدین حاجنی

سہ ماہی بحث و نظر پھلواری شریف، جنوری تا جون ۱۹۹۳ء — برہان دہلی — جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء

جنوری فروری مارچ ۱۹۹۳ء

بحث و نظر

پھلواری شریف، پٹنہ

فہرست مضامین

اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

برہان

جنوری و فروری ۱۹۹۳ء

مارچ ۱۹۹۳ء

اپریل ۱۹۹۳ء

مئی ۱۹۹۳ء

جون جولائی ۱۹۹۳ء

تجدید نو لاہور فروری ۱۹۹۳ء

تجدید نو (لاہور) شمارہ ۲ فروری ۱۹۹۳ء

فہرست

گوشۂ وفا براہی

مضامین

شاعری

کہانیاں

تجزیے

علاقائی ادب

تحقیق مجلہ

شعبہ اردو یونیورسٹی آف سندھ حیدرآباد

۵

ایڈیٹر
پروفیسر سید جعفر
صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

معاونین

ڈاکٹر [illegible] | ڈاکٹر [illegible]
[illegible] شعبہ اردو | [illegible] شعبہ اردو
یونیورسٹی آف حیدرآباد | یونیورسٹی آف حیدرآباد

۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

تخلیق (لاہور) ۲۳ (۲) فروری ۱۹۹۳ء

ترتیب

تخلیق لاہور	اپریل ۱۹۹۳ء	تشکیل کراچی	اکتوبر ۱۹۹۲ء تا ستمبر ۱۹۹۳ء

تخلیق (لاہور) ۴/۲۴ اپریل ۱۹۹۳ء

ترتیب

اجمال

شعری ادب کا منظر نامہ

سہ ماہی تکمیل بھیونڈی

ایک افسانوی خصوصی شمارہ

عزیز قیسی نمبر

اعزازی مدیر
یوسف ناظم

مدیر اعلیٰ و مرتب
مظہر سلیم

مدیر
مظہر سلیم

شریک مدیر
سعیدہ مظہر

جلد : ۶/۵
شمارہ : اکتوبر ۱۹۹۲ء تا مارچ ۱۹۹۳ء
اس شمارہ کی قیمت : ۳۰ روپے
سالانہ : ۱۰۰ روپے
بیرونی ممالک سے
فی پرچہ : تین ڈالر
سالانہ : بارہ ڈالر
ترسیلِ زر
[illegible]

رابطہ : [illegible] بھیونڈی [illegible]

پرنٹر پبلشر [illegible] بھیونڈی سے شائع کیا

نقشِ ہم کار
[illegible]

سفر

فہرست

تمثال

جلد ۱/۴ سہ ۹ ، ۱۹۹۳ء

شمارہ نما

متعلقہ تناظر تنقید، فکر و تحقیق

خصوصی شمارہ

تناظر

پیشکش

چوبیسویں (۲۴)

سہ ماہی تناظر دہلی

تنقید و تحقیق نمبر

مدیر اعزازی
بلراج ورما

مینیجنگ ایڈیٹرز رگھوناتھ کمر [redacted]
خوشنویس محمد ہارون
قیمت ۹۰ (نوے) روپے
طباعت نیشنل پرنٹرز، ساکت نگر اندرگلی، دہلی۔ ۱۱۰۰

چھ شمارے ایک ساتھ
مئی ۱۹۹۰ء تا جون ۱۹۹۱ء

نگارشات

۳
۳۰۰

ماہنامہ
کراچی
تہذیب

شمارہ جنوری ۹۳



مندرجات

شمارہ مارچ ۹۳



سر شاہ سلیمان
سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مندرجات

مندرجات شمارہ اپریل ۹۳ء

شمارہ مئی ۱۹۹۳ء



سید الاحرار مولانا حسرت موہانی

مندرجات

شمارہ جون ۱۹۹۳ء



نواب محمد اسماعیل خاں

مندرجات

تہذیب الاخلاق علی گڑھ — مندرجات — جنوری ۹۳ء

فروری ۹۳ء

مندرجات

مارچ ۱۹۹۳ء

مندرجات

اپریل ۹۳

مندرجات

مئی ۱۹۹۳ء

مندرجات

جون ۹۳

مندرجات

ماہنامہ جامعہ

جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

فروری ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

اپریل ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

مئی ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

جون ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۵۰/۔ روپے
خصوصی معاون ۱۰۰/۔ روپے
قیمت فی پرچہ ۵/۔ روپے

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان
ماہنامہ
جامعۃ الرشاد

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
پندرہ ڈالر امریکی
15/- $

جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

فروری ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

اپریل ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

مئی ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

جون، جولائی ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

شعبۂ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی

سرپرست ۔ ڈاکٹر سید ارتفاق علی
مدیر ۔ ڈاکٹر محمد شمس الدین
ایڈیٹر ۔ طاہر مسعود

جرنلسٹ

جنوری ۱۹۹۳

فہرست مضامین

روزنامہ "جنگ" ۔ ایک خصوصی مطالعہ

جمناتٹ (ہریانہ) جنوری۔مارچ ۹۳ء

مشمولات

"حریم" (لکھنؤ) جنوری ۱۹۹۳ء

Feb. 93

April 93

May 93

خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ

۷۸ — ۸۰

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

فہرست

فہرست

فہرست

دارالعلوم (دیوبند)

صفحہ	نگارش نگار	نگارش	نمبر شمار
۳	مولانا حبیب الرحمن قاسمی	حرف آغاز	۱
۶	۔ اخلاق حسین قاسمی دہلوی	مصوروں کے زیورات کا مسئلہ	۲
۱۳	۔ عبد الہادی قاسمی بنگلور	نکاح میں تصویر کشی اور ویڈیو کی شرعی حیثیت	۳
۲۱	۔ خورشید انور گیاوی استاذ دارالعلوم دیوبند	ہندوستان اور نظام قضا	۴
۲۸	۔ اختر امام عادل استاذ دارالعلوم حیدرآباد	مدارس اسلامیہ کیفی منشور کی روشنی میں	۵
۴۵	۔ نور عالم خلیل امینی ۔ دیوبند	مولانا محمد حسین ملا بہاری	۶
۵۱	ادارہ	بابری مسجد کی شہادت پر مہتمم دارالعلوم	۷
۵۲		حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کا بیان، سعودی گزٹ کا ضمیمہ	۸

صفحہ	نگارش نگار	نگارش	نمبر شمار
۳	حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	حرف آغاز	۱
۷	مولانا نثار حسین قاسمی پرنسپل انجمن عربی مدرسہ موضع بیجاپور	سیرت نبوی	۲
۱۱	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	تاریخ اسپین کا ایک عبرت خیز ورق	۳
۲۰	مولانا عبد الحفیظ رحمانی صاحب مہرپی سدھارتھ نگر	راماین اور حضرت ابراہیم علیہ السلام	۴
۲۴	مولانا شیر الدین صاحب قاسمی برنلے انگلینڈ	جنت نشان انگلینڈ میں شعلے	۵
۳۱	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	بابری مسجد تاریخ کے مختلف مراحل میں	۶
۴۵	مولانا قاری ابوالحسن اعظمی صاحب	رسم المصاحف اور اس کے مصادر	۷
۵۲	مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	موجودہ حالات میں کرنے کا کام	۸

اپریل تا جون ۱۹۹۲ء

صفحہ	نگارش نگار	نگارش	نمبر شمار
۳	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	حرف آغاز	۱
۸	۔ اعجاز احمد اعظمی مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور اعظم گڑھ	تصوف ایک تعارف	۲
۶۶	۔ اختر امام عادل دارالعلوم حیدرآباد	صوفیت ۔ ایک تعارف	۳
۹۷	۔ صبغۃ اللہ صاحب بختیاری	سلفی تصوف کتاب سنت کی روشنی میں	۴
۱۳۱	۔ نسیم الحسینی صاحب پاکستان	احسان و سلوک میں حضرت مدنی کا مقام رفیع	۵
۱۶۲	۔ مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی	باطن کی پاکیزگی اور اس کے اثرات	۶
۱۶۹	۔ مفتی محمد شفیع صاحب جیندی	سماع صوفیائے کرام کی نظر میں	۷
۱۸۴	پروفیسر خلیق نظامی صاحب	تصوف اور صوفیاء کا مقصد حیات	۸
۱۹۰	۔ ۔ ۔	بیعت کا مقصد	۹
۲۱۳	مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوری	ہندوستان کے قدیم اولیاء مشائخ	۱۰
۲۱۸	پروفیسر نثار احمد فاروقی	حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی زندگی کا ...	۱۱

صفحہ	نگارش نگار	نگارش	نمبر شمار
۳	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	حرف آغاز	۱
۱۰	علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مانچسٹر	محدثین و فقہاء	۲
۲۵	مولانا عبد الحی فاروقی صاحب جمعیۃ ہاؤس دہلی	مولانا معین القضاۃ حیدرآبادی	۳
۴۰	۔ اختر امام عادل استاذ دارالعلوم حیدرآباد	مدارس اسلامیہ کیفی منشور کی روشنی میں	۴
۵۱	۔ ابوالکلام آزاد	اقلیت کا سیاسی مفہوم	۵
۵۴	جناب محمد قمر الدین قمر امام نگری	اہم مشورے (غزل)	۶

دانش (اسلام آباد) شماره ۲۶ ۱۹۹۳ء

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شماره ۲۶

دانش (اسلام آباد) شماره ۳۲، ۱۹۹۳ء

بسم الله الرحمن الرحیم

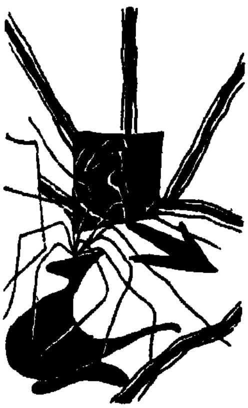
فهرست مطالب

دانش شمارهٔ ۳۲

دانش (اسلام آباد) شماره ۳۳، ۱۹۹۳ء

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب





"ذہن جدید" دسمبر ۱۹۹۲ء تا جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست

"ذہن جدید"

مارچ تا مئی ۱۹۹۲ء

[redacted]

فہرست

"ذہن جدید" نئی دہلی۔ جون تا اگست ۱۹۹۲ء

فہرست

ماہنامہ **راہ اعتدال** عمرآباد

جلد [illegible] — جنوری ۱۹۹۳ء — شمارہ [illegible]

نشانِ راہ

روح ادب دکلکتہ اکتوبر تا مارچ ۹۳ء

مشمولات

روحِ ادب کلکتہ — اپریل تا ستمبر ۱۹۹۲ء ● روشن خیال کراچی — جنوری، اپریل ۱۹۹۳ء

روحِ ادب ° مغربی بنگال اردو اکیڈمی، اپریل تا ستمبر ۱۹۹۲ء

مشمولات

کچھ بیان اپنا

اداریہ

مضامین

نظمیں

غزلیں

بنگلہ ادب

افسانے

تبصرۂ کتب

وفیات

خیال نما، جنوری ۹۳ء — روشن خیال

اپریل ۱۹۹۳ء

خیال نما

مئی ۱۹۹۳ء — ذی قعدہ ۱۴۱۳ھ

ریاض الجنۃ ماہنامہ

نمبر شمار	مضامین	اصحاب قلم	صفحہ
۱	مسئلہ تین طلاق اور سیاست۔	عبد العظیم ندوی	۳
۲	جیسی کرنی ویسی بھرنی . . .	تحریر حضرت مولانا عبد الحلیم [illegible]	۹
	قبروں کی زیارت	مفتی حبیب صاحب قاسمی دار العلوم [illegible] کشنپور، اعظم گڈھ	۱۲
۴	نئی نسل کے ایمان وعقیدے کی حفاظت۔	ابراہیم یوسف باوا صاحب [illegible]	۱۴
۵	تذکرہ قاری ظہیر الدین صاحب [illegible]	محمد الیاس صاحب اعظمی ایم۔اے	۲۳
۶	ماہ صفر کی شرعی حیثیت	مولانا خطیب الرحمن صاحب ندوی	۳۲
۷	ملفوظات مولانا محمد علی مونگیری رح	(ادارہ)	۳۵
۸	مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ۔	مولانا محمد فاروق صاحب اعظمی	۴۱
۹	فتاویٰ ریاض العلوم۔	مفتی عبد اللہ صاحب مظاہری	۴۴
۱	اشتہارات	حکومت اتر پردیش	۴۸

زبان و ادب (پٹنہ) جلد ۱۸ (۱-۲)

ترتیب

زبان و ادب پٹنہ

جلد ۱۸ (۳-۴)

ترتیب

زبان وادب (پٹنہ)

جلد ۱۸ (۵-۶)

ترتیب

شذرات : مشتاق احمد نوری — ۳

مضامین :

خصوصی مطالعہ :

افسانے :

نظمیں :

خاکہ / انشائیہ :

غزلیں :

زبان وادب (پٹنہ)

شمارہ ۱۹/۱-۳، ۱۹۹۳ء

ترتیب

شذرات : مشتاق احمد نوری — ۳

مضامین :

خصوصی مطالعہ :

افسانے :

سوانح :

غزلیں :

تبصرہ / تعارف :

تاثرات : ۱۰۵ — ۱۱۳

خبرنامہ : ۱۱۵

سہ ماہی سائنس کی دنیا دہلی

جنوری مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

صفحہ

سب رس (حیدرآباد) اس شمارے میں — اپریل ۹۳ء

سب رس (حیدرآباد) اس شمارے میں — مئی ۱۹۹۳ء

مضامین

سب رس (حیدرآباد) جون ۱۹۹۳ء — اس شمارے میں

مضامین

جنوری ۱۹۹۳ء

[illegible]

فروری ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

مارچ ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

اپریل ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

مئی ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

سب رس (کراچی) جون ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

ہدیۂ تشکر

جناب حاجی محمد شفیع (اسٹیل والا) کراچی		۴۰۰ روپے
" سید محمد عبد التواب	"	۵۰۰ روپے
" فضل گجراتی	"	۲۰۰ روپے
" محمد حسن علی باوہاب	"	۳۰۰ روپے

[illegible]

سوغات (۴) مارچ ۹۳ء

فہرست

ماہنامہ سہیل گیا شمارہ ۱ تا ۹، جلد ۵۲ تا ۵۳ ● ماہنامہ شاعر بمبئی جنوری ۱۹۹۳ء

ماہنامہ سہیل گیا

شمارہ ۱ جلد ۵۲

— فہرست —

شاعر (بمبئی) جنوری ۹۳ء

فروری ۱۹۹۳ء

مارچ ۱۹۹۳ء

اپریل ۱۹۹۳ء

مئی ۱۹۹۳ء

جون ۱۹۹۳ء

[redacted]

[illegible]

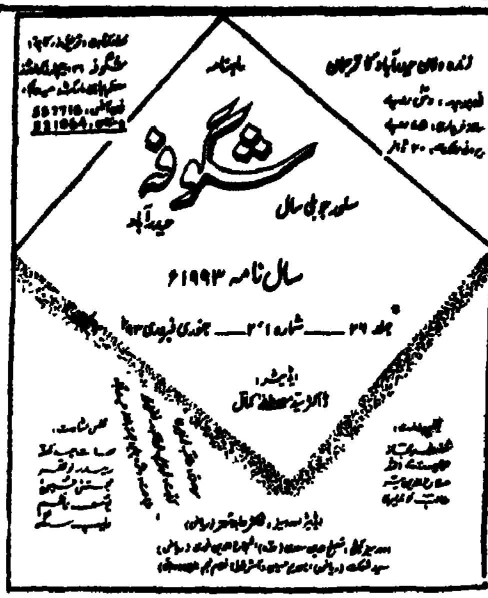
[redacted]

[illegible]

شب خون

جون تا جولائی ۱۹۹۴

[illegible]



چوُرن (منظومات)

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مرے دکھائی!

جدول

صفا حیدرآباد، شمارہ ۲۲، اپریل، مئی، جون ۹۳ء

فہرست مضامین

طلوع افکار

ترتیب

[illegible]

طلوع افکار

مندرجات

[illegible]

مندرجات

[illegible]

طلوع افکار ۱۹۹۳ء ماہ اپریل ۱۹۹۳

مندرجات

اپریل ۱۹۹۳ء شمارہ ۴ جلد ۴۴

مندرجات

مئی ۱۹۹۳ء شمارہ ۵ جلد ۴۴

مندرجات

جون ۱۹۹۳ء شمارہ ۶ جلد ۴۴

عصری ادب

شمارہ ۹۸ — اپریل ۱۹۹۳ء

ادارۂ تصنیف
ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹
فون نمبر ۷۲۲۳۳۶۳

نگراں
محمد حسن

مدیران
ڈاکٹر روشن آرا
سید ضیاء الدین احمد

فی شمارہ: بیس روپے — زرِ سالانہ: پچھتر روپے
بیرونی ممالک سے: ایک پاؤنڈ فی شمارہ (علاوہ محصول ڈاک)
پاکستان سے: فی شمارہ بیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

(پرنٹر پبلشر سید ضیاء الدین احمد نے [illegible] پریس ۱۳۳۶ فراشخانہ دہلی سے طبع کرا کر ادارۂ تصنیف، ڈی ۷، ماڈل ٹاؤن دہلی ۱۱۰۰۰۹ سے شائع کیا)
سرورق: [illegible] فاضل

فہرست

غالب نامہ نئی دہلی — جنوری ۱۹۹۳ء — سالنامہ فروغِ ادب بھوپال نمبر — جلد ۱۳، شمارہ ۱

غالب نامہ (نئی دہلی) سید مسعود حسن رضوی نمبر جنوری ۱۹۹۳ء

فہرست

اکیڈمی ... کا ماہانہ رسالہ

فون ۵۷۶۴۳

مدیر: سید منظور احمد قاسمی

فروغِ ادب

جلد ... شمارہ ... — قیمت فی پرچہ ... روپے، زر سالانہ ... روپے

سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد اپریل۔جون ۱۹۹۳ء ● فکر و نظر علی گڑھ ۱۹۹۳ء

سہ ماہی ۔ فکر و نظر ۔ اسلام آباد

تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کے لئے منظور شدہ
(بحوالہ وزارت تعلیم حکومت پاکستان چٹھی نمبر Bureau/CD/edu/۲۰۷۸۰۶۷)

رجب ۔ رمضان ۱۴۱۳ھ ۔ جنوری ۔ مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست

شوال ۔ ذوالحجہ ۱۴۱۳ھ ۔ اپریل ۔ جون ۱۹۹۳ء

فہرست

فکر و نظر علی گڑھ ۳۰ (۱) ۱۹۹۳ء

ترتیب

فکر و نظر علی گڑھ، مئی ۱۹۹۳ء

ترتیب

ادارہ مسلم ویلفیئر سوسائٹی جھریا، گوبند پور، دھنباد کا

سہ ماہی فنکار دھنباد

جلد ۳ شمارہ ۳ ۱۹۹۳ء — قیمت فی شمارہ پانچ روپے
سالانہ — بیس روپے

مدیر : محمد اکرام الانصاری
مدیر معاون : راشد انور راشد

مجلس مشاورت
کالی داس گپتا رضا
ڈاکٹر مہتاب اشرف
الیاس احمد گدی
انوار انصاری
ہمایوں اشرف
حسن رضا رضوی

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :-
ایڈیٹر فنکار، جھریا، گوبند پور، دھنباد، بہار
۸۲۸۱۰۹ — [illegible]

فنون لاہور جلد ۳۵، اپریل ۱۹۹۳ء

مندرجات

[illegible]

"فنون" لاہور۔ اپریل۔جولائی ۱۹۹۳ء

فہرست مندرجات

ترتیب

فہرست

اداریہ

مقالات

اردو:

فارسی:

منظومات

تراجم

جنوری ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۱
کتاب نما

اس شمارے میں

جائزے:-

فروری ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۲

اس شمارے میں

جائزے:-

مارچ ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۳

اس شمارے میں

جائزے

اپریل ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۴

اس شمارے میں

مئی ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۵

اس شمارے میں

جون ۱۹۹۳ء جلد ۳۳ شمارہ ۶

اس شمارے میں

سرسبز پٹنہ — جون ۱۹۹۳ء

اندراجات

جلد ۱۵۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۳ء عدد ۱

مضامین

جلد ۱۵۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۳ء عدد ۲

مضامین

جلد ۱۵۱ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۳ء عدد ۳

مضامین

فروری ۱۹۹۳ء

ادب

ہفت روزہ معیار کراچی

مئی ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

جولائی ۱۹۹۳ء

منادی

معاون مدیر
[illegible]

مدیر
[illegible]

منادی [illegible]

فہرست

[illegible]		[illegible]

منادی [illegible]

VOL 63 - NO 4 APRIL 1?93
[illegible]
TELEPHONE : [illegible]
TELEGRAMS : [illegible] NEW DELHI
THE MUNADI NEW DELHI

فہرست

[illegible]		[illegible]

منادی [illegible]

فہرست

افتتاحیہ	۲	[illegible]
[illegible]	۳	[illegible]
اردو گلستاں	۶	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

منادی [illegible]

فہرست

[illegible] پیغام	۲	[illegible]
[illegible]	۳	[illegible]
اردو گلستاں	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

منادی [illegible]

فہرست

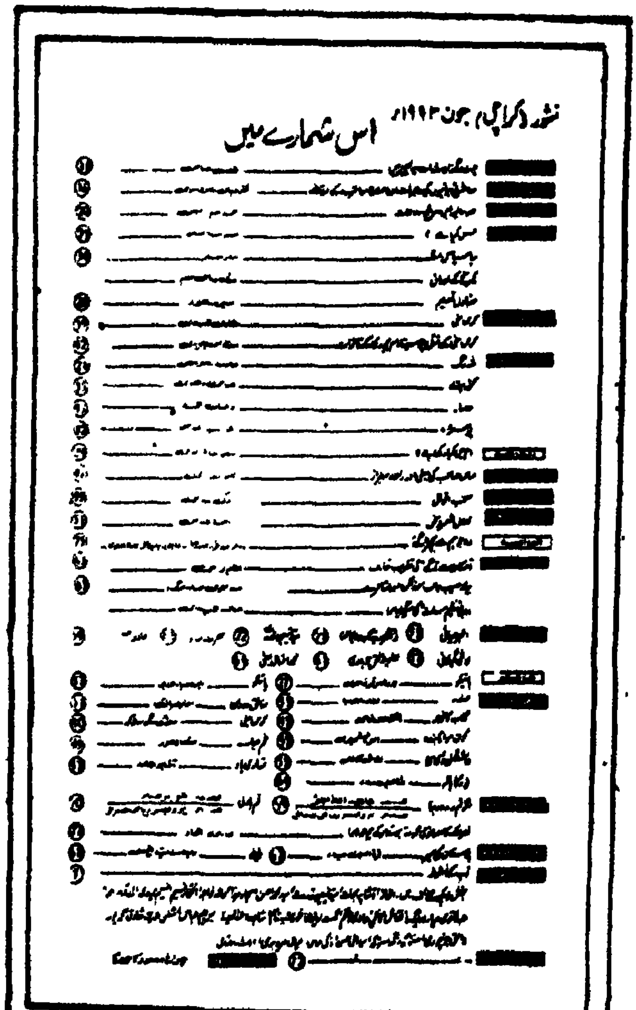
[illegible]	۲	[illegible]
[illegible]	۳	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

منشور، کراچی، مئی ۱۹۹۲ء

اس شمارے میں

اس شمارے میں

منشور



منشور (کراچی) جون ۱۹۹۲ء

اس شمارے میں

[illegible]

سہ ماہی

نقوش میوات

(۱)

اکتوبر ۱۹۹۲ء

سرپرست: حضرت سرور میواتی — نگران: مولانا کمال سالارپوری

مُدیر: شبیر احمد خان میواتی

میوات اردو اکادمی

بیرون گلی ... ساندہ خورد لاہور ۵۴۰۰۰

(قیمت ۱۵/- روپے)

مضمون نما

فہرست مضامین

ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان

[illegible]

آئینہ

آئینہ

نقیب ختم نبوت (ملتان) مئی ۱۹۹۳ء

آئینہ

نقیب ختم نبوت (ملتان) جون ۱۹۹۳ء

آئینہ

نگار پاکستان (کراچی) جنوری ۹۳ء

فہرست مضامین

"نگار پاکستان" (کراچی) جنوری ۱۹۹۳ء

● طلبا تحریک' جنوری ۱۹۵۳ء ● کراچی طلبا تحریک جنوری ۱۹۵۳ء پر ایک کتابچہ ●

"نگار پاکستان" (کراچی) مارچ ۱۹۹۳ء

● ڈاکٹر فرمان فتحپوری ● دیباچے جو مختلف کتابوں میں چھپے ●

"نگار پاکستان" (کراچی) اپریل ۱۹۹۳ء

● اقبال کی فارسی شاعری از فرمان فتحپوری۔ ●

نگار پاکستان (کراچی) مئی ۱۹۹۳ء

● نظام افسانہ بیگم حسرت کی موہانی از شفیق صدیقی مرحوم ● سفر نامہ سفر اقدس حجاز از بیگم حسرت موہانی ●

نگار پاکستان کراچی جون ۱۹۹۳ء ● سہ ماہی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۹۳ء ● سہ ماہی نیا ادبی سفر دہلی [illegible]

نگار پاکستان کراچی

فہرست مضامین

جون ۱۹۹۳ء

نوائے ادب بمبئی

ششماہی

مدیر

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

جلد ۴۳ — شمارہ ۱

اپریل ۱۹۹۳ ع

●

مندرجات

ترتیب

نیا سفر

ادبی سہ ماہی

جلد [illegible] شمارہ [illegible] — [illegible] ۱۹۹۳

مدیر

قمر رئیس

[illegible]

C - 1[illegible], VIVEK VIHAR, DELHI - 110 0[illegible]

نیا دور (کراچی) ۸۶-۸۸ خاص شمارہ

فہرست

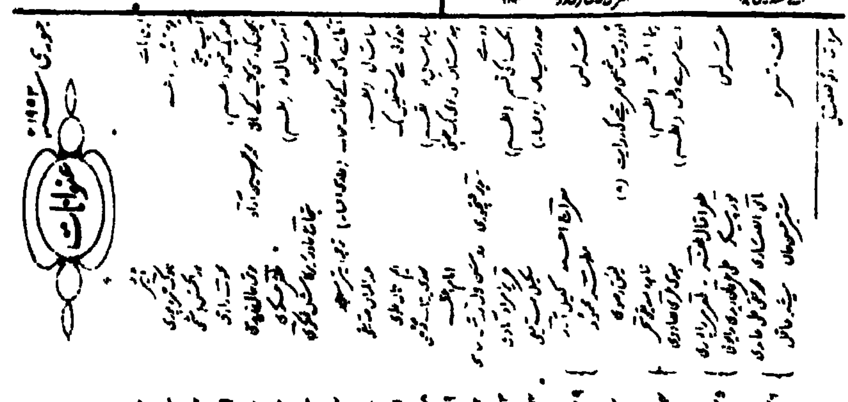
خاکے

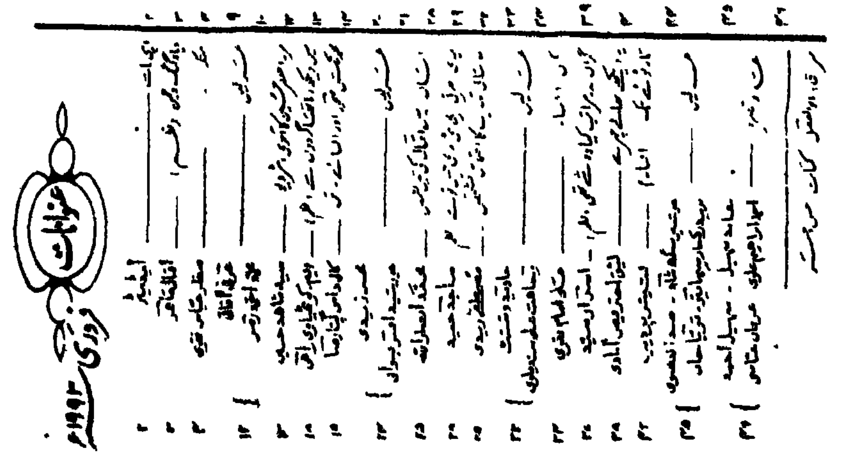
دس نظمیں

باعنوان غزلیں

افسانے

ضمیرالدین احمد کے خطوط





قومی یکجہتی نمبر

مارچ اپریل ۱۹۹۳ء

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

مئی ۱۹۹۳ء

عنوانات

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جون ۱۹۹۳ء

عنوانات

تمت

تتمہ

وہ رسائل جو ۱۹۹۲ء کی فہرست میں شامل نہ ہو پائے

مارچ ۱۹۹۳ء

آتش گل

ساتواں جزیرہ شیطانی جھیل
رات کا شہزادہ

ابن صفی کے تین مشہور ناول یک سالہ

۱۵

مدیر: نازش انصاری

فی شمارہ ۱۵ روپے سالانہ قیمت ۲۵۰ روپے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر، مالک ... انصاری نے ... پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۲۲۳۴ ... دہلی ۱۱۰۰۰۸

فہرست مضامین

ماہنامہ اخبار نوجوان (نئی دہلی) فروری ۱۹۹۳ء

ماہنامہ اردو میگزین (نئی دہلی) جون ۱۹۹۳ء

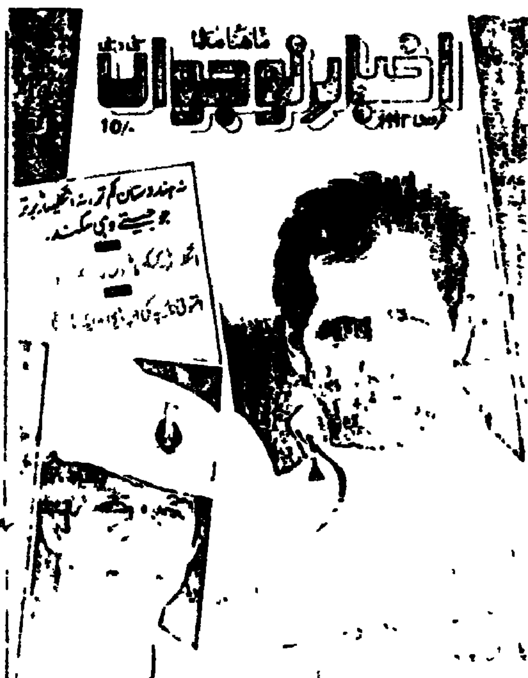
اخبار نوجوان

جلد ۵ شمارہ نمبر ۲ فروری ۱۹۹۳

ایڈیٹر :	سید حامد انیس
اسپورٹس ایڈیٹر :	پرویز ظہیر
معاون ایڈیٹر :	محمد انیس خطیب
فوٹو گرافر :	مرلی داس
منیجر :	سید مسعود

نامہ نگار :	
بمبئی :	ی۔ایس۔ موال
کلکتہ :	مسرور الدین ندوی
پٹنہ :	سید انور حبیب
حیدرآباد :	سید فاضل حسین پرویز
سعودی عرب :	لیاقت حسین
عرب امارات :	خالد حسین
انگلینڈ :	علاؤ الدین احمد
امریکہ :	جلال فرشوری

زرِ تعاون اندرونِ ملک



اردو میگزین

جلد ۳ شمارہ ۶ جون ۱۹۹۳

اس شمارے میں

وشاکھاپٹنم [illegible]

ماہنامہ

اصنام

[illegible] ○ اپریل / مئی [illegible] ○ شمارہ [illegible]

مدیر
اے ایم ایم [illegible]
نائب مدیر
ڈاکٹر [illegible]
[illegible]
[illegible]

زر تعاون
سالانہ [illegible] Rs 100/-
[illegible] Rs 200/-
فی شمارہ [illegible] Rs 8/-

[illegible]
[illegible] 26-40 [illegible]
[illegible] وشاکھاپٹنم ۔ 530002

ترتیب اصنام

ترتیب اصنام اپریل / مئی ۱۹۹۲ء

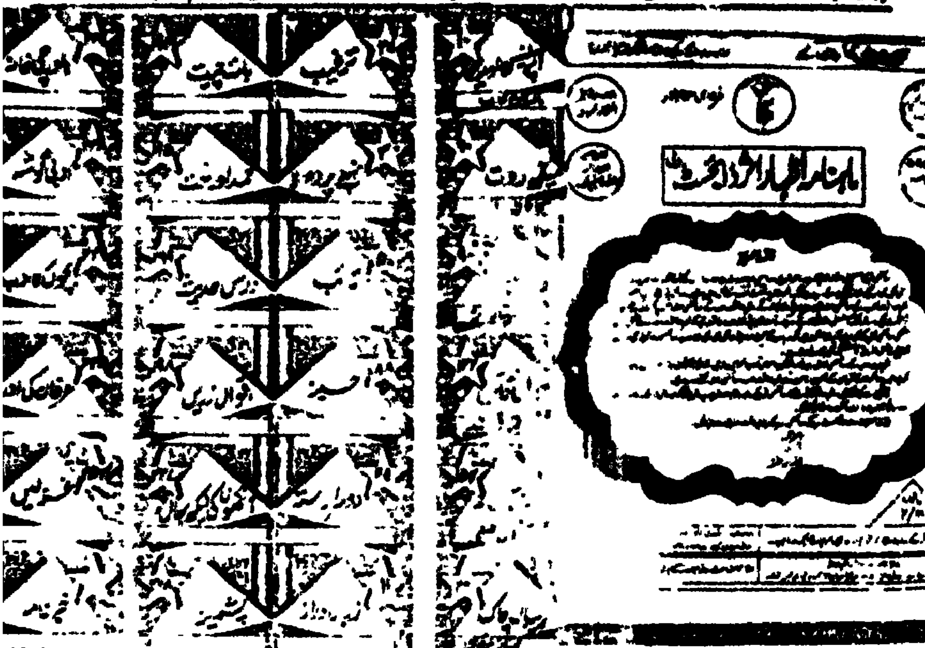
عید نمبر [illegible] (ادارہ)

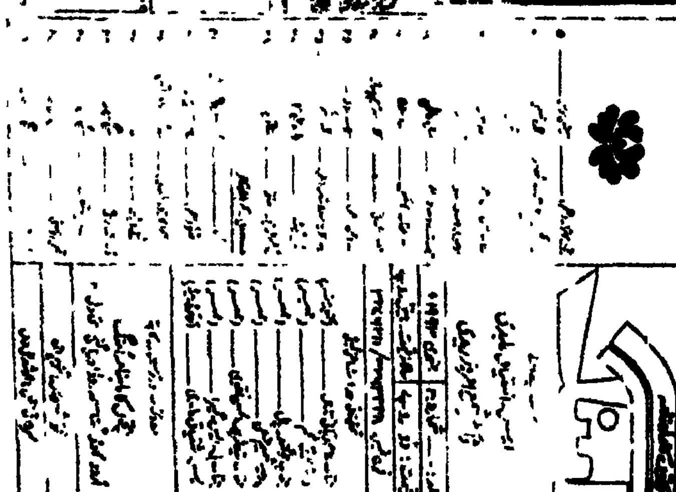
مدیر اعزازی [illegible] — ۲ — [illegible]

ہمارے خصوصی ممبران و معاونین

[illegible]

ماہنامہ اظہار الحق ڈائجسٹ دہلی (اپریل ۱۹۹۲ء) | امنگ نئی دہلی جنوری ۱۹۹۲ء | بیباک جرائم دہلی مارچ ۱۹۹۲ء





بیباک جرائم (دہلی) مارچ ۱۹۹۳ء

ثقلین

پیغام ۱

جلد ۱ شمارہ ۱

ترتیب

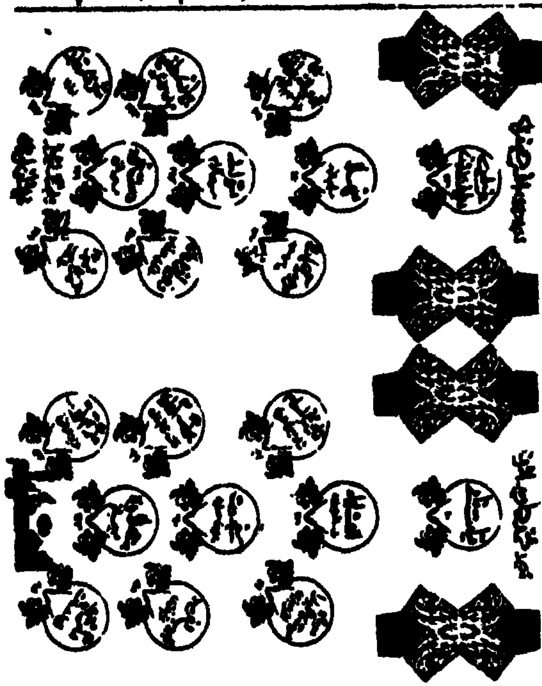
پیغام ثقلین

شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ — اپریل، مئی، جون ۱۹۹۲ء

Regd No PN 4603 5/85

"[illegible]" ماہنامہ [illegible] جنوری تا اپریل ۱۹۹۳ء

وزن





جرائم

شمارہ نمبر ۹۹

چیف ایڈیٹر:
حفیظ الرحمٰن خاں

ایڈیٹر:
شاہد نعیم

جوائنٹ ایڈیٹر:
صبیحہ خالد

MEMBER I. N. S.
[illegible]
PRESS COUNCIL OF INDIA

فی شمارہ: ۷ روپے
سالانہ: ۸۰ روپے

۵۰۰۲۸۶



توقیر چغتائی

ٹیلی فون ۴۴۳۵۱۳۳ | فیکس ۴۴۳۳۱۸۰-۰۲۱



محمد منصور یوسف

ساجدہ مجتبیٰ | پرویز ملک | جاوید اختر ساحر

جلد ۱۹ شمارہ ۱ | جنوری ۱۹۹۳ء | قیمت دس روپے

مشتاق روشن

جلد ۱۹ شمارہ ۲ | فروری ۱۹۹۳ء | قیمت دس روپے

جلد: ۱۹ شمارہ: ۳ | مارچ ۱۹۹۳ء | قیمت ۷ روپے

اس مہینے	۵	[illegible] مذہب کو سیاسی مقصد کے لیے استعمال کرنا	۲۲
عورت: ایک سرسری جائزہ	۷	افسانہ	۲۶
بوسنیا میں خواتین کی بے حرمتی	۱۱	کتابوں پر تبصرہ	۲۸
روسی عورت کا ماضی اور حال	۱۴	ادب	۳۰
رنگ کہتے ہیں	۱۸	محنت کشوں کی خبریں	۳۱
۸ مارچ - خواتین کے حوالے سے	۲۰	[illegible] اور جنسی تشدد	۳۲
جیل نوٹ	۲۲	خطوط	۳۳

جلد ۱۹ شمارہ ۵ | قیمت ۷ روپے | مئی ۱۹۹۳ء

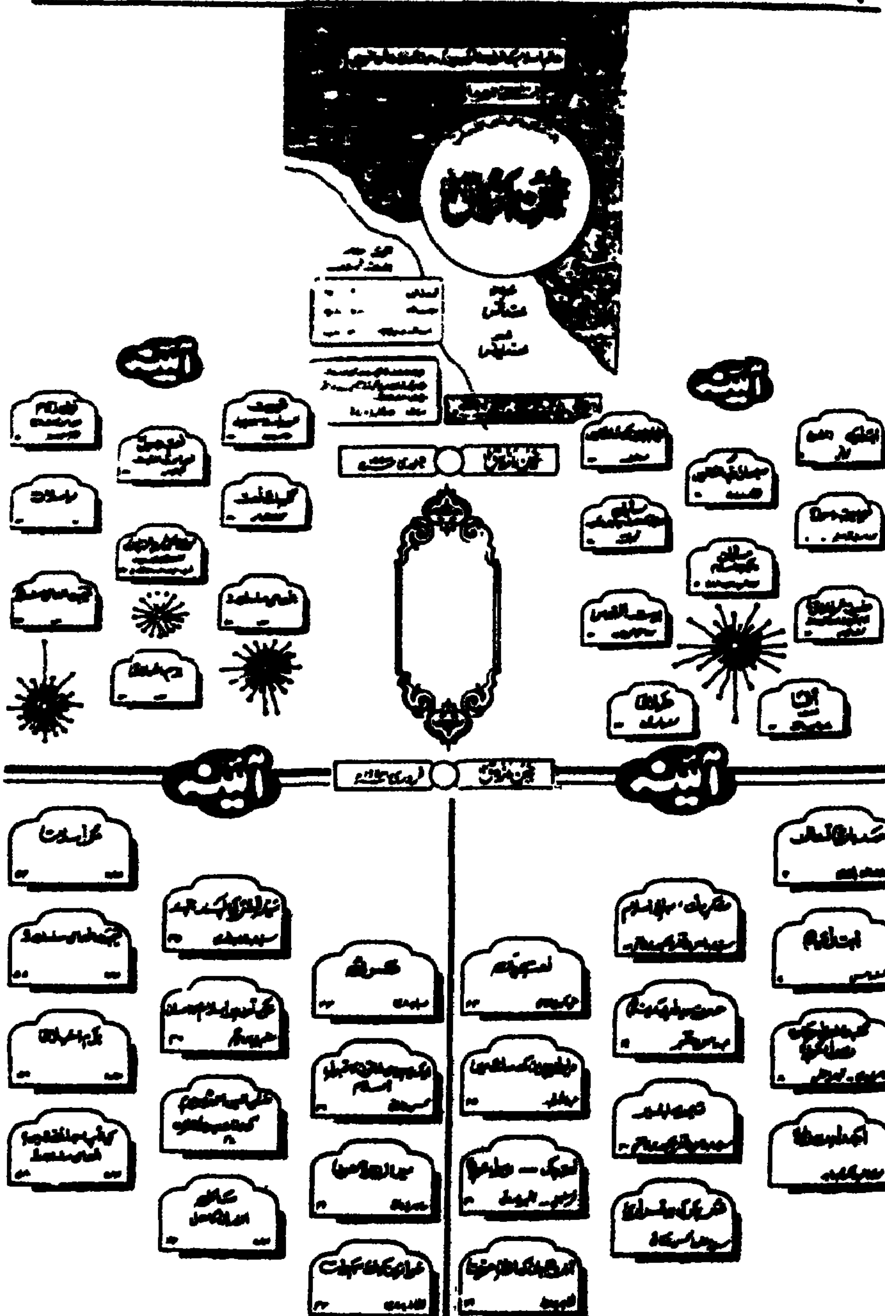
اس مہینے	۵	افسانہ	۲۱
آٹھویں ترمیم	۷	سیاسی تنظیمیں	۲۲
فلسطین	۱۰	اساتذہ کے مسائل	۲۳
پاکستان میں نشہ آور اشیا	۱۳	اطلاعیں	۲۵
لاطینی امریکہ میں [illegible]	۱۶	محنت کشوں کی خبریں	
خواتین سیمینار	۱۸		

جلد ۱۹ شمارہ ۴ | اپریل ۱۹۹۳ء | قیمت ۱۵ روپے

		[illegible] کب آئے گا؟	۲۶
سید حسن	۷	حبیب جالب کی آخری خواہش	۳۰
میری شاعری [illegible]	۸	[illegible] کا مسافر	۳۳
[illegible] آوارگی	۱۰	جالب سب سے اچھا	۳۵
قفس در قفس	۱۴	عوام کا شاعر ہوں	۳۷
شاعر شعلہ بیاں	۱۸	[illegible]	۴۰
جالب صاحب، آپ کو اس طرح جانا تھا	۲۲	آٹھویں ترمیم	۴۲
حبیب جالب [illegible] ہو گیا	۲۳	[illegible]	۴۶

جلد ۱۹ شمارہ ۶ | قیمت ۷ روپے | جون ۱۹۹۳ء

اس مہینے	۵	یوم مئی	۲۲
بجٹ	۷	[illegible]	۲۳
کیا پاکستان دہشت گرد ہے؟	۹	رنگ کہتے ہیں	۲۶
[illegible] سے ایک ملاقات	۱۴	افسانہ	۲۸
سیمینار	۱۸	خطوط	۳۱
مزدور بچے	۲۰	محنت کشوں کی خبریں	۳۳


آئینہ

حکمت قرآن

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرف اول		۲
...		۳
مرویات ... (۲)		۹
... اقبال (۳۱)		۱۵
لغات و اعراب قرآن (۳۱)		۲۳
...		۳۳
...		۳۹

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور



اس شمارے میں

ادارہ حسن پرست

مبارکباد

پیش کرتا ہے

[illegible]

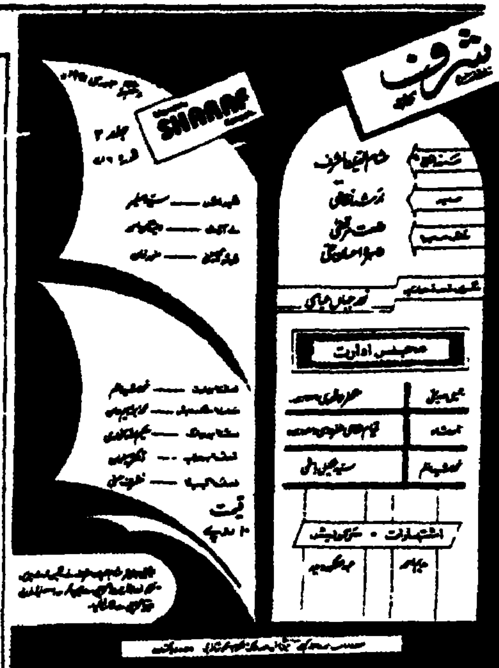
سہ ماہی دستگیر کوئٹہ

جلد نمبر ۳ — شمارہ ۲

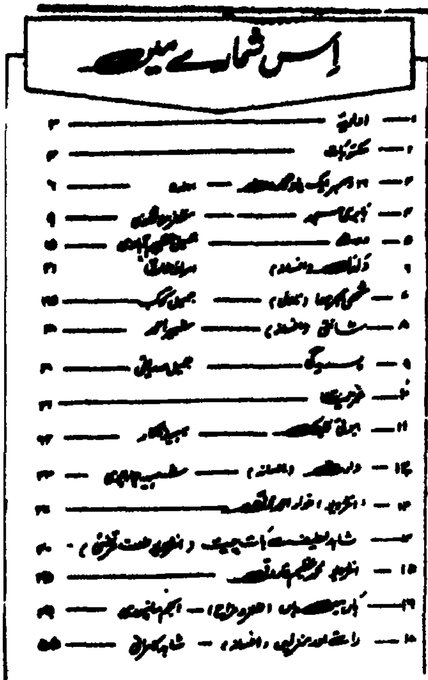
[illegible]

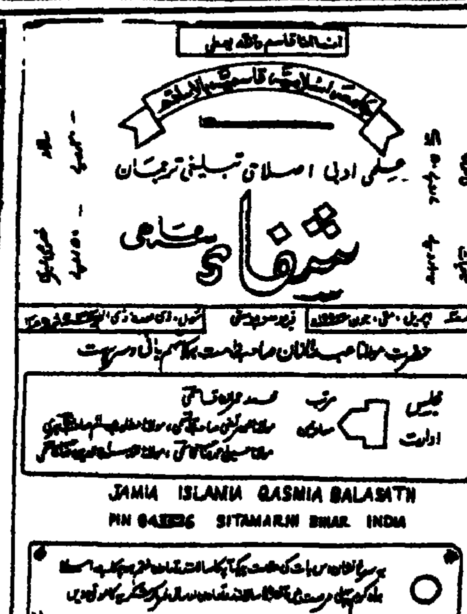
[illegible]

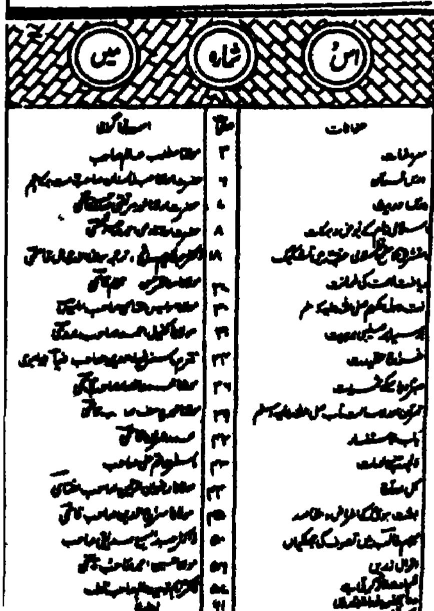
ماہنامہ شرف، کراچی، دسمبر ۱۹۹۰ء، جنوری ۱۹۹۱ء



سہ ماہی شفاء اپریل، مئی، جون ۱۹۹۲ء







فکر و نظر جون ۱۹۶۳ء

مندرجات

جلد نمبر ۲ [illegible]

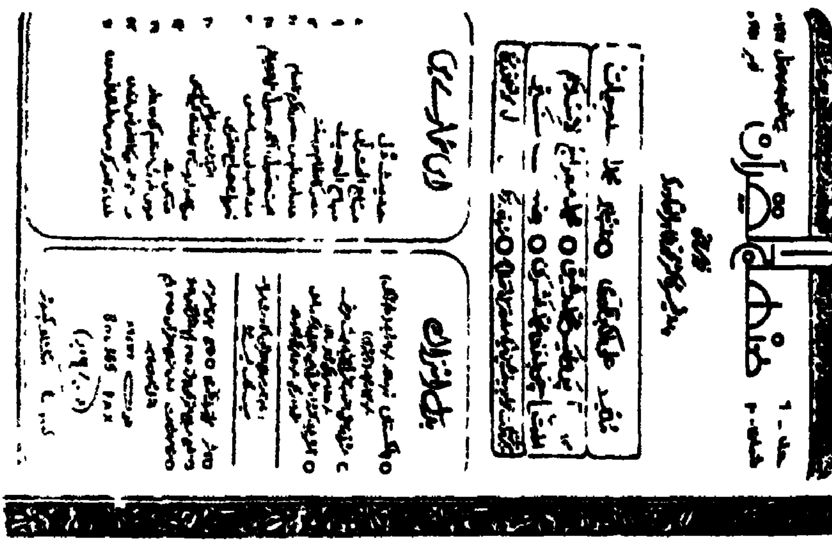
[illegible] ۱۹۹۰ء

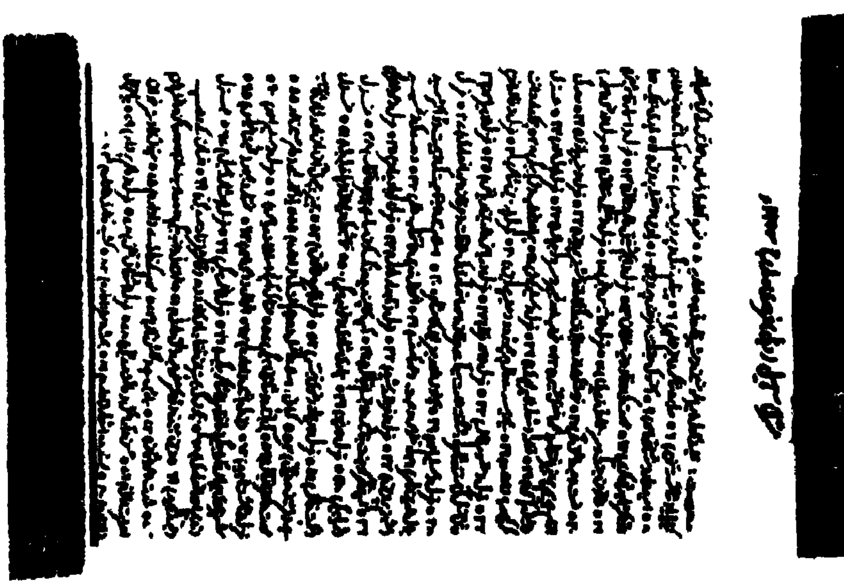
فہرست مضامین

[redacted]

[redacted]







نکہت گل

فی شمارہ : ۱۰ روپے
سالانہ قیمت ۸۰ روپے
سالانہ قیمت ۱۱۰ روپے
DL-289
مارچ ۱۹۹۳ء
شمارہ: ۳

اوسالا

حمد ابرار کرتپوری ۸

زکوٰۃ عادل حیاتی ۱۰

آٹوگراف واجدہ تبسم ۳۴

۱۴ ظفر مدیم بہاڑیاں بول اٹھیں

ممتا کی طاقت

حرف گلاب رنگوں میں

سید قیصر	۹۹
سید رضا جالندھری	۸۸
شکیل فرحت	۹۰
برقی سیفی کاس گنجوی	۹۸
اختر شاہجہانپوری	۹۹
چیک کلب ہتک گروشی	۹۹
فتح احمد	۱۲۹
قیوم کنول	۱۳۳
نثار سروہاری	۱۴۴
حقی آفریدی	۱۴۴
پروفیسر رشید الظفر	۱۴۴
ہدی گمنامی	۱۴۴
شبانہ ملتانی	۱۴۸

معصوم مینہ کی قاتل

نام ور شاں برمووی ۱۹۹

کلم چھتا شیر شاہ سوری ۲۰۳

آخری صفحہ ۲۲۹

بہت کچھ کہنا ہے ۲۲۳

تیجہ ادبی مقابلہ نمبر ۲۶	۹۳	تیجہ گمشدہ سطور	۲۱۱
۱۰۰۰ روپے کے انعامات	۱۹۱	گمشدہ سطور	۲۱۵
۸۰ روپے کے		تیجہ تحریری مقابلہ نمبر ۲	۲۲۱

صفیہ خان

ہمارے نونہال — بچوں کا رسالہ — حیدرآباد

جلد (۴) فروری ۹۲ء شمارہ (۵)

اپنی بات

ہمارے نونہال الحمدللہ پابندی سے آپ کے ہاتھوں میں آرہا ہے۔ ہماری پہلی کوشش یہ تھی کہ اردو کے دوسرے پرچوں کی طرح یہ کسی نظر بد کا شکار نہ ہو اور پابندی سے نکل سکے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ۶ سال سے اب تک کامیاب رہے ہیں ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ اس کی چھپائی کو خوبصورت بنائیں۔ اور صفحات میں اضافہ کریں آپ سب کی مدد شامل رہی تو یہ بھی جلد ہی کرلیں گے۔ اچھے لکھنے والوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ ہمارا تعاون کریں

(وحید)

ایڈیٹر
ابوالفہیم وحید گل خان
نائب مدیر
صلاح الدین مصری
زر تعاون
سالانہ 36 روپے
ششماہی 18 روپے
فی پرچہ 3 روپے
دفتر کا پتہ
ہمارے نونہال
23-2-222
مغلپورہ
حیدرآباد 500002
فون نمبر
523664

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر وحید گل خان نے اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد سے چھپا کر دفتر ہمارے نونہال 222-2-23 مغلپورہ حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست:

ضمیمہ

ضمیمہ۔۱

دانشوری (ادبی)

شمع سے شعلے کہتا (سریندر پرکاش)، ۱۳۹

میری دریافت کے بارے ایک خط (فاکنر بنام ملکم)، ۱۴۰

ناول پبلک اور مکالمہ (ستیہ پال آنند)، ۱۴۲

حرف اول: ہندو بیان کے سلسلے میں (شمس مظفر پوری)، ۱۴۳

کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس لیے؟ (سید عقیل)، ۱۴۶

دانشوری (تہذیبی)

پنڈت نہرو کی نگاہ میں ہندوستانی مسلمان (جواہر لال نہرو)، ۱۴۸

فرقہ وارانہ فسادات کے محرکات (ایم جے اکبر)، ۱۵۶

فرقہ اور مذہب کے نام پر فسادات (ایم ملک خان)، ۱۶۰

بمبئی ایک ملتی اور خونریز شہر (ذاکر ریشم باجوہ)، ۱۶۳

کیا شاہ بانو ہندو مسلم مسئلہ ہے؟ (ڈاکٹر رام پنت)، ۱۶۵

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر (وی این پانڈے کی کہانی)، ۱۶۶

عقیدے کے استادوں کی تیاری (سید حامد)، ۱۶۹

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندوؤں کا تعاون (پاکستان ...)، ۱۷۰

بنارس ہندو یونیورسٹی اور قومی یکجہتی (...)، ۱۷۲

دانشوری (مذہبی)

عمر خالق کردی (حسن سر شفیق)، ۱۸۰

مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے مسائل اور اشکال (صدرالدین اصلاحی)، ۱۸۶

طالبان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام: جماعت اسلامی کا ایک نیا شگوفہ (عبدالحمید نعمانی)، ۱۹۳

دانشوری (شعری)

کرۂ ارض (احمد ندیم قاسمی)، ۱۹۳

دھرتی کا لمس (احمد ندیم قاسمی)، ۱۹۶

بے تری رقم (جاوید حیدر)، ۱۹۷

خطاب بہ جاوید: جاوید نامہ کے دو حصوں کا ترجمہ (شہید تجلی)، ۱۹۸

گیت (رسول جالندھری)، ۱۹۹

امیر خسرو کی کویتا (رشید شمیم صدیقی)، ۱۹۹

اشلوک (وصی حیدری)، ۲۰۰

بیدل کی فارسی غزل کا اردو ترجمہ (ظہیر احمد صدیقی)، ۲۰۱

مہاجر (عبداللہ غازی)، ۲۰۴

دوسرا بن باس (کیفی اعظمی)، ۲۰۵

ہمیں انسان رہنے دو (محمود شام)، ۲۰۶

کیسی قوم کہاں کا ملک! (مشکور حسین یاد)، ۲۰۷

غزلیں: احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، انور شعور، سید ضمیر جعفری، ظفر اقبال، عبداللہ ناظر، محسن نقوی، ندا فاضلی، ۲۰۸ تا ۲۱۶

دانشوری (پاکستان)

ہمیں پاکستان میں اقلیتوں کو وہی منصب اور حیثیت دینی ہوگی جس کے ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے طالب ہیں۔ (اسلم شمیم)، ۲۱۸

مسلمان ایک غیر مسلم مملکت میں (جسٹس جاوید اقبال)، ۲۲۰

✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿✿

شیخ سعدی نے کہا تھا

"شیخ سعدی کے بارے میں ایک کہاوت یاد آتی ہے کہ بھری دوپہر میں وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اناج کی سوکھی ہوئی روٹیاں نمک کے ساتھ کھا رہے تھے۔ قریب ہی سے بادشاہ کا درباری شاعر ایک گھوڑے پر سوار گزرا۔ درباری شاعر نے شیخ سعدی کو دیکھا اور پہچان لیا۔ گھوڑے سے اُتر کر قریب گیا۔ کہنے لگا

"اے شیخ! اگر تم نے زندگی میں بادشاہ کے دربار میں جاکر کبھی کبھی سلام کرنے کی عادت ڈالی ہوتی تو آج اس طرح روکھی سوکھی روٹی نہ کھا رہے ہوتے۔"

شیخ سعدی نے منہ میں رکھے لقمے کو اچھی طرح چبایا نمک چکھا اور مسکرائے پھر گویا ہوئے۔ "اے رفیق! اگر تم نے روکھی سوکھی کھانے کی عادت ڈالی ہوتی تو تم کو کبھی بادشاہ کے دربار میں جاکر سلام نہ کرنا پڑتا۔"

اب دیکھیے کتنی عجیب بات ہے کہ شیخ سعدی کا نام مجھے ابھی تک یاد ہے مگر درباری شاعر کا نام بھول گیا ہوں مگر آپ میں سے اکثر کو اس درباری شاعر کا نام بھی ضرور یاد ہوگا اور بادشاہ وقت کا نام بھی جس کے دربار میں جاکر سلام عرض کرتا تھا۔"

(سریندر پرکاش۔ "سنڈے جمشید پور" ص ۱۱)

"عصری ادب" اپریل ۱۹۹۳ء

تاریخ: ۶ مارچ ۱۹۹۳ء

مدیر دریافت کے نام

مدیر محترم

یہاں واپس آیا تو "دریافت" کے تین شمارے ایک ساتھ ملے۔ ان میں نومبر ۱۹۹۲ء کا وہ شمارہ بھی تھا جس میں آپ نے میرا مضمون "تنقید کے ڈھکوسلے" اور ساتھ ہی پروفیسر گوپی چند نارنگ کا جوابی مضمون "نئے چند در ساختیات" شائع کیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے طنزیہ و تمسخرانہ انداز میں میری پگڑی اتارے اور اپنے سر پر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ عار کی ٹوپی محمود کے سر پر آتی بھی ہے یا نہیں؟۔ ویسے بھی' جیسا آپ جانتے ہیں' نارنگ صاحب میرے دوست اور مجھے عزیز بھی ہیں۔ اگر یہ پگڑی ان کے سر پر ٹھیک آتی ہے تو وہ بے شک اسے اپنے سر پر رکھیں اور رکھے رہیں۔ جہاں محبت کے رشتے ہوں وہاں حساب دوستاں در دل کا مقولہ مناسب رہتا ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں ایک نقطہ نظر پیش کیا تھا جس میں اس بات پر زور تھا کہ ان نظریوں سے امریکی ادب کا بھلا ہوا ہے اور نہ اردو ادب کا بھلا ہوگا۔ ساتھ ہی میں نے اپنے مضمون کے حاشیے میں چار کتابوں اور ان کے مصنفوں کے نام درج کیے تھے تاکہ اہل علم ان کتابوں کو پڑھ کر اس نقطہ نظر کو مزید سمجھ سکیں۔ آپ نے معلوم نہیں کیوں اس مختصر سے حاشیے کو میرے مضمون کے ساتھ شائع نہیں کیا؟۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔

نقاد کی حیثیت سے میرا یہ اصول رہا ہے کہ جب بھی ادب میں کوئی منفی رجحان داخل ہوا تو میں نے بساط بھر اس رجحان کا قبلہ درست کرنے کی کوشش کی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۸۳ء میں میں نے ایک مضمون "علامتی افسانہ ---- ایک منفی رجحان" کے عنوان سے لکھ کر اسے کراچی کے ایک سیمینار میں پیش کیا تھا اور "اوراق" میں ڈاکٹر وزیر آغا نے کئی صاحبان قلم سے اس مضمون کے جواب میں مضامین لکھوا کر "سوال یہ ہے" کے تحت شائع کیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی عرض کیا تھا کہ اب علامتی افسانے کا زور ٹوٹنے کا اور ہمارے افسانہ نگار اپنی تخلیقات کو نئی صورت دینے پر غور کریں گے اور آپ نے دیکھا کہ اس کے بعد علامتی افسانے کا زور ٹوٹ گیا بلکہ اب جدید تر صورت ہی بدل گئی ہے اور "کہانی" پھر واپس آگئی ہے۔ یہی مقصد "تنقید کے ڈھکوسلے" لکھنے کا تھا تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے اور باذوق قاری اور ادیب اس نقطہ نظر پر بھی غور فرمائیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے جوابی مضمون میں یہ جملہ لکھ کر کہ "حضرت جب آپ کو ساختیات کے بنیاد گزاروں کے نام تک معلوم نہیں تو قلم اٹھانا کیا ضرور ہے" "دس بارہ ساختیاؤں" کے نام دیے ہیں جن میں سے کئی وہ ہیں جن کے نام میرے مضمون میں بھی آئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ناموں کے تلفظ کی غلطی کی وجہ سے ان ناموں میں سے کئی کا املا تک درست نہیں ہے۔ ناموں کی یہ سب کی فہرست دیکھ کر مجھے گاؤں کے وہ ماسٹر صاحب بہت یاد آئے جن کے اسکول کے معائنے کے لیے انسپکٹر صاحب تشریف لانے والے تھے۔ ماسٹر صاحب نے چند سوالات بچوں کو اچھی طرح یاد کرادیے اور سوچا کہ جب انسپکٹر صاحب آئیں گے تو وہ یہی سوال بچوں سے پوچھیں گے۔ جیسے ہی انسپکٹر صاحب کلاس میں داخل ہوئے تو ماسٹر صاحب نے بچوں سے پوچھا---------- "بچو بتاؤ! رانا سانگا میدان جنگ سے کیا دبا کر بھاگا؟" سب بچوں نے ایک زبان ہو کر کہا---------- "دم" ---- ماسٹر صاحب نے کہا---- "شاباش" ماسٹر صاحب نے اب دوسرا سوال پوچھا "بچو بتاؤ! بلی اپنے گھر کیا ہوتی ہے؟"۔ سب بچوں نے ایک زبان ہو کر کہا---- "شیر" ماسٹر صاحب نے کہا---- "شاباش"۔ میرے دوست پروفیسر نارنگ صاحب نے تلفظ و املا کے ساتھ ناموں کی ایک فہرست پیش کرکے گاؤں کے روایتی ماسٹر صاحب والا کارنامہ انجام دیا ہے۔ دیکھیے نا! املا میں "دم" اور "شیر" جیسے ناموں سے کیا واقف ہو سکتا ہوں! ان سے تو گاؤں کے ماسٹر صاحب ہی واقف ہو سکتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں "سارک" کے سیمیناروں میں شرکت کے لیے مجھے بھارت بھیجا گیا تھا۔ وہاں جس روایت اور معمول کے مطابق نارنگ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کام کی باتیں کرنے کے بجائے اس بار "ردِ تعمیر" کے موضوع پر میرے مضمون کے حوالے سے گفتگو کرتے رہے۔ اس وقت برادرم ضیاء الدین بھی موجود تھے۔ کوئی سرے جائے اور وہاں بار بار "ردِ تعمیر" کے موضوع پر بات کرے تو انسان الجھنے لگتا ہے۔ میں نے کہا پروفیسر نارنگ آپ اس مضمون کے جواب میں ایک مضمون لکھیے لیکن یاد رہے کہ منہ نہیں کھنا چاہیے۔ منہ چڑانے سے الا کی پوچا تو چاہی ہے لیکن فکر و عمل کی پیروی نہیں ہوتی ہے۔ میں نے جس سطح پر بات کی ہے اس سطح پر آپ بھی گفتگو کیجیے۔ یاد رہے کہ میرے مضمون (تنقید کے ڈھکوسلے) میں براہ راست یا بالواسطہ کہیں بھی نارنگ صاحب کا حوالہ نہیں ہے بلکہ یقین کیجیے مضمون لکھتے وقت مجھے ان کا خیال تک نہیں آیا۔ اب اصول سے

جوابی مضمون لکھا ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ سارے مضمون میں مجھ پر کیچڑ اچھالنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا۔ نہ میرے نقطۂ نظر کو رد کیا۔ نہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی البتہ اپنی سعی پر مجھے رد کرنے کی کوشش ضرور کی اور کلکتہ، دلی، گیا سے پہنچے ہوئے ان الٹی خطوط کے اقتباس ضرور درج کر دیئے جن میں میری تنگ نظری، بے بضاعتی، شقی اور ذہنی فکر کا رونا رویا گیا ہے اور پھر انتظار حسین کی کہانی سے اقتباس دے کر اسے خود ادراکی کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے مضمون میں آگے چل کر میرے ایک اور مضمون کا حوالہ دیا ہے اور اسے ایک ایسے رنگ میں پیش کیا ہے جس کا تعلق میرے اس مضمون سے نہیں ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سب جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔ یہ دوسرا مضمون میں نے ژاں پال سارتر اور سیمون دی بووار کے حوالے سے (یہودی ڈاکٹر کے تعلق سے) ماہنامہ "علامت" لاہور میں لکھا تھا۔ نارنگ صاحب نے ایمان داری یہ برتی ہے کہ اس کے الفاظ "تنقید کے اکھاڑے" سے لے لیے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ میرا مضمون (تنقید کے اکھاڑے) "دریافت" کے اسی شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں ان کا جوابی مضمون شائع ہوا ہے۔ قارئین کرام دونوں مضامین ایک ساتھ پڑھ کر دیکھ لیں۔ ان کو خود اندازہ ہو جائے گا۔ اس حصے کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ پروفیسر موصوف پٹری سے اتر گئے ہیں اور سچ پوچھ کی سرایت و شقیوں کی چیزی سرمایہ کے متوالے کا کھلا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ مادیت کتنا بھولے آگر ای کر سکتے ہیں۔

ڈیئر مکرم! میں لڑنے مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ علم و ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہ میرا پیشہ ہے اور نہ ہی شوق۔ اب اگر میں نارنگ صاحب کے جوابی مضمون کا جواب دوں تو ظاہر ہے کہ مجھے نارنگ صاحب کے اس لہجے کو اور تیز اور شدید کرنا پڑے گا جس لہجے میں انہوں نے جوابی مضمون لکھا ہے۔ مجھے بھی ان خطوط کے اقتباسات پیش کرنے پڑیں گے جو کراچی، لاہور، راولپنڈی کے علاوہ دلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور پٹنہ سے ان کے جوابی مضمون کے حوالے سے موصول ہوئے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے مضمون میں پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک نقطۂ نظر پیش کیا ہے جو سرقے والا نظریہ نہیں ہے۔ میں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا جوابی مضمون پڑھ کر یہ طے کیا ہے کہ میں ایک اور مضمون اس سلسلے میں لکھوں گا اور نارنگ صاحب کی سطح پر اتر کر جوابی مضمون ہرگز نہیں لکھوں گا۔ آپ چاہیں گے تو یہ مضمون آپ ہی کو اشاعت کے لیے بھیج دوں گا۔ نارنگ صاحب میرے دوست تھے اور دوست سے گفتگو اس سطح پر نہیں ہوتی جس طرح پر نارنگ صاحب نے میرے بارے میں فرمائی ہے۔ خدا انہیں شاد و آباد رکھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے میرے مضمون کے نقطۂ نظر اور اس میں اٹھائے گئے سوالوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا اور اسی لیے ان کا ایک بھی تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔ ان کا مضمون پڑھ کر یہ شعر یاد آیا ہے:

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

وہ چار کتابیں جن کا ذکر میں نے اس خط میں کیا ہے یہ ہیں:

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا مخلص

(ڈاکٹر جمیل جالبی)

1. David Lehman, Signs of Times : Decoı s*ruction and the Fall of Paul Deman

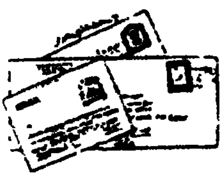
2. Davic Lodge, After Bakhtin , Essaysin Fiction and Criticism

3. David Lodge, Small World

4. Interview of Prof. Frank Kermode, Published in Criticism in Society by Imre Salusinszky

"دریافت" جنوری ۱۹۹۳ء

ستیہ پال آنند
پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۴۸۰ - ریاض ۱۱۶۹۱ (سعودی عرب)





غزل پر ایک اور مکالمہ

شاعر شمارہ نمبر ۶ ستمبر ۱۹۹۱ء میں منور کیف صاحب کا مضمون غور طلب ہے۔ ویسے بھی اب یہ ضروری ہے کہ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے تحت ہوئی بحث کی روشنی میں کچھ مفروضات کو ایک بار پھر پرکھا اور تولا جائے۔ میں کیف صاحب کا ممنون ہوں انہوں نے نا قدانہ نظر سے ان تمام نکات کا جائزہ لیا ہے جو میرے انٹرویو سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یوں بھی غلط بیانات کے کیچڑ سے بچ کر جناب نے میرے افکار اور خیالات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ وہ بھی کیف صاحب کی طرح مندرجہ ذیل باتوں پر متفق ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو وجوہ کے بارے میں ہے۔ نتائج کے بارے میں نہیں۔

- ایک: تقسیم ہند کے بعد صنف نظم کی ترقی دھیمی رہی ہے۔ اس کی نشو و نما نہیں ہو سکی۔
- دو: وجہ غالباً صنف غزل کی عامیانہ مقبولیت ہے جسے شاعروں سے ہر دل عزیز ہونے کی سند ملی ہے۔
- تین: جن نظم گو شعرا کو فوقیت حاصل ہوئی بھی ہے۔ وہ بھی (ڈاکٹر [illegible] صاحب مستثنیٰ ہیں)، غزل کی لفظیات کے دائرے میں رہ کر نظموں کی تخلیق کرتے ہیں۔ غزلیں کہتے ہیں اور مشاعرے پڑھتے ہیں۔
- چار: غزل کی صنف برصغیر کے تہذیبی ورثے سے اس حد تک جڑی ہوئی ہے کہ یہاں کی شعری روایات کے سیاق و سباق میں ہی اس پر غور و خوض ہو سکتا ہے۔ میرے انٹرویو میں اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور جو پیمانے میں نے استعمال کئے ہیں۔ وہ مغربی ادب کے لئے تو موزوں ہیں۔ صنف غزل کے لئے نہیں ہیں۔
- پانچ: تنقید نگار حضرات اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ انہوں نے کبھی اس صورت حال کو پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، اردو کا شعری ادب عصری عالمی شاعری کے مقابل اپنی کوئی حیثیت کیوں نہیں متعین کر پایا؟ اور مغرب کی یونیورسٹیوں کے کورسز میں جہاں جاپانی، چینی، کوریائی اور جنوبی امریکہ کے ہسپانوی ادب کے شہ پارے پڑھائے جاتے ہیں۔ وہاں اردو کا عمل دخل کیوں نہیں ہے۔ جب کہ اردو ایک بڑی زبان ہے اسے کروڑوں لوگ بولتے ہیں اور اردو کی نئی بستیوں میں تارک الوطن اردو داں اصحاب نے اسے چار دانگ عالم میں پھیلا دیا ہے۔
- چھ: فیض احمد فیض کیا اس لئے شہرت دوام کی سند حاصل کر سکے کہ وہ بہت اچھے شاعر تھے؟ یا ترقی پسند تھے اور کمیونسٹ تھے؟ یا اپنی نظموں میں بھی روایت سے تجاوز لفظیات، استعارات اور تشبیہات سے [illegible] کہ انہوں نے غزل کی لفظیات کا احترام کیا؟

کیا وہ واقعی عالمی سطح کے شاعر تھے؟ کیا ان کا درجہ [illegible] سے واقعی بلند تھا؟ کیا Poets' Poet ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کر کے اردو شاعری کو فیض یاب کیا یا نقصان پہنچایا؟ یہ چند بحث طلب سوالات ہیں اور ان پر بحث ہونی چاہئے۔

مثلاً اس خط میں "دستِ سنگ" کا ذکر نہیں کروں گا جو ۱۹۶۵ء میں چھپی۔ ان نظموں کا بھی ذکر نہیں کروں گا جو "وقت [illegible] وقت" (زیر [illegible]) میں شامل ہیں اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ میں نے کبھی نہ تو یہ کہا ہے کہ [illegible] غزل نے [illegible] پیدا کیا ہے اور نہ ہی اس غرض سے [illegible] کیا ہے کہ [illegible] اس [illegible] کا ازالہ ضروری ہے۔ میں نے اپنے انٹرویو میں یہ کہیں نہیں کہا کہ ہر غزل [illegible] شاعر [illegible] کی [illegible] میں نہیں آ سکتی۔ اس لئے اس میں [illegible] کہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ صرف یہ عرض کیا ہے کہ عصری عالمی شاعری کے مد مقابل کوئی بھی شعری تخلیق صرف اپنی ترجمہ شدہ حالت میں ہی رکھی جا سکتی ہے اور چونکہ غزل کا ہر شعر اپنی لسانی حد بندیوں میں مقید [illegible] زبان کے [illegible]

غالب کے انگریزی مترجمین نے وہ بحث اٹھائی ہے کیا یا ہر کو دیا نہ کرلیں۔ تو یہ بحث ان کی اساس کو تحفظ ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ انگریزی طبقہ میں ان تراجم کا ذکر چلتا ہے؟ یہ بہت عجیب ہے میری مراد غالب کے بارے میں کوئی VALUE JUDGEMENT دینا نہیں ہے۔ صرف ایک حقیقت کا اظہار ہے جسے بیشتر نقاد بھی تسلیم کرتے ہیں کہ غزلیہ شاعری ترجمے کی زد میں نہیں آ سکتی۔

یہ مجموعہ اس بات کا اعلان تو نہیں کر سکتا ہے کہ ہم کیا جانے کہ پھر بھی یہ فرق نہ ہے کہ صنف غزل کے بارے میں کچھ ایسی باتیں جو اگرچہ واضح نہیں تھیں، اب کی جائیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ غزل پر نیا تنقیدی مطالعہ انگریزی کے صرف اس حصے پر مبنی تھا۔ جو غزل کے بارے میں ہے اور دلچسپ طور سے تشنہ رہ گیا ہے۔

یہ نکتے جو محمد نے اپنے ایک مایہ ناز مضمون (مطبوعہ افکار، کراچی) میں اٹھائے ہیں ان کا ذکر ضروری ہے۔ جیسے کہ غزل کی بنیادی فروخت مضمون آفرینی ہے۔ معنی آفرینی نہیں اور اس حد تک یہ مضمون آفرینی کی کاوش ہے سے معنی آفرینی سے گریز کی سبب اس حد تک یہ روایت سے ہر حق نکل جاتی ہے۔ اس مضمون آفرینی کو سمجھنے کے لئے اور غزل کے سیاق و سباق میں اس کا تجزیہ کرنے کے لئے MICHAEL RIFFATERRE کے اس نظریہ کو جاننا ضروری ہے جسے انگریزی میں SUBMERGED MATRIX کہا گیا ہے۔ ایک اور اصطلاح کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ کرسٹیوا کی اصطلاح ہے جسے INTER TEXTUALITY کہتے ہیں۔ کرسٹیوا کے نظریے کو نیا نام دے ہم JUNG کے اجتماعی نسلی لاشعوری بیداری COLLECTIVE RACIAL PARAMNESIA سے جوڑیں تو جو تصویر غزل میں مضمون آفرینی کی نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے:

"غزل کا ہر شعر متقدمین اور ہم عصر شعرا کے مشترکہ SUBMERGED MATRIX کو اپنے استعارات، اپنی علامتوں اور اپنی لفظیات میں TREAT کرتا ہے اور اسے خود میں جذب کرتے ہوئے نئے یا پرانے ڈھنگ سے۔ نئے یا پرانے علامتی و استعاراتی سیاق و سباق میں وہی بات بار بار کہتا ہے۔"

[انگریزی سے ترجمہ۔ پراجیکٹ رپورٹ صفحہ ۲۱]

میں بات کو ختم کرتے ہوئے صرف ایک مثال دے کر اپنا منشا واضح کرنے کی کوشش کروں گا ۔۔۔ زیر نظر شمارہ نمبر ۹ کے صفحہ ۹۰ پر نقش دوست محمود سعیدی کی ایک غزل ہے جو اسی بحر میں ہے جس میں "دست برگ" کی بیشتر نظمیں ہیں، یعنی بحر خفیف مسدس مخبون محذوف۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن۔ شعری روایت سے عبارت اور مجید رفتہ شعرا یا ہم عصروں سے حاصل شدہ داخلی متنیت کے استعاروں کی رینج RANGE کس قدر محدود ہے اور اس انٹر ٹیکسچولٹی کے متنازع ریاض ایک ہی راگ کے ایک ہی سُر کو، یعنی ایک ہی مضمون کو کتنے بار باندھا جاتا ہے۔ اس کی ایک نہایت کارگر مثال یہ غزل ہے۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ مضمون کی بنیاد استعارہ ہے لیکن کوئی بھی استعارہ کلیتہً PARADIGMATIC نہیں ہوتا یہ SYNTAGMATIC بھی ہے۔ مغربی دنیا کی POETICS کی تھیوری کے مطابق استعارہ محض اصل تصویر کی SUBSTITUTION ہے جب کہ غزل کے اشعار میں ہمارے ہاں CONTINUITY سے بھی استعارہ تشکیل پاتا ہے۔ اس غزل میں کل چودہ اشعار ہیں۔ ان چودہ میں سے ٹھیک آدھی تعداد یعنی سات اشعار "سفر" کے استعارے سے عبارت ہیں۔ یعنی میرے حساب سے نقش دوست محمود سعیدی کے پاس ہر دوسرے شعر کے لئے اپنی غزل میں ایک ہی مضمون ہے یعنی کہ "آفرینی" کے لئے انہوں نے مختلف ذیلی پیکر تراشی کے نمونے دکھا لیا ہے۔ یہ قاری انٹر ٹیکسچوئلٹی کی عمدہ مثال ہے۔

●●

مشاعرہ، مارچ ۹۳ء

حرفِ اوّل

موضوعِ تحریر کی تمہید کے طور پر ایک مختصر سی تمثیل بے محل نہ ہوگی۔ اُردو غزل کی سولہ سنگار والی روایتی حسینہ کا تصور کیجیے۔ ستر سال پہلے تک کی موروثی ہندوستانی تہذیب کی دیہاتی دلہن کو یاد کیجیے۔ اگر حقیقی دلہن نہ دیکھی ہو تو تصویروں میں یا کتابی ...وں میں تو ضرور دیکھی ہوگی۔ آج ویسی ہی ایک حسینہ یا ویسی ہی ایک دلہن کو لوگ یوں کہنے لگے کہ تم تو ان بوجھل زیوروں ...و واہیات سی لگتی ہو۔ تمہاری ساری فطری رعنائیوں کو ان مکروہ زیوروں نے ناقص سا رکھا ہے۔ اور اس طرح ستم ظریفوں ...ینہ کو مسلسل بہکا بہکا کر پاؤں کے بچھوے سے لے کر کان کی بالی تک اس کے سارے زیور اُتروا دیئے۔ آخر میں ناک کی دکتی لیل بچ گئی۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ محض یہ ایک کیل بھی عورت کے سولہ سنگار پر بھاری پڑتی ہے۔ دشمنوں نے ...ہ کر آخر وہ بھی نکلوا دی۔ تب پیرہن کی باری آئی ـــ ظالموں نے نقص نکال نکال کر ایک ایک کر کے وہ بھی اُتروا دیئے۔ ...سارے زیور اور پیرہن اتر گئے تو حریفوں کو اس پر بھی صبر نہ آیا۔ ان کی نگاہِ بد جانِ غزل کی اسی زلف پر ٹک گئی جس کی ...یں ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں — لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

...ف بھی شاطر حریفوں کی آنکھ کا کانٹا بنی رہی۔ کیوں کہ یہ گھنی گھنی زلفِ دراز حسینہ کے لیے ذرا سی ستر پوشی کا کام بھی دے جاتی ...۔ اس کے لیے بھی لوگ طعنہ زن ہوتے کہ یہ کیا فضول سا جنگل جھاڑ سر پر ڈھوتے پھرتی ہو۔ صانعِ فطرت نے تمہاری جسمانی ...ت کو جو قاتل حسن بخشا ہے اُس سارے کو تو تمہارے سر کی بے تحاشا لمبی گھاس ڈھانپے رہتی ہے۔ مگر کم از کم اس معاملے غزل کی حسینہ جب جھانسے میں نہ آئی تو یاروں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زبردستی اس کا سر مونڈ ڈالا۔

اب آپ تصور کریں کہ ان سانحات کے گزر چکنے پر وہ حسینہ کیا رہ گئی! ـــ اور خاکم بدہن یہی حشر تو آپ کی پیاری اُردو کا ...نامحسوس تدریج سے ہونے والا ہے۔ وہی اُردو جس سے آپ کو وہی مشہور پیار ہے جو ایک طوائف کو اپنے عاشق سے ہوتا ہے، ...مانیے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ آپ کو اُردو ہرگز عزیز نہیں بلکہ آپ کو محض اپنے وہ ذاتی مفادات عزیز ہیں جو اُردو کے طفیل ...دو کے وسیلے سے حاصل ہیں۔ یعنی آپ صرف پھل کھاتے رہنا چاہتے ہیں، درخت کی زندگی کی خیر نہیں مناتے۔ آپ یہ بھی ...ں دیکھتے کہ اس درخت کی شاخوں پر تو پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا ہے، مگر اس کی جڑ کھود کر کھوکھلی کی جا رہی ہے۔ یعنی اس کی ساخت 'منہائی' جاری ہے۔

غریب اُردو کے خلاف زمانے میں کیا کیا نہ فتنے اٹھتے رہے ہیں۔ کیا کیا نہ الزامات ہیں اس غریب پر! یہ غیر ملکی ...ن ہے، یہ بٹوارے کی زبان ہے۔ یہ ترکی زبان ہے۔ یہ پاکستانی زبان ہے یہ مسلمانوں کی زبان ہے ـــ یہ تو کھلے ہوئے اندیشوں اور اُردو دشمنوں کی باتیں ہیں۔ یعنی جو ان کے دل میں ہے وہی ان کی زبان پر بھی ہے۔ کم از کم وہ ریاکار نہیں ہیں۔

کچھ لوگ محض حق کے اوپر سے کہتے ہیں کہ یہ اتحاد اور سیکولرزم کی زبان ہے۔ یہ جنگ آزادی کی زبان ہے جس نے بھارت کو "انقلاب زندہ باد" جیسا جوشیلا نعرہ دیا۔ اور وہ لوگ اس کی کتنی ہی خوبیاں گنواتے ہیں۔ اس کے حقوق کا اعتراف اور اس کی حق تلفیوں کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ اس کو خالص بھارتی زبان تک مانتے ہیں۔ دل بہلاوے کی ان باتوں سے اردو کا فی الواقع کہاں تک بھلا ہو پاتا ہے وہ کو اظہر من الشمس ہے۔ حق تو یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اردو زبان سکڑتی سمٹتی ہی جارہی ہے۔ وجود اور استعمال دونوں اعتبار سے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے روایتی گہوارہ اتر پردیش میں بھی اردو کو جینے تک کے لالے پڑ گئے ہیں۔ بس ایک فعال و متحرک بہار ہے جہاں نیم دلانہ ماحول میں بھی کسی طور سخت جان اردو کا کچھ بھرم قائم ہے۔

ایک طرف تو اُردو پر بعنوان دیگر اضمحلال اور انحطاط طاری ہے مزید برآں بعض اشتہاری غم خواروں اور ان سے ساز باز رکھنے والے منافق نمک خواروں کا یہ پیہم مطالبہ چلا آ رہا ہے کہ اردو کو ترقی دینے کے لیے اس کا موجودہ رسم الخط ترک کر دیا جائے۔ اردو زبان کو "عام فہم" (؟) بنا دیا جائے۔ خیر اس پر تو بہت بحثیں چل چکی ہیں وہ لوگ اہل اردو کو کسی دلیل سے قائل نہیں کر پائے بلکہ خود ہی لاجواب ہو کر بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ اس شاطرانہ مشورے کا لب لباب صرف یہ نکلتا ہے کہ اردو زبان کو عربی اور فارسی کی ان صوتیات سے محروم و معرّا کر دیا جائے جن کا تلفظ اور بہت زور ہے۔ ماموں اسطور خاص ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط میں نہیں ہو سکتا — مثلاً: ث۔ ح۔ خ۔ ذ۔ ز۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق — پھر اُردو زبان ان صوتیات سے محروم ہو کر کیا چیز رہ جائے گی۔ ذرا تصور کیجیے — وہی غزل والی شکستہ و ریختہ حسینہ — کیوں؟

اردو زبان کے خلاف ایک اور فتنہ وقتاً فوقتاً اس کو "آسان" بنانے کا اُبھرتا رہتا ہے۔ اس میں کبھی کبھی بعض وہ کوتاہ اندیش حضرات بھی سُر میں سُر ملا دیا کرتے ہیں جو واقعی اردو کی ترقی چاہتے ہیں۔ مگر "آسان" سے مراد زبان کو ثقیل نہ بنانا ہو تو اس کی تائید ہر کسی کو کرنی چاہیے۔ بلکہ زبان کو ثقالت سے محفوظ رکھنے کی تلقین و فہمائش تو ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ لیکن اب "آسان" کا مفہوم بدل گیا ہے۔ اب "آسان" بنانے کا مفہوم "شناخت" کو معدوم کرنے کا ہے۔ ہر زبان کی طرح اردو کا بھی اپنا ایک چہرہ اور اس کی ایک تہذیبی شناخت ہے۔ اور اس تہذیبی "شناخت" کے مظہر زیادہ تر فارسی و عربی سے کسب اور جذب کردہ وہ الفاظ، محاورات، استعارات، ضرب الامثال اور تشبیہات وغیرہ ہیں جو اُردو زبان میں گویا "حلول" کر چکے ہیں۔ "ناصحانِ مشفق" کو سب سے زیادہ شکایت اردو میں مستعمل فارسی اضافت (یعنی زیر) اور موصوف مرکب الفاظ سے ہے۔ سچ پوچھیے تو جہاں تک اردو زبان کے چہرے کا سوال ہے اس کے خدوخال اور رنگ و روغن پر غالب عنصر ہندی ہی کا ہے۔ کیونکہ ہندی اور اردو کی پیدائش تو ایک ہی خمیر ایک ہی کوکھ سے ہے۔ پھر بھی ایک ہی کوکھ سے پیدا ہونے والی دو صورتیں من وعن ایک تو نہیں ہو سکتیں۔ تو کیا بعد میں پیدا ہونے والی صورت کو "پلاسٹک سرجری" کر کے پہلے پیدا ہونے والی صورت کی فوٹو کاپی بنا دیا جائے؟ ستم گروں کا اصل مطالبہ یہی ہے۔ اردو کو آسان بنانے کی ریاکارانہ خیر خواہی کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہے۔ اور اردو کو "آسان" بنانے کا سب سے سائنٹیفک فارمولا یہ ہے کہ (۱) اس کا رسم الخط ترک کر دیا جائے (۲) اس کو فارسی اور عربی سے "در آنے والی" صوتیات سے "پاک" کر دیا جائے۔ (۳) اس کو فارسی اور عربی کے الفاظ محاورات وغیرہ سے کشید (Dist،ll) کر کے "منزا" کر لیا جائے۔ (۴) ضرورت پڑنے پر کچھ اور آسان بنانے کے لیے اردو کا ترجمہ بھی اردو میں کر لیا جائے۔ یہی تصور ہے "فتنہ کاروں" کے ہاں خالص، پاک صاف اور آسان اردو کا! — جس میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔

"زبان وادب" ۱۸ (۲-۱)

ادارہ



سید محمد عقیل

نور منزل، دریاباد، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس لیے؟

کسی نے کہا کہ تم کہانیاں لکھو؟۔ مگر تم بھی اس کے جواب میں کہہ سکتے ہو کہ کس نے کہا کہ تم ہماری کہانیاں پڑھو۔ مگر میں تو قاری اور خیر میرے پڑھتے ہوئے تمہاری کہانی بیکار ہوگی۔ آخر تم کہانیاں لکھتے ہی کیوں ہو۔ اگر مجھے پڑھنے سے روک سکتے ہو یا تمہارے لئے کوئی مقصد ہے یا یوں ہی تمہارے جی میں آئی اور تم نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ کیا ہو کہ اپنے گرد و پیش تم دیکھتے ہو اور محسوس کرتے ہو۔ وہی لکھتے ہو یا محض خیالی اور تجربے سے عاری زندگی۔ اور صرف کہانی لکھنے کا ایک نیا ڈھنگ ہی تمہارے پیش نظر رہتا ہے۔ کہانی تم لکھو، تم کہانی لکھو، مگر ہمیں بھی تو اپنے ساتھ شریک کرو۔ آخر تم کس دنیا کی باتیں کرتے ہو۔ کن کے تجربے بیان کرتے ہو اور کن لوگوں کا تم کہہ سکتے ہو کہ آخر فن اور آرٹ بھی تو کوئی چیز ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم تجربے ہی بیان کریں۔ وہ جو الف لیلیٰ ولیلیٰ۔ طرح کی کہانیاں تھیں۔ جو دیو اور پریوں کے قصے لکھا کرتے تھے، وہ بھی کس کی دنیا اور تصوراتی FANTASY تھا کہ رستے تھے اور کس کے لئے تھے۔ اور ان میں زندگی کے کون سے تجربے ہوا کرتے تھے؟ مگر یہ کہانیاں قاری کو ایسا پکڑ لیتی تھیں کہ بھلا تم انہیں شروع کر کے ختم کئے بنا چھوڑ سکتے تھے؟ یا آج بھی کیا تم چھوڑ دو گے؟ کیا زندگی اور اس کی معنویت وہ ہے جیسا کہ تم جیسے قاری سمجھتے ہیں؟ زندگی اور حقیقت زندگی کا مکمل عرفان ممکن ہے۔؟

تصور اور اس کے مختلف امکانات، زندگی کیوں نہیں؟ اگر ان تصورات کو زبان نہیں ملتی تو اس کا مافی الضمیر تلاش کرو، تم کو کہانی مل جائے گی۔ داستانوں اور الف لیلیٰ، صورتوں کو کیوں نہیں سمجھ لیتے۔ کیا دیو اور پریوں کی کارگزاریاں، زندگی کی حقیقتیں نہیں۔ ان داستانوں اور الف لیلیٰ صورتوں کو چھوڑنا ممکن نہیں، کیونکہ ان کہانیوں میں انسانی ذہن اور اس کی تمناؤں کا سب سے بڑا اظہار ہوتا ہے اور وہی قاری کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ راز ہے، ایک تجسس، جو انسانی اعمال اور کارناموں کی سب سے بڑی طاقت ہے، جو آرزوؤں کو بھی لپیٹ کر چلتا ہے۔ زندگی صرف جی کر چلے جانے کا نام نہیں بلکہ نئی صورتوں کی تلاش اور نئے امکانات پیدا کرنے کا نام ہے اور انہیں امکانات کی تلاش نے زندگی کو میدان عمل میں متحرک کیا ہے اور حقیقتوں کا نیا پیکر دیا ہے جو "پھر کیا ہوا" کی چاہ میں ہوتا ہے۔ اسی کی تلاش نے قدرکاری کی کہانیوں اور واقعات کو لپیٹ رکھا ہے۔ کہانی کی روح یہی ہے جو اسے قائم رکھنے والی ہے۔ وہ جستجو ہی ہے اور باقی باتیں اس کی تزئین DECORATION کے لئے ہیں۔ اب تجسس یا تلاش کس بات کی؟ یا تو زندگی کی بصیرت کی یا انسان کے نئے امکانات کی یا پھر نئے تجربات سے نئے نتائج تلاش کرنے کا نظریہ یا چاہے دیو پریوں کی کہانیاں، الف لیلیٰ کے قصے، میر امن کی داستانوں، یا طلسم ہوشربا کے واقعات، سب زندگی کے امکانات اور انسان کی قوت فکر و عمل کا اظہار ہیں اور پھر اس کی "انہونی" کے "ہو جانے" کی تمنا، قاری اور سامع کو واقعات میں پکڑے رہتی ہے۔ اور پھر ان کو سنتے اچھے برے نتائج کی تلاش۔ اچھے برے نتائج جو ایک موجود سماج کے حلال و حرام اور ایجاب و انکار TABOO سے آتے ہیں۔ یا پھر وہ جو UNIVERSAL ہیں جو زندگی کی بصیرت ہے اور انسان کے جمال و جلال کی تفتیش۔ حضرت امیر خسرو نیکی کی علامت ہیں تو ان کے واقعات میں قاری خسرو نیکی اور راہی کامیابی تلاش کرے گے۔ ان کا طرف دار رہنا چاہتا ہے جیسے کہ

حیات جاوداں، احتشام الدولہ، فولاد اور ملک احمر گو ہر بے بہا، بدی اور آخر کار شکست کی علامتیں ہیں۔ اور پھر قاری ان کا مخالف ہو کر ایسی مدد میں NEW AGE جیسے سمجھنے لگتا ہے اعمال کی ہزیمت پر تالیاں بجاتا ہے اور اگر یہی اعلیٰ دیں قیصوں کو دیتی کامیابی ملی تو تشکر نظر آنے لگتا ہے۔ تاہم ان کے ہر عمل میں ان کے ساتھ ساتھ چلنا مجبور بنتا ہے۔ راقم الحروف نے ایسے مناظر بھی دیکھے ہیں جہاں کسی بیٹھک میں دس یا پانچ آدمی بیٹھے ہوئے، انہیں گھیرے رہتے ہیں اور داستان گو، طلسم ہوش ربا پڑھ رہا ہے۔ یا اس کا کوئی قصہ بیان کر رہا ہے۔ اگر عمرو عیار کسی ساحر کے کریا میں پھنس جاتا ہے تو سب انہیں چھوڑ کر دست دعا بلند ہو جاتے ہیں اور جب عمرو عیار، ساحر کو مار کر اس کے سحر سے نجات پاتا ہے تو سب شکر کا سجدہ بجا لاتے ہیں اور پھر خوش ہو کر انہیں کی چسک لینے لگتے ہیں جو ان داستانوں کا ذہین قاری، صرف مسکرا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ابھی ایسے گھرانوں کے کچھ پرانے افراد موجود ہوں گے۔ جہاں جب طلسم ہوش ربا پڑھی جاتی تھی تو گھروں میں عورتیں کھانا پکانا چھوڑ کر داستانوں میں گم ہو جاتی تھیں اور بازار سے کھانا منگا کر کھا لیا جاتا تھا۔ آخر یہ محویت کیوں؟ اور کیسی؟ پھر نیک کرداروں کے ساتھ قاری کا کو اپنی پسند اور قدروں کی تسکین ملتی تھی مگر بد کرداروں کی پیش کش اور ان کے انجام کی بھی انہیں کیوں فکر رہتی تھی؟ افراسیاب اور تاریک نسل کش کے بد کرداروں میں بھی قاری کی دلچسپی کیوں؟ بات یہ ہے کہ وہ قاری کے لیے ریلیف، بھی تھے اور ولن بھی اور ولین کو اپنے کیفر کردار کو پہنچنا ہی چاہیے۔ تجسس کا اتار چڑھاؤ اور پھر بقول غالب نطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ یہی ایک سبب تھا اس کو بھی غور کیجئے کہ ایک خاص دور کی سوسائٹی نے جو اچھے اور برے معیار، زندگی کے لیے بنا رکھے تھے، ان کا کیا ساتھ دے سکتے۔ جیا چاہیئے کہ کامیابی اور ناکامی پر ہر دور کے قاری کی نظر رہی ہے۔ وہ ان کارگزاری کی نظر سے بھی آنکنا رہتا ہے کہ کیسے اپنی زندگی کی تعمیرات اور پیچیدگیوں کو کہانی نے کہاں تک پکڑا ہے اور پھر ان کا حل کن راستوں سے تلاش کیا ہے اور یہ حل کہاں تک حقیقی زندگی میں ممکن ہے؟ کیا یہ انسانی زندگی کے عمل و ارتقا کی تصدیق اور وضاحت بھی کرتے ہیں؟ سوسائٹی میں ایسے افراد ہو سکتے ہیں جو خیر کو سادگی اور ناکامی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور شر کو چالاکی اور کامیابی سمجھتے ہیں اور اس طرح قوس کا یہ رائے WRZA ME AD کے ذریعے کی نمایاں غور سکتا ہے۔ مثلاً آج کے افسانہ نگار کی ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ وہ آج کی زندگی کے خیر و شر کی صحیح درو تعبیر کس طرح کرے؟ بیشمار دوں کی سوسائٹی کے خیر و شر، مار دھاڑ، قتل و غارت گری، ہر روز ہی جیسا سرکوں سے موٹر کار بیچ کے اخلاقی جواز اور کسی گھوٹ برداشت میں مادیت کی راہیں تلاش کرنا، اسمگلنگ، دھوکہ دھڑی اور تمام ساریوں کو کامیاب سمجھے والی سوسائٹی کے معیاروں کو کس طرح چھان پھٹک کر دیکھئے اور پھر کیا بیان کیجئے وقت، کس مشق کے معاد کا خیال رکھئے اور کہاں اپنے ضمیر کی آواز کے ساتھ چلے۔ پھر کہانی کار کی ذمہ داری کیا ہوتی؟ کبھی کبھی صاف گوئی اور ضمیر کی آواز جنگی پڑتی ہے اور کہیں کچھ برداشت بھی کرنے کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ گلیلیو سے لے کر جیسے غالب اور منٹو سے لے کر کرشن چندر تک یہ صورتیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں

پھر سوسائٹی سے اور بلند ہو کر، پوری قوم کی تصدیق اور خاموشی یا مسطوری بھی آڑے آتی ہے۔ عارضی ڈپلومیٹیک ڈاکومنٹس کی تخلیقات کا ماحصل قوم کی کمزوریوں اور شاہی محل سرائے کی عیاشیوں کے اظہار کے لیے، سرائے کی طرح پر، اگر یہ فساد کی تاریخ میں کوئی جگہ نہیں مل سکی۔ تو کہانی کار اور ناول نگار کا ضمیر آزاد ہو کر بھی خاموش رہتا ہے۔ آج ان تمام باتوں سے بچنا آسان نہیں۔ پھر کہانی کار کے پاس صرف تفہیم اور اظہاریت ہی کا راستہ ہے جس سے وہ سوسائٹی کے مزاج کا تماشا بھی جانتا ہے اور اس میں تبدیلی لانے کی استطاعت اسے حاصل ہو سکتی ہے اور اس طرح، وہ اپنا نقطہ نظر بھی بیان کر سکتا ہے۔ اردو میں حد درجہ علامتی کہانیاں صرف آج تک لکھی گئی ہیں۔ ان کے مصنفین، میں اپنے لیے لکھتا ہوں، میں سب کے لیے لکھتا ہوں، میں کسی کے لیے نہیں لکھتا۔ میں صرف تجربے کے لیے لکھتا ہوں اور میں صرف لکھنے کے لیے لکھتا ہوں جیسے تمام مفروضات اور عمل یعنی پریکٹس سے گزر چکے ہیں۔

ان تمام صورتوں میں بہت سی کہانیاں لکھی گئیں اور علامتی کہانیوں میں کچھ اچھی اچھی کہانیاں لکھی بھی گئیں مگر زیادہ تر علامتی کہانیوں کو سرا دکھائی نہیں ملتا۔ کچھ کہانیوں کی شارحین نے ایسی ایسی تعبیریں کی ہیں کہ شاید، کہانی کار کے حاشیۂ خیال میں بھی وہ بات نہ رہی ہوگی جیسے انور سجاد کی کہانی گائے۔ یا رشید امجد کی کہانی "سمندر شوالہ" پر فرمان کا ایک نمونہ جس کے لیے یہ کہ "مرکزی قوت رعامی توجہ کا نتیجہ ہے...... جہاں پر عقلیت کی ہر تمنا کا ایک در مسدود ہے اور ایک اجاڑ پن کا احساس جنم لیتا ہے۔" انور سجاد کی کہانی گائے کی بھی تعبیرات عجیب عجیب طرح سے کی گئی ہیں۔ کچھ اسے پاکستان میں فوجی حکومت کے خلاف احتجاج کی کہانی بتلاتے ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ یہ کہانی پاکستان کی بدلتی ہوئی تہذیب کی کہانی ہے، کچھ اسے نئی نسل اور پرانی نسل کی آویزش کہتے ہیں۔ یہ تقسیم ہند کی بھی کہانی ہو سکتی ہے کہ اگر ہندوستان سمجھ لیا جائے تو گائے، ہندوستانی تہذیب کے وہ عناصر بھی ہو سکتے ہیں جنہیں پاکستان نے نئی بنتی ہوئی تہذیب اور خصوصاً وہاں کے مولویوں کی تہذیب، دیس نکالا دے رہی ہے، کوئی کہے کہ قدامت پرستی کی علامت بھی کہہ سکتا ہے۔ جیسے اب دنیا کی پرانی تہذیب جو کہ ہیں اور کر رہا ہر چیز کو دنیا چاہتا ہے مثلاً انتظار حسین، ناصر شہزاد اور ابن انشا اور کچھ مہاجرین لئے پیچھے سے نکالے گئے ہیں وہاں کہانی کے پردے میں ماضی کی بازیافت کا مشغلہ اختیار کر یا ناصر شہزاد اور گیت کی گلو سری میں غزلیں لکھ کر، [illegible] کر خود کو تہذیب کے تحفظ کا دعوے دار ہے۔ غرض کہ علامتوں اور تعبیرات کا کوئی انت نہیں ہے۔

بھائی دیتے ہیں، یہ کیسی عجیب چیز ہوتی ہے۔ کہانی میں سر تک اور واپس لوٹ آتا ہے تو پھر ایک ہیں اور بیانات کا حاصل ؟ پھر خود لیا کہانیوں سے دیکھتے ہیں۔

① میں نے دیکھا گرد اڑاتی سیہ راہ پر گاڑی کا ہیولا ابھر رہا ہے۔ سفید بیل جن کا نکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے ہیں اور ناکوں میں موٹے رسے اور سیاہ گھونگھرو، ٹیلی چادروں کے جھکوں میں چہرہ چھپائے، نیم خوابیدہ گاڑی بان جوش پر ہی کا تھی، جوتی، دکھ، دہشت بھری مہک کی ہر وقت قربت سے بے ہوش رہتے ہیں اور ان کے پیچھے سیاہ پردے۔ ایک لرزش، مجھے سرسے پاؤں تک رونگی گئی۔ تینوں بدنیتوں کی آنکھوں سے چمک رخصت ہو گئی۔ جیسے وہ موت کے قریب ہوں۔ گاڑی آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ گاڑی بالکل قریب آ گئی یہاں تک کہ ہمارے برابر سے گزر گئی۔ گاڑی بان ان کے چہرے چادروں میں چھپے تھے۔ اور سیاہ پردے (جاڑ ادبی) مدہم ہوا سے ہلنے کے باوجود نہ ہلتے تھے۔ اچانک وہ تینوں اس گاڑی کے پیچھے بھاگے اور ایک ساتھ انہوں نے پردہ اٹھا دیا۔ ان کے سر پردے کے بیچ سے گئے مگر پردہ اٹھنے کے باوجود ذرا بھی نہ ہلا تھا۔ دوسرے لمحے ایک دہشت زدہ لرزاں تیز چیخ کے ساتھ وہ تینوں بیٹھے اور دیوانوں کی صورت دیہات کی طرف بھاگے۔ "تم نے کیا دیکھا؟" "تم نے کیا دیکھا؟" میں ان کے پیچھے بھاگا مگر وہ بھٹی بھٹی آنکھوں کے ساتھ بھاگتے رہے۔ "بولو" "بولو" میں نے ان کی منت کی مگر وہ بھاگتے رہے یہاں تک کہ میں بھی ان کے ساتھ بھاگتا بھاگتا شہر کے کوسوں دور نکل آیا۔ "مجھے بتاؤ مجھے بتاؤ" آخر میں نے ایک شخص کو جا کر پکڑ لیا۔ اس نے پتلی پتلی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا منہ کھول دیا۔ اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چکی تھی۔ وہ تینوں گنگ ہو چکے تھے۔ میں چکرا کر گر پڑا مگر وہ تینوں بھاگتے رہے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے پیچھے گرد اڑتی رہی۔ پھر وہ بھی بیٹھ گئی اور میں گھر لوٹ آیا....... اسی دن سے گاڑی نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ اب وہ شہر سے نہیں گزرتی — پل سے ہو کر کچے میں اتر جاتی ہے اور مضافات کا رخ کرتی ہے۔ اہل شہر اس دکھ، دہشت بھری مہک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کا محض ایک لایا کرتیں۔ بھولی بسری کہانی کی طرح۔ مگر میں، اب بھی ایسا اپنے جسم میں اترتا جاتا ہوں اور کوئی دن رات میرے اندر ہوتا ہے "اب تمہاری باری کا جواب تم دیکھو گے" اور آج میں اسی پل پر آن کھڑا ہوا ہوں — اس سواری کے انتظار میں"

(سواری۔ خالدہ حسین۔ مجموعہ پہچان)

② جب تم یہاں تک آگئے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دوسرے راستے پر چل رہے ہو، ورنہ تم تیسرے راستے پہ جاتے اور مجھے دیکھ میں نے روزن نہیں کھو دا تھا۔ آج کوئی منزل نہیں لاحق ہے۔ بس کچا راستہ ہے۔ پڑ کون اور وا ضح — تو یہ تعویذ کھولو اور گزر جاؤ۔ اگر خدا سا۔ اسی لیے کہ اب تمہاری واپسی ناممکن ہے کیونکہ تمہارا نقش قدم بھی مٹایا جا رہا ہے جو کہ اسباب تمہیں اکیسویں منزل پر معلوم ہوں گے کہ ہکار نے وقت مقرر کر رکھا ہے۔

وہ بہت تیز بھاگتا وہاں سے گزر گیا اور کئی منزل آگے آنے کے بعد جب اس تعویذ کا خیال آیا تو کھول کر پڑھنے کی خواہش ہوئی۔ لیکن اس شخص نے تو منع کیا تھا کہ کھولنا نہیں ورنہ اثر زائل ہو جائے گا۔ نہ جانے وہ کون شخص تھا۔ سرمد تھا یا کوئی اور۔

جب اس نے تعویذ کھولا تو اس میں لکھا تھا

ہوزا ایسم نہ مزدان ہنر ہنر ماس دزماس
ہر شیور ہر دیور نہ شید سفتا تے ہر شندہ
ہر ستگر زمریاں زد ہیدد

شام	کا	دیپک	جلا	مَن	کا
دیا	بجھنے	لگا	یا	ریوس	شام
کا	دیپک	تھا	سن	کا	دیا

یہیں سے اس نے تیری تباہی میں قدم رکھا۔ یعنی جب وہ دشت قراقرم وا ضح ہو کر قراقرم ایک پہاڑ ہے دلدت نہیں کو عبور کر کے ۱۱ ویں منزل میں آگیا تو احساس ہوا جیسے اس کے پیچھے کوئی گھسٹ رہا ہو۔ اس نے یہ سمجھ سوچا کر چونکہ میں اتنی دور پہنچ آیا ہوں، اس لیے اس بار تو میرے نشانات وا ضح ہوں گے لیکن جب مڑ کر دیکھا تو لاتار چیونٹوں سے دو مردوں کی نیندیں اچاٹ ہونے لگیں۔ نہ جانے کس منزل سے ایک لاش اس کے ساتھ گھسٹتی آ رہی تھی جو اس کے رک جانے کے بعد بھی گھسٹ رہی تھی۔

[ہوزا ۔ میم ۔ فیروز فخر احسن]

(۲) سلسلہ چیتا ہوا تھا سے پہلے گزرے گی ۔ گھلے کمان تھے ۔ ہم ان چلتے ہیں ، ان گنت نقد گھر بیٹھا ۔ تاریخ جغرافیہ دیوبالا ، کہیں بھی خون کے رشتے تھے اور دل کے معاملات ۔ بیکار شام تھے ۔ بکر ترو کا پھول ، بھوک تھی اور فرش پا بیابان جیتے جیتے رود بیس شاعری تھی اور روستے روستے جس دنیا کمائی ۔ یہ پہننے سے پہلے جوہ ت ۔ بھرو دوپہر ، قیام اور شام ڈھلے ، ویران ہیں ۔ کبھی قدم تھا کہ آئینہ نہ کئے تم کی تصویر پر بیٹھے اور کبھی رو گئے تم کیے لمبے بال ، پریشان ، سیاہ بالوں میں سورج کے ذرے ۔ بازوؤں پر پھیلے ہوئے کا ہلکا سا دباؤ ۔ موسم سرما کی دھوپ ۔ بیوں کا لمس ، الاؤ کی آنچ اور میدان کا خواب ، بارشوں اور نمیدہ بارش کا مکھڑا ـــــ زمان و مکان کی ایسی سازش کہ جس کا میں شکار تھا ، کہ جس میں میں شریک تھا جو ہر یک وقت سازش کا شکار اور سازش میں شریک تھا ۔ لفظوں کو معنی نہیں پہنچا سکا جو ون سے تھے ۔ گرما ، سرما ، خزاں ، بہار کے گرد چکر کاٹتے رہے ۔ موسم جو لفظ تھے ، معنی نہ تھے ۔ سازش کا شکار جو تھا ساتھ ہی شکار میں تھا اور سازش میں شریک یوں تھا کہ میں نے اس حصار کو توڑنے کی کوشش نہ کی ۔ وہ دن بوس پہ صوتی و شرف بیسودوں کے دن تھے ۔ [آخری کچھ زیست ۔ جراح مینرا]

(یہ کہانی بھی ، دوسری نادر تحریروں کی طرح اشاعت ہوں [الہ آباد] میں بڑے اہتمام سے شائع کی گئی تھی اور دونوں دولی نمبروں میں ، اس کہانی کے بڑے چرچے تھے ۔)

کیا یہ حقیقت ہے کہانی کی کسوٹی کو متعین کرتی ہیں ؟ یا کہانی کوئی نئی کسوٹی جانتی ہیں ۔ ؟ تو وہ کون سی کسوٹی ہے ؟ آخر کہانی یا انسانی زندگی سے ، ان کا کیا تعلق ہے ؟ پھر تخیل کو بھی یہ کہ متعین کرتی ہیں ؟ فینٹسی FANTACY اور خیال کی اڑان سے یقیناً انسان کی مدد کی ہے ۔ ذہن کی یہی صورتیں ، ہوائی قلعے تعمیر کرتی ہیں ۔ مگر یہی ہوائی قلعے انسانوں کو سوچنے پر مجبور کرتے رہے ہیں کہ کیا ان ہوائی قلعوں کو بھی راہ عمل مل سکتی ہے ؟ ـــ

اور اگر انہیں راہ عمل مل گئی تو یہی ہوائی قلعے زندگی کی حقیقت بھی بن جاتے ہیں ۔ طلسم ہوشربا میں افراسیاب جادو کے سامنے ہوئے طلسم تھے ، جب تمام کام کرتے تھے تو قارئین اور سامعین انہیں محض خیالی اور ایک ناممکن العمل چیزیں سمجھتے تھے مگر جب انہیں خیالی صورتوں نے آج روبو ROBOT کی شکل اختیار کر لی ۔ اپنی بیٹھے میں گیس کے غبارے باندھ کر ، گوشت و پوست کے انسان کھلی ہوا میں آسمان میں پرواز کرنے لگے اور قلابازیاں دکھانے لگے اور خلائی " اسپٹنک " ، اپلس جب چاند ستاروں میں پہنچنے لگے ، تو تخت پر ربرجد پر سوار ہو کر عمرو عیار کا اڑنا ، حقیق اور عملی دنیا کا کارنامہ معلوم ہونے لگا ۔ طلسم ہوشربا کے جادوگروں کا زمین میں ڈوب کر زمین کاٹتے ہوئے چلنا ، کس قدر محیر العقول اور ناممکن العمل معلوم ہوتا تھا ۔ لوگ اسے محض زیب داستان سمجھتے تھے ۔

مگر آج زمین دوز ریلوں اور کوئلے کی کانوں میں کام کرتی ہوئی مشینوں نے ان تمام محض خیالی باتوں کو حقیقت بنا دیا ہے ـــ کیا یہ انسانی ذہن کے تخیل اور عمل کی کارفرمائی نہیں ہے ؟ مثالیں اور بھی ہو سکتی ہیں مگر چیز لیکن ان تمام خیالات اور فینٹسی نے کبھی تفہیم کا دامن نہیں چھوڑا کہ یہی تفہیم اور توجیہات تو خیالات کو حقیقت کا روپ دینے میں مدد کرتے تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ ان باتوں سے خفا ہو کر تجریدی افسانے لکھنے والا کوئی ہمارا افسانہ نگار تن کر کھڑا ہو جائے اور کہے کہ جب زبان اور لکھنے پرانے مفہوم تک منتقل ہونے کے اصول ختم ہو چکے ہوں گے اور زبان اپنی تفہیم اور رسل و رسائل کے نئے اصول بنائے گی اور واقعات سننے یا پڑھنے کے بجائے صرف دیکھنے VISUAL کی چیزیں رہ جائیں گے ۔ کیونکہ جس طرح سمعی اور بصری AUDIO VISUAL تجربے اور امکانات بڑھتے جاتے ہیں ، شاید کچھ دنوں میں لکھنے پڑھنے کا کام ہی ختم ہو جائے ۔ جب پورا ناول چند کیپٹوں میں قید ہو جائے گا تو کوئی رکتا ہی کیوں چھپوائے گا اور کوئی کتابوں کا اتنا بڑا بوجھ کیوں اٹھائے پھرے گا ۔ تب ان تجریدی افسانوں کی زبان اور ان کا مافی الضمیر محض آواز کے اختصار اور بلندی سے اپنا مفہوم ادا کر جائے گے اور تب ان افسانوں میں تحریر شدہ باتیں صرف تصویروں کے پس منظر سے ابھاری جائیں گی اور تب مجبورۃً العزیم ، ذریعہ پرکاش کا افسانہ تلقارمس ، ہوزہ ، میم ، فز ، چپ چڑھانگ ، بچھو ، غار ، نقش (انور سجاد کا افسانہ) مٹی کے گھوڑوں والی بگھی کا پہیرا (مرزا حامد بیگ کا افسانہ) سب کا دھیان ای نظام " اور اس کی " شیزد زینیا " وغیرہ سب اپنا طلسم در بند " کھول دیں گے ۔

لیکن دنیا کی کوئی فکر یا تجربہ ، جو عام انسانوں کی مشترک ذات کو اپنے ساتھ نہیں لیتے ، وہ عام انسانوں کی دلچسپی کا سبب کبھی نہیں بنتے ۔ عام انسانی سوسائٹی ، ہر فکر ، خیال اور تجربے میں اپنے تجربوں اور سوچ کی تصویر دیکھنا چاہتی ہے ۔ اور جب تک ، یہ مشترک صورت کسی طرز تحریر میں اسے نہیں ملتی ، ایسے تجربے کبھی پسندیدہ نہیں ہو سکتے ـــ اسی لیے افسانے کی نئی نسل نے ایسے افسانوں اور ایسی افسانوی " حکمت " کو شاید باہر کر دیا ہے اور اپنی زمانی تفہیم اور زندگی کے نئے مسائل کے ساتھ آگے بڑھے گا ۔ یہ آگے بڑھنا ہی زندگی کی دلیل ہے اور زندگی سے محبت بھی کیونکہ خیال کے آگے بڑھنے کے ساتھ ، زندگی بھی بہتر صورتوں کے تقاضے لے کر آگے بڑھتی ہے ۔ ماضی تو صرف تاریخ بن جاتا ہے ۔ لیکن مستقبل تاریخ بناتا ہے اور انسانوں کے لیے کسی بہتر دنیا کی تعمیر کی فکر کرتا ہے ۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ

ان سے بھی آج کی زندگی کے تناظر اور اس کی لایعنیت اور پیچیدگیوں کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ آج "تجریدی" کی بھی مختلف صورتیں بن گئی ہیں اور "رمز" میں بھی ان گنت قسمیں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ کہانیاں بھی ایک الجھی ہوئی ملی کرنٹ زندگی کی کہانیاں ہیں اور نئی زندگی کی پر اسراریت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کچھ برا نہ تھا۔ مگر سارا مسئلہ تو اظہاریت کا ہے اور تجرید میں کی حقیقی زندگی سے ان کا تعلق۔ یہ صحیح ہے کہ سماج میں سب کچھ اچھا اچھا ہی نہیں ہوتا رہتا۔ لیکن خراب پوزیشن میں بھی اچھی کہانی لکھی جاتی ہے۔ ایجابی بھی، اختلافی بھی۔ مگر تلاش اور گرفت، تجسس کے عنصر کہاں ہاتھ آتے ہیں۔ تجسس، واقعات اور حالات کا جبر کہانی کے فن کی نادرہ کاریاں متعدد ہوتی ہیں اور نادرہ کاری ناقابل تقسیم علامتوں سے نہیں پیدا ہوتی۔ زندگی کا نیا پن حسن کا معیار بدلتا ہے اور اس کی بالغ اور شعوری گرفت، کہانی کی نئی صورتیں پیدا کرتی ہے۔ پریم چند نے جب حسن کے معیار کو بدلنے کی بات کہی تھی تو وہ بھی یہی تھی کہ جاگیردارانہ نظام اور پونجی واد نے جو حسن کا معیار، اپنے مفاد اور لطف کے لئے بنایا تھا اس سے الگ ہٹ کر آج کی اصلیت کو تلاش کرو۔ اس حسن کا بھی ادراک کرو جو مجبور طبقے کے محنت مزدوروں میں ہے، یہ حسن محلوں اور محفلوں کے حسن بیمار سے الگ اور کہیں زیادہ "تیز" ہے اس حسن کی "تلاش، ضروری ہے۔ کہ یہ ایک نئی طاقت ایک نیا جذبہ اور نئی "تلاش" ہے جو اپنی عصری زندگی کے سنے رنج کا ادراک ہے۔ یہی حسن کی نئی قدر و قیمت ہے کہ اس زندگی میں بھی خوابوں کی ایک دنیا بستی ہے۔ اس دنیا اور اس کے مسائل کو دیکھنا بھی نئے کہانی کار کا فرض بنتا ہے۔ کہانی کا تجسس صرف یہ نہیں کہ قاری ایک خواب سے چونک کر دوسرے خواب میں جلا جائے۔

یا ریل کی پٹریوں کے نیچے، ایک بزرگ نماز پڑھتے ہوئے ملیں اور قاری دریائے حیرت میں غوطہ کھانے لگے یا پھر ایک برج کے اوپر آئے اور دوسری سے نیچے جاکر کنویں کی تہہ میں پانی کا منبع تلاش کرنے میں لگ جائے۔ کہانی کا تجسس ان واقعات کا ڈھونڈھنا بھی ہے جو اپنی سیاسی فتح اور کامرانی کے لئے، انسانوں کی لاشوں کو کھیتوں میں بیج کی طرح آخر کس لئے بو رہی ہیں اور ایسا کرنے میں ان کی کس ذہنیت اور سیاست کا اظہار ہوتا ہے۔ ان چھپے ہاتھوں اور گھناؤنی سازشوں پر کہانیاں لکھنا کیسے نئے کہانی کار کا فرض نہیں ؟ کیا فرقہ واریت کی نئی لہر کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہندوستانی قوم اس کے لئے سبب اور الجھنیں ہمارے کہانی کاروں کا مسئلہ نہیں ؟ شاید ہمارے افسانہ نگاران باتوں کو لحاقی سمجھتے ہیں اور جو چیز وقتی اور لمحاتی ہو اسے بہت سے لوگ ادب نہیں سمجھتے۔ اگر ملک میں ہونے والے یہ واقعات، جو ایک گٹھے WELL KNITT سماج کے انتشار کا سبب بنے ہوئے ہیں ہمارے ادب اور ادیبوں کا مسئلہ نہیں تو پھر، موضوع تمہاری کہانی کا کیا ہوگا ؟ یہ جو نئی مکلوف تہذیب سے زندگی کے عدم تحفظ اور آتنک واد کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں کیا یہ تمہاری کہانیوں کا مسئلہ نہیں ؟ کیا آج کی زندگی کو عقل میں بدلنے والوں کے چہرے سے نقاب ہٹانا، جدید دور کا تجسس نہیں ہے۔ ؟ کیا بمبئی، گجرات، کانپور اور کلکتہ کے قتل عام میں مرنے والے انسان، تمہاری کہانیاں نہیں۔ کہانی کارو ! یہ نہ بھولو کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب تمہاری سماجی تاریخ بھی ہے جسے آواز چاہئے۔ بھرمانہ خاموشی نہیں، عزم و ہمت چاہئے خوف کا پرچار نہیں، درد کا شعور چاہئے، جو دہشتا کا بھوروں سے بھرا کنڈلی نہیں۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہے جس میں ملک کا پورا کردار داؤں پر لگا ہوا ہے ہزاروں سال کی مشترکہ تہذیب معرض بحران ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہے جس میں اس گنگا جمنی تہذیب کے تار و پود بکھر رہے ہیں۔ ان صورتوں کو اپنی کہانیوں میں سمیٹ لو اور اپنے فیصلے کی آواز کو تیز کرو اور اپنے اشاروں کی سمتیں واضح۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ وقت آجائے، جب تم کو اس کی اجازت بھی نہ ملے کہ تم اپنے محسوسات کا اظہار بھی کر سکو۔

نازی جرمنی کے ادیبوں کی طرح اور تمہارے دیکھنے کے لئے صرف حکومت کی آنکھ رہ جائے یا پھر تم کنسنٹریشن کیمپ میں پہنچ جاؤ، جہاں تمہارے محسوسات اور تمہاری آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ کنویں کے اندر سے کیا آواز آرہی ہے ؟ سواری کے انتظار میں کوئی خوف سے پیلا چہرہ بنائے اپنے وجود کی لایعنیت تلاش کر رہا ہے، سورج سے اپنا کندھا تلاش کرنے میں جٹے ہوئے ہو۔ مگر یہ تمہارے اپنے سماج اور دور میں جو موت کے کنویں بنا رہے ہیں، جو کیسی چہروں میں انسانوں کو ڈالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، جو استحصال اور اقتدار کی تھی کا بازار گرم ہے، وہ تمہیں دکھائی نہیں دیتا ؟ فرقہ پرستی کی آگ میں جلتا ہوا ہندوستان، پاکستان میں مہاجروں کے مسئلے اور عالمی گدھ بازیاں کیا تمہیں کیوں نہیں دیتے ؟ اگر ان باتوں کے لئے تمہارا دل نہیں دھڑکتا، تمہارا قلم متحرک نہیں ہوتا، انسانوں کے یہ غم اور یہ مسائل، کبھی متاثر نہیں کرتے جو برصغیر اور عالمی افق پر ایک مستقل مسئلہ بنے ہوئے ہیں تو پھر نہ زندگی تمہارا مسئلہ ہے، اور نہ آرٹ، نہ انسان۔ تم پھر کس کی کہانیاں، کس لئے اور کس کے لئے لکھ رہے ہو۔ ؟ ❀

"شاعر" مارچ ۹۴ء

پنڈت نہرو کی نگاہ میں ہندوستانی مسلمان

۱۹۵۳ء میں ہند کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے وزرائے اعلیٰ کو ایک خط لکھا تھا جس میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کے متعلق اندیشوں کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ یہ خط جوں کا توں ہم یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

نئی دہلی، ۲۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

مائی ڈیر چیف منسٹر!

میرے ساتھی وزیر داخلہ، ڈاکٹر کاٹجو آپ کو الگ سے ایک نوٹ بھیج رہے ہیں جو ہندوستان میں عدالتی نظام کی اصلاح بارے میں ہے، یہ نوٹ اس مسئلے کو حل کرنے کی ایک ابتدائی کوشش کی ہے اور اس پر تفصیل سے غور و خوض کرنے سے قبل ہم .کی رائے جاننا چاہتے ہیں، عدلیہ کے ذمہ داروں اور دوسرے متعلقہ افراد سے بھی ہم صلاح و مشورہ کریں گے۔ تاہم مشاورت سی طویل عمل سے گذرنے کی خواہش نہیں ہے، کیونکہ ایسی صورت میں بہت تاخیر ہو جائے گی، اور ہم جلد اس کو کرنا چاہتے ہیں ندہ نومبر کے پارلیمنٹ کے سیشن میں اس سلسلے میں ایک بل پیش کرنے کی ہم ہر ممکن کوشش کریں گے۔

میرے دل میں جو چند اندیشے سر اٹھا رہے ہیں ان میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ اقلیتوں سے

متعلق ہندوستان میں صورت حال کچھ لمحاتے بگڑ رہی ہے اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا آئین اچھا ہے اور ہم اپنے قوانین و ضوابط میں کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کرتے، مگر انتظامیہ کے طریق کار افسروں کے طرز عمل سے دبے پاؤں ایسی تبدیلیاں آرہی ہیں جو ان قوانین و ضوابط پر اثر انداز ہوتی ہیں، اکثر یہ تبدیلیاں جان بوجھ کر نہیں کی جاتیں، مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق ہے عام طور پر اقلیتوں کی نمائندگی کا تناسب کم ہے اور کچھ جگہوں پر دراصل کچھ زیادہ ہی کم ہے، یہ درست ہے کہ ملک کے بعض ممتاز عہدوں پر اقلیتی طبقوں کے لوگ فائز ہیں، اور ان ہی میں سے خارجہ سکر میں بھی اعلا مناصب پر کام کر رہے ہیں لیکن جہاں تک مرکزی حکومت اور بعض دوسری جگہوں کے اعداد و شمار کا تعلق مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی ہے کہ اقلیتوں کی حالت بہت خراب ہے خصوصاً مسلمانوں کی اور بعض جگہ دوسروں کی بھی۔

ہماری دفاعی خدمات میں بمشکل کوئی مسلمان باقی رہ گیا ہے۔ دہلی کے اتنے بڑے سنٹرل سکریٹریٹ میں معدودے چند مسلما ہیں، شاید صوبوں میں صورت حال کسی قدر بہتر ہو، مگر بہت زیادہ نہیں جس چیز کا مجھے زیادہ احساس ہے وہ یہ ہے کہ اس صور حال کو سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں کی جارہی ہے، اگر اس صورت حال کو روکا نہیں گیا تو اور زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

ہمارے لئے یہ کہنا بہت آسان ہے کہ تقرراں کے سلسلے میں ہم کسی فرقہ وارانہ اور ایسے ہی دوسرے احساسات سے بالکل کا نہیں لیتے ہیں، فرقہ پرستی اور اس کے طریق کار کا ... حامی نہیں ہوں، اور میرے نزدیک ہندوستان میں یہ انتہائی خطرناک ذہنیت ہے جس کا ہر محاذ پر مقابلہ کرنا چاہئے، اس کے ساتھ ہمیں یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ ہندوستان جیسے وسیع اور مخلو آبادی کے ملک کے تمام علاقوں اور تمام فرقوں میں توازن کا احساس، نیز منصفانہ سلوک اور خوش آئند مستقبل کی ضمانت دی جانی چاہئے، اگر کسی بھی توازن کو بگاڑنے کا رجحان ہو، یا ایک پہلو کو دوسرے کے عوض ابھارا جائے تو اس کا نتیجہ مختلف بڑے گروہ کے درمیان توازن کی کمی بے اطمینانی اور مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

بالکل ایسا ہی ہو رہا ہے، اور یہ اچھی بات نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق ہے ہمیں اس غلط رجحان کو روکنے کے لئے خصوصی کوشش کرنی چاہئے، اگرچہ سرکاری ملازمین ہندوستان کے نظام کا ایک اہم جزو ہیں مگر جس صورت حال سے ہم دوچار ہیں وہ سرکاری ملازمتوں سے بھی زیادہ اہم اور وسیع ہے، ہمارا فرض ہے کہ ملک کے ہر فرد اور ہر طبقے میں یہ احساس پیدا کردیں کہ وہ ایک دوسرے کے شریک کار ہیں، نیز وہ فوائد اور مواقع میں بھی مکمل طور پر حصہ دار ہیں، یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہم صحیح ذہنی رویہ پیدا کریں گے۔ مجھے اس سے زیادہ بیجا بات اور کوئی نہیں معلوم ہوتی کہ ہم دوسروں کو وفاداری کا ثبوت دیں" "وفاداری" کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔ یہ بالکل وہی رویہ ہے جسے دنیا کے ایک حصے میں کمیونسٹوں نے اختیار کیا ہے، اور دوسرے حصے میں امریکیوں نے۔ دونوں ہی اپنے اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق یکسانیت اور فرماں برداری کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کی وجہ سے بین الاقوامی فضا میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے، یہی طرز نظر قومی پیمانے پر بھی، لازمی طور پر ٹکراؤ کا باعث ہوگا۔ اس سے قطع نظر فی نفسہٖ یہ غلط بات ہے۔

اوپر میں نے مسلمانوں کا حوالہ دیا ہے مگر اس کا اطلاق عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں پر بھی ہوتا ہے، بدقسمتی سے ہمارے وطن میں عیسائی مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد میں تشویش کا احساس پایا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر سوچتے ہیں کہ

ستان میں ان کا مستقبل غیر یقینی ہے، ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندستان ایک مخلوط ملک ہے۔ مخلوط - بہت سے
وں میں، مذہب، رسم و رواج، زبان، طرزِ زندگی وغیرہ۔ اکثریتی فرقے کی دوسروں پر اپنے آپ کو مسلط کرنے کی کوشش
ں اندرونی کشاکش کو دعوت دیتا ہے جو کہ اتنی ہی بری ہے جتنی کہ بیرونی ہمارے لئے آج ہندوستان میں بنیادی مسئلہ،
قی اور معنوی لحاظ سے، ہندوستان کی تعمیر کا ہے، یعنی ہماری قوم کی نفسیاتی یکجہتی کا۔

میں سمجھتا ہوں کہ زبان سے متعلق رویہ اکثر بہت زیادہ خوش کن نہیں ہوتا۔ اگرچہ میرے خیال میں کچھ عرصے سے اس
کچھ بہتری آئی ہے۔ ہم ہندی کو قومی زبان بنانا چاہتے ہیں اور میرے نزدیک ایسا ہونا بہت ضروری ہے، اس کے لئے ہمیں
کرنا چاہئے لیکن اس کا طریقہ بہت اہمیت رکھتا ہے اگر یہ طریقہ درست نہ ہوگا تو ہم اپنے مقصد سے اور زیادہ دور ہو
جائیں گے، زبان کا معاملہ جذبات سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، جس نے بھی یوروپ کی
یخ کا مطالعہ کیا ہے، اسے معلوم ہے کہ وہاں زبان کے اختلاف نے دوسرے تمام مسائل سے زیادہ مشکلات پیدا کی ہیں۔ اسے
معلوم ہوگا کہ کسی زبان کو کچلنے کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلا ہے، اس تجربے کے بعد اہل یوروپ کشاکش یا دباؤ کے کسی قسم کے اظہار
بچنے کے لئے متعدد اور متنوع زبانیں تک قبول کرنے کا میلان رکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں نے بھی سرکاری طور پر کئی زبانوں
بعض اوقات ایک سے زائد رسم الخط کو اختیار کیا ہے۔

اردو کے مسئلے سے جس طرح ہندوستان کے مختلف حصوں میں عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس سے مجھے
دکھ پہنچا ہے۔ یہ سب محض تہذیبی وجوہ کی بناء پر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ سیاسی اسباب کی بناء پر ہے۔ میں
سوال کی خوبیوں میں جا سکتا تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ خوبیاں بہت وسیع ہیں، لیکن ایسے معاملات میں محض خوبیاں
اہم نہیں ہوتیں بلکہ وہ نفسیات اور ذہنی ردعمل بھی اہمیت رکھتے ہیں جو اس کے ساتھ لوگوں کی بڑی تعداد کے اندر
ا ہوتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد اردو بولتی اور لکھتی ہے، پنجاب، دہلی اور شمالی یوپی میں
سے لوگ کافی ہیں، ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے لوگوں کی خاصی تعداد ہے، خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں
حقیقت ایسے گروہ پورے ہی ہندستان میں موجود ہیں اور بعض اوقات ان کی تعداد بھی خاصی بڑی ہوتی ہے، جنوب میں
ردو لکھنے اور بولنے والوں کی تعداد دیکھ کر مجھے تعجب ہوا خاص طور پر حیدرآباد اور آندھرا پردیش کے سرحدی علاقوں میں
بھی وہاں جاتا ہوں تو اکثر لوگ میری زبان آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

یہ حقیقت بہت اہم ہے کہ ہندوستان میں اردو ایک خاص قوت کی حامل ہے اور یہ تاثر دینا کہ ہم اس کے خلاف ہیں
ت بڑی تعداد کی دل آزاری کا باعث ہوگا اور ان میں یہ احساس پیدا کرے گا کہ ہم اس چیز کے خلاف ہیں جو ان کو بہت
دہ عزیز ہے، دوسرے معاملات کی طرح اس کو اس طرح نہیں دیکھا جا سکتا کہ ہم اس کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں بلکہ یہ
متعلقہ افراد کیا محسوس کرتے ہیں یہ نہیں کہ اکثریت کیا سوچتی ہے بلکہ یہ کہ اقلیت کا ردعمل کیا ہے، اس لئے کہ ہمارا مقصد ہمیشہ
یت کے ذہن میں تکمیل آرزو کا احساس پیدا کرنا رہا ہے۔

نے ہمارے لئے غیر ملکی ہو سکتی ہے، مگر ہندستان میں اس کا استعمال صدیوں سے قابل لحاظ پیمانے پر ہوتا آرہا ہے۔ وسط ایشیا کے کچھ علاقوں اور مغربی ایشیا اور ہندستان کے درمیان یہ رابطے کی کڑی رہی ہے، اور اب بھی ہے، اس کی وجہ سے ان ملکوں سے جن کی دوستی ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، سیاسی اور دوسرے قسم کے تعلقات قائم اور استوار ہوئے ہیں۔

تہذیبی طور پر اردو ان رجحانات کی حامل رہی ہے جن سے ماضی میں ہندی کو تقویت ملی ہے اور یہ بات مستقبل میں بھی ہو سکتی ہے، یہ یقیناً ہندی کی حریف نہیں ہے، اور یہ ممکن بھی نہیں ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کی اہمیت ہندستان میں آہستہ آہستہ کم ہوتی جائے اور یہ ایک تاریخی ارتقا ہوگا، ہندی اور اردو اپنی ساخت اور اسلوب کے لحاظ سے بتدریج ایک دوسرے کے نزدیک آسکتی ہیں اور ایسا ہونا ہی چاہیے۔ ناگری رسم خط کا پھیلاؤ لازمی ہے، لیکن اس کے ساتھ اردو اور اس کے رسم خط کو دبانے کا تاثر پیدا کرنا ایک غلط پالیسی ہے، اور ہمارے تہذیبی نظریے کو محدود کرنا ہے، اور ہمارے آئینی منصوبے کے خلاف ہے۔

لیکن میں لوگوں کی بڑی تعداد پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں زیادہ فکر مند ہوں، خواہ یہ تاثر ہمیں ناواجب نظر آئے، تاہم اس حقیقت کو سیاسی اور تہذیبی دونوں نقطۂ نظر سے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ ہمیں اس صورت حال کا دانشمندی سے سامنا کرنا ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو اور اس کے رسم الخط سے متعلق موجودہ پالیسیوں کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ خاصی حد تک ہندوؤں اور دوسروں میں بھی محرومی اور ناامیدی کا گہرا احساس پایا جاتا ہے، کچھ صوبوں میں حکومت نے اردو کی حوصلہ شکنی کے لئے واضح اقدامات کئے ہیں اور ایسے اسکولوں کی مالی امداد روک دی ہے جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے بہت سے بچے اور ان کے والدین جو اردو پڑھنے کے خواہشمند تھے اب اس سے محروم ہیں، بہت سی جگہوں پر اردو کے خلاف تیز اور جارحانہ تحریکیں چلائی جارہی ہیں گویا اردو ہماری کوئی خطرناک دشمن ہے، اگر ایسا ہی ہے تو ہم انھیں جو اس کو چاہتے ہیں نہ صرف ناراض کریں گے بلکہ لڑائی پر اکسائیں گے بھی۔ میں اس موضوع پر بہت متفکر ہوں، اس لئے کہ ایسا کرنے سے میرے تمام تہذیبی معیار متاثر ہوتے ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندستان کی یک جہتی کا مستقبل بھی مجھے بگڑتا ہوا نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر اس دانشمندی کو فراموش کر چکے ہیں جس کا گاندھی جی نے اس ملک کے بعض اہم مسئلوں کو سلجھانے کے سلسلے میں استعمال کیا تھا۔ ایسا ہی اہم مسئلہ زبان کا بھی تھا اور انہوں نے اردو کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ہم پر زور ڈالا تھا، اس وقت کے مقابلہ میں اب صورت حال بدل چکی ہے اور غالباً ہم اب وہاں تک نہیں جا سکتے جہاں تک اس سلسلہ میں گاندھی جی لے جانا چاہتے تھے تاہم بنیادی فکر اب بھی ویسی ہی ہونا چاہئے اور وہ دن تو بہت ہی برا دن ہوگا جب عوامی ہنگامے اور ناجائز مخالفت کی وجہ سے اس مسئلے پر یا کسی بھی اور مسئلے پر ہتھیار ڈال دیں گے۔

قومیت کا جذبہ کسی بھی فرد یا قوم کے لئے (ذہنی طور پر) وسعت اور پھیلاؤ کا تجربہ ہے خصوصاً ایک ایسے ملک کے لئے جو غیر ملکی قبضے میں ہو، قوم پروری ایک جوڑنے والی اور متحد کرنے والی قوت ہوتی ہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آسکتا جب اس اثر کا دائرۂ کار بہت سکڑ کر رہ جائے۔ بعض اوقات جیسا کہ یوروپ میں ہوا، یہ جذبہ جارحانہ اور جنگجویانہ ہو جاتا ہے اور خود کو دوسرے لوگوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ ہر قوم اس عجیب دھوکہ کا شکار ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے ممتاز اور برتر قوم

ہے، وہ جب طاقت ور اور مضبوط ہو جاتی ہے تو خود کو اور اپنے طور طریقے دوسروں پر مسلط کرنا چاہتی ہے۔ یہی کوشش جب کبھی بھی وہ بہت آگے بڑھ جاتی ہے، اور ٹکراؤ کر گرتی ہے۔ جرمنی اور جاپان کی انتہا پسند قوم پرستی کا معاملہ ٹھیک ایسا ہی تھا۔

لیکن قوم پرستی کی ایک غیر محسوس شکل ذہنوں کی وہ تنگ نظری ہے جو ملک میں اس وقت پھیلتی ہے جب اکثریتی فرقہ خود کو ہی پوری قوم سمجھتا ہے اور اقلیت کو خود میں جذب کرنے کی کوشش میں دراصل اسے اور زیادہ الگ کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں ذات پات کے نظام اور علاحدگی پسندانہ طور طریقوں کی وجہ سے خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنی وسیع تر یکجہتی کو بھول جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

فرقہ پرست تنظیمیں شدید تنگ نظری کی ایسی واضح مثالیں ہیں جو قوم پرستی کے بھیس میں ابھر کر سامنے آ رہی ہیں، اتحاد کے نام پر وہ تقسیم کرتی ہیں اور تباہ کر ڈالتی ہیں، سماجیاتی اصلاح کے مطابق وہ بدترین ردعمل کا مظاہرہ کرتی ہیں، ہمیں ایسی فرقہ پرست تنظیموں کی ملامت کرنی چاہئے مگر بہت سے دوسرے لوگ بھی اس تنگ نظری سے آزاد نہیں۔ یہ بہت ہی عجیب بات ہے کہ ہندوستان کی وسعت، جو اپنے میں ایک پوری دنیا ہے، اپنے اندر رہنے والوں کو نہ صرف بے فکر بناتی ہے بلکہ باقی دنیا کے معاملات کے تئیں ناواقف اور تنگ نظر بھی بناتی ہے۔ ہمیں ان تمام قوتوں کے خلاف صف آرا ہونا ہے۔

کشمیر کے حالیہ واقعات سے بہت سے لوگوں کو خوشی ہوئی ہے جو شاید یہ نہیں جانتے کہ اب انہوں نے مستقبل میں ہمارے لئے مزید تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں یہ تبدیلیاں ناگزیر تھیں اور ان کا تجزیہ کرنے پر ہم ایک بہت بڑے سبب تک پہنچ سکتے ہیں یعنی ہندوستان کے بہت سے لوگوں کی تنگ نظری اور متعصبانہ نقطۂ نظر کا کشمیریوں پر ردعمل۔ میں محض جن سنگھ اور پرجا پریشد کا حوالہ نہیں دے رہا ہوں گو انہوں نے اس سلسلے میں اہم رول ادا کیا ہے اگر ہندوستان کو واقعی ایسا عظیم ہونا ہے جیسا کہ ہم سب کی خواہش ہے تو اسے اندرونی یا بیرونی طور پر کسی ایک ہی کا ہو کر نہیں رہنا ہوگا اسے ایسی ہر چیز کو ترک کرنا پڑے گا جو ذہنوں کی ترقی اور سماجی زندگی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہو۔

ایسا ہی ایک مسئلہ اور ہے جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ عورتوں سے متعلق ہے گذشتہ عام انتخابات میں میں نے خاتون امیدواروں پر زیادہ اصرار کیا تھا، میری کوششوں کے باوجود معدودے چند عورتوں کو ہی امیدوار بنایا گیا یا منتخب کیا گیا، آج ہماری سیاسی تنظیم میں بہت کم عورتیں کام کر رہی ہیں، اگرچہ ہندوستانی عورت کا معیار کافی بلند ہے اور دنیا میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں نے ہمیں زیادہ متاثر کیا ہے، کوئی بھی قوم عورتوں کو ساتھ لئے بغیر بہت آگے تک نہیں جا سکتی۔ چینی انقلاب مختلف اعتبار سے بہت اہم ہے لیکن اس کا ایک اہم پہلو جس کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم ہے وہ عورتوں کی حیثیت میں ہونے والی تبدیلی ہے اور اصل انقلاب تھا۔

ان وجوہات کے علاوہ ایک خالص سیاسی وجہ یہ ہے کہ ووٹ دینے والوں کی کل تعداد کا تقریباً نصف عورتوں پر مشتمل ہے، انہیں ووٹ کا حق دینے کے بعد ہمیں اپنے عمل کی پیروی میں ان کیلئے کچھ اور دروازے بھی کھولنا ضروری ہوں گے۔ اگر ہم ان کو یہ مواقع مہیا نہیں کرتے تو ہم گویا ووٹروں کی آدھی تعداد کو نظر انداز کرتے ہیں اور یہ انتہائی غیر دانشمندانہ فعل ہوگا۔ میں نے اپنے ذہن میں آنے والے کچھ خیالات

پتنگنی میں آپکو لکھنے کی جسارت کی ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ ان پر غور و فکر کریں۔ یہ اہم معاملات ہیں اور ہمارے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ معمول کے مطابق ہر پندرہ روز پر خط بھیجنے میں میں کسی قدر غافل رہا، یہ خصوصی خط ہے اور پندرہ روزہ خط کے علاوہ ہے جس کے بارے میں مجھے امید ہے کہ اس کا سلسلہ جلد شروع ہو جائے گا۔

آپ کا مخلص
جواھر لال نہرو

(آوازِ ملک - ۱۹۶۲/۱۲/۱۹)

"محدث" جنوری، فروری ۱۹۹۴ء

جی ایم جگنو
۱۰ حجات والی گلی کلکتہ

فرقہ وارانہ فسادات کے گھیرے میں

سیاہ ۵ اتوار ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء سے لے کر جو دس دن گزرے ان دس دنوں نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے "سیاہ باب" کا اضافہ کیا ہے۔ ان دس دنوں کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نفاق و نفرت کی راہ پر کس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ اب پیچھے ہٹنا مشکل ہو گیا ہے۔ ان دنوں میں جو کچھ ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس سے ۱۹۴۷ء کی یاد آتی ہے جب خود غرض سیاست دانوں کی مفاد پرستی نے ہندو مسلم اتحاد میں شگاف ڈال کر مفاہمت کی تمام راہیں بند کر دی تھیں اور ملک کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ایودھیا میں ایک طرف کارسیوک بابری مسجد شہید کرنے کے نام پر ملک کی یکجہتی اور عدلیہ کے دستور کو تباہ و برباد کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کے ساتھی لیڈر پورے ایودھیا میں مسلمانوں کے مکانات اور مسجدوں کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ ایودھیا جہاں مسلمانوں کے چار سو سے زیادہ گھر تھے اور جن کی آبادی تقریباً پانچ ہزار تھی اور مسجدوں کی تعداد ۳۵ تھی۔ مسلمانوں کے تمام گھروں کو پہلے لوٹا گیا اور پھر پھونک دیا گیا۔ بہت سے لوگ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بہت سے لوگ لاپتہ ہو گئے اور بہت سے لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ بابری مسجد کے انہدام کے ساتھ ساتھ ایودھیا کی تقریباً تمام مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا اور وہاں آگ لگا دی گئی۔ وہاں فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا بلکہ ایودھیا میں مسلم کشی کی گئی۔ ان واقعات کا موازنہ ہم جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کے حالات سے بھی کر سکتے ہیں جب جمہوریت پسند سوشل ڈیموکریٹ طاقتوں کی کمزوریوں کے باعث ملک میں فاشزم کا عروج ہوا اور ہٹلر اقتدار میں آیا۔ بابری مسجد کے سانحہ کے بعد ملک بھر میں جو فسادات ہوئے ہیں ان میں ۵ ہزار سے زیادہ انسانوں کو موت کے گھاٹ

آزادی [illegible] فرقہ وارانہ فسادات تو ہندوستان میں آئے دن ہوتے ہیں مگر یہ فسادات تو [illegible] ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی بن گئے ہیں۔ ان فسادات کا الزام کانگریس والے ہندو [illegible] پی کے سر نہیں ڈال سکتے کیونکہ جب کانگریس کی حکومتیں تھیں وہاں بھی فسادات کی شدت ایسی ہی تھی بلکہ زیادہ ہی تھی [illegible] جیوتی باسو [illegible] وسٹ [illegible] ٹیگرا اور مٹیابرج میں ہوائیوں کے ساتھ [illegible] کے ساتھ [illegible] ظلم ڈھایا۔ کلکتہ شہر میں جو خونریزی ہوئی اسے کئی لوگوں کو اگست ۱۹۴۶ء کی یاد تازہ ہو گئی جب ایک پارٹی کی طرف سے ایکشن شروع کرنے پر شہر خون میں نہا گیا تھا۔

ان عام فسادات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کہیں ایسا نہیں لگا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین لڑائی ہو رہی ہے بلکہ واضح طور پر پولیس نے مسلم اقلیت کو ختم کرنے کی ابتدا شروع کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ فسادات میں زیادہ تر لوگوں کی اموات پولیس کی گولیوں سے ہوئیں اور چھرے بازی میں کم لوگ مرے۔ پولیس والے پہلے بھی فسادات میں ملوث رہے ہیں۔ خواہ وہ میرٹھ کا فساد ہو یا بھاگلپور کا۔ حالیہ فساد تو بڑے وسیع پیمانے پر تھا اس لئے پولیس والوں نے بھی بڑے پیمانے پر وحشیانہ رول ادا کیا۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ راج کسی بھی پارٹی کا ہو لیکن پولیس کا کردار ہر جگہ یکساں بالکل ایک جیسا ہے خواہ وہ مدھیہ پردیش ہو کہ اتر پردیش، ہریانہ ہو کہ گجرات، مہاراشٹر ہو کہ بنگال ہر جگہ پولیس والوں کا کردار ایک جیسا ہی نظر آیا۔ رام جنم بھو

بہ ۔ جیسا جہاں مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا وہاں بھی پولیس والوں نے ملک کے دیگر علاقوں کی پولیس والا رول ادا کیا۔ مگر ننا جنم بھومی کا داور لوروفوٹی پی شکلا ایسا تھا جس نے کم از کم دو سو مسلم عورتوں بچوں اور مردوں کو اپنی جان پر کھیل کر بچایا۔ اس مہم میں اس کا ساتھ تیو تی تلی یک شخص نے دیا۔ ان کے علاوہ عام ہندوؤں میں سے تقریباً دو درجن افراد نے مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ اتر پردیش کی پی اے سی پورے ملک میں سب سے زیادہ بدنام ہے۔ حالیہ فسادات میں پورے ملک میں مسلمانوں کے خلاف لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری ہوتا رہا اور پولیس ان سارے واقعات کو اندھی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ شہر کی سڑکوں پر ظلم و تشدد کا بازار گرم دکھائی دے رہا تھا۔ فساد کے وقت پولیس جو کچھ کرتی ہے اس کی کئی وجوہ ہیں اس سلسلے میں دو تین زیادہ اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاست میں حکمراں پارٹی کے لیڈر پولیس کے کام میں بے جا مداخلت کرتے ہیں اور جب اعلیٰ حکام پولیس تعیناتی کرتے وقت اس کی صلاحیت نہیں دیکھی جاتی بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون سا پولیس افسر حکمراں پارٹی کے مفاد کی حفاظت کرے گا۔ دوسری بات یہ کہ پولیس والوں کے ساتھ سماج دشمن عناصر کا میل جول اس قدر بڑھ گیا ہے کہ بعض مقامات پر ان کالا دھندہ کرنے والوں اور پولیس والوں میں کوئی فرق ہی نہیں رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فساد ہوتا ہے تو پولیس والے فسادیوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

مغربی بنگال میں گرچہ گزشتہ پندرہ سالوں سے کوئی بہت بڑا فساد نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سی پی ایم اور اس کے کارکنوں کے ساتھ ساتھ ان کی قیادت نے کبھی ایسے حالات ہی پیدا نہیں ہونے دیئے کہ ہندو مسلم آپس میں لڑ سکیں۔ مگر بابری مسجد کے انہدام کے بعد اگر مغربی بنگال خاص طور پر کلکتہ کی صورت حال وزیر اعلیٰ جیوتی باسو کے بس سے باہر ہو گئی تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ریاستی حکومت نے اتنا بڑا سانحہ اور المیہ دیکھ کر بھی کوئی حفاظتی تدابیر نہیں کیں۔ لگتا ہے ریاستی حکومت کو اپنے کارکنوں اور پولیس پر بے پناہ اعتماد تھا۔ مگر مغربی بنگال میں پہلی جیسی بات نہیں ہے۔ پہلے سی پی ایم ورکرز انقلابی کمیونسٹ تھے جو ہر طرح کی سختیاں جھیل کر بھی اپنے نصب العین کو نہیں بھولتے تھے مگر برسوں سے اقتدار میں رہنے کے بعد اب زندگی میں زیادہ آسائشوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ اب ورکرز پارٹی ڈسپلن کے بھی پابند نہیں رہے اور انہوں نے سماج دشمن عناصر سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی ہے۔ یہی حال اب کلکتہ پولیس کا بھی ہے۔ ان لوگوں کی کمزوریوں نے مغربی بنگال میں فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ دہرا دی۔

پورے ملک میں بہار جو کہ فرقہ وارانہ فسادات کے معاملہ میں ہمیشہ سرفہرست رہا ہے وہاں ملک کے دیگر مقامات کے مقابلے میں امن رہا۔ دنگے وہاں بھی ہوتے مگر بہت ہی تھوڑے سے علاقوں میں ہی محدود رہے۔ وہاں کے وزیر اعلیٰ لالو پرشاد

یادو واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بہار میں فسادات روک کر ایک [illegible] بے پناہ جیسی کا مظاہرہ کیا اور ضلع کے حکام کو بروقت مستعد کیا ساتھ ہی سے [illegible] کو روکنے کے انتظامات کی ذاتی طور پر نگرانی کرتے رہے۔ انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ بابری مسجد کے بعد کار سیوک جب ایودھیا سے اپنے گھروں کو واپس آئیں تو [illegible] میں فساد کرنے کا [illegible] حال حکومت [illegible] [illegible] تو وہ اپنی [illegible] سکیں [illegible] میں [illegible] فساد کو پھیلنے سے روک سکی ہے۔

[illegible] کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بابری مسجد کے انہدام کے بعد ان شہروں میں ایسا ہی ہوا [illegible] بارہ [illegible] اور تشدد کے آتش فشاں کا [illegible] دھار لیا ہوتا۔ [illegible] بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات میں جو لوگ مرے ان میں ۹۵ فیصد لوگ شہروں کے رہنے والے تھے۔

بڑے شہروں میں جو لوگ مرے اور جو زخمی ہوئے ان کی تعداد کچھ اس طرح ہے۔

شہروں کے نام	مرنے والوں کی تعداد	زخمیوں کی تعداد
ممبئی	۵۰	۱۰
سورت	۱۱۳	۶
بھوپال	۱۳۹	۴۵۰
کلکتہ	۲۵	۵۰
احمد آباد	۱۵۰	۷۰
کان پور	۶۳	۱۱۸
حیدر آباد	۱۳	۵۰
میسور	۹	۲۶۰
بنگلور	۲۸	۱۵۰

مسجد ڈھائے جانے کے ڈیڑھ مہینے بعد بھی ممبئی اور احمد آباد وحشی پن اور تشدد کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ لوگ زندہ جلائے جا رہے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کی جا رہی ہے (اس سلسلے میں سورت کے سانحہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ سترہ عورتوں کے ساتھ متعدد مرتبہ اجتماعی عصمت دری کی گئی۔ اس کے علاوہ سات عورتوں کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کی گئی اور پھر انہیں قتل کر دیا گیا)۔ معصوم بچوں کے سامنے ماں باپ کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ دو فرقوں کے مابین خلیج اتنی گہری کبھی نہیں ہوئی جتنی اب شہری حلقوں میں نظر آ رہی ہے۔

ایک ماہ بعد اچانک ۶ جنوری ۱۹۹۳ء کو وسطی ممبئی کے ڈونگری اور پائی دھونی جیسے مسلم اکثریت علاقوں میں تشدد کا لاوا پھوٹ پڑا۔ ۷ جنوری کو جوگیشوری میں آتشزنی کی واردات نے تشدد کا ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ چار دنوں تک شہر میں مسلمانوں کے گھروں اور کاروبار کو نشانہ بنایا گیا۔ تباہی مچانے والے شیوسینک

گئے۔ تاہم وہ [illegible] بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ [illegible] سے
[illegible] سڑک پر [illegible] جو بھاگ گئی کہ [illegible]
اور [illegible] کے [illegible] جو [illegible] کی لپیٹ میں [illegible] گئے۔
جب تک [illegible] ہوا تب تک [illegible] حالت تشدد میں [illegible]
موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

بمبئی کے فرقہ وارانہ فساد سے بہت پہلے کہ یہ فساد
منصوبہ بند تھا۔ مسلمانوں کی دکانیں، ریستوران، صنعت اور دیگر
املاک کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔

بمبئی میں پھوٹنے والے تازہ فرقہ وارانہ فساد میں پولس نے
مسلمانوں کا [illegible] ساتھ دیا [illegible] کر کے فساد پر [illegible]
قابو پانے میں ناکام رہی [illegible] جیسی کی گئی تھی۔ [illegible]
[illegible] کے ایڈیٹر [illegible] شیلا [illegible] کہا [illegible] اور ان
ڈائریوں کو جلانے سے [illegible] کوئی مدد نہ کی۔

انقلاب کے دفتر پر [illegible] انقلاب کے
چیف [illegible] اردو ٹائمز کے [illegible]
[illegible] آٹھ [illegible] مسلمان [illegible] جنہیں
[illegible] بمبئی کی [illegible]
اور [illegible] طوفان کم
ہونے تک بہت سی زندگیاں [illegible] ان کی
املاک [illegible] اور تباہ کی جا چکی تھیں۔

بمبئی شہر میں یہ سب [illegible] پولس کی اکثریت
[illegible] فساد کی ذمہ داری شیو سینا نے قبول کر لی [illegible]
باوجود حکومت نے شیو سینا کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔
ایسا لگ رہا تھا کہ پولس شیو سینا کے حکم کے مطابق کام کر رہی ہے
بمبئی کی تین سو سالہ تاریخ میں جنوری ۱۹۹۳ کا فرقہ وارانہ
فساد ہندوستان کا سب سے بڑا اور ہولناک فساد ہے جس میں
[illegible] کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ
[illegible] بمبئی میں [illegible]
[illegible] فساد [illegible] اور [illegible]
ایسے حالات میں [illegible] حکومت کے [illegible]
[illegible] نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں [illegible]

گئی [illegible] تھا لیکن اب
[illegible] ہزار [illegible]
[illegible] دیکھت
[illegible] لاکھ [illegible] کے لوگوں
سے [illegible] تھا [illegible] سے [illegible] ۔ انہیں
[illegible] بچا سکتا تھا۔ [illegible]
دل کو مجروح کر دیا اور [illegible] جید سے [illegible]
دے دیں۔

ان تمام واقعات کے باوجود مرکزی حکومت [illegible]
[illegible] مسلمانوں کے ایک وفد نے اس سلسلے
میں وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے ملاقات کی اور بمبئی کے حالات پر
قابو پانے کے لئے موثر کارروائی کا مطالبہ کیا۔ بعد میں [illegible]
نے بھی [illegible] ملاقات کی [illegible] دونوں [illegible]
نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ کی [illegible] تماشائی ہیں۔
بمبئی کے حالیہ فساد نے پورے ملک کے مسلمانوں کو ہلا
دیا ہے۔ آج مسلمان سرنگوں ہیں [illegible] آگر وہ کیا

کریں۔ وہ اب کس طرح سر اٹھا کر چلیں گے۔ آج مسلمانوں کے
[illegible] کھو بیٹھے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں مسلمان خود کو تنہا نہیں
سمجھیں وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں وہ ملک کے دیش باسی ان کے
ساتھ ہیں۔ مگر حقیقتاً دیکھا جائے تو مسلمانوں کا کوئی ہمدرد غم
گسار نہیں کوئی مددگار نہیں۔ حکومت کٹھ پتلی سی ہو گئی ہے۔ [illegible]

[illegible] ہے اور ایسے میں مسلمان خود کو محفوظ نہیں سمجھتے
کیونکہ [illegible] کے پاس کیندر ہے، منصوبہ ہے۔ [illegible]
اور ساتھ ہی یہ جذبہ ہے کہ پورے ملک کو ہندو رنگ میں
رنگ دیا جائے اور جو لوگ اس رنگ کو قبول کرنے سے
انکار کریں انہیں نکال باہر کیا جائے۔

انشا، مارچ ۹۳ء

ایم۔ ڈی۔ خان

فرقہ اور مذہب کے نام پر فسادات

مسلمانوں پر آر ایس ایس کے اعتراضات کی روشنی میں

ہمارے ملک میں جاریہ فرقہ وارانہ فسادات نے تاریخ کے اوراق کو معصوم بچوں، عورتوں اور بے قصور سینکڑوں افراد کے خون سے تربتر کر دیا ہے۔ ملک میں موجودہ سیاسی بحران جس کی دھیمی رو کی آگ برسوں سے اندر اندر سلگ رہی تھی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہم نے اس رو کی آگ کی طرف سے شعوری یا غیر شعوری طور پر آنکھیں موند لی تھیں۔ آج جبکہ اس آگ کے شعلے آسمانوں کو چھو رہے ہیں تو ہم ہڑبڑا کر اٹھے ہیں اور ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہیجانی یا شدید اضطراب کی حالت میں جو ردعمل ظاہر ہوتے ہیں وہ لازماً معقولیت پر مبنی نہیں ہوتے۔ سماج میں جو بھی واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں بہت ہی کم واقعات اچانک وقوع پذیر ہوتے ہیں ورنہ ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں فرقہ واریت اور خاص کر ہندو مسلم فرقہ واریت کا عروج بھی اپنی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ اس بڑھتی ہوئی فرقہ واریت نے ایک ایسی مکروہ شکل اختیار کر لی ہے کہ جس کے نتیجے میں ملک میں فسطائی اور بنیاد پرست طاقتوں کا برسر اقتدار آنا مستقبل قریب میں ناممکن نظر نہیں آتا۔ اس صورت حال کے لئے ملک کی ہر بڑی سیاسی پارٹی اور خاص کر بائیں بازو کی جماعتیں ذمہ دار ہیں کیونکہ ان پارٹیوں نے ہندو اور مسلم فرقہ پرست عناصر کے عوام میں پھیلتے ہوئے اثر و رسوخ کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بات کو ممتاز صحافی پریم شنکر جھا نے ۱ر جنوری ۹۳ء کے روزنامہ "سیاست" (حیدرآباد) میں شائع اپنے مضمون میں واضح کیا ہے۔ ملک میں آر ایس ایس پریوار (جس میں وشوا ہندو پریشد، بجرنگ دل، بی جے پی اور دوسری کئی محاذی ادارے شامل ہیں) ایک طرف اور دوسری طرف جماعت اسلامی، اسلامک اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آئی ایس او)، مسلم لیگ اور مجلس اتحاد المسلمین جیسی جماعتیں گزشتہ کئی برسوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کے رجحانات کو ابھارتے رہے ہیں۔ ملک کی معاشی پسماندگی، غریبی اور افلاس جیسے مسائل پر ان جماعتوں نے عوام میں ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ کے خلاف ورغلانے کا کام کیا۔ آر ایس ایس مسلسل یہ کہتی رہی ہے (برسوں سے) کہ ملک کی تقسیم اور یہاں کے عوام میں افلاس، غریبی، بے روزگاری اور آبادی میں غیر معمولی اضافہ کے لئے صرف اور صرف مسلمان ذمہ دار ہیں۔ آر ایس ایس پریوار کا استدلال ہے کہ مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ ریاست پاکستان حاصل کر لی اس لئے قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا قابل اعتراض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ Muslims want to have their Cake and eat it too. وہ کہتے ہیں کہ ایک طرف ملک کی تقسیم کے ذریعہ پاکستان حاصل کر لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں جمہوریت اور سیکولرزم کے فوائد بھی حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا ایک اور اعتراض یہ بھی ہے کہ ہندوستانی مسلم جماعتیں ملک میں جمہوریت اور سیکولرزم چاہتی ہیں لیکن یہی بات پاکستان کے تعلق سے نہیں کہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کی مخالفت کی جا سکتی ہے تو پاکستان میں مذہبی حکومت کی بجائے سیکولر جمہوری حکومت کے قیام کی بات کیوں نہیں کی جاتی۔ ہندوستان کی مسلم جماعتیں جو اپنے ملک میں جمہوریت اور سیکولرزم کی تائید کرتی ہیں تو وہ یہی رخ دنیا کی دیگر مذہبی حکومتوں کے تعلق سے کیوں اختیار نہیں کرتے۔ آر ایس ایس کا یہ بھی کہنا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی (FAMILY PLANNING) کو جب کئی مسلم ممالک میں اور خود پاکستان میں نافذ کیا گیا ہے تو یہاں ہندوستان کی مسلم جماعتیں کیوں اس پر اعتراض کرتی ہیں۔ اسی طرح ان کا کہنا ہے کہ جب ترکی، شام، عراق اور مصر جیسے ممالک میں مسلم معاشرہ میں ترقی پسند رجحانات ابھر رہے ہیں تو کیوں یہاں ادارے اور جماعتوں کی جانب سے ہندوستان کے عام مسلمانوں کو اس قسم کی

تبدیلیوں سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے۔ ان تمام اعتراضات کے پس منظر میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ مسلم جماعتیں ہندوستان کے مسلمانوں کو ملک کے معاشرے سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ ہم ایماندارانہ طور پر ان اعتراضات کا جائزہ لیں، مدلل جواب دیں اور ایسے اعتراض جن میں واجبیت ہے انہیں تسلیم کرنے کی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کریں۔ سب سے پہلا اعتراض کہ برصغیر ہندوستان کے مسلمان ملک کی تقسیم کے لئے ذمہ دار ہیں، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ پاکستان کا مطالبہ برصغیر کے عام مسلمانوں کا مطالبہ نہیں تھا۔ انگریزوں سے اقتدار کی منتقلی کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال میں پنجاب، یو پی اور دیگر علاقوں میں رہنے والے بڑے زمیندار، تعلقہ دار اور برصغیر کی مسلم ELITE کو خدشہ تھا کہ ان کی پوزیشن برقرار نہیں رہے گی۔ ان با اثر مسلمانوں نے اپنے معاشی اور سیاسی مفادات کی حفاظت کی خاطر عام مسلمانوں میں بھی (جن میں ۹۰ فیصد سے زیادہ غریب تھے) ایک ہیجانی کیفیت پیدا کردی کہ مسلمانوں کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ملک کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔ اس طرح سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کا عام مسلمان ہنگامے کا شکار ہو گیا۔ شعوری طور پر پاکستان کے قیام کے لئے سارے کروڑوں غریب مسلمان باشندوں یا دستکاروں کو ذمہ دار قرار دینا ناانصافی ہوگی جو اس وقت ہندوستان اور خاص کر شمالی اور جنوبی ہندوستان کے دیہات میں رہتے تھے۔ یہ کروڑوں مسلمان آج بھی بہت حد تک اپنے اطراف کے سماج میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ ان کی زبان مقامی زبان ہے، ان کے ریت رواج مشترک ہیں بلکہ ایک دوسرے کی موجودگی پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر بنارسی سلک اور دیگر کپڑا بُننے والے دستکار مسلمانوں کی کسی علیحدہ شناخت کا کوئی احساس ان میں آج بھی نہیں ہے۔ یہی حال جنوبی ہند میں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کا ہے جو مقامی زبان اور رہن سہن میں دیگر مذاہب کے پیروکاروں سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اس طرح سے ایک طرف تو آر ایس ایس کے اس الزام کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے لئے ہندوستان کا عام مسلمان ذمہ دار تھا تو دوسری طرف اس بات کا بھی اعتراف ضروری ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ان کروڑوں مسلمانوں کو جنہوں نے ہندوستان میں قیام کو پسند کیا مذہبی شناخت کو برقرار رکھنے کے علاوہ کسی اور بنیاد پر علیحدہ شناخت کی بات کرنا اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت دینا نامناسب ہے۔

ہندوستان کے کروڑوں مسلمان آسام سے لے کر گجرات تک، کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک آباد ہیں، لسانی اور معاشی طور پر اور عام رسم و رواج میں مقامی عوام سے قطعی طور پر علیحدہ نہیں ہیں۔ کشمیری مسلمان کشمیری زبان بولتا ہے۔ آسامی مسلمان کی زبان آسامی، بنگالی مسلمان بنگالی اور گجراتی مسلمان کی زبان گجراتی ہے۔ یوپی کے ہزاروں دیہاتوں میں، بہار میں، مدھیہ پردیش میں اور راجستھان کے دیہاتوں میں جو مسلمان ہیں ان میں سوائے مذہبی روایات اور مراسم کے کوئی اور علیحدگی کے رجحانات نہیں پائے جاتے۔ لسانی اور تمدنی سطح پر وہ مقامی کلچر کا ایک اہم جزو ہیں۔ ان حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہنا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پورے ملک میں یکساں طور پر کوئی علیحدہ شناخت ہو سکتی ہے غیر حقیقی ہوگا۔ اس لئے MUSLIM INDIA (جو کہ جناب شہاب الدین کے رسالہ کا نام ہے) کی بات کرنا بھی نامناسب ہے۔ انڈین مسلم کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن مسلم انڈیا کیا ہوتا ہے۔ جب مسلم انڈیا ہو سکتا ہے تو ہندو انڈیا اگر کوئی ہندو انڈیا کی بات کرے تو جواز

حاصل ہوتا ہے جب بے معنی سی بات ہوگی۔ آر ایس ایس کا دوسرا اعتراض کہ ہندوستان کی مسلم جماعتیں دیگر مسلم ممالک میں ہونے والی ترقی پسندانہ تبدیلیوں سے منحرف ہو رہی ہیں۔ مثلاً بعض دوسرے دقیانوسی مسلم ممالک کی پرجوش تائید کرتے ہیں۔ اس کی تاریخ اسی مسئلہ کے دوسرے رخ سے شروع ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو تحریک خلافت کے دوران [illegible] بدقسمتی سے خلافت عثمانی کی تائید میں اور کمال اتاترک کی ترقی پسند تحریک کے خلاف ورغلایا گیا اور [illegible] کی بے حقیقت بات شروع کی گئی جس کا مطلب تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک وحدت ہیں اور ان کا کوئی مخصوص وطن نہیں ہوتا۔ اب کیا اس وقت غلط ثابت ہوا جبکہ قوم، وطن اور زبان کے تقاضے ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کے درمیان مذہب سے زیادہ مضبوط اور گہرے ثابت ہونے لگے۔ نسلی طور پر ایک ہونے کے باوجود یورپ، مغربی ایشیا اور ایشیا میں کئی قومیں موجود ہیں۔ عیسائی مذہب کے پیرو ہونے کے باوجود یورپ کے باشندے علیحدہ علیحدہ قوموں میں تقسیم ہیں۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے، بدھسٹوں کا ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ وطنیت کی تشکیل محض مذہب یا رسوم کی یکسانیت کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ چین میں پیدا ہونے والے مسلمان کی قومیت چینی ہی ہوگی جبکہ امریکی مسلمان کی وطنیت امریکی ہوگی [illegible] اس بات پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ہندوستان کے مسلمانوں کی وطنیت اور قومیت ہندوستانی ہی ہوگی اور ہندوستان کا ہر مسلمان اپنے وطن سے محبت رکھتا ہے۔ اس کی ترقی اور خوشحالی کی مساعی میں اتنا ہی ذمہ دار ہے (باقی ص۳۷ پر)

جتنا کہ کوئی اور مذہب کا پیرو ہو سکتا ہے۔ آر ایس ایس پرچار کا یہ کہنا کہ عام ہندوستانی مسلمان ملک کی معاشی بدحالی اور پسماندگی کا ذمہ دار ہے، قطعی بے بنیاد اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ ملک کی معاشی بدحالی کے لئے وہ ایک سو اجارہ دار اور خاندان ذمہ دار ہیں جو ملک کی کل دولت کا پچاس فیصد اپنے قبضہ میں لئے رکھے ہیں۔ اس ملک کے برسر اقتدار طبقے اس صورت حال کے سو فیصد ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ انہوں نے مذہب، ذات پات، زبانوں اور علاقوں کی بنیاد پر انتخابات کے طریقہ کو رائج کیا اور ان ہی بنیادوں پر غریب عوام کو مسلسل تقسیم کرتے آرہے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ تقریباً تمام سیاسی جماعتیں بشمول بائیں بازو کی جماعتیں بھی اس سازش کا شکار بنی ہوئی ہیں۔ پسماندہ معاشی ماحول میں سماج کا ہر طبقہ چاہے وہ مذہبی گروہ ہو یا ذات پات کی بنیاد پر ہو، یہی چاہتا ہے کہ محدود وسائل میں وہ اپنے لئے کچھ حاصل کر سکے۔ اسی معاشی جدوجہد سے جو تصادم کا عمل شروع ہوتا ہے برسر اقتدار سرمایہ دار طبقہ اسے فرقہ وارانہ رنگ دے دیتا ہے۔ اس جدوجہد میں رجعت پسند جماعتیں یہ پرچار کرتی ہیں کہ دیکھو، تمہاری پسماندگی کے لئے فلاں گروہ ذمہ دار ہے جو خود بھی اپنی بقا کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔ ملک میں ایک ہی مذہب کے ماننے والے مختلف گروہوں کے درمیان تصادم اس کی مثال ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے تمام غریب و مفلس عوام زبان، علاقہ اور مذہب نیز ذات پات کی الگ الگ شناخت کے باوجود ملک میں معاشی اور سماجی انقلاب کے لئے ایک متحدہ جدوجہد کے لئے تیار ہو جائیں اور فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کریں۔

انشاء ۱۰ مارچ ۱۹۹۰

انجلی ویش پانڈے

بمبئی ایک زخمی اور خوفزدہ شہر

صنعت کار سیاستداں تال میل: شیو سینا کی طاقت کو بڑھانے میں مدد کی ہے، تب ہی وسنت راؤ نائک کی حکمرانی کے زمانے میں شیو سینکوں کو عام طور پر 'وسنت سینا' کہا جاتا تھا!

[illegible]

عروس البلاد کہلائے جانے والے شہر میں حالات کے معمول پر آنے کا کیا مطلب ہے جہاں ابھی تک مسلمان پناہ گزین کیمپوں میں رہتے ہیں یا تو اس بنا پر کہ ان کے مسکنوں پر کچھ نہیں رہ گیا ہے یا پھر اس سبب سے کہ وہ گھر سے زیادہ اس جگہ محفوظ ہیں؟

بمبئی کو اپنی رنگا رنگ ثقافت پر بڑا ناز تھا اب وہ پہلے جیسی محفوظ بندرگاہ نہیں رہ گیا ہے۔ یہ شہر جو اپنے معصوم شہریوں میں سے ہزاروں بے مطلب و بلا سبب ہلاکتوں کے ہولناک مناظر سے گزر چکا ہے اور بہت بڑے پیمانے پر املاک کی تباہی دیکھ چکا ہے اب وہ ایک زخمی اور خوفزدہ شہر کی تصویر پیش کر رہا ہے جہاں اس بات کا کوئی تیقن نہیں ہے کہ وہاں ایسی زندگی لوٹ کر آسکتی ہے جس میں انتقام اور تشدد کا جذبہ کار فرما نہ ہو۔

شیو سینکوں کے غولوں نے جو دہشت پھیلائی تھی وہ اس کے شہریوں خاص طور پر مسلمانوں، مسلم علاقوں میں رہنے والوں اور شہر کے غریبوں کے چہروں پر اب تک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ وہ سب کچھ کھو چکے ہیں جو ان کے لئے بیش قیمت تھی۔

مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا تھا اور فسادیوں کے غولوں نے جو بالکل آزادانہ طور پر منڈلاتے پھرتے تھے، مسلمانوں کی املاک کو بلا روک ٹوک پھونک ڈالا اور حد تو یہ ہے کہ زندہ انسانوں کو بھی جنونی بھیڑ نے زندہ جلا دیا۔ یہ سب کچھ ایک منظم قتل عام سے ہی مشابہ لگتا تھا۔

"بمبئی میں آج کل حالات 'معمول' پر آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آتش زنی نہیں ہوئی" یہ بات مسٹر گروپ کے آپ مدیر پی سائناتھ نے کہی ہے۔ وہ اور مسٹر کے ایڈیٹر ہارون رشید کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ رشید کا مکان بمبئی کے عالی شان علاقے واشنٹ موتی کمپاؤنڈ میں ہے جو آج کل جلے ہوئے گھروں کا ایک ڈھیر لگتا ہے۔

رشید مقامی شیو سینا کے کونسلر کے قریبی دوست تھے اور یہ صاحب ان کی سڑک کے سامنے، ان کی بلڈنگ کے پیچھے کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ جہاں کارپوریٹر اب بھی رہتے ہیں۔ شیو سینکوں نے واشنٹ موتی کمپاؤنڈ پر حملہ کیا تھا۔ صبح دس بجے سے شروع ہو کر یہ حملہ شام ۵ بجے تک جاری رہا اور ۳۰ خاندانوں نے جن میں ایک ہندو خاندان بھی تھا اس مکمل بلڈنگ کو خالی کر دیا تو بلڈنگ کو آگ لگا دی گئی اور یہ آگ سرخ لاٹوں اور پٹرول بم چلانے والی گنوں (لانچیروں) سے لگائی گئی تھی۔

آگ کو بجھانے کے لئے آگ بجھانے والا عملہ نہیں آیا۔ پولیس نے سینکوں کو روکنے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ شیو سینا کارپوریٹر نے رشید کو بار بار یقین دلایا تھا کہ وہ ان کو بچا لے گا لیکن جب حملہ آوروں نے بلڈنگ کو آگ لگائی اور زمین پر اس کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا تو کارپوریٹر نے اپنی انگلی تک نہیں ہلائی۔

"دوست کی حیثیت سے کارپوریٹر کم از کم مجھے اتنا تو بتا دیتا کہ وہ میری مدد نہیں کر سکتا ہے۔" رشید نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ جب وہ ان ہولناک لمحوں کو بیان کر رہے تھے جن سے وہ گزر چکے تھے۔ انہوں نے رنج و غصہ کے انداز میں کہا۔ "دوستی پر سے میرا اعتماد اٹھ چکا ہے"۔

"شیو سینکوں کے حملوں کا اصل زور مسلمانوں پر پڑتا ہے" پی۔ سائناتھ نے کہا۔ "ان کو اتنے بڑے پیمانے پر تباہی اور نقصان کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ہندوؤں کا بھی تھوڑا بہت نقصان ہوا ہی تھا اور وہ بھی اتفاقاً ہوا ہے۔ شکار ہونے والوں کی اکثریت مسلمانوں کے زیادہ غریب حصوں کی ہے۔ جنہوں نے اپنی دکانیں، روزگار، گھر اور تمام دنیاوی املاک کھو دی ہیں"۔

[illegible] سکھوں سے تھا" شیو سینکوں کی [illegible] کا موزوں ایک جلوس منظر کے [illegible] قتل عام سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کی شناخت [illegible] ان کے پاس [illegible] تھیں۔ وہ پٹرول [illegible] اور چھروں سے [illegible] ہاتھوں سے کھینچے جانے والے ٹھیلے [illegible] تھے۔ انہوں نے ٹھیلوں پر [illegible] پٹرول [illegible] اور چھروں سے [illegible] تھے۔

[illegible]

[illegible] مسلمانوں کا قتل [illegible]

[illegible] رشتے والے پہچان گئے تھے [illegible] پر حملہ ہوا تھا۔ اس [illegible] والی بھیڑ میں وہ نوجوان شامل تھے جو ایک دن پہلے تک مسلم نوجوانوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے رہے تھے اور مقامی ہوٹلوں میں چائے پیتے رہتے تھے۔

آج کل دادر میں ۱۰ ماچ کے [illegible] وی سیٹ ۲ ہزار روپے کی معمولی رقم میں فروخت کئے جا رہے ہیں۔ اور یہ سب مسلمانوں کے گھروں سے آئے ہیں۔ ان خاندانوں سے جنہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر دس ہزار روپے سے پندرہ ہزار روپے میں ان میں سے ایک خریدا تھا۔

اس منظم [illegible] کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے بال ٹھاکرے نے اپنے دستخطوں سے شیو سینا کے ترجمان "سامنا" کے اداریے میں دعوا کیا تھا کہ مسلمان بھنڈی بازار [illegible] سفید جھنڈے لہراتے ہوئے بھاگ رہے ہیں اور کہا "ہمیں اس وقت رکنا نہیں چاہئے"۔

"حکومت مہاراشٹر اور حکومت ہند اس

[illegible]

[illegible] ہے تماشہ [illegible] دو کاروں کو [illegible] غریبوں کی [illegible] قتل و [illegible] حالات سے [illegible] کے ہاتھوں [illegible] شیو سینا کے [illegible]

کے حالات پیدا کر دیئے اور پولیس اپنے سرپرستوں شیو سینا کے دماغ میں جگہ بنا چکی تھی

[illegible] ۱۹۸۶ء میں [illegible] آج کل اس کی ۲۳ فیصد ہے۔ دور [illegible] کے مواقع [illegible] اور سروس کے شعبوں میں بڑھ گئے اور مزدور طبقوں کو ایک مستقبل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کم سے کم ۷ ہزار کارخانے بیکار قرار دے دیئے گئے ہیں۔

ایسے حالات کے اندر شیو سینا کو بڑی زرخیز زمین مل گئی جس میں انہوں نے مسلمانوں کو "دشمنوں" کے روپ میں پیش کیا جنہوں نے روزگار چھین لیا ہے۔ صنعت کاروں نے شیو سینکوں کو پالا پوسا تاکہ ستر کی دہائی میں ریڈیکل ٹریڈ یونینوں کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی جائے۔ نوے کی دہائی میں وہ سامنت کی کیفیت نمودار ہونے کے بعد بائیں بازو اپنی کھوئی ہوئی ساکھ حاصل نہ کر سکا کیونکہ ہزاروں

مزدوروں کو [illegible] کر کے [illegible] پھینک دیا گیا تھا۔

[illegible] صنعت کاروں سے جو [illegible] حاصل ہوئی ہے اس کی [illegible] تصویر [illegible] تشددات سے ملتی ہے [illegible] "سامنا" [illegible] ہے ہیں۔

صنعت [illegible] سے جانچ [illegible]

[illegible] کا کام بھی شیو سینا کے مقصد [illegible] کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ [illegible] مظاہر قتل عام کے دوران [illegible] نظر آیا تو [illegible] نہیں تھی۔

رشید کا کہنا ہے۔ "انہوں نے [illegible] کے سامنے سے گزرتے ہوئے [illegible] کے قافلے سے مداخلت کرنے اور [illegible] چھپے ہوئے پولیس خاندانوں کو بچانے کی ناکام التجائیں کی تھیں۔ اخباروں کے ایک حصے میں خبروں کے برخلاف [illegible] کی شہر میں موجودگی کا بھی صورت حال پر کوئی سود مند اثر نہیں پڑا تھا"۔

[illegible] یہ بڑا [illegible] منظر ہے۔ مسلمان یہ نہیں بھول سکتے کہ [illegible] بریگیڈ نے ان سے کہا۔ "پاکستان چلے جاؤ" بجائے اس کے کہ وہ پلٹن سے گاڑی نکال کر مدد کے لئے دوڑ پڑتے۔ وہ یہ نہیں بھول سکتے کہ پولیس افسران نے نہ صرف یہ کہ مدد کرنے سے انکار کر دیا بلکہ تباہی و بربادی پھیلانے والے سینکوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے

تھے۔

ادھر ہندوؤں کے گروہوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو بچانے کی کوشش کی۔ لیکن بنی رہائشیں گری جا چکی تھیں اور عام بستی والے وہ لوگ جو چیخ و پکار کرتے اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد اور شیو سینا کے ساتھ نہیں ہیں حیرت زدہ تھے کہ وہ (مرد یا عورت) مسلح بھیڑ کا سامنا کیسے کر سکتے ہیں جب کہ ریاست نے چپ کی تھی اور حکومت کا وجود ہی نہیں تھا۔

اس کا تعین کرنے کے لئے کہ سلم (گندی بستیوں کے) علاقے اور دوسری بستیاں جو اس تشدد اور آتش زدگی کی مہم میں صاف کر دی گئی ہیں، وہ سود خوروں اور بلڈروں کے ہاتھوں فروخت نہ کر دی جائیں اور پرانے کرایہ داروں کے حقوق بحال رہیں اس کے لئے ایک آزادی مہم جاری کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

حکومت کی جانب سے اس طرح کا قدم ان لوگوں کی ہمت افزائی کرے گا جو فسادات کے دوران اپنے ٹھکانوں سے بھاگ گئے تھے جان بچا کر۔ آیا وہ لوگ جو شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں واپس آ جائیں گے یا نہیں؟ یہ ایک قطعی الگ سوال ہے۔ لوگوں کے لئے وہ جگہ واپس آ جانے کے لئے محفوظ نہیں ہے۔ یہ بات روزانہ [illegible] ملی محسوس کرتے ہیں۔

لیکن بستی میں بہت سے مسلمان اس پر زور دیتے ہیں کہ وہ نئے سرے سے شہر میں اپنی زندگی بنائیں گے جو کئی دہائیوں سے ان کا گھر ہے۔ "میں اپنا عقیدہ ٹھیک اسی جگہ پر پھر تعمیر کروں گا" رشید کا کہنا ہے۔ ان کا خاموش عزم اور تلخی کی عدم موجودگی، امید کی موہوم کرن سی ہے جو بادلوں سے بھرے افق میں نظر آ گئی ہے۔

■

"روشن خیال" (۱۴)

تاریخ ہند



(مشہور کتاب "انڈیا ڈیوائڈڈ" سے ماخوذ)

ہندوستان کے نامور ثقت اور پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی کتاب "انڈیا ڈیوائڈڈ" میں تحریر فرماتے ہیں: "مسلم شاہان ہند نے ہندوستان پر جو حملے کیے ہیں ان کا اسلام پھیلانے یا مذہبی جوش سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ ان کا واحد مقصد دوسری فاتح قوموں کی طرح مادی مفادات حاصل کرنا تھا جس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف بعض لڑائیاں ہندو راجاؤں کے خلاف لڑی ہیں بلکہ بیشتر لڑائیاں اپنے ہم مذہب مسلم بادشاہوں کے خلاف بھی لڑی ہیں" یہ ہے ڈاکٹر راجندر پرشاد کی رائے جبکہ ہندو رجعت پسندوں کا کہنا یہ ہے کہ "مسلم حملہ آوروں کا واحد منشاء تلوار کے ذریعہ اسلام پھیلانا اور ہندو مندروں کو توڑ کر ان کی جگہ مساجد تعمیر کرنا تھا" یہ غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈہ محض اس لیے کیا جا رہا ہے تاکہ "ہندو دھرم" کے نام پر اور اکثریت کو مشتعل کر کے کسی طرح اس ملک میں "راشٹریہ شکشی راج" قائم کیا جا سکے اور رجعت پسندوں کو اقتدار حاصل ہو جائے چنانچہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی نے اپنی مشہور کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصوں کا ترجمہ اور خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے

ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ "ڈاکٹر راجندر پرشاد" کی رائے

کیا شاہانِ ہند نے مندر مسمار کیے ہیں

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں کا ... ویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم نے کیا اور آخری حملہ آور احمد شاہ ابدالی اٹھارویں ... عیسوی میں یہاں آئے تھے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تقریباً ... تک اس ملک پر مسلمانوں کے جو حملے ہوتے رہے تھے ان میں ... ولی حملہ بھی مذہبی جوش یا تبلیغ مذہب کو پھیلانے کے مقصد پر نہیں تھا بلکہ دوسری فاتح قوموں کی فتوحات ... مسلمانوں کے حملوں اور فتوحات کا مقصد اسلام پھیلانا نہیں تھا بلکہ مادی مفادات ... حاصل کرنا تھا۔

ابتدائی زمانہ میں ہندوستان میں صرف ہندو ہی آباد ... اس لیے ہندوؤں ہی نے قدرتی طور پر مسلم حملہ آوروں کی ... مزاحمت بھی کی تھی اس بنا پر ابتدائی لڑائیوں کو ہندوؤں اور ... مسلمانوں کی لڑائیاں کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بات بھی ہے کہ پہلے ... ان میں سے ان تمام مسلم حملہ آوروں کی خواہش یہ رہی تھی کہ وہ ... ہندوستان کو اپنا وطن بنائیں چنانچہ گیارہویں صدی عیسوی ... شہاب الدین غوری کے حملہ کے بعد سے ہندوستان میں ... مسلمان حملہ آور بھی آتے رہے خواہ وہ پٹھان تھے یا تاتاری ... ترک تھے یا افغان۔ وہ ہندوستان کے کسی نہ کسی ... علاقوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ان کے مقبوضہ علاقوں میں تو سیع بھی شروع ہو گئی تھی۔

پھر جہاں جہاں ان مسلم حملہ آوروں کی سلطنت قائم اور وسیع ہوتی گئی وہاں ان کے لیے اپنے دارالسلطنت سے پورے ملک کا انتظام چلانا بھی مشکل ہو گیا تھا اور انہیں مختلف علاقوں میں اپنے گورنر مقرر کرنے پڑے تھے لیکن یہ گورنر بھی مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے تھے اور موقع ملتے ہی اپنے اپنے صوبوں میں اپنی خود مختار بادشاہتوں کا اعلان کر دیتے تھے اور بغاوت کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔

چنانچہ اسی بنا پر پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کے طویل دورِ حکومت کی تاریخ میں دو قسم کی لڑائیوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ ان میں ایک قسم کی لڑائیاں تو وہ تھیں جو مسلم سلاطین اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے برپا کرتے رہتے تھے اور چونکہ اس وقت ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر ہندو ہی حکمراں تھے انہیں مسلمان فتح کرکے دہلی کی سلطنت کے ساتھ ملحق کرنا چاہتے تھے اس لئے قدرتی طور پر ان لڑائیوں میں ہندوؤں ہی کو ایک فریق کی حیثیت حاصل تھی۔

اس کے بعد ایک وقت وہ بھی آیا جب دہلی کی مرکزی حکومت کے مقابلہ میں باغی گورنروں اور بعض عناصر کی بنا پر بہت سی دوسری آزاد مسلم بادشاہتیں بھی قائم ہوگئیں تو ان دوسری قسم کی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو خود مسلمان حکمراں دوسرے مسلمان حکمرانوں کے خلاف لڑتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں دہلی کے مسلم بادشاہوں کو جو لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں ان میں سے بیشتر لڑائیاں دوسرے مسلم بادشاہوں اور مسلم باغی گورنروں کے خلاف تھیں۔ ان لڑائیوں میں ہندو اور مسلمان دونوں طرف سے لڑتے تھے کیونکہ ہر فریق کی فوجوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی پائے جاتے تھے۔

یہاں ہمیں اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ غوریوں کے حملہ کے بعد شمال و مغرب کی طرف سے جو مسلمان بھی حملہ آور کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تھے انہوں نے ہندوستان کی کسی ہندو ریاست پر نہیں بلکہ کسی نہ کسی مسلم سلطنت ہی پر حملہ کیا تھا۔ اور وہ ہندوستان ہی کے کسی ایسے مسلم بادشاہ سے لڑے تھے جو ان سے پہلے یہاں اپنی سلطنت قائم کر چکا تھا اور ان حملہ آوروں نے خصوصی طور پر دہلی ہی کے کسی حکمراں کو شکست دی تھی۔

مثال کے طور پر تیمور اور نادر شاہ کے حملے کسی ہندو راجہ پر نہیں ہوئے تھے بلکہ ہندوستان کے مسلم سلاطین اور بادشاہوں پر کئے گئے تھے اور مسلمانوں ہی نے ان مسلم حملہ آوروں کا مقابلہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ بابر نے ہندوستان پر مغل سلطنت قائم کرنے سے پہلے پانی پت میں کسی ہندو راجہ سے جنگ نہیں کی تھی بلکہ دہلی کے مسلمان بادشاہ ابراہیم لودھی کے خلاف جنگ کرکے اسے شکست دی تھی۔ پھر جب ۱۵۲۷ء میں بابر کو میواڑ کے راجہ رانا سانگا کے خلاف جنگ لڑنی پڑی تھی تو اس جنگ میں راجپوتوں کے علاوہ میوات کا حسن خاں اور سلطان لودھی کا بیٹا محمود لودھی بھی مسلمان ہونے کے باوجود ہندو راجہ رانا سانگا کے ساتھ تھے اور رانا سانگا کی فوج ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر مشتمل تھی۔

پھر بابر کے فرزند شہنشاہ ہمایوں کو مسلمان بادشاہ شیر شاہ کے مقابلہ میں شکست کھا کر ہندوستان کے تخت کو عارضی طور پر چھوڑنا پڑا تھا اور جب شیر شاہ کی موت کے بعد ہمایوں ہندوستان کا دوبارہ حکمراں بنا تھا تو اسے شیر شاہ کی اولاد سے جو سب مسلمان تھے جنگ لڑنی پڑی تھی۔

ہندوستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شہنشاہ ہمایوں اور اکبر سے لے کر اورنگزیب تک مغل بادشاہوں کا بیشتر وقت اور ان کی بیشتر فوجیں یا تو باغی گورنروں کی سرکوبی میں صرف ہوتی رہی تھیں یا پھر وہ ہندوستان کے خود مختار بادشاہوں کو زیر کرنے میں مصروف رہے تھے۔ چنانچہ اورنگزیب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ جنوبی ہند کی مسلم بادشاہتوں یعنی گولکنڈہ اور بیجاپور کی تسخیر میں صرف کر دیا تھا۔

ان حالات میں نہ تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ملک میں مسلمان اسلام پھیلانے کے لئے آئے تھے اور انہوں نے ہندو مندر توڑے تھے یا انہوں نے ہندو راجاؤں کے خلاف جو لڑائیاں کی تھیں وہ ان کے مذہبی جوش کا نتیجہ تھیں اور نہ اس الزام ہی کو درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہاں اپنی حکومتیں قائم کر کے انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز یا فرق برقرار رکھا تھا۔

مسلمان بادشاہوں کی غیر فرقہ وارانہ پالیسی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر شہنشاہ اکبر کے دور میں راجہ مان سنگھ اور بھگوان سنگھ جیسے ہندو جرنیل اس کی فوج کی قیادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو اورنگزیب کے زمانہ میں ممتاز فوجی جرنیلوں میں جے سنگھ اور جسونت سنگھ کے نام سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے تو ضرور داخل ہوئے مگر ان کی فتوحات میں اسلام اور تبلیغ اسلام کا کوئی جذبہ نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد محض اپنی سلطنت کو وسعت دینا تھا اور اس غرض کے لئے انہوں نے اس ملک کے ہندو امراء اور عوام کی ہمیشہ غیر معمولی دلداری کی ہے۔ اور چونکہ ہندوستان کے مسلم حکمراں جہانبانی اور حکمرانی کے اصول سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے ان کی اسٹیٹ پالیسی ہمیشہ غیر فرقہ وارانہ رہی ہے اور انہوں نے ہمیشہ اس ملک کے ہندوؤں اور اس ملک کی تمام اقوام و مذاہب کو ایک ہی نظر سے دیکھا ہے اور ان کی اس وسیع النظری کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود سینکڑوں سال تک اس ملک کی ہندو اکثریت پر حکومت کرتے رہے۔

"دین دنیا" جنوری ۱۹۶۲ء

دین دنیا جنوری ۱۹۶۲ء

(ایک ہندو مورخ کے قلم سے)

شہنشاہ اورنگزیب نے مسلسل پچاس سال تک حسن و خوبی اور دانائی کے ساتھ حکومت کی ہے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مفقود ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو سپہ سالاروں کے ساتھ جتنے اورنگزیب کے تعلقات خوشگوار تھے ... یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی کو سب سے زیادہ رسوا اور بدنام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں اس عظیم حکمران کے بارے میں ایک مقالہ پیش کر رہے ہیں جس سے کوئی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نے ہندوستان پر کیسی رواداری سے حکومت کی ہے



شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر

اورنگزیب کی بابت عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کا سخت دشمن تھا لیکن اس کے "ہندو دشمنی" کے الزام کی اصل حقیقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فوجی سپہ سالار راجہ جے سنگھ تھا چنانچہ جب تک راجہ جے سنگھ زندہ رہا اس نے جنگی معاملات میں اس ہندو جرنیل کے مقابلے میں کسی مسلم سپہ سالار کا اعتبار نہیں کیا اور نہ اپنی اولاد کا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ماموں شائستہ خان کو دکن سے ہٹا کر سیواجی کے مقابلہ میں اسی ہندو جرنیل جے سنگھ کو بھیجا تھا۔ اگر اورنگزیب متعصب یا تنگ نظر ہوتا تو وہ ایک ہندو جرنیل کو تمام مسلم سپہ سالاروں پر ہرگز فوقیت نہ دیتا۔

جودھپور، اودے پور، کوچ بہار اور دوسری سینکڑوں ہندو ریاستیں جو اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار تھیں۔ اورنگزیب نے ان کے اختیارات کو جوں کا توں برقرار رکھا لیکن بیجاپور اور گولکنڈہ کی مسلم ریاستوں کو فنا کر کے مغلیہ حکومت میں مدغم کر لیا۔ کیا ہندو دشمن بادشاہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں پھر منصب، خطاب اور جاگیروں کی تقسیم میں اورنگزیب نے کبھی نہ کسی مسلمان میں امتیاز کیا اور نہ ہندو میں سب کو کھلے دل کے ساتھ نوازا۔ ملک کا ستم ہے کہ اسے پھر بھی غیر مسلموں کا کٹر دشمن کہا جاتا ہے کیا یہ اورنگزیب کے ساتھ کھلی ناانصافی نہیں ہے۔

ایک پابند شرع اور دیندار مسلمان ہونے کے باوجود اورنگزیب اپنے بیٹے شہزادہ محمد معظم کی شادی بڑی دھوم دھام سے راجہ روپ سنگھ کی بیٹی کے ساتھ کرتا ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ متعصب مورخوں نے جتنا اورنگزیب کو بدنام اور رسوا کیا ہے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں ملنی ناممکن ہے۔ اسے غیر مسلموں کا دشمن نمبر اول بتایا جاتا ہے۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے لاکھوں غیر مسلموں کو بالجبر مسلمان کر لیا اور لاکھوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے بے شمار مندر ڈھا دیئے۔ اسے متعصب، مکار، ظالم اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ غرضیکہ بد سے بدتر الزام جو کسی ادنیٰ درجے کے حکمران پر لگایا جاتا ہے وہ اس بادشاہ کے سر تھوپ دیا گیا ہے حالانکہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے اس پر لگائے گئے ہندو دشمنی کے الزامات میں سے کوئی ایک الزام بھی درست ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ وہ اکبر کی طرح بے دین اور جہانگیر کی طرح مذہبی معاملات میں لاپرواہ نہیں تھا بلکہ شعائر اسلام کی بڑی سختی کے ساتھ پابندی کرتا تھا اور عالم دین بھی۔ اس کا علم بڑا گہرا تھا۔

اور کبھی اس ہندو لڑکی پر مسلمان ہونے پر زور نہیں دیتا، بلکہ اس کے مذہب میں مداخلت کرنا بدترین گناہ خیال کرتا ہے اور اس شادی سے اتنا خوش ہوتا ہے کہ دلہن کو اپنی طرف سے لاکھوں روپے کا زیور عطا کرتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ کیا کسی متعصب بادشاہ سے اس وسیع نظری کی امید کی جا سکتی ہے؟ پھر خود اورنگزیب کے محل میں راجپوت رانی بائی اودے پور موجود تھی۔ اورنگزیب نے اس پر نہ کبھی تبدیلی مذہب کے لئے زور دیا اور نہ مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت کی۔ کیا کوئی متعصب بادشاہ یہ طریقہ کار اختیار کر سکتا ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس بادشاہ نے خود اپنی بیوی، بہو اور دوسری راجپوت رشتہ دار عورتوں اور ... پر کبھی تبدیلی مذہب پر زور نہیں دیا وہ بھلا غیروں کو مسلمان بنانے کے لئے کیوں جبر کرتا، اور بہ جبر مسلمان بنانا تو درکنار، اس نے تو اپنی حکومت میں تبلیغ اور اشاعت اسلام کا کوئی شعبہ نہیں کھولا جس کے ذریعے وعظ اور پند کے ذریعہ لاکھوں غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی جا سکتی تھی۔

اورنگزیب کے خلاف سب سے بڑا اور سنگین الزام یہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور بت خانوں کو دیکھ ہی نہیں سکتا تھا لیکن ... سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جب مندروں کا اس قدر دشمن تھا تو دکن میں ایلورا کے ... بت کدے کیسے باقی رہ گئے جو عین اورنگزیب کی دکنی راجدھانی دولت آباد اور اورنگ آباد کے جوار میں تھے۔ اورنگزیب دکن میں ایک دو دن نہیں رہا بلکہ اس کی زندگی کے آخری ۲۶ سال دکن ہی میں گذرے ہیں۔ اس مدت میں نہ جانے کتنی مرتبہ وہ ان بت کدوں کے پاس سے ... گذرا ہوگا لیکن اس نے انہیں ہوا تک نہیں لگنے دی۔ کیا کسی بت شکن کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ دہلی، متھرا، بنارس اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں ... نہیں کرا دیا۔ اورنگزیب کے زمانے کے ہزاروں مندر آج بھی موجود ہیں جن کو ... کبھی کسی نے ان کی مورتیوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور پھر بھی اورنگزیب پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت خانوں کا بہت بڑا دشمن تھا۔

اورنگزیب کی مذہبی رواداری کی اصل حقیقت کا اندازہ ہندوستان کے ماہر ہندو مورخین ... پرشاد، سر جادوناتھ سرکار اور پنڈت سندر لال کی تصانیف سے ہو سکتا ہے جن میں ان لائق مورخوں نے اورنگزیب کے بہت سے ایسے فرامین درج کئے ہیں ... کہ اورنگزیب نے مندروں کے لئے جاگیریں اور عطیات دیے۔ اس کے علاوہ ... فاروقی نے اپنی تاریخ میں اورنگزیب کے متعدد ایسے فرمان درج کئے ہیں جن کے ذریعے مغل حکام کو ... کے لئے تنبیہ کی ہے، مثلاً ... اور ۱۰۹۰ھ کے فرامین میں حکام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ بنارس کے ... کے ... میں وہ دخل نہ دیں ... کے لئے دی گئی ہے ... اسی طرح ایک ... جو

... کو ... بنارس کا ... کی ... : کہا جاتا ہے ... منہدم کیا گیا۔

سومنات ... بنارس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے مندر کو گرا کر مسجد بنوائی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ مندر کسی زمانے میں بھی نہ تھا بلکہ وہاں کبیر کے دین الٰہی کا ادارہ تھا جہاں سے اکبر کے نئے دین کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ اپنے دادا کے قائم کردہ اس ادارے کو توڑ کر اورنگزیب نے نہیں بلکہ شاہجہاں نے ... میں مسجد بنوائی تھی اور اس کا تاریخی نام "بنیاد شریعت" رکھا گیا تھا۔ ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں بھلا کون انصاف پسند مورخ اورنگزیب پر مندر شکنی کا الزام لگا سکتا ہے۔

اورنگزیب پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ اس نے مرہٹوں کو بری طرح کچلا، ان کے سرداروں کو ... کر رکھ دیا، سیواجی کے بیٹے سنبھاجی اور اس کے برہمن وزیر کوی کلس کو بے دردی سے قتل کرایا اور سیواجی کی اولاد کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ لیکن اس پر کوئی غور نہیں کرتا کہ مرہٹوں نے خود اورنگزیب کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ذرا سوچئے اور غور کرنے کی بات ہے کہ کیا موجودہ زمانہ کی کوئی جمہوری سے جمہوری حکومت بھی اس قسم کے سیاسی باغیوں کو برداشت کر سکتی ہے لیکن اورنگزیب نے پھر بھی سیواجی کی اولاد کے ساتھ رحم و مروت کا برتاؤ کیا۔ سیواجی کے پوتے ... کو منصب اور جاگیر عطا کی، سیواجی کے خاندان کے ایک ایک بچہ کے لئے وظیفے مقرر کئے لیکن انہوں نے پھر بھی بغاوتیں برپا کیں۔ ان بغاوتوں کے جواب میں اگر ان کے ساتھ سختی کی جاتی ہے تو اس خالص سیاسی معاملہ کو مذہب کے رنگ میں رنگ دینا کہاں کا انصاف ہے؟

اورنگزیب تو حکومت کے معاملہ میں اس قدر سخت تھا کہ اس نے نہ باپ کی نہ بھائیوں کے ساتھ رعایت کی اور نہ اولاد کے ساتھ مروت کی۔ ایسی حالت میں مرہٹوں کو اس سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ اگر اورنگزیب نے سیواجی کی مرہٹہ حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا تو اس نے گولکنڈہ اور بیجاپور کی اسلامی حکومتوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ ان حقائق کی موجودگی میں ... کہ اس پر مذہبی تعصب کا الزام کیونکر لگایا جا سکتا ہے۔ اورنگزیب کے تعصب اور مذہبی تنگ نظری کا صحیح اندازہ اورنگزیب کے زمانہ کے ایک انگریز سیاح کپتان ہملٹن کے سفرنامہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ یہ انگریز سیاح اورنگزیب کی مذہبی رواداری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی ... پوری آزادی سے برتی جاتی ہے۔ وہ ... برت رکھتے ہیں اور اسی طرح تہوار مناتے ہیں جیسے کہ گذشتہ زمانہ میں مناتے

"دینی دنیا" مارچ ۹۳ء

ڈاکٹر سید حامد

مقابلے کے امتحانوں کی تیاری

قارئین کرام کو غالباً علم ہوگا کہ اب زیادہ تر ملازمتوں کی بھرتی کمیشنوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ چونکہ بیروزگاری کی وجہ سے، امیدواروں کی ایک بڑی تعداد سرکاری ملازمتوں کے لیے درخواست دیتی ہے۔ اس لیے یہ نظام قائم کیا گیا ہے کہ امیدواروں کی صلاحیت کو مختلف مرحلوں میں جانچا جائے اور صلاحیت کی بنیاد پر ان کا انتخاب کیا جائے۔

سرکاری ملازمتیں مرکزی ہوتی ہیں یا ریاستی۔ مرکز کے دو اہم کمیشن، پبلک سروس کمیشن اور اسٹاف سلیکشن کمیشن ہیں۔ ہر ریاست میں بالعموم ایک ریاستی پبلک سروس کمیشن ہوتا ہے جو ریاستی سول سروس کے لیے تحریری امتحان اور انٹرویو کے ذریعے امیدواروں کو منتخب کرتا ہے۔

مذکورہ بالا دو مرکزی کمیشنوں میں سے یونین پبلک سروس کمیشن اعلیٰ سروسوں اور بڑی ملازمتوں کے لیے انتخاب کرتا ہے، مثلاً آئی اے ایس، آئی پی ایس، آئی ایف ایس، انڈین ریونیو سروس، انڈین پوسٹل سروس، انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس، کسٹم اینڈ سینٹرل ایکسائز، انکم ٹیکس وغیرہ۔ اسٹاف سلیکشن کمیشن کے دائرۂ انتخاب میں کلرک اور اسسٹنٹ، آڈیٹر، اپر ڈویژن گریڈ وغیرہ آتے ہیں۔

پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگس ملازمتوں کی بھرتی کے لیے اپنا نظم رکھتی ہیں۔ ریلوے سروس کمیشن جن کی تعداد ۹ ہے، ریلوے کی ملازمتوں کے لیے امتحان اور انٹرویو لیتے ہیں۔ اسی طرح بینکوں کے بہت سے کمیشن مختلف علاقوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

ریاستوں میں ریاستی پبلک سروس کمیشن ریاستی سول سروس کے لیے بھرتی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستوں میں ماتحت یا سب آرڈینیٹ ملازمتوں کے لیے مرکزی اسٹاف سلیکشن کمیشن کی طرح ریاستی کمیشن قائم کیے گئے ہیں ——— مندرجہ بالا بیان سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اب بیشتر ملازمتوں کے لیے صلاحیت کو معیار بنایا گیا ہے۔ اس لیے مقابلوں کی تیاری کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

ایک اور بات جو اس سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ شہریوں کی زندگی میں حکومت کا عمل دخل بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ جو طبقہ ترقی کرنا چاہتا ہے اور خوشحال رہنا چاہتا ہے وہ حکومت اور اس کے دفاتر میں مناسب نمائندگی حاصل کرے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ملک کے جمہوری اور انتظامی نظام میں سرکاری دفاتر میں نمائندگی حاصل کرنے کا واحد طریقہ مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کرنا اور ان میں بیٹھنا ہے۔

مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے یہ احساس شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ انہیں ملک کے معاملات میں بلا کم و کاست نمائندگی نہیں ملی۔ آزادی کے ۳۳ سالوں کے دوران سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب دن بدن کم ہوتا چلا گیا۔ دفاتر میں خواہ وہ مرکزی ہوں یا ریاستی، وہ شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کی ضروریات پر دھیان بالعموم ہمدردی اور تیز رفتاری کے ساتھ نہیں دیا جاتا اور ان کو اس سلسلے میں طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ جان فرسا احساس ان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے کہ اپنے ملک کے انتظام اور نشو و نما میں ان کو دخل نہیں دیا جاتا۔

ہمارے پاس اس قسم کے اعداد و شمار نہیں ہیں کہ مختلف ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب کیا ہے۔ لیکن اگر مثال کے طور پر اعلیٰ ملازمتوں کو لیا جائے تو ہر سال تقریباً ۸۰۰ یا ۹۰۰ جگہوں میں سے ۱۰ یا ۱۱ جگہیں ان کے ہاتھ آتی ہیں حالانکہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہر سال ان کے ۱۰۰ امیدواروں کو منتخب ہونا چاہیے تھا۔ ایک قباحت یہ بھی ہے کہ آبادی کے تناسب سے ملازمتوں کے مختلف امتحانوں میں مسلمان امیدواروں کے بیٹھنے کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ اور جو بیٹھتے بھی ہیں وہ ان میں سے اکثر پوری تیاری نہیں کرتے۔ انہیں یہ شکایت بھی رہتی ہے کہ ان کے ساتھ مقابلے کے امتحانوں میں انصاف نہیں کیا جاتا — اس لیے بعض طالب علم ان امتحانات میں قسمت آزمائی سے گریز کرتے ہیں۔

یہ شکایات صرف جزوی طور پر صحیح ہو سکتی ہے۔ بعض امتحانات اور امتحان لینے والے کمیشن جانب داری کے شبہے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے امتحانوں کا نظم و نسق اس وضع کا ہے کہ ممتحنوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ پرچہ کس امیدوار کا ہے اور اس کا کیا نام ہے؟ بعض امتحانوں اور بھرتیوں میں اثرات کام کر جاتے ہیں اور بعض جگہ انٹرویو بورڈ کا یہ رویہ بڑے طور پر ہو سکتا ہے کہ منصفانہ نہ ہو۔ لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں کے انتخابات میں اثرات کارگر نہیں ہو پاتے۔ اور اگر چھوٹی ملازمتوں کے انتخاب میں کہیں کا انصافی ہو پاتی ہے تو وہ بھی جزوی طور پر۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اگر کوئی امیدوار نمایاں طور پر اچھا ہے تو اس کی راہ میں تنگ نظری حائل نہیں ہو سکتی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں کو مناسب تعداد اور اپنے ملک کے انتظام اور ترقی میں معقول حصہ حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مقابلے کے امتحانوں میں جان فشانی کے ساتھ شریک ہوں اور ہر شہر میں ایسا انتظام کیا جائے کہ انہیں ملازمتوں کے مواقع اور مقابلے کے امتحانوں کی بابت ضروری اطلاعات ملتی رہیں اور کچھ نہ کچھ رہنمائی ملتی بھی ہو جس کے تحت وہ تیاری کر سکیں، فارم بھر سکیں اور مضامین کا صحیح انتخاب کر سکیں۔

چھوٹے پیمانے پر یہ کام ہر شہر میں وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ملازمتوں سے سبک دوش ہو چکے ہیں — یا ملازمت کے دوران بھی کچھ وقت خدمت خلق کے لیے نکال سکتے ہوں۔

ہماری حکومت نے جسے اقلیتوں کی دراصل زیادہ فکر نہیں رہتی لیکن جو اپنی فکرمندی کا اظہار کرتی رہتی ہے، اس بات کی جانب دھیان دیا ہے کہ مسلمانوں کا تناسب سرکاری ملازمتوں میں کم کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ وہ یہ دھیان زیادہ سے زیادہ موثر طریقے سے دیتی اگر مسلمانوں کے دشمن صرف سیاست کنندگی کا مقصد نہ بناتے، بلکہ مسلمانوں کی تعلیم، تعمیر اور مقابلے کی طرف توجہ دیتے۔ بہرکیف حکومت کا دھیان خاموشی کے ساتھ اس طرف دلایا گیا۔ اور کئی چار سال کی متواتر کوشش کے بعد حکومت نے یہ طے کیا کہ جب تک مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لیے کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا ... کہ مسلم نوجوانوں کا اہل بنانے کی کوشش کی جائے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو ہدایت دی گئی کہ وہ ان یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جہاں اقلیتوں کے طالب علموں کی معقول تعداد ہو، وہاں مقابلے کی تیاری کے لیے مراکز کھولے۔ اس ہدایت کے تحت شروع میں سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس کوچنگ سینٹر کے لیے جو وہاں پہلے سے کام کر رہا تھا، امداد دی گئی۔ اس کے بعد ۲۵ اور مراکز ملک بھر میں کھولے گئے جن میں ۲۰ یونیورسٹیاں ہیں اور ۵ ڈگری کالج ہیں۔

ہر چند کہ یہ اسکیم ۱۹۸۴ء میں شروع کی گئی لیکن اس کے نتائج حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ راقم الحروف کو یو جی سی نے اس کمیٹی کا صدر بنا کر بھیجا جس کا کام یہ تھا کہ وہ ان مراکز کی جانچ کرے اور اسکیم کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اپنی سفارشات پیش کرے۔ یہ رپورٹ شمالی، مشرقی اور جنوبی ہندوستان کے بعض مراکز کو دیکھنے کے بعد یو جی سی کو دے دی گئی۔ ان مراکز میں کامیابی حسب امید نہ ہونے کی وجوہات اجمالاً حسب ذیل ہیں:

(۱) بعض مراکز ایسی جگہوں پر کھولے گئے جہاں مقصود اقلیتوں کی تعداد کم ہے۔

(۲) تربیت دینے والوں میں بھی مہارت اور دلچسپی کی کمی پائی گئی۔

(۳) ان مراکز کی موجودگی کو ڈھنگ سے اور بڑے پیمانے پر مشتہر نہیں کیا گیا۔

(۴) مقامی مشورہ اور تائید حاصل کرنے کی کوشش بھی پورے طور سے نہیں کی جا سکی۔

(۵) تعلیمی طور پر پس ماندہ اقلیتوں کی طرف سے ان مراکز کی پذیرائی اور ان سے استفادہ خاطر خواہ نہیں کیا گیا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ اگر ۵۰ امیدواروں کی تربیت کا انتظام ہے تو ان میں پانچ یا دس سے زیادہ مذکورہ اقلیتوں کے امیدوار نہیں ہیں۔ اس کے نتیجے میں بقیہ ۴۰ یا ۴۵ نشستیں دوسرے طالب علموں کو دے دی گئیں۔ اس طرح مقابلے کے ضمن میں دوسرے طبقوں اور پس ماندہ اقلیتوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گیا۔

(۶) بعض جگہ اس اسکیم کو الگ سے چلانے کے بجائے مقابلے کے امتحانوں کی عام اسکیموں یا درج فہرست ذاتوں اور قبائلیوں کی اسکیم میں مدغم کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کا اصل مقصد فوت ہو گیا۔

یہاں پر یہ بات واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ حکومت ہند نے اپنی دستاویز "نئی تعلیمی پالیسی — عملی پروگرام ۱۹۸۶ء" میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان میں دو فرقے تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں — ایک مسلمان اور دوسرے نو بودھ جو ڈاکٹر امبیڈکر کی پیروی میں بدھ مت کے دائرے میں داخل ہوئے۔

(۷) مسلمان طلبہ بالعموم ایسے گھروں سے آتے ہیں جہاں تعلیم کا چرچا نہیں ہے اور جہاں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے دوران ان کو گھر پر تعلیمی مدد نہیں ملتی، لہٰذا وہ کلاس میں اپنے ہم جماعتوں کا بالعموم مقابلہ نہیں کر پاتے۔ اس سے سب سے بڑی خرابی یہ بھی رونما ہوتی ہے کہ ان کا اعتماد اپنی صلاحیتوں سے ہٹ جاتا ہے اور وہ خود کو کم اہل اور غبی سمجھنے لگتے ہیں۔ ایک بار اگر حوصلہ پست ہو گیا تو زندگی کی دوڑ میں بڑھنا دشوار ہو جاتا ہے!

آخری دشواری، جس کا ذکر ساتویں وجہ کے طور پر آیا ہے، کے دو حل ہیں: ایک طویل مدتی اور دوسرا فوری۔ طویل مدتی حل جس کے بغیر بات دراصل بنے گی نہیں، یہ ہے کہ مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانے کو پہلے ترجیح دیں تاکہ نئی نسل اس تعلیمی امداد سے جو بچے کو بہر حال درکار ہوتی ہے، محروم نہ رہے — فوری حل یہ ہے کہ ہمارے گھر جو کچھ فراہم نہیں کر پا رہے ہیں، ہمارا سماج یا معاشرہ اس کی ذمہ داری لے۔ اس کے لیے اسکول کے اوقات کے باہر ایسے کلاس جنہیں اصلا

راکیش شرما
ترجمہ: نجیب انصاری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندوؤں کا تعاون

- مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے سرسید احمد خاں نے ۱۸۶۳ء میں غازی آباد میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی بنائی تھی۔ اس کے ممبران میں ۱۰۷ مسلم اور ۸۲ ہندو تھے۔ سرسید کے بہت قریبی دوستوں میں مہاراجہ ایشوری پرشاد نرائن سنگھ، لالہ اجودھیا پرشاد منصف مرزاپور، راجہ جے کشن داس، بابو شیو پرشاد ستارہ ہند اور راجہ نے بھی ورسنگھ شامل تھے۔
- یکم اگست ۱۸۸۲ء کو یونیورسٹی کے قیام سے قبل مشاورتی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ۹ ہندو ممبران تھے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی مجلس منتظمہ میں ۶ ہندو ممبران تھے۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے گریجویٹ ایشوری پرشاد تھے۔ خان عبدالغفار خاں (سرحدی گاندھی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹوں کے بیچ میں تھے۔
- لالہ ملک چند دیوان سرسید کے اسلاف کی جانب سے مقرر کردہ ان کے سرپرست تھے۔ سرسید کے نانا نواب فخرالدین خاں نے اپنی جائداد کی تقسیم کے وقت لالہ ملک چند کو اپنے بیٹوں کے برابر حصہ دیا تھا۔
- اپنے پوتے راس مسعود کی بسم اللہ کے موقع پر سرسید نے راس مسعود کو اپنے دوست راجہ جے کشن داس کی گود میں بٹھایا تھا۔
- مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سرسید کے دادا کے بھائی خواجہ نجیب الدین کو اپنا ہیڈ خزانچی بنایا تھا۔
- مہاراجہ پٹیالہ کے غازی پور مدرسے کے سرپرست راجہ دیو نرائن سنگھ تھے۔ مدرسہ غازی پور میں سنسکرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔
- ۱۸۸۴ء میں انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے صدر دیال سنگھ نے سرسید کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا

  "آپ کا سب کے لئے محبت کا جذبہ اپنے ملک کے باشندوں کے لیے"
- ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں سرسید نے مسلمانوں کے ایک جلسے میں کہا تھا۔

  "دوستو! جس طرح اونچی ذات کے ہندو دور دراز سے آئے اور اس ملک کو اپنا بنالیا اسی طرح مسلمانوں کو بھی خود سے اسی ملک کے ساتھ جوڑ لینا چاہیے۔ یہی ہماری جنت ہے اسے جنت ہی رکھنا ہے"۔
- گورداسپور میں ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو انھوں نے کہا تھا

  "ہم (ہندو مسلمان) ایک ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ ایک جگہ پیدا ہوتے اور دنیا سے جاتے ہیں۔ ہم جب جب مل کر کھڑے ہوئے، دنیا کو ہلا دیا۔ جب ایک دوسرے کے خلاف ہوئے، تباہی کا سامنا کیا..... کیا مسلمان جو ہندوستان میں رہتے ہیں، ان کو کوئی اور ملک اپنا سکتا ہے؟ کیا ہندو بنا مسلمانوں کے رہ کے خوش رہ سکتے ہیں؟ ہم مل کر ہی ایک ملک ہیں، الگ ہو کر ذرے جو کسی مقصد کے نہ رہ

کچھ سچ:

- [illegible] کالج کے پہلے پرنسپل [illegible] تھے [illegible] پرنسپل [illegible]
- [illegible] پرنسپل [illegible] پرنسپل [illegible] کا تقرر [illegible] پرنسپل کے تقرر سے [illegible] ہو گیا تھا۔ [illegible] مولوی صاحب [illegible] تھے۔
- ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۸ء کے درمیان کالج میں [illegible] اساتذہ کا تقرر کیا گیا تھا
- یونیورسٹی کے قیام کے [illegible] میں [illegible] سے [illegible] کے درمیان [illegible] ساتھ [illegible] عیسائی اور ایک پارسی
- اس وقت یونیورسٹی میں [illegible] پروفیسر [illegible] ریڈر [illegible] لیکچرر ہیں
- یونیورسٹی میں [illegible] سے سنسکرت کا شعبہ قائم ہے جس کے پہلے صدر [illegible] تھے
- [illegible] میں [illegible] طلبا نے یہاں سنسکرت میں پی ایچ ڈی کیا پہلی ڈگری [illegible] نے حاصل کی تھی۔
- یونیورسٹی کی لائبریری میں [illegible] سے زیادہ [illegible] سنسکرت کی کتابیں ہیں
- یونیورسٹی کے کچھ ہال/ہاسٹل [illegible] (لڑکیوں کے لیے) [illegible] ہاسٹل [illegible] ہاسٹل [illegible] کے نام سے ہیں
- [illegible] سے [illegible] کے درمیان [illegible] کی ڈگری حاصل کرنے والوں میں ڈاکٹر [illegible] کا نام نمایاں تھا
- [illegible] سے [illegible] کے درمیان [illegible] انجینئرنگ میں [illegible] میں سے [illegible] اور [illegible] انجینئرنگ میں [illegible] میں سے [illegible] ہندو [illegible]

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی

- ۱۹۶۱ء سے [illegible] کے درمیان مختلف درجات میں [illegible]
- یونیورسٹی کے قیام کے [illegible]
- یونیورسٹی [illegible]
- یونیورسٹی سے [illegible]

[illegible]

ان میں سے بیشتر کو یونیورسٹی سے [illegible] ڈگری سے [illegible] یونیورسٹی کی [illegible] تاریخ میں [illegible] طلبا اور [illegible] شخصیتوں کو [illegible] ڈگری دی گئی

ماخذ

- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی روایات
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خطبات ([illegible])
- سرسید احمد خاں کے مختلف لیکچرز
- [illegible] اینڈ ہسٹری آف ایم اے او کالج

دومیش متر ا بحر عشق عثمانیہ
کاظم رضوی
مجلس دزر محبّت اصاری

بنارس ہندو یونیورسٹی اور قومی یکجہتی

بنارس ہندو یونیورسٹی، قومی یکجہتی اور ہندوستانی تہذیب میں گویا انسانی کے فروغ اور ترقی کا مرکز رہی ہے۔ اس کے قیام اور ترقی میں جہاں ایک طرف اس کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ کا تعاون تھا وہیں دوسری طرف دیگر مذاہب کے ماننے والوں اور ان کے ساتھیوں کا بھی تعاون تھا۔ نتیجے کے طور پر بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام میں مالویہ جی کو مسلمانوں سے جو تعاون اور حوصلہ افزائی ملی وہ قابل تعریف ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایچو پیا کے بادشاہ، ہز ہائینس کنگ آف سعودی عرب، ہز ہائی نس مہاراجہ نظام حیدرآباد، نواب رام پور اور سلطان احمد خاں گرانیار کا اس یونیورسٹی کی تعمیر میں خصوصی تعاون شامل رہا۔ آج بھی اس یونیورسٹی میں شعبہ ٹیکنیکل تعلیم کا رام پور ہال اور یونیورسٹی کیمپس میں نظام حیدرآباد کالونی جو اساتذہ کی رہائش کالونی ہے، کے ساتھ ہی سعودی عرب کے شاہ کے تعاون سے یونیورسٹی میں سوئمنگ پول قائم ہے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ہم آہنگی کی ایک بہترین مثال ہے۔

پٹنہ کے علی امام صاحب نے یونیورسٹی کے قیام میں تعاون کے طور پر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو جہاں ایک لاکھ ایک ہزار روپے کی رقم چندے میں دی تھی، وہیں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو صرف اکیاون ہزار روپے بطور چندہ دیئے تھے۔ چندہ کم ہونے کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے قبول نہیں کیا۔ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ جب علی امام صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے بنارس ہندو یونیورسٹی کو ایک لاکھ ایک ہزار روپے چندہ دیا، جبکہ مسلمان ہونے کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو صرف اکیاون ہزار روپے کیوں دیئے تھے تو انہوں نے جواب دیا:

"میں پیشے کے اعتبار سے وکیل ہوں اور ہندو اکثریت والے علاقے میں پریکٹس کرتا ہوں لہٰذا میری آمدنی ہندوؤں کی وجہ سے ہے۔ اس لیے میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں مالویہ جی کی یونیورسٹی کو زیادہ سے زیادہ امداد کروں۔ اسی لیے میں نے ہندو یونیورسٹی کو ایک لاکھ ایک ہزار روپے کی رقم چندے میں دی ہے۔"

اس سلسلے میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے جگری دوست علامہ محمد حسن فائز بنارسی کا ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ۱۹۹۰ء میں ایک سووینیر شائع کیا تھا جس میں بھارت رتن ڈاکٹر بھگوان داس کے حوالے سے شائع شدہ ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ اخلاقی طور پر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو ان کے جگری دوست علامہ محمد حسن فائز بنارسی نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام میں جتنا تعاون دیا ہے اتنا اقلیتی فرقے کے کسی شخص نے نہیں دیا۔

ممتاز شاعر، ماہر تعلیم اور دانشور علامہ فائز بنارسی، پنڈت مدن موہن مالویہ، بھارت رتن ڈاکٹر بھگوان داس اور دیش رتن بابو شیو پرشاد گپت کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ آغا حشر کشمیری، ڈاکٹر جگن ناتھ داس رتناکر، ڈاکٹر سمپورنانند

اپدیشہ ی پرکاش جی سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔ علاوہ
ازیں سن ناتر بہاری، مالویہ جی اور ڈاکٹر بھگوان داس کو لوگ
بنارس میں تریکا مورتی (تین مورتی) کے نام سے جانتے تھے
ماتر ناری سے نظام حیدرآباد کی بڑی دوستی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب مالویہ جی مالی امداد کے لیے نظام حیدرآباد
سے ملے تو اپنے ساتھ ماتر ناری کا خط لے گئے تھے
ماتر صاحب نے اپنی پوری زندگی مالویہ جی کے لیے وقف
کر دی تھی۔

آج بھی بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ، طلباء
اور طالبات میں قومی یک جہتی اور روادارانہ میل ملاپ کے لیے
کوشاں ہیں۔ گزشتہ دنوں کے واقعات کے بعد بنارس
ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر چندر شیکھر جھا نے
اپنے اساتذہ، طلباء اور طالبات کے ساتھ بہت رکھا
اور مالویہ بھون سے مہاتما گاندھی کے مجسمے (ٹاؤن ہال)

[redacted]

تک امن مارچ کی قیادت کی جس میں ہزاروں شہر کے ساتھ
ہندوؤں اور مسلمانوں نے شرکت کی۔

"سوراج کا مطلب یہ ہے کہ ہندو
مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی
یہودی سب اپنے اپنے مذہب
پر آزادی کے ساتھ عمل کر سکیں"

—— مہاتما گاندھی

"نیا دور" مارچ، اپریل ۹۳ء

**

عمر ضائع کر دی

مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی گواہی جو علماء کے لیے دلیل راہ ہے

مفتی محمد شفیعؒ

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوتا تھا اور مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال حسب معمول جلسے میں تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت اندھیرے میں سر پکڑے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا: "حضرت! کیسا مزاج ہے؟" کہا: "ہاں! ٹھیک ہی ہے۔ میاں' مزاج کیا پوچھتے ہو؟ عمر ضائع کر دی۔"

میں نے عرض کیا: "حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت اور دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ آپ کے ہزاروں شاگرد علماء اور مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟" فرمایا: "میں تم سے صحیح کہتا ہوں' عمر ضائع کر دی۔" میں نے عرض کیا: "حضرت' بات کیا ہے؟"

فرمایا: "ہماری عمر کا' ہماری تقریروں کا' ہماری ساری کدو کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں' امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا' تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

"اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی! ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا' وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

"اور ہم امام شافعیؒ' مالکؒ اور احمدؒ بن حنبل اور دوسرے مسلک کے فقہا کے مقابلے میں یہ جو ترجیح قائم کرتے آئے ہیں' کیا حاصل ہے اس کا؟

اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطا" (درست مسلک میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطا محتمل الصواب" (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں' تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔"

پھر فرمایا: "ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا' لہٰذا اجتہادی مسائل کا صرف اس دنیا میں فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح' یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو' اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی' قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین' حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر' حق تھی یا بالسر حق تھی۔

"اللہ تعالیٰ شافعی کو رسوا کرے گا نہ ابو حنیفہ کو' مالک کو رسوا کرے گا نہ احمد بن حنبل کو۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے' جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے' جنہوں نے نور ہدایت چار سو پھیلایا ہے' جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں' اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدان حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہ نے صحیح کہا تھا یا شافعی نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس۔

"تو جس چیز کو دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں اور نہ محشر میں' اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی' مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی ضروریات جو سبھی کے نزدیک اہم تھیں' جن کی دعوت انبیائے کرام لے کر آئے تھے' جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور جن منکرات کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی' آج وہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ آج ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے اور اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں۔ اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہئے تھا' پھیل رہے ہیں۔ گمراہی پھیل رہی ہے' الحاد آ رہا ہے' شرک و بت پرستی چل رہی ہے اور حلال و حرام کا امتیاز اٹھ رہا ہے' لیکن ہم لگے ہوتے ہیں ان فروعی بحثوں میں۔"

حضرت شاہ صاحب نے آخر میں فرمایا: "یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی!"

مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے مسائل اور ان کا حل

مولانا صدرالدین اصلاحی

(۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو آل انڈیا جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع منعقدہ حیدرآباد کے موقع پر "ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے بنیادی مسائل" کے موضوع پر اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ایک سمپوزیم منعقد کیا گیا جس میں ملک کی سربرآوردہ جماعتوں کے رہنماؤں نے حصہ لیا۔ یہ سمپوزیم مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی رکن شوریٰ نے اس موضوع پر جو مقالہ پڑھا اسے افادۂ عام کی غرض سے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔)

حضرات! ہر فرد کی اپنی ایک مخصوص شخصیت ہوتی ہے۔ وہ بعض امتیازی خصوصیات رکھتا ہے جن سے اسکی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ یہی انفرادیت اسکی ذات کو ممتاز اور نمایاں کرتی ہے اور اسی پر اس کا ذاتی تشخص موقوف ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی اس مخصوص شخصیت اور ان امتیازی خصوصیات سے محروم ہو رہے یا اس کو ان سے بجبر محروم کر دیا جائے تو گویا اسے اپنے آپ سے محروم کر دیا گیا اور اسے ایک دوسری شخصیت اڑھا دی گئی۔ اسی وجہ سے مہذب سماج کا یہ بنیادی وصف مانا گیا ہے کہ اس کے اندر انسان کی انفرادیت باقی رہے اور اسے اپنے طور پر پروان چڑھنے کی معقول آزادی حاصل ہو اور اس آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ حائل ہونے دی جائے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ایک سیاسی نظام اور ایک حکومتی ادارے کے قیام کی بنیادی غرض و غایت ہی اس آزادی کا تحفظ ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی آمرانہ نظام نے لوگوں کے اس سب سے اہم بنیادی حق پر کوئی پابندی عائد کردی تو انسانی ضمیر اسے کبھی برداشت نہ کر سکا اور اس کے خلاف برابر بغاوتیں کرتا رہا۔

یہ بات جس حد تک افراد کے حق میں ایک مسلمہ ہے، قوموں ملتوں اور تہذیبی گروہ

بارے میں اس سے بڑا مگر اتنا اہم تر اور عظیم تر مسئلہ ہوگی ۔ اتنا ہی اہم تر اور منظم تر جتنا کہ ایک پورا
ایک فرد کے مقابلہ میں ہوا کرتا ہے ۔ مذہبی اور تہذیبی گروہوں کی اپنی انفرادیت ہی تو ان کی
متاع ہوتی ہے ۔ وہ فی الواقع اسی وقت تک زندہ اور موجود ہوتے ہیں جب تک کہ ان
خص برقرار رہتا ہے ۔ ان کے اپنے اصول انکی عام زندگی کی رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں
نہیں اپنے مخصوص تصورات کے مطابق اپنے حال اور مستقبل کی تعمیر کی آزادی حاصل
ی ہے ۔ اس تشخص کا فنا یا مضمحل ہو جانا اور ان اصول و تصورات کا ان کی زندگی
یدان سے بے دخل کر دیا جانا در اصل ان تہذیبی اکائیوں کا ختم ہو جانا ہے ۔ اس لئے کسی
یا تہذیبی گروہ کے لئے بنیادی اور اصل مسئلہ صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے تہذیبی
ں اور اپنی زندگی کی دینی بنیادوں کو پوری طرح محفوظ رکھنے میں ہر خوف اور ہر خطرے سے
ہو ۔ اور ان کے مطابق اپنے مستقبل کی تعمیر میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے ۔

یب کشی اور اسکا انجام بد

جب مذہبی آزادی اور تہذیبی حق خود اختیاری کا انسانی
زندگی میں یہ مقام ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس آزادی
ں اور ان حقوق کا انکار دنیا کا سب سے بھیانک ظلم ہوگا ۔ ایک انسان کے قتل کو سب
ے جرائم میں شمار کیا جاتا ہے ۔ تہذیب کشی تو ایک پورے گروہ اور ایک پوری ملت کا
ی قتل ہے ۔ اس لئے کوئی شک نہیں کہ اس ظلم کی ہولناکی اپنی مثال آپ ہی ہو سکتی ہے

لیکن معلوم رہنا چاہیے کہ اس ظلم اور خون ناحق کی تلوار بھی دو دھاری ہوتی ہے ۔ جب
ائی جاتی ہے تو مظلوم ہی پر نہیں ظالم پر بھی گرتی ہے ۔ واضح بات ہے کہ ظلم کی جو چھری وہ کسی
ی گردن پر چلانے بڑھتا ہے وہ قبل اس کے کہ وہاں تک پہنچے خود اس کے اپنے ضمیر اور
اپنی انسانیت پر کاری ضرب لگا چکی ہوتی ہے ۔ ایسی حرکتوں کے نتیجے میں اسکی ذہنیت سخت ناہموار
سکی اخلاقی حس پامال ہو رہی ہے ۔ اسکے ضمیر میں شر پسندی اور اسکے مزاج میں بربریت گھر کر لیتی ہے اسکا کھلا
مطلب یہی تو ہوا کہ دوسروں کو تباہ کرنے والا اپنے کو بھی اخلاقی تباہی کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے ۔

جماعت افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے ۔ اس لئے جو بات ایک فرد کے بارے میں حقیقت
وہ جماعت کے بارے میں بھی حقیقت ہی ہوگی ۔ لہذا اگر کوئی جماعت کسی دوسری

جماعت کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کی اور کوئی ملت کسی دوسری ملت کی تہذیب اور اسکے مذہب کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کرتی ہے تو اس کا مطلب یقینی طور پر یہی ہے کہ وہ اپنے کو حق دشمنی، شرپسندی ظلم اور غارت گری کی ٹریننگ دے رہی ہے۔ حالانکہ یہ حق دشمنی اور ظلم و غارت گری جہاں ہوتی ہے وہاں سے مذہب رخصت ہو جاتا ہے اور تہذیب دم توڑ دیتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تہذیب کشی انجام کے اعتبار سے خودکشی بھی ہے۔ دوسرے مذہبوں اور تہذیبوں کے خلاف، جارحیت اختیار کرنے والے خود اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے بھی جانی دشمن ثابت ہوتے ہیں، اور یہ اس لئے کہ جب کسی گروہ کو ظلم و تعدی کا چسکا پڑ جاتا ہے تو وہ کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ جب تک دوسرے سامنے موجود ہوتے ہیں اس وقت تو انکی جان و مال اور انکی تہذیب و مذہب کا خون اس کے ذوق خون آشامی کو تسکین دیتا رہتا ہے، مگر جب دوسرے موجود نہیں رہ جاتے یا ان کی رگیں خشک کی جا چکی ہوتی ہیں تو فطری طور پر اسکی اس سفاک ذہنیت کا رخ اپنوں ہی کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس طرح ظلم و بربریت کی یہ آگ جب کھانے کے لئے کچھ اور نہیں پاتی تو خود اپنے ہی کو کھانے لگتی ہے۔

ہندوستان اور اسکی ملی وحدتیں ہم جس ملک کے باشندے ہیں اسکی حدود ہی لمبی چوڑی نہیں ہیں بلکہ اسکی برادری بھی بڑی ہے۔ یہاں دنیا کے سارے بڑے مذاہب موجود ہیں اور یہ زمین مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے دنیا کی زندگی مسائل کی زندگی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کہ یہاں بھی ہر مذہب کے پیرو اور ہر تہذیب کے علمبردار گروہ کے لئے مسائل کا پایا جانا ایک قدرتی بات ہے۔ ان مسائل کا اگر تجزیہ کیجئے تو وہ دو قسم کے دکھائی دیں گے۔ ایک قسم ان مسائل کی ہوگی جو ان گروہوں میں سے صرف اقلیتی گروہوں کے مخصوص مسائل ہیں، اور دوسری ان مسائل کی ہوگی جو عام اور ہمہ گیر نوعیت کے ہیں اور ان سے صرف وہی ملتیں دوچار نہیں جو اقلیت میں ہونے کے باعث سیاسی دشواریوں میں گھری ہوئی ہیں بلکہ اس اکثریتی گروہ کے لئے بھی یہ مسائل بڑی کی اہمیت رکھتے ہیں جو سیاسی حیثیت سے بالادست اور اپنے دینی اور تہذیبی معاملہ میں

کسی بھی بیرونی دباؤ یا خوف سے یکسر آزاد ہے۔

مشترک مسائل ان مسائل میں سے جو اس ملک کی سبھی ملتوں اور تہذیبی گروہوں کو درپیش ہیں۔ چند مسائل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس وقت میں انہی پر روشنی ڈالوں گا۔

پہلا مسئلہ وہ مادی ذہنیت ہے جو آندھی طوفان کی طرح اس ملک کے باشندوں پر چھائی چلی جا رہی ہے، اور جس نے یہاں مذہبی اور روحانی اقدار کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ یہ ذہنیت بنیادی طور پر مغربی تہذیب کے قاہرانہ تسلط کا نتیجہ ہے۔ اس تسلط کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس وقت ملک کی سیاسی سربراہی پر اس کی گرفت سب سے سخت ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہاں کی فکری رہنمائی اور اجتماعی لیڈرشپ ہے وہ بالعموم اسی مغربیت کے اندھے مرید ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے اکثر تو اس کی آخری حد، الحاد و انکار مذہب تک جا پہنچے ہیں۔ جب تک یہ صورت حال باقی رہے گی یہاں کے ہر مذہب اور تہذیب کے لئے مسائل پر مسائل پیدا ہوتے رہیں گے اور ان کا مستقبل کبھی روشن نہ ہو سکے گا۔

دوسرا مسئلہ نظام تعلیم کا ہے۔ برطانوی دور حکومت میں یہاں تعلیم کا جو نصاب اور نظام جاری کیا گیا تھا وہ اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ آج بھی بدستور موجود ہے۔ اس نظام تعلیم پر جو بھی اپنے مذہب، اپنی اخلاقی اقدار اور اپنی تہذیب کے نقطۂ نظر سے غور کرے گا وہ اپنے حق میں اسے سم قاتل ہی جانے گا۔ اس تعلیم کی خالص سائنسی برکتیں اپنی جگہ پر لاکھ قابل قدر سہی مگر اس کے اندر خون کی طرح دوڑنے والی فکر اسے قطعی طور پر اپنے خدا سے، اپنے مذہب سے، اپنی اخلاقیات سے، اپنی روحانی اقدار سے اور اپنے تہذیبی مزاج سے دور پھینک دینے والی ہے۔ چنانچہ جس حد تک بھی یہ نظام تعلیم ہماری نسلوں کو اپنے سانچے میں ڈھالتا گیا ہے یہاں کے مذاہب کی اور یہاں کی تہذیبوں کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی گئی ہیں قطعی بات ہے کہ یہ نامبارک سلسلہ اگر آئندہ بھی جاری رہا تو اس کے یہ نتائج اور زیادہ مہلک ہوتے چلے جائیں گے۔

تیسرا مسئلہ اہل مذاہب کا اپنی مذہبی تعلیمات اور اپنے تہذیبی اصولوں سے بے اعتنائی

کا خوفناک رویہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ ملک خدا پرستی اور روحانیت کا گہوارہ ہے۔ نظری اور روایتی طور پر یہ دعویٰ چاہے جتنا بھی صحیح ہو مگر عمل کی کسوٹی اس دعوے کو کھوٹ ہی کھوٹ قرار دیتی ہے۔ وہ یہاں تک بتاتی ہے کہ بعض پہلوؤں سے اس "مذہبی اور روحانی" ملک کا حال مادہ پرست مغرب سے بھی ابتر ہے۔ چنانچہ اپنے کاروباری اور قومی معاملات میں جن اخلاقیات کی پابندی کا وہ مظاہرہ کر رہا ہے ہمارا ملکی معاشرہ نوے فی صدی اس سے بھی محروم ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ ایک قلیل عنصر کو چھوڑ کر باقی پورا سماج مادیت، خود غرضی اور نفس پرستی میں بری طرح غرق ہے اور انہی صفات میں مسابقت کر رہا ہے اگرچہ ساتھ ہی وہ اپنے مذہب کا نام بھی بڑے جوش عقیدت سے لیتا رہتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مذہب کی تعلیمات اور تہذیب کے اصولوں کی کھلی ہوئی عملی مخالفت کے ساتھ ان کے حق میں یہ زبانی اظہار عقیدت ایک تکلیف دہ مذاق سے کم نہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جو پارٹیاں اور تنظیمی ادارے اپنے دعوے کے لحاظ سے مذہب اور تہذیب کی حفاظت و ترقی ہی کے لئے وجود میں آئی ہیں۔ اور انکی زبانوں پر دن رات دھرم اور سنسکرتی ہی کے نام رہا کرتے ہیں، ان کے رویے اور مشاغل میں بھی دوسروں سے نفرت اور دوسروں کے خلاف مادیت ہی کا زور شور سرفہرست رہتا ہے۔ کم از کم بیرونی حلقوں میں تو وہ اسی حیثیت میں جانی پہچانی جاتی ہیں۔ تہذیب کے نام پر فی الواقع یہ افسوسناک قسم کی بدتہذیبی اور مذہب کے نام پر فی الواقع یہ افسوسناک قسم کی مذہب دشمنی ہے۔ جس سے تہذیب اور مذہب کا مستقبل صرف تاریک تر ہی بن سکتا ہے۔ یقین رکھئے کہ یہ متعفن تہذیب نوازی اور یہ سڑی ہوئی مذہبیت مذہب کے خلاف آج ملحدوں اور منکروں کا سب سے کارگر ہتھیار بنا ہوا ہے۔ یہ روش دین و دیانت کے خلاف ایسی ناطق دلیل ہے جس کے ہوتے ہوئے یہاں مذہب بیزاری اور مادہ پرستی کو اپنے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ مذہب کے نادان اور نام نہاد پیروؤں کے ان سیاہ کارناموں کو وہ عوام کے سامنے پیش کر کے انہیں بڑی آسانی سے مذہب سے متنفر بنا سکتے اور انہیں اپنی صف میں لے جا کر کھڑا کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

چوتھا مسئلہ مذہب کے پیروؤں اور تہذیب کے علمبرداروں کا فکری جمود اور

انکی ذہنی مرعوبیت ہے۔ جو چوتھا سا گروہ اہل مذہب کا اس بے عملی کے روگ سے بچا ہوا۔ اور مذہب کی مخلصانہ پیروی اور اپنی تہذیب کی صد فیصد حفاظت اور ترقی کا سچا جذبہ ہے اسکا بھی حال بالعموم یہ ہے کہ وہ سینکڑوں اور ہزاروں برس کی پرانی دنیا میں رہ کر رہ ہے اور اس کی ذہنی ابھی تک ٹھٹری ہوئی ہے۔

بہ ظاہر اس فکری پس ماندگی کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نکل ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کا عبادت خانوں میں بند رہے اور انکی تہذیب زمانے کی رہنمائی کرنے کے بجائے اس کے پ چلتی بلکہ گھسٹتی رہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ خود یہ اہل مذہب اب عموماً یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ مذہب کا دنیا کے معاملات سے اور انسان کی فکری عملی اور تمدنی رہنمائی سے کوئی تعلق نہیں اس کا کام تو انسان کو بس ایک روحانی تسکین بہم پہونچانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے ا زندگیوں کا ایک کامیاب اور زندہ نظام بنائے رکھنے کے خیال تک سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے مذہب کی پاکیزہ روح اور اس کے بلند مقاصد سے دوری اور اس حقیقی توانائیوں سے بے خبری کا۔ اس بے خبری کے ہوتے ہوئے ان کے مذہب اور تہذیب مستقبل کبھی نہیں سنور سکتا یہی نہیں بلکہ یہ تہذیب نت نئے صدموں سے دوچار ہوتا

(۲) اقلیتی گروہوں کے مخصوص مسائل

ان عام اور ہمہ گیر مسائل کے علاوہ دوسرے مسـ جو یہاں کے بعض اقلیتی گروہوں کو خاص طور درپیش ہیں، یہ ہیں۔

پہلا مسئلہ یہاں کے اکثریتی گروہوں کے اندر پائے جانے والے ایک ایسے طاقتور کا وجود ہے جو بعض اقلیتی گروہوں خصوصاً مسلمانوں کی مذہبی انفرادیت اور ان کے ت تشخص کو مستقلاً نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ اور جس کی اس جارحانہ روش کے خلاف اس گرو اچھے اور انصاف پسند لوگ بھی بڑی حد تک بے بس بنے ہوئے ہیں۔ ان عناصر کو اپنی تہذیب اپنے مذہب کی حفاظت و ترقی سے اتنی گہری دلچسپی نہیں ہے جتنی کہ دوسروں کے مذاہب انکی تہذیبوں کی بیخ کنی سے ہے۔ انہیں اس بات پر غم اور غصہ کم ہے کہ ان کے پرسنل خود انہیں کے اپنے نمائندوں کی کثرت رائے سے تبدیلی کیوں کر دی گئی، بلکہ غصہ اس با

پر زیادہ ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کو ابھی تک کیوں نہیں بدل ڈالا گیا۔ انہیں تعیش کے سامان
کی درآمد پر برباد ہونے والے زرمبادلہ کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ اسلام کے ایک رکن
حج کی ادائیگی پر صرف ہونے والے زرمبادلہ کا ہوا کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں
نے اپنے ضمیر پر انتہائی سخت قسم کے پہرے بٹھا دیے ہیں۔ ورنہ اخلاقی موت کے منہ میں پھاند
پڑنے کے لئے وہ اتنی بے تابی کا مظاہرہ ہرگز نہ کرتے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر ایک دلچسپ
مگر نہایت انتہائی افسوسناک واقعہ کا ذکر کر دوں۔ آزادی کے تین چار سال بعد جب بہار
میں مسلمانوں کے خلاف انتہائی شدید قسم کے فسادات ہو رہے تھے۔ اس دوران اپنے ایک تعلیم
یافتہ جن سنگھی دوست سے گفتگو کے دوران ہم نے یہ سوال اٹھایا کہ یہاں اب مسلمانوں کو رہنے دیا
جائے گا؟ موصوف نے فوراً جواب میں فرمایا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم ہندوؤں میں اور جانوروں میں
فرق ہی کیا رہا۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ اگلے ہی دن آر ایس ایس کے سب سے بڑے رہنما کا
اخباروں میں یہ بیان آیا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو نکال دینا چاہیے۔ اب اندازہ کیجئے کہ جس
ملت کے ساتھ ان کے بالادست ہم وطنوں کا طرز فکر اور رویہ اس حد تک مخاصمانہ ہو اس کے
لئے ہندوستان "مسالمستان" نہ بنا رہے گا تو اور کیا ہوگا۔

دوسرا مسئلہ خود موجودہ دستور حکومت کے کچھ اجزاء خصوصاً اس کے بعض رہنما اصول
ہیں۔ اس دستور کا یہ بڑا عجیب اور بڑا پر معنی تضاد ہے کہ ایک طرف تو وہ سماجی انصاف،
مذہبی آزادی اور جمہوریت پسندی کے اونچے اصولوں اور حسین وعدوں سے بھرا ہوا ہے۔ دوسری
طرف اس میں مختلف مذہبی اور تہذیبی گروہوں کے شخصی قوانین تک کے وجود کو ناقابل گوارا
ٹھہرا دیا گیا ہے اور ریاست کی یہ ایک بنیادی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ملک کے تمام فرقوں
اور ملی گروہوں کے لئے یکساں سول کوڈ بنا کر نافذ کرے۔ گویا مذہبی اور تہذیبی آزادی کا جو وعدہ
اصولی طور پر اور گول مول انداز میں کر دیا گیا تھا، دستور کے اس رہنما اصول کے ذریعے اس کی
ایسی تشریح کر دی گئی ہے جس سے وہ بڑی حد تک بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے کوئی شک
نہیں کہ اس اصول کا اور انہی جیسی بعض دوسری دفعات کا دستوری وجود ملتوں اور تہذیبوں
کے سر پر لٹکتی ہوئی ایک ایسی تلوار ہے جو انہیں کسی اطمینان کا سانس نہ لینے دیگی۔

دستور کا یہ رہنما اصول اگرچہ اکثریت اور اقلیت میں کوئی امتیاز نہیں برتتا جسکی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ اکثریت کے لئے بھی اسی طرح ایک مسئلہ ہے جس طرح کہ اقلیتوں کے لئے ہے۔ لیکن یہ بات تبھی اسی وقت ہو سکتی تھی جب دستوری طور پر یہ ضروری قرار دیا گیا ہوتا کہ کسی بھی ملی گروہ کا پرسنل لا اس کے مستند نمائندوں ہی کی رائے سے بدلا جاسکے گا نہ کہ پارلیمنٹ کی عام کثرت رائے سے جہاں اکثریت کے نمائندوں کا تناسب اسی فی صدی سے بھی زائد ہے۔ ایسی پارلیمنٹ اگر اپنی کثرت رائے سے اکثریتی پرسنل لا میں کوئی ترمیم کرتی ہے تو وہ بلاشبہ وہ خود اکثریت کے اپنے ہی نمائندوں کی رائے اور فیصلے کا نتیجہ ہوگا جبکہ اقلیتی گروہوں کے بارے میں معاملے کی نوعیت بالکل دوسری ہوگی۔ اس لئے اس اصول کا وجود اگر ایک مسئلہ ہے تو صرف اقلیتی گروہوں کے لئے ہے۔ اکثریتی گروہ کے لئے ہرگز نہیں ہے۔

یہ شیطان کا سب سے بڑا کید اور دور حاضر کی سیاست کا سب سے بڑا فریب ہے کہ مذہب کا انسان کی مختلف اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور افسوس کہ مذہب کے مخصوص پیرو بھی اپنی کم نظری اور پست ہمتی کے باعث اس فریب کے بالعموم شکار ہو چکے ہیں۔ حالانکہ وہ مذہب مذہب نہیں جو مسائل حیات کے سلسلہ میں پوری پوری رہنمائی نہ دے سکے۔ اس لئے وقت کی یہ اہم ترین ضرورت ہے کہ مذہبی اور تہذیبی گروہ ذہنی مرعوبیت اور فکری جمود کی پستیوں سے باہر نکلیں زندگی کے مسائل کا سامنا کریں۔ تمدنی بلند نظری اور سیاسی سوجھ بوجھ سے آراستہ ہوں اور اخلاق اور خدا پرستی نیکی و راست بازی، عدل و احسان کی صفات ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ترقی پذیر تمدنی ثقافتی اور اجتماعی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیتوں میں بھی اپنی برتری ثابت کر دیں۔ یہی وقت ہوگا جب کہ انکی زندگی کی زمام کار ان کے مذہبی اور تہذیبی اصولوں کے ہاتھ میں آسکے گی اور وہ اپنے مسائل پر آسانی کے ساتھ قابو حاصل کر سکیں گے۔ ورنہ مذہب کو عبادت خانے میں مقید اور تہذیب کو صرف چند رسموں تک محدود رکھنا اور باقی پوری زندگی کو کسی اور نظام فکر و عمل کے حوالے کئے رہنا مذہب اور تہذیب کے حق میں وہی نتیجہ پیدا کرتا ہے جو دو کشتیوں کی سواری کا انجام ہوا کرتا ہے۔ مسائل تو زندگی کے میدان میں پیدا ہوتے ہیں اور اسی طاقت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جو وہاں برسرکار ہوا کرتی ہے۔ اس لئے اگر یہ طاقت کسی اور نظام فکر و عمل

کی ہوگی تو اس کے فیصلے مذہب کے حق میں نہیں اس کے خلاف ہی ہوا کریں گے۔ اور اگر وہ اپنی تگ و دو سے ایک مسئلہ حل کر پائے گا تو دو نئے مسئلے پیدا ہو چکے ہوں گے۔ اس لیے بالکل ضروری ہے کہ مذہب کی فکری قوت کو بھی بروئے کار لایا جائے اور زندگی کے پورے نظم پر اس کی صالح سیادت قائم کر دی جائے۔

حضرات! اب اقلیتی گروہوں کے تینوں مخصوص مسائل کے حل کو لیجئے۔ پہلے یعنی اکثریتی گروہ کا فرض اس سلسلے میں یہ ہے کہ اس کے خیر پسند اور منصف مزاج افراد اپنے بے راہ ہم مذہبوں کی ساری غلط کاریوں اور ظالمانہ حرکتوں کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو سمجھیں اور پھر ان کی ذہنی اصلاح کی بھرپور اور جرأت مندانہ جد و جہد میں لگ جائیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ کام جس طرح اقلیتی گروہوں کے مفاد میں ہے۔ اسی طرح خود ان کے اپنے دھرم اور تہذیب کے بھی مفاد کا عین تقاضا ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ اس کے ذریعے دوسروں کے مذہب اور تہذیب پر ہونے والے مظالم ہی کو نہ روکیں گے۔ بلکہ خود اپنی سنسکرتی اور اپنے دھرم کو بھی اس کے ناداں پیروؤں کے ہاتھوں سے داغ دار بنا دیے جانے سے بچا لیں گے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد مذہبی اور تہذیبی گروہ موجود ہوں۔ صحیح معقول اور منصفانہ بات صرف یہ ہوگی کہ تمام مذہبوں اور تہذیبوں کو اپنے اپنے طور پر آزادی کے ساتھ نشو و نما پانے کا موقع دیا جائے۔ ان کے درمیان حریفانہ کشمکش اور جارحانہ زور آزمائی کے بجائے صحت مند اور پرامن تعمیری مقابلہ ہو۔ اس طرح تجربے اور عمل کی کسوٹی پر ہر ایک کا کھرا کھوٹا آپ سے آپ نمایاں ہو جائے گا۔ جو کچھ کھوٹا ہوگا وہ خود بخود رد ہو کر رہ جائے گا۔ جو کھرا ہوگا وہ باقی رہے گا۔ یہی ملک کے مستقبل کے لیے بھی صحیح اور مفید ہے۔ یہی بنیادی انسانی حقوق کے بھی مطابق ہے۔ یہی تقاضائے انصاف بھی ہے اور حق بھی۔ یہی تہذیب کی اصل روح بھی ہے اور مذہب کی پسندیدہ راہ بھی۔ یہ تو ہوا اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں اکثریتی گروہ کا فرض۔ اقلیتی گروہوں کے کرنے کا کام اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود شناسی اور جرأت و عزیمت کے دوگونہ جوہر سے آراستہ کریں اور زندگی کا یہ راز ذہن میں بٹھالیں کہ جینے کا حق ملا نہیں کرتا، حاصل کیا جاتا ہے۔ کوئی قوم یا ملت دوسروں کے احساس فرض

کے نتیجے میں مذہبی آزادی اور تہذیبی حق خود اختیاری سے بہرہ ور نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے یہاں کی اکثریت کا انسانی مذہبی اور تہذیبی فریضہ جو کچھ بھی ہو اور اس کے ادا کرنے کے بارے میں وہ چاہے جو رویہ بھی اختیار کرے، اقلیت کو اپنی جگہ یقین رکھنا چاہئے کہ اس کے مذہبی اور تہذیبی مستقبل کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا سر تا سر اس کے اپنے ہی عزم حیات، اپنی ہی جرأت اور اپنی ہی سر فروشی پر موقوف ہے۔ دوسروں کا احساس فرض اور دوسرے ذرائع و عوامل صرف مدد دے سکتے ہیں۔ اور یہ بھی اسی وقت ہوتا ہے جب حقیقی عامل یعنی اقلیت کا خود اپنا احساس فرض سرگرم کار ہو۔ یہ "حقیقی عامل" جیسا کہ عرض کیا گیا دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کے اندر خود شناسی موجود ہو، وہ جانتی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے، اسے اس حقیقت کا علم ہو کہ اس کا دین اسے کس مقام پر اور کس حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے جس مقام پر اور جس حیثیت میں ہونا چاہئے اس مقام اور اس حیثیت کو حاصل کر لینے کا اس کے اندر پورا عزم اور کامل یکسوئی موجود ہو۔ ان دونوں باتوں کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اسکی زندگی کا پورا نقشہ بدل جائے گا، اس کے اندر سیرت کی بلندی، انسانیت کا درد، ہمدردی و غمخواری کا سوز، ایثار و قربانی کا جذبہ اور دلوں کو جیتنے کی امنگ پیدا ہوگی، وہ اپنے نصب العین حیات اور مقصد زندگی سے قریب آنے لگے گی، اس کے اندر عادلانہ بنیادوں پر قائم ہونے والی اجتماعیت اور صالح مقاصد پر مبنی یک جہتی پیدا ہونے لگے گی۔ مذہبی آن اور تہذیبی غیرت ابھرے گی اور اس کے تمام افراد اپنے ملی تشخص کو دل و جان سے عزیز رکھنے اور اس کی بقا و حفاظت کے لئے اپنی بہترین کوششیں صرف کر دینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور یہ کوششیں بھی صحیح سمت میں ہوں گی۔ غرض کسی بھی ملت کی اندرونی توانائی کا ابھار ہی اس کے مسائل کے حل کی شاہ کلید ہے۔ اسی سے وہ آگ بھی بجھے گی جو اکثریتی گروہ کے جذباتی طبقے کی شعلہ مزاجیوں نے اس کے ارد گرد لگا رکھی ہے اور اسی سے وہ برف بھی پگھلے گی جو خود اس کے اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔

دوسرے مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ مذہبی انفرادیت اور تہذیبی تشخص کا پورا پورا یقینی تحفظ حاصل کر لیا جائے اور اس غرض کیلئے دستور کی ان دفعات کو لازماً حذف کرا دیا جائے

جو اس انفرادیت اور تشخص کو ختم کرنے کی محرک بن رہی ہیں۔ دوسرے کاموں کی طرح یہ کام بھی یقیناً بڑا ہی دشوار ہے اور بڑی انتھک جد و جہد چاہتا ہے مگر ہمیں معلوم ہے کہ قوموں اور ملتوں کی انفرادیت اپنی تہذیبی بقا اور اشاعتی تشخص اتنی قیمتی چیز ہے کہ اس کے لئے ہر کوشش کم اور ہر قربانی ہیچ ہے۔ یہی تشخص ان کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے اپنی کوئی تدبیر کوئی سعی اور کوئی پونجی بچا رکھنے کی بات سوچی ہی نہیں جا سکتی۔ ایک فرد بھی اگر اپنی عزت اور عظمت کا تحفظ چاہتا ہے تو بسا اوقات اسے اپنی زندگی کی ساری جد و جہد وقف کر دینی پڑتی ہے۔ پھر ایک پوری ملت کی تہذیبی عزت اور دینی عظمت کا حقیقی تحفظ معمولی کوششوں سے حاصل ہو جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے! ۔

تیسرے مسئلہ کا حل چند ہمہ جہتی تدبیروں پر موقوف ہے اور ان تدبیروں کا مؤثر ہونا اقلیتی گروہوں کے اپنے عزم پر منحصر ہے۔ اگر وہ اپنی جگہ یہ طے کر لیں کہ اپنی نئی نسلوں کا دینی و تہذیبی مستقبل ہر حال میں محفوظ رکھیں گے تو یہ صورت حال یقیناً بدل جائے گی جو انکی تہذیب کو برابر چیلنج دے رہی ہے۔ اس کے لئے پہلی کوشش تو انہیں یہ کرنی ہوگی کہ ارباب حکومت پر معاملہ کی نوعیت اور اس کی سنگینی تفصیل کے ساتھ واضح کر دیں اور آپ ان کے احساس ذمہ داری کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ بلا تاخیر اس نصاب تعلیم کو اکثریتی گروہ کے مخصوص عقائد اور روایات سے پاک کر دیں۔ (اگر یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکے تو ماہرین قانون کے مشورے سے عدالتی چارہ جوئی کی جائے) تیسری کوشش اور تدبیر یہ کی جائے کہ اپنے پرائیوٹ تعلیمی ادارے کثرت سے قائم کیے جائیں جہاں بچے اپنے دین اور اپنی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق تعلیم بھی حاصل کر سکیں اور تربیت بھی حاصل کر سکیں۔ یہ ہر صورت میں کرنے کا اور ضروری کام ہے۔ کیونکہ سرکاری اسکولوں کا نصاب تعلیم انتہائی بہتر اور غیر جانبدار کیوں نہ بنا لیا جائے وہ کسی حال میں بھی اقلیتی گروہوں کے تہذیبی مزاج اور دینی طرز فکر سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا اس کے نتائج ان کے حق میں ہمیشہ ناقابل اطمینان ہی رہیں گے۔

حضرات! ہندوستان کے مذہبی اور تہذیبی گروہوں کے اہم مسائل کے تعین اور ان کے حل کی تشخیص کے بارے میں میرے خیالات کا خلاصہ یہی ہے۔ قدرتی طور پر میں نے

یہ گفتگو صرف اصولی باتوں ہی کے بیان تک محدود رکھی ہے کیونکہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن امید ہے کہ یہ مختصر سی گفتگو بھی ضرورت کے مطابق ثابت ہوگی اور بحث کے ضروری خطوط اس سے واضح ہو گئے ہونگے

آخر میں ایک اصولی اور بنیادی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کسی دینی یا تہذیبی گروہ کے مسائل کے حل کے لئے اختیار کی ہوئی تدبیریں کامیاب اس وقت ہو سکتی ہیں جب اس کے اندر ایک عام جذبہ اور ایک اجتماعی حرکت پیدا ہو چکی ہو۔ کیونکہ بلاشبہ ان مسائل میں سے ہر مسئلہ ایک بھاری چٹان ہے اور اس کے حل کی ہر کوشش گویا جوئے شیر لانا ہے۔ اس لئے مسلسل اور منظم کوششیں ہی کامیابی سے ہم کنار ہو سکتی ہیں۔ جس تہذیبی اکائی کو اپنا دینی اور تہذیبی وجود عزیز ہوگا۔ اس سے توقع یہی کی جائے گی کہ وہ اس کی بقا اور حفاظت کے لئے اپنی گروہ بندیاں بھی چھوڑ دے گی اپنے اندر کی جماعتی رقابتیں بھی ختم کر دے گی۔ ورنہ جینے کی آرزو خواب ہی بنی رہے گی۔ اور بکھرے ہوئے تنکے امن و سکون کا آشیانہ کبھی نہ بن سکیں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

۔ حیات نو ۔ مارچ ۱۹۳ء

از: مولانا عبدالحفیظ رحمانی، لوہرس سدھارتھ نگر۔

رامائن اور حضرت ابراہیم علیہ السلام

جماعت اسلامی کا ایک نیا شگوفہ

ماہنامہ دارالعلوم بابت ماہ اپریل ۱۹۹۲ء میں میرا ایک تنقیدی مضمون جماعت اسلامی کے ایک ممتاز اہل قلم پروفیسر عمر حیات غوری کے اس نظریہ کے خلاف شائع ہوا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی رام ہیں اور انہوں نے جو ثبوت فراہم کئے تھے ان کی حیثیت واضح کر دی گئی تھی، غوری صاحب نے راجہ دشرتھ کے سوانح کا جو تقابل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات زندگی سے پیش کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر چسپاں کرنے کی کوشش کی تھی اس مغالطہ کو بھی دو دو چار کی طرح واضح کر دیا تھا۔ لیکن غوری صاحب نے میرے اس مضمون کا جواب ماہنامہ زندگی نومبر ۱۹۹۲ء نئی دہلی میں شائع کرایا ہے۔ اور اس جوابی مضمون میں ان کو اصرار ہے کہ ثابت ہو نہ ہو، ثبوت ملے نہ ملے، شبہ سے بھی فائدہ اٹھا کر سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رام کہہ دیا جائے۔

پروفیسر صاحب کا خیال ہے کہ اگر رام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ثابت کر دیا جائے تو "اس سے دعوتی کام کے لئے زمین ہموار کرنے میں بڑی مدد ملے گی" یہ خیال بجائے خود غلط مقدمات پر مبنی ہے۔ انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ ہماری تحقیق رام کو اوتار ماننے والے بے کم و کاست قبول کر لیں گے اور دونوں شخصیات کو ایک تسلیم کرتے ہوئے اسلام کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس کو خوش فہمی یا غلط فہمی سے تعبیر نہ کیا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ اس کا ایک واضح ثبوت غوری صاحب کے اسی جوابی مضمون میں بھی موجود ہے کہ "ابھی یہ بات بھی محتاج ثبوت ہے کہ ہندوستان میں کبھی رام پیدا بھی ہوئے تھے۔ یہاں اس کی حیثیت محض اساطیری قصوں سے زیادہ کچھ نہیں" یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود جماعت اسلامی کے یہ دیدہ ور رام کو موضوع بحث بنا کر تحقیق کا لوہا منوا رہے ہیں۔ مگر مجھے کہنا یہ ہے کہ رام کی شخصیت محتاج ثبوت ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں کے مسلم اور مرجع عقیدت ہے یا نہیں؟ کتنے ہندو ان کے وجود کے قائل نہیں ہیں، اور رام سے منسوب واقعات کو سچا باور نہیں کرتے۔ ان حالات میں اگر غوری صاحب اپنی تحقیق کو مکمل بھی کر لیں تو اس انکشاف کے اثرات کیا مرتب ہوں گے اور دعوتی کاموں کے لئے زمین کس قدر ہموار ہوگی۔ زیادہ امکان منفی اثرات کے مرتب ہونے کا ہی ہے۔ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا قضیہ تو سب کے

سامنے ہے علاوہ ازیں تحقیقی کاموں سے دلچسپی لینے والا طبقہ بہت محدود ہوتا ہے جو داد تحقیق تو دے دیتا ہے لیکن اس کو حرف آخر سمجھ کر مذہبی عقیدت کا درجہ نہیں دیتا۔ پھر اس کدوکاوش کا حاصل کیا ہوگا۔ دعوتی کاموں کا دائرہ تو بہت وسیع ہے اور دعوت کے متعدد طریقے ہیں جو مثبت انداز میں کام کرنے کی اپیل کرتے ہیں۔ نیک نیتی سے کسی مثبت طریقہ دعوت کو اپنانا ہی دانشمندی ہے۔ پھر بھی پروفیسر صاحب کو اصرار ہے تو تحقیق فرمائیں۔ مگر تحقیق کے دامن پر اس طرح بدنما داغ نہ لگائیں کہ "رام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فلسطینی نام ابرام سے ماخوذ ہے" درحقیقت رام قدیم عبرانی زبان کا لفظ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت باسعادت سے پہلے یہ لفظ رائج تھا۔ توریت کے بیان کے مطابق بنو سام میں عبر کے پوتے یقطان کے بیٹے کا نام ہدورام رکھا گیا تھا، یہ ہدو اور رام دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بنو سام میں ایک شخص کا نام ارام بھی تھا۔ اس طرح کے اور بھی متعدد نام توریت میں آئے ہیں۔ عمرام۔ ابرام۔ اخیرام۔ یہورام وغیرہ مرکب نام ہیں۔ اس لئے محترم غوری صاحب کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "رام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے ماخوذ ہے" صحیح یہ ہے کہ رام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسم گرامی کا ایک جزو ہے۔ خود ابراہیم مرکب نام ہے۔ عبرانی میں یہی ابی رام تھا۔ تعریب میں ابراہیم ہوا ہے۔

"دارالعلوم" فروری ۹۳ء

احمد ندیم قاسمی

کرۂ ارض

یہ زمیں کتنی اکیلی تھی
جب آدم ابھی تخلیق کے بحران میں تھا
کتنے ستاروں کے انبار لدے تھے اس پر
کتنی صبحیں تھیں
جو انوارِ تجلّی ہوتی آتی تھیں
مگر کوئی انہیں دیکھنے والا ہی نہ تھا
کتنی شامیں تھیں
جنہیں وسعتِ شفق حسن کے مفہوم سمجھاتا تھا
مگر کوئی انہیں جانچنے والا ہی نہ تھا
پھول کھلتے تھے تو حیران نظر آتے تھے
اپنے ہی سینے کھلتے ہوئے سایوں کی طرف
دیکھتے رہتے تھے مگر
اور دیا تھے تو دریاؤں پہ بچھے

جیسے بیگار میں پکڑا ہو عناصر نے انہیں
بحر کی سطح کچھ اس طرح سے لرزاں تھی
کہ جیسے اس نے
اپنی گہرائی میں جھانکا ہو تو کانپ اٹھی ہو
چاند مدھم سا بجھا بجھا تھا — تو خورشید کو شوریدہ کی مانند
بجز جلنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا
یہ زمیں تھی کہ کوئی دشتِ بلا سا پسرا تھا — آسیب زدہ
گھر اس پہ وہ تنہائی تھی
جو ازل اور ابد کی طرح ابہام کے تابوت
میں آسودہ تھی

تب وہ مخلوق زمیں پہ آئی
[illegible]

پھر تو ہر چیز کا ، ہر چیز سے پیدا ہوا
اک مبدأِ بعید
پھول مسکراتے تھے تو اشجار کو وجد آتا تھا
چاند کے نور کو پیتا تھا
تو انگڑائیاں لیتا تھا سمندر کا شباب
شبنمیں جانبِ خورشید سفر کرتی تھیں
شامیں تھپکاتی تھیں اور صبحیں پرندوں کے
اُٹھتے ہوتے سنانے جگانے کے لیے آتی تھیں
کیا کبھی کا وہ عالم تھا
کہ ہر چیز توانائی کی تجسیم نظر آتی تھی
اور فضا — وسعت کے آئینے میں
اپنی تخلیق کی رعنائیاں جب دیکھتا تھا
— جھومتا تھا!

لیکن اے اہلِ جہاں!
یہ جو ہر شہر کے مرکز میں ، صلیبوں پہ
گڑے ہیں لاشے
یہ جو ہر [illegible]
اور تعفن بھری [illegible] قوت کے
نہ جانے کب [illegible]

یہ جو اک نقرئی زر کے لیے چھن جاتا ہے
کھیتوں کا سہاگ
یہ جو اک شخص کے قبضے میں رکھا رہتا ہے
لاکھوں کا وجود
اس سے بہتر تو یہی تھا کہ زمیں اب بھی اکیلی ہوتی
صبحیں انوار لٹاتے ہوئے ، نغمات سناتے
ہوتے گھبرا جاتیں
شامیں تاروں کے کفن اوڑھ کے مرتی رہتیں
پھول کھلتے تو فقط اس لیے کھلتے کہ
انہیں کھلنا تھا
اور اشجار پہ اک ہول سا طاری رہتا
سرِ دریا کوئی سایہ بھی نہ آنے پاتا
بحر پر تند سے بپھری ہوئی موجوں کے بگولے چلتے
سورج اور چاند ، سرِ صحنِ افلاک
چمکتے ہوتے ، ڈوبتے ہوتے
ابنِ آدم — سرِ فردوسِ بریں
اپنے خدام فرشتوں کے جلو میں چلتا
اور زمیں دوسرے سیاروں کی مانند
فقط گردشِ بے کیف میں تا حشر بھٹکتی رہتی!

"فنون" لاہور۔ اپریل، جولائی ۱۹۹۳ء

احمد ندیم قاسمی

دھرتی کا لمس

لمس دھرتی کا نہ محسوس ہو جس شاعر کو
اس کا انسان کی سوچوں پہ کبھی بس نہ چلے

کیا خبر اس کو، کہ ویرانۂ دل میں کیسے
گردباد اُٹھتے ہی اُڑ جاتا ہے صحرا کا قرار
اور اُفق تا بہ اُفق بنتے ہیں ٹیلوں کے مزار

اس کو معلوم ہی کیا، ذہن کے ایوانوں میں
کتنے فانوس جلے، جل کے بجھے، بجھ کے جلے
زندگی ایک ابابیل ہے، جس کا اک پَر
کوئی صیاد لئے بیٹھا ہے پاؤں کے تلے!

اس کو کیا علم، کہ اضداد کا مفہوم ہے کیا
کیسے تلوار بھی کھینچو تو کوئی اُف نہ کرے
اور اگر پھول بھی مارو تو سسک کر رہ جائے

کیا پتہ اس کو، کہ جذبے کے مسافر اکثر!
دن کی ظلمت میں بھٹکتے ہیں بعنوانِ اصول
رات کی دھوپ میں جل جاتے ہیں آئینے کے پھول
صبح کی دُھند سے چھا جاتی ہے احساس پہ شام
گلستانوں میں اُلجھ جاتی ہے دامن سے ببول
ریگزاروں میں مہکتے ہیں بہاروں کے رسول

▽

تخلیق ۵ فروری ۱۹۷۳ء



جے شری رام

انور رشاد بیگم
۲۶۱ - ... لین، نشاط گنج، لکھنؤ

تم اگر
جے شری رام کی تلوار کے ساتھ آئے ہو
تو آگے بڑھو
سر حاضر ہے
قلم کر لو
تلوار کے سامنے میری زبان سے
یہ تین شبد کبھی نہیں نکلیں گے
لیکن اگر
تم جے شری رام کے پاون شبد کے ساتھ آئے ہو
تو گلے لگ جاؤ
پھر میرے آگے نہیں
میرے پیچھے پیچھے چلو
تاکہ میں اپنے دیش کی سرحد تک اس پاون
ساری دنیا کی آلودہ فضاؤں کو
رام کے مبارک نام کی گونج سے معمور

"الشارہ" مارچ ۱۹۹۳ء

خطاب بہ جاوید! (ساتواں اور آٹھواں بند)

نئی نسل سے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

امیر قمر ! [illegible] بات

[illegible]

ابر ضیا
[illegible]
[illegible]
ابر ضیا
[illegible]
جو کے پھول کس لیے کانٹوں سے ہٹ گئے؟
گل رنگ میں سیاہ دائرے کیسے ابھر گئے؟
ہر شجر رنگ کہ ہر سایہ کیسے ہو گیا؟
یہ کیا ؟؟
یہ کیوں ؟؟
یہ کس کے ہاتھ ہے کہ جو
ساتھی آگ ہو گئے
ساتھی راکھ ہو گئے
جو چاند تھے سبھی [illegible] گئے
وہ کیسے [illegible] ہو گئے؟
ابر ضیا کہو ذرا ، ذرا !!
ابر ضیا کہے !!
کہ اس کی جبیں پہ جلے ہوئے
قلم والے لہو کے ہیں !
کہ اس کی آنکھوں میں سے بہے ہوئے
قلم رنگ ہی لہو کے ہیں
کہ اس کی آنکھوں میں بہے ہوئے
قلم کس کی
لہو کے ہیں !!!
ابر ضیا کہے !!
وہ پھول [illegible] کون ہے
کہ ان کے [illegible] سارے [illegible] گئے
[illegible]
وہ گل [illegible] گئے
وہ سب [illegible] جسم و جاں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
وہ کس کا رزق ہو گئے؟
کہاں پہ جا کے سو گئے؟
وہ کس [illegible] کو گئے؟
کہ [illegible]
جہاں "[illegible]"
[illegible] کی [illegible] ہو گئے؟
ابر ضیا
[illegible]
مجھے تو [illegible]
کہ [illegible] پہ وصل کیسے ہو گیا؟
جو [illegible] کے [illegible] تھی
وہ سانس کیسے ختم کی؟
[illegible] رسم کیا ہوئی؟

(روزنامہ خیال اپریل ۹۳ء)



گیت

رحمان خاور

سچ بول نہ بول سائیں
سچ بول نہ بول
جھوٹ کو لے کر کھیتک آیا ، سچ کا پڑا اکال
چاروں اور دھرا پر پھیلا سوچاؤں کا جال
امرت میں بھی آج کسی نے زہر دیا ہے گھول
سچ بول نہ بول
سارے ساتھی سارے سنگی ڈسنے والے ناگ
پھول کھلے ہونٹوں پہ جن میں بھری کپٹ کی آگ
ان ہی ناگوں پر اپنے من کا دوار نہ کھول
سچ بول نہ بول
کیا گیانی اور کیا اگیانی ، سب چھایا سب دھوپ
جس نے اپنا روپ گنوایا امر بھیا کے سروپ
سچائی کی وسعت سے تو بھی چن لے موتی لال
سچ بول نہ بول سائیں
سچ بول نہ بول

"معیار" مئی ۹۳ء

اشعار: ضمیر جعفری

یوں سمت آج نہیں عمر تری یاد آ گئی
جیسے بکھر جائے اچانک بانس کے جنگل میں آگ
جیسے سناٹوں میں لب پہ دفعتاً آ جائے راگ
یا کنول جیسی سنہری دھوپ میں لہرا گئی

کتنی شدید ہے فراق کی تنہائیاں مجھے
عالم یہ بن گیا ہے مٹایا نہ جائے گا
بے ہوش ہو کے ہوش میں آیا نہ جائے گا
اب پاس آ بچیں مری رسوائیاں مجھے

میرا مان اور میری مایا سائیں فکر تمہاری
میں سب کری اور گن ہاری میں اک مست مداری

گھونسہ یہ ٹھیک آئے تو ہم بھی ظاہر ہاری
دام نہیں تو ور کیسی کسوٹی، تف کنجوسوں کی یاری

کل مندر سے جھوٹی چلا ہے مسجد کس شوالے
منبر چومنے سے بھی پہلے سوچنے والے

منا نانو سے آئے تو یہ کچھ پھل ہے
ننھے پیلے موتی رنگوں سے بھرے ہی کیسی تر ہے

پایاب شب سراغ سحر بھی نہیں رہا
منزل تو کیا ملے گی سفر بھی نہیں رہا

یہ سب حسن کہ جیسے رگوں میں لہو نہ ہو
یہ سب طلب کہ صحت کا ڈر بھی نہیں رہا

جس میں کبھی کبھی اتر آتی تھی چاندنی
ملبہ میں وہ منظر وہ بھی نہیں رہا

احساس آئندہ کے بغیر آئندہ عبث
وعدہ گر گئی ہے تو سر بھی نہیں رہا

ظہیر احمد صدیقی

بیدل کی فارسی غزل کا ترجمہ

میرزا عبدالقادر بیدل

مینا از چہ خرابات جنون کرد بہارش؟
کآفاق بخمیازہ گرفتہ است خمارش!

شام این ہمہ سامان کدورت ز کجا یافت؟
کز زنگ نشد پاک کفِ آئینہ دارش!

گردون بتمنای چہ گل میرود از خویش!
عمریست کہ بر گردش رنگ است مدارش

دریا بحضور چہ جمالست مقابل!
کز خانۂ آئینہ گرو برد کنارش

صحرا برمِ ناز چہ محمل فکر افگند
کاندیشہ پریخانہ شد از رقص غبارش!

○

ظہیر احمد صدیقی

مینا کس بزمِ خرابات جنوں کی ہے بہار؟
کہ جہاں سارا ہے خمیازہ کش دردِ خمار

کیسے ملا شام کو سامانِ کدورت آخر!
نہ ہوا رنگ سے پاک اس کا کفِ آئینہ دار!

[illegible]

وہ حسیں کون ہے دریا ہے مقابل جس
کس لیے خانۂ آئینہ ہوا اس کا

چشم صحرا میں ہے کیا کوئی رمِ محمل
کہ پری خانۂ اندیشہ بنا رقص

○

میرزا عبدالقادر بیدل

شبنم بہ حیرت دم افسرد کہ چون
یک آبلہ گردید ہمہ کام دو پا

آئینہ ز کلفت چہ مشرب زدہ
کز ہر چہ رسد پیش نہ فرد است و نہ

دل ریز چہ سحر است کہ در دیدہ
حسن است و نیفتاد بہیچ آئینہ

عمر از چہ شتاب این ہمہ آشفتگی
کآتش بنفس ورزد و بگرفت شر

بیدل ز چہ مکتب سبق آگہی آمد
کاینجا بحقیقت خامہ گرفتہ است

○

ظہیر احمد صدیقی

[illegible]

جانے آئینہ ہے کس مذہب و مشرب کا امیں
سامنے آئے جو اس کے ہے اسے فخر نہ عار

دل عجب چیز ہے تحقیق کی قلمرو میں تو وہ
حسن ہے خود نہیں آئینہ سے اس کو سروکار

کس خیالی سے ہوئی عمر بسر آشفتہ دماغ
سانس کو آگ دکھا کے اسے کرلی ہے شرر

دولت آگہی بیدل تجھے کس نے بخشی
ترے اندر سے ہے ٹوٹی قلم گوہر بار

○

میرزا عبدالقادر بیدل

لب از پ لب ضبط نفس کردکہ ہر سنگ
بعطر مژہ خوابانده چہ تکلیف خرامش!
ابر از پ گوش این ہمہ سامان عرق داشت!
آئینہ بچکید از نم خمیدہ ننگارش

عشق ازو طرفت رقص بجبیں شب داد؟
کز عرض بمعنی داد لب خندہ سوارش!

گلشن ز چہ میش رنگند آموخت گلگشتش؟
کاملاد سرو کہ بیدای نگارش!

بلبل ز چہ ساز انجمن آرای طرب بود؟
کز یک لب منقار ستودند بہارش

طاؤس بپرواز چہ گزار پرافشاند؟
کز خود بچکید آئینہ ای نقش و نگارش!

○

عقل کو اس طرح کیا ہے کہ ہے خندہ بلب؟
دست ہے سبز شب رقص قمر ہے سدا

سیکش نہ کیا ہے کہ ہوا جس سے شگفتہ ہر چمن
کہ رنگیں اس سے خلق سبھی دلدادہ لگ

جانے کس ساز سے بلبل ہوئی نغمہ پیرا!
اس کی منقار کی نے ہائیکے ہے ہم اس کا برابر!

جلوہ طاؤس ہے پرواز میں گوہر افشاں!
خود سے اتری ہے یا آئینہ نقش و نگار

○

میرزا عبدالقادر بیدل

نسخہ بحر ساز بیک فطرت تبسم گل سر جوت
ز بوی گل تا نوای بلبل ندای تسبیح گفتگوت

سر لیس ما تہ از دو پیام گزر وصل ما ہ
چمن رنگ رفتم ز خویش دیگر ہ رنگ باشد نگاہ بہ روت

اگر بجلوہ تو آبیاری دگر چرا خم تو شد کہ ای
ز حیرتم من خبر نداری بیادم آئینہ رو بروت

جنون نگند دل ہوای ہم بیاد از شد خود وطن
رہا ست سررشتہ نفس ہم چو بند آہسی جستجو

کجاست مضمون مقتدای کہ بیدل الفا کند تا
ہمانشم دیگر نداری بجز خم موش خم سر

○

میرزا صائب

دم بخود کس کے لب سے ہیں یہ سامنے کون؟
دل ہر رنگ میں غلطاں ہے چہ لالہ و کر

میرزا صائب

نالہ کو کس کی ہوا اتنا کہ ہے طوطی ماندہ
ہے نرم جھکا ہوا کہ کے اندر آئینہ ہوا

کہیں بحر ساز تبسم گل کا فطرت تبسم گل سے
کہیں تماشا کہ ہے گل کی یک ساتھ نشہ

صبا سر کو جھکی سے آئی پیام گونہ وصل لیکر
جہاں میں ہے خود غیر و منکر کہ جان میری اسے جان تو ہے

اگر ہمی جیل بند تو ہے چراغ اگر ہیں تو نور تو ہے
تو میری حیرت سے ہے نظر ہے سے آئینہ تیرے سے ودود
ہے

جنوں و نازش دل ہوس بھی قمر سے اتنا نہیں شاد وطن کی
رہا ہے یہ رشتۂ نفس بھی کہ جس قدر تیری جستجو ہے

کہاں ہے سخن بھلا ایسا کرے جو بیدل اسے ہی اتنا
ہے گلہ جلوہ زار اک بس اسے جان جو نمد تار ہے

میرزا عبدالقادر بیدل

بے وصل بست در رنگ بہار آمد
بیگدرم دل کہ گردم آئینہ آمد

کیست کہ فہمد زبان بیمانیہای من
لذت دیدار ہی غنچہ طپید آمد

بسکہ ہر جلوہ او گشت سراپای من
حیرتم عکس است اگر گردم دیوار آئینہ

نہ دل خواہی بگر تاہر آرائی باش
جوش زنگار است و بس نقش و نگار آئینہ

دام جوہر لوز طاؤس وارد در بغل
لیکن رنگی کہ شد یارب شکار آئینہ

بے خودی ساغر کش کیفیت دیدار کیست
در شکست رنگ ہی چشم بہار آئینہ

ظہیر احمد صدیقی

وصل کی خوشبو رنگ بہار آئینہ
دل کو چھوتی بھی میں آئینہ آئینہ

کون ہے جو کہے میری ہے عاشق کی زبان
لذت دیدار مانگے ذرے طپید آئینہ

ہی سراپا بسکہ خود جلوہ جانے دوست جاں
میری حیرت عکس ہو گر جل دیوار آئینہ

ہر دل کی گر طلب ہے تاہر آرائی نہ کر
جوش ہے زنگار کا نقش و نگار آئینہ

لوز طاؤس رنگے دام جوہر در بغل
کہ رنگ یارب شد شکار آئینہ

بے خودی ہے مست گلکے بادۂ دیدار سی
میں شکست رنگ میں دیکھوں بہار آئینہ

میرزا عبدالقادر بیدل

امروز کیست مست تماشای آئینہ
کز کار صنع سیرت اجزای آئینہ

ہر حرف حرف جلوہ پرستی دل و ...
گرفت لی نوا دل ما جای آئینہ

حسن و برابر لوز نیرنگ در بغل
ما و دل و یک صدق انشای آئینہ

بیدلی کہ دارد عرض نزاکت سیمای ...
... آئینہ

...ئہ چشم باز کنی جلوہ سپید
...بت شبہت ز سمای آئینہ

...، بہر دل دردمند آرزوی داغ
...د است باب تمنای آئینہ

...ید صدیقی

. آج کون مست تماشائے آئینہ
رہے ہیں ناز سے اجزائے آئینہ

چند عمر جلوہ پرستی میں صرف کی
کو مرے گھر نہ مل جائے آئینہ

حسن اور برابر لطف نیرنگ ہو ہر...
میں اور دل کا اک ورق الٹائے آئ...

جس وقت سامان پہ نزاکت نما جہا...
پال آ گیا دیدۂ بینائے آئ...

جس سر کو کہیے جلوے میں ہو...
ہے اسم شبہت تو سما ہے آ...

ہر دل کو کب کریں وہ عطا آرزوئے دا...
بیدل سکندری ہے تمنائے آ...

"نگارش" (۲) ۹۲

عبداللہ غازی

مہاجر

ہم آگئے ہیں، مگر خالی ہاتھ آئے ہیں
ہمارے خواب تھے ایسے
کہ ساتھ آنہ سکے
حسین خیال، جنھیں ہم سفر بنا نہ سکے۔
تصورات!
جو راہِ سفر میں چھوٹ گئے
تخیلات
جو ٹکرائے یادِ ماضی سے
بکھر کے ٹوٹ گئے

یہ راستہ ہے کہ منزل؟
پتہ نہیں چلتا
گمان ہوتا ہے اکثر
قریب منزل کا
زمیں یہاں کی الگ
آسماں یہاں کا جدا
شعارِ زیست عجب
طریقِ فکر نیا

وہ خواب!
پالا تھا برسوں سے جن کو سینے میں
یہاں وہ خواب حقیقت بنا نہیں سکتا
تصورات کو
پھر سے چلا نہیں سکتا
تخیلات کی دنیا
سجا نہیں سکتا۔

کٹھن ہے زیست بہت
مگر!
میں لوٹ کے واپس بھی
جا نہیں سکتا۔

931, SOUTH LAFLIN
CHICAGO, ILLINOIS 60607 (U.S

دوسرا بن باس

کیفی اعظمی

رام بن باس سے لوٹ کر جب گھر میں آئے
یاد جنگل بہت آیا جو نگر میں آئے
رقصِ دیوانگی آنگن میں جو دیکھا ہوگا
۶ دسمبر کو شری رام نے سوچا ہوگا
اتنے دیوانے کہاں سے مرے گھر میں آئے

جگمگاتے تھے جہاں رام کے قدموں کے نشاں
پیار کی کہکشاں لیتی تھی انگڑائی جہاں
موڑ نفرت کے اسی راہ گزر میں آئے

دھرم کیا ان کا ہے، کیا ذات ہے، یہ جانتا کون
گھر نہ جلتا تو انھیں رات میں پہچانتا کون
گھر جلانے کو مرے لوگ جو گھر میں آئے

شاکاہاری ہے مرے دوست تمہارا خنجر
تم نے بابر کی طرف پھینکے تھے سارے پتھر
ہے مرے سر کی خطا زخم جو سر میں آئے

پاؤں سرجو میں ابھی رام نے دھوئے بھی نہ تھے
کہ نظر آئے وہاں خون کے گہرے دھبے
پاؤں دھوئے بنا سرجو کے کنارے سے اٹھے
راج دھانی کی فضا آئی نہیں راس مجھے
۶ دسمبر کو ملا دوسرا بن باس مجھے

ہمیں انسان رہنے دو



محمود شام

ہم دین حق مانگا
تو ہم اجڑے
ہمارے گھر جلے
ورثے لٹے
ہم کٹ گئے صدیوں کے رشتوں سے
پرانے حق تو کیا ملتے
نئی محرومیاں ہی ریزہ ریزہ کر گئیں ہم کو
پرانے موسموں میں پھر بھی غیرت تھی، مروت تھی
نئے موسم نہ جانے کونسی مٹی سے اٹھے تھے
وہ اپنی خواہشوں کی آندھیوں میں اتنے اندھے تھے
کہ ہم وطنوں کی آوازیں بھی ان کو زہر لگتی تھیں
جو ہم وطنی میں حق مانگا
تو پھر اجڑے
لہو بہنے لگا
کٹنے لگے بازو
بدن کی دھجیاں اڑنے لگیں، روحیں تڑپتی تھیں

ہمارے حق تو کیا ملتے
ہمیں پھر بانٹ ڈالا۔ کاٹ ڈالا
فاصلے بڑھتے گئے دم بدم
اسی حق کی تمنا میں ہمیں بانٹا گیا پھر سے
چلو اب کے زباں کے نام پر مانگو
بلند آواز سے مانگو
کھلے حلق سے مانگو
مگر اپنا مقدر پھر وہی ویرانیاں، مقتل
لہو، وحشت، ستم، بے روزگاری، دربدر ہم تم
کہاں کا حق تو کیا ملتا

نئی راہ سمتوں کا دور دورہ ہے
چلو اس بار ہم انسان بن کے مانگنے نکلیں
نہ پھر تقسیم ہم ہوں گے
نہ پھر تسخیر ہم ہوں گے
نئی پہچان ہوگی اور نہ اب کوئی نیا نعرہ
ہماری ایک خواہش ہے
ہمارا ایک نعرہ ہے
ہمیں انسان بننے دو
ہمیں انسان رہنے دو

۱۱ جنوری ۱۹۹۳ء

کیسی قوم کہاں کا ملک!

نئی بات کہیں گے ہم تو کیسی قوم کہاں کا ملک
پہلے اپنی فکر ہے ہم کو کیسی قوم کہاں کا ملک

مہر و وفا پر مٹی ڈالو کیسی قوم کہاں کا ملک
اپنے جسم و جاں کو دیکھو کیسی قوم کہاں کا ملک

ملت ہے کس کھیت کی مولی وطن ہے کس چڑیا کا نام
کوئی دوسرا قصہ چھیڑو کیسی قوم کہاں کا ملک

ملک و قوم ہماری جیب میں پیسہ بن کر بولتے ہیں
پیسے کی جھنکار پہ جھومو کیسی قوم کہاں کا ملک

قومی ترانے سب افسانے تم دیوانے ہم دیوانے
راک اینڈ رول اور ڈسکو ناچو کیسی قوم کہاں کا ملک

ہم تو اپنے شوق کی خاطر ساری سیاست کرتے ہیں
اس کو ہماری ہابی سمجھو کیسی قوم کہاں کا ملک

پی آر ہے سب سے آگے باقی سب ہیں خواب کے دھاگے
ان دھاگوں کو توڑو پھینکو کیسی قوم کہاں کا ملک

یاؔد تمہاری طنز بھری ان باتوں سے دم گھٹتا ہے
اٹھو ہمارے پاس سے اٹھو کیسی قوم کہاں کا ملک

مشکور حسین یادؔ

"اردو ڈائجسٹ" فروری ۱۹۷۲ء

احمد فراز

○

اُس نے سکوتِ شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات، بام پر ماہِ تمام رکھ دیا

امدِ دوست کی نوید، کوئے وفا میں عام تھی
میں نے بھی اک چراغ سا دل، سرِ شام رکھ دیا

شدتِ تشنگی میں بھی غیرتِ میکشی رہی
اُس نے جو پھیر لی نظر، میں نے بھی جام رکھ دیا

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں، بر سرِ عام رکھ دیا

اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

اس نے نظر نظر میں ہی، ایسے بھلے سخن کہے
میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر، بچوں کا نام رکھ دیا

○

تُو نہ چاہے تو نہیں ہوں، تُو جو چاہے تو
مری اوقات ہی کیا ہے، پر کہا ہے تو میں

تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی
تُو اگر اپنے تعلق کو نباہے تو میں

دل نے کب شیوۂ دریوزہ گری رکھ
تیرے در پر نہ ہوا میں، سرِ راہے تو میں

تُو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں
یاد، اکثر نہ سہی، گاہے بگاہے تو میں

حیف اُس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراہے تو میں

اور کیا چاہیے اس فقر و فقیری میں
صاحبِ خرقہ و پیوند لگا ہے تو میں

"فنون" جنوری

احمد ندیم قاسمی

○

انجام بُرا ہوا انا کا
در بند ملا مجھے خدا کا

میں تکتا رہا ہوں شام تا شام
رستہ کسی دیر آشنا کا

اب عشق کریں تو کس بھرم پر
معیار ہی گر گیا وفا کا

دلہن کی بھتیجیوں سے پُوچھو
کیوں زرد رہا اثر حنا کا

نکلیں اگر ابتدا سے ہم لوگ
تب مرحلہ طے ہو انتہا کا

زیتون کی شاخ کو سنبھالو
پَر ٹوٹ گیا ہے فاختہ کا

چڑیاں بھی خموش ہو گئی ہیں
شاید یہی وقت ہے دعا کا

(فنون ۳۷، ستمبر دسمبر ۹۲ء)

احمد ندیم قاسمی

○

تیری جانب سفر حیات مری
تُو مرا ہے تو کائنات مری

عکس در عکس تُو نظر آئے
بٹ گئی آئنوں میں ذات مری

اپنی اپنی ہیں ساری مملکتیں
سارا دن تیرا، ساری رات مری

پوری دنیا سراپا استعجاب
سُن کے اک سیدھی سادی بات مری

میں کہ مسجود ہوں فرشتوں کا
عرش تک حدِ ممکنات مری

میرے اندر ہزار دنیائیں
اور پھر اَن گنت جہات مری

میرا فن میرے بعد بھی زندہ
یوں ہوئی موت سے نجات مری

اپنے باطن کا ترجماں ہوں ندیم
میرا ہر شعر، واردات مری

"فنون" جنوری۔ اپریل ۹۳ء

انور شعور

ہی ہے بُری بھلی میری
جیسے اوقات ہو یہی میری

و دیوار کے سوا گھر میں
بات سنتا نہیں کوئی میری

ر دو چار دن کا کھیل نہیں
عمر برباد ہو گئی میری

ں گزرے تو گونج اٹھتی ہے
کتنی سنسان ہے گلی میری

ب گئیں اک تری تمنا میں
آرزوئیں بڑی بڑی میری

ما بڑا شور صبح آنے کا
آنکھ تک تو نہیں کھلی میری

ف بکھرے ہوئے ہیں محفل میں
کون دیکھے گا سادگی میری

تمہارے مزاج میں آئے
کیا خوشی اور ناخوشی میری

م کس کا بتاؤں، کس کا نہیں
شہر بھر سے ہے دوستی میری

سا لگتا ہے، بات چیت اس سے
ہو رہی تھی ابھی ابھی میری

آپ کیوں منہ بگاڑتے ہیں شعور
میرے ہونٹوں پہ ہے ہنسی میری

ذرا دیر آشیانہ چاہتا ہوں
مسافر ہوں، ٹھکانا چاہتا ہوں

سکوں ملتا ہے رونے سے نہایت
مگر میں مسکرانا چاہتا ہوں

جسے بھولے ہوئے ہے ایک دنیا
اسی کو میں بھلانا چاہتا ہوں

سفر کی دھول کیسے صاف کر لوں
اسے صورت دکھانا چاہتا ہوں

میں اس کے سامنے خاموش رہ کر
نہ جانے کیا چھپانا چاہتا ہوں

مرے آنے کا مقصد پوچھتے ہو؟
ادھر دیکھو، بتانا چاہتا ہوں

شعور اپنا وطن، اپنا وطن ہے
یہیں کا آب و دانہ چاہتا ہوں

«فنون» جنوری-اپریل ١٣

سید ضمیر جعفری

○

دشت آئے گا، پہاڑ آئیں گے، دریا آئے گا
پھر کسی بستی سے باہر کوئی خیمہ آئے گا

چھوٹی چھوٹی حسرتوں پر آئی نا آسودگی
تو اگر دریا پہ بھی جائے تو پیاسا آئے گا

کب تلک آخر ان سیہ محرومیوں کی عمر قید
کوئی تو دیوارِ زنداں میں دریچہ آئے گا

گاؤں یوں گم سم ہیں جیسے ان کی گلیوں سے کبھی
اب کوئی بارات گزرے گی نہ دولہا آئے گا

اک عجب لذت ہے بچپن کے گھروندوں کا لمس بھی
پیڑ جب تک کٹ نہیں جاتا، پرندہ آئے گا

کل کے بچوں کے کنول چہروں سے دھل جائے گی دھول
خوابِ فردا دیکھنے والو! وہ فردا آئے گا

یہ ستارے تو فلک کی ناخلف اولاد ہیں
کون کہہ سکتا تھا، ایسا بھی زمانہ آئے گا

تم کوئی اپنے لہو سے عہد نامہ تو لکھو
بات میں رس اور لفظوں میں کرشمہ آئے گا

آدمی کے ساتھ اس کے خواب مرجاتے نہیں
ہیر اب بھی منتظر ہے اس کا رانجھا آئے گا

ہم تو خیر انساں تھے، کچھ الفاظ پگھلے بھی تو کیا
دھوپ اتنی ہے کہ پتھر کو پسینہ آئے گا

کون موتی لا سکا ہے بحر میں ڈوبے بغیر
موت سے تم زندگی مانگو تو جینا آئے گا

آسماں پر سرخ صادق رونقیں جاگی تو ہیں
رات کو جانا ہے، جائے گی، سویرا آئے گا

فطرتِ فیاض سے مایوس ہونا ہے غلط
تم کسی پتھر سے گزرو گے تو رستہ آئے گا

تو محاذِ جنگ سے پسپا ہوا تو راہ میں
جو بھی شخص آئے گا، تیرے قد سے اونچا آئے گا

راستے سارے کھلے ہیں راہ رو کے واسطے
رخ اگر قبلے کی جانب ہے، مدینہ آئے گا

کس نے جنگل میں اکیلی بھیڑ دیکھی ہے ضمیر
شیر شہروں میں بھی آئے گا تو تنہا آئے گا

ظفر اقبال

وبا نہیں ہے اور برابر ڈھونڈتے ہیں
ہے جسے دنیا کے اندر ڈھونڈتے ہیں

فان گلیوں میں کہیں پھرتا ہے
کو شہر سے باہر نکل کر ڈھونڈتے ہیں

ے رنگ رفتہ ہے سر عاک تماشا
آنکھوں میں تھے ان کو ہوا پر ڈھونڈتے ہیں

آنکھوں میں رکھ کر اک تلاش رائگاں کو
ہوتا نہیں ہے اس کو اکثر ڈھونڈتے ہیں

آنکھوں سے کس کو دیکھتا ہے کس جگہ پر
کچھ بھی نہیں ہے اور سراسر ڈھونڈتے ہیں

باہر ہے اس کو کھوجتے ہیں جان و دل میں
بیٹھا ہے اندر اس کو باہر ڈھونڈتے ہیں

ہے بھی یا نہیں شک سا ہے کوئی اپنے اندر
پایا ہے اسی کو بار دیگر ڈھونڈتے ہیں

ے جا بھی چکا دیوانہ اپنی بات کہہ کر
لڑکے ابھی سڑکوں پہ پتھر ڈھونڈتے ہیں

ے جنکی شاخ سخن قول تھی کیسی
وہ لمحہ تھا ظفر جس کو مکرر ڈھونڈتے ہیں

بہت مشکل میں رہنا اور کبھی آسان ہو جاتا
اگر کچھ بھی نہ ہو سکتا تو بس حیران ہو جاتا

کسی طوفاں سے گھر جاتا ہے جیسے شام پڑتے ہی
پھر اس میں رفتہ رفتہ آپ بھی طوفان ہو جاتا

کوئی دشمن نہیں کوئی مخالف بھی نہیں لیکن
یہ کس سے لڑتے لڑتے اس طرح ہلکان ہو جاتا

بدل جاتا بھی ہے اندر کا یہ موسم کسی لمحے
بہت آباد بھی ہوتے ہوئے ویران ہو جاتا

سفر کی شرط ہی کرنی ہے پوری جس طرح بھی ہو
سواری ہو نہیں سکتا تو پھر سامان ہو جاتا

ہماری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا کسی صورت
یہ بے آباد گھر میں آپ کا مہمان ہو جاتا

ہم اس کے گھر کا حصہ ہی جو بنتا چاہیں تو کیا کم ہے
در و دیوار ہو رہنا کبھی دالان ہو جاتا

کبھی اس بھیڑ سے باہر نکل سکتا بھی ہو ممکن
اکیلے بیٹھے بیٹھے اس قدر گنجان ہو جاتا

ظفر رکھتا تھا آواز و ہوا سے رابطہ کچھ تو
بہت اچھا نہیں لگتا ہے یوں سنسان ہو جاتا

شب خو
جنوری، فرو

ظفر اقبال

بہتا نہیں خاموش گھنیرے میں اندھیرا
پھیلا اور دھڑکتا ہے اندھیرے میں اندھیرا

جو صورتِ حالات ہے پہلے تو نہیں تھی
کیا ہے گھٹا ٹوپ تو ڈیرے میں اندھیرا

نکلی ہوئی تھی رات سے پہلے ہی سے چاند
بادل نے کیا اور دلیرے میں اندھیرا

البتہ سمندر کی سیاہی ہے الگ چیز
جنگل میں ہے اتنا نہ بسیرے میں اندھیرا

پھولوں کو ٹٹولیں گے تو ہوگا کہیں معدوم
تیرے میں زیادہ ہے کہ میرے میں اندھیرا

یہ پیار کا دستور بھی عجب ہے کہ جہاں پر
گھاٹے میں اجالا ہے تو دھیرے میں اندھیرا

جس وسط میں ہوں اور مجھے اندازہ نہیں کچھ
ہے میرے بکھیرے کہ بکھیرے میں اندھیرا

گھلتی ہی گئی روشنیِ خوابِ معانی
بڑھتا رہا الفاظ کے گھیرے میں اندھیرا

تو شامِ حریفاں پہ ظفر خوش نہ بہت ہو
اتنا ہے ترے سامنے سویرے میں اندھیرا

شیشۂ جاں پہ ذرا سا ہی ضرر
ہم سے ملتا ہے سو اتنا تو اثر
شاید اس بار نتائج ہوں کوئی
اپنی محفل میں ہمیں بارِ دگر
مجھے دے جانے وہ اک لمحۂ خوا
اور مجھ سے یہ مرے شام و سحر
راستے ہی میں کہیں بیٹھا ہوں ر
کوئی آ کر مرا سامانِ سفر
یونہی بے سمت نکل پڑتا ہے د
اس سے پہلے کہ مجھے راہگزر
لے کے جائیں گے جہاں تک
غیر ممکن ہے وہاں میرا ہنر
شہر میں کوئی اگر ہے مرا
راستہ بھول گیا ہوں، سے مجھے گ
شکل پھرتا ہوں جس سمت ملا
اگر آئے بھی تو کیا جانے کدھر
اب تو میں آپ بھی تیار ہوں جا
آخری عمر کا یہ عشق جدھر

شب خون، جون جولائی ۱۲



عابد اللہ غازی

◆

ذکرِ یارانِ وطن سے دل کو بہلاتے ہیں ہم
ہم صفیرانِ چمن تم کو بھی یاد آتے ہیں ہم

مٹ گئے سب بھی مقدر تھے دلِ صد پارہ کے نقوش
جا بجا پہچانے ہوئے چہرے بھولے جاتے ہیں ہم

ایسی وحشت ہو کہ دل لگتا نہیں احباب میں
اور تنہائی میسر ہو تو گھبراتے ہیں ہم

انقلابِ دہر سمجھیں یا اسے تاثیرِ عشق
بے محابا وہ ملے ہیں تو شرماتے ہیں ہم

اپنی اس عادت پہ ہم اکثر پشیماں ہو چکے
جب زباں پہ بات آتی ہے تو کہہ جاتے ہیں ہم

یہ شرابِ وصل ہے ملتی نہیں بازار میں
اس کی چشمِ شوق سے خود کھینچ کر لاتے ہیں ہم

اللہ اللہ عابدؔ بیمار کو دیکھا نہیں کس کا فسانہ
جیسے کہتے ہوں کہ تجھ سے عشق فرماتے ہیں ہم

۸۱ء

◆

یہ ضمانت کہ نہیں وقت بدل جائے
آئے طوفاں تو سب کچھ نہ بہا لے جائے

پھول ہی پھول ہیں کہ موسم بھی مغرور کھلا
جانے کس وقت یہ کایا پلٹ جائے

شاخ سے ٹوٹ کے بے سمت سفر ہے اپنا
اب جہاں چاہے زمانے کی ہوا لے جائے

برگِ آوارہ ہوں قسمت پہ بھروسہ ہے مجھے
نازِ شوق جہاں چاہے صبا لے جائے

وقت ٹھہرا بھی اگر ہو تو بھروسہ کیا ہے
گھڑی ساعت سے یہ کب رنگ بدل جائے

حسنِ تعبیر سے بے ربطیِ ہستی ملے
کوئی آنکھوں سے نہ خوابوں کو چرا لے جائے

محسن نقوی

آسماں تھا کہ زمیں، یاد نہیں
کس کو دیکھا تھا کہیں، یاد نہیں

چاند پگھلا تھا، کہ لو دیتی تھی
دھوپ میں اُس کی جبیں، یاد نہیں

تیرے اقرار پہ دل دھڑکا تھا
وہ گماں تھا کہ یقیں، یاد نہیں

دار کو دار کی حرمت بھول گئی
تخت کو تخت نشیں یاد نہیں

دل وہ برباد مکاں ہے اب تو
جس کو خود اپنے مکیں یاد نہیں

دل پہ جب ہجر کا محشر گزرا
کون تھا دل کے قریں، یاد نہیں

جس سے بھیگی ہوئیں آنکھیں محسنؔ
وہ شرر تھا کہ نگیں، یاد نہیں



ندا فاضلی

غزل

اٹھ کے کپڑے بدل گھر سے باہر نکل جو
رات کے بعد دن آج کے بعد کل جو ہوا

جب تلک سانس ہے بھوک ہے پیاس ہے یہ ہی اتہا
رکھ کے کاندھے پہ ہل کھیت کی اور چل جو ہوا

خون سے تر بہ تر کر کے ہر رہگزر تھک چکے
لکڑیوں کی طرح پھر سے چولہے میں جل جو ہوا

جو مرا کیوں مرا، جو لٹا کیوں لٹا، جو جلا کیوں
مدتوں سے ہیں گم ان سوالوں کے حل جو ہوا

مندروں میں بھجن، مسجدوں میں اذاں، آدمی ہے
آدمی کے لیے ایک تازہ غزل جو ہوا

مسلم شمیم

ہمیں پاکستان میں اقلیتوں کو وہی منصب اور حیثیت دینی ہوگی جس کے ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے طالب ہیں ـــــ

یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا (فیض)

سوویت یونین کے انہدام کے المیہ پر گفتگو جاری ہے اور عرصہ دراز تک جاری رہے گی ماضی قریب میں ایک نیا المیہ بھی جنوبی ایشیا میں وقوع ہوا ہے یا اس کی ابتداء ہوئی ہے۔ یہ المیہ دنیا کے سب سے بڑے جمہوریہ ہندوستان میں سیکولرزم کے انہدام کی سنگین صورت حال کا المیہ ہے۔ ہندوستان میں بنیاد پرستی اور مذہبی احیاء پرستی جس فسطائیت کو جنم دے کر پروان چڑھا رہی ہے اس سے ہندوستانی معاشرہ ہی متاثر نہیں ہوگا بلکہ اس کے اثرات ساری دنیا پر پڑیں گے۔ اور خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک پر۔ جنوبی ایشیا کے ممالک تو براہ راست زد پر ہو گئے ہیں۔ اہل فکر و دانش کے لئے یہ انتہائی سنگین مسئلہ تاریخ کا ویسا ہی مرحلہ ہے جب اسپین میں دوسری جنگ عظیم سے کچھ ہی پہلے جنرل فرانکو کی قیادت میں فسطائیت کے عفریت نے سر ابھارا تھا۔ اس دور کے جمہوریت پسندوں نے اسے مجموعی طور پر انسانی تہذیب و تمدن اور ثقافتی ورثہ پر یلغار قرار دے کر جمہوریت اور ثقافت کی مدافعت کرنے کے لئے بین الاقوامی پیمانے پر ایک بریگیڈ تشکیل دیا تھا جس میں اہل دانش اور اہل قلم بھی شریک ہوئے تھے اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے۔ ہندوستانی معاشرے کو جس فسطائیت کا سامنا ہے اس کے ہولناک نتائج اور اثرات کا عالمی برادری اور عالمی رائے عامہ کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہئے اور ہندوستان کی سیکولر جمہوری روایات کی پاسداری اور حمایت کے لئے موثر ہمہ گیر اور جامع حکمت عملی تشکیل دی جانی چاہئے۔

اس ضمن میں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ان تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے جو ہندوستان کے رسائل و جرائد میں بائیں بازو کے دانشوروں اور اہل قلم کی شائع ہو رہی ہیں۔ ان روشن خیال اہل فکر و دانش کا تعلق مختلف فرقوں سے ہے۔ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری جنرل اور مشہور ترقی پسند ناقد و دانشور ڈاکٹر قمر رئیس کی زیر ادارت شائع ہونے والے سہ ماہی جریدہ "نیا سفر" کے مندرجات سے ہندوستان میں فسطائیت کے حقیقی خطرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس۔ "آخر دسمبر ۱۹۹۲ء میں جب اس کا اداریہ قلم بند کرنے کا وقت آیا تو محسوس ہوا جیسے ذہن سے ادب اور اس کے مسائل کی آگہی کے سارے خیمے اکھڑ چکے ہیں۔ ادب کی وہ اقدار عالیہ جن سے میرے وجود کی تہذیب ہوئی اپنی معنویت کا سفینہ لے کر کسی انجان سفر پر چپکے سے نکل چکی ہیں اور میں نیم وحشی ہو گیا ہوں۔ ۶ دسمبر سے اب تک اس ملک میں غارت گری بربریت اور بے دریغ ہلاکت کی جو گرم ہوائیں چلیں، انہوں نے ذہن کو صرف ایک فقط ایک سوال پر مرکوز کر دیا ہے۔ کیا یہ عظیم ملک مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ منافرت کی آگ میں جل کر بھسم ہو جائے گا یا زندہ رہے گا۔ ۶ دسمبر کو ملک کی شفاف پیشانی پر جو داغ لگا ہے اسے بحر ہند کا سارا پانی بھی شاید دھو نہیں سکے گا۔ اس سانحہ کے بعد ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا ہے جس کے خد و خال روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ صرف ایک مسجد کا انہدام نہیں ہے۔ اس وحشیانہ عمل نے مشترکہ تہذیب، متحدہ قومیت اور سیکولر جمہوری نظام کے اس قلعہ کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اس میں دراڑیں ڈال دی ہیں جس کے سایہ میں ہم امن اور سلامتی سے بیٹھے اکیسویں صدی میں ایک جدید ہندوستان کی تعمیر کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ سارے خواب اب ظلمت پرستی کی دھند میں تحلیل ہوتے نظر آتے ہیں۔"

ڈاکٹر قمر رئیس کی اس تحریر کا حرف حرف صورت حال کی سنگینی کی شہادت دے رہا ہے۔ گزشتہ سال؛ اوائل میں ہندوستان کے ایک اور معتبر ترقی پسند شاعر اور دانشور مرحوم غلام ربانی تاباں نے ہمیں دوران گفتگو ۲ دسمبر ۱۹۹۲ء کے ہونے والے المیہ کی پیشگوئی کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ بابری مسجد تو آج کے حالات میں سیکولرازم کی علامت ہے۔ اس طرح اس کا انہدام گویا سیکولرازم کے انہدام پر منتج ہوگا۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ایسا نہیں کہ سیکولرازم پر یقین رکھنے والے ہندوستان میں اقلیت میں ہیں بلکہ بقول ان کے عددی اکثریت سیکولرازم پر یقین رکھنے والوں کی ہے۔ سیکولرازم دشمن طاقتیں منظم ہونے کے باعث موثر ہیں اور سیکولرازم دوست طاقتیں غیر منظم ہونے کے باعث غیر موثر ہیں اگر سیکولرازم پر یقین رکھنے والوں نے بنیاد پرستوں کی جارحیت کا موثر جواب نہیں دیا تو جیسا کہ اب تک ہوا ہے فسطائی طاقتیں پیش رفت کرتی چلی جائیں گی اور معاشرہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جائے گا اور یہ تاریکیاں ہندوستان کی فضاؤں سے نکل کر ارض کے ایک بڑے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی۔ اس کا احساس اہل دانش کر پائے اور بروقت اس کے سدباب کے لئے آمادہ جہاد نہ ہوئے تو جو المیہ ظہور پذیر ہونے والا ہے وہ اپنا دائرہ عمل مکمل کرے گا۔ صورت حال کی سنگینی کے باوجود یہ رائے قائم کر لینا کہ ہندوستان میں سیکولرازم، روشن خیالی اور خرد افروزی کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے۔ قنوطی رویہ کا اظہار ہے اور شکست پرستی کے سامنے سپر ڈال دینے کے مترادف ہے۔

یہ ایسا چیلنج ہے جس نے پورے ملک کے ہر زبان، ہر مذہب، ہر علاقہ کے باضمیر روشن خیال اور سیکولر ذہن کے دانشوروں، ادیبوں، فنکاروں، صحافیوں اور نوجوانوں کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ ملک میں ایک نئی نظریاتی جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔ ایک طرف سماجی انصاف، مساوات، آزادی فکر و اظہار اور انسان دوستی کی اعلیٰ اقدار پر قائم جمہوری نظریہ حیات ہے اور دوسری جانب ہندو احیاء پرستی اور موہوم ہندو تہذیب پر قائم ایک TOTALITARIAN نظام حیات کی بالادستی کا تصور ہے جو فسطائی طاقتوں کی طرح تاریخ اور تہذیب کے سارے مظاہر کو مسخ کر کے پیش کر رہا ہے۔ اس نظام میں کسی دوسرے مذہب، نسل، تہذیب اور نظریہ حیات کے پنپنے اور زندہ رہنے کی گنجائش ہی نہیں۔ اس لئے اس میں آزادی فکر و اظہار کے حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظریاتی جنگ میں صرف مسلمانوں کو نہیں جمہوری نظام کو عزیز رکھنے والی ساری طاقتوں، ساری جماعتوں کو شریک ہونا ہے کہ اس نظریاتی آویزش کا احساس عام ہو رہا ہے۔ سیکولر اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں سے قطع نظر جنہوں نے بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے کے لئے پروگرام اور حکمت عملیاں بنائی ہیں، ملک کی مختلف ادبی، تہذیبی، تعلیمی اور سیکولر مزاج کی مذہبی تنظیموں نے بھی فسطائی طاقتوں کے مقابلہ میں سیکولر جمہوری نظام کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان مذہبی تنظیموں میں بھارتیہ آریہ پرتی ندھی سبھا (صدر سوامی اگنی ویش) اور اسلامی مرکز (صدر مولانا وحید الدین خان) شامل ہیں۔

ہندوستان میں بنیاد پرستی اور احیاء پرستی کے پس منظر میں نظریاتی آویزش کے حوالہ سے پاکستان کے دانشوروں اور اہل قلم کی ذمہ داری اور فرائض یکساں ہیں۔ ہمارے ملک میں روشن خیالی اور خرد افروزی کے خلاف برسر پیکار طاقتیں دراصل بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کی طاقتیں ہیں اور ان کی سرگرمیوں سے ہندوستان میں ہندو بنیاد پرستی کو براہ راست تقویت پہنچ رہی ہے۔ ہمارے یہاں کے رجعت پرست حلقے بڑے تواتر اور استقامت سے سیکولرازم کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ ہندوستان اگر سیکولر ریاست نہ رہا اور وہاں سیکولرازم کے انہدام کا عمل ایک حقیقت بن گیا تو ہندوستان میں مسلم آبادی کا کیا بنے گا اور ان کی حیثیت کیا رہے گی۔ بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کہیں بھی ہو اور کسی مذہب اور عقیدہ کے حوالہ سے، اس کی نوعیت ایک جیسی ہوگی۔ آپ اگر ہندوستان میں ہندو بنیاد پرستی کی مذمت کرنے چلے ہیں تو آپ کو اپنے گریبان میں بھی جھانکنا چاہئے۔ فارسی کا مقولہ ہے کہ ہر چہ برائے خود روا نہ پسندی، برائے دیگراں مپسند۔ آپ اپنے معاشرے میں عقیدت کی بنیاد پر عدم مساوات کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہو کر دوسرے معاشرے میں اپنے لئے مساوات کا خود کو حق دار جانتا کہاں کی منطق ٹھہرے گی۔ ہمارے یہاں ایک مکتب فکر بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ روشن خیالی اور خرد افروزی کی بیخ کنی میں مصروف ہے اور اپنے معاشرہ کو قرون وسطیٰ کی تقلید اور رجعت پسندی کی تاریکیوں میں دھکیلنے کے در پے ہے۔ سیکولرازم کے سلسلہ میں گمراہ کن پروپیگنڈہ اس سلسلہ کی کڑی ہے۔ اگرچہ سیکولرازم نہ تو لادینیت ہے نہ دہریت سے عبارت ہے اور نہ ہی کسی مذہب کو ترک کر دینے سے گریز کرتا ہے اور ایک جمہوری پسند ادارہ رواداری پر مبنی ہے۔ سیکولرازم ایک سائنٹفک اصطلاح ہے جو فسطائی سماجی ارتقا کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ انقلاب اور جمہوریت کے ظہور کے ساتھ [illegible] ہوئی ہے۔ سیاسی اعتبار سے سیکولرازم سے مراد مذہبی امور میں ریاست و حکومت کی عدم مداخلت [illegible]
[illegible]

اور مساویانہ حقوق اور منصب کے حقدار ہوں۔ لہٰذا ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو مساویانہ حیثیت اور حقوق حاصل ہوں تو ہمیں اپنے ہاں کی اقلیتوں کو وہی حیثیت اور مقام دینے کی تدبیر کرنی پڑے گی۔ جس کے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے طالب ہیں۔ ہم اپنے قلم قبیلے سے تعلق رکھنے والوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں گے اور ہندوستان میں بنیاد پرستی اور مذہبی احیاء پرستی کے خلاف نظریاتی جنگ میں اپنے کردار اور عمل سے غافل نہیں ہوں گے اور انہیں اپنے معاشرے میں بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کے مقابلہ میں روشن خیالی اور خرد افروزی کے فروغ کے لئے اپنا زور قلم صرف کرنا ہوگا اور مصروف جدوجہد رہنا ہوگا۔

جمال دوست کرا ہیں شمائل داشتم گفتم
گذشتم از سر خود ہرچہ در دل داشتم گفتم

مطبوعہ افکار، فروری ۱۹۹۳ء

مُسلمان

ایک غیر مُسلم مملکت میں

۱۹۵۳ء میں جب ملک کے جید علماء سے کہا گیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ اگر امتیازی سلوک روا رکھا جائے اور اس کے جواب میں غیر مسلم مملکتیں اپنی مسلمان اقلیت کے ساتھ یہی امتیازی سلوک روا رکھیں، تو کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین بیچ اس مسئلے کے۔؟

[illegible]

جس نظریے کی بناء پر پاکستان میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھنے کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس کے بعض نتائج ان مسلمانوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے جو غیر مسلم حکمرانوں کے تحت ملک میں آباد ہیں۔ ہم نے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے سوال کیا کہ آیا ایک مسلمان ایک غیر مسلم مملکت کی وفادار رعایا ہو سکتا ہے؟

ان کا جواب ذیل میں درج ہے

س: کیا آپ کی رائے میں ایک مسلمان ایک کافر حکومت کے احکام کی تعمیل کا پابند ہو سکتا ہے؟

ج: یہ ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار ہو۔

س: کیا چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی مملکت کے وفادار شہری ہوں؟

ج: جی نہیں۔

یہ جواب اس نظریے کے بالکل مطابق ہے جو ہمارے سامنے پر زور طریق پر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر پاکستان کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے دستور کی بنیاد مذہب پر رکھے تو یہی حق ان ملکوں کو بھی دینا ہوگا جن میں مسلمانوں کی بڑی بڑی اقلیتیں مشتمل ہیں یا جو کسی ایسے ملک میں غالب اکثریت رکھتے ہیں جس میں حاکمیت کسی غیر مسلم قوم کو حاصل ہے۔ لہٰذا ہم نے مختلف علماء سے یہ سوال کیا کہ اگر پاکستان میں غیر مسلموں سے شہریت کے معاملات میں مسلمانوں سے مختلف سلوک کیا جائے تو کیا علماء کو اس امر پر کوئی اعتراض ہوگا کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے۔ اس سوال کے جوابات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری

صدر جمعیت العلمائے پاکستان

س: کیا آپ ہندوستان کا ہندو حکومت قائم کرنے کا حق تسلیم کریں گے جہاں ہندو دھرم کے مطابق حکومت قائم رہے؟

ج: جی ہاں۔

س: اگر اس نظام حکومت میں منو شاستر کے تحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ تو کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟

ج: جی نہیں۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

س: اگر ہم پاکستان میں اس قسم کی اسلامی حکومت قائم کر لیں تو کیا آپ ہندوؤں کو اجازت دیں گے کہ وہ اپنے دستور کی بنیاد اپنے مذہب پر رکھیں؟

ج: یقیناً مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیئے جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان میں یہی صورت حالات ہیں۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

س: ہندوستان میں کتنے کروڑ مسلمان آباد ہیں؟

ج: چار کروڑ۔

س: کیا آپ کو اس امر پر اعتراض ہوگا کہ ان پر منو کے قوانین عائد کئے جائیں جن کے تحت انہیں کوئی شہری حق حاصل نہ ہوگا اور ان سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے؟

ج: میں پاکستان میں ہوں اور ان کو مشورہ نہیں دے سکتا۔

میاں طفیل محمد
جماعت اسلامی

س: دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کس قدر ہے؟

ج: پچاس کروڑ۔

س: اگر آپ کے قول کے مطابق مسلمانان عالم کی کل آبادی پچاس کروڑ ہے اور پاکستان، سعودی عرب، یمن، انڈونیشیا، مصر، ایران، شام، لبنان، شرق اردن، ترکی اور عراق کے مسلمانوں کی تعداد تیس کروڑ سے زیادہ نہیں، تو کیا آپ کے نظریے کا یہ نتیجہ نہ ہوگا کہ بیس کروڑ مسلمانان عالم محض لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے والے بن جائیں گے؟

ج: میرے نظریے کا اطلاق ان کی حیثیت پر نہ ہونا چاہئے۔

س: کیا اس حالت میں بھی کہ ان سے ذمیوں کا یا غیر مساوی سلوک کیا جائے اور معمولی حقوق شہریت سے بھی محروم کر دیا جائے؟

ج: جی ہاں۔

اس گواہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے ملک کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو اسامیاں پیش بھی کرے تو ان کا فرض ہوگا کہ ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔

غازی سراج الدین منیر

س: کیا آپ پاکستان میں اسلامی مملکت کا قیام چاہتے ہیں؟

ج: یقیناً۔

س: اگر ہمسایہ ملک اپنے سیاسی نظام کو اپنے مذہب پر مبنی قرار دے تو اس پر آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟

ج: اگر وہ چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔

س: کیا آپ ان کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ تمام مسلمانان ہند کو شودر اور ملیچھ قرار دے دیں اور انہیں کسی قسم کا شہری حق نہ دیں؟

ج: ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ ایسی حرکت سے پہلے ہی ان کی سیاسی حاکمیت ختم کر دی جائے۔ ہم ہندوستان کے مقابلے میں بہت طاقتور ہیں۔ ہم ضرور اتنے مضبوط ہوں گے کہ ہندوستان کو ایسا کرنے سے روک دیں۔

س: کیا تبلیغ اسلام مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں شامل ہے؟

ج: جی ہاں۔

س: کیا مسلمانان ہند کا بھی یہ فرض ہے کہ علی الاعلان اپنے مذہب کی تبلیغ کریں؟

ج: جن کو اس کا حق حاصل ہونا چاہئے۔

س: اگر ہندوستانی مملکت مذہبی بنیاد پر قائم کر دی جائے اور وہ اپنے مسلم باشندوں کو تبلیغ مذہب کے حق سے محروم کر دے تو کیا ہوگا؟

ج: اگر ہندوستان کوئی ایسا قانون وضع کرے گا تو چونکہ میں "تحریک توسیع" پر ایمان رکھتا ہوں اس لئے ہندوستان پر حملہ کرکے اس کو فتح کر لوں گا۔

گویا مذہبی وعدوں کی بنا پر امتیازی سلوک کی بابت سوالات کا یہ جواب ہے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری

س: کیا آپ چار کروڑ مسلمانان ہند کے لئے بھی وہی نظریہ پسند کریں گے جو آپ پاکستان کے مسلمانوں کے لئے پیش کر رہے ہیں؟

ج: وہ نظریہ اختیار کرنے کے بعد تو ایک منٹ کے لئے ہندوستان میں نہ رہ سکیں گے۔

س: کیا مسلمان کا نظریہ ہر مقام پر اور ہر وقت میں برقرار رہتا ہے؟

ج: جی نہیں۔

س: پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانان ہند بھی وہ نظریہ اختیار نہ کریں جو آپ کا ہے؟

ج: اس کا جواب انہی کو دینا چاہئے۔

ہمارے سامنے جس نظریے کی حمایت کی گئی ہے، اس کو اگر ہندوستان کے مسلمان اختیار کر لیں تو وہ مملکت کے سرکاری عہدوں سے کلیۃً محروم ہو جائیں گے اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کا یہی حشر ہوگا جہاں غیر مسلم حکومتیں قائم ہیں۔ مسلمان ہر جگہ ذاتی طور پر مشتبہ ہو جائیں گے اور فوج میں بھرتی نہ کئے جائیں گے۔ کیونکہ اس نظریے کے مطابق کسی مسلم ملک اور کسی غیر مسلم ملک کے درمیان جنگ ہونے کی صورت

میں غیر مسلم ملک کے مسلم سپاہیوں کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو مسلم ملک کا ساتھ دیں، یا اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں۔ ہم نے اس مسئلے پر دو عالموں سے سوالات کئے، جن کے جوابات درج ذیل ہیں۔

مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری
صدر جمعیت العلمائے پاکستان

س: ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانان ہند کا فرض کیا ہو گا؟

ج: ان کا فرض ظاہر ہے کہ انہیں ہمارا ساتھ دینا چاہئے اور ہندوستان کی جانب سے ہمارے خلاف نہ لڑنا چاہئے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

س: ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی حالت میں مسلمانان ہند کا فرض کیا ہو گا؟

ج: ان کا فرض ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف نہ لڑیں اور نہ کوئی ایسا فعل کریں جو پاکستان کی سلامتی کے لئے مضر ہو۔ ■

"روشن خیال" (۳۱)

ایودھیا کے بعد کیا ؟

سید حامد

۶ دسمبر کو جو قیامت برپا ہوئی اس نے ہندوستان کو ہلا ڈالا اور مسلمانوں کے سکون، ان کی سلامتی اور ان کے حقوق کو تہس نہس کر دیا۔ مسلمانوں کو اپنی اوقات معلوم ہو گئی۔ وہ سوچنے لگے کیا اپنے وطن میں ہم عزت کے ساتھ رہ سکیں گے۔ کیا یہاں ہم آزادی کا سانس لے سکیں گے۔ کیا ہمیں عبادت کی اجازت ہو گی۔ کیا ہمارے مذہب، ثقافت اور روایات باقی محفوظ رہ سکیں گی یا جس طرح ان کی مسجد منہدم کی گئی ہے اسی طرح وہ سب کچھ جو انہیں عزیز ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں مسمار کر دیا جائے گا۔ کیا تعداد کو قانون پر بالادستی حاصل ہو گئی ہے؟ کیا اکثریت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اقلیت کو روند ڈالے، آئین کو بالائے طاق رکھ دے، قانون کی دھجیاں بکھیر دے، عدالتوں کی حکم عدولی برملا اور علی الاعلان کرے۔ کیا ہندوستان کے ہر باشندے کو ہندوتو (ہندوازم) کے آگے سربسجود ہونا پڑے گا۔ کیا اس ملک میں حکومت جمہوری نہیں ہے، اکثریت کی ہے اور اقلیتیں اکثریت کی رعایا ہیں اور ان کے رحم و کرم پر یہاں زندگی گزار رہی ہیں۔ کیا مساوات کی پکار ایک سراب ہے، کیا سیکولرزم کا دعویٰ ایک فریب ہے۔ کیا ہندوستان ایک دھارمک ریاست ہے جہاں ہندو دھرم کو فضیلت حاصل ہے اور باقی سب دھرم ریاست کے دھرم کے تابع فرمان ہیں۔ کیا مساوات کے یہ سارے دعوے باطل ہیں؟ کیا جمہوریت کا اعلان دھوکے کی ٹٹی ہے!

دیار شب کا مقدر صبح تھا ہمیں پاسے کب
تو کہتا ہے کہ آزادی کی ہے لیکن پری

بابری مسجد کیا شہید ہوئی مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جگن ناتھ آزاد کہنے لگے ہم آپ کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ مسلمان سرنگوں ہیں ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب سر اٹھا کر کیسے چلیں گے۔ وہ خدا کے گھر کی حفاظت نہ کر سکے، وہ نامراد اب کس لیے جئیں گے۔ ان کے سینے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ جن سے رہا نہیں گیا وہ کفن باندھ کر سڑکوں پر نکل آئے اور نہ معلوم کتنوں نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ جن میں نکلنے کا یارا نہ تھا وہ گھروں میں بیٹھے سلگ رہے ہیں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ مسجد کو روئیں کہ شہیدوں کو، شہید دونوں ہی ہو گئے

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

لوگ کہیں گے کہ مسلمان تنہا نہیں ہیں وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں، ان کے ہم وطن ان کے ساتھ ہیں۔ یہ شکست مسلمانوں کی، ان کے مذہب کی شکست نہیں ہے۔ یہ شکست اعلیٰ انسانی قدروں کی شکست ہے، جمہوریت اور سیکولرزم اور مساوات اور انصاف کی شکست ہے۔ بی جے پی، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کا ہندوستان پر کوئی ایمان نہیں۔ سیاسی پارٹیوں کو دیکھیے تو بھاجپا کے علاوہ ساری پارٹیاں کل کے آئینے میں عملاً کھڑی ہیں، وہ مظلوم اقلیت کا ساتھ دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ انہیں فکر ہے کہ کہیں ہندوستان جمہوری اور سیکولر قدروں کو ترک نہ کر دے۔ یہاں دھرم کا بول بالا نہ ہو جائے، یہاں مذہبی ریاست وجود میں نہ آ جائے۔ زخم خوردہ مسلمان جو خاک چاٹ رہے ہیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بھاجپا کو چھوڑ کر سارا ہندوستان ان کا ہمدرد و غم گسار

سابق وائس چانسلر، اے. ایم. یو. علی گڑھ —— مکان ۱۰۰، ہمدرد نگر، نزد تغلق آباد، نئی دہلی۔

ہمارے اندر کیا کمیاں ہیں کیا کمزوریاں اور وطن اور اہلِ وطن کے تئیں کیلئے مہرباں ہیں۔ ہمیں ان کا احتساب کرنا ہوگا، انھیں تسلیم کرنا ہوگا تاکہ ہم اپنے نقطۂ نظر اور رویے کو نئے قالب اور نئے مشترک عزائم کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ یہ وہ بہت بڑے سانحے نے ملک کو ہلا ڈالا ہے۔ یہ ہمارے سوچ و گوش پر منحصر ہے کہ ہم اس زبردست تخریب سے ایک بڑی تعمیر کا سر و سامان کر سکیں۔ پہلا قدم تو یہ ہوگا مل جل کر بیٹھنا، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا، اس کی رعایت کرنا، باہمی داد و ستد سے ایک قابلِ عمل رابطہ، رشتہ اور ہم کاری کو وجود میں لانا۔ ہمیں اپنی سمت نظر میں انقلاب آفریں تبدیلی کرنی چاہیے۔ مسلمان بچوں کو نئے ڈھنگ سے اٹھانا چاہیے۔ انھیں مذہب، انسانیت اور وطن دوستی اور مسئولیت کے سبق پڑھانے چاہییں، ہزار جتن کر کے انھیں جہالت سے چھٹکارا دلانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ جمہوریت کی بنیاد انصاف پر رکھی جاتی ہے۔ ہم سب کو ساری فضلی اور قانونی موشگافیوں سے اوپر اٹھ کر اپنی صورتِ حالات، اپنی کیفیت پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ کیا ہم گزشتہ ۴۵ سال کی مدت میں ایک منصفانہ اور مساوات پر مبنی سماج کو وجود میں لا سکے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا ہمارے یہاں اونچی ذاتوں کا تسلط ہنوز قائم ہے؟ کیا آئین کا منشا اور حکومت کی بہت سی فلاحی اسکیمیں ملازمین حکومت کیلئے ہر ماہ کا فیصلہ ہو جاتی ہیں۔ کیا اس کا کوئی علاج نہیں؟ کیا وہ خلیج جو سرکار کے قول و فعل کے درمیان خندۂ دنداں نما بنی ہوئی ہے اسی طرح بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ کیا یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ ترقی یافتوں اور پسماندوں کو مقابلے کے میدان میں ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تاکہ اول الذکر کی حرکتِ مسلسل اور ان کی پیش قدمی انھیں پسماندوں سے اور زیادہ آگے کر دے۔ کیا یہ سب کچھ نئے ملک کا ضمیر مطمئن ہو سکتا ہے کہ مقابلے کی آزادی اور روزگار کے مواقع ہر ہندوستانی شہری کی دسترس میں ہیں؟ ایسا مقابلہ انصاف پر مبنی یا انصاف دشمنی پر مبنی ہے۔ نابرابروں کے درمیان مقابلہ کیسا؟ منڈل کمیشن کی سفارشات منظور کی گئیں تاکہ پسماندوں کے لیے کچھ تلافی، اعانت ہو سکے تو ایک ہنگامہ اور توڑ پھوڑ کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ مسلمان پیچھے رہ گئے ہیں۔ اپنے ملک کے انتظام میں ان کا عمل دخل برائے نام ہے۔ پسماندگی کی رفتار زیادہ تیز رہی ہے۔ انھیں معیاد بستہ ریزرویشن دینے ہوں گے تاکہ ترقی کی دوڑ میں وہ بھی حصہ لے سکیں۔ اس حادثے کے بعد اگر عادلانہ سماج قائم نہ ہوا اور اقلیتوں اور کمزوروں کی دستگیری عادلانہ کی گئی تو عداوت، نفرت اور نفاق اسی طرح جنم دیتے رہیں گے بلکہ دور پکڑتے رہیں گے۔

یاد رکھنا کہ اگر قوم، نظام اور انتظامیہ کے انصاف پر کبھی ایک خوشی یا بات کو بھی اعتماد نہ رہا تو فتنہ و فساد برابر سر اٹھاتے رہیں گے۔ یہ کہنا اور کہنا چاہیے کہ انصاف کے بغیر کسی نظام کو ثبات نہیں ہوتی۔ انصاف کرنا اور استحکام بخشنا حکومت اور معاشرے دونوں کا فرض ہے۔ ساری جماعتوں کو مل بیٹھ کر سوچنا ہے کہ نصاب کو مددگار کس طرح بنایا جائے گا۔ ہزاروں سال کی اسکولوں کی کتابوں کو کیسے پاک کیا جائے گا۔ اکثریت اپنے مذہب کے قصے اپنے گرد طواف کرنے اور دوسروں کی جذبات اور ضروریات کو نظرانداز کرنے کے بجائے اقلیتوں کی تالیفِ قلب کس طرح کرے گی؟

تعلیم کا نصاب کسی قوم کی تشکیل اور اس کے نقطۂ نظر اور سمتِ سفر کے تعین میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے نفرت اور تنگ نظری اور بے بہری سے پاک ہونا چاہیے اسے اس طرح ڈھالا جائے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار بچپن سے طلبا کے ذہن نشین ہو جائیں اور وہ عالمگیر انسانیت کے مفادات و مصالح، عزائم اور منصوبوں سے روشناس ہو جائیں۔

ان سب امور کو نئی روشنی میں دیکھنا ہوگا ورنہ عداوت کا سارا کاروبار ہمارے پاؤں کی بیڑی بن جائے گا اور نصاب اور گھروں اور جلسوں اور اخباروں کے صفحوں میں لیٹے ہوئے نفرت اور دشمنی کے بیج تباہی کے برگ و بار لائیں گے۔

یہ مضمون کل مکمل نہیں ہو پایا۔ آج یعنی ۸ دسمبر ۱۹۹۲ کی خبروں نے امید کی اس مشعل کو بجھا دیا جو تخریب کی راکھ سے تعمیر کو اٹھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں نے مندروں کو جلانا شروع کر دیا اور ہندوؤں پر حملے بھی ہونے لگے۔ لندن میں ایک مندر کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب یہ آگ برصغیر کے تینوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ شری اڈوانی، شری جوشی اور شری سنگھل کو آج گرفتار کر لیے گئے۔ پوچھے گئے سوال کا جواب شری اڈوانی نے جس انداز سے دیا اس میں پشیمانی ذرہ بھر بھی نہ تھی بلکہ سرکشی کے تیور نمایاں تھے۔ انھوں نے ساری خرابی کا ذمہ دار سرکار کو ٹھہرایا۔

سرکار نے کل جو فیصلے کیے تھے شاید وہ انھیں عمل میں نہ لا سکے۔ مسجد کی تعمیر تو اب دشوار نظر آتی ہے۔ آج کی خبر یہ ہے کہ کار سیوکوں نے میدان کا اندازہ چھوڑنے سے پہلے مسجد کی جگہ چبوترہ بنا کر اس پر مورتی استھاپت کر دی تھی، پیرا ملٹری فورسیز کے بعض جوانوں نے اس پر پہرے کو بٹھا دیا اور یہ مورتی کی پوجا کی۔ اب مورتی کو وہاں سے کون ہٹائے گا؟

[illegible] سے ہی کار سیوکوں کو اس کام کی مہلت دی ہی گئی تھی۔ انھیں مرکزی حکومت کی نیت پر شبہ ہے انصاف کی [illegible] سب سے [illegible] کا روٹ اسباب اختیار کر کے [illegible]

منے میں تاخیر اور کوتاہی ہے۔ ہماری ترقی پسند اور جمہوریت پسند مرکزی حکومت ابھی یہ سوچ رہی ہے کہ مسجد کس ادارے کے ذریعے بنوائی جائے جب تک وہ کسی فیصلے کو پہنچے گی ملک میں ایک بڑی پریکھا اور وشو ہندو پریشد مسجد کی تعمیر کے خلاف شور مچائیں گی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بابری مسجد کے شہید ہونے کا جو ردعمل ہوا اور مندروں کی جس طرح بے حرمتی کی گئی یا جلانے کی کوشش ہوئی اور کئی مندر نذر آتش کیے گئے، اس نے معاملے کو اور الجھا دیا ہے۔ اس وقت عام بدگمانی اور باہمی عداوت کے ماحول میں اس گتھی کو سلجھانا ممکن نظر نہیں آتا۔

اس مضمون میں مسلم قیادت کے جوش و خروش کی تعریف کی گئی تھی کہ اس نے عوام کو ضبط کی تلقین کی۔ اب ایسا لگتا ہے کہ عوام تک یا تو یہ پیغام پہنچا ہی نہیں یا وہ تنگ آکر جنگ پر آمادہ ہو گئے ہیں اور اب وہ اپنے رہنماؤں کی بات نہیں سنیں گے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے۔ اچھا ہوتا اگر مسلم رہنما دور درشن اور آکاش وانی پر مسلم عوام سے مخاطب ہوتے اور انہیں ضبط کی تاکید کرتے۔ یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلم رہنما عوام سے کٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور عوام کے درمیان وہ زندہ رابطہ ہے ہی نہیں جو خدمت اور غیر انفرادی اور فلاحی اور رفاہی کاموں کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ رابطہ قائم ہوتا تو پھر عوام انتشار سے دوچار نہ ہوتے۔ تنظیم کے کام میں تاخیر بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حالات اب کیا کروٹ لیں گے۔ ایسے میں منظم، متحد اور باخبر رہنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ بھی ہوگی جب انتشار کے چکر کو توڑا جائے۔ ہمارے مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے ہاتھ جوڑ کر اپیل کرنی چاہیے کہ "خدارا" اس بنا پر کہ ہندوستان میں بابری مسجد شہید کر دی گئی ہے اپنے یہاں نہ مندر جلائیں نہ بت توڑیں۔ [illegible] ہندوستان کے مسلمانوں پر زد پڑتی ہے۔ [illegible] اس کے علاوہ اگر آپ اس طرح بدلہ لیں گے تو ہندوستان میں اس وقت جو ہمدردی مظلوم مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر پیدا ہوئی ہے اسے عداوت میں بدلتے دیر نہیں لگے گی۔ اپنے ملک کے ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کیجیے۔ اگر ان بی بی سی لندن سروس سے مخاطب کیا جاسکے تو شاید وہاں سے ہمارے رہنما [illegible] پاکستان اور بنگلہ دیش اور [illegible] کے مسلمانوں سے خطاب کرنے کا موقع [illegible]۔ [illegible]

لے گا۔ اس نے آج سے تقریباً سال بھر پہلے تک مسلم قیادت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ بھاجپا کے رہنماؤں کے ساتھ بات کریں اور ان سے پوچھیں کہ وہ مسلمانوں سے چاہتے کیا ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح مفاہمت کے باب وا ہو جائیں۔ لیکن اب پتہ چلا ہے کہ اس کا مشورہ خوش فہمی پر مبنی اور غلط تھا۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے دور درشن پر اہل ہند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بی جے پی اور وشو ہندو پریشد نے ملک کو دھوکا دیا ہے، اس کے ساتھ عہد شکنی کی ہے۔ جو جماعت اپنے قول سے پھر جائے جس کے نزدیک حصول مقصد کے لیے ہر طرح کے ذرائع کا استعمال کرنا جائز ہو، جو نہ اپنے بیان کا پاس کرے نہ عدالت کے احکام کی تعمیل۔ بظاہر اس سے بات کر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ فسطائی طریق کار کی ایک نشانی ہے۔ فسطائی طاقتیں جمہوری روایات اور اخلاقی اقدار کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہ بھی اپنے مقصد کی راہ میں ایک پل کے لیے بھی حائل نہیں ہونے دیتیں۔ بھاجپا نے طے کر لیا ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندو راج استوار کرے گی۔ ایسا کرنے کے لیے وہ کہیں رکے گی نہیں۔ انصاف کے تقاضے اور جمہوریت کے آداب اس کے سد راہ نہیں بن پائیں گے۔ جس پارٹی کا سیاسی فلسفہ کدورت، عداوت اور تنگ نظری سے عبارت ہو، وہ رواداری اور انصاف کی بات سنے گی ہی کیوں؟ لیکن ہم پھر بھی اتنا کہیں گے کہ موقع پڑے تو اس سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اس کے عہد و پیمان پر اعتبار کیے بغیر۔ ممکن ہے کہ خود اس کے مصالح اسے کسی وقت ہماری بات پر غور کرنے کے لیے مجبور کریں۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں۔ لائحہ عمل اور منصوبہ فی الحال ابھی مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ضرورت ہے عزم و احتیاط اور نظم و ضبط کی، عوام سے رابطہ استوار کرنے کی، انہیں اشتعال کے خلاف آگاہ کرنے کی، انہیں خاموشی، سنجیدگی اور صلح کوشی کے ساتھ اپنی اپنی بستیوں میں دفاع کے لیے تیاری کی۔ اتنا ہی اہم ہے سیکولر اور انصاف پسند سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے قدرتی یار اور ہمدرد سابق اقلیتیں، درج فہرست ذاتیں، قبیلے اور دوسرے پسماندہ اور کمزور طبقات ہیں۔ ان کے ساتھ بھی رابطہ بڑھانا چاہیے۔ الغرض ہمارے رہنماؤں کو نئے پس منظر میں ان سارے مسائل پر غور کرنا اور مسلمانوں کی حفاظت، ان کے استحکام اور فلاح و ترقی کی کوشش کرنی [illegible]

بہرحال مسلمانوں کو ضعیفی کے جرم اور بدنظمی کے گناہ کی سزا مل گئی۔ وہ ملنا ہی تھی اور غافل رہیں وہ اپنے مفادات اور مسلکوں پر لڑتے اور جھگڑتے رہیں۔ وہ اسی طرح بے مصرف اور نا اہم باتوں پر اور بے خبر رہیں وہ بدخواہوں کی چالوں اور ارادوں سے۔

مسلمانوں کے خیر خواہ ان کی تالیفِ قلب کے لیے اور رویہ اختیار کیا تا بن مٹانے اور عالمی رسوائی کے داغ کو دھونے کے لیے اعلان کر رہے ہیں کہ بابری مسجد نئے سرے سے تعمیر کرائی جائے گی۔ یہ کوئی بھی نہیں بتاتا کہاں اور کب اور کس وضع پر۔ تعمیر نو کا مفہوم تو یہ ہوا کہ جس جگہ اسے توڑا گیا ٹھیک وہیں بنائی جائے گی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا مرکزی حکومت کی کچھ اچھال نے اس جگہ پر چبوترہ بنوا دیا اور مورتی وہاں رکھوا دی۔ کیا اس کا ارادہ ایک کو تڑوانے اور دوسری کو ہٹوانے کا ہے۔ کیا اس بے ریڑھ حکومت میں اتنا دم ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ سرکار کے پھیپھڑوں میں آکسیجن بھر دی گئی اور اس نے یہ فیصلہ کر بھی لیا تو بھی کیا اس طرح ملک گیر فتنہ و فساد کا ایک نیا دروازہ نہ کھل جائے گا؟ کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے بھی سنائی دیے کہ انہدام کے اثرات کو مٹانے کے لیے اور سابقہ کیفیت کو بحال کرنے کے لیے مسجد اسی جگہ پر بنے گی اور جب وہ بن جائے گی تو اس میں مورتی اسی طرح سے رکھ دی جائے گی جیسے وہ انہدام سے پہلے رکھی ہوئی تھی۔ سبحان اللہ! قیامت رفتہ کو آواز دینے کی اس سے انوکھی مثال عمل در کنار، تخیل کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ مسلمان ایک بل سے کتنی بار ڈسا جائے گا۔ اگر ایسا کیا گیا تو بھارت اس طویل اور المناک جھگڑے کا ری پلے دیکھے گا جس کی نمائش کی ذمے دار ایک بار پھر بھارت سرکار ہوگی۔ تکنیکی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو "ری پلے" میں کیا مضائقہ ہے۔ ری پلے تو پہلے ہی (۶ دسمبر کو قریب ہی ایک جگہ پر) کارسیوکوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کیا تھا اور بھارت سرکار کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی لیکن اب بھی اس کی سلامتی ہوش و حواس کی بات کہنے جیسا حکومت کی ایوان ایک ستون بافری ہے اور یہاں یہ ستون سرے سے غائب۔

ایک تجویز یہ بھی سننے میں آ رہی ہے کہ مسجد قریب ہی کسی دوسری جگہ بنا دی جائے۔ ٹنگ پالی کی یہ نئی ترکیب نکالی گئی۔ کیا اس پرانی تجویز کو مسلمان اب اس لیے قبول

سے گزر چکے ہیں؛

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا کریدتے ہو جب اب راکھ جستجو کیا ہے

ہمدردوں اور بے دردوں سے مسلمان یہی کہیں گے کہ خدارا اب ان کے زخموں کو نہ کریدیں، مسجد بنانا چاہیں بنائیں، نہ بنانا چاہیں نہ بنائیں۔ بنانا چاہیں تو جس جگہ بنانا چاہیں بنا ڈالیں۔ مسلمان بھرپائے انھیں اب اس قضیے میں نہ الجھائیں۔ ان کے زخموں کو نہ کریدیں۔ ہماری جمہوریت میں اقلیت ہونا سب سے بڑا پاپ ہے۔ اس پاپ کی سزا انھیں کب تک دی جائے گی، سزا کی بھی تو کوئی میعاد ہوتی ہے۔ جس عداوت اور نفرت کے چہرے سے نقاب اس تزک و احتشام کے ساتھ اٹھا دیا گیا اب وہ ساتھ پردوں کے پیچھے بھی چلی جائے تو کسی نگاہوں کو دھوکا نہ دے سکے گی۔ وہ کروڑوں کدورت پیشہ دل جنھیں گھٹا ٹوپ اندھیروں نے گھیر لیا ہے روشنی کی کرنوں کو آئندہ برداشت کیسے کر سکیں گے۔ بابری مسجد کی شہادت سے مظلوموں کے دل ٹوٹ گئے۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ کیونکہ دل زندہ رہنے کا حوصلہ اور اعتماد کا انحصار ہوتا ہے۔ ہاں سے آنسو ریچھ جاتے۔ جہاں دل ٹوٹے ہیں وہاں آنکھیں کھل جاتی ہیں؛ وہ دوست اور دشمن، عارضی اور دائمی، حقیقی اور سیاسی میں فرق کرنے لگے۔

آپ نے دیکھا جہاں ایک کے علاوہ ساری سیاسی پارٹیاں مسجد کی حفاظت کے حق میں تھیں اور زیادہ تر اہلِ علم و دانش ان کے ہم نوا تھے۔ وہاں پھر بھی مسجد محفوظ نہ رہ سکی۔ اس سے نتیجہ کیا نکلا۔ یہ پارٹیاں اور یہ اہلِ دانش عوام کی اکثریت کے ترجمان نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو یہ سانحہ نہ ہوتا۔ ہمیں ہندو عوام کے پاس جانا پڑے گا۔ ابھی نہیں کہ اس وقت اس کا غلط مفہوم نکالا جائے گا۔ جب نفرت کی آگ ٹھنڈی ہونے لگے تو ہمیں ان کے سامنے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کرکے رکھنا ہوگا۔ فاصلے سے بیگانگیاں دن دونی رات چوگنی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کیوں نہ ہم عہد کر لیں کہ ہم فاصلے کو حائل نہ ہونے دیں گے لیکن "ہم" سے مراد کیا ہے۔ ہماری نمائندگی کون انجام دے گا۔ ہماری طرف سے عہد کون کرے گا، جہاں تنظیم نہ ہو، اتحاد نہ ہو، اعتماد نہ ہو وہاں ترجمانی کون کر سکتا ہے وہاں اہلِ وطن ہماری بات کیوں سننے لگے۔ جنھیں وہ عقیدت سے دیکھتے ہیں ان کی بات کو وہ وقعت کیوں دینے لگے۔

بہرحال اگر ہمیں زندہ رہنا ہے اور حوصلہ مندی کے ساتھ سر اٹھا کر، سینہ تان کر، باوقار طریقے کے ساتھ تو ہمیں اپنا گھر ٹھیک

ور الزام و دشنام کی صدائیں آتی ہیں۔ ہم اپنے اس گھر کے مکینوں کو منہ نہیں لگاتے۔ اب ہم سے یہ اطمینان چھین لیا گیا ہے کہ سیکولر جمہوریت میں دینی مدارس سے قطع نظر ہم اس دین سے رہ جائیں گے۔ اب تو ہمیں نگرانی بھی کسی اور نگہبانی کا طریقہ اپنانا پڑے گا۔ غنیم گھات میں ہو تو ایک لمحے کی غفلت گھاتک بن جاتی ہے۔ ہم کسی کو غنیم نہیں سمجھتے تاوقتیکہ وہ اپنے برتاؤ سے یہ ثابت نہ کر دے۔ ہماری حالت ہے کیا ایک ادارہ بھی ہم ڈھنگ سے نہیں چلا پاتے۔ ہمارے اداروں اور انجمنوں میں خانہ جنگی کا سا سماں رہتا ہے۔ ہم کو مسلمانوں کی ضرورتوں اور ان کے فرائض کا احساس ہے لیکن اسی وقت تک جب تک ہم خود کو مستثنیٰ کر دیں۔ ہم اپنی ذات کو ملت کے مفاد سے بالاتر نہیں بالاتر سمجھتے ہیں۔ مسلکوں کی لڑائیاں ہم میں ہوتی ہیں غیبت اور بہتان کا کاروبار ہمارے ہاتھوں فروغ پاتا ہے جہالت ہماری دینی راہ بن گئی ہے۔ وقت ضائع کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر ہم ترقی کریں تو کیوں کر۔

وقت آگیا ہے کہ ہمارے بڑے مل بیٹھیں اور باہمی مشورے کے بعد سمتِ نظر اور سمتِ سفر دونوں متعین کر دیں۔ اقلیت کی صورتِ حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ اکثریت سے بہت زیادہ محنت کر کے مہارت، فضیلت اور امتیاز حاصل کرے۔ ہندوستان میں جہاں اکثریت اقلیتوں اور پسماندوں کے استحصال کو ایک فنِ لطیف کی طرح برتتی چلی آئی ہے، اس بات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اکثریت کے ایک طبقے نے اس وقت کھل کر جو حملہ ہم پر کیا ہے اس میں سے ہمارے لیے بھلائی کی صورت نکلتی ہو۔ ہمیں خطرے کا پہلی بار سچا احساس ہو جائے اور ہم اس کے لیے ڈھال وضع کر لیں۔

اس اثنا میں ہمارے وزیر اعظم نے اپنے اعلان کے ایفا کی کوشش کی ہے۔ پارٹیوں پر جو قدغن لگائی ہے، اس میں سے نکلنے کے لیے چور دروازے بہت ہیں خصوصاً ایسی پارٹیوں کے لیے جو تنظیم کی لڑی میں پروئی ہوئی ہوں اور ایسی حکومت کے زیر سایہ جو خوش خرام اور نرم لگام اور کمزور ہو۔ یہ بات البتہ افسوسناک ہے کہ جب کوئی تادیبی کارروائی کی جاتی ہے تو مسلمانوں کو ان کا حق حصہ امید سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے چنانچہ ہندوؤں کی تین پارٹیوں کو ممنوع قرار دیا گیا تو مسلمانوں کی دو پارٹیوں کو بھی زیر قدغن لے آئی۔ اسلامک سیوک سنگھ کو بند کرنے کا جواز تھا لیکن جماعت اسلامی نے کیا قصور کیا تھا۔ تعلیم، اخلاق، رہنمائی اور راحت رسانی کے علاوہ یہ کچھ نہیں کرتی رہی ہے۔ آندھرا پردیش میں سائیکلون آیا تو جماعت نے بغیر امتیازِ مذہب راحت رسانی کا کام بڑی جانفشانی اور سلیقے سے انجام دیا جس کا اعتراف مقتدر حکام نے بھی کیا۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ایک پاکستانی اور ایک تخریبی انجمن کے ہم نام ہیں اور ان انجمنوں کا طرزِ عمل جارحانہ رہا ہے۔ یہ فیصلہ نظرثانی کا مستحق ہے۔

جو کام فوراً انجام دینا ہے وہ ہے ریلیف یا راحت رسانی کا کام۔ یہ کام بھی تنظیم چاہتا ہے۔ پھر مظلوموں کی فریاد سننا ان کی بات اہلِ اقتدار تک پہنچانا، ان کی دادرسی کرنا۔ ان کے زخموں پر پھاہے رکھنا۔ پولیس اور آرمڈ پولیس کی زیادتیوں کو دستاویزی روپ میں پیش کرنا۔ اب کے تو فسادات ملک گیر ہو گئے، ورنہ کچھ شہر ایسے ہیں جو ہر وقت فساد آمادہ رہتے ہیں۔ وہاں لوگوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے منصوبے تیار رہنے چاہییں۔ اگر فسادات ہمارا مقدر بن گئے ہیں تو ہمیں اپنے مقدر کا پاس رکھنا چاہیے۔ ہمت اور تنظیم کے ساتھ مقسوم کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ دوستی اور محبت کا ہاتھ ہم ضرور بڑھائیں لیکن ہر بار احتیاط کے ساتھ، اعتماد کے ساتھ اور طاقت کے ساتھ۔ رفاقت دوستی، تعاون، خیر اندیشی بجا اور برمحل مسکینی بیجا انکساری، نیازمندی، سرنگونی بے جا اور باطل مظلوموں کی مدد اس طرح کیجیے کہ جو لوگ آگے آجائیں وہ زیادہ پا جائیں اور جن لوگوں کی غیرت اور تامل انھیں آگے نہ بڑھنے دے وہ محروم رہ جائیں۔ ریلیف یا راحت رسانی کے کام میں جو مجلسِ ماتم میں کیا جا رہا ہے بزمِ مے کا سا سماں نہ ہونا چاہیے؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہ بھی نہ ہو کہ بعض ظلم رسیدوں پر بیک وقت کئی امدادی انجمنوں کی نظرِ التفات پڑے اور دوسروں تک کوئی پہنچنے نہ پائے۔ مناسب ڈھنگ تو یہ ہوگا کہ ہر آفت زدہ شہر میں تقسیم کا کام صرف ایک ایجنسی یا ادارہ کرے۔ یہ اعلان کرنا اس کی اخلاقی اور ضابطے کی ذمہ داری ہوگی کہ ان اداروں، انجمنوں یا ایجنسیوں کے ناموں کا شہر یا قصبے یا گاؤں میں اعلان کر دے جنھوں نے وہاں کے لیے روپیا اور اشیا فراہم کی ہیں اور فراہمی کی مقدار بھی کھول کر بیان کر دی جائے۔ مسلمان جن میں غیرتِ ملی اور انسانی ہمدردی زندہ ہے، ایسے موقعوں پر دل کھول کر مدد کرتے ہیں۔ جب تک برباد شدہ لوگ نئے سرے آباد نہیں ہوتے ان کے لیے کھانے بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں بھی تال میل اور احتیاط ضروری ہے تاکہ رزق ضائع نہ ہو۔

امداد کی رقوم کا ایک اچھا مصرف بازآبادکاری ہے

مکان پھر سے بنائے جائیں۔ مکانوں اور دکانوں میں سامانِ رہائش اور سامانِ تجارت پہنچایا جائے۔ زخمیوں کا علاج اور بیواؤں اور یتیموں کے لیے پرورش کا مستقل انتظام، یہ سب خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ ان کے لیے معقول اقدامات ضروری ہیں۔ یتیم بچوں کی تعلیم کو راحت رسانی کے کام میں ترجیح دینی چاہیے۔

اگر ایک محلے میں ہندو اور مسلمان دونوں مجروح ہوئے ہیں تو ہماری ریلیف پارٹیوں کو امداد کرتے ہوئے مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہ کرنا چاہیے۔ ہمارے دل انسانیت اور انصاف کا جو خون ہوا ہے، اس پر دکھے ہیں۔ علاوہ بریں ہمیں جلے ہوئے مکانوں کی راکھ سے ایک ایسی عمارت کو تعمیر کرنا ہے جو بعید پہلو سے بالاتر ہو۔

تازہ ترین اطلاعات بتا رہی ہیں کہ شہید صرف بابری مسجد کو نہیں کیا گیا۔ دیپ آشیش مکرجی نے ۶ر دسمبر کو جو کچھ دیکھا اس کی رپورٹ انھوں نے ایودھیا سے روانہ کی۔ اس کا ترجمہ قومی آواز نے ۱۵ر دسمبر کے شمارے میں شائع کیا ہے اس کو پڑھ کر آنکھیں اور کھل گئیں۔ ایودھیا شہر کی دوسری مسجدیں بھی نذر آتش کر دی گئیں اور چن چن کر مسلمانوں کے مکان جس کی آبادی پانچ ہزار تھی جلا دیے گئے۔ شری اٹل بہاری واجپائی بلکہ سادھوی رتمبھرا نے اس وقت جو تقریر کی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آتش زنی اور قتل و غارت گری کی یہ ساری کارروائی سوچے سمجھے منصوبے کے تابع تھی۔ کیا ایودھیا کی دوسری مسجدیں بھی، جن کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے، رام جنم بھومی مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں؟ اسی رپورٹ میں

> "ہم کو عدم تشدد پر پوری طرح عمل کرنا چاہیے لیکن بے بسی کے ساتھ نہیں۔ علی برادران نے جو فارمولا سپاہیوں کے فرض کے بارے میں بتلایا ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہے استعفا کی دعوت دینا چاہیے۔ ہم کو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے بہترین آدمیوں کے بغیر تحریک جاری نہیں رہ سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم سوراج کے قابل نہیں ہیں اور نہ خلافت کے اور پنجاب کے ساتھ جو مظالم ہوئے ہیں ان کا مداوا کر سکتے ہیں۔"
>
> مہاتما گاندھی

ایک اور حادثہ کا ذکر بھی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بھاجپا اقتدار میں آگئی، اگر اس نے تمام اقلیتوں

میں مسلمان تو مسلمانوں سے کیا مطالبہ کرے گی؟ کیا پہلی بھاجپا کانگریس جیسا اس کے سیاسی مسلک کا اتباع کرنا یا اس کی قصیدہ سرائی کرنا کافی نہیں ہوگا۔

اس کی مانگ صرف یہ ہوگی کہ اپنی شناخت بھول جاؤ، اپنے مذہب کو ترک کر دو اور ہندوویت کے رنگ میں خود کو رنگ لو۔ ورنہ تم پر جو بیتے گی اس کے ذمہ دار تم ہی ہوگے۔ قاریئن حسن حیدر پر جو بیتی اس سے اندازہ لگائیں۔ دیپ آشیش لکھتے ہیں:

> "یہ (حسن حیدر) بھی ایودھیا میں بڑی آراضی کے مالکوں میں شامل ہیں، ہندوؤں سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی آراضیوں پر بہت سے بے گھر ہندوؤں کو آباد کیا ہے۔ ایک شخص نے یہ بھی بتایا کہ مسٹر حسن حیدر بھارتیہ جنتا پارٹی ایودھیا کے صدر بھی تھے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہیں کسی بھی طرح کا تحفظ حاصل کرنے سے (انھوں نے) انکار کر دیا تھا لیکن آج صبح کارسیوکوں کے ایک جتھے نے ان کے گھر میں گھس کر لاٹھیوں سے ان کی پٹائی کر کے اس حال کو پہنچا دیا... حاجی محبوب نے اپنے ہی علاقے کے چند افراد کے نام بتائے جنھیں ۶ر دسمبر کی شام کو تباہ اور تاراج کرنے والے ہجوموں نے ہلاک کر دیا تھا۔"

ایک سو آدمیوں نے تھانے میں پناہ لی تھی... ہرچند کہ ایودھیا کے مسلمانوں کے تعلقات مقامی ہندوؤں سے بہت اچھے تھے مسلمانوں کے مکانوں کی نشاندہی تو مقامی ہندوؤں نے ہی کی ہوگی۔

آج (۱۶ر دسمبر) کی اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ

مرکزی سرکار نے اب مضبوط قدم اٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ تینوں بچی ہوئی ریاستوں کی بھاجپائی حکومتوں کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ سیکولر پارٹیوں اور خود کانگریس کے سیکولر رہنما کسی دباؤ یا الزامات سے نہیں ہوا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ سیکولر رہنماؤں کی مدد کریں اور سارے ہمت مند اقدامات میں حکومت کا ساتھ دیں۔ خوشی دینے کے بجائے

ہم بھول جائیں کہ حکومت نے کیا نہیں کیا۔ اس وقت دھیان صرف اس طرف دیں کہ سرکار کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اس نے جو غلطیاں کیں اس کی مذمت نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہمارے روشن خیال ہندو بھائیوں نے کی۔ اب وہ بعد از خرابی بسیار راہ راست پر آئی ہے۔ ہمیں اس کی منزل کو آسان کرنا چاہیے۔ اس گئی گزری حالت میں بھی ہندوستان میں ایسے ہندو نظر آتے ہیں جو بھید بھاؤ سے بہت اوپر اٹھ کر انسان دوستی، مسلمان پسندی اور وطن پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

انھیں جزائے خیر دے اور ان کے حوصلوں اور ارادوں کو مضبوط کرے۔ اسٹیٹسمین میں حال ہی میں دو لڑکیوں وندنا ویکٹیشن اور لیونم ۲ ۱۲ دسمبر کا خط فخرالدین علی احمد کے نام چھپا ہے جسے

ایڈیٹر نے سرخی دی ہے کہ

"ہندوستان کے مستقبل کی آواز سنیئے"

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل کے بعض بچے اور بچیاں تعصب کے دہرے بندھن توڑ کر متحد ہو رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے بھارت کے خواب دیکھ رہے ہیں جو نفرت اور عداوت سے پاک ہو۔ نئی نسل کے لیے نونہالوں سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں لیکن ہمیں بھول کر بھی مستقبل کی طرف سے مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ ہندوستان اگر بے تعصب اور روشن خیال اور سلامت رو اور انسان دوست رہتا ہے تو اس میں فائدہ سب سے زیادہ مسلمانوں کا ہے۔ اس لیے ایسے بھارت کی تعمیر میں ان کا یوگ دان بھی سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔

"تہذیب الاخلاق" فروری ۱۹۹۳ء

مولانا محمد رئیس ندوی

ہندو مذہب کے اصول، مصلحین کے اقدامات اور تاریخی شواہد سے

اجودھیا میں

رام مندر کے وجود کی تردید

ایک مشہور ہندو محقق چیدانند داس گپتا نے کہا:

"ویدوں اور دسرتھ جاتک میں لکھا ہے کہ شری رام چندر جی اور ان کے باپ مہاراجہ دسرتھ بنارس کے راجہ تھے۔ شری رام چندر، سیتا اور لچھمن کے قصے جس بالمیکی رامائن میں مذکور ہیں اس میں مہاتما بدھ (بدھ مذہب کے بانی) کا ذکر ہے، اس زمانہ میں کوشل سلطنت کی راجدھانی کا نام ایودھیا نہیں بلکہ سروستی تھا جو ایودھیا سے مختلف دوسرا شہر تھا اور بالمیکی رامائن میں اس سلطنت کا نام کوشل بتلایا گیا ہے جس پر شری رام چندر جی اور ان کے باپ دسرتھ راج کرتے تھے۔"

(ملخص از السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا مورخہ ۱۵ر تا ۲۱ر جون ۱۹۸۶ء وہندوستان کا شاندار ماضی از اے، ایل باشم ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء ص ۶۷/۶۸ دبابری مسجد تاریخی پس منظر از سید صباح الدین ۱۹۸۶ء اعظم گڈھ ص ۱۵۴ تا ص ۱۵۶)

ایک دوسرے ہندو محقق ڈاکٹر آر، ایل شکلا لکھتے ہیں کہ:

"شری رام چندر اور سیتا و لچھمن کی پوری کہانی جس رامائن بالمیکی میں مذکور ہے وہ شروع میں چھ ہزار اشلوک پر مشتمل تھی پھر بذریعہ الحاق واضافہ بعد میں ایک زمانہ کے بعد اسے بارہ ہزار اشلوک پر مشتمل بنایا گیا پھر اس میں بتدریج ترقی ہوتے ہوتے چوبیس ہزار اشلوک ہو گئے، رامائن والی کوشل سلطنت کی راجدھانی سرجو ندی کے ساحل سے ساڑھے تیرہ میل دور واقع تھی جب کہ موجودہ ایودھیا سرجو کے بالکل ساحل پر ہے۔ رامائن میں مذکور ہے کہ سرجو ندی پچھم کی جانب بہتی ہے جب کہ آج کل یہ ندی مشرق کی جانب بہتی ہے۔" (ایشک سنواد ماہ نومبر ۱۹۸۴ء ص ۱۲/۱۳ ورام کی نگری سچ یا جھوٹ از ڈاکٹر آر، ایل شکلا دبابری مسجد ایودھیا حقائق اور افسانے از مولینا حبیب الرحمن قاسمی ص ۱۴/۱۵)

ایک تیسرے ہندو محقق ڈاکٹر ایس، آر پٹیل ضلع منتری ار جک سنگھ وارانسی نے لکھا کہ:

"موجودہ اجودھیا کو رام چندر جی کا جنم استھان اور دارالسلطنت کہنا بالکل افسانوی اور من گھڑت

بات ہے بلکہ رام اور ان سے متعلق ایودھیا کی کہانی بھی افسانوی و فرضی ہے" (روزنامہ سوتنتر بھارت
وارانسی بابت ۲۰ دسمبر ۱۹۹۲ء صفحہ ۲ بعنوان چھٹی تپری رام کی سیتا کو چنوتی)

ایک چوتھے ہندو لیڈر پنڈت لوک پتی ترپاٹھی بنارس نے کہا کہ:

"شری رام چندر جی کے زمانہ والا ایودھیا دریائے سرجو دگھا گھرا میں ڈوب کر بہت زمانہ پہلے ختم ہو گیا تھا
موجودہ ایودھیا اودھ کے نوابوں کا آباد کردہ ہے۔" (بابری مسجد از صباح الدین صفحہ ۳ مقدمہ)

جس ایودھیا میں بابری مسجد موجود ہے اسی ایودھیا کے ایک مندر دنت کنٹھ مندر کو بابر شاہ نے پانچ سو بیگھہ زمین بطور عطیہ دے رکھی ہے اس کے کاغذات اب بھی اس مندر کے مہنت کے پاس موجود ہیں۔ (ہفت روزہ نئی دنیا دہلی ۲۵ نومبر تا یکم دسمبر ۱۹۸۶ء)۔

فسانہ عبرت نامی کتاب مصنفہ رجب علی سرور میں مذکور ہے کہ بابری مسجد ۹۲۳ھ میں باہتمام سید میر عاشق بنی ۲۲
اس کا مطلب یہ ہوا کہ تخت دہلی پر بابری قبضے سے دو سال پہلے یہ مسجد شاہ سکندر کے دور حکومت میں بنی تھی بلکہ ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ سید میر عاشق نے ۹۲۳ھ میں صرف تجدید تعمیر کی تھی ورنہ اس سے پہلے یہ مسجد موجود تھی جس پر تفصیلی بحث ہماری زیر تصنیف کتاب میں ملے گی۔

اس زمانے میں ہندوستان پر سکندر لودھی بن بہلول لودھی سلطان عادل نظام خاں کی حکومت تھی، وہ ۸۹۴ھ میں دہلی کے تخت سلطنت پر بیٹھا تھا اور ۹۲۳ھ تک حکمراں رہا وہ بابر سے کہیں زیادہ دیندار و اولو العزم اور بہادر و وسیع اختیارات والا بادشاہ تھا اس کے زمانے میں جلال شاہ و موسیٰ عاشقان موجود تھے آخر ان دونوں حضرات کا ایودھیا کا رام مندر توڑنا اور اس کی جگہ مسجد کی تعمیر کرانا اگر مقصود تھا تو انہوں نے اس دیندار و اولو العزم بادشاہ سکندر لودھی سے کہہ کر یہ کام کیوں نہیں کرالیا؟ اور ہندوستان میں بابر کے فاتح بن کر آنے کا انتظار کرتے رہے؟ بلکہ سکندر لودھی سے بھی پہلے کسی مسلم حکمراں کے ذریعہ یہ کام کرالینا چاہئے تھا۔

اور البتہ انگریزوں کی پلاننگ کے مطابق ۱۸۵۵ء میں ان لوگوں نے بابری مسجد کے علاوہ ایودھیا کی بعض مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر دینے والی اپنی شر انگیز مہم اور نہایت غیر معتدل نیز فتنہ و شورش کے زمانہ میں جولائی اگست ۱۸۵۵ء میں بابری مسجد کی بھی بے حرمتی کی پھر بعد میں ترقی کر کے مزید شرارت کی، مسجد کے اندر و باہر شیطنت کا مظاہرہ کیا اور انتہائی درجہ کی بدعنوانی کرتے ہوئے بابری مسجد سے باہر ایک معمولی اونچائی والا چبوترہ اکیس فٹ لمبا اور سترہ فٹ چوڑا بنا کر اس پر صرف ایک بالشت لمبا اور چوڑا و اونچا مندر نصب کر کے پوجا پاٹ شروع کر دی اس شر انگیزی و شرارت کے خلاف اس شر انگیزی و شرارت کے ابھارنے والے انگریزوں ہی کی عدالت میں مجبور و مقہور و مغلوب مسلمانان ایودھیا ہی کی طرف سے ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو بابری مسجد کے امام و خطیب مولانا محمد اصغر صاحب نے چارہ جوئی کے لئے اسی طرح سے درخواست دی، جس طرح اگست ۱۹۴۷ء میں انگریزی اقتدار کے بعد ہندو اقتدار بنام کانگریسی اقتدار قائم ہونے کے بعد سے مسلمان اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے خلاف ناکام چارہ جوئی کے لئے کانگریسی حکومت اور اس کی قائم کردہ عدالتوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں مگر نہ انہیں انگریزی دور میں داد مل سکی نہ کانگریسی دور

میں رہی۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا ۔ ۳۰ ر نومبر ۱۸۵۸ء کو انگریزی سرکار کی بارگاہ میں بابری مسجد کے امام و خطیب مولانا محمد اصغر صاحب نے جو درخواست تحریر کی تھی اس کا حاصل معنی یہ ہے کہ :

"انگریزی حکومت کے ایک سرکاری ملازم بیگ سنگھ نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر بابری مسجد کے اندر منبر و محراب کے پاس سوا گز کا ایک چبوترہ بنا کر اس پر بت نصب کر دیا اور چبوترہ کے پاس ہی ایک گڈھا کھود کر آگ جلا کر اس میں ہون اور پوجا پاٹ شروع کر دیا، مسجد سے باہر والے میدان میں جس مقام کو ہندو لوگ رام جنم بھومی کہتے ہیں وہ زمین صدہا سال سے خالی پڑی تھی اس پر بلوہ کے بعد (یعنی جولائی ۱۸۵۵ء والے بلوہ جو بابری مسجد کے علاوہ بعض دوسری مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کرنے کے لئے ہندوؤں کی طرف سے انگریزی سازش کے مطابق کیا گیا تھا)۔ ایودھیا کے تھانے دار نبی غلام (یہ نام کا مسلمان آج کے زمانے کے سکندر بخت نائب صدر بھاجپا و عباس نقوی جیسا تھا) کی سازش سے اس خالی میدان میں ہندوؤں نے راتوں رات ایک بالشت اونچائی والا جو چبوترہ رام جنم استھان یا رام جنم بھومی کے نام سے تیار کیا تھا اس وقت مسلمانوں کی دادطلبی پر انگریز سرکار نے تھانے دار نبی غلام کو معطل اور مہنتوں پر جرمانہ عائد کیا تھا اسی طرح مسجد کے اندر والے ہندوؤں کے بنائے ہوئے اس چبوترہ و بت کے معاملہ میں کوتوال شہر مرتضی خان سے موقع کا معائنہ کروا کے چبوترہ کو کھود کر پھینکوائے اور ہندوؤں پر وہاں پوجا کرنے کی پابندی لگائے اور مسجد سے باہر والے چبوترہ کو ہندو لوگ جو بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اس پر کارروائی کرے۔"

اس مقدمہ کی سماعت پہلی بار انگریزی سرکار کی عدالت میں ۱۵ ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو ہوئی تھی، فیصلے کی تفصیل واضح نہیں البتہ اتنی بات واضح ہے کہ مسجد کے اندر و باہر والے چبوترے بحکم سرکار کھود کر پھینک دیئے گئے تھے۔ مگر مسلمانوں کی طرف سے یکم نومبر ۱۸۶۰ء کو پھر اس وقت بابری مسجد کے امام و خطیب میر رجب علی کو انصاف و دادطلب کرنے کیلئے انگریزی سرکار والی عدالت میں درخواست دینی پڑی، اس دادطلبی والی درخواست کا حاصل معنی یہ ہے کہ :

"مدعی علیہ اقبال سنگھ نے بابری مسجد کے پاس بیس دن پہلے زبردستی ایک نیا چبوترہ بنا لیا ہے اور روز بروز اس میں اضافہ بھی کرتا ہے اور منع کرنے سے باز نہیں آتا، اس نے مسجد کے قریب ایک جھنڈا بھی برائے فساد نصب کر دیا تھا جسے بحکم کوتوال اکھاڑ دیا گیا، اسی طرح آج سے ڈیڑھ سال پہلے یعنی مئی ۱۹۵ء میں ہری داس مہنت بابری مسجد سے متصل بابری مسجد کی خالی زمین پر اپنا مکان بنانا چاہتا تھا مگر سرکاری مداخلت سے اسے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی، مگر مدعا علیہ سرکاری کارروائی کے باوجود شرارت سے باز نہیں آتا ہے بوقت اذان مسجد کے پاس سنکھ بجاتا ہے ہماری درخواست ہے کہ اس نئے چبوترہ کو بھی اکھاڑ پھینکا جائے اور سنکھ بجانے پر پابندی لگائی جائے۔"

اس درخواست کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان ایودھیا کی طرف سے ۳۰ ر نومبر ۱۸۵۸ء والی درخواست کے جواب میں انگریز حکومت کی سرکاری و عدالتی کارروائی کے نتیجہ میں بابری مسجد کے اندر و باہر شرپسند ہندوؤں کے ذریعہ بنائے گئے چبوترے اور دوسرے نشانات اگرچہ کھود کر پھینک دیئے گئے تھے اور ہری داس مہنت کی طرف سے تعمیر کی کوشش کو ناکام کر دیا گیا تھا مگر انگریزی حکومت کی منصوبہ بند سازش کے مطابق مندر کے اندر تو نہیں مگر باہر پھر اکتوبر سنہ ۱۸۶۰ء میں نیا چبوترہ ہندوؤں نے بنا لیا۔

مسلمانوں کی طرف سے دی گئی اس درخواست پر انگریزی سرکار والی عدالت نے معاملہ کی تحقیقات کرکے رپورٹ پیش کرنے کا حکم جاری کیا اس پر عمل کرتے ہوئے سرکاری طور پر جو رپورٹ تیار کی گئی وہ انگریزی سازش و شرارت کا آئینہ دار ہے، اس رپورٹ کا حاصل یہ ہے کہ:

"اس جگہ کوئی نیا چبوترہ نہیں بنا ہے اور وہاں ایک جھونپڑی چار مہینہ پہلے بنی ہے جس میں مدعا علیہ اقبال سنگھ رہتا ہے، اقبال سنگھ کو فہمائش کر دی گئی ہے کہ کوئی جدید تعمیری کام نہ کرے نہ چبوترہ بڑھائے نہ بنائے ورنہ اسے وہاں سے ہٹا دیا جائے گا اور اس کی کٹیا کو بھی وہاں نہیں رہنے دیا جائے گا"

یہ رپورٹ ۱۹ر دسمبر ۱۸۶۰ء کو پیش ہوئی اس رپورٹ سے صاف عیاں ہے کہ رپورٹ تیار کرنے میں انگریزی و ہندو سازش کا پورا دخل ہے، مسلمانوں کی درخواست میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ۱۸۵۵ء میں ہندوؤں کی شورش کے بعد جو چبوترہ بابری مسجد کے باہر بابری مسجد کے پاس بنا لیا گیا تھا وہ ۱۵ر دسمبر ۱۸۵۸ء والے سرکاری حکم کے مطابق کھود کر ختم کر دیا گیا تھا جس کے بعد دوبارہ سرکاری حکم کے خلاف پھر ۱۰ر اکتوبر کو بابری مسجد کے باہر بابری مسجد کے پاس ہندوؤں کی طرف سے نیا چبوترہ بنا لیا گیا ہے مگر تیار شدہ رپورٹ میں اس حقیقت کو حسب عادت نہیں حسب سازش (جو انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد سے اب تک بھارتی عدالتوں اور سرکاروں کا بھی شیوہ و شعار ہے) نظر انداز کر کے لکھ دیا گیا کہ یہاں کوئی نیا چبوترہ نہیں بنا ہے بلکہ جس چبوترہ کو مسلمانوں کی طرف سے دی گئی درخواست میں نیا چبوترہ کہا گیا ہے وہ پرانے زمانہ سے موجود و برقرار ہے اس طرح مسلمانوں کی حقیقت بیانی کی تکذیب دیدہ و دانستہ کی گئی جیسا کہ آج کل بھی مسلمانوں کے عام معاملہ خصوصاً بابری مسجد کے سلسلے میں انگریزوں کی روحانی شاگرد بھارتی سرکاروں اور عدالتوں اور ان کے کارکنوں کا شیوہ و شعار ہے اور کاروبار بھی۔ مسلمانوں کی طرف سے دی گئی درخواست میں اگرچہ وہاں کسی جھونپڑی (کٹیا) کی موجودگی کا کوئی ذکر نہیں تھا مگر رپورٹروں نے انگریزی سازش کے مطابق رپورٹ میں ظاہر کیا کہ وہاں اقبال سنگھ مدعا علیہ کے رہنے کے لئے بطور مسکن ایک کٹیا موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کٹیا مسلمانوں کی اس درخواست کے بعد رپورٹ تیار کرنے کا حکم صادر کرنے کے وقت بنائی گئی جس کی بابت رپورٹ میں حسب سازش و حسب عادت کہہ دیا گیا کہ یہ کٹیا چار مہینے پہلے سے بنی ہوئی ہے۔

جعل سازی و عیاری و انگریزی سازش والی اس رپورٹ کے بعد مسلمانوں کی مذکورہ درخواست پر انگریزی کی سرکاری عدالت کی طرف سے جو کارروائی ہوئی وہ جن الفاظ میں سرکاری و عدالتی طور پر لکھی گئی اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

"مسلمانوں کی درخواست مذکورہ اور اس سلسلے میں مطلوبہ رپورٹ پر غور کر کے یہ حکم صادر کیا جا رہا ہے کہ تھانیدار سے تحریری طور پر دریافت کیا جائے کہ مدعی علیہ نے چار مہینہ پہلے جو کٹیا وہاں بنائی ہے اس کے لئے اس نے سرکاری اجازت لی تھی یا نہیں؟ اگر بلا سرکاری اجازت یہ کٹیا بنائی گئی ہے تو اسے اکھڑوا کر پھینک دیں۔"

انگریزی عدالت کے اس حکم نامہ میں چبوترہ سے متعلق کوئی بھی حکم نہیں صادر کیا گیا لہذا وہ جبراً و قہراً برقرار رکھا گیا اور آئے دن مسلمان انگریزوں کی سازش سے ہندوؤں کی کھڑی کردہ پریشانیوں کے شکار ہوتے رہے جس کی تفصیل ہماری زیر تصنیف کتاب میں ہے۔ انگریزوں کی سازش سے ہندوؤں کے تعمیر کردہ اس چبوترہ کو جنم استھان قرار دیا جاتا رہا اس

اس لئے اس پاس کوئی ہندو عمارت نہیں تھی تاآنکہ انگریزی سازش ہی کے مطابق ایودھیا کے مہنت رگھوبیر داس کے ذریعہ ۲۹ جنوری ۱۸۸۵ء کو سرکاری عدالت میں اس مضمون کی درخواست دلائی گئی کہ اس چبوترہ پر کوئی عمارت نہ ہونے کے باعث سردی و گرمی و برسات میں پجاریوں اور یاتریوں کو اذیت ہوتی ہے اس لئے اس چبوترہ پر مندر کی تعمیر کی اجازت دی جائے۔ (مسلم انڈیا اردو مئی ۱۹۸۶ء)

انگریزی حکومت و عدالت اندرونی طور پر ہندوؤں سے سارے اقدامات کرانے کے باوجود اس بات پر راضی نہیں ہوئی کہ اس چبوترہ پر ہندوؤں کو مندر بنانے کی اجازت دے اس مقدمہ کو فیصل کرنے کے لئے انگریزی حکومت کی طرف سے ایک ہندو جج ہری کشن مقرر کئے گئے تھے جنہوں نے کہا کہ جنم استھان کہے جانے والا چبوترہ چونکہ بابری مسجد کے پاس واقع ہے اس لئے اس چبوترہ پر مندر بننے سے ہندو مسلم فساد کا خطرہ ہے لہذا اس پر مندر بنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

الغرض اسی طرح کے بکھیڑے انگریزی حکومت کے خاتمہ تک چلتے رہے جن کی کسی قدر تفصیل ہماری زیر تصنیف کتاب میں ہے یہاں تک کہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ملک ہندوستان انگریزوں سے آزاد ہوا، مگر یہ ملک دو حصوں پاکستان و بھارت میں منقسم ہوگیا، بھارت پر کہنے کو سیکولر و جمہوری سرکار کی حکومت رہی مگر حقیقت میں اس پر ایسے غیر جمہوری و غیر سیکولر حکمرانوں کی گرفت مضبوط رہی جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف بے پناہ جذبات رکھتے ہیں چنانچہ آزاد ہونے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی سیکڑوں مسجدوں کو تباہ و برباد کرایا گیا اور بہت ساری مساجد کو مندروں میں تبدیل کیا گیا اور لاکھوں مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کے سبب ہلاک کیا گیا ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے خصوصا پولیس و فوج کے محکموں کے دروازے بند کئے گئے اور ان کی معیشت تباہ کی گئی ان کی زبان و تہذیب کو مٹانے اور بدلنے کی کوشش مسلسل جاری ہے، پھر ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کرنے کے بعد مسلمانوں کا قتل عام، لوٹ کھسوٹ، معیشت و مکانات کو تباہ، بہت سارے مسلمانوں اور ان کے مکانات کو نذر آتش کیا گیا اور اب اعلان کیا جا رہا ہے کہ دہلی کی جامع مسجد کاشی (بنارس) کی مسجد گیان واپی و متھرا کی عیدگاہ اور ہزاروں دوسری مساجد کو بھی تباہ کر کے ان کی جگہ پر مندر تعمیر کئے جائیں گے اور سیکولر حکومت نہایت اطمینان سے ہمیشہ یہ ٹیپ کا بند سناتی ہے کہ ہم پوری طرح مسلمانوں ان کی عبادت گاہوں اور دوسرے امور کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ حدیث نبوی میں ہے کہ حکمراں طبقہ کا جھوٹ بولنا سب سے زیادہ مذموم ہے مگر مسلمانوں اور ان کی قیمتی چیزوں کے دعوی تحفظ کرنے والا انگریز کا جانشین ہندوستانی حکومت کا حکمراں طبقہ بہت ہی زیادہ جھوٹ بولتا ہے اور موجودہ ہندوستانی وزیر اعظم کے بارے میں سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ نے علی الاعلان کہا کہ اس سے بڑا جھوٹا و فریب کار ہم نے کبھی اور کہیں نہ سنا اور نہ دیکھا۔

(۶ ردسمبر کے بعد والے عام اخبارات میں یہ بات دیکھی جا سکتی ہے) باخبر لوگ مثلاً سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش مسٹر ملائم سنگھ یادو اور ان جیسے لوگ بابری مسجد کی شہادت سے پہلے علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ بابری مسجد کے خلاف اتر پردیش بھاجپا سرکار اور مرکزی کانگریسی سرکار میں سانٹھ گانٹھ اور عہد و معاہدہ ہو چکا ہے مگر دوسری طرف مرکزی سرکار جھوٹ بولتے ہوئے یہ راگ الاپ رہی تھی کہ بہر قیمت بابری مسجد کی حفاظت کی جائے گی۔ اتر پردیش کی ریاستی سرکار و مرکزی سرکار نے یہ ڈھونگ بھی رچایا کہ سپریم کورٹ کے ذریعہ ریاستی حکومت سے

ری مسجد کے تحفظ کا حلف نامہ محض شعبدہ بازی اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے داخل کیا گیا اور کام اس
برعکس کیا، پھر مسجد منہدم ہونے پر اسی طرح کی شعبدہ بازی کرتے ہوئے کہہ دیا گیا کہ اتر پردیش کی بھاجپا سرکار
دشواش گھات کیا لیکن مرکزی حکومت نے جو دشواش گھات پوری دنیا کے ساتھ کیا اسے یہ حکومت اپنی سادہ
ں کہتی پھرتی ہے، پھر اسی طرح کا ایک وعدہ حکومت نے بابری مسجد کی نئی تعمیر کے سلسلے میں کیا اور پوری دنیا
دھوکہ دے دیا۔ اس مسجد کی تعمیر کے بجائے اب وہاں مندر تعمیر کرنے کی کھلم کھلا سازش ہو رہی ہے اور مسجد کی
توفہ املاک کو اپنے تصرف میں لے لیا گیا ہے۔

افسوس اس طرح کی سیکولر حکومت سے زیادہ مسلمانوں پر ہے کہ پینتالیس سالوں کی مدت میں روز بروز
مالہ واضح سے واضح تر ہوتا جا رہا ہے مگر وہ اسلامی اصول کے مطابق متحد ہو کر صورت حال سے نپٹنے کے
ۓ کسی قسم کی بات نہیں سوچتے اپنی تباہی و بربادی پر صرف بے معنی قسم کی چیخ و پکار، آہ و فغاں،
رہ بازی، اشک ریزی کرتے ہیں۔ جو کام پوری امت کو متحد ہو کر کرنا ہے اس سے سبھی لوگ غافل ہیں۔
لہم اھد قومی فانہم لا یعلمون۔

اللہ تعالیٰ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔

(آمین)

"محدث" جنوری، فروری ۱۹۹۳ء

بابری مسجد کا انہدام

فسادات اور ہندوستانی مسلمان

اصغر علی انجینئر

٦ دسمبر کو ہونے والا بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ ـــ ہم نرم سے نرم الفاظ استعمال کریں تو بھی ـــ بڑی سنگین نوعیت کا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہمارے ملک کی سیکولر سیاست کے دامن پر بدنما داغ ہے اور اس کے لیے بی ۔ جے ۔ پی ۔ وی ۔ ایچ ۔ پی ۔ بجرنگ دل وغیرہ تو ذمے دار ہے ہی ، ملک کی حکمراں پارٹی کانگریس بھی ذمے دار ہے ۔ یہ محض بابری مسجد کا انہدام نہیں ہمارے تمام آدرشوں اور خوابوں کا انہدام ہے۔ مہاتما گاندھی، نہرو ، مولانا حسین احمد مدنی اور ابوالکلام آزاد کے اصولوں کا انہدام ہے۔

اگر بابری مسجد کا انہدام سیکولر سیاست کے نام پر بدنما داغ ہے تو اس کے فوراً بعد ہونے والے فسادات اور مسلمانوں کا قتل عام ، اس کے منہ پر زوردار تھپڑ ہے۔ نہ صرف یہ کہ نرسمہا راؤ حکومت بابری مسجد کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی بلکہ یہ ہندوستان کے شہریوں کی بھی حفاظت نہ کر سکی ۔ اتنا ہی نہیں زیادہ تر یہ قتل عام بھی پولیس کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ فرقہ پرست ہندوؤں کا کام پولیس خود کر رہی ہے ۔ اور وہ بھی بڑی صلاحیت کے ساتھ۔ بمبئی میں ہی پولیس کے ہاتھوں کم از کم ١٥٠ سے زیادہ لوگ مارے گئے ، ہزاروں مارے گئے اور کروڑوں کی مالیت کا سامان نذر آتش ہوا یا لوٹ لیا گیا۔ (یہ مضمون آخر دسمبر میں لکھا گیا۔ ادارہ)

سورت، جو جنوبی گجرات کا صنعتی شہر ہے، پہلے کبھی فسادات سے آشنا نہ تھا لیکن اس مرتبہ اس شہر میں بھی بربریت کی انتہا ہو گئی ۔ ۴۰ افراد کو زندہ نذر آتش کر دیا گیا ، ۲۲ افراد کو ٹرین سے اتار کر قتل کر دیا گیا اور کئی عورتوں سے زنا کر کے اس کی فلم بنانے کی کوشش کی گئی۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو کر ہجرت پر مجبور ہوئے وہ الگ ، اس کے علاوہ مہاراشٹر ، گجرات ، یوپی ، بہار ، مغربی بنگال ، راجستھان ، مدھیہ پردیش ، کرناٹک ، آندھرا پردیش ، آسام ،

اڑیسہ وغیرہ میں بھی جگہ جگہ فسادات ہوئے اور کل مرنے والوں کی تعداد ۱۲۰۰ سے زائد ہو گئی۔ اور یہ تو سرکاری اعداد و شمار ہیں۔

اور ہمیں یہ بھی ذہن نشین کرنا ہے کہ نہ تو یہ پہلا ملک گیر فساد ہے نہ آخری یہ تو ہمارے ملک کا دستور ہی بن گیا ہے۔ پہلے تو ہم اسے باقاعدہ فرقہ وارانہ فسادات کہہ سکتے تھے۔ اب اس کی نوعیت بتدریج بدلتی جا رہی ہے۔ ان فسادات میں اب ہندوؤں کا کم اور پولیس کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ عام طور پر اب اموات قانون کے رکھوالوں کے ہاتھ ہی ہوتی ہیں۔ میرٹھ کے ۱۹۸۷ء کے فسادات کے بعد یہ رجحان۔ جو پہلے سے موجود تھا زیادہ زور پکڑ چکا ہے۔ میرٹھ کے فسادات میں یہ رجحان اتنا شدید ہوا کہ ایمنیسٹی انٹرنیشنل — جو کہ ایسی واقعات کی تحقیقی رپورٹ شائع کرتی ہے جس میں حکومت اور اس کی ایجنسیاں شامل ہیں — نے بھی میرٹھ کے واقعات پر رپورٹ شائع کی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات کا کیسے مقابلہ کیا جائے اور ہندستانی مسلمانوں، ان کے لیڈروں اور دانشوروں کا کیا رویہ ہو؟ کیا حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اب مایوسی کے سوا کچھ نہیں؟ یا یہ کہ مسلم نوجوان مسلح ہو کر میدان میں آجائیں اور ملک کے ہر کونے کو پنجاب اور کشمیر بنا دیں؟ ہمارے خیال میں یہ انتہا پسندانہ اور شدید ردِ عمل ہے۔ جس کے اثرات نہ صرف ملک کے لیے بلکہ خود مسلمانوں کے لیے بے حد سنگین ثابت ہوں گے۔ محض مایوسی انھیں بے عملی کی طرف اور سپردگی کی طرف لے جائے گی اور ہتھیار اٹھانے والی بات ان کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگی۔ جو نوجوان ہتھیار اٹھانے کی بات کرتے ہیں وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور یہ بات قابلِ عمل ہے بھی یا نہیں۔

ہم اس بات پر کچھ اور روشنی ڈالنا چاہیں گے۔ ہماری جنگ آزادی کے دوران بھی یہ رجحان پایا جاتا تھا۔ کچھ نوجوانوں۔ جنھیں ہم آزادی کی تاریخ میں دہشت پسند یا انتہا پسند کے نام سے یاد کرتے ہیں — کا یہ خیال تھا کہ انگریزوں سے مسلح جنگ کرکے ہی ہم آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں نے عدم تشدد کا فلسفہ اپنایا اور کہا کہ عوام میں بیداری پیدا کرکے اور عوامی تحریک چلا کر ہی ہم انگریزوں کو آزادی دینے پر مجبور کر سکتے ہیں اور مہاتما گاندھی نے عوام میں زبردست بیداری کی لہر پیدا کی اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ عوامی بیداری کا آخر انگریزوں پر

اتنا دباؤ پڑا کہ ۱۹۴۷ء میں انگریز ملک کو آزاد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مسلح نوجوانوں کا رول آزادیٔ ہند کی تحریک میں ہرگز مرکزی حیثیت نہیں رکھتا۔ مرکزی حیثیت عوامی تحریک کی ہی ہے

اس سوال کے علاوہ کہ تشدد ان معاملات میں کتنا کارگر ہوتا ہے، دوسرے اخلاقی نوعیت کے بھی سوال ہیں جو تشدد کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ بندوق اٹھاتے وقت اس کی سمت دشمن کی طرف ہوتی ہے لیکن بہت جلد اس کی سمت اپنوں کی طرف ہو جاتی ہے پنجاب اور کشمیر کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مسلح گروہ اختلاف رائے کو بالکل برداشت نہیں کر پاتے اور بہت جلد ان افراد کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیتے ہیں جو ان سے ذرا سا بھی اختلاف رکھتے ہوں۔ نفسیاتی طور پر بندوق اٹھانے والے کے ذہن پر ہمیشہ شک۔ اور خوف کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اسے ہر مخالف دشمن یا دشمن کا ایجنٹ نظر آنے لگتا ہے۔ وہ مخالفت اور دشمنی میں فرق کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ کشمیر اور پنجاب میں معمولی معمولی اختلافات پر اپنوں ہی پر گولی چلا دینے کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مسلح انتہا پسندوں نے اپنوں ہی کو زیادہ نشانا بنایا ہے۔ چنانچہ پنجاب میں ہندوؤں کے مقابلے میں سکھ اور کشمیر میں فوجیوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان ہی زیادہ مارے گئے ہیں۔ اعداد و شمار اس کے شاہد ہیں۔

پھر پنجاب اور کشمیر میں سکھ اور مسلمانوں کا جماؤ ہے، اکثریت ہے۔ ان علاقوں کی سرحدیں پاکستان سے ملی ہوئی ہیں اور پاکستان انتہا پسندوں کو تربیت بھی دے رہا ہے اور اسلحہ بھی۔ یہ سب کچھ ملک کے دوسرے حصّوں میں ناممکن ہے۔ دیگر کشمیریوں اور پنجابی سکھوں کی اپنی نسلی، لسانی اور علاقائی شناخت بھی ہے جو ملک کے دیگر حصوں میں مسلمانوں کی نہیں ہے۔ پنجاب اور کشمیر میں یہ علاقائی شناخت مذہب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ حالانکہ اس سے انکار نہیں کہ اس میں مذہب کا بھی اپنا رول ہے۔ ایسے حالات میں ملک کے دوسرے حصوں میں اسلحہ اٹھانا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پولیس بڑی حد تک ہندو فرقہ واریت سے متاثر ہو چکی ہے۔ اگر مسلمان پتھر پھینکتا ہے تو اس کا جواب گولیوں سے دیتی ہے۔ اور اس کا خمیازہ اکثر بے گناہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بعض وقت تو پُرامن مسلمانوں پر وہ ظلم ہوتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ پھر یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر مسلم نوجوان ہتھیار اٹھالیں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ معاملے کا ہرگز حل نہیں ہو سکتا۔

ملک میں پڑھا لکھا ہندو فرقہ واریت کے اثر میں بڑھتی ہوئی تعداد میں آتا جا رہا ہے۔ وہ
ں بھی کچھ بی جے پی کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے اور کچھ خود اپنے ہی تعصبات کی وجہ سے
سلمانوں کو مذہبی طور پر جنونی، غیر روادار اور تشدد پسند سمجھتا ہے اور تمام تر فسادات کا
ے دار اُسے ہی قرار دیتا ہے۔ آج اس تاثر کو ختم کرنے اور اس کے خلاف جدوجہد کرنے کی
نرورت ہے لیکن اگر خدا نہ کرے کچھ نوجوانوں نے ہتھیار اٹھالیے تو مسلمانوں کے خلاف اس قسم کے
یالات اور تاثرات میں انتہا درجے کی شدت پیدا ہوگی اور ہندو فرقہ پرستوں کے تشدد کو
ر اعتبار سے جواز حاصل ہو جائے گا۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ انھیں کسی طرح ایسا جواز
اصل نہ ہو۔

یہ بھی قطعاً غلط خیال ہے کہ اسلام مسلمانوں کو ہر معاملے میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت
یتا ہے۔ اسلام کی پہلی تعلیم رحم، دردمندی، ہمدردی، عدل، احسان، مساوات اور اخوت کی
ہے۔ ان تعلیمات پر بنیادی زور ہے۔ ہم مسلمان اپنا ہر کام اس اللہ کے نام سے شروع کرتے
یں جو رحیم اور رحمان ہے۔ وہ عادل اور محسن ہے اور ہمیں حسن کلام (موعظتہ الحسنہ) اور حکمت
سے کام لینے کی ہدایت بار بار کرتا ہے۔ اسلحہ اٹھانے کا ہر مرحلہ آخری مرحلہ ہے اور اسلحہ اسلحہ
کے جواب میں ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ آج چونکہ کچھ پولیس والے مسلمانوں پر گولی چلاتے
یں تو اب بندوق اٹھانے کا وقت آگیا ہے، حقائق پر دھول ڈالنا ہے۔

اس بات کا ہم نے مضمون کے شروع میں ہی اقرار کیا ہے کہ کچھ پولیس والے مسلمانوں
و گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ہر پولیس والا مسلمانوں
کھلا دشمن ہے۔ یہ رجحان بے شک بڑھ رہا ہے لیکن اگر کچھ مسلم نوجوانوں نے بندوق اٹھالی
یہ رجحان بڑھے گا، کم نہیں ہوگا۔ ہماری کوشش اس رجحان کو کم کرنے کی ہونی چاہیے۔
یسے سنگین حالات میں بھی بمبئی میں کئی مثالیں اور شہادتیں ایسی ملی ہیں کہ پولیس نے مسلمانوں
ی مدد کی اور فسادات کی آگ کو مستعدی سے بجھایا۔ خصوصاً پولیس کے اعلیٰ افسروں میں
رقہ واریت کا اثر نچلے افسروں اور کانسٹبلوں سے بہت کم ہے۔ ہمیں پولیس کے اعلیٰ افسروں
ی زیادہ سے زیادہ مدد لینے کی ضرورت ہے۔ انھیں بھی فرقہ پرستی کی گود میں دھکیلنا نہیں ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہندوستان مسلمانوں کے لیے دار الامن رہا ہے یا نہیں اور یہ
ہو سکے [illegible] ہونے کی کسوٹی کیا ہو؟ کیا ہم آج ہندوستان کو دار الامن کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

اس کی اصل کسوٹی یہ ہوگی کہ ہمارا سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریہ کیا ہے۔ آج بھی دستورِ ہند کے مطابق ہندستان ایک سیکولر ملک ہے اور یہاں تمام مذاہب کو برابر کا تحفظ اور آزادی حاصل ہے۔ اس دستوری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا نہ دستورِ ہند میں تبدیلی کی کوئی لہر پیدا ہوئی ہے۔ دراصل بی جے پی کے علاوہ تمام سیاسی جماعتیں دستور کی بنیادی حیثیت کو تسلیم کرتی ہیں اور سیکولرزم کو بنیادی فلسفہ قرار دیتی ہیں۔ آج بی۔ جے۔ پی ہی ایک واحد جماعت ہے جو سیکولرزم کی مخالفت پر آمادہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آج سیکولرزم کے آدرش پر عمل میں کمی آئی ہے اور ایک طبقہ اسے محض اقلیتوں کی خوشنودی کا فلسفہ قرار دے رہا ہے لیکن یہ محض اور رجحانوں میں ایک رجحان ہے۔ اس رجحان کے خلاف لڑنے اور جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ آج ہمیں کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے یہ رجحان اور مضبوط ہو جائے نہ ہی ہمیں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ اب ہندستان مسلمانوں کے لیے دارالامن نہیں رہا۔ اور ہتھیار اسی صورت میں اٹھائے جا سکتے ہیں جب ہندستان دارالحرب میں تبدیل ہو جائے اور یہ دارالحرب میں اسی وقت بدل سکتا ہے جب یہاں کے حکمراں سیکولرزم کے نظریے کو ترک کر دیں اور مسلمانوں کی آزادی سیاسی اعلامیے کے ذریعے سلب کر کے انھیں دشمن قرار دے دیں۔ ایسا تو اب تک کوئی رجحان بھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ پولیس کا ایک طبقہ متعصبانہ رویہ اختیار کرتا ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہندستان مسلمانوں کے لیے دارالامن نہیں رہا۔ مسلح فوجیں اور سی۔ آر۔ پی۔ ایف وغیرہ آج بھی مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہیں اور مسلمان فسادات کے دوران فوجی دستوں کا استقبال کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ سی آر پی ایف کے رویے سے بھی بہت خوش نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف ہمیں مایوس ہونے کی بھی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ مایوسی انسان کو بے عمل بناتی ہے اور حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ختم کر دیتی ہے۔ ہر تحریک کا بانی مایوسی کی مذمت کرتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی مایوسی کو مذموم قرار دیا ہے۔ قوموں کو اکثر بحرانی دور سے گذرنا پڑتا ہے اور ہر بحرانی مرحلہ قوموں کے امتحان کا مرحلہ ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں کئی سخت مراحل سے گذرے ہیں اور اکثر کامیابی سے گذرے ہیں استقلال سے مشکلات پر قابو پایا ہے اس لیے آج کے تاریک حالات میں بھی ہمیں امید کے قمقمے روشن رکھنا چاہییں

گے اور اپنے روشن مستقبل کے لیے جدوجہد جاری رکھنا ہوگی۔ جسمانی جدوجہد اور ذہنی اجتہادات ہی زندگی کی ضمانت ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۱۰ کروڑ ہے۔ یہ تعداد کئی ملکوں کی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ کوئی ملک اتنی بڑی آبادی کو ظلم وستم کا نشانہ بنا کر ہرگز ہرگز آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اس ملک میں سیکولر طاقتیں کچھ حد تک کمزور ضرور ہوئی ہیں لیکن نابود ہرگز نہیں ہوئیں اور جمہوری ملک کی بقا کی ضمانت ہی سیکولرزم کا آدرش ہے اور ہندستان جیسے کثیر مذہبی اور کثیر تہذیبی ملک میں سیکولرزم ہی جمہوریت کی بقا کی ضمانت ہے اور اقلیتوں کے روشن مستقبل کی بھی۔ بی جے پی ملک کو فاشزم کی جانب لے جانا چاہتی ہے۔ جواہر لال نہرو نے برسوں پہلے یہ کہا تھا کہ ہندستان میں فاشزم فرقہ واریت کی صورت میں ہی آئے گا اور انھوں نے اپنے آخری دنوں میں یہ بھی کہا تھا کہ ملک کے اتحاد کا سب سے بڑا دشمن فرقہ واریت ہے، خارجی حملہ نہیں۔ پنڈت جی کی یہ باتیں آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔

اس لیے آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم سیکولر طاقتوں کو مضبوط بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اس کے لیے محض جذبات سے نہیں بڑے صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ حق اور صبر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صبر نا امیدی اور بے عملی والا صبر نہیں بلکہ سچائی اور جدوجہد والا صبر۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بہت دانش مندی سے اپنی بقا اور خوشحالی کے لیے صحیح حکمت عملی تیار کریں۔ ہم اس ملک میں صدیوں سے رہتے چلے آتے ہیں اور اس ملک کے عوام رواداری اور امن پرستی کے حامل رہے ہیں۔ آج بھی وہ امن چاہتے ہیں۔ فسادات نہیں۔ فسادات مفاد پرست کراتے ہیں اور وہی اس کا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ صوفیائے کرام کا ہندستانی عوام نے ہمیشہ احترام کیا ہے اور آج بھی کرتے ہیں۔ بابا فرید۔ خواجہ معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیاء اور کبیر آج بھی نہایت احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں اور عوام بلا تفریق مذہب و ملت آج بھی ان کی درگاہوں پر اپنا شیش جھکاتے ہیں۔ اسی طرح سنت تکارام وٹھوبا اور دیگر سنت جو ہندو ذات پات کے نظام سے اوپر اٹھ کر انسانی مساوات کے گیت گاتے تھے عوام کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ ہمیں ان روایتوں کو مضبوط بنانا ہے اور مشترکہ تہذیب کو زندہ رکھنا ہے تاکہ عوام کا اتحاد مضبوط ہو اور فرقہ وارانہ نفرت کا توڑ ہو۔

آج جدید دور میں مذہب کا استعمال جتنا اہلِ سیاست کر رہے ہیں شاید خود مذہبی پیشوا بھی

نے نہیں کیا ہوگا۔ فرقہ واریت بھی مذہب کے اسی سیاسی استحصال کا نتیجہ ہے۔ بی۔ جے۔ پی نے ہندو مذہب کا استحصال کرنے میں تمام حدوں کو پار کر دیا ہے۔ بی۔ جے۔ پی آج جدید ہندستان میں مذہب کا اتنا جارحانہ استحصال اس لیے کر رہی ہے کہ اسے ایک طرف ذات پات کی تفریق بھی قائم رکھنا ہے تاکہ اوپری ذاتوں کے ہاتھ میں اقتدار رہے اور دوسری طرف ذات پات کے ماوراء جاکر تمام ہندوؤں میں اتحاد کا ڈھونگ بھی رچایا جا سکے اور ان کے ووٹ حاصل کیے جاسکیں۔ یہ کام نہایت مشکل ہے اور مذہبی جارحیت کے ذریعے یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ رام جنم بھومی کا مسئلہ مذہبی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔

بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ جدید دور میں مذہبی بنیاد پرستی اتنی جارحانہ صورت کیوں اختیار کر رہی ہے۔ ماہرین سماجیات کے لیے اس کا سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ صارفیت اور جدیدیت ایک جانب اور مغرب زدگی دوسری جانب انفرادی مذہبی اور تہذیبی روایتوں اور تشخصوں کو ختم کر کے بڑے شہروں میں پوری شدت سے بیگانگی کا جذبہ پیدا کر رہی ہیں جس کا آخر کار مذہبی اور تہذیبی بنیاد پرستی زور پکڑتی ہے جس کا استحصال اہل سیاست اپنے مفادات کے لیے کرتے ہیں۔ بیگانگی کا احساس (FEELING OF ALIENATION) جتنا شدید ہوتا ہے، مذہبی بنیاد پرستی بھی اتنی ہی شدت اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور جسے اہل سیاست اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جدید ہندستان میں بی جے پی کی کامیابی کی بھی ایک وجہ یہی ہے اور خصوصاً پڑھے لکھے متوسط شہری طبقوں میں۔

مسلم لیڈر بھی مسلم عوام کے مذہبی جذبات اور ساتھ ساتھ اقلیت میں ہونے کے احساس کا پوری شدت کے ساتھ استحصال کر رہے ہیں۔ مسلم دانشوروں کو خصوصاً اس طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ آج کے موقع پرست مسلم لیڈروں کو نہ مذہبی اقدار کا پاس ہے نہ مسلم عوام کے جان و مال کے تحفظ کا خیال ہے۔ ورنہ وہ بابری مسجد کے مسئلے کو بہت محتاط اور حکیمانہ طریقے سے استعمال کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلم لیڈر شپ نے نہ تو کوئی سوچی سمجھی حکمت عملی بنائی نہ کہیں سیاسی توازن کا ہی خیال رکھا بلکہ ان لیڈروں کے مختلف دھڑے ایک دوسرے کے مقابلے میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا بے رحمانہ استحصال کرتے رہے اور اب بھی یہی رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس سے ہندو فرقہ پرستی کو جارحانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے جواز مہیا ہو رہا ہے۔ آج مسلمانوں کو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد

اور ذاکر حسین جیسی عالمانہ، باوقار اور محتاط رویہ رکھنے والی لیڈرشپ کی سخت ضرورت ہے۔ اگر آج ایسی باوقار اور محتاط لیڈرشپ ہوتی تو بابری مسجد کے انہدام پر مسلمانوں کا رویہ محتاط ہوتا۔

احتجاج کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ بمبئی کی حد تک یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا احتجاج غیر محتاط تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سماج دشمن عناصر اس کی اگوائی کر رہے تھے ورنہ نہ ہندوؤں کی دکانیں لوٹی جاتیں نہ مندروں پر حملہ ہوتا۔ کچھ مندروں کو آگ لگانے کی بھی کوشش کی گئی اور کہیں کہیں مورتیاں بھی توڑی گئیں۔ اگر مولانا آزاد جیسے قدآور لوگ ہوتے تو مسلمانوں کا احتجاج نہایت باوقار ہوتا اور ایسے احتجاج کا حکومت پر زیادہ اثر پڑتا اور پولیس کو اس طرح جارحانہ رویہ اختیار کرنے کا بھی موقع نہ ملتا اور بے گناہ مسلمانوں کی جانیں بھی ضائع نہ ہوتیں۔

اس نازک مرحلے سے گذرنے کے لیے مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ سیکولر اور امن پسند طاقتوں کا ساتھ دیں اور اپنے لیڈروں کو جارحانہ رویہ اختیار کرنے سے باز رکھیں۔ ایک طرف بی۔ جے۔ پی کے زیر اثر کچھ نام نہاد ہندو سنت رام للا کے درشن پر مصر ہیں جس کی اجازت عدالت نے دے دی ہے تو دوسری طرف بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے لیڈر وہاں جاکر نماز ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے تو دونوں طرف سے فرقہ وارانہ جارحیت کو ہوا ملے گی اور ہندو فرقہ پرستی کو نیا جواز۔ زخموں کو مندمل کرنے کے لیے بابری مسجد کی تعمیر ضروری لگتی ہے لیکن اس پر زور دینے سے پہلے ہمیں نتائج پر بھی اچھی طرح غور کر لینا ہوگا۔ یہ معاملہ ہمیں ہندستان کی سیکولر طاقتوں کے حوالے کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مسلمانوں کی زندگی کے تحفظ اور بابری مسجد کی از سرِ نو تعمیر کی مانگ کے درمیان توازن پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ ہمارے محتاط رویے سے سیکولر طاقتیں بھی مضبوط ہوں گی اور ہندو فرقہ پرستی کو بھی وہ جواز نہ مل سکے گا جس کی اُسے ہندو متوسط طبقے میں اپنی جارحانہ مہم کو مضبوط بنانے کے لیے تلاش ہے۔ مسلم عوام اپنے تشخص کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کا بھی تحفظ چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی ان کے امن پسندانہ جذبات کی نمائندگی کرتی ہے یا محض اپنے مفاد کی؟ (جاری)

"نیا ادبی سفر" جنوری۔ مارچ ۹۳ء

بابری مسجد/حادثہ

رد عمل مسلمانوں میں ہ ناتھا' ان کو غصہ آناتھا' ان کے اندر پیدا شدہ اس رد عمل اور غصہ کو صحیح رخ مسلم قیادت دے سکتی تھی' لیکن افسوس کہ ابو الکلام آزاد ' اور حفظ الرحمان سیوہاروی کی وفات کے بعد ملی قیادت ختم ہوگئی اور ان کا کوئی جانشین پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر فریدی تھوڑی سی مدت کے لئے سامنے آئے لیکن قضا و قدر کے ہاتھوں نے انہیں بھی ہم سے چھین لیا۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

بابری مسجد رابطہ کمیٹی اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے نام سے بابری مسجد کے تحفظ کے لئے جو شخصیتیں منظر عام پر آئیں ' لگتا ہے کہ ان کے سامنے شہرت و ناموری اور اقتدار و لیڈری کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔ یہ حوصلہ ہارے ہوئے جذباتی اور ابن الوقت افراد تھے جنہوں نے بیک وقت بزدلی اور جذباتیت' بے خبری اور بے دانشی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا' نوشتہ دیوار کو پڑھنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی اور جب بابری مسجد ان کے سر کی دونوں آنکھوں کے سامنے گرادی گئی تو اب یہ اس کے جنازہ میں کفن چوری کی نیت سے پھر شریک ہونے کی کوشش کر رہے ہیں' اور ملت کے جسم سے بچے بچائے خون کو بھی نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ پورے ملک میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے' ان کی جائیدادیں ' فیکٹریاں اور ان کے تجارتی مراکز جلائے جا رہے ہیں یہ ہندو مسلم فسادات نہیں ہیں بلکہ یہ ایک طرح کا پولیس ایکشن ہے جو کرفیو لگانے کے بعد دکھ درد سے چور' بابری مسجد کے حادثہ کے نتیجہ میں حواس باختہ مسلماں مظلوموں کے ساتھ پولیس کے درندے انجام دے رہے ہیں اور کانگریس کی حکومت ان کی کھلا کھلا پشت پناہی کر رہی ہے۔ مسٹر نرسما راؤ کی حکومت نے بی جے پی کی حکومت سے بابری مسجد شہید کراکے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں' ایک طرف تو بابری مسجد گروا کر انتہا پسند ہندوؤں کے ووٹ اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی ہے' دوسری جانب چار صوبوں میں بی جے پی کی حکومت ختم کرکے انتخابات میں بازی ہوئی بازی جیتی ہے' تیسری جانب انتہا پسند تنظیموں پر پابندی عائد کرکے اپنی انتظامیہ اور پولیس کے ذریعہ مسلمانوں کے قتل عام کا کام تسلسل کے ساتھ کرکے وہ اکثریت کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہے کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے آر ' ایس ایس ' بجرنگ دل' وشو ہندو پریشد اور شیو سینا کی ضرورت نہیں' ہماری حکومت یہ کارنامہ ان سے بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے اور بمبئی' احمد آباد' سورت ' بنگلور ' بھوپال' دہلی اور کانپور وغیرہ اس کے گواہ ہیں' انتہا پسند تنظیموں کے ساتھ " جماعت اسلامی" جیسی دستور اور حکومت کی وفادار مسلم تنظیم پر پابندی لگا کر نرسما راؤ صاحب نے اپنی حکومت کی پیشانی پر "عدل گستری " کی مہر ثبت کردی ہے' مسلمانوں کو یہ بات ہرحال میں واضح کردینی چاہئے کہ بی جے پی کی حکومتوں کا خاتمہ اور بعض تنظیموں پر پابندی ایک سیاسی عمل ہے مسلمانوں کے مفادات کا اس سے کوئی تعلق نہیں' وہ صرف انصاف کے طالب ہیں انہیں کسی تنظیم یا کسی حکومت سے نہ کوئی محبت ہے نہ عداوت وہ اس سلسلہ میں بالکل غیر جانبدار ہیں۔ (ع ، ح ، ر) .

سریندر موہن

یہ ہندوستان کی لازوال سیکولر روایات اور اقدار ہی ہیں کہ جب جنونی اور متعصب لوگوں نے اجودھیا کی بابری مسجد کو منہدم کرکے انتہائی قابل مذمت جرم کا ارتکاب کیا تو ما سوا بھارتیہ جنتا پارٹی اور شیو سینا کے تمام سیاسی جماعتوں، زندگی کے ہر ایک میدان سے تعلق رکھنے والے صاحب بصیرت حضرات اور عام لوگوں نے بلا امتیاز مذہبی عقائد اس واقعہ کی مذمت میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہیں لیا گاندھی جی کے المناک قتل کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں مکمل طور پر الگ تھلگ ہوگئی ہیں۔ اسی شرمناک قومی جرم کے احساس نے ہی آر ایس ایس، بی جے پی کے چوٹی کے رہنماؤں کو بھی اظہار تاسف پر مجبور کیا۔ یہاں تک کہ رسمی طور پر ہی سہی اعتدال پسند قائدین جیسے اٹل بہاری نے خود کو اس شرمناک حرکت سے لاتعلق بتانے کی ہمت جتا پائی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اتر پردیش کی بی جے پی حکومت عدالت کے احکامات اور مرکزی حکومت کو دی گئی یقین دہانی کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے بابری مسجد کو مسمار کرنے کی سازش میں شریک رہی وشو ہندو پریشد کے نیتاؤں نے سپریم کورٹ میں حلفی بیان داخل کیا تھا کہ اجودھیا میں اس نوعیت کے کسی بھی ناخوش گوار واقعہ کو رونما نہیں ہونے دیا جائے گا لیکن انہوں نے اپنی عہد شکنی کے ذریعہ قدیم ہندو تہذیب اور ثقافت کی شاندار روایات کو رسوا کردیا لیکن ستم ظریفی ہے کہ یہ سارا کارنامہ بھگوان رام کے نام پر انجام دیا گیا۔ شاید یہ قائدین بھگوان رام کے خاندان یعنی رگھو کل کے مشہور قول "جان جائے پروچن نہ جائے" کو فراموش کرچکے ہیں۔ پریشد نے اس مقدس قول سے صریح روگردانی کرتے ہوئے یہ بتادیا کہ اس کے وعدے کبھی ایفاء نہیں ہوسکتے ہیں اور اس کا خمیازہ دوسروں کو اپنی زندگیوں سے چکانا پڑے گا۔

تاہم پوری قوم کو جس امر نے ششدر اور مایوس کردیا تھا۔ وہ وزیر اعظم اور مرکزی وزیر داخلہ کا اس مسئلے کے سلسلے میں انتہائی عامیانہ رویہ تھا۔ مسٹر نرسا راؤ نے یوم آزادی کے موقع پر لال قلعے کی فصیل سے قوم کو مخاطب کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ بابری مسجد کا تحفظ ہر قیمت پر کیا جائے گا۔ انہوں نے اپنی عہد و پیمان کا اعلان پارلیمنٹ کے علاوہ قومی یکجہتی کونسل وزیر اعلا کلیان سنگھ سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بارہا یقین دلا چکے تھے کہ کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کے لئے مرکزی حکومت نے ایک ہنگامی منصوبہ (contin gemnc) plan) تیار کرلیا ہے، لیکن ان کی یہ یقین دہانی صرف بیان بازی تک ہی محدود رہی چنانچہ مرکزی حکومت کی مکمل بے عملی اور کوتاہی نے ساری قوم کا سر شرم سے جھکا دیا اور ملک کو بین الاقوامی سطح پر رسوا کردیا وزیر اعظم کے استعفا کے پرزور مطالبہ کے پیچھے یہی محرک کارفرما تھا۔ اگر مسٹر نرسا راؤ ان واقعات کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے مستعفی ہوجاتے تو وہ گاندھیائی جراءت کا قابل تقلید نمونہ ہوتا اور اس اقدام سے عالمی برادری میں ہندوستان کی ساکھ اور وقار بحال ہوجاتا۔ اسی طرح اقلیتی فرقے کے نوجوانوں کے بپھرے ہوئے جذبات کو بھی بڑی حد تک ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا۔

اجودھیا میں عبادت گاہ کی بے حرمتی کے بعد اس حربک شہر سے اقلیتی فرقے کی بیخ کنی کے لئے ان پر منظم اور منصوبہ بند حملے کئے گئے۔ یہاں اقلیتی فرقہ کے خلاف جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا وہ اسی دوپہر میں صحافیوں کے ساتھ رونما واقعات سے بھی زیادہ قابل مذمت تھے۔ اس سیاہ اتوار کو اجودھیا میں تشدد کا جو ننگا ناچ کھیلا گیا اسے فرقہ پرست تنظیموں کا کوئی بھی نیتا نہیں روک سکا اور اس کے بعد ملک کے طول و عرض میں جو کچھ بھی رونما ہوا ماضی میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ملک میں جہاں جہاں بھی بپھرے ہوئے مسلمانوں نے اکٹھا ہوکر اور کچھ مقامات پر ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کی کوشش کی تو سیکورٹی فورسیز اور پولیس ان پر بری طرح ٹوٹ پڑی۔ تشدد کے ابتدائی چند دنوں کے دوران ہونے والی زیادہ تر ہلاکتیں پولیس ایکشن کا نتیجہ تھیں، یہ وہ بے گناہ مسلم نوجوان تھے جو اسلام سے اپنی گہری وابستگی اور وفاداری کو ظاہر کرنا چاہتے تھے جنہیں پولیس نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ اگرچہ کہ سارے ملک میں یہ عمومی تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے ہیں مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وردی میں ملبوس لوگوں نے جنگلی بے حیائی اور وحشیانہ پن کے ساتھ اقلیتی فرقہ کو اپنے غیض و غضب کا

بہرحال جب کچھ علاقوں میں تشدد پھوٹ پڑا تو ایک قابل غور نکتہ دیکھنے میں آیا کہ فسادیوں میں دلت اور پس ماندہ ذاتوں کے لوگ شامل نہیں تھے گو کچھ ایسی مثالیں ہو سکتی ہیں جہاں ان طبقات کے لوگ فسادات میں ملوث رہے ہوں مگر آگرہ اور میرٹھ ڈویژنوں کے سارے دیہی علاقے پرامن رہے۔ دوسری طرف بہار نے یہ ثابت کردیا کہ اگر مضبوط قوت ارادی ہو تو فرقہ وارانہ تشدد کو برپا ہونے سے روکا جاسکتا ہے۔ ریاستی حکومت بھی اس معاملہ میں پوری طرح چوکس رہی۔ اسی لئے تشدد کے چند واقعات سے قطع نظر ریاست میں عام طور پر امن و امان قائم رہا۔

بلاشبہ یہ رجحان پروان چڑھ سکتا ہے۔ ہندوؤں کو کمزور اور چھوٹے طبقات کی جان و مال کی سلامتی کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لینا چاہئے اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام کرنا چاہئے۔ صرف اسی صورت میں وہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں مندروں کی بے حرمتی اور ہندوؤں پر ہوئے حملوں کی مذمت کرنے کے مجاز ہوں گے۔ ہمیں ان دونوں ملکوں میں رونما ہوئے واقعات کی کڑی مذمت کرتے وقت وہاں کی حزب اختلاف کی جماعتوں کے انداز فکر اور رویہ کو نوٹ کرنا چاہئے اسی طرح وہاں کی حکومتوں کی اس یقین دہانی کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے جو انہوں نے تباہ شدہ مندروں کی سرکاری صرفہ پر تعمیر نو اور مرمت کے بارے میں کرائی ہے۔

مسلم قائدین نے ایک مرتبہ پھر مسجد کی سلامتی کو لاحق خطرات اور انتہائی اشتعال انگیزی کے باوجود صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ حتی کہ مسجد کو مسمار کرنے کے بعد بھی مسلم قیادت نے اپنے فرقہ کو صبر و ضبط سے کام لینے کی تلقین کی۔ اسی طرح مسلم عوام نے بھی مرکزی حکومت کو واضح الفاظ میں یہ جتا دیا تھا کہ مسئلہ اجودھیا کے حل کے سلسلہ میں اس کی حکمت عملی اور طریقہ کار پر مسلمانوں کو ذرہ برابر اعتماد نہیں رہا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے حکومت یا اکثریتی فرقہ کے ساتھ تصادم کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ تاہم اس حقیقت سے منہ نہیں موڑا جاسکتا ہے کہ نا انصافی اور مظلومی کے احساس نے نوجوان طبقہ کے جذبات کو مغلوب کردیا تھا۔ چنانچہ ان کا رد عمل فطری ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ان کے ذہنوں پر دغا بازی اور ذلیل کئے جانے کا احساس غالب ہے۔

تمام محب وطن اور ذی ہوش ہندوستانیوں نے اس سانحہ سے لاحق خطرات کو بھانپ لیا ہے۔ ملک پہلے ہی بلیو اسٹار آپریشن کے سانحہ سے گزر چکا ہے، جب حکومت نے ایک انتہائی غلط فیصلہ کرکے سکھوں کے مقدس ترین مقام "گولڈن ٹیمپل پر فوج کشی کا حکم دے دیا تھا۔ اس غلط مہم جوئی کی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ٹھیک اسی موقع پر یا بعد میں ارباب اقتدار سکھ فرقے کے سامنے نادم ہو کر معافی مانگتے مگر اقتدار کے نشہ میں چور ہمارے حکمرانوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ہمارا ملک پھر اسی طرح کے پر آشوب حالات اور سانحہ کو برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لہذا خیر سگالی کا جذبہ رکھنے والے تمام افراد، چاہے وہ کسی بھی مذہب، عقیدہ یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں کا یہ لازمی فریضہ ہے کہ وہ مسلم عوام کے مجروح جذبات اور احساسات پر مرہم رکھنے کی بھرپور کوشش کریں۔ اسی طرح مسلم قیادت کو اپنے فرقہ کے اندر کچھ گروپوں کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کرنے کا اہم فریضہ انجام دینا ہوگا۔ اس کوشش میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنا دست تعاون بڑھانا ہوگا۔

حالات رفتہ رفتہ معمول پر آرہے ہیں، مگر ذہن بری طرح مضطرب اور متاثر ہیں فی الحال اولین ضرورت بڑے پیمانے پر راحتی کاموں کی ہے۔ دوم یہ کہ دونوں فرقوں کے درمیان برسا برس سے قائم اخوت اور بھائی چارے کے تعلقات کو جن لوگوں نے نقصان پہنچایا ہے انہیں قرار واقعی سزائیں دی جائیں۔ مگر امن و آشتی کی بحالی انتقامی رویہ کے ذریعہ ممکن نہیں۔ ہمارے عوام ہندو اور مسلمان دونوں ہی جرمن اور فرانسیسی قوموں سے کم بالغ نظر نہیں ہیں، جرمن اور یہودی، اور یہودی اور فلسطینی یہ تمام قومیں ایک دوسرے کے خلاف ایک طویل مدت تک برسرپیکار رہی ہیں۔ ان میں ظالم اور مظلوم قومیں بھی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ قومیں اپنے نئے اور پرانے اختلافات کو دوستانہ ماحول میں حل کرنے کے لئے کوشاں ہیں تاہم اس کے لئے درگزر اور فراموش کردینے کی پالیسی اختیار کرنا پہلی شرط ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ماضی میں ان کی قومیتیں مختلف تھیں اور آج بھی ہیں، مگر ہمارا معاملہ ان کے بالکل برعکس ہے ہم ہندوستانی ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں، جو ایک قابل فخر قوم کا حصہ ہیں جن کی تاریخ مشترکہ فن تعمیر، ادب، اور دوسرے میدانوں میں شاندار کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ مزید برآں برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لئے تمام فرقوں نے مشترکہ جدوجہد کی ہے علاوہ اس کے ہمارے ملک نے ہمیشہ مغربی ایشیا میں اپنے پڑوسیوں کے خلاف سامراجیت کی ہر سازش کی مخالفت کی ہے بلا شبہ بابری مسجد کی مسماری بھی سامراجیوں کی پھوٹ ڈالو سازش کا نتیجہ ہے۔

اخلاق حسین قاسمی

مسلمانوں کی تباہی کی

اصل ذمہ داری علماء اور اکابرین پر ہے جو نہ صرف مل کر بیٹھنے

میں ناکام رہے بلکہ مسلمانوں کو صحیح سمت دینے کی اسلامی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہے۔ متنازعہ جگہ پر نماز پڑھنے کی دھمکی ———————— یہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کا دھندہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمان پھر بازاروں میں قتلیں اور گردن کٹوائیں۔

حکومت اپنے اعلانات میں قطعی طور پر سنجیدہ نہیں ہے۔ مولانا نقوی نے کہا کہ مسجد مسلمانوں کی ہے۔ مورتیاں رکھنے سے شرفاء مسجد کے حکم سے خارج نہیں ہوتی بلکہ اگر ۱۰۰ برس تک بھی وہاں مورتیاں رہتی ہیں تو وہ زمین مسجد ہی رہے گی۔ ———————— اگر سپریم کورٹ یہ فیصلہ دیتی ہے کہ وہاں پہلے مندر تھا تو ہم مسجد کے دعوے سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہیں ———————— مسجد کی تعمیر نو کا معاملہ حکومت پر چھوڑ دینا چاہئے اگر مسجد تعمیر نہیں ہوتی ہے تو مسلمان حکومت اور عدلیہ سے جواب طلب کریں گے ———————— بابری مسجد تحریک سے وابستہ کمیٹیاں فوراً توڑ دینی چاہئے کیونکہ یہ کمیٹیاں خود مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہیں ———————— مسلمانوں کی طرف سے ہندو عوام کو چیلنج کرنا شرعاً غلط ہے۔

———————— جو لوگ جوشیلے نعرے اور زہریلی تقریریں کر رہے ہیں وہ در اصل اپنے ضمیر کی گندگی چھپا رہے ہیں انہوں نے وارننگ دی کہ کوئی تحریک ' آندولن ' مظاہرہ مسلمانوں کی ہلاکت کا پیش خیمہ ہوگا۔

جناب سید حامد صاحب

بابری مسجد' رام جنم بھومی کے قضیہ نے باہمی خیر اندیشی ' خوش ہمسائگی اور مصالحت کو برباد کر دیا پچھلے چھ برسوں میں نگاہیں بدل گئیں دل بدل گئے' طور طریقے بدل گئے' ہندوستان کی اکثریت اور سب سے بڑی اقلیت کے درمیان ایک گہری کھائی کدورت' نفرت اور عداوت کی کھد گئی اب ملک کے سامنے درپیش ایک ہی سوال ہے اس کھائی کو پاٹا جائے یا اسے چوڑا ہونے دیا جائے؟ وزیر اعظم نے اپنی کمزوری کی تلافی' مسلمانوں کی اشک شوئی اور دنیا کو دکھانے کے لئے شاید بغیر کچھ سوچے سمجھے یہ اعلان کر دیا کہ بابری مسجد از سر نو تعمیر کی جائے گی یعنی جس جگہ پر وہ کھڑی تھی اسی جگہ پر وہ پھر سے بنائی جائے گی بعض مسلمان رہنماؤں نے مطالبہ کرنا شروع کر دیا ہے کہ وعدہ وفا کیجئے اور ذخم خوردہ اقلیت کے گھاؤ پر مرہم رکھئے' مسجد کو از سر نو تعمیر کیجئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان اقلیت پر اکثریت نے بہت بڑا ظلم کیا ہے ان کا غصہ واجبی فطری طور پر شعلہ فشاں کے اظہار کے لئے جو لوگ سڑکوں پر نکل آئے انہیں امن و امان کے محافظوں نے گولیوں سے بھون ڈالا اور اکثریت کے انتہا پسندوں نے ان کی بستیوں پر یورش کر دی۔ ہم لوگ سوچنے لگے تھے کہ گاندھی جی کے حادثہ قتل کی طرح بابری مسجد کی شہادت بھی نفرت اور عداوت کو پسپا کر دے گی' ان کی جگہ ندامت لے لے گی اور تلافی مافات کی کوشش کی جائے گی۔ ہوا اس بار اس کے برعکس اکثریت نے انفعال کے بجائے فاتحانہ افتخار کا طریقہ اختیار کیا اور اب دن بہ دن یہ رخ پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔

یہاں یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ بھاجپا اور شیو سینا کو چھوڑ کر ملک کی بنیادی سیاسی پارٹیوں نے بابری مسجد کو توڑے جانے کی سخت مذمت کی۔ سارے سیکولر عناصر ہندو بنیاد پرستوں اور دوڑھی وادیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے گھنگھور گھٹا میں یہ ایک نقرئی لکیر ہے۔ ایسے عناصر کی روشن خیالی اور انصاف پسندی کو اگر داد نہ دی گئی تو یہ کفران نعمت ہوگا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم ہندوستان کی روشن خیالی اور ترقی پر آمادہ پارٹیوں اور جماعتوں کے قریب آئیں اور ان کے ساتھ اپنے روابط کو استوار کریں۔ ہم سب کو مل کر اکثریتی بلکہ اعلیٰ ذاتی دھماندہ کا مقابلہ کرنا ہے۔ ان کے علاوہ ہمیں کمزور طبقات اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے ربط و ضبط بڑھانا چاہئے تاکہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے ظلم اور استحصال کے طویل سلسلہ کا خاتمہ کیا جا سکے۔

یہ سب کچھ صحیح ہے اور ہمیں اپنے نقطہ نظر میں اس عنوان کی ترمیم کرنی ہے لیکن روشن خیالوں' پسماندوں اور کمزوروں سے رشتہ جوڑتے وقت ہمارے دل میں ذرا دیر کے لئے بھی یہ خیال نہ آنا چاہئے کہ سیکولر عناصر ملک کی اکثریت کے ترجمان ہیں جن لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور جنہوں نے اپنے کان زمین سے لگا رکھے ہیں ان کا تجزیہ ہے کہ مسجد کے انہدام سے ہندوؤں کی اکثریت مطمئن ہے' وہ سمجھتی ہے کہ بالآخر غلامی کی نشانی مٹا دی گئی' اور اگر اس وقت یا آئندہ چھ ماہ کے اندر عام چناؤ ہو جائیں تو بھاجپا اور زیادہ تعداد میں واپس آئے گی۔ پشیمانی کا احساس جلد ہی کافور ہو گیا' اس وقت ہندو جارحیت اپنے نقطہ عروج پر ہے۔

ایسی صورت میں مسلمانوں کو طے یہ کرنا ہے کہ کیا وہ بابری مسجد کی تعمیر نو کا سرکار سے مطالبہ کریں ایسا کرنے سے پہلے انہیں سوچ لینا چاہئے کہ اس مطالبہ کے مضمرات کیا ہیں قارئین واقف ہوں گے کہ سرکار کے تغافل آمیز تساہل نے کار سیوکوں کو چھوٹ دے دی کہ مسجد کی جگہ پر چبوترہ بنا کر وہاں مورتیاں رکھ دیں۔ اب اسے وہ مندر کا نام دے رہے ہیں اس،

طرح کار سیوکوں نے ریاستی سرکار کی نظر التفات اور مرکزی حکومت کی نگاہ تغافل کے سایہ میں وہ کام کروالے' ایک تو انہوں نے بابری مسجد مسمار کردی' دوسرے نئی مندر (چھوٹا سا شوالہ) بنا دیا۔ اب اگر مسجد وہاں بنتی ہے تو پہلے اس چبوترہ کو توڑنا اور مورتی کو ہٹانا پڑے گا اگر سرکار نے ایسا کیا تو ملک بھر میں ایک زبردست ہنگامہ برپا ہوگا کہ سرکار مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے مندر توڑ رہی ہے سارا نزلہ مسلمانوں پر گرے گا اور وہ بے دریغ تہ تیغ کئے جائیں گے اور اس "کار خیر" میں امن کی حفاظت کرنے والے دستے پہلے کی طرح حملہ آوروں کا ہاتھ بٹائیں گے یا کم از کم نظر دوسری طرف کرلیں گے۔ سوچئے کیا ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں پر جو ابھی اپنے مرنے والوں کا شمار کر رہے ہیں' زخمیوں کو گن رہے ہیں اور خود اپنے زخم چاٹ رہے ہیں' ایک دوسری قیامت گزر جائے کوئی مانگ اس سے زیادہ ناعاقبت اندیشی اور خود آزاری کی نہیں ہوسکتی اس دوسری قیامت سے جان و مال' عزت اور آبرو کا جو نقصان ہوگا وہ تو ہوگا ہی' ہندوؤں کے دلوں میں ہماری طرف سے کدورت اور بڑھ جائے گی جو آئندہ زندگی کے ہر مرحلہ اور ترقی کے ہر منصوبہ میں ہمارے خلاف جائے گی اجودھیا میں مسجد کے انہدام کو تماشائی بن کر جس طرح پولیس اور سی آر پی ایف نے دیکھا' اسے مد نظر رکھتے ہوئے کیا ہم امید کرسکتے ہیں کہ وہ نوتعمیر مندر کو مسمار کرنے پر راضی ہوجائیں گے اگر مطالبہ کرنے کا مقصد محترم وزیر اعظم کو ان کے گھر تک پہنچانا ہے تو اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کی صلاحیتیں الم نشرح ہو چکی ہیں ور گھر تک پہنچانے کی یہ ورزش ہماری تسکین کا باعث ہو یا نہ ہو مہنگی ہمیں بہت پڑے گی یاد رکھئے کہ اس ملک میں جب بھی ہنگامہ ہوگا یا امن ٹوٹے گا تو اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہی پہنچے گا۔

بابری مسجد اپنی اصلی جگہ پر تو بننے سے رہی اور اگر بفرض محال وہاں بن بھی گئی تو ایک قیامت کبریٰ بپا ہوجائے گی اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات اور تنگ ہوجائے گا۔ تو کیا وہ دوسری جگہ بنے؟ اس طرح بننے سے کیا حاصل ہوگا۔ یہ تجویز تو مسلمانوں نے کئی سال ہوئے رد کردی تھی۔ یہ سوچنا خام خیال ہے کہ فسادات نے ان کی ریڑھ اس حد تک توڑ دی ہے کہ اب وہ اس بات کے لئے راضی ہوجائیں گے جسے وہ جائز نہیں سمجھتے۔ امید ہے کہ ہمارے اہل اقتدار اور ہمارے اہل وطن اس طرح کا سجھاؤ دے کر ہمارے زخموں پر نمک پاشی نہیں کریں گے۔

بابری مسجد کو تعداد کے نشہ میں اکثریت کے انتہا پسندوں نے زمین بوس کردیا' ریاستی حکومت نے سازش میں

شرکت کی اور مرکزی حکومت نے آنکھیں بند کرلیں بہرحال ایک فیصلہ ہوگیا اس میں کوئی تبدیلی بھی اب نہیں ہوسکتی مسلمانوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مسجد کی مسماری کو روکتے اور اتنی طاقت اب بھی نہیں ہے کہ وہ چبوترہ توڑ کر اور مورتی ہٹا کر وہاں مسجد بنالیں۔ ان پر مذہب کی رو سے اب کوئی الزام عائد نہیں ہوتا لہٰذا انہیں اب اس مسئلہ میں ہرگز دخل نہیں دینا چاہئے' نہ اس کے بارے میں کوئی مانگ سرکار سے کرنی چاہئے۔ اس وقت غیرت اور مصلحت دونوں کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ صبر و شکر کرکے بیٹھ جائیں ملک جو چاہے فیصلہ کرے ان کا جہاں تک تعلق ہے بابری مسجد شہید ہوچکی۔ عدالتی کاروائی کو بھی اب کالعدم ہونا چاہئے کیونکہ اس سے بھی تلخی بڑھے گی اور ملک کی اکثریت کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے جو غبار بھرا ہوا ہے وہ اور گہرا ہوجائے گا اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے مسلمانوں کو صبر کرنا چاہئے وہ صبر و صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ کی نصرت کے طلبگار رہیں گے۔ اب ہرگز نہ ان سے مواخذہ ہوگا' نہ ان کے علماء سے کہ مسجد کو تم نے مسمار کیوں ہونے دیا اگر اب وہ ضد یا اصرار کرتے ہیں کہ مسجد اسی جگہ پر بنے جہاں وہ پہلے کھڑی تھی تو قرائن کہتے ہیں کہ ان سے اور ان کے رہنماؤں سے روز حشر باز پرس ضرور ہوگی کہ تم نے ایسا رخ کیوں اختیار کیا۔ جس کو اختیار کرنے کے لئے تم دین کی طرف سے پابند نہیں تھے اور جس کے اختیار کرنے سے قوی احتمال اس بات کا تھا کہ ایک بار پھر ہزاروں مسلمان مارے جائیں اور لاکھوں بے گھر ہوجائیں اور جو بچ جائیں ان پر اور ان کی اولاد پر ایک مدت تک عرصہ حیات تنگ رہے ہم سب کو سوچ رکھنا چاہئے کہ ایسے تباہ کن رخ کو اختیار کرنے کے لئے ہمارے پاس روز حشر جواب کیا ہوگا جو لوگ عوام کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے مکلف ہیں کیا انہیں زیب دیتا ہے کہ مسلمانوں کو تباہی کی بھٹی میں جھونک دیں اور آخر کیوں۔ بابری مسجد کی تعمیر نو ہو مسجد اسی جگہ پر رہے اس پر اصرار کرنا در اصل فی الحال خود کشی کے مترادف ہے اور خود کشی حرام ہے' انفرادی خود کشی حرام ہے اجتماعی خود کشی نہ صرف حرام ہے بلکہ سب سے بڑا جرم ہے کیا ہماری آنکھیں اب بھی نہ کھلیں گی' کیا ہم مسلمانوں کو اس راستہ پر ڈال دیں گے جس میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے' تباہی ہی تباہی ہے اور جس میں ہلاکت کے سوا کچھ نہیں؟

جن لوگوں نے بابری مسجد کے سلسلہ میں کمیٹیاں قائم کیں' یا اس ضمن میں مسلمانوں کی نمائندگی مذاکرات اور ملاقاتوں میں کی انہیں اپنی اخلاقی ذمہ داری کو مد نظر رکھتے ہوئے عزت اور خوبصورتی کے ساتھ کنارہ کش ہوجانا چاہئے تاکہ [illegible]

ہی خود کو فریب خوردہ رہنما کے لئے یہ دونوں صورتیں
شرمناک ہیں اذیت ناک ہیں افسوسناک ہیں۔

روشن خیال ہندو جو ہمارے ہمدرد ہیں اور کچھ
سیاسی پارٹیاں مسلمانوں سے کہیں گی کہ مسجد کو سابق بابری مسجد
سے کچھ فاصلہ پر بن جانے کے لئے رضامندی دے دو ہمیں
چاہئے کہ ان کے اخلاص کا اعتراف کرتے ہوئے صاف صاف
کہہ دیں کہ ہم زخم خوردہ ہیں ہمارے زخموں کو اب نہ کریدئے
ہمیں مقدمہ مسجد بحث میں اب نہ الجھائیے ہم پر بڑے مظالم
ہوئے ہیں ہم نے بہت نقصان اٹھائے ہیں آپ جو چاہے کیجئے
چاہے تو مسجد بنائیے یا نہ بنائیے چاہے کہیں بنائیے ہم سے کوئی
سروکار نہیں ہم صبر کرکے بیٹھ گئے ہم بھرپائے ہیں اب نہ
چھیڑئے ہم نے جمہوریت بھی دیکھ لی ہم نے سیکولرزم کو بھی آزما
لیا ہمیں حکومت کے انصاف اور اس کے کس بل کا بھی اندازہ
ہوگیا۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

حمیت، غیرت اور مصلحت سب کا یہی تقاضہ ہے حزم اور احتیاط
بھی یہی کہتی ہے دانش اور دوراندیشی بھی یہی راہ دکھاتی ہے ان
سطور کے پایان میں یہ نامہ سیاہ بارگاہ رب العزت میں گڑگڑا کر
دعا کرتا ہے کہ پروردگار ہمیں سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا
فرما اور اس راہ پر قدم رکھنے سے روک دے جو لاریب ہلاکت
اور تباہی کی راہ ہے ہم بڑے نازک موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں
ہمیں روشنی عطا کر کہ ہم صحیح راستہ اختیار کرسکیں۔

۲— آگے کی طرف دیکھئے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد سے کوئی ہندوستانی مسلمان چین سے نہیں
سویا۔ کچھ سے رہا نہیں گیا، وہ گھر سے نکل گئے اور جان جان
آفریں کے سپرد کردی۔ باقی کڑھتے رہے، گھٹتے رہے، ظلم و ستم
کا نشانہ بننے کے بعد اگر دادرسی کی امید نہ ہو تو انسان اور کیا
کرسکتا ہے؟ اور یہ ظلم و ستم تو ایسا تھا جس میں اکثریت کے
علاوہ حکومت کا تغافل اور اس کی رضا بھی شامل تھی لیکن
مسلمانوں کا حوصلہ ٹوٹا نہیں ہے۔ بہت سے نوجوانوں کی آنکھوں
میں انتقام کی آگ ہے لیکن انتقام سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔
اس کی آگ جنگل کی آگ کی طرح ہوتی ہے کہ سارے جنگل کو
جلا کر دم لیتی ہے پھر کچھ نہیں بچتا۔ دین حق ۳:۱۳۴ "والکاظمین الغیظ و
العافین عن الناس" یعنی غصہ کو ضبط کرنے والوں اور انسانوں کو
معاف کردینے والوں کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے اور معصیت کے
[illegible]

گے تو قرآن کریم کے تحت ایسا کریں گے۔ اپنے رہنماؤں سے تو
وہ نالاں ہیں کہ انہوں نے سوائے مصلحت کے کیا دھرا کچھ نہیں
اور انہیں کٹوا دیا، نہ ان کی تعلیم کی طرف دھیان دیا، نہ ان
کے علاج کا انتظام کیا، نہ کبھی ان کی پسماندگی کو دور کرنے کے
لئے جتن کئے۔ انہوں نے اس قضیہ کے سایہ میں خود اپنی اہمیت
بڑھائی، در صبو وزیر و سلطان تک رسائی حاصل کی، در اصل
ارباب اختیار نے ہی انہیں یک قلم مسلمانوں کا لیڈر بنا دیا ورنہ
ان میں کون تھا جو مسلمانوں کی رہنمائی کرسکتا، ان میں سے کون
خود غرضی سے اوپر اٹھ پایا، ملت کا درد ان میں سے کس نے
محسوس کیا، ان میں سے سوجھ بوجھ کس کے پاس تھی۔ فیصلوں
اور اقدامات کے نتائج آگے چل کر کیا ہوں گے، اس کو سوچنے
کی صلاحیت کس میں تھی؟ بابری مسجد کے دردناک اور بھیانک
انہدام سے ہمارا نقصان ہی نقصان ہوا لیکن اس ملک گیر شر میں
دو چھوٹے سے پہلو بھلائی کے بھی تھے، ایک تو یہ کہ ملک کو اور
ہمیں اپنے خطرات کا پہلی بار صحیح اندازہ ہوا، دوسرے مسلمانوں
کو خود غرض بے عقل اور جاہ کن قیادت سے چھٹکارا مل گیا،
سوئے اتفاق سے اگر چھٹکارا نہ بھی ملے تو بھی یہ قیادت اپنے
اصلی قد تک تو سمٹ گئی۔

اب ہمیں اس بحث میں نہ پڑنا چاہئے کہ وہ غلطیاں
کون سی تھیں اور کس کس کی تھیں جنہوں نے بالآخر اس
شرمناک کرتوت کی شکل اختیار کرلی۔ ہمیں بغیر ذرا دیر کے لئے
دل چھوٹا کئے یا مایوسی کو ذہن میں راہ دیئے، حسب ذیل کام
کرنے چاہئیں۔

(۱) جہاں جہاں ممکن ہو ہمیں مل بیٹھ کر یہ اعلان
کرنا چاہئے کہ مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک، بہت بڑا ظلم ہوا
ہے اور وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ایک مراعات یافتہ اور فرقہ
پرست طبقہ کے علاوہ حکومت وقت کو اس اتیاچار کا ذمہ دار قرار
دیتے ہیں۔ حکومت کا پہلا اور بنیادی فرض ہے، شہریوں کی جان
و مال اور ان کے دھرم کی حفاظت ہماری ایک ریاستی حکومت
نے اس فرض کو پاؤں تلے روند ڈالا اور مرکزی حکومت نے اس
فرض کی ادائیگی سے بکمال استغناء اور بہ تغافل اکمل سبکدوشی
حاصل کرلی۔

(۲) یہ بات بھی واضح کردی جائے کہ مسلمان جانتے
ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ جس زمین پر بابری مسجد لگ بھگ
ساڑھے چار سو سال تک کھڑی رہی وہ زمین ان کی ہے اور اس
ملک میں اگر انصاف کا چلن عام ہوا تو وہ زمین ان کو مل کر
رہے گی، لیکن ان کے نزدیک اب صحیح لائحہ عمل یہی ہے کہ وہ
خود اب اس مسجد کے سلسلہ میں کوئی مطالبہ نہ کریں۔ اب...

آزمائش ہے۔ خود مسلمان اب کوئی مقابلہ کرکے رجعت پسند اور فرقہ پرست جماعتوں کو فروغ دینے اور مزید قوت پہنچانے سے احتراز کریں گے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ قضیہ اگر پھر گرما گیا تو انسانوں کی سلامتی اور ملک کی سالمیت کو زبردست نقصان پہنچے گا اور ہمارا وطن عزیز صدیوں پیچھے چلا جائے گا۔ جنگل کے قانون کی پیروی بھاجپا اور ہندو پریشد کو مبارک ہو، مسلمان ہرگز بھی ایسا نہ کرنا چاہیں گے۔ کم از کم ان میں سے وہ لوگ جو ٹھنڈا مزاج اور ہوش پر گرفت رکھتے ہیں۔

(۳) رمضان کا مبارک مہینہ سر پر آگیا ہے اور عید آنے والی ہے رمضان بھر ہمیں اپنے شہیدوں کی مغفرت کی اور مسلمانوں اور ہندوستان کی سلامتی کی دعائیں مانگنی چاہییں اور عید کو ہم صرف اس حد تک منائیں جس حد تک مذہب ہمیں تاکید کرتا ہے یعنی فطرہ ادا کریں اور عید کی نماز پڑھیں کوئی جشن اس روز نہ منائیں، نہ خوشی کا اظہار کریں، یہ بڑی بے شرمی اور بے غیرتی ہوگی اگر ہم نے اس بار عید کو تہوار کے طور منایا۔ عید الفطر کے علاوہ عید الاضحی پر بھی ہماری روش یہی رہنی چاہیے تاکہ ہمارے اہل وطن کو معلوم تو ہو کہ خدا کے گھر کو مسمار کیے جانے اور اس کے بعد بے شمار مسلمانوں کے شہید اور ہزاروں گھروں کے برباد ہونے کا گھاؤ آسانی سے بھر نہیں پائے گا۔ ان دونوں تہواروں کے موقع پر اوسطاً ہم جتنا روپیہ صرف کرتے ہیں وہ امداد یا ریلیف اور بازآبادکاری کے لئے صرف کیا جائے، بلکہ اس مد کی رقم سے آگے بڑھ کر ہم آفت زدوں کی امداد کے لئے وسائل فراہم کریں۔ اس طرح دو کام ہوجائیں گے۔ (۱) ہم باوقار اور بے خطر طریقہ سے احتجاج کرپائیں گے (۲) تنظیم اور ترتیب کے ساتھ آفت رسیدوں کی مدد ہوسکے گی۔

(۴) چونکہ فرقہ وارانہ فسادات ہندوستانی مسلمانوں کے مقدر میں لکھ دئے گئے ہیں انھیں چاہیے کہ ان سے نپٹنے کا منصوبہ بنائیں اس کے اہم اجزاء یہ ہوں کہ تناؤ یا تعلقات میں بگاڑ کی پہلی آہٹ پر شہر کے باعزت مسلمان وہاں کے باعزت ہندوؤں کے ساتھ بیٹھیں اور سر جوڑ کر اور قدم اٹھا کر تناؤ اور کھنچاؤں کو دور کریں اور اپنے اپنے ہم مذہبوں کو سمجھائیں اور اتحاد کی برکت اور پھوٹ کے خطرات سے آگاہ کریں، اور مقامی انتظامیہ کو بھی ہوا کے رخ سے مطلع کردیں اور اس سے تقاضہ کریں کہ تناؤ کو ٹکراؤ بننے سے روکے۔

(۵) اپنے محلوں اور گھروں میں "پہلے دفاع" کے (یعنی جب تک کہ پولیس آتی ہے)، انتظام ضرور کرلیں۔ حفاظت خود اختیاری ہر شہری کا نہ صرف حق بلکہ فرض ہے۔ اس ضمن میں بھی مقامی ارباب انتظام سے رابطہ کارآمد ہوگا۔ ہر شہر میں ایسے لوگوں کی موجودگی مفید ہوگی جن کی پہنچ سینئر افسروں تک ہو۔ اس پہنچ کے لئے اہتمام کرنا ہوگا۔ دور رہیں گے تو نقصان صرف ہمارا ہوگا۔

(۶) ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ بالقصد اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات کو خوشگوار بنائیں کیونکہ حکومت کی زمام در اصل اس کے ہاتھ میں ہے، اکثریت کے ایثار نہ چاہیں تو حکومت کی ساری پالیسیاں دھری کی دھری رہ جائیں، ان پر عمل نام کو نہ ہو، جیساکہ ان احکام کے سلسلہ میں ہمیں تجربہ ہوتا چلا گیا ہے۔

(۷) دوسری اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور تعلقات ایسے ہونے چاہیں کہ ان کا گوشہ خاطر ہماری طرف رہے۔

(۸) ہندوستان کے روشن خیال افراد اور ترقی پسند جماعتوں نے مسجد کو گرانے پر سخت سرزنش کی ہے۔ وہ سوچتی ہیں کہ مذکورہ تنازعہ در اصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جھگڑا نہیں ہے بلکہ یہ جدال ہے سیکولر اور کٹر پنتھی طاقتوں کے درمیان۔ ان جماعتوں اور افراد اور پریس کو ہمیں انصاف پسندی، حسن ارتباط اور حکمت عملی سے اپنے قریب رکھنا چاہیے۔ یہاں تک جو کہا گیا وہ فوری حیثیت رکھتے ہیں ہمیں دور رس قدم بھی اٹھانے چاہئیں۔

(۹) ہماری کمزوری، بے بسی، گمراہی اور استحصال آبادی کی ان پڑھ ہونے کی وجہ سے ہے ہمیں سب سے پہلی ترجیح رفع جہالت اور ہمہ خواندگی کو دینی چاہیے۔ ہماری بے توجہی نے ملک کی شرح خواندگی کو نیچا کر رکھا ہے اور اس کی ترقی کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں ہم اپنا منصوبہ کیوں نہ بنائیں کہ دس سال کے اندر مسلمان ناخواندگی سے نجات پا جائیں۔ اس کے لئے محنت اور ایثار بڑی مقدار میں درکار ہوں گے، لیکن زندہ رہنا ہے اور غیرت کے ساتھ تو یہ کرنا ہوگا۔

(۱۰) بچوں کو تعلیم اس طرح سے دی جائے کہ ان کا نقطہ نظر وطن دوستی انسانیت نوازی، روشن خیالی اور معاملہ فہمی کا ہو اور وہ آگے بڑھ کر اپنے ملک کے لئے سرمایہ افتخار بن سکیں۔

(۱۱) بعض جانبدار مورخوں نے تاریخ کے اوراق کو سیاہ کیا ہے اس کی باقاعدہ طور پر مورخین ہی کی طرف سے تردید کی جائے تاکہ تلخ ماضی سے باہمی بدگمانیاں دور ہوں۔

(۱۲) اردو زبان کے ساتھ جیسا برتاؤ اس ملک میں کیا گیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے جمہوری ملک میں نہیں ملے گی۔ ایسے وقت میں جب ملک کا ضمیر مسلمانوں کی طرف سے بیدار ہوا ہے اردو کا مقدمہ ں کے اجلاس میں پیش کرکے داد رسی حاصل کرنی چاہیے ی پریس کو بہرحال اپنی طرف رکھنا

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مسلمان سب قوموں سے زیادہ روزگار کو ترستے رہتے ہیں۔ جہاں انھیں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے سو سرکاری ملازمتیں ملنی چاہئیں تھیں وہاں انھیں صرف سولہ ملتی ہیں۔ آبادی میں ان کا تناسب ۱۲ فیصد ہے اور ملازمتوں میں تقریبا دو فیصد۔ اپنی صنعت اور تجارت کو چلانے کے لئے بھی انھیں طرح طرح کی دشواریاں ہوتی ہیں۔ ہم فریاد کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو نوکریاں نہیں ملتیں جواب ملتا ہے مقابلہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے' مقابلہ میں بیٹھو' صلاحیت ثابت کرو' نوکری حاصل کرو۔

سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

جواب دینے والے کتنے بے حس اور بے درد ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ نابرابروں میں مقابلہ کرانا ان میں سے کمزور فریق کے ساتھ بڑی ناانصافی اور بڑا ظلم ہے۔

ہمیں سرکار کو بتانا چاہئے کہ امن کی عمارت صرف انصاف کی بنیاد پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ ملازمتوں میں ناانصافی سے روزگار تو ہاتھ سے جاتا ہی ہے' حوصلہ بھی ٹوٹتا ہے اور بعد میں ہمارے ساتھ انصاف کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ایک معینہ مدت (فرض کیجئے ۲۰ سال) تک مسلمانوں کے لئے ملازمتوں میں تحفظ یا ریزرویشن ہونا چاہئے' تاکہ وہ ترقی یافتہ اکثریت اور دوسرے فرقوں کے برابر آجائیں اور ازاں بعد اپنی قوت بازو سے ملازمتیں اور روزگار کھلا مقابلہ کرکے حاصل کریں۔

(۴) مسلمانوں کے متعلق ان کے وطنی بھائیوں کے دلوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور غلط تصورات پھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں دور کرنے کے لئے اول تو مسلمان بچوں کو اپنے دین اور اسلام کی تاریخ سے متعلق واقفیت بہم پہنچانی چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر کھینچ سکیں اس کا اہتمام خود مسلمانوں کو اپنے گھروں یا اپنے اسکولوں میں کرنا ہوگا۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات اسلام کی شبیہ کو ٹھیک ٹھاک سے پیش کرنے کے لئے یہ ہوگی کہ ہمارے بچوں کو شروع سے یہ سمجھایا جائے کہ اسلام صرف عقیدہ اور عبادت کا نام نہیں ہے' یہ دونوں تو ذریعہ ہیں شخصیت کو بنانے اور کردار کو ڈھالنے کا۔ اگر ان کے اطوار و کردار سے راستی' رحم' پاک بازی' حلم، مروت اور خیر اندیشی ظاہر نہیں ہوتی تو وہ مسلمان نام کے ہیں۔ دراصل اسلام کے نام پر ایک تہمت ہیں۔ اسلام سہل بھی ہے اور سخت گیر بھی۔ یہ اپنے جاننے والوں کو' بشرطیکہ انھیں صحیح تعلیم دی جائے خیر و فلاح کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے اور خیر کا یہ دیرینہ اصول ہے کہ وہ صاحب خیر تک محدود نہیں رہتا' اپنے قرب و جوار پر اثر انداز ہوتا ہے' اپنے جسمانی اور ذہنی دفاع کی ہمیں ضرور تیاریاں کرنی چاہئیں' لیکن یہ احتیاط رکھئے کہ ہمارا نقطہ نظر اور زندگی اور حوادث و افکار کے تئیں ہمارا رخ دفاعی اور منفی ہوکر نہ رہ جائے بلکہ اقدامی مثبت اور آگے بڑھانے والا ہو۔

(۵) سیاست میں جو برائیاں گھس آئی ہیں ان کا خمیازہ بھارت بھگت رہا ہے لیکن کسی چیز کو صرف اس بنا پر ترک نہیں کرسکتے کہ اس میں خرابیاں داخل ہو گئی ہیں۔ ہمیں سیاسی چالوں کو بیک وقت دیانت داری اور ہوشیاری سے کھیلنے کا ہنر سیکھنا چاہئے۔ ہمیں ایسے امیدواروں کے چنے جانے میں معاون ہونا پڑے گا جو سیکولر ذہن اور فراخ دل رکھتے ہوں اور جو دوسرے ملکی مسائل کے علاوہ مسلمانوں کی ترجمانی جرأت اور تعمیری اور موثر انداز میں کرسکیں خود غرض نمائندوں سے اولین فرصت میں نجات پانے میں ہی ہمارے لئے عافیت ہے۔ اگر ہم نے آئندہ انتخابات سے پہلے ایک بیدار رائے عامہ نہ بنائی اور نسبتا اچھے اور لائق امیدواروں کو نہ چنا تو ہم وہیں کے وہیں رہ جائیں گے اور ہماری مت کوئی نہیں سنے گا۔ یہاں بیداری کے علاوہ تنظیم درکار ہوگی۔ سیاست میں جاگیرداری کا خاتمہ ریاستوں میں زمینداری کے خاتمے سے کم اہم نہیں ہے۔ نمائندوں کا کام چالان یا دوسرے چھوٹے بڑے نجی کام کرانا نہیں ہے۔ ان کا اصلی کام یہ ہے کہ حکومت کو صحیح مشورہ اور رائے دہندوں اور ان کے احساسات کے بارے میں صحیح اطلاعات دیں اور جرأت کے ساتھ ان کے حقوق کا مطالبہ کریں۔ یہ عہد تو ہمیں اپنے امیدواروں سے لینا پڑے گا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی پیش رفت اور ان کی سلامتی کے لئے باخبر اور باأثر آواز اٹھائیں گے جہاں تک سلامتی کی بات ہے کچھ عرصے سے یہ رجحان زور پکڑ رہا ہے کہ پولیس اور دوسری حفاظتی فورسیز فسادات کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف تعصب برتنے لگی ہیں۔ بھاجپا' شیو سینا اور سنگھ پریوار کی دوسری شاخوں کے اثر سے اور اجودھیائی نزاع کے سائے میں یہ خطرناک رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کے خلاف مرکزی سرکار نمائش کی خاطر شاید کچھ آوازیں اٹھائے؟ لیکن ان فورسیز کے ساتھ اپنے رخ اور اپنے تعلقات کو استوار خود ہمیں کرنا ہوگا۔ زندگی میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی کو برا کہتے رہئے وہ برا بن جاتا ہے' کسی سے مخالفت یا عداوت کرتے رہئے تو وہ واقعی مخالفت اور دشمنی اختیار کرلیتا ہے یا ان کی لے کو تیز تر کردیتا ہے۔ ہمیں اس مسئلے پر نظرثانی کرنی چاہئے۔ یہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ طاقت آہستہ آہستہ اراکین حکومت کے ہاتھ سے نکل کر پولیس کے

ہاتھ میں جاری ہے۔ حالات معمول سے ہٹ جائیں تو طاقت بہت بڑھ جاتی ہے' پولیس کے عدم بیدار پولیس دشمنی دونوں پر خطر ہوگئی ہیں اور یوں تو انہیں داخل اور نرم استدلال کے ساتھ اپنے وطن کے اکثریتی فرقہ کو متوازن کوشش کے ذریعے اپنے تئیں خوش گمان بناتا ہے۔ ان کے آگے جھکنا تو ہرگز نہیں لیکن ان سے دوستی اور خوش ہمسائیگی کا ہاتھ ملاتا ہے۔

مولانا وحید الدین خاں

ٹھیک اسی قسم کا واقعہ دوبارہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں پیش آیا ہے۔ بعض اسباب نے ہندو انتہا پسندی کو دوبارہ موقع دیا۔ وہ ازسر نو اٹھ کھڑی ہوئی اس بار اس انتہا پسندانہ تحریک کا مرکز اجودھیا تھا۔ اور عام طور پر اس نے بابری مسجد رام جنم بھومی تحریک کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

یہ تحریک ابتداءً ۱۹۸٦ میں شروع ہوئی۔ جذباتی ہنگاموں کے درمیان وہ بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شدید ترین مرحلہ میں پہنچ گئی۔ اس کا آخری نقطہ عروج ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء تھا جبکہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد کی قیادت میں ایک لاکھ سے زیادہ انتہا پسند ہندو اجودھیا میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے ۴۶۵ سالہ بابری مسجد پر یلغار کردی اور چند گھنٹہ کے اندر اس کو ڈھاکر زمین کے برابر کردیا۔

یہ بلاشبہ جدید ہندوستانی تاریخ کا سیاہ ترین واقعہ تھا۔ عبادت خانہ کسی سماج میں آخری قابل احترام چیز سمجھا جاتا ہے۔ عبادت خانہ کو گرانا گویا تمام انسانی قدروں کو ڈھا دینا ہے۔

یہ فعل پارلیمنٹ کے فیصلہ کے خلاف تھا۔ یہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف تھا۔ یہ نیشنل انٹیگریشن کونسل کی تجاویز کے خلاف تھا۔ انڈیا کی تمام بہترین روایات کے خلاف تھا۔ وہ عالمی رائے عامہ کے خلاف تھا یہ اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر کے خلاف تھا۔ حتی کہ یہ خود متعلقہ انتہا پسند لیڈروں کے اپنے بیان کے خلاف تھا۔ غرض کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی وصول نہیں جس کی تائید اس اقدام کو حاصل ہو

تمام سنجیدہ طبقوں نے بجا طور پر اس واقعہ کو ملک کے لئے انتہائی افسوسناک اور سیاہ واقعہ قرار دیا ہے بلاشبہ یہ اتنا زیادہ المناک واقعہ ہے کہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ مگر دوسرے تمام حادثات کی طرح' اس حادثہ میں بھی یقیناً ایک مثبت پہلو موجود ہے۔ اس تاریکی میں بھی روشنی کا ایک امکان جھلک رہا ہے۔

یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ یہاں امکانات کی مقدار' ہمیشہ مسائل سے زیادہ ہوتی ہے۔ ظلم کا کوئی بھی واقعہ اس پر قادر نہیں کہ وہ تمام امکانات کو مٹادے۔ کسی بھی تاریکی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ امید کے تمام چراغوں کو بے نور کردے۔

فطرت کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ یہاں۔ ظلم اپنی آخری انتہا کو پہنچ کر برعکس بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سماج میں انتہا پسندی کی تحریک صرف ایک بار اٹھتی ہے۔ اور ایک بار جب وہ اپنے آخری انجام تک پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کو دہرانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد فاشزم اٹلی میں دہرائی نہ جاسکی۔ اور اسی طرح نازی ازم کو دوبارہ جرمنی میں فروغ حاصل نہ ہوسکا۔

بابری مسجد کا اس طرح ظالمانہ طور پر ڈھایا جانا ہندو انتہا پسندی کے آخری انجام کا ظاہر ہونا ہے۔ بابری مسجد کا انہدام دراصل ہندو انتہا پسندی کا انہدام ہے۔ اب انشاءاللہ اس ملک میں نیا احساس جاگے گا اور کم از کم دو نسل تک اس طرح کے کسی حتمی واقعہ کو پھر دوہرانا ممکن نہ ہوگا۔

بابری مسجد کے انہدام نے تخریب پسند طاقتوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اب یقین ہے کہ اس ملک میں سنجیدہ ذہن کے لوگوں کا غلبہ ہوگا۔ زندگی کی تعمیر کے مواقع کھل جائیں گے جو انتہا پسندوں کی منفی کارروائیوں کی وجہ سے بند ہوگئے تھے۔ ۱۹۹۲ء کا خاتمہ اس ملک میں مذہبی تشدد پسندی کا خاتمہ ہے اور اسی کے ساتھ امن اور رواداری اور باہمی احترام کے نئے دور کا آغاز بھی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے واقعہ کے بعد ہندو صاحبان کی طرف سے جو ردِ عمل سامنے آیا وہ بہت امید افزا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت نے کھل کر مسجد کو ڈھانے کی مذمت کی۔ اس کے بارے میں اخبارات کی رپورٹیں' ان کے اداریے نوٹ اور ان میں چھپنے والے خطوط بتاتے ہیں کہ ہندو ذہن کو اس واقعہ سے بہت سخت جھٹکا لگا ہے۔

بظاہر حالات تقریباً یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ہندو انتہاپسندی کی سخت حوصلہ شکنی ہوگی اور ایک عرصہ تک کے لئے وہ خود ہندوؤں کے درمیان بے زمین ہوکر رہ جائے گی جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے' ان کے لئے اب بہترین روش یہ ہے کہ وہ ماضی کی طرف نہ دیکھیں' وہ صرف مستقبل کی طرف دیکھیں۔ ۶ دسمبر کے بعد پیش آنے والی صورت حال کو وہ اپنے لئے تعمیرِ استحکام کے وقفہ کے طور پر استعمال کریں۔

داخلی تعمیر کے پہلو سے اس ملک میں مسلمانوں کے لئے کرنے کے بہت کام ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے اندر دینی اور اخلاقی بیداری لانا ہے۔ انہیں اسلام کا پیغام دوسروں تک

پہنچانے کے لئے محنت کرتا ہے ۔ مسلم نسلوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بناتا ہے۔ انہیں تجارت اور صنعت میں آگے بڑھاتا ہے۔ انہیں اپنے موجودہ ملی اور اسلامی اداروں کو ترقی کی طرف لے جاتا ہے ۔ انہیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے وغیرہ اس قسم کے بہت سے تعمیری کام ہیں جن کو انجام دینا ابھی باقی ہے۔ اب پہلی ضرورت یہ ہے کہ موجودہ وقفہ کو ان کاموں کی تکمیل میں استعمال کیا جائے۔ اگر بالفرض کہیں کوئی ناخوشگوار بات پیش آئے تب بھی اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تعمیری جدو جہد کو جاری رکھا جائے۔

پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی

جس مقام پر بابری مسجد واقع تھی وہاں مورتیوں کی دوبارہ تنصیب یوپی میں گورنر راج کے نفاذ کے بعد ہوئی مسٹر نرسمہا راؤ نے بابری مسجد کے انہدام کے فوری ردّ عمل کے طور پر اعلان کیا تھا کہ مسجد اپنے سابق مقام پر دوبارہ تعمیر ہوگی لیکن وہ آہستہ آہستہ اپنے اس موقف سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ان کارکنوں کی گرفتاری جن کا تعلق راشٹریہ سویم سیوک سنگھ سے تھا مسٹر اٹل بہاری باجپائی کے محض چوبیس گھنٹے کے برت کے بعد روک دی گئی منہدم شدہ مسجد کے مقام پر رکھی گئی رام للّا کی مورتیوں کے درشن کا مسئلہ ہائی کورٹ کی بنچ کے سامنے ہونے کے باوجود اس کی اجازت دے دی گئی وزیر اعظم یا وزیر داخلہ یا وزیر تعلیم کی اس توجیہہ کو کون مان سکتا ہے کہ اس اجازت کا تعلق مرکزی حکومت سے نہیں ہے بلکہ یہ فیصلہ فیض آباد کے مقامی حکام نے کیا ہے اتنے اہم مسئلے پر اتنی معمولی حیثیت کے سرکاری ملازمین بغیر اقتدار اعلیٰ کے مشورے کے خود اپنی صوابدید پر کیسے اقدام کرسکتے تھے! یہ سب باتیں واضح طور پر اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ مرکزی سرکار فرقہ پرست طاقتوں کے دباؤ کے سامنے یکسر لاچار و بے بس ہے۔

دوسری طرف بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور اس طرح کی دوسری جماعتیں اپنی معنویت بالکل کھو چکی ہیں اور اب ان کے وجود کا کوئی جواز نہیں ہے وہ جب تک بابری مسجد کی حفاظت کرنے سے قاصر رہیں تو اب ان سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ حکومت کو بابری مسجد کی اس کے سابق مقام پر دوبارہ تعمیر کے لئے مجبور کرسکیں گی۔ ان کے بعض لیڈروں کے اس طرح کے بیانات کو مسئلہ یو این او میں اٹھایا جائے گا اسے سلجھانے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیں گے۔

اب ہمارے مطالبے صرف دو ہونے چاہئیں اور اپنے ان مطالبوں پر ہمیں شدت سے اصرار کرنا چاہئے کہ وہ لوگ جو اس فریب ہی کے مرتکب ہوئے ہیں اور اب بھی ہو رہے ہیں اپنے عہدوں اور مناصب سے دستبردار ہوں اور دوسرے بابری مسجد کو بہر صورت اپنی سابق جگہ پر تعمیر کیا جائے ۶ دسمبر کے واقعہ ہائلہ نے قانونی اور اخلاقی صورت حال یکسر تبدیل کردی ہے اب مسلمانوں کی کسی تنظیم کو اس معاملے میں موجودہ ارباب اقتدار کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہئے۔

"التوعیہ" جنوری ۱۹۹۳ء

معذرت کا ایک لفظ بھی نہیں

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری اندرجیت گپتا سے بشاکھا ڈے سرکار کا انٹرویو

سوال: بی جے پی نے جب حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی تو وہ پارلیمنٹ میں بالکل الگ تھلگ پڑ گئی تھی۔ کیا بی جے پی کی یہ پوزیشن آئندہ کے سیاسی تال میل کا نتیجہ ہے؟

جواب: یہ درست ہے کہ بی جے پی دفاعی موقف اختیار کرنے پر مجبور تھی اور سب ہی اس پر حملہ کر رہے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی ہماری ماچاتی بھی اپنی کرسی برقرار نہیں رکھ سکے، انہیں الزام بھی نہیں دیتا۔ اس کا کام بہت مشکل تھا مگر الگ تھلگ پڑ جانے کی اصطلاح ایک سستی اصطلاح ہے۔ پارلیمنٹ کی چار دیواری میں وہ الگ تھلگ پڑ گئی ہوتی مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کے باہر ہندو جذبات سے بھی کٹ گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک میں جو کچھ ہوا اس کے سنگین اور شدید ثمرات ہوں گے۔ ان واقعات سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی تقسیم بہت بڑھ گئی ہے۔ اسے کم کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ برسوں سے ہندوؤں کے ذہنوں میں جو زہر بھرا گیا ہے اس کی وجہ سے ان لوگوں کو تشویشناک حالات سے دوچار ہونا ہوگا جو بی جے پی سے لڑنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اپنی (لوک سبھا کی) تقریر میں کہا ہے۔ یہ ایک سیاسی لڑائی ہے۔ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جس سے محض انتظامی (ایڈمنسٹریٹو) اقدامات کے ذریعہ نمٹا جا سکتا ہے۔ سیاسی اور نظریاتی جدوجہد ایک طویل جدوجہد ہوگی۔ اس نقطۂ نظر سے میں نہیں سمجھتا کہ بی جے پی 'الگ تھلگ' پڑ گئی ہے۔ شاکھاؤں اور [illegible] دھرم پرچار جو برسوں سے کیا گیا ہے اور جس سے لوگوں کے ذہن آلودہ ہوئے ہیں اسے اتنی آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ متحدہ محاذ کے ذریعہ بی جے پی کا موثر ڈھنگ سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ خاص طور سے ایسی حالت میں جبکہ ہر ایک جماعت کی اصطلاح میں بات کرتا ہے۔

جواب: دیکھئے میں کہوں گا یہ پسندیدہ بات ہے۔ میں محاذ کے تعلق سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایک وسیع ترین مخالف فرقہ پرستی پلیٹ فارم تیار کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمیں بعض مخصوص اقدامات کرنے ہوں گے۔ ہم مختلف مہمیں شروع کرنے نچلی سطح پر عوام تک جانے کی بات کر رہے ہیں۔ اس کے لئے جلسے، جلوس، پد یاترائیں، امن مارچ، سیمینار وغیرہ منظم کئے جائیں۔ یہ اپنی جگہ اہم ہیں مگر یہ نظریاتی تعصب کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں ہوں گے۔ وہ پارٹیاں جو ۶ دسمبر کو جو کچھ ہوا اس کی مخالف ہیں اور اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح کا پلیٹ فارم تیار کرنا ہوگا۔ ہمیں عوام کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ ہندو دھرم کے نام پر جو کچھ کیا گیا وہ دراصل ہندو مت پر بھی حملہ ہے۔

سوال: کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کانگریس سے بھی ہاتھ ملائیں گے؟

جواب: اب تک کانگریس نے اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ ہم نے کہا کہ سب سے بڑی اور پرانی پارٹی کی حیثیت سے کانگریس کو اپنی بنیادوں کو منظم اور سرگرم کرنا چاہئے۔ اگر ہمارے پیروکار یہ دیکھیں گے کہ کانگریس اپنی عوامی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتی ہے تو ان کا حوصلہ بڑھے گا اور وہ کانگریس کے ساتھ مخالف فرقہ پرستی مہم میں شریک ہوں گے۔ مگر اب تک کچھ سامنے نہیں آتا۔ صرف ایک دن وزیر اعظم نے اچھی اچھی باتیں کیں کہ ہمیں مل کر کام کرنا چاہئے مگر اس کے بعد سے خاموشی ہے۔ کیسی سیاسی سنجیدگی ہے؟ انہیں دوسری پارٹیوں سے رابطہ قائم کرنا چاہئے اور خود کچھ آزادانہ مہم شروع کرنی چاہئے۔

سوال: نیشنل فرنٹ (قومی مورچہ) کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا وہ کانگریس کی سرگرمی میں ایسی مہم میں شریک ہوگا؟

جواب: دیکھئے، ہماری طرف سے بھی بعض مسائل ہیں۔ مثال کے طور پر تیلگو دیشم کہتی ہے کہ آندھرا پردیش میں اس کی اصل لڑائی کانگریس سے ہے اس لئے وہ کانگریس کے ساتھ مشترکہ محاذ میں شرکت کے بارے میں کیا۔۔۔ دلچسپی نہیں دکھاتی۔ بلاشبہ ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سوال: کیا بایاں محاذ کانگریس اور نیشنل فرنٹ کے درمیان پل کا فرض انجام دے گا؟

جواب: چند دنوں قبل ایک میٹنگ میں وی پی سنگھ نے دو ٹوک لفظوں میں کہا کہ ہم وزیر اعظم کے استعفیٰ کی مانگ کر رہے ہیں مگر بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ فی الوقت یہ ترجیحی فریضہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اصل لڑائی تو فرقہ پرستوں سے لڑنی ہے مگر اخبارات میں یہ باتیں چھپتی ہی نہیں ہیں مگر وی پی سنگھ جو کہتے ہیں وہ اپنی پارٹی کے تمام لوگوں کی طرف سے نہیں کہتے۔ مثال کے طور پر ان کی پارٹی میں عدم اعتماد کی تحریک پر ووٹ کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ ایک دو لوگ کہہ رہے ہیں کہ بی جے پی کی تحریک عدم اعتماد کی حمایت کی جائے۔ ان کے لیڈروں کے مختلف خیالات ہیں اور آئندہ ملنے والے دو دنوں کے بارے میں فکرمندی، ان کے انداز فکر کو متاثر کرتی ہے۔

سوال: پارلیمنٹ میں اپنی تقریر میں آپ نے وزیر اعظم کی سادہ

ہوئی کا حوالہ دیا۔ کیا واقعی وہ اتنے سادہ لوح ہیں؟ اور اگر واقعی ایسا ہے تو کیا انہیں حکومت کی سربراہی کرتے رہنا چاہیئے؟

جواب: میں سادہ لوحی سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر میں نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ دیکھئے وہ اتنے سادہ لوح بھی نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نرسمہا راؤ بحران سے نمٹنے میں بری طرح سے ناکام رہے ہیں۔ ان کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی جانی چاہیئے۔ بدترین بات یہ ہے کہ ان کی زبان سے معذرت کا ایک لفظ تک ادا نہیں ہوا۔ انہوں نے سب کو یقین دلایا تھا کہ اس ڈھانچہ کی حفاظت کی جائے گی مگر وہ حفاظت نہیں کر سکے۔ کیا اس کے لئے انہیں کم سے کم معذرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے؟ ایسے وقت میں ضد کو جائز ٹھہرانے کا موقف درست نہیں ہے۔ اگر وہ ایک ایسے وزیراعظم کی حیثیت سے یاد رکھے جانا چاہتے ہیں جو راست گو اور ایماندار تھا تو انہیں ایسا (معذرت تک ادا نہ کرنے والا) موقف۔

نہیں اپنانا چاہیئے۔

ایک لحاظ سے وہ سادہ لوح ہیں کیونکہ انہوں نے بھروسہ کیا کہ کلیان سنگھ ڈھانچہ کی حفاظت کے لئے مرکزی فورسز استعمال کریں گے۔ یہ بالکل مہمل بات تھی۔ بی جے پی کا پورا ... ہی الگ تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے لئے نرسمہا راؤ بھی ذمہ دار ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے خود گدی چھوڑ دیتے۔

سوال: بائیں بازو کی پارٹیاں ان کے استعفے پر اصرار کیوں نہیں کر رہی ہیں؟

جواب: اس وقت ان کے استعفے کا مطالبہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ کوئی نہ کوئی حکومت ضروری ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی بھی حکومت نہ رہے۔ ہاں، آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وزیراعظم کو بدلا جائے۔ مگر یہ تو حکمراں پارٹی کا کام ہے۔ اسے طے کرنا ہوگا کہ وہ انہیں بدلنا چاہتی ہے یا نہیں۔ صاف ہے کہ وہ (حکمراں پارٹی) ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی یا وہ اس کے موڈ میں نہیں ہے۔ پھر شور مچانے سے کیا فائدہ ہے کہ "وہ استعفیٰ دیں، استعفیٰ دیں" جبکہ آپ کو پتہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔

سوال: حکومت ملک کے نقطۂ نظر سے کیا بی جے پی لیڈروں کی گرفتاری اور ان کی ریاستی حکومتوں کی برطرفی مناسب تھی؟

جواب: گرفتاری ناگزیر تھی۔ ان لیڈروں نے اپنی کارروائیوں سے اسے ناگزیر بنا دیا تھا۔ کوئی کتنا بھی بڑا لیڈر کیوں نہ ہو قانون سے بالاتر نہیں ہے مگر میرے خیال میں حکومتوں کی برطرفی جلد بازی میں کی گئی۔ چیف منسٹر کہتے رہے تھے کہ ان کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ ایک ایسی تنظیم کا رکن حکومت کا سربراہ نہیں ہو سکتا جس پر پابندی عائد کی گئی ہو مگر ہمارے ملک میں ایک دستور بھی ہے۔ مرکز کو مناسب مقدمہ تیار کرنا چاہیئے تھا۔ اس کو ... ثابت کرنا تھا کہ کس طرح یہ ریاستی حکومتیں دستور کی خلاف ورزی کر رہی ہیں اور مرکز کے احکامات کو نافذ کرنے سے انکار کر رہی ہیں۔ ایسا کرنے کی وجہ سے بعض لوگ سمجھیں گے کہ انہیں صرف اس لئے برطرف کیا گیا کہ وہ بی جے پی کی حکومتیں تھیں۔ میرے خیال سے کسی حد تک یہ جوابی اٹھایا گیا قدم ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں اب ایودھیا مسئلہ کو کس طرح حل کیا جانا چاہیئے؟

جواب: مسجد کی ازسرنو تعمیر کا مسئلہ ہے جس کا اعلان وزیر اعظم نے اس کے مضمرات پر غور کئے بغیر کیا ہے۔ میری رائے میں مسلمانوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہوگا کہ وہ اصرار کریں کہ مسجد اسی جگہ تعمیر کی جائے۔ اس وقت جو صورتحال ہے اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے مزید مشکلات پیدا ہوں گی۔ مسلمان ہی سب سے زیادہ مصیبت سے دوچار ہوں گے۔ ہم مسلم لیڈروں کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو کچھ پھر سے تعمیر ہوگا وہ ... ی۔ اب تو صرف ایک ... ہو سکتی ہے۔ ... ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ کچھ فاصلہ پر مسجد اور مندر دونوں کی تعمیر ہو۔ جس جگہ مسجد تھی اسے شہیدوں کی یادگار یا ایسی ہی کوئی یادگار بنایا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا ایودھیا کے واقعات بائیں بازو کی ناکامی کو بھی اجاگر نہیں کرتے؟ ایسا لگتا ہے کہ پورے ایودھیا معاملہ میں بائیں بازو کا کوئی کردار ہی نہیں تھا.....

جواب: دیکھئے، آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ کا کوئی کردار ہی نہیں تھا مگر آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی ناکام ہوئے۔ اتر پردیش بھی ہمارا گڑھ نہیں تھا۔ میں مانتا ہوں کہ بائیں بازو کی طاقتیں کسی بھی ریاست میں اتنی طاقتور نہیں ہیں کہ عوام کے شعور کو متاثر کر سکیں لیکن اسے منصوبہ بند طریقہ سے نظریاتی جدوجہد کے ذریعہ حاصل کرنا ہوگا۔ بائیں بازو کی مہم بھی جستہ جستہ ہی رہی ہے۔ ہمیں بھی کچھ نتائج اخذ کرنے ہوں گے۔ ہم نے اب تک اس پر غور نہیں کیا ہے۔ ہم اس پر غور کرنے والے ہیں، تب ہم کو واضح طور پر پتہ چلے گا کہ ہماری ناکامیاں کیا ہیں، ان کی وجوہات کیا ہیں اور انہیں دور کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

انتشار مارچ ۹۳ء (بشکریہ سنڈے آبزرور)

انہدام کا ریہرسل پہلے سے

شمیم فیضی، ایڈیٹر حیات، اجے بھون، کوٹلہ مارگ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰

پوری قوم کا سر شرم سے جھک گیا ہے۔ نہ صرف ایک سیکولر جمہوری ملک بلکہ مہذب معاشرہ کی حیثیت سے بھی ہندوستان کا وقار مٹی میں مل گیا ہے۔ قانون کی حکمرانی کے اصول، عدلیہ کے احکامات اور دستورِ ہند کو پیروں تلے روندنے والے فسطائی ہندوؤں نے صرف بابری مسجد ہی نہیں ڈھائی ہے بلکہ انہوں نے ملک کے سیکولر جمہوری تانے بانے کو بھی آگ لگا دی ہے۔

سب سے زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ یہ ہولناک جرم کرنے کے بعد سنگھ پریوار بجائے ندامت کے اس سنگین جرم کیلئے نابنیاد منطق و دلائل پیش کر رہا ہے۔ ایک طرف یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ جوش و خروش میں کار سیوک بے قابو ہو گئے تھے تو دوسری طرف اس تھیوری کا پرچار کیا جا رہا ہے کہ قیادت سے کنٹرول کھو دیا تھا۔ مگر اخبارات میں جو حقائق شائع ہوئے ہیں ان سے واضح ہے کہ "سیاہ اتوار" کے واقعات نہ صرف منظم اور منصوبہ بند تھے بلکہ ان کی پہلے سے ریہرسل بھی کی گئی تھی۔ نہ صرف مسجد پر ہتھوڑے برسانے والے اس سے واقف تھے بلکہ قائدین بھی پوری طرح سے سازش میں ملوث تھے۔ شیو سینا کے ممبر لوک سبھا موریشور ساوے نے کہا ہے کہ مسجد منہدم کرنے کا منصوبہ بہت پہلے بنا لیا گیا تھا اور اس کی ساری تفصیلات سے ایل کے اڈوانی کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔

یہ سازش تین مرحلے والی سازش تھی: مسجد منہدم کرنا، اخبار نویسوں کو ہندوستان کی تاریخ کے اس گھناؤنے جرم کی تاریخ لکھنے سے روکنا اور فیض آباد، ایودھیا میں اقلیتی فرقہ کا قتل عام کرنا۔

انتہا پسندوں نے منہدم مسجد سے [illegible] ایودھیا میں صرف ایک ہی نعرہ تھا "[illegible]" جس کا مطلب [illegible] [illegible] مسجد کے ڈھانچہ کو [illegible] گیا

تین گھنٹے بعد ایک بھی گنبد باقی نہ رہا

…تے گی مگر اس کے ساتھ ہی سنگھ پریوار کے لیڈروں نے مذہبی جنون … بھڑکانے کی مہم شروع کر دی۔ سنگھ … کے ہندو وہی آرگنائزر … ۱۳ دسمبر ۱۹۹۲ء نے لکھا ہے۔

"اس حکمت عملی (اشتہاد لیشن) … حکومت کی جانب سے سپریم کورٹ سے … بعد وعدہ کی حکمت عملی سے صفحوں کے اعلان میں … کی غلط فہمی نہ پیدا ہو اور سنگھ پریوار کے دشمن اس کا غلط استعمال … کر پائیں۔ اس لئے ایل کے ایڈوانی اور مرلی منوہر جوشی کو کہا گیا کہ … رتھ یاترا شروع کر دیں۔ متذکرہ ان دو شہروں سے یاترا … شروع کرنے کا مطلب یہ تھا کہ متعلقہ حلقوں کو پتہ چل جائے کہ پارٹی … (بی جے پی) ٹکراؤ کو وسعت دینا چاہتی ہے۔"

ان دونوں یاتراؤں کے دوران بی جے پی کے "ذمہ دار" لیڈروں … بالکل کھلم کھلا عدالت عالیہ کے احکامات کی خلاف ورزی کی اپیل کی۔ … ڈی کے سنگھل نے کہا کہ "عدالتی فیصلوں کا اطلاق افراد پر ہوتا ہے … سیوکوں پر نہیں" لال کرشن ایڈوانی نے کہا کہ کارسیوا "کدال اور … بیلچوں سے ہوگی۔"

۵ دسمبر کو ہی یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ دوسرے … دن ایودھیا میں کوئی "انتہائی ڈرامائی اقدام کیا جائے گا" سینت … مہا گوپال داس نے تو اخبار نویسوں سے یہ بھی کہہ دیا کہ مسجد پر حملہ … نا ممکن ہے کے لئے یہ دلیل دی کہ "یہ حملہ مسلم لیگی کمیونسٹ اور … پاکستانی لوگ کریں گے۔"

روزنامہ "پائنیر" کے فوٹوگرافر پروین جین نے ۷ دسمبر کے … پرچے میں لکھا ہے۔

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد اچانک منہدم کی گئی تو پھر اس … بات کو سنئے۔ ہفتہ ۵ دسمبر کے دن بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک ممبر … پارلیمنٹ نے مجھے اتوار کے پروگرام کے بارے میں پیشگی وارننگ … دی۔

"وہ مسکراتے ہوئے مجھے اس جگہ لے گئے جہاں ایک کارسیوک … ۲ برس پرانی مسجد کو گرانے کی ریہرسل کر رہے تھے۔ کارسیوک … اور لوہے کے تاروں کی مدد سے ایک بڑی چٹان کو کھینچ رہے … تھے۔ دوسرے دن کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ مسجد کو اسی … طرح گرایا گیا جس طرح کی ریہرسل ایک دن پہلے کی گئی تھی۔

مسجد کے پاس ہی ایک کنکریٹ کا ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا کارسیوک … اس کی سمت دوڑنے کی ریہرسل کر رہے تھے۔ یہ اتوار کو مسجد پر دھاوا … بولنے کی ریہرسل تھی۔

ایسی ہی جھوٹی "کارسیوا" اور ریہرسل کا حوالہ اسٹیٹسمین … کے نامہ نگار سنجے کاؤ نے بھی اپنی رپورٹ میں دیا ہے … جو ۴ اور ۵ دسمبر کے شماروں میں شائع … ہوئی۔ ان کی رپورٹ ہم من وعن اس … شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔

سنجے کاؤ نے اپنی رپورٹ میں سازش کے تیسرے مرحلے … کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ انہوں نے ایک کارسیوک کا یہ بیان … نقل کیا ہے کہ ایودھیا اور فیض آباد کے تمام مسلمانوں کے گھروں … کی نشان دہی کر لی گئی ہے۔ پیٹریاٹ کے نامہ نگار دین کرپال … نے ۸ دسمبر کو جو رپورٹ فیض آباد/ ایودھیا کے مسلمانوں کی تباہی … پر بھیجی ہے اس سے سنجے کاؤ کی رپورٹ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

مسجد کو منہدم کرنے کی سازش پر ٹائمز آف انڈیا کے … نامہ نگار سانتیل داس گپتا نے لکھا ہے

"ڈھانچہ کو ماہرین نے توڑا ہے۔ ہتھوڑے، کدال اور … رسیاں مسجد کو منہدم کرنے کے لئے استعمال کی گئیں۔ انتہائی … چالاکی سے مرکزی فورسز کے راستہ کو بند کیا گیا (سڑکوں پر ڈرم … پھیلا کر، جلتے ہوئے ٹائر پھینک دیئے گئے) پوری کارروائی … انتہائی منظم ڈھنگ سے کی گئی۔ منہدم کرنے کی کارروائی میں … کبھی بھی دو ہزار سے زیادہ کارسیوک شامل نہیں ہوتے۔ … باقی کارسیوک رام کتھا کنج میں لیڈروں کی تقریریں سن رہے … تھے۔"

"دو انشاء" مارچ ۱۹۹۳ء

کارسیوکوں کے اعترافات

وہ گئے، انہوں نے ڈھا دیا۔ وہ واپس آگئے۔" ادھر پردیس سے جانے والے ہزاروں کارسیوکوں کا موڈ ایودھیا سے واپس آنے کے بعد حصولیابی کی مسرت اور خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے اندر تاسف کا احساس بالکل نہیں تھا۔ ایسے بہت سے کارسیوکوں سے میری مختصر سی ملاقات کے بعد ایک معنی خیز نکتہ میرے ذہن میں یہ ابھرا ہے کہ ایودھیا میں یہ پوری کارروائی پہلے سے منصوبہ بند تھی اور اس کی بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اشتراک نے پہلے سے اچھی طرح مشق کر لی تھی۔ انہوں نے ڈھٹائی کے ساتھ جو کچھ کہا اس سے میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ فرقہ پرست اشتراک ان کے ذہنوں کو تیار کرنے میں کتنی حد تک کامیاب ہو گیا کہ بدترین جرم کو بھی وہ جائز قرار دے رہے تھے اور مذہب کے نام پر اس کا دفاع کر رہے تھے۔

محبوب نگر کے ایک کارسیوک نے فرقہ پرست کٹر ذہن کے عام انداز فکر کی علامت بن کر کہا۔ "ہم نے وہ کام چھ گھنٹے میں کر دیا جس کو وہ (بی جے پی وغیرہ) اتنے برسوں میں نہیں کر پائے۔ ہم بات چیت اور عدالتوں پر کبھی یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہندوؤں کی بالاتری قائم کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔"

جب ان سے پوچھا گیا کہ اس ردعمل اور اثرات سے کیا وہ واقف ہیں تو اس کا جواب اور بھی زیادہ شرمناک تھا۔ "اب ملک نے دیکھ لیا ہے کہ ہم کیا کرنے کے اہل ہیں۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ کیا ہوتا ہے، ہماری منزل صاف ہے۔ چند ہزار لوگ مارے جائیں گے۔ لیکن یہ کوئی بڑی قیمت نہیں ہے۔"

کچھ کارسیوک اس "فخر و ناموری" میں نہائے ہوئے تھے اور اس ذیشان خیر مقدم پر سرور تھے جو بی جے پی، آر ایس ایس کے کارکن ایودھیا سے واپس آنے پر اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے وقت کر رہے تھے۔ وہ ایودھیا کے واقعہ کے بارے میں دوسروں کے ساتھ اپنی مسرتوں اور اپنے تجربوں کو بانٹنے کے لئے تیار تھے حالانکہ ان میں کچھ اپنے ناموں کو بتلانے میں جھجک رہے تھے لیکن ان میں سے کچھ اپنی ذاتی تفصیلات دینے کے لئے تیار تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی جو بالائی تعلیم یافتہ پرتوں سے تعلق رکھتے تھے وہ اپنے ناموں کا انکشاف کرنے میں جھجک رہے تھے اور اپنے پیشوں کو نہیں بتا رہے تھے۔

رگھوما ریڈی دوسروں سے زیادہ تفصیلات دینے کے لئے تیار تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ انک آگے بڑھے ہوئے کارکنوں کو عملی کارروائی کی تفصیلات [illegible]

گیا تھا کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھیں۔

اس نے تسلیم کیا کہ مسجد کا مسمار کیا جانا پہلے سے منصوبہ بند تھا اور ہر چیز اس دن کے لئے تیار رکھی گئی تھی۔ ان کو صاف ہدایات تھیں کہ کام کو کس طرح کیا جائے گا۔

اس کے کہنے کے مطابق کارسیوکوں کے ایک حصہ کو پولس کی گھیرابندی کو توڑنا ہوگا اور پولس کو جم کر لڑائیوں میں مصروف کیا جائیگا اور دوسرا حصہ مسجد پر دھاوا بولے گا۔ تیسرا الگ حصہ کو ڈھانچہ کو منہدم کرنے کے اوزار دیئے گئے تھے اور ان کو ایودھیا میں پہنچا لیا گیا تھا اور بڑی تعداد میں اکٹھا کر لیا گیا تھا۔

ان سے دریافت کیا گیا کہ انہوں نے مسجد کو اس طرح ڈھانے کا راستہ کیوں اختیار کیا جب کہ وہ ڈائنامائیٹ کے ذریعہ اس کو اڑا سکتے تھے؟ "وہ بزدلانہ فعل ہوتا۔ ایسا سوچا گیا تھا لیکن اس کو ترک کر دیا گیا۔ ہم اس کو اپنے ہاتھوں سے ہٹا دینا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے جذبات اور طاقت کا اظہار کر دیں" اس نے بتایا۔

تمام کارسیوک کلیان سنگھ کی پولس کے بارے میں ہر اچھی بات کہہ رہے تھے۔ کھم کے راجندر نے کہا "انہوں نے ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ انہوں نے تو ہم پر لاٹھیاں تک نہیں اٹھائیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ حکومت کے افسران نے پولس افسروں کو احکامات جاری کر دیئے ہیں کہ چاہے کچھ بھی ہو انہیں چھونا نہیں۔"

ایک کارسیوک نے جو ایسٹ گوداوری کا تھا تسلیم کیا کہ بجرنگ دل نے اس مقصد کے لئے خودکشی کرنے والے دستے تیار کر لئے ہیں۔ دوسروں نے ہمیں بتایا کہ وہ دستے مرنے کے لئے تیار ہیں اور ان کی زندگیوں کا بیمہ کرا دیا گیا تھا۔ اس پورے عرصہ کے دوران جب وہ مسجد کو برباد کر رہے تھے تو جو تنظیموں کے رہنما اس کی رہنمائی کر رہے تھے وہ کارسیوکوں [illegible]

> "آپ پھر بیہودہ سوالات کر رہے ہیں۔ لگتا ہے ایودھیا میں اخبار نویسوں کی جس طرح ہم نے پٹائی کی، اس سے آپ لوگوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے۔"

ہے کے ڈھانے کا کام وہ ڈسپلن کے ساتھ کریں تاکہ پاکستان کو نظر انداز کیا جاسکے لیکن پھر بھی تین لوگ مارے گئے لیکن اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ قربانی ہم نے رام کی خاطر کی ہے۔" اسی شہر کے ایک اور کارسیوک نے کہا جو پیشہ سے وکیل ہیں۔

تنڈور کے ہوسٹ ریڈی نے بجرنگ دل کی بھرپور تعریف کی: "انہوں نے ہمیں ہر چیز فراہم کر دی تھی یہاں تک کہ وہ بنیادی اوزار بھی نہیں بھولے تھے جیسے جیسے ہم کام بڑھا رہے تھے انہوں نے ہاتھوں میں پیچکس، لوہے کے سریا، چھینی اور ڈھانے کیلئے دوسرے اوزار دے رکھے تھے۔"

عادل آباد ضلع کے سینیٹس نے کہا کہ جیسے ہی مسجد ڈھانے کا کام مکمل کر لیا گیا تو ونئے کٹیار نے ان سے کہا کہ وہ جگہ نہ چھوڑیں کیونکہ فریضہ ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ اسی دن دو گھنٹے کے بعد آدھی رات کو عارضی مندر کی تکمیل ہو گئی تھی۔

نلور کے ایک کارسیوک نے فخریہ اعلان کیا کہ وہ ایودھیا صرف ایک مقصد سے گئے تھے، کسی بھی قیمت پر مسجد کو ڈھانا ہے۔ اس نے اس حقیقت کی تصدیق کر دی کہ جیسا قبل ازیں طے کیا جا چکا تھا وزیر اعظم کے گاؤں ونگارا کے سرینواس کو منہدم کرنے والے دستے کی اگلی قطار میں رکھا گیا تھا اور اس کو ڈھانے والے اوزار دے دیئے گئے تھے۔ ایک کلو میٹر تک ایک قطار میں سمنٹ کی بوریاں اور اینٹیں مندر کی تعمیر کے لئے رکھ دی گئی تھیں۔ تمام ہی کارسیوکوں نے یہ تسلیم کیا کہ ان کی بہت اچھی دیکھ بھال ہوئی اور کسی کو بھی بے آرامی کا کسی طرح بھی سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غذا بھاری مقدار میں موجود تھی۔ آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے ذرائع کے کہنے کے مطابق وافر مقدار میں اتنی غذا اسٹور کر لی گئی تھی کہ چار ہفتوں تک کام چل سکتی تھی۔ نہایت اچھی میڈیکل اور دوسری سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔

> "ہمارے لیڈروں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ اتر پردیش حکومت نے پولس کو ہدایت کر دی ہے کہ کارسیوک ایودھیا میں جو چاہے کریں، ان کے خلاف کسی بھی حالت میں طاقت کا استعمال نہ کیا جائے۔"

جب یہ دریافت کیا گیا کہ کس نے یہ انتظامات کئے

دیا۔ "کون کرتا، اتر پردیش میں ہماری حکومت نے کیا تھا۔"

اس سے بھی زیادہ دلچسپ نئے آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے چوٹی کے لیڈروں کے طور طریقوں کے بارے میں انہوں نے بیانات دیئے جنہوں نے اس پوری کارروائی کو چلایا تھا۔ کرنول انجینئرنگ کالج کے ایک طالب علم نے کہا کہ "جب تک مسجد کا پہلا گنبد گرتا، اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی خاموش رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ہماری ہمت افزائی کرنی شروع کر دی تھی۔ سادھوی رتمبرا اس پورے عرصہ میں اشتعال انگیز تقریریں کرتی رہی تھی اور چلا رہی تھی "ایک دھکا اور دو، بابری ڈھانچہ توڑ دو"۔

کارسیوکوں نے اس بڑی خوشی کو چھپایا نہیں کہ جو سلوک کارسیوکوں نے صحافیوں کے ساتھ کیا تھا: "ایک دن پہلے ہی ہمارے رہنماؤں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ صحافیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں کیونکہ وہ ہمارے خلاف متعصبانہ پرچار چلا رہے ہیں اور ہم نے وہی کیا جس کے وہ حقدار تھے، ان کو اپنے ستاروں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ وہ زندہ ہیں۔"

کارسیوک اس پر بڑی تلخی محسوس کر رہے تھے کہ شیو سینا کے آقا ساری شان و عظمت چرانے کی کوشش کر رہے ہیں یہ دعویٰ کر کے کہ مسجد کو شیو سینکوں نے ڈھایا ہے: "یہ بالکل جھوٹ ہے، گو مہاراشٹر کا دستہ سب سے بڑا تھا لیکن ہم بھی پیچھے نہیں رہے تھے۔ آندھرا سے تقریباً ۴ ہزار کارسیوک گئے تھے لیکن آپریشن کی اگوائی بجرنگ دل نے کی تھی اور اس کے سرگرم کارکنوں نے اس کی تکمیل کی تھی۔ ہمیں اس پر فخر ہے" حیدرآباد کے ایک نوجوان نے کہا۔

مسمار کرنے کے ردعمل اور اثرات کے بارے میں وہ کیا سوچتے تھے، ان میں سے کسی نے بھی ہندوؤں کی طرف سے مخالف ردعمل کی توقع کا اظہار نہیں کیا۔ "حقیقتاً اس سے ہمیں تقویت ملے گی اور آئندہ انتخابات میں ہم پورا ہاتھ مار لیں گے۔ ہندو تمام ہی کھل کر اپنی تعریف کا اظہار نہیں کریں گے۔ لیکن اپنے دلوں میں اس کا وہ خیر مقدم کریں گے۔"

اس طور پر کارسیوکوں کے اندر تاسف کا کوئی احساس نہیں ہے، وہ اڑے ہوئے ہیں اور پُر امید ہیں۔ ان کو توقع ہے کہ ہندوؤں میں اُبال آ جائے گا اگر مسجد اسی جگہ پر پھر سے تعمیر کی جائے گی۔

اس نامہ نگار نے آخری سوال کیا: "آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" سب سے مل کر ڈرا دینے والا جواب دیا: "اسی وجہ سے ہم نے صحافیوں کو مارا ہے پھر بھی آپ لوگ سبق نہیں سیکھے!"

"انشاء" ۱۱ مارچ ۱۹۹۳ء

احمد سعید ملیح آبادی کے ۴۲ اداریوں میں سے ایک

ا۔ کوئی بابر نہیں آئے گا

ہندوؤں کے ایک دھارمک لیڈر جگت گرو شنکر آچاریہ سوامی سوا روپانند جی نے موودی پورم کے مقام پر دیو مندر کے "پران پرتشٹھا" میں یہ اعلان کیا کہ اگر مسلمانوں کو بابری مسجد واپس چاہئے تو وہ انہیں صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب وہ دوبارہ بابر کو دعوت دے کر بلائیں۔ تب احمد سعید صاحب نے مذکورہ عنوان کے تحت درج ذیل اداریہ مضمون قلمبند کیا۔

"سوامی جی کی خدمت میں جواباً عرض ہے کہ بابری مسجد کو حاصل کرنے کے لئے کوئی بابر سمرقند و بخارا یا کابل سے ہندوستان نہیں آئے گا۔ پانچ سو برس قبل جب بابر اپنے وطن ازبکستان میں فوجی مہموں میں مسلسل ناکامیوں کے بعد طالع آزمائی کے لئے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان آیا تھا تو اس نے بھارت کے ہندوؤں پر حملہ نہیں کیا تھا۔ بابر کا حملہ ابراہیم لودھی کی پٹھان حکومت پر تھا جسے پانی پت کے میدان میں شکست دے کر وہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے مدِ مقابل ہندو نہیں، پٹھان حکمران تھے جو مسلمان تھے۔ اور بابر کے چار سالہ دورِ حکومت کے بعد اس کی قابلِ واپسی پر جب اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا تو اُسے ہندوؤں نے نہیں، شیر شاہ سوری نے رگیدا تھا۔ بابر نے ہندوستان کی سلطنت ہندوؤں سے نہیں چھینی تھی، افغانوں سے چھینی تھی لہٰذا اس کا حملہ بھارت نہیں، ہندوستان کے مسلم حکمرانوں پر تھا۔

"بابر نے ایودھیا میں رام جنم استھان مندر ڈھا کر اس جگہ بابری مسجد بنائی" اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں، صرف کھوکھلا دعویٰ اور دھاندلی ہے لیکن پانچ سو برس پرانی بابری مسجد جسے بابر کے عہد میں اس کے ایک گورنر میر باقی نے تعمیر کرکے اپنے بادشاہ بابر کے نام سے موسوم کیا تھا، اس پر آزاد اور سونتر بھارت میں ہندوؤں نے جبر و استبداد سے قبضہ کر لیا ہے۔ اس کی شہادت اور ثبوت کے لئے کسی تاریخ یا دستاویز کی ضرورت نہیں۔ یہ داستان آج کی اور واردات تازہ ہے جس کی کہانی بابری مسجد کے مینار و گنبد، زبانِ خاموش سے زمانے کو سنا رہے ہیں۔ رام جنم استھان مندر ڈھانے کا کلنک بابر کے ماتھے پر نہیں لگا۔ مگر افسوس، کچھ جنونی لوگوں نے ہندو دھرم کو کیسا بدنام و رسوا کیا۔ اوپر سے ایک دھارمک پیشوا کا ترمندہ ہو کر اینٹھ اکڑنا اور خم ٹھونک کر چیلنج کرنا کہ بابری مسجد لینا ہے تو بلاؤ کسی بابر کو جو بھارت پر حملہ کرکے اُسے فتح کرے اور بابری مسجد جسے رام جنم بھومی مندر بنا لیا گیا ہے، پھر سے ڈھا کر اس پر اپنی مسجد اُٹھائے۔ چھی چھی: کیسی گھٹیا بات اور کیسے اوچھے وچار!!

"جگت گرو سوامی جی کو ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اگر ان کے بلاوے اور آواز دینے پر سچ مچ کوئی بابر آکر بھارت میں پھاند پڑے تو تاریخ اپنے کو ایک بار پھر دوہرائے گی۔ جب اصلی بابر آیا تھا تو ہندوؤں نے اس کا مقابلہ نہیں کیا تھا، پٹھانوں نے اس کے سامنے سینہ تانا تھا اور یہ مسلمان تھے۔ سوامی جی کی للکار سُن کر خلاء سے کوئی نقلی بابر، بھارت میں دھم سے کود ہی پڑا تو اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بار پھر مسلمان اٹھیں گے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ بھارت اب تک پاکستان تین بار حملہ کر چکا ہے۔ ہر حملے کے وقت ہندو، مسلمان اور سکھ عیسائی کندھے سے کندھا ملا کر بھارت کی رکھشا کرنے اور دشمن سے لوہا لینے میدانِ جنگ میں جاتے رہے ہیں۔ اور سب کا خون ایک ساتھ مورچوں اور دمدموں پر بہتا رہا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہندو فوجی کے خون کی دھارا، مسلمان فوجی کے خون کی دھارا سے الگ بہی ہو۔ نہ اُن کی دھاراؤں کو شناخت کرکے الگ کیا جا سکا۔

"کیا سوامی جی کو معلوم ہے کہ سیالکوٹ سیکٹر میں شکر گڑھ، پاکستان کا بہت ہی مضبوط اور ناقابلِ تسخیر قلعہ رہا ہے۔ ہر جنگ میں اُسے فتح کرنے کے لئے بھارت کے ویروں کو اپنے لاشوں کی سیڑھی بنانا پڑی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شکر گڑھ کا مورچہ کسی طرح فتح نہیں ہو رہا تھا۔ انڈین آرمی نے کئی یلغاریں کیں مگر پاکستان کے جاں بازوں نے پسپا کر دیا۔ تب فیلڈ کمانڈروں نے مختلف یونٹوں سے مسلمان فوجیوں کو جمع کرکے شکر گڑھ سے

مورچے پر آگے بڑھایا۔ دونوں جانب سے اس زور سے "نعرۂ تکبیر" بلند ہوا کہ توپوں کی گرج اور ٹینکوں کی دھمک اس کے آگے ماند پڑ گئی۔ دونوں ہی نے اپنے اللہ کو آواز دی۔ بھارت کے مسلم جوانوں کا نعرۂ تکبیر زیادہ زوردار اور بھاری تھا۔ شکر گڑھ کا مورچہ ان کے سامنے ریت کے قلعے کی طرح بکھر گیا۔ اللہ نے فتح و نصرت بھارت کی طرف بھیجی کیونکہ بھارت حق پر تھا، پاکستان حملہ آور تھا۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، نہ ان کا ساتھ دیتا ہے۔ فوجی تاریخ کے اس ہوشرُبا کارنامے کا ذکر اس وقت کے وزیرِ دفاع بابو جگ جیون رام نے اپنی تقریروں میں جابجا کر کے مسلمانوں کو شاباشی دی تھی۔ ۱۹۷۶ء میں کلکتے کے راج بھون میں ایک گفتگو کے موقع پر جب ہم نے وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کو اس واقعہ کی یاد دلائی تو انھوں نے بھی تصدیق کی اور ہماری بات سے اتفاق کیا کہ مادرِ وطن کی حفاظت میں مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے تو وہ کسی بھی دشمن کے دانت کھٹے کر سکتے ہیں۔ مر مٹیں گے مگر نہ اپنے وطن عزیز پر آنچ آنے دیں گے، نہ اپنے اسلاف کے نام کو بٹّہ لگنے دیں گے۔

اور ابھی چند روز پہلے کی بات ہے۔ سرحد پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے اور دشمن کے طیاروں دل پر زن رہے تھے تو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے انڈین آرمی ایڈوانس مورچوں پر بڑھی۔ اس وقت انڈین آرمی میں کتنے ہی بریگیڈیر رحمان اور ٹینک شکن ویر عبدالحمید سر سے کفن باندھے تیار کھڑے تھے جن کی ماؤں اور بیویوں نے اپنے پیاروں کو یہ کہہ کر رخصت کیا تھا کہ پیٹھ دکھا کر منہ پر کالک نہ لگانا، جامِ شہادت پی کر خون سے لال وردی پہنے سرخرو آنا۔ سوامی جی سے ہم پوچھتے ہیں کہ یہ مسلمان جوان جب سرحد پر وطن عزیز کا دفاع کرنے کے لئے اپنا آخری قطرۂ خون بہاتے ہیں اور اُن کے جسموں کے چیتھڑے مشین گن کی گولیوں اور بموں سے اڑتے ہیں تو کیا وہ صرف اپنی مسجدیں بچانے جاتے ہیں؟ کیا وہ بھارت کے مندروں اور گرجوں کی حفاظت کے لئے اپنی جان نہیں دیتے؟ اور کیا اسی طرح ہمارے ہندو اور سکھ ویر صرف اپنے مندر اور گردوارے بچانے میدانِ جنگ میں جاتے ہیں؟ نہیں، یہ سب بھارت ماتا کے سپوت اس دیش کے ایک ایک درخت اور کنکر پتھر کی حفاظت کے لئے اپنی عزیز جان نچھاور کر دیتے ہیں۔

"کیا ہمارے جوان اسی لئے اپنی جان دیتے ہیں کہ اُن کے پیچھے کچھ جنونی لوگ اور اُن کو بھڑکانے والے مذہب کے ٹھیکیدار مندر، مسجد، گردوارے اور گرجے کو برباد کریں؟ اس جذبۂ ایثار و سرفروشی کی تمنا کو وہ لوگ کیا خاک سمجھیں گے جو دوسروں کی محنت پر پلتے اور مفت کی دودھ ملائی کھاتے ہیں۔ یہ سب بھارت کے اندرونی دشمن ہیں۔ اُن کے لئے تو ایک بابری مسجد کے نام پر کسی بابر کا آجانا ایک کھیل ہوا مگر بھارت کے جانبازوں کے لئے تو ایک قیامت سے کم نہیں۔ سوامی جی کو یہ کہہ کر ہم مایوس کئے دیتے ہیں کہ کوئی بابر باہر سے حملہ کرنے اور بابری مسجد واپس لینے نہیں آئے گا۔ سوامی جی بھلے ہی کسی بابر کو آواز دیتے رہیں مگر مسلمان کسی بابر کو نہیں بلائیں گے اور کوئی ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھے گا تو اس کی آنکھ نکال لیں گے۔ وطن کی محبت ہم جانتے ہیں۔ سوامی جی کیا جانیں جن کے من میں محبت کی جگہ نفرت کی بھٹی جل رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ بابری مسجد کو واپس لینے کوئی بابر باہر سے نہیں آسکتا۔ اسی بھارت سے ایک دن کوئی رام اُٹھے گا اور نئے راون کو مار کر اپنی ایودھیا میں انصاف کا بول بالا کرے گا۔"

(۱۸ فروری ۱۹۸۷ء)

ادا نشاد ۔ مارچ ۹۳ء

کشمیر کے مندروں کے ڈھانے کا سفید جھوٹ

انڈیا ٹوڈے کی تحقیقاتی رپورٹ

"اجودھیا سے متعلق شہری حقوق اور آزادی کی تنظیموں کی خاموشی کو دیکھئے! کیوں؟ اس لئے کہ یہ معاملہ ہندو مذہب سے متعلق ہے اگر یہ مسلمانوں کے مذہب سے متعلق ہوتا تو ان تنظیموں کا ردِ عمل مختلف ہوتا۔ وہ تمام سیاسی پارٹیاں جو مسجد کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں انھوں نے کشمیر میں توڑے جانے والے ۵۵ مندروں کے سلسلہ میں ایک لفظ تنقید کا نہیں کہا، کوئی اس بارے میں بات نہیں کرتا، یہ دوہرے معیار کیوں؟"

دہلی کے ایڈوانی (فروری ۱۹۹۱ء)

اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد منہدم کئے جانے کے چند روز بعد ایل کے ایڈوانی کا بیان

جھوٹ، جھوٹ اور صرف جھوٹ۔۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہندوتو کی چیمپئن طاقتوں نے مندر مسجد معاملہ میں دروغ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ مذہب کے توے پر روٹیاں سینکنے والوں نے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے لئے جھوٹ کو شعار بنا رکھا ہے۔ سب سے پہلے معروف انگریزی صحافی اور انڈین ایکسپریس کے سابق ایڈیٹر بی جارج ورگیز نے کشمیر میں مندر توڑے جانے کے آر ایس ایس لیڈروں کے جھوٹ کی پول کھول دی۔ ورگیز نے ۸ مئی اور ۱۱ جون کو انڈین ایکسپریس میں دو مضامین اس



"جب کشمیر میں ۵۵ مندروں کی بے حرمتی کی جارہی تھی تب کوئی آواز نہیں سنی یہ دوہرے معیار کیوں؟"

"کشمیر میں سیکڑوں مندروں کو تباہ کردیا کسی نے انگلی نہیں اٹھائی کیا ہندوؤں کے جذبات نہیں ہیں" (بی جے پی کے جنرل سکریٹری کیدارناتھ ساہنی کا بیان، ۳۰ جنوری ۱۹۹۳ء)

"کشمیر میں ۱۹۸۶ء میں ۴۴ مندروں کو نقصان پہنچایا گیا۔" (جموں میں واقع بی جے پی کے دفتر کا بیان)

دو برس قبل ایک سینئر آر ایس ایس لیڈر نے معروف صحافی بی جی ورگیز کو ۶۲ مندروں کی فہرست دی تھی جن کے متعلق آر ایس ایس کا دعویٰ یہ تھا کہ انہیں ۱۹۹۰ء میں کشمیری جنگجوؤں نے تباہ کردیا تھا۔۔۔۔۔۔۔

[illegible]

مندر کا نام	بی جے پی کا مبینہ دعویٰ	حقیقت کیا ہے
دشنامی اکھاڑا (سری نگر)	پوری طرح جلا دیا گیا	محفوظ
گنپت یار مندر (سری نگر)	نقصان پہنچا گیا	محفوظ
رگھوناتھ مندر (سری نگر)	جلا دیا گیا	اس وقت سری نگر میں تعمیر ہونے والی [illegible]
شو مندر (ہومر گر، جل)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
بنہان مندر (سری نگر)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
شو مندر (دار بشار، سری نگر)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
جے دیوی مندر (بیجبہاڑہ)	بے حرمتی کی گئی	محفوظ
وشیشور مندر (بیجبہاڑہ)	بری طرح نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
شو مندر (بیجبہاڑہ)	بری طرح نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
رگھوناتھ مندر (اننت ناگ)	نقصان پہنچایا گیا	محفوظ
گوتم ناگ مندر (اننت ناگ)	توڑ دیا گیا	محفوظ
دیال گام مندر (اننت ناگ)	پتھراؤ میں معمولی نقصان پہنچا	محفوظ
گنگا بھون اور سکی پورا	پوری طرح جلا دئے گئے	۱۹۸۹ میں نقصان [illegible]
اننت ناگ کے تین مندر		[illegible]
وانپوہ مندر (اننت ناگ)	۱۹۸۹ میں نقصان پہنچایا گیا [illegible]	
شیل پتھری مندر (بارہمولہ)	نقصان پہنچایا گیا	۱۹۹۰ میں نقصان پہنچا
کھیر ون ناتھ مندر (بارہمولہ)	نقصان پہنچایا گیا	۱۹۹۰ میں نقصان پہنچایا گیا
کھیر بھوانی مندر	نقصان پہنچایا گیا۔	محفوظ
رودا بھوانی مندر وسکور گندربل	جلا دیا گیا	محفوظ
کھیر بھوانی مندر گندربل	راکٹ سے نقصان پہنچا۔	محفوظ
شو مندر گندربل	جلا دیا گیا	محفوظ
مٹن مندر اننت ناگ	لوٹ کر جلا دیا گیا	محفوظ

سلسلہ میں لکھے گئے مضامین میں ایک کا عنوان "کہاں ہیں کشمیر میں توڑے گئے مندر" اور دوسرے کا عنوان تھا "لیجئے کشمیر میں مندروں کے توڑنے کے پروپیگنڈے کی حقیقت"۔

بی جے پی کا جھوٹ سفید سے سفید تر ہوتا چلا گیا ہندوؤں کے چیمپئن جس لیڈر کو دیکھئے مندروں کی تعداد کے متعلق الگ ہی راگ الاپ رہا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے ستر جھوٹ بولنے پڑتے ہیں لورتا ایس ایس اور ان کے ہم نوا اب یہی کر رہے ہیں معروف انگریزی جریدے انڈیا ٹوڈے کے ۲۸ فروری ۱۹۹۳ء کے شمارے میں اس کے نمائندے ہرنیندر باویجہ نے کشمیر میں مندروں کے توڑے جانے کے بی جے پی کے طومار باندھنے کی حقیقت بیان کی ہے۔ باویجہ کی قیادت میں انڈیا ٹوڈے کی تحقیقاتی ٹیم نے بی جے پی کے ذریعہ فراہم کردہ فہرست میں درج ۲۳ مندروں کا دورہ کیا وہاں کے پجاریوں سے باتیں کیں، ۲۳ مندروں کی حفاظت پر مامور بی ایس ایف کے جوانوں سے تصدیق کی دو تواتر سے، آس پاس کے رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں سے پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ بی جے پی کا پروپگنڈہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ بی جے پی کے بڑے بڑے لیڈر کہتے پھر رہے ہیں کہ اننت ناگ ضلع کے گاؤں دیال گام کے مندر کو پتھراؤ کرکے بری طرح نقصان پہنچایا گیا تھا اور دیال گام کے اکلوتے خاندان کے پنڈت سربراہ اور مندر کے پجاری بیشوناتھ گپتا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اس مندر کو آج تک کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یہ کہہ کر بیشوناتھ نے مندر کا دروازہ کھول کر دکھایا کہ وہ صحیح و سالم ہے۔ بیشوناتھ نے بتایا کہ ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۱ء کے عرصے میں جب جگموہن راج میں اضافہ ہوا تو گاؤں کے کئی پنڈت خاندان نقل مکانی کر گئے۔ مگر وہ نہیں گئے اور گاؤں کے مسلمانوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ یہیں رہیں اور مندر میں پوجا پاٹ کرتے رہیں۔ باویجہ کی رپورٹ کے مطابق بنیادی حقیقت یہ ہے کہ بارہمولہ کے شیل پتھر اور کھیرون مندر کو چھوڑ کر دوسرے تمام مندر پوری طرح محفوظ ہیں۔ جن کے متعلق بی جے پی آر ایس ایس اور اس کے چیلے چپاٹے کہتے پھر رہے ہیں کہ انہیں جلا دیا گیا انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا اور ان کی بے حرمتی کی گئی۔ بی جی ورکرز کا اپنے ایک مضمون میں کہنا ہے کہ وہ کشمیر کے کمشنر نے اننت ناگ بارہمولہ اور سری نگر کے ڈپٹی کمشنروں سے تحقیقات کرائی انھوں نے پجاریوں اور مندر کے درشن کے لئے آنے والوں سے بات چیت کر کے رپورٹ دی کہ جن مندروں کی فہرست میں تباہ شدہ اور خاکستر بتایا گیا ہے وہ تباہ ہوئے ہیں نہ انہیں جلایا گیا ہے نہ ہی نقصان ہوا ہے معاملہ کو وہ پروپگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ دوسرے کے مطابق وہ خود

ایک سرکاری گائیڈ کے ہمراہ سری نگر گئے اور کئی مندر دیکھے ان میں دو تو کشمیر کے بہت اہم اور معروف مندر ہیں لیکن یہ مندر جسے آر ایس ایس کی فہرست میں مسمار بتایا گیا ہے اور دوسرا دشنامی اکھاڑہ جہاں سے امرناتھ مندر کی یاترا شروع ہوتی ہے لیکن اس کے دھرم شالہ کے ساتھ جلا دیا گیا بتایا جاتا ہے۔ جب کہ پجاریوں، پنڈتوں اور درشن کرنے والوں کو کچھ پتہ نہیں۔ سی آر پی ایف کی ان چوکیوں کے جوانوں کو معلوم ہے متعلق کچھ معلوم ہے جو مندر کے احاطہ میں قائم ہے البتہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ سی آر پی ایف کی چوکیوں پر حملوں کے دوران مندروں کی دیواروں پر گولیاں ضرور لگی تھیں۔ حملے چوکیوں پر کئے گئے تھے نشانہ مندر نہیں تھے۔ کھیرت یار مندر کے پجاری موہن لال کہتے ہیں کہ دو سو برس قدیم اس ہنومان مندر میں آج تک پوجا پاٹ جاری ہے۔

ورگیز اور بادیجہ کے ذریعہ اپنی قلعی کھلتی دیکھنے کے بعد بی جے پی والے اب سابق وزیر مملکت داخلہ ایم ایم جیکب کے بیان کی آڑ لے رہے ہیں۔ جو انھوں نے پارلیمنٹ میں دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۱ء کے درمیان ۳۰۸ عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا گیا اب بی جے پی والوں کی ذہنیت ملاحظہ فرمائی جائے کہ کہا جا رہا ہے کہ ان ۳۰۸ عبادت گاہوں میں سے ۱۶ تو مسجدیں اور مسجدوں سے متعلق املاک ہیں اور یہ سب مسلم اکثریتی کشمیر میں تباہ کی گئی ہیں اور بقیہ ۳۲ دھرم شالائیں اور مندر ہیں۔ قلعی کھلتی دیکھ کر اڈوانی جیسے بی جے پی کے لیڈر بلبلا رہے ہیں۔ کشمیر میں متاثر ہونے والے مندروں کی بی جے پی کے ذریعہ بتائی گئی تعداد بالکل غلط ہے۔ کشمیر کے مندروں کا دورہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مندر تو صحیح سلامت ہیں مگر بی جے پی کے جھوٹ کی عمارت ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی ہے۔ مگر بی جے پی کو شرم آ گئے گی۔ ملاحظہ ہو بابری مسجد کے زیادہ تر بابری مسجد کو توڑنے کی کوشش کے دوران پولیس فائرنگ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد بھی بڑھا چڑھا کر بتائی گئی۔ اور یہ سب لوگ بعد میں زندہ سلامت پائے گئے تھے۔

ایل کے اڈوانی بی جے پی کے ایسے لیڈر ہیں جو کشمیر میں مندر توڑے جانے کا بار بار پروپیگنڈہ کرتے ہیں جولائی میں سیکولر انڈیا ٹوڈے [illegible] کے نامہ نگار نے کشمیر کا دورہ کرنے کے بعد ان سے فون پر بات چیت کی [illegible] کچھ اس طرح ہوئی۔

سوال: جو آپ مندر توڑے جانے کی بات کرتے ہیں تو وہ واقعات کس عرصہ میں رونما ہوئے تھے۔

ایل کے اڈوانی: ۱۹۸۶ء میں اننت ناگ اس وقت شروع ہوا تھا جب جی ایم شاہ وزیر اعلیٰ تھے اس سال سب سے زیادہ مندروں کو نقصان پہنچایا گیا تھا اور انہیں تباہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۹ سے ۱۹۹۱ء کے دوران بھی بہت سے مندر متاثر ہوئے تھے۔

سوال: کیا آپ کے پاس کوئی فہرست ہے؟

ایل کے اڈوانی: میرے پاس کوئی فہرست نہیں ہے لیکن بڑی تعداد میں مندر توڑے گئے۔

سوال: بی جے پی کے مختلف لوگ مختلف تعداد بیان کر رہے ہیں؟

ایل کے اڈوانی: دیکھئے میں قیاس آرائی نہیں کروں گا۔

سوال: لیکن یہ بہت سنگین الزام ہے؟

ایل کے اڈوانی: [illegible] میں قیاس آرائی نہیں کروں گا کیونکہ [illegible] اس طرح کا ہے جیسے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سابق وزیر مملکت داخلہ ایم ایم جیکب نے خود پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ کشمیر میں ۳۰۸ عبادت گاہیں متاثر ہوئی ہیں۔ [illegible] مندروں کی بات کی۔

سوال: اگر کوئی کشمیر جائے اور چیک کرنے کے بعد معلوم ہو کہ ان میں سے کسی مندر کو نقصان نہیں پہنچا تو آپ کا کیا موقف ہوگا؟

ایل کے اڈوانی: کیا یہ تعداد کے کم یا زیادہ ہونے کا معاملہ ہے؟ میری شکایت [illegible] ہے۔ ایک شخص بابری مسجد کو گرائے جانے پر ہونے والے رد عمل کو [illegible]۔

سوال: لیکن۔

ایل کے اڈوانی: میرے پاس اب زیادہ کچھ کہنے کے لئے نہیں ہے میں اس قسم کی بات چیت جاری نہیں رکھ سکتا۔

”نئی دنیا“ مارچ ۱۹۹۳ء

مسٹر اڈوانی کے نام ایک خط،

ایک خط جو دو خطوط کا مجموعہ ہے، پہلے خط میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اور مذہبی، نسلی، لسانی اور تاریخی تعصبات کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہوئے "عوام" معصوم ہیں، "سرمایہ داروں" کے بہکاوے میں آ گئے ہیں جبکہ دوسرا اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑی ہوئی دو ہندوستانی لڑکیوں کا مسٹر اڈوانی کے نام کھلا خط ہے جو ہندوستانی ہفت روزہ "اسٹیٹسمین" میں شائع ہوا

پیاری زاہدہ!

آج نہیں بلکہ ابھی "روشن خیال" ملا اور تنہائی میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ ہر شمارہ پہلے شمارے پر سبقت لے جاتا ہے بلکہ اس بار آپ کے اداریئے "وحشت خیال" نے مجھے مجبور کر دیا۔ پہلے تو میں آپ کی زبان، آپ کے لہجے، تاریخی اور سیاسی شعور سے متاثر ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ کے پس منظر کو فراموش کر کے ہم تاریک راہوں میں کھو جاتے ہیں اور اپنی منزل سے بھٹک جاتے ہیں۔ آپ نے جس طرح تاریخ کے اوراق سے انسان کے مظالم اور اس کی جفا کاریوں کو نکال کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے دل لرز جاتا ہے اور ہم شرم سے سر جھکا لیتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں جو خطرے ہیں، جن کا خوف ہے، جن جذبات کا سیلاب آپ کے دل میں امنڈ رہا ہے شاید اسی نے "زاہدہ حنا" کے پیراگراف دیئے ہیں۔ ورنہ آپ یہ سوال کبھی نہ کرتیں کہ "کیا ہم اتنے منافق ہو چکے ہیں کہ ایک جانب کے عوام کے لئے دوسری جانب کے عوام کا خون جائز قرار دے دیں؟ بیسویں صدی کے اختتام پر یہ وہ بنیادی سوال ہے جو وقت نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ہم جو عوام میں سے ہیں، جنہوں نے ہمیشہ عوام کی اخلاقی عظمت کے قصیدے تصنیف کئے ہیں، ہم اس سوال کے مقابل ہیں اور جواب کا ہمیں یارا نہیں"

آپ "ہر دامن داغدار" اور ہر گروہ کے ہاتھ "خون آلود" دیکھ رہی ہیں۔ زاہدہ اپنے اس خط کے جواز کے لئے میں اپنے کرب کا اظہار غالب کا شعر دہرا کر کروں گی۔

کہیو غالب! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میرے اور میرے ہم خیال دوستوں کے دل میں بھی یہی درد اٹھا ہے۔ ہم نے بھی تنہائیوں میں آنسو بہائے ہیں لیکن ہم اس درد کی تپش کو اپنے اوپر طاری ہو جانے دیں تو ہم ہی نہیں ہمارا سارا گروہ جو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے اس اندھیرے میں بھٹک جائے گا۔ مارا جائے گا۔ ہم اپنے "دشمن" کو کھو دیں گے۔

میرے سامنے سب سے بڑا گروہ تو ساری دنیا کی عورتوں کا ہے۔ جس میں ہم دونوں بھی شامل ہیں۔ ہماری تعداد نصف سے زیادہ ہے۔ ہم نے تو "سروں کے مینار" نہیں بنائے۔ ہم نے "مال غنیمت نہیں سمیٹا"۔ ہمارے ہی کانوں اور گلے کے زیور نوچے گئے۔ ہماری ہی کوکھ جلائی گئی۔ ہم نے ہی آنسو بہائے۔ ہماری ہی بے حرمتی ہوئی اور ہو رہی ہے۔ زاہدہ! ہمارا دامن کیسے داغدار ہے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ظلم نہیں کر سکتے لیکن قانون بھی "امکان" پر کسی کو مجرم قرار نہیں دے سکتا۔ اب تک تو اس گروہ کا

دامن داغدار نہیں ہے۔ اگر عورتیں نا کردہ گناہوں کی ذمہ داری لے لیں تو ان کے بوجھ سے وہ دب جائیں گی۔ ہم پر اس "مندر" سیاست دانوں اور حکمرانوں کے جرم کی ذمہ داری نہیں ہے۔

آپ نے لکھا ہے "پہلے شاہ بت شکن ہوتے تھے اب گرا مسجد و مندر اور کلیسا و حرم شکن ہیں" یہ الفاظ زاہدہ حنا کے نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے جو ہندو ہیں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں۔ یہ اس کا اشارہ ان "کیسری" رنگ کے لباس میں ملبوس کرائے پر حاصل کئے گئے "عوام" سے ہے جن کو گمراہ کر کے ہمیشہ آگے بڑھا جاتا ہے کیونکہ ان کی جانوں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ان کو اسی لئے جاہل رکھا جاتا ہے کہ جب اور جس طرح کی ضرورت ہو انہیں استعمال کیا جائے۔ ان کو مذہب کا ذہنی نشہ پلایا جاتا ہے جسے مارکس نے "عوام کی افیون" کہا ہے۔ انہیں کے لئے Lumpen Proletariat کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

سیکولرازم یا مذہبی رواداری کے تحفظ کے جوش میں ہم ان سرمایہ دار طاقتوں کو فراموش نہیں کر سکتے جو مذہبی تعصب کو بھڑکا کر اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ بابری مسجد کے فسادات کا ایک یہ بھی رخ تھا کہ وہ بستیاں جہاں غریب مسلمان رہ رہے تھے اس لئے بھی جلائی گئیں کہ انہیں حاصل کر کے اس زمین پر اونچے متوسط طبقے اور امیروں کے لئے فلیٹ اور شاندار مکانات بنا کر ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ اور بھی سرمایہ جمع کر سکے۔ میرے سامنے ان "عوام" کی قراضی اور قربانیوں کی وہ مثالیں بھی ہیں جو ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان عوام میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں۔

لیکن میں آپ ان "روشن خیال" نوجوانوں اور بچوں کو بھی تحفہ پیش کرتی ہیں جن کے دامن بے داغ ہیں اور جن کے ہاتھ پاک ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ یہ ہمیشہ ہی معصوم اور بے گناہ رہیں گے لیکن ان کے مستقبل کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ہم انہیں تاریخ کے جھنجھلاتے حصے نہیں دے سکتے لیکن "روشن خیال" تو دے سکتے ہیں۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ اور اونچے آدرش تو دے سکتے ہیں۔ آج جب ہم بیسویں صدی کے اختتام پر کھڑے ہیں ہم اپنے آپ سے اور ان سے یہی عہد کر سکتے ہیں کہ ان کے آدرشوں کی لو بجھنے نہیں دیں گے۔ کچھ اسی قسم کی وہ آدرش والی لڑکیوں کے خط کا ترجمہ آپ کو "روشن خیال" میں شائع کرنے کے لئے بھیج رہی ہوں۔

بابری مسجد کے واقعے کے بعد ۲۱ دسمبر کو Statesman اخبار کے ایڈیٹر سی آر ایرانی کے خط کے ساتھ ساتھ یہ خط شائع کیا گیا۔ میرا خیال ہے مسٹر ایرانی اور اندرجیت گپتا (جن کا انٹرویو آپ نے شائع کیا ہے) اسی گروہ کے ساتھ ہیں جس کی قیادت ——— جیت رہے۔ ٹیگور اور فیض احمد فیض نے کی ہے وہ خود بھی تو کر گئے ہیں۔

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

فیروزہ مکرجی

Statesman Weekly
19. 12. 1992

۱۲ دسمبر کی صبح ایک کھلا خط جو مسٹر اڈوانی کے نام ہے ایک کم عمر خاتون میرے مکان پر آکر دے گئیں۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر نہیں کی لیکن میرا فون نمبر لے گئیں۔ یہ خط طالب علموں کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ان کے دل کی آواز ہے ہم اسے بغیر کسی ترمیم و اضافے کے شائع کر رہے ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ ہمارے قارئین کا پہلا خط ہے جو "اسٹیٹسمین" کے پہلے صفحے پر شائع کیا جا رہا ہے۔

ست ... !! یہ ہندوستان کے مستقبل کی آواز ہے

ان لڑکیوں کے خط کے متن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

سی۔ آر۔ ایرانی۔

ڈیئر مسٹر اڈوانی

——— شکریہ آپ کی اور آپ کے رفقا کی مہربانی سے آج کوئی بھی ہندو اپنا سر اونچا کر کے نہیں کھڑا ہو سکتا کیونکہ آپ نے ہندو مذہب کی روح کو ہی برباد کر دیا مسٹر اڈوانی جب آپ نے کپڑوں میں ملبوس کٹر متعصب لوگوں کو بابری مسجد کے گنبد پر کھڑے ہوئے دیکھا تو آپ کو کیا محسوس ہوا۔ خوشی؟ فتح؟ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ "ہندوستان" نے محسوس کیا۔ شرم، بے عزتی اور انتہائی بے آبروئی بھگوان کے لئے بتائیے تو سہی کہ ۴۰۰ برس پرانی تاریخی عمارت ڈھا کر آپ کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟ کیا آپ کے بیمار ذہن کے لئے یہ کوئی مذاق تھا کہ آپ نے اس ملک میں امن اور صلح پسندی سے زندگی گزارنے کی صدیوں پرانی روایات کی "علامت" کو فرقہ پرستی اور شر کے عفریت کا نوالہ بنا دیا۔ کیا کبھی ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ہمسائے میں اپنے مندروں اور مسجدوں میں عبادت نہیں کی؟ کیا ان دونوں کو اس طرح جدا کرنا ضروری تھا؟ اگر وہ رام کی پیدائش کی جگہ بھی تھی، اگر ایک ہزار سال پہلے وہاں کوئی مندر بھی تھا اور خود ایودھیا کے باسیوں نے اس معاملے کو درگزر کیا تو آپ کیوں نہیں کر سکتے تھے؟۔ آپ کے ہندو ازم کے نعرے سے گندی سیاست کی بو آتی ہے۔ کیا آپ ان سینکڑوں ہندوستانیوں، پاکستانیوں اور بنگلہ دیشیوں کی اخلاقی ذمہ داری لے سکتے ہیں جو مارے جا رہے ہیں یا بستیوں میں بھوکے مر

رہے ہیں۔ آپ کا یہ عمل قتل عام سے بڑا
سے کم نہیں تھا
آپ نے کس کے لئے مسجد کو گرایا؟ ایک
عام ہندوستانی کے لئے نہیں جس میں ہندو
مسلمان دونوں ہی شامل ہیں اور جو امن و
آشتی سے رہ رہے ہیں۔ ان ۸۰۰ ملین
ہندوستانیوں کو آپ کون سی اخلاقی قدریں
دیں گے؟۔ یقیناً امن و صلح پسندی کی قدریں
نہیں جن کا حامل ہندو مذہب ہے۔ آپ کی
تنگ نظری اور تعصبات سے ہمیں گھن آتی ہے
طالب علموں کے لئے آپ کو معاف
کرنا بہت دشوار ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم ایک
ایسے ملک کے شہری ہیں جس کا آئین
سیکولرزم، جمہوریت اور مذہبی رواداری کا حامل
ہے۔ جی ہاں۔ مذہبی رواداری، جس پر
ہماری بقا کا بھی انحصار ہے۔ ہمارے آئین کی
توہین کرکے آپ نے ہمارے ملک کے ہر
باعزت شہری کی شخصیت کو مجروح کیا ہے
آپ کہتے ہیں کشمیر میں ۵۰ مندر گرائے
گئے مگر ہندو سیاست داں ہوتے ہوئے آپ
کشمیر اور ہندوستان کے سیاسی حالات میں فرق
نہیں دیکھ سکتے
یہ وہ دور ہے جب ہم اکیسویں صدی
کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے
ہمیں پچاس سال پیچھے کر دیا۔ ہمارا ملک طرح
طرح کے مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔ یہ وہ
وقت ہے جب ہر شہری کو ملک کے ان مسائل
کو حل کرنے کے لئے توجہ دینا ہے۔ آپ
نے یہ کوشش کی کہ نفرت آمیز مذہبی
تعصبات کو ملک کی سیاست میں شامل کر دیا اور
آپ خود کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ اس سے بھی
مذہبی ہو سکتے ہیں۔
آپ سے یہ بات کہنے کی اب حال
سے لئے ہمارے مستقبل کو برباد کر دیا۔ ہم
ہندوستان کا مستقبل ہیں۔ ہم بابری مسجد کو
برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کو کیا حق تھا کہ
ہمارے مستقبل کے خوابوں کو برباد کر
دیں؟۔ آپ کو کس نے اجازت دی تھی؟۔
کس نے حق دیا تھا کہ ان کروڑوں روشن
خیال انسانوں کے آدرشوں کو چکنا چور کر دیں
جو ہندوستان کی تقدیر کے معمار ہیں۔
کیا آپ ہمیں جواب دے سکتے ہیں؟۔
ورشا نکانش
پونم بدھک

رابعہ! میرا خیال ہے اس خط پر تبصرہ
کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ
ہندوستان کے روشن ضمیر اور دانشور طبقے کے
جذبات اور ان کی دیانت داری کا مظہر ہے۔
آپ کی
[illegible]
●●

"روشن خیال" (۴)

راجیو سکسینہ

رام جنم بھومی اور تلسی داس

یہ ممکن نہ تھا کہ رام مندر ڈھا کر بابری مسجد بنائی گئی ہوتی اور 'رامائن' لکھنے والے تلسی داس، مغلِ اعظم مہابلی اکبر سے اِس ظلم پر احتجاج نہ کرتے

[illegible] بات کرنے والے اس مسئلے کا تدارک ... کی سیڑھی بنا رہے ہیں

جہاں کوئی سنت تلسی اس نے ہی رام کی داستان کو مقبول کیا۔ ہر سال دسہرے پر گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے میں رام لیلا ہوتی ہے تو اس کا سرا بجا طور پر سنت تلسی داس کے سر بندھتا ہے۔

خاندان میں کوئی تقریب ہو تو رام کتھا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ایک طرح سے سنت تلسی داس کی تخلیق رام چرت مانس کو ہندو گھرانوں میں وہی مقام حاصل ہو گیا ہے جو قرآن شریف کو مسلمانوں اور بائبل کو عیسائیوں میں حاصل

رام چرت مانس کو اتنی زبردست مقبولیت حاصل ہوئی کہ سنت تلسی داس کی دیگر تخلیقات پس پردہ چلی گئیں۔ آج سنت تلسی داس کو صرف ایک مذہبی شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کی دیگر تخلیقات ونے پتریکا، کوتاولی، دوہاولی اور گیتاولی کے موضوعات، رام چرت مانس کے موضوع سے قطعی مختلف ہیں۔ کسی میں انہوں نے بنارس میں وبا کے پھیلنے اور زبردست بیروزگاری کا شکوہ کیا ہے تو کسی میں خود گٹھیا کے مرض سے پیدا ہونے والے کرب کا اظہار کیا ہے۔ ایک نظم تو ان برہمنوں کے ظلم پر ہے جنہوں نے سنت تلسی داس کے متعلق فتویٰ دے دیا تھا کہ وہ برہمن نہیں۔ بلکہ مخلوط ذات کے ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کی زیادہ تر نظموں پر رام سے عقیدت کا رنگ غالب ہے۔ تمام ادبی ناقدین مانتے ہیں کہ اپنی دیگر نظموں میں جس طرح سے سنت تلسی داس نے عصری موضوعات کو اپنایا ہے اس کے پیش نظر ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ رام مندر کے انہدام پر کوئی نظم نہ لکھتے اگر واقعی کوئی رام مندر منہدم کیا گیا ہوتا۔ کیونکہ رام مندر کا انہدام ان کے لئے گٹھیا کے مرض کے درد سے زیادہ کربناک ہوتا۔

تلسی داس نے رام مندر کے انہدام کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تو اس کا دفاع "تلسی داس" کے ایک "ہمدرد" نے اس دلیل کے ساتھ کیا ہے

"بھگوان رام کے مندر کا انہدام ان کے لئے (سنت تلسی داس کے لئے) یادگار واقعہ نہیں بلکہ ایک برے خواب کی طرح رہا ہوگا۔ جسے انہوں نے اپنی یادداشت سے خارج کر دیا ہوگا۔" تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بنارس میں وبا کا پھیلنا اور گٹھیا کے درد سے کراہنا "یادگار واقعات" تھے۔ جن پر نظمیں لکھی جا سکتی ہیں؟ اور کیا کاشی کے برہمنوں کا ہتک آمیز رویہ اس عظیم شاعر کے لئے "یادگار واقعہ" تھا؟ رام مندر کا اگر واقعی انہدام ہوتا اور وہ "برا خواب" ہوتا تو اس کے مقابلہ میں یہ تو بہت چھوٹے موٹے واقعات ہیں۔ یہ ایسا سنگین جرم ہوتا جسے سنت تلسی داس کبھی فراموش نہیں کر پاتے۔ اس کے مجرموں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔

دراصل سنت تلسی داس کی جانب سے سوال پیش کرنے والوں میں اتنی جرات نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دیں کہ سنت تلسی داس، مغلوں کے مظالم سے ڈر گئے تھے اس لئے

انہوں نے اس واقعہ پر کوئی نظم نہیں کہی۔ ویسے ہم یاد دلا دیں کہ بھگتی فرقوں کے سنت صوفی بنیادی طور پر باغی ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے اصولوں کے تحفظ پر اصرار کرتے تھے اور اس کے لئے جان دینے کو بھی تیار رہتے تھے۔ اسی بے باکی اور بے خوفی کی وجہ سے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔

جب اکبر دہلی میں تخت نشیں ہوئے، اس وقت تک ایک عظیم سنت اور شاعر کی حیثیت سے تلسی داس مقبول ہو چکے تھے۔ اکبر انہیں اپنے نورتنوں میں شامل ہونے کی دعوت دیتے رہے۔ اکبر نے انہیں اپنے درباریوں میں شامل کرنے کی باقاعدہ پیش کش کی تو دوسرے تمام خوددار سنتوں کی طرح سنت تلسی داس نے بھی یہ پیش کش ٹھکرا دی اور جواب میں ایک دوہا لکھ کر بھیج دیا کہ جب میں بھگوان رام کے دربار میں شامل ہو گیا تو پھر کسی انسان کے دربار میں منصب دار کیسے بن سکتا ہوں۔ اکبر اعظم اگر اس ہتک کو برداشت کر سکے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک عوامی مقبولیت کے حامی سنت نے یہ ہتک کی تھی۔

ایک غلط فہمی یہ پھیلائی جا رہی ہے کہ بابری مسجد کے باہر مگر اس کے احاطہ ہی میں تعمیر رام چبوترہ کی تعمیر، سنت تلسی داس کی خواہش پر، اکبر کے حکم سے کی گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اکبر کے دربار میں سنت تلسی داس کی بہت عزت تھی، مگر ان کے دور میں یہ چبوترہ تعمیر نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چبوترہ ڈیڑھ سو برس قبل تعمیر ہوا۔ اور تازہ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اس چبوترے کی تعمیر پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے قائدین مولوی امیر علی اور سنت رام چرن داس نے، اپنے فوجیوں کی سہولت کے لئے کرا دی تھی۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ اکبر کے دربار میں سنت تلسی داس کی بڑی عزت تھی۔ رتنوں میں سے ایک عبدالرحیم خانخاناں، سنت تلسی داس کے گہرے دوست تھے۔ خانخاناں خود ایک بڑے شاعر تھے۔ وہ اودھ کے کسانوں میں بہت مقبول تھے۔ آج بھی عام کسان، عام دیہاتی ان کے دوہوں کو محاوروں اور کہاوتوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض دوہے، خانخاناں اور تلسی داس کی مشترکہ تخلیق ہیں۔ ایک مصرعہ ایک دوست کا ہے تو دوسرا دوسرے دوست کا۔

اکبر اعظم کے وزیر خزانہ ٹوڈر مل، بھی سنت تلسی داس کی بہت عزت کرتے تھے۔ انہوں نے بنارس میں ہنومان مندر کی تعمیر کے لئے تلسی داس کو زمین دان کی تھی۔

یہ بالکل سچ ہے کہ اگر تلسی داس نے اکبر سے شکایت کی ہوتی کہ ان کے دادا، بابر نے کسی رام مندر کو توڑ کر اپنے نام سے مسجد تعمیر کروائی ہے تو اکبر اس مسجد کو توڑ کر اس کی جگہ پھر سے مندر کی تعمیر کا حکم دیتے۔ کیونکہ ایسی عمارت خود بابر کی پالیسی سے انحراف کی علامت ہوتی۔ بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کی تھی کہ وہ رعایا، جو مسلمان نہیں ہے، کے مذہب اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام کرے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ ٹوڈر مل نے جو زمین تلسی داس کو دان کی تھی اس پر سنت تلسی داس نے رام مندر نہیں بلکہ ہنومان مندر ہی تعمیر کروایا۔ ایودھیا میں ہنومان گڑھی کے بارے میں بھی ایسی ہی روایت ہے۔ مندر کے موجودہ مہنت نے راقم الحروف کو بتایا کہ ہنومان گڑھی میں مندر کی تعمیر ۱۷۵۴ء میں نواب منصور علی نے کروائی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ اس جگہ پہلے ایک مسجد تھی۔ جو نواب صفدر جنگ کے دور تک کھنڈر ہو گئی تھی۔ نواب کو مغل بادشاہ نے دہلی طلب کر لیا تھا۔ جب وہ الہ آباد پہنچ گئے تو انہوں نے نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے خاندان ایک والے کو سونپ دی۔ اس وقت اس علاقہ میں ایک صوفی، سنت کا بڑا چرچا تھا۔ گوسوامی پنتھ کے ایک ہندو سنت نے اس سے پناہ مانگی۔ صوفی سنت نے پناہ دے دی۔ کچھ عرصہ بعد صوفی سنت چل بسے۔ گوسوامی نے دیوان ٹِکَیت رائے سے درخواست کی کہ وہ زمین انہیں مندر کی تعمیر کے لئے دے دی جائے۔ گوسوامی نے بھی اس وقت کے رواج کے مطابق ہنومان مندر ہی بنوایا۔ اسی دوران بیراگی پنتھ کے سادھوؤں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ایک گوسوامی ہنومان مندر بنوا رہا ہے، جب کہ یہ صرف بیراگیوں کا حق ہے۔ بیراگیوں نے حملہ کر کے اس قطعہ زمین پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں نواب منصور علی کی مدد سے بیراگیوں نے قلعہ کی طرز کا مندر تعمیر کیا۔

یہ بات نوٹ کرنی چاہئے کہ شمالی ہندوستان میں رام مندر کی تعمیر کی نہیں، بلکہ ہنومان مندر کی تعمیر کی عام روایت ہے۔ ایودھیا میں کئی ہنومان مندر ہیں۔ رام مندروں میں ننھے رام یا بچے رام کی مورتیاں ہیں۔ مگر ہنومان مندروں میں کم سے کم قد آدم یا اس سے بڑی مورتیاں ہیں۔ عام طور سے انہیں ہی سنکٹ موچن کہا جاتا ہے اور ان سے ہی اکھاڑے منسوب ہوتے ہیں۔ جہاں نوجوان کسرت کرتے ہیں۔

سچائی تو یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں اصل بھگوان، شو ہیں۔ شمالی ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی گاؤں ہو، جس میں شو مندر نہ ہو۔ جب تلسی داس نے دیکھا کہ ایودھیا میں بھی شو کا ہی بول بالا ہے تو انہوں نے رام کے کردار کو مقبول کرنے کے لئے ایک ترکیب سوچی۔ رام چرت مانس میں شو اپنی پتنی پاروتی کو رام کتھا سناتے ہیں۔ اس طرح سے سنت تلسی داس نے شو کے ماننے والوں کی نظر میں بھی رام کو قابل عبادت بنا دیا۔

تلسی داس نے ادویت پنتھ (وحدانی فلسفہ کے ماننے والے) سمیت، سبھی پنتھوں کے ماننے والوں کی عزت کی۔ ادویت وادی بھی سنت تلسی داس جیسے دویت وادی (ذو وجودی فلسفہ کے ماننے والے) کے نظریاتی گہرائی

ـ۔ اُ ۔ واقعی رام مندر منہدم کیا گیا ہوتا تو ں داس کے دل میں بھی کسی حد تک نفرت یا ۔ ضرور ہوتا۔ مگر انہوں نے کہیں بھی اس کا ۔۔ نہیں کیا ہے۔

اس کے برخلاف انہوں نے اسلام کے تی سے احترام اور اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ ـب کالی داس کے ... یں نے تلسی داس کو جولاہا ہ کر ان کا مذاق اڑایا تو تلسی داس نے دوہے ں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ۔ مجھے کسی ی بیٹی ذات سے وابستہ کرو۔ میں بیاہ نہیں اوں گا۔ کیونکہ نہ تو میرا کوئی بیٹا ہے جسے کسی ی بیٹی سے بیاہ کر کسی کی ذات خراب کرنا ہے مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے ۔ میں بھوک لگے گی تو بھیک مانگ کر کھالوں گا اور رات مسجد میں سو جاؤں گا۔ تلسی داس جی کے لفظوں میں

دھوت کہو، او دھوت کہو
راجپوت کہو، جولاہا کہو کوئی
کاہو کی بیٹی سے بیٹا نہ بیاہو
کاہو کی جات بگاڑے نہ کوئی
مانگ کے کھیبو مسیت میں سوئبو
لیبے کو ایک نہ دیبے کو دوئی

اگر اسلام سے انہیں ذرہ برابر نفرت ہوتی تو اپنے دور کے دوسرے بے گھروں کی طرح مسجد میں رات گزارنے کی بات وہ کبھی نہ کرتے۔ یاد رہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کو مندروں میں رات گزارنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ مگر فیصلہ پناہ مانگنے والے کی ذات کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ جب کہ مسجد میں کوئی بھی مسافر رات گزار سکتا تھا۔

اگر آج کچھ لیڈر تلسی داس کی وقعت کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں رام مندر کے انہدام کی بات نہ کر کے ان کا سیاسی لوزلر بنانا پسند نہیں کیا۔ تلسی داس رام کے سچے بھگت تھے اور ان کی "آستھا" (عقیدہ) کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں تھی۔ جبکہ آج جو لوگ "آستھا" کی بات کر رہے ہیں وہ اسے اقتدار پر قبضہ کی سیڑھی بنانا چاہتے ہیں۔ ■

"روشن خیال" ا (۴)

بابری مسجد تنازعہ ـــــ ایک تاریخی تجزیہ

پرویز حفیظ 105/3D کڑایہ روڈ کلکتہ-700017

یکم فروری ۱۹۸۶ء کو بابری مسجد کے گیٹ کا تالا کھولنے کا حکم جاری کرتے وقت فیض آباد کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر کے ایم پانڈے نے طنزیہ لہجہ میں کہا تھا۔

"گزشتہ ۳۵ برسوں سے ہندو محدود طور پر ہی سہی (اندر رکھی ہوئی) ان مورتیوں کی پوجا کر رہے ہیں تو آج اگر دروازے کے تالے کھول دیئے جائیں گے تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا"

۶ دسمبر ۹۲ء کو ایودھیا میں بابری مسجد کو زمین بوس کرنے کے بعد ہندو فسطائی طاقتوں نے جج پانڈے کے متکبرانہ فیصلہ کو بالکل جھٹلا کر رکھ دیا ہے۔ گزشتہ دو ماہ میں پورے ملک کی جو حالت ہوئی ہے وہ آسمان ٹوٹ پڑنے سے کیا کم ہے۔ اس واقعہ کے سو برس قبل ۱۸۸۵ء میں اجودھیا کے مہنتوں نے بابری مسجد کے مقابل بنے رام چبوترے پر ایک مندر تعمیر کرنے کے لئے عدالت سے اجازت مانگی تھی لیکن اس وقت کے جج نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا کہ اس سے خون خرابہ اور دنگے فساد کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اس انصاف پسند جج کا نام تھا پنڈت ہری کشن۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف تک بابری مسجد کسی تنازعہ کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ عیار برطانوی حکومت نے اودھ کو ہتھیانے کے لئے ہندو مسلم عوام میں نفرت کی خلیج پیدا کرنے کے لئے تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ اجودھیا ہندوؤں کے لئے عقیدت کا مقام رہا ہے اس لئے چند شر پسند برطانوی مورخین کے بہکاوے میں آکر بابری مسجد کے قریب واقع ہنومان گڑھی کے مہنتوں نے جنہیں بیراگی کہا جاتا تھا اچانک ۱۸۵۳ء میں بابری مسجد کی زمین کو رام جنم استھان کہنا شروع کر دیا اور یہ غلط پروپیگنڈہ شروع کیا گیا کہ بابر نے ایک عظیم رام مندر کو توڑ کر یہ مسجد بنوائی تھی۔ یہ بات بھی قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ اس وقت تک اس مظلوم مسجد کو جامع مسجد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ۱۸۵۳ء میں حملہ کرکے ایک دن بیراگیوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا۔ دریں اثنا ایک مہنت باغی ہوکر لکھنؤ جا پہنچا اس نے وہاں جاکر اسلام قبول کر لیا اور یہ خبر پھیلا دی کہ ہندوؤں نے بابری مسجد کو مسمار کر دیا ہے۔ اس زمانے میں مولوی امیر علی نام کے ایک بزرگ لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ مہنت کی زبانی بابری مسجد کی بے حرمتی کی سن کر وہ جلال میں آگئے۔ انہوں نے جہاد کا اعلان کر دیا اور ہزاروں افراد کے ہمراہ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے اجودھیا کوچ کر گئے۔ نواب واجد علی شاہ کو جب اس کی خبر ملی تو اس نے برطانوی ریزیڈنٹ سے مدد طلب کی۔ بالآخر کرنل بارلو کی قیادت میں برٹش فوج' رام پور کے راستے لیبے رام بالی اندزاب کے ملازم ٹھاکر سنگھ کے سپاہیوں نے شجاع گنج قصبہ کے پاس مولوی امیر علی اور ان کے ساتھیوں کو گھیر لیا کافی خون ریزی ہوئی دونوں فریقوں کو کافی ہلاکتیں اٹھانا پڑیں۔ مولوی امیر علی کو بہ حالت نماز قتل کر دیا گیا اور ان کا سر نواب واجد علی شاہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ اپنی شہادت کے بعد مولوی علی کی مقبولیت بے حد بڑھ گئی۔ علاقے اور دور دراز کے لوگ

ان کی عقیدت سے سرشار ہو گئے۔ ضلع بارہ بنکی کے رحیم گنج قصبہ میں ان کی یاد میں سالانہ عرس ہونے لگا عوام ان کی درگاہ کی زیارت کے لئے جوق در جوق آنے لگے۔

ادھر اجودھیا میں مسجد بدستور مہنتوں کے زیر قبضہ تھی۔ ۱۸۵۵ء میں ایک بار پھر مسلمانوں نے حملہ کر کے مسجد حاصل کر لی اور مہنتوں اور بیراگیوں کے قدم اکھاڑ دیے لیکن پھر ایک دن بیراگیوں نے کئی ہزار ہندوؤں کے ساتھ مسجد پر یلغار کی مسلمانوں نے سخت مزاحمت کے بعد مسجد بچالی لیکن اس کوشش میں ۷۵ افراد شہید ہو گئے۔ ان شہداء کا اسی جگہ دفن کر دیا گیا جہاں انہوں نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ آج وہ مقام "گنج شہیداں" کہلاتا ہے۔

بار بار کے خوں ریز فسادات نے دونوں فرقوں کو پریشان کر رکھا تھا ادھر نواب واجد علی شاہ بھی ان واقعات سے عاجز ہو گئے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے دانشمند بزرگوں نے سلطنت کے نمائندے اور برطانوی ریزیڈنٹ کے سامنے ایک میٹنگ میں فیصلہ کیا کہ دونوں فرقوں کے افراد وہاں عبادت کریں گے۔ مسجد بدستور مسلمانوں کی عبادت گاہ کے طور پر استعمال کی جائے گی اور ہندو بھائی مسجد کے سامنے والی زمین پر جسے وہ مقدس سمجھتے ہیں پوجا پاٹ کریں گے۔ تین سال بعد برطانوی حکومت نے مسجد اور ہندوؤں کے پوجا کے مقام کے درمیان آہنی باڑ لگا دی اور ہندوؤں کو ایک چبوترہ بنانے کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں کو مشرقی دروازے سے مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا اور اس کی بجائے شمالی دروازہ استعمال کرنے کو کہا گیا۔ اس طرح حالات قدرے پرسکون ہو گئے اور دونوں قوم کے لوگ اس متنازعہ جگہ میں برسوں تک پوجا پاٹ اور نماز ادا کرتے رہے۔ ایک بار ۱۹۳۴ء میں کچھ مقامی ہندوؤں نے گئو کشی کے ایک واقعہ کو بہانہ بنا کر مسجد پر حملہ کر دیا تھا اور دو گنبد بھی ڈھا دیئے گئے تھے لیکن برطانوی پولیس نے نہ صرف یہ کہ اس امر کے بعد مجرموں کو گرفتار کر لیا تھا بلکہ اس کے بعد جرمانہ عائد کر کے خود برطانوی حکومت نے مسجد کی مرمت کروائی تھی۔

۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی ایک سرد رات میں چند افراد مسجد کے اندر داخل ہو کر مورتی نصب کرنے میں کامیاب ہو گئے اور دوسری صبح اجودھیا کے ہندوؤں نے یہ اعلان کر دیا کہ مسجد کے اندر بھگوان رام "پرکٹ" ہوئے ہیں۔ انصاف اور سچائی کا خون کرتے ہوئے ضلع مجسٹریٹ نے مسجد کے امام صاحب کو فوراً مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس پورے واقعے کو اجودھیا تھانے میں سب انسپکٹر رام دوبے نے اس طرح F.I.R کی صورت میں درج کیا:

"ماتا پرشاد کے الفاظ میں (جو مسجد کی نگرانی پر تعینات تھا) جب میں صبح آٹھ بجے جنم بھومی پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ پچاس ساٹھ افراد مسجد کے کمپاؤنڈ کے گیٹ کا تالہ توڑ کر سیڑھی کی مدد سے مسجد کی دیوار پھلانگ کر مسجد کے اندر داخل ہوئے اور شری بھگوان کی مورتی مسجد کے اندر نصب کر دی اور زعفرانی رنگ سے اندرونی اور بیرونی دیواروں پر سیتا رام لکھ دیا۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود سپاہی ہنس راج نے انہیں وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا مگر وہ نہ مانے۔ ضلع انتظامیہ کے افسران دوسرے دن محل وقوع پر پہنچے۔ بعد ازاں پانچ چھ ہزار افراد نے جو بھجن گا رہے تھے اور مذہبی نعرے لگا رہے تھے مسجد کا محاصرہ کر لیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے لیکن ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا گیا۔ رام داس اور رام شکتی داس کی قیادت میں نامعلوم افراد نے رات کو چوری سے مسجد کے اندر داخل ہو کر اس کی بے حرمتی کی سرکاری ملازم اور کئی دوسرے

> " شاید دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہوگا جب ایک سیکولر جمہوری ملک کے ایک صوبہ کے وزیر اعلیٰ نے اپنی ذاتی نگہداشت میں کھڑے ہو کر ایک فرقہ کی عبادت گاہ کو جو ایک بیش قیمت تاریخی سرمایہ بھی تھی جنونیوں کے ہاتھوں مسمار کروایا "

"اب وقت آگیا ہے کہ ان جھوٹے سیکولرسٹ لیڈروں سے جنہوں نے آزادی کے بعد سے مسلمانوں کا محافظ ہونے کا دعویٰ کر کے پوری قوم کو اپنا یرغمال بنا رکھا ہے، آزادی حاصل کی جائے۔"

افراد اس بات کے گواہ ہیں۔"

اس رپورٹ کی بنیاد پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے کے نائر نے وزیر اعلیٰ، چیف سکریٹری اور ہوم سکریٹری کو یہ پیغام بھیجا۔ "رات کے اندھیرے میں جب مسجد سنسان تھی چند ہندوؤں نے بابری مسجد میں داخل ہو کر وہاں ایک مورتی رکھ دی۔ ڈی ایم اور ایس پی موقعہ واردات پر موجود ہیں۔ حالات قابو میں ہیں۔" چیف سکریٹری اور آئی جی نے مورتی کو فوراً ہٹانے کے احکامات صادر کیے لیکن ڈی ایم نائر نے نقص امن کا بہانہ بنا کر معاملہ ٹال دیا۔ اس نے علاقے کو "مخدوش" قرار دے کر وہاں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ مسجد کے امام کو وہاں سے ہٹا کر مسجد میں تالے لگوا دیے۔ کھلی جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے چار پجاریوں کو مسجد کے اندر داخل ہو کر مورتی کی آرتی کی اور آہنی باڑ کے پیچھے سے بھکتوں کو شری رام کے درشن کی اجازت بھی دے دی۔ جبکہ مسلمانوں کا داخلہ اس علاقے میں ممنوع قرار دیا گیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مجسٹریٹ نے ایک عدالتی حکم کے ذریعہ مسجد کو مسلمانوں کے حوالے نہ کر کے اسے ضبط کر لیا اور وہاں ایک ریسیور بٹھا دیا۔

اجودھیا کے پریشان حال مسلمانوں کے ایک وفد نے دلی جا کر وزیر اعظم نہرو سے ملاقات ''۔ پنڈت نہرو نے ایک سخت الفاظ پر مشتمل خط کے ذریعہ اتر پردیش سرکار کو کڑے اقدامات کر کے مورتی نکلوانے کا حکم دیا۔ نہرو جی نے بہ نفس نفیس اجودھیا کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا لیکن وزیر اعلیٰ گووند بلبھ پنت نے انہیں طفل تسلی دے کر اجودھیا آنے سے روک دیا اور یہ یقین دہانی کرائی کہ یہ معمولی سا واقعہ وہ خود سنبھال لیں گے لیکن انہوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ دریں اثنا سازش کی ایک کڑی کے طور پر گوپال سنگھ وشارد نام کے ایک شخص نے عبادت کی آزادی کے نام پر ۱۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں ایک سول سوٹ دائر کر دیا۔ سول جج نے فوراً احکامات جاری کیے نہ تو مسجد سے مورتیاں ہٹائی جائیں اور نہ ہی پوجا اور محدود درشن میں کوئی مداخلت کی جائے۔ مسجد کو اس کے اصلی حقداروں کو واپس دینے کی بات بالکل بھلا دی گئی۔ ۳ مارچ ۱۹۵۱ء میں دیے گئے ایک اور فیصلہ نے مسلمانوں کی حق تلفی کو مزید مستحکم کر دیا۔ "یہ ایک ناقابل تردید سچائی ہے کہ جس دن یہ مقدمہ دائر کیا گیا اس دن شری بھگوان کی مورتی وہاں موجود تھی":

اتر پردیش حکومت کی جانب سے ۲۴ اپریل ۱۹۵۰ء میں فیض آباد کے ضلع مجسٹریٹ نے سول جج کے سامنے جو رپٹ پیش کی اس میں صاف صاف لکھا تھا۔

"اس مقدمہ میں ملوث جائداد بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے اور کافی زمانے سے مسلمانوں کی عبادت گاہ کی حیثیت سے استعمال کی جا رہی تھی۔ اسے کبھی بھی شری رام چندر جی کے مندر کی طرح استعمال نہیں کیا گیا ہے.... شری رام چندر جی کی مورتیاں ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات کو چوری سے اور ناجائز طریقے سے اندر رکھ دی گئیں"۔

۱۹۵۱ء کے بعد سے بابری مسجد کے کیس کو سرد خانہ میں ڈال دیا گیا۔

قارئین بابری مسجد ایکشن کمیٹی سے تو واقف ہوں گے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ۱۹۸۴ء میں رام جنم بھومی ایکشن کمیٹی نامی ایک تنظیم نے رام جنم بھومی کی بازیابی کے لیے ایک تحریک شروع کی۔ رتھ یاترائیں نکالی گئیں اور جلوس چلائے گئے۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں اس تحریک کی باگ ڈور وشو ہندو پریشد نے ہاتھ میں لے لی۔ وی ایچ پی کے لیڈروں نے یوپی کے کانگریسی وزیر اعلیٰ اور فیض آباد کے ڈی ایم سے خفیہ ملاقاتیں کیں اور انہیں ۸ مارچ ۱۹۸۶ء (شیوراتری) کے پہلے مسجد پر لگے تالے کھولنے کے لئے آمادہ کر لیا۔

عدالتی نظائر اور روایات کو بالائے طاق رکھ کر ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء میں فیض آباد کے ایک وکیل نے منصف مجسٹریٹ کے سامنے کھلے عام پوجا پر عائد کردہ پابندی ہٹانے کی درخواست رکھی۔ سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ شخص بابری مسجد کے متعلق کسی بھی مقدمہ میں کوئی فریق نہیں تھا نہ ہی عدالت نے دوسرے فریق مسلمانوں کو اس نئی پیش رفت کی اطلاع دی۔ محمد ہاشم کو جو شروع سے تن تنہا اور بلا کسی ذاتی مقصد کے بابری

جد کے مقدمات کی پیروی میں پیش پیش رہے ہیں اس سازش
ھنک ملی تو انہوں نے مسلمانوں کی شنوائی کے لئے ایک رٹ
ئل کی جسے جج نے نہایت بے توجہی سے مسترد کر دیا۔ فیض آباد
ے ضلع جج کے ایم پانڈے نے صرف ڈی ایم اور ایس پی سے
ینڈآرڈر کی بابت دریافت کیا اور چند منٹوں میں بابری
جد کے گیٹ پر لگے تالے کھلوانے کا حکم جاری کر دیا۔ اس
یصلہ کے چند سطور کا مطالعہ جج کی ذہنیت کی غمازی کے
لئے کافی ہے حالانکہ مسلمانوں کو صفائی اور شنوائی کا موقعہ
یں دیا گیا پھر بھی آنریبل جج صاحب نے فرمایا۔ "تمام
ریقین کے بیانات سننے کے بعد
بات صاف ہو جاتی ہے کہ
روازے کا تالا کھول کر زائرین اور
بھگتوں کو اندر رکھی مورتیوں کی پوجا
اجازت جاری کر دینے سے
دوسرے فرقہ کے لوگ یعنی مسلمان
ی بھی حالت میں متاثر نہیں ہوں
گے۔ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید
ہے کہ یہ عمارت کورٹ کے قبضہ میں ہے اور ۱۹۵۰ اور ۱۹۵۱
کے عدالتی فیصلوں سے گزشتہ ۳۵ برسوں سے ہندوؤں کو یہاں
پوجا کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ اگر گزشتہ ۳۵ برسوں سے
ان مورتیوں کی محدود طور پر ہی سہی پوجا کی جاتی رہی ہے تو آج اگر
گیٹ کا تالا کھول دیا جائے گا تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے
گا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف
کیا ہے کہ مسلمانوں کو اس متنازعہ فیہ جگہ پر عبادت کی اجازت
نہیں ہے بلکہ انہیں وہاں تک جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔"
اس فیصلہ نے گویا پانڈورا کا صندوق کھول دیا ہو۔ یکم فروری
۱۹۸۶ء سے آج تک ہندوستان اس فیصلہ کے نتائج سے
نبرد آزما ہو سکا ہے۔ پے درپے اتنے واقعات رونما
ہوئے کہ ملک کا امن و سکون لٹ گیا۔ ایک انتہا پسند جماعت
بجرنگ دل کے نام سے تشکیل کی گئی جس نے تشدد کے
راستے سے رام جنم بھومی کو مکت کرانے کا عہد کر لیا۔ ہندو
فسطائی تنظیمیں بے پناہ طاقت ور ہوتی چلی گئیں اور حکومت

آنریبل جج نے فرمایا ...

"اگر گیٹ کا تالا کھول دیا جائے

تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑیگا"

ان کے سامنے مسلسل گھٹنے ٹیکتی رہی۔ سارے ملک میں
قتل وغارت کا بازار گرم کر کے بی جے پی اور اس کی پارٹنر
پارٹیاں آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل وغیرہ نے
دلی پر حکومت کا پلان مرتب کیا۔ ۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو متنازعہ
فیہ جگہ پر شری رام مندر کی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد رکھوا کر
ایک بار پھر حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کی۔ اس
کے بعد عام انتخابات سے قبل ایل کے اڈوانی نے سومناتھ
سے اجودھیا تک رتھ یاترا نکال کر اس پوری تحریک میں ایک
نئی زندگی پھونک دی۔ حالانکہ بہار میں لالو پرشاد یادو جیسے
نو مشق وزیر اعلیٰ نے اڈوانی کی رتھ
یاترا روک کر انہیں گرفتار کر لیا اور
اترپردیش میں ملائم سنگھ یادو نے مسجد
پر حملہ آور کارسیوکوں پر فائرنگ کروا کر
انصاف اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا
لیکن اس وقتی ناکامی سے تلملا کر ہندو
فرقہ پرستوں نے ۱۹۹۰ء کے اواخر
میں ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں
کے خون سے بھارت کی دھرتی کو لال کر دیا۔ ۱۹۹۱ء کے الیکشن
میں بھاجپا نے بھاری کامیابی حاصل کی۔ نہ صرف لوک سبھا میں
اس نے سو سے زائد سیٹوں پر قبضہ کر لیا بلکہ یو پی سمیت وہ چار
صوبوں میں برسر اقتدار آنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ اترپردیش
کا بینہ کے تمام وزراء کو لے کر وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ دوسرے
دن اجودھیا گئے اور وہاں رام للہ کے سامنے عہد کیا "رام للہ
ہم آئے ہیں مندر یہیں بنائیں گے"۔
اب آپ ہی بتلائیے شری رام چندر جی کے سامنے کیا
گیا عہد زیادہ اہم تھا یا وزیر اعظم نرسمہا راؤ، ہندوستانی
پارلیامنٹ، قومی یکجہتی کمیٹی، سپریم کورٹ وغیرہ کو دیئے ہوئے
عہد؟ اس لئے بھاجپا پر یہ الزام لگانا کہ اس نے عہد شکنی کی
ہے تو وزیر اعظم راؤ کی حکمت عملی اور اپنی ذمہ داری ٹالنے کے
علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اگر کسی نے عہد شکنی کی ہے تو وہ ہیں
ہندوستان کے وزیر اعظم جنہوں نے یوم آزادی کے مبارک
موقعہ پر گزشتہ سال لال قلعہ سے سارے ملک کو یہ وچن

دیا تھا کہ وہ بابری مسجد کی حفاظت ہر قیمت پر کریں گے انہوں نے اپنا وچن نہیں نبھایا۔ جب بی جے پی تو شروع سے کہہ رہی تھی کہ وہ مسجد توڑ کر دم لے گی۔

بہر حال ۶ر دسمبر اتوار کو شاید دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہوگا جب ایک سیکولر جمہوری ملک کے ایک صوبہ کے وزیر اعلیٰ نے اپنی ذاتی نگہداشت میں کھڑے ہو کر ایک فرقہ کی عبادت گاہ کو جو ایک بیش قیمت تاریخی سرمایہ تھی، جنونیوں کے ہاتھوں مسمار کروا دیا۔ مرکزی پولس نے فائرنگ تو درکنار لاٹھی چارج تک سے احتراز کیا اور جب اس شرمناک واقعہ پر احتجاج کرنے کے لئے سارے ملک کے مسلمان سڑکوں پر نکلے تو پولس نے نہایت دل کھول کر ان پر اپنی بندوقوں کے دہانے کھول دیئے۔ گزشتہ دو ماہ میں پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان مارے جا چکے ہیں اور ان کی اربوں کی جائیدادیں یا تو لوٹ لی گئیں یا نذر آتش کر دی گئیں۔

۶ر دسمبر کو پولس اور مرکزی سیکوریٹی فورسز کے ہزاروں افسران اور جوانوں کی موجودگی میں بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ یو پی حکومت کو برخواست کرنے کے ۳۶ گھنٹوں بعد تک مرکزی حکومت نے ملبے کے ارد گرد سے کار سیوکوں کو نہیں منتشر کیا۔ مسجد کے مقام پر ایک عارضی مندر تعمیر کرنے کی مہلت فراہم کی گئی۔ بابری مسجد کے دوبارہ اسی مقام پر تعمیر کا وعدہ کیا گیا اور ہمیشہ کی طرح اس وعدے کی بھی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ ہندوؤں کو مورتی درشن کی اجازت دی گئی مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روک دیا گیا۔ زمانے کا منہ بند کرنے کیلئے آر ایس ایس، بجرنگ دل اور وی ایچ پی پر ایسی مضحکہ خیز پابندی عائد کی گئی کہ سارے ملک میں یہ تنظیمیں اور ان کے لیڈر کھلے عام اپنے کام میں مصروف ہیں اور پولس خاموش تماشائی ہے۔ اڈوانی، جوشی، سنگھل وغیرہ کو قید کرنے کے نام پر ایک نہایت پرتعیش گیسٹ ہاؤس میں قیام و طعام و آرام کا موقعہ فراہم کیا گیا۔ پورے ملک میں ہوئے فسادات میں اور خصوصاً بمبئی میں پولس نے نسلی تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے فسادیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے جان و مال سے کھیلے گئے۔ دس دنوں تک بمبئی جلتی رہی اور حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ شہر کو فوج کے حوالے نہیں کیا گیا۔ شیوسینا کے چیف بال ٹھاکرے گلا پھاڑ کر چلا رہے ہیں کہ ان کے کاڈرز (cadres) نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے لیکن نامرد حکومت کو یہ جرأت کہاں کہ شیوسینا پر پابندی عائد کرے اور بال ٹھاکرے کو گرفتار کرے۔

پنڈت نہرو اور مرد آہن مولانا آزاد نے بھی اس معاملہ میں تغافل برتا۔

غرض یہ کہ حالات نہایت ناساز گار ہیں۔ ایسے حالات میں دو راستے مسلمانوں کے لئے کھلے ہیں یا تو مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہو کر تشدد کی راہ اپنا لیں اور اس طرح اجتماعی خودکشی کریں کیونکہ نہ صرف یہ کہ دشمن کی تعداد ہم سے سات گنا زیادہ ہے بلکہ وہ زیادہ مسلح، زیادہ تیار اور زیادہ عیار بھی ہیں اور دوسرے یہ کہ نام نہاد قانون کے محافظ اب کھل کر فرقہ پرستوں کے محافظ بن چکے ہیں اس لئے ٹکراؤ کے راستے میں سوائے ہماری بربادی کے اور کوئی بات ممکن نہیں ہے۔ دوسرا راستہ جو میرے خیال میں صحیح راستہ ہے وہ یہ ہے کہ بابری مسجد کی چھ دسمبر کی شہادت کو ہم لوگ قوم کے لئے یوم نشاۃ ثانیہ بنا لیں اور ایک نئے جوش ایک نئی لگن اور ایک نئے حوصلے کے ساتھ تندہی سے قوم کی تعمیر میں مصروف عمل ہو جائیں۔ جاپان کی مثال سامنے رکھیں دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر اپنی دانست میں جاپانی قوم کو نیست و نابود کر دیا تھا لیکن جاپانیوں نے اس ذلت کا بدلہ لینے کے لئے ایک ایسی حکمت عملی اپنائی اور ساری قوم نے دل و جان سے اسے کامیاب بنایا کہ آج سوئی سے لے کر آبدوز تک، کیلکولیٹر سے لے کر واشنگ مشین تک، معمولی کوارٹز گھڑیوں سے لے کر ٹویوٹا کاروں تک، ٹکنالوجی، کمپیوٹر اور سائنس کی دنیا میں جاپان سرفہرست پہنچ گیا ہے۔ امریکہ کو اپنی زوال

پذیر اقتصادیات کو درست کرنے کیلئے جاپان کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑ رہا ہے۔ قوموں کی تاریخ میں بابری مسجد کی شہادت جیسے المناک سانحے ظہور پذیر ہوتے آئے ہیں لیکن زندہ قوموں کی یہ پہچان ہے کہ وہ ایسے نامصائب حادثات سے شکست خوردہ نہیں ہوتی ہیں۔ آج ہندوستانی مسلمانوں کو بابری مسجد کی شہادت سے عبرت حاصل کرنا چاہئے۔ اپنے اچھے برے کی پہچان کرنا چاہئے۔ دوست دشمن کی شناخت کرنی چاہئے۔ صرف بی جے پی اور دیگر کھلی ہوئی فرقہ پرست قوتوں سے ہی ہوشیار رہنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اب وقت آگیا ہے کہ ان جھوٹے سیکولرسٹ لیڈروں سے بھی جنہوں نے آزادی کے بعد سے مسلمانوں کا محافظ ہونے کا دعوی کر کے پوری قوم کو اپنا یرغمال بنا رکھا ہے آزادی حاصل کی جائے۔ اگر کانگریس پارٹی سچ مچ مسلمانوں کی ہمدرد ہوتی تو ۱۹۴۹ء میں پنڈت نہرو جو نہایت مضبوط پوزیشن میں تھے بہ آسانی مسجد کے اندر سے "مورتیوں" کو نکلوا کر بابری مسجد مسلمانوں کے حوالے کر سکتے تھے لیکن انہوں نے صرف ایک خط لکھ کر اپنا فرض پورا کر دیا۔ ابوالکلام آزاد جیسے مرد آہن کانگریس میں موجود تھے انہوں نے بھی اس معاملے میں تغافل برتا۔ بابری مسجد کے تالے کھلنے کے بعد ۱۹۸۷ء میں دلی میں بوٹ کلب میں ایک بے معنی اور غیر ضروری ریلی کر کے چند گمنام مسلمانوں نے راتوں رات قومی سطح پر مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے جو شہرت اور کامیابی حاصل کی ان تمام موقع پرست، خودغرض، غیر ذمہ دار حضرات سے دست بستہ التجا ہے کہ وہ اب قوم پر رحم کریں اور جذباتی اور اشتعال انگیز بیانات سے قوم کو مزید فریب اور بربادی میں مبتلا نہ کریں۔

آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہم سچے مسلمان بن جائیں کیونکہ اللہ رب العزت کا فرمان ہے کہ اگر مسلمان گمراہی کے راستے پر چلیں گے تو ان پر ظالم حکمران مسلط کر دیئے جائیں گے۔ اپنا محاسبہ کر کے دیکھئے کیا ہمیں اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کی سزا تو نہیں مل رہی ہے! آج دین کا راستہ چھوڑ کر ہم نے بے دینی کو اپنا لیا ہے۔ آج تقویٰ سے گریز کر کے ہم نے بدکاری کو گلے لگا لیا ہے۔ ایک سچا مسلمان اور ایک اچھا ہندوستانی بن کر ہی ہم سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اپنی ترجیحات (PRIORITIES) درست کر لیں۔ ہمیں اپنے معاشرے سے تعلیمی اور معاشی پس ماندگی دور کرنا ہوگی۔ ایک طالب علم کا حصول علم بھی ایک جہاد ہے اور رسول صلعم کی حدیث ہے کہ ایک عالم یا دانشور کی روشنائی شہید کے لہو سے زیادہ متبرک ہے۔ ہمیں اپنا حال اور اپنا مستقبل خود بنانا ہوگا۔ اغیار سے سوائے طفل تسلیوں کے اور کسی چیز کی توقع رکھنا فضول ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر پوری قوم جنگی پیمانے پر اپنی اصلاح میں جٹ جائے۔ یہی وقت کا تقاضہ ہے اور اس میں قوم کی نجات پوشیدہ ہے کیونکہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا ؞

"انشاء" مارچ ۹۳ء

حرفِ اوّل

ایک ذاتی وضاحت

اب کے "حرفِ اوّل" کا ابتدائی حصہ ایک ذاتی وضاحت کے لیے وقف کرنا پڑ رہا ہے۔ ان سطور میں میرے مخاطب میرے خیرخواہ، میرے بدخواہ، میرے دوست، میرے دشمن، میرا اثبات کرنے والے، میری نفی کرنے والے ——— سبھی ہیں۔

بعض عناصر نے ادبی دنیا میں گزشتہ کئی برسوں سے، ایک مغالطے کو حقیقت کا رنگ دے کر عام کر رکھا ہے۔ مغالطہ یہ ہے کہ میں ایک ادبی گروہ یا کسی گروپ کا سربراہ ہوں۔ اس گروہ کو کبھی ندیم گروپ، کبھی قاسمی گروپ اور کبھی فنون گروپ کا نام دیا جاتا ہے اور اس مغالطے کو بڑے التزام کے ساتھ پاکستان، ہندوستان اور دوسرے براعظموں میں رہنے والے اردو دان طبقوں میں پھیلا یا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بالمشافہ گفتگو میں، انٹرویوز میں اور مراسلت میں مجھ سے بار بار استفسار کیا جاتا ہے کہ یہ کس نوعیت کی کشیدگی ہے؟ اہلِ قلم کی ایک معقول تعداد اس دھینگا مشتی میں اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کر رہی ہے؟ اور میں ایک سینیئر قلم کار کی حیثیت میں، اس افسوسناک صورتِ حال کو ختم کرنے کا اقدام کیوں نہیں کرتا؟

میرا کوئی گروپ نہیں ہے

میں اعلان کرتا ہوں کہ میرا یا میرے احباب کا یا میرے رسالے کا کوئی گروپ نہیں ہے۔ فنون کے مندرجات گواہ ہیں کہ گزشتہ تیس برسوں میں اس کا طرزِ عمل کاسموپولیٹن رہا ہے۔ فنون کو نظریاتی یا گروہی یا شخصی وابستگیوں سے بلند ہو کر مرتب کیا جاتا ہے۔ اس ادبی مجلے کا ایک معیار مقرر ہے۔ اگر کوئی تحریر اس معیار پر پوری اترتی ہے تو یہ معلوم کیے بغیر کہ اس کا مصنف کون ہے، اور کہاں کا رہنے والا ہے اور کس کا دوست یا دشمن ہے، اس معیاری نظم یا غزل یا افسانے یا مضمون کو درج کر دیا جاتا ہے۔

ہر زندہ انسان کی طرح میرا ایک حلقۂ احباب یقیناً ہے مگر میں ان احباب میں سے سو فی صد کے ساتھ نظریاتی طور سے متفق نہیں ہوں اور ہمارے روابط کی نوعیت محض شخصی ہے۔ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایسے افراد بھی ہیں جو کبھی کبھار احتیاطاً یا کسی خوف کے زیرِ سایہ منافقت کی زد میں آجاتے ہیں اور انسانی رشتوں میں منافقت سے بڑے گناہ کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرے ساتھ منافقت برتی جا رہی ہے مگر میں کسی کو ٹوکتا نہیں کہ کسی کا مزاج یا نفسیات بدلنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس صورت میں میں کوئی گروپ کیا بناؤں گا اور کیوں بناؤں گا۔ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو میرا لفظ مجھے زندہ رکھے گا۔ اگر اس لفظ میں جان نہیں ہے تو میں کیوں کسی کو یاد رہوں گا۔ چنانچہ میری شخصیت کی کسوٹی وہ

وقت سب سے بڑا منصف ہے

مجھے ہمیشہ اپنے کام سے کام رہا ہے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ مجھ پر کون حملہ آور ہو رہا ہے اور کون میری نفی پر تُلا ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ نفی اور اثبات کا فیصلہ مطبوعہ نقد اور وقت کے سپرد ہوتا ہے چنانچہ میں نظمیں اور غزلیں اور کہانیاں لکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھار کوئی مضمون کوئی کالم لکھ لیتا ہوں۔ فنون مرتب کرتا ہوں اور اس رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے مقدور بھر کی حد تک محنت کرتا ہوں۔ پھر عزت مندانہ معاش کی مصروفیت ہے۔ میرے پاس جماعت سازیوں اور حلقہ بندیوں کا وقت بھی نہیں ہے اور اتنا روپیہ بھی نہیں ہے کہ کسی فرد یا گروہ کو خرید سکوں۔ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف ہوں اور اس صورتِ حال سے انتہائی حد تک مطمئن ہوں۔ پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ زندگی کی مختصر مہلت کو کشیدگیوں اور دشمنیوں میں ضائع کرتا پھروں۔

میری روحانی آسودگی

کرۂ ارض پر سانس لینے والے ایک سیدھے سادے انسان کی حیثیت میں، جب میں اپنی زندگی کی ساڑھے چھہتر منزلیں طے کرنے کے بعد پلٹ کر دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو مطمئن پاتا ہوں۔ کسی ذرا سے پچھتاوے کا سایہ بھی میرے ماضی کے منظر کو نہیں دھندلاتا۔ یہ سوچ کر ایک عجیب سی تسکین محسوس کرتا ہوں کہ میں اس معیارِ حیات میں نہ کسی کو فریب دینے کا مرتکب ہوا ہوں اور نہ میں نے کبھی اپنے ضمیر کو فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً اس مدت میں بعض لغزشیں بھی ہیں، بعض کوتاہیاں بھی ہیں، بعض نادانیاں بھی ہیں، اور ان کا کوئی جواز بھی نہیں ہے مگر یہ عام انسانی فروگذاشتیں ہیں بلکہ میرا موقف تو یہ ہے کہ اگر مجھ سے یہ فروگذاشتیں سرزد نہ ہوتیں تو بحیثیت انسان میری تکمیل ہی معرضِ خطر میں پڑ سکتی تھی۔ قدرت نے دیانت اور محبت کو میرے وجود میں خون کی طرح جاری و ساری رکھا ہے، سو میں ذہنی اور روحانی طور پر بحمد للہ ایک آسودہ شخص ہوں — بعض تشنۂ تکمیل آرزوؤں کے باوجود آسودہ، کہ آرزو کرنا انسان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے اور یہ الگ بات ہے کہ ہر آرزو کا پورا ہونا ضروری نہیں۔

میرا ترقی پسندی کا نظریہ

جب میں جوان ہوا تو میرا پہلا مسئلہ یہ تھا کہ میں جس ملک میں رہتا ہوں، اس پر ایک غیر ملکی سامراج کیوں مسلط ہے۔ اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ میرے آس پاس انسانوں کی اکثریت اپنی ابتدائی ضرورتیں بھی کیوں پوری نہیں کر سکتی اور وہ زندگی کی ہر آسائش سے محروم کیوں ہے۔ بیشتر انہی دو دکھوں نے میری شاعری اور نثر میں اظہار پایا۔ نہ میں نے برطانوی استعمار کو بخشا اور نہ اپنی انسانی برادری کی محرومیوں کو نظر انداز کیا۔ ساتھ ساتھ میں نے انسانوں کی باہمی محبتوں اور ان محبتوں کی گوناگوں کیفیتوں کے بھی گیت گائے کہ کوئی بڑے سے بڑا نظریہ بھی انہیں گزند پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میری ترقی پسندی نے بنیادی انسانی جذبات کی کبھی نفی نہیں کی کیونکہ یہ جذبے ہی تو انسان کو انسان بناتے ہیں۔

آزادی کے بعد بین الاقوامی دہشت گردی کے علاوہ خود اپنے بھائی بندوں کا ظلم و جبر میرا موضوع فن رہا۔ میں نے ویت نام فلسطین اور دیگر عالمی مسائل پر نظمیں لکھتے ہوئے، کشمیر کو کبھی فراموش نہ کیا۔ ایک عالمی شخصیت بننے کے بجائے میں نے اپنے پاکستانی تشخص پر اکتفا کی کہ پاکستان ہی میری پہچان ہے۔ پاکستان کی تاریخ بیشتر آمروں کی تاریخ ہے مگر کوئی بھی آمر مجھ سے اپنے حق میں ایک حرف بھی وصول نہ کر سکا۔ میں ان پر صاف اور غیر مبہم لفظوں میں بار بار واضح کرتا رہا کہ اہلِ قلم حکومتوں سے وفاداری کے عادی نہیں ہوتے بلکہ ہم تو صرف اپنے ملک اور اس میں رہنے بسنے والے کروڑوں کے وفادار ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ تم آزادیٔ اظہار کا ہزار گلا گھونٹو، ہم اہلِ قلم براہِ راست نہیں تو علامت یا استعارے کی زبان میں اپنا مافی الضمیر بہر صورت بیان کریں گے اور اپنے ہم وطنوں کے بہتر مستقبل کی خاطر ہر صعوبت برداشت کریں گے۔

[illegible]

انسان ہر مخلوق سے اشرف اور افضل ہے۔ اسی طرح میں نے انسان کے بہ صورت مر جانے کے دکھ سے خوفزدہ ہو کر انسانی زندگی کو لایعنی اور بے معنی کبھی قرار نہیں دیا کیونکہ میرے نقطۂ نظر کے مطابق تو:

جہاں سے شاخ ٹوٹی ہے وہیں سے شاخ پھوٹی ہے

اور یہی تسلسلِ حیات بنی نوعِ انسان کی فنا کی نفی کرتا ہے۔

انسانی برادری کا ایک خود آگاہ فرد

آج میں نے سوچا کہ میرے بارے میں پھیلائی ہوئی اتنی بہت سی غلط فہمیوں کے ماحول میں، میں اپنے پیار کرنے والوں سے اپنا تعارف خود کیوں نہ کرا دوں۔ اگر اس سلسلے میں مجھ سے کہیں کہیں تعلّی سرزد ہوئی ہے تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ تعلّی میرا میدان ہی نہیں ہے — میں تو کرۂ ارض پر سانس لینے والی انسانی برادری کے کروڑوں اربوں افراد میں سے ایک خود آگاہ فرد ہوں اور بس — اور اگر مجھ سے پیار کرنے والے مجھے عزت اور محبت کا مستحق سمجھتے ہیں تو یہ ان کی اپنی بڑائی ہے۔ رہے مجھ سے دشمنی رکھنے والے اور میری نفی کرنے والے، تو میں اُن کے حق میں دعا کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔

"فنون" جنوری-اپریل ۹۳ء

حرفِ اوّل

پچھلے دنوں تنقید کی ایک نہایت دلچسپ مثال سامنے آئی ہے۔ ایک خاصے معروف نقاد نے انگریزی زبان کے ایک ہفت روزے میں اکا دُکا دوسرے ادبی رسائل کے ساتھ ہی "فنون" کو بھی ــــ بلکہ "فنون" کو بطورِ خاص، رگید ڈالا ہے۔ ان کا نام لکھنے سے گریز کیا جا رہا ہے کیونکہ مقصد صرف تنقید کے ایک گمراہ کن رجحان کی نشان دہی ہے۔ ان کی تنقید کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ یا تو وہ "فنون" کو دل جمعی سے پڑھتے نہیں، اور اگر پڑھنے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں تو محض جستہ جستہ پڑھتے ہیں، اور اگر ہر شمارے کے سبھی مندرجات پڑھتے ہیں اور اس کے باوجود ناپسند فرماتے ہیں تو وہ یقیناً کسی خوفناک نفسیاتی کمپلکس میں مبتلا ہیں یا پھر کسی شدید عصبیت کے شکار ہیں۔ بصورتِ دیگر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ "فنون" پر بے بنیاد الزامات کی بوچھار کر دیتے۔

وفیات پر اعتراض

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ چند برس پہلے ایک دریدہ دہن نے "فنون" کے "حرفِ اول" میں "وفیات" کے حوالے سے لکھا تھا کہ یہ رسالہ اپنی ہر اشاعت میں مرنے والوں کا قبرستان سجا دیتا ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کا شدید ردِ عمل ہوا تھا۔ مگر مرنے والے اہلِ قلم سے سمجھ میں نہ آنے والی اس پرخاش کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ انہی نقاد نے "فنون" کے ایک شمارے پر تبصرہ کرتے ہوئے وفیات کے حوالے سے فرمایا ہے کہ یہ رسالہ اس دوران میں مرنے والوں پر دو چار "نمائشی" آنسو ٹپکانے کا عادی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرنے والوں کو یاد کرنے سے ان حضرات کو کیا اور کیوں تکلیف ہوتی ہے جبکہ مرنا تو سبھی کو ہے۔ پھر "وفیات" تو ہماری تاریخِ ادب کا حصہ ہیں۔

"فنون" کے حصۂ غزل پر اعتراض

انہی نقاد صاحب نے "فنون" میں غزلیات کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہنا بھی اپنی دیانت کے مطابق سمجھا ہے کہ ان بہت سی غزلوں کو دیکھ کر ایک صدی پہلے شائع ہونے والے "گلدستے" یاد آ جاتے ہیں جن میں الّم غلّم غزلوں کی بھرمار ہوتی تھی۔ کاش یہ نقاد "فنون" میں شائع ہونے والی غزلوں کے مطالعے کی زحمت بھی گوارا کر لیتے۔ تب شاید انھیں احساس ہوتا کہ یہ غزلیں اس ہر دلعزیز صنفِ شعر کے بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے رجحانات کی بلیغ ترجمان ہوتی ہیں۔ ان کے لفظ لفظ میں جدید حسّیت اور روحِ عصر دھڑکتی ہے۔ یہ غزلیں نئے استعاروں کی تخلیق کر رہی ہیں اور عام استعمال کے الفاظ نئے مفاہیم سے آراستہ کر رہی ہیں۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ان نقاد صاحب کی طرح ہمارے بیشتر نقادوں نے لکیر کی فقیری کا منصب سنبھال رکھا ہے اور لکیر کا فقیر جب اس لکیر سے ذرا سا بھی ہٹے گا تو اسے چکر آنے لگیں گے۔ یہ اردو تنقید نگاری کی بدقسمتی ہے۔

"فنون" کے معیاروں پر اعتراض

ان نقاد صاحب نے اس کے علاوہ بھی "فنون" پر پھبتیاں کسی ہیں۔ متذکرہ شمارے میں نہ اختر حسین جعفری کی نظم ان کو متوجہ کر سکی اور نہ وہ رشید ملک، احمد ہمدانی، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے عالمانہ مقالات کے بارے میں کچھ کہہ سکے۔ نہ "اختلافات" میں محمد ارشاد اور رشید ملک کی گفتگو انھیں متاثر کر سکی۔ نہ انھوں نے رضیہ فصیح احمد، رفعت مرتضیٰ، گلزار، نیلوفر اقبال اور عطیہ سید کے معیاری افسانوں کی کوئی رسید دی۔ انھیں صرف محمد منشا یاد کا افسانہ "ایک تھی فاختہ" یاد رہا اور وہ بھی "فنون" پر آوازہ کسنے کے لیے کہ جس طرح اس افسانے میں فاختائیں ہجرت کر جاتی ہیں، اسی طرح ادبی رسائل کی "فاختہ" بھی کہیں اڑ گئی ہے اور رہا سہا کوڑا باقی رہ گیا؟

حمدوں اور نعتوں کے الگ شعبے پر اعتراض

نقاد صاحب کا ایک اور اعتراض یہ ہے کہ حمدوں اور نعتوں کو شروع میں الگ سے کیوں درج کیا جاتا ہے جبکہ اگر کوئی حمد یا نعت اچھی ہے تو اسے نظموں کے حصے میں شامل کرنا چاہیے۔ نعت کی صنف نے دورِ حاضر میں جو عروج حاصل کیا،

۲۸۳

ے اس کا بھی اور حمد اور نعت کے موضوعات کی انفرادیت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ انھیں الگ جگہ دی جائے. نقاد صاحب
شبہ ہے کہ حمد و نعت کا الگ شعبہ مقرر کرنے کا مقصد حکومتِ وقت کو راضی رکھنا ہے اور اس شعبے کا آغاز جنرل ضیاء الحق کے
دور میں ہوا تھا. نقاد صاحب پر یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۷ء میں پاکستان پر قبضہ کیا
ماہنامہ "فنون" تو ۱۹۶۳ء سے جاری ہے۔ اگر "فنون" کا اور دیگر ان معیاری ادبی رسائل کا جو حمد و نعت کو اپنے ہاں الگ
دیتے ہیں، مقصد جنرل صاحب کو خوش کرنا ہوتا تو ان کی موت کے بعد تو یہ سلسلہ رک جانا چاہیے تھا۔ اور کیا "نیا دور" سول
کے بارے میں گفتگو کو بھی اس سطح پر اتارا جا سکتا ہے!

اعتراض ہی اعتراض | "فنون" پر ان صاحب نے جو دیگر الزامات لگائے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

• "فنون" نے محمد حسن عسکری کے خلاف مہم چلا رکھی ہے.
• "فنون" اردو ادب کے جدید دور کے ہراول ادب کو نظر انداز کرتا ہے
• اگر جدید ادب "فنون" میں راہ پا بھی لیتا ہے تو محض شو پیس کے طور پر.
• "فنون" کی حالت دردناک ہے۔ یہ رسالہ بے وقری اور بے وقعتی کی گہرائیوں میں اترا جا رہا ہے.
• "فنون" کے اس زوال کی وجہ مدیر کی کبر سنی بھی ہو سکتی ہے.
• اس رسالے کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو رہا ہے.
• آدھا شمارہ رطب و یابس سے بھرا ہے.
• معمولی درجے کے اہل قلم کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے.
• بیشتر مندرجات میں معاشرتی اور سیاسی حوالے سے بچ بچ کر چلنے کی ذہنیت کارفرما ہے.

یہ سب کچھ ان نقاد صاحب نے لکھا ہے جو حال ہی میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں.

"فنون" اس ضمن میں سوائے اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہے کہ اگر جدید اردو تنقید کا یہی معیار ہے تو ہم سب کا اللہ والی!

"فنون" ستمبر۔ دسمبر ۹۲ء

۲۸۱

انسان ہر مخلوق سے اشرف اور افضل ہے۔ اسی طرح میں نے انسان کے بہرصورت مرجانے کے دکھ سے خوفزدہ ہو کر انسانی زندگی
کو لایعنی اور بے معنی کبھی قرار نہیں دیا کیونکہ میرے نقطۂ نظر کے مطابق تو:

جہاں سے شاخ ٹوٹی ہے وہیں سے شاخ پھوٹی ہے

اور یہی تسلسلِ حیات بنی نوعِ انسان کی فنا کی نفی کرتا ہے.

انسانی برادری کا ایک خود آگاہ فرد

آج میں نے سوچا کہ میرے بارے میں پھیلائی ہوئی اتنی بہت سی غلط فہمیوں کے ماحول میں، میں اپنے پیار کرنے والوں سے اپنا
تعارف خود کیوں نہ کرا دوں۔ اگر اس سلسلے میں مجھ سے کہیں کہیں تعلّی سرزد ہوئی ہے تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ تعلّی میرا
شیوہ ان ہی نہیں ہے —— میں تو کرۂ ارض پر سانس لینے والی انسانی برادری کے کروڑوں اربوں افراد میں سے ایک خود آگاہ فرد
ہوں اور بس —— اور اگر مجھ سے پیار کرنے والے مجھے عزت اور محبت کا مستحق سمجھتے ہیں تو یہ ان کی اپنی بڑائی ہے۔ رہے مجھ سے
دشمنی رکھنے والے اور میری نفی کرنے والے، تو میں اُن کے حق میں دعا کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں.

"فنون" جنوری۔ اپریل ۹۳ء

ایک بیراگی ـــ انیس شاہ جیلانی

انیس شاہ جیلانی کا نام میں نے پہلے پہل آج سے بارہ تیرہ برس پیشتر سنا۔ اس نے حیرت شملوی کے خطوط پر مشتمل ایک پمفلٹ نما کتاب تالیف کی تھی (میں حیرت شملوی کو بالکل نہیں جانتا تھا) اس کے کافی طویل دیباچے میں حیرت شملوی کی علو الکلامی اور سخن سنجی کی بہت ستائش کی گئی تھی اور یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ اس عہد کا سب سے بڑا شاعر اور نثر نگار تھا اور اگر اس کی ساری غیر مطبوعہ تصانیف چھپ کر سامنے آ جائیں تو دنیا کو حیرت ہو جائے گی۔ (انیس شاہ کے اصل الفاظ مجھے یاد نہیں ہیں) یہ تعریف و تحسین اس متوالے پجاری کی سی تھی جو اپنی دیوی کے اوصاف بڑھا چڑھا کر گاتا ہے۔ کتاب کے آخر میں حیرت شملوی کی بیس سے زیادہ زیرِ طبع کتابوں کی فہرست تھی۔ یہ کتابیں غالباً اب تک نہیں چھپ سکیں۔ جب میں نے خط پڑھے تو میں ان کے اسلوبِ نگارش اور خیالات سے واقعی مرعوب سا ہو گیا اور حیرت شملوی ادب کے میدان کا ایک چھپا ہوا رستم نکلا جسے نقادوں نے بے منصفی سے نظر انداز کیا ہے (شاید میں نے ہی آتشکدے میں اس پر تبصرہ بھی کیا)

مگر انیس شاہ جیلانی کی شخصیت نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ حیرت شملوی کو پوجنے والا میرا یہ ہم وطن یا ہم دیس کون ہے اور ایسا آدمی میری نگاہوں سے کیوں کر چھپا رہا، وہ یقیناً کوئی نایاب پرندہ (Bird) ہوگا ـــــ اس دریافت سے تین چار سال بعد میں اور میرا شکاری اور گھوڑوں کا عاشق بھائی اس کی سرکاری جیپ میں صادق آباد وہاں کے میرزا ادیب حسین کے مشہور کتب خانے کو دیکھنے گئے۔ میر صاحب اس خطے کے بڑے زمینداروں میں سے ہیں، ایک پکے محب قوم، کٹر مسلم لیگی، قائد اعظم اور مادر ملت کی عقیدت اور محبت کا دم بھرنے والے، مس قرۃ العین کے ناولوں سے لگے ہوئے ایک کرانہ۔ بہاولپور کے خطے میں وہ یقیناً کتابوں کے سب سے بڑے جامع ہیں۔ اس جامہ زیب، مستعلیق ارسٹوکریٹ نے اب صادق آباد میں ایک وسیع و عریض محلسرائی تعمیر کا پروجیکٹ شروع کر رکھا ہے جو ان کی زندگی میں مکمل نہیں ہوگا۔ میر صاحب ابھی اپنی پرانی حویلی میں رہتے ہیں مگر انھوں نے کتب خانے کو کوئی پندرہ سال سے زیر تعمیر محلسرا میں منتقل کر دیا ہے۔ یہی میرزا ادیب حسین ہمیں انیس شاہ جیلانی سے ملانے اور اس کا کتب خانہ دکھانے اپنی گاڑی میں محمد آباد لے گئے۔ صادق آباد سے محمد آباد کا قصبہ جو صادق آباد کی تحصیل میں ہے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر ہے اور سڑک اناج کے کھیتوں، گنے کی چار دیواری میں گھرے آم کے باغوں، کھجور کے جھنڈوں کے پاس سے جاتی ہے۔ مگر بہاولپور کے خطے کے دوسرے علاقوں کی طرح سنہری فضا میں صحرا یا روہی کی بو ٹھہری ہے، کیونکہ اب سے پچاس برس پہلے جب یہاں نہریں نہیں آئی تھیں اور خال خال آبادی تھی، یہ سارا علاقہ چولستان کے لق و دق ریتلے ویرانے کا حصہ تھا۔ روہی جس کے گیت خواجہ غلام فرید نے گائے ہیں جس میں نازک نازک جٹیاں ون کو اپنے کچے گھروندوں میں جا بیٹھیں، سو ڈھولتی تھیں اور رات کو دولوں کا شکار کرتی تھیں۔ قدم قدم آبادی کے باوجود وہ 'روہی' کی بو اب تک یہاں سے نہیں گئی نہ کبھی جائے گی۔ یہ دنیا کی سب سے مست کر دینے والی مہک ہے...... انیس شاہ جیلانی کا مسکن قصبے سے ایک کچا اونچی کرسی پر ایک پختہ سرخ اینٹوں کی چھوٹی سی عمارت ہے۔ گھر کے بجائے دیہاتی لائبریری یا ڈسپنسری لگتی ہوئی۔ وہ ہمیں برآمدے میں ملا۔ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص میں ایک خوش مزاج دبلے چھریرے بدن کا آدمی۔ میرے چھٹپنے کے سکاٹ لینڈ کے ناولسٹ رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی عکسی تصویروں سے وہ کافی مشابہت رکھتا تھا۔ وہی کتابی چہرہ، فراخ پیشانی، وہی ہونٹ کے کناروں سے نیچے آتی ہوئی ہلالی مونچھ کا اسٹائل۔ بالوں کے بیچ میں سیدھی مانگ، آنکھوں میں وہی روحانی نراہٹ، روہی کی فضاؤں میں پروردہ سب مردوں عورتوں میں یہ روحانی نراہٹ پائی جاتی ہے۔ وہ مجھے اور میرے بھائی کو اس تپاک سے ملا جیسے ہم برسوں کے بچھڑے ہوں، وہ ہمیں اندر لے گیا۔ دالان نما بیٹھک کمرہ خالی، بھاری قالین بچھا ہوا۔ سامنے کی دیوار کے پاس محمل الماری کی ترتیب، دائیں طرف داخل ہونے والے دروازے کے پاس توشک پر ایک 'میز' جیسی مہاجنوں کی دکانوں پر ہوتی تھی اور جس پر حساب کتاب کے بہی کھاتے لکھتے تھے۔ میز پر ہمارے اسکول کی کلکی قلم، ایک بڑی صورت والی دوات، ایک رجسٹر سا

اس کے اوپر کھلا تھا اور اس نے بتایا یہ اس کے لکھنے کا گوشہ ہے، اور ان دنوں وہ اپنا ہندوستان کا سفرنامہ لکھ رہا ہے جہاں ایک دو نوجوان لڑکے ملازم دیکھے۔ وہ یہاں ایک گوشہ گزیں کی طرح رہتا تھا، اپنی کتابوں اور اپنے لکھنے پڑھنے کے سامان کے ساتھ اس کی ضرورت کا اور اس کی کوئی ضرورت تھی) اس پاس کوئی نشان نہ تھا۔ ہم نے اس کا کتب خانہ دیکھا۔ اردو اور فارسی کی کتابیں اس کے عالم و فاضل مرحوم باپ مبارک شاہ صاحب کی اکٹھی کی ہوئیں۔ اس نے ہمیں حیرت شکوہی کے مسودات اور ملفوظات کے انبار بھی دکھائے اور رئیس امروہوی مرحوم کے کاغذ کے پرزوں پر لکھے اشعار کا ذخیرہ بھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ پچھلے برس رئیس صاحب یہاں اس کے پاس مہینہ بھر مہمان رہے۔ وہ کاغذ کے پرزوں پر اشعار، رباعیات لکھ لکھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینکتے رہتے تھے اور وہ ان سے آنکھ بچا کر ان تبرکات کو محفوظ کر لیتا تھا۔ وہ رئیس امروہوی کا ذکر بڑی والہانہ شیفتگی سے دیر تک کرتا رہا۔ انیس شاہ جیلانی مجھے ان خبطی لوگوں میں سے لگا جو ادب پر تیکے ہوتے ہیں اور ادیبوں یا کتابیں لکھنے والوں کو اس ذوق شوق سے جمع کرتے ہیں جیسے ٹکٹ جمع کرنے والے نادر ٹکٹوں کے . . . . . . اس نرم گفتار خوش ذوق شخص کی طبیعت لطافت اور ظرافت کے عنصر سے بنی تھی اور اس کی صحبت میں وقت گزرنے کا پتہ نہ چلا . . . . . پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مجھے خط لکھتا رہے گا۔ شاید اس نے ایک دو خط لکھے بھی جن کا جواب میں نے نہیں دیا۔

اس ملاقات کو آٹھ نو برس سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے۔ میں اس کی کتاب کی پشت پر اس کے فوٹوگراف سے دیکھ سکتا ہوں کہ اس کی "اسٹیو نسونین" مونچھیں برف کی سی سفید ہو چکی ہیں۔ اسی طرح سر کے بال جو ماتھے سے بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں چہرے کچھ پرچھائیں سی آ گئی ہے۔ ہاں وہ رومانی آگ آنکھوں میں ابھی ہے (وہ میری طرح پیر فرتوت نہیں ہوا، نری بجھا ہوا) تقریباً نو برس کے بعد کوئی تین مہینے ہوئے اس کا پہلا خط مجھے ملا۔ لفافے پر میرا بہاولپور کا پتہ درج تھا اور ظاہر ہے اس کے خیال میں میں ابھی تک بہاولپور ہی میں تھا۔ سرنامے میں مجھے "بخدمت جناب ادیب شہیر" لکھا تھا میں خوب ہنسا۔ میں نے اپنے جواب میں اس خطاب پر احتجاج کیا اور اسے لکھا کہ میں "ادیب شہیر" قسم کی کوئی چیز نہیں اور اس لفظ سے مجھے نفرت ہے۔ مزید یہ کہ میں "ادیب" بھی نہیں صرف ادب پڑھنے والا ہوں۔ اس طرح ہمارے درمیان خط و کتابت جاری ہو گئی۔ میں نے اس کے رئیس امروہوی مرحوم پر لکھے ایک مضمون کی تعریف کی۔ اس نے لکھا کہ وہ رئیس پر ایک ہزار صفحات کی کتاب لکھ سکتا ہے۔ اس کے پاس اتنی یادیں کتنی کی ہیں مگر اسے چھاپے گا کون . . . . پھر ایک خط میں اس نے مجھے بتایا کہ اس نے ہندوستان کے سفرنامے والی کتاب کئی سال پہلے مکمل کر لی تھی لیکن اسے زیور طباعت سے آراستہ کرنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہ تھے رہ گئے سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے لئے کسی شریف النفس پبلشر کی تلاش کروں۔ پھر اس کا آخری خط آیا اس نے سرائیکی زبان میں ایک کتاب "مہانڑاں ڈیکھنس" لکھی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ میں "افکار" میں اس پر تبصرہ کروں میں نے اسے فوراً لکھا کہ میں سرائیکی ہوں مگر مجھے عبارت کو پڑھنے میں سخت دقت ہوتی ہے اور وہ کسی سرائیکی ادیب سے اس پر تبصرہ کرا کے مجھے بھیج دے . . . . مگر چند روز بعد "مہانڑاں ڈیکھنس" کا رجسٹرڈ پیکٹ آ گیا۔ اس کے بعد اغلاط نامے کا ایک پوسٹ کارڈ ـــــ سو تبصرہ مجھے ہی کرنا ہو گا بہرحال ہیں۔

"مہانڑاں ڈیکھنس" مکمل پڑھنے میں مجھے پندرہ دن لگے ہیں کیونکہ سرائیکی خط پڑھنے کی مجھے مشق نہیں۔ اور ساری کی ساری مصنف کے اپنے خط میں لکھی ہوئی ہے اگر وہ نہایت خوش خط ہے۔ "مہانڑاں" سرائیکی میں بڑے یا عظیم شخص کو کہتے ہیں، "ڈیکھنس" نظر آنے والا ہے۔ میرے دوست انیس شاہ جیلانی کی یہ کتاب پاکستان کی گیارہ عظیم یا معتبر شخصیات کے قلمی خاکوں پر مشتمل ہے۔ یہ عظیم شخصیات کون ہیں؟ سابق گورنر جنرل غلام محمد، لیاقت علی خان، فیض احمد فیض، مولانا مودودی، شیخ محمود دلچسپ، بھٹو، نظامی صیب، محمد علی جناح، فقیر بخت علی، صادقین، رفیق ساحل، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، بھٹو۔ سرائیکی زبان میں لکھے یہ خاکے بڑے انوکھے اور خوبصورت ہیں اور مصنف ملک و قوم سے محبت کرنے والا ایک دردمند اور ادیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے والے یا شہرت پانے والے لوگ ہی عظیم نہیں ہوتے، بخت علی فقیر جیسے لوگ بھی عظیم ہوتے ہیں، جو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنی زبان میں دل پر اثر کرنے والی شاعری کرتے ہیں جسے کبھی چھپنا نصیب نہ ہو گا۔ وہ مشہور نہیں ہیں۔ ان کے نام اور کام کو کوئی نہیں جانتا۔ اخبار ان کے ناموں کی سرخی نہیں جماتے . . . . . . لیکن کیا وہ ان لوگوں سے کم عظیم ہیں جو دنیا میں شور و غل مچاتے ہیں۔ مجھے (شروع شروع کی جان کاہی کے باوجود) ان خاکوں کو اپنی پیاری سرائیکی میں پڑھنے میں بڑا لطف حاصل ہوا۔ ہماری علاقائی زبانوں میں سرائیکی زبان بولنے اور لکھنے میں سب سے میٹھی ہے۔ پنجابی، پشتو یا بلوچی کے برعکس (جو بڑی زبانیں ہیں، اور جن کے دامن میں کافی ادبی سرمایہ ہے) سرائیکی بولتے ہوئے گلے میں ذرا بھی کھرکھراہٹ محسوس نہیں ہوتی گویا کہ شیر میں شکر گھول کر رکھ دیا ہو . . . . . . اور سرائیکی زبان

٭ مصنف . . . . قیمت ۵۰ روپے۔ تقسیم کنندہ: سرائیکی ادبی اکیڈمی، ڈیرہ غازی خان (؟)، ضلع رحیم یار خان

ت عظیم ادب بھی موجود ہے ـــــ خواجہ غلام فرید کی افانی کافیاں، مولوی لطف علی کی مثنوی سیف الملوک۔

بخت علی فقیر، جو اب اسی برس کا ہو چلا ہے، پیشے کے لحاظ سے ایک قلعی گر تھا اور انیس شاہ نے خود اسے احمد پور لمہ میں گاؤں والوں کے برتن قلعی سے اجالتے دیکھا ہے۔ وہ تب عنفوانِ شباب میں تھا۔ پھر اس کو عشق کی ٹھوکر لگی اور وہ ایک سانولی سلونی کی محبت میں گھلنے لگا۔ اس خطے کے لوگ محبت کے لئے ہی بنے ہیں اور اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اس خاتون کا نام شاید بخت بی بی تھا۔ وہ ایک قلعی گر سے 'مکلانا' یا بیاہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بخت علی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے دھندا چھوڑ دیا فقیر اور شاعر بن گیا۔

اس سرائیکی کے رابرٹ برنز کی ایک آتشیں رومنتک کا آزاد اردو ترجمہ یہ ہے:

اے سانول (محبوبہ) لمحہ لمحہ تیری گمبھری سیاہ آنکھیں مجھے مارے ڈالتی ہیں۔ یہ تیری قاتل آنکھیں بے دھڑک مجھ پر تیر چلاتی ہیں۔ نہ مرنے دیتی ہیں نہ جینے۔ ان میں سرمے کی تحریر کے 'نیم بخت' قتل ہو گیا۔ اس کا دن تیرہ و تار ہے۔ سیاہ، سانولی چہرہ نور سے تاباں تھا۔ آنکھیں نشیلی، بیچ میں سیاہ زلف لٹکتی ہے۔ بخت کا دل اس حسن پر کیوں نہ صدقے ہو، کیوں نہ تڑپے۔ عشق کے تھپیڑے تلوار کٹار کے وار سے زیادہ سخت، زیادہ بے رحم ہوتے ہیں ...... نہ ہی یار سے وصال ہوتا ہے اور نہ ہی موت مجھے ختم کرتی ہے۔ لمحہ لمحہ دل ڈوبتا جاتا ہے ... بخت! کوئی ایسی تدبیر تیرے پلے آن پڑی ہے کہ اس دلبر کا تیرا رد نہیں ملتا۔

مگر ترجمے میں سرائیکی ادب کی وہ خاص کیفیت، جو روہی کی سرزمین نے یہاں بسنے والوں کی طبیعت یا مزاج یا ان کی خوبصورت زبان میں پیدا کی ہے، نا مجھ کو مزہ نہیں دے سکتی ـــــ سرائیکی کا جادو، اس کی ناقابلِ یقین حلاوت ـــــ یہ ایسی چیزیں ہیں جو اسی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

'دھاندڑ' (ڈیکھنس) میں یہ فیمی خاکے کے ساتھ اس شخصیت کا فوٹو ہے۔ فیض احمد فیض میر پور خاص کے ایک ۱۹۷۳ء میں منعقد والے مشاعرے میں نظم پڑھ رہے ہیں (انیس شاہ نے اس میں شرکت کی تھی)۔ سب سے دلچسپ تصویر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ہے۔ سکھر کے ایک فوٹوگرافر کی کھینچی ہوئی اور ان دنوں کی جب وہ صاحبِ اقتدار تھے۔ سفید سوٹ، سیاہ ٹائی پہنے وہ آنکھیں پھاڑے کھڑکی میں کسی جگہ کھڑے ہیں اور ہمارے انیس شاہ جیلانی کا ماموں سید بہادر علی شاہ جیلانی سرائیکی پگڑا اور قبا میں ان کی آنکھوں میں سرمے کی سلائی پھری ہے ـــــ تعظیم اور چاہت کی علامت ـــــ کجل کی یہ دھار سرائیکی شاعری اور ادب میں بار بار آتی ہے...... ہم سب روہی کے رہنے والے اس کجل کی دھار کے کشتہ ہیں ہم پہ رحم کھاؤ۔

تو یہ ہے انیس شاہ جیلانی کی دل لبھانے والی کتاب ایک قیمتی دستاویز۔ غالباً سرائیکی میں اپنی طرز کی پہلی اور واحد کتاب۔ اللہ اس دیوانے روپیے، کے وسائل اتنے دیتا کرے کہ وہ اپنے سب خواب پورے کر سکے۔ وہ ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا اور جیسا کہ انگریزی شاعر رابرٹ براؤننگ نے کہا ہے عمر کا بہترین حصہ آگے آنے والا ہے:

The Best is yet to Be

●●

"فنون" ۳۴، ستمبر۔ دسمبر ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
بیروباڑی، گوہاٹی - ۷۸۱۰۱۳

من آنم کہ من دانم

اپنی بابت لکھتے ہوئے سب سے پیشتر یہ عرض کرنا ہے کہ میں صرف پانچویں جماعت تک اُردو کا طالب علم رہا۔ میرے لیے رسم الخط کی شناسائی کے علاوہ کریما، بوستاں، گلستاں وغیرہ شروع کی جاتی تھیں۔ بریلی کے ڈی۔ اے۔ وی۔ اسکول میں پانچویں جماعت تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ مکتب میں جو شام کو صرف پانچ گھنٹوں کے لیے لگتا تھا، میں شام ڈھلے تک جا سکتا تھا کہ میرٹھ ضلع کے نیچے بھیج دیا گیا جہاں دو کلاسیکل زبانیں لینا لازمی تھا میں نے لاطینی اور فارسی پسند کیں جو ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس پس منظر میں بچے کے ذہن کی پرداخت دیرینہ ادبیات کے گہواروں سے گزرنے میں خوش سامانی سے بھرپور ہوتی ہے۔ جہاں تک اُردو کا سوال ہے پانچویں جماعت تک ہی پڑھ سکا۔ مجھے بے بسی کم مائیگی کا احساس ابھی تک رہتا ہے۔ اُردو سے دلچسپی پیچ پیچ کر عشق میں تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی اور غالباً اُردو سے میرا دل لگاؤ اس دور کے ماحول سے بھی عبارت تھا لہٰذا اس ماحول پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بریلی کا محلہ ملوک پور مخلوط آبادی پر مشتمل تھا۔ بیشتر مکانات کائستھوں (سکسینہ اور بھٹناگر) اور مسلمانوں کے تھے۔ مزید برآں دستگیروں میں ہمارا خاندان اور برہمنوں میں لالہ مہاراج جو باقی میں صاحب املاک تھے۔ ملوک پور میں آباد تھے۔ اردو اپنے پورے شباب پر تھی اور فضا بھی اس سے معمور رہتی تھی۔ آئے دن مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ ان دنوں سیکولر کی اصطلاح سے کون واقف ہو سکتا تھا مگر ہندو مسلمانوں میں رواداری، وضعداری حسب معمول رائج الوقت تھے۔

ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے ذکر سے ۱۹۲۱ء کی فضا یاد آ گئی۔ وہ ہمت حسن نے تمام اختلافات کو مٹا دیا تھا۔ ایک واقعہ ذکر یہاں کافی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ بریلی کے محلہ کوتوالی میں ایک مندر جس کا نام بیتارام مندر ہے۔ اس مندر کا دالان اور چبوترا دکن۔ وہیں اور سیڑھیوں سے اترتے ہوئے مندر کا صحن ہے جو وسیع و عریض ہے کہ تقریباً دس ہزار آدمی بآسانی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہیں پر علی برادران (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی)، پیران کی تقاریر سنیں۔ عطاء اللہ شاہ بخاری بڑے زور و شور سے تقریر کرتے تھے۔ جوش میں آکر میان میں پڑی ہوئی تلوار نکال کر تو ان کی تقریر بھی وہیں سنی۔

ایک اور میٹنگ کا ذکر غالباً غیر ضروری نہ ہوگا:
مولانا حسین احمد مدنی خطاب کرنے سے پہلے نعرۂ تکبیر بلند کرتے تھے اور حاضرین ہدایت کے مطابق اللہ اکبر بہت بلند آواز میں کہتے۔ مندر کے صحن میں نعرۂ تکبیر کا بلند ہونا اور ہندوؤں مسلمانوں کا اجتماعی طور بآواز بلند اللہ اکبر کہنا کیا حسن سلوک پر روشنی نہیں ڈالتا۔ ان اجتماعات کا مجھ پر جو اثر مرتب ہوا اس سے وطن پرستی کا جذبہ ابھرا! جو آج تک تنزل نہیں ہوا۔

وطن پرستی کے محور پر گردش کرتی ہوئی ایک اور داستان پیش ہے جس کی بابت ایک معترضہ سنا ہوا ہے کہ

وہ حقیقت جو اب فسانہ ہے ـــــ یا
وہ فسانہ جو کل حقیقت تھا

۱۹۴۲ء میں بھارت چھوڑو تحریک ملک کے گوشے گوشے میں جوش و خروش سے چلائی جا رہی تھی اور اس کی قیادت صرف نوجوان ہاتھوں میں تھی بالخصوص ان طلبا کے ہاتھوں میں جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن تھے۔ البتہ کبھی کبھی جے پرکاش، اچیوت پٹوردھن اور ارونا آصف علی پر مشتمل روپوش قیادت سے بھی احکامات موصول ہو جاتے تھے مگر چونکہ تمام تر انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے اخبارات نے حکومت کی پالیسی کے خلاف بطور احتجاج اشاعت بند کر دی تھی اور صرف حکومت نواز اخبارات ہی شائع ہوتے تھے لہذا پارٹی سے احکامات نا قریب مفقود ہو گیا تھا۔ بریلی شہر میں تین چار حلقوں میں منقسم طلبا تحریک کو چلا رہے تھے آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ پولیس کے محافظ خانہ کو جو ڈسٹرکٹ عدالت ہی کے احاطہ میں تھا کس نے [illegible] دیا تھا؟ عدالت اور امپیریل بینک (جو آزادی کے بعد سے اسٹیٹ بینک ہو گیا ہے) کے بیچ کنٹونمنٹ کو جاتی ہوئی سڑک پر تین مرتبہ [illegible] پر کس نے قتل کیا تھا؟ دہلی سے نقل مکانی ہو کر کلکتہ جانے والی اس ٹرین کو جس میں انگریز سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ سوار تھا کس نے پٹری سے اتار کر گرا دیا تھا؟

مذکورہ بالا واقعات میں ہم تین نوجوان دوست شامل تھے ماسٹر محرومت، اکرام حسین اور بشیر دیال مصرا۔ دل چاہتا ہے کہ پوری داستان پر روشنی ڈالوں ـــ

بہ حرف می نتواں گفت تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

ان واقعات کو بالتفصیل بیان کرنے کا تو جی چاہتا ہے مگر میں قلم پر گرفت رکھتے ہوئے اختصار سے ہی کام لوں گا۔ محافظ خانے پر رات کو صرف ایک سپاہی کا پہرا لگا رہتا تھا۔ بشیر دیال مصرا نے راستہ بھول کر ادھر آنکلنے کی بات کرتے ہوئے اس سپاہی کو سگریٹ پیش کیا اور دوسرا خود سلگایا۔ ہمارے پاس خاصا لمبا رستہ تھا اکرام نے پٹرول سے گیلن بھر لے کر اس رستے کو پٹرول میں تر کر لیا۔ دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر اکرام نے مجھ سے کہا کہ تم میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر روشن دان سے رستہ اندر ڈال دو۔ پٹرول میں تر رستہ اندر گرا دیا گیا۔ جو گیلن میں پٹرول بچ رہا تھا بقیہ پٹرول کو اکرام نے پاس کے کنوئیں میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب اور مزا آئے گا"۔

رستے کا دوسرا سرا میرے ہاتھ میں تھا سیٹی بجاتے ہوئے بشیر دیال مصرا کو اشارہ کیا گیا کہ وہ سڑک پر چلے جائیں۔ اس کے بعد اکرام نے رستے کے سرے میں دیا سلائی لگائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا رستہ جلنے لگا اور محافظ خانے میں آگ لگ گئی۔ فائر بریگیڈ کا دستہ آیا مگر اس نے کنوئیں میں پائپ ڈال کر آگ بجھانا شروع کیا مگر اس میں پٹرول بھی تھا لہذا فائر بریگیڈ نے آگ کے شعلوں کو مزید بلند کر دیا۔ بریلی کے محافظ خانے میں لگی آگ کئی دنوں میں بجھائی جا سکی۔ غالباً پورے چار دنوں میں آگ پر قابو پایا جا سکا۔

اس واقعے کے پورے گیارہ دن بعد ایک اور واقعہ ہو گیا۔ ان دنوں دیسی ساخت کے پستول تک ہی رسائی ہو سکتی تھی امپیریل بینک کے بائیں جانب سڑک کچہری روڈ سے کنٹونمنٹ کو جاتی تھی۔ اس سڑک پر ٹریفک بہت کم رہا کرتی تھی سڑک قریب قریب سنسان تھی ادھر ہم کنٹونمنٹ کے [illegible] کے ساتھیوں کو لینے جا رہے تھے کہ تین فوجی افسر آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دو انگریز لیفٹیننٹ اور ایک ہندوستانی سکنڈ لیفٹیننٹ۔ کوئی بھی [illegible] مگر اکرام نے دونوں انگریز افسروں کو گولی سے اڑا دیا۔ تیسرے ہندوستانی افسر نے مورچہ سنبھال لیا۔ ایک پیڑ کی اوٹ سے اس نے گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ ہندوستانی افسر کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا مگر اکرام نے عمداً گریز کیا اور ہم تینوں پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے اس کی زد سے باہر ہو کر فرار ہو گئے۔

اسی نوعیت کی دوسری سرگرمیوں یعنی سیاسی نوعیت کی سرگرمیوں میں ہم تینوں دوست ہی کیا بے شمار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی حصہ لیتے ہوئے آزادی کے لیے جدوجہد میں مشغول رہے اور اس میں توجہ طلب وہ اشتراک عمل تھا جو بلا امتیاز مذہب و ملت سب کو ایک محاذ پر لے آیا تھا۔ پولیس کی گرفت میں آ جانے پر اکثر نوجوان اپنا صحیح نام و پتہ بھی نہیں بتلاتے تھے۔ حصول آزادی کے بعد میں نے اور میرے بے شمار دوستوں نے سیاسی تنظیموں میں اپنا اندراج کرانا اہانت آمیز سمجھا کیوں کہ ہم اپنی وطن پرستی کو انتخابی مفادات سے بالاتر سمجھتے تھے اور ہنوز سمجھتے ہیں۔ ایسی کوئی پنشن وطن پرستی کو بازاری جنس بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اقدار سے وابستگی کردار سازی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ۱۴؍ اگست ۱۹۸۲ء کی حشر انگیز رات کو لینڈ سلائڈ (land slide) نے میرا گھر تباہ کر دیا اور میری شریک حیات (جو ڈاکٹر تھی اور خاصی کامیاب سمجھی جاتی تھی) مع تین بچوں (ایک بیٹا اور دو بیٹیاں) کے لقمۂ اجل ہو گئے۔ نتیجۃً میری زندگی کے سارے مقاصد ہی فنا ہو گئے مگر بایں ہمہ میں نے پولیٹیکل پنشن کے لئے درخواست ارسال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ حسِ وابستگی (Sense of Commitment)۔ آج کل کی گرانی کے دور میں بھی عزیز جان رکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے مگر اصولوں کی پاسداری بھی کوئی چیز ہے ـــ

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

([illegible])

سیلِ شعور (Stream of Consciousness) نے کیا کچھ لکھوا دیا ہے۔ یہ بات سے ہٹ کر ادبیات سے متعلق جو ناقابلِ فراموش باتیں ذہن میں محفوظ ہیں وہ کم دلچسپ نہیں ہیں۔ محلہ لوک پور میں ہمارے گھر کے سامنے ہی ٹھاکر موتی سنگھ حسرت کا مکان تھا۔ پنڈت برج نرائن چکبست کو میں نے ٹھاکر صاحب کے یہاں دو دفعہ دیکھا۔ حسرت اور چکبست شکل و صورت میں بھی خاصی مشابہت رکھتے تھے۔ ۱۹۱۹ یا ۱۹۲۰ء کے دوران ایک بار دونوں کے مابین جو گفتگو ہو رہی تھی خاصی دلچسپ ہے۔

ٹھاکر صاحب کا بڑا لڑکا میرا دوست تھا۔ میں اس کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ چکبست کی نظم "راماین کا ایک سین" شائع ہو چکی تھی جو درج ذیل شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام

ٹھاکر صاحب نے تاثر خواہ داد دیتے ہوئے مذکورہ شعر کو قدرے ترمیم سے پڑھتے ہوئے داد دی تھی یعنی یوں ؎

رخصت ہوا وہ باپ کو کرتا ہوا پرنام
راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام

چکبست زور سے ہنس پڑے اور ٹھاکر صاحب کے ادبیاتی رموز بینی کی داد دینے لگے۔ "بالکل صحیح اصلاح فرمائی ہے حسرت صاحب آپ نے جنید بہر کیف 'خدا' کا استعمال کیوں کرے گا۔ واہ حضرت! لفظ 'پرنام' کو بھی آپ نے صحیح تلفظ میں استعمال کیا ہے خوب!" اسی طرح چکبست نے جواب دیا تھا۔

استاذی نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی (مرحوم) کا ذکر بھی کچھ بے محل نہ ہوگا۔ بالخصوص اس لیے بھی کہ ہمارے تعلقات ۱۹۲۳ء سے ان کی رحلت تک کے عرصے کو محیط رہے۔ مرحوم دل و دماغ کی جملہ خوبیوں کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دبستانِ دانش و بینش تھے۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے کیا تھا اور اس کالج کے گریجویٹ ہونے والے پہلے بیچ (Batch) میں شامل تھے۔ انگریزی اچھی لکھتے تھے اور انگریزی بولتے وقت تلفظ میں سب سے محتاط رہتے تھے۔ جب مجھے تک بندی کا شوق ہوا اور میں نے ان سے رجوع کیا، اس وقت وہ بلیا میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ انھوں نے شرفِ تلمذ سے مجھے نوازنا منظور فرمایا، جو میرے لیے موجبِ افتخار و تفوق ہے۔ سبکدوش ہو کر ریاست جموں و کشمیر میں دیوان ہو گئے اور وہاں سے واپس آکر لکھنؤ ہی میں رہے۔ کشمیری محلہ میں استاذ کا گھر۔ اس کا بھرپور نقشہ میرے تصور میں ممتاز جگہ رکھتا ہے۔

"یادوں کی بارات" میں جوش ملیح آبادی نے جو کچھ لکھا ہے بالکل غلط ہے۔ اثر مرحوم اپنا کلام سنانے سے بجز بیشتر احتراز کیا کرتے تھے۔ مئی ۱۹۴۹ء کے دوران جب میں سوانگی (آسام) پر ڈگری کالج میں پرنسپل تھا، استاذی کے گھر پہونچا۔ ڈاکٹر ... پاکستان سے آیا ہوا ادیب بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے بے حد اصرار پر انھوں نے اپنی غزل کے چند اشعار سنائے جن میں درج ذیل شعر سنانے کے فوراً بعد مجھ سے کہا کہ "انگریزی کے بہ وجہ بہت پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور وہ بالعموم آخذ کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔ تاثر کی یہ خیال میں نے کہاں سے لیا ہے؟" شعر تھا ؎

ان پہ ہنسیے شوق سے جو مائلِ فریاد ہوں
ان سے ڈریے جو ستم پر مسکرا کر رہ گئے

اگر دریافت نہ کیا گیا ہوتا تو میرے تصور کو مہمیز کون کرتا؟ در اصل پر میرا تصور شکسپیر کے معروف ڈرامے جولیس سیزر پر گیا جہاں کیشیس سے متعلق سیزر نے کہا ہے کہ "یہ شخص ہنستا نہیں ہے خطرناک ہو سکتا ہے"۔ میں نے یہی بتا دیا جس کو سن کر بہت خوش ہوئے۔

میری کاوشات میں اثر مرحوم کے "اثر" کی نشاندہی کو ہے۔ ان کی دو تین ہدایات لائقِ توجہ و عمل ہیں:

(۱) اگر کسی شعر میں خاص نکتہ پیش کیا گیا ہو مگر جاذب اثر نہ معلوم ہوتا ہو یعنی کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت سے لبریز و سرشار نہ ہوا ہو تو استفہامیہ یا استعجابیہ کے اس کو دلکش بنایا جا سکتا ہے۔

(۲) شعر میں اگر ابہام ہو تو اس نوعیت کا ہو کہ اس کی تشہیر میں ناشنیدہ موسیقی کے ذہنی و قلبی محسوسات کا پتہ لگاتا ہو، اگر یہ خوبی نہ ہو تو ابہام 'ابہام' نہیں بلکہ اہمال ہے۔

(۳) تنقید بھی دشوار و مشکل تخلیق ہے۔ ناقد کو تقابلی ادب سے گہری شناسائی ضروری ہے۔ شعر و شاعر کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اور بھی کار آمد رموز و خواص ہیں مگر یہ مضمون ان سب پر روشنی سے بہت طویل ہو جائے گا۔

سہیل عظیم آبادی مرحوم، جنھیں میں بھائی جان کہا کرتا، بڑی وضع قطع کے آدمی تھے۔ اگر وہ میری ہمت افزائی نہ فرماتے اور ہدایت سے نہ نوازتے تو میری ادبیاتی شگفت غالباً قدرے بحال آگیں نہ ہوتی۔ ایک مثال، تنقید میں خلوص و تلاش ...

حوصلہ بھی بہت ضروری ہے۔ اقبال پر میری تنقید نے ثابت کیا ہے کہ وہ برہمن نژاد (برہمن زاد میں ذم کا پہلو مضمر ہے) نہیں تھے

بھائی جان کو ایک خط میں جب اس کی بابت لکھا تو انھوں نے فرمایا کہ جرأت مندانہ طور پر اس مسئلہ کو رائے بحث و مباحثہ پیش کروں۔ بھائی جان (قطع کلام معاف فرمائیں) مجھے روز خط لکھتے تھے لہذا ہفتہ میں ایک دو ایسا بھی ہوتا تھا کہ مجھے ان کے دو خط ملتے یعنی ایک وہ بھی جو اتوار کو لکھا جاتا۔ اتوار کو لکھے گئے خط میں مضمون لکھنے کو کہا گیا تھا اور اس کی ایک کاپی بھی طلب فرمائی ــ

"اقبال سے متعلق چار فیصلہ طلب امور" جو ہماری زبان کو دیا گیا تھا، اس کی ایک کاپی بھائی جان کو پوسٹ کردی گئی۔ بھائی جان نے "شیرازہ" کے کشمیری شمارے میں اس مضمون کا کشمیری زبان میں ترجمہ چھپوا دیا۔ کہا جاتا تھا کہ وادی میں اقبال کے خاندانی سلسلے ہنوز ہند میں مگر ایک بھی آگے نہ آیا۔

ٹونک پر شعرزار محلہ تھا جہاں اردو، فارسی زبانوں کے ادبیات کا تذکرہ رہتا تھا۔ فانی بدایونی، بسمل بدایونی، دل شاہجہان پوری ایسی شخصیات سے میں بے حد متاثر ہوا۔ ایک نشست میں دل صاحب نے ایک شعر پڑھا جو ایک دم از بر ہوگیا ــ

جانے جانے کس نظر سے اس نے دیکھا کیا کہوں
دل کے افسانے میں اک ٹکڑا نیا شامل ہوا

لفظ ٹکڑا کو کیسی شعری وضاحت سے آراستہ کیا گیا ہے۔

تعلیمی اکتسابات میں چار مضامین (انگریزی، تاریخ، فارسی) میں ماسٹرز ڈگریاں اور انگریزی ادبیات میں ڈاکٹریٹ نیز متعدد مضامین میں ڈپلومے وغیرہ شامل ہونے کی وجہ سے شخصیات کا مجھ پر خاصا اثر پڑا۔

چونکہ انگریزی زبان کا پروفیسر اور بعد کو پوسٹ گریجویٹ کا پرنسپل ہو جانے کی وجہ سے میں ایسے علاقوں میں بھی رہا اردو اور ہندی زبانیں مروج نہیں ہیں لہٰذا انگریزی زبان ہی کا رہا ہوں۔ اگر ریڈیو، ٹی وی ایسے ذرائع ابلاغ تک رسائی نہ ہو تو غالب اردو سے بالکل نا آشنا ہوگیا ہوتا۔ آسام، میزورم وغیرہ علاقوں میں رہنے کی وجہ سے مجھ میں دردوں بینی پیدا ہو

ہر کجا رفتیم سیر خلوت دل داشتیم
بیدل آغوش فلک ہم دور این خانہ بود

اب زندگی کی ۸۲ ویں خزاں سے دوچار ہوں۔

انگریزی میں سات اور اردو میں دو تصنیفات چھپ کر چکا ہوں اور بے شمار سمیناروں میں شرکت کرتا رہا ہوں اور "نامی" کی جانب محو سفر ہوں اور بس۔

□□

"نیا دور" مئی ۹۳ء

بیگم ثاقبہ رحیم الدین ـــــ ایک تعارف

بیگم ثاقبہ رحیم الدین پاکستان کی ادبی دنیا میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اور اپنے سماجی کاموں کی وجہ سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ آپ نے ادبی مضامین اور بچوں کے لئے کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا تعلق ایک معزز تعلیمی خاندان سے ہے۔ ان کے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستان کے ماہر تعلیم اور صدر تھے۔ دوسرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین بارہ ادبی کتابوں کے مصنف تھے۔ اور انہیں غالب کی اُردو شاعری کا انگلش میں ترجمہ کرنے پر ہندوستان کے بہترین ادبی انعام سے نوازا گیا۔ آپ ڈاکٹر محمود حسین مرحوم کی دختر ہیں۔ جو وفاقی وزیر تعلیم، وائس چانسلر کراچی اور ڈھاکہ یونیورسٹی بھی رہے۔ آپ کے والد ایک تعلیمی ادارے "جامع تعلیم ملی" سندھ کے بانی تھے۔ اور ۲۸ سال تک اس کی امارت کو رونق بخشی اور مسلسل خدمت کی۔ آج بھی یہ ملیر کراچی میں مستحکم بنیادوں پر علم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ بیگم ثاقبہ رحیم الدین نے ۲۹ سال تک سپاہیوں کے خاندان کی ویلفیئر کے لئے شب و روز اعزازی کام کیا۔ اسی طرح اعزازی خدمات تعلیم بالغاں اور بچوں کی صحت و ادب کی تنظیموں میں انجام دیتی رہیں۔ چند سال تک اعزازی طور پر درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ آپ نے ادبی تنظیم "قلم قبیلہ" اور بچوں کی تنظیم "پاکستان چلڈرن اکیڈمی" کی بنیاد ڈالی اور مندرجہ ذیل اداروں میں کام کیا۔

(ا) "قلم قبیلہ" ادبی تنظیم بانی اور تا زندگی صدر۔ (ب) "پاکستان چلڈرن اکیڈمی" بانی اور تا زندگی صدر۔ اکیڈمی کی پاکستان میں نو شاخیں ہیں۔ (ج) محروم سماعت ویلفیئر سوسائٹی کی صدر۔ (د) صوبائی گرل گائیڈ ایسوسی ایشن کی پیٹرن (بلوچستان)۔ (ہ) محروم بصارت ایسوسی ایشن آف بلوچستان کی پیٹرن (س) علمی و ادبی تنظیم "اقبال اکیڈمی" پاکستان لاہور کی ممبر۔ (ش) مصنفین کمیٹی پاکستان اور اشاعت کنندگان کمیٹی پاکستان کی صدر (ص) غریب بچوں کے ادارہ "گہوارہ" راولپنڈی کی سرپرست۔ (ض) معذور بچوں کے لئے "سرور سکول" پشاور کی ممبر اور "بنات تعلیم القرآن ہائی اسکول ایبٹ آباد" کی سرپرست اعلیٰ۔ "یونیورسل گرلز کالج راولپنڈی" کی سرپرست۔

ذاتی تعلیم | آپ ایف اے کی طالبہ تھیں کہ آپ کی شادی جنرل رحیم الدین خان سے ہو گئی۔ شادی کے بعد آپ نے تعلیم جاری رکھی۔ اور ایم اے اُردو فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ حال ہی میں آپ اُردو ادب میں ڈاکٹریٹ کا ریسرچ مقالہ لکھ رہی ہیں۔

ادبی خدمات | (ا) آپ نے دو جلدوں پر مشتمل قلم قبیلہ کے ادبی کام کو مرتب کیا۔ (ب) اکیڈمی کی طرف سے "میں پاکستانی ہوں" کی دو جلدوں کو مرتب کیا۔ اور آپ درج ذیل کتب کی مصنفہ بھی ہیں۔ (۱) "صبح کا تارا" بچوں کے لئے کہانیوں کی کتاب۔ (۲) "پیام محبت و انسانیت" "سیرت النبیؐ" (۳) "محفل تنہائی" ادبی مضامین۔ (۴) "جاگو جاگو" بچوں کے لئے کہانیوں کی کتاب۔ (۵) "مکتب چلے چلو" بچوں کیلئے کہانیوں کی کتاب (۶) "تہذیب کے زخم" ادبی مضامین۔ زیر اشاعت (۷) "سورج ڈھلے" بچوں کے لئے کہانیاں۔ زیر تصنیف۔ (۸) "نیند آئی" بچوں کے لئے کہانیاں۔ زیر تصنیف ـــ (۹) ادبی سہ ماہی رسالہ "قلم قبیلہ" کی نگران و مدیرہ اور (۱۰) بچوں کے لئے رسالہ "روشنی" کی نگران و مدیرہ اور پبلشر۔ (۱۱) اس کے علاوہ آپ کی کتاب "جاگو جاگو" کا اکادمی ادبیات پاکستان سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی میں ترجمہ کروا کر اشاعت کروا رہی ہے۔

بیگم ثاقبہ رحیم الدین کی طرف سے بچوں کی ویلفیئر کے لئے خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی تنظیم یونیسیف (UNICEF) نے آپ کو سال ۱۹۸۹ء میں کمپلیمنٹری اعزاز بھی عطا کیا۔ بیگم رحیم الدین اپنے مضامین (ARTICLES) ذیل جگہوں پر پڑھتی رہی ہیں۔

(ا) اقبال کانگریس۔ لاہور۔ (ب) اقبال اکیڈمی۔ لاہور۔ (ج) اسلامی کانفرنس برائے بین الاقوامی خواتین۔ اسلام آباد۔ (د) پاکستان اہل قلم کانفرنس اسلام آباد (ر) پاکستان سیرت کانفرنس۔ اسلام آباد۔ وغیرہ وغیرہ ـــ آپ کی بہت سی ادبی کاوشیں پہلے ہی مندرجہ ذیل مشہور ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

فنون، اوراق، نگار، نیرنگِ خیال، تخلیق، افکار، ماہِ نو، محفل، ادبی مجلہ، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، دانشور، شب خون، ہم قلم، نوائے زبان، ادبی مجلہ، قلم قبیلہ مجلہ ۔۔ آپ کی تحریریں بچوں کی کہانیاں وغیرہ بچوں کے رسائل پاکستان بھر میں عرصے سے شائع ہو رہی ہیں۔

نونہال۔ ٹوٹ بٹوٹ۔ بچوں کا رسالہ۔ انکل سرگم۔ ننھے جاسوس۔ بچوں کا اخبار۔ چاند ستارے۔ مستقبل۔ آنکھ مچولی۔ پھول۔

بیگم رحیم الدین نے کسی بنا پر بطور طالبہ کچھ ملازمت اختیار نہیں کی۔ تھیسس ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ آپ تخلیقِ ادب کو زندگی کا اہم مقصد مانتے ہوئے ادبی خدمات میں مصروف ہیں کہ "وہ آپ نہ صرف پاکستانی بچوں بلکہ عالمی سطح پر بچوں کی دنیا میں مثبت تبدیلی لاکر اُن کے روشن مستقبل کے لئے ہردم کوشش کر رہی ہیں۔ ثاقبہ رحیم الدین کی اہم تصانیف ۱۹۹۲ء تک۔

(۱) "صبح کا تارا" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (۲) "پیغام محبت و انسانیت" سیرت نبوی پر مضامین۔ (۳) "محفل تنہائی" ادبی مضامین کا مجموعہ۔ (۴) "جاگو جاگو" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (۵) "دوستو چلو چلو" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (۶) "سورج ڈھلے" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (۷) "تہذیب کے زخم" ادبی مضامین کا مجموعہ۔ (زیرِ تصنیف ہے)۔ (۸) "نیند آئی" بچوں کے لئے کہانیاں۔ (زیرِ تصنیف ہے)۔ (۹) منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ "قلم قبیلہ" جلد اوّل مرتب کیا۔ (۱۰) منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ "قلم قبیلہ" جلد دوم۔ مرتب کیا۔ (۱۱) "میں پاکستانی ہوں" بچوں کے لئے کہانیاں جلد اوّل مرتب کیا۔ (۱۲) "میں پاکستانی ہوں" بچوں کے لئے کہانیاں جلد دوم مرتب کیا۔ (۱۳) ادبی مجلہ "قلم قبیلہ" کی مدیر اور نگران اور سرپرست۔ (۱۴) بچوں کا رسالہ "روشنی" کی مدیرہ اور نگران اور سرپرست۔

(ملنے کا پتہ :۔ ۹ جامی روڈ۔ راولپنڈی)

(۱۵) ادبی ٹرسٹ "قلم قبیلہ" کی بانی، سرپرست اور تاحیات چیئرپرسن۔ (۱۶) بچوں کا ادارہ "پاکستان چلڈرنز اکیڈمی" کی بانی، سرپرست اور تاحیات چیئرپرسن۔

A ۔ کتاب "صبح کا تارا" ۔۔ دوسرا شمارہ زیر اشاعت ہے۔
B ۔ کتاب "پیغام محبت و انسانیت" ۔ دوسرا شمارہ شائع ہو چکا ہے۔
C ۔ "قلم قبیلہ" منتخب ادبی تحریروں کا مجموعہ جلد دوم ۔۔ دوسرا شمارہ زیر اشاعت ہے۔
(اس لئے A ، C نہیں بھیجی جا رہی ہیں)

العلم کراچی جنوری تا مارچ ۹۳ء

میراجی کے بارے میں ایک خط

عزیزم رشید امجد!

سلام بن رزاق نے آپ کا خط پہنچا دیا تھا۔ انہیں دنوں مجھے آنکھ کا آپریشن کرنا پڑا۔ لکھنا پڑھنا کچھ دنوں کے لئے معطل ہو گیا۔

میراجی کی شخصیت اور فن پر لکھنا تو لمبا کام ہے۔ کبھی کراچی یا اسلام آباد آیا تو ملنے اس موضوع پر باتیں کر لیں گے۔

وہ پارسی لڑکی جس کے بارے میں آپ جاننا چاہتے ہیں اس کا نام منی رباڈی تھا۔ اس لڑکی سے میراجی کے عشق کو بہت اہمیت نہ دیجئے۔ ایسی اور بہت لڑکیاں ہیں۔ وہ ایک دلی ریڈیو اسٹیشن پر تھیں۔ مجھے ان کے نام یاد نہیں۔

میراجی بمبئی آنے کے بعد کچھ دن چار بنگلے میں بھی رہے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی کوٹھی نما عمارت تھی کس کی تھی مجھے نہیں معلوم۔ اکثر ادیبوں اور شاعروں کو یہاں رہنے کا ٹھکانا مل جاتا تھا۔ کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، وشوامتر عادل اور کئی ادیب اور شاعر بمبئی آنے کے بعد وہیں رہے تھے۔ میراجی بھی کچھ دن وہاں رہے۔ کچھ دن دادر میں مہندر ناتھ کے پاس رہے اس کے بعد موہن سہگل کے پاس، ماٹنگا منتقل ہو گئے تھے۔ موہن سہگل، وشوامتر عادل، منی رباڈی، اس کی بہن نرگس، جو فلموں میں شمی کے نام سے معروف ہوئی اور ان کے ساتھ اور بہت سے لڑکے لڑکیاں انڈین پیپلز تھیٹر سے وابستہ تھے۔ منی رباڈی موہن سہگل کی دوست تھیں۔ وہ آجکل فلموں کے لئے ڈریس ڈیزائنر کا کام کرتی ہیں۔

میں ان دنوں شالیمار پکچرس سے وابستہ تھا، جو پونے میں تھی۔ جوش ملیح آبادی اور کرشن چندر بھی وہیں تھے۔ تقسیم ہند کے بعد کمپنی کے مالک ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد لاہور چلے گئے، کمپنی بند ہو گئی میں بمبئی آ گیا۔

میراجی سے میری ملاقات سنہ ۴۰ء یا ۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو پر ہوئی تھی۔ کچھ دن میں نے بھی وہاں کام کیا تھا۔ شام کو ہم دونوں کا اکثر ساتھ رہتا تھا۔ دلی میں لال قلعے کے سامنے جو بازار ہے وہاں ایک ریستوران تھا۔ وہاں بیٹھ کر ڈرافٹ بیر پیا کرتے تھے۔ چھے آنے کا گلاس ملا کرتا تھا۔

میں دلی سے میرٹھ چلا گیا۔ کچھ دن سپلائی کے محکمہ میں کام کیا۔ پھر ایم۔ اے کے لئے علیگڑھ یونیورسٹی چلا

گیا۔ علیگڈھ سے پونے گیا تھا۔

میراجی بھی تلاش معاش میں بمبئی آئے۔ وہاں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ملا تو میرے پاس پونے آگئے اور میرے پونا چھوڑنے تک وہیں میرے پاس ہی رہے۔ کام وہاں بھی انہیں نہیں مل سکا۔ ۱۹۴۸ء میں جب بمبئی آیا تو میراجی بھی آگئے۔

موہن سہگل فلم ڈائریکٹر بن گئے اور وہ مکان چھوڑ گئے۔ وشوامتر عادل مدراس کی ایک فلم کمپنی سے متعلق ہو کر مدراس چلے گئے۔ مہاتی نام کے ایک فلم جرنلسٹ میرے دوست تھے۔ لاہور جاتے وقت وہ اپنا فلیٹ مجھے دے گئے۔ وہ فلیٹ میں نے مدھوسودن اور میراجی کو دے دیا۔

کچھ مدت وہاں رہنے کے بعد میراجی بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا ان کی آنتوں میں زخم ہو گئے ہیں۔ یہ کثرت سے دیسی کچی شراب پینے کا نتیجہ تھا۔ مجھے باندرہ میں ایک مکان مل گیا تھا۔ میں انہیں اپنے پاس لے آیا۔ دو ڈاکٹر ان کا علاج کرتے رہے۔ ان میں ایک ہومیوپیتھ تھا۔ میراجی کا اصرار تھا انہیں ضرور بلایا جائے اس کے باوجود بھی کہ علاج برابر جاری رہا انہیں افاقہ نہیں ہوا اور ان کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ حوائج ضروری کے لئے پلنگ سے اٹھ کر پاخانے تک جاتے جاتے کپڑے خراب ہو جاتے تھے۔ فرش تک گندہ ہو جاتا تھا۔ مہترانی نے کچھ دن کام کرنے کے بعد انکار کر دیا۔ وہ کام میری بیوی کو کرنا پڑا۔

میری شادی انہیں دنوں ہوئی تھی۔ میری بیوی کم عمر بھی تھیں، سولہ سترہ کے قریب ان کی عمر تھی۔ میری اور ان کی عمر میں پندرہ سال کا فرق تھا۔ میرے گھر کے قریب بھابا اسپتال تھا۔ اس کے انچارج ڈاکٹر ملوے میرے دوست تھے۔ میراجی کی یہ حالت دیکھ کر انہوں نے مشورہ دیا میں انہیں اسپتال میں منتقل کر دوں۔ کھانا گھر سے بھجوا دیا کروں اس لئے کہ ساگودانہ یا اسی طرح کا بہت ہلکا کھانا ڈاکٹر نے ان کے لئے تجویز کیا تھا۔ چنانچہ انہیں بھابا اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ایک دو بار میں اسپتال جاتا تھا ڈاکٹر بھی آتے رہتے تھے۔

ایک روز ڈاکٹر ملوے نے آکر شکایت کی میراجی پرہیز نہیں کرتے۔ برابر کے مریضوں سے مانگ کر دال چاول کھا لیتے ہیں۔

میں نے اسپتال جا کر انہیں بہت سمجھایا مگر میری بات کا ان پہ کوئی اثر نہیں ہوا اور نہایت ڈھٹائی سے کہنے لگے "میں تو گھر میں رات کو باورچی خانے میں جا کر کھانا کھا لیتا تھا" تب مجھے احساس ہوا اتنے علاج کے باوجود بھی وہ کیوں ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں نے انہیں لالچ بھی دیا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو والدہ کے پاس لاہور بھجوا دوں گا مگر ان کی حالت گرتی ہی چلی گئی اور ایک روز ڈاکٹر نے

مجھے بتایا۔ ان کی ذہنی حالت بگڑ گئی ہے۔ جو گیا ہے۔

مجھے بڑا افسوس ہوا۔ ڈاکٹر نے بتایا آتشک کے مریضوں کے ساتھ ایک عمر میں ہو جانا ممکن ہے ان کی عمر اس وقت پینتیس کے قریب تھی مگر بال سب سفید ہو گئے تھے۔ انجان لوگ کبھی کبھی پوچھ بیٹھتے تھے۔

"یہ آپ کے والد ہیں؟"

اس روز انہیں جاجا اسپتال سے کے۔ای۔ایم (KEM) اسپتال میں منتقل کیا ڈاکٹر نے کہا، انہیں بجلی کے جھٹکے دینے پڑیں گے۔ میرا جی یہ سن کر بہت افسردہ ہوئے۔

"اختر میں یہ نہیں چاہتا۔"

"آپ اچھے ہو جائیں گے"۔ میں نے کہا۔

"میرے دور ہو گئے تو لکھوں گا کیسے؟" انہوں نے افسردہ ہو کر کہا۔

میں ہنسنے لگا۔ "لکھنا تو آپ کے دماغ کا کمال ہے کا نہیں۔"

ایک نوجوان ڈاکٹر جو لاہور سے آیا تھا مجھ سے پوچھنے لگا۔ میرا جی وہ شاعر تو نہیں جو لاہور میں تھے؟ میں نے کہا یہ وہی ہیں۔ اس نے ان کے علاج میں بہت دلچسپی لی۔ میں اور سلطانہ، میری بیوی روز انہیں دیکھنے جاتے تھے۔ ایک روز جو گئے تو معلوم ہوا، انہوں نے ایک نرس کی کلائی میں کاٹ لیا۔ میں نے کہا "میرا جی اتنی خوبصورت نرس کی کلائی میں کاٹ لیا آپ نے"!

بگڑ کر کہنے لگے، "پھر اس نے مجھے انڈا کیوں نہیں دیا کھانے کو"

ایک دو روز بعد ریل گاڑیوں کی ہڑتال ہو گئی اور میں شام کو اسپتال نہیں جا پایا۔ رات کو کھانا کھا رہا تھا کہ اسپتال کا تار ملا کہ میرا جی گذر گئے۔

میرے پڑوس میں نجم الحسن نقوی رہتے تھے۔ مشہور فلم ڈائرکٹر تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا اور ہم دونوں اسی وقت ایڈورڈ میموریل اسپتال پہنچے اور اگلے روز لاش لے جانے کی بات کر کے انہیں وہیں رکھوا دیا۔

میرا جی اپنے زمانے کا بڑا ادبی نام تھا۔ میں نے بمبئی کے تمام ادیبوں کو اطلاع بھجوائی، اخبار میں بھی چھپوایا مگر کوئی ادیب نہیں آیا۔ جنازے کے ساتھ صرف پانچ آدمی تھے۔ میں، مدھوسودن، مہندر ناتھ، نجم نقوی اور میرے ہم زلف آنند بھوشن۔ میرن لائنز کے قبرستان میں تجہیز و تکفین کے

وفات کی تاریخ ۳؍نومبر ۱۹۴۹ء ۔ پیدائش ۲۵؍مئی ۱۹۱۳ء دن سنیچر

بھرتری ہری کا ترجمہ اتنا ہی جتنا چھپا ہے۔ البتہ خیام کی کچھ رباعیوں کا ترجمہ میرے پاس ہے۔ ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو کتابوں کے مسودے "تین رنگ" اور "سہ آتشہ" میرے پاس ہیں۔ کئی سال ادھر کی بات ہے میں بیمار ہو گیا تھا۔ احتیاطاً میں نے اکثر نظمیں نقل کر کے جمیل جالبی اور سب کو بھجوا دی تھیں۔ وہیں نظمیں اکٹھی کر کے ان کا مجموعہ چھاپا گیا ہے۔ چونکہ باہر نظمیں چھپ گئی تھیں اس لئے میں نے کتاب نہیں چھاپی۔ اب ارادہ کر رہا ہوں۔ شاید کچھ نظمیں رہ گئیں۔

انہوں نے آپ بیتی لکھنے کی نیت کئی بار کی تھی مگر کبھی ایک صفحہ کبھی ڈیڑھ صفحہ لکھا اور چھوڑ دیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میراجی سے متعلق تاثرات جاننے کے لئے تو یا آپ کبھی بمبئی آئیے یا کبھی میں ادھر آیا تو ملئے۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

اختر الایمان

۲۷؍ اکتوبر ۹۱ء

(سوغات (۵) ستمبر ۹۳ء)

جناب محمد احمد سبزواری

ابوسعید بزمی

تاریخ صحافت کا ایک روشن ستارہ

ابوسعید بزمی مرحوم ایک کامیاب صحافی، دانشور اور اہل قلم تھے۔ اُن کا تعلق ریاست بھوپال سے تھا۔ وہ مدینہ بجنور، احسان لاہور اور کراچی سے وابستہ رہے تھے۔ حیدرآباد میں رسالہ "انقلاباتِ عالم" جیسی کتاب کے مصنف کی حیثیت سے اُن کی شہرت پورے ملک میں پہنچ چکی تھی۔ درج ذیل مقالہ ان کے ابتدائی ادوار کا احاطہ کرتا ہے۔ بنیادی طور پر بزمی مرحوم ایک انقلابی اور سیماب صفت انسان محسوس ہوتے ہیں۔ وہ ایک خلش خیال کے آدمی تھے لیکن مدینہ بجنور کی ادارت کے دوران اُن کو تحریکِ پاکستان کے تناظر میں بھارت میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کی راہ میں حائل مشکلات کا شدت سے احساس ہوا جس کا اندازہ اس دور کے "مدینہ" کے فائلوں کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے جو ادارہ کی موجودہ لائبریری اسلام آباد میں راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ تقابلی نظر کے مطالعے سے ریاست بھوپال کا وہ خوشنما تصور قائم نہیں رہتا جو شاید ہمارے ذہن و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس ریاست نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور دیگر اداروں کی مدد کی۔ علامہ سر محمد اقبال، سر راس مسعود، علامہ شبلی جیسی گرانمایہ شخصیات کی سرپرستی کی لیکن ہم کو یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ریاست بھوپال میں بہرحال شخصی حکمرانی تھی اور اطراف ملک میں اُبھرنے والی جمہوری تحریکات کے اثرات سے وہ کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی۔ یہ تاریخی کشمکش بھی جو اس وقت سارے ملک میں جاری تھی بہرحال تاریخ کا حصہ ہے اس لیے ہم لوگوں کو جو خوشنما تاریخ کا ایک مخصوص انداز سے مطالعہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے جو جمہوری روایات کے عین مطابق ہے۔ تاہم جناب بزمی مرحوم کے حالات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کا کانگریس کی جانب جھکاؤ ایک سیاسی غلطی تھی۔ (مدیر)

بزمی مرحوم کی وفات کے بعد اُن کے رفیقوں اور دوستوں "اے حمید" (مشہور ناول نگار) "مولانا عبدالمجید سالک" مدیر "روزنامہ انقلاب" لاہور اور مشہور ڈرامہ نگار "سید امتیاز علی تاج" مصنف ڈرامہ انارکلی لاہور نے ابوسعید بزمی کو اپنے مضامین کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا۔ جو لاہور کے پندرہ روزہ اخبار "بنت راوی" میں جس کی مدیرہ بیگم بزمی تھیں بزمی نمبر میں شائع کیا گیا۔ مگر اول تو یہ تحسین و آفریں بڑی محدود رہی۔ دوسرے اس وقت جو کچھ لکھا گیا اس میں ان کی لاہور اور کراچی کی صحافتی زندگی اور ان کی عادات و اخلاق پر ہی روشنی ڈالی گئی اور بچپن اور اوائل جوانی کو تقریباً نظرانداز کر دیا گیا اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ لکھنے والے اس پس منظر سے کما حقہٗ واقف نہ تھے اور کوئی ان کو یہ تفصیلات فراہم بھی نہ کر سکا۔ خود بیگم بزمی کبھی بھوپال نہ جا سکیں کیونکہ سیاسی وجوہات کی بنا پر ابوسعید بزمی کا بھوپال میں داخلہ ممنوع تھا۔ اور ان کو صرف ان چند موٹی موٹی باتوں کا علم ہو سکا جو مرحوم خود ہی بیان کر دیا کرتے تھے۔ ان کے بچے بہت کم سن تھے اور ان کو والد مرحوم کے بچپن کے حالات کو جاننے کا شعور ہی نہ تھا۔ ایسی صورت میں خاندانی حالات بھوپال کے ماحول اور وہاں کے دوستوں اور واقف کاروں کے کوائف اور ان کی ابتدائی سیاسی زندگی کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی اس وجہ سے ان کی

زندگی کا یہ اہم گوشہ تشنہ ہی رہا۔ حافظہ کی بچپن اور جوانی کے نقوش اور فانی زندگی میں بڑا ہی گہرا اثر رکھتے ہیں جو کسی شخصیت کو پوری طرح سمجھنے میں صداقت بہت ضروری ہے۔ بزمی کے ابتدائی حالات میں ملتے ہیں ... راقم الحروف جو شائع ہونے والا بزمی کے اطوار پر یہ حالات کو دوام زندگی کے ان گوشوں کو آنے والی نسل کے لئے محفوظ کر رہا ہوں تاکہ ان کی شخصیت کے صحیح خط و خال سامنے آ سکیں ۔

ریاست بھوپال متحدہ انڈیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست تھی اور ہندوستان میں ریاست حیدرآباد کے بعد اسی کا درجہ تھا۔ برصغیر میں پانچ ریاستوں یعنی حیدرآباد، میسور، کشمیر، بڑودہ اور گوالیار کے رئیسوں کو ۲۱ توپوں کی سلامی ملتی تھی اور بھوپال کے فرماں روا کو اپنی ریاست میں ۲۱ اور بیرون ریاست ۱۹ توپوں کی سلامی ملتی تھی۔ شمالی ہند کے مسلمان تلاش معاش میں حیدرآباد دکن کا رخ کرتے تھے اور جو زیادہ فاصلے پر جانا نہ چاہتے تھے وہ بھوپال ہی میں رک جاتے تھے۔ مسلسل چار خواتین کی فرمانروائی نے ریاست کو امن و امان کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں یہاں نواب سلطان جہاں بیگم کی حکومت تھی جو صرف اہل علم و فن کی قدردان ہی نہ تھیں بلکہ کافی عرصے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی چانسلر بھی رہیں وہ خود صاحب قلم تھیں اور ان کی ذاتی تصانیف کی تعداد ۴۲ ہے۔ بھوپال سے ہندوستان کی مشہور درسگاہوں اور مؤلفین و مصنفین کی امداد کی جاتی تھی۔ جس میں قابل ذکر سیرۃ النبی صلعم کی تالیف کے لئے مولانا شبلی نعمانی کی امداد ہے۔ جس کی نسبت خود علامہ نے ایک قطعہ کہا تھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔ ؎

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل — کہ اس میں اک فقیر بے نوا ہے اور اک سلطان ہے

اسی دور میں ایک عالم مولوی سراج الحق دیوبند سے بھوپال آئے۔ پہلے "قاضی ریاست" پھر "صدر الصدور" کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ عہدہ اکبر کے دور میں تو مرکزی حکومت کے وزارت کے مماثل ہوتا تھا۔ اب اگرچہ اس کی وہ شان تو باقی نہ رہی تھی تاہم یہ عزت و وقار کا ایک اہم عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ علوم دینی کی ترویج، اختلافی فرعی مسائل پر فیصلہ دینا، مسلمان علماء و فقہا سے رابطہ رکھنا، ان کو وظائف یا الاؤنس دینا اور منصب افتاء کے فرائض کی انجام دہی اس کی ذمہ داریاں تھیں۔

مولوی صاحب کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی صاحبزادی ام ہانی۔ دوسرے فرزند (مولوی) انوار الحق عرف ... اور تیسری محمودہ خاتون۔ مولوی صاحب نے اپنی چھوٹی بیٹی کا عقد اپنے بھتیجے حافظ عبداللطیف سے کیا۔ جو بھوپال کے محکمہ قانون انصاف میں ملازم تھے۔

حافظ عبداللطیف مولوی سراج الحق کے بڑے بھائی مولوی فضل الحق نامی ایک ذی علم شخصیت کے صاحبزادے تھے جو دیوبند کے بڑے سنجیدہ اور صاحب علم انسان تھے۔ مولوی فضل الحق دیوبند کے مدرسے کی تاسیس کے سلسلے میں معروف کار رہے اور بعد میں دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے۔ آخر میں اختلافات ہونے کی وجہ سے وہ اس عہدے سے مستعفی ہو گئے تھے۔ مولوی فضل الحق کی چار اولادیں تھیں تین صاحبزادے، ضیاء الحق، لطیف احمد، ظہور الحق اور ایک صاحبزادی خدیجہ نامی تھیں۔ مولوی فضل الحق کا تذکرہ مناظر احسن گیلانی نے مولانا قاسم نانوتویؒ کے سوانح میں کیا ہے۔

ابو سعید بزمی حافظ عبداللطیف کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے جو ۱۵ ستمبر ۱۹۱۱ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق کی اولاد میں کیونکہ یہ پہلا بچہ تھا لہٰذا مولوی صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ ایک روایت کے مطابق ابو سعید بزمی کا پہلا نام ابو قحافہ رکھا گیا تھا اسی زمانے میں ایک نوجوان شاعر اور ادیب اور اس عہد کے لحاظ سے ایک ترقی پسند فرد رشید احمد ارشد تھانوی مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ان سے کچھ دور کی قرابت داری بھی تھی ایک دن جب انہوں نے مولود کا نام سنا تو اس سے سخت اختلاف کیا اور کہا کہ بچے کو اپنی زندگی میں اس نام کی وجہ سے مشکلات پیش آئیں گی پہلے تو نانا نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا لیکن دو چار مرتبہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ابو قحافہ نام تبدیل کر کے ابو سعید رکھ دیا گیا۔ جب سن شعور کو پہنچے تو بزمی تخلص اختیار کیا اور یوں یہ ابو سعید بزمی بن گئے۔ کیونکہ گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس لئے یہ اپنے نانا کے بہت دلارے بن گئے۔ ہر وقت انہی کے ساتھ رہتے۔ مسجد ان کے ساتھ جاتے۔ مولوی صاحب کا اتی قیام بہت

بنگال تھے۔ علاوہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد کے علماء کے ایک گروہ کے کمالات ذہنی پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں شہر بھوپال میں فارسی کا ایک مدرسہ سلیمانیہ تھا نواب صدیق حسن خاں اور مولانا برکت اللہ بھوپالی جیسے اصحاب اس سے منسلک رہے تھے جہاں منشی اور منشی فاضل کی تعلیم دی جاتی تھی جس کے امتحانات جامعہ پنجاب لاہور لیا کرتی تھی چنانچہ برقی کو اس مدرسہ میں داخل کرا دیا گیا اور یہیں سے انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں وہ جامعہ احمدیہ میں داخل ہوئے جس میں فقہ، تفسیر، حدیث، منطق وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور عربیہ تعلیم ہوتی تھی۔ اس درسگاہ میں مقامی طالب علم تو بہت کم ہوتے تھے البتہ پاکستان کے سرحدی صوبہ، قبائلی علاقوں، افغانستان، سمرقند و بخارا کے طالب علم یہاں آیا کرتے تھے۔

برقی کو بچپن ہی سے مصوری کا شوق ہوا۔ جب چھ سات سال کے تھے تو سلیٹ پر جانوروں اور آدمیوں کی شکلیں بنایا کرتے تھے پھر ان کو کہیں سے مصوری کی ایک کتاب مل گئی جس کی وہ نقل کیا کرتے تھے۔ کیونکہ مصوری خاندانی روایات کے منافی تھی اس وجہ سے چھپ چھپ کر اور پلنگ یا تخت کے نیچے بیٹھ کر اپنا شوق پورا کیا کرتے تھے مگر ایک دن پکڑے گئے اور ان کی اس حرکت پر نہ صرف ان کی گوشمالی ہوئی بلکہ ان کی محبوب ترین کتاب کو نذر آتش کر دیا۔ برقی کو برسوں اس حادثے کا صدمہ رہا۔

انگریزی اسکولوں میں کھیل کے میدان تھے اور ہاکی جو بھوپال کا قومی کھیل تھا اس کا عام رواج تھا مگر تعلیم مشرقی کے اسکولوں میں کھیل شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر ان کے گھر کے پاس بھی کوئی میدان نہیں تھا اس وجہ سے یہ ہاکی اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں سے الگ تھلگ رہے۔ رہے دوسرے کھیل مثلاً تاش، شطرنج یا چوسر وغیرہ تو ان کی بھی ان کو ہوا نہ لگی وہ بھی ان سے عمر بھر بے بہرہ ہی رہے۔

ان کے بچپن کے دوستوں میں زیادہ تر ان کے ہم سبق لوگ تھے۔ ان کے ابتدائی دوستوں میں مولوی عبدالعزیز منشی فاضل جو مدرسہ جامعہ احمدیہ میں استاد ہو گئے۔ (مولانا) طرزی مشرقی منشی فاضل جنہوں نے بعد میں سیاست میں حصہ لیا اور [illegible] ناظر اوقاف کے عہدہ پر ہو گئے۔ حافظ منظور احمد منشی فاضل بعد میں تحصیلدار ہو گئے۔ سید حبیب احمد منشی فاضل جو جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کے قرابت دار تھے بعد میں وہ لیکچرار بن گئے۔ سعید اللہ خاں رزمی جو بعد میں ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم ہوئے۔ منظور حسین سرکش منشی فاضل جو بعد میں سرکاری ملازمت میں آ کر اوقاف وغیرہ کے نگران مقرر ہوئے اور بھوپال کی مشہور تاج المساجد کی تعمیر میں مولانا عمران ندوی کے ساتھ بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ذوالفقار کیفی منشی فاضل (جو محکمہ تعلیمات میں ملازم تھے) مولانا حمید اللہ قدسی (اوائل جوانی میں پہلے ندوۃ العلماء بعد میں دیوبند چلے گئے بانی مدرسہ جامعہ کراچی کے کتب خانہ سے منسلک رہے اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ عبدالباری (الیس عبدالہادی صاحب پرنسپل احمدیہ کالج [illegible] اور بعد میں مفتی ریاست ہوئے) اور مولوی محمد علی خاں مولوی فاضل جو پہلے بھوپال میں شملہ ڈپٹی [illegible] تھے بعد میں دہلی آ کر سعودی سفارت خانے سے منسلک ہو گئے، اور مولوی نور الحسن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا اس وقت کے جملہ دوست احباب ان کے ہم درس یا آگے پیچھے کے ساتھی تھے ان میں سوائے چند سب زاہدان خشک کے زمرہ میں آتے تھے جو مشرقی تعلیم کی وجہ سے ان کے غور و فکر میں ایک رجعت تھی اور وہ ایک گونہ محدود سوچ کے مالک تھے۔ برقی زاہد خشک نہیں تھے بلکہ بڑے زندہ دل، شوخ طبیعت اور ہنس مکھ انسان تھے۔ ان کو ایک ایسے نوجوان کی ضرورت محسوس ہوئی جو مغربی تعلیم سے روشناس ہو اور ساتھ ہی ساتھ ان کی متابعت بھی کر سکے۔ اتفاق سے یہ نوجوان ان کو محمد احمد سبزواری (راقم الحروف) کی شکل میں مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک انجمن ترقی تعلیم بنائی جس میں وہ خود صدر اور سبزواری اس کے سیکرٹری چنے گئے۔ اس کے جلسے انہیں کے کمرے میں جہاں ایک پلنگ اور چند کرسیاں پڑی تھیں ہوا کرتے تھے۔ تین چار مقرر تقریریں کیا کرتے تھے۔ تعلیم نسواں، کیا پردہ ضروری ہے؟ شمشیر زیادہ طاقتور ہے یا قلم؟ ایسے موضوعات پر چھوٹی چھوٹی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ چند مہینوں کے بعد یہ انجمن ختم ہو گئی پھر کچھ ماہ بعد ایک دوسری انجمن، انجمن توسیع مذاق علمی کے نام سے بنی اس کے بھی صدر برقی اور سیکرٹری سبزواری تھے۔ اس کے جلسے ماہانہ ہونے لگے۔ تقریریں کرنا

کسی کو نہ آتا تھا۔ دراصل تقریروں کا ڈھنگ ان سب کو ماسٹر امیر الدین ٹکن میکر نے سکھایا۔ ماسٹر صاحب کافی طویل عرصے بمبئی میں رہنے کے بعد بھوپال آئے اور انہوں نے شہر کے چوک میں شام کی کلاسوں کا ایک کوچنگ سنٹر کھولا۔ اس میں ایک انجمن بھی "انجمن ترقی تعلیم" کے نام سے قائم کی۔ جس میں ماسٹر صاحب اپنے شاگردوں کو تقریریں کرنا سکھاتے تھے۔ اس کے جلسے ہر جمعرات کو ہوتے تھے۔ اس میں بیرونی لوگ بھی شامل ہو سکتے تھے۔ جیسے ابوسعید بزمی، محمد احمد سبزواری، شاکر علی خان (جو بعد میں سیاسیات میں اشتر بھوپال کے نام سے مشہور ہوئے)۔ پنڈت چتر نرائن جو ریاست بھوپال میں پہلے نائب وزیر اعظم اور بعد میں وزیر اعظم رہے۔ ظہور بھوپالی جو بعد میں وزیر تعلیم بنے اور دوسرے نوجوان حصہ لینے لگے۔ کبھی کبھی ان جلسوں میں منجھے ہوئے سیاستداں بھی شریک ہو کر محفلوں کی رونق بڑھایا کرتے تھے۔

بزمی کو ابتدائے عمر ہی سے مختلف صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ سب سے پہلے والدہ کا انتقال ہوا پھر نانا صاحب رخصت ہوئے ان کی عمر سترہ سال کی ہوگی جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ یہ صدمہ بزمی اور ان کے اس خاندان کے لئے بڑا

سخت تھا۔ کیونکہ اب بزمی کو خود اپنے چھوٹے بھائی اور دوسری والدہ کی کفالت کی ذمہ داریاں سنبھالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور ان کو مجبوراً اپنے والد کے محکمہ میں بیس روپے ماہانہ پر ملازمت قبول کرنا پڑی۔

بزمی نے مشرقی علوم کی ڈگریاں تو پہلے ہی لے لیں تھیں اب وہ مغربی تعلیم کی جانب راغب ہوئے۔ صرف انگریزی میں امتحان دے کر۔ پہلے میٹرک پھر بی اے اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ جہاں وہ اوّل قرار دیئے گئے اور گولڈ میڈل ملا۔ ایم اے سے فراغت کے بعد مطالعہ کی ایسی چاٹ پڑی کہ پہلے انہوں نے بھوپال کی تاریخ پڑھی اس میں ان کو نواب سکندر جہاں بیگم کی شخصیت نے کافی متاثر کیا۔ نواب سکندر بیگم اعلیٰ درجہ کی منتظم اور مدبر خاتون تھیں۔ انہوں نے ہی دراصل ریاست کو ریاست بنایا۔ نظم و نسق قائم کیا۔ عہدوں کی جدید تنظیم کے ساتھ عہدے داروں کے اختیارات اور فرائض مقرر کئے، پولیس کا محکمہ بنایا، عدالتوں کی بنیاد ڈالی، اردو کو سرکاری زبان قرار دیا اور کل قوانین اردو میں مرتب کرائے۔ پھر انہوں نے مصر کی تاریخ پڑھی جہاں یہ محمد علی پاشا، احمد عربی پاشا اور سعد زاغلول پاشا سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے ترکیہ کی تاریخ پڑھی۔ اس میں غازی مصطفےٰ کمال سے متاثر ہوئے مگر ان کے بعض اقدامات سے ان کو اتفاق نہیں تھا۔ غالباً مطالعہ تاریخ کے یہی وہ اوّلین نقوش تھے جنہوں نے بعد میں ان کو "تاریخ انقلاب عالم" لکھنے کی ترغیب دی۔

۱۹۲۶ء میں نواب حمید اللہ خاں ریاست بھوپال کے فرمانروا ہوئے۔ یہ پہلے گریجویٹ رئیس اور علیگڑھ کالج کے پروردہ تھے۔ ابتدا ہی سے ان کے برصغیر کے سیاسی زعماء سے مراسم تھے۔ جو بعد میں انتہا کو پہنچ گئے۔ بھوپال میں الیگزینڈر ہائی اسکول کے قدیم طلباء کی ایک انجمن تھی۔ نواب صاحب نے بھی اسی اسکول میں تعلیم پائی تھی۔ لہٰذا جب یہ رئیس بنے تو انجمن نے ان کو ایک استقبالیہ دیا جس میں اس توقع کا اظہار بھی تھا کہ ان کے دور میں بھوپالیوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق پورے پورے حقوق ملیں گے۔ دراصل بھوپال میں اعلیٰ عہدوں پر علیگیرین اور دوسرے غیر بھوپالی حکام فائز تھے۔ چنانچہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے ۱۹۲۹ء میں "ینگ مین نیشنل ایسوسی ایشن" کی بنیاد پڑی۔ جس میں زیادہ تر سرکاری ملازم شامل تھے۔ بزمی اس کے متعلق لکھتے ہیں :-

"اس تحریک نے ریاست کے ذہین اور پرجوش تعلیم یافتہ جوانوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اگر یہ جماعت زیادہ عرصہ قائم رہتی تو اپنے نصب العین اور اصول کار کے اعتبار سے ہر پھر کر صحیح راستہ پر آجاتی۔ لیکن حکومت بھوپال نے جلد ہی اس کی آئندہ بڑھتی ہوئی طاقت کا احساس کیا اس کی جڑ پر کلہاڑی رکھنا ضروری سمجھا۔ اور اس کے ممبروں کو اس طرح خائف کیا کہ چند مہینوں کے اندر اس جماعت کے سارے اجزاء منتشر ہو گئے۔" (ریاستوں کی سیاست)

ملہ مسلمانوں کو اس ملکی غیر ملکی سیاست نے ہر جگہ نقصان پہنچایا۔ (مدیر)

پھر حامد رضوی وکیل نے جو بھوپالی سیاست کے گاندھی کہے جاتے تھے حقوق طلبی کے میدان میں اُترے یہ کئی سال بھوپال کی قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ یہ آئینی جنگ کے قائل تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جگر ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں، "میں آپ کی فراست و ذکاوت کا ہمیشہ سے معترف رہا ہوں اس کے ساتھ ہی آپ کے قلب کو عام انسانی ہمدردی کا منبع و مخزن بھی سمجھتا ہوں۔ آپ انسانی فطرت کی خامیوں اور پختگیوں کو گہری فلسفیانہ نظر سے دیکھنے کا حس رکھتے ہیں اور آپ کا ذہن جزوی واقعات سے کلی نتائج کو نہایت صحت کے ساتھ اخذ کرتا رہتا ہے۔"

(ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ صفحہ ۴۳۹)

۱۹۲۹ء میں چند نوجوانوں نے سوشل ورکرز لیگ بنائی جس میں بزمی بھی شامل تھے۔ ۱۹۳۳ء میں "انجمن رعایائے بھوپال" بنی، گو اس کے صدر سعید اللہ خاں رزمی تھے۔ مگر اس میں کچھ ایسے عناصر بھی شامل تھے جن کو عوام پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے مقابلے میں چند سرپھرے نوجوانوں نے جن میں شاکر علی خاں پیش پیش تھے "انجمن خدام وطن" بنائی اور اس نے ایک اخبار "صبح وطن" بھی نکالا۔ اسی زمانے میں اور بہت سے اخبار بھی نکلے۔ چنانچہ بزمی نے بھی دسمبر ۱۹۳۵ء میں ایک اخبار "رہنما" نکالا جو تین ہفتوں کے بعد ہی بحکم سرکار ختم ہو گیا۔ اور اس کے ایڈیٹر اور پبلشر عظمت بھوپالی پر مقدمہ چلا اور ان کو بھوپال چھوڑنا پڑا۔ "انجمن خدام وطن" میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں بزمی، قدوس صہبائی، طرزی مشرقی، لطف اللہ خاں نظمی، فضل علی سرور، عبدالرحمن کوکب، اخلاق محمد خاں، نور بانو خان، ظہور ہاشمی، احمد مکی وغیرہ شامل تھے۔ "صبح وطن" پر مقدمات بھی چلے اور ان میں سے بہت سے لوگ پکڑے گئے۔ اور ان کو سزائیں بھی ملیں۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ایک ایسی ریاست میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور جہاں کا حاکم مسلمان تھا وہاں ابتدائی تحریکوں اور قید و بند کی جملہ سختیاں مسلمانوں نے اُٹھائیں۔ ماسٹر لال سنگھ اپنی سرکاری ملازمت کے دوران ہندو مہا سبھا کی سرگرمیوں میں غیر رسمی طور پر حصہ لیتے رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اس کے صدر بنے اور بعد میں پرجا منڈل کے لیڈر کی حیثیت سے اُبھرے۔ اور انضمام سے پہلے حادثہ میں ہلاک ہو جانے کی وجہ سے وزیر بنتے بنتے رہ گئے۔ مگر وہ اعزاز پاکستان کی اسمبلی میں نواب بھوپال کی نمائندگی ان کے بھتیجے رشید الظفر خان نے کی۔

گویا اب بزمی کھلم کھلا سیاست میں کود چکے تھے۔ اس زمانے میں بیسیوں اخبارات نکل رہے تھے ان میں شذروں، سرخیوں، نظموں اور کارٹونوں کے ذریعے حکومت پر تنقید ہوتی تھی لہذا حکومت نے اس سے بچنے کے لئے پریس ایکٹ کا سہارا لیا۔ گو مقننہ میں بیشتر غیر سرکاری ارکان نے اس کی مخالفت کی تاہم حکومت نے یہ قانون نافذ کر دیا۔ نیز ملازمین سرکار کے لئے بھی ایک قانون نافذ کیا گیا کہ وہ خفیہ یا اعلانیہ کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں۔ چنانچہ اب بھوپال نیشنل لیگ قائم ہوئی اور اس کی گیارہ رکنی مجلس عاملہ میں بزمی بھی شامل تھے۔

"صبح وطن" میں ایک کارٹون شائع ہوا جس پر کچھ لوگوں کو سزائیں ہوئیں۔ پھر ایک کارکن حمید قریشی پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس مقدمہ کی کارروائی خفیہ ہوگی۔ پیشی کے دن عوام کا ایک بڑا مجمع لگ گیا، لوگ کمرۂ عدالت میں گھس گئے۔ عدالت مقدمہ کی سماعت ملتوی کرنا پڑی اور عوام ملزم کو اپنے گھیرے میں لے کر باہر آ گئے۔ اس پر انجمن کے اراکین پر مقدمہ چلایا گیا اور ان کو دو، دو سال کی سزا دی گئی۔ جن میں شاکر علی خاں، قدوس صہبائی۔ اور پنڈت چتر نرائن وغیرہ شامل تھے۔

شہر بھوپال کے موجودہ قاضی معجدی الحسینی نے "بھوپال تحریک آزادی کے آئینے میں" ایک بڑی مفید اور کارآمد کتاب لکھی ہے جس میں دور حمیدی کی سیاست کا بلا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس میں بعض مقامات پر واقعات کا تسلسل برقرار نہیں رہا اور چند باتیں اندراج سے رہ گئیں، بہرحال ۱۹۳۸ء میں بھوپال میں "پرجا منڈل" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے

واعظین میں جو اصحاب شامل تھے، ارشد تھانوی (ادبی جرگہ جنھوں نے بزمی کا نام تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا) بزمی
جرگہ اور دعوت دے فرمایا۔ ممبر سازی کے بعد اس کے صدر بزمی اور سیکرٹری بابو لال شیدا بنائے گئے۔ یہ جماعت کا الحاق
لکھنؤ آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس" سے ہوا جس کا پہلا اجلاس لدھیانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں
ہوا جس میں بھوپال کی نمائندگی شاکر علی خاں نے کی۔

گو بھوپال مسلم لیگ کے قیام کے بعد انجمن "خدام وطن"، "منظم جرگہ" بھوپال کے چند ارکان ریاست کی مقننہ کے لئے کھڑے ہوئے جن میں بزمی اور قدوس صہبائی بھی شامل تھے اور یہ دونوں اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ اور چاہے ہی اجلاس میں مختلف امور حکومت پر کڑی تنقید کی اور حکومت کے چھکے چھڑا دئے۔ شہر کے عوام کو مقننہ کے اجلاسوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ اور عام طور پر گیلری میں چند افراد سے زیادہ نہیں ہوتے تھے مگر جس زمانے میں بزمی وغیرہ مقننہ کے ممبر تھے اور جس دن ان کی تقریر کا دن ہوتا تھا تو عوام کا ہجوم گیلری میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی بلکہ لوگ ہال کے باہر گیلری میں کھڑے ہو کر ان کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ بیان کے دل کی آواز ہوتی تھی۔

لکھنے پڑھنے کا شوق تو بزمی کو بچپن ہی سے تھا مگر ابھی تک انہوں نے باقاعدہ مضمون نگاری شروع نہیں کی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں کاس طرف توجہ دی اور ان کے مضامین رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ کیونکہ خیالات پیشہ سے ترقی پسندانہ تھے (ابھی ترقی پسند مصنفین تحریک باضابطہ شروع نہیں ہوئی تھی گو "انگارے" شائع ہو کر ضبط ہو چکا تھا) اور اس وقت رسالہ "نگار" نیاز فتح پوری اور ترقی پسند تحریک کا نقیب سمجھا جاتا تھا۔ لہذا بزمی نے اس میں "عربی شاعری" "عہد جاہلیت کی عربی شاعری" "قدیم عربی شاعری میں عشق کے تصور" پر مضامین لکھے۔ اس زمانہ میں بجنور سے ایک سہ روزہ اخبار "مدینہ" نکلا کرتا تھا گو یہ کانگریسی اخبار تھا لیکن مسلمانوں کا ترجمان تھا۔ (دو بیسویں زمانے میں مسلم لیگ اپنی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور میں تھی) مگر مسلمانوں میں کافی مقبول تھا۔ اتفاق کہ اس زمانے میں قدوس صہبائی جو کچھ عرصہ "مدینہ" کی مجلس ادارت میں شامل تھے استعفیٰ دے کر بھوپال آگئے اور انہوں نے بزمی سے اس کا تذکرہ کیا۔ بزمی نے ان کے کہنے پر وہاں درخواست بھیج دی جو مجید حسن، مالک اخبار نے منظور کر لی اور اس طرح بزمی ۱۹۳۸ء میں صحافتی دنیا میں داخل ہو گئے اور بزمی وہاں صہبائی سے زیادہ مقبول اور معتبر نہ رہ سکے؟ گو یہ اخبار کانگریسی تھا مگر مجید حسن اور اخبار کے بیشتر کارکنوں کو مذہب سے لگاؤ تھا اور وہ مذہب کی اہانت برداشت نہیں کرتے تھے۔ صہبائی نے بچپن میں قرآن حفظ کیا تھا مگر بعد میں وہ کٹر کمیونسٹ بن گئے۔ نماز، روزہ اور دوسرے تمام شعائر اسلامی کو ترک کر دیا۔ وہ پہلے نماز تو بزمی نے بھی اپنے والد کے انتقال کے بعد چھوڑ دی تھی مگر روزے پابندی سے رکھتے تھے بعد میں جیل میں نہ صرف نماز کی پابندی کرتے رہے بلکہ اپنے ساتھیوں کو ترجمے اور تفسیر کے ساتھ قرآن پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں شاکر علی خان کے علاوہ پنڈت چترنرائن بھی شامل تھے۔

جب نظم و ضبط برقرار نہیں رہتا اور افراتفری پھیلتی ہے اور عوام کے جذبات حکومت کے خلاف بھڑک اٹھتے ہیں: تو ہر گوشہ سے احتجاج بلند ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک جلسہ جو بیگم واڑے نے بھوپال میں مزدوروں کے صدر تھے (واضح رہے کہ اس وقت تک بھوپال میں ہندو مہاسبھا اور ٹریڈ یونین قانون نافذ نہیں ہوا تھا) اپنی یونین کے جلسے میں ایک سیاسی کارکن کو دعوت تقریر دی کاس پر جوشیلے نوجوان نے تقریر کا آغاز ہی کچھ ایسے انداز سے کیا جس میں حکومت کی نفی ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس سلسلہ میں ان کے نو دس ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اور ان سب کو دو، دو سال قید بامشقت کی سزا بھی سنائی گئی۔ بزمی اس وقت بھوپال میں نہیں تھے مگر اول تو انہوں نے بھوپال کے ایک سیاسی کارکن کا ایک مضمون "بھوپال قتل گاہ عوام" اپنے اخبار میں چھاپا اور خود بھی ایک بیان دیا۔ جس میں صحیح صورت حال کا تجزیہ پیش کیا گیا تھا۔ اسی عرصہ میں یہ بھوپال کونسل میں اجلاس میں شرکت کے لئے بھوپال آئے اور اسی رات ان کو

گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اور ڈیفنس آف انڈیا کے تحت دو سال قید بامشقت کی سزا دے دی گئی۔ جہاں سے یہ ۱۹۴۲ء میں رہا ہوئے۔ اس طویل سزا نے ان کے اعصاب کو کافی متاثر کیا۔ جیل میں شروع میں ان کے ساتھ اخلاقی مجرموں کا سا سلوک کیا گیا۔ نہ بستر۔ نہ چارپائی۔ بس ایک بوسیدہ کالا کمبل۔ نہ یہاں کسی کتاب اور اخبار کی اجازت تھی اور نہ یہاں لکھنے پڑھنے کا کوئی سامان فراہم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھوک ہڑتال کر دی اور جس میں بعد میں ان کے ساتھی بھی شریک ہو گئے۔ بھوک ہڑتال کئی ماہ کی کشاکش کے بعد ان کو صرف لکھنے پڑھنے کی اجازت مل گئی مگر اخبارات اور کتابوں کی اجازت پھر بھی نہ ملی۔ اس زمانے میں [illegible] ملک اخبار مدینہ کا [illegible] اگر ان کی گرفتاری کا اخبار سے کوئی تعلق نہیں تھا تاہم انہوں نے نہ صرف ان کی ملازمت بحال رکھی بلکہ درمیان میں کچھ ان کے خاندان کی مالی اعانت بھی کرتے رہے۔

آخر ۳ اگست ۱۹۴۲ء کو جیل سے رہا ہوئے۔ اسی ہفتے کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا ریزولیوشن پاس کیا۔ یہ طویل جدوجہد کے بعد کچھ عرصہ چین سے گھر میں آرام کرنا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ان کو خیال آیا کہ اس وقت کی موجودہ سیاست۔ معاشیات کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے معاشیات کے مطالعے کا فیصلہ کیا۔ اور اس زمانے کے مشہور مصنفین جے تھار اور بیری کی کتاب "معیشت الہند" کا مطالعہ شروع کیا۔ چونکہ میں نے معاشیات میں ایم۔اے کیا تھا اور ان کی فرمائش پر "اخبار مدینہ" کے لئے ہندوستان کے بعض معاشی مسائل پر مضامین لکھے تھے۔ اس لئے یہ روز شام کو عصر کے بعد میرے گھر آ جاتے تھے۔ اور مطالعے کے سلسلے میں جو نکات ان کے ذہن میں آتے تھے ان پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ سی۔آئی۔ڈی کا ایک آدمی ان کی نگرانی کرتا رہتا تھا۔ میں جس مکان میں مقیم تھا اس کی ایک بڑی ڈیوڑھی تھی جس میں میرے مکان کے دروازے کے علاوہ تین اور مکانوں کے دروازے بھی تھے۔ اس زمانے میں بھوپال میں بیشتر مکانوں کے ساتھ چبوترے (جو شہر کے اور والے بیٹھکوں کی نشست کے کام آتے تھے) ہوتے تھے۔ چنانچہ پولیس والا باہر والے مکان کے چبوترے پر بیٹھ جاتا تھا اور جب گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ نکلتے تو ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو جاتا تھا۔ ایک دن یہ آئے اور کہا کہ میرا وارنٹ گرفتاری جاری ہو گیا ہے اور شاید رات کو مجھے گرفتار کر لیا جائے لہٰذا میں ریلوے (جو اس وقت ریاست کی سرحد ختم ہونے کے بعد پہلا ریلوے اسٹیشن تھا اور اس وقت ریاست گوالیار میں شامل تھا) جانا چاہتا ہوں۔ جہاں کی مقامی کانگریس کے وکیل ایک مسلمان تھے اور جن سے بھوپال کے سیاسی کانگریسیوں کے گہرے تعلقات تھے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میں اس لباس میں (کھادی کی شیروانی کرتہ۔ پاجامہ اور سر پر گاندھی ٹوپی) اسٹیشن جانا نہیں چاہتا لہٰذا تم مجھے اپنی شیروانی اور کپڑے دے دو۔ چنانچہ میں نے انہیں شیروانی اور کرتہ پاجامہ دے دیا جو انہوں نے پہن لیا۔ مگر ٹوپی کا سوال ذرا ٹیڑھا تھا کیونکہ میں ترکی ٹوپی پہنتا تھا اور وہ میرے پاس ایک ہی تھی۔ لہٰذا طے ہوا کہ اسٹیشن تک ان کو یہی ٹوپی دے دوں۔ جو اسٹیشن پہنچ کر وہ مجھے واپس کر دیں گے۔ اس طرح وہ میرے کپڑے اور ٹوپی پہن کر لمحوں میں ننگے سر دروازے سے باہر آئے اور پولیس والے کی مخالف سمت میں چل کر اسٹیشن پہنچ گئے۔ پولیس والا کھادی پوش کی آمد کا انتظار ہی کرتا رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا تھا۔ یہ ان کی بھوپال سے آخری روانگی تھی۔ اس کے بعد یہ کبھی بھوپال نہیں گئے۔ لطف یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں "[illegible]" کی مخلوط حکومت بنی تھی جس میں ان کے ساتھی پنڈت جواہر لال نائب وزیراعظم بنے اور کئی بھوپال نے ساتھی وزیر بنے اور آزادی کے بعد چودھری وزارت۔ بی اس میں آ کر پنڈت جواہر لال وزیراعظم ہو گئے۔ میں اس وقت بھوپال ہی میں تھا اور میں نے پنڈت جی سے دو ایک مرتبہ کہا کہ بنری صاحب کا جو وارنٹ ہے اور ان پر بھوپال آنے کی جو پابندی ہے وہ اب ختم کرنے کی کارروائی کی جائے مگر اس پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور اس طرح محسن بھوپالی کا یہ شعر ایک صداقت ثابت ہوا۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

برنی کئی ہفتے بھیلسہ میں رہے اور پھر اِدھر اُدھر پھرتے بجنور پہنچ گئے۔ مگر اتفاق دیکھئے کہ وہاں بھی کچھ عرصے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک مضمون پر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ جس کا سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہا اور جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو انہوں نے بجنور کو خیرباد کہہ دیا اور دہلی آ گئے۔

برنی کی سب سے پہلی تالیف "مسلمان کیا کریں" ہے۔ یہ ہندوستان کے مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ اہم رہنماؤں کے اُن ۵۳ مضامین کا مجموعہ ہے جو اس عنوان سے "مدینہ" بجنور میں اکتوبر ۱۹۳۸ء سے اپریل ۱۹۳۹ء تک شائع ہوئے۔ ان میں کانگریسی، مسلم لیگی، کمیونسٹ، آزاد خیال سبھی لوگ شامل تھے۔ "مدینہ بجنور" نے ہی ان کو شائع کیا ہے۔ "ریاستوں کی سیاست" اور "راج محل کے اندر" دونوں سیاسی کتابیں ہیں۔ آزادی سے پہلے برصغیر میں ساڑھے چھ سو چھوٹی اور بڑی ریاستیں تھیں۔ ان میں اگر ایک طرف حیدرآباد جیسی بڑی ریاست شامل تھی جس کا رقبہ یورپ کے اکثر ملکوں سے بڑا تھا، تو دوسری طرف ایسی ریاستیں بھی شامل تھیں جو صرف راجاؤں کی حویلیوں تک محدود تھیں۔ بیشتر ریاستوں میں رئیسِ وقت کی زبان ہی قانون تھی جہاں قانون نام کو تھا وہاں بھی اس کی آڑ میں گلچھرے اُڑائے جاتے تھے۔ عوام کا استحصال عام تھا۔ ان کی ذمہ داریاں تو تھیں مگر وہ حقوق سے محروم تھے۔ اگر کبھی کوئی رئیس عوام کے آنسو پونچھنے کی کوشش کرتا تو اس کے مصاحب اور حاشیہ نشین اس کی اصلاحات کو ناکام بنانے پر پورا زور صرف کر دیتے تھے اور اس کو یقین دلا دیتے تھے کہ سب کچھ ٹھیک ہے اور عوام خوش حال اور اس کی جان و مال کو دعائیں دیتے ہیں۔ اور یہی راج محلوں کی سیاست تھی۔ برنی کی ان دونوں کتابوں میں اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اس برصغیر میں ایک نئی صبح طلوع ہوئی۔ ایسی صبح جس سے کروڑوں عوام کی امیدیں وابستہ تھیں لیکن ابھی سورج کی روشنی پوری طرح پھیل بھی نہ پائی تھی کہ خوشی و مسرت کے نعرے۔ آہ و بکا کی چیخوں میں تبدیل ہو گئے۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہنے لگیں، لاکھوں انسانوں کی سربریدہ لاشیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ شیرخوار بچوں کو ماؤں کی گود سے چھین کر ہوا میں اُچھالا گیا۔ اور اُن کو نیزوں سے چھید گیا۔ ہزاروں عورتوں کے دامنِ عصمت کو سرِ راہ تار تار کیا گیا۔ وہ کون سا ظلم تھا جو روا نہ رکھا گیا۔ برنی نے خون کی یہ ہولی اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے تاثرات کو "جب خون بہہ رہا تھا" میں قلم بند کیا۔ اس کا انتساب بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" ۱۷ اگست ۴۷ء کی رات کو ماڈل ٹاؤن لاہور کی ایک سنسان سڑک پر جیپ کو روک کر فوجی انداز سے پوچھا گیا "کون ہو؟" جواب دیا گیا "میں ہوں برنی"۔ "کیا کہا بھجنی؟" ایک نے دوسرے سے کہا "بھئی اس نے تو بھجنی نام بتایا ہے"۔ پھر یہ تصدیق کی اور پوچھا "بھجنی نام بتایا ہے"۔ "ہاں"۔ "ہندو ہو"۔ خاموشی۔ "بھئی یہ تو ہندو ہے چلو چھوڑ دو"۔ یہ ڈوگرا فوج کے سپاہی تھے جو ماڈل ٹاؤن کی حفاظت پر مامور تھے اور نام پوچھنے پر مسلمان کو گولی کا نشانہ بنا رہے تھے۔ چنانچہ یہ کتاب بھجنی کے نام سے ہی منسوب کی گئی۔ یہ کتاب کافی مقبول ہوئی اور ایک سال کے اندر ہی اندر اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

لیکن برنی کی معرکتہ الآرا تصنیف "تاریخ انقلاباتِ عالم" ہے۔ جو ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ انقلاباتِ عالم کی ساری داستان ابتدائے آدم سے لے کر اب تک ایک مربوط زنجیر کی مانند ہے۔ اس میں پہلے تجربے پر دوسرے اور دوسرے پر تیسرے تجربے کی بنیاد رکھی گئی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ ■

العلم (کراچی)، جنوری۔ مارچ ۱۹۹۳ء

محمد مارماڈیوک پکتھال

ایک عظیم نو مسلم کی حیرت انگیز سرگزشت

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

مترجم قرآن، مفکر اسلام، ادیب، محقق، صحافی
ر مبلغ و خطیب محمد "مارماڈیوک پکتھال بلاشبہ ان
سیات میں سے ہیں جو صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں
ر صدیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ غیر معمولی
ملاحیتوں کے حامل نابغہ انسان تھے۔ ان پر قدرت
اوندی کا سب سے بڑا کرم یہ تھا کہ اگرچہ وہ کفر
شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں پیدا ہوئے، مگر
ن کی عقل سلیم انھیں اسلام کی سیدھی اور روشن
اہراہ پر لے آئی اور بہت سی دیگر تصانیف کے
اوہ، انہوں نے خصوصاً" ترجمہ قرآن کی صورت
ں انگریزی خواں طبقے کو ایسا انمول تحفہ عطا کیا جو
است تک راہروان شوق کی رہنمائی کرتا رہے گا
ر خود پکتھال مرحوم کے لئے بھی بے بہا صدقہ
ریہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

مارماڈیوک ولیم پکتھال ۷، اپریل ۱۸۷۵ء کی
نج انگلستان میں سفک (SUFFALK) کے
ریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد
چارلس پکتھال مقامی گرجا گھر کے پادری تھے۔
چارلس کی پہلی بیوی سے دس بچے تھے۔ وہ وفات پا
گئی تو انہوں نے دوسری شادی امیرالبحر ڈی اینج
او برائن کی بیٹی میری سے کی۔ اس بیوی سے چارلس
کے ہاں مارماڈیوک پکتھال تولد ہوئے۔

موصوف چھ برس کے تھے کہ ان کے والد
انتقال کر گئے، چنانچہ یہ خاندان گاؤں سے ترک
مکانی کر کے لندن کے محلہ کنگلشن میں آ گیا اور ننھے
مارماڈیوک کو نارفوک کے اسکول میں داخل کرایا گیا
جہاں شروع ہی میں انہوں نے اپنی ذہانت کا سکہ جما
لیا، خصوصاً" ریاضی میں اپنی قابلیت کا بھرپور مظاہرہ
کیا، مگر کچھ عرصے کے بعد وہ سخت بیمار ہو گئے اور
ڈاکٹروں نے ایک سال کے لئے آرام تجویز کیا۔

مکمل صحت یابی کے بعد پکتھال کو ہیرو
(HARROW) کے مشہور و معروف پبلک
اسکول میں داخلہ دلایا گیا جہاں انہوں نے جغرافیہ
اور لسانیات میں امتیاز حاصل کیا۔ زمانہ طالب علمی

میں ونسٹن چرچل سے ان کی گہری دوستی تھی جو آخیر وقت تک قائم رہی۔ چرچل نے آگے چل کر برطانوی سیاست میں غیر معمولی نام پیدا کیا۔

ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد پکتھال فرانس گئے جہاں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور پھر اٹلی کے شہر فلورنس سے اطالوی زبان میں دستگاہ حاصل کی۔ واپس لندن آکر جرمن اور ہسپانوی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اس کے ساتھ انہیں ادب و تاریخ سے بھی گہرا شغف تھا اور اسی حوالے سے انہوں نے مشرقی زندگی اور معاشرتی روایات سے بھی اچھی خاصی شناسائی حاصل کر لی اور اس سے گہرے اثرات قبول کئے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر انیس برس کی عمر میں پکتھال امور خارجہ کے امتحان میں شریک ہوئے اور اگرچہ امتحان میں اول آئے، مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر انہیں مطلوبہ ملازمت نہ دی گئی جس سے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے۔ اس زمانے کے تاثرات وہ یوں قلم بند کرتے ہیں:

"میں ناامیدی اور افسردگی کا شکار ہو گیا۔ مجھے لندن کا ابر آلود، گھٹا گھٹا اور یکرنگ ماحول بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ میری سوچوں پر مشرقی ممالک کی وہ فضا چھائی رہتی جہاں سورج پوری آب و تاب سے چمکتا تھا اور جہاں کھجوروں کے نخلستان اور اونٹوں کی قطاریں دل و دماغ کو نئی فرحت اور سکون سے آشنا کر دیتے تھے۔ اگرچہ میری عمر کچھ زیادہ نہ تھی لیکن میرے دل میں ان ملکوں کے لئے بے پناہ کشش تھی جو مجھے اس طرف کھینچتی رہتی تھی۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ میری والدہ نے بھی مجھے خوابوں کی اس سرزمین میں جانے کی اجازت دے دی۔"

اگرچہ ان کے عزیزوں کی طرف سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تجویز بھی تھی، مگر انہوں نے مشرق اوسط کی سیاحت کو ترجیح دی اور اپنے ایک دوست ڈولنگ کے ساتھ مصر پہنچ گئے۔

مصر پہنچ کر پکتھال نے یہاں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ شروع کر دیا اور کچھ عرصہ قیام کے بعد شام چلے گئے۔ وہاں وہ ایک پادری ڈینزر سے ملے جو آثار قدیمہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انہوں نے پادری سے گہرے تعلقات استوار کر لئے اور اس سے عربی سیکھنا شروع کی۔ پھر وہ ایک ترجمان اور گائیڈ کو ساتھ لے کر صحرا عبور کر کے شہران، رملہ اور غزہ پہنچے۔ دوران سفر انہوں نے عرب کسانوں اور دیہاتیوں کی معاشرت اور مسائل سے بھی واقفیت حاصل کی اور عربی کی استعداد میں اضافہ کیا۔ دوسری جانب انہوں نے اونٹ پر سوار ہو کر کوہ جودی (ترکی) تک کا سفر کیا۔ وہ مشرق اوسط کی سادہ اور فطری زندگی سے بہت متاثر ہوئے اور یوں لگا جیسے انہیں ان کے پسندیدہ خواب کی تعبیر مل گئی ہو۔ وہ لکھتے ہیں۔ "مجھے یہاں کی زندگی میں عجیب قسم کا سکون ملا۔ یورپ میں رہتے ہوئے میں نے کسی شخص کو کبھی خوشی سے ہمکنار نہیں دیکھا، لیکن عربوں میں بیشتر لوگ مجھے خوش نظر آئے۔ ان کی زندگی سادہ تھی اور وہ فطرت کی آغوش میں مطمئن زندگی گزارتے تھے، حالانکہ اکثر عرب ممالک مغربی اقوام کے غلام تھے اور یہ قومیں ان پر بہت برے طریقے سے حکومت کرتی تھیں۔ اہل یورپ کو یہاں حکومت کرتے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انسان انسان کا کس طرح دشمن ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپی قوموں نے اپنے مفادات کے لئے ان معصوم انسانوں کا خوب استحصال کیا۔"

زندگی کے اس تضاد اور سامراج کے اصل کردار نے نوجوان پکتھال کے حساس دل و دماغ میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ انہیں یورپ کی استحصالی قوتوں سے نفرت ہونے لگی اور مشرق کے مظلوم انسانوں سے ہمدردی ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس ماحول میں انہوں نے اپنا پہلا ناول SAID THE FISHERMAN (سعید ایک مچھیرا) لکھا جسے یورپ کے بیشتر ناشروں نے چھاپنے سے انکار کر دیا، البتہ میسرز میتھوئن نے اسے شائع کر دیا اور پھر فرانسیسی، جرمن اور دیگر یورپی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

مشرق اوسط کی سیاحت کے بعد پکتھال انگلستان واپس چلے گئے اور کئی سال لندن، سفک اور سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہے۔ اس دوران ان پر مطالعہ اور غور و فکر کا خاص رجحان غالب رہا۔ ملکی حالات کی بے اطمینانی بدستور جاری تھی اور یورپ کا ماحول انہیں سچا سکون اور اطمینان فراہم کرنے سے قاصر تھا۔ اسی دوران برطانوی سفیر لارڈ کرومر نے انہیں مصر بلوا لیا تاکہ اہل مصر کی نفسیات کے سلسلے میں ان سے رہنمائی حاصل کرے۔ یہ وہ دور تھا جب مصر

میں عرصے سے اضطراب پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ برطانوی سامراج اپنے پورے عروج پر تھا مگر مصر کے لوگ اس کی گھبراہٹ سطوت کو خاطر میں لائے بغیر ہنگاموں اور شورشوں میں مصروف رہتے تھے۔

[illegible] میں پکتھال مصر پہنچے تو بعض حلقوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ برطانیہ کی خفیہ سروس سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ پکتھال نے مصر کے تعلیمی اداروں کے تفصیلی دورے کیے جس سے اہل مصر کی معاشرت کے نئے گوشے ان پر وا ہوئے اور عربی زبان کی استعداد میں اور اضافہ ہوا۔ اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی انہوں نے دو کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔

VEILED WOMAN اور CHILDREN OF THE NILE

مصر سے پکتھال اپنی اہلیہ کے ساتھ بیروت گئے، وہاں سے شام پہنچے اور پھر بیت المقدس میں خاصا عرصہ قیام کیا۔ اس سفر میں انہوں نے عربی کی تحصیل مکمل کی، اسلام کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کیا اور مشہور علماء سے طول طویل گفتگوئیں کیں۔ اس زمانے میں وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ مسجد اقصیٰ میں شیخ الجامعہ سے عربی پڑھتے پڑھتے انہوں نے قبول اسلام کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیخ مصر تھے اور جہاندیدہ بھی۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ ایک نوجوان آدمی کا یہ جذباتی فیصلہ نہ ہو، انہیں مشورہ دیا کہ اپنے والدین سے صلاح کر لیں اور خوب سوچ سمجھ لیں۔ پکتھال لکھتے ہیں: "اس مشورے نے میرے دل پر عجیب اثر کیا۔ میں تو عام یورپیوں کی طرح یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مسلمان کرنے پر تلے رہتے ہیں مگر اس گفتگو نے میری رائے بدل دی اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ مسلمان تو بڑے روادار اور حقیقت پسند ہیں، ان پر متعصب ہونے کا خواہ مخواہ الزام لگایا جاتا ہے۔"

اسلام کے بارے میں پکتھال کا براہ راست مطالعہ جاری رہا اور وہ شدت کے ساتھ اس کا اثر قبول کرتے رہے۔ مصر و شام کے علاوہ انہوں نے عراق اور ترکی کی بھی سیاحت کی۔ ترکی زبان بھی سیکھی اور ان ملکوں کے مسلم معاشروں کا انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا اور ساری چیزوں نے مل کر ان کے دل و دماغ کو یوں متاثر کیا کہ انہوں نے عربی لباس پہننا شروع کر دیا اور اسلام کی حقانیت ان کی روح میں اترتی چلی گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت عثمانیہ میں اندرونی خلفشار پیدا ہو رہا تھا اور یورپی طاقتیں خلافت کی قوت توڑنا چاہتی تھیں۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں خلافت عثمانیہ کو شکست ہو چکی تھی۔ مد نظر ہو کہ پکتھال کا خیال تھا کہ یورپی طاقتیں محض مذہبی تعصب اور اسلام دشمنی کے سبب خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں۔ [illegible] میں وہ مشرق اوسط سے واپس انگلستان گئے اور اینگلو عثمانیہ سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترکوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کا تدارک ہو، مگر شدید مخالفت اور متعصبانہ فضا میں یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور غیر معمولی ذہنی دباؤ کے تحت پکتھال بیمار ہو گئے۔

بقول پکتھال "فروری [illegible] میں میں نے چند ماہ کے لیے ترکی جانے کا ارادہ کیا تاکہ اس فضا سے نکل سکوں جس نے مجھے بیمار کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے ان ایام میں برطانوی اخبارات اور عوام ترکوں کے خلاف اس صلیبی جنگ کے نعروں کی پرجوش حمایت کر رہے تھے جو بعض عیسائی بلقانی حکمرانوں نے بلند کیے تھے۔ ایک مسلم طاقت کے خلاف عیسائیوں کی اس یکجہتی اور اتحاد کو بہت سے لوگوں نے سراہا لیکن اس سے ان انگریزوں کے دل ٹوٹ گئے جو مشرق سے پیار کرتے تھے۔ اس وقت مجھے یوں لگتا تھا جیسے عیسائیت دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کی خیر اندیشیاں اور فیض رسانیاں صرف عیسائی اقوام تک محدود تھیں اور دوسری وہ جو ساری دنیا کو بلا لحاظ مذہب و نسل عدل و انصاف اور مساوات کا مستحق سمجھنے کی دعوے دار ہے، مگر روس، انگلستان اور بلقانی ریاستوں میں پہلی قسم کی عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ یہ مذہبی جنون اور تعصب و تنگ نظری کی وہی کیفیت تھی جو اگر کم علم جاہل مسلمانوں میں نمودار ہوتی ہے تو ہم اس کی مذمت کرتے نہیں تھکتے۔ مگر خود اس کا بار بار مظاہرہ کرتے ہیں۔"

پکتھال، ترکوں سے پہلے ہی سے متاثر تھے، مگر اب انہیں کئی ماہ تک یکسوئی کے ساتھ وہاں قیام کا موقع ملا تو ترکوں کی سادگی اور طبعی خوبیوں نے انہیں

مس طور پر اپنا اسیر بنا لیا' چنانچہ غازی طلعت بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں: "ایک روز میں نے طلعت بک سے کہا آپ دشمنی غیر مسلح پھرتے رہتے ہیں۔ آپ کو اپنے ساتھ مسلح پہرہ دار محافظ رکھنے چاہئیں۔ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر میرا کوئی محافظ نہیں۔ مجھے اسی پر اعتماد ہے اور موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔"

پکتھال' غازی انور پاشا' شوکت پاشا' غازی رؤف بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا تذکرہ بھی بڑی عقیدت اور والہانہ محبت سے کیا کرتے۔ ان کا تاثر تھا کہ لوگ ناحق ترکوں پر آزاد خیالی اور لادینی کا الزام دھرتے ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ خدا سے ڈرنے والا مسلمان پایا۔

قیام ترکی کے دوران پکتھال نے قبول اسلام کا مصمم ارادہ کر لیا' چنانچہ انہوں نے غازی طلعت بک سے کہا: "میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔" اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ قسطنطنیہ میں قبول اسلام کا اعلان نہ کیجئے۔ بہتر ہے کہ اس کا اعلان لندن سے ہو۔ یورپ میں اس کے تبلیغی نتائج زبردست رہیں گے۔ اسی مشورے کا نتیجہ تھا کہ پکتھال صاحب نے لندن جا کر دسمبر ۱۹۱۴ء میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا جس سے وہاں کی علمی اور سیاسی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ عیسائی دنیا کا عمومی تبصرہ یہ تھا کہ جس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کرتا ہے اس میں یقیناً بہت سی اچھائیاں ہوں گی۔

قبول اسلام کے موقع پر پکتھال کے تاثرات یہ تھے: "میں اپنے زور مطالعہ سے مسلمان ہوا ہوں اور میرے دل میں اس کی بے حد قدر ہے۔ مسلمانوں کو اسلام ورثے میں ملا ہے' اس لئے وہ اس کی قدر نہیں پہچانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و عافیت کا گہوارا ہے اور اس نعمت پر میں خدائے بزرگ و برتر کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے۔"

جنگ عظیم شروع ہوئی تو انہوں نے پوری کوشش کی کہ انگریزوں اور ترکوں کے درمیان صلح ہو جائے۔ جنگ ختم ہونے پر انہوں نے خلافت کی بقا کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا مگر افسوس انگریزوں کے تعصب اور غرور کے سامنے پکتھال کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہو گئیں۔ یوں بھی جب چند سال بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے خود ہی خلافت کا قلع قمع کر دیا تو ترکی کے ساتھ پکتھال کی دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔

جنگ عظیم کے دوران محمد مارماڈیوک پکتھال لندن میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ جمعہ کا خطبہ دیتے' امامت کراتے' عیدین پڑھاتے اور نماز میں تراویح کے امام ہوتے۔ رسالہ "اسلامک ریویو" کی ترتیب و تدوین بھی انہی کے سپرد تھی۔ اس دوران وہ "ادارہ معلومات اسلامی" سے بھی منسلک رہے۔ ترکی کے حق میں متعدد مضامین کے علاوہ ان کی تین کتابیں بھی شائع ہوئیں یعنی "ٹیلز فرام فائیو چمنیز" (۱۹۱۵ء)' "دی ہاؤس آف وار" (۱۹۱۶ء) اور "نائٹس آف اعرابی" (۱۹۱۷ء)

۱۹۲۰ء میں جناب عمر سبحانی کی دعوت پر پکتھال بمبئی آ گئے اور وہاں کے مشہور اخبار "بمبئے کرانیکل" کی ادارت سنبھال لی اور ۱۹۲۴ء تک یہ ذمہ داری نباہتے رہے۔ انہوں نے بے شمار اداریوں میں یہ بات کھل کر لکھی کہ خلافت عثمانیہ کی تباہی میں عیسائی دنیا کا کیا کردار تھا اور یہ کہ عالم اسلام کے خلاف انگریز کس انداز کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ غرض اس دوران انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کے مسائل میں گہری دلچسپی لی۔ ہندوستان کی مقامی سیاست میں جزوی طور پر حصہ لیا اور ناگپور اور بڑوچ میں کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔ ہندوستانی طرز معاشرت پر انہوں نے کہانیاں بھی لکھیں اور ایک انسائیکلوپیڈیا کے لئے بمبئی اور گجرات کے بارے میں دو بھرپور مقالے بھی قلم بند کئے۔

۱۹۲۴ء میں انہوں نے "بمبئے کرانیکل" کی ادارت ترک کر دی اور مغربی گھاٹ میں کچھ دن آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ یہیں انہیں نظام حیدر آباد کی جانب سے دکن کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری اور ناظم تعلیمات سر راس مسعود کے خطوط ملے جن میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ پکتھال اپنی خدمات حیدر آباد دکن کے سپرد کر دیں' چنانچہ موصوف نے نظام کے حکم پر چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی قبول کر لی اور یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو نئی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

پکتھال حیدر آباد دکن کے ماحول اور معاشرت سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں: "حیدر آباد ایک شاندار جگہ ہے' ناقابل بیان حد تک خوبصورت۔ یہ آفتاب خلیہ کی ایک ضو فشاں کرن ہے۔ تہذیب و ثقافت میں اس کا مشرق میں کوئی جواب نہیں۔" دکن اور اس کی تہذیب سے پکتھال کا گہرا قلبی لگاؤ آخیر وقت تک قائم رہا۔ انہوں نے چادر گھاٹ کالج کو ترقی دینے کے لئے خوب محنت کی' طلبہ کی کردار سازی کے لئے خصوصی اقدامات کئے اور بہت جلد اسے مثالی ادارہ بنا دیا۔ ان خدمات کی قدر کرتے ہوئے حضور نظام نے انہیں ریاست کے سول سروس ہاؤس کا منتظم اعلیٰ بنا دیا۔ اس ادارے میں حیدر آباد سول سروس کے تمام اعلیٰ عہدیدار تعلیم و تربیت حاصل کیا کرتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے "اسلامک کلچر" کے نام سے ایک سہ ماہی انگریزی رسالے کا اجرا کیا جس کے سرپرست اعلیٰ حیدر آباد کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری تھے۔ اس رسالے میں علمی اور تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے جن میں اسلامی تعلیمات کا اثبات دلائل و براہین کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اس رسالے کو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ بنانے کے لئے سخت محنت کی۔۔ ایک ایسا علمی جریدہ جو ہر پہلو سے اسلامی ثقافت اور روایات کا آئینہ دار ہو۔ اپنے عہد ادارت میں انہوں نے متعدد مستشرقین کو اس رسالے میں لکھنے پر آمادہ کیا اور دنیا بھر کی تقریباً" ستر یونیورسٹیاں اس کے خریداروں میں شامل ہو گئیں۔ اشاعت کے لئے آنے والے مضامین کو وہ اکثر دوبارہ لکھتے اور رسالے کے اعلیٰ علمی معیار کو کسی صورت بھی کمزور نہ ہونے دیتے۔ چونکہ پکتھال دنیا کی بہت سی زبانیں جانتے تھے' اس لئے وہ ان زبانوں کے علماء اور محققین کے مقالات کا آسانی سے ترجمہ کر لیتے [illegible] ترین کتابوں پر تبصرہ بھی خود کرتے اور یوں انگریزی خواں طبقہ دنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے چھپنے والی کتابوں سے باخبر ہو جاتا۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے مدراس میں مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد لیکچر دیئے۔ سالانہ [illegible]

دوست ماجمعل محو کرتے تھے اور ان میں مختلف مشاہیر اپنے رشحات فکر پیش کرتے تھے۔ ان لیکچروں کے موضوعات میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلو شامل تھے جو بعد میں "کلچرل سائیڈ آف اسلام" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ تعلیم یافتہ سنجیدہ طبقے میں یہ لیکچر بہت پسند کئے گئے۔

پکتھال کا سب سے بڑا' سب سے لازوال اور عظیم کارنامہ ان کا ترجمہ قرآن ہے۔ اس سے قبل انگریزی زبان میں قرآن حکیم کے جتنے ترجمے ہوئے تھے وہ غیر مسلم مستشرقین اور علماء نے کئے تھے اور مختلف مواقع پر موصوف نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ ان مترجمین کا رویہ اسلام اور قرآن کے بارے میں معاندانہ اور تعصب پر مبنی ہے' اس لئے وہ قرآن پاک کے مطالب سے انصاف نہیں کر سکے' چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ترجمے کا فریضہ انجام دے۔ حیدر آباد میں انہوں نے اس مبارک کام کا ارادہ کیا اور یہ خبر نظام تک پہنچی تو انہوں نے اس منصوبے پر خوشنودی کا اظہار کیا اور پوری تنخواہ کے ساتھ انہیں دو سال کی رخصت عطا فرمائی تاکہ ترجمے کا کام کامل سکون' توجہ اور یکسوئی کے ساتھ مکمل ہو۔ جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو نظام نے اپنے خرچ پر پکتھال کو مصر بھیجا تاکہ علمائے ازہر سے ضروری نکات پر مشورہ کیا جا سکے' چنانچہ موصوف نے قاہرہ میں کئی ماہ قیام کیا اور جامعہ ازہر کے ریکٹر شیخ مصطفیٰ المراغی اور علامہ محمد احمد الغمراوی سے طویل ملاقاتیں اور مشورے کئے اور بعض دیگر علماء و فضلاء سے بھی قرآن حکیم کے مشکل مقامات پر بحث مباحثہ کیا اور جہاں ضروری سمجھا ترجمے پر نظرثانی کی۔ بالآخر تین سال کے محنت شاقہ رنگ لائی اور ۱۹۳۰ء میں یہ ترجمہ THE GLORIOUS QURAN کے نام سے بیک وقت لندن اور نیو یارک سے شائع ہوا۔ یہ نسخہ دو جلدوں میں حیدر آباد دکن سے بھی شائع ہوا اور اس کے جملہ اخراجات حضور نظام نے ادا کئے۔

محمد مارماڈیوک پکتھال ترجمہ قرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اس ترجمے کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے [illegible]

قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں۔ اس کا مقصد قرآن کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ یہ دعویٰ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ کسی الہامی کتاب کو ایک ایسا شخص عمدگی سے پیش نہیں کر سکتا جو اس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا ہے جو مسلمان ہے جبکہ بعض تراجم میں ایسی تعبیریں کی گئی ہیں جو مسلمانوں کے لئے دلآزار ہیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ یہ قدیم علماء کا اور میرا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لئے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے۔ لیکن بہرحال یہ ترجمہ قرآن مجید نہیں ہو سکتا کہ قرآن تو بے مثل و بے بدیل ہے۔ قرآن میں تو اتنی ہم آہنگی ہے کہ لوگ اسے سنتے ہی رونے لگتے ہیں اور وجد میں آ جاتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی زبان میں پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اس کے سحر کی قدرے عکاسی کی گئی ہے۔ یہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا اور نہ میرا یہ مقصد ہے۔"

چنانچہ یہ پہلا انگریزی ترجمہ قرآن ہے جس میں بائبل کے سے ترجمے کا لطف آتا ہے اور نہ صرف صحت، سلاست اور فصاحت کے اعتبار سے مقبول ترین ہے بلکہ پرشکوہ اور بے پناہ اثر آفریں ہے۔ محترمہ مریم جمیلہ نے اس ترجمے کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

"مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا۔ کسی ترجمے میں وہ فصاحت و بلاغت اور دلکش انداز بیاں نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لئے "گاڈ" کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے لیکن پکتھال نے ہر جگہ "اللہ" ہی استعمال کیا ہے۔ اس سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لئے بڑی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔"

بہرحال پکتھال صاحب کی اس عظیم دینی اور علمی خدمت کو پورے عالم اسلام میں سراہا گیا اور حضور نظام نے انہیں پہلی گول میز کانفرنس میں سلطنت آصفیہ دکن کے وفد کا سیکرٹری نامزد کیا۔

جنوری ١٩٣٥ء میں محمد مارماڈیوک پکتھال حیدر آباد ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو گئے۔ سرکار نظام نے تاحیات پنشن مقرر کر دی۔ اور پکتھال واپس لندن چلے گئے اور وہاں ہمہ تن تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ "اسلامک کلچر" جو پہلے حیدر آباد سے چھپتا تھا اب لندن سے چھپنے لگا۔ راکل سنٹرل انجمن سوسائٹی لندن کی طرف سے ان کے سلسلہ وار مضامین "جدید دنیا میں مسلمانوں کا کردار" بھی شائع ہونے لگے۔

اس طرح بقیہ حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کرتے ہوئے یہ عظیم انسان، بے مثل عالم اور مفکر و مبلغ ١٩ مئی ١٩٣٦ء کی صبح حرکت قلب بند ہونے سے وفات پا گئے۔ ١٨ مئی کی رات سونے سے پہلے انہوں نے ایک کاغذ پر قرآن پاک کی یہ آیت اور اس کا انگریزی ترجمہ تحریر کیا:

"بلى من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عند ربه ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون"

ترجمہ: حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں (البقرۃ۔ آیت ١١٢)

گویا اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں محمد مارماڈیوک پکتھال کو کامیابی اور خوشنودی کا مژدہ سنا دیا۔ یہ نصیب اللہ اکبر! انہیں لندن میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا اگرچہ ان کی دیرینہ تمنا تھی کہ ان کی موت اسپین میں ہو اور وہ وہیں دفن ہوں۔ اسپین کے اسلامی دور سے انہیں بے حد محبت تھی۔

پکتھال یورپی ہونے کے باوجود مکمل طور پر اسلامی اخلاق سے آراستہ تھے۔ پنج گانہ نمازوں اور رمضان کے روزوں میں کبھی ناغہ نہ ہونے دیتے۔ قدم قدم پر اللہ اور رسول ﷺ کا ذکر فرماتے۔ اللہ پر ان کا ایمان بڑا مستحکم تھا۔ ہر کام اس کی رضا کے مطابق انجام دیتے۔ بے حد شریفانہ جذبات کے مالک تھے۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران غریب اور نادار طلبہ کی دل کھول کر مالی امداد کرتے۔ بے تعصب اور بے ریا انسان تھے اور ان سے ملنے والے ایمان میں تازگی محسوس کرتے تھے۔ مشہور مصنف شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں:

"مجھے علی گڑھ میں ان کے چند شاگردوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، لیکن ہر ایک ان کے خلوص اور ان کی شفقت پدرانہ کا مداح تھا۔"

[illegible] "اردو ڈائجسٹ" جنوری [illegible]

حیاتِ جگر کا ایک اہم باب*

ایک خط کی روشنی میں

ڈاکٹر افضال احمد

حضرت مسعود حسن ذوقی صاحب مرحوم جگر مراد آبادی مرحوم کے بہت قریب رہے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ جگر پر ایک جامع اور کتاب تصنیف کریں۔ ہر طرف سے حالات جمع کر رہے تھے۔ مرحوم نے جناب پروفیسر دیال صابر جن کا قیام ۱۹۶۰ء میں شکوہ آباد تھا۔ ان کو جگر اور شیراز بی صاحبہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے مین پوری بھیجا۔ صابر صاحب نے شیراز بی سے ملاقات کی اور تمام حالات خط کی صورت میں ذوقی صاحب کو بھیج دیے۔ یہ خط انھوں نے ۱۴۔ نومبر ۱۹۶۰ء کو لکھا تھا۔ خط کی عبارت حسب ذیل تھی۔

میں آج ۱۲۔ نومبر ۱۹۶۰ء کو شیراز صاحبہ سے ملنے کی غرض سے مین پوری گیا۔ دوپہر کے وقت خدا بخش مین پوری میں پہنچ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پاکستان نہ چلی گئی ہوں۔ محلے پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہیں ہیں اور اسی مکان میں جس میں وہ جگر مرحوم کے زمانے رہتی تھیں اور جس مکان کو جگر صاحب اپنا "طور" کہا کرتے تھے۔ جس مکان میں شیراز صاحبہ رہا کرتی ہیں اس کے کئی حصے ہیں۔ اور زیادہ حصے کرایے پر اٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن گھر سے ملا ہوا جو حصہ ہے اس میں شیراز صاحبہ، ان کی ماں اور ایک بہن رہتی ہیں۔ میں اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر ایک بوڑھی عورت باہر نکلی، میں نے ان سے کہا میں شیراز صاحبہ سے ملنے آیا ہوں۔ اور ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ شیراز صاحبہ کی بہن تھیں۔ میری بات سن کر وہ اندر چلی گئیں اور تھوڑی دیر بعد دونوں بہنیں باہر آئیں۔ مجھے اندر بلایا گیا اور ایک چوکی جس پر قالین بچھا تھا بٹھا دیا گیا۔ خود دونوں بہنیں برابر کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

. . . پہلے بڑی دیر وہ مہمان نوازی میں مصروف رہیں۔ اپنی بیماری کا ذکر کیا۔ میرے حالات دریافت کیے۔ پھر میں نے خود ہی کہا کہ میں ایک خاص غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ غرض یہ ہے کہ حضرت مسعود حسن صاحب ذوقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ حضرت جگر مراد آبادی مرحوم پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ذوقی صاحب جگر صاحب کے خاص دوست رہے ہیں۔ وہ جگر مرحوم کی زندگی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جگر مرحوم کے اس زمانے

---

* یہ خط اور شیراز صاحبہ کی تصویر دونوں میرے پاس موجود ہیں۔ افضال احمد

ے کے حالات جمع کروں ۔ جب مرحوم مین پوری میں رہتے تھے ۔ جگر صاحب کے ان تاثرات کے سلسلے تلاش کروں ، جن کے تحت جگر مرحوم نے شعلہ طور میں بہت سی غزلیں کہی ہیں اور جن کا تعلق مین پوری اور آپ کی (شیراز صاحبہ) ذات سے ہے ۔ شیراز صاحبہ بڑی معاملہ فہم عورت ہیں ۔ میری غرض کو بخوبی سمجھ لیا ہوگا ۔ اور پھر نہایت دل نشین لہجے میں تمام حالات بتائے ۔

شیراز صاحبہ کا اصل وطن شکوہ آباد ہے اب ان کی عمر تک بھگ ساٹھ سال ہے ۔ جب وہ پندرہ ، سولہ سال کی تھیں ، تب اپنی ماں کے ساتھ مین پوری چلی آئی تھیں اور پھر یہیں کی ہوگئیں ۔ تیس سال کی عمر تک انھوں نے خاص اور اونچے درجے کی طوائفوں طرح زندگی گزاری ، وہ شروع ہی سے کافی مشہور تھیں ۔ شکوہ آباد میں ایک پختہ مکان تھا ۔ اور مین پور میں کئی مکان ہیں ۔ اس کے علاوہ نقد روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے ۔ وہ کبھی روپے کی بھوکی اور محتاج نہیں رہیں ۔ اس کے علاوہ کافی تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں ۔ اسی لیے انھوں نے عام طوائفوں کی طرح زندگی نہیں گزاری ۔ ۱۹۲۸ء تک وہ مستقل اور پابندی کے ساتھ مین پور کے ایک رئیس کے ساتھ رہیں ۔ ۱۹۴۸ء کو حج کعبہ کو چلی گئیں ۔ اور وہاں سے واپس آکر پردہ اختیار کر لیا ۔ قریب ۲۰ سال پردے میں رہیں ۔ اس عرصے میں اپنے شرعی محرموں کے علاوہ کسی مرد سے نہیں ملیں ۔ ان رئیس سے بھی نہایت شریفانہ اور مہذب طریقے سے مل لیتی ہیں ۔ ان کی موجودہ زندگی نہایت پاک صاف اور شریفانہ ہے ۔ نماز کی سختی سے پابند ہیں ۔ ذریعہ معاش مکانوں کا کرایہ ہے ۔ ان کے ساتھ ان کی بوڑھی ماں اور اعجاز صاحبہ (بہن) رہتی ہیں ۔!

شیراز صاحبہ نے جگر مرحوم کے حالات خود بتائے ۔

جگر مرحوم شیخ اصغر حسین اصغر مختار کلکٹری مین پوری کے یہاں رہتے تھے ۔! اصغر صاحب خود بھی اچھے شاعر تھے اور بڑے شاعر نواز مہمان نواز آدمی تھے ؛ جگر صاحب ان کے یہاں برسوں رہے ہیں ۔ اصغر صاحب کے ساتھ جگر صاحب شیراز صاحبہ کے یہاں جایا کرتے تھے ! اور غالباً جس دن شیراز صاحبہ کو پہلی بار دیکھا اسی دن عشق ہو گیا ۔ اور پھر وہ بڑھتا ہی گیا ۔ جگر صاحب کا رندی کا زمانہ تھا ۔ شراب بے حد پیتے تھے ! شیراز صاحبہ شراب کو سخت ناپسند کرتی تھیں جگر صاحب اس سے واقف تھے ! اس لیے ان کے پاس اکثر بغیر پیے ہی جاتے تھے ۔ لیکن جب کبھی وہ پی کر جاتے تو شیراز صاحبہ ان کے سامنے سے اٹھ جاتی تھیں ۔ اس پر جگر صاحب اصغر صاحب کے پاس جاتے اور کہتے تھے کہ "سرکار مجھ سے خفا ہیں "! اصغر صاحب تسلی دیتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی بات نہیں ۔ آج تم نے پی لی ہے ۔ اس لیے خفا ہیں ۔ پھر جگر صاحب غسل کرتے اور کپڑے بدل لیتے تھے اور دوبارہ جاتے تھے تب شیراز صاحبہ انھیں اپنے پاس بٹھا لیتی تھیں ۔

جگر صاحب مرحوم شیراز صاحبہ سے جلوت و خلوت ہر حالت میں ملے مگر ہمیشہ تہذیب و محبت کی حدود میں رہے ۔ بدمستی و خلوت میں بھی انھوں نے شیراز کو کبھی "عورت" نہیں سمجھا ، ہمیشہ محبوب اور بعض اوقات تو معبود تک ہی سمجھتے رہے ۔ اس سلسلے میں حد یہ ہوتی تھی کہ وہ شیراز صاحبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے ۔ ہتھیلی اوپر کر کے نہایت نرمی سے پوچھتے تھے :

اور اس کا جواب پاکر ہاتھ چھوڑ دیتے تھے : بوسہ صرف قدموں کا لیا ہے۔
اکثر یہ ہوا کہ جگر صاحب شیراز صاحبہ کے کمرے میں آتے فرطِ محبت میں نیم غشی کا عالم ان
: پھر جو کچھ کہا بزبانِ خاموشی ہی کہا ہے۔۔۔ انتہائی نشے کے عالم میں وہ کبھی بے تمیزی کی بات یا حرکت نہیں
جب غافل ہو جاتے تو چپ چاپ لیٹ جاتے تھے :۔
شیراز صاحبہ جگر مرحوم سے محبت کرتی تھیں اور احترام کرتی تھیں۔ اور آج تک نہایت خلوص و احترام سے ان کا ذکر کر
ذکر کرتے وقت وہ کبھی مسکرا دیتی ہیں اور کبھی آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔
جگر صاحب شیراز صاحبہ کو ہمیشہ سسرکار کہتے تھے اور ان کے گھر کو طور کہتے تھے، میرا خیال ہے کہ ان کے دیوان "شعل
م بھی اسی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ جگر صاحب شیراز صاحبہ کی بہن اعجاز صاحبہ کو ہمیشہ "اعجاز بہن" کہہ کر پکارتے تھے
ے اعجاز صاحبہ کے کردار پر تو خیر کوئی روشنی نہیں پڑتی مگر جگر صاحب کی شرافت اور خلوص روشن ہوجاتا ہے "
جگر مرحوم کی توبہ کی وجہ بھی شیراز صاحبہ ہی ہیں۔ جب وہ ۱۹۴۸ء میں حج سے واپس آئیں تو جگر صاحب اپنے ایک مین پور
کے دوست کے ساتھ شیراز صاحبہ سے ملنے گئے۔ شیراز صاحبہ پردے میں تھیں۔ وہیں سے انھوں نے مین پور
والے صاحب کے لیے کچھ کھجوریں اور ایک گلاس آبِ زمزم بھیجا۔ انھوں نے کچھ کھجوریں کھائیں اور آبِ زمزم پی لیا
اور کہا: آپ نے جگر صاحب کے لیے یہ چیزیں کیوں نہیں بھیجیں۔
شیراز صاحبہ نے پردے سے جواب دیا: "انھیں صاحب اس سے کیا حاصل ؟ آج اس حلق میں آبِ زمزم
جائے گا ... اور کل پھر شراب جائے گی۔ زمزم کی بھی توہین ہوگی اور پینے والے کو بھی کچھ لطف حاصل نہ ہوگا"
جگر صاحب یہ سن کر فوراً کھڑے ہو گئے۔ اپنے دوست کو وہیں چھوڑ کر اصغر صاحب کے گھر
گئے، غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور پھر واپس آ گئے اور بلند آواز سے کہا:
" "اب زمزم بھیجئے۔ میں اسے پیوں گا اور انشاء اللہ اب اس حلق میں کبھی شراب نہ جائے گی۔"
زمزم بھیجا گیا اور جگر صاحب نے پیا اور اس کے بعد تمام زندگی شراب نہیں پی۔"
مجھے شیراز صاحبہ نے ایک تصویر دکھائی۔ گروپ کے بیچ میں جگر صاحب کھڑے ہیں تصو
کی پشت پر جگر صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک شعر ہے ۔

اب بھی ہیں تیرے تصور سے وہی راز و نیاز
اپنے اُجڑے ہوئے آغوشِ محبت کی قسم
جگر مراد آبادی

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ جگر صاحب کا خط نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ جگر صاحب حج سے واپس آ
تو شیراز صاحبہ سے نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیراز صاحبہ نے انکار کیا تو نہیں مگر یہ کہا کہ وہ نکاح ایک
سال بعد کر سکیں گی۔ جگر صاحب کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی ۔۔۔ اور وہ گونڈے چلے گئے۔ ادھر اصغر گونڈو
صاحب کا انتقال ہو چکا تھا، جگر صاحب نے اپنی پہلی بیوی سے جو اصغر صاحب کے عقد میں تھیں دوبار
شادی کر لی۔ شیراز صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا کہ جگر صاحب نے غصے میں انھیں طلاق دیدی تھی اور جب شیراز

سے ملے تو اپنی اداسی اور تکلیف کو چھپا نہ سکے۔

شیراز صاحبہ آٹھ آٹھ مہینے کراچی میں رہی ہیں۔ جگر صاحب بھی کراچی مدتوں رہے ہیں اور بھی دونوں حضرات برابر ملتے رہتے تھے، جگر صاحب اور شیراز صاحبہ کی آخری ملاقات دسمبر ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی اس کے بعد وہ ہندوستان چلی آئیں! اور پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔

جب جگر صاحب کے انتقال کی خبر مین پورا پہنچی تو شیراز صاحبہ کے گھر میں کہرام مچ گیا اور انھوں نے بہت کچھ خیرات وغیرہ بھی کی۔ انھیں اس بات کا ملال ہے کہ ان کے پاس گونڈے سے کوئی خط وغیرہ نہیں آیا۔

آج کل شیراز صاحبہ بیمار ہیں۔ پہلو میں درد ہے۔ مجھ سے ہنس ہنس کے کہہ رہی تھیں کہ معلوم ہوتا ہے جگر کی روح مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ جب وہ یہاں تھے تو اکثر اپنا شعر پڑھتے تھے:

ستم آپ اُلفت میں آساں نہ سمجھیں
تڑپ جایئے گا جو تڑپا سیئے گا

خیر میں نے انھیں کبھی تڑپایا نہیں مگر وہ اب مجھے ضرور تڑپا رہے ہیں۔

میں نے شیراز صاحبہ سے کہا کہ اگر آپ اپنی کوئی تازہ تصویر عنایت کر دیں تو بڑا کرم ہو۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا "خیر آپ مانگتے ہیں تو لے جایئے۔ یہ کہہ کر مجھے تصویر دے دی میں نے اسے شائع کرنے کی اجازت چاہی! تو پھر تھوڑی دیر کو خاموش ہو گئیں اور پھر کہا "اچھا کوئی بات نہیں آپ شائع کر سکتے ہیں۔!"

میں شیراز صاحبہ کے پاس تین گھنٹے بیٹھا۔ وہ نہایت خلوص و محبت اور تہذیب سے پیش آئیں میں ان سے بہت متاثر ہوا۔! حاجی عبدالحفیظ خان صاحب درانی شکوہ آبادی سے جگر صاحب کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے شیراز صاحبہ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کی۔! حاجی صاحب بڑے نمازی اور اللہ والے ہیں ان کی صداقت اور حق گوئی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ یوگیندر پال صابر

"دائرہ" جنوری۔ مارچ ۱۹۹۳ء

مولانا سید حامد علی مرحوم

آیات (امسال رواں کا پہلا شمارہ) پریس میں جانے ہی والا تھا کہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ مشہور عالم دین مولانا سید حامد علی صاحب کا ۳؍مارچ ۱۹۹۲ء بروز بدھ انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی ولادت یکم مئی ۱۹۲۲ء کو قصبہ میران پور کٹرہ ضلع شاہجہاں پور (یوپی) میں ہوئی اور تقریباً ۷۰ برس کی عمر پائی۔ مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم بریلی کے مدرسوں اشاعت العلوم اور مصباح العلوم میں حاصل کی۔ منشی، کامل، مولوی، فاضل دینیات اور فاضل ادب کے امتحانات الہ آباد بورڈ سے دیئے۔ انگریزی کے امتحانات پرائیویٹ طور سے پاس کئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کا مدرسہ اشاعت العلوم ہی میں عربی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ جولائی ۱۹۴۴ء سے تقریباً چار سال تک اسلامیہ کالج شاہجہاں پور میں عربک ٹیچر کی حیثیت سے کام کیا۔

مولانا مرحوم مولانا مودودی کی تحریروں سے متأثر ہوکر جماعت اسلامی کی تشکیل سے قبل ہی تحریک اسلامی کی فکر کے ہم نوا بن گئے تھے۔ البتہ اس سے باضابطہ وابستگی غالباً ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی ہند کی تشکیل کے بعد اس کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے۔ متعدد ذمہ داریوں کے ساتھ شعبۂ نشر و اشاعت و شعبۂ دعوت غیر مسلمین کی بھی ذمہ داریاں نبھائیں۔

آپ کو تصنیف و تالیف سے شغف اور اس کا خصوصی ملکہ تھا۔ اپنی تصانیف کا جو گرانقدر سرمایہ آپ نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے (جس کی تعداد تقریباً ۳۰ ہے) وہ رہتی دنیا تک صدقۂ جاریہ رہے گا۔ ابتداء میں آپ کی تصانیف مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہوئیں۔ بعد میں ادارۂ شہادتِ حق کے نام سے آپ نے ایک الگ اشاعتی ادارہ قائم کرلیا۔ آپ نے مختلف دینی موضوعات پر چھوٹے چھوٹے بہت سے کتابچے تحریر کئے۔ مثلاً اسلام آپ سے کیا چاہتا ہے؟ اسلام ایک نظام رحمت۔ اقامتِ دین اسلام کا تقاضہ۔ حج کیا ہے؟۔ تعدد ازدواج۔ نماز اور اس کے اذکار وغیرہ۔ قرآن پر آپ کی گہری اور وسیع نظر تھی۔ آپ کی ایک اہم تصنیف 'قرآنی اصطلاحات اور علمائے سلف و خلف' اس پر شاہد عدل ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں آپ نے

سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمہ اور تحشیہ کا معرکۃ الآراء کام شر
کیا تھا۔ ابھی پارۂ عم کے علاوہ سورۃ مائدہ تک چار جلدیں ہی شائع ہو سکی تھیں کہ آپکے سا
کے سبب یہ سلسلہ ناتمام رہ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر مسلمین میں دعوتی کام کرنے کی بہترین صلاحیتیں عطا فر
تھیں۔ اس میدان میں آپ نے زبان اور قلم دونوں کے ذریعے خوب خوب خدمات انجام د
ملک کے طول و عرض کے دورے کئے۔ بے شمار ٹریننگ کیمپس میں شرکت کی اور نہ جا
خدا کے کتنے بھٹکے ہوئے بندوں کو آپ کے ذریعے ایمان کی روشنی ملی۔ غیر مسلموں کی نف
کو سامنے رکھ کر آپ نے متعدد کتابچے تصنیف کئے۔ مثلاً تحریکِ اسلامی اور برادرانِ وطن۔ ش
کے اثرات اسلامی زندگی پر وغیرہ۔ آپ کو مذاہب کے تقابلی مطالعہ سے بھی خصوصی دلچسپی
اور آپ نے اس موضوع پر بہت سے کتابچے تصنیف کئے۔ اگر ایک طرف باطل مذاہب کی کم
کو واشگاف کرتے ہوئے آپ نے ان کے مقابلے میں اسلام کی برتری اور حقانیت واضح کی
دوسری طرف مذہب کا انکار کرنے اور الحاد کا علم بلند کرنے والوں کے خلاف بھی محاذ لیا
ردّ الحاد پر متعدد کتابچے تحریر کئے۔ مثلاً خدا کا انکار کیوں؟۔ خدا ہے۔ کیا خدا کی ضرورت ہ
ملحدین کے شبہات۔ اور خدا پرستی ملحدین کی نظر میں۔ ان کتابچوں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان
آپ نے خدا کے ساتھ شرک کرنے یا اس کا انکار کرنے والوں کے دلائل کی کمزوری کو مدلل ا
میں واضح کیا ہے اور ان کے پراگندہ ذہنوں کو صاف کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آ
نے مسائل سے علمی اور عقلی اسلوب میں بحث کی ہے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے اور صحیح
غلط کو پرکھنے میں تدبر و تفکر سے کام لینے پر ابھارا ہے۔

تقریباً چار سال قبل مرکز الدراسات العلمیہ علی گڑھ کے ذمہ داروں نے جب مجلہ آیا
نکالنے کا فیصلہ کیا تو مولانا مرحوم کی انھیں خدمات کے پیش نظر آپ کو اس کی مجلس مشاو
کا رکن منتخب کیا۔ آپ نے نہ صرف اس کی منظوری عطا فرمائی بلکہ وقت کے اس اہم فیصلہ پر
جانب سے تحسین اور ہمت افزائی کے کلمات سے نوازا۔

ادارۂ آیات مولانا مرحوم کے لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اور دعا کرتا
کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان خدمات کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اعلیٰ علیین میں جگہ د
فرمائے۔ آمین۔

(مدیر معاون)

"آیات" جنوری، اپریل ۹۳ء

ہم اور ہمارے اسلاف

مولانا محمد فاروقی صاحب اعظمی

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ

جب مؤرخ بنام جہادِ وطن سرفروشی کی تاریخ دُہرائیگا
آپ حیرت کریں گے کہ اس باب میں سب سے پہلے ہمارا ہی نام آئیگا

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جس جانبازی اور سرفروشی کا ثبوت مسلمانوں نے دیا ہے شاید ہی کسی قوم وملت کے ماننے والوں نے دیا ہو انھیں مجاہدینِ اسلام میں سے مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ؒ بھی ہیں آپ میں جبن وبزدلی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ٹاؤن ہال امن کمیٹی کا سینٹر تھا، امن کی کوشش کرنیوالے ہندو مسلمان یہاں تقریبًا ہر دوسرے تیسرے دن جمع ہوتے تھے۔ ایک روز جب خونریزی کا دورِ شباب تھا ٹاؤن ہال کے چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئیں تھیں بلوائیوں کے ہجوم کے سامنے پولیس اور ہجوم بھی ہتھیار ڈالے ہوئے تھے۔ ہندو دوستوں نے بڑے اصرار سے کہا:

"مولانا آپ اور آپ کے ساتھی ہمیشہ قوم پرور رہے ہیں ہماری ندامت کی کوئی انتہا نہیں رہے گی اگر آپ صاحبان پر آنچ آئی یہ وحشی ہجوم کسی کے بس کا نہیں ہے۔ یہاں ہمارے تمام حفاظتی انتظامات ناکام ہوچکے ہیں اُو کھلے میں ایک کیمپ بنایا گیا ہے وہاں یہ ہجوم نہیں پہونچ سکتا ہے وہاں فوجی دستے لگا دیئے گئے، آپ اور آپ کے ساتھی وہاں تشریف لے چلیں آپ حضرات کی بڑی مہربانی ہوگی"

اس نازک وقت میں جب موت سامنے کھڑی تھی ہندو دوستوں کی یہ اپیل کس قدر مؤثر ہوسکتی تھی، آپ تو د اپنے دل سے پوچھئے کیا آپ اس وقت اس اپیل پر لبیک نہ کہتے اسوقت آپ کے ساتھ اور بھی رفقاء تھے۔ مگر سب سے پہلے جس نے ترُخ کر جواب دیا وہ مجاہدِ ملت کا عالی حوصلہ تھا آپ نے فرمایا:۔

"ہمارے لئے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم پناہ گزیں بن کر رہیں۔ بیشک یہ سخت آزمائش ہے مگر اس میں ڈٹ کر اس بحران کا سامنا کرنا ہے۔ ؎

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

حفظ الرحمٰن کی زندگی تک ممکن نہیں ایک دفعہ مولانا شہر کا گشت لگا رہے تھے اچانک دیکھا کہ کچھ نہتے مسلمان کسی مؤمن کی نماز جنازہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے مولانا تیزی سے اس مقام پر پہونچے نماز صف بندی ہو چکی تھی مولانا کی نظر اچانک سامنے پڑی تو دیکھا کہ چند فوجی اسلحہ سے لیس چلے آرہے ہیں، مسلمانوں کی صف باندھے دیکھکر فوجیوں نے گولی چلانے کا ارادہ کر لیا اور بندوقیں سیدھی کر لیں، اگر چند لمحے اسی طرح بیت جاتے تو ان میں سے کوئی بھی نہ بچتا، مولانا اس منظر کو دیکھکر موٹر سے کود پڑے اور آناً فاناً ان درندے فوجیوں کے سامنے جا پہنچے اور گرج کر پوچھا ان نہتے مسلمانوں پر گولی چلانے کا تمہیں کس نے اختیار دیا ہے مولانا کی پُر وقار آواز کانپ رہی تھی قومی غیرت اور حمیت کے جذبات نے ان کو فرشتہ بنا کر بھیجا تھا، فوجی مولانا کی اس بے باکی اور غیر معمولی شجاعت پر حیران رہ گئے ان میں سے کسی نے کہا کہ یہ سب مسلمان ملکر ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں، مولانا نے فرمایا کہ

"کیا یہ نہتے مسلمان جن کے سامنے ایک بھائی کا جنازہ رکھا ہے تم پر حملہ کر سکتے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمانوں کے خون سے اس طرح ہولی کھیلو تو یہ حفظ الرحمٰن کی زندگی تک ممکن نہیں، میں ہرگز یہ نہیں ہونے دوں گا"

مولانا کے آہنی ارادے نے ان وحشیوں کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ کنور مہندر سنگھ آئی، اے، ایس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنگرور لکھتے ہیں

میں اکیلا ہی جاؤں گا ۱۹۴۷ء کے فسادات کے فوراً ہی بعد جب میں دہلی میں بطور مجسٹریٹ تعینات تھا ان دنوں مجھے دہلی کے گلی کوچوں میں رات بے وقت گشت کرنا پڑتا تھا کبھی کبھار مولانا بھی ہمراہ ہوتے تھے جو شخص اپنے عقائد کا پکا ہو وہ بہادر بھی ہوا کرتا ہے اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کئے ہیں مولانا بھی اپنے دھن کے پکے تھے اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ میں گھبراتے نہیں تھے میں نے ان کو

کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹتے دیکھا ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا میں پولیس لے کر فوراً موقعہ پر پہونچا دیکھا کہ مولانا پہلے ہی وہاں موجود ہیں میں نے گذارش کی کہ اب آپ تشریف لے جائیں میں یہاں کی دیکھ بھال کر لوں گا میں نے ہر چند چاہا کہ پولیس ساتھ کر دوں تاکہ مولانا کو گلی قاسم جان تک پہونچا آئے، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی جاؤں گا، میں نے تعمیلِ حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کیلئے بھیجدیا مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جاں کی طرف چل پڑے، بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو میں آہستہ سے انکے پیچھے ہولیا تاکہ راستہ میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آجائے، مولانا کی زندگی ہمارے لئے ایک بیش بہا سرمایہ تھی جسے ہم کسی قسم کے خدشہ میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے، اس واقعہ کا ذکر آج پہلی بار کر رہا ہوں، مولانا کو بھی اس کا علم نہ تھا۔

مجاہدِ ملّت کے تین خاص وصف

مجاہدِ ملّت کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تین جو ایسے عطا فرمائے تھے جنہوں نے مجاہدِ ملّتؒ ملک وملّت کا بہترین رہنما بنا دیا، اور جن کی وجہ سے نہ صرف ان کی شخصیت اُبھرا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں نے ان کی ان صفات اور شخصیت سے حیات تازہ کا پیام پایا، ورنہ ہندوستان میں ان کی حیثیت غلامانہ ہوگئی تھی۔ مولانا کے یہ تین جو ہر تدبّر جرأت، اور خطابت تھے، تدبّر سے تقاضائے وقت سمجھ کر، جرأت سے عملی قدم اٹھاتے اور قوتِ بیان سے سمجھاتے تھے۔!!!

"ریاض الجنۃ" مئی ۹۳ء

عرفان عباسی
[illegible] ناسخ ٹولہ، [illegible] روڈ
لکھنؤ

ایک البیلا ناول نگار — خان محبوب طرزی

تقسیم ملک کے بعد یعنی چوتھی و پانچویں دہائی کے درمیانی چند سالوں میں لکھنؤ سے رسالہ "اتحاد" نکلتا تھا جس کا دفتر امین آباد چوراہے کے قریب گونگے روڈ پر تھا۔ اس کے سرپرستوں میں رفیع احمد قدوائی، موہن لال سکسینہ، گوردھن سماسنے اور ترلوک سنگھ وغیرہ تھے اور مجلس مشاورت میں متعدد معروف ناموں کے ساتھ صحافی، شاعر و ادیب اور سماجی و سیاسی کارکن مولانا محمد اسمٰعیل اسلم لکھنوی و عبدالواحد خاں مائل ملیح آبادی وغیرہ بھی شامل تھے۔

یوں تو معاونین کی فہرست طویل تھی لیکن انتخاب و ترتیب مضامین میں مائل صاحب، کتابت و طباعت کے مراحل میں اسلم صاحب، دفتری کاموں میں فروغ علوی کاکوروی و اقبال صدیقی اور مالی معاملات میں رفیع صاحب ہی کام آتے تھے۔

ایک بار زیر کتابت شمارے کی تکمیل میں چند صفحات کی کمی پڑ گئی۔ دفتر میں جو مضامین موجود تھے وہ مجلس مشاورت کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اکثر اس طرح کی کمی مائل صاحب کے قلم سے پوری ہو جاتی تھی لیکن اس شمارے کے لیے ان کا کتابت شدہ مضمون پریس جا چکا تھا اور اس میں اضافہ کرنا ممکن نہ تھا۔ دو ایک صفحہ کی بات ہوتی تو کسی غزل وغیرہ سے پوری کر لی جاتی لیکن کسی غلط فہمی کی وجہ سے یہ کمی آٹھ نو صفحات کی تھی۔ اُدھر کاتب صاحب منتظر تھے کہ مواد ملے۔ ادھر اقبال صدیقی صاحب خاموشی کے ساتھ دفتر سے چلے گئے۔ ہم لوگ پریشان تھے اور اخبارات و رسائل الٹ پلٹ رہے تھے کہ کوئی مناسب مضمون مل جائے تو نقل ہی کر لیا جائے

چند لمحات گزرے تھے کہ کسی کے زینہ چڑھنے کی آواز نے متوجہ کیا۔ ہماری نگاہیں اٹھی ہی تھیں کہ اقبال صدیقی داخل ہوئے ان کے ساتھ "متوسط القامت، ہلکا پھلکا چھریرا بدن، ابھرا چہرہ، جس پر غور و فکر اور متانت و سنجیدگی کی تہیں، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، ہونٹ بھنچے ہوئے، تبسم دبا، سر پر انگریزی تراش کے بال، جسم پر معمولی لباس، مزاجاً خلیق لیکن کم گو، بیدار اور خوددار و خوش" سے ایک صاحب اور تھے —— وہ تھے اپنے دور کے بسیار نویس، زبان و بیان پر قادر، کثیر التصانیف صاحب طرز ناول نگار — خان محبوب طرزی — میں نے انہیں اکثر امین آباد کے مختلف حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے دیکھا تھا لیکن ان کی زود نویسی، فنی مہارت، وسعت معلومات، حاضر دماغی اور قلم کی حیرت ناک روانی دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

میز پر قلم و کاغذ موجود تھا۔ طرزی بیٹھے، کاغذ رکھا، قلم اٹھایا اور تحریر شدہ صفحات مشین کی طرح گرانے لگے۔ ایک گھنٹہ شاید ہی لگا ہو کہ ایک پیالی چائے کے خاتمے کے ساتھ ایک طویل کہانی مکمل کر کے خاموشی کے ساتھ زینے سے نیچے اتر گئے۔ کہانی ان کے تحریر کردہ سترہ صفحات پر مشتمل تھی۔ عنوان تو حافظہ میں محفوظ نہیں ہے لیکن وہ ایک ایسی ضعیفہ کی کہانی تھی جس کا اکلوتا بیٹا محاذِ جنگ سے لوٹا نہ تھا۔ ان کو اس کے بارے میں عرصے سے کوئی اطلاع نہ ملی تھی۔ وہ بے چین و بے قرار ہر وقت بیٹے کا انتظار کرتی اور ہر آہٹ کو اس کے پیروں کی چاپ سمجھ کر دوڑتی، کبھی گرتی اور کبھی کہیں ٹکرا کر لہولہان ہو جاتی —— کہانی شائع ہوئی اور حاصل شمارہ

سکی۔

خان محبوب طرزی کی ولادت موتی حسین گنج لکھنؤ میں ایک متوسط الحال گھرانے میں ۱۹۱۰ء میں ہوئی تھی۔ ان کے اجداد کو تاتار تھا۔ اس نسبت سے افراد خاندان "تاتارزئی" کہے جاتے رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے "طرزی" ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ محبوب طرزی کے دادا و والد کوئٹہ سے لکھنؤ آئے تھے اور حسین گنج میں بس گئے تھے۔ طرزی کی ابتدائی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ گھریلو تعلیم کے بعد کچھ دن مشن اسکول میں رہے پھر دارالعلوم اسلامیہ ہائی اسکول لکھنؤ (اب ڈگری کالج) میں دسویں تک پڑھنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور معاشی تگ و دو میں لگ گئے۔ ملازمت کا آغاز علی گڑھ کی تالا ساز فیکٹری میں بعہدہ سپروائزر ہوا۔ چند ماہ گزرے تھے کہ ۱۹۳۲ء میں محکمۂ دماغ میں اسٹور کیپر ہو گئے لیکن وہاں بھی دل نہ لگا۔ ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر کے فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو گئے۔ الی ووڈ اسٹوڈیو، ہندو تھیٹرس اور ایسٹ انڈیا وغیرہ میں کام کیا۔ لیکن والد کو فلم انڈسٹری سے ان کی وابستگی پسند نہ تھی۔ ان کی ہدایت پر ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ واپس آ گئے۔ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہوئے۔

کچھ دن گزرے تھے کہ عالمی جنگ نے شدت اختیار کر لی اور انھوں نے ایک فوجی عہدہ قبول کر لیا۔ اسی زمانے میں یوپی گورنمنٹ نے ڈرامہ پبلک شعبہ قائم کیا جس نے طرزی کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۶ء تک چلا۔ ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ میں ایک فلم کمپنی "سینی..." کے نام سے قائم ہوئی طرزی اس سے منسلک ہو گئے لیکن وہ کبھی بھی چل نہ سکی۔

طرزی کی زندگی کا بیشتر حصہ افکار، مصائب، بے روزگاری اور معاشی تنگی میں گزر چکا تھا۔ اب انھوں نے صرف قلم کے سہارے حیات کے پیچ و خم سے گزرنے کا فیصلہ کر لیا اور سارا وقت ادبی مشاغل میں صرف کرنے لگے۔

طرزی بچپن ہی سے بڑے ذہین، طباع اور قوی الحافظہ تھے۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق فطری تھا، جس پر علی گڑھ یونیورسٹی کے ادبی ماحول میں جلا ہوئی۔ انھوں نے پہلا افسانہ "خوبصورت شرارت" کے عنوان سے لکھا تھا اور پہلا ناول "شہزادی کا شب نور" تھا، جو پہلے ہفت روزہ "سرفراز" لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوتا رہا، پھر کتابی شکل میں چھپا۔ اس کے بعد اس طرح مصروف قلم کاری ہوئے کہ لاتعداد مضامین، ریڈیائی فیچر، کہانی، افسانے، ڈرامے اور مذہبی واقعات، سائنسی، جاسوسی، سیاسی، ثقافتی، تاریخی، سماجی، اصلاحی، تبلیغی و دیگر موضوعات پر

ناولوں کا انبار لگا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ناولوں کی تعداد دو سو سے زائد ہے اور ایسے ناولوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو انھوں نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے معمولی معاوضہ لے کر دوسروں کے نام سے لکھے اور وہ ان کے ناموں سے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

طرزی سائنس جیسے خشک، غیر رومانی موضوع تعلیم کے باوجود بڑے شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ناول نگاری میں انہماک، بسیار نویسی، موضوعات کے انتخاب، سائنسی نکات، انفرادیت، معلومات کی وسعت اور طرز نگارش میں ان کی مثال ملنا دشوار ہے۔ وہ بیک وقت مختلف موضوعات پر چار پانچ ناول شروع کرتے اور لکھتے تھے۔ احباب و قدرداں موجود ہیں، وہ ان سے مخاطب بھی ہیں اور قلم بھی چل رہا ہے۔ لکھنے کے لیے کسی مخصوص جگہ کی ضرورت تھی نہ سکون و تنہائی کی۔ بچوں کے شور، ٹریفک کی ہنگامہ خیزی، احباب کی گفتگو، مباحثے اور قہقہے ان تمام حالات میں ان کے قلم کی روانی میں فرق نہیں آتا تھا۔ بلا کے ذہین اور قوی الحافظہ تھے۔ ایک ناول کے ۲۰۰ صفحات لکھتے لکھتے دوسرے ناول کا بقیہ حصہ شروع کر دیتے تھے۔ وہ کردار نہ بھولتے تھے۔ ان کی صلاحیت، جہاں سے لکھنا چھوڑتے تھے گزشتہ صفحات پر نظر ڈالے بغیر وہیں سے آگے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ پلاٹ اور کردار ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے وہ جب اور جہاں چاہتے تھے فٹ کر دیتے تھے لیکن کیا مجال کہیں چوک جائیں یا تحریر میں کسی طرح کے جھول کا شائبہ تک نظر آئے۔

طرزی سائنس کے طالب علم رہے تھے اور سائنسی نکات کو سادہ و سلیس زبان اور لطیف و دلچسپ انداز میں ناول کے قالب میں ڈھالنے میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ حسب ضرورت سائنسی ایجادات اختراع کر لیتے انھیں اس طرح ناول کا حصہ بنا دیتے کہ قاری کو اختراع کا گمان تک نہ ہوا اور ناول ختم ہونے تک اس کی حیرت و دلچسپی قائم رہے۔

ناول نگاری میں انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی تھی۔ اپنے ناولوں کے موضوعات عموماً عام زندگی سے اخذ کرتے تھے اور روزمرہ پیش آنے والے اہم واقعات کو چند دنوں میں دلچسپ کہانی اور ضخیم ناول کی شکل میں پیش کر دیتے تھے۔ کئی سو صفحات کے ناول چند دنوں میں اور طویل افسانے چند گھنٹوں میں مکمل کر دینا ان کے معمولات میں تھا۔ ان کے ناول کردار نگاری اور پلاٹ کی ترتیب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

طرزی نے مختصر وقفۂ حیات میں جو ادبی خدمات انجام دیں اور تنہا جتنا کام کیا اس کے لیے کئی زندگیاں درکار تھیں۔ ...

واحد تو کیا کسی ادارہ نے بھی اتنا کام شاید ہی کیا ہو۔۔۔ ان کی بسیار نویسی کا اندازہ ان کی زندگی کے آخری دو سال کے شائع شدہ ناولوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جب مسلسل مصائب، افکار، عسرت و افلاس انہیں توڑ چکے تھے اور اعصاب نود نویسی میں معاونت سے کترانے لگے تھے۔۔۔

۱۹۵۶ء

صبح بنارس۔ سیلاب۔ نازک ادا۔ اُفق کے پار۔ دوشیزۂ روم۔ انجمن۔ صنم کدہ۔ پُراسرار عرب۔ نئی زندگی۔ قمر طلعت۔ دُلہن۔ جنگل کا راجا۔ مہرا فروز وغیرہ

۱۹۵۷ء

مقدس لہو۔ دوسری دُنیا کا انسان۔ رُوحِ رواں۔ پارس۔ گیتی آرا بیگم۔ جانباز۔ نیلوفر۔ حادثہ۔ صنوبر۔ گل بانو۔ وغیرہ

انہیں دو سالوں میں متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی ان کی کہانیاں اور افسانے وغیرہ ناولوں کے علاوہ ہیں۔ یوں تو طرزی کے مختلف موضوعات پر لکھے گئے تقریباً سارے ناول پسند کیے گئے اور انھوں نے سارے ملک میں اپنے قارئین و مداحین کا ایک وسیع حلقہ بنا لیا تھا جو ان کے ناول ذوق و شوق سے پڑھتا تھا اور نئے ناول کی اشاعت کا منتظر رہتا تھا۔ لیکن "عشرا" "اُفق کے پار"۔ "قیامتِ صغرا" "معمولی چادر"۔ "مقدس لہو"۔ "آغازِ سحر"۔ "نیا راستہ"۔ "قمر طلعت"۔ "برق پاش"۔ "جانباز"۔ "ایک جان تین قالب"۔ "اُرجن فلسفی" اور "امین آباد" وغیرہ بہت مقبول ہوئے۔ اور بعض کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے۔

طرزی ایک ہی وقت میں متعدد باتیں سوچتے، کئی ناول ایک وقت شروع کرنے اور روانیِ قلم کے ساتھ پلاٹ ترتیب دینے کے گُر سے خوب واقف تھے۔ ان کے ذہن میں کوئی موضوع آئے اور ناول شروع نہ ہو، یہ ممکن نہ تھا۔ متعدد موضوعات کے ساتھ انھوں نے "آغازِ سحر"۔ "مقدس لہو" اور "جانباز" وغیرہ ناول لکھ کر جہدِ آزادی کی نہایت موثر و حسین انداز میں عکاسی کی ہے۔

وہ لکھنؤ کی آب و ہوا میں پروان چڑھے تھے، اس کی معاشرت پر "اودھ کے بانکے"۔ "سیلاب"۔ "نواب قدسیہ محل"۔ "رنگین جل پری"۔ "نازک ادا بیگم"۔ "دلہن"۔ "قمر طلعت" اور "امین آباد" وغیرہ ناول لکھ کر اس کا حق ادا کیا ہے۔

طرزی کو صحافت سے بھی لگاؤ تھا۔ روزنامہ "اردو" [illegible] کے ایڈیٹر رہے تھے اور دوسرے اخبارات سے بھی وابستہ تھے جن میں "سرپنچ" لکھنؤ بھی شامل ہے۔

طرزی کی سب سے بڑی کمزوری ان کی قناعت پسندی، مروت اور بے لوث ادبی خدمت کی لگن تھی جس نے کبھی انہیں معاشی خوشحالی فارغ البالی کا منہ نہ دیکھنے دیا۔ وہ دن رات اور بے تکان لکھتے تھے پبلشر ان کے ناول چھاپ کر تجوریاں بھرتے تھے لیکن ان کی دیدہ ریزی و جاں فشانی کا برائے نام معاوضہ قسطوں میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ ان کی کوئی ضرورت پوری نہ ہو سکے۔ وہ بے زری کے شکنجے سے نکل سکیں اور پیٹ کا دوزخ پاٹنے کے لیے نت نئے ناول لکھ کر پیش کرنے پر مجبور رہیں۔

طرزی نے ساری زندگی انھیں حالات میں گزاری۔ نہ کبھی ناقدر شناسیِ زمانہ کا شکوہ کیا، نہ اپنی محنت کے صلے کا تعین کیا اور نہ کبھی پبلشر سے کوئی مطالبہ کیا۔

ایک بار کسی نے ان سے قلم کاری کی آمدنی اور تخلیقات کے معاوضے کے بارے میں سوال کیا، تو۔۔۔

"میں اُردو ادب کی خدمت کو عبادت سمجھتا ہوں اور عبادت کا معاوضہ طلب نہیں کیا جاتا"

یہ جواب تھا، قناعت پسند، تنگ دست، باصلاحیت، بسیار نویس اور صاحبِ طرز ناول نگار کا، جس نے ساری عمر اسی عبادت میں گزار دی۔ شہرت و مقبولیت کے باوجود نہ کبھی معاشی بدحالی میں فرق آیا نہ کبھی بے زری کے پھندے سے نکل سکا۔

طرزی نے مسلسل جن ناساعد حالات میں خونِ جگر صرف کر کے ملک، ادب اور معاشرے کی خدمت و اصلاح کی پُرخلوص و بے لوث کوشش کی اس کا ساتھ ایک ناتواں جسم کب تک دیتا۔ بالآخر وہ وقت بھی آیا جب خونِ جگر سے اہلِ ذوق کی تسکین کا سامان کرنے والے بے مثل ناول نگار کی صحت نے جواب دے دیا۔ جسم ٹوٹنے لگا۔ لیکن اس کا قلم چلتا رہا، روزی حاصل کرنے کی جدوجہد جاری رہی اس وقت تک جب تک آخری سانس کے جھٹکے نے اس کے ہاتھ سے قلم گرا نہیں دیا۔

۱۹۶۰ء میں خان محبوب طرزی کا لکھنؤ میں انتقال ہوگیا

* نیا دور، جون ۹۳ء

نواب میر عابد علی خاں صاحب مرحوم

خواجہ حسن ثانی نظامی

(پیدائش ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء وفات ۱۱ نومبر ۱۹۹۲ء)

آنکھیں بڑی۔ دہانہ چوڑا۔ ہونٹ رنگین۔۔۔۔ پان کی لالی سے کم سگرٹ کے دھوئیں سے زیادہ!۔۔۔۔۔

پیشانی کشادہ روشن اور قومی کی سرپرستی سے بے نیاز! مگر تن نازک جب دیکھو شیروانی کا نیازمند!

قد ایسا جیسے بوٹا سا کہیے۔ لیکن وہ بوٹا جس کے اندر ایک اونچا گھنیرا، چھتنار درخت چھپا ہو۔ سایہ دار بھی، پھل دار بھی اور سر بلند بھی!

اردو کی ترقی پسند تحریک سے عابد علی خاں صاحب (ایڈیٹر سیاست حیدرآباد) کی وابستگی کا حال مجھے بہت دن بعد معلوم ہوا۔ اول اول انھیں ایک خانقاہ کی نسبت سے جانا کہ وہ حضرت شاہ صابر حسینی رح سجادہ نشین درگاہ حضرت خاموش رح کے داماد ہیں۔ یا حیدرآباد کی بعض دعوتوں یا رتھوں میں لوگوں نے انھیں "عابد نواب" کہہ کر مخاطب کیا تو سمجھا کہ حضرت صابر حسینی رح کی صاحبزادی کسی جاگیردار سے بیاہی گئی ہیں۔ تھوڑی واقفیت سے بعض اوقات غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ اللہ مجھے معاف کرے میرے ذہن میں بھی ان کی پہلی تصویر ادھوری اور کسی قدر غلط بن کر آئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ نے دنیا کا سارا کارخانہ نوابوں اور جاگیرداروں ہی کے سپرد کر رکھا تھا۔ اور اس طبقے نے بڑی عظیم ہستیاں پیدا کی تھیں نیز خانقاہیں بھی کسی زمانے میں ایسی تھیں جہاں نہ جمود کا نام تھا نہ فرسودگی جگہ پاتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ جاگیریں کاہلوں اور نکموں کی جاگیر ہو گئیں۔ اور خانقاہوں میں پیر طریقت اور شیخ وقت کا نہیں مریدوں اور عقیدت مندوں کا سکہ چلنے لگا۔ یہ لوگ اپنے جاہل جاہل پیروں اور پیرزادوں کے جسم پر بھی بوڑھے چولے دیکھنا پسند کرتے تھے اور ان کی تسکین کا سامان بس یہ رہ گیا تھا کہ خانقاہیں چلت پھرت سے خالی ہوں۔ دیوان کی چھتوں پر کہرا۔ دیواروں پر کائی اور حجروں میں لوبان کی ایسی دھونی رمائی جائے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے! پھر جیسی طلب ویسی رسد۔ اچھے اچھے لوگ شرما حضوری زمانے کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے! ۶

ہر چند کہ عابد علی خاں صاحب ایک روشن خیال اور روشن نظر خانقاہ کے داماد تھے اور ان کے بڑے برادر نسبتی حضرت قطب میاں صاحب نے خانقاہ کے سہارے کے ساتھ گفتگو کی کرسی کو بھی رونق بخشی تھی اور ان سے چھوٹے برادر نسبتی حضرت فرید میاں نے ذکر و شغل کی مشق کے ساتھ نظام حیدرآباد کے "صرف خاص" کے اہتمام کی

مشقت بھی سہی تھی۔ تاہم یہ کیا ضروری ہے کہ کسی خانقاہ میں سب افراد ایک جیسے ہوں۔ خاص کر وہ داماد جو نواب بھی ہوں اور چھاپہ خانے اور اردو اخبار کے مالک بھی! خبر نہیں کیوں۔ چھاپہ خانے کے ساتھ میرے دماغ میں کالک کا تصور آتا تھا۔ اور اردو اور اس کا اخبار اور پھر اس اخبار کا دفتر، یہ سب تو مجھ ہی کو کیا بقول کسے ہر ایک کو عاشقی اور شاعری اور بے ترتیبی یاد دلاتے ہیں!

مگر پھر ایک کاروباری ضرورت سے اخبار سیاست کے دفتر اور پریس جانا پڑا جہاں عابد علی خاں صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ قریب سے دیکھنے پر ان کی دنیا کچھ اور ہی نظر آئی۔ نہ کاہلی نہ کچرا نہ دھواں نہ کالک نہ فرسودگی نہ بے ترتیبی! سیاست کا سا چھاپہ خانہ تو میں نے انگریزی اخباروں کا بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری سجی سجی۔ بک شک سے درست در و دیوار، زمین و آسمان سب سے خوش حالی اور بلند اقبالی نمایاں!

یہ دوسری تصویر پہلی تصویر یا تصور سے بالکل مختلف پائی۔ مگر واقعیت اب بھی مکمل نہیں تھی۔ اس لئے پھر غلط فہمی پیدا ہوئی کہ کوئی زمانہ نہ تو مسلمانوں میں ایسے اولوالعزم پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ نہ ہندوستان میں کوئی کارخانہ یورپ وامریکہ کے انداز کا دکھائی دیتا ہے اس لئے عابد علی خاں صاحب مسلمانوں میں کیسے موجود ہیں اور ان کا کارخانہ ہندوستان میں کیونکر ہے؟ اگر عابد علی خاں صاحب واقعی مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے تو اب تک آنکھوں سے اوجھل کس طرح رہے؟ اور ان کے سے اعلیٰ طباعتی اور اشاعتی کارخانہ جات بھلا ہمارے بارے الحمد ہندوستان میں کیوں ہونے لگے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں پر اعتبار کریں! یہ تو خود ہندوستان کا ہندوستان میں پردیسی ہونا ہو گیا!

میں خیالات کے اس طلسم میں الجھا ہوا تھا کہ ایک ساتھی نے جو نکالا اور کہا کہ اس نئی دنیا کے چلانے والے دراصل حضرت جگر ہیں۔ ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے بھائی جگر! مگر میں نے بے اختیار کہا کہ حضرت جگر اس یگ کے ابدال قطب جس قدر بھی ہوں اور خوش عقیدہ لوگوں کے خیال کے موافق اس دنیا کے انتظام وانصرام کی ڈوریاں چاہے جس طرح ہلاتے ہوں۔ لیکن اس کا "کن فیکون" تو اللہ میاں نے عابد علی خاں صاحب ہی سے کرایا ہوگا۔ پھر انہیں داد کیسے نہیں ملے گی؟

کسی نے سچ کہا ہے کہ صاف ستھرا نستعلیق آدمی اندر سے بھی پاک اور ہلو تر ہوتا ہے۔ اور اس کی کاروباری بھاگ سلیقے کی ہو تو معاملات کا بھی کھرا نکلتا ہے۔ تجربے نے عابد علی خاں صاحب کی ایک اور خوبی یہ دکھائی کہ وہ دل کے بھی بڑے ہیں۔ کاروباری آدمی اگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھتے رہنے کی عادت نہ ڈال لے تو اس کا کاروبار جو بٹ ہو جائے یا ترقی نہ کرے۔ دوسری طرف یہ مشکل کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھنا سیکنڈ نیچر اور طبیعت ثانی بنے تو آدمی خود چھوٹا ہو جائے اس لئے وہ کاروباری لوگ جو باریک بینی کے عادی ہونے کے باوجود وسیع النظر اور دل کے بڑے ہیں خصوصی تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں میں عابد علی خاں صاحب کو اونچے مقام کا مالک سمجھتا ہوں۔

میں نے جب جب مرحوم کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ انھوں نے میری درخواست کو شرف قبول عطا فرمایا اور پھر ہزار اصرار کے باوجود نہ کبھی آمد و رفت کا کرایہ لیا۔ نہ ہوٹل کے بل میں دخل انداز ہونے دیا نہ یہ بات مانی کہ غریب خانے پر قیام فرمائیں۔ اس کے برعکس خود حیدرآباد بلاتے تو بیٹی کی شادی تک میں دعوت نامے کے ساتھ ہوائی جہاز کا ٹکٹ رکھتے!

عابد علی خاں کی عظیم شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ میں انھیں مالک، صحافی، منتظم، کامیاب تاجر اور ماہر آجر کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ لیکن ان کی زندگی کے ان پہلوؤں میں سے ہر پہلو صرف پہلو نہیں ایک آدمی لگتا تھا۔ پورا اور مکمل آدمی! ان کی ذات میں واقعی کئی آدمی جمع تھے اور وہ اکیلے دنیا سے نہیں گئے ہیں۔ کئی اور آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئے ہیں۔ ان کی موت نے دنیا کو ایک آدمی سے سونا نہیں کیا ہے۔ کئی آدمیوں سے سونا اور محروم کیا ہے۔

مرحوم کی صحافتی زندگی کے بارے میں کبھی بطور خاص کچھ سوچا نہیں تھا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے سنسنی خیزی کو اپنائے بغیر ایسی زبردست کامیابی کس طرح حاصل کی۔ سنسنی اخباری دنیا کا سکۂ رائج الوقت ہمیشہ سے ہے۔ بڑے بڑے تیس مار خاں انگریزی اخبار بھی ہر وقت چونکا دینے والی اسٹوری اور کہانی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لیکن سیاست وہ واحد اخبار نظر آتا ہے جو سنسنی کے ذریعے عارضی مقبولیت کے پیچھے کبھی نہیں پڑا۔ اس نے اپنی ان تھک محنت سے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ ہی پیدا نہیں کیا بلکہ اس حلقے کا ذوق بھی بنایا۔ اس حلقے کو واقعی سنسنی سے زیادہ نئی، مکمل اور بھرپور سے

کی تحریروں سے دلچسپی رہی اور عابد علی خاں صاحب کے سادہ مگر پرکار اسٹائل نے ان کا دل موہ لیا۔

مرحوم اس لحاظ سے بھی اردو صحافت کی تاریخ میں نمایاں مقام پا گئے کہ انھوں نے طویل مدت تک بڑے تشخص اور وضع داری کے ساتھ اپنی پالیسی کو قائم اور جاری رکھا۔ ان کی پالیسیاں صبح و شام نہیں بدلیں۔ ان کے ہاں کوئی تبدیلی آئی بھی تو اس نے قلابازی کی شکل اختیار نہیں کی بلکہ ربط و تسلسل کے ساتھ شریفانہ اور باوقار انحراف کی شان دکھائی گئی۔ ان پر سرکار پرستی کی تہمت ... لیکن دلچسپ بات یہ تھا کہ کسی بھی تہمت لگانے والے نے اس سرکاری درباری اخبار کو ... پڑھنا نہیں چھوڑا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ عابد صاحب مرحوم کے ہاں کوئی کشش ایسی ضرور ہے کہ اختلاف رکھنے والے بھی ان کے ساتھ چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جس کے ساتھ دنیا چلے۔ اس کے ساتھ دنیا سے فائدہ اٹھانے والے کیوں نہ چلیں؟ سیاست کی مقبولیت اور عابد علی خاں صاحب کی ترقی کا راز شاید یہی تھا۔

سردار دیوان سنگھ مفتون کا نام اردو کے مشہور ترین صحافیوں میں آتا ہے۔ انھوں نے اپنی زرد صحافت کو احترام عطا کرنے کے لئے لکھا تھا کہ دوسرے اخبار والے قصیدے پڑھ کر فائدے حاصل کرتے ہیں اور میں پولیس کے تھانیدار کی طرح رقمیں وصول کرتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ عابد علی خاں صاحب جیسے لوگوں نے اردو صحافت کو بھٹئی اور تھانے داری دونوں کے چکر سے نجات دلائی اور فنی مہارت، مستقل مزاجی اور ان تھک محنت کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ انھوں نے اپنے اخبار سیاست کو ایک مجلس بنائے رکھا جس کی طرف محتاج اور مختار سب کھنچے چلے آتے تھے اور وہ دولت جس کے لئے دنیا میں اتنی چیخ و پکار ہے عابد صاحب پر بن مانگے برستی تھی۔

میں نے عابد صاحب کو دوستوں کا دوست دیکھا اور کبھی کبھی یہ شان بھی نظر آئی کہ ایک چھوٹا سا میز نما آدمی اپنی بھاری بھرکم آواز کے ساتھ ٹھکانہ گرج رہا ہے اور الفاظ اس کے ہونٹوں پر فیصلے بن کر نمودار ہو رہے ہیں۔ چھوٹے اپنی ضرورتیں اس کے پاس لا رہے ہیں اور بڑے اپنی مشکل کشائی کے لئے اس کے ہاں حاضر ہیں۔ ذاتی معاملات میں۔ سماجی معاملات میں۔ سیاسی معاملات میں۔ قومی معاملات میں۔ کہیں بھی وہ بیگانہ نہیں ہے۔ اگر وہ کسی ولایت کا مالک ہے تو اس ولایت کا کوئی دور دراز کونا بھی ایسا نہیں جہاں اس کا فرمان جاری و ساری نہ ہو۔ اس کی رائے کا وزن حیدرآباد اور آندھرا ہی میں نہیں ہے۔ دہلی کا ایوان اقتدار بھی اس کی بات سننے کے لئے کان لگائے رکھتا ہے۔ نہایت شائستہ۔ نہایت ملنسار۔ بہت ہی خلیق۔ واقعی ایک بڑا انسان! زاہد میاں، شاہد میاں خوش قسمت ہیں کہ عظیم باپ کی وراثت کے ساتھ ایک تابناک روایت بھی انہیں ملی ہے۔ خدا اس روایت کو قائم رکھے۔

میں ادارۂ منادی اور جماعت نظامیہ کی طرف سے مرحوم کی بیوہ بیگم صاحبہ، اہل خاندان اور ورثا، اردو صحافی برادری کو پرسا دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عابد علی خاں صاحب کی مغفرت بھی فرمائے اور ان کے درجات بھی بلند کرے کہ مرحوم نے منکروں کے درمیان بھی اپنے اقرار کو برقرار رکھا اور زندگی بھر اللہ کے بندوں کی خدمت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ اس بڑے غم کی سہار بھی ہم سب کو عطا فرمائے آمین۔

منادی ۔ فروری ۹۳ء

من کہ

عابد علی خاں

میں کہ میر عابد علی خاں ابن میر محمود علی خاں ابن میر حافظ علی خاں ملقب نواب انتخاب جنگ بہادر اپنے بارے میں کچھ لکھنا بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ یہ بھی مشکل کام ہے کہ ۹۲ سال کی اس داستان کو کہاں سے شروع کیا جائے۔ میرے اعمال نامے میں اندراج کیا ہے جس کے تذکرے کے لیے مجبور ہونا ہو۔

جمعہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء م ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ بوقت فجر میری تاریخ پیدائش ہے۔ میں نے حیدرآباد کے ایک جاگیردارانہ گھرانے میں ایک ایسے وقت جنم لیا، جب کہ جاگیردارانہ نظام، نظام دکن کے اقتدار کے تحفظ کا دوسرا نام بنا ہوا تھا۔

میرے والد نواب میر محمود علی خاں نے بھی جن کے پدر محترم یعنی میرے دادا حافظ علی خاں انتخاب جنگ سے جو نظام ششم نواب میر محبوب علی خاں کے مدرسہ عالیہ میں ہم جماعت اور حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم کے اتالیق تھے اور نانا عابد علی خاں نواب صولت جنگ، سے غالباً دور بینی ورثے میں حاصل کی تھی اور جاگیردارانہ نظام کے تعلق سے نوشتہ دیوار پڑھنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ اسی لیے تو انہوں نے اپنے دور کے بیشتر جاگیرداروں کے لڑکوں کے برخلاف ہم تمام بھائیوں کو اسکول اور کالج کی راہ دکھائی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مال و دولت، یہ جاگیر و منصب، یہ جاہ و حشم سب عبث ہیں۔ یہ زیادہ دنوں تک کام دینے والی چیزیں نہیں۔ جو چیز اہم ہے، وہ تعلیم ہے۔ اسی سے تمہارے آبا و اجداد کا نام باقی رہ سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جاگیرداروں کے بچے ایک علیحدہ درس گاہ، جاگیردار کالج یا ثانوی درجے تک مدرسہ عالیہ میں پڑھا کرتے تھے۔ میری تعلیم کی ابتدا بھی مدرسہ عالیہ میں ہوئی اور یہیں سے میں نے میٹرک کامیاب کیا۔ جاگیردارانہ گھرانوں کی روایات کے مطابق مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے نظام کالج میں داخلہ لینا چاہیے تھا لیکن میں نے اردو ذریعہ تعلیم کی واحد اور منفرد یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کا انتخاب کیا اور اس مادر جامعہ نے جس میں "انقلابی شاعر" مخدوم کے نغمے گونجا کرتے تھے، مجھے امارت اور غربت کے فرق اور تفاوت سے واقف کرایا۔ میں نے فلسفے سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ یہ میری خوش بختی تھی جو مجھے خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر قاسم مولوی لال اور ڈاکٹر ولی الدین جیسے بلند قامت دانشوروں کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا شرف حاصل رہا۔

جامعہ عثمانیہ ہی میں مخدوم سے ملنے کا موقع ملا تھا اور جب فارغ التحصیل ہو کر باہر نکلا تو انہیں کی سنگت اور صحبت میں ادب و سیاست کی تحریکات سے اولاً نظری اور پھر عملی دلچسپی بڑھنے لگی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" نکالا کرتے تھے۔ ان دنوں حیدرآباد سے کئی اردو اخبارات شائع ہوتے تھے، لیکن "پیام" ہی وہ اخبار تھا جو سیاسی بیداری اور ترقی پسند و جمہوری تحریکات کا علمبردار تھا۔ "پیام" سے اور قاضی عبدالغفار صاحب سے ربط کے علاوہ دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی سرگرمیوں نے انقلاب کے تصور سے مجھے روشناس کرایا۔ ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ تمدن پر جمہوری اور اتحادی طاقتوں کا غلبہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دنیا بھر کی نوجوان نسل ترقی پسند اور امن دوست تحریکات سے وابستہ ہو رہی تھی۔ میں بھی مخدوم، میر حسن اور سجاد ظہیر اور کیفی اعظمی جیسے ابھرتے ہوئے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کے قافلے میں شامل ہو گیا۔ اسی لیے مجھے ۱۹۴۳ء میں اپنے شہر کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری بنایا گیا۔ ان ہی دنوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی عظیم الشان تاریخی کل ہند کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ میں نے ۱۹۴۷ء تک یہ فرائض ادا کیے اور اشتراکیت کو انسانی دکھ درد کی نجات کے ایک نسخہ کی حیثیت سے قبول تو کر لیا لیکن پارٹی کی باقاعدہ رکنیت قبول نہیں کی کیوں نہ میں شروع ہی سے کسی جماعت سے وابستگی ناپسند کرتا رہا ہوں۔ یہ بھی میرے لیے

ایک اعزاز تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود میں نے ہندوستان میں پارٹی پر سے پابندی اٹھائے جانے کے بعد بمبئی میں منعقد ہونے والی پہلی پارٹی کانفرنس میں مخدوم کے ساتھ شرکت کی اور بمبئی ہی میں قیام کے دوران مجھے بنے بھائی اور پروفیسر نورالحسن سے قریب ہونے اور ان سے کھل کر مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا۔ حیدرآباد سے جو مندوبین اس کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے، ان میں میں واحد تھا جسے بنے بھائی کے گھر قیام کا موقع ملا۔ نورالحسن صاحب بھی ان دنوں بنے بھائی کے ساتھ مقیم تھے۔ اس موقع پر مجھ سے خواہش کی گئی تھی کہ میں کارل مارکس کی کتاب WAGE.' ABOUR AND CAPITAL کا ترجمہ کروں۔ یہ میرا پہلا قلمی کام تھا جو کتابی شکل اختیار کرسکا۔ میں نے "جمہوریہ چین" اور چین کی شخصیتوں پر دو اور کتابیں لکھیں۔

والد صاحب کی خواہش کے احترام میں نظام کی حکومت کے چھوٹے افسر کی حیثیت سے داخل ہوا لیکن اس حال و ماحول میں سرکاری ملازمت کا بندھن کب تک گوارا کرتا اور ارباب مجاز بھی ایک ایسے آدمی کو کب تک سرکاری عہدے پر باقی و برقرار رکھتے جو سرپھرے انقلابیوں کا ہم اعتقاد دوست تھا۔ گھر والے بھی میری ان سرگرمیوں پر تشویش کا اظہار کرنے لگے تھے۔ والد محترم کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ اپنے گھر اور اپنے ماحول سے ذہنی تصادم کی داستان اس مرحلے پر اختتام کو پہنچی جب کہ ریاست حیدرآباد میں شخصی حکمرانی کا تار و پود بکھر کر رہ گیا اور یہ ریاست آزاد ہندوستان کا ایک جز بن گئی۔ ایسے وقت میں میں نے صحافت کو اپنا پیشہ بنانے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۴۸ میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء سے روزنامہ "سیاست" نکال رہا ہوں۔ ۹۴ برس کی عمر کے اس "کینوس" پر آپ کو نہ جانے کتنے ہی اچھے برے رنگ ملیں۔ جاذب نظر بھی اور آنکھوں میں چبھنے والے بھی، لیکن اس "کینوس" کو ایک روشن لکیر سی گھیری ہوئی ہے اور یہ لکیر میرے فکری ارتقا کی نمائندگی کرتی ہے۔

میرا اخبار جس دن شائع ہوا تھا اس دن سے کافی عرصے تک اس کی ۱۸۰۰ کاپیاں بھی مشکل سے فروخت ہوتی تھیں لیکن آج اس اخبار کا حلقہ اشاعت وسیع ہو گیا ہے۔ "سیاست" ان چند اخباروں میں سے ہے جو اعلیٰ تعداد اشاعت اور درجہ بندی کے لحاظ سے متوسط درجہ کے زمرے سے تعلق رکھتا ہے۔ "سیاست" آج میری میراث نہیں رہا ہے۔ یہ اس کے بے شمار پڑھنے والوں کی آواز بن گیا ہے اور آج بھی اسے وہ تمام طبقے اپنا ترجمان سمجھتے ہیں، جنہیں سیکولرازم، سوشلزم اور امن بقائے باہم پر ایقان ہے۔

سیاست کی اشاعت کے آغاز کے بعد سے میری زندگی کی عائلی نوعیت ختم ہوگئی ہے۔ سیاست کے صفحات میں ہر روز آپ جو کچھ دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں، اس میں زندگی کی ہر اچھائی اور برائی صاف جھلکتی نظر آئے گی۔ میں بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ سیاست میں خبروں کی ترتیب، معلوماتی مضامین و پس منظر کا مواد کچھ ایسا ہوتا ہے کہ نہ صرف اہل علم و دانشور بلکہ ایک عام قاری بھی اس کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اب خبر رسانی کے قومی اداروں اور ترسیل و ابلاغ کے عصری وسائل، تنظیم جدید یا صحافتی امور کے کسی بھی مسئلے میں سیاست کی رائے کو وقعت و اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ قومی پریس کے نمائندوں کے دوش بدوش پریس ٹرسٹ آف انڈیا اور یو این آئی کے انضمام اور علیحدگی ان دونوں مرحلوں پر میں بھی ان اداروں کے ڈائرکٹروں میں شامل رہا اور یہ اعزاز اردو میں شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوا ہو لیکن اس افتخار سے بڑھ کر یہ بات میرے لیے قابل عزت ہے کہ "سیاست" ملک کا واحد اردو اخبار ہے جسے کم و بیش تمام ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا قلمی تعاون حاصل ہے اور اس میں ان کی تخلیقات شائع ہوا کرتی ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کے کنبے کی طرح "سیاست" نے اپنے لکھنے والوں کا ایک خاندان بھی بنالیا ہے۔ انگریزی اخبارات کے ساتھ ساتھ "سیاست" کے ایڈیٹر کو بھی ایسے مباحث اور ایسے سیمیناروں میں اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے جن میں قومی مسائل زیر بحث رہتے ہیں۔ اب اردو صحافت کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنا اور زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے اعلیٰ معیار کے مطابق کوشش کرنا ہی میرا مقصد حیات ہے۔ سیاست کی آواز اور اس کے اثر کے باعث حکومت امریکہ نے ۱۹۶۸ء میں صدارتی انتخابات کے معائنہ کی دعوت دی تھی۔ سوویت یونین بھی دو مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یوروپ کے کئی شہر اور مشرق وسطیٰ بھی جا چکا ہوں۔ صدر جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد مرحوم کے ہمراہ مشرقی یوروپ اور یوگوسلاویہ اور نائب صدر مسٹر پاٹھک کے ساتھ افغانستان اور خلیجی ممالک کے دورے کا موقع ملا۔

چونکہ شہر حیدرآباد کی وضعداری اور بھائی چارگی کی روایات میرے نزدیک سب سے بلند مقام رکھتی ہیں، اس لیے میں پوری دیانت داری اور خلوص سے کوشش کرتا ہوں کہ "سیاست" کو صحت مند پرانی اور نئی قدروں کا ایک خوش گوار امتزاج بناؤں۔

اردو سے میری والہانہ محبت کو آپ میری مادری زبان ہونے کے سبب قرار دے لیں لیکن میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ یہ ہی وہ زبان ہے، جس نے ہمارے ملک میں مختلف تہذیبوں کو ملانے اور ان اقدار کو متحد بنانے کے عمل میں تیزی پیدا کی اور جس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ عصری تقاضوں کو بڑی آسانی سے قبول کر سکتی ہے اسی لیے میں اس کی نشو و نما اور اس کے ارتقاء کی ہر تحریک سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ ویسے مرکزی انجمن ترقی اردو کی نائب صدارت اور اپنی ریاست کی انجمن ترقی اردو کے شریک معتمد اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی پہلی عاملہ کے ایگزیکیٹو چیرمن کی حیثیت سے مجھے اردو اور اردو والوں کی خدمت گزاری کا شرف حاصل رہا ہے۔ اردو تعلیم کو عام کرنے کے پروگرام پر عمل کرتے ہونے پرائمری سے ثانوی درجوں تک ماڈل اسکول اور کوچنگ سنٹروں کے قیام کی جدوجہد میں اپنے دوست احباب کے ساتھ کندھے پہ جھولی لٹکانے صاحب خیر سے اردو کے لیے اس کا حق صرف ایک روپیہ مانگتا رہا ہوں۔

مجھے فخر ہے کہ میری اپیل رائیگاں نہیں گئی۔ میں نے ساڑھے تین لاکھ روپے کا تعلیمی ٹرسٹ بنایا ہے جس کے منافع سے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے زیر اہتمام دو اردو ماڈل اسکول، بردیہال اور اردو گھر میں کامیابی سے چلائے جا رہے ہیں۔ اردو مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے ساتھ انگریزی، ہندی اور تلگو میں تعلیم کا کامیاب تجربہ جاری ہے۔

میں نے پہلے ہی بتایا ہے کہ میری تعلیم اس دور کے "نوابوں" کے طبقے کی روایات کے مطابق انگریزی ماحول میں ہوئی تھی اور میں نے اپنی مرضی سے اچانک اپنا ذریعہ تعلیم بدل کر ملک کی پہلی اردو ذریعہ تعلیم کی مادر جامعہ کو اپنایا تھا۔ اس لیے میں اردو میں کسی حد تک "بہ دانی" کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا، لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ اردو میرا ایمان ہے۔ میرا سرمایہ و حیات ہے۔ اس دور فکر نے شاید مجھ سے کچھ ایسے کام بھی کرانے ہوں جو میری بساط سے بہت بڑے تھے۔ میں نے یہ محسوس کر کے اردو کی تخلیقات کے لیے سرمایہ کی فراہمی ادیبوں اور لکھنے والوں کے بس کی بات نہیں ہوتی اور اردو کے شاعر و ادیب بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود افلاس کے دلدل سے نکل نہیں پاتے۔ ان کی امداد و اعانت کے لیے ادبی ٹرسٹ قیام کا اعلان کر دیا لیکن سوال یہ تھا کہ سرمایہ کہاں سے آئے لیکن جو تحریک پورے خلوص سے شروع کی جاتی ہے اس کے پھلنے پھولنے کی راہیں نکل ہی آتی ہیں۔ چنانچہ میری حوصلہ افزائی کرنے والے کچھ لوگ اور بھی مل گئے اور جو یکا و تنہا ایک مشکل سفر پر چل پڑا تھا، بہت جلد اپنے آپ کو ایک کارواں کا جزو محسوس کرنے لگا۔ میں نے اس ٹرسٹ کے کارپس کی فراہمی کے لیے ہر سال ایک ہند مشاعرے کے انعقاد کا انتظام کیا۔ ۱۸ سال قبل ناعرہ ہی اپنے نظم و ضبط، ہندوستان کے مشہور شاعر شمولیت و شرکت اور اردو نوازوں کی اعانت سے بڑا کامیاب رہا۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرے اب سارے ملک میں مشہور ہیں۔ میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ان مشاعروں کو سننے کے لیے ایسے سرکاری حکام اور قومی قائدین بھی بیٹھے رہا کرتے ہیں، جنہیں اردو کی شاعرانہ نزاکت خیالی کو سمجھنا دور کی بات ہے، اردو زبان بھی نہیں آتی۔ اسی ٹرسٹ کے زیر اہتمام اب تک آٹھ مطبوعات شائع ہو چکی ہیں اور شاعر و ادیبوں کی بروقت امداد کے لیے زائد از دو لاکھ روپے جاری کیے گئے۔ اب ادبی ٹرسٹ کا کارپس ڈھائی لاکھ روپے مستحکم ہے۔ حکومت نے جناب اندر کمار گجرال، سابق مرکزی وزیر برائے سوویت یونین کی صدارت میں گجرال کمیٹی تشکیل کی تو مجھے بھی اس کا ایک رکن نامزد کیا گیا۔ افسوس ہے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات کی رپورٹ اب تک منظر عام پر نہیں آ سکی ہے۔ تاہم میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اس کمیٹی کے اجلاسوں میں، میں نے کسی مصلحت کو پیش نظر رکھے بغیر اردو والوں کی انتہائی دیانت داری سے نمائندگی کی اور اردو کو سیکولر زبان کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کیا۔ بعض اہم تجاویز منظور کرانے میں کامیاب رہا جن کو ٹھیک ٹھیک روبہ عمل لانے کی صورت میں مجھے یقین ہے کہ اردو والوں کے کئی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

مجھے اردو والوں سے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ ہر مرحلے پر مجھے ان کا اعتماد حاصل رہا ہے اور "سیاست" محض ایک اخبار کی بجائے ایک ادارہ بنانے میں انہوں

مجھے ادبی تخلیقی صلاحیتوں کا گراں بہا تحفہ دیا ہے۔ وہ بھی اب میرا مقصد و نظر بن گئے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب کے ادارہ ادبیات اردو سے کون اردو داں واقف نہیں۔ اس عظیم ادارے کی مالی حالت بے حد خراب تھی۔ سالانہ صرف ۲ ہزار روپے کی سرکاری گرانٹ پر یہ ادارہ چل رہا تھا۔ ادارے کے عہدے داروں کی خواہش پر میں نے ادبی ٹرسٹ کے ایک مشاعرے سے ڈیڑھ لاکھ روپے جمع اور حوالے کیے جس سے ایک ٹرسٹ بنایا گیا۔ کہ جس کی رقم سے سالانہ ۲۲ ہزار روپے آمدنی ہوتی ہے۔

پرانے شہر حیدرآباد میں جو مہاراجہ کشن پرشاد اور چندو لال شاداں کا شہر ہے۔ انجمن ترقی اردو کو ۲۰ سال قبل

حکومت سے ایک قطعہ اراضی کا مل گیا تھا۔ پرانے شہر میں چونکہ اردو سرگرمیوں کے لیے کوئی مرکز نہ تھا۔ میں نے مشاعرے اور عطیے سے ساڑھے تین لاکھ روپے کا ایک خوبصورت ہال تعمیر کروایا۔ جہاں آج شاندار لائبریری تعلیم بالغاں کا مرکز ہے اور اب حیدرآباد کے ۹۰ فیصد جلسے اسی اردو گھر میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو گھر کے اخراجات کی پابجائی کے لیے ایک لاکھ روپے کا ٹرسٹ بھی بنایا۔

میں نے زندگی کے نو دہے مکمل کر لیے ہیں۔ زندگی کے نشیب کم اور فراز زیادہ دیکھے ہیں۔ مجھے اپنی ہی زندگی میں دین و دنیا کی تمام سہولتیں، اعزازات اور نیک نامی ملی ہے۔ ان بے شمار نعمتوں کے بدلے میں جتنا بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں کم ہے۔ زندگی کے اس آخری مرحلے میں بھی میری سانسوں کی تکمیل کے لیے جو کچھ وقت باقی رہا ہے، یہ کوشش ہے کہ وہ اردو کو اس کا مستحق مقام و مرتبہ دلانے کی جدوجہد میں صرف ہو۔ میں نے ہمیشہ عدل اور انصاف اور میل ملاپ کے راستے کو اپنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے قدم انشاءاللہ تعالیٰ نہیں ڈگمگائیں گے۔

"سب رس" مارچ ۹۳ء

خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے

ظفر الحسن

یاری کا سبق لینا ہو تو عابد سے لو۔ نواب عابد علی خاں سے۔ نوابی کی بات بعد میں کروں گا۔ عابد جیسا دوست بڑی مشکل سے ہاتھ لگتا ہے۔ سبط حسن اپنے ایک لنگوٹی یار اور ہمدم دیرینہ کے متعلق بتا رہے تھے اور سے بھئی اب وہ بہت بڑے شاعر اور اس سے بڑے ہندوستان گیر شہرت کے لیڈر ہو گئے ہیں اپنی اور ہماری لکھنؤ کی یاری اور فاقہ مستی کے دنوں کو حرف غلط کی طرح مٹا کر راج کپوروں اور دلیپ کماروں کی باتیں کرتے اور ان ہی سے کھلتے ملتے ہیں۔ دوستی یوں بھول جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

اوپر میں نے عابد کو ایک وجہ سے "نواب" لکھا ہے۔ عابد بلاشبہ سابق ریاست حیدرآباد کے ایک ممتاز جاگیردار خاندان کا فرد ہے۔ میں نے اسے کئی بار لکھا کہ نواب انتخاب جنگ سے تیرا کیا رشتہ تھا اور تیرے خاندان کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نوابی اس کی گھٹی میں ضرور ملائی گئی ہوگی۔ مگر جب سے میں نے اسے دیکھا ہے اور پینتالیس سال سے دیکھ رہا ہوں عابد کسی طرف سے بھی نواب نظر نہیں آیا۔ نہ پہلے اور نہ اب۔ حیدرآباد پہنچے دو تین دن ہوئے تھے میں، شباب، جگر اور دو ایک پرانے یار روزنامہ سیاست میں عابد کے کمرے میں بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک خاص بات محبوب حسین جگر کے متعلق بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ جب سے عابد کو دیکھا ہے جگر کے ساتھ اور جگر کو دیکھا ہے عابد کے ساتھ۔ جس طرح ریاست حیدرآباد میں [illegible]ل الرحمن اور عطاء الرحمن جیسے سگے بھائیوں کی طرح دو دوستوں کی جوڑی بھی نہیں ملی۔ اتنی مدت گزر گئی آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس دوست داری میں کس کا کتنا حصہ ہے۔ ہاں تو ہم حاضرین کمرے میں قہقہے لگا رہے تھے، پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے کہ ایک صاحب جن کا شمار یاران محفل میں نہ تھا۔ مخل ہو کر اور عابد کو بار بار نواب نواب کہہ کر تعریف کرنے لگے کہ نواب صاحب ایسے ہیں نواب صاحب نے فلاں سکارنامہ انجام دیا وغیرہ۔

وہ ایک بار تو میں طرح دے گیا۔ صبر کے گھونٹ پی لیے پھر ایک دم مجھ پر "اشفاقی دورہ" پڑا۔ ہمارا یار اشفاق حسین جب ایسی صورت پیدا ہوتی تو غلاظتیات کی پوری ڈکشنری سنا دیتا۔ خود مزے لیتا اور مخالف کو بے موت مار ڈالتا۔ [illegible] کے جواب میں وہ ماں، بہن سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ [illegible] کلر سیا تو میں آج بھی ہوں اور اسے زندہ دلی کی علامت [illegible] ہوں مگر گالی تو اشفاق حسین، میر حسن اور مخدوم محی الدین [illegible] ساتھ دفن ہو گئی۔ نہ ان جیسے کلاسیکی گالیاں دینے بلکہ اختراع کرنے والے ہیں اور نہ ہم جیسے لطف اندوز ہونے وا[لے] لے دے کے ایک شباب رہ گیا ہے مگر وہ بھی کیسے گالی د[ے] اور کس سے گالی سنے۔ ہمارے پہنچنے سے اس کے چمن میں تھوڑی بہت بہار آئی تو وہ بھی ہمارے لوٹنے [کے] بعد خزاں کا شکار ہو گئی۔ عابد کا گالی سے کیا تعلق۔ غلطی [سے] کبھی زبان سے "تو" نکل جانے تو فورا گلی کرلے۔

ہاں تو اس بے تکلف محفل میں ان ناجنس "نواب" کی گردان شروع کی۔ مجھ میں اشفاق کی روح [حلول] کر گئی تو میں نے ان سے کہا آپ جس کو بار بار نواب کہہ [رہے] ہیں اس کا پول کھولوں؟ آپ کا یہ نواب عابد، جب میں [نے] اتحاد طلبا نے جامعہ عثمانیہ کا صدارتی انتخاب لڑ رہا [تھا] دیواروں پر ہماری پارٹی کے پوسٹر چپکاتا۔ جلسوں میں [پرچے] تقسیم کرتا اور "ظفر وزارت زندہ باد" کے نعرے لگاتا تھ[ا] اس نے خود کو نواب منوایا نہ ہم نے نواب مانا اس [لیے] ہماری ایسی محفل میں خدا کے لیے اسے نواب نہ کہیے۔ [بعد] میں مجھے افسوس ہوا کہ اشفاق کی روح نے میرے جسم [میں] داخل ہو کر مجھ سے ایسی بات کیوں کہلوائی مگر بعد میں [خوشی] ہوئی کہ تیس سال بعد حیدرآباد آیا ہوں میرے گالی والے یار زندہ نہیں تو کم از کم ان کی روحیں تو میرے [آس پاس] منڈلا رہی ہیں۔

میں نے عابد سے کہا اخبار سیاست کا دفتر ہما[را] اڈا کیوں ہے۔ اپنے محلے سے کہہ دو کہ ہمارے ہر آرڈر [کی] فورا تعمیل کریں۔ زاہد علی خاں سے کہا جو عابد کا فرزند [ہے] تم ہمارے اے ڈی سی، پرائیویٹ سکریٹری وغیرہ

ہے۔ زاہد بڑے باپ کا بڑا بیٹا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے سیاست کو پروان چڑھتے دیکھا ہے۔ اسے اپنے باپ کی محنت شاقہ کا علم اور اس سے زیادہ اس روزنامہ سے محبت کا علم ہے۔ وہ عابد کے نقش قدم پر چل کر اس اخبار کو مزید ترقی دینے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے۔ میں بارہا اس کے کمرے میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ باپ کے دوست کے ساتھ گپ لڑانے کو اس نے اپنے کام پر ترجیح دی ہو۔ مجھے یہ بھی احساس ہونے نہیں دیا کہ میں اس کے کام میں مخل ہو رہا ہوں اس لیے مخل ہونے کے لیے کسی دوسرے کمرے کا انتخاب کروں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ اخبار کے کس شعبے کے کس کام پر زاہد کو مکمل عبور حاصل ہو گیا ہے کیونکہ اس نقطہ نگاہ سے میں نے اس کے کام اور کارکردگی کا تجزیہ نہیں کیا مگر یہ میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ روزنامہ سیاست کے کسی کاروبار سے وہ غافل نہیں ہے۔ سمجھدار ہے، معاملہ فہم ہے، متوازن مزاج کا مالک ہے۔ عابد کی طرح کی ادب آداب کی پرانی روایات کا احترام کرتا ہے۔ اسی باعث محبوب حسین جگر کی اخبار میں جو اور جتنی حکمرانی ہے اس میں رتی برابر دخل نہیں دیتا۔ یہ زاہد کی سعادت مندی ہے۔

محفل جمی ہوئی تھی اور عابد کا چپراسی بار بار اندر آکر کاغذات وغیرہ پیش کر رہا تھا۔ میں نے چپراسی سے کہا جب تک عابد صاحب کے کمرے میں ہماری محفل جمی رہے نہ باہر کا کوئی مہمان اندر آنے اور نہ دفتر کا کوئی آدمی، کاغذ، خط یا مراسلہ وغیرہ۔ اخبار دیر سے نکلے یا بالکل ہی نہ نکلے کوئی مضائقہ نہیں، ہماری گپ شپ میں خلل نہ پڑے۔ تین سوا تین مہینے اخبار بھی وقت پر نکلا اور ہماری محفلیں بھی جاری رہیں۔ عابد ہماری دلجوئی بھی کرتا رہا اور اپنے پروگراموں کی پابندی بھی۔ ایک بجے تک دفتر میں، اس کے بعد دوپہر میں قیلولہ اور آرام اور شام چھ بجے نظام کلب میں بلیرڈ۔ ساری دنیا ایک طرف عابد کا بلیرڈ ایک طرف۔ اسی پابندی پر مجھے نواب والا جنگ یاد آگئے۔ بارش ہو، آندھی آئے، کچھ ہو جائے نواب صاحب اپنی رولس رائس میں بیٹھے حسین ساگر کے بند پر

سیاست کی شہرت، مقبولیت اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی دولت آسمان سے نہیں ٹپکی ہے اور نہ عابد کی کسی اور "سیاست" کا نتیجہ ہے۔ دراصل اس کے خون پسینے کی کمائی ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا حیدرآباد میں موسلا دھار بارش ہوئی۔ حیدرآبادی بارش یا یہاں کے نکاسی آب کے نظام یعنی ڈرینج سسٹم کا کمال یہ ہے کہ ادھر بارش ہوئی ادھر دس پندرہ منٹ کے اندر بارش کا تمام پانی نالیوں میں سے ہوتا ہوا غائب۔ نشیبی علاقوں اور تنگ گلیوں کی بات مختلف ہے مگر عام اور بیشتر جگہوں پر برسات کا ٹھہرا ہوا پانی دکھائی نہیں دیتا۔ سیاست کا دفتر جواہر لال روڈ کی ایک چھوٹی سی گلی میں واقع ہے ذرا نشیبی خطے میں واقع ہے۔ پانی نشیب ہی میں مرتا ہے۔ مرے پہ سو دُرّے گلی کے جمع شدہ پانی کو باہر نکالنے کا کوئی راستہ نہ تھا کیونکہ گلی میں کوئی نالی ہی نہ تھی۔ اس پر جواہر لال روڈ کا پانی بن ناتھے بیل کی طرح گلی میں گھسنے لگا۔ وہ تو کہیے عمارت دو منزلہ ہے ورنہ معلوم نہیں کیا محشر برپا ہو جاتا۔

عابد اور جگر بڑے دل والے ہیں۔ دونوں نے ایک ایک بالٹی اور جھاڑو سنبھالی اور بالٹی بھر بھر کر جواہر روڈ کی طغیانی میں اضافہ کرنے لگے۔

پہنچا وہیں پہ آب جہاں کا خمیر تھا

ذرا تصور کیجیے دونوں کے پاجامے گھٹنوں تک۔ آستینیں کہنیوں تک سر جھاڑ منہ پہاڑ ایک ہاتھ میں بالٹی دوسرے میں جھاڑو کام میں اس طرح جٹے ہوئے جیسے اس کے سوا انہیں کوئی اور کام کرنا ہی نہیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب سیاست ایک ہزار چھپتا تھا۔ عابد کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ ایک دن اس کی اشاعت پندرہ ہزار روزانہ ہو جائے گی۔ اسے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اس نے تو ایک خاص جذبے کے تحت اور ایک مثال قائم کرنے کے لیے جھاڑو دی تھی۔ اس جھاڑو نے ہن برسایا۔

سقوط دکن کی پہلی برسی سے کچھ پہلے اور فوجی حکومت کے دنوں میں سیاست کی اشاعت شروع ہوئی (۱۵ اگست ۱۹۴۹ء)۔ یہ زمانہ بڑی افراتفری، پریشانی اور مشکلات کا تھا اردو داں اور اردو عوام یا تو جیل در جیل، پاکستان منتقل ہو رہے تھے یا مستقبل قریب میں پیش آنے والے معاشی مسائل سے خوفزدہ ہو کر ایک پائی بچانے کی فکر میں تھے۔ نیلام گھر مسلمانوں کے پچاسوں سال کے جمع کردہ نادرات اور دوسری اشیاء سے پٹے پڑے تھے۔ خود میرے گھر کا سامان جس میں صوفہ سیٹ، مسہری، دریاں، سنگھار میز، سلائی مشین، ڈنر سیٹ، باورچی خانے کا سامان اور دوسری چیزیں تھیں محض بارہ سو میں نیلام ہوئیں۔ ایسے میں اردو اخبار کی اہمیت اور افادیت کے باوجود ضرورت نہیں رہا تھا۔ مسلما

کورونی کی فکر تھی خبروں کی نہیں۔ اردو اخبار کون خریدتا! ایسا اخبار جس کا مسلک قوم پرستی اور ترقی پسندی تھا۔ جیسا کہ ابھی لکھ چکا ہوں ابتدا میں اس کی اشاعت صرف ایک ہزار تھی اور جب میں گیا ہوں تو کچھ کم پندرہ ہزار ہو گئی۔ پاکستان کے معیار سے یہ اشاعت بہت کم ہے مگر سنجیدگی سے سوچیے تو پاکستان میں جس کی قومی زبان اردو ہے لاکھ سوا لاکھ کی اشاعت کونسا غیر معمولی معیار ہے۔ دونوں ملکوں کے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے میں لاکھ سوا لاکھ کے مقابلے میں اس پندرہ ہزار کو زیادہ بڑی تعداد سمجھتا ہوں۔

واہ واہ شاباش عابد واہ واہ
اردو والوں میں تو بازی لے گیا

مخدوم کی ایک تحریر کے مطابق روزنامہ سیاست اب میری عادتوں اور طلب میں شامل ہو چکا ہے۔ صبح بستر سے اٹھتے ہی سگریٹ کی طلب اور ساتھ ہی ساتھ سیاست کی طلب ہوتی ہے۔۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ایک جگہ لکھا ہے "میری بات تو پوچھو مت۔ اخبار سیاست تو میری زندگی کا جزو اور روزمرہ کا معمول ہے۔ علی الصبح چائے کی پیالی کے ساتھ سیاست کی لت سی پڑ گئی ہے۔ جب تک میں حیدرآباد میں رہا مخدوم اور راج کی طرح صبح سویرے سب سے پہلے جو کام کرتا تھا وہ سیاست کا مطالعہ تھا۔ عابد کی مہربانی سے بننے کے دو دن کا سیاست غالب لائبریری آتا ہے۔ مجھے خوشی اور اس کے ساتھ حیرت بھی ہے کہ ممتاز محقق اور مولوی عبدالحق کے (تا حال مجوزہ) سوانح نگار مشفق خواجہ سیاست کا بڑے اشتیاق سے انتظار کرتے، شوق اور التزام کے ساتھ پڑھتے اور تعریف کرتے ہیں۔ ان کی تعریف بطور سند اس لیے نقل کر رہا ہوں کہ وہ بڑے نک چڑھے محقق اور نقاد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سیاست کی طلب اور لت میں اس کے محاسن کے ساتھ ساتھ عابد کے پیار کی خوشبو بھی شامل ہے۔ پیار پیار میں عابد کو ایک بات بتا دوں۔ وہ اپنے کاتبوں سے کہہ دیں کہ ہیری کو ہیاتری، ہیلنا کو ہیاندا، ایم اے کو یم اے لکھنا ترک کردیں۔ یہ پرانے حیدرآباد کی غلط کتابت اور لکھائی تھی۔

ایک دن عابد کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک شاعر صاحب تشریف لائے۔ جیب سے ایک غزل نکالی اور سنانے کی بجائے عابد کے سامنے رکھ دی اور کہا بچی بیمار ہے۔ عابد نے مسودے پر کچھ لکھا اور ایک صاحب کا نام لکھ کر کہا ان سے مل لیجیے۔ ان کے جانے کے بعد کہا یہ سب فراڈ ہے کوئی بیمار نہیں ہے، شاعر محترم کو شراب کے لیے پیسے درکار تھے اس لیے ڈھونگ رچا گئے۔ اب انہیں غزل چھپنے سے پہلے ادارہ بھی معاوضہ مل جانے کا اور یہ آج ادارہ بھی شراب خانے جائیں گے۔ عابد اس طرح کے لوگوں کی بھی مالی امداد کرتا ہے۔ خود زاہد خشک ہے مگر رند قدح خوار کی بھی اعانت کرتا ہے نہ جانے کس کس طرح کی کتنی مدد کرتا ہے۔

دوسرے موقع پر ایک اور صاحب تشریف لائے۔ دراز قامت، چوڑا چکلا سینہ، گمبھیر آواز، شیر کا سا چہرہ، نام ان کا یاد ہے مگر عمداً درج نہیں کر رہا ہوں کیونکہ ان کی ہندوستان گیر شہرت اسمگلنگ کی وجہ سے ہے۔ سنا ہے وہ ہندوستان کے سب سے بڑے اسمگلر ہیں۔ ان کی بابت بہت کچھ سن چکا تھا۔ یہ کہ ہندوستان کے بڑے بڑے افسر اور لیڈر اور وزیر اور سفیر نے ان سے رشوت لی تھی۔ وہ ہزاروں غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتے ہیں اور اداروں کو رقمی امداد دیتے ہیں۔ مجھ سے تعارف ہوا تو کہنے لگے ہمیں پاکستان بلا لیجئے۔ میں نے کہا کہ آپ کے لیے تو ساتوں سمندر کھلے ہوئے ہیں جس ملک میں چاہیں جا سکتے ہیں۔ آپ کو کون روک سکتا ہے۔ یہ حضرت عابد کے مداح تھے اور اس سے ملنے کے لیے بطور خاص سیاست کے دفتر آئے تھے۔ میں نے ان کے جو حالات سنے ان سے اندازہ ہوا کہ قاسم بجلی جیسے لوگ ان کے آگے طفل مکتب ہیں۔ جہاز پر قلی کا کام کرتے تھے اور وہاں بہت سے گر سیکھے اور اس طرح شہرت حاصل کی۔

عابد نے روزنامہ سیاست میں کتابوں کی مطبوعات کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ شہر حیدرآباد، حیدرآباد مجموعہ، صورت گران دکن، برجستہ اشعار، دکنی دیس اور مخدوم کے نثری مضامین کا مجموعہ عجمی نے پیچھے چھوڑ کر اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ بعض مطبوعات بڑی گراں قدر اور مورخ کے لیے مفید ہیں۔

حلقے میں ایک بار پرانے حیدرآباد دکن کی اہم اور نادر تصاویر سیاست میں شائع ہوئی ہیں جو کہ دکن کے مشہور فوٹوگرافر راجہ دین دیال کی اتاری ہوئی ہیں۔ تصاویر کا یہ سلسلہ نہایت روح پرور اور دل خوش کن ہے۔ یہ تصاویر حیدرآباد کی پرانی تاریخ یاد دلاتی ہیں۔ دکن دوستی کی قابل فخر مثال ہے۔ یہ کام صرف عابد جیسا فعال ایڈیٹر ہی کر سکتا تھا جس کی نظر میں حال اور مستقبل ہی نہیں حافظے میں ماضی بھی ہے۔

ادبی ٹرسٹ اور عابد علی خاں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یوں تو اس ٹرسٹ کے قیام کا خیال نواب مہدی نواز جنگ کو آیا اور ان

ہی کے پہنچنے پر عابد نے اس ٹرسٹ کی امداد میں پہلا مشاعرہ کیا اور سووینیر نکالا اور ٹرسٹیوں کی فہرست میں بعض بڑے نام ملتے ہیں مگر جہاں تک کام کا تعلق ہے میرے خیال میں عابد اور میر حسن نے اس پودے کی آبیاری کی۔ میر حسن کے انتقال کے بعد تو عابد نے تنہا تنہا اسے اپنے خون جگر سے سینچا۔ دس بارہ مشاعرے کیے اس کی آمدنی سے ایک بک ڈپو قائم کیا اور سب سے اہم یہ بات کہ اردو آنرس کلاس کا اہتمام اور نور العلوم کالج برائے خواتین کی بڑی امداد اور پھر ایک درجن کتابیں شائع کرنا اور شاعروں اور نثر نگاروں کی ان کی تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں جزوی رقمی مدد دینا ہوں۔ شاعروں اور صحافیوں کے علاج معالجے اور شدید ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر یا تجہیز و تدفین کے لیے امداد چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو نہایت شریفانہ اور انسانی جذبے پر دلالت کرتی ہے۔ غرض عابد کی سرکردگی میں ادبی ٹرسٹ کی جو بھی سرگرمیاں رہیں

لائق صد ستائش رہیں۔ وہ شہرت سے بے نیاز ہے دولت سے بے نیاز ہے عزت اور عظمت سے بے نیاز ہے اللہ نے اسے سب کچھ دیا ہے اور اس لیے دیا ہے کہ وہ مستعد کارکرد اور ایماندار ہے اس نے اپنے ہر جوہر قابل سے کام لیا ہے۔

مخدوم کے بعد فرزندان جامعہ میں جو بہ لحاظ عمر معلوم نہیں کتنے چھوٹے بڑے ہیں صرف دو نے ہندوستان بھر شہرت حاصل کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور عابد علی خاں۔ راج کی مصروفیات بہت کچھ سیاسی اور کچھ ادبی ہیں وہ اردو کی گود میں پلا، جوان ہوا اور اب بڑھاپے کی منزل کی طرف گامزن ہے سیاست اس کا اوڑھنا اور اردو اس کا بچھونا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند اور انجمن ترقی اردو حیدرآباد سے وابستہ ہے۔ یہ وابستگی نمائشی اور کاغذی نہیں ہے۔ کام کرتا ہے اور دل لگا کر۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود راج اور عابد اردو کے معاملے میں یک جان ہیں۔

عابد نہ ادیب ہے نہ مقرر مگر ہندوستان کا ہر ادیب نہ صرف اس سے واقف ہے بلکہ اس کی ہر صدا پر لبیک کہتا ہے۔ ادبی ٹرسٹ کا مشاعرہ ہو یا شنکر جی کی یاد میں عابد جس شاعر کو مدعو کرے گا وہ ضرور آئے گا۔ قوم پرست ہونے کے باوجود عابد اول بھی مسلمان ہے اور آخر بھی مسلمان۔ مگر ایسا کٹر اور گرم مسلمان نہیں کہ غیر مسلموں کے در پے آزار ہو۔ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت پوری انسانیت کی خدمت کو ایک نیکی سمجھتا ہے اس کا دامن سیاسی آلائشوں سے پاک ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ عابد کا کوئی مخالف ہی نہیں۔ میں جب دکن میں تھا اس وقت اور کراچی آنے کے بعد کچھ لوگوں نے دبی زبان میں اس کی مخالفت کی۔ ان سب کو میں نے ایک ہی جواب دیا اس وقت دکن میں کون ہے جو عابد کی طرح خلوص اور لگن کے ساتھ اتنی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ مجھے صرف اور صرف ایک نام بتا دیجئے میں عابد کی مخالفت میں آپ کا شریک کار ہو جاؤں گا۔

ooo

سب رس ۔ مارچ ۱۹۹۳ء

مکاتیبِ قاضی عبدالودود بنام سید انیس شاہ جیلانی*

قاضی عبدالودود بلاشبہ اردو دنیا کے محقق اعظم تھے، جب جب وہ قلم اٹھاتے تھے غیر ضروری تمہید اور لفاظی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ کام کی باتیں ہمیشہ لپیٹنے کا فن ان کو خوب آتا تھا۔ خوب پڑھے لکھے اور گڑھے ہوئے آدمی تھے۔ لندن، جرمنی اور متحدہ ہندوستان کے ہر گوشہ فکر یہ مسلم ہے ان کی معلومات وسیع و عریض تھیں۔ بیمار سے وہ عنفوان شباب ہی میں رہنے لگے تھے اسی لیے کسی قدر نازک مزاج کیوں نہ ہوتے۔

لیکن ماہنامے کے اجرا کی سوجھی تھی نہیں سرکار دربار سے اجازت نامہ آخر بن گیا۔ ویسے صلاحیت کا فقدان ہے۔ باوجود تقاضا، قاضی صاحب نے دوسرے شمارے کے لیے مضمون کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے ہوں گے کہ رسالہ [illegible] نصیر حسین خان خیال کے بارے میں کچھ کاوش لکھ گئے۔ وہ سچ لکھنا اور سہنا بھی جانتے تھے۔ میں نے حیرت شملوی کے خطوط طلب کیے تو فرمایا پہلے وہ رسالہ تو نکال لو اس کے بعد تحقیق فرمائیے کہ رسالہ پر تحقیقی مضمون کی سوجھی تھی، وہ کر لو، تب شاید حیرت شملوی کے خطوط تک بھی پہنچ سکو گے۔ رسالہ تو بوجہ نہ نکلا اور تحقیقی مضمون کون لکھتا۔ البتہ نگارش حیرت شملوی کی جمع آوری کی نسبت پیش پیش رہا، دو ہزار خط فراہم اور نقل ہو چکے ہیں۔ حیرت مرحوم کے سلسلے کی ایک کتاب "مخطے دیدم" منظر عام پر آ چکی ہے۔ یہ معاصرین حیرت کا تذکرہ حیرت کے قلم سے ہے، اور کمالات کے ایک منتشر انبار سے میری دس روزہ کاوش، جانفشانی اور کرید کا مظہر ہے۔ اب دیوان کی باری ہے۔ خطوط قاضی عبدالودود صاحب نے عطا نہیں کیے۔ پس ماندگان قاضی صاحب تک رسائی میرے بس میں نہیں رہی۔ قاضی صاحب کے خطوں میں ڈاکٹر عبدالحق

اس پر صحیح معانی و مطالب کا فقدان بس غزل ہے اور
خوب ہے۔"

بجائے تصدیق اور تردید کے دونوں پہلو لیے ہوئے جب نقوش کے خطوط نمبر حصہ سوم میں چھپی گئیں نے متعدد شاعروں ادیبوں اور ناقدوں سے رائے طلب کی، تو قاضی صاحب کی رائے اثر مرحوم کی تائید نہیں کرتی، جیسا کہ آپ ان کے آخری مکتوب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

میرے ممدوح حضرت حیرت شملوی مرحوم کی ایک غزل ہے سہ

کیوں ہوں نہ مغفرت کا طلب گار بھی بہت
بیمار بھی بہت ہوں گنہگار بھی بہت
سنگین ہے سزا تو کسی سے کہیں بھی کیا
یہ دیکھ کر کہ ہم ہیں خطاکار بھی بہت
اچھا ہوا کہ آپ الگ ہم سے ہو گئے
الفت کی ورنہ راہ تھی دشوار بھی بہت
ہم پر غرور عشق کی تہمت سہی مگر
ہے بے نیاز حسن کی سرکار بھی بہت
ہے یہ بھی واقعہ کہ صداقت کے نام پر
باندھے گئے ہیں جھوٹ کے طومار بھی بہت
کچھ اہل قافلہ ہی نہیں مست و بے خبر
بہکے ہوئے ہیں قافلہ سالار بھی بہت
حیرت نیازمند تو ہے آپ کا ضرور
لیکن نہ بھول جائیے کہ ہے خوددار بھی بہت

یہ غزل لکھنؤ کے اثر مرحوم صاحب کو اچھی نہ لگی، اپنے ایک شاگرد زبیر کے نام لکھتے ہیں:

"حیرت کا سہرا ہے بالکل پسند نہ آئی اور اغلاط کا مجموعہ،
کا ذکر آیا ہے مراد بابائے اردو ہیں۔

خطۂ بہار، پنجاب کی طرح برائے نام غیر ہے۔ خدا بخش اورینٹل لائبریری ہر ایک کے علم میں ہے۔ سید سلیمان ندوی اور دو ایک دوسرے سلیمان بھی وہیں کے تھے۔ قاضی عبدالودود ایک معزز خانوادے کے نہایت محترم ادیب اور انسان تھے، خدا غریق رحمت کرے۔

انیس شاہ جیلانی
۱۴ اپریل ۱۹۸۷

۱۷ نومبر ۶۲ء
پٹنہ ۴

مکرمی۔ خط ملا، یادآوری کا شکریہ۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں اور اس کا بالکل وقت نہیں کہ آپ کے رسالے کے لیے مضمون لکھ سکوں۔

---

* محمد آباد، تحصیل صادق آباد، ضلع رحیم خاں (پاکستان)

امید ہے کہ آپ کا رسالہ کامیابی حاصل کر سکے گا۔

خیر اندیش

قاضی عبدالودود

پٹنہ

۹ جنوری ۶۳ء

مکرمی! میں تین ہفتوں کے سفر سے واپس آیا تو آپ کے متعدد خط ملے۔ میں فی الحال بہت مصروف ہوں، اور آپ کے رسالے کے شمارہ ۱ کے لیے کچھ لکھنا میرے لیے ممکن نہیں، یہ وعدہ کرتا ہوں کہ دوسرے شمارہ کے لیے ایک مضمون ضرور بھیجوں گا۔

خیر اندیش

قاضی عبدالودود

پٹنہ ۴

۴/۳ ۶۳ (۱۹۶۳ء)

مکرمی: آپ کا خط مورخہ ۲۷ فروری ملا۔ میں نے نوائے کیمرج کے شمارۂ ۱ کے متعلق ایک مفصل مضمون کلکتہ کے ایک رسالے میں جس کا نام شاید چراغ راہ تھا۔ تین چار سال ہوئے لکھا تھا۔ آپ براہ مہربانی جلد بتائیں کہ اس کے کون کون سے شمارے آپ کے پیش نظر ہیں۔

نصیر حسین خیال شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے، اور ان لوگوں میں تھے جنہیں سچ بولنے سے قلبی اذیت ہوتی تھی۔ یہ پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۷ء میں انیس بیس برس کے ہوں گے۔ صحیح سال ولادت معلوم نہیں۔ ان کی شادی کلکتہ میں ہوئی اور اسی بنا پر وہیں مقیم ہو گئے۔ غالباً ۱۹۱۷ء میں اردو کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی جس کے یہ صدر تھے۔ ان کی بعض تصانیف شائع ہوئی موجود ہے۔ ازاں جملہ "مغل اور اردو" یہ مجموعہ خرافات ہے۔ ان کا انتقال ۳۴ء یا ۳۵ء میں بمقام کلکتہ ہوا۔ یہ حیدرآباد میں سر علی امام کے اردو سکریٹری تھے۔ لیکن مشہور کر رکھا تھا کہ وہاں کسی بڑے عہدے پر تھے اور وہاں "ادیب الملک" خطاب ملا تھا۔ یہ خطاب خود انہوں نے اپنے کو دے رکھا تھا۔ ایک جنید صاحب جن کا ادارۂ نوائے کیمرج سے تعلق تھا سنا ہے کہ آج کل پنجاب ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ بشیر حسین زیدی کا بھی اس سے گہرا تعلق تھا، یہ دو تین سال قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے اور آج کل پارلیامنٹ یا راجیہ سبھا کے ممبر ہیں۔

والسلام

عبدالودود

۴/۲ ۶۳ پٹنہ ۴

مکرمی! آپ کا خط ملا اور اس کا جواب بھی گیا۔ لیکن شاید جو کچھ میں نے نہیں لکھا تھا اس لیے یہ دوبارہ تحریر ہوتا ہے۔ (۱) میں نے نوائے کیمرج کے شمارۂ ۱ (شمارۂ ۲ نہیں) پر ایک مفصل مضمون کلکتہ کے ایک رسالے میں جس کا نام شاید چراغ راہ تھا، تین چار سال گزرے شائع کیا تھا۔ آپ کے پاس نوائے کیمرج کے کون کون [illegible] ہیں؟ (۲) شمارۂ ۱ میں ایک صاحب طالب علم کے کیمرج کا نام رکن ادارہ کی حیثیت سے درج ہے۔ سنا ہے کہ وہ تین چار برس قبل تک پنجاب ہائی کورٹ کے جج تھے۔ آج کل کا حال معلوم نہیں۔ (۳) بشیر حسین زیدی کا نام شاید رکن ادارہ کی حیثیت سے شمارۂ ۱ میں نہیں، لیکن ان کا اس سے گہرا تعلق تھا۔ سابق ریاست رام پور کے وزیر اعلیٰ اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ اور فی الحال لوک سبھا یا راجیہ سبھا کے رکن ہیں۔ حسین الدین صاحب [illegible] ہائی کورٹ کے جج ہوئے ان کی وفات ہو چکی ہے (۴) نصیر حسین خیال عظیم آبادی شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے۔ یہ ۱۸۹۷ء میں انیس بیس سال کے تھے، سال ولادت معلوم نہیں۔ معمولی تعلیم پائی، کلکتہ میں شادی ہوئی اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء (غالباً) میں ایک اردو کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی یہ اس کے صدر تھے۔ دو تین اردو کتابوں کے مصنف ہیں ازاں جملہ "مغل اور اردو"۔ حیدرآباد میں سر علی امام کے اردو سکریٹری رہے لیکن مشہور کر رکھا تھا کہ وہاں کسی بڑے عہدے پر تھے، لوگ یہ بھی سمجھتے تھے اور غالباً خود انہیں نے اسے شہرت دے رکھی تھی کہ انہیں ادیب الملک کا خطاب حیدرآباد سے ملا تھا، لیکن یہ غلط محض ہے۔ اواخر ۱۹۲۵ء میں ان کی وفات کلکتہ میں ہوئی۔ مدفن پٹنہ ہے۔ ان کی تحریروں میں حقیقت سے انحراف کی ہر ممکن کوشش موجود ہے، انتہائی درجے کے غیر معتبر شخص تھے۔ ذاتی معاملات میں بھی اور علمی معاملات میں بھی۔ مگر چونکہ دنیا احمقوں سے بھری ہوئی ہے، ان کی زندگی میں ان کا حال نہ کھل سکا۔

اس خط کا جواب ذیل کے پتے سے عنایت ہو۔

C/o Mr Nuruddin Ahmad
Barrister At Law
10. Alipur Rd
DELHI

۱۰۔ علی پور۔ دہلی

والسلام

قاضی عبدالودود

[کارڈ - مہر ڈاک خانہ اپریل ۱۹۶۴ء]

بوساطت: مظفر الدین صاحب بیرسٹر
۱۰۔ علی پور روڈ۔ دہلی

شفیق کرم، آپ کا خط ملا۔ میرے پاس نوائے کیمبرج کا صرف
پہلا شمارہ ہے جو آپ نے ۳ شماروں کے بارے میں لکھا ہے ان میں سے دوسرا
آپ کے پاس نہیں ہے یا کیا تیسرا ہے؟
میرا مضمون جس پرچے میں نکلا تھا وہ بند ہو گیا۔ اس کے ایڈیٹر کا پتہ
یہ ہے۔

نیاز احمد خاں صاحب ایم۔اے لیکچرار اردو
16 E. WELLEZLEY SQUARE
CALCUTTA-16

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔
مخلص
قاضی عبدالودود

پٹنہ
۹ مئی ۶۳ء

کرمی! آپ کے کئی سندیسے واپسی پر ملے۔ جواباً گذارش
ہے۔ انھوں نے کیمبرج کا وہ شمارہ جس میں میرا مضمون نوائے کیمبرج پر چھپا تھا
شاید ہی میرے پاس ہو۔ اس کی تلاش فی الحال میرے لیے ممکن نہیں۔ اگر کچھ
نکلنے کے بعد مل گیا تو ضرور بھیج دوں گا۔ نیاز احمد صاحب کو میں اس کے
متعلق کچھ نہیں لکھ سکتا۔ مدتوں سے میری ان کی مراسلت نہیں۔
۲۔ میں نے سنا ہے کہ کرمی ڈاکٹر عبدالحق کا کوئی مذہب نہ تھا۔ یہ محض
سماعی بات ہے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ڈاکٹر عابد حسین (جامعہ ملیہ)
مجھ سے کہتے تھے کہ انھوں نے عبدالحلیم شرر کے ایک پوتے کا نام ونیہ
تجویز کیا تھا۔ اگر آپ اس اطلاع سے کام لینا چاہیں تو اس کی ڈاکٹر عابد
حسین صاحب سے تصدیق کر لیں۔ ممکن ہے وہ اس کی اشاعت نہ چاہیں۔
میں "عبدالحق بحیثیت محقق" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ
رہا ہوں۔ دو تین سو صفحے اس کے چھپ بھی چکے ہیں مگر ابھی تک نامکمل ہے۔
قاضی عبدالودود

۲۹ نومبر ۶۳ء
پٹنہ

کرمی۔ آپ کے دو خط ملے

آپ ایک ماہنامہ نکالنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں آپ نے
کم و بیش ۱۶ خط مجھے لکھے تھے۔ اس کے بعد نوائے کیمبرج۔ آپ کی
توجہ کا مستحق ٹھہرا۔ اب حیرت فکوی مرحوم کے خطوط کی طرف التفات ہے
پہلے رسالہ نکالیں۔ اس کے بعد نوائے کیمبرج پر مضمون لکھیں اس
کے بعد حیرت مرحوم کے خطوط کی نوبت آئے گی۔
"عبدالحق بحیثیت محقق" کی ۳ قسطیں معاصر کے ۳ شماروں میں شائع
ہوئی ہیں اور مقالہ اب تک نامکمل ہے۔ آپ شائع شدہ اجزا کے شائق ہیں
تو معاصر والوں سے طلب کریں۔
شعلہ صاحب کے پاس حیرت صاحب کے بہت سے خطوط ہوں
گے۔ مجھ سے ان کی مراسلت بہت کم رہی تھی۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Naraindas & Co Chemist
Gurdwara Rd
Karol Bag New Delhi

خیر اندیش
قاضی عبدالودود

ادارۂ تحقیقات اردو
پٹنہ ۴
۲۳/۵ ۶۹ء

شفیق کرم!
آپ کا خط ملا۔ آپ کی دو طرحی غزل کے ۲ شعر کو میں کسی طرح "اغلاط کا"
کہہ سکتا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اس میں گنجینۂ معانی و مطالب کا فقدان
رہا۔ پسند نہ کرنا یہ اور بات ہے۔
مخلص
قاضی عبدالودود

(مراسلہ: ڈاکٹر مختار الدین احمد)

زبان و ادب پٹنہ جلد ۱۹ شمارہ ۶

ایک تحریر مجتبیٰ حسین کی یاد میں

فہمیدہ جعفر

میرے سامنے ایک کتاب کھلی پڑی ہے۔ نام ہے "جشن سہ قرن" جسے مجتبیٰ حسین نے مرتب کیا اور جس پر تین جلد سے لکھا ہے: "بزرگانِ تنقیدی مضامین" پہلا صفحہ الٹتی ہوں تو ایک خوبصورت تحریر، مجتبیٰ کی جانب سے قلم میں نظر آتی ہے۔ "عزیزہ فہمیدہ جعفر۔ یہ حرف اپنے واسطے پیدا "ایک فن ہے اور دوسروں کے لئے بیشتر عبادت ہے۔ دعاؤں کے ساتھ مجتبیٰ حسین۔ ملتان۔ ۱۵ جولائی ۱۹۸۳ء۔ شام ۷ بج کر ۵ منٹ۔

پڑھنے والے، نہ جانے کتنے برسوں سے یہ کتاب، میری کتابوں کے ذخیرے میں شامل تھی۔ اس نے مجھے ادب اور تنقید سے آشنا کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ادب اور مذہب میں کیا رشتہ ہے ——— پھر کہ آنے والے زمانوں میں ادب کا مستقبل کیا ہے۔ اسی نے مجھے ذوقِ سلیم اور فن کے بارے میں آگہی دی تھی۔ اور ساری بات یہ ہے کہ آگہی ذمہ داریوں سے دوچار کرتی ہے۔

عبادت کا لفظ۔ کتنا سچ ہے۔ اور مجتبیٰ صاحب نے جب یہ فقرہ، صبح کی اس گرم شام کو میری اس کتاب پر لکھا ہوگا تو اس لفظ نے اپنے پھیلاؤ میں کائنات کے خلق و تخلیق کو اپنے میں ضم کر لیا ہوگا۔ رب العزت کی عبادت، پیدا کرنے والے نے بھی تو سورۂ ذاریات میں یہی کہا ہے

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"

میں نے تو جن و انس کو پیدا ہی نہیں کیا، سوائے اس کے کہ وہ عبادت کریں۔

۱۵ جولائی ۱۹۸۳ء کی شام تھی۔ جس میں ۱۹۸۸ء کے بعد سے مشتاق و میرے تک ایک چھ سال کی دوری تھی۔ لیکن یہ دوری نہیں اور بھی کتنا قریب لے آئی تھی۔ یہ چھ سال تھے جنہوں نے عبادت کے تصور کو کائنات کے وسیع کینوس پر پھیلا دیا اور عشق حقیقی کے اسی مرتبے سے اس مرتبے تک، دکھوں اور خوشیوں کے طویل و عریض سائبان میں اس عبادت کے مفہوم کو سمجھنے کی سعی جاری ہے۔ مجتبیٰ صاحب سے محبت عشق کی پہلی شفقت اور خلوص کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔

یہ بھی عبادت کی وہ منزل ہے جس کے لئے کائنات وجود میں آتی ہے۔ ارکانِ عبادت تو ہم سے ادا ہوں تو ہوں، جب تک وجود میں عبادت کی نیت نہیں ابھرتی، وہ پورے معنی نہیں بنتے

نومبر میں .... علیم کا فون آیا ——— "مجتبیٰ صاحب گزر گئے"۔ بچپن یاد آتا ہے۔
* خیال رکھا سمجھ مضطرب ہو گیا۔ "ہاں۔ مجتبیٰ صاحب کے بعد یکدم لگی ہی جھٹکے سے چلی گئی"

میں نے کہا "خدا کے سپرد کرو۔ ہم کہاں ٹھیک ہیں ———"

آپریشن کامیاب رہا۔ وہ تیزی سے صحت مند ہو رہے ہیں۔ کراسویل روڈ پر نرسوں کے فلیٹوں سے ہیں، عمارت میں ان کا مختصر سا فلیٹ چاہنے والوں، ادیبوں، شاعروں اور ادب نوازوں دوستوں سے گھرا رہتا تھا۔ وہ باتیں کرتے، قہقہہ لگا کر ہنستے، رک رک کر گفتگو کرتے۔ یہی وہی رونق تھی، وہی ٹھٹھے، وہی تیکھی سی سنجیدگی اور شگفتگی۔ شخصیت کی وہ بڑی سی طاقت جو اثر رکھتی تھی۔ ہر حالت پر بھی دیکھا کرتیں پاس لوگ بیٹھے کتنے سے فن کی باتیں سن رہے ہیں۔ سوال پوچھے جا رہے ہیں اور وہ سب کے جواب دے رہے ہیں۔ چہرے کا اطمینان اور سکون، اندر کی شخصیت پر دبیز پردے ڈال رہا تھا۔

پھر انہوں نے واپسی کی ٹھان لی۔ میں نے کہا "ابھی ٹھہریے، جلدی کیا ہے۔ شاید آپ لندن کی سردی سے اکتا گئے ہیں۔" "ایسا نہیں ہے۔ لندن بھی کچھ کم خوبصورت نہیں ہے۔ دراصل مجھے بہت پیدل چلنا پڑتا ہے۔ اچھا ہونے کے لئے ——— اور تمہارے شہر کے اس فلیٹ میں ممکن نہیں ہے۔" وہ وطن لوٹے تو اچانک ہمارے پاس آ جاتے۔ منیر بیمار ہو کر کے ایک دیکھ بھال کر رہے تھی۔ وہ بستر پر آرام سے لیٹے تھے۔ اور ہم لوگ ان کے ارد گرد بیٹھے ادبی باتوں میں مصروف تھے۔ صبح فن کے قریب تھیں جیسے ایک لمحے کے لئے ٹھہروں سے اوجھل ہونے دینا چاہتی ہوں۔ اس رات ہم نے کتنی باتیں کیں۔ کتنی اچھوتی اور نایاب باتیں۔ میں نے فن کے ایک مضمون کا اقتباس سنایا۔ "آج کی نئی نسل، ہم سے پوچھ رہی ہے کہ آپ نے ہمیں کیا دیا ——— پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم، گیس چیمبرز، نیپام بم اور تیسری ایٹمی جنگ کا خطرہ کا ہوا، منحوس سلیے۔ یہ آپ کی ڈپلومیسی، یہ نظریات، اخلاقیات، اور کرتوت، ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ قومی، جنگ کے اسی درخت پر نظر جاتی ہے، جس میں زرد پتے کھلتے ہیں۔ اس لئے محرومی اور معاشرے سے کٹ جانے کا احساس بڑھ گیا ہے۔ یہ خوف، یہ تشویش، یہ تنہائی، یہ ویرانی، یہ کرب، یہ بے خوابی --- ایلیٹ نے The Rock میں لکھا ہے۔

The desert is sqreezed in the tube

The desert is in the heart of your brother

کہنے لگے، "تم نے اس بارے میں کیا سوچا ——— ؟" میں نے کہا "جہنم میں مخلص ہونے کے بعد ہی کردار نروان حاصل کر سکتے ہیں ———" "اصل بات تو وابستگی کی ہے۔" بولے "وابستگی بڑے کنویں جیسی گہرائی ہے ———" "وابستگی، عبادت کا ہی تو ایک نام ہے۔ یہ تصور نہ ہو تو ساری عمارت دلدل میں کھڑی ہے ———" ایک یقین کا اُجالا تھا جو لفظوں کی صورت ہر طرف پھیل رہا تھا۔ رات آدھی ہو چکی تھی۔ جعفر نے سلسلے کو روکنے کی کوشش کی "انہیں آرام کرنے دو ——— صبح باتیں کر لینا" مگر وہ دونوں کے "تخلیقی عناصر اور جمالیاتی اقدار۔ قومی کو پہچاننے کا نام ہے۔ اس اعلیٰ سماجی شعور سے بے بہرہ اور بے خبر ہو کر فن اور جمالیات کی ساری بحث دابہ ہے۔ آدمیوں میں کسی قسم کا جذبہ، کوئی نفرت، کوئی محبت، کوئی آواس کوئی خوشی نہ ہو تو، ایسی دنیا میں کوئی کب تک رہ سکتا ہے۔ آئی اسلامیہ اسلامی [illegible]

----- گفتگو میں فن کا انہماک گہرا ہو جاتا تھا۔

Man is composite Creature . he needs not only

money. but also morality. mi9th. music and mystry

جانتی ہوں نا ----- انسان کو اخلاق، مسرت، موسیقی اور رمزیت درکار ہے ---- "

مَیں نے پلٹ کر بھابی کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ سچ ہے جیسے ایک پاؤں پر کھڑی ہیں چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے میاں کی طبیعت اور کیفیت پہچان لیتی ہیں۔ زیادہ جگا کر تھکانا مناسب نہیں ہے۔ مگر بھابی جاق و چوبند اور پوری طرح گفتگو میں محو تھیں۔ "معافی چاہتی ہوں۔ بھابی۔ تھک گئی ہوں گی آپ۔ اب سو جائیے" مگر ان کا انہماک، گفتگو میں دلچسپی اور مجتبیٰ بھائی کے ایک مصرعے کے پڑھنے کے بعد دوسرا مصرعہ روانی سے پڑھنے پر اندازہ ہو گیا کہ یہ خاتون، کس پائے کا ذوق رکھتی ہیں۔

اگلے دن فیروزہ آپا آئیں ------- یادیں اور باتیں چھڑیں۔ غیر منقسم ہندوستان، ادب، شعر، سیاست، موجودہ عہد کے بحران پر انتہائی متنوع، وسیع اور جذباتی منظر کو نمایاں کرتی گفتگو

لندن سے رخصت ہوتے ہوئے ہم نے کوئٹہ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ آنکھیں اشکبار تھیں کسے پتہ تھا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے۔

مجھے ان سے جو ذہنی قربت اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ اس میں شاید میری اپنی ذات کا کوئی کمال نہ تھا۔ یہ اُن کا خلوص، محبت، حُسنِ سلوک اور انسان دوستی کا اعجاز تھا۔ ذہنی وابستگی اور اکرام کے جو رشتے اُستوار ہوئے تھے، وہ میری ذات پر قرض ہیں آج جب ہم، اُن کی یاد منانے اردو مرکز میں یکجا ہوئے ہیں اور مَیں تعزیتی مضمون پڑھ رہی ہوں تو مجھے اپنے عجز اور کم مائیگی کا اعتراف کرنا ہے۔ مَیں پروفیسر مجتبیٰ حسین کے شایانِ شان، عقیدت کے الفاظ پیش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مگر مجتبیٰ بھائی سے محبت کے حوالے سے اُنہیں آواز دے سکتی ہوں۔ " مجتبیٰ بھائی۔ آپ نے وعدہ وفا نہیں کیا۔ میں تو کراچی میں گُھٹی گُھٹی حبس زدہ، کلاشنکوف، اور آتش و آہن کی گھن گرج اور مُعلق ہوئی فضاؤں سے نکل کر کوئٹہ کے کُشادہ۔ فطرت سے محو کلام عظیم الشان مناظر دیکھنے گئی تھی۔ جہاں بلند و بالا پہاڑ، زمین کی گہرائیوں میں مضبوطی سے قدم جمائے کھڑے ہیں کھیت کلی وادیاں، پہاڑ اور جھیلیں اور آبشاروں کا حُسن ہے۔ مگر یہ کیا ہُوا ---- "

لمحے بھر میں فضا کی شادابی رخصت ہو گئی۔ فضا سیاہ پوش اور عالم سوگوار تھا۔ سناٹے میں فقط سسکیاں اور ہچکیاں سنائی دیتی تھی۔ بھابی مجھے امام ضامن باندھنے آئی تھیں۔ اور آپ کا پیغام محبت لائی تھیں۔ اُس شام مجھے آپ سے کراچی میں ملنا تھا "چلو مختصر ہی۔ مگر تم اُن سے مل تو لو گی۔" کتنی چاہت اور اپنائیت تھی۔ ہم جب کسی کے دوست ہوتے ہیں، محبت کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ ساری دنیا آ کے جانے ----- مگر پل بھر میں کوئٹہ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ سڑک سے

گزرنے والی ہر گاڑی یونیورسٹی کیمپس میں واقع بارہ نمبر کے بنگلے کے سامنے ٹھہر کر رک جاتی تھی اور گاڑی چلانے والا مجتبیٰ بھائی کے قلب کی عافیت کی دعائیں مانگتا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا۔ طالب علم، اساتذہ، عام شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے دوست احباب سب بے چین تھے۔ ٹھیک سے نہیں چل رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ کسی ظالم نے لاہور میں ائیرپورٹ جانے والی ایک سڑک مجتبیٰ کے حوالے کر کے گھیر دیا تھا۔ پامال کر دیا تھا — مجتبیٰ بھائی کی صحت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ملک کے اور بیرونی حلقوں میں پھیل گئی۔ لوگ کہہ رہے تھے — یہ سانحہ صرف کراچی نہیں۔ پاکستان کا ہے۔ اردو ادب کا ہے —۔

بھابی، بچی اور دیگر آنکھیں ایک ہی سوال کر رہی تھیں۔ میں ساتھ کیوں نہ تھی — تم تو ملک سے باہر تھے آپریشن کے بعد سنبھل سنبھل کر ہمارا کراچی تم — تم نے انہیں تنہا کیوں جانے دیا —۔

سب بھر کو جی تک اس کی پرواہ ہے جب تم ان کے لفظوں کو سہارا دے کر جنازے کی سیڑھیاں طے کر رہی تھی تو ان کے ہاتھوں میں مجتبیٰ بھائی کی گرم نرمی تھی۔ جسے وہ بے ساختہ چوم رہی تھیں۔ خشک اور سنسان نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ آنکھیں، جن کا گوشہ بھی نہ بھیگا تھا۔ کراچی ائیرپورٹ پر ان کے بیٹے طالب کی چیخ نے جیسے انہیں جگا دیا۔ وہ بلک بلک رونے لگیں اور اس دن سے مسلسل رونے جا رہی ہیں۔

رخصت کے وقت میں نے کہا۔ بھابی حوصلہ رکھیے۔ بولیں، حوصلہ تو جانے والے لے گئے۔ بیٹا کیوں سنبھلی — دیکھی اور دیکھیے — وقت کی بھی تو کسوٹی ہے جب یہ کہا جائے گا کہ ادب سے بڑے کتنی وابستگی ہے — قدریں کیا ہیں اور احساس زندہ کیا ہے —۔

مجتبیٰ بھائی نے کہیں لکھا تھا۔ اگر احساس مر جائے تو ادب ہی نہیں، پوری قوم کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ جب قومی شعور کند اور تنقید کو دشمنی سمجھتے ہیں تو ذہین بانجھ ہو جاتی ہے۔ وہ فریاد کرتی ہے۔ میرے سہارا نہیں رہے، میری داستانیں بہلاوا نہیں کہلاتیں۔ میرے بچے کھلونے نہیں۔ میرے گیت لہلہاتے نہیں — اب کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا۔ کوئی میری بات نہیں سنتا —۔

خواتین و حضرات — ابھی شہرہ آفاق کی دنیا میں آپ کی سماعت تک یہ اعلان پہنچانا چاہتی ہوں۔ ادب، ذہین کی آواز ہے — جب تک ذہین زندہ ہے — ہم اس آواز سے بھاگ نہیں سکتے — یہی آواز کو زندہ رکھیے کہ یہی تو مجتبیٰ بھائی کی پکار ہے —

(تشکیل (کراچی) شمارہ ۱۰ اکتوبر۔ دسمبر ۹۳

ن۔م۔ راشد کا ایک خط

نوادرات

ن۔م۔ راشد کا غیر مطبوعہ خط بنام سید ضمیر جعفری

آپ نے سنا ہوگا شوق کا کوئی مول نہیں یعنی شوق کی کوئی قیمت نہیں۔ کسی کو ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ کوئی ہیرے جواہرات جمع کرتا ہے۔ کوئی مورتیاں جمع کرتا، کوئی نوادرات جمع کرتا ہے۔ کسی کو پہلے سے چند مشہور یا چند حسینوں کے خطوط ملتے ہیں۔ مجھے مشاہیر کی تحریریں جمع کرنے کا شوق رہا۔ ۱۹۵۲-۵۳ء کی بات ہے میں حکیم یوسف حسن (مرحوم) کے ساتھ نیرنگ خیال میں کام کرتا تھا۔ حکیم صاحب نے ایک دن ڈھیر سارے خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب بیکار ہیں انہیں ضائع کر دو۔ میں نے ان سے اجازت لے کر جلدی جلدی خطوط دیکھنے شروع کر دیئے اور کچھ خطوط محفوظ کر لیے جو اب بھی میرے پاس ہیں ان میں مرزا عظیم بیگ چغتائی، قاضی عبدالغفار کے چند خطوط ہیں جو ان حضرات کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں حکیم صاحب کے ساتھ کاروباری معاملات پر مبنی ہیں۔ امتیاز علی تاج، بیگم تاج، قدیر لکھنوی، یگانہ چنگیزی، محترمہ تسنیم سلیم چھتاری (جب ان کی تحریر کا ابتدائی دور تھا ۱۹۳۰-۱۹۳۲ء کا عرصہ) سیدہ اختر حیدرآبادی وغیرہ کے خطوط مضامین و دیگر مسائل سے متعلق ہیں۔ سیدہ اختر کے خطوط بعض خاص وجوہ کی بنا پر بہت اہم ہیں۔ ذیل کا خط اردو کے نامور شاعر اور ادیب ن۔م۔ راشد کا ہے جو مشہور و معروف مزاح نگار جناب سید ضمیر جعفری کے نام ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں ان کے اشعار کی ایک غزل شامل ہے اور گمان غالب ہے کہ یہ غزل بھی (شاید) راشد کے مجموعے میں نہ ہو اس طرح اس خط کی افادیت و اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ اس خط پر میں نے کب اور کس طرح ڈاکہ ڈالا تھا۔ میں اسے نوادرات میں سمجھتا ہوں اسی لیے نوادرات کے عنوان سے مرشدی سید ضمیر جعفری کی اجازت و اطلاع کے بغیر شائع کر رہا ہوں۔ کہ یہ ایک نادر چیز ہے۔ (ق۔س)

147–47 (C),
Village Road,
JAMAICA 35,
L.I., N.Y.

اصل تحریر کا عکس

۵ جون ۱۹۵۳ء

پیارے ضمیر — یہ انگریزی میں تائپ شدہ خط
لکھنے کا تکلف تسہیل میری بنا پر آیا — نیا نیا تائپ، راشد خریدا ہو تو
لذت کی بات ہے — پہلی جون کی [illegible] اور مجھے [illegible]
آدھ [illegible] دیسے خیریت سے پہنچ گئے [illegible] راستے کی

تھکاوٹ دور نہیں کر سکے۔ وہاں کے لیے یہ ماحول
اتنا نیا اور اتنا مختلف ہے کہ خود میرے لیے بھی تھا۔ لیکن
امید ہے آہستہ آہستہ اس سے اجنبیت کم ہو جائے گی اور لگاؤ پیدا ہو جائے گا۔
یہاں تمہارا ذکر اکثر رہتا ہے۔ آفتاب نقوی جو تمہارے ساتھ
سنگاپور میں تھے۔ آج کل یہاں اقوام متحدہ کے نئے یونٹ
میں کام کر رہے ہیں۔ وہ تمہاری کئی علانیہ اور کئی "خفیہ"
باتیں سناتے رہتے ہیں۔

کراچی میں کیا گزر رہی ہے؟ کیا حساب الملک بہادر
بے گناہ کش ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا ہوا تو تمہارے ذہن کی
نشوونما کے لیے برا نہیں ہوگا۔

پچھلے دنوں ایک غزل ہو گئی تھی۔ اس کے چند شعر یہ ہیں

لگا نہ ہوش، حال تباہ بن کے رہی ۔ شراب دل زدگاں کی پناہ بن کے رہی
ہم اس کا تذکرہ یوں بار بار کرتے رہے ۔ شب گناہ کی لذت گناہ بن کے رہی
بہار نور گل و لالہ بن کے آئی تھی ۔ شرار غم کے لیے مہلت نگاہ بن کے رہی
شب وصال جدائی کا وہ خیال رہا ۔ کہ وہ بھی ہجر کا روز سیاہ بن کے رہی
اسی نے خود نگری کا یہ حوصلہ بخشا ۔ کسی کی چشم تجسس جو نگاہ بن کے رہی
جو تیغ نے سر منبر اچھال دی تھی وہ بات ۔ پھر ایک بار سر منزل گواہ بن کے رہی
وہ روز میں جب عشاق کا ہو نہ ملال ۔ لب آگ، جہنم آب دیدہ بن کے رہی
مرا از درد مرے سینے میں آہ تھی راشد ۔
ستارہ بن نہ سکی اور آہ بن کے رہی

صفیہ تمہیں دعا دے رہی ہیں۔ [illegible] سلام

مخلص
ن م راشد

"فیض الاسلام" مارچ ۱۹۹۳ء

ثاقبہ رحیم الدین

نسیم حجازی

اردو ادب کی تاریخی ناول نگاری میں نسیم حجازی صاحب کو پیش بچاس یا پچپن سال سے وہ قد آور شخصیت بن چکے ہیں کہ ان پر قلم اٹھانا پانچ کا ساخاصہ محال ہے۔ آج اس اہلِ قلم اور باذوق لوگوں کے اجتماع میں، میں مختصراً آپ کی شخصیت نہیں بلکہ آپ کی تحریروں کے بارے میں کچھ کہنے کی جسارت کروں گی۔

نسیم حجازی ۱۹۳۳ء میں میر جعفر جمالی کے رفیق کی حیثیت سے بلوچستان گئے وہاں روزنامہ تنظیم جاری کیا اور اپنے قلم اور زورِ صحافت سے تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اسی دوران میں آپ کی پانچ معرکۃ الآرا کتابیں "داستانِ مجاہد" "محمد بن قاسم" "انسان اور دیوتا" "یوسف بن تاشفین" اور "آخری چٹان" شائع ہوئیں۔ نسیم حجازی صاحب کا ایک ہی خواب تھا اور ان کو ایک ہی آرزو بے چین رکھتی تھی کہ بلوچستان اور اس کی کل ریاستوں کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ صحافت مطالعت اور روزمرہ کی تنقید کی جھاڑیوں کے درمیان اگتی ہے۔ نسیم حجازی کی بصیرت اور صداقت کو جاننے کے لیے ان کے ان چند مقالوں پر نظر ڈالئے مثلاً پاکستان۔ ایک نظریاتی ریاست اور اس کی ذمہ داریاں۔ ہم نے زندگی سے کیا سیکھا" اور "عبرت انگیز کہانی" جو سکندر مرزا کے گورنر جنرل بن جانے کے بعد کے تاثرات ہیں۔ آج بھی بلوچستان میں لوگ شاہد ہیں کہ نسیم حجازی صاحب نے ایک صحافی کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں وہ قابلِ تحسین ہیں۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ تاریخ میں افراد کی کہانی اور گزرتے ہوئے واقعات غیر جانبداری سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ تاریخی صداقتیں جذبے سے عاری اور کسی قدر یا ہر دور کا ساتھ دیا پر زور نہیں دیتیں۔ تاریخ نویسی اجتماعی حیات کا صحیح اور سادہ بیان ہے۔

تاریخی ناول نگاری تاریخ کے ان گوشوں کو چھو لیتی ہے جس سے زمانہ ناواقف رہا ہو۔ مورخ جہاں ریاست کی ہموار راہ پہ متوازن قدموں سے گزر گیا ہوتا ہے۔ وہاں تاریخی ناول نگار رک رک کر راہ کے چھوٹے چھوٹے خودرو پھولوں کو چن لیتا ہے اور باریک کانٹوں کو سمیٹتا جاتا ہے تاریخی لحاظ سے یہ مگر ان کہے واقعات سے ناول کی دنیا تعمیر ہوتی ہے۔ تاریخی ناول میں ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ تاریخی واقعات کے درمیان کچھ امکانات چھپے ہوئے ہوتے ہیں جو اگرچہ پوری سچائی نہیں ہوتے مگر سچائی سے قریب ہوتے ہیں تاریخی ناول نگاری کا فن نہ صرف تاریخ ہے اور نہ مکمل طور پر ناول نگاری۔ تاریخی ناول نگاری کا فن تاریخی حقائق کو مسخ یا تبدیل نہیں کر سکتا بلکہ تاریخ کے دبیز پردوں تلے انسانی احساسات و جذبات اس کا مرکز بنتے ہیں۔ لہٰذا ادب کے دامن کا ایک سرا تاریخ سے بندھا اور دوسرا داستان یا کہانی سے گرد لپٹا ہوتا ہے۔

نسیم حجازی کے ناول "معظم علی" اور "تلوار ٹوٹ گئی" میں سلطنت بنگال اور میسور کی سوا دو سو سال پرانی تہذیب صحیح انداز میں موجود ہے اسی طرح سے آپ کے ناول "آخری چٹان" میں تاریخی صداقت اور بعض اوقات ناول کے ہیرو کے الفاظ میں بھی جوش کی ترنگ نظر آتی ہے دنیائے ادب میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض خشک اور غیر دلچسپ تاریخ کو دہرانے سے ناول کس طرح وجود میں آ سکتا ہے جہاں تاریخی کرداروں میں جھول ہو وہاں نسیم حجازی بھرپور خامہ فرسائی کرتے ہوئے رنگ آمیزی کرتے ہیں مثلاً سلطان جلال الدین اداسی اور خاموشی سے اپنے خیمے میں چلا جاتا ہے تو اس سلسلے میں نسیم حجازی دو ایک صفحے لکھ جاتے ہیں۔

نسیم حجازی کی ناول نگاری میں اسلوب پر دو طرح کی چھاپ ہے ایک تو مشرقی پنجاب کی ہری بھری زمین کے رنگ ہیں اور دوسرے بلوچستان کے پتھریلے کہسار، صحرا اور طویل وادیاں ہیں۔ کسی فن پارے میں زندگی کی ابھار بکھیرنے کے لیے منظر نگاری اسلوب کا حصہ بن جاتی ہے منظر نگاری کئی لحاظ سے ادب کی ایک مستقل صنف ہے شاعری میں خصوصاً مثنوی اور مرثیہ میں منظر نگاری کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ نثر میں

ان میں قدرتی مناظر، ثقافتی مناظر اور تہذیب و تمدن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ آج کے ادب میں منظر نگاری سے مراد صرف حسین فضا قائم کرنا نہیں بلکہ کرداروں کی پس پردہ روح اور کہانی کے چھپے معنی کو اجاگر کرنا ہے۔

نسیم حجازی کے ناول 'شاہین' میں گو نذر رود میں اندلس میں مسلمانوں کے زوال پر اپنے درد و کرب کا اظہار ہے۔ یہاں یوسف بن تاشفین کی مقبولیت تاریخ کا اہم باب ہونے کی وجہ سے بھی ہے مگر اس کا ایک کمال دیکھئے۔

"آسمان کی روشنی میں ہم ان ستاروں کو بھول جاتے ہیں جو رات کی تاریکی میں بھٹکے ہوئے قافلوں کو منزل کی راہ دکھاتے ہیں" اس کے بعد نسیم حجازی فتوحات میں ہونے والے گمنام شہیدوں اور تاج محل کے بے نام مزدوروں کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کے خون سے تاریخ کے عنوان لکھے گئے اور جن کا پسینہ پتھر کو موتی بنا کر تاج محل تعمیر کرتا رہا۔ نسیم حجازی کے "اندھیری رات کے مسافر" میں بڑا معنی خیز سماں بندھا ہے۔ لکھتے ہیں "ہم نے دیکھا کہ جب طوفان آیا ہو تو پرندے اچانک خاموش ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت آج اہل غرناطہ کی ہے"۔ "محمد بن قاسم" میں قدرت بیان ملاحظہ کیجیے۔ "زبیر مجھے اس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے اس کی زندگی کس قدر مختصر ہے اسی قدر اس کا مقصد بلند ہے"۔

نسیم حجازی بلاشبہ علامہ اقبال، مودودی اور شبلی نعمانی سے متاثر تھے وہ ہلال اور صلیب کی جنگ کو صرف حکومتوں کی جنگ یا ای صحرائی یا فوجی یلغار کا نام نہیں دیتے بلکہ دو نظام حیات، دو نظریوں اور دو تہذیبوں کا تصادم قرار دیتے ہیں۔ نسیم حجازی صاحب نے خود قبول کیا ہے کہ ناول نگاری ان کے نزدیک ایک مشن کی تکمیل کا ذریعہ رہی ہے اور وہ اسلامی نظریہ حیات و آخرت ہے۔

زمانہ قدیم سے ادب میں ہیرو کا تصور واضح مگر بدلتا رہا ہے۔ اس تصور کے بنیادی ستون یہ تھے کہ ہیرو عظیم مقبول اور اعلیٰ ترین صفات سے آراستہ ہوتا تھا ہیرو کی رحمت ہر مشکل و الجھن پر آخر کار حاوی ہوتی تھی۔ البتہ کہیں ہیرو ذہنی طور پر فاتح اور کہیں جسمانی اور مادی لحاظ سے فاتح ہوتا تھا۔ یہ تصور عرصہ دراز تک چلتا رہا۔ وقت کے بدلتے دھارے نے ہیرو کو خاصہ بدل دیا ہے۔ یقیناً ہیرو محض خلاصے اور نتیجے کے طور پر تو عظمتوں کی بلند ترین چوٹی پر ہوتا ہے مگر اس کا راستہ حقیقت سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ دور حاضر کا ہیرو پہلے سے طے شدہ برائیوں کا مالک نہیں ہوتا اور نہ وہ آئیڈیل طریقے سے ہر بدی پر قابو پاتا ہوا نیکیوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ دراصل آج کل ادب میں ہیرو نہایت پیچیدہ انداز کے ذہنی اور سطحی عمل میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کی شخصیت کی کئی تہیں ہیں اور دل جدوجہد اور تفاخر کے میدان کو آزمائشوں سے محدود کرپاتا ہے۔ دور حاضر کے ہیرو کی زندگی میں خیر اور شر کے دھارے ملتے اور جدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات بھی بڑی حد تک درست ہے کہ آج بھی ہیرو کا کردار محض لطافت سے چھپے انداز میں یا گہرے معنوں میں اچھائی کا عنصر پیدا کرتا ہے مگر ہر انسان کی بنیادی صفت کی طرح آج کے ہیرو میں نیکی اور بدی کے سلسلے گڈمڈ ہوتے رہتے ہیں۔

نسیم حجازی کے ناولوں میں تاریخی ہیرو تو خوبیوں کا مکمل پیکر ہیں ہی مگر جو کردار تاریخی ثبوت سے کچھ کم ہیں وہ بھی آئیڈیل انسان ہیں۔ جو خوبی زیادہ اجالے اور تھوڑے سے سائے سے مل کر جنم لیتی ہے اور انسان سے زیادہ قریب ہوتی ہے نسیم حجازی کے اکثر ہیرو اور کئی کرداروں کی تعمیر میں نظر نہیں آتی ہے۔

نسیم حجازی کی زندگی کے پچاس پچپن سالوں میں ان کے ناولوں کا عربی، سندھی اور بنگالی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے شائع شدہ ناولوں میں آپ کی بیشتر ناولوں کا ایک یا دو ایڈیشن شائع ہوتا تھا مگر اب زیادہ تر کتابوں کے تیس سے پچاس تک ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

"فیض الاسلام" فروری ۱۹۹۳ء

وفیات

۱۹۹۲ء میں اردو زبان و ادب اور صحافت کو فائدے کم اور نقصانات سے زیادہ دوچار ہونا پڑا۔ اہم اور سربلند شخصیتوں کی وفیات نے ادب اور تہذیب کے افق کو تم دیدہ سا کر دیا۔

○ ۳؍ ستمبر ۱۹۹۲ء کو کراچی پاکستان میں اردو کے بزرگ شاعر جناب سید شاہ محمود عالم وفا براہی ۷۶ سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ جناب وفا ایک محفل مشاعرہ میں صدارت کر رہے تھے کہ قلب پر شدید حملہ ہوا اور جبر حیات سے آزاد ہو گئے۔ وہ پٹنہ، بہار کے رہنے والے تھے اور ہند و پاک کے مشاعروں میں اپنے کلام اور پُرسوز ترنم کے باعث بے حد مقبول سخن ور تسلیم کیے جاتے تھے۔ نکہتِ گل، سحر نظر، شرارِ فطرت اور شعارِ نو، چار شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ سب رس کے دیرینہ قلمی معاون بھی رہے ہیں۔ خدا مغفرت فرمائے۔

○○ ۲۲؍ نومبر ۱۹۹۲ء کو نامور طنز و مزاح نویس ادیب، ڈرامہ نگار، جناب رشید قریشی سابق ڈپٹی سکریٹری حکومت آندھرا پردیش قلب پر حملے کے باعث اللہ کو پیارے ہو گئے۔ رشید قریشی جامعہ عثمانیہ کے نامور فرزندوں میں سے تھے۔ ادارہ ادبیات اردو اور اس کے بانی ڈاکٹر زور سے انھیں دیرینہ رفاقت رہی۔ ادارہ سے ان کی پہلی کتاب "ہمی کی دنیا" شائع ہو چکی ہے۔ طنز و مزاح کی تین کتابیں قریشی مرحوم کی ذہانت فکر اور شعورِ تخلیق کی روشن مثال ہیں۔ زندہ دلان حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد نے دسمبر ۹۲ کا خصوصی شمارہ رشید قریشی کی یاد میں شائع کر کے انھیں بروقت خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔

○○○ ۵؍ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بزرگ اقبال شناس عالم اور ماہرِ تعلیم مولوی سید خلیل اللہ حسینی (بانی و صدر کل ہند مجلس تعمیرِ ملت) کا انتقال ہوا۔ خلیل مرحوم نے انوار العلوم کالج کی ترقی میں بہ حیثیت پرنسپل (۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۳ء) گراں قدر خدمات انجام دیں۔ شعلہ بیان مقرر، اقبال شناس عالم اور کلام پاک کے مفسر ہی نہیں نئی نسل کے لیے حرکت اور جوش کا درس دینے والے استاد بھی تھے۔ ارباب حیدرآباد ان کی یاد کو فراموش نہ کر سکیں گے۔

○○ ۳؍ جنوری ۱۹۹۳ء کو لاہور میں ممتاز شاعر جناب طفیل ہوشیارپوری ایڈیٹر ماہنامہ "محفل" نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ غزل، نظم اور نعتیہ شاعری میں طفیل نے نام کمایا۔ ۱۹۱۴ء میں بمقام ہوشیارپور (پنجاب) پیدا ہوئے۔ تمام اصنافِ شعر میں طبع آزمائی کی۔ جامِ مہتاب (رباعیات)، شعلۂ جام (مجموعۂ غزلیات)، سوچ کے الاؤ (نظمیں)، رحمتِ یزداں (نعتیہ شاعری) چار مجموعے طفیل صاحب کو زندہ رکھیں

○○ ۷؍ فروری ۱۹۹۳ء کو انسانیت، سیکولرزم اور اتحاد کے بے باک مجاہد شاعر جناب غلام ربانی تاباں (۸۰) سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ تاباں صاحب ۱۵؍ فروری ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے انٹر کامیاب کیا پھر آگرہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایل ایل بی ہوئے وکالت میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چوں کہ مزاج شاعرانہ تھا ملک کی تحریکِ آزادی میں شامل ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ سازِ لرزاں، حدیثِ دل اور ذوقِ نظر، نوائے آوارہ شعری مجموعوں کے علاوہ نثر میں ایک کتاب "ہوا کے دوش پر" بھی آپ کی یادگار ہے۔ ۱۹۷۱ء میں پدم شری ایوارڈ ملا تھا جسے آپ نے ارباب حکومت کی اردو زبان اور تہذیب، نیز ملک میں آئے دن کے دنگے فساد پر قابو نہ پانے پر احتجاج کرتے ہوئے اس ایوارڈ کو واپس کر دیا تھا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے ادبی مشیر وضعدار اور ترقی پسند اقدار کے فرد اور سخنور رہے تھے۔ اور غزل کے محبوب شاعر۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔

(د، خ)

سب رس، اپریل ۱۹۹۳ء

"کندن" کے مدیر لیاقت قریشی کا انتقال

نہایت دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی جارہی ہے کہ گوہر پبلیشرز کراچی کے مالک اور ادبی ماہنامہ "کندن" کراچی کے مدیر اعلیٰ لیاقت قریشی ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء کی صبح ۴ بجے حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ ادبی حلقوں میں لیاقت قریشی مرحوم کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

ان کے لائق فرزندوں کا یہ عہد کہ لیاقت قریشی مرحوم کی جلائی ہوئی شمع فروزاں رکھیں گے۔ قابل ستائش ہے۔

ادارہ "قومی زبان" جناب لیاقت قریشی کے اس "سانحہ ارتحال" پر ان کے پسماندگان کے غم میں شریک ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

علامہ اقبال کے بچوں کی آیا انتقال کر گئیں

شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کے بچوں کی آیا مسز ڈورس احمد گزشتہ دنوں لاہور میں ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ ۔ ۔ آنجہانی کو یہاں عیسائیوں کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال کی اہلیہ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے جاوید اقبال، صاحبزادی منیرہ اقبال کی پرورش کی تھی۔

صحافی ستار طاہر انتقال کر گئے

ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور کے ایڈیٹر ستار طاہر حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ وہ نماز عید کے بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور وہ طبی امداد ملنے سے قبل ہی خالق حقیقی سے جا ملے انھیں اسلام پورہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ میں ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی ستار طاہر کے سوگواران میں بیوہ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہیں۔ (روزنامہ "جنگ" کراچی ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء)

| قومی زبان مئی ۱۹۹۳ء |

اردو شعر و ادب میں خود ساختہ دانشوروں کی کمی نہیں ہے۔ ایسے افراد بے شمار ہیں جن کی تخلیقی صلاحیت تیسرے درجہ کی اور مطالعہ صرف چند حوالوں پر مشتمل ہوتا ہے، قوتِ مشاہدہ بہت کمزور، تنقیدی شعور سے ناشناس اور تحریر کے رموز و نکات سے بے بہرہ ہوتے ہیں مگر ان کی پی آر دست زبردست ہوتی ہے ادب کا شعور نہ ہونے کے باوجود، تخلیقات کے کمزور و بے جان ہونے کے باوصف اور تنقیدی اصول و ضوابط سے ناواقفیت کے بعد بھی ان کے رخت مزدوری اور حاشیہ بردار ان کی زندگی میں انہیں عظیم شاعر یا ادیب، نقاد اور دانشور بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں اور ان کی تعریف و توصیف میں صفحات کے صفحات سیاہ ہوتے رہتے ہیں مگر جب ان کی آنکھیں بند ہوجاتی ہیں تو وہ ماضی کی خاک تلے ایسے دبتے ہیں کہ ان کا چہرہ بھی پہچان میں نہیں آتا۔ تاریخ انہیں فراموش کر دیتی ہے اور آنے والی نسلیں ان کے نام سے بھی ناآشنا ہوتی ہیں لیکن اس کے بالکل برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حقیقی معنوں میں دانشور، نقاد، شاعر اور ادیب ہوتے ہیں وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے متعلق میر نے کہا تھا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایسے ہی نابغہ روزگار میں اختر حسین رائے پوری اور سید ممتاز حسین بھی تھے جو ۱۹۹۲ میں دنیائے ادب کو داغِ مفارقت دے گئے یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کا تعلق اردو کی ترقی پسند ادبی تحریک سے تھا اور دونوں نے اس سال رحلت فرمائی جس سال سوویت روس کا شیرازہ منتشر ہوا۔

پہلے اختر حسین رائے پوری نے اردو ادب کو سونا کیا۔ کون نہیں جانتا کہ اختر حسین رائے پوری ترقی پسند ادبی تحریک کے معماروں میں سے ایک تھے۔ ایک بلند پایہ نقاد، مترجم، افسانہ نگار اور سوانح نگار تھے۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے نظریہ سازوں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعہ، تنقیدی بصیرت، علمی استدلال، ژرف نگاہی اور فکر و نظر کے ذریعہ تخلیقی ادب کو سماجی عمل کے تابع قرار دے کر جدلیاتی مادیت کی کسوٹی پر پرکھنے کا سلیقہ سکھایا۔ انھوں نے ترقی پسند نظریات کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ترقی پسند نظریات کے معیارات مقرر کرکے عصری مسائل کے تناظر میں تخلیقات پر تنقیدی فکر و نظر ڈال کر اردو ادب کو ایک نئے ادبی رویہ سے روشناس کیا۔ وہ اختر حسین رائے پوری ہی تھے جنھوں نے ترقی پسندی کو سنجیدگی اور معنویت

ے نکال کر تاریخی، سائنسی اور علمی روح سے آشنا کیا۔

اختر حسین رائے پوری کے ادبی کارناموں کی تعداد بہت کم ہے لیکن ان کے باوجود ان کی تحریروں میں ایسی بلند نظری، پاکیزگی، جذبہ کی ت مند روایت کی پاسداری، زندہ معاشرہ کی بازیافت، تاریخی شعور اور حرکت و حرارت ہے کہ انھوں نے صرف ترقی پسند ادبی تحریک کو ادبی اعتبار اور سربلندی سے نوازا بلکہ آئندہ نسلیں بھی ان کی تحریروں سے متاثر ہوتی رہیں گی اور اردو ادب کی تاریخ ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہے گی۔

ہی ترقی پسند ادبی تحریک کے آنسو اختر حسین رائے پوری کے غم میں خشک نہیں ہونے تھے کہ ترقی پسند ادب کا ایک اور بلند پایہ سرنگوں ہو گیا یہ معروف ادیب، نقاد و پروفیسر ممتاز حسین تھے جنھوں نے رحلت فرما کر اردو تنقید کو یتیم کر دیا۔

پروفیسر ممتاز حسین ایک بلند پایہ نقاد اور ایک اہم دانشور تھے۔ ان کا شمار اردو کے ان نقادوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو تنقید کو تنقیص و تبصرہ سے سائنسی تنقید کے معیار تک پہنچایا۔ وہ اردو تنقید کی تاریخ میں نہ صرف ایک باب کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ وہ ایک نظریہ ساز شخصیت کے حامل تھے۔

پروفیسر ممتاز حسین نے یوں تو افسانے بھی تحریر کیے، صحافت سے بھی وابستہ رہے لیکن ادب میں ترقی پسند تنقید ان کی شناخت و پہچان کا ذریعہ انھوں نے ترقی پسند تنقید کو اپنی فکر و نظر، علم و آگہی، بصیرت و بصارت، ذہانت و مطالعہ، منطقی استدلال، سماجیاتی تجزیہ اور سائنسی معروضیت کے سائنسی تنقید کے درجہ تک پہنچا دیا۔

موجودہ دور میں پروفیسر ممتاز حسین وہ واحد نقاد تھے جو کٹر ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ انھوں نے روایات کو فراموش نہیں کیا تھا اور نہ ہی جدید ادبی سرمایہ کی طرف سے یکسر نظریں پھیر رکھی تھیں۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اگرچہ شعور مختلف جہتوں کا حامل تھا۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اس کے اندر جو قوت، دلکشی اور جاذبیت ہے، اس سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف وہ نئے رجحانات، جدید ادبی مسائل اور تحریکات سے بھی بخوبی واقف تھے لہٰذا ان کی تنقید گہری بصیرت اور وسیع مطالعہ کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ان کا انداز اور منطقی تھا۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو انھیں اپنے دور کے تمام نقادوں سے ممتاز کرتی تھیں۔

یقینی طور پر پروفیسر ممتاز حسین کی رحلت سے اردو تنقید میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کسی بھی صورت سے پُر نہیں ہو سکتا۔

ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند تنقید کے حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور انتشار میں جب کہ ترقی پسند افکار و نظریات پر شب خون مارنے سامراجی قوتیں کامیاب ہو گئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک اپنا رول ادا کر چکی، ترقی پسند تحریک کے دو چند، نقادوں، دانشوروں اور ادیبوں کی موت ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اس دور انتشار میں جبکہ PSUDO ادیبوں کی بھرمار ہے، حقیقی ادیبوں سے دنیائے ادب خالی ہو جائے تو یہ کہنا بجا ہے کہ یہ بد قسمتی کا عہد کہا جائے گا۔

"اردو ڈائجسٹ فیصل" جنوری ۱۹۹۳ء

O

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ اپنی چالیس سالہ عمر میں موت کے کتنے ہی صدمات سے دوچار ہو چکا ہے۔ سب سے پہلے ہم نے اس کے بانی ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے لیے صفِ ماتم بچھائی، پھر میاں محمد شریف کا نوحہ کیا، اس کے بعد رئیس احمد جعفری کا مرثیہ پڑھا، بعد ازاں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی موت پر آنسو بہائے، پھر سید محمد جعفر شاہ پھلواروی کے انتقال پر اظہارِ ملال کیا، پھر بشیر احمد ڈار کی رحلت کا مرحلہ پیش آیا، اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا محمد حنیف ندوی نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ متعلقین ادارہ میں ڈاکٹر رفیع الدین اور پروفیسر محمد سرور جامعی کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ ہم نے ان کو بھی اس دُنیائے فانی سے رخصت ہوتے دیکھا۔ کچھ عرصہ پروفیسر حمید احمد خاں کا نام نامی بھی ارکانِ ادارہ میں شامل رہا، ہماری آنکھوں کے سامنے وہ بھی لقمۂ اجل ہو گئے۔

یہ تمام حضرات اپنی اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل تھے اور ان کی بوقلموں خدماتِ علمی کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان میں سے ہر بزرگ نے علم کے ہر میدان میں تگ و تاز کی اور بعد میں آنے والوں کے لیے اپنے پیچھے بڑا تصنیفی ذخیرہ چھوڑا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے اور ان کی حیاتِ مستعار کے قافلے زندگی کے نشیب و فراز کی بہت سی منزلیں طے کرتے ہوئے موت کی منزل کے قریب آپہنچے تھے۔

۲۵۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کو رات کے آخری پہر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے قافلہ سالار سراجِ منیر آخری سفر پر روانہ ہوئے۔ انھوں نے زندگی کی صرف اڑتیس ۳۸ بہاریں دیکھی تھیں کہ موت کا پیغام آگیا اور عینِ موسمِ بہار میں خزاں چھا گئی۔!

انا للہ وانا الیہ راجعون

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ نے اپنی چالیس برس کی عمر میں جو گوہرِ آب دار کھوئے اور جن بڑے بڑے اصحابِ علم کو رخصت کیا، بعض معاملات میں سراجِ منیر ان سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ "المعارف" خصوصی شمارہ ۱۰

"فنون" نمبر ۳۵ کی اشاعت کے بعد اب تک حزیں لدھیانوی، ممتاز ڈاہر، الطاف پرواز، کمار پاشی، بشیر بدر، ابن حیدر (سید علی حیدر زیدی) اور تصور کرتپوری کے سے اہم شعراء کا سانحہ انتقال ہو چکا ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر حکم چند نیر کی وفات کی خبر بھی ملی ہے۔ مرزا غلام نبی جانباز بھی جو شاعر، سیاسی کارکن اور مورخ تھے، رخصت ہو چکے ہیں۔ معروف اداکارہ نیر سلطانہ اور نوجوان اداکار اسماعیل شاہ بھی ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ ان سب کی رحلت سے شعر و ادب اور تہذیب و ثقافت کی دنیا اداس ہو گئی ہے۔ ادارہ "فنون" ان کے پسماندگان کے دکھ میں شریک ہے۔

اس شمارے کی طباعت کے دوران میں طفیل ہوشیارپوری اور احمد صفا براہی کے سے کہنہ مشق شعراء اور ناظر درانی کے سے نوجوان شاعر کے انتقال کی روح فرسا خبریں بھی ملی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

فنون: ۳۷، ستمبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء

فنون ۔ ۲۷ اور فنون ۔ ۲۸ کی اشاعت کے وقفے میں علم و ادب اور فن و صحافت کی بعض بڑی شخصیتیں رخصت ہو گئیں مقبول عوامی شاعر حبیب جالب ۔ قد آور صحافی مظہر علی خان، ایک انتہا درجے کا وسیع المطالعہ نقاد، افسانہ نگار اور مترجم ستار طاہر معروف نقاد ڈاکٹر ملک حسن اختر، محترم محقق ڈاکٹر محمد باقر، مشہور صوفی واصف علی واصف، ثقافت کے میدان کا ایک سرگرم ادیب یا فیض انور، ایک عمدہ شاعر محمود کنور، اور ایک کامیاب موسیقار ماسٹر عنایت حسین کے علاوہ ادھر بھارت میں غالبیات کے ایک بے مثل ماہر مالک رام، ایک ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں، اور ایک مقبول فلمی ہدایت کار اور ادیب کمال امروہوی ——— ان سب نے اس دوران میں رخت سفر باندھا اور عالم جاودانی کو سدھار گئے ۔

بھارت کے معروف شاعر بشیر بدر کے بارے میں پاکستان کے اخبارات میں ایک غلط خبر چھپ گئی تھی چنانچہ فنون میں بھی اس کا ذکر آگیا ۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ صرف علیل ہوئے تھے اور اب اللہ کے فضل سے چاق و چوبند ہیں ۔

ـ فنون ، جنوری ۔ اپریل ۹۳ء

محمد عمر فاروق

جوابِ آں غزل

م۔ش کی قادیانیت نوازی
اور شیخ اعجاز احمد و اولادِ اقبالؒ کی گارڈین شپ

زیرِ نظر مکتوب "مشہور" نوائے وقتی کالم نگار "م۔ش" کے جواب میں ایڈیٹر "نوائے وقت" کو لکھا گیا، "جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے" سچائی کے چند بول برداشت نہ کر سکے۔ لیکن حق و صداقت کو اپنے اظہار کے لئے "نوائے وقتوں" کی ضرورت کبھی نہیں رہی اور نہ ہی اس کے ابن الوقت لکھاریوں کی تائید و تصدیق کی کمی محسوس ہوئی ہے۔

فروری ۹۳ء میں قادیانیت زدہ مضمون نگار م۔ش نے علامہ اقبال کے حوالے سے قلم کی جو ابکائی کی ہے اُن کے پیچھے بھی وہی "امراضِ خبیثہ" کی علامت جدیدہ ہے۔ ہر چند کہ لوارہ ایسے مرفوع القلم لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہتا لیکن کبھی کبھی ریکارڈ کی درستگی کے لئے مذکورہ قماش کے دریدہ دہنوں کی خبر گیری کرنا از حد ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسے دو نہادوں کے لئے جناب محمد عمر فاروق کا یہ "نسخۂ شافی" خامے کی چیز ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔ اللہ کریم ایسے سرطانی مریضوں کو شفائے کاملہ عطاء فرمائے۔ (آمین)

لوارہ

محترمی ایڈیٹر صاحب روزنامہ نوائے وقت لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ!

گزارش ہے کہ بندہ "نوائے وقت" کا مستقل قاری ہے۔ تاریخ سے گہری شیفتگی کی وجہ سے میں م۔ش صاحب کی یادداشتوں کا بغور مطالعہ کرتا ہوں۔ ریکارڈ کی درستگی کے لئے یہ چند سطور پیشِ خدمت ہیں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

م۔ش صاحب نے "پدرم دہقان بود" کی ۱۳۷ ویں قسط بابت ۱۲ فروری ۱۹۹۳ء میں "علامہ کے ٹرسٹی" کے عنوان سے چودھری محمد حسین مرحوم کی خدمات پر ایک تفصیلی مضمون رقم کیا ہے۔ لیکن انہوں نے مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ایک واضح مکتوب کے ناقابلِ تردید شواہد کو مبالغہ آمیزی کی حد تک جھٹلانا چاہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس مضمون میں انہوں نے نجانے کیوں حقائق سے چشم پوشی کرنے کی سعیٔ ناکام کی ہے۔ شاید یہ اُن کے حافظے کی کمزوری ہے۔ یا درونِ خانہ مصلحتوں کا اظہار بے اختیار! جبکہ انہیں یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ علامہ اقبالؒ کی محفلوں کے رازدار ہیں اور انہیں علامہ کی خدمت کا موقع بھی میسر آیا ہے۔ آخر وہ یہی بات کہنے

ہے گریزاں کیوں ہو جاتے ہیں؟ میم۔ شین صاحب کے اس نارواطرزِ عمل کی شکایت میگزین کے انہی صفحات پر ممتاز صحافی دانشور سید سبط الحسن ضیغم اور جناب احمد محمود سعید میاں بھی کر چکے ہیں۔ محترم م۔ش سے ہماری گذارش ہے کہ اگر وہ مصلحتوں سے دامن چھڑا نہیں سکتے تو خدارا! تاریخ کے اعلےٰ اوراق کو مسخ نہ کریں۔ حقائق مقدس ہوتے ہیں۔ صداقت اپنے اندر ایک قوت رکھتی ہے۔ جو سچائی کے دامن پر دیدہ دانستہ ڈالے گئے دبیز پردوں کو اتار پھینکتی ہے۔ "نوائے وقت" ایک قومی اخبار اور نظریۂ پاکستان کا منادہونے کا دعویٰ بھی رکھتا ہے۔ اس حوالے سے یہ بات "نوائے وقت" ایسے موقر جریدے کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اس کے صفحات پر روزِ روشن کی طرح واضح حقیقتوں کا مذاق اڑایا جائے۔ اور علامہ اقبال کے کروڑوں عقیدت مندوں کے جذبات مجروح کئے جائیں۔

م۔ش صاحب نے چودھری محمد حسین کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"قبلہ چودھری صاحب ان چار افراد میں شامل تھے جنہیں حضرت علامہ اقبال نے اپنے کمسن بچوں کا گارڈین مقرر کیا تھا۔ باقی تین حضرات میں حضرت علامہ اقبال کے برادرِ نسبتی خواجہ صاحب، دوسرے شیخ اعجاز احمد جو شاعرِ مشرق کے سگے بھتیجے اور تیسرے میاں طاہر الدین تھے۔۔۔۔"

اس مختصر پیراگراف میں انہوں نے شیخ اعجاز احمد کا تذکرہ کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات اقبالیات کے ماہرین نے اپنے مکمل دلائل و براہین کے ساتھ واضح کر دی ہے کہ علامہ محمد اقبال نے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو قادیانی عقائد کی بناء پر اپنے بچوں کی گارڈین شپ سے علیحدہ کر دیا تھا اور سر راس مسعود کو ایک خط میں شیخ اعجاز احمد کی جگہ پر بچوں کی سرپرستی کے لئے لکھا تھا۔ گارڈین شپ سے علیحدگی کی اصل وجہ سامنے لانے کی بجائے م۔ش نے لکھا ہے کہ: "شیخ اعجاز احمد اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں میں مصروف تھے"۔ بہرحال یہ وہ حقائق ہیں جو اقبال اکادمی پاکستان کے مجلہ "اقبالیات" لاہور کے جولائی ۱۹۸۷ء کے شمارے میں جناب ڈاکٹر وحید عشرت کے قلم سے سامنے آچکے ہیں۔ اور پھر ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت کے اوراق کی زینت بھی بن چکے ہیں۔ یہ تو تھی وہ سچائی جسے پسِ پردہ ڈالنے کے لئے نوائے وقت کا سہارا لیا گیا۔ اب سنیئے مکتوبِ اقبالؒ کی وہ حیرت ناک کہانی جس کے مرکزی کردار چودھری محمد حسین اور شیخ اعجاز احمد تھے۔ یہ مکتوب اس لئے بھی اہم ہے کہ اقبال کے نام نہاد وارث اس خط میں کتر بیونت سے باز نہ آئے۔ اسی لئے خط کا اصل عکس نہ شائع کیا گیا۔ پہلے خط کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

لاہور

اکتوبر ۱۹۳۳

ڈیئر مسعود۔ [illegible] تھا۔

امید ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ الحمد للہ کہ آپ بخیریت [illegible]۔ جواب لکھتا ہوں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] تمام ان کے حسب ذیل ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

والسلام

محمد اقبال

لاہور

۱۰ جون ۷ ۱۹۳ء

ڈیر مسعود!

پرسوں میں نے تمہیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار GUARDIAN مقرر کئے تھے۔ یہ GUARDIAN ازروئے وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ طاہر دین۔ یہ میرے کلرک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

۲۔ چودھری محمد حسین۔ ایم۔اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان۔

۳۔ شیخ اعجاز احمد بی۔اے، ایل۔ایل۔بی سب جج دہلی۔

۴۔ عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بے چارے کی بات میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیرالدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳۔ شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے شرعاً یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا GUARDIAN ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے۔ اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو GUARDIAN مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجۂ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا۔ کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لئے بہت مفید ہے۔ یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں۔ موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

(بحوالہ "اقبال اور مسعود حسن" ص ۱۵۰۔ از ڈاکٹر اخلاق اثر)

علاوہ ازیں شیخ عطاء اللہ کے مرتب کردہ مجموعۂ مکاتیب "اقبال نامہ" کے ایک ہی ایڈیشن کے دو نسخوں کے درمیان اس قدر واضح فرق موجود ہے کہ یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ شعوری کوشش کے تحت علامہ اقبال کے

اس خط کے مندرجات میں تحریف سے کام لیا گیا۔ جس کا مقصد شیخ اعجاز احمد کے عقائد کے بارے میں علامہ اقبال کے تاثرات کو چھپانا تھا۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں چودھری محمد حسین پر یہ الزام دیا ہے کہ "گارڈین شپ میں ان کے حریف چودھری محمد حسین نے سیاست کرتے ہوئے علامہ محمد اقبال کی طرف سے ان کی صالحیت کے سرٹیفکیٹ کو دبانے کے لئے یہ تحریف کی"۔ حالانکہ چودھری محمد حسین نے شیخ اعجاز احمد کے بارے میں متعلقہ حصہ حذف کر کے ان کے قادیانی عقیدے کے لئے فائدہ مند ہونے کی بجائے اُلٹا نقصان دہ ہو سکتی تھی بقول ڈاکٹر وحید عشرت: "چودھری محمد حسین نے تو شیخ اعجاز سے سیاست نہیں کی بلکہ شیخ اعجاز احمد کی گارڈین شپ محفوظ کرنے کے لئے اقبال کے خط کی عبارت کو بدل دیا۔ اور شیخ اعجاز کے عقائد اور ان کی گارڈین شپ سے محرومی کی وجہ کو چھپا دیا ہے اور انہیں خط سے نکال کر شیخ اعجاز احمد کی خدمت انجام دی۔ اس لئے شیخ اعجاز کو چودھری محمد حسین کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ حالانکہ وہ اُلٹا گلہ کر رہے ہیں کہ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز کی متنازع شخصیت کو متنازع بنا دیا۔ اس کی وجہ بظاہر گارڈین شپ میں شیخ اعجاز کو شریک رکھنا بھی مطلوب ہو، ہے کہ خاندانِ اقبال کے اس فرد کو کسی نہ کسی طرح گارڈین شپ میں باقی رکھا جائے۔ تاہم نیک نیتی سے بھی گئی اس کتر بیونت سے اخلاقی جواز کی تفہیم نہیں ہوتی کہ جس چیز کو علامہ شرعاً مشتبہ سمجھتے تھے اس کو عبارت حذف کر کے مباح کرنے کی سعی کیوں کی گئی اور شیخ اعجاز کے لئے یہ نرم گوشہ کیوں پیدا کیا گیا۔

(اقبالیات" جولائی ۹۸۷

فی الحقیقت علامہ اقبالؒ جن کے قادیانیوں کے متعلق افکار چھپے ڈھکے نہیں ہیں۔ ان کی ذات کو متنازع بنانے کی یہ کوششیں دراصل قادیانیوں کی زیرِ زمین تخریبی کارروائیوں کا ایک حصہ ہے۔ جس کے لئے انہوں نے مختلف ا[illegible] کو استعمال کیا۔ حالانکہ علامہ محمد اقبالؒ نے ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے محض اس لئے استعفیٰ دے دیا تھا کہ قادیانی سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کشمیر کمیٹی کے ذریعے قادیانیت کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ اور کشمیری مسلمانوں کے مسائل اُن کا مطمحِ نظر نہ تھے۔ قادیانی مسئلہ پر ہی علامہ اقبال کی پنڈت نہرو سے خط و کتابت ہوئی۔ جو "[illegible] ریویو" میں اشاعت پذیر ہوئی۔ جو نفس مضمون کے اعتبار سے علامہ اقبالؒ کے عقیدۂ ختمِ نبوت پر غیر متزلزل ایمان کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔ قادیانیوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی خوفناکی کا اندازہ انہوں نے بہت پہلے لیا تھا اور اپنی غیرتِ ایمانی کا برملا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"ختمِ نبوت کے معنیٰ یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے۔ اور واجب القتل ا مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا تھا۔ حالانکہ وہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا مصدق تھا۔ اور اسکی اذان میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق تھی۔ (انوارِ اقبال ص ۴۵۔ از بشیر احمد ڈار)

اپنے ان مستحکم عقائد کی بنیاد پر علامہ اقبال یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ اُن کا قادیانی العقیدہ بھتیجا اُن کی مسلمان اولاد کا سرپرست بن جائے۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں اقبال کے بارے میں کہا کہ وہ قادیانیوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور عمر کے آخری حصے میں وہ مجلسِ احرار کے رہنماؤں کی با[illegible] میں آ کر قادیانیت کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ حالانکہ ایسا شرمناک الزام حضرت علامہ اقبال کی شفاف شخصیت

داغدار بنانے کے مترادف ہے۔ اور ان کے عقائد و افکار پر گھناؤنا حملہ ہے۔ جبکہ اقبال ختم نبوت کے عقیدے کو جان سے زیادہ عزیز گردانتے ہیں۔ اور اس عقیدہ کو اسلام کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اور وہ زندگی کے کسی مرحلے میں بھی قادیانیت کے قریب نہیں رہے۔ رہی بات مجلسِ احرار کی تو یہ حقیقت کبھی مخفی نہیں رہی کہ حضرت علامہ محمد اقبالؒ اور مجلسِ احرار کے رہنماؤں امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور چوہدری افضل حق مرحوم کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ اور علامہ مرحوم نے قادیانیت کے خلاف مجلسِ احرار کی تحریک کو مستحسن نظروں سے دیکھا اور ہمیشہ ان کی تائید کی۔ سیاسی راہیں اگرچہ جُدا ہوں لیکن وضعدار لوگ شخصی احترام اور انسانی اقدار کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ کے بعد علامہ مرحوم نے ہی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ایماء پر مجلسِ احرار کو "تحریکِ کشمیر" چلانے کا عندیہ دیا تھا۔ اس تحریک میں پچاس ہزار سے زائد احرار رضاکاروں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ علامہ اقبالؒ ہمیشہ حق پرست علماء و مشائخ کے قریب رہے۔ اور بعض علمی مسائل و اشکالات میں ان سے مستفید ہوتے رہے۔ علامہ مرحوم نے قادیانیوں کی مخالفت عقیدۂ ختمِ نبوت پر کامل یقین و اعتماد کی بنیاد پر کی تھی نہ کہ اس میں کسی ذاتی رنجش کو عمل دخل تھا۔ جو شخص یا جماعت علامہ کی قادیانیت دشمنی کو ذاتی اختلافات کا نتیجہ بتاتی ہے وہ خود در حقیقت اقبال دشمنی کا شکار ہیں۔ علاوہ ازیں علامہ اقبال کے قادیانیوں کے بارے میں صریح و مضبوط موقف کو چھپانے سے خود علامہ مرحوم کی ذات پر حرف آنے کا اندیشہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبالیات کے ماہرین قادیانیوں اور ان کے کار پردازوں پر کڑی نظر رکھیں۔ اور مکاتیب اقبال کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور ان کے خطوط کے مکمل عکس چھاپیں تا کہ ان میں ہونے والی بددیانتیوں اور تحریفات کو آشکارا کیا جا سکے۔ اقبال اکادمی اس اہم قومی معاملے پر ضرور توجہ کرے۔ اسی کے ساتھ م۔ش صاحب سے بھی گذارش کروں گا کہ وہ بھی روایات تحریر کرتے وقت احتیاط اور چھان پھٹک سے کام لیں اور محض اپنے حافظے و یادداشت پر انحصار کرنے کی بجائے تحقیق سے مدد لیں اور کتب و جرائد سے اپنی تحریر کو باحوالہ بنائیں۔ تاکہ مستند تاریخی روایات کا ذخیرہ مرتب ہو سکے۔ اور اصل حالات و واقعات قوم تک منتقل ہو سکیں۔ آپ کے قادیانیوں سے تعلقات اپنی جگہ لیکن خدارا علامہ اقبال کا نام لے کر خرافات کے منسوب سے اقبال کے افکار اور عقائد کو پامال نہ کریں۔ کیا یہ بات اپنی جگہ درست نہیں ہے کہ آپ قیامِ پاکستان سے قبل قادیانی تنظیم انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے صدر نہیں رہے۔ کیا یہ بھی غلط ہے کہ ربوہ میں قادیانی سربراہوں سے آپ کی ملاقاتیں بالالتزام ہوتی رہیں۔ کیا اس حقیقت کا انکشاف بھی بے موقع نہ ہوگا کہ لاہوری قادیانیوں کا ترجمان ہفت روزہ "لاہور" آپ ہی کے پریس پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپتا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود آپ کو مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال کا محافظ اور ترجمان و خدمت گار سمجھا جائے کیا اسی اقبال کا! جنہوں نے اپنے خطبات میں فرمایا تھا کہ "قادیانی اسلام اور وطن دونوں کے غدار ہیں"[1]۔ "قادیانیت یہودیت کی طرف رجوع ہے"[2]۔

اور آپ ابھی تک انہیں غداروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ایں چہ بوالعجبی است

والسلام

محمد عمر فاروق (تلہ گنگ۔ ضلع چکوال)

ہفت روزہ ختم نبوت ۱۰ اپریل ۱۹۹۰ء

۱۔ پنڈت نہرو کے نام خط ۲۱ جون ۱۹۳۶ء

۲۔ حرف اقبال صفحہ ۱۱۵

ہفتہ وار "پیام" اور مولانا آزاد

ڈاکٹر فیروز احمد

مولانا آزاد نے اپنی طویل صحافتی زندگی میں جن اخبارات و رسائل کی ادارت کی یا جن اخبارات کے اجرا میں بنیادی کردار ادا کیا، اُن کی فہرست لمبی ہے، لیکن اس فہرست میں چار اخبارات ایسے ہیں جو تحریک آزادی کے ایک خاص موڑ پر بہت کم وقفے سے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ اور جن کی مجموعی مدتِ اشاعت دس برسوں سے زیادہ نہیں۔ یہ اخبارات ہیں: پیغام۔ الجامعہ۔ البلاغ (دورِ ثانی) اور پیام۔ ان میں پیغام ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء، الجامعہ یکم اپریل ۱۹۲۳ء اور البلاغ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو منظرِ عام پر آیا اور یہ تینوں بالترتیب ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء، مارچ ۱۹۲۴ء اور ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو شائع ہو کر بند بھی ہو گئے۔

ان میں البلاغ سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو پیغام اور الجامعہ کے ساتھ مولانا آزاد کی وابستگی اس ڈائریکٹر کی ہے جو پس پردہ رہ کر اپنے منصوبوں کو قوت سے فعل میں لاتا ہے، دوسرے لفظوں میں پیغام اور الجامعہ سے مولانا آزاد کا تعلق ان اخبارات کی پالیسی کے نگراں اور محافظ کا تھا اور جب تک ان کی اشاعت جاری رہی یہ اخبارات مولانا آزاد کی مرتب کردہ پالیسی کے پابند رہے۔ تقریباً یہی صورتِ حال پیام کی بھی ہے، جس کی تقریب کے سلسلے میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، لیکن قبل اس کے کہ 'پیام' کی اشاعت اور مولانا آزاد کی اس سے وابستگی کے متعلق تفصیلات پیش کی جائیں، ایک ضمنی لیکن بے حد اہم پہلو کی طرف توجہ ضروری ہے۔

شعبۂ اُردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی جے پور

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ الہلال کے اجرائے ثانی اور پھر اس کے بند ہو جانے کے بعد مولانا آزاد صحافت سے دور ہو گئے تھے، یہ خیال درست نہیں ہے، الہلال کا دورِ ثانی جس شان سے شروع ہوا، اس کا اختتام بلاشبہ اتنا ہی حیرت انگیز ہے، لیکن اس حقیقت سے عام طور پر لوگ واقف نہیں کہ الہلال کے بند ہو جانے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد مولانا آزاد نے دہلی سے ایک نیا اخبار 'اقدام' جاری کرنے کا اعلان کیا تھا، یہ اعلان کب اور کس اخبار میں شائع ہوا اور اس کی اصل عبارت کیا تھی، ان سب کا تو علم نہیں لیکن دہلی سے ہی عبدالوحید نامی ایک شخص کا مراسلہ تاج (آگرہ) میں شائع ہوا تھا جس کے مطالعہ سے مذکورہ اعلان کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے مراسلہ نگار نے لکھا ہے:۔

"سنا گیا تھا اور اعلان بھی ہو چکا تھا کہ مولانا ابوالکلام 'اقدام' کے نام سے ایک نیا اخبار دہلی سے نکالنے والے ہیں، مگر اخبار اب تک نہیں نکلا اور مولانا بدستور کانگریس کے کاموں میں مصروف ہیں جو غالباً دسمبر تک ختم نہ ہو سکیں گے۔ ایک رہنمائے قوم کا اعلان کر کے اس طرح خاموش ہو جانا تعجب خیز ہے۔ اس وقت ہمدرد کے بند ہو جانے کے بعد 'اقدام' کی سخت ضرورت ہے۔[1]"

اس مراسلے میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ اعلان کسی غیر معروف شخص کی طرف سے نہیں بلکہ 'رہنمائے قوم' یعنی مولانا آزاد کی جانب سے کیا گیا تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ 'اقدام' کی اشاعت کے لئے انتخاب دہلی کا کیا گیا تھا۔ اب یہ 'اقدام' شائع ہوا یا نہیں، فی الوقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے، لیکن اس جانب توجہ ضروری ہے کہ جن ایام میں 'اقدام' کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا، ان دنوں مولانا آزاد کا قیام زیادہ تر دہلی میں ہی تھا، اور ان کی سیاسی سرگرمیاں روز افزوں تھیں، اس کا اندازہ خود مراسلہ نگار کو بھی تھا، مگر اس نے یہ چبھتی ہوئی بات لکھ دی تھی کہ "ایک رہنمائے قوم کا اعلان کر کے اس طرح خاموش ہو جانا تعجب خیز ہے" یہ ایک بڑی بات تھی اور نہ صرف اس زمانے میں سیاسی حالات سے باخبر اشخاص بلکہ آج بھی مولانا آزاد کے تقریباً تمام ناقدین اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ رانچی کی نظربندی سے رہائی کے بعد مولانا آزاد نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لینے کا فیصلہ کیا

---

[1] تاج ص ۱۶، مطبوعہ ۷، جون ۱۹۲۶ء

مگر یہ سیاست سے زیادہ دینی فرض کی ادائیگی کا جذبہ تھا جو مولانا آزاد کو ایک بار پھر سیاست کی راہ پر لے آیا۔ ۱۹۱۹ء تک وہ اس راہ پر چل کر بہت دور آچکے تھے، ان کے عزم وارادے اور تیز اصابت رائے نے ساتھ چلنے والوں کے دلوں میں انکے لئے عزت واحترام کا جو جذبہ پیدا کیا، اسکا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جولائی ۱۹۲۹ء میں وہ نیشنلسٹ پارٹی کے صدر اور اس کے اگلے ہی سال کانگریس کے قائم مقام صدر منتخب ہوئے۔ اس زمانہ تک تحریکِ آزادی جن مراحل میں داخل ہو چکی تھی، اس کا مزید اندازہ اس سے ہوگا کہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں 'مکمل آزادی' کی تجویز منظور ہو چکی تھی اور یہ فیصلہ بھی کیا جاچکا تھا کہ ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو پورے ملک میں 'یوم آزادی' منایا جائیگا۔ اس طرح قائم مقام صدر کی حیثیت سے مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات دوچند تھیں، بقولِ شاعر؂

اس وقت ہیں آپ مسند آرائے وطن
اور آپ کے قبضہ میں ہے فردائے وطن
کچھ سوچئے تدبیر سکونِ منزل
اترے گا کہاں محملِ لیلائے وطن

اس پس منظر میں تاج کی ایک چھوٹی سی خبر ملاحظہ فرمایئے:

"دہلی۔ ۱۱ر اگست، مولانا ابوالکلام آزاد صدر انڈین نیشنل کانگریس آج صبح پنجاب میل سے کلکتہ روانہ ہوگئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا دفتر اب کلکتہ میں رہے گا۔" [1]

الہلال بند ہو چکا تھا۔ 'اقدام' اعلان کے باوجود اگست ۱۹۲۹ء تک نہیں نکل سکا اور مولانا آزاد بعض سیاسی اسباب کی بنا پر دہلی سے کلکتہ منتقل ہوگئے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نئے اخبار یا رسالے کے نکالنے کا ارادہ انہوں نے ترک نہیں کیا، خصوصاً اس صورت میں کہ اب وہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے قائم مقام صدر بھی تھے۔ چنانچہ وہ اسباب موجود تھے، جن کے پیشِ نظر ایک نیا اخبار نکالا جاسکتا تھا۔ یہی اخبار مولانا آزاد کی کلکتہ آمد کے بعد 'پیام' کی صورت میں سامنے آیا۔

اس مقام پر ان غلط بیانیوں کی طرف توجہ ضروری ہے، جو 'پیام' کے متعلق اب تک رائج ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ابوسلمان شاہجہاں پوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

۱۔ ...مولانا آزاد نے ۱۹۲۷ء میں 'پیام' کے نام سے ایک اخبار کلکتہ سے جاری کیا تھا۔

---

[1] تاج ص ۱۱، ۱۴ر اگست ۱۹۳۰ء

اس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری کا خیال ہے کہ "پیام جنوری ۱۹۲۷ء کے بعد نکلا اور جون ۱۹۲۷ء میں جب الہلال نکلا تو پیام اس سے پہلے بند ہو چکا تھا۔[1]"

ابو سلمان شاہجہاں پوری اور ان کی تائید میں ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ کہنا کہ پیام جنوری ۱۹۲۷ء کے بعد نکلا اور جون ۱۹۲۷ء میں الہلال کے اجرا۔۔۔ سے قبل بند ہو چکا تھا، صریحاً غلط ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ پیام کے مدیر عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ اس قسم کے بیانات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ابو سلمان شاہجہاں پوری کی نظر سے پیام کا ایک بھی شمارہ نہیں گذرا اور انہوں نے غیر محققانہ طور پر ایک ایسا فیصلہ صادر کر دیا جس کی صحت ہر لحاظ سے مشکوک ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پیام کا اجرا الہلال کے بند ہو جانے کے تقریباً ۲ برس بعد عمل میں آیا، اس درمیان جیسا مذکور ہوا، دہلی سے 'اقدام' نکالے جانے کا اعلان ہو چکا تھا، مگر بعض وجوہ سے 'اقدام' کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی، لیکن بعد ازاں اقدام کا نعم البدل پیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔

پیام کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا، اس کا قطعی جواب دینے سے قبل درج ذیل 'اشتہار' کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ منیجر پیام کی جانب سے اخبارات کو جاری کیے گئے اس اشتہار میں کہا گیا ہے کہ:

> "پیام ہفتہ وار مصور ملک کے مشہور اخبار نویسوں کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مرحوم پیغام اور الہلال کو جو قلم مرتب کرتے تھے، وہی اب 'پیام' کے صفحات پر گل افشانی کر رہے ہیں، اگر آپ کو اخبار بینی کا صحیح ذوق ہے تو 'پیام' بہت پسند آئے گا۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ 'پیام' آزادی کا علم بردار اور اعلانِ حق میں بیباک ہے۔ ہر اشاعت میں مزین تصاویر کے ساتھ نہایت مفید اور دلچسپ مضامین شائع ہوتے ہیں۔
>
> پتہ منیجر پیام نمبر ۱، تاراچند اسٹریٹ کلکتہ"[2]

پیام کے اس اشتہار سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہفتہ وار مصور اخبار تھا اور اس کی ادارت میں پیغام اور الہلال کے مرتبین شامل تھے۔ (پیغام کے مرتب مولانا ملیح آبادی اور الہلال کے مرتب خود مولانا آزاد تھے) دوسرے لفظوں میں اشتہار بالا کی رو سے پیام کی ترتیب و تہذیب میں دونوں اہل قلم شریک

۱؎ مولانا آزاد شخصیت اور کارنامے ص ۱۱۰، ناشر اردو اکیڈمی دہلی ۱۹۸۶ء۔ ۲؎ تماشا ص ۱۸۱۔ ۷ و ۱۴ جون ۱۹۳۱ء۔

تھے، یہ اگرچہ قرینِ قیاس ہے لیکن پیام کے جو شمارے اس وقت پیشِ نظر ہیں اور جن کی تفصیلات حسبِ موقع درج کی جائیں گی۔ ان پر نہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا نام ہے اور نہ ہی مولانا آزاد کا۔ اس کے برخلاف ایک غیر معروف شخص ملّا جان محمد کا نام بطور ایڈیٹر جلد ۲ کے شمارہ نمبر ۱۰ مطبوعہ ۱۶ر مارچ ۱۹۲۳ء پر تحریر ہے اور اس سے قبل یعنی جلد ۲ کے شمارہ ۹ مطبوعہ ۹ر مارچ ۱۹۲۳ء پر یہ نام بھی موجود نہیں، چونکہ پیام کے مذکورہ دونوں شماروں کے علاوہ مجھے ماقبل یا مابعد کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ پیام کے ابتدائی شماروں پر بطور مدیر کس کا نام درج تھا۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری نے اس سلسلہ میں قطعیت کے ساتھ عبدالرزاق ملیح آبادی کو پیام کا مدیر قرار دیا ہے لیکن مندرجہ بالا اشتہار کی رو سے اس بیان میں قباحت یہ ہے کہ جو دلیل مولانا عبدالرزاق کے مدیر ہونے کے حق میں دی جا سکتی ہے اس کا اطلاق مولانا آزاد کے سلسلہ میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب کسی اخبار یا رسالے کے مدیر کی تعداد بیک وقت دوؔ تو ہو نہیں سکتی، اس لئے پیام کے ابتدائی ۹ر شماروں تک ادارت کے فرائض کس نے انجام دیئے، یہ مسئلہ پھر بھی تحقیق طلب ہے۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ پیام ہفتہ وار مصوّر اخبار تھا، اس کے جو دو شمارے فی الوقت ہمارے پیشِ نظر ہیں، وہ اردو ریسرچ سینٹر حیدر آباد میں موجود ہیں۔ میں ذاتی طور پر عبدالصمد صاحب مالک اُردو ریسرچ سینٹر حیدر آباد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس سے استفادے کا موقع عنایت فرمایا۔

پیام کے یہ دونوں شمارے مارچ ۱۹۲۳ء کی ۹ر اور ۱۶ر تاریخ کو شائع ہوئے۔ ان تاریخوں کو ذہن میں رکھا جائے تو بقیہ ۸ر شمارے جنوری اور فروری میں شائع ہوئے ہوں گے اور اس اعتبار سے جنوری ۱۹۲۳ء کو بہ آسانی پیام کی اشاعت کا سال قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس میں ایک بڑی الجھن یہ ہے کہ جو شمارے اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں ان پر جلد ۔۲، تحریر ہے اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ پیام کا اجرا جنوری ۱۹۲۳ء سے قبل عمل میں آیا؟ مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ پیام ہفتہ وار اخبار ضرور تھا، مگر اس کی اشاعت وقتِ مقررہ پر اور مسلسل نہیں تھی یعنی اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ مارچ کے مذکورہ شماروں سے قبل پیام کے بعض شمارے وقت پر نہ نکل سکے ہوں۔ مثلاً اگر جنوری ۱۹۲۳ء کو پیام کی اشاعت کا سال قرار دیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جنوری کی ۷ر ۱۴ر ۲۱ر اور ۲۸ر کو پیام شائع ہوا ہوگا، مگر شواہد کی روشنی میں ایسا نہیں ہے۔

۱۶ر مارچ ۱۹۳۱ء کو پیام میں 'بصائر' کے تحت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی کسی غیر مطبوعہ تصنیف کے کچھ حصّے "مسلمانوں سے وعدۂ الٰہی کس صورت میں پورا ہوگا" کے عنوان سے شائع کرتے ہوئے ایڈیٹر ملّا جان محمد نے جو مختصر نوٹ تحریر کیا ہے، اس کی ابتدائی سطور ہی قابل لحاظ ہیں، ایڈیٹر نے لکھا ہے:

"۱۸ر جنوری کے پیام میں ملیح آبادی صاحب کی ایک قلمی کتاب کے بعض حصّے شائع کیے گئے تھے، جن میں صرف کلام اللہ کی آیات کا ترجمہ تھا۔[1]"

اسی طرح ۹ر مارچ ۱۹۳۱ء کے شمارے میں "پیام کی قیمت میں تخفیف" کا اعلان کرتے ہوئے ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ:۔

"جب سے 'پیام' کی قیمت میں اضافہ کیا گیا ہے، بکثرت بھائی التجا کر رہے ہیں کہ قیمت کم کی جائے کیونکہ انھیں ۲ آنہ ادا کرنا شاق گذرتا ہے، اس طرح کی درخواستیں کلکتہ سے لیکر پشاور تک سے آئی ہیں، مجبوراً فیصلہ کیا گیا ہے کہ قیمت کم کر کے حسب سابق ایک آنہ کر دیا جائے اور صفحے بھی ۱۶ر کر دیئے جاتیں۔ ہم نے یہ قربانی قبول کرلی ہے۔

اب قارئین کے ذمّہ ہے کہ دفتر کی مالی مشکلات کا خاتمہ نئے خریدار بہم پہنچا کر کر دیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ جلد اسی قیمت کے صفحات بڑھا دیں۔[2]"

اس ضمن میں پیام کے معاصر تاج میں شائع شدہ ایک اشتہار کا مطالعہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا یہ اشتہار پیام کے 'عید نمبر' سے متعلق ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:۔

"پیام کا عید نمبر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوگا، جس میں علاوہ صدہا مختلف دلچسپ مضامین کے تقریباً آٹھ صفحوں پر بے شمار رنگین تصاویر اور نظر فریب کارٹون شائع ہوں گے۔ یہ نمبر بہت بڑی تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ تاجر پیشہ حضرات کے لئے اپنی تجارت فروغ دینے کا یہ زرّیں موقع ہے۔[3]"

اب ان شواہد کا تجزیہ کیا جائے تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ جنوری کی مقررہ تاریخوں میں سے کم از کم ایک تاریخ ایسی ہے جب پیام وقت پر شائع نہیں ہوا، ۹ر اور ۱۶ر مارچ کے پیام کی صورت بھی یہی ہے۔

---

[1] پیام ص ۶، نمبر ۱۰، جلد ۲، ۱۶ر مارچ ۱۹۳۱ء۔ [2] پیام ص ۳۔ نمبر ۹، جلد ۲۔ ۹ر مارچ ۱۹۳۱ء۔
[3] تاج ص ۱۸، ۲۸ر جنوری ۱۹۳۱ء۔

۲۔ کسی ایسے اخبار کا جو وقت مقررہ پر کم نکلتا ہو، اس کی قیمت میں اضافہ کرنا اور پھر قارئین کے اصرار پر نہ صرف قیمت میں کمی کا اعلان کرنا بلکہ اخبار کے صفحات میں اضافے کا وعدہ بھی کرنا۔ اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ اخبار کو نام و نمود حاصل ہو چکا تھا۔

۳۔ اس نام و نمود کے ساتھ اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اخبار نے 'خاص نمبر' کا اعلان کیا اور تاجر پیشہ حضرات کو متوجہ کیا کہ وہ اخبار میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں[۱]۔ واضح رہے کہ یہ اشتہار اواخر جنوری میں شائع ہوا تھا۔ اگر اس سے پیشتر اخبار ہم عصر صحافت میں اپنی جگہ نہ بنا چکا ہوتا تو چند شماروں کے بعد ہی کسی خاص نمبر کا اعلان بے معنی معلوم ہوتا۔

ان مباحث کی روشنی میں جنوری ۱۹۳۱ء میں پیام کا اجرا مشتبہ معلوم ہوتا ہے اور قیاس غالب ہے کہ اس کی اولین اشاعت نومبر کے وسط یا دسمبر[۲] کے اوائل میں عمل میں آئی ہوگی۔ اب اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو مارچ کے شماروں میں درج جلد۔۲، کی معنویت سمجھ میں آجاتی ہے۔ یعنی نومبر یا دسمبر میں اس کا جو شمارہ یا شمارے شائع ہوئے، انھیں جلد اول کے تحت شمار کیا گیا اور چونکہ جنوری سے نیا سال شروع ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کے بعد کے شماروں پر جلد۔۲ لکھا گیا۔

---

[۱] ۱۹ر مارچ کے پیام سے معلوم ہوتا ہے کہ 'پیام' کا عید نمبر اپنی خصوصیات کے لحاظ سے 'مقبول' ہو چکا تھا۔
[۲] ایک امکان یہ بھی ہے کہ اگست ۱۹۳۰ء میں مولانا آزاد کی گرفتاری سے قبل پیام جاری ہوا ہو اور گرفتاری کے بعد اس کی اشاعت میں دشواریاں پیدا ہو گئی ہوں۔

(نخلستان، جنوری۔ مارچ ۹۳ء)

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

الفاظ "انجیل، تورات اور زبور" کی لغوی تحقیق

[ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ (۱۹۰۱ء - ۱۹۷۹ء) ماضی قریب کے ان اہل علم میں سے تھے جو اپنی علمی زندگی کے آغاز میں ہی "ہفت زبان" عالم کی حیثیت سے معروف ہو گئے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ وہ مغربی زبانوں میں سے انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور ہسپانوی جانتے تھے۔ ان مغربی زبانوں کے علمی سرمائے سے انہوں نے نہ صرف اپنی تحقیقی کاوشوں میں استفادہ کیا بلکہ ان زبانوں میں شائع شدہ بعض مقالات کو اردو میں بھی منتقل کیا۔ اطالوی مستشرق پرنس کاستانی کی مرتبہ "تاریخ اسلام" کا دیباچہ ان کی کاوش سے ہی اردو دان طبقہ پڑھ سکا تھا۔

مشرق و مغرب کی متعدد زبانیں جاننے کے باعث انہیں الفاظ کی تحقیق اور اشتقاق سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا اظہار یوں تو ان کی اکثر تحریروں سے ہوتا ہے تاہم زندگی کے آخری آٹھ دس برسوں میں یہ موضوع، بالخصوص، ان کے غور و فکر کا مرکز رہا۔ فروری تا ستمبر ۱۹۷۰ء کے "اورینٹل کالج میگزین" (پنجاب یونیورسٹی - لاہور) میں ان کا ایک طویل مقالہ "تحقیق اللغات" شائع ہوا، جو بعد میں حذف و اضافہ اور ترتیب کی مناسب تبدیلیوں کے ساتھ ماہنامہ فکر و نظر (اسلام آباد) [بابت دسمبر ۱۹۷۱ء و جون ۱۹۷۲ء] میں اشاعت پذیر ہوا۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے مزید الفاظ کی لغوی تحقیق اور اشتقاق کا کام جاری رکھا اور اس سلسلے کا ایک اور مضمون فروری و مئی ۱۹۷۶ء کے "اورینٹل کالج میگزین" میں پہلے مقالے کے تکملہ و تتمہ کے طور پر شائع ہوا۔

ماہنامہ "فکر و نظر" میں شائع شدہ مقالے میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے ابتداً مفسرین کرام کے درمیان موجود اس اختلاف نظر پر بحث کی ہے کہ آیا قرآن مجید میں عجمی زبانوں کے قرآنی الفاظ موجود ہیں یا نہیں اور پھر عجمی زبانوں کے ۲۴ الفاظ کی لغوی تحقیق پیش کی ہے۔ آئندہ صفحات میں

ڈاکٹر مرحوم کے مقالے کا ابتدائی حصہ اور تین الفاظ — انجیل، تورات اور زبور — کے بارے میں ان کی تحقیق پیش کی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں عجمی الفاظ کے استعمال کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے، تعصب سے خالی نہیں۔ غیر مسلم مستشرقین کے تعصب کی کیفیت تو دوسری ہے، خود مسلمان اہل علم بھی بعض اوقات زبان کے تعصب کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس موضوع پر متعدد کتب اور مقالات لکھے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

* آرتھر جیفری، The foreign Vocabulary of the Quran، بڑودہ: اورینٹل انسٹی ٹیوٹ (١٩٣٦ء)
* شوکت سبزواری، قرآن میں عجمی الفاظ، ماہنامہ فکر و نظر (اسلام آباد)، اپریل ١٩٧٢ء، ص ٦٦٣ - ٦٧٣
* علی محسن صدیقی، قرآن میں غیر عربی الفاظ کی حقیقت، ماہنامہ چراغ راہ (کراچی)، مئی ١٩٦٨ء، ص ٤٣ - ٥٣ — مدیر]

آیا قرآن شریف میں عجمی الفاظ پائے جاتے ہیں یا وہ "عربی مبین" ہونے کی حیثیت سے غیر زبانوں کے الفاظ سے بالکل پاک ہے، اس مسئلہ پر آئمہ اسلام دو گروہوں میں منقسم ہیں اور انھوں نے اپنی اپنی رائے کے حق میں بہت سے دلائل دیے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عکرمہ اور مجاہد اس بات کے قائل تھے کہ قرآن پاک میں عجمی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور انھوں نے متعدد الفاظ مثلاً سجیل، مشکوٰۃ اور یم کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ عجمی ہیں۔ بعض دیگر مفسرین بھی اس بات میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے کہ قرآن میں عجمی الفاظ کے وجود کا اعتراف کریں۔ کیوں کہ ان کی یہ رائے ہے کہ جو عجمی الفاظ معرب بن جائیں اور عربی قالب میں ڈھال لیے جائیں، ان کا استعمال مخلِ فصاحت نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ عسیر الفہم نہیں رہتے بلکہ قریب الفہم بن جاتے ہیں۔

لیکن اس قول کے برعکس بہت سے آئمہ مثلاً امام شافعی، امام ابن جریر طبری، ابو عبیدہ، معمر بن مثنیٰ، قاضی ابو بکر باقلانی اور ابن فارس قزوینی (م ٣٩٥ھ) قرآن پاک میں عجمی کلمات کے منکر ہیں۔ ان کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اس کی زبان "عربی مبین" ہے اور وہ ایسی واضح زبان میں نازل ہوا ہے کہ جس کو عرب لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔

انّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (الزخرف: ٣)

اس کے علاوہ خداوند کریم فرماتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: ٤)

ان کے دیگر ہم خیال علماء نے بھی یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن میں عجمی الفاظ کے وجود کو تسلیم کرنے سے عربی زبان پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ ناقص اور نامکمل ہے اور آسمانی پیغام کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے اپنے پیغام کے لیے ایسی زبان اختیار کی جو سب زبانوں سے

ہے اور لوائے مطلب کے لیے نبطی، فارسی اور سریانی زبانوں کی محتاج نہیں ہے۔ ابن فارس لکھا ہے کہ "اگر قرآن میں غیر عربی الفاظ آئے ہیں تو اس سے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ عربی دیگر زبانوں مقابلہ میں نامکمل ہے۔"

امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ کی تفسیر میں جو یہ کہا گیا ہے کہ عباسؓ اور دوسرے مفسروں نے بعض الفاظ کو فارسی اور بعض کو حبشی یا نبطی بتایا ہے، تو در اصل یہ کا توارد اور توافق ہے یعنی عربوں، ایرانیوں اور حبشیوں نے یکساں الفاظ کو اتفاقاً استعمال کیا ہے امام ممدوح کی یہ توجیہ تسلی بخش نہیں ہے کیوں کہ سینکڑوں الفاظ کے متعلق متعدد قوموں کا توارد اور قیاس کے خلاف ہے۔

ابو منصور ثعالبی (م ۴۲۹ھ) نے کتاب الجواہر میں اس مسئلہ کو یہ کہہ کر سلجھانے کی کوشش کی ہے

"قرآن مجید "مبین" یعنی صاف اور واضح زبان میں نازل ہوا ہے اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو عربی نہ ہو یا جسے کسی غیر زبان کی مدد کے بغیر سمجھا نہ جا سکے۔ قدیم عربوں کے شام اور حبشہ کے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے اور وہ ان ملکوں کا سفر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے عجمی کلمات اخذ کر لیے لیکن ان میں کچھ تبدیلیاں کر دیں مثلاً بعض حروف کو گرا دیا اور بعض عجمی الفاظ میں جو ثقالت تھی، اسے دور کیا اور پھر ان الفاظ کو اپنی شاعری اور گفتگو میں استعمال کیا۔ چنانچہ اس طرح سے وہ الفاظ خالص عربی الفاظ کی مثل بن گئے اور ان کے لٹریچر کے علاوہ قرآن میں بھی استعمال ہوئے۔ لہذا حقیقت یہ ہے کہ الفاظ پہلے عجمی تھے لیکن جب عربوں نے ان سے کام لیا اور ان کو معرب بنا لیا تو وہ الفاظ عربی بن گئے۔"

امام جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے بھی تقریباً اسی رائے کا اظہار کیا ہے اور "اتقان" میں اس ث کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے۔"

"میرے نزدیک صحیح رائے وہ ہے جس سے دونوں قولوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ الفاظ اپنی اصل کے لحاظ سے عجمی ہیں لیکن جب وہ عربوں کے استعمال میں آئے اور انھوں نے ان کو معرّب بنا لیا اور ان کو تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صورت دے دی تو وہ الفاظ عربی بن گئے اور

جب قرآن نازل ہوا تو یہ الفاظ عربوں کے کلام میں مخلوط ہو چکے تھے۔ لہذا جو شخص یہ بات کہے کہ یہ الفاظ اپنی موجودہ معرّب صورت میں عربی ہیں، تو وہ بھی سچا ہے اور جو شخص یہ کہے کہ وہ الفاظ اپنے اصل ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں تو وہ بھی سچا ہے۔"

ابو منصور جوالیقی (م ۵۳۹ھ) اور ابن الجوزی بغدادی (م ۵۹۸ھ) اور دیگر علماء کے اقوال بھی اسی کے قریب قریب ہیں۔

یل، تورات اور زبور ایسے قرآنی الفاظ ہیں] --- جن کے متعلق اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ ۂ اصلی ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن معرّب بننے کے بعد عربی زبان کا جزو بن گئے ہیں اور قرآن ۔ نے ان کو جس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول ﷺ

کے اولیں مخاطب ان کے مفہوم و معنی سے بخوبی واقف تھے اور ان کا استعمال قرآن پاک کی زبان کے "مبین" ہونے میں کسی طرح حارج و حائل نہ تھا۔

انجیل

قرآن مجید کی رو سے انجیل وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ؑ کو عطا فرمائی تھی۔ انجیل کا لفظ قرآن پاک کی چھ مختلف سورتوں میں بارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ المائدہ میں انجیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ

(ہم نے ان انبیاء کے بعد قدم بقدم حضرت عیسیٰ فرزند مریم کو بھیجا۔ جس نے پیش نظر تورات کی تصدیق کی اور ہم نے اسے انجیل دی۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔)

قرآن پاک کے باقی مقامات میں بھی جہاں کہیں انجیل کا ذکر آیا ہے، اسی طور پر ایک الہامی کتاب کی حیثیت سے آیا ہے۔ لیکن جو انجیل آج کل عیسائیوں کے ہاں متداول ہے، وہ ایک انجیل نہیں بلکہ چار الگ الگ کتابیں ہیں جن میں سے ہر ایک انجیل کہلاتی ہے اور اپنے مؤلف کی طرف منسوب ہے۔ ان اناجیل اربعہ کو متی، مرقس، لوقا اور یوحنا نے (علماء مغرب کی تحقیق کے مطابق) حضرت مسیح ؑ کے تقریباً ایک سو سال بعد تالیف کیا تھا۔ ان میں حضرت عیسیٰ ؑ کی زندگی کے چند متفرق واقعات اور ان کے معجزات و کرامات کا ذکر آیا ہے۔ اور ان کے علاوہ ان کی تعلیم و تلقین بھی شامل ہے جو بیشتر وعظ و نصیحت کی صورت میں ہے اور جس میں پہاڑی والے وعظ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

بعض عرب علماء نے [لفظ] انجیل کو عربی قرار دیا ہے اور اسے مادہ "نجل" سے مشتق کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن قاضی بیضاوی نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔ ابو منصور جوالیقی اور شہاب الدین احمد خفاجی نے بھی انجیل کو معرب بتایا ہے لیکن انہوں نے اس عجمی لفظ کی نشان دہی نہیں کی جس کی تعریب کی گئی ہے۔ ابو السعادات ابن الاثیر جزری نے "النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر" میں لکھا ہے کہ یہ کلمہ عبرانی ہے یا سریانی یا عربی۔ علامہ زبیدی صاحب تاج العروس نے بھی علماء لغت کے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ انجیل کو عبرانی کہتے ہیں، بعض سریانی اور بعض عربی۔ لیکن انہوں نے اس بارے میں خود کوئی قطعی بات نہیں کہی۔ علماء لغت کے نزدیک قولِ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کسی غیر زبان کا لفظ ہے جسے معرب کیا گیا ہے لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے اور اس کی اصلی صورت کیا تھی۔

لفظ انجیل کے بارے میں مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دراصل یونانی کلمہ Euaggelion ہے جو عبرانی یا ارامی کے توسط سے عربی میں آیا ہے۔ اس کے لغوی معنی بشارت ہیں اور یہ حضرت عیسیٰ ؑ کی تعلیم اور ان کے پیغام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مروجہ اناجیل کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے پیغام کو آسمانی بشارت کہتے تھے جسے انہوں نے الجلیل اور فلسطین کے دیگر شہروں اور قوموں میں چل پھر کر سنایا اور اپنے حواریوں سے بھی کہا کہ "جاؤ اور لوگوں کو خوش خبری دو کہ آسمانی بادشاہت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔" لوقا کی انجیل (باب چہارم) میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام شہر ناصرہ میں یہودیوں کی عبادت گاہ میں گئے اور اشعیا نبی کی کتاب کھول کر یہ عبارت پڑھی کہ "خدا کی روح مجھ پر غالب ہے، کیوں کہ اس نے مجھ کو مسیح کہا تاکہ میں مساکین کو یہ بشارت سناؤں کہ اس نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں دل شکستہ لوگوں کو شفاء دوں، اسیروں کی آزادی کی منادی کروں، جو اندھے ہیں ان کو بینائی عطا کروں اور جو مظلوم ہیں ان کو آزاد کروں۔" چوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی تعلیم اور اپنے پیغام کو بشارت سے تعبیر کیا ہے، اس لیے وہ کتاب بھی جس میں ان کی سیرت اور ان کی تعلیم مدون اور محفوظ ہوئی، انجیل یعنی بشارت کہلائی۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اہل وطن کی زبان ارامی تھی، پھر ان کے پیغام کے لیے ایک یونانی لفظ کیوں مروج ہوا۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت مسیح کے زمانہ میں فلسطین اور مشرق وسطیٰ کے اکثر ملکوں میں کئی صدیوں سے یونانی ایک علمی زبان کی حیثیت سے رائج چلی آ رہی تھی اگرچہ قدیم یونانی قوم کی حکومت زوال پذیر ہو چکی تھی لیکن ان کے علوم کا سکہ جاری تھا اور ان کی زبان کا علمی تسلط بہت سے ملکوں پر ہنوز قائم تھا لہٰذا حضرت مسیح کے حواریوں اور مبلغوں نے اپنے دین کی اشاعت کے لیے اسی عالمگیر علمی زبان سے کام لیا چنانچہ اناجیل اربعہ جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات زندگی اور عقائد مندرج تھے، یونانی ہی میں لکھی گئیں اور چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے پیغام کو بار بار بشارت کہا تھا اس لیے وہ انجیل کے نام سے موسوم ہوئیں جس کے معنی خوش خبری کے ہیں۔

انگریزی زبان میں انجیل کے لیے گاسپل (Gospel) کا جو لفظ مستعمل ہے، اس کے معنی بھی بشارت ہیں۔ گاسپل گویا انجیل کا لفظی ترجمہ ہے۔ انگریزی لفظ Evangel بھی مذکورہ بالا یونانی کلمہ سے ماخوذ ہے چنانچہ اناجیل کے مؤلفین Four Evangelists کہلاتے ہیں۔

تورات

قرآن پاک کی رو سے تورات وہ الہامی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی۔

تورات کا لفظ قرآن پاک میں اٹھارہ مرتبہ آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں ہے۔

اِنَّا اَنزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيهَا هُدًى وَ نُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ اَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبّٰنِيُّونَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ

(ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ فرماں بردار پیغمبر اسی کے مطابق یہود کے مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں اور ان کے عالم اور فقیہ بھی جو اللہ کی کتاب کے نگہبان ہیں اور اس کے شاہد ہیں۔)

تورات ایک عبرانی لفظ ہے جس کے لغوی معنے شریعت یا قانون (Law) کے ہیں۔ انگریزی میں تورات کو Torah کہتے ہیں۔

ہمارے بعض علماء نے تورات اور انجیل کو وری اور نجل سے مشتق بتایا ہے لیکن علامہ زمخشری نے اس قول کو قبول نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں اور تکلف سے کام لے کر ان کو وری اور نجل سے مشتق بتانا اور ان کا وزن تفعلہ اور افعیل قرار دینا صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب یہ دونوں لفظ عربی ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً پندرہ سو سال پیشتر کا ہے۔ اس دوران میں بنی اسرائیل پر بہت سے مصائب آئے اور طاقتور ہمسایہ قوموں اور سلطنتوں نے ان پر کئی بار حملہ کیا اور ان کے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ ان انقلابات میں تورات بھی کئی بار برباد ہوئی لیکن بنی اسرائیل نے اسے ہر بار از سر نو مرتب کیا۔ علماء کا اندازہ ہے کہ تورات اپنی موجودہ صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً آٹھ سو سال پیشتر مرتب ہوئی تھی۔

جو تورات آج کل یہودیوں کے ہاں متداول ہے، وہ ذیل کی پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ سفر التکوین (کتاب پیدائش) جس میں پیدائش عالم سے لے کر حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے تک کے حالات مذکور ہیں۔

۲۔ کتاب الخروج جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور فرعون کے پنجۂ ستم سے نجات پانے کی کیفیت مندرج ہے۔

۳۔ الاویین

۴۔ العدد

۵۔ التثنیہ میں حضرت موسیٰ کی بقیہ زندگی کے حالات اور ان کی لائی ہوئی شریعت کی تفصیلات ہیں۔

مذکورہ بالا پانچ کتابوں کو انگریزی میں Books of Moses کہتے ہیں اور سورۃ اعلیٰ میں جن "صحفِ موسیٰ" کا ذکر آیا ہے ان سے شاید یہی کتابیں مراد ہیں۔ مغربی علماء کے ہاں ان کے لیے Pentatench کی اصطلاح بھی رائج ہے جس کے لفظی معنی "کتبِ خمسہ" ہیں۔

زبور

ازروئے قرآن مجید زبور وہ الہامی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد پر نازل کی تھی۔ قرآن پاک میں زبور کا ذکر حضرت داؤد کے تعلق سے تین بار آیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا یعنی ہم نے داؤد کو زبور دی۔ اور یہی الفاظ سورۃ النساء میں بھی آئے ہیں۔
اس کے علاوہ سورۃ الانبیاء میں بھی زبور سے ایک اقتباس منقول ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ
(اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھا ہے کہ بے شک زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔)

علامہ جوہری نے "صحاح" میں لکھا ہے۔ زبر کے معنی کتابت یعنی لکھنے کے ہیں اور زبر (کسرہ

کے ساتھ) کتاب کو کہتے ہیں، جس کی جمع زبور آتی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ زبور زبر (فتح کے ساتھ) سے مشتق ہے اور وہ فعول کے وزن پر ہے اور مفعول کے معنے میں آیا ہے۔

قرآن پاک میں جمع کا صیغہ زبر (ضمہ کے ساتھ) چند بار الہامی کتابوں کے معنے میں آیا ہے اور ان آسمانی نوشتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جن میں انسانی اعمال لکھے جاتے ہیں، لیکن اصطلاحی طور پر زبور سے مراد وہ الہامی کتاب ہے جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے یروشلم کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اس کے قریب صیہون (Zion) کی پہاڑی پر ایک عالی شان خیمہ نصب کیا جہاں قربانی دی جاتی تھی اور اللہ کی عبادت کی جاتی تھی۔ انہوں نے اس معبد میں خدا کی حمد و ثنا کے لیے سینکڑوں آدمی مقرر کیے۔ حضرت داؤد (خود بھی خوش گو تھے اور خدا کی تعریف میں ترانے گاتے تھے اسی لیے آج تک لحن داؤدی ضرب المثل ہے۔

آج کل یہود کے مقدس مذہبی نوشتوں میں داؤد کے ترانے بھی شامل ہیں جن میں خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء کی گئی ہے۔ ان کو عبرانی میں مزامیر داؤد اور انگریزی میں Psalms of David کہتے ہیں۔ ان مزامیر کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔

حواشی

۱۔ بحوالہ الاتقان للسیوطی، جلد اول ص ۲۱۵

۲۔ علمائے لغت کی اصطلاح میں معرّب کسی عجمی زبان کا وہ کلمہ ہے جسے عربی میں اختیار کرتے وقت حروف کی کمی بیشی یا تبدیلی کے بعد عربی قالب میں ڈھال لیا جائے اور اسے عربی الفاظ کی شکل و صورت دے دی جائے۔

۳۔ الاتقان فی علوم القرآن، فصل فیما وقع لغیر لغۃ العرب

عالم اسلام اور عیسائیت - جنوری ۱۹۹۳ء

سلیم الدین قریشی

"مرآۃ القدس" یا "داستانِ مسیح"

[مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی اور مذہبی آزاد خیالی و وسیع المشربی کی بنیاد پر گوا کے جیسوئٹ پادریوں کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی تاکہ ان کے مذہبی افکار سے آگاہ ہو سکے۔ معاصر مؤرخین نے اکبر کے دربار میں تین مسیحی جماعتوں کے آنے کا ذکر کیا ہے۔ پہلی جماعت ۱۵۸۰ء میں آئی، دوسری ۱۵۹۱ء اور تیسری ۱۵۹۵ء میں وارد ہوئی۔ تیسری اور آخری جماعت میں شامل پادری جیروم زیویر یا زیر نیموشویر (۱۵۴۹ء - ۱۶۱۷ء) اپنے علمی کام کی وجہ سے اہلِ تحقیق کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

یورپ کی "تحریکِ اصلاحِ مذہب" کے بالمقابل کیتھولک نقطۂ نظر کی تائید و تبلیغ کے لیے ۱۵۳۹ء میں اگنیشس لویولا (Ignatius Loyala) نے انجمنِ عیسوی (Society of Jesus) کی بنیاد رکھی تھی۔ اس انجمن کے ابتدائی کارکنوں میں ایک شخص فرانسس زیویر تھا جو ۱۵۴۲ء میں ہندوستان آ گیا تھا۔ اس نے گوا میں تبلیغ و اشاعتِ مسیحیت کی خاطر سینٹ پال کالج کی بنیاد رکھی۔ فرانسس زیویر کے خاندان میں جو دوسرا اہم مشنری پیدا ہوا وہ جیروم زیویر (یا زیر نیموشویر) تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ فرانسس زیویر کی بہن کا پوتا (یا نواسا) تھا۔[1]

زیر نیموشویر پرتگال کے ایک قصبے نور میں پیدا ہوا تھا۔ انیس برس کی عمر میں "انجمنِ عیسوی" کا باقاعدہ رکن بن گیا تھا۔ فلسفہ اور مسیحی دینیات کے مطالعہ کے بعد ۱۵۸۱ء میں گوا آیا۔ ابتداءً کوچین میں مقیم رہا، بعد میں گوا میں انجمن کی شاخ کا افسرِ اعلیٰ اور نائب پروونشل مقرر ہو گیا۔ تقریباً بیس برس (۱۵۹۵ء - ۱۶۱۴ء) آگرہ اور لاہور میں مغل دربار سے منسلک رہا۔ واپس گوا جانے پر کرانگانور کا معاون آرچ بشپ بنا اور گوا میں فوت ہوا۔

زیر نیموشویر نے اپنے ذوقِ تبلیغ اور جلال الدین اکبر اور اس کے جانشین کے "مذہبی مزاج" کے پیشِ نظر مسیحیت اور اس کی تعلیمات پر چند کتابیں لکھیں جو فارسی میں منتقل کی گئیں اور اکبر کو پڑھ کر سنائی گئیں۔ زیر نیموشویر کی حسبِ ذیل ترجمہ شدہ کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

۱۔ مرآۃ القدس یا داستانِ مسیح

۱۶۰۲ء میں پرتگیزی زبان سے فارسی میں منتقل کی گئی اور اسی سال اکبر کی خدمت میں پیش کی

گئی۔ اکبر کو پیش کردہ نسخہ جس پر اکبر کی مہر اور شویر کے دستخط ثبت ہیں، بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے، تاہم اس کے متعدد نسخے دنیا کے دوسرے کتب خانوں میں ملتے ہیں۔[۲] ایک مصور مگر ناقص نسخہ عجائب خانہ لاہور میں موجود ہے۔ اس کے پہلے ورق کے پہلے صفحے پر اکبر کی مہر ہے۔ اس صفحے کی باقی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی خاندان کے افراد کی نظر سے گزرتا رہا ہے۔[۳]

مراۃ القدس کا ایک نسخہ ہالینڈ کی لیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیو (Ludovico De Dieu) کے ہاتھ لگا تو انہوں نے اسے لاطینی میں منتقل کر دیا۔ پروفیسر ڈیو ۱۶۳۵ء سے ۱۶۴۰ء تک لیڈن یونیورسٹی میں عربی اور فارسی زبانوں کے استاد تھے۔ مراۃ القدس کا فارسی اور لاطینی ترجمہ، جناب ظہیر الدین قریشی کی تحقیق کے مطابق "یورپ میں فارسی رسم الخط میں شائع ہونے والی کتابوں میں قدیم ترین" ہے۔[۴]

جناب قریشی نے "مراۃ القدس" یا "داستانِ مسیح" کے فارسی اور پھر لاطینی ترجمے پر اپنی تحریر میں روشنی ڈالی ہے جس کا متعلقہ حصہ زیرِ نظر شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۲۔ آئینۂ حق نما

اس کتاب کا ملخص "منتخب آئینۂ حق نما" کے نام سے ملتا ہے۔

۳۔ آداب السلطنت (تالیف ۱۶۰۹ء، نورالدین جہانگیر کے نام معنون ہے۔)

۴۔ "داستانِ احوالِ حواریاں" یا "وقائع حواریانِ دوازدہ گانہ"

زیرِ نیمو شویر پرتگیز تھا اور اس نے جملہ کتابیں اپنی مادری زبان ہی میں تالیف کی تھیں جنہیں عبدالستار بن قاسم لاہوری نے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ عبدالستار بن قاسم لاہوری کون تھے؟ ان کے کارنامۂ حیات کے بارے میں معلومات از حد محدود ہیں۔ عبدالستار بن قاسم نے پادری شویر سے پرتگیزی زبان سیکھی اور شاید پادری شویر کو فارسی سیکھنے میں مدد دی۔ پرتگیزی زبان سے ترجمہ شدہ "ثمرۃ الفلاسفہ" میں انہوں نے لکھا ہے کہ[۵]

> پادری شویر دانایانِ فرنگ میں سے برگزیدہ شخص حال ہی میں دربار میں آیا ہے۔ اس سے [پرتگیزی] زبان سیکھنا شروع کی۔ اقبال روز افزوں یاور ہوا۔ چھ مہینے میں اس زبان کے مطالب علمی و عملی سمجھنے کی طاقت آ گئی۔ بات چیت کم کرنے اور شغلِ ترجمہ کی وجہ سے اس زبان میں گفتگو کی مہارت نہیں ہوئی ہے۔

"ثمرۃ الفلاسفہ" یا "احوالِ فرنگستان" میں یونان اور روم کے حالات اور وہاں کے فلسفیوں کے افکار پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مخطوطات متعدد کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔[۶] جان رائے لینڈز

مانچسٹر کے کتب خانے کے نسخے کے سرورق پر ایک تحریر ہے جس میں عبدالستار کو "تاریخ فرشتہ" کے مصنف محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ کا فرزند بتایا گیا ہے۔

پادری شویر کی تالیفات اور "ثمرۃ الفلاسفہ" کے تراجم کے علاوہ عبدالستار بن قاسم لاہوری نے شرف الدین علی یزدی کی تالیف "ظفر نامہ" کی تلخیص بھی کی ہے۔ مدیر

ی

دری برکت اللہ نے پادری شوبر کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس کا باپ مقدس فرانسس زیویر کا
" تھا۔ دیکھیے: پادری برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، لاہور، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی
۱۹ء)، ص ۱۷۶

تفصیل کے لیے دیکھیے: سی۔ اے۔ اسٹوری Persian L:terature: A
Bio-bibliographichal Sur جلد ۱، حصہ ۱، لندن: دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف
ٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ (۱۹۷۰ء)، ص ۱۲۳ - ۱۲۵، جلد ۱، حصہ ۲، لندن: لُزاک اینڈ کمپنی (۱۹۵۳ء)،
۱۲:

رشید احمد، مفصل فہرست مخطوطات و نادر مطبوعات (مشتمل بر ذخیرۂ عجائب گھر)، لاہور: عجائب گھر
۱۹ء)، جلد اول، ص ۱۷ - ۱۸

سلیم الدین قریشی، فارسی کی پہلی کتاب، ماہنامہ "کتاب" (لاہور)، نومبر ۱۹۸۵ء

حوالہ حافظ احمد علی، عبدالستار بن قاسم لاہوری: اکبری عہد کا فرنگی زبان کا مترجم، ماہنامہ "معارف"
م گڑھ)، جنوری ۱۹۳۶ء، ص ۵۵

"سرۃ الفلاسفہ" کے خطی نسخوں کے لیے دیکھیے: سی۔ اے۔ اسٹوری، جلد ۱، حصہ ۲، حوالہ مذکورہ،
۱۱۱۰ - ۱۱۱۱

اسٹوری نے "سرۃ الفلاسفہ" کو "شرۃ الفلاسفہ" لکھا ہے جو درست نہیں۔ اسٹوری کی فہرست میں
لائبریری، رامپور کے نسخے کا ذکر نہیں ہو سکا۔ یہ نسخہ ۱۲۳۶ھ کا مکتوبہ ہے اور حافظ احمد علی خان نے
نسخے کے حوالے سے "عبدالستار بن قاسم لاہوری" پر مقالہ لکھا تھا، حوالہ مذکورہ، ص ۵۳ - ۵۹]

اس کتاب [داستان مسیح] کی ایک نقل جو شوبر کی وفات کے بعد ۷ رمضان ۱۰۲۷ھ کو مکمل کی
تھی، ہالینڈ پہنچی جہاں لیڈن یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ڈیو (Dieu) نے اسے
نی ترجمے کے ساتھ ۱۶۳۹ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا سرورق لاطینی میں ہے اور کتاب کا عنوان
ی رسم الخط میں بھی دیا گیا ہے۔ البتہ فارسی ٹائپ میں علی حروف کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس
ن کی چھپائی بلاک سے کی گئی ہے۔ فارسی متن کے لیے جو ٹائپ استعمال کیا گیا ہے وہ نسخ اور
ے کے ملے جلے رسم الخط میں ہے، کچھ حروف کے لیے نستعلیق بھی استعمال کیا گیا ہے۔
"داستان مسیح" ۱۸ سنٹی میٹر کے ۶۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر فارسی
عبارت دی گئی ہے اور مقابل میں لاطینی ترجمہ دیا گیا ہے۔

"داستانِ مسیح" --- مترجم کی نظر میں

کتاب ڈیو کے لاطینی مقدمے سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد مترجم نے "راہنمائی [راہنمائی] وہدایت صاحب ترجمہ برائے خوانندگان" کے عنوان کے تحت قارئین کو مطلع کیا ہے کہ [1]

شوبر نے اس کتاب میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر دی ہیں جن کا تعلق انجیل سے نہیں اور جو یا تو ناقابل اعتبار ہیں یا جھوٹی ہیں۔ اس میں دی گئی بہت سی باتیں خدا تعالیٰ کی بزرگی اور انجیل مقدس کے دین کے خلاف ہیں حتیٰ کہ جو چیزیں اس نے انجیل سے لی ہیں، ان کو بھی پلید اور ملوث کر کے پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے ان کے اثر اور پاکیزگی کو ختم کر دیا ہے۔ میں نے یہ کلمات اس لیے لکھ دیے ہیں تاکہ لوگ اس کو پڑھ کر گمراہ نہ ہو جائیں۔ ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو پڑھتے وقت صرف وہ ہی چیزیں قبول کریں جو انجیل سے موافقت رکھتی ہوں۔

ڈیو نے اس کتاب کا عنوان "داستانِ مسیح لتا آلودہ" لکھا ہے۔ ڈیو نے لاطینی عبارت کے ساتھ حاشیہ دیا ہے، اس میں جگہ جگہ اس آلودگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شوبر نے اپنے دیباچے کو اللہ اکبر کے الفاظ سے شروع کیا تھا۔ ڈیو نے ان الفاظ کو عبارت سے حذف کر دیا ہے۔

شوبر کا اندازِ تالیف

ڈیو کی اس کتاب پر تنقید کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شوبر پر اسلامی تعلیمات کا کافی اثر تھا "داستانِ مسیح" لکھنے سے پہلے وہ قرآن کریم کا پرتگیزی زبان میں ترجمہ کر چکے تھے۔ [2] جس کی وجہ سے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم اور دوسرے پیغمبروں کے متعلق جو بیانات اس کتاب میں درج ہیں، ان میں سے کئی ایک قرآن کریم کے بیانات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ شوبر کے لئے ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عیسائی عقائد کو اگر اسلامی تعلیمات کے ساتھ ملا کر پیش کیا جائے تو اکبر کو یہ تعلیمات قبول کرنے میں آسانی ہوگی۔ شوبر نے اپنے دیباچے کے شروع میں کتاب کا عنوان "مراۃ القدس" دیا ہے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "در آں گزارش ی یابد داستان احوال حبیب حضرت یسوع کرسٹس و بیان در بارہ تعلیم آسمانی و معجزات بزرگ قدرادو" اس کے بعد "گفتار امد خطاب زمین پوش" کے الفاظ ہیں۔

شوبر کا یہ دیباچہ اس کتاب کے لکھنے کے محرکات کے علاوہ اکبر کی مذہبی پالیسی اور اس دور کے عیسائی مبلغین کے طریقۂ کار کو سمجھنے کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

دیباچہ کتاب

"جب حضرت مسیح کے معجزات کی شہرت روئے زمین پر پھیلی تو اولیسہ کے بادشاہ ابگر کی خواہش ہوئی کہ ان کے دیدار سے فیض یاب ہو۔ اس نے اپنے ایک دانا ایلچی کو ان کی خدمت میں روانہ

اور پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کے ملک تشریف لے آئیں تو وہ اپنی آدھی سلطنت ان کی خدمت میں
ش کر دے گا۔

بادشاہ نے ایلچی کے ساتھ ایک ماہر مصور بھی روانہ کیا تاکہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ نہ آ
لیں تو وہ ان کی ایک تصویر کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے اور اس طرح ان کو دیکھنے کی خواہش پوری کر
سکے۔ ایلچی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا اور اپنے بادشاہ کا پیغام دیا۔ اس نے جب یہ جان لیا
۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ان کے ملک جانا دشوار ہے تو مصور نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے
ار لا کر اور اپنی عقل و دانش کو استعمال کر کے اپنی توقع سے بہتر اور خوب تر تصویر تیار کی اور اسے دیکھ
ر خوش ہوا لیکن دوسرے دن جب اس نے اس تصویر کا اصل سے مقابلہ کیا تو بے حد شرمندہ ہوا، اور
س تصویر کی درستی اور تصحیح میں مصروف ہو گیا۔

یہ کام ختم کرنے کے بعد اس کا احساسِ شرمندگی دور ہوا اور وہ خدا کا شکر بجا لایا۔ دوسرے اور
تیسرے روز پھر ایسا ہی ہوا اور وہ پہلے سے زیادہ شرمندہ ہوا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ جو
کچھ وہ ایک دن تیار کرتا، اگلے روز اسے ناقص اور نامکمل پاتا حتیٰ کہ شرمندگی اور ناامیدی سے مایوس ہو
گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس پر ترس آیا اور اس کی روانگی سے قبل انھوں نے اس سے اس کی چادر طلب
کی اور اسے اپنے چہرے پر لگا کر اسے واپس کر دی۔ اس نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر اس چادر
پر بالکل درست اور صحیح اتر آئی تھی۔

اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر مصور اپنے ملک واپس آیا اور یہ تصویر بادشاہ کی خدمت
میں پیش کی۔ بادشاہ نے بڑی عزت اور اہتمام کے ساتھ اس تصویر کو اپنے پاس رکھا اور اس کی برکت
سے اپنی مہموں میں کامیاب ہوا۔

میں نے یہ قصہ اس لیے بیان کیا ہے کہ جہاں پناہ آپ نے جبکہ حضرت یسوع کے کمالات کی
داستانیں مختلف روایات سے سن رکھی تھیں، خواہش ظاہر کی کہ میں ان کی صحیح داستان پیش کروں۔ آپ
نے اپنی علم دوستی اور سچائی کی تلاش میں اس کمترین دعا گو پادری — زیر نیمو شویر — کو جس کی پیشانی
آستان بوسی سے روشن ہے، اشارہ کیا کہ آنحضرت کے کردار و گفتار کے متعلق جو کچھ ہماری کتابوں میں
درج ہے، میں اس کو فارسی میں لکھ کر پیش کروں۔ شاید اس لیے کہ میں نے اپنی زندگی کے چالیس
برس اسی پیشے میں گزارے تھے اور پچھلے سات یا آٹھ سال سے فارسی سیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے سراپا دل ہو کر اس کام پر کمر باندھی اور زندگی کی ضروریات و آسائشات سے کنارہ کشی
کر کے کئی روز اس کام میں مصروف رہا حتیٰ کہ فضل الٰہی کی فرمائش کو پورا کیا، کیوں کہ بادشاہ کے احکام
کو کسی دوسرے حکم سے کم نہیں سمجھنا چاہیے، خاص کر ان چیزوں میں جن کا پوشیدہ رکھنا لوگوں پر ستم
۸ کرنے کے مترادف ہے اور جن پر عمل کرنا خدا کی عبادت کے برابر ہے۔

چنانچہ ریلیل فرشتے نے مقدس طوبیات سے فرمایا تھا کہ بادشاہوں کے رازوں کو پوشیدہ رکھنا
نیک کام ہے لیکن اسرار الٰہی کا بیان اور ان کی تشہیر کرنا بہت ہی پسندیدہ اور قابلِ تعریف فعل ہے۔

اس لیے اس کتاب کے مکمل کرنے میں اگر کوئی تاخیر ہوئی ہے تو وہ اس وجہ سے کہ میں نے
[illegible]

اور فارسی کا لاطینی کتابوں سے مقابلہ کیا تو دل کو تسکین نہ ہوئی۔ جو کام مجھے پہلے کامل نظر آیا تھا، بعد میں ناقص معلوم ہوا، اور اپنے کام کو دیکھ کر دکھ ہوا اور اپنی کم مائیگی اور نارسائی سے ناامید ہوا۔ میں نے اس کام کی تکمیل کے لیے خدا سے دعا مانگی اور خدا کی عنایت اور ظلِ الٰہی کے اقبال سے مجھے اپنی مشکلات حل کرنے میں مدد ملی اور یہ کام مکمل کر کے میرے دل کو قرار آیا اور تسلی ہوئی اور حوصلہ ہوا کہ میں یہ کتاب آپ کے سامنے پیش کروں۔

میں دعا کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ آپ کو اور دوسرے سامعین کو خوش رکھے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کتاب کے عہد میں جو کتابیں فارسی میں ترجمہ کی گئیں، ان سب میں سے یہ کتاب اس چیز کی مستحق ہے کہ آپ کو اس پر سب سے زیادہ ناز ہو کیوں کہ اس سے پہلے اس قسم کی کوئی کتاب ترجمہ نہیں کی گئی۔

شاید اس لیے کہ اس دور میں فارسی دانوں کو لاطینی زبان نہ آتی تھی اور لاطینی ادب فارسی سے ناواقف تھے، اور شاید اس لیے بھی کہ اس دور میں آپ کی طرح کوئی ایسا علم دوست بادشاہ نہ تھا جو سچائی کی تلاش میں آپ کی طرح سرگرم رہا ہو۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب آپ کو پسند آئے گی۔ اس لیے نہیں کہ بندہ نے اسے شوق، اخلاص اور محنت سے مرتب کیا ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں ان تمام چیزوں کا ذکر ہے جن کی حضرت عیسیٰ نے تعلیم دی تھی یا سکھی تھی۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حضرت عیسیٰ کی ولادت سے لے کر نبوت تک کے حالات کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں ان کے معجزات، عجائبات اور تعلیمات کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں ان کی وفات اور لوگوں کی سلامتی کے لیے انھوں نے جو مشکلات اٹھائیں اور محنت کی، اس کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں ان کے قبر سے اٹھائے جانے اور آسمان پر لے جائے جانے کا بیان ہے۔

میں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھ سکتا تھا، نہیں لکھا، لیکن مجھے امید ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ درج ہے، وہ حضرت عیسیٰ اور ان کی تعلیمات کو جاننے کے لیے کافی ہو گا۔ جس طرح ہاتھی کے قدم کے نشان سے اس کے جثہ کا پتا چل جاتا ہے اور شیر کی طاقت کا اس کے پنجہ کے نشان سے پتا چل جاتا ہے، اسی طرح مجھے امید ہے کہ یہ کام آپ کو میری خدمت گزاری کی آرزو کی طرف توجہ دلانے کے لیے کافی ہو گا۔

میری درخواست ہے کہ یہ کتاب دربار میں پڑھ کر سنائی جائے کیوں کہ اس کی تعلیمات ہر نیک کام کا سرچشمہ ہیں اور اس میں روح کے علاج اور دل کی تسکین کے لیے دوا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ ہر کتاب روح کے لیے دوا کا کام دیتی ہے لیکن یہ کتاب حضور کی روح کی تسلی کے لیے دوسری کتابوں سے افضل ہے کیوں کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے کہ میری گفتار روح کے لیے دوا اور سرچشمہ ہدایت ہے۔ آخر میں میرے لیے یہ کہنا لازم ہے کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ انجیل مقدس سے لیا گیا ہے اور میں نے دوسری کتابوں کے حوالے دینے سے گریز کیا ہے لیکن جہاں کہیں یہ حوالے دیے گئے ہیں، میں نے ان کتابوں کے نام حاشیے میں درج کر دیے ہیں۔

پڑھنے میں آسانی کے لیے میں نے متن کا خلاصہ ان حاشیہ میں دے دیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی

بعض باتیں ایسی ہیں کہ انسان کی عقل عاجز اور دنگ رہ جاتی ہے۔ میں نے یہ باتیں اور ان کی مثالیں دوسری کتاب "آئینۂ حق نما" میں جو میں لکھ رہا ہوں اور جو ان شاء اللہ تعالیٰ جلد مکمل ہو جائے گی، بیان کی ہیں۔

میری دعا ہے کہ حضرت عیسیٰ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے اور اپنی شناسائی کو جو سلامتی جان کے لیے لازم ہے، اس بندے کی دعا کے مطابق آپ پر عیاں کرنے کا کرم فرمائے۔ در دارالخلافہ آگرہ بتاریخ یازدہم اردی بہشت سن ہزار و ششصد و دو از ولادت حضرت خداوند اختتام [پذیرفت]۔"

شوریر کے اس دیباچے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اس کتاب کا خود لاطینی زبان [۳] سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا لیکن کتاب کے اختتام پر دی گئی مندرجہ ذیل عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ

رجمہ مولانا عبدالستار لاہوری نے مصنف کی اعانت سے کیا تھا۔

> این نامہ گرامی و دیباچہ سعادت مندی پادری زیر نیمو شوریر فرنگی از طائفہ محبت حضرت عیسیٰ بحکم شاہنشاہ دوران خدیو دو شتہان دارای روزگار جلال الدین اکبر پادشاہان خلد اللہ ملکہ و سلطانہ از انجیل مقدس و دیگر کتب پیغمبران در دارالخلافہ آگرہ فراہم آوردہ، مولانا عبدالستار بن قاسم لاہوری باتفاق این بندہ در جہاں دارالخلافہ ترجمہ کردہ در سن ہزار و ششصد و دو از ولادت حضرت ایشوع و چہل و ہفت الہیٰ از جلوس مقدس شاہنشاہی انجام یافت۔"

پادری شوریر کی ایک دوسری کتاب

داستان مسیح کے بعد ڈیو نے اسی سال یعنی ۱۶۳۹ء میں فارسی کی مزید دو کتابیں اسی مطبع [جولیڈن یونیورسٹی کے استاد تھامس ارپینس (THOMAS ERPENIUS) نے ۱۶۱۳ء میں قائم کیا تھا۔] سے شائع کیں۔ ان میں سے پہلی "داستان سان پیدرو" ہے۔ یہ شوریر کی کتاب "داستان احوال حواریاں" یا "وقائع حواریان دوازدگانہ" کی پہلی جلد پر مشتمل ہے۔

"داستان مسیح" کی طرح یہ کتاب بھی شوریر نے اکبر کی فرمائش پر لکھی تھی اور اس کا فارسی ترجمہ مولانا عبدالستار لاہوری نے مصنف کی اعانت سے سرانجام دیا تھا۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں مرتب کی گئی تھی۔ مصنف نے اس کی پہلی چار جلدیں ۱۶۰۵ء میں اکبر کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ اکبر کی وفات کے بعد ۱۶۰۷ء میں یہ کتاب مکمل ہوئی تو شوریر نے اسے جہانگیر کے نام معنون کیا اور اس کی ایک جلد جہانگیر کو پیش کی۔

ڈیو نے "داستان مسیح" کی طرح اس کا بھی فارسی سے لاطینی میں ترجمہ کیا اور یہ کتاب دونوں متنوں کے ساتھ شائع کی۔ ڈیو نے ترجمے میں اور حاشیے کے ذریعے اس کتاب کو بھی شوریر کی غلط بیانیوں اور نجاست اسیری سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب ۱۹ سنٹی میٹر کے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک صفحے پر لاطینی ترجمہ دیا گیا ہے اور اس کے مقابل دوسرے صفحے پر فارسی عبارت درج ہے۔ سرورق پر فارسی عنوان بلاک سے چھاپا گیا ہے اور کتاب کی بقیہ عبارت فارسی ٹائپ میں ہے۔

اس کتاب کے قلمی نسخے یورپ اور ہندو پاکستان کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ آصفیہ

کتب خانہ [حیدر آباد - اندھرا پردیش] میں اس کا جو نسخہ ہے، اس کا عنوان "مجموعہ رسائل حالات پیٹرس وغیرہ حواریان حضرت عیسیٰ" دیا گیا ہے۔ یہ نسخہ اس سے قبل اکبر کے کتب خانہ میں رہ چکا تھا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ "نسخہ کتاب بارہ اپاسل" کے عنوان سے ۱۸۹۴ء میں سردھنہ سے شائع ہوا تھا۔

حواشی

۱۔ ترجمہ از فارسی

۲۔ ای - جی- براؤن، A, LITERARY HISTORY OF PERSIA لندن (۱۹۰۲ء).
جلد ا، ص ۴۰

۳۔ اس کتاب کا اصل نسخہ جو پرتگیزی زبان میں ہے، اب روم میں ویٹیکن کے کتب خانے میں موجود ہے۔ شویر ۱۶۱۵ء میں واپس گوا چلے گئے تھے۔ وہاں ۲۷ جون ۱۶۱۷ء کو گھر میں آگ لگ جانے کی وجہ سے وفات پائی تھی۔ مذکورہ بالا نسخے پر آگ سے جلنے کے آثار باقی ہیں۔

عالم اسلام اور عیسائیت - جون ۱۹۹۳ء

داستانِ مسیح

HISTORIA CHRISTI
PERSICE

Conscripta, simulque multis modis contaminata,

A

P. HIERONYMO XAVIER, Soc. Jesu.

LATINE

Reddita & Animadversionibus notata

A

LUDOVICO DE DIEU.



LUGDUNI BATAVORUM,
Ex Officina Elseviriana, A° cIↃ IↃ CXXXIX.

639

"داستانِ مسیح" کا سرورق جو مارچ ۱۶۳۹ء میں لیڈن سے شائع ہوئی۔

اخلاق جہانگیری

فارسی میں بے شمار منابع ایسے ہیں، جو آج تک قلمی نسخوں کی شکل میں دنیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انہیں منظر عام پر لایا اور شایع کرایا جائے۔ جس سے ہماری تہذیب اور تاریخ کے نئے نئے گوشے سامنے آسکیں گے۔ ایسی کتابوں میں ایک "اخلاق جہانگیری" بھی ہے جس کا ایک قلمی نسخہ نیشنل میوزیم۔(۱) نئی دہلی میں محفوظ ہے(۸۱-۹۸)اس نسخہ کے پہلے اوراق پر حسب ذیل تحریریں ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ نسخہ کن کن شخصیتوں کے کتب خانوں کی زینت رہا ہے۔ نیز کتاب کی فہرست دی گئی ہے۔

۱۔ اللہ اکبر در شہور ۲۳ عالمگیری بخزانہ کتب الفقراحقر محمد ابراہیم حسینی است۔
مہر محمد ابراہیم حسینی خانہ زاد عالمگیر بادشاہ

۲۔ بیست و دوم محرم الحرام از جلوس اشرف مطابق ۱۱۱۹ھ ... ابتیاع نمود۔
مہر سید مرتضیٰ عالمگیر شاہی

۳۔ نورالدین محمد۔ فہرست مقالات کتاب "اخلاق جہانگیری" کہ مصنفین و علما و حکما کہ ندماء حضرت نورالدین محمد جہانگیر محمد نوراللہ مرقدھم وجعل الجنتہ مثواہم بودند متفق اللفظ والمعنی بود نقلیات غریبہ و حنفیات عجیبہ مشتمل بر بیست و دو مقالہ، کہ ہر یکی قاری و سامع را ابرائے حق جل شانہ ہدایت و فواید عظیم می بخشد، از کتب معتبرہ برداشتہ در ضبط رقم وقید قلم درآوردہ اند۔

(ا) مقالہ اول در محبت و عشق و سخنان اولیاء اللہ۔(ب) مقالہ دوم در فضیلت علم و علماء رحمہم اللہ تعالیٰ۔(ج) مقالہ سیوم در خوف ورجا۔(د) مقالہ چہارم در حسن خلق و مذمت بدخلقی۔(ہ) مقالہ پنجم در تواضع و شفقت۔(و) مقالہ ششم در علو ہمت۔(ز) مقالہ ہفتم در توکل۔(ح) مقالہ ہشتم در صبر۔(ط) مقالہ نہم در سخاوت و مذمت بخل و حسد۔(ی) مقالہ دہم در عدالت امراواولی الامرو تامل در حکم۔(ک) مقالہ یازدہم در حرم۔(ل) مقالہ دوازدہم در فراست۔(م) مقالہ سیزدہم در فواید مشورت۔(ن) مقالہ چہاردہم در میامن توبہ۔(س) مقالہ پانزدہم در درجات۔(ع) مقالہ شانزدہم در معارج شجاعت۔(ف) مقالہ هفدهم در سیاست۔(ص) مقالہ [illegible]۔(ق) مقالہ [illegible]

وشامت کذب ۔(ر) مقالہ بیستم در قناعت و مذمت طمع و حرص و سرقہ ۔(ش) مقالہ بیست ویکم در مطایبات ۔(ت) مقالہ بیست و دوم در متفرقات و در نصیح روایات و تنقیح حکایات۔

۴۔ ۷ اشہر شعبان ۱۱۰۰ھ، مہر

۵۔ سوال امیر الامرا، مہر امیر الامرا خان مرحوم .... شعبان ۲۱

۶۔ شہر ربیع الثانی عرض دیدہ شد

۷۔ در شہور ۲۲ در خزانہ کتب الفقر احقر محمد ابراہیم. ... شہر جمادی الاول عرض دیدہ شد۔

۸۔ کتاب اخلاق جہانگیری .. داخل کتاب خانہ نواب مستطاب.. بتاریخ ۵ ۔ شہر محرم الحرام ۱۰۶۲ھ۔ اس میں بہت سی مہریں ہیں جو پڑھی نہیں جاتیں۔

اس کتاب کے مؤلف نور الدین محمد ہیں، جن کو جہانگیر نے لاہور کا قاضی بنایا تھا۔ شیخ معین الدنیا والدین الواعظ ہروی مؤلف کے اجداد میں سے ہیں ۔جس کا ذکر انہوں نے کئی جگہ کیا ہے ۔ سلطان حسین مرزا (م ۹۱۱ھ) کے زمانے میں قاضی نظام تھے اور ان کے انتقال کے بعد یہ عہدہ مولانا معین الدین واعظ کے سپرد ہوا جو قاضی کے حقیقی بھائی تھے۔ مؤلف نے لکھا ہے کہ وہ یہ عہدہ قبول نہیں کر رہے تھے ۔بڑی مشکل سے چار شرطوں پر راضی ہوئے۔

یہاں یہ بھی بتلا دیا جائے کہ یہ وہی معین الدین ہیں، جن کا دیوان غلطی سے خواجہ معین الدین چشتی کے نام سے شایع اور مشہور ہو گیا ہے۔

بہر حال مؤلف نے اس کتاب کی تالیف کا سبب یہ بتلایا ہے کہ جہانگیر بادشاہ آگرہ سے اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کے لیے کچھ دنوں رک کر مانڈو اور گجرات کے لیے روانہ ہوئے ۔اس وقت اس کتاب کی تالیف شروع ہوئی ۔ پھر جب لاہور کے قاضی بنا کر بھیجے گئے، جس کی وجہ سے وہ دربار سے دور ہو گئے، اس مفارقت کے زمانے میں بھی وہ بادشاہ کی تعریف و توصیف سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے ۔ اس لیے انھوں نے اس کتاب کی تالیف کی اور اس کا نام " اخلاق جہانگیری " رکھا۔ اس کے حروف کی تعداد کے مجموعہ سے اس کتاب کے اختتام کی تاریخ ۱۰۳۱ھ / ۲۲-۱۶۲۱ء نکلتی ہے۔ مگر کتاب کے آخر میں مؤلف نے اس کے اختتام کی تاریخ ذیقعدہ ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) بتلایا ہے۔

اس کتاب میں مؤلف نے بے شمار صوفیوں، اولیاء اللہ، علما و حکما، شعرا وغیرہ کے اقوال اور حالات درج کیے ہیں ۔ نیز بے شمار منابع سے استفادہ کیا ہے، جن میں ریاض الملوک [illegible]

بحر العلوم، اخلاق ناصری، زاد المعاد، تاریخ ہرات، جامع الحکایات وغیرہ ہیں۔ ہندستانی کتابو
سے بھی استفادہ کیا گیا ہے مگر ان کا نام نہیں بتلایا گیا ہے۔ مؤلف نے صرف " در کتب
مسطور راست" یا " در کتب حکمائی ہند آوردہ اند " لکھ دیا ہے.....

ان مقالات میں ہندستان سے متعلق بہت سی تاریخی اور اساطیری شخصیتوں کے حالا
اور واقعات ملتے ہیں۔ جو ہندستانی تاریخ اور تہذیب کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے اہمی
کے حامل ہیں۔ یہ واقعات کہاں تک مبالغہ آمیز یا صحیح ہیں، اس کا اندازہ خود پڑھنے والے لگا
ہیں۔ مثلاً ہندستان میں حضرت آدمؑ کی قبر پر ایک درخت ہے، جس پر سال میں دو م
پھول آتے ہیں، نیز ہر پھول پتے کی شکل کا ہوتا ہے، جس پر لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوا ہوتا ہے۔

ہندستان کی کتابیں قدیم زمانے میں ایران میں بھی بہت مقبول تھیں۔ چنا
نوشیرواں نے۔ ہندستانی کتاب میں پڑھا کہ ہندستان بھی ایک جگہ ہے، جہاں کے میو
مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ اس نے ایک قاصد ہندستان بھیجا کہ اس کی تحقیق کرے۔ و
کے ایک بزرگ نے کہا کہ میوے سے مراد علم کا پھل ہے کہ یہاں کے علما اس سے جہل
مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ جب نوشیرواں کو پتا چلا تو اس نے علما کی عزت کرنے میں ا
بھی مبالغہ کیا.....

سلطان علاؤالدین خلجی (م ۷۱۶ھ) کے زمانے میں ولار نامی خواجہ سرا نے جو پانی پت کا حا
کسی کو قید میں ڈال دیا اور ایک بڑی رقم لے کر اس سے معاملہ طے کیا۔ اس کے بعد پھر ا
رقم مانگی۔ اس نے حضرت بوعلی قلندر (م ۷۲۴ھ) کے آستانہ پر جا کر پناہ لی۔ ولار بھی وہاں پہنچا،
دیکھتے ہی حضرت نے غصے سے اپنی جانماز کو خانقاہ کی دیوار پر مارا اور اسی وقت وہ گھوڑے
گر کر مر گیا۔ مقامی لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ مگر شیخ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ
غصے میں سلطان کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا " علاؤالدین کوتوال دہلی کو شرف پانی
سلام پہنچے۔ اگر پانی پت میں کوئی اچھا حاکم نہیں بھیجا تو دہلی میں کوئی اور کوتوال بنایا جا
علاؤالدین بہت خوش ہوا کہ آپ نے اسے "شحنۂ دہلی" کہکر یاد کیا ہے۔ میز اس نے اپنے لا
کے ہاتھ جواب بھیجا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس خادم کے بیٹے کو وہاں کا حاکم بنائیں
کوئی اور حاکم بھیجا جائے گا۔

اسی طرح ایک قصہ دیا ہوا ہے جو "اخلاق جلالی" میں بھی ملتا ہے کہ ملک سشاہ

بڑے عالم امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک جوینی نے جو امام غزالی کے استاد تھے۔ فتویٰ دیا کہ کل لوگ روزہ رکھیں۔ اس پر پہلے تو بادشاہ بہت غصہ ہوا اور امام الحرمین کو بلوا بھیجا، لیکن بعد میں انہیں بڑے احترام سے واپس کیا، نیز انہیں کے فتوے کے مطابق عمل ہوا۔

اس کتاب کا اصل مقصد یہ ہے کہ جہانگیر تمام اخلاق حمیدہ کا مظہر تھا، چنانچہ تقریباً ہر مقالے کے آخر میں مؤلف نے بادشاہ وقت کی تعریف کی ہے۔

●●

العلم فروری ۱۹۹۳ء

شعار عالم بگرامی

ڈپٹی نذیر احمد پر کفر کا فتویٰ

مسلمان عوام ہمیشہ اس عالم کی جان کے دشمن رہے ہیں جس نے کوئی ایسی بات کی جو ان کے فہم و خیال سے باہر ہو اور ظاہر پرست فقہا نے بھی ایسے میں عوام کا ساتھ دیا

کفر کے فتوے جاری کرنا ہمارے بیشتر علما کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔

"امہات الامہ" ہم نے ابھی دیکھ کر رکھی ہی تھی کہ روزنامہ "پیسہ" اخبار۔ لاہور میں کسی نرخ آبادی کا ایک مراسلہ دیکھنے میں آیا جس میں یہی کچھ لکھا تھا کہ دہلی میں بہت بڑا جلسہ رہا اور اس میں "امہات الامہ" کے اکثر مضامین پڑھے گئے۔ آخر متفق الفاظ ہو کر وہاں کے مولویوں نے مصنف امہات الامہ کو کافر قرار دیا۔ ان کے ساتھ کھان پان سب بند۔ حقہ پانی ترک۔ اس کے چند ہی روز کے بعد ایک مطبوعہ اور مہر شدہ کفر کے فتوے کی زیارت بھی ہوئی۔ زیارت کرتے ہی یادش بخیر ہمیں چند اور کافر یاد آگئے، جن کی نسبت ایک زندہ علامہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

"عوام کا ہر زمانے میں یہ حال رہا ہے کہ جو بات ان کے فہم اور خیال سے باہر ہوتی تھی اس کے اظہار پر وہ جان کے دشمن بن جاتے تھے۔ سلطنت کی روک تھام سے صرف اس قدر ہو سکتا تھا کہ کسی کی جان کو خطرہ نہ پہنچنے پائے لیکن صرف اس بندش سے کیا کام چل سکتا تھا۔ عوام جس کو چاہتے تھے مردود عام کر سکتے تھے اس سے بڑھ کر یہ آفت تھی کہ ظاہر پرست فقہا بھی عوام کے ساتھ ہو جاتے تھے اور کفر کے فتووں سے انسان کا زندہ رہنا مشکل کر دیتے تھے۔ امام غزالی آمدی رازی ابن رشد، شہرستانی اور ابن تیمیہ کے حالات پڑھو ان میں ایک بھی فقہا کے فتووں کے حملوں سے نہ بچ سکا۔"

ان کافروں کا حال پڑھ کر ہم کو معلوم ہو گیا کہ ہمارا زمانہ بھی متعصب فقہا سے خالی نہیں۔ جن بزرگوں نے مصنف امہات الامہ کے کفر کے فتوے پر مہریں لگائی ہیں۔ ان میں ماشاء اللہ آج ایک ایک فقیہ اور اسلام کا چمکتا ہوا تارا ہے۔ ان کے علم و فضل کے ڈنکے چار دانگ ہندوستان میں بج رہے ہیں۔ وہ اسلام کی خدمت میں اپنے تمام عیش و نشاط کو نثار کیے ہوئے جابجا عربی مدارس قائم کرتے پھرتے اور اسلامی انجمنوں کی بنیادیں ڈالتے پھرتے ہیں۔ دہریوں، نیچریوں اور عیسائیوں اور آریوں اور خدا معلوم کن کن مذہب کے والوں سے سامنے بحث مباحثے کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کرتے پھرتے ہیں مگر افسوس نتیجہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے اور وہ یہ کہ سال بھر میں ایک کو مسلمان بناتے ہیں تو چار کو خارج کرتے ہیں۔

برا حوال آں کس بباید گریست
کہ دخلش بود نوزدہ خرچ بیست

شمس العلماء علامہ شبلی فرماتے تھے کہ "امہات الامہ کی تصنیف کے بعد جب ندوہ کا جلسہ دہلی میں ہونے والا تھا تو میں نے جلسے کا اشتہار دیتے ہوئے ہندوستان کے نامور علماء کی فہرست بھی شرکت جلسہ کے لئے چھاپی تھی۔ اس میں مولوی نذیر احمد خان کا نام بھی تھا ... وہ اشتہار کہیں مولوی نذیر احمد خان کے پرانے حریف کی نظر پڑ گیا تو انہوں نے مجھے بھی صرف اس بنیاد پر کافر قرار دے کر فتویٰ چھپا دیا کہ نذیر احمد کے نام کے ساتھ میں نے مولوی کیوں لکھا۔"

"روشن خیال" (۱۹۸۴)

ولادیمیر گاوریلین

ماسکو

ماسکو سے اردو میں کتابیں

"رادوگا" اشاعت گھر ۱۹۸۲ء میں دارالاشاعت "ترقی" سے الگ ہو کر قائم ہوا تھا۔ وہ غیر ملکی قارئین کے لئے دنیا کی کوئی تیس زبانوں میں کتابیں شائع کرتا ہے جن میں اردو بھی شامل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کتابیں قوموں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی قارئین کے لئے ماسکو سے اردو میں پہلی کتابیں ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھیں۔ [illegible] سے آج تک ایک سو سے زائد کتابیں ترجمہ ہو کر اردو میں چھپ چکی ہیں۔ ان میں بچوں اور بڑوں کے لئے روسی کلاسیکی مصنفین کے شاہکار شامل ہیں جیسے چیخوف، گورکی، ترگنیف، لیو تالستائی، دستوئیفسکی، [illegible] وغیرہ۔ ان ادیبوں کی تصانیف قارئین میں بہت ہی مقبول ہیں۔ وہ ان کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ ان کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہو گئے اور یہ سمجھنے میں آنے والی بات ہے کیونکہ روسی کلاسیکی ادیبوں کی تخلیقات انسانیت پسندی، انصاف، نیکی، محبت و شفقت کی پیغامبر ہیں۔ مثال کے طور پر دستوئیفسکی کو ہی لیجئے۔ وہ پچھلی صدی کی روسی نثر کے دور عروج کی نمایاں پیداوار ہیں۔ ان کی بیشتر کتابیں غریب اور سادہ انسانوں کی مصیبتوں اور [illegible] کی بات کے بارے میں ہیں کہ وہ بڑی اور زیادہ [illegible] عکس [illegible] سامنے کرتے ہیں۔ اپنے ناول "ذلتوں کے مارے لوگ" کے کردار [illegible] کی [illegible] میں دستوئیفسکی نے اپنے فن کے مرکزی موضوع کا اظہار کیا۔ یعنی انسانیت [illegible] کی زندگی [illegible] جیسے کہ مصنف کے ہم عصر سماج [illegible] ایسا نصیب کر دیا تھا۔ دستوئیفسکی کے ایک اور مشہور ناول "ایڈیٹ" کے بھی دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دستوئیفسکی خود [illegible] "ایڈیٹ" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایک لاجواب اور دلچسپ ہستی کی تصویر کشی کی جائے۔ اور یہ اتفاقی بات نہیں کہ بہت سے اردو قارئین دستوئیفسکی کا کوئی ناول پڑھ کر ہم سے ان کا ایک اور ناول ارسال کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

لیو تالستائی کی کتابیں بھی قارئین میں کم مقبول نہیں۔ پچھلے سال تالستائی کی کہانیوں کا مجموعہ بعنوان "[illegible]" دوسری بار شائع کیا گیا۔ یہ کہانیاں اس عظیم مصنف کی تخلیقی صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ کتاب کی ابتداء تالستائی کی کہانی "[illegible]" سے ہوتی ہے اور خاتمہ "[illegible]" [illegible] کہانی

یہ ناول مصنف کی موت کے بعد شائع ہوا۔ تالستائی کی اردو میں شائع شدہ ایک اور ضخیم کتاب "آنا کارینینا" دو جلدوں میں ناول ہے۔ مصنف نے اس ناول پر چار سال کی محنت سے کام کیا اور شروع میں ان کا ارادہ تھا۔ اعلیٰ سماج کی ایک خاتون کی زندگی کو بیان کرنا لیکن اس ناول کو لکھتے لکھتے اس کا ڈھانچہ درجہ بدرجہ وسیع تر ہوتا گیا اور اس کے موضوعات میں زیادہ گہرائی آتی گئی۔ ایک "تلون مزاج بیوی" کے متعلق ناول سے شروع ہو کر "آنا کارینینا" نے سب سے عظیم سماجی ناول کی شکل اختیار کر لی۔ اب تالستائی نے روسی زندگی کے ایک پہلو [illegible] گزشتہ صدی کی آخری دہائی [illegible] کی اس کی تمام تر پیچیدگیوں اور تضادات کے ساتھ عکاسی کی۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۰ء میں تالستائی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تالستائی ہمارے دور کے سب سے پُرخلوص انسان تھے۔ کہ انہوں نے اپنی زندگی حق کی تلاش کے لئے وقف کر دی اور سچائی کے حصول اور اس کو زندگی میں داخل کرنے کی کوششوں پہ مستقل لگے رہتے تھے۔

سوویت دور کے مصنفین کا حصہ "رادوگا" اشاعت گھر کے پروگرام میں بھی کافی وسیع ہے اور اس میں مکسم گورکی کی کتابیں آ گئی ہیں۔ گورکی کے عالمگیر شہرت کے ناول "ماں" کی بنیاد ۱۹۰۵ء کے پہلے روسی انقلاب کے حقیقی واقعات پر ہے۔ عالمی ادب کی تاریخ میں نہ کسی فن کار اور تخلیق کو قارئین کی اتنی زبردست تعداد نصیب ہوئی اور نہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی قسمت پر اس کا اتنا زیادہ اور براہ راست اثر پڑا جتنا گورکی کی اس کتاب کا۔ اردو میں اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ گورکی کی ایک اور مقبول عام تصنیف ہے تین جلدوں آپ بیتی۔ پہلی کتاب کا نام ہے "بچپن"۔ یہ اس لڑکے الکسی پیشکوف کی زندگی کی کہانی ہے جو بعد میں عظیم [illegible] ادیب میکسم گورکی بنا۔ اپنے باپ کی موت کے بعد وہ اپنے بڑے [illegible] نانا کے گھر آتا ہے۔ کتاب میں اس بچے کا ماحول دکھایا ہے جو [illegible] کے سبب سے زیادہ [illegible] تھی۔ [illegible] زندگی سے سرشار [illegible] اور ان کی "[illegible]" کہانیوں کی جادو بھری دنیا۔ اس ناول میں اس زمانے کے روس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ "بچپن" گورکی کی آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے۔ باقی دو ہیں: "زندگی کی شاہراہ پر" اور "منزل کی تلاش"۔ ہر جلد بجائے خود ایک ناول ہے۔

اردو قارئین کو شاعری سے لگاؤ جانتے ہوئے ہم نے اس قسم کی کئی کتابیں شائع کی ہیں حالانکہ شاعری کا ترجمہ کرنا جیسا سب کو معلوم ہے بہت ہی مشکل کام ہے۔ اس کام میں [illegible] انصاری، تقی حیدر اور [illegible] سلیم جیسے تجربہ کار مترجموں نے اپنا کام نمایاں دکھا دیا۔ ان کی کوششوں کی ایک مثال

شاعرانہ مجموعہ "سرخ ہرا نے عصر" ہے۔ یہ سوویت یونین کے انتہائی مختلف شاعروں کی منتخب نظموں اور شاعری تخلیقات کا مجموعہ ہے جو سارے سوویت جمہوریاؤں کی قومی زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ولادیمیر مایاکوفسکی، الکسانڈر بلوک، سرگئی یسینن اور بورس پاسترناک سے لے کر یوگینی یوتوشینکو، رسول حمزاتوف اور مرزا ترسون زادہ جیسے ہم عصر شاعروں تک بیسویں صدی کے سوویت شعراء اس مجموعے میں مختلف شعری اصناف کی بھی نمائندگی کرتے ہیں اور انفرادی شاعرانہ اسلوب ملتے ہیں۔

ہم اپنے تبصروں میں بچوں کی کتابوں کے لیے بھی کوئی جگہ الاٹ کرتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں اس قسم کی کتابیں نستعلیق میں شائع ہونے لگی ہیں۔ ان میں کئی معلوماتی کتابیں شامل ہیں مثلاً کرلیوف کی کتاب "الاؤ سے ری ایکٹر تک"۔ طلباء کے لیے جو بار بار ذکر کرتے ہیں، کاریں اور گھڑیاں کیوں چلا کرتی ہیں؟ ہمیں اپنے گھروں اور کارخانوں میں بجلی کی کس لیے ضرورت ہوتی ہے؟ ادیب الیکسی کرلیوف ان اور دوسرے بہت سے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس کتاب میں رنگین تصویریں اور خاکے بھی ہیں یہ دکھانے کے لیے کہ مختلف آلات کی ساخت کیسے ہوتی ہے!

بچوں اور نوجوانوں کے لیے ایک اور دلچسپ کتاب ولادیمیر کورولینکو کا طویل افسانہ "نابینا موسیقار" ہے۔ یہ کورولینکو کی جنہوں نے ۱۹۲۱ء میں وفات پائی مقبول ترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک نابینا لڑکے کے بارے میں کہانی ہے جو بعد میں مشہور موسیقار بن گیا تھا۔ اس افسانے کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے اور اس نے کورولینکو کو ساری دنیا میں شہرت عطا کی ہے۔ اکثر اس افسانے کا ذکر "افسانہ مسرت" کہہ کر کیا جاتا ہے۔ "انسان کی خوشی و مسرت کس بات میں ہے؟ اس کی جانب لے جانے والی سب سے صحیح، سب سے یقینی راہیں کون سی ہیں؟" افسانے کا ہیرو اپنے جداگانہ انداز میں اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ یہ روشن و دانا کتاب انسان سے محبت کا سبق دیتی ہے۔

ایک اور مقبول ادیب نکولائی نوسوف نے بچوں کے لیے ایک افسانوی دلچسپ کا تحفہ دیا ہے۔ جس میں ایک ننھا کردار ہے، نہ جانوں۔ اس کی مہمیں صرف مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ بہت سبق آموز بھی ہیں۔ نہ جانوں اپنے دوستوں کے ساتھ حیرت انگیز سیاحت کرتا ہے، غبارے میں پرواز کرتا ہے، تصویریں بنانا اور نظمیں لکھنا سیکھتا ہے، گیس سے چلنے والی موٹر کار پر سیر کرتا ہے، گانا اور ساز بجانا سیکھتا ہے۔

معلم صاحب علیم سوخوملینسکی کو ادیب کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل ہے۔ بچوں کے لیے ان کی کہانیوں کا مجموعہ کا ترجمہ بھی نستعلیق میں شائع کیا گیا ہے۔ سوخوملینسکی کی کہانیاں عام طور پر چھوٹی اور سادہ لیکن بامعنی ہیں۔ وہ بچوں کے بارے میں ادیب کے مکمل علم کا اظہار کرتی ہیں۔

لیوبی اور ساوا لووا کی کتاب "ستاروں اور سیاروں کی دنیا تصویروں میں" بچوں کے لیے ایک معلوماتی کتاب ہے۔ اس میں سادہ اور سہل انداز میں بچوں کو ستاروں، سیاروں اور دوسرے فلکی اجسام کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ یہ کتاب رنگین تصویروں سے مزین ہے۔

قارئین کے لیے یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ پچھلے سال تک ماسکو میں "رادوگا" اشاعت گھر کی شاخ اردو میں بھی کتابیں شائع کرتی تھی۔ ان میں زیادہ تر کتابیں جدید دور کے ادیبوں کی تخلیقات ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مجموعہ پیش کیا جا سکتا ہے جس کا عنوان ہے "ممتاز سوویت افسانہ نگار"۔ اس مجموعے میں تیس برس (۱۹۲۰ تا ۱۹۵۰ء) کے سوویت ادب کے ارتقاء کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں میکسم گورکی، الیکسی تالستائی اور میخائیل شولوخوف جیسے معروف نامور ادیبوں کی کہانیاں شامل ہیں۔ شاندار ادبی اسلوب کے مالک دوسرے نثر نگار مثلاً آندرے پلاتونوف، کنستانتین پاؤستوفسکی اور لیونید سوبولیف کی بھی کہانیاں ہیں۔ قاری کو متنوع سوویت تہذیب کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ خواہ وہ قدرت سے متعلق پاؤستوفسکی کا مختصر افسانہ ہو، خواہ ایک محنت کش سے متعلق پلاتونوف کا طویل افسانہ، اپنے انداز سے دلچسپ ہے اور قارئین کو متاثر کرے گا۔

ریاستی انعام یافتہ روسی ادیب بورس واسیلیف بہت سے ملکوں میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "سحر کتنی پرسکون ہے یہاں۔۔۔" پانچ نوجوان سوویت لڑکیوں اور ایک سارجنٹ میجر کی شجاعت و بہادری کی داستان ہے جنہوں نے نازیوں کے خلاف جنگ میں اپنی زندگیاں قربان کیں لیکن پھر بھی ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

تاشقند سے اردو میں ایک اور شائع شدہ کتاب الیکسی تالستائی کا ناول "دوشیزۂ مریخ" ان کا ایک سائنس فکشن ناول ہے۔ اس میں مریخ سیارے کی طرف جس پرواز کا تصور پیش کیا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم کی قوت کا آخری اور واحد مقصد بنی نوع انسان کی بھلائی ہوتی ہے اور اس کے برعکس جہالت اور کشش پستی بگاڑ اور بدی پیدا کر سکتی ہیں۔

تاشقند کی شاخ سے اردو میں کئی سوویت ریپبلکوں مثلاً ازبکستان، آذربائیجان اور آرمینیا کے ادیبوں کی تخلیقات شائع کی گئیں۔ پریمقل قادروف نامور ازبک سوویت ادیب ہیں۔ ان کا تاریخی ناول "ظہیر الدین بابر" ان کی عالی تصانیف میں سے ایک ہے۔ مصنف نے اس ناول میں ظہیر الدین بابر کی متاثر کن شخصیت کی بڑے بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔

* اردو انٹرنیشنل، جنوری، فروری ۱۹۲

خواجہ حسن نظامی مرحوم

کتب خانہ رام پور

کتب خانہ رام پور صبح صاحبزادہ عبدالصمد خاں صاحب چیف منسٹر ریاست رامپور کے مکان پر ملنے گیا تھا۔ بہت اخلاق سے پیش آئے اور جنرل ڈکسن صاحب مرحوم کا ذکر کرتے رہے۔ جو ان کے دوست تھے۔ میں نے کہا میں ۱۹۰۶ء میں جنرل ڈکسن کے ہمراہ رام پور آیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی نہیں آیا۔ جنرل ڈکسن مسلمان تھے اور میرے مرید تھے اور ہر سال دہلی میں لندن سے مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اور نظامیہ سلسلے کے اذکار اور اشغال سیکھتے تھے۔ چیف منسٹر صاحب نے کہا۔ افسوس ہے کہ ان کی تجہیز و تکفین عیسائی طریقہ پر ہوئی۔ میں نے کہا دہلی میں وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنے انجام کا فکر ہے کہ میری بیوی پکی عیسائی ہے۔ مرنے کے بعد میری لاش عیسائیوں کے حوالے کر دے گی اس واسطے عربی حروف میں میں نے کلمۂ توحید اپنی کلائی پر گدوا لیا ہے تاکہ مرنے کے بعد سب کو معلوم ہو جائے کہ میں مسلمان ہوں اور میری میت مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے تو میں نے جنرل ڈکسن سے کہا تھا کہ تم اس کی کچھ پروا نہ کرو چاہے تم کو عیسائیوں میں دفن کیا جائے اور چاہے ہندوؤں میں۔ مگر تم مرنے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ جاؤ گے۔ جن کی غلامی اور اطاعت کا تم نے اقرار کر لیا ہے۔

چیف منسٹر صاحب نے کہا۔ بے شک یہ ٹھیک ہے۔ جو جس سے محبت رکھتا ہے وہ اسی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ چیف منسٹر صاحب بڑے مستعد اور محنتی آدمی ہیں۔ نواب صاحب مرحوم کے زمانہ میں ریاست کو جتنی ترقیاں حاصل ہوئیں وہ سب انہی ان صاحب کی قابلیت اور محنت کا نتیجہ تھا۔

جس شخص نے رامپور کی اسلامی ریاست کو اپنی زندگی کا بہت زیادہ وقت خرچ کر کے ترقی دی اور بربادیوں سے بچایا وہ خدا کے ہاں جا کر بھی اجر پائے گا اور دنیا میں بھی اس کی قدر کی جائے گی اور موجودہ نواب صاحب بھی اپنی بیدار مغزی سے ایک ایسے بے مثل وزیر کی قدر دانی کریں گے اور میں نے دیکھا کہ آج کل ہز ہائی نس نواب رضا علی خاں بہادر کوئی کام اپنے چیف منسٹر کی رائے لیے بغیر نہیں کرتے۔ اور میرے دل پر بہت اثر ہوا جب ہز ہائی نس نے چیف منسٹر کو چچا کہہ کر آواز دی اور چیف منسٹر ہاتھ جوڑ کر دوڑتے ہوئے ان کے سامنے آئے۔ آقا کو ایسا ہی برتاؤ زیبا تھا اور ماتحت کے لئے بھی ایسی ہی اطاعت اور ادب و تہذیب مناسب تھی۔

رام پور کا کتب خانہ تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ چیف منسٹر صاحب کی اجازت لے کر اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے اس کی خواہش کی تو چیف منسٹر صاحب نے فوراً اجازت نامے لکھ کر متعلقہ افسروں کو بھجوا دیئے۔

کتب خانہ ایک عالیشان قلعہ کے اندر ہے جس میں مرحوم نواب صاحب نے بہت ہی خوبصورت اور بلند عمارتیں بنوائی ہیں۔ میں جب وہاں گیا تو ابر گھرا ہوا تھا۔ باغ کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ حامد منزل وغیرہ عمارتیں سناٹے میں کھڑی تھیں۔ جگہ جگہ بندوق اور سنگین کے پہرہ دار کھڑے تھے مگر وہ بھی خاموش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب مرحوم یہاں سے گئے ہیں اور ان کی جدائی کو ہر چیز محسوس کر رہی ہے۔

کتب خانہ میں داخل ہوا تو وہاں کے عملے نے بہت موزوں خیر مقدم کیا۔ شجاعت علی خاں صاحب نائب مہتمم کتب خانہ نے اپنے پاس لے جا کر بٹھایا اور فوراً تصوف کی کتابوں کی ایک بہت ضخیم فہرست منگا کر میرے سامنے رکھ دی۔

شجاعت علی خاں صاحب علی برادران کے عزیز ہیں۔ نوعمر ہیں اور اپنے فرائض میں بہت مستعد معلوم ہوتے۔ ان کو کتب خانہ کی ترقی کا ذاتی طور پر بھی شوق معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تصوف کی چند کتابیں فہرست سے چھانٹیں اور ان کو منگا کر دیکھا۔ پھر شجاعت علی خاں صاحب نے کتب خانہ کی چند نادر اور نایاب کتابیں منگا کر دکھائیں۔ ایک کتاب پر شاہجہاں بادشاہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت تھی۔ شاہجہاں

کا خط بہت اچھا تھا۔ اسی کتاب پر شاہجہاں کی لڑکی جہاں آرا بیگم کی تحریر بھی تھی جس کا خط پکا تھا۔ میں نے کہا تین سو برس پہلے بھی عورتوں کے خط ایسے ہی ہوتے تھے جیسے آج کل ہوتے ہیں۔ اس تحریر میں بھی جہاں آرا بیگم نے یہ لکھا ہے کہ میں چشتیہ خاندان میں مرید ہوں۔ جہاں آرا بیگم کی قبر پہ بارگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں ہے اور اس پہ جہاں آرا بیگم کی لکھی ہوئی عبارت کندہ ہے جو پڑھی جاتی ہے۔

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبرپوش غریباں ہمیں گیاہ بس است
الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا مرید خواجگان چشت
بنت شاہجہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ۔
سنہ ۱۰۹۲ ہجری۔

چنگیز خاں کی باتصویر تاریخ بھی دکھائی گئی۔ جو فارسی زبان میں ہے۔ مگر خط عربی ہے۔ اس کتاب میں تصویریں نہایت عمدہ ہیں اور ان تصویروں سے چنگیز خانیوں کی شکلیں اور لباس اور ان کی عورتوں کے لباس اور عجیب و غریب رسموں کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں اور سروں پر ٹوپیاں پہنتی تھیں اور ٹوپیوں کے اوپر کئی گچھوں کے پھندنے ہوتے تھے۔ جو کلغی کی طرح اوپر اٹھے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ انگریزی وضع کی چھجے دار ٹوپیاں بھی اوڑھتے تھے اور بوٹ تو سب پہنتے تھے۔

ایک باتصویر دیوان حافظ بھی دکھایا گیا اس کی تصویریں ایسی عمدہ تھیں کہ میں نے ایسی نفیس قلمی تصویریں آج تک نہیں دیکھیں۔

شجاعت علی خاں صاحب نے کتب خانہ کے شیعہ سنی علما سے بھی ملایا۔ جو ایک بڑی تاریخ کی تالیف میں مصروف ہیں اور چھ سات سال سے وہ تاریخ لکھی جا رہی ہے۔ ایک میں ہوں کہ ایک مہینہ میں ۴۰۰ صفحے کی سیرت نبوی لکھ دی اور ایک یہ ہیں کہ ہلا ماٹلا چھ سات برس سے ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ مگر محققانہ تاریخیں اس سے بھی زیادہ محنت اور وقت چاہتی ہیں۔ اور کم وقت میں جو کام کیا جائے وہ زیادہ مستند نہیں ہو سکتا۔

اس کتب خانہ میں بیس پچیس ہزار کتابیں ہیں جن میں نو ہزار قلمی اور نادر کتابیں بھی ہیں۔

شجاعت علی خاں صاحب کمال اخلاق سے قلعہ کے باہر تک پہنچانے آئے اور میں نے مہمان خانہ میں اگر یادداشت لکھی۔ پھر نواب صاحب باندہ سے باتیں کیں۔ اور اس کے بعد نواب صاحب کے محل

خاص باغ میں گیا۔ وہاں چیف منسٹر اور پرائیویٹ سکریٹری اور نواب صاحب کے چھوٹے بھائی صاحب . . . . . سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ نواب صاحب لہارو کے عزیز خسرو مرزا صاحب بھی ملے ایک گھنٹہ سے زیادہ وہاں ٹھہرا۔ پھر سب سے رخصت ہو کر مہمان خانہ میں آیا۔ اور کھانا کھا کر ریل پہ چلا آیا۔

مہمان خانوں کے کنٹرولر واجد علی صاحب بھی ملنے آئے تھے۔ بہت لائق اور منتظم عہدہ دار ہیں انہوں نے صاحب منصرم ریل تک پہنچانے آئے اور ساڑھے آٹھ بجے ٹرین میں سوار کر کے واپس گئے جو گارڈ میری سواری میں تھی اس کے کوچمین شاہ نواز خاں بڑے کلہ جبڑہ کے پٹھان ہیں۔ شیر کی سی صورت ہے اور ان کی باتیں بھی بہادر پٹھانوں کی سی ہوتی ہیں۔

مولانا سید محمد یحییٰ صاحب فرنگی محلی بھی آج لکھنؤ جا رہے ہیں۔ وہ یہاں پانچ دن ٹھہرے مگر نواب صاحب اس قدر کم فرصت اور ریاست کے انتظامات میں مصروف ہیں کہ ان کو ملاقات کا وقت نہیں دے سکے۔ اس لئے آج مولانا واپس جا رہے ہیں۔ کہتے تھے کہ نواب صاحب مرحوم نے ایک دفعہ ان کو بلایا تھا اور بہت سے علما کو جمع کر کے گفتگو کی تھی۔ مگر اس کے بعد میں پھر کبھی یہاں نہیں آیا۔

مرحوم نواب صاحب کی میت ایک صندوق میں بند کر کے امانت رکھ دی گئی ہے۔ صندوق ایک کمرہ میں رکھا ہے اور اس کے دروازہ پر تیغہ لگا دیا گیا ہے۔ نجف اشرف میں مقبرہ تیار ہوا ہے میت وہاں بھیجی جائے گی۔

ساڑھے آٹھ بجے لکھنؤ سے ڈاک گاڑی آئی اور میں اس میں سوار ہو کر نو بجے مراد آباد پہنچا اور فوراً دہلی کی گاڑی میں سوار ہوا۔ جو دوسرے پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ دس بجے تک تاریخ اردو پڑھتا رہا۔ دس بجے کے بعد ٹرین روانہ ہوئی پھر سو گیا۔ صبح چار بجے دہلی پہنچا۔ ٹیلیفون سے گھر کی خیریت معلوم ہوئی۔ کرایہ کی موٹر میں دہلی سے گھر میں آیا۔ سڑک پر سید ابن عربی اور سید نثار علی اور بھولا اور رمجی اور حمید روشنیاں لئے ہوئے کھڑے تھے۔ پہلے زنانہ میں گیا۔ خواجہ بانو بیدار تھیں۔ سب بچے سوتے تھے بورڈنگ ہاؤس میں آیا۔ غسل کر کے نماز پڑھی۔ پھر ڈاک پڑھنے بیٹھ گیا۔ پارہ آج ۸۰ درجہ پر تھا۔

فن کتابیات میں مسلمانوں کا حصہ

افضل حق قرشی ـ حمیدہ شاہ

مسلمانوں کی علمی تاریخ میں "کتابیات" کا آغاز علم و دانش کے آغاز و ارتقاء کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ بہت سے دوسرے علوم و فنون کی طرح "فن کتابیات" کا سرا بھی مسلمانوں کے سر ہے۔ جیوفرے روپر کے بقول :

"معاملے کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اپنی تہذیب کے زریں عہد میں اس وقت عربوں اور خود مسلمانوں نے شارياتی کتابیات پر خاص توجہ دی جب اہل یورپ اس کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں تھے۔"(۱)

عباسی عہد میں علوم کی کثرت تنوع سے اہل علم کتابیات کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ ذخائر علوم سے آگاہی ہو۔ علماء نے موضوعی اور خود نوشت کتابیات کا سلسلہ شروع کیا۔ وراقوں نے مختلف کُتب خانوں کے ذخائر سے فائدہ اٹھا کر اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں کتابیات تیار کیں۔ یہ سلسلہ اتنا پھیلا کہ کتابیات کو فہرست ' برنامج ' ثبت ' مشیخہ ' معجم کے مختلف ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔

نویں ' دسویں صدی عیسوی میں موضوعی کتابیات کی ترتیب و تدوین شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ جابر بن حیان (۷۲۳ـ ۸۱۳) کے نامور شاگرد محرقی کی تصانیف کی دو فہرستیں تھیں۔ ایک فہرست کبیر جو کیمیا گری اور دوسرے فنون سے متعلق تھی اور دوسری فہرست صغیر جو صرف علم کیمیا گری کی کتابوں کے بارے میں تھی۔(۲) حنین بن اسحاق۔ (۸۱۰ـ ۸۷۳) نے جالینوس کی کتابیات مرتب کی۔ اس میں جالینوس کی تصانیف کے مختلف تراجم کا ذکر تھا جو نویں صدی عیسوی تک موجود تھے۔(۳) حنین نے ۱۲۹ کتابوں کی فہرست دی ہے جن میں سے سو کے تراجم خود اس نے کئے۔ ابو بکر محمد بن زکریا رازی (۸۶۴ـ ۹۲۵) نے اس کتابیات پر استدراک "الکتاب فی استدراک ما بقی کتب جالینوس مما لم یذکرہ حنین ولا جالینوس فی فہرست" کے نام سے لکھا۔(۴) ابو زکریا یحییٰ بن عدی (۸۹۳ـ ۹۷۳) ابن ندیم کا ہمعصر تھا۔ ابن ندیم کے بقول اسی عہد میں اقران و معاصرین کی علمی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی۔(۵) اس

نے ایک کتابیات مرتب کی تھی۔ ابن ندیم نے اس سے استفادہ کیا اور اکثر اسکے حوالے دیئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ میں نے یہ چیز یحییٰ بن عدی کی فہرست کتب میں خود اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہے۔(۶) نیز یحییٰ بن عدی نے اپنی فہرست کتب میں ارسطو کی ان تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔(۷) ابو الحسن علی بن کوفی (م ۳۴۰) کی مرتبہ کتابیات کا ذکر بھی ابن ندیم کے ہاں ملتا ہے۔ مورخ ہشام کلبی کے تذکرہ میں ہے کہ میں یہاں اس کی تصنیفات اسی ترتیب سے بیان کروں گا جس طرح ابو الحسن بن کوفی کی تحریر میں ہیں۔(۸) نیز مدائنی کے تذکرہ میں ہے کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابو الحسن بن کوفی کی تحریر میں اس کی مندرجہ ذیل تصنیفات درج ہیں۔(۹) ابو ریحان البیرونی (۹۷۳۔ ۱۰۴۸) کی مرتب کردہ رازی کی کتابیات(۱۰) ابن رضوان (۹۹۸۔ ۱۰۶۱) کی مرتب کردہ جالینوس کی کتابیات(۱۱) اور ابن قیم (۱۲۹۲۔ ۱۳۵۰) کی مرتب کردہ ابن تیمیہ کی کتابیات(۱۲) بھی موضوعی کتابیات کی ذیل میں آتی ہیں۔

خود نوشت کتابیات کے ضمن میں جابر بن حیان (۷۳۷۔ ۸۱۳) اور ابو بکر محمد بن زکریا رازی (۸۶۴۔ ۹۲۵) کے حوالے ملتے ہیں۔ ابن ندیم نے ان سے استفادہ کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ جابر اپنی کتاب فہرست میں خود لکھتا ہے کہ ان کتابوں کے بعد میں نے تیس رسالے تصنیف کئے جو بے نام ہیں۔ پھر ان کے بعد میں نے چار مقالات تصنیف کئے۔(۱۳) نیز ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی تصانیف جو خود اسی کی فہرست سے منقول ہیں۔(۱۴) جابر بن حیان نے اپنی نگارشات کی دو فہرستیں مرتب کی تھیں۔ ایک بڑی جو فلسفیانہ اور کیمیائی تصنیفات کی اور دوسری چھوٹی جس میں اسکی کیمیائی تصنیفات درج تھیں۔ جابر کی کتابوں کی ایک تیسری فہرست بھی تھی۔(۱۵) ابن عارف اندلسی (م ۱۰۰۰) نے اپنی کتابوں کی کتابیات مرتب کی تھی۔(۱۶) ابن جوزی (۱۱۳۶۔ ۱۲۰۰) نے اپنی کتابوں کی فہرست مرتب کی۔(۱۷) سیوطی نے (۱۴۴۵۔ ۱۵۰۵) نے اپنی تصنیفات کی فہرست مرتب کی۔(۱۸) ابن طولون دمشقی (۱۴۷۳۔ ۱۵۴۶) نے اپنی نگارشات کی کتابیات مرتب کی۔(۱۹)

دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ابن ندیم (۹۳۵۔ ۹۹۰) نے الفہرست مرتب کی۔ اس نے اس عہد میں آنکھ کھولی جب اسلامی تہذیب اپنے اوج کمال پر پہنچ چکی تھی اور کتابوں کی کثرت کیوجہ سے کتب خانوں کا رواج بھی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے عہد کی کتابوں کا گہرا مطالعہ بھی کیا تھا اور اس عہد کے علماء اور فضلاء سے اسے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ اس کے اساتذہ کی فہرست میں الحسن بن سوار بن الخمار، ابو الفرج اصفہانی، ابو الحسن محمد بن یوسف الناقد، ابو اسحاق السیرافی، اسماعیل الصفار وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ

دوسرے اصحاب علم سے بھی ملتا تھا اور ان کے کتب خانوں سے استفادہ بھی کرتا تھا۔
الفہرست اس کے وسیع علم و مطالعہ کا نچوڑ ' اساتذہ سے استفادہ اور کتابی معلومات کا حاصل ہے۔ یہ کتاب دس مقالوں پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ کے تحت مختلف علوم و فنون کا ذکر ہے۔ مصنفین کا ذکر ترتیب زمانی سے کیا گیا ہے۔ پھر ان کی کتابوں کے نام تحریر کئے ہیں۔ اہم کتب کے بنیادی افکار و آراء کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے اصل مراجع و مصادر کی نشاندہی کی ہے۔ عموماً" اہم علمی موضوعات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہر موضوع کی ابتداء میں ایک تمہید ہے ' جس میں اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں اور ان کے مصنفین کے اعداد و شمار بھی موجود ہیں۔ الفہرست میں صرف کتابوں کے اعداد و شمار ہی پر اکتفا نہیں کیاگیا بلکہ اس میں کتابوں اور مصنفین کے متعلق نقد و بحث اور تحقیق بھی کی گئی ہے۔ الفہرست میں وہ تحریر کرتا ہے :

یہ عرب و عجم کی ان تمام کتابوں کی فہرست ہے جو عربی زبان اور اس کے رسم الخط پر مشتمل ہیں۔۔۔۔۔۔ اس وقت سے معلومات فراہم کی گئیں جب سے وہ علوم عالم وجود میں آئے اور ہمارے زمانہ یعنی ۳۷۷ھ تک پائے جاتے ہیں۔ (۲۰)

ظاہر ہے کہ ان کا احاطہ کتابیات کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ خود ابن ندیم نے جابجا ان کا حوالہ بھی دیا ہے۔ لیکن الفہرست کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ "تمام" کا لفظ کثرت کتب کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد مصنفین کی مشہور متداول کتابوں کا تذکرہ ہے۔ فقیہ زعفرانی کے تذکرہ میں ہے :

"یہاں ہم زعفرانی کی روایت کردہ کتابوں کے نام لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیونکہ وہ بہت کم تعداد میں ہیں اور ان میں بیشتر دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکی ہیں۔ اور بعد میں وہ قید تحریر میں نہیں لائی گئیں۔(۲۱)

منصوری کے تذکرہ میں ہے کہ وہ جلیل القدر اور عمدہ کتابوں کا مصنف ہے۔(۲۲)

الفہرست میں کتابوں کے ناموں کے اندراج میں کتاب کے معروف و غیر معروف دونوں نام نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مثلاً" عینیہ بن منہال کی کتاب الامثال السائرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک جگہ میں نے اس کتاب کا نام "الابیات السائرۃ" لکھا ہوا دیکھا ہے۔(۲۳) سعید بن حمید کی کتاب "انتصاف العجم من العرب" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تسویہ کے نام سے معروف ہے۔ (۲۴)

مختلف مقام پر ماں باپ کی نسبت کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً" محمد بن حبیب کے متعلق لکھا ہے کہ حبیب ماں کا نام ہے۔(۲۵) اسماعیل بن علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ علیہ ماں کا

مصنفین کے اسلوب تحریر کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں مثلاً" ہثالی کے بارے میں تحریر ہے کہ اس کی تصانیف میں سے ایک کتاب نحو الغریب ہے جو انداز و اسلوب میں تو کتاب العین سے ہم آہنگ ہے لیکن ترتیب میں اس سے مختلف ہے۔(۲۷) کیتی کے بارے میں تحریر ہے کہ وہ اچھا مولف ہے(۲۸) مصنفین کے علمی مقام و مرتبہ پر بھی بات کی ہے۔ مثلاً" اصمعی کے بارے میں لکھا ہے کہ ہمارے شیخ ابو سعید نے ابوالعباس مبرد کی روایت بیان کی ہے کہ اصمعی شعر اور معانی میں سب پر برتری اور تفوق رکھتا تھا(۲۹)۔ مصنفین میں باہم فرق اور زیادہ مہارت کی بات بھی کی ہے۔ مثلاً" ابومخنف کے ضمن میں لکھا ہے کہ میں نے احمد بن حارث خزاز کی ایسی تحریر پڑھی ہے کہ اہل علم کے نزدیک ابومخنف معاملات عراق' اس کے واقعات اور فتوحات کے بارے میں سب سے فائق ہے۔ مدائنی امور خراسان' ہند اور فارس میں' واقدی امور حجاز اور سیرت میں دوسروں کی نسبت زیادہ آگاہ ہیں۔ البتہ فتوحات شام کے واقعات و اطلاع کے بیان میں سب برابر کے شریک ہیں۔(۳۰) کوئی کتاب اگر کسی سے منسوب ہو تو اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً" فتح بن خاقان کی کتاب البستان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ فتح بن خاقان کی طرف منسوب ہے۔ مگر جو شخص اسے معرض تصنیف میں لایا اس کا نام محمد بن عبدربہ اور لقب راس البغل ہے۔ (۳۱) بعض مقامات پر کتاب کے مندرجات کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے۔ مثلاً" ابن ابی طیفور کی کتاب "ابواب الخلفاء" کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے مقصود ان لوگوں کا ذکر ہے جن سے خلفاء مانوس تھے' جن سے مشورہ لیتے تھے اور جن سے فکری و عقلی راہنمائی حاصل کرتے تھے اور امداد و استواری کے طالب ہوتے تھے۔(۳۲) مشترک مصنفین کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً" بنو صباح کے تحت محمد' ابراہیم اور حسن تین علمائے نجوم اور ان کی تصانیف کا ذکر ہے۔ اس میں کتاب "برھان صنعۃ الاسطرلاب" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب محمد نے تصنیف کی جو ناتمام تھی۔ اسے ابراہیم نے مکمل کیا۔ اسی طرح کتاب "عمل نصف النہار بجھۃ واحدۃ بالہندسہ" کے بارے میں ہے کہ اس کی تصنیف کا آغاز محمد نے کیا اور تکمیل حسن نے کی۔(۳۳)

مختلف دواوین کے اشعار کی تعداد بھی بیان کی ہے۔(۳۴) جگہ جگہ کتابوں کے اوراق کی تعداد بتائی ہے۔(۳۵) ایک مقام پر وضاحت کی ہے کہ جہاں کہیں بغیر کسی نسبت کے ورق کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد "ورق سلیمانی" ہے جو بیس سطروں کو محیط ہوتا ہے' یعنی ہر ورق کے صفحہ میں بیس سطریں ہوتی ہیں۔ ہر جگہ اس بات سے ان اشعار کی کمی اور بیشی کا حساب لگایا جاسکے۔ یہ اندازہ اغلبیت اور تقریب پر مبنی ہے کیونکہ ہمارے برسوں کے تجربہ سے ہمیں یہی ملا ہے۔(۳۶)

ابن ندیم نے کسی اہم کتاب کا نسخہ کہیں دیکھا تو اس کی تفصیل پیش کی مثلاً" زجاج نے معتضد کی خواہش پر نحو کی کتاب "جامع المنطق" کی شرح لکھی۔ اس کا ایک ہی نسخہ تھا جو معتضد کے کتب خانے میں تھا۔ ابن ندیم نے تحریر کیا ہے کہ سلطنت کی تباہی و بربادی کے بعد یہ شرح سلطان کے متعلقات میں سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں دستیاب ہوئی۔ اس نے اسے دیکھا ہے۔ باریک و نرم طلی کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے زجاج نے بڑی عظمت حاصل کی۔(۳۷)

ابن ندیم نے کتابوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ماخذ کی نشاندہی بھی کی ہے۔ چنانچہ جن کتابوں کو خود دیکھا' ان کے کاتبوں کے ناموں کی وضاحت کی ہے' جن علماء سے معلومات حاصل کیں ان کا حوالہ دیا ہے۔ اور دوسرے ذرائع مثلاً" کتابیات وغیرہ کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

ابن ندیم کی الفہرست کے بعد دوسری اہم کتابیاتی تالیف محمد بن الحسن بن علی ابو جعفر الطوسی (۹۹۵۔۱۰۶۷) کی فہرست "کتب الشیعہ" ہے۔ وہ شیعہ مذہب کا عظیم مجتہد تھا اور شیخ الطائفہ یا صرف "الشیخ" کے لقب سے مشہور ہے۔

اس کی اساس ابن ندیم کی الفہرست پر ہے لیکن شیعہ مصنفین اور ان کی تصانیف کے بارے میں خاصے وقیع اضافے کئے ہیں۔ الفہرست اور فہرست کتب الشیعہ کے درمیان اور بھی بہت سی کتابیات مرتب کی گئیں۔ الطوسی اپنی فہرست کے دیباچے میں اس امر کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ تحریر کرتا ہے:

"جو سے پہلے میرے دوستوں نے فہرستیں مرتب کیں لیکن ایک مرتبہ ابوالحسن احمد بن الحسین الغضائری کے سوا سبھی ناقص تھیں۔ (۳۸) دوسری کتابیات میں ابن نہیک' احمد بن محمد' ابن بابویہ کی مرتب کردہ کتابیات شامل تھیں۔(۳۹)

فہرست میں طوسی نے ۸۸۳ قدیم اور معاصر مصنفین کی تصانیف کی فہرست دی ہے۔ اندراجات مصنفین کے ناموں کے تحت حروف تہجی کے اعتبار سے پہلے حرف تہجی کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں۔(۴۰)

طوسی کی فہرست کے بعد دوسری اہم کتابیاتی تالیف شیخ احمد بن علی النجاشی (م ۱۰۴۳) کی اسماء الرجال ہے۔ اس کا زمانہ تالیف بھی تقریباً" وہی ہے جو الطوسی کی فہرست کا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک مکمل کام ہے لیکن طوسی کی فہرست کے ساتھ تقابل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس کا نیا ایڈیشن ہے۔ یہ زیادہ مکمل اور صحیح ہے۔ اس میں ۱۲۲۹ مصنفین کا

رشید الدین ابی جعفر محمد بن علی بن شہر اشوب السروی (۱۰۹۶ - ۱۱۹۲) کی "کتاب معالم العلماء فی فہرست کتب الشیعہ و اسماء المصنفین" الطوسی کی فہرست کا نیا ایڈیشن ہے۔(۴۱) اسے مولف نے ۵۷۷ھ ۱۱۸۱ کے دوران مرتب کیا۔ اس نے ابتداء سے اپنے عہد تک کے علماء اور ان کی تصانیف کی فہرست دی ہے۔ اس میں الطوسی اور النجاشی کی فہرستوں پر زیادہ اضافہ نہیں۔ ماسوا ان مصنفین کی کتابوں کے جو الطوسی اور النجاشی سے چھوٹ گئے یا ان کے عہد کے بعد ہوئے۔(۴۲)

منتجب الدین علی بن ابی القاسم القمی (۱۱۱۰ - ۱۱۸۹) کی "اسماء مشائخ الشیعہ و مصنفیہم" الطوسی کی فہرست کا ضمیمہ ہے۔ یہ ۵۷۷ھ ۱۱۸۱ کے دوران مرتب کی گئی۔ اس میں ۵۰۰ مصنفین کا تذکرہ ہے۔ جو یا تو الطوسی کے معاصر تھے یا متاخر اور جن کا ذکر فہرست کتب الشیعہ میں نہیں۔(۴۳)

ابو بکر محمد بن خیر بن عمر بن خلیفہ الاموی الاشبیلی (۱۱۰۸ - ۱۱۷۹) ماہر لسانیات اور محدث تھا۔ اس کی شہرت کا سبب وہ کتابیات ہے جو "الفہرست مارواہ عن شیوخہ من الدواوین المصنفہ فی ضروب العلم و انواع المعارف" کے نام سے معروف ہے۔ یہ ہمارے کتابیاتی ورثے میں اہم کتب میں سے ہے۔ تقریباً" ان ۱۴۰۰ کتب پر مشتمل ہے جو اس نے اندلس کے مختلف مقامات پر اپنے اساتذہ سے پڑھیں یا جن کی انہوں نے اسے اجازت دی۔ تعارف کے بعد مصنف نے ان کتب کی فہرست دی ہے جو اس نے قرآنی علوم کے سلسلے میں پڑھیں۔ پھر حدیث، سیرہ انساب، فقہ مالکی، صرف و نحو، لغت، ادب اور شاعری کی کتب کا بیان ہے اور آخر میں ان کتابیات کا تذکرہ ہے جو اس سے پہلے مرتب کی گئیں۔ وہ ہر مضمون میں اپنے اساتذہ کا ذکر کرتا ہے اور مختلف مقامات کے حوالے سے ان کی جماعت بندی کرتا ہے۔(۴۴)
مولف روایت کا اسلوب اپنائے ہوئے ہے۔(۴۵) یہ کتابیات ابن خیر کے عہد کے مسلم سپین میں پائی جانے والی اور پڑھائی جانے والی کتابوں کے سلسلے میں ایک اہم ترین دستاویز ہے۔(۴۶)

طاش کبری زادہ (۱۴۹۵ - ۱۵۶۱) ابن حجر اور دیگر علمائے کبار کا معاصر تھا۔ اس کی تصنیف "مفتاح السعادۃ" و "مصباح السیادہ علوم اسلامیہ" کی تاریخ و تصنیف کے سلسلے میں دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب قیمتی کتابیاتی معلومات کو سموئے ہوئے ہے۔ اس میں اہم مولفین اور تالیفات کا ذکر ہے۔ مصنف نے کتاب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔
حصہ اول نظری طریقے کو حاصل کرنے کی کیفیت ...

، مباحث پانچ فصلوں میں تقسیم ہیں۔ فصل اول میں عقلی علوم کا ذکر ہے۔ فصل دوم میں ان
ام کا ذکر ہے جو الفاظ سے متعلق ہیں اور اس ضمن میں تدوین شدہ کتابوں کا نام اسی فصل
، شاعروں مصنفوں ' مورخیوں ' نثر نگاروں ' لغت نویسوں ' نحویوں اور قاریوں کے حالات
ہے ہیں۔ علم تاریخ کا اسی فصل میں ذکر ہے۔ مورخین کے حالات اور ان کتابوں کا ذکر
ہے۔ فصل سوم میں علم منطق ' علم آداب الدرس ' علم الجدل کا اور ان کے مصنفین کا ذکر
ہے۔ فصل چہارم میں علوم حکمیہ ' علم الکلام ' طب و زراعت وغیرہ کا ذکر ہے اور ان دوائر
ں مصنفین اور کتب کا ذکر ہے۔ فصل پنجم میں علم الاخلاق ' خانہ داری ' علوم شرعیہ مثلاً
رات ' تفسیر ' حدیث ' فقہ ' اصول فقہ اور ان کے علماء کے حالات اور تصانیف کا تذکرہ ہے۔
دوسرے حصے میں فصل ششم ترکیہ سے متعلق علوم کے بارے میں ہے۔(۴۷)

حاجی خلیفہ (۱۰۴۸ـ ۱۶۵۷) کی کشف الظنون عن اسماء الکتب و الفنون ' مفتاح السعادۃ کا تکملہ اور ضمیمہ ہے۔(۴۸) اس نے اس کتاب کا مواد جمع کرنے کے لئے تقریباً بیس برس صرف کئے۔ یہ پندرہ ہزار سے زائد اندراجات پر مشتمل ہے۔ حاجی خلیفہ نے اندراج کے لئے مصنف کی بجائے عنوان کتاب کا استعمال کیا ہے۔ اندراجات کی ترتیب عربی حروف تہجی کے مطابق ہے۔ ہر کتاب سے متعلق وہ اس کے مصنف ' سال تصنیف ' کتاب کے حصوں اور ابواب کی تقسیم کا اصول اس کی مختلف شروح ' فرہنگوں اور ترددات و تنقیدات کی تفصیلات اور کتاب کا موضوع بیان کرتا ہے۔ اس نے ان تمام کتابوں کا جو اس نے دیکھیں پہلا جملہ لکھ دیا ہے۔ تاکہ کتابوں کے پہچاننے میں آسانی ہو۔ اس نے کشف الظنون میں ۹۵۰۰ سے زائد مصنفین اور ۳۰۰ سے زائد علوم و فنون کا احاطہ کیا ہے۔(۴۹) بعد کے لوگوں نے اس کے متعدد ضمیمے مرتب کئے۔ ان میں سے آخری اسماعیل پاشا بغدادی (م ۱۹۲۰) کی "ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون" ہے۔ اس نے تیس برس اس پر کام کیا اور انیس ہزار (۱۹۰۰۰) اندراجات مرتب کئے۔(۵۰)

ان کے علاوہ سید اعجاز حسین کنتوری (۱۸۲۵ـ ۱۸۷۰) کی "کشف الحجب و الاستار عن اسماء الکتب و الاسفار" محمد محسن المعروف آقا بزرگ الطہرانی و علی نقی منزوی کی الذریعہ الی تصانیف الشیعہ ' سید عبدالحی لکھنوی (۱۸۶۹ـ ۱۹۲۳) کی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ' عربی زبان میں مختلف علوم کے بارے میں فواد سیزگین کی جرمن کتابیات ' یوسف الیان سرکیس کی معجم المطبوعات العربیہ و المعربہ ' مصر سے السمیل الشتانی ' ترکی سے محمد طاہر کی عثمانلی مولفری اور توزک علیہ گرافیاسی ' ایران سے خان بابا مشار کی فہرست کتابہائی چاپی ایران ' پاکستان سے

حوالہ جات

۱۔ Geoffrey Roper "The bibliography of the Arab Middle East" in Arabic Resources ed David Burnett (London Mansell 1981) 16

۲۔ ابن ندیم، الفہرست (مصر المکتبۃ التجاریۃ الکبری، ۱۳۴۸ھ) ص ۵۰۰

۳۔ ایضاً ایضاً ص ۴۰۳

۴۔ ایضاً ایضاً ص ۴۱۷

۵۔ ایضاً ایضاً ص ۳۶۹

۶۔ ایضاً ایضاً ص ۴۵۲

۷۔ ایضاً ایضاً ص ۳۵۲

۸۔ ایضاً ایضاً ص ۱۴۰

۹۔ ایضاً ایضاً ص ۱۴۸

۱۰۔ Arab Islamic bibliography ed Diana Grimwood Jones Derek Hopwood and J.D Pearson (Sussex England Harvester Press 1977) 5

۱۱۔ محمد تقی دانش پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ اہدائی آقای سید محمد مشکوۃ بہ کتابخانہ دانشگاہ تہران، جلد سوم بخش دوم، (تہران دانشگاہ تہران ۱۳۳۲)

۱۲۔ پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ آقای سید محمد مشکوۃ، جلد سوم بخش سوم، (۱۳۳۵)۔

۱۳۔ ابن ندیم، الفہرست، ص ۲۵۷

۱۴۔ ایضاً ص ۲۹۹

۱۵۔ پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانۂ آقای سید محمد مشکوۃ جلد سوم بخش دوم

۱۶۔ ایضاً ایضاً جلد سوم، بخش دوم۔

۱۷۔ ایضاً ایضاً

۱۸۔ بروکلمان "ابسوطی" در دائرہ معارف اسلامیہ II 6۔

۱۹۔ پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ آقای سید محمد مشکوۃ، جلد سوم، بخش دوم

۲۰۔ ابن ندیم، "الفہرست" ص ۲

۲۱۔ ایضاً ص ۲۹۷

۲۲۔ ایضاً ص ۳۰۶

۲۳۔ ایضاً ص ۷۲

۲۴۔ ایضاً ص ۱۵۱

۲۵۔ ایضاً ص [illegible]

۲۶۔ ابن ندیم، الفہرست ص ۳۱۷

۲۷۔ ایضاً ص ۱۲۴

۲۸۔ ایضاً ص ۱۲۵

۲۹۔ ایضاً ص ۸۲

۳۰۔ ایضاً ص ۱۳۷

۳۱۔ ایضاً ص ۱۹۹-۱۰۰

۳۲۔ ایضاً ص ۱۵۹

۳۳۔ ایضاً ص ۲۸۵

۳۴۔ ایضاً ص ۲۲۳-۲۴۲

۳۵۔ ایضاً ص ۱۳۲، ۱۵۷، ۱۹۷

۳۶۔ ایضاً ص ۲۲۷

۳۷۔ ایضاً ص ۹۰

۳۸۔ الطوسی "فہرست الطوسی (کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۵۵ء) کل ۱-۳

۳۹۔ A. Sprenger, 'Preface' in Fihris al Tusi (Calcutta Asiatic Society 1858) 1

۴۰۔ ایضاً ایضاً ص ۴

۴۱۔ عباس اقبال "دیباچہ" در کتاب معالم العلماء، مولفہ ابن شہر آشوب (تہران ۱۳۵۳ھ) ص ۵

۴۲۔ ایضاً ایضاً ص ۱۱

۴۳۔ ایضاً ایضاً ص ۴

۴۴۔ Encyclopaedia of Islam New ed., SV "Ibn Khayr" by C.H Pellat

۴۵۔ محمد ماہر حمادہ "المصادر العربیہ والمعربۃ" (بیروت موسستہ الرسالۃ، ۱۹۸۰ء) ص ۳۷

۴۶۔ Pellat "Ibn Khayr" op.cit

۴۷۔ حمادہ، المصادر ص ۴۱-۴۲

۴۸۔ ایضاً ص ۴۰

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ پژوہ، "دیباچہ" در فہرست کتابخانہ آقای سید محمد مشکوۃ جلد سوم بخش اول

●●

[illegible]

ضمیمہ ۲

بعض اہم تحریریں جو پیش نظر مجموعے کی ضخامت بڑھ جانے کے سبب نکالنی پڑیں کم سے کم انکا
ذکر تو کر ہی دیا جائے تاکہ اگر کسی کو ضرورت ہو تو ان حوالوں کے ذریعے آسانی سے اپنے مواد تک پہنچ سکے یہ دستاویز دیا ہے۔

المعارف اشاریہ (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور)	مرتبہ، اختر النسار	اقبال	اکتوبر ۱۹۹۱ء
''الشریعہ'' جلد ۳، ۴ (اکتوبر ۱۹۹۱ء تا ستمبر ۱۹۹۲ء) کی مکمل فہرست۔		الشریعہ	ستمبر ۱۹۹۲ء
ہمارا ادب (کشمیر کلچرل اکیڈمی) سرینگر کا اشاریہ۔	عبد المجید حاجنی	از یانت	جلد ۹ شمارہ ۱۲، ۱۳، ۱۹۹۲ء
خدا بخش لائبریری میں اردو رسائل پر خام مواد	شعائر اللہ خاں	اخبار اردو	فروری ۱۹۹۲ء
ساختیات یا ترکیبیت	حسین مجید (پٹنہ)	عصری آگہی	اگست۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء
دیباچہ غرۃ الکمال کی معنویت	قاضی جمال حسین	فکر و نظر	جنوری ۱۹۹۳ء
امیر خسرو اساطیر کے نرغے میں	رشید ملک	المعارف	مئی، جون ۱۹۹۳ء
خالق باری	گیان چند	ایران اردو	اپریل ۱۹۹۳ء
مولانا سید سلیمان اشرف صاحب	شبیر احمد نوری، سید نور محمد قادری	اقبال	" ۱۹۹۲ء
رشید احمد صدیقی مرحوم (مضمون) بیٹے کا سیہ	رشید احمد صدیقی	افکار	" ۱۹۹۲ء
عمل تحقیق کی قاضی عبد الودودی روایت	محمد حسن	زبان و ادب	۱۸ (۲-۱)
قاضی عبد الستار کا افسانہ آنکھیں	قاضی عبد الستار	آفتاب (خصوصی شمارہ) ۱۹۲۰ء۔۔۔۱۹۸۰ء	
ایک پاکستانی القدس میں (سفرنامہ)	محمد مہربان احسان	اردو ڈائجسٹ	اپریل ۱۹۹۳ء
دانشور، نقاد فراق گورکھپوری	جمیل جالبی	نقوش (شمارہ ۱۴۰)	نومبر و دسمبر ۱۹۹۲ء

شناگو سے شناگو (سفرنامہ)	مظفر الدین فاروقی	آگہی	ستمبر ۱۹۹۲ء
شیشہ (افسانہ)	" "	مریبہ	جون ۱۹۹۱ء
ریختہ (")	" "	"	جنوری ۱۹۹۳ء
لال گنبد کا پتھر (افسانہ)	" "	"	جون، جولائی ۱۹۹۳ء
مذہب کون؟	" "	... ...	... ...
خواجہ احمد عباس کا افسانہ: سردار جی	خواجہ احمد عباس	روشن خیال (۴)	
آملسنہ ماکی نے عجائب خواب (فارسی افسانہ)	محسن ولادی (ترجمہ) نیر مسعود	نیا دور (لکھنؤ)	جنوری ۱۹۹۳ء
مکتوبات شیخ الاسلام کا ایک مطالعہ	عتیق الرحمٰن سنبھلی	الفرقان	جنوری فروری ۱۹۹۳ء
پطرس بخاری کا مضمون: علم کا وسیلۂ اظہار	احمد سلطان	قومی زبان (آندھرا)	مئی، جون ۱۹۹۳ء
مولانا آزاد کا الہلال اور نئی روشنی	سیدہ سیدین	اسلام اور عصر جدید	اکتوبر ۱۹۹۲ء ۴/۲۴
رئیس المترجمین حنین بن اسحاق	علی عبداللہ الدفاع	آیات	ستمبر۔ دسمبر ۱۹۹۳ء
ابن نفیس۔ حیات و خدمات	عبدالعلی	"	جنوری۔ اپریل ۱۹۹۳ء
ابن الہیثم۔ عظیم ماہر بصریات	احمد مرسی	"	مئی۔ اگست ۱۹۹۳ء
عرب جہاں راں اور انجم شناسی	حسن صالح شہاب	"	" " "
اسپین میں عربی علوم کے تراجم	سعد عبداللہ البشری	"	" " "
ترجمۃ المسویۃ بین الافادہ والقبول	محمد عبدالسلام	فکر و نظر (علیگڑھ)	جنوری ۱۹۹۳ء
حضرت امام مالکؒ اور آپکے فقہی اصول	احسان اللہ فہد فلاحی	اسلام اور عصر جدید	اپریل ۱۹۹۲ء
روزہ اور اس کی حکمتیں	اسحاق بھٹی	المعارف	فروری، مارچ ۱۹۹۳ء
مسلم پرسنل لا میں مداخلت	... ...	دین دنیا	مارچ ۱۹۹۳ء
خاندانی منصوبہ بندی پر ایک نظر	رشید احمد جالندھری	المنار (لاہور)	فروری، مارچ ۱۹۹۳ء
جدید حیاتیاتی علوم اور اسلام	محمد آفتاب شیخ	المعارف	" " "
قائد اعظم اور سیکولر سیاست	سبط حسن	روشن خیال	۴/۸

سر ظفر اللہ نے قائد اعظم کو کافر سمجھ کر ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔	قمر الحسنین	نقیب ختم نبوت	مئی ۱۹۹۳ء
ایمان اور عقلیت کے درمیان تعلق	پال ہیڈلیم / سید جمال الدین	اسلام اور عصر جدید	اپریل ۱۹۹۲ء
یہ سید وقتی فروغ شب تک کی بات ہے (ایضاً)	راحت سعید	ذہن جدید	جون۔ اگست ۱۹۹۳ء
تشخص کا بحران	عالم خوندمیری	المعارف	جنوری ۱۹۹۳ء
تعلیم و تجربہ بچوں کا عہد طفولیت چھین رہا ہے	ایم۔ اے۔ سراج	آموزگار	مئی۔ جون ۱۹۹۳ء
سرکاری درسی کتابوں میں ترجیحات کا خلاصہ	حبیب اللہ اعظمی	رفیق منزل	مارچ ۱۹۹۳ء
ترجمان القرآن: قرآن مجید کی ایک اچھوتی اور منفرد تفسیر	عالم خوندمیری	المعارف	خصوصی شمارہ ۹ اور ۱۰
فن سیر و مغازی: ایک تعارف	قاضی اطہر مبارکپوری	الحق	جنوری۔ فروری ۱۹۹۳ء
مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا	علی مظفر نواب	زبان و ادب	۱۸(۳-۴)، ۱۹(۱-۲)
ہندوستان کا ایک جدید غزل گو: ظفر گورکھپوری	رؤف امیر	فنون	ستمبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء
امیر شکیب ارسلان	سید احتشام الدین ندوی	الحق	جنوری۔ فروری ۱۹۹۳ء
جے پور کے دو قدیم رسائل	ڈاکٹر فیروز احمد	نخلستان	اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء
راجستھان میں تحقیق: دانش گاہوں سے باہر	پروفیسر نثار احمد فاروقی	نخلستان	اپریل۔ جون ۱۹۹۳ء
خوشامدی ادب: کیوں اور کیسے؟	محمد حسن	عصری ادب	اپریل ۱۹۹۳ء
ڈم ڈم کولی: شخصیت اور فن	فاروق بخشی	نخلستان	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۲ء
محمد حسن: اپنے بارے میں	محمد حسن	عصری ادب	اپریل ۱۹۹۳ء
کلام اقبال کی بازیافت	اکبر حیدری کاشمیری	شیرازہ (کشمیر)	جلد ۲۹/۲، ۵

اقبال پر اہم مضامین جو مجموعے کی ضخامت بڑھ جانے کے سبب ضمیمہ نمبر ا میں نہ آسکے۔

علامہ اقبال اور خطائے الہام	مرزا محمد منور	اقبال	اکتوبر ۱۹۹۱ء
اقبال اور خانصاحب منشی سراج الدین احمد (میر منشی) - (۱)	کلیم اختر	"	" "
علامہ محمد اسد اور علامہ محمد اقبال	" "	"	اکتوبر ۱۹۹۲ء تا جنوری ۱۹۹۳ء
اقبال اور میاں محمد شاہ نواز	افضل حق قریشی	"	اپریل ۱۹۹۳ء
اقبال کا نادر و نایاب کلام	پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری	شیرازہ	۲۰/۳/۵
کلام اقبال کی بازیافت - ایک حیرت انگیز دریافت	" "	اکادمی	جنوری - جون ۱۹۹۳ء
علامہ محمد اقبال اور خان صاحب میر خورشید احمد	کلیم اختر	اقبال	جولائی ۱۹۹۳ء
علامہ اقبال اور عرشی (۱)	محمد اقبال شاہد	دانش (۲۳)	ستمبر ۱۹۹۲ء
تیموری مغل عہد کے شعراء اور اقبال	فرخ جلالی	اقبال	اکتوبر ۱۹۹۲ء تا جنوری ۱۹۹۳ء
علامہ محمد اقبال اور خواجہ محمد شجاع ناموس	ڈاکٹر رحیم بخش شاہین	"	" "
سید نور محمد قادری اور اقبالیات	سید محمد عبداللہ قادری	"	" "
زمیندار کالج گجرات میں اقبال شناسی — مجلہ شاہین میں مندرج مضامین	ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری	"	" "
اشاریۂ اقبالیات امروز (زمانی اعتبار سے)	تسلیم احمد تصور	"	" "
تشابہات اقبال	محمد منصور عالم	شب خون	جنوری، فروری ۱۹۹۳ء
علامہ اقبال کا خطبۂ لاہور (آل انڈیا مسلم کانفرنس لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء)	مترجم: پروفیسر محمد جہانگیر عالم	اقبال	اکتوبر ۱۹۹۱ء
سر محمد اقبال کا خطبۂ صدارت (بالہ آباد آل انڈیا مسلم لیگ دسمبر ۱۹۳۰ء)	مترجم: سید نذیر نیازی	"	" "
اقبال، قائد اعظم اور کشمیر	ترجمہ: محمد سہیل	المعارف	اپریل ۱۹۹۳ء
فکر اقبال میں شخصیت، تقدیر اور وقت	عالم خوندمیری	"	مئی، جون ۱۹۹۳ء
خدا رحمت کند اقبال و آزاد کے مابین تفاوت رہ	سید حسن احمد	فکر و نظر (علیگڑھ)	

ضمیمہ-۳

"اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں"

مکمل فہرست

فہرست

تشکیل (کراچی) ۵۸
تعمیر ہریانہ (چنڈی گڑھ) ۵۹
تلاش جدید (نئی دہلی) ۶۰
تمثال (کراچی) ۶۱
توازن (مالیگاؤں) ۶۳
توحید (ایران) ۶۷
تہذیب (کراچی) ۶۸
تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) ۶۹
جامعہ (دہلی) ۷۰
جدید فروغ اردو (لکھنؤ) ۷۰
جمنانٹ (ہریانہ) ۷۱
چہار رنگ (دہلی) ۷۲
چھاؤں (دہلی) ۷۲
حجاز جدید (دہلی) ۷۴
حریم (لکھنؤ) ۷۵
حیات نو (بلریا گنج، اعظم گڑھ) ۷۶
خاتون مشرق (دہلی) ۷۷
خبرنامہ (لکھنؤ) ۷۸
خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ) ۷۹
خرام (کانپور) ۸۴
دارالسلام (مالیرکوٹلہ) ۸۵
دارالعلوم (دیوبند) ۸۵
دانش (اسلام آباد) ۸۶
دائرے (کراچی) ۸۷
دریافت (کراچی) ۸۸
دستک (ڈھاکہ) ۸۹
دعوت صادق (پٹنہ) ۹۱
دعوت و عزیمت (دہلی) ۹۲
دوشیزہ (کراچی) ۹۳
دین دنیا (دہلی) ۹۴
ذہن جدید (دہلی) ۹۵
راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) ۹۷
راہ اسلام (دہلی) ۹۸
راہ اعتدال (عمرآباد) ۹۹
رفیق منزل (دہلی) ۱۰۰
روح ادب (کلکتہ) ۱۰۱
روشن خیال (کراچی) ۱۰۲
رہبر صنعت و تجارت (کلکتہ) ۱۰۳
رہگذر (حیدرآباد) ۱۰۳
ریاض الجنۃ (جونپور) ۱۰۴
زبان وادب (پٹنہ) ۱۰۵
زرین شعاعیں (بنگلور) ۱۰۶
زندگی نو (نئی دہلی) ۱۰۷
سائنس کی دنیا (نئی دہلی) ۱۰۷
سب رس (حیدرآباد) ۱۰۸
سب رس (کراچی) ۱۰۹
سچی کہانیاں (کراچی) ۱۱۰
سرمایہ (کلکتہ) ۱۱۱
سنی دنیا (بریلی) ۱۱۲
سوغات (بنگلور) ۱۱۳
سہیل (گیا) ۱۱۶
شاعر (بمبئی) ۱۱۷
شان ہند (دہلی) ۱۱۸
شب خون (الہ آباد) ۱۱۸
شمع (نئی دہلی) ۱۱۹
شہود (کلکتہ) ۱۲۰
صحیفہ (لاہور) ۱۲۱
صدا رنگ (نئی دہلی) ۱۲۲
صریر (کراچی) ۱۲۳
صفا (حیدرآباد) ۱۲۴
ضیاء وجیہ (رام پور) ۱۲۵
طلوع افکار (کراچی) ۱۲۶
عالم اسلام اور عیسائیت (اسلام آباد) ۱۲۷
علم وادب (لکھنؤ، بنگلور) ۱۲۸
علوم القرآن (علیگڑھ) ۱۳۰
غالب نامہ (نئی دہلی) ۱۳۱
فروغ ادب (بھونیشور) ۱۳۲
فکر و عمل (بہار شریف) ۱۳۳
فکر و نظر (اسلام آباد) ۱۳۴
فکر و نظر (علیگڑھ) ۱۳۶
فنون (لاہور) ۱۳۷
فیض الاسلام (راولپنڈی) ۱۴۰
قومی راج (بمبئی) ۱۴۱
قومی زبان (کراچی) ۱۴۲
کتاب نما (نئی دہلی) ۱۴۳
گفتگو (بمبئی) ۱۴۴
گلبن (احمدآباد) ۱۴۷
گلستان اردو (بنگلور) ۱۴۸
متاع آخرت (کانپور) ۱۴۹
مجرم (نئی دہلی) ۱۵۰
مجلہ الکلیۃ الشرقیہ اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ۱۵۱
مجلہ بدایوں (کراچی) ۱۵۲
مجلہ تحقیق (لاہور) ۱۵۳

رسالے جو تاخیر سے شائع ہوتے ہیں

ضمیمہ-۱

ضمیمہ - ۲

تصحیحات

اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں

صفحہ / کالم / سطر	
چار / ۱ / ۱۵	حریم (لکھنؤ)
چار / ۱ / ۱۶	حیات نو (بریا گنج، اعظم گڑھ)
چار / ۲ / ۱۰	راہ اسلام (دہلی)
پانچ / ۲ / ۹	نقوش حیات (مہردولی بازار، بستی)
پانچ / ۰ / ۱۶	ضیاء (سر ضیاء الدین ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۱۸
پانچ / ۲ / ۱۷	عصری آگہی (دہلی)، ۲۱۹
پانچ / ۳ / ۱۸	علی گڑھ میگزین (علیگڑھ)، ۲۲۱
پانچ / ۳ / ۹ ؛ ۱۹۴ / ۳ / ۱	فصیل (کرناٹک)، ۲۲۳
پانچ / ۳ / ۱۰ ؛ ۱۹۴ / ۳ / ۲	فکر و تحقیق (دہلی)، ۲۲۴
پانچ / ۳ / ۱۱ ؛ ۱۹۴ / ۳ / ۳	فن اور شخصیت (بمبئی)، ۲۲۵
پانچ / ۳ / ۱۲ ؛ ۱۹۴ / ۳ / ۴	قومی زبان (آندھرا پردیش)، ۲۲۶
پانچ / ۳ / ۱۳ ؛ ۱۹۴ / ۳ / ۵	کاوش (لاہور)، ۲۲۸
پانچ / ۳ / ۱۴ ؛ ۱۹۴ / ۳ / ۶	محسن (محسن الملک ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۲۹
پانچ / ۴ / ۵ ؛ ۱۹۴ / ۴ / ۱	معیار تحقیق (ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ)، ۲۳۱
پانچ / ۴ / ۴ ؛ ۱۹۴ / ۴ / ۲	نیا دور (کراچی)، ۲۳۶
پانچ / ۴ / ۶ ؛ ۱۹۴ / ۴ / ۳	وقار (وقار الملک ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۴۳

مراسلات

ڈاکٹر عطا خورشید

خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۸۰-۷ کے بارے میں

نواب رحمت اللہ خاں شروانی صاحب کے ہاں خدا بخش لائبریری جرنل "مثنویات" نظر سے گذرا۔ مطالعہ کے لیے ان سے ایک شب کے لیے عاریۃً مانگ لایا۔ مطالعہ کے بعد چند باتیں ذہن میں آئیں جسے ایڈیٹر ہونے کے ناطے آپ کے گوش گذار کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آئندہ شماروں میں اس کی خوبیاں تو برقرار رہیں لیکن خامیوں کا اعادہ نہ ہو۔

(۱) ڈاکٹر متین احمد صبا کا مقالہ " مثنوی حالنامہ/گوی و چوگان " محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ لیکن چند باتیں غور طلب ہیں۔ عنوان (ہاف ٹائٹل) میں عارفی ہروی کی وفات کا سنہ ۹۵۰ھ لکھا گیا ہے جو کہ نسخہ کے کاتب میر علی کا سال وفات ہے۔ اندر آپ نے بھی نوٹ میں عارفی ہروی کا سال وفات ۹۵۰ھ لکھا ہے۔ جبکہ خود آپ نے اسی صفحہ پر قبلاً ۸۵۲ھ ہی لکھا ہے۔

کسی نسخے کو ایڈٹ کرنے کے وقت اس کے تمام نسخوں کے متعلق ساری معلومات یکجا کر لینی چاہیے۔ نیز جہاں تک ممکن ہو سکے ان تمام نسخوں کی بازیافت کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور پھر تمام نسخوں کی روشنی میں متن کی تدوین کرنی چاہیے۔ مثنوی گوی و چوگان کی ترتیب میں صرف خدا بخش کے دو نسخوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ جبکہ اس کے نسخے مختلف جگہوں پر بھی ملتے ہیں نیز میر علی الکاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نہایت ہی خوبصورت نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی موجود ہے اور کوئی بعید نہیں کہ یہ نسخہ خدا بخش سے قدیم تر ہو (اس نسخے پر سنہ کتابت موجود ہے جبکہ نسخہ خدا بخش پر

موجود نہیں) لہٰذا اس نسخے کو بھی ترتیب کے وقت مدنظر رکھنا چاہئے تھا۔ اس سے ایک نئی بات یہ بھی سامنے آتی کہ کیا ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے دو نسخوں میں بھی اختلافات نسخ ملتے ہیں یا نہیں، اور اگر صرف نسخۂ خدابخش کو ہی متعارف کرانا مقصود تھا تو اس کا عنوان رکھنا چاہئے تھا۔ "مثنوی حالنامہ/ گوی و چوگان/ نسخۂ خدابخش۔"

ص ۱۵۰ پر جامی کی تصنیف "بہارستان" سے ایک عبارت نقل کی ہے اور فٹ نوٹ کا نمبر بھی دیا ہے لیکن فٹ نوٹ میں وہ حوالہ موجود نہیں، غالباً کتابت میں چھوٹ گیا اور پروف ریڈر صاحب نے بھی اس پر دھیان نہیں دیا

ص ۱۵۰ پر ہی علی شیر نوائی کے حوالے سے مولانا عارفی کی مماثلت سلمان سے دکھائی گئی ہے۔ چونکہ علی شیر نوائی کی عبارت نقل نہ کر کے مقالہ نگار موصوف نے اس کا مفہوم درج کیا ہے اور اپنے الفاظ میں تحریر کیا ہے اس لئے مولانا عارفی کے لیے احترام کے الفاظ استعمال کرنا چاہئے تھا جیسا کہ اس سے قبل اور مضمون کے بقیہ حصوں میں کیا ہے۔ "عارفی ... مماثل تھا... مبتلا تھا۔" یہ جملے طبیعت پر گراں گذرتے ہیں۔ پروف ریڈر کو بھی جملوں میں تھوڑا بہت اصلاح کا اختیار رہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ اختیارات استعمال کر لینا چاہئے۔

مقالہ نگار موصوف نے اس مثنوی کے تعارف میں لیے "فارسی میں مناظرہ گوئی کی روایت اور اس کے ارتقا کی تاریخ میں ایک اہم کڑی۔" (ص ۱۴۹) بتایا ہے لیکن مناظرہ گوئی والی بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ پوری مثنوی پڑھ لینے کے بعد بھی کہیں بھی اس میں مناظرہ گوئی نظر نہیں آتی ہے۔ مقالہ نگار موصوف کے نزدیک مناظرہ سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت ضروری تھی۔

(۲) جناب زاہد ظہیر صاحب نے "دیوان میر سوز" کے نسخۂ کراچی کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔ لیکن ایک بات کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جہاں دو سنین کے اواخر اور اوائل کا ذکر ہو وہاں اس کی مطابقت عیسوی یا دوسرے سنین سے نہیں کرنا چاہیے ورنہ مفہوم خبط ہو جاتا ہے۔ مثلاً ص ۱۸۵ پر "۶۲-۱۷۶۱ء کے اواخر یا ۶۳-۱۷۶۲ء کا آغاز" سے مفہوم واضح نہیں ہو پاتا۔ یہاں صرف ہجری سنہ ہی کافی تھا۔

ص ۱۸۷ کی سطر ۲ پر نسخہ کا سائز ساڑھے اکیس اور ساڑھے پندرہ سم (سنٹی میٹر) بتایا گیا ہے جسے کاتب نے ۱۵.۵×۲۱.۵ لکھا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اردو ہندسوں کے مطابق یہ کچھ کا کچھ ہو گیا۔ اردو ہندسوں کے ساتھ اردو اعشاریہ استعمال کرنا چاہیئے۔ اس کی ہدایت کاتبوں اور پروف ریڈرز کو دے دی جائے ورنہ انگریزی اعشاریہ اردو میں صفر کا ہمشکل مانا جائے گا۔

(۳) "تذکرہ ہاشم" کے تعارف میں ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے نسخۂ ڈھاکا کا سنہ کتابت ۱۰۸۳ھ بتایا ہے اور اس کی

جبکہ اس نسخے پر بھی ایک مہر کے سنہ پر رکھی ہے۔ کسی نسخے پر ثبت مہر کی تاریخ سے نسخے کے ACCURATE سنہ کتابت کا پتا نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ مہریں ایک بار کسی سنہ میں بن جایا کرتی تھیں اور وہ برسوں چلا کرتی تھیں۔ ہر سال کی الگ الگ مہریں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ لہٰذا اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ سنہ کتابت سے قبل کی مہریں بھی ثبت ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے کلیم سہسرامی صاحب کا یہ استخراج کہ چونکہ مہر ۱۰۸۲ھ کی ہے اس لیے کتابت بھی ۱۰۸۳ھ کی ہوگی، صحیح نہیں ہے۔

(۴) ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری صاحب کا مرتبہ فکر و نظر کا اشاریہ بھی آپ نے اس شمارے میں شائع کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ مستقل یہ سلسلہ شروع کرتے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے اساتذہ نے M.Phil کی ڈگری کے لیے طالبعلموں سے اشاریے تیار کرانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، آپ ان میں معیاری اشاریوں کو بھی اپنے جرنل میں شائع کرتے۔

اردو میں اشاریہ سازی کی اہمیت و افادیت کو ابھی تک نہیں سمجھا گیا ہے۔ اسے لوگ بیکار کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ریسرچ اسکالرز کے لیے اہم REFERENCE TOOL کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اہمیت نہ دینے کی بنیادی وجہ یہ ہے اشاریہ سازوں کی تن آسانی، جس کے تحت صرف مشتملات کو ابجدی ترتیب سے نقل کر دینا ہی اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اشاریہ، اشاریہ ہی کیا جس میں ریسرچ اسکالرز کو اپنے مطلوبہ مواد کے لیے مکمل اشاریے کو دیکھنا پڑے۔ اشاریہ دراصل اشارے کو کہتے ہیں کہ بلکے سے اشارے سے ریسرچ اسکالر اپنے مطلوبہ مواد تک بغیر وقت صرف کیے پہونچ جائے اور اسے ایک ہی جگہ سارا مواد مل جائے۔ اگر اپنے مواد کے لیے اسے مکمل اشاریہ دیکھنا پڑے تو اشاریہ کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔

اشاریوں میں اس طرح کی بنیادی غلطیوں کی موجودگی کی وجہ صرف یہ ہے کہ اردو میں اب تک اس کے اصول منضبط نہیں کیے گئے ہیں۔ ہر اشاریہ ساز اپنی راہ خود بنا کر اس پر چل پڑتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اس کے اصول بنائے جائیں۔ اس کے لئے خدا بخش لائبریری ہی قدم اٹھا سکتی ہے۔ اشاریہ، ببلیوگرافی وغیرہ پر ایک چھوٹی سی نشست بشکل سمینار کر لی جائے تو مناسب ہوگا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری کے مرتبہ اشاریے کا اشاریہ ادارہ کی طرف سے تیار کرا کر شامل کیا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ تشنگی دور کرنے کی بجائے خود تشنگی کا شکار ہو گیا۔ غالباً اس اشاریہ کو جرنل کی ابتدا میں رکھنے کا ارادہ ہوگا اس لیے اشاریے کا اشاریہ بھی صفحہ نمبر ۱ کے حساب سے بنایا گیا لیکن بعد میں اسے درمیانی حصہ میں شامل کیا گیا، لیکن اشاریے کے نمبر اپنی ہی جگہ رہ گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اب اس سے کسی طرح کی کوئی مدد نہیں مل سکی

بعد میں نظر ڈالنے پر پتا چلا کہ اشاریہ کا علیحدہ سے ایک صفحہ نمبر ہر صفحہ کے نچلے حصے میں ڈالا گیا ہے جو غالباً بعد میں ڈالا گیا ہوگا جس سے آسان صورت یہ تھی کہ اشاریہ کے اشاریے میں پہلے صفحہ نمبر کو مٹا کر تسلسل والے صفحہ نمبر کی کتابت کرا دی جاتی کیونکہ قاری کی نظر میں وہی نمبر ہوتے ہیں جو تسلسل کے ساتھ پورے شمارے میں ہر صفحہ پر اوپر میں ڈالے جاتے ہیں۔ اوپر نیچے دو دو صفحہ نمبر ڈال کر اس کمپلیکیٹیڈ اشاریہ کو مزید کمپلیکیٹیڈ بنا دیا گیا۔

فاضل اشاریہ ساز نے اسے توضیحی اشاریہ بتایا ہے، لیکن وضاحت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔ اشاریہ میں وضاحت لازمی ہے لیکن یہ وضاحت ایک، دو یا زیادہ سے زیادہ تین جملوں پر مشتمل ہونا چاہئے۔ جو عنوانات وضاحت طلب ہیں، فاضل اشاریہ ساز نے وہاں تو وضاحت نہیں دی ہے لیکن بعض جگہوں پر بلا ضرورت وضاحت پیش کی ہے اور وہ بھی اتنی طویل کہ وہ اشاریہ کے مزاج سے میل نہیں کھاتی ہے۔ مثلاً "دل یا پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے" (ص ۳۰۲)۔ "مشینی دماغ اردو کی خدمت میں" (ص ۳۰۵)۔ "ماضی تمام کے تین صیغے" (ص ۳۰۵)۔ "سماج اور شعر" (ص ۳۰۶)۔ "گوندھا تا لینڈ" (ص ۳۰۷) وغیرہ وضاحت طلب مضامین میں کوئی وضاحت نہیں جبکہ "جسٹس سید محمود" (ص ۳۲۴) "حاجی اسمٰعیل اور چند غیر معروف رفقا" (ص ۳۲۵) "حکیم محمد شجاع" (ص ۳۲۵)، "خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں" (ص ۳۲۶)۔ "خلیفہ عبدالحکیم" (ص ۳۲۶)۔ "خواجہ منظور حسین" (ص ۳۲۶) "ڈاکٹر سید محمود" (ص ۳۲۷) وغیرہ جیسے مضامین میں اول تو وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر وضاحت دی تھی تو اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سلسلے کی دوسری بات یہ کہ وضاحت کا کیا معیار قائم کیا گیا ہے اس کا پتا نہیں چلتا ہے۔ کہیں معروف شخصیت کے ساتھ بھی وضاحت ہے جہاں کوئی ضرورت نہیں تھی اور کہیں کسی غیر معروف شخصیت کے ساتھ وضاحت نہیں جبکہ اس کی ضرورت ہے۔

اب آئیے اشاریہ کے موضوعات کی طرف۔ پہلا موضوع ہی آنکھوں کو کھٹکتا ہے کیونکہ یہ موضوع بھی ہے اور غالباً عنوان بھی۔ ہر عنوان کو اس کے موضوع کے تحت رکھنا چاہئے۔ لہٰذا اس "افتتاحیہ" کو بھی اس کے موضوع میں رکھنا چاہئے تھا۔ افتتاحیہ کوئی موضوع نہیں ہوتا ہے اور غالباً ادارے نے بھی اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ کیونکہ شمارے کے اشاریے میں یہ شامل نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اسے کاٹ کر نکال دینا چاہئے تھا۔

ص ۳۰۴ پر "نفسیاتی افسانہ" جسے "افسانہ" موضوع کے تحت رکھا گیا ہے موضوع سے یہ پتا نہیں چل پاتا ہے کہ آیا یہ کوئی افسانہ ہے یا افسانہ پر تنقید؟ اسی طرح ص ۳۰۹ پر "انگریزی ڈراما" کے تحت دو عنوانات ہیں۔ "ابسن کا گڑیا گھر — ایک مطالعہ" اور "بندھن"۔ اول الذکر ایک ڈرامے پر تنقید ہے، اور

ثانی الذکر غالباً ایک انگریزی ڈراما ہے لیکن موضوع (انگریزی ڈراما) سے اس فرق کا پتا نہیں چلتا ہے۔ اس کا موضوع انگریزی ڈراما کی جگہ "انگریزی ادب" ہونا چاہیے تھا۔ نیز اشاریہ سازوں کے ذہن میں یہ بات بھی رہنی چاہیے کہ اگر ایک موضوع پر کافی عنوانات ہوں تب تو ان کی تقسیم در تقسیم کرتے جائیں لیکن اگر عنوانات کم ہوں تو انھیں بنیادی موضوع کے تحت ہی رکھنا چاہیے۔

اشاریہ سازی میں موضوعات کی تقسیم ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ پورے مضمون یا مقالے کو پڑھ کر اس کا مناسب موضوع منتخب کرنا بہت بڑا دماغ سوزی کا کام ہے۔ اکثر ایک عنوان کئی کئی موضوعات پر محتوی ہوتا ہے۔ ایسے مضامین کو ان تمام موضوعات کے تحت رکھنا چاہیے۔ نیز ہر موضوع کے اندر عنوانات کی ترتیب بھی موضوعاتی ہونا چاہیے۔ مثلاً ص ۲۴۳ کا نمبر ۹۵ "بابائے اردو مولوی عبدالحق" اور ص ۲۴۴ کا نمبر ۱۰۰ "مولوی عبدالحق" ان تینوں مضامین کو ایک جگہ ہونا چاہیے لیکن ابجدی ترتیب کے سبب اول الذکر دونوں حرف ب کے تحت اور ثانی الذکر حرف م کے تحت رکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح ص ۲۳۳ کا نمبر ۱۳ "پروفیسر رشید احمد صدیقی" اور ص ۲۳۴ کا نمبر ۲۱ "ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی: کچھ اپنے خیالات" اول الذکر کو حرف پ کے تحت اور ثانی الذکر کو حرف ت کے تحت رکھا گیا ہے اسی طرح منظر عباس نقوی کا مضمون "رشید صاحب کا اسلوب" اردو ادب۔ تاریخ و تنقید کے ذیل میں رکھا گیا ہے حالانکہ اسے بھی رشید صاحب کے تذکرے کے ذیل میں مذکورہ بالا مضامین کے ساتھ ہی رکھنا چاہیے تھا۔ عربی ادب کے تحت ص ۲۱۸ پر نمبر ۲۱، ۲۲ (نہج البلاغہ) اور اسلامیات کے تحت ص ۲۰۸ پر نمبر ۴ کے "حکمت و دانش (نہج البلاغہ کی روشنی میں) ان تینوں کو بھی ایک ہی جگہ ہونا چاہیے۔ یہ اشاریہ موضوعات کے ساتھ ساتھ عنوانات میں بھی انتشار کا شکار ہے جس کی اصلاح طباعت سے قبل ضروری تھی۔

اشاریہ ساز عموماً تذکرہ کے ذیل میں صرف انھیں مضامین کو شمار کرتے ہیں جن میں صاحب تذکرہ کے صرف حالات زندگی ہوتے ہیں کہ کہاں اور کب پیدا ہوئے، کہاں تعلیم پائی، کہاں پرورش پائی، کہاں اور کب مرے۔ یہ غلط فہمی عام طور سے ہے اور پیش نظر اشاریہ کے مرتب موصوف بھی اس غلط فہمی کے شکار ہیں۔ حالانکہ تذکرے کو اتنا محدود کر دینا صاحب تذکرہ کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ اس کے تحت وہ سارے مضامین آئیں گے جن میں صاحب تذکرہ کے حالات کے علاوہ ان کے کارنامے، ان کے خیالات، ان کے افکار، ان کے واقعات، ان کی تنقید، ان پر کی گئی تنقیدیں، غرض مختلف النوع قسم کے وہ سارے موضوعات جن کا تعلق اس شخص سے براہ راست یا بلاواسطہ ہو، تذکرے کے ذیل میں آئیں گے۔ مثلاً نظم و نثر کے اشاریہ ساز موصوف نے اردو شاعری کے تحت انیس، ناسخ

وغیرہ پر لکھے گئے مضامین کو جمع کیا ہے۔ حالانکہ ان مضامین کو ان کے تذکرے کے تحت ہونا چاہیے تھا۔ "کتابیات" کے تحت مرتب موصوف کا ہی ایک مضمون (اشاریہ "نقش ذاکر" کے نام سے ہے جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی تصانیف کی وضاحتی فہرست پیش کی گئی ہے اور دوسرا مضمون "ڈاکٹر ذاکر حسین" کے عنوان سے تذکرہ کے ذیل میں ص ۳۲۷ پر موجود ہے۔ ان ہر دو مضامین کو تذکرہ کے ذیل میں اور ایک ہی جگہ ہونا چاہیے۔ موضوعات کو جتنا سمیٹ سکیں اتنا بہتر ہے۔ ہر مضمون کو ایک نیا موضوع دینا بھونڈا پن ہے۔ اور اگر "کتابیات" موضوع ہی رکھنا تھا تو "علم کتابیات" ص ۱۸۱ موضوع کے ذیل میں احتشام بن حسن کا مرتبہ "اشاریہ فکر و نظر" کو بھی "کتابیات" کے ہی ذیل میں رکھنا چاہیے۔

الغرض یہ کہ فکر و نظر کے اس اشاریہ کو شائع کرنے سے قبل اس پر ایک بھرپور تنقیدی نظر ڈال لی جاتی تاکہ موضوعات کے ساتھ ساتھ عنوانات کی شتر گربگی بھی دور ہو جاتی۔ موضوعات کی شتر گربگی دور کرنے کے لیے ادارہ کی طرف سے تو ایک فہرست دی گئی لیکن وہ خود خامیوں کا شکار ہو گئی اور زیادہ کار آمد نہ ہو سکی۔ حالانکہ اس فہرست کی جگہ اگر اشاریہ کی کتابت اسی فہرست کے مطابق کرائی جاتی تو یہ شتر گربگی نہ رہتی یا اگر کتابت ہو چکی تھی تب بھی ہر موضوع کو اس کے مضامین کے ساتھ کاٹ کر ادارہ کی فہرست کے مطابق چسپاں کر لیا جاتا تو کچھ بہتر صورت نکل آتی۔ خدا بخش لائبریری جرنل جیسے معیاری رسالے میں اس طرح کی چیزیں طبیعت پر گراں گذرتی ہیں۔

(۵) مراسلات (مراسلہ؟ ص ۲۴۵) کے تحت جو بھی مراسلے شائع کیے گئے ہیں، ان کا عنوان قائم کیا گیا ہے — "خدا بخش لائبریری جرنل ۶۹-۷۴ کے بارے میں۔" لیکن صرف پہلا مراسلہ ہی جرنل ۶۹-۷۴ کے بارے میں ہے۔ بقیہ مراسلات کا موضوع دیگر ہے۔ قاری عنوان دیکھ کر تمام مراسلات کا موضوع جرنل ۶۹-۷۴ ہی سمجھتا ہے۔ یہ شتر گربگی ادارہ کی ہے۔ اس ضمن میں ایک استفسار کی اجازت چاہوں گا کہ عبدالرئوف خاں کا مراسلہ جو کہ جرنل ۶۹-۷۴ سے متعلق ہے اسے مراسلات کے ذیل میں رکھا گیا ہے لیکن عارف نوشاہی کا مراسلہ جو اسی موضوع سے متعلق ہے، اسے مضمون کی شکل دے دی گئی۔ یہ تفریق کیوں؟

(۶) چلتے چلتے ایک دو باتیں مزید عرض کر دوں کہ کاتب اور پروف ریڈر ہر دو کو اس بات کی ہدایت کر دی جائے کہ سن کی جگہ سنہ، مصرعہ کی جگہ مصراع یا مصرع، لئے، دئے، کئے کی جگہ لیے، دیے، کیے اور مُدامہ کی جگہ ڈراما لکھا کریں۔ نیز پروف ریڈرس کو اس بات کا اختیار رہتا ہے کہ مضمون نگار کے جملوں کی بے ربطی کو مختصر سی ترمیم و تنسیخ کے ساتھ دور کر دے۔ مضمون نگار کی بے ربط تحریروں کو من و عن کتابت کرا دینا مناسب نہیں۔

(۷) اب ایک نظر کتابت کی غلطیوں کی طرف۔ جو اگرچہ یہ بہت کم ہیں لیکن خدا بخش لائبریری جرنل جیسے معیاری

رسالے میں اتنی غلطیاں بھی راہ پا جائیں تو مناسب نہیں۔

ص ۲۱۰	س ۱۰	ترجیع (غلط)	ترجیح (صحیح)
ص ۲۲۱	س ۵	حالی (غلط)	خلیل (صحیح)
ص ۳۴۴	س ۴	جوامع الکلام (غلط)	جوامع الکلم (صحیح)
ص ۳۴۴	س ۱۷	ثمرۃ الفاسفہ (غلط)	ثمرۃ الفلاسفہ (صحیح)

(۸)۔ ۔۔ ایک بات اور یاد آگئی کہ خدا بخش لائبریری جرنل کا مقالات شائع کرنے اور ایڈٹ کرنے کیلئے ایک اصول ہونا چاہئے۔ اس میں جرنل کو مقالہ نگار کی نہیں بلکہ مقالہ نگار کو جرنل کے اصولوں کی پیروی کرنی چاہئے یا ہر صفحہ کا فٹ نوٹ اسی صفحہ پر کتابت کرائی جائے۔ یہ مناسب نہیں کہ ایک ہی شمارے میں کسی مقالے کا فٹ نوٹ اسکے آخر میں اور کسی مقالے میں ہر صفحے پر۔ ایسا پیش نظر شمارے میں ہے اور اس شترگربگی کا الزام ادارہ کے سر جاتا ہے۔

●●

جناب فرخ جلالی

علی گڑھ

خدا بخش جرنل نمبر ۸۴ مل گیا۔

آپ نے نوٹ شائع کیا اچھا کیا۔ میرے پاس حضرت مظہر جان جاناں کے حالات جمع ہیں مگر اس وقت دستیاب نہیں۔ ایک نوٹ کسی کتبہ کے سلسلہ میں نوٹ کیا تھا۔ حوالہ کا "ز" کاغذ ادھر اُدھر ہو گیا اس میں ایک شجرہ ہے جو درج ذیل ہے۔ اس وقت یونہی لکھتا ہوں۔

جوہر علی خاں قاقشال

نواب مرزا مراد خاں از اولاد محمد بن حنیفہ (علوی)

- امیر مرزا کمال الدین
  - خواجہ رستم شاہ
    - امیر محمد
      - امیر غلام محمد
        - بابا خان قاقشال
          - شاہ بابا سلطان
            - مرزا محمد امان
              - مرزا عبد السبحان (رشتہ میں اکبر کا نواسا)
                - میرزا جان (میر حبیب اللہ)
                  - شمس الدین مظہر جان جاناں ۱۱۹۵ھ خلیفہ نور محمد بدایونی نقشبندی متوفی دہلی مزار بازار چتلی قبر
        - مجنوں خاں قاقشال (عہد اکبر میں ایک بغاوت کی تھی)
          - جباری خاں
            - محمد جمشید
              - محمد باری آتی (صاحب تقول عشرہ و تاریخ مجمل مفصل)

hero of the Musslamans and Mahatma Gandhi a living idol of the masses.

But it is none the less his personal triumph and a testimony to his authentic mission that he stands approved and confirmed by his countrymen not merely as an ambassador, but as an embodied symbol of the Hindu-Muslem Unity.

Who can foretell the secrets of to-morrow ? Who foresee the hidden forces that some-times work to build our destiny higher than our dream ? Perchance it is written in the book of the future that he whose fair ambition it is to become the Muslim Gokhale may in some glorious and terrible crisis of our national struggle pass into immortality as the Mazzini of the Indian Liberation

HYDERABAD, DECCAN, Sarojini Naidu

survey of Mohomed Ali Jinnah's work were both untimely and unfair to a man in the very prime of life and on the threshold of his public achievement.

A casual pen might surely find it easier to describe his limitations than to define his virtues. His are none of the versatile talents that make so many of his contemporaries justly famed beyond the accepted circle of their daily labours. Not his the gracious gifts of mellow scholarship, or rich adventure or radiant conversation; not his the burning passion of philanthropy or religious reform Indeed by his sequestered tastes and temperament Mohomed Ali Jinnah is essentially a solitary man with a large political following but few intimate friendships, and outside the twin spheres of law and politics he has few resources and few accomplishments.

But the true criterion of his greatness lies not in the range and variety of his knowledge and experience but in the faultless perception and flawless refinement of his subtle mind and spirit, not in a diversity of aims and the challenge of a towering personality but rather in a lofty singleness and sincerity of purpose and the lasting charm of a character animated by a brave conception of duty and an austere and lovely code of private honour and public integrity.

The tale of his actual contribution is still comparatively slender. But it is not by the substance but by the rare significance of his patriotic service that he holds to-day his unique place in the front rank of our national leaders.

Like others of our generation, he suffers from a system of education so widely separated from the familiar traditions and culture of our race, and lacking the magic of a common medium, he may never perhaps hope to establish between himself and his people that instinctive and inviolable kinship that makes the interned Mohomed Ali for instance, a living



The Ambassador of Unity.

a magnetic presence, an impressive delivery, and a voice which while lacking volume has an arresting timbre. But though occasionally he has attained a moment of wholly unconscious and stirring eloquence, he has the cogent force of a brilliant advocate rather than the glowing fervour of a brilliant orator. And it is not on a public platform, but at a round table conference that he finds full scope for his unusual powers of persuasion, luminous exposition, searching argument and impeccable judgement. It is an open secret that his was a large and responsible share in the recent discussions regarding the Muslim University as well as the anxious deliberations of the joint Congress League Committee that sat at Lucknow last year to formulate a scheme of Indian reforms elaborated from the Memorandum of the Nineteen.

There was, it must be admitted, a growing surprise and reproach in the minds of his followers that so ardent an apostle of Indian Self-Government should hold aloof from the recently organised Home Rule movement which was rousing the country like a clarion call to freedom. It may have been partly due to a lingering sense of allegiance to a school of politics in which he had been trained, but whose timid and stationary doctrines he had long since outgrown or it may have been due to the habitual caution of a nature slow to commit itself to new and far-reaching responsibilities. However, the news of Mrs. Besant's internment last June, which evoked such unparalleled demonstrations throughout India, moved Mohomed Ali Jinnah to a prompt and militant chivalry in defence of the immutable laws of justice and liberty so rashly and so ruthlessly assailed. He immediately joined the Bombay Home Rule League not merely as a member, but undertook, as its president, the delicate task of guiding its fortunes and guarding its interests through that troubled period of its indignant activities.

*　*　*　*　*

VI

To attempt at this stage more than a brief general

entered in a body to greet and bless their comrades of the Muslim League.

The new year dawned cloudless for this valiant fighter of national battles, bringing him some of the highest awards of his professional and public career. He added much lustre to his forensic reputation by his masterly conduct of two sensational law-suits that aroused deep interest throughout the country, connected respectively with Mr. Horniman, the trusted friend, and Mr. Tilak, the beloved tribune of the Indian people.

In the autumn he was once more elected by the Mussalmans of his province to the Viceregal Council where he commands unanimous respect and esteem by his personal dignity of character and his fearless and vigilant championship of Indian rights and demands.

Towards the close of 1916 Mohomed Ali Jinnah was twice called upon to make a public declaration of his political creed, as President of the Bombay Provincial Conference held at Ahmedabad in October, and two months later, as President of the All-India Muslim League at Lucknow.

Both his Gujrat address, in which he indicated a tentative system of administrative reforms partly based on Gokhale's scheme, since published, and in his Lucknow pronouncement where he so firmly and clearly defined the place and purpose of Muslim India in the national regeneration he proved the remarkable breadth and boldness of his statesmanship, his consummate grasp of both the transitional phases and the abiding principles of political evolution, and his incorruptible faith in the vision of a free and federated India claiming hershonoured place and making her matchless contribution in the mighty republic of world-nations and civilisations.

As a speaker Mohomed Ali Jinnah has the triple assets of

uary 1915 brought Hindus and Mussalmans close together in a bond of common loss and sorrow. It was keenly felt that the time was now ripe for a more direct and definite *rapprochement* between the two great communities that had so recently exchanged such cordial expressions of good-will and fellowship from afar.

The Indian National Congress was to hold its sittings that year in Bombay and there could be no better centre of reconciliation than this cosmopolitan capital of India.

Mohomed Ali Jinnah, supported at that time by all the leading local Mussalmans, sent an invitation to the All-India Muslim League to hold its next annual sessions in Bombay during the national week in December.

The story of that invitation and its startling sequel is too well-known to be retold in all the details of its shameful and subterranean intrigue so carefully conceived, so cleverly manipulated. Sufficient to say that in an hour of such grave and bitter crisis, calculated to shatter the master-dream of Indian nationalism this dauntless soldier of unity rose to the heights of an invincible patriotism. With a proud and splendid indifference, to all personal suffering and sacrifice heedless alike of official dissuasion or disfavour, the aggressive malice and machinations of his opponents or even the temporary injustice of distant friends, Mohomed Ali Jinnah strove with an incomparable devotion and courage to create that supreme moment in our national history which witnessed the birth of a new India, redeemed and victorious in the love of her united children.

Seldom has the pageant of Time unrolled a scene so touching, so thrilling, so magnificent with drama and destiny as was enacted on the afternoon of the 30th December 1915, when amidst the tears and appaluse of a gathered multitude the veteran heroes of the National Congress

unnecessary and unaccountable set of new rules and restrictions hindering their admission into educational centres hitherto so hospitable and so easy of access.

On the eve of his departure for India in the autumn of 1913 at the express desire of his friends Messrs Mohomed Ali and Syed Wazir Hassan then in England Mohomed Ali Jinnah formally enrolled himself as a member of the All-India Muslim League to whose expanded outlook he had already contributed so signally by his example. Typical of his exquisite if somewhat exigent sense of honour is it to find that even so simple an incident partook of something like a sacrament. His two sponsors were required to make a solemn preliminary covenant that loyalty to the Muslim League and the Muslim interest would in no way and at no time imply even the shadow of disloyalty to the larger national cause to which his life was dedicated.

In May 1914 he returned to England as a member of the All-India Congress Deputation concerning the proposed reform of the India Council. He had already in this connection moved resolutions both at the Karachi sessions of the Congress a few months earlier and at the Agra sessions of the Muslim League.

In a country where the personal element forms so integral a part of public success, it was no small compliment to Mohomed Ali Jinnah's social as well as mental qualities that he was chosen to be the spokesman of articulate India before the representatives of the British Parliament and the British public. The leading English journals published numerous interviews and his concise and lucid statement of the Indian case which appeared in the London "Times" attracted widespread attention and comment.

* * * * *

V

The tragic death of Gopal Krishna Gokhale in Febr

the later Council meeting, where being specially requested to speak, he gave his informal and invaluable support to Clause D of the new Constitution which materially embodies the Congress ideal of

"Attainment under the aegis of the British Crown of a system of Self-Government suitable to India through constitutional means, by bringing about, amongst others, a steady reform of the existing system of administration, by promoting national unity, by fostering public spirit among the people of India, and by co-operating with other communities for the said purpose."

* * * * *

IV

The year 1913 stands out as a distinct landmark in my friend's inner life. Not only did a wider measure of public recognition wake in him a deeper sense of personal responsibility, but one or two new and sympathetic influences brought an intimate touch of warmth and colour into his somewhat lonely and impersonal existence.

About the middle of April, he proceeded to Europe in search of a long idle holiday with Gokhale for fellow traveller, and the Arabian stars and Egyptian waters keep record, doubtless of their mutual hopes and dreams for the country of their devoted service.

Once in England, however, there was no rest for this tireless worker. He was at once drawn into the tangled web of the Indian student-world whose cause he espoused with such assiduous zeal and understanding. Within a few weeks of his arrival he founded the London Indian Association which forms so excellent a focus for the otherwise scattered energies and activities of young India in a foreign land; and it was mainly at his instance that a committee was appointed by the India Office to inquire into the legitimate grievances of Indian students suffering so keenly from an

weary details.

* * * * *

III

Meanwhile the Time-spirit, so busy altering world-values and world-visions, had been secretly at work, and the heart of Muslim India, always passionately faithful to its own spiritual traditions, became suddenly and vividly aware also of its own political inheritance and its own responsibility in shaping the national future.

The All-India Muslim League, started a few years previously at Dacca to voice current Mussalman opinion and aspiration, was found to be too narrow and too nebulous in its scope and aims for this intense and growing national consciousness. And about the middle of 1912 a Conference of Muslim Leaders met at Calcutta to consider the remodelling of its constitution on more progressive and patriotic lines. It was decided to send Mr Syed Wazir Hassan, the indefatigable Honorary Secretary of the League, on an extensive tour to ascertain the views of Muslims in every province regarding so momentous a change of policy and perspective. And in the following December a special council meeting of the association was called, presided over by His Highness the Agha Khan to discuss the draft of an entirely new constitution, which was ultimately and enthusiastically adopted at the memorable sessions of the All-India Muslim League held at Lucknow on the 22nd March 1913—a date that inaugurates a new era in the political history of Muslim India.

Mohomed Ali Jinnah, pledged to the greater national welfare, had with characteristic independence and honesty kept apart from a movement till then so frankly and exclusively sectarian in its purpose. But by an act of courtesy which was in itself a graceful acknowledgement of his merits he was invited to attend the Calcutta Conference, and also



The Ambassador of Unity.

his name into such prominence. Interesting too, and suggestive in view of succeeding events, is it to find this future leader fo the Mussalmans present as a sort of "cross bencher" at the Conference of Hindu and Muslim leaders convened at Allahabad in 1910, under Sir William Wedderburn's benign direction to consider a somewhat premature and artificial *entente cordiale* between the two communities still so sharply divided by a gulf of mutual dislike and distrust.

In the autumn of 1910 he was elected by the Mussalmans of the Bombay Presidency as their representative to the Supreme Legislative Council, and though the question, naturally arises as to how far it was consistent with the avowed principles of so staunch a nationalist to represent a purely sectarian interest—the fact nevertheless remains that Mohomed Ali Jinnah invariably lent his willing support to every liberal measure involving the larger national issues like Gokhale's Elementary Education Bill, for instance, and Mr. Basu's Special Marriage Bill, to which conservative India as a whole was so violently opposed. His only original work, however, during this period was in connection with the Wakf Validating Bill, to introduce which he was specially nominated for an extra term in 1913 by Lord Hardinge, then Viceroy. His admirable skill and tact in piloting through such an intricate and controversial measure—the first instance of a Bill passing into legislation on the motion of a private member—won him not only the appreciation of his colleagues but also his first meed of general recognition from his co-religionists all over India, who while still regarding him a little outside the orthodox pale of Islam were so soon to seek his advice and guidance in their political affairs.

On his return from the Imperial Council in March, he gave his evidence before the Public Services Commission then sitting in Bomaby—a refreshing page in a vast mass of

the London Indian Society, and the guardian angel of young India in England. Who can exaggerate the value of such a noble inspiration in moulding the soul of a disciple so reverent and responsive ?

On his return to India in 1896 Mohomed Ali Jinnah found his family involved in heavy financial ruin; and this favourite of fortune, suddenly faced with unexpected poverty, set out to conquer the world equipped with nothing but the charmed missiles of his youth, his courage and his ambition.

After three years of severe hardship, his brave and buoyant patience bore fruit. Through the kind offices of an old friend he was granted permission to read in the Chambers of Mr. Macpherson, then acting Advocate-General of Bombay,—a courteous concession, the first of its kind ever extended to an Indian which its recipient still remember as a beacon of hope in the dark distress of his early struggles.

Occasional briefs now began to dribble in, and the obscure young lawyer needing only an opportunity soon proved his real mettle and started to lay the foundation of his notable legal success.

In 1906 when I met him in Calcutta at the historic sessions of the National Congress where Dadabhai Naoroji first enunciated the glorious ideal of Self-Government for India, Mohomed Ali Jinnah, for the moment acting as private secretary to his old master, was already accounted a rising lawyer and a coming politician. For, true to his early teaching, and fired no doubt by the virile patriotism of men like the late Mr. Badruddin Tyabji and the lion-hearted Pherozeshah Mehta he had long since joined the ranks of the National Congress and regularly attended its annual gatherings. Incidentally it is interesting to note that his maiden speech at this National Assembly was made in connection with the Wakf-i-ala-aulad—a measure that was later to bring

Never was there a nature whose outer qualities provide so complete an antithesis of its inner worth. Tall and stately but thin to the point of emaciation, languid and luxuriou of habit, Mohomed Ali Jinnah's attenuated form is th deceptive sheathe of a spirit of exceptional vitality an endurance. Some-what formal and fastidious, and a littl aloof and imperious of manner, the calm hauteur of hi accustomed reserve but masks for those who know him, naive and eager humanity, an intuition quick and tender a a woman's, a humour gay and winning as a child's—Pre eminently rational and practical, discreet and dispassionat in his estimate and acceptance of life, the obvious sanity an serenity of his worldly wisdom effectually disguise a shy an splendid idealism which is of the very essence of the man.

* * * * *

II

Hindu by race and Muslim by religion—it may not b wholly idle to fancy something a little symbolic in th Khoja parentage of a child destined to become "an Ambass dor of the Hindu-Muslim Unity".

Mohomed Ali Jinnah was born on the 25th Decembe 1876—(there is no reliable record of the actual year)—th eldest son of a rich merchant of Karachi. Reared in carele affluence and adored by his family, he might so easily hav grown into an indolent and ignorant boyhood. But he fo tunately loved his studies and received his early educatio at the Madrassah and afterwards at the Mission Schoo of his native city. In 1892 he was sent to England—"a ta thin boy in a funny long yellow coat,"—is an amusing de cription of him. There he joined Lincoln's Inn, studied la and was in due course called to the bar. It seems a pity th so fine an intelligence should have denied itself the hal mark of a university training. But he had, instead, what fro an Indian standpoint was the golden privilege of close ass ciation with the great Dadabhai Naoroji, then President c

MOHOMED ALI JINNAH

AN AMBASSADOR OF UNITY.

A PEN PORTRAIT.

"It is my ambition to become the Muslim Gokhale," confessed Mohomed Ali Jinnah in a priceless moment of self-revelation.

In the light of this avowal it is interesting to recall Gokhale's own prediction about his gifted comrade in the service of India.

"He has true stuff in him," he said, *"and that freedom from all sectarian prejudice which will make him the best ambassador of the Hindu-Muslim Unity".*

These words, generous as they sound, are no more than a just tribute to a distinguished patriot who has so swiftly and so securely won his acknowledged place in the forefront of the national movement.

Few figures of the Indian Renaissance are so striking or so significant; to a student of psychology none more singularly attractive by the paradox of a rare and complex temperament, of strange limitations and subtle possibilities, that hides the secret of its own greatness like a pearl within a shell.



The Ambassador of Unity.

NOTE

The Brief biographical study entitled "An Ambassador of Unity" which prefaces this volume of the Hon'ble Mr. Mohomed Ali Jinnah's speeches was originally intended for the "Indian Nation Builders" series, and claims to be no more than a hasty and imperfect sketch of a remarkable personality, meant to take its place in that little national portrait gallery of impressionist drawings of distinguished men.

My cordial thanks are due to the many friends who have afforded me their ready assistance in retrieving from scattered sources, these valuable speeches, which, now collected for the first time, cannot fail to arouse profound and vivid interest in the minds of all who are concerned with the vital issues of contemporary political events and activities in India.

To my illustrious compatriot the Raja Saheb of Mahmudabad I am deeply indebted for the admirable and characteristic Foreword which he has so kindly contributed. No token of appreciation of a man's personal worth or public work could be more appropriate or auspicious than so fine a tribute from this great-hearted Prince of Indian Nationalists to the patriotic mission of an acknowledged "Ambassador of the Hindu-Muslim Unity"....

6th February, 1918. SAROJINI NAIDU

Mohammad Ali Jinnah

Sarojini Naidu

CONTENTS

1993

Price Rs.75/-

Printed by Liberty Art Press (Proprieters Maktaba Jamia Ltd.) 1528 Pataudi House, Daryaganj, New Delhi and published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna.

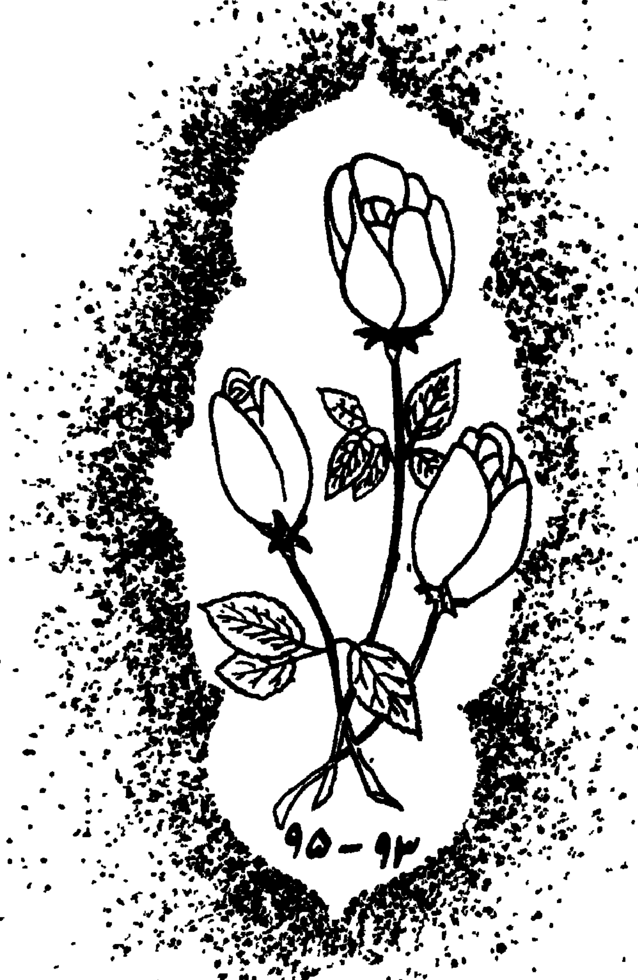
KHUDA BAKHSH LIBRARY JOURNAL

90-92

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

خدا بخش لائبریری

جرنل پٹنہ



خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۲۳۲۴/۷۷ | قیمت فی پرچہ: پچیس روپے

شمارہ: نوانوے پچانوے | سالانہ: ۲۰۰ روپے (ہند میں)

قیمت: پچھتر روپے | ۶۰ ڈالر ایشیا، ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

۱۹۹۴

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس، پرودپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی میں چھپواکر خدابخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

ہ اردو رسائل ۱۹۹۳ء (کے نصف دوم) میں

جہان ودود

مراسلات

حصہ انگریزی

❁❁

اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں

نصف ثانی

پیشگفتار

خدا بخش لائبریری میں اردو کے قدیم رسائل کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ان تمام قدیم رسائل کی فہرست و رسائل کی تفصیلات کے ساتھ جلد ہی شائع کی جا رہی ہے۔

خدا بخش میں محفوظ سارے قدیم رسائل کے مشمولات کے اشاریے بھی بنا دیے گئے ہیں۔ جن رسالوں کے اشاریے مکمل ہو چکے ہیں ان کی تعداد چھ سو کے قریب ہے۔ اب ان سب کے اندراجات کو موضوع وار بانٹا جا رہا ہے تاکہ ایک موضوع پر رسائل میں چھپی پوری دولت سے اردو ادب کے طالب علم بیک نظر بہ سہولت مستفیض ہو سکیں۔ موضوع وار اشاریے تقریباً پچاس جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

● اس صدی کے آخری ربع میں اردو رسائل میں کیا اہم تحریریں آتی رہیں؟ ۱۹۷۶ء سے اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ ایسی تمام تحریروں کے اشاریے بنائے جاتے رہیں۔ ایک سال کا ایک ایسا ہی خدا بخش اشاریہ بکتمہ جا ہونے مدت ہوئی شائع کر دیا تھا۔ اب دس سالہ اشاریہ اشاعت کے لیے پریس جا رہا ہے۔ جو صدی کے آخری ربع کے پہلے دس سال کے رسائل کے مشمولات کا انڈکس ہے۔

صدی تقریبات کا منصوبہ بن رہا تھا کہ ایک خیال یہ بھی آیا کہ خدا بخش صدی تقریبات کے بعد اردو رسائل کی کیا صورت حال ہے، ۱۹۹۲ء میں کون کون سے رسالے نکل رہے ہیں، اس کا ایک ایسا اشاریہ بن جائے جو ہر رسالے کے پورے کردار کو روشناس کرا دے، چنانچہ "اردو رسائل ۱۹۹۲ء" کے تحت سارے ماہنامے، سہ ماہی اور رسالے جو لائبریری میں آتے ہیں، بغیر کسی امتیاز کے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی، متعلقہ صفحات کا عکس لے لیا گیا۔ ساتھ ہی ان رسالوں میں جو اہم تحریریں شائع ہوئیں ان میں کا ایک حصہ اس پیشکش میں ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا۔

اردو میں اس وقت ڈھائی تین سو کے قریب ایسے رسائل نکل رہے ہیں۔ ان میں ۱۹۹۲ء کے جو پرچے ہمیں میسر آ سکے ان کی تعداد دو سو سے زیادہ نکلی۔ ان رسالوں میں شمع، بیسویں صدی جیسے رسائل بھی شامل ہیں؛ چہار رنگ، خاتون مشرق جیسے بھی، اور معارف، غالب نامہ، افکار، نقوش اور فنون بھی۔ کچھ رسالے ہمیں نہ مل سکے مثلاً ابتدائی تعلیم (لاہور)، تعلیمی زاویے (لاہور)، مغربی بنگال، ہلال، بشریٰ، سرپنچ، نامہ بر، خبرنامہ ہریانہ، اردو اکیڈمی، اور اسلام اور عصر جدید وغیرہ۔ ان کا ہمیں افسوس ہے۔ امید تھی ۱۹۹۲ء کے رسائل کا احاطہ کرتے کرتے ان میں سے بھی کچھ مل جائیں گے۔ کچھ نہ کچھ مل بھی گئے!

○

'اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں' کی اشاعت کے بعد 'اردو رسائل ۱۹۹۳ء میں' پیش خدمت ہے۔ ۱۹۹۳ء کی پیشکش دو حصوں میں ہوگی۔ پہلے حصے میں جنوری۔جون' اور' دوسرے میں جولائی۔دسمبر کے رسائل شامل کیے گئے ہیں۔

۱۹۹۲ء کے رسائل کیسے لیا کیا گیا تھا کہ جتنے پرچے بھی برصغیر یا کہیں باہر سے ہمیں میسر آسکے یا جن کے بارے میں ہمیں اطلاع مل سکی، ایک بھرپور فہرست بنانے کے لیے ہم نے اُن سب کے ایک/دو/تین متعلقہ صفحات لے لیے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد دو سو سے کچھ اوپر تھی۔ اب ۱۹۹۲ء کے ایسے پرچے جو اس وقت ہمیں نہیں مل پائے تھے بالحاظ اس کے کہ وہ کس درجے کے ہیں ہم نے انہیں پیش نظر ۱۹۹۳ء کی فہرست میں بطور تتمہ شامل کرلیا ہے۔ ان میں سے کچھ ۱۹۹۲ء کے ہیں جو ہمیں اس وقت میسر نہ آسکے تھے اور کچھ ایسے ہیں جو ہیں تو ۱۹۹۲ء کے لیکن شائع ہوئے ۱۹۹۳ء میں۔ اس طرح ۱۹۹۳ء میں اردو رسائل کی تعداد دو سو چھپن تک پہنچ گئی ہے۔ یہ وہ پرچے ہیں جو ہمیں میسر آسکے۔ (۱۹۹۲ء میں یہ تعداد ۲۰۴ تھی)۔

ایک بار آسان کرنے کے لیے، خاص کر اس واسطے کہ پیش نظر جلد کے قاری کو بھی ایک مکمل فہرست فوری طور سے دستیاب رہے، ہم نے مناسب سمجھا کہ ۱۹۹۲ء کی مکمل فہرست کو اس جلد میں دوہرا دیا جائے۔ یہ آخر میں لگائی جا رہی ہے۔

۱۹۹۳ء میں جن رسائل کو علمی/ادبی ریسرچ کے سلسلے میں زیادہ کارآمد پایا گیا ان کی مکمل فہرستیں دی جارہی ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں محض کسی ایک مہینے کے شمارے کی فہرست دی گئی تھی، لیکن اب اہم رسائل کے تمام شماروں کی فہرستیں دی گئی ہیں۔

ترتیب کے آخر میں تین ضمیمے ہیں:

ضمیمہ ۱ کے تحت کچھ مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں اس بات کا التزام نہیں رکھا گیا ہے کہ یہ مضامین انہیں مجلات سے ماخوذ ہوں جن کی مکمل فہرستیں دینا ہم نے ضروری سمجھا ہے۔

ضمیمہ ۲ میں کچھ منتخب مضامین کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ اس کا مقصد ان مضامین سے محض روشناس کرانا ہے تاکہ دلچسپی رکھنے والوں کو اس کی اطلاع رہے اور اگر وہ ان تحریروں سے استفادہ کرنا چاہیں تو شماروں کے حوالے سے ان تک پہنچ سکیں۔

ضمیمہ ۳ کے طور سے ۱۹۹۲ء کے رسائل کی فہرست دی جارہی ہے تاکہ ۱۹۹۳ء کے قاری کے سامنے پوری تصویر رہے۔

—— مرتب

فہرست

تتمہ

وہ رسائل جو ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء کے نصف اوّل کی فہرست میں شامل نہ ہو پائے

چکر

ضمیمہ-۱

ادبی دانشوری

تہذیبی دانشوری

مذہبی دانشوری

شعری دانشوری

پاک دانشوری

پاک مذہبی دانشوری

شخصیات

وفیات

تاریخ علوم وفنون

ممالک اسلامیہ

متفرقات

کتابیں / رسائل
مخطوطات

۱

آثار جدید (مئو)

جولائی۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء

ترتیب

ترتیب

ترتیب

ترتیب

آثار جدید (مئو) نومبر، دسمبر ۱۹۲ء ● آج (کراچی) جولائی۔ دسمبر ۱۹۲ء

ترتیب

ترتیب

آج (کراچی)

ترتیب

ایک سرکاری قومی اردو ادبی ماہنامہ

آج کل

جولائی ۱۹۹۳ء

ترتیب

اگست ۱۹۹۳ء

ترتیب

ایک بین الاقوامی ادبی ماہنامہ
آجکل
نئی دہلی

ترتیب

ترتیب — اکتوبر ۱۹۹۳

ترتیب — نومبر ۱۹۹۳

آج کل (نئی دہلی) — نومبر، دسمبر ۹۳ء ● اخبار اردو (اسلام آباد) — جولائی، اگست ۹۳ء

ترتیب
دسمبر ۱۹۹۳ء

جلد ۱۰
شمارہ ۷
جولائی ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۸
اگست ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۹
ستمبر [illegible]

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۱۰
اکتوبر [illegible]

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۱۱
[illegible]

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۱۲
دسمبر [illegible]

فہرست

فہرست

فہرست

ادبیات (اسلام آباد)

سرما ۱۹۹۳ء

۱۰ اپریل-جون ۹۲	۱۰ جنوری-مارچ ۱۹۹۲ء	۱۰ اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۱ء	۱۰ اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۹ء	اردو (کراچی)

سہ ماہی اردو ۲ شمارہ (۴) ۱۹۸۹ء

اکتوبر-دسمبر ۸۹ء

فہرست

جنوری-مارچ ۹۲ء

فہرست

اکتوبر-دسمبر ۹۱ء

فہرست

اپریل-جون ۹۲ء

فہرست

اردو (کراچی) ○ جولائی - ستمبر ۱۹۹۲ء ○ اکتوبر - دسمبر ۱۹۹۲ء ○ جنوری - مارچ ۱۹۹۳ء

سہ ماہی شمارہ ... ۳ ... شمارہ (۳) [illegible]

جولائی - ستمبر ۱۹۹۲ء

فہرست

سہ ماہی شمارہ ... ۴ ... شمارہ (۴) [illegible]

اکتوبر - دسمبر ۱۹۹۲ء

فہرست

سہ ماہی شمارہ ... ۱ ... شمارہ (۱) ۱۹۹۳ء

جنوری - مارچ ۱۹۹۳ء

فہرست

اردو ڈائجسٹ

جولائی ۹۲ء

[illegible]

اس شمارے میں اگست ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں ستمبر ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

اکتوبر ۱۹۹۳ء

محفل پیارے بچوں کی

[اس] شمارے میں

شہید پاکستان صدر ضیاء الحق

اشراق

جولائی ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترسیل

مدیران: [illegible]

مہمان مدیر
۱۰ ڈاکٹر [illegible] — اشاریہ

ادبی البم
۱۳ ادارہ — [illegible]

خود نوشت
۱۵ شاہد الحق حقی — [illegible]

نئی نظم
۲۳ [illegible] — [illegible]
۲۴ [illegible] — [illegible]
۲۵ [illegible] — [illegible]
۲۶ [illegible] — [illegible]
۲۷ [illegible] — [illegible]
۲۸ [illegible] — [illegible]
۲۹ [illegible] — [illegible]
۳۰ [illegible] — [illegible]

نئی غزل
۳۳، ۳۴، ۳۸ — [illegible]

نیا افسانہ، نئی کہانی
۳۹ [illegible] — [illegible]
۴۲ [illegible] — [illegible]
۴۴ [illegible] — [illegible]
۵۳ [illegible] — [illegible]
۶۱ [illegible] — [illegible]
۶۵ [illegible] — [illegible]
۶۶ [illegible] — [illegible]

نئی کتابیں
۷۳ [illegible] — تبصرہ نگارات

محفل
۷۵ [illegible] — [illegible]

اگست ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترسیل

مدیران: یوسف، موجد

مہمان مدیر
۱۰ ڈاکٹر سلیم اختر — اشاریہ

ادبی البم
۱۳ ادارہ — [illegible]

خود نوشت
۱۵ شاہد الحق حقی — [illegible]

یادداشتیں
۲۳ بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری — ہم سفر

نئی نظم
۳۱ [illegible] — [illegible]
۳۲ [illegible] — [illegible]
۳۳ [illegible] — [illegible]
۳۴ [illegible] — [illegible]
۳۵ [illegible] — [illegible]
۳۶ [illegible] — [illegible]
۳۷ [illegible] — [illegible]
۳۸ [illegible] — [illegible]

نئی غزل
۴۱، ۴۲، ۴۸ — [illegible]

نیا افسانہ، نئی کہانی
۴۹ [illegible] — [illegible]
۵۵ [illegible] — [illegible]
۶۰ [illegible] — [illegible]
۶۶ [illegible] — [illegible]

نئی کتابیں
۷۰ [illegible] — تبصرہ نگارات

محفل
۷۵ بابا چکتل — [illegible]

ترتیب

۱۰ ● [illegible] — [illegible]

ادبی البم

۱۳ — [illegible]

خودنوشت

۱۵ — شان الحق حقی — [illegible]

یادداشتیں

۲۴ — [illegible] — ہم سفر

نئی نظم

۲۹ — [illegible] — [illegible]
۳۰ — [illegible] — [illegible]
۳۱ — [illegible] — [illegible]
۳۲ — [illegible] — [illegible]
۳۳ — [illegible] — [illegible]
۳۴ — [illegible] — [illegible]
۳۵ — [illegible] — [illegible]
۳۶ — [illegible] — [illegible]

نئی غزل

۳۹ — [illegible]
۴۳ — [illegible]

نیا افسانہ، انشائیہ

۴۵ — [illegible] — [illegible]
۵۶ — [illegible] — [illegible]
۶۱ — [illegible] — [illegible]
۶۹ — [illegible] — [illegible]

نئی کتابیں

۷۲ — [illegible] — تبصرہ و تعارف

محفل

۷۵ — [illegible] — [illegible]

اکتوبر ۱۹۶۶ء کی تخلیقات

ترتیب

مہمان مدیر

۱ — [illegible] — اداریہ

ادبی البم

۱۲ — ادارہ — [illegible]

خودنوشت

۱۵ — شان الحق حقی — یادش بخیر

یادداشتیں

۲۳ — [illegible] — ہم سفر

نئی نظم

۳۱ — [illegible] — [illegible]
۳۲ — [illegible] — [illegible]
۳۳ — [illegible] — [illegible]
۳۴ — [illegible] — [illegible]
۳۵ — [illegible] — [illegible]
۳۶ — [illegible] — [illegible]
۳۷ — [illegible] — [illegible]
۳۸ — [illegible] — [illegible]

نئی غزل

۴۱ — [illegible]
۴۳ — [illegible]
۴۴ — [illegible]

نیا افسانہ۔ ترجمہ

۴۹ — [illegible] — [illegible]
۵۱ — [illegible] — [illegible]
۵۵ — [illegible] — [illegible]
۶۱ — [illegible] — [illegible]
۶۴ — [illegible] — [illegible]
۶۷ — [illegible] — [illegible]

نئی کتابیں

۷۳ — [illegible] — تبصرہ و تعارف

محفل

۷۵ — [illegible] — [illegible]

نومبر ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

مرتبہ: مرجہ

مہمان مدیر

۱۰ ڈاکٹر سلیم اختر — انشائیہ

ادبی البم

۱۳ اداره — جمیل ملک، جوگندر پال، مقصود زاہدی، محسن احسان، احمد اسلام امجد، ڈاکٹر صابر آفاقی، سلطانہ مہر، رشید منظر، ڈاکٹر ذکاء الدین شایان، مصطفیٰ جمال، کرامت بخاری، حالی، [illegible]

خود نوشت

۱۵ سلطان الحق حقی — آدمیزاد گم گشتہ، جزل

یادداشتیں

۲۴ بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری — ہم سفر

نئی نظم

۳۵ جمیل ملک — ہمزاد سے گفتگو
۳۶ مقصود زاہدی — [illegible]
۳۷ فرزانہ عزیز — [illegible]
۳۸ محسن عابد — [illegible]
۳۹ بشیر [illegible] — [illegible]
۴۰ [illegible]، جمال نقوی (دھنک) — [illegible]
۴۱ ماہ طلعت زاہدی — [illegible]
۴۲ رشید منظر — [illegible]

نئی غزل

۴۵ تا ۵۲ محسن احسان، امجد اسلام امجد، [illegible]، حبیب [illegible]، ڈاکٹر صابر آفاقی، خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر ذکاء الدین شایان، [illegible]، مصطفیٰ جمال، [illegible]

نیا افسانہ، طنزیہ، انشائیہ

۵۳ جوگندر پال — [illegible]
۵۷ سلطانہ مہر — [illegible]
۶۲ ڈاکٹر اختر بستوی — [illegible]
۶۸ افضال احمد — [illegible]

نئی کتابیں

۷۳ [illegible]، ڈاکٹر [illegible]، ڈاکٹر [illegible] — تبصرہ و تعارف

محفل

۷۷ یاران محفل — چند خطوط

دسمبر ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

مرتبہ: [illegible]

۳ ڈاکٹر [illegible] — انشائیہ

ادبی البم

۱۵ اداره — [illegible]

خود نوشت

۱۶ سلطان الحق حقی — [illegible] (۲)

یادداشتیں

۲۲ بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری — ہم سفر

ادبی حقائق

۳۱ [illegible] — دلچسپ ادبی حقائق

نئی نظم

۳۵ [illegible] — [illegible]
۳۶ [illegible] — [illegible]
۳۷ [illegible] — [illegible]
۳۸ [illegible] — آسمان [illegible]
۳۹ [illegible] — [illegible]
۴۰ [illegible] — [illegible]
۴۱ [illegible] — [illegible]
۴۲ [illegible] — [illegible]

نئی غزل

۴۴ تا ۵۰ [illegible]

نیا افسانہ، طنز و مزاح

۵۱ [illegible] — [illegible]
۵۶ [illegible] — [illegible]
۶۳ [illegible] — [illegible]
۶۴ شبنم شکیل — [illegible]

نئی کتابیں

۶۶ [illegible] — تبصرہ و تعارف

محفل

۶۹ یاران محفل — چند خطوط

اقبال

بزمِ اقبال کا سہ ماہی مجلہ

جلد ۳۰ — اکتوبر ۱۹۸۳ء — شمارہ ۴

مدیرِ اعزازی: ڈاکٹر وحید قریشی

نائب مدیر: [illegible]

بزمِ اقبال ۰ لاہور

فہرست — اکتوبر ۱۹۸۳ء

جولائی ۱۹۸۳ء

فہرست

اقبال ریویو (حیدرآباد) اپریل، اکتوبر ۹۲ء ● اقبالیات (لاہور) جنوری ۹۲ء

اقبال ریویو (حیدرآباد)

اقبال ریویو (حیدرآباد)

اپریل ۹۲ء — جلد ۳۲ شمارہ ۱

فہرست مضامین

فہرست — اکتوبر ۹۲ء

موضوع: مسجد قرطبہ۔ تجزیہ و تحسین

اداریہ —— وحید الدین احمد

....

اقبال اکیڈمی کی خبریں

ڈاکٹر [illegible] کے مضمون کے بارے میں [illegible]

[illegible]

اقبالیات (اردو) (اقبال ریویو)

جنوری ۱۹۹۲ء — جلد نمبر ۳۲ ○ شمارہ نمبر ۴

ترتیب

العلم (کراچی)

اگست، اکتوبر، دسمبر

العلم

سہ ماہی اشاعت
فروری، اپریل، جون
اگست، اکتوبر، دسمبر

جلد: ۲، شمارہ ۵: اگست ۱۹۹۲ء

فی شمارہ ... روپے
... روپے
سالانہ ۵۰ روپے
بیرون ہند ۱۵ ڈالر

العلم ... حبیب منگ
(پاکستان) ... ۳۰۰۰۔۴
ٹیلیفون نمبر: ۳۷۵۱۰۱۹

مقالہ نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ہندوستان کے مشہور ... کو حیات ... دہلی کی طرف سے ...
سلسلے میں ۱۹۹۳ء ...
... کے اعزاز دیا گیا۔
ادارہ "العلم" موصوف کو ... پیش کرتا ہے

فوٹو گرافر: سید رضی رضوی

اکتوبر ۱۹۹۲ء

دسمبر ۱۹۹۲ء

الطاف علی بریلوی نمبر

مندرجات

مُندرجات

ترتیب

جلد [illegible] | جولائی [illegible] ——— محرم [illegible] | شمارہ [illegible]

ترتیب

جلد [illegible] | اگست ستمبر [illegible] ——— ربیع الاول [illegible] | شمارہ [illegible]

ترتیب

جلد [illegible] | اکتوبر [illegible] ——— ربیع الثانی [illegible]

ترتیبِ اوراق

افسانے

غزلیں

انشائیے

غزلیں

اس کتاب میں

آپس کی باتیں

استعاریہ

اردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

جولائی ۱۹۹۳ء

اگست ۱۹۹۳ء

ستمبر ۱۹۹۳ء

اکتوبر ۱۹۹۳ء

نومبر ۱۹۹۳ء

دسمبر ۱۹۹۳ء

برہان

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

تحقیق (سندھ) پاکستان

شمارہ ۲ ۱۹۸۸ء، شمارہ ۳ ۱۹۸۹ء

فہرست

فہرست

تحقیق (سندھ) پاکستان

فہرست

شمارہ ۴ شمارہ ۵

فہرست

(سندھ (پاکستان) شمارہ ۷ ۱۹۹۳ء

فہرست مشمولات

فہرست مضامین

فہرست مضامین

ترتیب

ترتیب

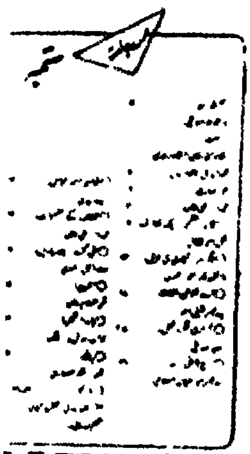
ترجمان الاسلام (بنارس) — جولائی۔دسمبر ۱۹۹۲ء

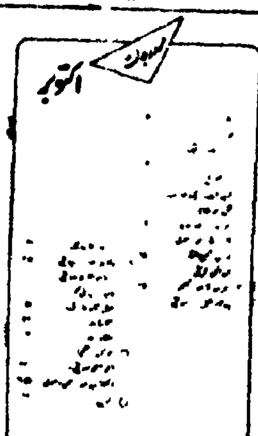
فہرست مضامین

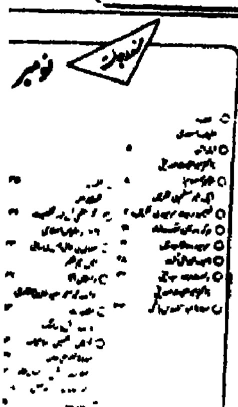
فہرست مضامین

تشکیل (کراچی) — اکتوبر۔دسمبر ۱۹۹۲ء

الجمال







ماہنامہ تہذیب

مندرجات شمارہ جولائی ۱۹۹۳ء

مندرجات شمارہ اگست ۱۹۹۳ء

مندرجات (جولائی)

مندرجات (اکتوبر)

مندرجات (اگست)

مندرجات (نومبر)

مندرجات (ستمبر)

مندرجات (دسمبر)

ماہنامہ جامعہ

فہرست مضامین (جولائی)

فہرست مضامین (اگست)

فہرست مضامین (ستمبر)

فہرست مضامین (اکتوبر)

فہرست مضامین

فہرست مضامین (دسمبر)

فہرست (جولائی)

فہرست (اگست)

فہرست (ستمبر)

فہرست (اکتوبر)

فہرست (نومبر)

فہرست (دسمبر)

دانش (اسلام آباد)

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شماره ۳۴

سخن دانش

بخش فارسی

شعر فارسی و اردو

بخش انگلیسی

[illegible]

اخبار فرهنگی

[illegible]

وفیات

درگذشت سید [illegible]

بخش اردو

بخش انگلیسی

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شماره ۳۵

سخن دانش

بخش فارسی

شعر فارسی و [illegible]

[illegible]

...ت (کراچی) — اگست - اکتوبر ۹۳ء ، نومبر ۹۳ء - جنوری ۹۴ء

...جامعہ (دہلی) — جون - اگست ۱۹۹۳ء

فہرست

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شمارهٔ ۳۴

سخن دانش

بخش فارسی

شعر فارسی و اردو

بخش انگلیسی

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شمارهٔ ۳۵

سخن دانش

بخش فارسی

فت (کراچی) — اگست۔ اکتوبر ۹۳ء ، نومبر ۹۳۔ جنوری ۹۴ء

[illegible] جدید (دہلی) — جون۔ اگست ۱۹۹۳ء

فہرست

فہرست

ایوانِ ادب (پٹنہ) — جلد ۱۶ شمارہ ۴ — ۹

ترتیب

سب رس (حیدرآباد) — جولائی، اگست ۱۹۴۳ء

اس شمارے میں

مضامین

اس شمارے میں — ستمبر

اس شمارے میں — اکتوبر

اس شمارے میں — نومبر

[illegible]

(دسمبر ۹۳ء)

اس شمارے میں

کراچی

اس شمارے میں (اگست)

اس شمارے میں (جولائی)

اس شمارے میں (اکتوبر)

اس شمارے میں (ستمبر)

سب رس (کراچی)

جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۲ء

اس شمارے میں

اس ماہ کی شخصیت

اس شمارے میں

سوغات (بنگلور) شمارہ ۵

ستمبر ۱۹۹۳ء

فہرست

سوغات (بنگلور) شمارہ ۵

سہیل (گیا) — جولائی – دسمبر ۱۹۹۲ء

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

ترتیب

مدیر: نسیم درانی

غزلیں

(۱)

[illegible]	[illegible]	۲۳۲
[illegible]	احمد ظفر	۲۳۳
[illegible]	حسین ملک	۲۳۴
[illegible]	[illegible]	۲۳۵
[illegible]	شوکت واسطی	۲۳۶
[illegible]	[illegible]	۲۳۶
[illegible]	[illegible]	۲۳۷
[illegible]	[illegible] سلام	۲۳۸
[illegible]	جمیل عظیم آبادی	۲۳۹
[illegible]	[illegible]	۲۴
[illegible]	[illegible]	۲۴۱
[illegible]	صابر ظفر	۲۴۲
[illegible]	[illegible]	۲۴۳
[illegible]	[illegible]	۲۴۴
[illegible]	اقبال عالم	۲۴۵
[illegible]	[illegible]	۲۴۶
[illegible]	شوکت [illegible]	۲۴۷
[illegible]	[illegible]	۲۴۸
[illegible]	طارق نعیم	۲۴۹
[illegible]	[illegible]	۲۵۰
[illegible]	[illegible]	۲۵۱
[illegible]	[illegible]	۲۵۲
[illegible]	[illegible]	۲۵۳
[illegible]	[illegible]	۲۵۴
[illegible]	[illegible]	۲۵۵
[illegible]	[illegible] عباس	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

ترتیب

اسلامی ممالک کی کہانیاں

شورِ آسب ۳ مرسلہ سادہ

ناشا لیباد یکی ۷ محمد نشا میاد

ویگن میں ۱۰ انور خان کمال

شناخت ۱۳ نجمہ السالم

رات میں اور بہار کی ۱۶ آشنا کا دارالہا

تنور ۲۰ فرہاد تیکرہ

سیں عرب یحیٰ یحییٰ ۲۲ طیرونشہ جاوید

کی زارہ ۲۶ عارف القوریکہ

[illegible]

کتب و رسائل پر تبصرہ ۳۰ افتخار امام صدیقی

دو شمارے ۔ ایک ملاقات ۳ ۱ ص ۱ ۳ ۴

[illegible]

شمارہ نمبر ۷ [۱۹۹۳ء] جلد ۴۳

اسلامی ممالک کی کہانیاں

دیاسی لڑکی ۴ لے سمٹ لیا گئے

پلیس واک ۹ نجیب محفوظ

آخری سوچ ۱۳ عبدالرحمان الامینے

تحیس پہلے رہائش ۱۸ زین العابدین الحسینی

چڑیا کہانی ۲۲ مرشید شروف

برف کا بستر ۲۵ انور محمد خان لے

چرخی مار ۲۷ سامرہ بانے

بشیر سیدر ۴ شہزاد احمد ۵ وزیر آغا ۶
سمانا شکی ۷ بشیر منوی ۸ غضنفر ساجد ۹
عبداللہ کمال ۱۰ عرفان صدیقی ۱۱ منصور سبزواری ۱۲
خالد اقبال یاسر ۱۳ رشید مظفر ۱۴ جعفر شیرازی ۱۵
شفقت چلیپہ ۱۶ صادق ۱۷ ابرار احمد ۱۸
سوہنی راہی ۱۹ عبدالاحد ساز ۲۰ رفیق سندیلوی ۲۱
خالد رشید ۲۲ عذرا پروین ۲۳ اظہر ۲۴
نذیر قیصر ۲۵ گلشن ۲۶ رباب لطیف ۲۷
نعیم ضیا الدین ۲۸ ✱ افتخار امام صدیقی ۲۹

کتب و رسائل پر تبصرہ ۳۰ افتخار امام صدیقی

دو شمارے ۔ ایک ملاقات ناکس (۲) ۳ ۱ ص ۱ ۳ ۴

رفیق اعظم | جاوید انور | شدالنوانی
محمود حالی | بشیر سیدر | حمید الماس
راہی فدائی | رونق فطری | یوسف جمال
صغیر جمال | مشتاق مصطفیٰ | قیصر جمال
شاہد عزیز | محمد حامد | حمید اختر
خالد جمالی | بسمل عارفی | اختر یوسف

شمارہ نمبر ۸ [۱۹۹۳ء] جلد ۴۳

ترتیب

شمارہ نمبر ۱۰ [۱۹۹۲] جلد ۶۳

شب خون

اگست۔ ستمبر ۱۹۹۲ء

اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء

ترتیب

ترتیب

ترتیب

ترتیب

شیرازہ دسمبر کشمیر — ۳۰/۱۱، ۱۲ سال ۱۹۹۱

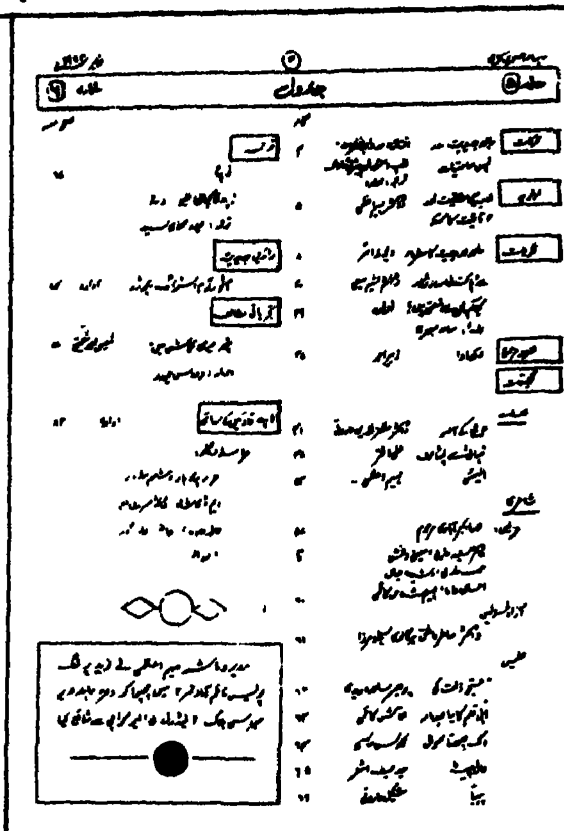
ترتیب

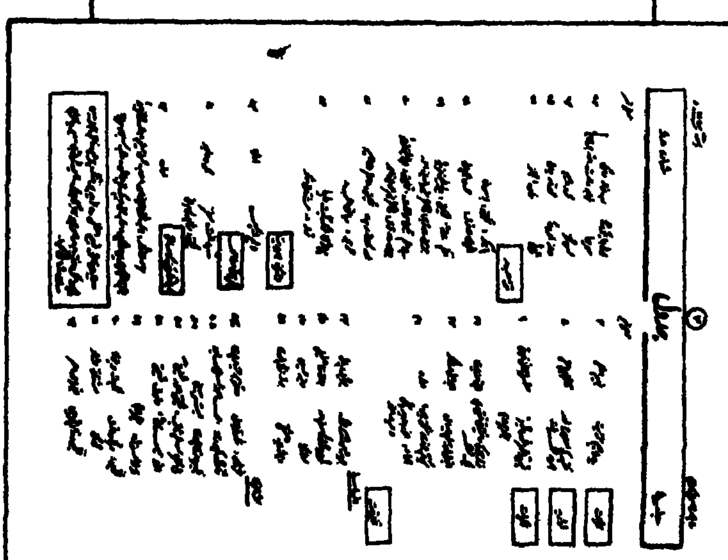


جلد ۵　　جدول　　شمارہ ۶

جلد ۵　　جدول　　شمارہ ۵

جلد ۵　　جدول　　شمارہ ۱





مجلہ غالب نامہ نئی دہلی

جولائی ۱۹۹۳ء

جلد ۱۴ ——————— شمارہ ۳

ناشر و طابع: شاہد ماہلی ——————— مطبوعہ: عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

فہرست

قیمت: ۵۰ روپے

خط و کتابت کا پتا

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲—۱۱

فون: ۳۷۱۳۵۸۳
۳۳۱۶۵۱۸

فکر و نظر (علیگڑھ) ۳۰/۳، ۴، ۱۹۹۳ء

فکر و نظر (علیگڈھ) ۳۰/۳

ترتیب :

فکر و نظر (علیگڈھ) ۳۰/۴

ترتیب :

فنون (لاہور)

فہرست مندرجات

جولائی - دسمبر

افسانے

غزلیں

سفرنامہ

طنز و مزاح

	قومی زبان (آندھرا پردیش) جولائی۔ اگست ۹۳ء

اختلافات ذکا صدیقی، صابر آفاقی، عامر سہیل، امتیاز الحق امتیاز، احسن ثاقب، محبوب عارفی،	رفاقت حیات، اختر رضی، نقوی احمد پوری، خیر الدین انصاری، رانا غلام شبیر، فرشتہ،	یوسف حسن، امتیاز علی خان، محمد سعید، مسرت ہاشمی۔ ۱۱

۲

قومی زبان (آندھرا پردیش)

جولائی۔ اگست ۱۹۹۳ء

ترتیب

-۵-

ماہنامہ قومی زبان کراچی

انجمن ترقی اردو پاکستان

[illegible]

مدیر اعلیٰ: ادا جعفری، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ

مدیر: ادیب سہیل

بدل اشتراک: [illegible]

جنوری ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۱

مضمون نما

فروری ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۲

مضمون نما

مارچ ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۳

مضمون نما

اپریل ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۴

مضمون نما

مئی ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۵

مضمون نما

کہانی رنگ رنگ

جون ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۱۰

مضمون نما

کہانی رنگ رنگ

جولائی ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۷

مضمون نما

کہانی رنگ رنگ

اگست ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۸

مضمون نما

ستمبر ۱۹۹۳ء — جلد ۶۵ — شمارہ ۹

مضمون نما

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں

طنز و مزاح

●

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں

جائزے

[illegible]

[illegible] کے شاہکار [illegible] / مشرقی شعریات / ارشاد [illegible]۔

●

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں

جائزے

[illegible] کی [illegible] / کلیات [illegible] / [illegible]
[illegible] / سائنس نامہ / [illegible]
ماہنامہ [illegible] کی دنیا۔

اس شمارے میں

●

اس شمارے میں

●

اس شمارے میں

جلد ۱۵۲ ماہ جولائی ۱۹۹۳ء مطابق ماہ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ عدد ۱

مضامین

جلد ۱۵۲ ماہ اگست ۱۹۹۳ء مطابق ماہ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ عدد ۲

مضامین

جلد ۱۵۲ ماہ ستمبر ۱۹۹۳ء مطابق ماہ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ عدد ۳

مضامین

جلد ۱۵۲ ماہ جمادی الاخری ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۳ء عدد ۶

مضامین

(جولائی)

○ معیار یہ	ن م راشد، شکیل، مدحت…
○ اوراقِ اقتباس	علی رضا، مختار، ماجد، حکیم، راجہ، عارف
○ مجالس	انشائیہ:
○ علمی انتخابات کے نتائج	ڈاکٹر وزیر آغا
○ سخن تحقیق زادہ شاعری	مضامین:
○ شاعرِ طلاب قریشی سے مکالمہ	ڈاکٹر شمس الحق، ڈاکٹر عابدہ
غزلیں:	فردوس حیدر، ستارہ، ایم ایس
شکیل عادل زادہ، آغا، صہبا اختر	افسانے:
محسن احسان، قاسم	علی حیدر ملک، شاہد، رشید
عرفان صدیقی، اختر	قدیر انصاری، اظہر مسعود خان، سعید
امیر قزلباش، طالب رامپوری	یادداشت:
محسن بھوپالی، شہاب الدین شہاب	سودا بہ دفعِ مصرعِ ثانی (تیسری قسط)
مبارک، تاثیر، انصار، شاہین	تحقیق:
گل، حسن، سجاد	ڈاکٹر ابوسعید علی سے مکالمہ
نظمیں:	کتابوں پر تبصرے
سرشار صدیقی، رسی، ظفر	اور ملک و بیرونِ ملک ادبی سرگرمیاں

اس شمارے میں دیکھیے

○ یادِ رفتگاں:
خلیفہ عبدالحکیم، عبدالحی، سید انیس شاہ جیلانی، ماہر القادری، (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)، سیف الدین سیف (انور سدید)، جگر مراد آبادی (علی حیدر ملک)، حسرت چغتائی (انعام الحق)، کوثر، محمود (افضل)، نثار (سید یحییٰ)، ساحل (اظہر مسعود خان)۔

○ تنقید و تحقیق:
ترقی پسند تحریک (انوار احمد)، اختر الایمان کی شاعری (طالب قریشی)، حافظ محمود شیرانی (حاکم مہمانی)، یہ صدی اور ہم (ڈاکٹر وزیر آغا)، اردو کا ادب (احمد الیاس)، اردو میں انشائیہ (انور سدید)، اقبال (مشفق خواجہ)، فراق گورکھپوری (اقبال)، قیامِ پاکستان کا موسم (اعجاز حسین)، فردوس حیدر کے افسانے (مشتاق احمد)، صدی اور ادب (ڈاکٹر انور سدید)، منظر امام، آنکھوں میں (قادر قریشی)، مقالہ، منظر گیری (اختر رضا)۔

○ انشائیہ:
زبان (انور احمد)۔

○ مکالمات:
ممتاز شاعر شکیل عادل، ممتاز ادیب اکرام بریلوی، ممتاز دانش ور ڈاکٹر۔

○ طنز و مزاح:
برکات (ڈاکٹر علی خان)، خورشید رضا (رحیم راحت)۔

○ سرگزشت:
سفر امریکہ سے ایک باب (ڈاکٹر سلیم اختر)۔

○ ایک کردار ایک کہانی:
میرے خواب ٹوٹ گئے۔

○ اردو صحافت:

حال اردو کی تاریخی صحافت پر تجزیہ ہے۔

○ اوراقِ گم گشتہ:

ڈاکٹر رضوی، محمود شام

○ ادبی جرائد کا جائزہ

کتابوں پر تبصرے

○ اندرونِ و بیرونِ ملک ادبی سرگرمیاں۔

اور

○ اشاریہ:
گزشتہ برس "معیار" میں شائع ہونے والی نگارشات کی فہرست۔

○ غزلیں

[illegible]

○ نظمیں

[illegible]

○ قطعات

[illegible]

○ رباعیات

[illegible]

○ نعت

[illegible]

○ افسانے

[illegible]

○ غیر ملکی ادب

[illegible]

اس شمارے میں

اس شمارے میں

اس شمارے میں

نقوش (کراچی) — دسمبر

اس شمارے میں

[illegible]

نخلستان (بجنور) — جولائی۔دسمبر

مشمولات

نقد و نظر (علی گڑھ) جلد ۱۵ شمارہ نمبر ۱ ۹۳

منظومات

نقوش (لاہور) شمارہ ۱۴۱

فہرست

مقالات و مضامین

نظم

نعت

دعا

نظم و غزل، رباعیات

افسانے

سفرنامے

نقوش (لاہور) شمارہ ۱۴۱

فن اور شخصیت

انشائیہ

تبصرے

نگار پاکستان (کراچی) — جولائی۔ نومبر ۱۹۹۲ء

"نگار پاکستان" (کراچی) جولائی ۱۹۹۲ء

● فرمان فتحپوری نمبر: مرتبہ خلیق انجم ●

"نگار پاکستان" (کراچی) اگست ۱۹۹۲ء

● انتخاب غزلیات میر حسن، شائع کردہ "اردو اکادمی، دہلی" مرتبہ مظفر حنفی ●

"نگار پاکستان" (کراچی) ستمبر ۱۹۹۲ء

● وصی احمد بلگرامی مرحوم کی کتاب "ملک خطا کے شہزادے" ●

"نگار پاکستان" (کراچی) اکتوبر ۱۹۹۲ء

● مشکلات غالب از نیاز فتحپوری ●

"نگار پاکستان" (کراچی) نومبر ۱۹۹۲ء

● فرمان فتحپوری کے سات مضامین جو ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء میں مختلف رسائل میں چھپے ●

نوائے ادب (بمبئی) — اکتوبر ۹۳ء

منـــدرجات

نیادور (لکھنؤ) — جولائی، اگست ۱۹۹۳ء

عنوانات

عنوانات

عنوانات

عنوانات

عنوانات

تمت

تتمہ

وہ رسائل جو ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء کے نصف اوّل کی فہرست میں شامل نہ ہو پائے

نونہال (کراچی) جولائی ۹۳ء ● آنند ڈائجسٹ (پٹنہ) اگست ۹۳ء

حسن ترتیب





کپل دیو

دنیائے کرکٹ کی منزل بن گیا

آنے والا ہر کھلاڑی یہ منزل

حاصل کرنے کی کوشش کرے گا

ابلاغ (پشاور) • اکتوبر ۱۹۹۲ء • اکرام المشائخ (بہاولپور) جنوری/مارچ

محکمہ تعلیم صوبہ سرحد نے منظور شدہ

ابلاغ

پشاور

جلد — ۵، شمارہ — ۳

مرتبین — سیدہ حنا — نسرین سوش — مدیر معاون حامد سوش

قیمت فی شمارہ — ۲۵ روپے

زر سالانہ بیرون ملک — 360 روپے

اکتوبر — ۱۹۹۲

زر سالانہ — [illegible] روپے

پاکستانی کرنسی میں

رجسٹری سے — ۲۵ روپے

نشرو اشاعت — عشرت سینما روڈ — گلبہار نمبر ۳ پشاور

[illegible]

الثنائی — ۱۷ اے ایس سی کالونی [illegible] فون [illegible]

[illegible]

[illegible]

ترتیب

اداریہ —

مطالعہ

[illegible]

افسانے

[illegible]

غزلیں

[illegible]

تبصرات

[illegible]

نظمیں

[illegible]

بزم احباب — مدیر

اکرام المشائخ

اِکرام المشائخ ڈیرہ نواب صاحب

جنوری تا مارچ ۱۹۹۲ء

جلد ۲ شمارہ ۵

حضرت مخدوم سید اکرام حسین صاحب [illegible] مدظلہ

سرپرست اعلیٰ

حکیم محمد افتخار حسین [illegible]

مدیر معاون

حکیم محمد ممتاز حسین طاہر چشتی

معاونین

ممتاز جاوید سلیم چشتی بی اے

شیر قانون

محمد اسلم راؤ ایڈووکیٹ

محمد افضل خان ایڈووکیٹ

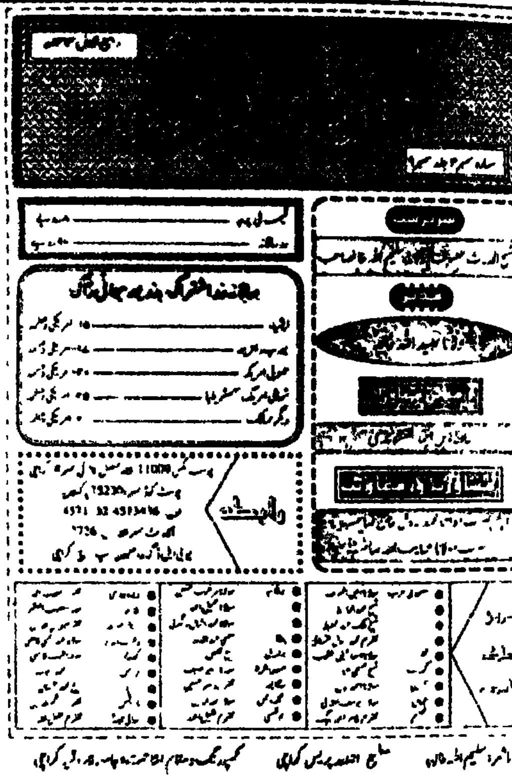
فی پرچہ [illegible]



خانقاہ عالیہ چشتیہ ڈیرہ نواب صاحب ضلع بہاولپور

فہرست

حکیم محمد افتخار حسین [illegible] چشتی نے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر خانقاہ عالیہ چشتیہ ڈیرہ نواب صاحب ضلع بہاولپور سے شائع کیا۔



آئینہ

آئینہ

آئینہ

ماہنامہ

پیش رفت

Rs 450/

70/-

8/-

ترتیب

میزان

کامیابی

تحریر (لاہور)

دسمبر ۱۹۹۳ء

ترتیب



ماہنامہ

تحریر لاہور

ایڈیٹر — حنا صدیقی — ناہید صدیقی

اعزازی مشاورت — طاہر شادانی

اعزازی مدیران — ... طاہر صدیقی — شاہدہ صدیقی — سعادت نسرین — امین صدیقی — طاہرہ صدیقی — جلیل صدیقی

تزئین و آرائش — ... حنیف — عمران حنیف

مقام اشاعت

چوک اردو بازار لاہور

تعمیر

جلد نمبر [illegible] شمارہ نمبر [illegible]

اکتوبر [illegible]

نگران ۔ کے۔ ایل۔ دھر

مدیر ۔ عبدالغنی

معاون مدیر ۔ موتی لال رینہ

تزئین ۔ [illegible]

شائع کردہ

ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن حکومت جموں و کشمیر

ترتیب

مشاعرہ نمبر

چوں چوں کا مربہ

بدایوں

جلد نمبر [illegible] جولائی [illegible] شمارہ [illegible]

مدیر

اسحاق طبیب

[illegible]

قیمت فی پرچہ [illegible]

[illegible]

دفتر چوں چوں کا مربہ [illegible]

بھان متی کا پٹارا (فہرست)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترجمان

مجلہ المنتظر

لوگانواں سادات مرادآباد

جلد نمبر ٦ — شمارہ نمبر ١٢

ماہ دسمبر سنہ ۱۹۹۳ء

نگران:- حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید قرۃ العین مجتبیٰ صاحب قبلہ

ایڈیٹر:- سید نعیم عباس عابدی صاحب قبلہ

معاون ایڈیٹر

علی نقی لوگانوی — سید حیدر عباس نقوی

معاون خصوصی:- ڈاکٹر سید صدیق علی صاحب ایم، ڈی۔ جناب الحاج سید خورشید حسین صاحب

جناب مولانا غلام عباس صاحب قبلہ مقیم افریقہ۔ جناب سید محمد عباس صاحب، سید نعیم اختر صاحب

(دہلی برانچ المنتظر)

فہرست مضامین

اراکین ادارہ کا اہل قلم حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

جملہ خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

مجلہ المنتظر، لوگانواں سادات، مراد آباد

(یو. پی)



فہرست:

بیاد امام المشائخ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

خوبصورت اور صحت مند قدروں کا ترجمان

ماہنامہ درویش لاہور

مقام اشاعت: المصطفیٰ ہومیو کلینک، ۲۰ عبدالکریم روڈ، لاہور

اولیاء اللہ نمبر

مدیر اعلیٰ ۰ ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

فون ۹۲۶۵۱۵۱۱ — فی پرچہ: ۳۰ روپے

جلد: ۵ — شمارہ: ۱۰ — اکتوبر ۱۹۹۳ء

مِن درویش

حصہ اوّل

حصہ دوم

حصہ سوم

رنگ (دھنباد) جولائی ستمبر

بیادگار خیابان احمد ندیمی

● تخلیقی ادب کی اشاعت کا پروقار ذریعہ
● جدیدیت اور تجربیت کے سلسلہ میں فکر و نظر کی سنجیدہ کوشش
● نئی نسل کی ذہنی تربیت کا آرگن
● جدید ادب میں تنقیدی روش سے بیباکانہ انحراف
● ادب میں نئے تجربوں کی صداقت کا بیباک ترجمان
● تنقیدی ادب میں دیانتداری کا آئینہ

سہ ماہی رنگ دھنباد

مدیران:
شان بھارتی
آمر صدیقی

بساطِ رنگ

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ
سہ ماہی رنگ
[illegible] دھنباد - ۸۲۸۱۲۱

فی شمارہ: دس روپیہ
زر سالانہ: پچاس روپیہ

[illegible] دھنباد [illegible]

بساطِ رنگ

اقتباسات

اداریہ

مضامین

نظمیں

ہندی نظم

پنجابی نظم

افسانے

[illegible]

[illegible]

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

سہ ماہی

دھنباد

مدیران:
آر صدیقی ۔ شان بھارتی

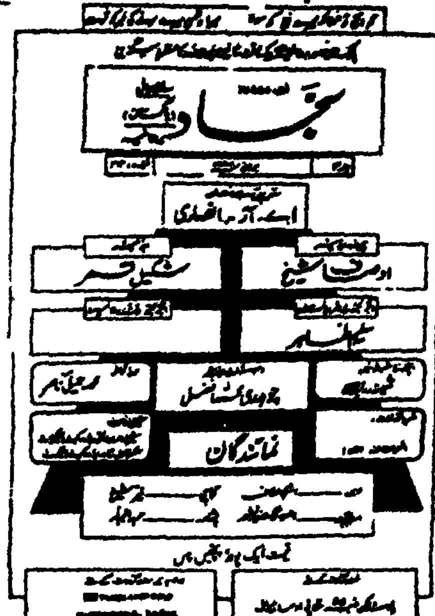
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سجاد (ساہیوال، پاکستان) جولائی ۹۳ء ● سنسد (نئی دہلی) ستمبر، اکتوبر ۹۳ء ● شفق (پٹنہ) ستمبر، نو



مضامین:

[illegible]

غزلیں:

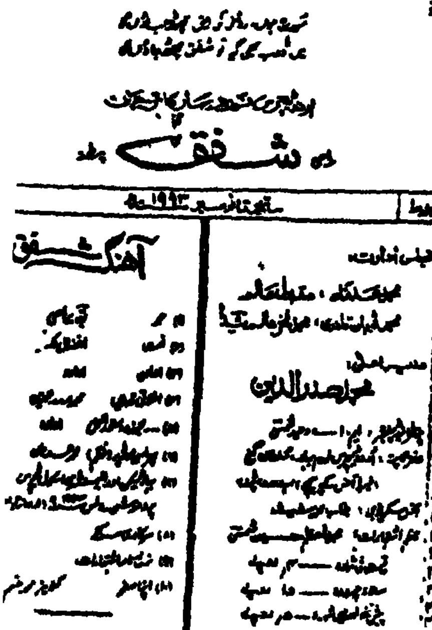
[illegible]

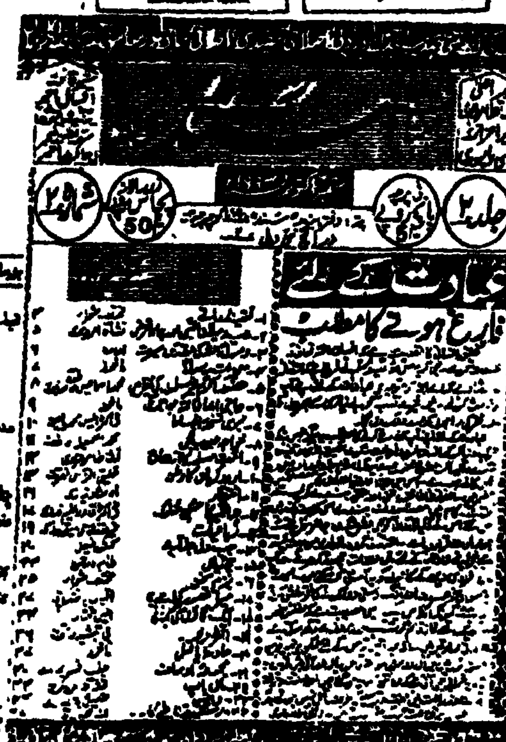
قطعات:

[illegible]

تبصرے:

[illegible]





ترجمان ندوۃ الطلبہ جامعہ امام ابن تیمیہ

طوبیٰ

سرپرست اعلیٰ ——— فضیلۃ الشیخ محمد خورشید السلفی
رئیس التحریر ——— فضیلۃ الشیخ [illegible]
رئیس الندوۃ ——— [illegible]

مدیر: عبدالواسع

مجلس ادارت

[illegible]

مجلس ندوۃ (الشعبۃ العربیۃ)

[illegible]

مجلس ندوۃ (الشعبۃ الاردیۃ)

[illegible]

بزم بزرگ و یار طوبیٰ

علم و دانش (گورکھپور) ستمبر و اکتوبر ۹۳ ● مسرت ڈائجسٹ (کراچی)

زیر سرپرستی دارالعلوم گورکھپور

علم و دانش

ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۳ء

۲	افتتاحیہ	ادارہ
۳	مطالعہ قرآن	جوہر قاسمی
۹	درس حدیث	مولانا عبدالباری
۱۱	تبلیغی سفر	سید حبیب اللہ صاحب
۱۶	ملفوظات	مولانا محمد ...
۱۹	مولانا کا کردار	ادارہ
۲۲	اکابرین گورکھپور	قاضی عظیم الحق صاحب
۲۵	تبادلہ خیالات	ڈاکٹر ... جوہر
۳۰	لطیفہ	ادارہ
۳۱	ادب	جوہر قاسمی

مدیر مسئول

حکیم محمد احمد قاسمی

مدیر تحریر

محمد انعام الحق جوہر قاسمی

فی کاپی ۵ روپے

سالانہ خریداری ۵۰ روپے

خصوصی تعاون ۱۰۰۰ روپے

لائف ممبر ۱۰۰۰ روپے

ماہنامہ مسرت ڈائجسٹ

مدیرہ

بشریٰ صدیقہ

مدیر خصوصی: وسیم اے صدیقی

نائب مدیرہ: طاہرہ حبیب

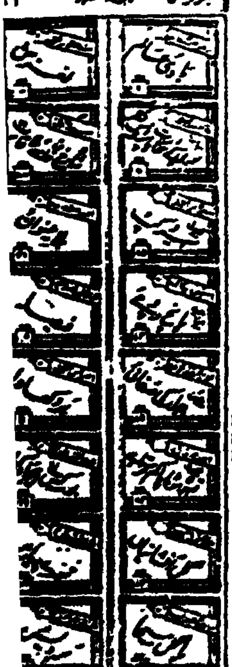
ناشر: یو۔ زیڈ تاثیر

مرکزی منیجر: فاروق علی خان

ترتیب: انیس صدیقی



آئینہ



سرپرستی میں آباد سے شائع ہونے والا ہندوستان کا واحد ادبی ماہنامہ

ماہنامہ نسیم سحر

الہ آباد

بیادگار
حضرت مولانا حسرت موہانی رحمۃ اللہ علیہ

سرپرست: الحاج عبدالستار خیری
معاون: ایس ایم ولی الحسن

جلد ۱ — ماہ دسمبر ۹۳ء — شمارہ ۴

ایڈیٹر صبیحہ موہانی

مجلس مشاورت

پروفیسر عنوان چشتی	حساب سیکل قاسمی
ڈاکٹر بشیر بدر	گوہر شبیر روی
پرنسپل نثار عباسی	الحاج ایس دہلوی
ڈاکٹر فہمیدہ ساحل علمی	خلیل عشرت
خلیق الزماں نصرت	احتشام خاں پوری
محمد مطیع پرویز	ڈاکٹر رضیہ سلطانہ نکہت
عقیل شاطر	شمس الاسلام نسیم

نسیم سحر میں شائع ہونے والے تمام ادبی و غیر ادبی مواد میں تمام واقعات اور مقالات حقیقی ہوتے ہیں اور حقیقی افراد مقالات واقعات یا کسی طرح کی مطابقت محض اتفاق سمجھی جائے گی جس کا ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔

نسیم سحر میں شائع ہونے والے تمام مضامین کے جملہ حقوق بحق ایڈیٹر پبلشر محفوظ ہیں۔

نسیم سحر سے متعلق تمام تنازعات کا حق صرف الہ آباد عدلیہ کو ہی ہوگا۔

نوٹ: ناقابل اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضامین وغیرہ کاغذ کے ایک طرف بین السطور کا لحاظ رکھ کے لکھیں۔

جنرل منیجر: متین الحسن موہانی

معاونین ادارت
ڈاکٹر سلمیٰ بیگم
زرینہ نسیم
امینہ بانو

نگران شعبہ فروخت
خلیل انجم (کاملی)
محمد فاروق اختر

غیر ممالک میں ہمارے نمائندے
• ... ریاض
• محمود الحسن ... لاہور
• ... دوحہ
• زین العابدین ... دمام

قیمت 7/- فی شمارہ

سالانہ قیمت ہندوستان کے لئے	۸۰/-
غیر ممالک سے	۵۰۰/-
غیر ممالک سے خصوصی تعاون	۱۰۰۰/-

EDITOR, PRINTER, PUBLISHER & OWNER SABIHA MOHANI " SAHAR " - PRINTED AT ASRAR KARIMI PRESS JOHNSON GANJ ALLAHABAD-PUBLISHED FROM C 717, KARELI SCHEME, ALLAHABAD-211016.

فہرست بجریدہ کا جسمہ

سہ ماہی

ورق تازہ

ممبئی (مہاراشٹر)

مدیر

ابراہیم اختر

ترتیب کار

اسلام الدین یقین

مجلسِ انتظامیہ

مینیجنگ ایڈیٹر — محمد تقی

• امداد اشرف بیگ شعلہ
• قیصر اقبال قریشی
• محمد عبدالباسط خان

سال: پہلا — شمارہ: پہلا

جنوری، مارچ ۱۹۹۳ء

مجلسِ مشاورت

• ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ
• قاضی سلیم
• بشر نواز
• سید ہاشم
• دیپک قمر
• عبدالستار سہروردی
• ڈاکٹر رشید ررسار

قیمت فی شمارہ: ۱۰ روپیہ

زرِ سالانہ: ۴۰ روپیہ

خوشنویس: حکیم خورشید

قیمِ کار: امداد سہانی، صدیقہ، فسانہ بلڈنگ، یوسف کالونی، فاروقی روڈ، ممبئی

ادارہ جدید، فاروقی پریس روڈ ... ممبئی

پرنٹر پبلشر: محمد تقی نے مکتبہ پبلیکیشن کے لیے ... پریس سے چھپوا کر فسانہ بلڈنگ، یوسف کالونی، فاروقی روڈ، ممبئی سے شائع کیا

ایڈیٹر: ابراہیم اختر

رابطہ: فسانہ بلڈنگ، یوسف کالونی، فاروقی روڈ، ممبئی (مہاراشٹر)

ترتیب

ترتیب

غزلیں

[illegible] ——— [illegible]

ترتیب

تتمه

ضمیمہ

ضمیمہ۔۱

ادبی دانشوری

تہذیبی دانشوری

مذہبی دانشوری

شعری دانشوری

پاک دانشوری

پاک مذہبی دانشوری

شخصیات

وفیات

تاریخ علوم و فنون

ممالک اسلامیہ

متفرقات

کتابیں / رسائل

مخطوطات

ناصر بغدادی

ادب میں گروپ بندی کا مسئلہ

تخلیقی ادب کی ترویج اور نشوونما تخلیق کاروں کے قلم کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ادب زندگی کا ترجمان، معاشرے کا عکاس اور عصری آ[گہی] کا آئینہ دار اس وقت ہوتا ہے جب فنکار نہ صرف آزادیٔ تحریر کی دولت سے مالا مال ہوں بلکہ ادبی فضا بھی گروہ بندی اور عصبیت کے [...] رجحانات سے کلی طور پر آزاد ہو۔

معاصر اردو ادب کے تناظر میں اگر ہم گہری نگاہ سے دیکھیں تو اس بات کی توضیح کی چنداں ضرورت نہیں ہوگی کہ ہمارا اسی فیصد ادب:

1- اجتماعی سوچ کا عکاس نہیں ہے۔
2- معاشرتی محسوسیت کا ترجماں نہیں ہے۔
3- عصری آگہی کا آئینہ دار نہیں ہے۔

اس کے برخلاف معاصر اردو ادب ایک ایسا میدانِ کارزار بنا ہوا ہے جہاں ادب کی برسرپیکار ہستیاں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں اپنی بہترین صلاحیتوں کے مظاہرے میں مصروف ہیں۔ آزادیٔ تحریر کا ذکر خارج از بحث ہے۔ ہمارے اہلِ قلم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کے فنی اجتہادات اور تخلیقی امتیازات کی حدود کیا ہیں۔ بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والوں کی فکری عمل اس نہج پر پہنچی ہی نہیں ہے جہاں انھیں آزادیٔ تحریر کے فقدان کا احساس ہوتا۔ البیئر کامیو نے بتایا ہے کہ ادب و فن کی پیدائش آزادانہ فضا کے بغیر ممکن نہیں۔ اسے اب کیا کہیے کہ ہمارا ادیب ادب کی تخلیق تو کرتا ہے مگر اس ادبی حقیقت سے ہنوز ناواقف ہے۔ ویسے خال خال چند تخلیقی فن کاروں کے تاثر پاروں کے بین السطور آزادیٔ تحریر سے محروم ہونے کی کیفیت نیم مرئی و نیم محسوس شکل میں ہمیں مل جاتی ہے۔

معاصر ادب میں انتشار اور اس کے غیر تخلیقی ہونے کے حقیقی ذمہ دار صحیفت اور گروہ بندی کے مذموم رجحانات ہیں۔ گروہ بندی ادب دونوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ یہ نہ ارفع ادب کے تخلیق کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور نہ اس کی نمو پذیری کے سلسلے میں معاون ہو سکتی ہے۔ اگر معاصر ادب میں معاشرے اور ہمارے کی سیّال کیفیت نظر آتی ہے تو اس کی ایک وجہ بھی گروہ بندی اور ادبی صحیفت۔ ادب میں تعصبات کی قسمیں دو ہو جاتی ہیں تو ادب کی صالح قدریں کلاسیکی اور تہذیبی سیاق و سباق سے کٹ کر رہ جاتی ہیں۔ عامۂ شا کے ادب کی تخلیق خود ایک اچھا کام ہے لہذا تعصبات سے اسے کامل طور پر مبرا ہونا چاہئے۔ ای ایم فورسٹر (E.M FORSTER) نے ایک ہے کہ تخلیقی فنکار اس نصب العین سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے۔ قلم کا جہاد تلوار کے جہاد سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ البیئر کامیو نے نوبل انعام قبول کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اپنی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں ایک فنکار ا معاشرے کے پرخلوص احساسات کا عکاس بن سکتا ہے مگر اس مقصد کے حصول کے لئے صداقت اور آزادی کی تلاش اور خدمت ضروری

اگر ہم آج کے ادب کے سیاق و سباق میں معاصر لکھنے والوں کے ادبی کردار کا مطالعہ کریں تو ہمیں شدید مایوسی سے دوچار ہونا پ ہمارے بیشتر لکھنے والوں کو صداقت کی تلاش سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ معاشرتی خرابیوں کی نشان دہی کی کوشش میں وہ اپنے خیالات ڈھنگ میں پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ وہ ادب کی نئی معروضی جہتوں کے متلاشی ہیں نہ عصری آگہی کو اپنی تحریروں میں اجاگر کرنا ان مسلک ہے۔ وہ نہ آزادی تحریر کے فقدان کے شاکی ہیں نہ انسانی اقدار اور تجربے کے گوناگوں پہلوؤں کی ترجمانی ان کا نصب العین ہے تحریروں کے مطالعہ سے اُن کا ادبی طرز عمل اور تخلیقی مزاج کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ سچا لکھنے والا حیات و کائنات کا تازہ وجدان رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے دور کے بیشتر لکھنے والوں نے دیانت دارانہ ادبی تصوّر پر اپنا مدار رکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ نے تعصبات سے بلند ہو کر حرکی نقطہ نظر، فلسفیانہ وجدان اور فکری آہنگ کو اپنانے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ادب کے بڑے اور ناقدوں نے جو کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں ان کا مطالعہ کیجئے تو بس یہ محسوس ہوگا جیسے نئے عصری ادب کے نام پر گروہ بندی اور صحیفت کے ز عناصر کا احاطہ کیا گیا ہے!

شہرت کی خواہش انسانی فطرت کا ایک کمزور پہلو سہی لیکن اس کی تلاش کسی جرم کا ارتکاب نہیں مگر اس کا حصول اس وقت ایک معافی جرم بن جاتا ہے جب ہم ایسی نام نہاد ادبی تحریروں کی حوصلہ افزائی کریں جو تعصبانہ تجربے سے مروّج اور مخلوط ہوتی ہیں۔ اس لئے ادب فکری نہج اور وجدانی بنیاد سے محروم تو ہوتا ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ اعتبارات پر پہرے بھی بٹھا دیتا ہے! شہرت کی خ ادب کے نام پر ادبی کچرے کا ارتکاز ایک ناقابل معافی ادبی جرم ہے۔

آج کا بیشتر ادب بے روح پروپیگنڈہ بازی کا دوسرا نام ہے۔ شہرت کے جھوٹے نشے میں مست ہونے کی جھوٹی خواہش نے آج کے والوں کو کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ آج ادب کے قلم نے دانستہ طور پر ابہام اور اہمال کو اپنایا ہے تاکہ اس کے پس منظر میں وہ آفاقی انسانی جذبات کے خلوص اور معاشرتی بہبود کے تصورات سے دامن بچا کر اپنی تحریروں کو یوں تجریدی رنگ میں پیش کرے کہ قاری کا ذ رہ جائے۔ قاری کو اس طرح الجھا کر وہ شخصی انانیت اور تجریدی اسلوب نگارش کو جدیدیت سے مخصوص ملاحتی لب و لہجہ اور کا نام دیتا ہے۔ پروپیگنڈا باز ادیب کے نقطہ نظر سے آج کا اردو ادب جدید رجحانات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے بقول اس گروہ والے کے پاس شعور اور مطالعے کی کمی نہیں ہے۔ وہ پیچیدہ مسائل کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اسی شدت سے اس کے خیالات کو مربوط اور منضبط ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ سب ہی نام نہاد ہیں اور ہر تخلیق جدید ادب کے نئے قافلے کی ہے۔ عصری نام نہاد لکھنے والوں کا ایک جم غفیر ہے۔ سب اظہار عصری شعور کے ترجمان اور ادب و آگہی کے منصب رکھنے کے علمبردار ہیں مگر

...بندی نے ... ایسا ادب پیدا ہو رہا ہے جس کی حیثیت کھوکھلے پروپیگنڈے سے زیادہ نہیں۔ ان تحریروں کے ایک معتد بہ حصے کو ادائی
... عصری" ... اور اس دور کے ذاتی و جذباتی سانچوں سے ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔

آج ... ادب کے تقریباً ہر معتبر نام کے گرد غیر معروف بونوں کا ہجوم ہے جو کچھ تو حقیقتاً معتبر نام ہیں اور کچھ پروپیگنڈا بازی کے طفیل راتوں ... شہرت کے آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ بونوں اور معتبر ناموں کی باہمی گٹھ جوڑ گروہ بندی کی مستحکم شکل ہے۔ یہ سازشی اشتراک در حقیقت "... ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے نشانہ ساز اصول کی پیروی ہے جو اتفاق سے دونوں ہی فریقوں کے مفاد میں ہے۔ بونوں کی سب سے بڑی اور ... دلی خواہش کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بھی ادب کے قد آوروں کی اگلی صف میں شامل ہو جائیں۔ بس اسی اتفاقی کا لبادہ زیب تن کرنے کے بعد ... ان ... ادب کے چند معتبر ناموں کی جانب سے سبز سگنل کا فرمان حاصل ہوتا ہے تو انہیں احساس معنویت (SENSE OF SINGNIFICANC) کے ساتھ ساتھ انہیں اپنا قد بھی اونچا ہوتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ ان نام نہاد عہد ساز شخصیتوں کو زندہ ... کرنے کی دھن میں لفاظی اور فصاحت و بلاغت کے آزمودہ نسخوں کو آزمانے پر پوری طرح کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ فرماں بردار اور سعادت مند ... گوشوں کی طرح وہ بھی اپنے ادبی مرشد کی شان میں مداح سرائی اور قصیدہ خوانی شروع کر دیتے ہیں ایسے توصیفی مضامین کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو جاتا ہے جن میں ان SELF-STYLED نام نہاد ادبی شخصیتوں کے لئے بصیرت افروز اسمائے صفات (ADJECTIVES SUPE...) کا استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر معتبر نام شاعر کا ہے تو وہ مختلف طور پر [illegible] اور غالب کا ہم پلہ بن جاتا ہے۔ خوش فکر اور فلسفیانہ وجدان ... حامل شاعری اس پر ختم ہو کر عصری دانش کو متاثر کرتی ہے اور اگر معتبر شخصیت افسانہ نگار ہے تو موپاساں، او ہنری اور چیخوف اس کے آگے ... پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ اس پر لکھے گئے تنقیدی پاروں کی جھلکیاں کچھ اس انداز میں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں

1. "ان کا منفرد لب و لہجہ، ملامتی پیرایہ اظہار اور تجریدی ڈھانچہ سب مل کر ان کی ایک نمائندہ جہت اور ان کا منفرد تشخص قائم کرتے ہیں"
2. "وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ تلمیح کی ٹرانسفارمیشن کے واسطے سے کہہ جاتے ہیں"۔
3. "اس نے اردو افسانے کو فارمولا کہانی کی دلدل سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ا ر. کی افسانہ نگاری کو پرکھنے کا تنقیدی شعور ... ست تیز دکھائی دیتا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ وہ پیدائشی افسانہ نگار واقع ہوا ہے اور اس صنف ادب میں وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اتفاق سے تنقید نگاری، قد ... ور نام کا میدان ہو تو ہمارے ٹی ایس ایلیٹ کی ماہیت اور سلامتی نہ صرف خطرے میں نظر آتی ہے بلکہ اس کی ادبی عظمت ... صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اردو زبان کی یہ عظیم المرتبت ادبی ہستی معروضی اور منطقی تنقید کی علمبردار بن جاتی ہے۔ انتقادی ادب کی شعوری اور لاشعوری کاوشوں کو پورا کرنے والی اس ہستی پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں ان کی جھلکیاں ان خطوط پر ہمیں ملتی ہیں!

1. "ان کی تنقید جذبات اور تخیل کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مشاہدہ، فکر اور وجدان باہم دگر آمیز ہو کر ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتا ہے"
2. "ان کی تنقید کا انداز منفرد اور توضیح کا انداز جداگانہ ہے۔ ان کے نزدیک تنقید کا منصب تخلیقی فن پارے کی تفہیم تک محدود نہیں"
3. "وہ ایک مخصوص نقطہ نظر رکھنے کے باوجود ایک منصف مزاج نقاد ہیں۔ اس لئے وہ اپنے ہم عصروں کو بھی ذاتی تعصبات اور ترجیحات سے بلند ہو کر پرکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔"

من حیث المجموع موصوف کے صد آفریں انتقادی مضامین اردو زبان کے لئے موجب افتخار ہیں۔ استدلال ان کی تنقید نگاری کا وصف

اس سے قاری کو ان کی تنقیدی تحریروں میں تجزیاتی فکر اور ایک وسیع تر عصری شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ پڑھنے والے کو اپنی رنگینی سے نہیں بات کے وزن سے متوجہ اور متاثر کرتے ہیں۔

یہ ہیں معتبر ادبی ناموں کے ارفع ادبی اوصاف جو بونوں کو یہ مستثنیات ان کی ہر تحریر میں نظر آتے ہیں۔ اس موڑ پر بات کا، تقاضا نہیں۔ اس طرح کی صورت استنباط کے ساتھ آگے مزید واضح ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ بونوں کو یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے مشکل نہیں اور اس کا جواب بھی آسان ہے کہ گروہ بندی اور تعصبات نے ادبی دنیا کو ایک بازار بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس بازار میں ہر لکھنے والے کی حیثیت ایک دکاندار جیسی ہو گئی ہے۔ وہ جو کچھ فروخت کرتا ہے۔ اس کی معقول قیمت بھی وصول کرتا ہے۔ بورخیس (BORGES) نے لکھنے والے کو اپنی قدر دانی (APPRECIATION) اور داد طلبی کی بابت معلوم کرنے کے لئے دوسرا جنم لینا چاہئے۔ مگر اس کی اس اطلاق و انطباق ہمارے لکھنے والوں پر کسی طور نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ زمانے خیال و خواب ہوئے جب لکھنے والا ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بالاتر ہو کر لکھتا تھا۔ اگر آج وہ کسی ادبی شخصیت کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے یا اپنے مضمون میں اس پر تحسین و آفرین کی بارش کرتا ہے تو اسے مناسب وقت پر دوسری جانب سے داد و تحسین اور شرف قبولیت کی توقع ہوتی ہے۔ یہ ادبی داوری کا مسئلہ نہیں بلکہ داد و ستد کی بات ہے جوں ہی بونے کا کوئی افسانوی یا شعری مجموعہ طباعت و اشاعت کے مراحل طے کر کے منظر عام پر آتا ہے تو کتاب کی رونمائی کے موقع پر صاحب بونے کی "ناقابل فراموش" ادبی خدمات کو پیش نظر رکھ کر اپنے حلقہ بگوشوں کی بھیڑ میں تعریفی ریمارکس سے لبریز ایک مختصر سا مضمون کر اس کے قد میں رواج کا اضافہ کر دیتے ہیں اور پھر یہی مضمون کسی معتبر ادبی جریدے میں اشاعت پذیر ہو کر بونے صاحب کو قاری کے سامنے ادب کا درخشاں ستارہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک بونے کی شاعری پر ایک معروف نقاد کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔

"روایتی اسلوب کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری ایک مابعد الطبیعاتی نہج اور بنیاد رکھتی ہے اس لحاظ سے وہ بیسویں صدی میں غزل کی روایت، تشکیل و ارتقا کے امانت دار ہیں"

یہ ہماری علمی کم مائیگی اور ادبی تہی دامنی ہے کہ اس گرانقدر تبصرے کے مطالعہ سے قبل اس صاحب طرز بونے شاعر اور اس کے نظام ابلاغ کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں تھا

اگلے وقتوں میں دربار کے شعرا بادشاہ سلامت کی خدمت میں مبالغہ آمیز روایتی تحسین سے بھرپور قصیدے لکھ کر شاہی انعام و اکرام سے بہرہ ور ہوتے تھے اور عالم پناہ بھی از راہ نوازش انعام و اکرام اور خلعت فاخرہ سے ان شعرا کو نوازا کرتے تھے۔ انہیں خطوط پر آج ادب کے سالار خود اپنے بونوں کی ادبی خدمات پر وقتاً فوقتاً انہیں اپنے مضامین میں توصیفی کلمات سے یاد کر کے انہیں انعام و اکرام سے سرفراز کر رہے ہیں۔ درباری شعرا کے باب میں معاملہ داد و دہش کا تھا مگر آج ادبی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ داد و ستد کی بات ہے۔

اردو ادب میں قحط الرجال کی کیفیت نہیں مگر غیر جانبدار نقد لکھنے والوں کے نرم رو آہنگ پر حاشیہ بردار بونوں کا ابلیسی شور و غوغا اس قدر حاوی ہے کہ ایک طوفان بدتمیزی کا سماں قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔ ادبی دنیا ایک ایسے بازار کے مماثل ہو گئی ہے جہاں معیاری ادب و تحقیق کی آراستہ دکانیں تو موجود ہیں مگر خریدار وہاں اس لئے نہیں آتا کہ ان دکانوں کے سامنے سستے قسم کے "فٹ پاتھ کے تاجر" بیچ بیچ کر سستی چیزیں سستے داموں پر فروخت کر رہے ہیں۔ کم فہم خریدار تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ سڑکوں پر آوازیں لگا کر بیچنے والے وہی چیزیں فروخت کر رہے ہیں جو دکانوں پر انہیں مہنگے داموں پر مل رہی ہیں مگر انہیں کیا پتہ کہ ہانگ کانگ اور جاپان کے تیار شدہ سامان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

ادب کی یہ مسخ شدہ صورت حال بہت پریشان کن ہے۔ آج ادب ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں۔ ہر ادبی گروہ کا تنقیدی حصار اس کے ارکان کے لئے ایک طرح کا امتناعی حکم جاری کرتا ہے کہ وہ دوسرے ادبی گروہ یا غیر جانبدار لکھنے والوں کی تخلیقات کو پڑھ کر بھی تحسین پیش

...ور کی بات ہے راے زنی اور تبصرہ آرائی سے بھی گریز کرے اور یوں اپنے غیر جانبدار المشرب ہونے کا ثبوت دے کہ اس کی وروکے کی چوٹ پر
...اہم کرے یہ المیہ یونانی المیہ سے کم نہیں کہ صحیفت کا زہر ادب کی رگوں میں دور تک سرایت کر چکا ہے۔ افسوس کہ بعض معتبر لکھنے والے بھی
...اس گروہ کے ارکان اور غیر جانبدار لکھنے والوں سے یوں الگ ہیں جیسے وہ کسی جان لیوا بیماری کے جراثیم سے ہوں جن لکھنے والوں کی یہ ذہنیت ہو
...ن کا تنقیدی معیار اور ادبی کردار کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے میں ادب کا طالب علم قاری کبھی غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ بورخیس
(BORGES) نے ایک جگہ کہا ہے کہ اگر لکھنے والا خود اپنی تحریروں پر یقین نہ کرے تو وہ اپنے قاری سے یہ کیسے امید رکھ سکتا ہے کہ وہ انہیں
...یح تسلیم کرے گا۔ صحیفت پر ایمان رکھنے والے ہمارے ادیب خوب جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کا بڑا حصہ جھوٹ کا پلندہ ہے مگر
...ں کے باوجود انہیں اس بات کی قوی امید ہے کہ ان کی بلند آہنگ پروپیگنڈا بازی ان کے ہر جھوٹ کو سچ میں تبدیل کر کے اردو ادب [illegible]
...ں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتی ہے!

معاصر اردو ادب کا معتدبہ حصہ لکھنے والوں کے تعصبات کا آئینہ ہے اگر اس سازشی رجحان کا جلد خاتمہ بالخیر نہیں ہوا تو اردو ادب کے طفیلی
(PARASITES) ان ذہین اور پختہ کار اور باصلاحیت فنکاروں کو دیمک بن کر چاٹ جائیں گے جو گروہ بندی سے الگ تھلگ، معاصرانہ
چشمکوں سے دامن بچائے ہوئے، ادب کی بے لوث خدمت میں مصروف ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ادبی اقدار کا نئے سرے سے تعین
...ریں مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ادب کے پیمانے انسان اور صحیفت سے لبریز پیمانے ہی کو بدل دیا جائے ادب کے نام نہاد سرپرستوں کو یہ
...ق نہیں پہنچتا کہ وہ لکھنے والے سے اس کی مرضی کے خلاف وہ سب کچھ لکھوانے کی کوشش کریں جو وہ لکھنا نہیں چاہتا۔ اہل قلم کا یہ پیدائشی
حق ہے کہ وہ از خود موضوعات کا تعین کرے اور بلا استثناء ان پر طبع آزمائی کرتا جائے۔ ادب پر جب تک نام نہاد معتبر ناموں کی حکمرانی ہوگی
معیاری اور تخلیقی ادب کی تخلیق کوئی آسان بات نہیں۔ آج لکھنے والوں کی اکثریت ان موضوعات پر قلم اٹھا رہی ہے جن کے محرک ادب کے
(GOD FATHERS) ... ہیں۔ جب لکھنے والا مستعار موضوعات پر لکھتا ہے تو فی الحقیقت وہ اپنے اندر کے تخلیقی ادب
...سے دستبردار ہو کر ایک ایسے وظیفہ خوار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس کا کام وظیفہ دینے والے کی ثنا خوانی کے علاوہ کچھ نہیں۔ جب صورت حال
...یہ ہو تو لکھنے کا عمل زندگی کی طرح بیکراں دریافت اور انکشاف کا تحیر خیز سفر ثابت نہیں ہوتا۔ یوں بڑی طرح بات کی نفی ہو کر رہ جاتی ہے اور بڑا
...دب تو دور کی بات ہے ادب ہی پیدا نہیں ہوتا۔

("دریافت" نومبر، دسمبر ۱۹۹۳ء)

محمود ایاز

نقشِ اوّل

"سوغات" کا پانچواں

آپ کے پیشِ نظر ہے اور اس ڈھائی سال کے عرصے میں محسن خان کے افسانے "زہرا" کے ء
کوئی اور افسانہ ایسا نہیں وصول ہوا جسے پڑھ کر خوشی ہو۔ لوگ پوچھتے ہیں "سوغات" میں ا
کیوں نہیں شائع ہوتے۔ ایک صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ "سوغات" افسانے نہیں چھ
اس لئے سلام بن رزاق اور انور خان جیسے افسانہ نگار بھی "سوغات" میں مضمون نگار کی حیثیت ۔
شریک ہوتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ "سوغات" میں افسانے اس لئے نہیں آرہے ہیں کہ ایسے اف
جو "سوغات" شائع کر سکے وصول نہیں ہورہے ہیں۔ شاعری کا حال بھی زیادہ دل خوش کن نہیں
غزل نے اس حصّے کو کسی حد تک سنبھال لیا ہے۔ ناصر کاظمی نے کہا تھا "طاؤس ناچتا ہے تو ج
ہرا بھی ہو۔" سوال یہ ہے، طاؤس کہاں ہیں؟ جنگل ہرا کیسے ہو؟

تخلیقی کام تو ایک طرف، ہم لوگ تو اب ایسا لگتا ہے، وقتی غم اور غصّے کے سبب سا
موثر اظہار پر بھی قادر نہیں رہے ہیں۔ ایودھیا پر جو نظمیں آرہی ہیں انہیں کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔
طرح کے سانحات اور واقعات پر شبلی یا ظفر علی خان کی نظمیں آج بھی اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ ان لوگو
ان نظموں کو نہ اعلیٰ شاعری کا نمونہ سمجھ کر پیش کیا اور نہ ان کے پڑھنے والوں کو ایسی کوئی غلط ف
رہی۔ نہ تب نہ اب۔ ایک قومی حادثہ پیش آیا، جذباتی دھچکا پہونچا، لکھنے والوں نے اپنے صد
اور غم کا اظہار کر دیا۔ انہیں اس پر قدرت تھی، اظہار کے سانچوں سے واقف تھے، الفاظ کا تخلیا

استعمال نہ سہی خطیبانہ استعمال کرسکتے ہے۔ کچھ جذباتی مجبوریاں تھیں سننے والوں کی اور پڑھنے والوں کی بھی۔ دونوں کے درمیان ایک مشترک رشتہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جذبات اور احساسات کا اظہار ہوتا تھا وہ مصنوعی اور نقلی نہیں ہوتے تھے۔ بات دل سے نکلتی تھی اور دل تک پہونچتی تھی۔ جہاں یہ بنیادی باتیں نہ ہوں وہاں تو جگن ناتھ آزاد صاحب کی نظم بھی وجود میں آسکتی ہے۔ سچ ہے، نگاہِ یار کچھ ایسی پھری حرماں نصیبوں سے۔ کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی ہم خواب بن جائے۔
لیکن جب کسی معاشرے کے افراد انفعالیت اور خود غرضی کی اس اسفل سطح کو پہونچ جائیں کہ جذباتی رشوت بھی شکریے کے ساتھ قبول ہو تو پھر شکایت کس سے ؟ ایسے موقعوں پر گوپال متل، اللہ ان کے ساتھ عفو و کرم کا معاملہ کرے، بہت یاد آتے ہیں۔

ایودھیا اور اس کے بعد کے سانحات پر نظموں کی بات نکلی ہے تو جی نہیں چاہتا کہ عرفان صدیقی کا ذکر کئے بغیر گذر جاؤں۔ اس سانحے کا بڑا موثر اظہار ان کی دو غزلوں میں ہوا ہے جو "سوغات" کے پچھلے شمارے میں شائع ہوئی تھیں ؎

حلق بریدہ کاٹ رہے ہیں شاہ رگیں تلواروں کی ۔ میں جو یہ نقشہ کھینچ رہا ہوں، اگلی رات کا منظر ہے۔

اس شمارے میں تیئیس غزلیں شائع ہو رہی ہیں اور صرف دو شاعروں کی۔ حمید نسیم کی چار تازہ غزلوں کے تیور اتنا تو بتا رہے ہیں کہ ان کا لکھنے والا ان توقعات کو پورا کرے گا جو ان کے درج ذیل اشعار نے قائم کی تھیں :

جان فروشوں کا وہ انبوہ رہا   پے بہ پے دشنۂ قاتل ٹوٹے
الحذر! اے خس و خاشاکِ ہوس   شررِ جستہ ہے جو دل ٹوٹے

اب مرا درد نہ تیرا جادو   مرگِ انبوہ میں کیا میں، کیا تو

مند گئیں تاروں کی آنکھیں بھی، چاند بھی آج نہیں نکلا ہے   "کن" کی جرأت سے پہلے کیا تھا، آج وہ عالم دیکھ لیا ہے
رنگ ہزاروں گزری رُتوں کا، خاک سے مل کر خاک ہوا ہے   دیکھ سکو تو پاؤں کی مٹی گل پیکر ہے، ماہ لقا ہے

آج اتار دیے ہیں ہم نے دُکھ اور سُکھ کے پیراہن   اب میں ازل کی عریانی ہوں، یہ عریانی سدا سہاگ

نکہتِ آسودہ کہیں گاہوں سے پوچھ   کیسے بے نافہ ہوا دشتِ ختن
وہ پیڑ کیا ہوئے جو بہت سایہ دار تھے   دو دن کی دھوپ شہر کو صحرا بنا گئی

تم کہو تو یہ تماشہ اسی دم دکھلا دوں   ایک پل کی تو بڑی آگ مری خاک میں ہے

ملے تھے ایک عمر بعد دوست جشن ہو گیا   مہکتی شام، پورا چاند، یہ تو اک بہانہ تھا

احمد جاوید کی غزلیں پہلی بار "روایت" لاہور میں نظر سے گذری تھیں، کوئی دس برس پہلے دل میں اتر گئیں۔ "سوغات" کی اشاعت کے ساتھ ان کے پتے کی تلاش ہوئی تو معلوم ہوا کہ پاکستان میں ایک سے زیادہ احمد جاوید ہیں۔ بعد از تلاشِ بسیار ملے تو انکساری و خاکساری کا وہ عالم کہ ادیبوں شاعروں میں ڈھونڈھیے تو لندن سے دلّی تک کہیں نہ ملے۔ بڑی معذرتوں کے ساتھ چار غزلیں بھیجیں جو پچھلے شمارے میں شائع ہوئیں۔ پھر چھبیس [۲۶] غزلیں، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ جو ان کی لاپرواہی کے ہاتھوں ضائع ہونے سے کسی طرح بچ گئی تھیں حاصل ہوئیں۔ عجیب کیفیت اور انداز کی غزلیں ہیں۔ کہیں کہیں تو ایک عالم جذب و مستی میں رقص کناں درویشوں کی تصویریں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ اردو میں جو "تصوّف" اور "عشقِ حقیقی" کی شاعری ملتی ہے اس کا بہترین حصّہ بھی ان غزلوں کے مقابلے میں کہیں نہیں ٹھہرتا اور ان دونوں میں کوئی مناسبت بھی نہیں ملے گی۔ اردو میں اس نوعیت کی شاعری اپنی بہترین صورت میں بھی بہت جلد اکتا دینے والی یکسانیت اور تکرار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اصغر وغیرہ کا تو ذکر کیا آسی غازی پوری کی شاعری کا بھی یہی حال ہے فانی البتہ اس سلسلے میں کسی حد تک استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں (اس پہلو سے قطع نظر عمومی طور پر بھی فانی کی شاعری پر سرور صاحب اور مغنی تبسم کے علاوہ کم نقادوں نے توجہ دی ہے) لیکن آسی جیسے بزرگوں نے دراصل شاعری کو بطور فن اختیار ہی نہیں کیا تھا اور یہ تھی بھی ان کے مرتبے سے بہت نیچے کی چیز۔ احمد جاوید کی غزلیں اس یک رخی اور یکسانیت کا شکار نہیں ہیں۔ ان کے ہاں عشق پوری زندگی بن گیا ہے۔ زندگی کے سارے رویّے اسی سے متعیّن ہوتے ہیں، جینے مرنے کی ہر قدر کا تعیّن اسی سے ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان غزلوں کا شاعر زندگی کے میلے میں شریک بھی ہے۔ میلے سے وہ واپس بھی لوٹتا ہے لیکن میلے میں شرکت نے اس کے تجربات کو تنوّع بھی دیا ہے اور وسعت بھی، چند اشعار دیکھئے صرف تنوّع کا اندازہ کرنے کے لئے:

سجے ہیں دشت و بیاباں عجب قرینے سے   مجھے فقیر، تجھے بادشاہ کرنے کو

جاوید وہاں تک تو مشکل ہے کوئی پہنچے   منگوائیے قاصد بھی، جبریل امیں کر کے

کیا اس کی لطافت کا احوال بیاں کیجے   جو دل پہ ہوا ظاہر، آنکھوں کو نہیں کر کے

بارش کا ہے ایسا کال   سوکھے پڑے ہیں دل کے تال

مٹی کو پروا ہی نہیں ہے   کس کا چاند ہے، کس کا لال

ان نگاہوں کی گفتگو میں ہے — نیند میں گم ہواؤں کا الجھاؤ
اس بدن کی نزاکتیں مت پوچھ — شیشۂ گل میں چاند کا لہراؤ
ایسی تنہائی کا مداوا کیا — سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ
اُس گلی، اُس دیار کی خوشبو — اے شبک سیر تیز گام ہوا ؤ
رات کہتی ہے مجھ کو پیار سے دیکھ — مجھ میں ہے چشم یار کا گھراؤ

ئی سورما بدنِ دریدہ میں آفتاب لئے ہوئے — ہے دہانِ زخم سے نعرہ زن، سرِ رزم گاہ مری طرح
غروبِ روزِ مبارزت کہ شب سیاہ شکست ہے — کسی دل کے ساتھ اُجڑ گئی ہے یہ خیمہ گاہ مری طرح
ھی اِس گرفتۂ غم پہ بھی نگہِ کرم، کہ کہیں نہیں — کوئی شہ سوار تری طرح نہ غبارِ راہ مری طرح
ئی آگ ان کو جلا رہی ہے بہارِ تازہ کی اوٹ سے — لبِ جوئبار جھلس گئے ہیں گل و گیاہ مری طرح

یہ دل بھی ہے شگفتن خواد کب سے — نسیم رحمۃ للعالمینی
نہ جانے کتنے سجادے جلا کر — ہوئی فرصت مری آتش جبینی
ترے نظارے کو سیکھی ہے میں نے — یہ انفس چشمی و آفاق بینی
تجھے جاوید ہم پہچانتے ہیں — چل اب بس کر یہ شمس العارفینی

کوئی سوار اُٹھا ہے پسِ غبارِ فنا — قضا نے ہاتھ کلاہ و نیام پر رکھا

اک پل کو بھی آنکھیں رنگیں خانۂ دل میں — ہر لمحہ نگہبانیٔ اسباب میں رہنا

چراغ ہے مری راتوں کا ایک خوابِ وصال — جو کوئی پل تری چشمِ سیاہ میں آیا

ابھی گذر رہا ہے دلِ خود کفیل سے — لنگر سے روٹی لیتے ہیں پیالی سبیل سے

دنیا مرے پڑوس میں آباد ہے، مگر — میری دعا سلام نہیں اس ذلیل سے

کر چکا ہے کوئی افلاک و زمیں کی تکمیل — پھر بھی ہر آن مجھے عرضِ ہنر میں رہنا
اک میں ہی رہ گیا ہوں کئے سر کو بارِ دوش — کیا پوچھتے ہو بھائی مرے خاندان کو
جس دن سے اپنے چاکِ گریباں کا شوق ہے — تالے لگا گئے ہیں رفوگر دکان کو

ہمارے تو اک گھر بھی ہے بھائی مجنوں — پڑے ہیں اُسی کو بیابان کر کے
دیا ہم نے دل اُن پری چہرگاں کو — ز روئے قیاس آدمی جان کر کے
سنو! اب تو ہم جینے تک سے گئے ہیں — وہی جینے مرنے کی گردان کر کے
مری کشتِ جاں پر سے گذرا ہے جاوید — سحابِ جنوں زورِ باران کر کے

ان اشعار کا انتخاب بہترین اشعار کے طور پر نہیں کیا گیا ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کیفیت، تجربات اور اظہار کا کیسا تنوع ان میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ انتخاب چھبیس (۲۶) غزلوں سے ہوا ہے اور جس شاعر کی چھبیس (۲۶) غزلوں میں اظہار و بیان کے اتنے پہلو مل جائیں اس کی قدرتِ کلام اور تخلیقی توانائی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جسے آپ کسی ایک خانے میں بند نہیں کر سکتے ممکن ہے جدید شاعری کے مذاق و مزاج کو یہ غزلیں راس نہ آئیں لیکن بہ طور تبدیلیٔ ذائقہ کبھی کبھار اچھی شاعری کے بھی کچھ نمونے سامنے آتے رہیں تو "جدید" شاعروں کو تو چھوٹ نہیں کرنا چاہیے۔ مبسوط، مدلّل اور سیر حاصل مضامین نقّاد لوگ لکھیں گے۔ میں تو بس اپنے پڑھنے والوں کو اس لطف و انبساط میں شریک کرنا چاہتا ہوں جو ان غزلوں سے مجھے حاصل ہوا ہے۔

سوغات (۵) "ستمبر ۱۹۹۳ء

حسین الحق

صدر شعبۂ فارسی، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

نیو کی اینٹ

سلامت اللہ نے آفس جاتے ہوئے دیکھا تھا پھر دفتری کاموں کی
بھیڑ میں بات ذہن سے نکل گئی

پھر شام کو جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو بھیڑ ویسی کی ویسی ہی نظر آئی۔ صبح میں تو آفس جانے کی جلدی بھی تھی اور ایک خیال یہ بھی آیا تھا۔ ہو کوئی فنکشن..... بچے بچیاں بڑی ہو جاتی ہیں تو ان کے تلک یا چھیکا وغیرہ کا فنکشن بھی کیا کر بھیڑ اکٹھی کرتا ہے..... مگر شام کو بھی بھیڑ ویسی ہی نظر آئی تو اس کو تشویش ہوئی... کیا کوئی بیمار ہے؟ اب آفس کی جلدی تو تھی نہیں۔ اس نے سائیکل اپنے دروازے پر لگائی اور دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کی طرف بڑھ گیا

"کیا بات ہے بھائی؟ سب خیریت تو ہے؟ پوجن بھائی کہاں ہیں؟" وہ ایک آدمی سے اتنا ہی پوچھ پایا تھا کہ شیو پوجن نظر آ گئے

"آداب شیو پوجن بھائی بڑی بھیڑ ہے! صبح بھی دیکھا سب خیریت ہے نا!"

"ارے آپ نہیں جانتے؟ شیو پوجن جی تو....."

ایک آدمی بہت ہلک کر کچھ بتانے کے موڈ میں تھا کہ اچانک شیو پوجن نے اسے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قدم گھر کے باہر کے منڈپ سے آگے بڑھانے شروع کر دیے..... سلامت اللہ بھی شیو پوجن کے ساتھ آگے بڑھنے پر مجبور تھا..... اس آدمی کے بولنے شیو پوجن کے اس آدمی کو ہاتھ سے ایک طرف کرنے، سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنے اور منڈپ سے آگے کی طرف قدم بڑھانے میں شاید دو سیکنڈ کا وقفہ گزرا ہوگا، اس بیچ شیو پوجن چپ رہے پھر بولے... "نہیں کوئی خاص بات نہیں... تنگ ہم ہار گئے تھے...."

شیو پوجن کی اس گفتگو کے درمیان ہی ایک اور آواز سنائی دی جو آدمی سلامت اللہ کو شیو پوجن کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا..... اس سے کوئی اور دوسرا آدمی شاید آہستہ سے کہہ رہا تھا..... "سالا مشٹنڈا ہے!"

یہ جملہ سلامت اللہ نے بھی سنا اور شیو پوجن نے بھی... دونوں کے بیچ یہ جملہ پہنچتے ہی شیو پوجن زور سے ہنسے... "اور سنائیے کیا حال چال ہے؟ سب خیر خیریت ہے نہ"

سلامت اللہ کو اچانک محسوس ہوا کہ وہ تو ننگا ہے..... مادر زاد برہنہ..... وہ اور شیو پوجن دونوں گیٹ تک آ چکے تھے

"اچھا شیو پوجن جی... آداب!" وہ سمجھ نہ پایا کہ اس کے اور شیو پوجن کے بیچ اب اور کون سا لفظ باقی بچا تھا!

"نمستے!" شیو پوجن نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے...

سلامت اللہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

شام..... وہ بھی دسمبر کی چاروں طرف اندھیرا جھک آیا تھا.. بجلی نہیں تھی، سارے ہر گھر میں لیمپ لالٹین جل چکی تھی، اچانک اسے اپنا گاؤں یاد آ گیا ..... شام ہوتے ہی وہاں بھی ہر گھر میں مٹی کے چراغ اور لالٹین جل اٹھتی تھیں، پوس اور ماگھ کے جاڑے میں، گھر کی بیٹھک میں سب جمع ہوتے رحیم چچا، سبطے ماموں، رامیشور چاچا، منگرو کاکا!

اس نے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک نظر شیو پوجن کے گھر پر ڈالی اور اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

گھر میں داخل ہو رہا تھا تو گلی میں بچوں کے کھیلنے کی آواز سنائی دی
"بے کھیئنا ہے ری..."

بچے ماں کے کمرے میں لوڈو کھیل رہے تھے، بڑا لڑکا اپنے ٹیبل پہ پڑھ رہا تھا، بیوی کچن میں تھی، دیکھتے ہی عجب انداز میں بولی

"آپ آ گئے؟"

"کیوں کیا بات ہے؟" اسے کچھ حیرت سی ہوئی، وہ روز ہی آتا ہے اور بیوی بنا کچھ کہے بس ہلکے سے مسکرا کر استقبال کرتی ہے.... پھر یہ؟

"نہیں اندھیرا بڑھ رہا تھا اس لیے جی لگا ہوا تھا۔"

"کیا اٹ پٹی سی باتیں کر رہی ہو؟ اندھیرا کیا آج ہی ہوا ہے۔؟"

"اچھا اچھا منہ ہاتھ دھو لیجئے چائے تیار ہے" اسے لگا وہ بات کا رخ بدل رہی ہے۔

"ابو ابو! شیو پوجن چاچا کے یہاں اینٹ آئی ہے" اس کی بیٹی اس کی آواز سنتے ہی دوڑی آئی۔

وہ شاید عادت کے مطابق دن بھر کی اہم خبریں سنانے کے موڈ میں تھی

"چلو جا کے پڑھو۔ رات ہو گئی ہے" بیوی نے جھپٹ کر اس کا بازو پکڑا اور اپنے کمرے کی طرف دھکیل دیا۔

"پاگل ہو گئی ہو؟ اس طرح کیوں ڈانٹتی ہو؟ اور یہ شیو پوجن کے یہاں اینٹ کیسی؟"

"چپ رہیے" اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے بولی "آواز دوسرے گھروں میں بھی جاتی ہے۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لیجئے"

سلامت اللہ کچھ نہ بولا، وہ تھکن محسوس کر رہا تھا اور بھوک بھی لگی تھی، نفس کے وقت کا کھایا کتنی دیر تک پیٹ میں رہتا؟ آج تو کوئی ڈھنگ سا ہی بھی نہیں پھنسا کہ ناشتہ پانی کرا دیتا.... مگر شیو پوجن، اسے پھر باہر کی بھیڑ یاد آئی....

پھر بیٹی کا جملہ... "اینٹ آئی ہے" اور اچانک شیو پوجن کا جملہ بازگشت کی طرح گونجا۔ "تک باہر چلے گئے تھے۔"

"سنو!" اچانک اس کی چیخ جیسی جاگ اٹھی اور آہستہ سے بیوی کو پکارا

"کیا ہے؟"

"یہ شیو پوجن.... اجودھیا گیا تھا کیا؟"

"جی باہر ابھی کچھ بھیڑ ہے۔" بیوی آہستہ سے بولی اور تھکے قدموں پھر کچن میں چلی گئی۔

بجلی پھر گل ہو گئی تھی اور پورے محلے میں ایک عجیب سا سناٹا چھا رہا تھا۔ آس پاس کے گھروں سے لالٹین کی کمزور روشنی اس طرح تھرتھرا رہی تھی اس کی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے گھر کے اندر چلی آتی تھی کہ اسے لگا سانپ کی کینچلی چمک رہی ہے۔ اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا.... کل سب بچے کھیل رہے تھے.... تب کتنا ڈر لگا تھا اس کی!"

"سنو؟" اس نے پھر بیوی کو پکارا

"جی!"

"تمہارے ابا کے دو تین خط آچکے ہیں نا؟ اب تو چھٹی دن کی چھٹی بھی ہونے والی ہے، اپنے میکے ہو کر آؤ"

"اچھا چلی جاؤں گی۔ پہلے کچھ کھا لیجئے" وہ آہستہ سے بولی۔ اس کا اداس دل رکھنے والا تھا۔

اس نے تھوڑا سا کھایا.... وہ کہہ رہا تھا... مگر بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ . . چائے پی کر اس نے سگریٹ سلگائی اور صوفے پر ہی نیم دراز ہو کر ایک کش لیا، اور ایک لمحے بے خیالی کے عالم میں خیال آیا: مکان ملت نگر میں ہے،
مسلم علاقوں میں تو کرایہ آسمان چھوتا ہے۔ مالک مکان سمجھتے وہ جدا ہے۔ مکان نہیں دے رہا ہے کہ کرایہ دار کی عمر بڑھا رہا ہے۔ مگر کرایہ دار بھی تو بیوی، بچوں کے ساتھ اور کیا لیکن یہاں تو آمدنی محدود، رشوت کے نام پہ چائے پانی.... یا کسی قسمت نے یاوری کی تو دس بیس روپئے۔ آمدنی والا ٹیبل اسے آج تک ملا ہی نہیں ہے۔

ایسے میں وہ سرکاری کوارٹر چھوڑ کر کہاں جاتا؟ اور کوارٹر بھی کیا؟ ایل آئی جی ٹینیمنٹ.... مگر ایک کلرک کو ایل آئی جی ہی ملتا تو اور کیا ملتا۔

"جے شری رام۔" اچانک ایک زوردار نعرہ گونجا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھئے بیٹھئے۔" بیوی جلدی سے پاس آئی اور آہستہ سے بولی "گھبرانے کی بات نہیں صبح سے ہی چل رہا ہے۔ دیکھئے والوں کا پھر کوئی نیا جلوس آیا ہوگا۔"

وہ بیٹھ گیا مگر دل کی دھڑکن تو بڑھ ہی گئی تھی.... اس نے محسوس کیا اس سردی میں بھی ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔

گئی رات تک گلی میں بھیڑ کا احساس ہوتا رہا، رہ رہ کر نعرے سنائی دیتے رہے اور تنہائی کا ایک بیتال صلاحیت کے کندھوں پہ چڑھا چپر چپر اس کی کھوپڑی کھاتا رہا۔

"میکے جانے کی بات آپ نے کیوں کی؟" رات میں جب بچے سو گئے تو بیوی نے آہستہ سے پوچھا

"کیوں؟ نعرے نہیں سن رہی ہو؟ نعرے تو عقیدت کے طور پر لگائے جا رہے ہیں۔

"عقیدت کو نفرت بننے کتنی دیر لگتی ہے؟"

بیوی چپ ہو گئی، رات آہستہ آہستہ گہری اور تاریک ہوتی جا رہی تھی، وہ بہت دیر تک جاگتا رہا، خلاف معمول جاگتا رہا، ورنہ وہ تو دن بھر کا تھکا ہارا بستر پہ اس طرح گرتا تھا کہ اسے اس کا پتہ نہ چلتا کہ بیوی کس وقت اس کے بغل میں آکر لیٹی۔ مگر آج وہ جاگ رہا تھا، آخر وہ کیوں جاگ رہا تھا؟ شاید وہ خوف زدہ تھا

۶ دسمبر گزر گیا تو ... تو پھر؟ اچانک جیسے کسی نے کہا ... سلامت اللہ نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں انگارے ڈال دیئے ہوں ... ہاں یہی وہ لمحہ ہے جو سات کشتوں کے آئینے میں بانٹ رہا ہے ... پچپن برس کی کوار مڑی زندگی میں پہلی مرتبہ تھا ... کل تک وہ صرف سلامت بھائی تھا۔!

اچانک اسے اپنے کچھ رشتہ دار یاد آگئے ... اپنا بھائی برکت اللہ، چچا عزت اللہ، ماموں عبدالستار ... یہ سب لوگ اب کراچی میں تھے۔ ایک مرتبہ ایک شادی میں وہ بھی کراچی گیا تھا شیر وہ گیا اور چلا آیا۔ اس وقت اسے کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی۔

ہاں ... اُسے یاد آیا ... اس کے ماموں نے جب کہا: سلامت تم بھی یہیں آجاؤ ... تو وہ جھنجھلا کر بولا تھا کیوں، کیا میں وہاں بھوکا مر رہا ہوں؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ ماموں نے اُسے سمجھانا چاہا۔" وہاں اس قدر فسادات ہوتے ہیں کہ ہمارا بر تشویش ہوتی رہتی ہے۔

"ماموں سننے کے بعد آپ لوگ تو کم از کم فسادات کا حوالہ نہ دیا کیجئے۔" شاید اس کے لہجے میں تلخی کچھ زیادہ آگئی تھی۔ ماموں تو ایک دم چپ ہو گئے اور باقی لوگوں نے بھی، جب تک وہ وہاں رہا پھر اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔

"کیا ماموں صحیح کہہ رہے تھے؟ اچانک اس کے ذہن میں ایک رسیلا ناگ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک منٹ کے لیے وہ کشمکش کا شکار رہا۔ پھر سر جھٹک دیا۔ نان سنس جو کچھ میرے اردگرد ہے، وہی میرا ہے۔"

"ہرے راما، ہرے کرشنا ..." اس کے خیال کی رو اچانک ٹوٹ گئی۔ شیو پوجن کے یہاں بھجن شروع ہو چکا تھا۔

"اور یہ؟" اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا

"یہ تو ایک جھانکی ہے، متھرا کاشی باقی ہے۔" اسے شہر کی دیوار پر لکھا ایک نعرہ یاد آگیا۔

دور سے ایک گاڑی کی آواز فضاؤں کا سینہ چیرتی اس تک پہنچی ... ٹھنڈ کچھ اور بڑھ گئی تھی، باہر یخ بستہ ہوائیں اور اپنے شباب پر تھا۔ بیوی بچے لحاف میں گرم ہوا ئے سو رہے تھے۔ اس نے لحاف سے ذرا سا سر نکال کر دیوار گیر گھڑی دیکھی ... وہ بج رہے تھے ... پھر نگاہ خود بخود کلینڈر کی طرف چلی گئی۔

۶ دسمبر! ... اچانک ایک عجیب الٹی سی بات اس کے ذہن میں آئی۔ "کیا ۶ دسمبر گزر گیا؟" ... پھر اس سے لگے ایک اور مبہم سوال ... "۶ دسمبر کیوں آتا ہے؟ ..." پھر ایک اور خوف ... کیا ۶ دسمبر پھر آئے گا؟" ... ایسے ہی اشتباہات کے درمیان وہ اور الجھ گیا۔

[illegible]

بچوں کا بڑی تیاری میں مصروف تھے۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شیو پوجن کے یہاں بڑی چہل پہل تھی۔ شاید بہت سارے لوگ رات میں رک گئے تھے۔ نل کے نیچے منہ دھونے اور نہانے کا سلسلہ جاری تھا، ٹوکر پورے گھر میں جھاڑو لگا رہا تھا، غالباً نئے مہمانوں کے استقبال کی تیاری تھی۔

"آج بچوں کو سر جانے دو، اور تم بھی تیار ہو جاؤ میں تم لوگوں کو حیات بھائی کے یہاں چھوڑتا ہوا آفس جاؤں گا" سلامت نے بیوی سے کہا

"کیوں؟"

"تم لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر آفس میں جی نہیں لگے گا۔"

بیوی نے ایک منٹ سوچا پھر بولی۔ کالونی میں عزیز بھائی انعام صاحب اور فضل احمد بھی تو ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے بھی مشورہ کر لیجیے۔"

سلامت اللہ کو یہ بات پسند آئی، وہ گھر سے نکلا اور کیسے نظر جھکائے ان تینوں سے ملنے چلا گیا، وہ تینوں بھی اس نئی صورت حال سے ادب ہوئے تھے مگر چونکہ شیو پوجن کا گھر ان کی لائن میں نہیں تھا اس لیے اتنا زیادہ متاثر نہیں تھے، ویسے فضل احمد کی بات اس کے جی کو لگی کہ "آج دن بھر دیکھ لیا جائے۔" پھر انعام الحق کہنے لگے "تیسری چھٹیاں باقی ہیں۔ تم لوگ اطمینان سے جاؤ۔ میں آج چھٹی لے لیتا ہوں"

مگر آفس میں بھی اطمینان کہاں، شیو پوجن بھی اُسی کلاس میں تھے جس میں سلامت اللہ تھا اور شیو پوجن کے لوٹ آنے کی خبر سب کو مل چکی تھی بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے آفس والے میں کل کئی لوگ وہاں ہو بھی آئے کیونکہ گفتگو گھوم پھر کر شیو پوجن تک پہنچ رہی تھی ... اور باوجود یہ کہ سلامت اپنے ٹیبل پر تھا مگر دوسری میزوں پر ہونے والی سرگوشیوں کی طرف سے اپنے کان کیسے بند کر لیتا؟

"مگر بھائی، نکالنے والے بھی بڑے گنی تھے۔ ایسا نکالا ہے کہ کہیں سے ٹوٹی نہیں ہے۔"

"ارے تو ہے بھی تو پانچ چھ سو برس پرانی ... تب میٹریل ہی بہت مضبوط نہیں ہوتی تھی"

"شیو پوجن کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے۔"

"کیوں نہ ہو؟ اس کو شنکر جیسا سنگھرش تو مانو ہو پاؤ ——— تو کل کو شیو پوجن سو نستر تا سیناتی کی پنشن بھی لگا جو وعدہ کرتا ہے وہ دکشنا بھی دیتا ہے اور پھر وہ جرم سنگھرش کا ایک انگ بن کر شیو پوجن سا تو ان سات دھام ملک بھی بن گیا!"

"سلامت اللہ کا گھر تو شیو پوجن کے گھر کے پاس ہی ہے
اس کا کیا حال ہے؟" ایک بہت مدہم سرگوشی ابھری

"وہی ہوگا، جو ان لوگوں کا سارے دیش میں ہے۔"
سلامت اللہ اچانک چونک اٹھا۔ تو اس رگڑے جھگڑے میں
وہ باضابطہ ایک پارٹی ہے!.... اچانک ہی جیسے پورا منظر
نامہ بدل گیا، اب تک وہ صرف اپنے بچوں، اپنے گھر اور اپنی
کالونی کے حوالے سے سوچ رہا تھا مگر اسے اچانک احساس ہوا
کہ ہاری ہوئی فوج کا ایک سپاہی وہ بھی ہے.... وہ ایک ایسی
جنگ میں ہارا ہے جس میں اس نے حصہ نہیں لیا.... اسے اپنے
آپ پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا.... مگر ان کا کیا کروں؟
اسے اپنے ہم پیشہ یاد آگئے.... ان میں ایک تو شیو پوجن
ہی ہے جو ایک ایسی جنگ کا فاتح ہے جس میں اس کا مقابلہ کرنے
والا کوئی تھا ہی نہیں..... اور پھر باقی ہیں کہ یہ میرے دوست
جو ایک ایسی جیت پر خوش ہیں جس میں ان کا کوئی حصہ نہیں..
مگر تب اسی پل مولانا عبدالجبار کی ایک تقریر یاد آگئی...
"اسی کی طرح ہم نے بھی مادرِ وطن کو خوب صورت بنانے میں کوئی
کسر نہیں چھوڑی..... گرینڈ ٹرنک روڈ، تاج محل، لال قلعہ
ہم نے بنوایا....."
سلامت اللہ نے اچانک ہی اپنے آپ کو ایک شدید قسم
کی نفرت اور درد کے گھیرے میں گھرتا محسوس کیا..... اب تو
حالات سے مگر نفرت کس سے؟ ہم پیشہ دوستوں سے یا مولانا
عبدالجبار سے؟ اسے اس سوال کا کوئی صحیح جواب نہ مل سکا۔
بے خیالی میں اس نے میز کی دراز کھولی اور اس میں پڑا ایک ہفتہ
وار نکالا جو اس نے چند دنوں قبل خریدا تھا.... اسی بے خیالی
میں وہ اس کے صفحات الٹنے لگا... الٹتے پلٹتے وہ ایک صفحے پر
رک گیا... پورے صفحے پر ایک رنگین تصویر تھی... ڈھیر سارے
لوگ گنبد پر چڑھ کر اس کو توڑتے ہوئے...."
درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور بھنور یا بگولے کی طرح اس کے
اندر اندر سر سے پیر تک دوڑتی رہی.... اس نے محسوس کیا اس
درد میں دکھ کے ساتھ شرمندگی بھی شامل ہے.... اس کا جی چاہا
وہ چیخ کر روئے... اس کا جی ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر... لیکن وہ چیخ نہ بول سکا... اسے بیٹی کا جہیز یاد
آگیا... شیو پوجن کے یہاں سے آئی ہے... اس ایک بہن پر خوشی ابھرنے لگے
صورت میں مادرزاد برہنہ بھاگتی عورتوں کا عکس... بمبئی میں پیلی
لاشیں..... اسے گجرات یاد آگئے..... یہ زندہ جلائے جیتی /
جہیز مانگے گی..... پھر خسرو کی جیسے چیخ سی سنائی دی..... اسے
لگا بابل مورے..... ہفتہ وار سے نکل کر وہ تصویر اس کے سامنے
آن کھڑی ہوئی اور سینہ پیٹنے لگی.....ظالمو میرے گوہر نہ چھینو!
"سلامت!" اسے کہیں بہت دور سے آتی ایک آواز سنائی
دی اور وہ چونک پڑا۔

اس کو کلیگ فضل احمد اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اسے
پکار رہا تھا.... اس نے چونک کر اپنے آپ کو دیکھا۔ ہفتہ وار
کھلا پڑا تھا اس کی آنکھیں تر تھیں اور آفس کے سبھی لوگ اسے
دیکھ رہے تھے۔ ... وہ ہڑبڑا کر باتھ روم کی طرف دوڑا
باتھ روم میں منھ ہاتھ دھو کر نکلا تو اس کی طبیعت بالکل اچاٹ ہو چکی
تھی۔ اسی عالم میں وہ باس کے کمرے میں چلا گیا۔
"سر میں گھر جانا چاہتا ہوں"
"گھر؟" باس نے گھڑی دیکھی، صرف دو بجے تھے
"جی سر۔ میں بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں"
"اچھا جاؤ!" باس نے نہ جانے کیا سوچ کر اجازت
دے دی۔
"سلامت!" جب وہ چیمبر سے نکلنے کے لیے مڑا تو
باس نے پکارا
"جی سر؟"
کبھی کبھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہونے یا نہ ہونے پر
اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا، ایسے میں آدمی کو تھوڑا دھیرج سے کام
لینا چاہئے ...
ہر PHASE TEMPORARY ہوتا ہے"
باس جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ شاید سلامت نے وہ سن لیا اور
آہستہ سے آفس سے باہر آگیا۔
مگر وہ تصویر اسے بار بار یاد آتی رہی، اس کے اندر پھر
پھڑک جھل سی مچی، کاش وہ وہاں ہوتا تو کم از کم اپنی جان تو دے
ہی دیتا.... دہلی میں بیٹھے کئی لوگوں کے لئے بڑی بھدی بھدی
گالیاں اسے یاد آئیں.... ان سموں کو تو گولی مار دینا چاہیے
حفاظت کا نعرہ بلند کر رہے تھے... دھوکے باز کہیں کے..
کم از کم وہ وہاں ہوتا....
پھر اس نے اپنے کو میدانِ جنگ میں بڑے ردروں کی طرح لڑتے
دیکھا، اس کے چاروں طرف دشمنوں کا ایک جمِ غفیر، ڈھالوں تلواروں
نیزوں بھالوں سے لیس اور وہ تنہا، بغیر زین کے گھوڑے پر ایک
ٹوٹی تلوار لیے ہوئے.... اس نے دیکھا کہ وہ ٹوٹی تلوار کے سہارے
لڑ رہا ہے، دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے اس پر حملے ہو
رہے ہیں۔ وہ سب کا سامنا کرتا ہوا، مینار کا ٹوٹا گنبد پر چڑھ جاتا
ہے۔ اور ان سے ایک دھواں دھار جنگ لڑنے لگتا ہے جو گنبد
گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔
اسی عالم میں گھر آگیا
گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے بیوی نے بم پھینک دیا۔ "کئی بار
شیو پوجن جی آپ کو تلاش کرتے ہوئے آئے"
"شیو پوجن؟ مجھے کھوج رہے تھے؟"
"جی ہاں!"

جیسن ہوئی۔ شری نارائن تیار بیٹھے تھے کرسی آئی ڈی ی دلسے گھوم رہے ہیں ہیں ۔ اور پھر اتنا کہہ کر وہ رکے۔ سلامت اللہ کو دیکھا اور آہستہ سے بولے ..... یہ تو آپ کے لئے بھی اتنی ہی جستجو پر مبنی ضروری ہے۔

سلامت اللہ کو ہنسی آگئی ... اس نا ن سنس میں اب کیا جنس تلاش کیا جائے؟

مگر پھر اچانک گزارے یاد آگئے .... یہ زندہ لوگ ہے بیٹی کا جہیز مانگنے کی ..... اسے لئے جہیز دینے کا وقت آگیا ... ایک مرتبہ پھر سا لے سے وہ تصویر نکل کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی .... پورا سراپا آگ میں جھلس رہا تھا اور شعلے سانپ کی زبان کی طرح لپلپا رہے تھے .... لاکھوں میں ایک سے کس دو دیکھ رہے تھے نے لگا وہ پکار رہی ہے ... سلامت اللہ ۔ .. سلامت اللہ!

" اچھا یہ تو بتایئے ..... یہ کس جنتے کی ہے؟" اچانک سلامت اللہ نے ایک بہت ہی غیر متعلق سوال کر ڈالا

" یہ؟ یہ .. نیولی ہے . . اور یہ کا تو زیادہ حصہ برباد ہی ہو چکا۔" شیو پوجن نے ملا جھجک اور بڑی صفائی سے جواب دیا۔

مگر جب وہ اُسے لے کر اپنے گھر پہونچا تو بیوی بالکل الف ہو گئی اور پھر شیرنی کی طرح جیسے ان پر جھپٹ پڑی۔ آپ کی عقل ماری گئی ہے کیا؟ کل سے اسی کے سبب اتنا پریشان تھے اور آج اسی کو گھر اٹھا لائے؟"

" یہ بہر حال ایک چیز ہے!" سلامت اللہ نے سمجھایا چاہا

"ایسی چیز ہے؟" وہ غصے میں ناچ ناچ گئی۔ "کسی کو ناسور یا پھوڑا ہو جائے تو وہ بھی تو اس کی ایک ہی چیز ہوتا ہے تو کیا وہ اُسے سینت سینت کر اپنے پاس رکھے رہتا ہے؟"

" وہ بول وہ قوۃ! سلامت اللہ بگڑا ٹھا کیا بے ہودہ تیں کرتی ہو؟ کہاں ناسور؟ کہاں یہ؟ اسے اس کی حفاظت کرنا اور حرمت بچانا ہمارا فرض ہے"

"اچھا ابو۔ ایک بات بتایئے۔" اچانک کالج میں پڑھنے والا بیٹا بول پڑا۔ "آپ ہی نے بتایا تھا کہ واجد علی شاہ کے وقت سے یہ ہمارے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ تو پھر ایک ایسی چیز جو ہر دور میں ہر آدمی کے لئے مسئلہ بنی رہی حد یہ کہ اب شیو پوجن جا جا کے لئے بھی مسئلہ بن گئی اُسے اپنے سر منڈھ لینا کہاں کی عقل مندی ہے؟

سلامت نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھا .... ہاں اس کا بیٹا تھا مگر دھند گہری تھی اس لئے شناخت مشکل ہو رہی تھی۔

پھر بیوی کی آواز سنائی دی لاکو رٹ کچہری تھانہ .... ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں یہ شیو پوجن کے گھر جاتا ہماری طرف مڑ گئے تو؟ نہ بابا نہ .....؟ باقی زندگی بھی ..... بیوی بالکل مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی۔

" دیکھو تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔" سلامت اللہ کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے گھر میں بھی ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے۔

"کیوں؟ مجھے کیوں؟"

" پتہ نہیں۔ لیکن کئی مرتبہ آچکے ہیں جب کہ مل لیجئے"

" میں کیا کروں گا جا کر؟ پھر کوئی پاگل ہو۔ کچھ کہ دے ۔ اچانک اُسے جملہ یاد آگیا ۔ سالا متلا "

" کیوں کسی نے کچھ کہا کیا؟"

" نہیں ..... مطلب نعرہ وارہ .. اب وہ بیوی کو ی تفصیل کہاں بتاتا!

" نعرہ .. کوئی ضروری ہے کہ آپ ہی کو سالے کے لے رہو .... ویسے بہت دیر سے کوئی نعرہ بھی سنائی نہیں دیا ہے پھر ایک دو دن کا معاملہ نہیں۔ ہمیں بھی تو یہیں رہنا ہے جا کے ل لیجئے .... دریا میں رہ کے ...."

وہ ایک تذبذب کے عالم میں گھر سے نکلا اور شیو پوجن کے گھر کی طرف ڑ گیا۔

" ارے!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، فس سے واپسی پر وہ اپنے ہی خیالوں میں ایسا گم رہا کہ شیو پوجن کے گھر کی طرف ذہن ہی نہیں گیا .... وہاں تو منظر ہی دوسرا تھا، ملبہ ہٹ چکا تھا، بھیڑ تقریباً ختم ہو چکی تھی، بجلی بھی بحال ہو چکی تھی۔ اس کے پکارتے ہی شیو پوجن ہڑبڑا کر باہر نکلے .... ارے سلامت بھائی، آپ؟ میں آپ کو کئی بار کھوج چکا"

" کیا بات ہے؟"

" آیئے آیئے نا۔" وہ اُسے لئے بیٹھک میں چلے گئے رضا .... چائے لے آ رے۔" انہوں نے نوکر کو آواز دی

" دیکھئے۔ ایسا ہے کہ .... " تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات کے وہ اصل پوائنٹ پر آہی گئے .... میں نے آپ کو بتایا ہی تھا کہ میں باہر گیا تھا۔ پھر آفس میں بھی آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا یہ تو آستھا کا معاملہ تھا سلامت بھائی .... آپ کچھ خیال مت کیجئے۔ آپ دیکھ ہی رہے تھے، کتنی بھیڑ تھی .... مگر آج سوچا ہے ..... شیو پوجن تھوڑا ٹھہر کر بولے .... " اصل میں وقت اور حالات دونوں جیسے تو ہم لوگوں کی دردوں کی بیماریاں ہیں .... تو اب اسی کو بہانہ بنا کر دھڑ پکڑ ہو رہی ہے تھانے سے دو دو لوگ بھی گھوم رہے ہیں کہ دیر کا اندیشہ ہے .... پالن کرنا ہی ہوگا۔ آج کسی وقت چھاپہ پڑ سکتا ہے .... اب اسے کہاں لے جاؤں؟"

اس نے بڑی حیرت سے شیو پوجن کو دیکھا .... ستونستر تا سیاسی دھرم سنگھرش کا اہلک؟ وہ حادثہ؟ وہ شیو پوجن کو ایک ٹک تکتا رہا اور وہ بولتے رہے۔ "وہ میشو رجی ہر کام پر سادا گروال صاحب سب نے انکار کر دیا .... اور بات بھی ٹھیک ہی ہے ویسے بھی ان لوگوں کے گھروں کی بھی تلاشی ہو سکتی ہے ..... ایسے میں اب لے دے کے آپ ہی بچ جاتے ہیں جہاں تلاشی کا چانس نہیں .... کرپا کرکے اس کو آپ اپنے سامان رکھ لیجئے۔ میں نے سوچا مگر ادھر ادھر بھٹکنے کی ہمت

اہل ذوق نے انھیں سراہا۔ کیوں کہ ان میں قال کے ساتھ حال بھی شامل تھا۔یہی وجہ ہے کہ انسانی روح نے ان سے تازگی حاصل کی اور معنویت پائی۔

داراشکوہ اپنی مذہبی اور روحانی روایات کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی دوسری مذہبی جماعت کی فلسفیانہ روایات سے بھی آگاہ تھا۔ وہ دونوں مذاہب (اسلام اور ہندو دھرم) کی روحانی شخصیت سے بھی برابر ملتا رہا۔ مزید یہ کہ وہ عرفان و حقیقت کا ذوق رکھتا تھا اور وحدۃ الوجود کی شراب سے سرشار۔ دارا نے جہاں ممتاز صوفیائے کرام کے سوانح لکھے، وہاں اس نے مجمع البحرین، کے نام سے کتاب لکھی، جس میں اس نے بتایا کہ دونوں قوموں (ہندو اور مسلم) کے حقیقت شناس ایک ہی راہ کے سالک ہیں اور توحید و وحدت کے نغمہ سرا، دونوں قوموں کی عارفانہ روایات کی چھان بین کرنے کے بعد دارا نے ان میں ایک ہی حقیقت کو جلوہ گر پایا۔ لیکن دونوں کا باہمی اختلاف لفظی اختلاف ہے۔ شہد کو شہد کہیں یا عسل، اس سے شہد کی حقیقت تو نہیں بدلتی۔ ۱۸۰۵ھ میں مصر میں شیخ احمد نے اور ۱۹۲۹ء میں مولوی محفوظ الحق نے کلکتہ سے اس کا عربی اور انگریزی ترجمہ بترتیب شائع کیا۔

دارا نے ۱۶۵۷ء میں ہندو فلسفے کی معروف کتاب اوپنشد کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اوپنشد کا فلسفہ ویدک فلسفہ کی ایک ارتقائی شکل ہے اور برہمن ازم کی ظاہر پرستی اور رسوم و عادات کے خلاف احتجاج۔ اپنشد فلسفہ ہندوستانی فکر میں ایک نیا انقلاب تھا، جس میں انسانی فکر نے ان فضاؤں میں پرواز کی ہے، جن سے وہ اب تک ناآشنا تھا۔ اس پرواز کا مقصد مذہب کے حقیقی معنی، انسان، کائنات اور خدا کی حقیقت کا سراغ لگانا تھا۔ ان مقاصد کا سراغ لگانے کے لیے قدیم ہند کے اہل نظر سب سے پہلے اپنی تلاش میں نکلے اور اپنے من میں ڈوبنے کے عمل کو حقیقت کبریٰ تک پہنچنے کا زینہ قرار دیا۔

دارا نے پچاس اپنشدوں کو علمائے بنارس کے تعاون سے فارسی زبان میں منتقل کیا۔ دارا نے "سر اکبر" کے مقدمہ میں لکھا کہ توریت، انجیل، زبور اور دوسرے آسمانی صحیفوں

نے رحمان سے توحید کی تعلیم دی ہے۔ موجودہ وقت میں جبکہ اہل ہوس، خدا شناس لوگوں کے درپے آزار ہیں اس نے (دارا) اپنشدوں کا جو توحید کا سرچشمہ ہیں، بغیر کسی حذف و اضافہ کے فارسی میں ترجمہ کر دیا ہے۔

دارا نے اپنی اس رائے کی تائید میں کہ اپنشد آسمانی صحائف ہیں، قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کیا ہے، جن میں کہا گیا ہے کہ خدا نے دنیا کی ہر قوم میں اپنے پیغمبروں کو بھیجا ہے۔ البتہ اس نے سورۃ "واقعہ" کی آیت کریمہ "انہ لقرآن کریم فی کتٰب مکنون" (۵۶: ۷۸) میں "کتاب مکنون" کی جو تفسیر و تشریح کی ہے۔ وہ محل نظر ہے۔ اس کی رائے میں "کتاب مکنون" سے مراد اپنشد ہیں۔ یہ تفسیر روایت اور درایت دونوں کے خلاف ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سر اکبر جسے ڈاکٹر تاراچند اور سید محمد رضا جلالی نے طہران سے شائع کیا ہے اور تفصیل سے دارا کے آثار و احوال پر بحث کی ہے۔)

دوسرے مذاہب کی تعلیمات اور روایات پر لکھنا اہل علم کی قدیم سنت ہے۔ دارا شکوہ سے بہت پہلے البیرونی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "الہند" میں ہندو مذاہب کی روایات پر لکھتے ہوئے بتایا کہ ہندو مذہب بنیادی طور پر ذات مطلق پر یقین رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اہل ہند کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے بیرونی لکھتے ہیں ۔ اللہ سبحانہ کے بارے میں (اہل) ہند کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی ذات واحد ہے، جو ازلی ہے۔ اس کی کوئی ابتداء نہیں، انتہا نہیں۔ وہ اپنے فعل میں مختار ہے، حکیم ہے۔ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں .... اللہ کی ذات پاک و بے مثال کے بارے میں یہی نقطہ نظر ڈاکٹر رادھا کرشن نے "زندگی کے متعلق ہندوؤں کا نقطہ نظر" میں پیش کیا ہے۔ البیرونی شاید پہلا مسلم محقق ہے، جسے ہندو روایات ان کے بنیادی ماخذ پر عبور و رسوخ حاصل تھا اور وہ پنڈتوں سے دوستی رکھتا تھا۔

دارا نے البیرونی کی روایت کو آگے بڑھایا، دارا کو علمی روایات کے ساتھ ساتھ حکمرانی کی روایات بھی ورثے میں ملی تھیں، وہ جانتا تھا کہ ملک کی اکثریت کا تعاون حاصل کئے

کیے بغیر حکومت مضبوط بنیادوں پر مستحکم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ دارا کی سیاسی اور علمی سرگرمیوں کا ایک مقصد ہندو، مسلم تعلقات کو خوش گوار بنانا بھی تھا۔ یہاں پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دارا کا تعلق برصغیر کے معروف صوفی شیخ محب اللہ الہ آبادی سے بھی تھا جن کا کہنا تھا کہ "انصاف کا تقاضا ہے کہ حکمرانوں کی بنیادی فکر کا محور انسانوں کی فلاح و بہبود ہونی چاہیے۔ تا کہ لوگ سرکاری اہل کاروں کے استبداد سے محفوظ رہیں۔ عدل و انصاف کو اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ لوگ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، تمام انسان درحقیقت خدائی کنبہ ہیں۔ اگر ایک آدمی ایسے تصورات (تمام انسان خدائی کنبہ ہیں) رکھتا ہے، تو پھر وہ مسلم اور غیر مسلم کا لحاظ کئے بغیر سب کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے۔ قرآن مجید اور (شیخ ابن عربی کی) فتوحات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام بنی نوعِ انسان کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں۔"

داراشکوہ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ:

۱۔ خدا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یومِ آخرت پر صدقِ دل سے یقین رکھتا تھا، وہ نہ صرف تلاشِ حق میں زندگی بھر سرگرمِ عمل رہا بلکہ حق کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے ریاضت بھی کرتا رہا۔

۲۔ ویدانت اور تصوف ایک ہی منزل کے رہرو ہیں۔

۳۔ اس پر الحاد و زندقہ کی تہمت ایک "سیاسی تہمت" ہے۔ جس سے ہر مذہب کے حق پرستوں کو واسطہ پڑا۔ شیخ ابن عربی، ابن سبعین اور اس پایہ کے علمائے ربانی تک اس "تہمت" سے نہیں بچ سکے۔

۴۔ صوفیا کرام کی تحریروں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ان کی اشاریت، شاعرانہ اسلوب اور صوفیانہ زبان کو ملحوظ خاطر رکھے، چنانچہ داراشکوہ کے بارے میں مولانا سید ابوالخیر مرحوم کا یہ کہنا کہ خود اس نے اپنے "کفر" کا اقرار کرتے ہوئے کہا ہے کہ

، سے اس کا دل "کفر حقیقی" کی لذت سے آشنا ہوا ہے، "اسلام" رخصت ہو گیا ہے، دارا
، ساتھ انصاف نہیں ہے۔ مولانا مرحوم (سید ابوالخیر مودودی) نے اپنے مقالہ میں دارا کے "
"پر علامہ شبلی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ شبلی "سر اکبر" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس
ب کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دارا شکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا، دارا شکوہ نے اس
ب میں بسم اللہ کی بجائے گنیش جی کی تصویر دی ہے۔" (مقالات، ۱۰۲/۱) افسوس! علامہ
موف نے دارا کو "ہندو" قرار دینے میں کسی دلیل یا منطق کا سہارا نہیں لیا۔ "سر اکبر" کے
قلمی نسخے رائل ایشیاٹک بنگال، اور کلکتہ یونیورسٹی لائبریری میں بھی پائے جاتے ہیں جن
، "سر اکبر" کی ابتدا "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے کی گئی ہے۔ البتہ آصفیہ ر ...
دکن میں موجودہ نسخے میں "اوم سری گنیش اینمہ" ضرور ہے۔ جس کے بارے میں ...
ے کہ یہ جملہ ایک ہندو کاتب کے قلم سے ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے۔ دارا شکوہ از بکرما
(Bikaran) دہلی ۱۹۸۲ء، دوسرا ایڈیشن، ناشر منشی رام)

شبلی کے علاوہ سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم نے بھی اپنی کتاب "بزم
وریہ" میں دارا کو "ہندو" ثابت کرنے کے لیے اسی قسم کی دلیلیں دی ہیں۔ جو تمام تر سطحی
ہیں۔

مولانا سید ابوالخیر شاید اس امر سے آگاہ نہیں کہ خود شبلی نے اس امر پر "افسوس"
اظہار کیا ہے کہ ان کے "کفر" سے ابھی تک بوئے ایمان "آرہی ہے۔ شبلی فرماتے ہیں۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارا بوئے ایمان ہم

کیا مولانا مرحوم یا کوئی اور اس شعر کی بنا پر شبلی پر الحاد و زندقہ کی تہمت ...
رسکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ تصوف کی ڈکشنری میں "کفر" کا معنی انکار حق نہیں اور اک
لغت ہے، جسے اصحاب معانی کفر قرار دیتے تھے۔ اہل حق نے علمائے دنیا کی نفس

پرستیوں کا نہیں وہ دین و مذہب قرار دیتے تھے۔ انکار کیا اور زبان حال سے برابر یہ صدا اٹھتی رہی کہ "آگر یہی ہے عاشقی تو پھر ترک عاشقی اولی" یہی وجہ ہے جب حالی جیسے صاحب ذوق نے شبلی کے اس شعر کو سنا تو ان پر "گھنٹوں خود فراموشی (طاری) رہی۔" (کاروان خیال از ابوالکلام آزاد)

یہی بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کی غیر معمولی انتظامی اور سپاہیانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ دارا کو "ملحد و زندیق" ثابت کیا جائے۔ اور ان سرکاری مورخوں پر اعتماد کر کے۔ مثلاً منشی محمد کاظم، محمد ساقی خاں وغیرہ) دارا شکوہ کے محاسن کا انکار کر دیا جائے۔ مولانا ابوالخیر مرحوم نے دارا شکوہ کو "خود سر" "خود رائے اور ستائش پسند" قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اختلاف رائے کی بناء پر لوگوں کو سر دربار ذلیل و رسوا کرتا تھا۔ دارا کے صبر و تحمل اور وقار و تمکنت کا ذکر کرتے ہوئے محمد افضل سرخوش جیسے درویش منش دانش مند اپنے تذکرہ الشعراء میں لکھتے ہیں کہ ایک دن شاہزادے کی محفل میں تمکین نامی ایک آدمی نے رکیک اور مہمل جملے کہے، جس پر شاہزادہ خاموش ہو گیا اور اہل محفل جو خوف زدہ تھے، تمکین کا سر قلم ہونے کے منتظر۔ لیکن دارا نے محفل کو برخاست کر دیا اور محل کے اندر جاتے ہوئے کہا کہ آئندہ اس مسخرے کو دربار میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح نتائج الافکار کے مولف نے بتایا ہے (جس کا ذکر سید صاحب مرحوم نے اپنے مقالہ میں بھی کیا ہے) کہ دارا نے اپنی موت سے قبل جلاد سے نماز کے لیے چند گھڑیوں کی مہلت مانگی اور نماز پڑھنے کے بعد گیارہ قدم سوئے بغداد چلا اور حضرت شیخ عبدالقادر کی روح سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرا سر قلم کر کے آپ نے مجھے حیات جاوداں عطا کی ہے کیا کوئی دنیا دار ہ ایں وقار و تمکنت موت کا مقابلہ کر سکتا ہے؟

(المعارف، اکتوبر ۱۹۹۳ء)

سید ضمیر حسن دہلوی
"دہلیز" A/168، بٹلہ ہاؤس، خورجہ (یو۔پی)

جدوجہد آزادی اور منٹو کا افسانہ

نیا قانون

منگو کوچوان انگریزوں سے نفرت کرتا ہے اس لئے کہ وہ ہندوستان پر اپنا تسلط جمائے ہیں۔ طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں اور منگو کوچوان کو ستاتے ہیں۔ پیشانی گوروں سے اس کا جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایسا سلوک کیا کرتے تھے جیسے وہ ایک ذلیل کتا ہو۔ ایک روز منگو کوچوان کو اپنی سواریوں کی زبانی خبر ملی کہ نیا قانون بننے والا ہے جس سے ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔ منگو جسکو سب نہایت عقلمند آدمی سمجھتے ہیں، اس ہونے والی تبدیلی کو سمجھتا نہیں۔۔ اس کو فریب کھاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ پہلی اپریل کو جو نیا قانون نافذ ہونے والا ہے وہ زندگی کے انداز کو بدل دے گا وہ خوش تھا کہ نیا قانون اسے انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائے گا۔ انگریزوں کا منحوس چہرہ دیکھتے ہی اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ نئے قانون کے ساتھ استاد منگو کے دل میں صرف غلامی سے چھٹکارے ہی کا خیال نہیں آیا، یہ لہر بھی اٹھی کہ لاریوں اور ان کا سودا بھی؛ اس کا اثر پڑے گا۔ اس کے بعد وہ گوروں کا خون نہیں چوس سکیں گے۔ پھر یہ بات بھی اس کے ذہن میں آئی کہ اس کے بعد روس کا بادشاہ بھی کچھ نہ کچھ کرکے رہے گا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم بنانے پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو وہ ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا تھا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔ نئے قانون کی اہمیت اس کے دل میں اور بڑھ گئی جب اس نے دو گریجویٹ طالب علموں کی زبانی یہ سنا کہ جو بیکار گریجویٹ مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ کمی ہوگی۔

پہلی اپریل کو جیسا کہ نیا قانون تو نافذ ہوگیا لیکن [illegible] استاد منگو کو اس حقیقت کا احساس اس وقت ہوا جب چھاؤنی میں ایک گورے کو پیٹنے کے سلسلے میں اسے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہ سمجھتا تھا کہ نئے قانون کے تحت حالات بدل چکے ہیں اس لئے دل کی بھڑاس نکالی جاسکتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پولیس آئی تو وہ نیا قانون چلاتا رہا لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔ منٹو کی اس مختصر سی کہانی میں کئی حقیقتوں کا اظہار ہوا ہے۔ ہندوستانی عوام کی انگریزوں سے نفرت، تبدیلی کی خواہش، آزاد ہونے کا خیال، سرمایہ داروں کی دست درازی، اشتراکی نظام کی استواری، تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری سب اپنی اپنی جگہ اس دور کی حقیقتیں ہیں۔ منٹو نے ان کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے۔ ہر چند کہ ان حقیقتوں کو پیش کرنے میں کوئی واضح سیاسی نقطۂ نظر نہیں ہے لیکن جو حالات ہیں ان کی عکاسی ہی نے اس کہانی کو حقیقت نگاری کی سرحدوں میں داخل کر دیا ہے۔

جہاں تک ایک واضح نقطۂ نظر کا معاملہ ہے غالباً یہ اس زمانے کے سیاسی منظر نامے میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ گاندھی جی کی جس حکمت عملی نے مختلف سیاسی اور سماجی جماعتوں میں مفاہمت پیدا کی تھی اس کے پیش نظر صرف ایک ہی بات تھی اور وہ تھی انگریزوں کے لئے ہندوستان چھوڑو کا نعرہ۔ اس سے اور کیا ہوگا اور اس کے لئے کیا کیا جائے یہ روداد الگ الگ جماعتوں کے منشور میں الگ الگ بیان کی گئی تھی۔ آزادی ہم نے اس ویژن کی سب سے بڑی حقیقت کثرت میں وحدت کے جادو سے حاصل کی ہے۔

نیا قانون ــــ تجزیہ

منٹو کے ایسے افسانے جن میں باقاعدہ ان کے سیاسی شعور اور ترقی پسندانہ نظریات کا کھل کر اظہار ہوا

ہے۔ "نیا قانون"، "شعر" اور "شغل" ہیں۔ منٹو کرشن چندر کی طرح کسی سیاسی یا ادبی تحریک سے وابستہ نہیں تھے چنانچہ وہ کہانی کو تبلیغی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنے افسانوں تک خود کو فنی تقاضوں تک ہی محدود رکھا ہے۔ خطیبانہ انداز اور اشتراکیت کے حق میں الاپ کی بلند آہنگی ان کے ابتدائی دور کے بعد آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی تھی مگر ان کے پُرخلوص اور دردمند دل میں انسان دوستی تو آخری دم تک قائم و دائم رہی۔ مذکورہ بالا تینوں افسانوں کی ہر سطر سے انسان دوستی آشکار ہوتی ہے۔ اس جذبے میں پاکیزگی تھی۔ خلوص تھا، نرم نرم حدت تھی۔ اسی جذبے نے ان کے سیاسی مسلک کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

منٹو مشکل سے اکیس بائیس سال کے تھے جب ان کے دل و دماغ نے بدیسی حکومت کی ستمگری اور عوام کی ناگفتہ بہ حالت کے خلاف شد و مد سے جہاد شروع کر دیا تھا۔ عوام کی بے بسی اور بے چارگی ان کی روح کو تڑپا دیتی تھی اور امیر و غریب کا تفاوت ان کے دل پر ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتا تھا۔ منٹو کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "آتش پارے" اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اشتراکی نظریات کی طرف مائل تھے۔ ان کے خیالات باغیانہ تھے۔ مشہور انقلابی شہید بھگت سنگھ کے لئے ان کے دل میں خاص عزت اور عقیدت تھی۔ جلیانوالہ باغ کے سانحے سے بھی وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ جن شہدا نے تحریک آزادی میں وطن عزیز کے لئے جانیں قربان کر دی تھیں ان کی یاد میں منٹو کا سر تعظیم و عقیدت سے خم ہو جاتا تھا۔ منٹو کے اس دور کے افسانے "خونی تھوک"، "انقلاب پسند"، "طاقت کا امتحان"، "دیوانہ شاعر" وغیرہ سب منٹو کے سیاسی موقف کے مظہر ہیں۔

"نیا قانون" منٹو کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی عظمت فن اور فکر دونوں کے اعتبار سے مسلم ہے۔ یہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دور کا آئینہ دار ہے۔ جس میں ہماری امیدیں، امنگیں، تمنائیں، اور ناکامیاں جھلکتی ہیں۔ اچھے افسانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا تانا بانا زیادہ بکھرا ہوا نہ ہو بلکہ مرکزی خیال ایک ہو۔ کردار، واقعات اور مکالمات اسی ایک خیال کو ابھار کر اس میں شدت پیدا کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوں۔ یہ بات بھی یہاں پوری طرح حاصل ہو گئی ہے۔ کردار صرف ایک ہے استاد منگو۔ واقعات اور مکالمات مختصر اور پس منظر کے طور پر ایک ہے یعنی نئے قانون کے نفاذ کا انتظار، ایک نئے نظام کی تمنا تھی لیکن ان سب باتوں کی تان ایک احساس شکست پر جا کر ٹوٹتی ہے۔

"استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو؟ قانون وہی پرانا ہے۔"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔"

ایک عام ہندوستانی کی طرح منگو کوچوان کا سیاسی شعور بہت خام ہے۔ وہ اپنی سواریوں کی سنی سنائی باتوں سے اپنی محدود ذہنی استعداد کے مطابق غلط سلط معانی اخذ کر لیتا ہے لیکن بنیادی طور پر اس کے خیالات میں حقیقت کی جھلک موجود ہے۔ اس کے خیال میں کسی پیر فقیر نے بددعا دی تھی کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہیں گے اور غیر ملکی لوگ اس پر راج کریں گے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اسے یہ احساس ہے کہ فسادات سے ملک کمزور ہوتا ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت کھو دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر بدیسی حکمران تسلط جما لیتے ہیں۔ منگو کوچوان کو انگریزوں سے دلی نفرت ہے۔ وہ آگ لینے آئے تھے اور گھر کے مالک بن بیٹھے جو اب سارے ملک میں اپنا سکہ چلا رہے ہیں۔ ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں سے یہ نفرت کا احساس کوئی نئی بات نہیں ہے۔ غدر سے بہت پہلے اردو کے ایک شاعر مصحفی نے اس کا سبب اپنے ایک شعر میں پیش کیا تھا۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

معاشی استحصال کے علاوہ، غدر میں انگریزوں کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم، ان کی شاطرانہ حکمت عملی، سفاک دستیاں اور مقامی لوگوں سے نفرت و کدورت کا احساس، ان سب کے ساتھ مل کر ان کی حاکمانہ رعونت، عجب و نخوت اور ہندوستانیوں سے ذلت کا برتاؤ ایسے اسباب نہیں تھے جن کی شناخت کرنا عام ہندوستانی کے لئے مشکل ہو۔ منگو کے انگریزوں سے بغض کا ذاتی جواز بھی ہے۔ چھاؤنی کے گورے اس پر ناجائز رعب گانٹھتے تھے اور اس سے تحقیر آمیز سلوک کرتے تھے جیسے وہ ان کا زرخرید غلام ہو۔ اپنے خام سیاسی شعور کے باوجود منگو کے جذبات و احساسات وطن پرستی سے لبریز ہیں اور یوں وہ ایک طرح سے ہندوستانی قوم کے جذبات کا سمبل یا علامت بن کر ابھرتا ہے جو غلامی کے جوئے کو اتار پھینکنا چاہتی ہے۔ منگو کو جب ایک دن اپنی سواریوں کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یکم اپریل کو نیا قانون نافذ ہوگا جس سے ملک کے نظام میں ہمہ گیر تبدیلیاں واقع ہوں گی تو وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یکم اپریل کو انڈیا ایکٹ کے نافذ ہوتے ہی انگریزی حکومت ہندوستان سے اپنا بوریا بستر گول کر جائے گی۔ نیا قانون نافذ ہونے پر غریبوں کو سود خوروں سے نجات ملے گی اور بیٹھے ہوئے بیکار نوجوانوں کو ملازمت کے مواقع میسر ہوں گے۔ گویا ہر طرف خوشحالی ہوگی۔ چہل پہل ہوگی۔ مسرتیں آگئیں ہوں گی اور یہ تصور کر کے وہ بے چینی سے انتظار

بکھر بکھر اپریل پر آنکھیں جلنے لگ جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں آزادی کے لئے جدوجہد بھی ذہنی افراتفری کا شکار رہی۔ مختلف سیاسی گروہ اپنے اپنے منشور پر نظر رکھتے ہوئے انگریزی حکومت کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔ کانگریس جو ان سب کی رہنمائی کر رہی تھی اس کے سامنے بھی آزادی کا واضح مفہوم اور کوئی منظم فکر و فلسفہ نہیں تھا کہ ڈومینین اسٹیٹس ہوم رول، مکمل آزادی، الغرض بھارت سے جتنا ہوا ہمارا قافلہ منزل تک کیسے پہنچا یہ ایک طویل داستان ہے۔ آزادی کی کہانی میں اس کی تفصیلات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد ملک کے کونے کونے سے یہ آواز بلند ہوئی، کون آزاد ہوا کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی۔

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے۔ ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

اے دوست ابھی آرام نہ کر ہے خام شعورِ آزادی

چلے تھے جس کے لئے ہم یہ وہ سحر تو نہیں

ہم ہندوستانی اپنی آزادی کی لڑائی پر کتنا ہی لکھیں وعدوں کی کتھا کہیں لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری آزادی کچھ بین الاقوامی حالات کا نتیجہ تھی۔ اس کے لئے مناسب قربانیاں دینے کا موقع ہی نہیں آیا۔ اسی لئے ہمیں اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس نہ جدوجہد آزادی کے دوران ہوا اور نہ آزادی کے حاصل کرنے کے بعد چند حریت پسند انقلابی نوجوانوں کے سہارے چلنے والی یہ تحریک منزل مقصود پر یوں پہنچ گئی جیسے رات خود صبح کے کنارے تک پہنچ جاتی ہے۔ آزادی کا باقاعدہ شعور نہ ہمیں آزادی سے پہلے حاصل ہوا تھا اور نہ آج تک ہو سکا ہے چونکہ اس کی تشکیل میں ایک آنچ کی کمی رہ گئی۔ منٹو نے اپنی کہانی میں اس حقیقت کی طرف بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

"منگو نے ٹھنڈی سانس بھری اور بہت دیر تک حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آ جائے گا یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

نیا قانون میں منٹو نے اپنے مطالب کے اظہار کے لئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ خوب ہیں۔ ان سے کہانی کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے اور بات زیادہ پُرمعنی اور پُراثر ہو جاتی ہے۔ تشبیہات میں کوئی ندرت نہیں، پیچیدگی نہیں، تخییل نہیں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بالکل سیدھی ہیں کوئی شبہ نہیں۔ منٹو کے ہاتھوں میں معمولی تشبیہات غیر معمولی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ مثالیں دیکھئے۔

"جب بھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آ جاتی، نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔" اقتباس ختم..... دوسرا اقتباس "جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا، مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔"

منگو کا یہ غصہ ہندوستانیوں کے بدیسی حکومت کے خلاف جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور منگو اس طرح پوری قوم کی نمائندگی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے خام اور ناپختہ انداز میں اپنی محدود ذہنی صلاحیتوں کے مطابق لیکن اس جذبے کی عظمت اور پاکیزگی سے بھلا کون منکر ہونے کی جرأت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ جذبہ ہماری آزادی کی لڑائی میں بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی ارتقائی منازل سے نہ خواص نے کچھ سروکار رکھا اور نہ عوام ہی ہو کر گزر سکے جس کا نتیجہ وہ ہوا جو منٹو نے "موتری" کی دیوار پر بیچوں بیچ کوئلے کی سیاہی سے لکھا ہوا دیکھا تھا اور جس کی وجہ سے اسے بغیر رفع حاجت کئے الٹے قدموں باہر آنا پڑا تھا۔

"دونوں کی ماں کا ہندوستان تارا"

منٹو نے ہندوستان کی آزادی کو معاشی سہولتوں سے بھی جوڑا تھا۔ وہ اشتراکیت کے بارے میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ ملک روس میں اس نے کچھ چمتکار ضرور دکھایا ہے۔ معاشی استحصال اور دولت مندوں کی دراز دستیوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ اشتراکیوں کی طرح وہ ایک غیرت مند شکار کھیلنے کا متمنی تھا وہ چاہتا تھا کہ آزادی کے ساتھ ایک سنہرا دن بھی آئے۔ چنانچہ مارواڑیوں کو ٹھکانے لگانے پر بھی کہ اس نے بازار میں ایک حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دودھ کی لسی پی تھی اور ایک بڑی سی چاقو سے شیشم کی ساتویں لکڑی میں سوراخ ڈال دیا ہے۔ اس کا اسلامی جوش بہا تھا اور اس نے اس گورے کو ٹھنڈی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

اس تصویر میں منگو ایک متحرک قوت کا مظہر بن جاتا ہے جو نیا قانون کے نافذ ہونے کا بے تابی سے منتظر ہے اور جو ایسی تغیر و تبدیلی کا بدلہ [illegible] کے گوروں سے لینے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس کے اندر لاوا ابل رہا ہے اور وہ موقع کی تلاش میں ہے کہ اپنے شعلوں کی بھڑاس نکالے [illegible] سے اطمینان قلب حاصل ہو۔

کھوسلا اور ظلم عطا کیا ہے۔ ور ساری کہانی ایک ٹھوس اکائی لگتی ہے جس میں کوئی جوڑ بے جوڑ نہیں ہے کوئی بھی کڑی ملتی جاتی ہے۔ تمام تفصیلات مرکزی خیال سے جڑی ہوئی ہیں۔ موزوں تشبیہات اور کردار نگاری نے استاد منگو کے کردار کو اس طرح سے تیار کیا ہے کہ پڑھنے والا اُسے آسانی سے بھلا نہیں سکتا۔ یہی چیز کہانی کے بقا کی ضامن ہے۔ منگو کوچوان یہاں: لیڈروں کی طرح بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا گو اس ڈکارے کر مونچھوں کو چوستے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا "بہت تیری ایسی کی تیسی" کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی۔ غریبوں کی کٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل۔ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔

منگو کوچوان کے دل میں انگریزوں کے خلاف جو غم و غصہ بھرا ہوا تھا اس کا اظہار کہانی میں جگہ جگہ اور بھولے طریقے سے ہوا ہے۔ یہ غم و غصہ ہندوستانی عوام کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے جو انگریزوں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ وہ انھیں ملک سے نکالنے کے لئے بیقرار تھے۔ منگو کی یہ تصویر اسی جذبے کی عکاسی کرتی ہے۔

(اقتباس)

"گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرا دیا اور پچھلی نشست پر بیٹھے گورے سے پوچھا۔

صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا صاحب

کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے تھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ اڈے کے تمام کوچوان ان کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہونے والا ہے۔ استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔ تانگوں کا یہ اڈا شہر میں دیہاتی چوپال سا درجہ رکھتا ہے جہاں بیٹھ کر یہ لوگ اپنی ناقص معلومات کے ذریعے دنیا بھر کے مسائل سلجھا لیتے ہیں یا انہیں سلجھانے کے وہم میں مبتلا ہو کر ریشم کے لچھے کی طرح اور زیادہ الجھتے جاتے ہیں۔

شہر کی اس چوپال میں ہر طبقے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس میں کوچوان بھی ہیں جو اپنی سواریوں کی سنی سنائی باتوں کو دہراتے ہیں۔ منگو جیسے استاد بھی ہیں جو سب کی سنتے ہیں اور پھر اپنے خیال کے گھوڑے دوڑا کر اس کا من چاہا نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ طالب علم بھی ہیں جو کسی اسمبلی ممبر کی سفارش پر اپنے لئے [illegible] کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ مارواڑی بھی ہیں جو نئے قانون کے پس منظر میں اپنے مفادات کا جائزہ لیتے ہیں اور بیرسٹر بھی ہیں جنہیں نئے قانون کا وہ حصہ جو فیڈریشن سے متعلق ہے بے تکا معلوم ہوتا ہے۔ غرض اس ماحول میں پوری سیاسی فضا کا نچوڑ سمٹ آتا ہے۔ منٹو نے اسی کی عکاسی کی ہے آگے قدم نہیں بڑھایا کیونکہ منٹو کہانی لکھتا ہے سیاست داں نہیں ہے کہانی کار کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ سیاسی پالیسی بھی وضع کرے۔ یہ غلطی کرشن چندر سے سرزد ہوئی جنھوں نے اچھی خاصی کہانیوں کو سرخ انقلاب کا ضمیمہ بنا دیا۔ البتہ منٹو کے کردار باصلاحیت ہیں وہ اپنے اپنے مقام اور حیثیت کے مطابق دانشورانہ گفتگو کرتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے تھے۔ فرقہ واریت برطانوی حکومت کے استحکام سے کچھ ہی دن پہلے انگریزوں کی سازش کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اکبر کے بہادر شاہ ظفر کے عہد تک کا زمانہ منگو کوچوان ایک ہی جست میں طے کر گئے۔ بہرحال یہ افسانے کی بات ہے اور افسانے تاریخی حوالوں سے دور ہو کر بھی تاریخی حقائق کے سب سے بڑے عکاس ہوتے ہیں۔ منٹو کا نیا قانون ایک اچھا افسانہ بھی ہے اور تاریخی بازیافت کا ایک موثر ذریعہ بھی۔ یہی اس کے بقا کی ضمانت ہے۔

سید حامد

مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی

یہ خطبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سالانہ جلاس کے موقع پر
۳۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو غالب اکیڈمی دہلی میں پیش کیا گیا

اگر سیمیناروں، کانفرنسوں اور ورکشاپوں سے پسماندگی دور ہو جایا کرتی تو ہم ہندوستانی مسلمان سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے۔ لیکن چشم فلک آج یہ عجیب منظر دیکھ رہی ہے کہ باوجود ان اجتماعات کے اژدہام کے مسلمان پسپائی سے چھٹکارا نہیں پاسکے۔ اس کی وجوہات کئی ہیں۔ یہاں اس تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ میں شروعات میں ان اسباب پر انگلی رکھوں گا جن کی طرف عام طور پر دھیان نہیں گیا ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں کہ آپ کو سرسید کی طرف لے جاؤں۔ ہمارے فیصلے اور منصوبے مٹی میں اس لیے مل جاتے ہیں کہ ان میں ہمارا خونِ جگر شامل نہیں ہوتا۔ ہم قوم کی خدمت کا ارادہ اور اعلان یا تو اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ہمیں نیک نامی حاصل ہو، یا اس لیے کہ ہماری بدنامی ڈھک جائے، یا اس واسطے کہ ہمیں لوگ اس قسم کی محفلوں میں کھینچ لاتے ہیں یا اس لیے کہ خدمت خلق کی شہرت ہماری اپنی ترقی کے لیے زینہ بن جائے، حکومت اور سیاسی پارٹیاں ہماری طرف ملتفت ہو جائیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا نبض شناس اور معالج لکھتا ہے:

"سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہِ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔

جناب سید حامد سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، تعلیم آباد، تغلق آباد، نئی دہلی

اس مقام پر ہم کو ایک کہانی یاد آئی۔ انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا۔ پاؤں نے کہا کہ میں کیوں چل کر غذا بہم پہنچاؤں۔ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بسا بساندا ہونا میں کیوں سونگھوں۔ منہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں۔ سب اپنے آپ چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں توں گزر گئے۔ پھر تو پاؤں لڑکھڑانے لگے، ہاتھ کانپنے لگے، منہ ہلانے کی طاقت نہ رہی۔ آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا۔ تب تو گھبرائے کہ یہ کیا ہوا۔ اس وقت عقل کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔ تم نے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہم کو کب مطلب ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ تمہارا ہی کام تھا اور اس کا نقصان تمہارا ہی تھا۔ بس جس قوم کے لوگوں میں خود غرضی ہوتی ہے، جیسا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے تو وہ آپ اپنے تئیں برباد کرتی ہے۔"

اس دور میں خود غرضی کے اوزار سے خود کو برباد کرنے کا کام ہم نے بہت تیز کر دیا ہے۔ سر سید کے وقت میں بہت سے اہلِ اخلاص تھے۔ کچھ تھے، کچھ نے سید والا گہر کی آگ سے شعلہ پکڑ لیا۔ اب تو کوئی شخص جو ملت کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہو مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر   کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

منصوبے نہ بھی بنائیے تو بھی کام ہوتے چلے جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ دل کو لگی ہوئی ہو۔ جو بات نکلے دل سے نکلے۔ وہ بات کیا جس کی شناسا صرف زبان ہو، جو دل اور جگر دونوں سے کترا کے نکل جائے۔

اقبال کی نظم 'شمع و شاعر' یاد آتی ہے۔

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا
قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا
اور ہے تیرا شعار آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا
کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بت خانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

جب تک ہم خود غرضی، شہرت طلبی اور ریاکاری سے اوپر نہیں اٹھیں گے، ہماری آواز میں کوئی اثر پیدا نہیں ہوگا۔ ہم اپنے درخشاں ماضی کے راگ لاکھ الاپتے رہیں، ہم اپنے حال کو سنوار نہیں پائیں گے، نہ ایک روشن مستقبل کی بنا ڈال سکیں گے۔

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

دوسری بڑی کمزوری جس نے ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل دیا ہے، اداروں کو چلانے کے لیے ہماری نا اہلیت ہے۔ ہمارے بیشتر ادارے خانہ جنگی کے اکھاڑے ہیں۔ یہی نہیں، ان میں داخلے اور تقرر شاذ ہی صلاحیت کی بنا پر ہوتے ہوں۔ سفارش، مروّت، اثر، دباؤ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے معیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اب تو ہمارے بڑے بڑے اداروں میں بھی رشوت راہ پاگئی ہے۔ ہمارے لیے نااہلوں کی ماموری اور داخلے، ادارے کے معیار، اس کی فضیلت اور شہرت سے زیادہ اہم ہیں۔

اب جو کچھ میں کہنے جا رہا ہوں اسے چاہے تیسری بات کہیے چاہے دوسری بات کا شاخسانہ کہیے۔ ہمارے اداروں میں جب کبھی مقدار اور معیار میں جنگ ہوئی ہے، معیار نے مات کھائی ہے۔ ہم نے کسبِ فضیلت کے تصور کو اپنے لائحۂ عمل اور قلمرو خیال سے نکال باہر کیا ہے۔ اداروں کے سربراہ بالعموم محاصرہ میں رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ دباؤ اور سفارش قبول کرتے رہیں اور قبولِ عام کی مسند پر بیٹھے رہیں۔ سخت اور دشوار فیصلوں سے وہ کتراتے رہیں کہ ان میں سکون اور جان کا جوکھوں ہے۔ کسی کو کیا ضرورت کہ ادارے کے مفاد میں ایسے محکم، عادلانہ اور دور اندیشانہ فیصلے کرے۔ جو اہلِ غرض اور اہلِ قیادت کو اس کے درپے آزار کردیں، دن کا چین اور راتوں کی نیند اس پر حرام ہوجائے۔ بااثر اور بے اصول افراد سے ٹکرانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی باتیں مانتے چلے جاؤ، پھر ہر طرف تمہاری تعریف ہوگی اور زندگی آرام سے بسر ہوجائے گی۔ ایسے معاشرے میں جو قدروں سے ناآشنا ہے، غلط فیصلوں کی تعریف ہوتی ہے اور صحیح فیصلوں پر کہرام برپا ہوجاتا ہے۔ ادارے ہمارے ایسے ہی ہوں گے جیسے ہمارا سماج خود ہے۔ ہم یہ کہہ کر مطمئن بھی ہوجاتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ سماج اوپر

اٹھتا ہی اچھے اداروں کے ذریعے ہے۔ جن اداروں کا کردار پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے انھیں ہم نظر انداز کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان پر ہم نا اہلوں، بد اندیشوں، ہوس پیشوں اور اسلحہ برداروں کو قابض ہونے دیتے ہیں۔ ہمارا نقطۂ نظر اس قدر مسخ ہوگیا ہے، ہمارے طرزِ فکر میں اتنی رداعت آگئی ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی تائید بسا اوقات شر کے حصے میں آتی ہے۔ خیر کی بندشوں سے ہم اکثر بیزار نظر آتے ہیں۔ صارفیت کی باڑھ ہر طرف آئی ہوئی ہے۔ ہم اس میں اس طرح ڈوب گئے ہیں کہ جانبر ہونا دشوار نظر آتا ہے۔ ہم اس طرح جی رہے ہیں جیسے یہ فانی زندگی ہی سب کچھ ہو اس کے ساتھ ہمارا وجود ختم ہوجائے گا۔ ہم سے نہ مواخذہ ہوگا نہ بازپرس۔ ہم سے حساب لیا ہی نہیں جائے گا۔ منوں مٹی کے نیچے جب ہماری ہڈیاں گل جائیں گی تو ہمیں قیامت کے روز کون اٹھائے گا۔ اور قیامت ہوگی بھی کیوں۔ زر کی ننگی ہوس میں مسلمان غیر مسلموں سے بازی لے گئے ہیں۔ روزِ حشر کے مواخذہ کا تصوّر ان کے لیے بہت بعید اور نہایت مبہم ہوگیا ہے۔

وہ رائے عامہ جو افراد کو سیدھے راستے پر رکھتی ہے؛ ظلم کے خلاف مؤثر احتجاج کرتی ہے، وہ ہماری دسترس سے باہر ہوگئی ہے۔ اسی لیے ہمارے خوش حال اور صاحبِ اقتدار افراد بے جگری کے ساتھ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ انھیں احتساب کا کوئی ڈر ہی نہیں؛ اسی لیے کارہائے خیر اور کارہائے فلاح میں مسلمانوں کو وہ 'مدد نہیں ملتی'، وہ اعتراف ہاتھ نہیں آتا جو دل اور مقصد کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے، اسی لیے لوگ قواعد و ضوابط کو اپنی اغراض کے مطابق توڑتے مروڑتے رہتے ہیں اور معاشرہ چیں بہ جبیں بھی نہیں ہوتا۔ ہم دولت کی پرستش کرتے ہیں، یا کامیابی کی؛ ان کے حصول کے لیے ہر اصول کو توڑ ڈالنے میں ہمیں کوئی باک نہیں۔ چالاکیوں سے ہم قدروں کو تاراج کرتے ہیں اور اس عمل کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ ہم اس گت کو کئی دہائیوں کے انحطاط کے بعد پہنچے ہیں لیکن گزشتہ دس سال میں کاروانِ زوال اور رفتارِ ادبار بہت تیز رو ہوگیا ہے۔ اتنا تیز رو کہ ہم رُک کر دم لینے نہیں پاتے۔ ویسے تو یہ رفتارِ زمانہ ہے۔ ہندوستان کی سیاست ان ایّام میں جیسی بے ضمیر اور بے مہار اور جرائم آلود ہوگئی ہے، مسلمان اس کے اثرات سے محفوظ کیونکر رہتے۔ چونکہ اخلاقاً وہ عضوِ ضعیف بن گئے تھے لہٰذا نزلہ ان پر سب سے زیادہ گرا۔ ہمارے اہلِ سیاست اہلِ صحافت اور اربابِ خطابت نے ان کو غور و فکر سے بیگانہ اور سستی جذباتیت کا دیوانہ بنا دیا۔ اب آپ ہی سوچیے کہ جس جماعت میں اتحاد نہ ہو، سنجیدگی نہ ہو، جفاکشی نہ ہو، جو راست روی سے دامن

ے اور نئے میٹ ورک سے کم کوشی کے آثار ہیں وہ ترقی کیسے کرسکیں گے' زندہ اور باآبرو کیسے رہیں گی' جانبر
ار ہو گی۔

اس تاریک تصویر میں جو موئے قلم نے کھینچی ہے روشنی کی لکیریں بھی ہیں۔ جنوبی ہندوستان اور
حد تک جنوبی مغربی ہندوستان کا نقشہ اس سے مختلف ہے۔ وہاں مسلمان سنجیدہ ہیں' محنت بھی
ے ہیں اور قدروں سے اس قدر بے گانہ بھی نہیں ہیں اور خود شمالی ہندوستان میں اوپر کی تہ یا کرسٹ کو
بے لکھوں اور دانشوروں پر مشتمل ہے' اگر کھرچ کر نکال دیجیے تو جاہل یا نیم خواندہ عوام کے تمّ خمیر کو
بہت بہتر پایئے گا۔ امکانات کے حامل یہی سادہ لوگ ہیں۔ ہم امیدیں انھیں سے باندھ سکتے ہیں۔ مسجدوں'
وں' کوٹھریوں اور کوچہ و بازار کو آباد رکھنے والے یہ لوگ تہذیب کی شناعت سے بچے ہوئے ہیں' انھوں
ر دفریب نہیں سیکھا نہ اُنھیں ملّی مفاد کو اپنی اغراض پر قربان کرنے کا ہُنر آتا ہے۔ دانشوروں اور
شوں کے درمیان اس فرق پر آپ حیران کیوں ہوتے ہیں۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے کہ جہاں موقع ملا دولتمند
ں کا' پڑھے لکھے جاہلوں کا' طاقت ور کمزوروں کا استحصال کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں چونکہ اَن پڑھ
ہ زیادہ ہیں اور پڑھے لکھے بہت کم اس لیے پڑھے لکھے ان پڑھوں کی جہالت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے
' اپنے مقاصد کے لیے انھیں بہکاتے اور بھڑکاتے ہیں۔ ان کے ترجمان بن کر نام اور زر کماتے ہیں۔ یاد
ہے مُسلمانوں کی اُمیدوں کا محور کونسلوں کے لیڈر نہیں مسجدوں کے مُتقی ہی بن سکتے ہیں۔

مُسلمانوں کی عام حالت کا نقشہ اس قدر تفصیل کے ساتھ میں نے اس لیے کھینچا کہ ان کی تعلیمی
ں حالی کا تعلق اس سے براہِ راست ہے اور اس لیے بھی کہ اگر ان میں تعلیم عام ہو جائے تو وہ پسماندگی
دلدل سے نکل آئیں اور نہ اپنے انھیں بھڑکا سکیں نہ بیگانے بیوقوف بنا سکیں۔ ہماری سرکار نے شاید
، خیال سے کہ اگر مُسلمانوں کو اپنی تعلیمی بے چارگی کی خبر مل گئی تو ان کا دل بیٹھ جائے گا۔ گزشتہ پانچ
م شماریوں میں اکٹھا کیے ہوئے فرقہ وار تعلیمی اعداد و شمار کو طاقِ نسیاں میں رکھ دیا جس پر خفا کے
رے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ان اعداد و شمار کو شائع کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہو رہی ہے۔ حکومت
طرف سے مایوس ہو کر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے بے ترتیب یا رَینڈم ڈھنگ سے ایک ملک گیر
بی سروے کرایا ہے' جس کے نتائج منظرِ عام پر آنے لگے ہیں۔ سروے کے انکشافات نے ہمارے
ریں اندیشوں کو صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔ مسلمان ہر جگہ اپنے اہلِ وطن سے تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ ایک مثال

ہے، جو نمایندہ نہیں بلکہ انتہائی ہے، یہ بات ذہن نشین ہو جائے گی۔ ہریانہ کے ضلع گڑگاؤں کی فیروز پور جھرکہ تحصیل میں مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا تناسب ۴ر۱ فی صد ہے۔

آپ کے پاس وقت نہیں اس لیے میں صرف اشارے کرتا چلا جاؤں گا۔ مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کے لیے مندرجہ ذیل قدم اٹھانے چاہئیں بغیر تاخیر کے :

(۱) ہر ریاست میں ان گنتی کے لوگوں پر مشتمل ایک بورڈ بنایا جائے جو ریاست بھر میں مسلمانوں کی نگاہوں میں معتبر ہوں۔ مسلم اسکولوں اور کالجوں کی یک گونہ نگرانی کے لیے یا تو حکومت اس بورڈ کو تسلیم کرے یا مسلم اکابرین ریاست اپنے اخلاقی اثرات کو کام میں لاکر ان اداروں کے منتظمین کو مجبور کریں کہ اداروں کو سنواریں، سدھاریں، ان کے معیار کو اونچا کریں۔

(۲) خواندگی کی ملک گیر تحریک میں مسلمان آگے بڑھ کر حصہ لیں۔

(۳) لڑکیوں کی تعلیم پر لڑکوں کی تعلیم سے بھی زیادہ، کہیں زیادہ زور دیا جائے۔ ان کے لیے اسکول اور ہوسٹل کھولے جائیں۔

(۴) اپنے اسکولوں کو بہتر بنانے اور نئے اسکول کھولنے کے علاوہ دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ مقامی روابط کے ذریعے شہر کے اچھے اسکولوں میں داخلے حاصل کرنے چاہئیں۔ کیوں کہ ہم اتنے اسکول نہیں کھول سکتے اور نہ کھولنے چاہئیں، جو ہمارے بچوں کے لیے کافی ہوں۔

(۵) ہمارے گھروں میں بالعموم بچوں کو نہ تعلیمی ماحول ملتا ہے نہ تعلیمی امداد۔ اس کی وجہ سے وہ کلاس میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان کا اعتماد جو زندگی میں کامیابی کی کنجی ہے، گھائل ہو جاتا ہے۔ ہمارے بچوں کو جو کچھ نہیں دے پا رہے، وہ ہمارے معاشرے کو دینا چاہیے۔ ہر چھوٹے شہر میں کسی ایک اسکول میں اور بڑے شہروں میں کئی جگہ اصلاحی یا ریمیڈیل کلاسیز کھولنے چاہئیں۔ ایسے اسکولوں کا ایک کامیاب نمونہ وہ اصلاحی کلاسیز ہیں جو ہمدرد کا بزنس اینڈ ایمپلائمنٹ بیورو رابعہ گرلس پبلک اسکول میں کئی سال سے چلا رہا ہے۔ اس کے علاوہ محلے محلے پڑھے لکھے پڑوسی اپنے جوار کے بچوں کو تعلیمی امداد دے سکتے ہیں۔ یہ ان کا فرض ہے اور یہی قوم کا ان پر قرض ہے۔

(۶) مسلمان بچوں کے گھر میں بیٹھ جانے یا ڈراپ آؤٹ کی شرح تشویشناک حد تک اونچی ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے باپ یا تو خوانچہ گیری یا چھوٹی دوکان داری کرتے ہیں یا گھریلو دھندا یا

وہ چاہتے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو ان کا بیٹا دوکان پر یا گھر یلو دھندے میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے حکومت
ن ہے کہ ایسے بچّوں کے لیے معاوضہ (opportunity cost) کا انتظام کرے۔ ورنہ ایک بڑا طبقہ
سے محروم رہ جائے گا۔ خود ہمارا فرض ہے کہ والدین کو بتائیں کہ بچّوں کو اسکول سے اٹھا لینا یا سرے
نہیں اسکول نہ بھیجنا ان کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

(۷) یہ بات کئی زاویوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں غریب
نوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ صوفیائے کرام کے اثر سے بہت سے غریب اور مظلوم ہندوؤں
ماً ہریجنوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ وہ جاہل تھے اور جاہل رہ گئے۔ اور اب ان کو وہ مراعات
حاصل نہیں جو درج فہرست والوں کو حاصل ہیں۔ ان کی طرف دھیان دینے کی خصوصی ضرورت ہے۔ صدیوں
ان کے ساتھ جو غفلت برتی گئی، اس کی تلافی کرنا ہمارا فرض ہے۔

جن اقدامات کا میں نے ذکر کیا ہے اُن کو عمل میں لا۔ نے کے لیے دو تحریکیں درکار ہوں گی۔ ایک تو
ماؤں میں بڑے اور ملک گیر پیمانے پر جوش و خروش اور تدبیر و تنظیم کی سابقہ تعلیمی تحریک، دوسرے
ت سے متواتر مطالبہ کہ مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کی طرف دھیان دے۔ اپنے ایم۔ پی اور ایم۔ ایل۔
صاحبان کو مجبور کیجیے کہ اس مطالبے کو اپنی مشترکہ تائید کا وزن دیں۔ مرکزی حکومت کے ایما پر میں
یک کمیٹی کے ان سابقہ پروگراموں کی تعمیل کا جائزہ لیا تھا جو نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کی بہتری کے
شامل کیے گئے تھے۔ ہماری دریافت عبرت ناک تھی۔ حکومت کو دلائل، احتجاج اور التماس کے ساتھ
پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ ہماری آبادیوں میں اسکول کھولے، ہماری لڑکیوں اور ہمارے اہل حرفہ کے
ں کی تعلیم کے لیے خاص انتظامات کرے اور اقلیتی اداروں کو اس حیثیت سے تسلیم کرنے میں لیت و
ہ نہ کرے اور اُردو میں ابتدائی تعلیم کا محکم اہتمام کرے۔

غفلت کے ایک لمحے میں حکومت نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ (۱۹۸۱ء) کے ذریعہ یونیورسٹی
مقاصد یا اختیارات میں یہ مقصد یا اختیار بھی شامل کر دیا تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور
تی پیش رفت کا سروسامان کرے۔ یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ نے اس پراوزن [C 2 (5)] سے پورا
ہ اٹھانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے اراکین پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر فخرالدین احمد، پروفیسر
اب زیدی اور یہ نامہ سیاہ تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنے دوسرے

امتیازات کے علاوہ علی گڑھ تحریک کے مورخ اور اس پر سند ہیں۔ سید والا گہر کے خادموں اور عقیدت مند
میں میں بھی اپنے آپ کو شمار کرتا ہوں اور میرا تعلق مسلمانوں کی تعلیم سے، اپنی بساط کے مطابق کم
ہے۔ ہم سب نے بڑی کاوش کے بعد ایک رپورٹ تیار کی۔ ہم یہ سمجھے کہ ترمیمی ایکٹ کی مذکورہ د
علی گڑھ تحریک کے احیاء، جو ڈوڈو کی طرح مردہ ہو چکی تھی، امکانات رکھتی ہے اور بشارت دیتی ۔
لیکن بے عملی اور بے حسی کے اس دور میں ہوا کیا۔ ان لوگوں نے جنھیں علی گڑھ تحریک کے رموز و کردا
کوئی شعور نہیں۔ رپورٹ کو اس طرح سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کہ اب وہ پہچانی بھی نہیں جاتی۔ حکومت
یو جی سی کو ہماری سفارشات کا وہ روپ ملا جو بگڑ چکا تھا اور جس کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ شاید کوئی
منظور بھی ہوئی لیکن اس حالت میں کہ رقم ناکافی اور مقاصد مبہم اور بکھرے ہوئے ہیں۔ لوگ یہ بھ
گئے کہ رپورٹ کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ یونیورسٹی کو داخلی طور پر خود کیا کرنا ہے۔ دوسرا حصہ ملک میں
کی اشاعت سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک حصہ پر بھی دھیان نہیں دیا گیا۔ مقصد کو مجوب قرار دیجیے تو :

اس سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جاتا

غرضیکہ علی گڑھ تحریک کو زندہ کرنے کا ایک موقع جو حسن اتفاق سے میسر آگیا تھا ہاتھوں سے جاتا رہا۔ عر

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

آپ بخوبی واقف ہیں کہ علی گڑھ تحریک کے اہم ترین ستون ایم اے او کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس
تھے۔ ایم اے او کالج خدا کے فضل سے اپنے بانی کی منشا کے مطابق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ آزاد
کے بعد اس کی بڑی توسیعات ہوئیں۔ افسوس ہے کہ نہ وجہ اسے تنک معیاری نے گھیر لیا۔ پھر بھی اُ
ہے کہ کبھی اس کے اچھے دن بھی آئیں گے اور توسیع کی جگہ ترفیع، پھیلاؤ کی جگہ بلندی لے لے گی اور
معیار مقدار کو ہٹا کر اپنی جگہ بنائے گا۔ ایک وصف ہے جسے انگریزی میں optimum کہتے ہیں جس کا
ترجمہ موزوں ترین کیا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی کا بھی ایک موزوں ترین سائز ہوتا ہے۔ اسے گھٹا دیجیے
اس کی منفعت محدود ہو جاتی ہے اور اس پر صرفہ برداشت اور امکانِ دوام سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر
بڑھا دیجیے تو نظم و ضبط، معیار اور اقدار سب یک قلم مجروح ہو جاتی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سربراہ کو
ہمیشہ مقدار اور معیار، وقتی مقبولیت اور ادارہ کے دور رس مفاد کے درمیان فیصلہ کرنا پڑتا ہے

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جہاں تک تعلق ہے اس کا مقصد علی گڑھ تحریک کو ملک بھر میں پھیلانا تھا' اس کے پیغام کو گھر گھر پہنچایا تھا۔ اوائل ایآم میں اس نے زبردست کارہائے نمایاں انجام دیے۔ آگے چل کر اُس نے مسلمانوں کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرنا شروع کردیا۔ کانفرنس نے سیاست سے بھی لو لگائی۔ اس میدان کی نظر میں اس نئی دلچسپی نے اسے اپنے بنیادی مقصد یعنی تعلیم کی اشاعت سے ہٹادیا۔ ۱۹۲۰ء تک کانفرنس بہرحال سرگرم کار رہی۔ یونیورسٹی کیا بنی کہ کانفرنس نے پسپائی اختیار کی، گویا اس کا دیرینہ مقصد پورا ہوگیا۔ یہ پسپائی ارادی تھی یا بے ارادہ، اس کا فیصلہ کرنے میں نہیں کھڑا ہوا ہوں' مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اب کوئی ساٹھ سال سے کانفرنس بے عملی اور ہزیمت کا شکار ہے۔ اور گزشتہ نصف صدی سے تو یہ اس حیثیت کو پہنچ گئی ہے' جیسے انسانی جسم میں اپینڈکس کی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے کہ ایک پل کی غفلت ایک صدی پیچھے ڈھکیل دیتی ہے۔

زنتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل ماندم صد سالہ راہم دور شد

ایک لمحہ کا ذکر کیا۔ یہاں پوری نصف صدی ضائع کردی گئی۔ یہاں یہ بات بھی آپ کی توجہ کے قابل ہے کہ آزادی کے بعد ایک عرصے تک جنوبی ہند کے مسلمان سید والاگہر کی وضع کی ہوئی کانفرنس کی طرف دیکھتے رہے کہ وہ تعلیمی مہم میں ان کی رہنمائی کرے گی۔ کوئی تیس سال ہوئے علی گڑھ اور کانفرنس کی طرف سے مایوس ہوکر انھوں نے اپنی تحریک الگ شروع کردی۔ کیرالا میں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ (آپ کو معلوم ہے کہ علی گڑھ کے ابنائے قدیم ہی اس کے محرک تھے) اور پھر کرناٹک میں الامین سوسائٹی' تامل ناڈو میں ایس آئی ای ٹی نے گرانقدر کام کیا اور آندھرا پردیش خصوصاً حیدرآباد میں تو کارگزار انجمنوں اور اچھے اداروں کی بھیڑ لگ گئی۔ لہٰذا اب یہ سوچنا کہ علی گڑھ تحریک کا احیا علی گڑھ میں ہوگا۔ خام خیالی ہے۔ اب مرکز ثقل جنوب منتقل ہوگیا ہے۔ علی گڑھ تحریک اگر کبھی زندہ ہوئی تو وہ زیادہ سے زیادہ شمالی ہندوستان کا احاطہ کرسکے گی۔

آج کا جلسہ جس ڈھنگ سے شروع ہوا ہے اور اس کے پیچھے جو نسبتاً نوخیز اور حوصلہ مند ابنائے قدیم ہیں ان سے امید کی جاسکتی ہے کہ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کہف سے نکل کر سرگرم عمل ہوجائے گی۔ نظر باقاعدہ گھڑوں میں وقت نہ گنوائیے' اختلافات کو ہوا نہ دیجیے' اچھے اسکول کھولیے' ان کی حالت کو

شدھارئیے، ساکھ قائم کیجیے اور اس کا فائدہ ارتفاعِ تعلیم اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے اُٹھائیے۔ بہار میں فضا محنت اور مقابلے کے لیے سازگار ہے۔ یوپی خوابِ غفلت میں گرفتار ہے۔ یہاں صرف دو شہر ایسے ہیں جہاں تعلیم نے تحریک کی شکل اختیار کی ہے۔ ایک تو کانپور جہاں Movement for Education کے ڈاکٹر (محمود رحمانی اور جمیل احمد) جنوب کے ڈاکٹروں کی طرح ملت کی مسیحائی کر رہے ہیں، دوسرے بنارس جہاں سرسید سوسائٹی نے اہلِ تجارت کی نگاہ تعلیم کی طرف موڑ دی ہے۔ تھوڑی بہت جنبش اور شہروں میں بھی نظر آ رہی ہے۔ یوپی رابطہ کمیٹی نے انھیں بہت جھنجھوڑا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ریاض الرحمٰن خاں صاحب شیروانی جن کا دل صحیح جگہ پر ہے اور جن کا ذہن پیش رفت کی طرف آمادہ ہے۔ اور جو گفتار کو کردار کا بدل نہیں سمجھتے اپنے نسبتاً نوعمر رفقائے کار کے ساتھ مل کر بلند پروازی کی جگہ ارضی پروازی کے باب کا آغاز کردیں گے۔ انشاء اللہ۔

دینی تعلیم کا تو ابھی تک ذکر بھی نہیں آیا۔ اس کی حالت عصری تعلیم سے بہتر نہیں ہے۔ نصاب میں توسیع (اہم جدید مضامین کے شمول کے ذریعے) اور طریقِ تدریس میں ترمیم کو اب زیادہ دیر تک اُٹھا نہیں رکھا جاسکتا۔ عصری تعلیم پانے والوں کو دین کی واقفیت بہم پہنچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ کانفرنس اس طرف دھیان دے سکتی ہے اور اُن دانوں کو جو شمالی ہندوستان میں بکھرے ہوئے ہیں ایک لڑی میں پرو سکتی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اور ہم اپنے بیان کو اپنے رب کی حمد پر ختم کرتے ہیں، جو سارے جہان کا رکھوالا اور پالنے والا ہے۔

(جامعہ دسمبر ۹۳ء)

مطلع اتنا ابر آلود بھی نہیں ہے

سید حامد، سابق وائس چانسلر اے ایم یو علی گڑھ

انسان پریشانیوں میں گھر جائے اور کملانے لگے تو امید کی ذرا سی کرن بھی آب حیات کا کام کر جاتی ہے۔ جس کسی کو جینے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ بڑی مصیبتوں کا مقابلہ خم ٹھونک کر کرتا ہے اور چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو ڈھال بنا لیتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں پر برا وقت پڑا ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہر طرف سے حوصلہ شکن خبریں آتی رہیں مظلوم پر الزاموں کی یورش بھی ہو تو وہ بیچارہ کیا کرے اس کے لئے کوئی چارہ اس کے سوائے نہیں رہتا کہ کمر ہمت کس لے اور دانت پیس کر میدان کارزار میں اتر آئے ——— میدان کارزار یعنی بے درد مقابلہ کی دنیا۔ مسلمانوں نے ہنوز ایسا کیا تو نہیں ہے، لیکن کوشش کی آہٹیں مل رہی ہیں۔ قارئین مجھے معاف کر دیں کہ میں ان آہٹوں کی صدا کو اونچا کر کے دکھاؤں، یا سنواؤں۔

یہ دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمان ہندوستان کی آبادی کا تقریباً ۱۲ فیصد ہیں۔ آٹھ دس سال تک سول سروسیز کے مقابلہ میں ہر سال تقریباً ۹۰۰ سو کامیاب امیدواروں میں بارہ کے قریب مسلمان ہوتے تھے۔ گزشتہ دو تین سالوں میں یہ تعداد ۱۸ سے ۲۲ تک پہنچ گئی امسال کل ۷۹۱ امیدوار چنے گئے جن میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے ۹۵ ہونا چاہیئے تھی۔ کل ۲۴ مسلمان کامیاب ہوئے۔ یعنی ابھی منزل دور ہے لیکن یہ بات کیا کم ہے کہ چند سال ہوئے جہاں ہمارا تناسب ۱ر۳۳ ۔۵ر۱ ہوتا تھا وہ اب ۳٪ ہو گیا ہے۔ ہم پروردگار کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ایک پر تو ہمیں رجعت قہقری سے چھٹکارا ملا اور ہم نے آگے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا خواہ وہ رینگنے کی ہی شکل میں کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب کے ایما پر اور
مدد نیشنل فاونڈیشن کی اعانت سے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے تعلیم آباد، سنگم وہار
جنوبی دہلی) میں جو مرکز سول سروسیز کے مقابلہ کے لئے کھولا ہے وہ سال بھر کی مختصر
ت میں حوصلہ افزا نتائج سامنے لایا ہے۔ پچھلے سال اس نے آٹھ لڑکوں کو امتحان کی
زی منزل یعنی پرسنلٹی ٹسٹ کے لئے تیار کیا۔ چار لڑکے کامیاب ہوئے امسال جس جماعت
دو شروع سے تیار کر کے لایا تھا۔ اس میں سے ۹ لڑکے دوسری منزل یعنی خاص تحریری
تحان میں کامیاب ہوئے۔ اور ۱۲ لڑکے آخری منزل کی تیاری کے لئے ان کے ساتھ شامل
گئے ان ۲۱ امیدواروں میں سے اس نتیجہ کے مطابق جو آج ۲ رجون ۱۹۹۲ء کو اخبارو ں
ں شائع ہوا ہے، ۱۲ بفضلہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ انمیں دس مسلمان ہیں اور تین درج
ست ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

فہرست حسب ذیل ہے۔
ن احمد، انجم پرویز، اصغر سول، مظفر حسین، نورالدین انصاری، اظہر شمس، اشتیاق حسین
یبہ وارثی، آر ڈی نظیم، نظام، تامیز وکندن، کے ایل مینا، سنجے بارا۔
یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ہمدرد اسٹڈی سرکل سے جتنے مسلمان طالب علم امسال
یاب ہوئے ہیں اتنے ہندوستان کے کسی دوسرے تربیتی مرکز سے نہیں ہوئے۔
یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ راقم سطور کی متواتر کوششوں کے بعد مرکزی سرکار نے مقابلہ
امتحانوں کے لئے تربیت کی اسکیم منظور کی تھی۔ یہ ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ذریعہ
م یونیورسٹیوں اور کالجوں میں روبہ عمل آئی۔ ہندوستان بھر میں ۵۳ کوچنگ سنٹر کھولے
۔ جہاں تک سول سروسیز کا تعلق ہے ان مراکز کے نتائج حوصلہ افزا نہیں رہے لیکن
ا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان طلبہ کو یہ اطلاع مل گئی کہ قوت بازو سے اچھی ملازمتیں حاصل
ہا سکتی ہیں۔ چھوٹی ملازمتیں، سرکاری اور نجی سیکٹر میں ان مراکز کے تربیت یافتہ طالب علم
معقول تعداد میں حاصل بھی کیں۔ مقابلہ کی ایک فضا تیار ہو گئی۔ اس سے بہت بہتر نتائج
مل ہو سکتے تھے۔ اگر ان تربیت گاہوں کے سربراہ خلوص، محنت، لگن اور بصیرت سے

کام لیتے اور مسلم عوام اس پروگرام کا پورا فائدہ اٹھاتے ۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے ہمدرد اسٹڈی سرکل کو قائم کرتے وقت ان کمیوں کو دور کر دیا۔ یہ اسکیم بغیر کسی بیرونی اعانت کے شروع کی گئی تھی لیکن بعد میں وزارتِ فلاح نے اپنی تربیتی اسکیم کے تحت آئے جزئی امداد دینا منظور کر لیا۔ ہمدرد اسکیم کے تحت خوبی یہ ہے کہ اس میں طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بھی ہے۔ بہت بڑا کیمپس ہے۔ اس پروگرام کے تحت لائبریری لکچر روم ڈائننگ ہال، ایڈمنسٹریٹیو بلاک اور پچاس کمرے فرنیچر اور ضروریات کے ساتھ ہر امیدوار کو ایک کمرہ الاٹ کیا جاتا ہے۔ اور صبح سے رات تک ڈائریکٹر کے زیرِ نگرانی طلبہ کو تیاری میں مصروف رکھا جاتا ہے۔ مختلف مضامین کے متخصصین کو مذاکرات کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ یہ تاثرات عام ہو گیا ہے کہ پرسنیلٹی ٹسٹ کی جتنی اچھی تربیت ہمدرد اسٹڈی سرکل میں ملتی ہے اتنی ہندوستان میں کہیں نہیں ملتی۔ انٹرویو بورڈوں میں جو مشق کے لئے تشکیل دیے جاتے ہیں۔ ہمیں مرکزی سروسیز سے نوجوان افسروں کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات انوکھی سی لگتی ہے مگر ہے امرِ واقعہ کے مطابق کہ جہاں تک سول سروسیز کا تعلق ہے، یو جی سی کے ۵۲ اور وزارت فلاح کے مراکز نے مل کر بھی کامیابی کی وہ منزل طے نہیں کی جو ہمدرد اسٹڈی سرکل اپنی مختصر خوا کے دوران طے کر پایا ہے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ محنت باقاعدہ محنت اور لگن شرط ہے۔ کوئی کام ایسا نہیں جو انجام نہ دیا جا سکے۔ افسوس اس بات کا ضرور ہے کہ مسلمانوں کی قیادت نے انہیں تعمیری کاموں سے سدا دور رکھا اور حکومت انہیں کھلونے دے کر بہلاتی رہی۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ مسلمانوں کو تعلیم و تربیت اور مقابلہ کے میدان میں اتار دیتی۔

خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ آج کی سادہ سی کامیابی کل شاندار فتوح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

(حیات نو، اگست ستمبر ۹۳ء)

قوت بندوق سے نہیں قلم سے آتی ہے

مولانا کلب صادق

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے گیارہویں اجلاس منعقدہ جے پور کے اجلاس عام میں جو رام لیلا میدان جے پور (رام رواس باغ کے سامنے) منعقد ہوا حضرت مولانا کلب صادق' نائب صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ایک دن پر اثر تقریر فرمائی۔ وقت' حالات' مزاج' حسیات اور ضرورت کے مطابق ایسی جامع' مختصر تقریر تھی جو دل کو چھو رہی تھی اور ایسے منطقی انداز میں پیش کر رہے تھے کہ لوگوں کو بالکل پاس کی بات لگ رہی تھی ان کو اپنا مشاہدہ محسوس ہو رہا تھا۔ خاص طور سے بھارتیہ جنتا پارٹی کو اشاروں و کنایوں میں صرف ۲۵ سال پہلے کا ایک اپنا چشم دید واقعہ سنایا جس نے اس زمانہ میں اخباروں میں زبردست ہلچل مچایا تھا پیش کیا کہ انسان کا بچہ جسے بھیڑیوں نے پالا تھا وہ بھیڑیا ہوگیا اور اسے صرف انسان کے خون سے دلچسپی رہ گئی اسی طرح سے آج بھارتیہ جنتا پارٹی کو مسلمانوں کے خون سے دلچسپی ہے۔ ان کی تقریر کو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے شمس الہدیٰ ندوی ترتیب دے کر پیش کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

حمد و ثنا کے بعد

اما بعد

معزز حاضرین! السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

برادران وطن

اللہ کی طرف سے انسان کو جو سب سے زیادہ حسین اور سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ خوبصورت تحفہ دیا گیا اسی کو ہم دین اور اسی کو ہم مذہب اور اسی کو ہم دھرم کہتے ہیں۔ لیکن وہ دین اور وہ مذہب اور وہ دھرم جو پھول کی شکل میں ہمارے لئے آیا تھا' جو ایک امرت کی شکل میں ہمارے سامنے آیا تھا' جو ایک پیغام حیات کی شکل میں ہمارے سامنے آیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ آج یہ پھول کانٹا بن چکا ہے اور یہی امرت زہر بن چکا ہے اور یہی پیغام حیات' پیغام موت و پیغام فنا میں تبدیل ہو چکا ہے اور آج اسی دھرم اور مذہب کے سہارے نہ معلوم کتنے بے خطا انسانوں کی جان لی جاتی ہے' کتنی عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں' کتنے بچے یتیم ہو جاتے ہیں اور عورتوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایسے کیوں ہوا؟

تقریباً ۲۵ سال پہلے کی کی بات ہے جب لکھنؤ میں' مجھے اچھی طرح سے یاد ہے اخباروں میں یہ خبر آئی تھی کہ شکاریوں کی ایک پارٹی لکھنؤ کے قرب و جوار میں شکار کھیلنے کے لئے گئی تھی تو انہوں نے شکار کے دوران ایک عجیب و غریب منظر دیکھا اور انہوں نے منظر یہ دیکھا کہ ایک انسانی بچہ جو صورت میں انسان اور شکل میں انسان مگر وہ ایک بھیڑیے کے بھٹ سے برآمد ہوا معلوم یہ ہوا کہ کسی دیہات کا کوئی بچہ تھا جسے بھیڑیا اٹھا لے گیا تھا مگر اس بھیڑ میں شرافت تھی کہ اس بچہ کو کھایا نہیں بلکہ بھیڑیے کی جو مادہ تھی اس نے اسے دودھ پلا پلا کر پالا اور اس کو بڑا کیا۔ اس بچے کو میں نے اسپتال میں دیکھا تھا وہ بچہ انسان کا بچہ تھا' لیکن جب بھیڑیا اسے اٹھا لے گیا اور بھیڑیے نے اسے پالا پوسا تو میرے عزیز و شکل یہ ہوئی کہ انسان کے بچے کے

نے دودھ لے جائیں تو وہ خوش ہوتا ہے' انسان کے بچے
سامنے آپ چاکلیٹ لے جائیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔
ن کے بچے کے سامنے آپ مٹھائی لے جائیں تو وہ خوش
ا ہے۔ انسان کے بچے کے سامنے آپ پھل لے کر جائیں
ہ خوش ہوتا ہے مگر وہ انسان کا بچہ جو انسان کا بچہ تھا مگر
۔ بھیڑیوں کے بھٹ میں بھیڑیوں کے ساتھ پل پوس کر اور
ہو کر دوبارہ انسانوں کے درمیان آیا تو میں نے یہ منظر اپنی
موں سے دیکھا کہ اگر آپ اس کے سامنے دودھ لے
یں تو وہ غراتا ہے۔ اس کے سامنے پھل لے جائیں تو وہ
، آنکھیں نکالتا ہے۔ اس کے سامنے چاکلیٹ یا کوئی شے
، جائیں تو وہ اس کو کاٹنے کے لئے دوڑتا ہے۔ یہ منظر میں
نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' ان ساری تفصیلات کو اس زمانہ
، اس زمانہ کے اخبارات میں چھپے ممکن ہے یہاں بھی چھپا
۔ لیکن جب اسی انسان کے سامنے جو بچہ تھا انسان کا مگر
ے بھیڑیوں نے پالا اور بھیڑیوں نے پرورش کیا اس کے
نے آپ کچا گوشت لے جائیں کہ جس سے خون کی بوندیں
ب رہی ہوں تو اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی تھی۔ وہ
لی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کرتا تھا اس کا مطلب یہ
ا کہ انسان کا بچہ بڑا پیارا ہوتا ہے۔ بڑا بھولا ہوتا ہے وہ
ر ہنستا ہے' دوسروں کو ہنستے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن
سان کا بچہ جب بھیڑیے اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں تو بڑا
نخوار ہوجاتا ہے' بڑا خطرناک ہوجاتا ہے اس کو پھر انسان
، گوشت کے علاوہ کسی اور شی سے دلچسپی باقی نہیں رہتی
ہ وہ مذہب تو بہت بھولا بھالا تھا' مذہب تو بہت سیدھا سادھا
ا تھا' مذہب تو انسانوں کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتا
۔ لیکن جب سیاسی بھیڑیے اسے اٹھا کر لے گئے تو پھر یہ
ہب بڑا خونخوار ہوگیا' پھر یہ مذہب بڑا جفا کار ہوگیا' اب
ں کو صرف انسان کے خون سے دلچسپی ہے۔ اب اس کو
لتے ہوئے گھروں سے دلچسپی ہے۔ اب اس کو گری ہوئی
جدوں سے اور اللہ کے گھروں کی بے حرمتی سے دلچسپی

ہے تو اس میں مذہب کا کوئی دوش نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھئے
۔ مذہب کن ہاتھوں میں ہے' میں اپنے ہندو بھائیوں کو
رجہ کرنا چاہتا ہوں اور ان کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے
ندو دھرم کا ادھین کیا ہے اچھی طرح سے 'گیتا جی میرے
رہانے رکھی رہتی ہے۔ میں اس کتاب کو پڑھتا رہتا ہوں اور
ب جب پڑھتا ہوں میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔
ب پڑھتا ہوں اس سے بہت متاثر ہوتا ہوں۔ میں نے گیتا
، جو پڑھا ہے تو مجھے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہندو دھرم تو
بت کا پیغام ہے۔ میں نے ہندو دھرم کا ادھین کیا تو میں یہ
ہتا ہوں کہ ہندو دھرم تو قوت برداشت اور شکتی کا نام ہے
یکن آج جن لوگوں کے ہاتھوں یہ ہندو دھرم آگیا ہے وہ اس

ہندو دھرم کے سہارے بے خطا انسانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ ہندو دھرم شکتی کو لے کر چلتا ہے۔ رحم کو لے کر چلتا ہے اور میں صاف صاف آپ کے سامنے کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام انصاف کو لے کر چلتا ہے اور نیائے کو لے کر چلتا ہے۔ صاحب آپ یہ نہ دیکھئے کہ کس کے ہاتھ میں ہندو دھرم ہے اور آپ یہ نہ دیکھئے کہ کس کے ہاتھ میں اسلام ہے آپ یہ دیکھیں کہ کون ہندو دھرم کو اپنے پاس رکھنے کے بعد ایسے کام کر رہا ہے جسے ہندو دھرم کی ٹیک ہی ہو' کون ایسا انسان ہے جو ہندو دھرم جس کی فلاسفی میں تیاگ شامل ہے۔ رام چندر جی نے راج پاٹھ کو چھوڑ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں دھرم ہوتا ہے وہاں تیاگ چھوڑا جاتا ہے۔ دلی کے پارلیمنٹ پر للچائی ہوئی نظریں نہیں لگائی جاتی ہیں۔ لیکن جب دھرم کے ذریعہ ستہ کی بات کی جارہی ہو' جب دھرم کے ذریعہ حکومت کی بات کی جارہی ہو تو آپ سمجھ لیں کہ یہ دھرم کی خدمت کے لئے نہیں ہے بلکہ دھرم سے اپنی خدمت لینے کے لئے ہے۔

میں اپنے ہندو بھائیوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہندو دھرم میں شکتی ہے ہندو دھرم میں محبت ہے' ہندو دھرم میں پریم ہے لیکن آج جو لوگ ہندو دھرم کا نام لے رہے ہیں اور اسی کے سہارے اپنی سیاست کو چلا رہے ہیں کیا کسی بیوہ کو روتے ہوئے دیکھ کر آپ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھا ہے' کبھی یتیم کو دیکھ کر آپ نے اس کے دل میں تڑپ محسوس کی ہے' عورتوں کی بے حرمتی ہوتی ہے انہوں نے کبھی ایک لفظ بھی کسی کے مذمت میں یا مسلمانوں کی تسلی کے لئے کہا ہے۔ نہیں کہا ہے۔

مذہب تو انسانوں کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب سیاسی بھیڑیے اسے اٹھا کر لے گئے تو پھر یہ مذہب بڑا خونخوار ہوگیا' پھر یہ مذہب بڑا جفا کار ہوگیا' اب اس کو صرف انسان کے خون سے دلچسپی ہے۔ اب اس کو جلتے ہوئے گھروں سے دلچسپی ہے۔ اب اس کو گری ہوئی مسجدوں سے اور اللہ کے گھروں کی بے حرمتی سے دلچسپی ہے۔ تو اس میں مذہب کا کوئی دوش نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھئے کہ مذہب کن ہاتھوں میں ہے

اب میں آپ کے سامنے اسلام کی باتیں کرنا چاہتا ہوں میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں میں نے عرض کیا کہ جس طرح سے ہندو دھرم محبت کا پیغام ہے اسی طرح سے اسلام نیائے' انصاف اور جسٹس کا پیغام ہے۔ اسلام دوسری شئے ہے اور مسلمان دوسری شئے۔ جیسے ہندو دھرم دوسری شئی ہے اور ہندو الگ ہے۔ جو ہندو دھرم پر چلے وہ ہندو ہے

جو ہندو دھرم کا استحصال کرے وہ ہندو نہیں ہے وہ ہندو دھرم کا دشمن ہے تو اب ملاحظہ فرمائیں پاکستان میں کیا ہوا میں برابر پاکستان جاتا رہتا ہوں۔ میرا اسلام پر یقین ہے اور میں جانتا ہوں کہ اگر اس دنیا میں صحیح اسلام کو نافذ کر دیا جائے تو نہ صرف مسلمان مطمئن ہو جائیں بلکہ غیر مسلم بھی خوش اور پرسکون زندگی گزاریں گے۔ اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں صورت حال یہ ہوئی کہ وہ کٹھ ملا لوگ کہ جن کے پاس علم نہیں تھا وہ اسلام کو سیکھ نہیں سکتے تھے وہ مذہب کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے انہوں نے وہاں پر بڑا فتنہ و فساد کیا۔ آپ یقین کریں' بڑے بڑے علماء و سمجھدار لوگوں کی بات میں نہیں کر رہا ہوں لیکن پبلک کو مشتعل کر دینے والے کٹھ ملا ہوتے تھے انہوں نے وہاں پر ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ سے لڑانا شروع کر دیا اور دوسرے فرقہ کو پہلے فرقہ سے۔ اور جس طرح سے یہاں پر بہت سے کچھ دار ہندو فسادی نہیں ہونے کے باوجود مجبور ہو گئے اور بے بس ہو گئے ان فسادی ہندوؤں کے سامنے' اسی طرح وہاں کے مسلمان بہت سے جو فساد نہیں چاہتے تھے مگر وہ بے بس نظر آنے لگے ایسے فسادی مسلمانوں کے سامنے۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ میں ہندو بھائیوں سے کہتا ہوں کہ پاکستان کے الیکشن سے سبق حاصل کریں۔ پاکستان کے مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ جو اسلام کا نام لیتے ہیں یہ چالیس سال سے ہم کو لڑا رہے ہیں۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا خون بہا رہا ہے۔ عبادت گاہوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے تو آپ دیکھ لیجئے کہ ان مسلمانوں نے اس ساری نام نہاد قیادت کو یک قلم Reject کر دیا اور نامنظور کر دیا۔ یہاں سے آپ کو سبق لینا چاہئے' میں کہتا ہوں کہ جو سلوک پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی نام نہاد نہ کہ اصلی دینی قیادت کے ساتھ کیا ہے وہی سلوک یہاں کے ہندوؤں کو بی جے پی' آر ایس ایس اور شو سینا کے ساتھ کرنا چاہئے اگر وہ اس ملک کی خیریت چاہتے ہیں ان کو مسلمانوں سے سبق لینا چاہئے' اور میں مبارکباد دینا چاہوں گا پاکستان کے مسلمانوں کو انہوں نے کبھی کوئی عقل کا کام نہیں کیا اور یہ پہلی مرتبہ عقل کا کام کیا ہے۔

جہاں تک اسلامی قوانین کا تعلق ہے میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں' ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں اپنی گورنمنٹ سے' اپنی سرکار سے' اپنی حکومت سے۔ وہ ابھی جیسا کہ ہمارے بہت والا صاحب فرما رہے تھے کہ گورنمنٹ چاہتی ہے کہ یونیفارم سول کوڈ نافذ کرے۔ بہت سے لوگ پڑھے لکھے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ ایک انگریزی دوا ہوتی ہے اس کا نام ہے کلوروفارم۔ کلوروفارم کا کام کیا ہوتا ہے آپ کو معلوم ہے؟ کلوروفارم سے پہلے کام لیا جاتا تھا تعمیر کا اور اب کام لیا جاتا ہے اس سے تخریب کا۔ پہلے آپریشن کیا جاتا تھا تو اس کو سونگھا دیتے تھے مریض بے چارہ بے ہوش ہو جاتا تھا اور اطمینان سے آپریشن کر دیتے تھے۔ اب ڈاکو اپنے ساتھ کلوروفارم لئے گھومتے رہتے ہیں' سڑکوں پر' ریلوں میں' بسوں میں اور جہاں ان کو موقع ملا دیکھا کہ جیب میں پیسے ہیں انہوں نے کلوروفارم سنگھائی اور دولت لے کر چمپت ہو گئے تو میرے عزیز! آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ جو حکومت جو آپ کے سامنے یونیفارم کی بات کر رہی ہے یہ یونیفارم نہیں ہے۔ آپکی قیمتی دولت کو چھیننے کیلئے کلوروفارم کا استعمال کیا

[redacted]

چاہتا ہے کہ آپ کے ہوش و حواس کو سلب کر دیا جائے اور آپ کے متاع دین کو چھین لیا جائے۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ بہت مقدس ہے۔ پارلیمنٹ بہت سپریم ہے یہ جو بات طے کرے تو آپ کو ماننا پڑے گا تو ٹھیک ہے بھائی جب ہم اس ملک میں رہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے ہم پارلیمنٹ کے Sensitive سے تھوڑے انکار کرتے ہیں اس کی عظمت سے انکار تو نہیں کر سکتے۔ میں بالکل حکومت کو سمجھا دینا چاہتا ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ کان کھول کر سن لے۔ ٹھیک ہے ہم پارلیمنٹ' کی لوک سبھا' راجیہ سبھا کی عظمت کے قائل ہیں لیکن ہم سے کتنی عظمت کا مطالبہ ہے۔ ہم اپنے مقتدوں کے برابر سمجھیں پارلیمنٹ کو' کیسے لیتے ہیں' ذرا تھوڑی دیر کے لئے مجھے معاف کریں گے مسلمان بھائی' میں جسارت کر رہا ہوں لیکن ایک نتیجہ تک پہنچنا ہے ہم مقتدوں کے برابر سمجھیں مان لیتے ہیں' قانون کے برابر سمجھیں ہم مان لیتے ہیں' ارے حضور وہ معذرت کے لئے معاف کریں ذرا ساعت فرمائیں۔ ہم حضرت امام ابو حنیفہ' امام شافعی' امام مالک' امام احمد بن حنبل کے برابر مقدس مانیں۔ مانے لیتے ہیں۔ ہم امام باقر' امام جعفر صادق کے برابر مقدس مانیں۔ مانے لیتے ہیں۔ ہم خلفاء راشدین کے برابر مقدس مانیں' مانے لیتے ہیں۔ معاذ اللہ استغفر اللہ۔ حضرت محمد

رسول اللہؐ کے برابر مقدس مانیں مانے لیتے ہیں۔ لیکن میرے عزیز! اس پارلیمنٹ کو بفرض محال ہم حضور گرامیؐ کے برابر بھی مقدس مان لیں تو قرآن میں تو حضورؐ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ "ان اتبع الا ما یوحیٰ الی-----" میں تو اللہ کے حکم کی پابندی کرتا ہوں' قانون شریعت بدلنے کا تو مجھ کو بھی اختیار نہیں ہے۔ تو جب دنیائے اسلام کی سب سے عظیم ذات' اس سے عظیم ذات کوئی ہو ہی نہیں سکتی اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ قانون شریعت میں کوئی تبدیلی کرسکے تو دنیا کی وہ کون سی قوت و طاقت ہو سکتی ہے کہ جس کو ہم یہ پاور Power دے دیں کہ وہ شریعت اسلامی میں تبدیلی کرے۔ آخری بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔

میرے عزیزو!-----

سلطنت دو طرح سے جاتا ہے یا تو چوری ہوتی ہے یا چھن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سائیکل چوری ہو جاتی ہے' اگر آپ یہاں بھی سائیکل پر سوار ہو کر آئے ہوں گے تو ممکن ہے یہاں سے بھی سائیکل چوری ہو جائے۔ سائیکل جب چوری ہوتی ہے کہ جب سائیکل کو آپ چھوڑ دیں۔ دوسری صورت کیا ہوتی ہے کسی نے آپ کے ہاتھ سے کوئی شئی چھین لی۔ چوری اس وقت ہوتی ہے جب آپ کسی شئی کو چھوڑ دیا کرتے ہیں اور چھنی جاتی ہے کوئی شئی اس وقت جب آپ میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اگر شریعت اسلامی حکومت آپ سے چھینا چاہتی ہے تو آپ سمجھ لیجئے دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ جب آپ سے شریعت چھین لی جاسکتی ہے اس وقت جب شریعت کو آپ نے چھوڑ دیا ہو یا اس وقت جب آپ اتنے کمزور و ناتواں ہو جائیں کہ اپنی شریعت کی حفاظت کی آپ کے اندر طاقت نہ رہ جائے۔

[illegible]

میرے عزیزو!

جیسا کہ علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ آپ شریعت کو چھوڑ دیں نہیں اگر آپ نے شریعت کو لاوارث بنا دیا تو حکومت کے چور اسے اڑا کر لے جائیں گے اور اگر آپ کمزور ہو گئے تو حکومت کے ڈاکو اسے چھین کر لے جائیں گے' حضور کریمؐ نے کہا اور ارشاد فرمایا۔ تمام شہید و سنی مانتے ہیں کہ مسلمان کو کیسا ہونا چاہئے۔ ارشاد ہوتا ہے "تخلقوا باخلاق اللہ۔" ایک صحیح مسلمان وہ ہے کہ اللہ سے ملتے جلتے صفات بقدر طاقت بشری اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔ وہ مسلمان میں صفات الٰہی بقدر بشری اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اللہ کیا ہے؟ آپ پہلے یہ بتائیں کہ اللہ عالم ہے یا جاہل؟ اللہ عالم ہے تو مسلمان اگر جاہل ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے دور ہو گیا۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ فقیر ہے یا غنی اگر فقیر ہے تو آپ کو اختیار ہے اور اگر وہ غنی ہے تو مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ فقیر ہو۔ آپ مجھے بتائیں کہ اللہ قوی ہے کہ کمزور' اگر اللہ قوی ہے تو مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کمزور ہو۔ اللہ کے صفات کو دیکھنا چاہئے اور اس کے صفات کے آئینے میں اپنے کردار کو ڈھالتے چلے جایئے۔ آپ صحیح مسلمان ہوتے چلے جائیں۔

قوت کیسے آتی ہے میں ذرا خلاصہ کر کے یہ کہتا ہوں کہ میں آپ سے کہہ دوں کہ آپ ملی خیشہ ہو جائیے۔ اگر ذرا خلاصہ کرکے ہندو قوم کو ملی خیشہ بنانا چاہتے ہیں تو اتنا جانتا ہوں کہ ہندو اتنے سمجھدار ہیں کہ وہ اس کے بہکاوے میں نہیں آئیں گے لیکن میں اس کے ساتھ ساتھ اتنی وارننگ دیئے جاتا ہوں کہ ملی ٹینسی سے ملی ٹینسی پیدا ہوگی یہ بات اچھی طرح سے آپ سمجھ لیجئے ملی ٹینسی سے آپ محبت نہیں کرسکتے ہیں ملی ٹینسی سے صرف ملی ٹینسی ہوتی ہے۔ میں ایک پوری اپنی ذاتی ذمہ داری کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام بے خطا لوگوں کے قتل کی کبھی بھی' کبھی بھی' کسی بھی صورت میں اجازت نہیں دیتا ہے' لیکن اس کا ہم کیا کریں کہ اب کچھ لوگوں کو وہ ترکیب آگئی ہے کہ جس کے ذریعہ سے فسادات میں فقط اقلیت کا ہی نقصان نہیں ہوتا ہے بلکہ اکثریت کا بھی کیسے نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہ خطرناک طریقہ بھی اب اقلیت کو آگیا ہے۔ اور یہ وارننگ ہے بال ٹھاکرے کے لئے' اور ان کے ایسے افراد کے لئے کہ وہ ہوشیار ہو جائیں اس لئے کہ جب بھی پھلجڑی چھوٹتی ہے اور کہیں پٹاخہ ہوتا ہے تو ہم اس کو روکنا بھی چاہیں تو پھر ہمارے بس کے باہر ہے (میں لکھنؤ کے جلسے میں یہ بات کہہ چکا ہوں) کہ اس حد تک مسلمانوں کو دبائیں کہ ہم اسے روک سکیں اور ایسا نہ ہو کہ آپ مسلمانوں کو اتنا دبائیں' اتنا دبائیں' اتنا دبائیں کہ وہ پہلے تشدد کا نشانہ ہمیں کو بنا دیں۔ کہ پہلے آپ مریئے ہم ان سب کو دیکھ لیتے ہیں تو وہ نوبت بھی آسکتی ہے۔ تو ملی ٹینسی کے بارے میں تو میں کہہ ہی نہیں سکتا ہوں اس لئے کہ ملی ٹینسی سے ہمیشہ ملی ٹینسی پیدا ہوتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ میں یہ ضرور آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ قوی ہوں' قوت ہاتھ میں بندوق لینے سے نہیں آتی ہے' قوت ہاتھ میں خنجر لینے سے نہیں آتی ہے' قوت ہاتھ میں قلم لینے سے آتی ہے۔ اصلی قوت وہ ہے جو علم سے پیدا ہوتی ہے' اصلی قوت وہ ہے جو عقل سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا وقت بھی ختم ہو رہا ہوگا میں اس جملے پر اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔

اسلام بے خطا لوگوں کے قتل کی کسی بھی، کبھی بھی، کسی بھی صورت میں اجازت نہیں دیتا ہے، لیکن اس کا ہم کیا کریں کہ اب کچھ لوگوں کو وہ ترکیب آگئی ہے کہ جس کے ذریعہ سے فسادات میں صرف اقلیت کا ہی نقصان نہیں ہوتا ہے بلکہ اکثریت کا بھی کیسے نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہ خطرناک طریقہ بھی اب اقلیت کو آگیا ہے۔ اور یہ وارننگ ہے بال ٹھاکرے کے لئے، اور ان کے ایسے افراد کے لئے کہ وہ ہوشیار ہو جائیں

آج میں بہت عرصہ کے بعد جے پور آیا تو جب ادھر جامعہ ہدایہ سے آرہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہاتھی پہ ہاتھی، ہاتھی پہ ہاتھی چلے جارہے ہیں تو میں نے پوچھا یہ کیسے ہاتھی جارہے ہیں تو معلوم ہوا کہ آمر کے قلعے جارہے ہیں۔ ہاتھی تو میں نے بارہ چودہ دیکھے مگر مجھے اس میں سے ایک بھی ایسا ہاتھی دکھائی نہیں دیا جو ہاتھی آدمی پر سوار ہو۔ بڑے بڑے ہاتھی تھے، بڑے خطرناک ہاتھی، بڑے قوی ہیکل ہاتھی مگر میں نے پھر دیکھا کہ اتنا سا آدمی اتنے بڑے ہاتھی پر بیٹھا ہے۔ تو یہ کیا بات ہے وہ تو بڑا ہے، وہ تو قوی ہے۔ تو آپ کہیے قوت ہاتھی کے پاس، طاقت اس کے پاس ہے وہ اتنا لمبا چوڑا، یہ انسان اتنا سا، مگر ہاتھی آدمی پر سوار نہیں ہو سکا۔ آدمی ہاتھی پر سوار ہوتا ہے اس لئے کہ ہاتھی کے پاس جسمانی قوت زیادہ ہوتی ہے مگر اصلی قوت جسم کی نہیں ہوتی ہے اصلی قوت عقل کی ہوتی ہے۔

مسلمانو!

اگر تم دنیا پہ غلبہ چاہتے ہو تو عقل اور علم کو حاصل کرو اللہ تم کو ساری دنیا میں غلبہ اور طاقت اور سرفرازی عطا کردے گا۔ و آخر دعوانا۔۔۔ ☆ ☆

ہدایت دسمبر ۱۹۹۳، فروری ۱۹۹۴ء

انوار علی خان سوز

مسلم اساسیت
(Muslim Fundamentalism)

فنڈامنٹلزم کی اصطلاح امریکہ سے مستعار لی گئی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ فنڈامنٹلزم یعنی اساسیت کی تحریک جنگ عظیم اول کے بعد شروع ہوئی ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ بائبل کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھا جائے اور بائبل کی کوئی نئی تعبیر نہ کی جائے۔ بائبل میں جن معجزات کا ذکر ہے انہیں حرف بحرف صحیح مانا جائے۔ مسیح کے بغیر باپ کی پیدائش اور ان کا آسمان پر جانا بھی بالکل صحیح تسلیم کیا جائے۔ اس تحریک کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ نظریہ ارتقاء کو غلط ثابت کیا جائے۔

مگر "اساسیت" کی تحریک کی ابتداء در حقیقت ۱۸۳۰ء سے شروع ہوئی تھی۔ یہ تحریک ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک کاشتکار ولیم ملر (WILLIAM MILLER) نے شروع کی تھی۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ۱۸۴۳ء میں مسیح دوبارہ تشریف لائیں گے اور "الف مبارک" شروع ہو جائے گا۔ اس کے پیروؤں کی تعداد ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک ہو گئی تھی، لیکن جب ۱۸۴۳ء ختم ہو گیا اور مسیح دوبارہ تشریف نہ لائے تو لوگوں کے دماغ میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ "الف مبارک" کے ماننے والوں کو "الفیین" (MILLENARIANS) کہنے لگے۔ مسیح کی آمد کے مخالفوں نے اس بات کو لے کر بائبل کی لفظی تشریح کے بجائے معنوی تشریح شروع کر دی۔

۱۸۳۵ء میں انگلینڈ میں بھی اس تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایونجلیکل چرچ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک کی وجہ سے امریکہ میں ولیم ملر کی اچھی خاصی شہرت ہو گئی، مگر جب مسیح دوبارہ تشریف نہ لائے تو ساری تحریک بے جان ہو کر رہ گئی اور انگلستان میں بھی لوگوں نے "الف مبارک" کی دوسری تشریح کرنی شروع کر دی۔

اس کے بعد ۱۸۷۰ء تک یہ تحریک بے جان ہی پڑی رہی، لیکن جب چرچ کو جدید خیالات سے خطرہ لاحق ہوا تو پادریوں نے ان خیالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ الفیین کی تحریک ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی، اس کے ماننے والوں نے مسیح کی دوبارہ آمد کے تخیل کو تو چھوڑ دیا تھا مگر وہ "الف مبارک" کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسیح ایک خاص وقت پر تشریف لائیں گے، اس لیے ہمیں مسیح کی آمد کی تیاری کرنی چاہیے اور عیسائیت کو جدید خیالات سے بچانا چاہیے۔ امریکہ میں

ایپس کوپلین (EPISCOPALIAN) اور پرس بی ٹیرین (PRESBYTERIAN) چرچ
نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک میں مختلف فرقوں کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس
تحریک کی طرف سے ایک رسالہ "سچائی" (TRUTH) کے نام سے نکلتا تھا۔ اس رسالہ کا ایڈیٹر جیمس
ایچ۔ برکس (JAMES H. BROOKS) (۱۸۳۰ء - ۱۸۹۷ء) "الف مبارک" کے ماننے
والے امریکہ کے بڑے شہروں میں کانفرنسیں کرتے تھے۔ نیاگرا میں ۱۸۹۹ء تک ان لوگوں کی
کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ نیویارک میں بھی ان لوگوں نے ایک کانفرنس کی۔

"الف مبارک" کے ماننے والے یہ کہتے تھے کہ عیسائی معاشرہ مسیح کے آنے کے بعد ہی ٹھیک
ہوگا، لیکن یہ کسی تاریخ کا تعین نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں کو "ماقبل الفیین" کہا جاتا تھا۔ کچھ لوگ
ایسے تھے جنہیں "مابعد الفیین" کہا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ امریکہ میں ہر طرح کی معاشی،
معاشرتی اور اخلاقی ترقی ہو رہی ہے، اور مسیح علیہ السلام اس وقت تشریف لائیں گے جب دنیا ان کی آمد کے
لیے تیار ہو چکی ہوگی، لیکن ملر کے حامی جنہیں "ماقبل الفیین" کہا جاتا ہے وہ اس سلسلے میں زیادہ پرامید
نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عیسائی سماج مسیح کے آنے کے بعد ہی سدھرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ
مسیح علیہ السلام انیسویں صدی کے آخر تک ضرور آجائیں گے۔ ملر کے حامی سمجھتے تھے کہ مسیح انہی کے زمانے
میں تشریف لے آئیں گے۔ ۱۸۷۰ء میں جو تحریک پیدا ہوئی، اس کے حامی بائبل کی نئی ترجمانی
کرتے تھے، مگر ۱۸۳۰ء میں جو تحریک پیدا ہوئی تھی، اس کے حامی بائبل کی نئی تعبیر کو ماننے سے
انکار کرتے تھے۔

بائبل پر سخت تنقید کی وجہ سے بہت سے عیسائی تقریباً کفر کی حد تک پہنچ گئے تھے مگر ملر کی
تحریک اب ابھر کر اوپر آنے لگی اور اسی کا نام "الف مبارک" کے ماننے والا ہو گیا۔ اسی کو الفیین کی
تحریک کہا جانے لگا۔ اسی زمانے میں "الف مبارک" کے ماننے والوں کو ایک عظیم شخصیت مل گئی
جس کا نام "ڈواٹ۔ ایل۔ موڈی" (DWIGHT L. MOODY) تھا۔ یہ شخص ۱۸۹۹ء تک زندہ
رہا۔ "الف مبارک" کے ماننے والے عیسائی مبلغوں کو جو دوسرے ممالک میں کام کرتے تھے امداد بھی
دیتے تھے، ان لوگوں نے پرنسٹن میں ایک دارالعلوم بھی کھولا جس میں بائبل کی لفظی تشریح پر پورا زور
دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے یونیورسٹی کے پروفیسروں کو تبادلۂ خیالات کے لیے بلایا۔

"الف مبارک" کے ماننے والوں نے قدامت پسندوں اور ایونجلیکل پروٹسٹنٹس
(EVANGELICAL PROTESTANTS) کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ان لوگوں نے
۱۹۰۹ء میں بارہ کتابچے چھپوائے۔ ان کتابچوں کا نام "اساسیات" (FUNDAMENTALS)
تھا۔ ان بارہ رسائل میں بائبل پر تنقید کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ ان رسائل میں بائبل کی جدید
ترجمانی کو غلط ثابت کیا گیا تھا۔ جو دلائل بائبل کی لفظی تشریح کے حق میں پرنسٹن کے دارالعلوم میں

جمع کیے گئے تھے۔ ان کی رو سے نئی تعبیر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ بارہ رسالے ڈھائی لاکھ کی تعداد میں مفت تقسیم کیے گئے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء تک چلتا رہا۔

جیمس ایچ۔ بروکس اس تحریک کو کافی عرصہ تک سنبھالے رہا، مگر ۱۸۹۷ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ ۱۹۱۲ء تک نیاگرا کانفرنس کے سارے حامی مر گئے۔ ان سارے رہنماؤں کے بعد "الف مبارک" کے ماننے والوں میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ الفیین دو حصوں میں بٹ گئے۔ دونوں کی طرف سے دو رسالے نکلنے لگے۔ ایک کا نام "واچ ورڈ اینڈ ٹرتھ" (WATCHWORD & TRUTH) تھا اور دوسرے کا نام "ہماری امید" (OUR HOPE) تھا۔ ان دونوں رسالوں میں ایک دوسرے کے عقائد پر تنقید کی جاتی تھی اور اپنے عقائد کو صحیح ثابت کیا جاتا تھا۔

جنگ عظیم اول کے بعد امریکہ میں سخت اخلاقی انحطاط رونما ہونے لگا۔ "الف مبارک" کے ماننے والے اس اخلاقی زوال سے سخت پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس اخلاقی زوال کو روکا جائے۔ انہوں نے امریکہ کے مختلف شہروں مثلاً نیویارک، فلاڈلفیا وغیرہ میں بہت سی کانفرنسیں کیں۔ ان کانفرنسوں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ چنانچہ الفیین (MILLENARIANS) نے اپنا نام بدل کر "عالمی عیسائی اساسیات تنظیم" (WORLD'S CHRISTIAN FUNDAMENTAL ASSOCIATION) رکھا لیا۔ الفیین (MILLENARIANS) کو اساسیین (FUNDAMENTALISTS) کہا جانے لگا۔

اساسیین نظریۂ ارتقاء کے سخت مخالف تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ نظریۂ ارتقاء کو پبلک اسکولوں میں نہیں پڑھانا چاہیے۔ ٹینیسی نے ایک قانون اس سلسلے میں پاس کر دیا مگر اس قانون کو عدالت میں چیلنج کیا گیا۔ امریکہ کے مختلف شہروں میں اس قسم کے جلسے کیے گئے مگر ان جلسوں میں زیادہ لوگ شریک نہ ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۸ء تک چلتا رہا

جنگ عظیم اول کے بعد اخلاقی زوال کے ساتھ کمیونزم کا خطرہ بھی بڑھ رہا تھا۔ لوگ بائبل کی نئی تعبیر کو اختیار کر رہے تھے۔ اساسیین ایک طرح سے محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ ایپس کوپل، پریس بی ٹیرین، بپٹسٹ اور میتھوڈسٹ چرچ کے لوگ ان نئی تعبیروں کو ماننے لگے۔ ہنری ایمرسن فوس ڈک (HENRY EMERSON FOSDUK) جدید تعبیر کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ فوس ڈک نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا کہ "کیا اساسیین کی فتح ہوگی؟" ہنری ایمرسن فوس ڈک بپٹسٹ چرچ سے تعلق رکھتا تھا۔ "الف مبارک" کے ماننے والوں نے اسے چرچ سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس میں پندرہ ممبر شامل تھے۔ کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ بپٹسٹ چرچ میں اختلاف آراء کو برداشت کیا جانا چاہیے۔ بہرحال ہنری ایمرسن فوس ڈک کو چرچ سے باہر نہیں نکالا گیا۔ اس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ اساسیین (FUNDAMENTALISTS) کو فتح حاصل نہ ہو سکی۔

اساسیین کے چند اصول یہ تھے۔ اوّل بائبل کو صرف کلام الٰہی سمجھا جائے۔ ثانیاً یہ مانا جائے کہ مسیح کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ثالثاً کفارہ مسیح کا عقیدہ حرف بحرف تسلیم کیا جائے۔ رابعاً از سر نو پیدائش اور معجزاتِ مسیح کو مکمل طور پر تسلیم کیا جائے۔

اساسیین کے اختلافات تقریباً ۱۹۲۰ء تک ختم ہو چکے تھے مگر ان کا استدلال ختم نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں اساسیین کے نظریات نے پھر زور پکڑنا شروع کر دیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک اساسیین عوام میں زیادہ مشہور نہیں رہے۔ اس دوران میں اکثر اساسیت پسندوں نے ایک نیا فرقہ بنا لیا۔ یہ فرقہ بہت چھوٹا تھا۔ اس فرقہ میں ہر فرقہ کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اساسیت پسندوں کا یہ طبقہ اپنے پرانے عقیدوں پر جما رہا۔

جنگِ عظیم ثانی کے بعد اساسیین میں خوشحالی پھیل گئی۔ ان لوگوں نے صنعتی ترقی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو قبول کر لیا۔ انہوں نے اپنے عقائد کو پھیلانے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی وژن کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اسی دور میں بلی گراہم (BILLY GRAHAM) اساسیین کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ بلی گراہم نے سائنس کی مخالفت بند کر دی۔ اس نے کہا کہ اگر امریکہ نے اپنے اخلاقی زوال کو نہ روکا اور دولت کو غلط طریقے پر استعمال کیا تو امریکہ کو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دولت کی فراوانی کے ساتھ امریکہ میں جرائم کی رفتار بھی بڑھنے لگی۔ گھریلو زندگی میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہونے لگے۔ اب اساسیین کا مقصد ان جرائم کو روکنا اور خاندانی روایات کو برقرار رکھنا قرار پایا۔

جس طرح جنگِ عظیم اوّل سے پہلے نظریۂ ارتقاء کی مخالفت کی گئی تھی، اسی طرح جنگِ عظیم ثانی کے بعد کمیونزم کی مخالفت شروع ہوئی۔ اساسیین یہ سمجھتے تھے کہ اب عیسائیت کو کمیونزم سے خطرہ ہے، لہٰذا اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس وقت اساسیین کا نمائندہ رسالہ "آج کا عیسائی" (CHRISTIAN TODAY) تھا۔

اساسیین نہ شراب پیتے ہیں، نہ سگریٹ نوشی کرتے ہیں اور نہ رقص میں حصہ لیتے ہیں۔ بعض لوگ ان میں سے فلمیں بھی نہیں دیکھتے۔ اکثر اساسیین ۱۸۱۷ء میں جو کانفرنس نیاگرا میں ہوئی تھی، اسی کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور انہیں عقائد کو مانتے ہیں۔ مثلاً بائبل وحیِ الٰہی ہے۔ بائبل کے الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ تثلیث کا عقیدہ، انسانی کمزوری اور نجات کے لیے دوسری پیدائش، کفارہ مسیح، مسیح پر ایمان لانے والوں کے لیے نجات کی بشارت اور مسیح کی دوبارہ آمد۔

اس حد تک میں نے مسیحی اساسیین کے نظریہ کی تشریح کی ہے اور ان کی پوری تاریخ بھی

بیان کر دی ہے۔ ۱۸۴۰ء کے آس پاس مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جو مہدی اور مسیح کی آمد کے منتظر تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح مہدی کے بغیر ناممکن ہے، اور مہدی کے بعد مسیح کا آنا بھی ضروری ہے۔

سوڈان میں محمد احمد (۱۸۴۳ء تا ۱۸۸۵ء) نے مہدویت کا دعویٰ کیا۔ مہدی سوڈانی نے بہت سی فتوحات حاصل کیں مگر ۱۸۸۵ء میں مہدی سوڈانی کا انتقال ہو گیا۔

برصغیر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۸۳۹ء تا ۱۹۰۸ء میں مہدی و مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ مرزا صاحب کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح مہدی کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مہدی کے بعد مسیح کا آنا بھی ضروری ہے تو انھوں نے مسیح ہونے کا بھی دعویٰ کیا، چونکہ مسیح علیہ السلام نبی تھے اس لیے انھوں نے نبوت کا بھی دعویٰ کیا۔ مسلمانوں نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے وہ ایک فرقہ بن کر رہ گئے۔ جس طرح ۱۹۱۴ء میں اساسیین دو فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ اسی طرح غلام احمد قادیانی کے انتقال کے بعد تقریباً ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ احمدی بھی دو فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک فرقہ قادیانی تھا دوسرا لاہوری۔

مرزا غلام احمد قادیانی گو خود کو نبی قرار دیتے تھے جو سراسر کفر تھا لیکن وہ بنیادی طور پر قرآن میں کسی ردوبدل کے قائل نہیں تھے۔ قرآن کو وحی الٰہی مانتے تھے اور معجزات کو بھی تسلیم کرتے تھے۔

ایران میں ۱۸۴۴ء میں مرزا علی محمد باب (۱۸۱۹ء تا ۱۸۵۰ء) نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ عیسائی اور مسلمان سب ایک عہد مبارک کا انتظار کر رہے تھے اس لیے مہدویت کے دعویٰ داروں کو بہت سے پیروکار مل گئے۔ باب کا انتقال ۱۸۵۰ء میں ہوا اور اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں بابی تحریک دو حصوں میں بٹ گئی اور مرزا حسین علی نے یہ دعویٰ کیا کہ جس موعود شخصیت کا باب نے دعویٰ کیا تھا، وہ میں ہوں۔ وہ خود کو اللہ کا مظہر کہتا تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید بہاء اللہ کے بعد کوئی مبارک دور شروع ہو جائے گا، لہٰذا بہاء اللہ کو بھی بہت سے پیروکار مل گئے۔ لیکن نہ تو مہدی سوڈانی کے بعد، نہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بعد، نہ باب اور بہاء اللہ کے بعد کوئی مبارک دور شروع ہوا۔ مسلمانوں میں جن لوگوں پر اساسیین کا اطلاق ہو سکتا ہے تو وہ یہی چند فرقے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سارے شیعہ اور سنی راسخ العقیدہ مسلمان ہمیشہ ان فرقوں کے مخالف رہے ہیں۔

لفظ اساسیین کا اطلاق آج کل بعض مسلمان جماعتوں پر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جماعتِ اسلامی، اخوان المسلمون، ایرانی انقلاب کے حامی وغیرہ۔ اگر اس لفظ کو اساسیاتِ دین کے معنی میں لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ کوئی لبرل سے لبرل مسلمان بھی اپنے آپ کو اساسیاتِ دین کا منکر نہ قرار دے گا اور اگر کوئی مسلمان اساسیاتِ دین ہی سے انکار کر بیٹھے تو غالباً انتہائی آزاد خیال مسلمان بھی اسے مسلم

قوم کا فرد ماننے کے باوجود اس کی تحریروں کو کوئی وزن نہ دے گا۔

مسیحیوں نے "اساسیات" (FUNDAMENTALS) کے نام سے کچھ رسالے شائع کیے تھے جن کی وجہ سے انھیں اساسیین (FUNDAMENTALISTS) کہا جانے لگا۔ ان رسائل میں مسیحیت کے بنیادی عقائد بیان کیے گئے تھے اور ان کی تعبیر کو غلط ثابت کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ہر مسیحی جو ان رسائل سے متفق تھا اسے FUNDAMENTALIST کہا جا سکتا ہے، مگر [اسلامی] دُنیا میں اُن لوگوں کو اساسیت پسند کہا جا سکتا ہے جو انیسویں صدی میں مہدی اور مسیح کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین میں جن چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے، انھیں دین سے خارج کر دیا جائے اور اسلام کو اس کی اصل بنیادوں پر قائم کیا جائے، مگر اس سلسلے میں بھی مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ بعض ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو دین میں اضافے کو صحیح سمجھتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کو راسخ العقیدہ شمار کیا جاتا ہے۔ اہل قرآن کے نام سے ایک گروہ مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ جو باتیں صرف قرآن میں پائی جاتی ہیں، انھیں پر دین کی عمارت استوار ہونی چاہیے، مگر [ا]س گروہ کو دین سے منحرف قرار دیا جاتا ہے۔

آج بھی جتنے متجدد مسلمان اصلاح کے مدعی ہیں وہ محض قرآنی بنیادوں پر دین کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں جو احادیث جمع کی گئی ہیں، ائمہ فقہ و حدیث نے ان کی جو تشریحات کی ہیں، ان کی طرف وہ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ وہ محض ابتدائی اسلام کی طرف مراجعت کرنا چاہتے ہیں مگر یہ لوگ آزاد خیال سمجھے جاتے ہیں لہٰذا آزاد خیال لوگوں کو فنڈامنٹلسٹ قرار دیا جانا چاہیے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین کی لفظی تشریح کرنے والوں کو اساسیت پسند کہا جانا چاہیے مگر اس گروہ میں نہ جماعت اسلامی آتی ہے اور نہ اخوان المسلمون اور نہ ایرانی انقلاب کے حامی۔

امام خمینی نے امام مہدی کے عدم ظہور کے باوجود اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے "حکومتِ اسلامی" نام کی ایک کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ پرانا شیعی نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی نظام اور دور میں بھی قائم کیا جا سکتا ہے، لہٰذا امام خمینی کے حامیوں کو فنڈامنٹلسٹ نہیں کہا جا سکتا۔

جماعتِ اسلامی کی بنیاد مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے ڈالی تھی۔ جو لوگ راسخ العقیدہ سمجھے جاتے ہیں انھوں نے مولانا مودودی کی بعض تحریرات پر اعتراضات کیے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان اعتراضات میں کوئی وزن ہے یا نہیں، ان اعتراضات کے پیش نظر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعت

اسلامی کو فنڈامنٹلسٹ کس طرح قرار دیا جاتا ہے۔ مولانا مودودی نے سبع سموات کی نئی تعبیر کی ہے، حالانکہ پرانے علماء سات آسمانوں کو ٹھوس مادہ سے بنے ہوئے تعبیر کرتے تھے۔ عرش کی تعبیر مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ نے اقتدار سے کی ہے حالانکہ پرانے علماء اس کی یہ تعبیر نہ کرتے تھے۔

الاخوان المسلمون کی بنیاد حسن البنا نے ڈالی تھی۔ مگر اس زمانے میں حسن البنا صرف دینی اصلاح کے کام کر رہے تھے اور الاخوان المسلمون بھی صرف مسلمانوں کی اصلاح کے کام میں مصروف رہی۔ ایک وقت آیا کہ کرنل ناصر الاخوان المسلمون کے ساتھ مل کر انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے۔ اس دور میں کرنل ناصر اور الاخوان المسلمون ایک ہی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ لہٰذا کرنل ناصر کو بھی فنڈامنٹلسٹ کہا جانا چاہیے۔ انقلاب کے بعد الاخوان المسلمون کے سب سے بڑے مفکر سید قطب تھے اور سید قطب مولانا مودودی کی فکر سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے قدیم علماء کی روش سے ہٹ کر اسلام کی ایک نئی تعبیر کی۔ اپنی کتاب "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" میں انھوں نے کہا ہے کہ ابو بکرؓ نے لوگوں میں مالِ غنیمت کو مساوی طور پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا ان کے زمانے تک معاشی مساوات باقی رہی مگر حضرت عمرؓ نے پہلے اسلام لانے والوں کو زیادہ حصہ دیا اور بعد میں اسلام لانے والوں کو کم حصہ دیا، اس کی وجہ سے معاشی عدم مساوات پیدا ہو گئی۔ سید قطب نے لفظی تشریح پر اکتفاء نہ کیا، اس لیے الاخوان المسلمون کو بھی فنڈامنٹلسٹ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو لوگ مذہب پر نہایت سختی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں، انھیں فنڈامنٹلسٹ کہا جانا چاہیے۔ دین پر سختی کے ساتھ جمے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ پرانی روایات پر سختی کے ساتھ جما رہنا چاہیے۔ حالانکہ اس دور کی جن جماعتوں کو فنڈامنٹلسٹ کہا جاتا ہے وہ سب علامہ اقبال، محمد عبدہ، ڈاکٹر علی شریعتی اور جمال الدین افغانی کے نظریات پر بڑی شدت کے ساتھ جمی ہوئی ہیں۔ کیا ان سب کو فنڈامنٹلسٹ کہا جائے گا۔ علامہ اقبال، علی شریعتی، محمد عبدہ نے دین کی نئی تعبیر پیش کی ہے۔ سید قطب پرانے لباس کو چھوڑ کر جدید لباس پہنتے تھے۔ ڈاکٹر علی شریعتی بھی جدید لباس پہنتے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی جدید لباس پہنتے ہیں۔ ان میں جماعت کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان بھی ہیں۔ سید قطب اور امام خمینی عورت کے چہرے کو چھپانا ضروری نہیں سمجھتے اور جماعتِ اسلامی میں بعض ارکان کا بھی یہی خیال ہے۔ الاخوان المسلمون کے نزدیک داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے۔ سید قطب داڑھی نہیں رکھتے تھے۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا کہ داڑھی کی کوئی مقدار نہیں ہے۔ یہ غالباً ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔ اس پر راسخ العقیدہ علماء نے سخت اعتراضات کیے تھے۔ امام خمینی نے علی رجائی کو وزیر اعظم بنایا تھا اور وہ بھی جدید لباس پہنتے تھے۔

اگر روایت پرست مسلمانوں کو فنڈامینٹلسٹ کہا جائے تو یہ مسلمان اس دور میں انقلاب کے علمبردار نہیں ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں میں روایت کے ماننے والے دو گروپ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروپ دیو بندی ہے اور دوسرا بریلوی مگر دونوں گروپ اپنے عقائد میں اختلاف کے باوجود جماعتِ اسلامی اور الاخوان المسلمون دونوں کی مخالفت میں متحد ہیں اور ایرانی انقلاب کے بھی عام طور پر حامی نہیں ہیں۔ خود وہابی مسلمان جن کی حکومت سعودی عرب میں ہے، وہ بھی ایرانی انقلاب کے ہم نوا نہیں ہیں۔ جماعتِ اسلامی ملوکیت کو غلط سمجھتی ہے اس لیے وہ سعودی حکومت کو اسلامی حکومت نہیں بتاتی۔ روایت پرست شیعہ عام طور پر امام خمینی کے مخالف ہیں۔ عام طور پر روایت کے ماننے والے علما اپنی حکومتوں کے وفادار ہیں۔

آج جو لوگ مسلم فنڈامینٹلزم کی اصطلاح سے نہایت خوف زدہ ہیں، ان کے خوف کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ جن تحریکوں کو اسلامی فنڈامینٹلسٹ تحریک کہا جاتا ہے۔ ان تحریکوں میں مسلم قوم کے دانشور پائے جاتے ہیں جو اسلام کے اوپر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔ وہ خلافت راشدہ کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کو اس دور میں نافذ کرنا چاہتے ہیں، مگر خلافت راشدہ کے طریقۂ انتخاب کو اس دور میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ امام خمینی نے ایران میں باقاعدہ جمہوریت قائم کی ہے جس میں ممبرانِ پارلیمنٹ کا باقاعدہ انتخاب ہوتا ہے۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی ایک نیا سماجی، سیاسی اور معاشی نظام قائم کرنا چاہتے تھے، مگر یہ نظام اس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے روبہ عمل لایا جائے گا۔

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ اسلامی نظام کس طرح وجود میں آسکتا ہے تو مولانا نے جواب دیا تھا کہ صرف جمہوری ذرائع سے۔۔۔

الاخوان المسلمون شام میں جمہوریت کی بحالی کے لیے کوشش کر رہی ہے، حالانکہ حافظ الاسد خود کو جمہوریت کا حامی بتاتے ہیں۔ مصر میں الاخوان المسلمون جمہوریت کی بحالی کے لیے پریشان ہے کیونکہ مصری حکمران خود کو جمہوریت کا حامی بتاتے ہیں۔ سعودی عرب میں کیونکہ ملوکیت ہے اور الاخوان کی تعداد بہت کم ہے اس لیے وہ کھل کر سامنے نہیں آتے ہیں۔ مصر اور شام ہی میں الاخوان کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ اگر یہ پارٹیاں برسر اقتدار آگئیں تو ان دونوں ممالک میں جمہوریت قائم ہو جائے گی مگر چونکہ عوام الناس اسلام پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں اس لیے جمہوریت کی اسلامی شکل قائم کی جائے گی۔

ان جماعتوں میں مسلم دانشوروں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ لہٰذا لبرل مسلمانوں کو ان جماعتوں کی تائید کرنی چاہیے۔ کیونکہ ان جماعتوں کو عوام اچھا سمجھتے ہیں یا کم از کم انھیں برا نہیں خیال کرتے۔ انھی جماعتوں کی وجہ سے اسلام کی ایک نئی تعبیر وجود میں آسکتی ہے۔ ان میں سے بیشتر جماعتوں کے سربراہ اور دانشور اپنا شجرۂ نسب علامہ اقبال، محمد عبدہ، ڈاکٹر شریعتی اور جمال الدین افغانی سے جوڑتے

ہیں۔

مسیحی اساسیین نظریۂ ارتقاء کو غلط سمجھتے تھے انہوں نے ٹینیسی میں اس کے خلاف ایک قانون بھی بنوا دیا تھا۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ نے بھی نظریۂ ارتقاء کو غلط ثابت کیا ہے، مگر علامہ اقبال نظریۂ ارتقاء کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ اقبال کو نہایت عظیم اسلامی مفکر بھی مانتے ہیں۔ جماعت اسلامی میں بعض لوگ نظریۂ ارتقاء کو صحیح سمجھتے ہیں اور بعض لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں۔ اگر سعودی عرب یا کسی دوسرے ملک میں نظریۂ ارتقاء نہیں پڑھایا جاتا تو ان ممالک میں الاخوان یا جماعت اسلامی کی حکومت نہیں ہے۔

یہ ساری جماعتیں کمیونزم کی مخالف ہیں، مگر یہ کمیونزم کے لادینی فلسفہ کی مخالف ہیں جس میں مادہ ہی اصل شئے ہے اور خدا کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ مگر قومی ملکیت کو ماننے والے ان جماعتوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال زمین کو اللہ کی ملکیت قرار دیتے ہیں نہ کہ انسان کی۔ ان جماعتوں نے کبھی نظریۂ ارتقاء کو اپنا موضوع بحث نہیں بنایا۔ جس طرح مسیحی اساسیین کے لیے نظریۂ ارتقاء کی مخالفت ہی ایک نکتۂ اتحاد بن گئی تھی، اسی طرح کمیونزم کے معاشی نظام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کمیونزم کے خلاف جو نکتۂ اتحاد ہے وہ کارل مارکس کی خدا بیزاری ہے۔

اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ الاخوان المسلمون، جماعت اسلامی اور ایرانی انقلاب کے حامیوں کو کسی معنی میں بھی فنڈامنٹلسٹ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

(بہ شکریہ سہ ماہی "تحقیقات اسلامی" علی گڑھ)

(عالم اسلام اور عیسائیت، اگست ۹۳ء)

احمد ظفر

○

ایسا ہونا تھا، ایسا ہوتا ہے
محفل میں بھی دل تنہا ہوتا ہے

اپنے آپ میں جو کھویا ہوتا ہے
شہر میں اس کا ہی چرچا ہوتا ہے

اتنا دنیا سے پیچھے رہتا ہوں
جتنا دنیا کو سوچا ہوتا ہے

منظر دُھلتا ہے اتنا بارش سے
جتنا پت جھڑ میں میلا ہوتا ہے

اس سے آگے بھی ہے اک دنیا سی
جتنا انساں نے سمجھا ہوتا ہے

پھول کی پتی پر شبنم جمتا ہے
سات کو تارا جو ٹوٹا ہوتا ہے

صبح حسینہ باغ میں جب آتی ہے
چہرہ شبنم سے دھویا ہوتا ہے

ذہن نہ سوتے تو پھر آنکھ نہیں لگتی
جس کو سونا ہے سویا ہوتا ہے

(فنون جولائی۔دسمبر ۱۲ء)

احمد ندیم قاسمی

○

دستک یہ کمال کر گئی تھی
اک پل میں صدی گزر گئی تھی

پھر نُور کا اک وفور سا تھا
اس تک تو مری نظر گئی تھی

کس دل سے اُسے وداع کرتا
آنکھوں میں تو ریت بھر گئی تھی

میں بڑھ نہ سکا اُفق سے آگے
ہاں، گردِ سفر بکھر گئی تھی

دن کی بھی پُکار پر نہ نکلی
وہ رات جو میرے گھر گئی تھی

سینے پہ پہاڑ بن کے اُتری
فریاد، جو بے اثر گئی تھی!

○

ہوا نے گھر کا دروازہ بجایا
میں حیراں تھا، مرے ہاں کون آیا

مجھے اپنا بنایا صرف اُس نے
جو تھا دنیا کی نظروں میں پرایا

جب اپنا عشق پہنچا انتہا تک
تو ہر انساں کو سینے سے لگایا

مَیں سرگرداں ہوں اپنی جستجو میں
مجھے کوئی اشارہ دے، خدایا!

صدا سے روشنی منزل ہے میری
سدا پیچھے رہا ہے میرا سایا

ندیمؔ اِس عہد کا یہ المیہ ہے
موحّد نے خدا کو بُت بنایا

(فنون، جولائی، دسمبر ۸۳ء)

فنون لاہور

افتخار عارف

○

انہیں میں جیتے، انہیں بستیوں میں مر رہتے
یہ چاہتے تھے مگر کس کے نام پر رہتے

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

پرندے جاتے نہ جاتے پلٹ کے گھر اپنے
پر اپنے ہم شجروں سے تو باخبر رہتے

بس ایک خاک کا احسان ہے کہ خیر سے ہیں
وگرنہ صورتِ خاشاک دربدر رہتے

مرے کریم! جو تیری رضا، مگر اس بار
برس گزر گئے شاخوں کو بے ثمر رہتے

○

قلم جب درہم و دینار میں تولے گئے تھے
کہاں تک دل کی چنگاری! ترے شعلے کیے تھے

فصیلِ شہرِ دربستہ گواہی دے کہ کچھ لوگ
دہانِ حلقۂ زنجیر سے بولے گئے تھے

تمام آزاد آوازوں کے چہرے گرد ہو جائیں
فضاؤں میں کچھ ایسے زہر بھی گھولے گئے تھے

فسادِ خون سے سارا بدن تھا زخم ہی زخم
سو نشتر سے نہیں، شمشیر سے کھولے گئے تھے

وہ خاکِ پاک ہم اہلِ محبت کو ہے اکسیر
سرِ مقتل جہاں نیزوں پہ سر تولے گئے تھے

(فنون، جولائی۔ دسمبر ۹۳ء)

بیدل حیدری

○

ہر چند کہ زخمی ہوں مگر ڈر نہیں لگتا
پتھر بھی اب اُس ہاتھ میں پتھر نہیں لگتا

اب میرا مکاں اونچے مکانوں میں گھرا ہے
اب دھوپ کا بازار مرے گھر نہیں لگتا

دریا میں اُترنے سے مجھے روکنے والو!
پیاسے کو سمندر بھی سمندر نہیں لگتا

فٹ پاتھ پہ سونے کی نہیں جب سے اجازت
شہروں میں کوئی شخص بھی بے گھر نہیں لگتا

بیدلؔ مجھے جس شخص نے برباد کیا ہے
وہ سادہ ہے ایسا کہ ستمگر نہیں لگتا

(فنون، جولائی۔ دسمبر ۹۳ء)

تنویر سپرا

تنویر سپرا کے "لفظ کھردرے"

اُردو کے نامور شاعر تنویر سپرا کا یہ مجموعہ کلام پہلی بار ۱۹۸۰ء میں چھپا، اب اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۲ء میں نکلا ہے۔

مضمون خشک، تلخ زبان، لفظ کھردرے
نازک سماعتوں پہ مرے شعر بار ہیں

مسافت میں نہیں حاجت اسے چھتنار پیڑوں کی
بیاباں کی دہکتی گود میں جو شخص پلتا ہے

اس بار جنوں مصلحت آثار نہیں ہے
یا سر نہیں یا جبر کی دیوار نہیں ہے

اے تنویر سپرا کاٹ پھینکو اپنے شانوں سے
جو ہر چوکھٹ پہ جھک جائے وہ سر اچھا نہیں ہوتا

لہو کی وردیاں تنویر سپرا پہننی ہوں گی
اگر شہرِ شرافت کو بچانا ہے رذیلوں سے

یہ لفظ ہیں لفظوں سے کہیں بھوک مٹی ہے
منشور کی سوغات نہیں چاہیے مجھ کو
مخلص ہو تو تقسیم کرو زر کو ابھی سے
وعدوں کی سیہ رات نہیں چاہیے مجھ کو
جو صرف چھلکتے ہوئے دریاؤں پہ برسے
تنویر وہ برسات نہیں چاہیے مجھ کو

آج بھی سپرا اس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے
میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں

سپر بلیک میں ملیں تو خرید لا
دو چار قہقہے لبِ رنجور کے لیے

: (فنون جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۳ء)

●●

عبداللہ جاوید

دُعا

داتا
جو دینا ہے
وہ دے دیتا
تو میں یہ کرتا نہ ہی وہ کرتا

مرے ہاتھ
سدا کے سوالی تھے
ترے دستِ عطا کب خالی تھے؟

مجھے بھیک کی پل پل جلدی تھی
تری جانب سے پابندی تھی
مری پستی، تیری بلندی تھی
یا تیری سب نیرنگی تھی — داتا

جو اُوامر تھے
میں ان سے بچا
میں نواہی سے ہر دم لپٹا
اس حکم عدولی سے آقا

مرا تن من سارا داغ ہُوا
تونے پھر بھی اتنا کرم کیا
مرے سامنے آئینہ رکھا
جب عکس نے منہ پر تھوک دیا
تب مجھ پر میرا حال کھُلا — داتا

یہ بھی تیری عطا ہے، تیری عطا
مرے چہرے کا اک اک دھبّا
ابھی خلق کی آنکھوں سے ہے چھُپا

مرے شانے آج بھی سیدھے ہیں
اور سر اونچا کا اونچا ہے
مری ٹوپی آج بھی ٹیڑھی ہے
اور پُھندنا بھی لہراتا ہے

یہ جو خلقت مجھ پہ نہیں ہنستی
کوئی مجھ پر طعنہ نہیں کستی
نہیں کھُلتی ان پہ مری پستی
یہ بھی تیری عطا ہے تیری عطا — داتا

لے میں اندر سے شرماتا ہوں
پھر تیرے در پر آتا ہوں
مجھ بھیک کی جلدی والے پر
اس اندر سے منہ کالے پر
رحمت کر دے

نہ ہی دنیا اور نہ ہی عقبیٰ!
تری خوشنودی اور تیری رضا
یہی میری طلب ہے، میری دُعا — داتا

(فنون، جولائی ـ دسمبر ۹۳ء)

خالد احمد

تعارف: محمد حنیف

خالد احمد کا ندیم صاحب اور "فنون" سے تعلق لازم و ملزوم ہے۔ لاہور سے تبادلے کی وجہ سے دفتر "فنون" میں حاضری ، "فنون" میں شرکت پہلے کی طرح نہیں رہی۔ تاہم اس عرصہ میں کچھ غزلیں اور دو یادگار نظمیں "فنون" میں چھپیں۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" "ریحان بابا کے لئے"۔ یہ نظمیں پڑھ کر فکر کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ "ہتھیلیوں پہ چراغ" "تشبیب" اور نئی کتاب "پہلی صدا پرندے کی" غزلوں اور نظموں میں خالد احمد اپنے عہد کے بڑے فن کاروں میں سے ایک نظر آتا ہے۔ خالد احمد تنقید نگار بھی ہے جو "فنون" میں اہم موضوعات پر کے نام سے شذرے تحریر کرتا رہا ہے لیکن خالد احمد مشہور بطور شاعر ہوا۔ "تشبیب" کے بعد "ہتھیلیوں پہ چراغ" شاعری کی دوسری کتاب ہے: جس میں حمد، نعت، قصیدہ، غزل، نظم سب کچھ ہے اور ہر صنعت اپنی جگہ اعلیٰ معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ خالد احمد نے کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے۔ "میری شاعری لہو میں رت جگانے کے لئے ہے۔ میرا قاری میرا دمساز ہے۔ میرا قاری میرا دل ہے۔ میں دلوں پر لکھتا ہوں" ——— "ہتھیلیوں پہ چراغ" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے جہت فکر کے ہاتھوں میں کماں کیوں دی تھی
اب جہت تُو ہے تو کیا، تیر تو چل جانا تھا

ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے
تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

چُپ کا زہر پی لینا، غم کے ہونٹ سی لینا
مصلحت نہیں یارو، بات بے حسی کی ہے

پھولوں میں رنگ اور نشوں میں نشہ نہ تھا
جب تک ترا جمال لہو میں رچا نہ تھا

پلکوں کی ہتھیلیوں پہ خالد
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

ہر قدم جاری تھی نادیدہ سہاروں کی تلاش
ہر قدم منت کشِ اغیار ہونا تھا، ہوتے

بے حس کسی خنکی سے پگھلتے نہیں خالد
اے ماں ترے بیٹے ترے اشکوں پہ کھڑے ہیں

"تشبیب" خالد احمد کی پہلی کتاب ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور عقیدت کا اظہار ہے۔ انتہائی چھوٹی بحر میں احساسات کا اظہار اس قادر الکلامی سے ہوا ہے کہ پڑھنے والا بھی جذب و مستی کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اس قصیدہ میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دوستوں کے لئے بھی دعا گو ہے۔ مختصر بحر میں کیا خوبصورت اندازِ بیان ہے:

آپ ہیں گرفتہ آں

آپ کا ورثہ ہیں
فاطمہ کے دو لال
آپ کا ترکہ ہے
ترکِ مال و منال
سیزدہ دہر اثاث
نیند ہو جس پہ محال
آدھی نانِ جویں
پانی ایک پیالہ
فاقے یوں کاٹے
فاقے دیئے اُجال

جامعہ عثمانیہ دکن کے سابق پرنسپل حافظ سید محمد نعمان صاحب لکھتے ہیں:

"مجھے اس کی تشبیب "۔ میں حضرت کعب بن زبیرؓ، امام بوصیریؒ، نظامی، جامی اور محسن کی قصیدہ گوئی کی تمام رعنائیاں بھی نظر آتی ہیں اور اس روایت کے تنتے امکان بھی عجم کے حسنِ طبیعت نے عرب کے سوز دروں سے ہم آہنگ ہو کر وہ رنگ دکھاتے ہیں کہ دل سے بے اختیار ماشاءاللہ کی صدا نکلتی ہے۔ عربی اور ہندی روایاتِ شعر کے دل نشیں امتزاج، تمام مشرقی زبانوں سے فراخدلانہ استفادے۔ ممدوح کی بصیرت اظہار کی ندرت۔ نظر کی وسعت اور عقیدت و محبت کی رنگارنگی کی بدولت اُردو قصیدہ اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ گیا ہے"

"لمحہ تیار ہے" ایک اعلیٰ درجہ کی نظم ہے جس میں خالد احمد کا ذاتی دکھ ماں کی رحلت کا دکھ۔ آفاقی دکھ بن گیا ہے۔

مری بہنو!
مرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
مرے حصے کے آنسو بھی، تمہارے نام نکلے ہیں
مری بہنو!
اسی انداز سے روؤ، مگر کچھ زور سے روؤ
کہ اس ماتم کی آوازیں، مرے پتھرائے کانوں کو
نہ جانے کیوں بھلی معلوم دیتی ہیں
کوئی بتلائے، اس سینہ زنی۔ اس سینہ کوبی سے
مجھے کس نوع کی تسکین ملتی ہے
مرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے

لمحہ تیار ہے لیکن، ابھی کچھ دیر میرے گھر میں
بوڑھی برکتوں کا ابر رہنے دو
لمحہ تیار ہے، بیٹوں کی آنکھیں خشک ہیں، لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غمگسار اپنے بہت سے کام ادھورے چھوڑ آئے ہیں
تمہی سوچو! جنازے کون تنہا کے قبرستان پہنچا ہے
مری بہنو!

تم اپنے سر، مرے سینے سے ٹکراؤ
کہ اس سینے میں بھی دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
مرے آقا!

مری ماں نے اذانوں کے جلو میں مجھ کو چھوڑا ہے
مرے آقا!

مری ماں مغربوں کے پالنے والے کا شفقت ریز سایہ تھی
مرے آقا!

یہ بوڑھی ہڈیاں، اولاد کی چاہت کی چکی میں بڑی محنت سے پس کر بھربھری ٹھہریں
مرے آقا!

یہ بوڑھی انگلیاں راتوں کو سپنے کاڑھتی تھیں
تاکہ دن نکلے تو ان کے رنگ میرے روپ میں تعبیر ہو پائیں
مرے آقا!

یہ آنکھیں صرف میری راہ تکتی تھیں
سبھی گلیاں مرے گھر کی طرف آتی تھیں لیکن میں نہ آتا تھا
مرے آقا!

بھرے گھر میں، فقط یہ بوڑھی آنکھیں میری آنکھیں تھیں
کفن کی سرسراہٹ تک یہ ٹوٹے کھول دیتی ہے
یہ آنکھیں بار بار اس طرح کھلتی ہیں کہ گویا ان میں
اب تک نور باقی ہے، یہ مجھ کو دیکھ سکتی ہیں
مرے آقا!

یہ لب وہ پھول سے لب ہیں کہ جو اپنی دعاؤں کی مہک کو
روز اک بالکل نئی، لیکن بسی فرما کہانی کے بدن میں یوں
لپیٹ دیتے کہ یہ خوشبو مرے کانوں کے رستے جان و تن کے
آخری تاریک گوشے تک پہنچ جاتی، مرا سر سے تن یکسر
معطر کرکے سو جاتی کہ میں جب صبح دم اٹھوں تو یہ
خوشبو مرے دل کی مہک بن کر مجھے مہکاتے رکھے اور دن
نیکی بدی کے درمیاں باریک سے خط پر بہت ہموار
قدموں سے گزر جائے
مرے آقا!

یہ پھولوں سے بھی نازک ہاتھ میری ڈھال تھے
ان میں دعا کے رنگ کھلتے تھے، یہ رنگ ان بوڑھے ہاتھوں سے
دعا بن بن کے اڑتے تھے
مرے آقا!

یہ خالی ہاتھ اک اللہ پر کامل توکل کی توانائی سے، اُٹھتے تھے

مرے آقاؐ!

میں جو کچھ ہوں، مرے مولا کی رحمت، آپؐ کی اُلفت
اور اس کے بعد میری ماں کی محنت اور شفقت کا نتیجہ ہے

مرے آقاؐ!

مجھے ربِ دو عالم پر توکل، آپؐ کے کردار کے سانچے میں ڈھلنے کی تمنا
اور انسانوں کی عزت اور دنیا میں فقط محنت کے رستے
آگے بڑھنے کے سبق، مجھ تک مری ماں کے وسیلے سے ہی پہنچے ہیں

مرے آقاؐ!

میں اپنے پالنے والے سے پہلے، آپؐ کے بابِ شفاعت پر
یہ بوڑھی ہڈیاں لے کر کھڑا ہوں تاکہ میں اپنے وسیلے کے لئے
اکمل شفاعت کی ضمانت مانگ لوں، اور آپ کی
اکمل شفاعت کے بھروسے پر میں اپنے پالنے والے
سے اپنی ماں کی خاطر جنت الفردوس کا طالب بنوں
اپنے وسیلے کے لئے ربِ محبت سے مکمل مغفرت چاہوں

مرے آقاؐ!

اجازت دیں، لحد تیار ہے، لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غمگسار اپنے بہت سے کام ادھورے چھوڑ آئے ہیں

مرے آقاؐ!

اجازت دیں، میں اپنی ماں کو مٹی میں ملا دوں
آپ کو اپنے بہت پیارے چچا کا واسطہ ہے
حضرت حمزہؓ کی بے پایاں وفا کا واسطہ ہے
میرے آقاؐ! مجھ کو مت دیکھیں کہ میں نے
اپنی بوڑھی ماں کی بوڑھی چھاتیوں سے خون نچوڑا ہے
مگر مجھ کو اذانوں کے جلو میں اُس نے چھوڑا ہے

دوسری نظم "جہان بابا کیسے" میں خالد احمد ایک فلسفی شاعر نظر آتا ہے۔ اس میں فلسفۂ زمان و مکان جاری و ساری ہے۔ قوموں کے عروج و زوال اور مکافاتِ عمل کو تاریخی تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ خالد احمد کی شاعری اور تنقید پر مستند بات تو کوئی پڑھا لکھا نقاد ہی کر سکتا ہے۔ میں نے تو ایک دوست کی حیثیت سے، ادب کے ایک عام قاری کے نقطۂ نظر سے بات کی ہے اور

دنیا فقط گماں ہے، سب کچھ درونِ جاں ہے
جاگو ضرور خالد، آنکھیں مگر نہ کھولو

———— (فنون، جولائی۔دسمبر ۱۹۹۳ء)

خورشید رضوی

مناجات

کبریائی کی ردا عرشِ بریں پر رکھ کر
بے نیازی کی ادا صرفِ کرم کرتے ہوئے
زینہ زینہ کبھی لاہوت کی رفعت سے اُتر

وسعتِ عرصۂ کونین سے کتراتے ہوئے
یوں مرے دل کی جراحت میں سمٹ آ جیسے
جیسے خوشبو کسی غنچے میں سمٹ آتی ہے

ہے مرے ظرف سے باہر تری عظمت کا تضاد
چھوڑ دے میرے لیے اپنے تنوع کا جلال
ایک ہی رنگ میں کچھ دیر مرے پاس ٹھہر

بے زبانوں کے لیے دل میں چھپے پیار کا رنگ
سنگ میں محوِ نمو سبزۂ کہسار کا رنگ
دل پہ مرہم کی طرح پُرسشِ غمخوار کا رنگ

یوں تو تُو کون سے منظر میں نہیں ہے لیکن
میری درماندہ سی، محدود سی، محجوب سی آنکھ
بس ابھی ایک دریچے میں تجھے مانگتی ہے

انور شعور

○

سب کچھ تھا مگر کوئی نہیں تھا
سایہ تھا وہ آدمی نہیں تھا
تھی جس سے اُمید معذرت کی
اُس شخص کو یاد بھی نہیں تھا
آدم کے بغیر زندگی تھی
ہنگامۂ زندگی نہیں تھا
چپکے سے گزر گئی جوانی
اعلان تو لازمی نہیں تھا
جس روگ نے میری جان لے لی
وہ روگ مجھے کبھی نہیں تھا
ناقابلِ اعتبار تھا وہ
ناقابلِ دوستی نہیں تھا
اُس شے کے خیال میں رہے ہم
جس شے کا وجود ہی نہیں تھا
تھی بات بجا شعور لیکن
اظہار کا وقت ابھی نہیں تھا

(فنون، جولائی۔ دسمبر ۹۳ء)

شوکت ہاشمی

○

گھر سے باہر قدم میں نے رکھا نہیں تھا کہ گھر بجھ گیا
گھر بجھا کر سفر پر روانہ ہوا تو سفر بجھ گیا

ہجر کی شام نے اس تماشے سے خوش تو بہت ہوں مگر
دل میں غم بھی بڑا اس اداسی کا ہے، یہ اگر بجھ گیا

یوں ہوا پھر اسے بھی پرندوں کی ہجرت کے دکھ کھا گئے
صبح اور شہر کے درمیاں زندگی کا شجر بجھ گیا

اے مری روشنی سے بچی زندگی! تیرا ماتم کروں
کیا کہوں، اس چکاچوند میں میرا کیا کیا ہنر بجھ گیا

وہ سفر میں مرا آخری موڑ تھا اور ہوا چل پڑی
آخری موڑ پر کیوں چراغِ سرِ رہگزر بجھ گیا

اس محبت کے دکھ کی کہانی مجھے آج بھی یاد ہے
اور کہانی یہی ہے، شگفتہ رہا عمر بھر، بجھ گیا

میں نے سب کو چراغِ نظر دے دیا تھا کہ موسم کھلے
اور موسم کھلا تو مرا ہی چراغِ نظر بجھ گیا

دیر سے گھر پلٹنے کے انجام سے کون واقف نہیں
اے ستاروں کے تاجر! تجھے کیا خبر، تیرا گھر بجھ گیا

واقعہ یہ ہوا بجھ گیا میں ادھورا سفر چھوڑ کر
سانحہ یہ ہوا، دل مرا بس کسی بات پر بجھ گیا

خیمۂ عمر کے اس اندھیرے میں شوکت نہیں سوجھتا
اک دیا جو محبت نے روشن کیا تھا مگر بجھ گیا

○

وہ جو کنجِ شجر چھوڑ کر آ گئے تھے، کہاں آ گئے
بدگماں لوگ تھے، دھوپ کے شہر میں بدگماں آ گئے

ہائے کن ساعتوں میں دعا چھاؤں کی مانگتے تھے ہم
لوگ لے کر ہمارے لئے دھوپ کے سائباں آ گئے

اے زمیں! تیرے ناخلف بیٹے سہی، تیرے بیٹے تو ہیں
دیکھ تو ماں! ترے سامنے ہم بھی گریہ کناں آ گئے

اے اداسی کے موسم کی دشمن ہوا! مت کھلی وار کر
تیرے نرغے میں میرے قبیلے کے سب نوجواں آ گئے

وہ بھی دکھ کو چھپانے کی کوشش میں تھا، روئے ہم بھی نہیں
یہ الگ بات ہے، اشک آنکھوں میں پھر ناگہاں آ گئے

اس بھرے گاؤں کو چھوڑتے وقت تو ہم بھی خوش تھے بہت
آج اس شہر کو دیکھ کر سوچتے ہیں، کہاں آ گئے

ہم نے ان کو مٹانے میں عمریں گنوا دیں مگر ہاشمی
سانحہ یہ ہوا پھر وہی فاصلے درمیاں آ گئے

(فنون، جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۳ء)

سید ضمیر جعفری

○

گردن کٹ گئی کالر سے — ٹینک ڈھلے ہیں ڈالر سے
کتنا سرد اور زرد ہوا — انساں، انساں کے ڈر سے
اس کا نسخہ اور کوئی ؟ — جنگ رکی کب لشکر سے
مال برآمد کون کرے — نقب لگی ہے اندر سے
دفتر — ہتّی کھتّی کی — حاکم ہیں سوداگر سے
مشرق مغرب کے مابین — کنوئیں کی جنگ سمندر سے
سورج مانگے ہے کرنیں — چھت لٹکی چمگادڑ سے
دھوپ بھی نکلی نم نم سی — بادل بھی کم کم برسے
جانے کب چھوٹے گی جان — دارا اور سکندر سے
غم کو آگ نہ لگ جائے — ایٹم کے بجلی گھر سے
ماں کہے اس دھوپ میں مانگ — چھاؤں ماں کی چادر سے
میرے شعر کی شُدھ مٹی
جہلم اور گوادر سے

(فنون، جولائی — دسمبر ۹۳ء)

ظفر اقبال

○

عداوت سب سے رکھتا ہوں کہ یہ منشور ہے میرا
نشانِ منزلِ مقصود کتنی دور ہے میرا

میں اپنی بات پر خود بھی کبھی رہتا نہیں قائم
سو، جیسا بھی ہے، یہ انداز تو مشہور ہے میرا

بہت ممکن ہے پھر سے آندھیوں کی زد میں آجائے
وگرنہ اس برس بھی ٹہنیوں پر بور ہے میرا

میں اپنے معجزے کی خود وضاحت کیا کروں آخر
کہ یہ میری روایت ہے نہ یہ دستور ہے میرا

مسافت پر نکلنے کا ابھی سوچا ہی تھا میں نے
جو دیکھا تو بدن سارا تھکن سے چور ہے میرا

کسی کے سامنے ہے صورتِ حالات جو بھی ہے
لب خاموش ہیں اس کے، دل رنجور ہے میرا

مسائل اپنے اپنے تھے، ضرورت اپنی اپنی تھی
نہ میں ممنون ہوں اس کا، نہ وہ مشکور ہے میرا

کہیں پر بھی کوئی اب میری گنجائش نہیں باقی
زمیں مشکل میں ہے، اور، آسماں مجبور ہے میرا

ظفر، تعمیر ایسی کر رہا ہوں خوابِ ہستی کی
کہ جس میں بادشاہِ وقت خود مزدور ہے میرا

○

کہیں جانے سے ہوا، اور، نہ آنے سے ہوا
کچھ ہوا بھی تو کسی اور بہانے سے ہوا

فائدہ رازِ دلِ زار کسی صورت بھی
نہ بتانے سے ہوا ہے نہ چھپانے سے ہوا

کچھ سمجھ آپ بھی آتی گئی اس کو آخر
اور، قائل بھی وہ کچھ پاس بٹھانے سے ہوا

راہ سے دل کو ہٹایا تو کہیں بات بنی
ربطِ خاص اک یہی دیوار گرانے سے ہوا

تھا اندھیرا بھی کسی اور طرح کا اب کے
گھر یہ روشن بھی فقط آگ لگانے سے ہوا

جو کہیں بھی نہیں موجود یہ ہنگامہ تمام
اس کی تصویر ہی دنیا کو دکھانے سے ہوا

سب سمجھتے ہیں کہ اس بار تو بپا یہ فساد
رنگ پر اور کوئی رنگ جمانے سے ہوا

جمع پونجی تو بہا لے گیا میری بھی وہ ساتھ
یعنی نقصان بھی طوفان اٹھانے سے ہوا

منکشف اس پہ مرا شوقِ ملاقات، ظفر
دور رہنے سے ہوا، آنکھ چرانے سے ہوا

O

برا سمجھوں اسے اب یا کہ اچھا کرچکا ہوں
وہی کافی ہے جیسا اور جتنا کرچکا ہوں

کیا ہے جو بھی کچھ، یہ دردِ سر میرا نہیں ہے
کہ ایسا کرچکا ہوں کہ یا ویسا کرچکا ہوں

مری دانست میں تو کارنامہ یہ ہے میرا
کہ میں کچھ کر گزرنے کا ارادہ کرچکا ہوں

بھلا اب اور کیا کرنے کی ہو مجھ سے توقع
اسے دیکھا ہے اور اس کی تمنا کرچکا ہوں

مجھے وہ کام کرنے کے لئے اب کہہ رہے ہیں
جسے میں اپنی جانب سے دوبارہ کرچکا ہوں

کسی صورت مجھے کچھ بھی نہ کرنے دے یہ د
اگر معلوم ہوجائے میں کیا کیا کرچکا ہوں

مجھے توفیق ہی سب سے الگ بخشی گئی تم
جو یہ سب کررہے ہیں، میں وہ تنہا کرچکا ہوں

بظاہر تو روانی ہی فقط ڈالی ہے میں نے
جو دریا ہی نہیں تھا اس کو دریا کرچکا ہوں

ظفر، اب اور یاران غزل کیا چاہتے ہیں
کہ میں اک بار تو مردے کو زندہ کرچکا ہوں

O

دربدر کوبکو ہوگئی ہے
جو یہاں گفتگو ہوگئی ہے

کچھ نہ کچھ مختلف تھی جو خواہش
اب وہی ہوبہو ہوگئی ہے

صرف دل میں تھی پہلے محبت
اب مرے چار سو ہوگئی ہے

کوئی شوق آشیاں بن گیا تھا
کوئی شے آرزو ہوگئی ہے

تھی سات پردوں میں وحشت
لئے روبرو ہوگئی ہے

نتیجہ تو نکلے گا آخر
اب دوبدو ہوگئی ہے

رکھی وہ موج ملامت
رگوں میں لہو ہوگئی ہے

میں ہوگیا ہوں کوئی اور
مرے بعد تو ہوگئی ہے

ونڈنے کیا چلے تھے، ظفر ہم
لیا سے کیا جستجو ہوگئی ہے

فنون، لاہور

سیّد منیر

○

ایک ہی بات ہے، جس رُخ سے حقیقت دیکھو
مجھے دیکھو کہ مرے شہر کی حالت دیکھو

پابجولاں کی وفا حلقۂ زنجیر میں ہے
مجھے آزاد کرو، پھر مری اُلفت دیکھو

پھر ہوا حکم تو نکلا ہے مرے شہر پہ چاند
شب کے ماتھے پہ لگائی ہوئی تہمت دیکھو

تم جو کرتے ہو ہر اک بات میں مثبت کی تلاش
آؤ دیکھو، مرے انکار کی شدت دیکھو

جسے خود اپنی جفاؤں کی بھی پہچان نہ تھی
اُسے برداشت کیا ہے، مری ہمت دیکھو

وقت بہتا ہے مگر وقت میں گہرائی بھی ہے
رات کے پچھلے پہر درد کی ساعت دیکھو

کوئی دیوار کے اُس پار بھی رہتا ہے منیر
آدمیت کی نظر سے وطنیت دیکھو

(فنون، جولائی۔دسمبر ۶۳ء)

حرفِ اوّل

ندیم

آمریت کی ہوا خواہی کیوں

ہماری ذہنیت کا یہ کتنا المناک رُخ ہے کہ جو ملت قائد اعظم کی ولولہ انگیز رہنمائی میں جمہوریت کے زور پر اور کروڑوں جمہور کی تاریخ ساز تحریک کے بل پر وجود میں آیا تھا، اس میں آمریت کے مرثیہ خوانوں اور نوحہ گروں کا آج بھی بہت زور شور ہے۔ وہ لوگ جو جمہوریت کی بات کرتے نہیں تھکتے تھے اور وہ ادارے جنہوں نے جمہوریت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا، آج بھی آمروں کا ماتم یوں شدت اور رقت سے کرتے ہیں جیسے پاکستان آمریت ہی کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ہمارے معیاروں کا یہ تضاد کتنا دل شکن ہے کہ ہم قائد اعظم کی جمہوریت پسندی کا پرچم بھی بلند کرتے ہیں اور ساتھ ہی پاکستان کی تاریخ کے سینے میں نیزوں کی طرح گڑی ہوئی آمریتوں کے جھنڈوں کو بھی پھڑپھڑانے دیتے ہیں۔ صاف مطلب یہ ہے کہ اب ہم قائد اعظم کا ذکر محض رسماً، محض ضرورتاً، محض برائے بیت کرتے ہیں ورنہ دراصل ہم آمریت کی گرفت سے باہر نکلنے پر آمادہ ہی نہیں ہیں۔ وہ عناصر جنہوں نے تحریکِ پاکستان اور قائدِ پاکستان کی کھلی مخالفت کی، اگر آج آمریت کے سب سے بڑے وکیل بن جائیں تو بات سمجھ میں آتی ہے، مگر وہ عناصر جنہیں دعویٰ ہے کہ وہ جمہوریت کا عروج آمریتوں کے دور میں بھی برقرار رکھنے کے لیے وہ اپنے مرحوم سربراہوں کو جمہوریت کے قبلہ قرار دیتے ہیں، اگر محض کسی پارٹی کی مخالفت کے جوش و خروش میں آمروں کو پاکستان کا ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں، تو انہیں ایک بار آئینہ ضرور دیکھ لینا چاہیئے۔

جمہوریت کا ذائقہ

میرا اندازہ یہ ہے کہ پے در پے مارشل لاؤں کی زد میں آتے رہنے کی وجہ سے ہم آمرانہ طرزِ حکومت کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم نے یہ عادت بالکل بے خبری میں، قطعی طور سے غیر محسوس طور پر اختیار کر لی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی سینتالیس سالہ آزادی میں جمہوریت کا ذائقہ صرف تین بار چکھا ہے۔ قیامِ پاکستان سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک کے جمہوری دور کو ہم نے دستور سازی کے جھگڑوں کی نذر کر دیا۔ اس مختصر مدت میں عام انتخابات کے بغیر ہی ہم نے سات عدد وزرائے اعظم بھگتائے۔ ایک وزیر اعظم کو قتل کیا اور باقی وزرائے اعظم کی چھٹی چھوٹی کرنے کی روایت ہے کہ ملک کے ایک گورنر جنرل نے اس وقت کے ایک وزیر اعظم کو اپنے ہاں بلا کر پوچھ کر کیا آپ بتائیں کہ گورنر جنرل اپنے وزیر اعظم کو ڈسمس کر سکتا ہے؟ وزیر اعظم نے جواب دیا کہ جی ہاں کر سکتا ہے۔ اس پر گورنر جنرل نے ارشاد فرمایا تو جائیے میں تمہیں ڈسمس کرتا ہوں۔ یعنی ہماری اس دور کی جمہوریت کے چہرے پر بھی آمریت کے داغ تھے۔ خدا خدا کر کے ایک بڑا بھلا دستور بنا اور اس کے تحت عام انتخابات کی تیاریوں کے سلسلے میں جلوس نکلنے لگے اور جلسے ہونے لگے تو ایوب خان نے جو اس وقت جنرل تھے اور بعد میں فیلڈ مارشل کہلائے، اچانک پاکستان پر قبضہ کر لیا۔

جمہوریت کے ساتھ زیادتی

جمہوریت کا دوسرا دور پاکستان کے پہلے عام انتخابات کے انعقاد کے بعد آیا۔ اسی دور میں ۱۹۷۳ء کا وہ آئین متفقہ طور پر منظور ہوا جس کے بارے میں اس کے مخالفین بھی کہتے تھے کہ ان حالات میں اس سے بہتر آئین مرتب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ آئین منظوری کے بعد صرف چار برس زیرِ عمل رہا، جب بدقسمت تاریخ نے کروٹ لی جس میں بدقسمتی سے بڑے بڑے عالم اور جمہوریت نواز بھی شامل تھے، فوجی آمریت کا راستہ بالکل صاف اور ہموار کر دیا اور وہ مارشل لاء وجود میں آیا جس نے گیارہ برس تک پاکستان کی غیرت و حمیت کے ساتھ بہت خوفناک کھیل کھیلا۔ یہ ملک محض آمرانہ اقتدار کی

وجہ سے پوری دنیا میں بدنام ہوا۔ اس دور میں قوم کے ایک نہایت محبوب رہنما کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ پھر اس آمریت نے ریفرینڈم کے ذریعہ خود کو بھی رہنما بنایا اور غیر جماعتی انتخابات کا بھی انعقاد کرکے جمہوریت کی روح کے چیتھڑے اڑا دیے گئے۔ پھر اسی غیر جماعتی اسمبلی سے ۔۔۔ بھی بنا دی گئی اور بعد میں اسی اسمبلی پر کرپشن کے الزامات عائد کرکے اسے برطرف بھی کر دیا گیا۔

آج کا جمہوری دور

تیسرا جمہوری دور وہ ہے جو ابھی جاری ہے۔ اس جمہوری دور کو تین مارشل لاؤں کے ملبے پر پاکستان کی تعمیر نو کا مرحلہ طے کرنا ہے۔ اور یاد رہے کہ یہ تین مارشل لا، پاکستان کی تاریخ کی نصف مدت پر محیط ہیں۔ چنانچہ اس ملبے کو اٹھوانے اور منظر کو صاف کرنے اور تعمیر نو کی بنیادیں رکھنے اور ایک آزاد اور جمہوری، اسلامی عوامی معاشرے کی طرف پیش رفت کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا، لیکن ہم سب کی یہ دعا ہونی چاہیے کہ یہ وقت زیادہ طویل نہ ہو ورنہ تھکے ہوئے عوام، تنگ آئے ہوئے عوام، گرانی اور بدعنوانی اور دہشت گردی کی چٹانوں تلے کراہتے ہوئے عوام، اپنی آزاد مملکت میں ایک بار تو آزادی سے سکون کا سانس لے سکیں۔ آمریتوں نے ہمارے عوام کے طرز فکر کو بدل ڈالا ہے۔ سبھی تو نہیں مگر ان کا ایک حصہ کہتا ہے کہ مارشل لا ہم سے پوچھ کر نہیں لگایا جاتا۔ اور اگر انتخابات میں ایسے لوگ بھی منتخب ہو کر آ جاتے ہیں جو محض اپنی زمینوں کے بل پر، اپنی ملکیتوں کے بل پر، اپنے مال و دولت کے بل پر، اپنے پیروں کی مریدی کے بل پر کامیاب ہونے میں آ رہا ہے۔ ہمیں تو دو وقت کی روٹی چاہیے۔ وہ حلال ہو یا حرام، اس سے کیا ہوتا ہے —— سب ٹھیک ہے۔ ہم سے نمائندوں کو خدمات کی کسوٹی پر پرکھنے کے نسخے نہیں پائے جاتے۔ —— اس طرح کی ذہنیت سراسر آمریتوں کی پیدا کردہ ہے اور یہ بہت خطرناک ذہنیت ہے۔

افہام و تفہیم کی ضرورت

یہ منفی ذہنیت اگر کسی قوم کے ذہن و ضمیر پر قابض ہو جائے تو وہ قوم بے حس ہو کر رہ جاتی ہے اور تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی بے حس قوم کی آزادی زیادہ دیر تک محفوظ رہی ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ذہنیت کو ختم کیسے کیا جائے۔ تو یہ کام تو صرف سیاسی جماعتیں ہی کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ بھی بے حسی اور بے دلی کا شکار نہ ہو چکی ہوں۔ یہ بے حسی جذباتی نعروں یا گالی گلوچ یا ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے سے ختم نہیں ہو سکتی۔ اس بے حسی کا واحد علاج افہام و تفہیم کی وہ فضا ہے جو پاکستان کی وزیر اعظم نے جگہ جگہ کی تقریروں میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پاکستان بھر کی سیاسی جماعتوں کے ساتھ جس فراخ دلانہ سلوک کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی وجہ سے خدا کرے چڑھی ہوئی تیوریاں اتر جائیں، بھنچے ہوئے تیور کھل جائیں اور تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہونے لگیں۔ اگر ہم سبھی یہ طرز فکر اختیار کریں —— اگر صوبائی خود مختاری اور علاقائی مسائل کے سلسلے میں ہم اتنے ہی فراخ دل ہو جائیں، اگر ہر صوبے کے باشندوں کے حقوق کے تحفظ کو ہر حکومت اپنا ایمان بنا لے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ملک جو ایک زبردست جمہوری تحریک کی برکت سے وجود میں آیا ہو، ایک متوازن جمہوریت کا خوبصورت نمونہ نہ بن جائے۔ اگر ہم مذہبی، علاقائی، لسانی اور گروہی تعصبات کو بھلا دیں، ذات کو مملکت پر فوقیت دینا ترک کر دیں اور پاکستان کی آزادی کی غیر مشروط دوستی کی قسم کھا لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم وہ منزل نہ پا لیں جس کی قائد اعظم نے واضح طور پر نشان دہی فرما دی تھی۔

(فنون، جولائی۔ دسمبر ۹۳ء)

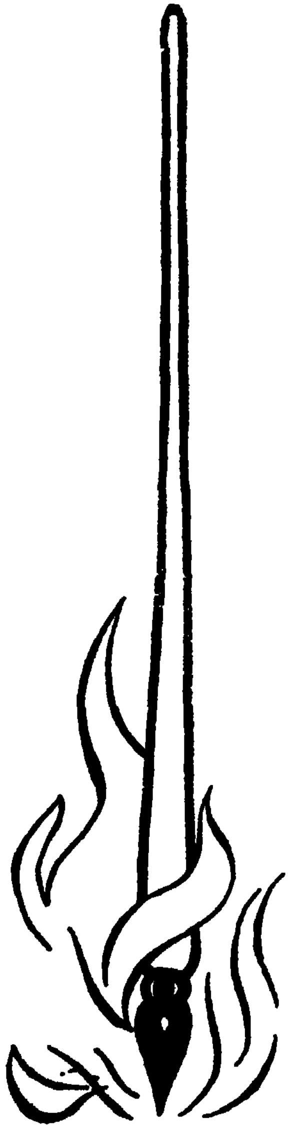
ادارئیہ

ایک ایک پائی وصول کی جائے



معین قریشی صاحب کی نگران حکومت نے بحالت مجبوری مارچ 85 سے جون 93 تک کے ساٹھ ہزار سے زیادہ نادہندگان کی ستو سو صفحات پر مشتمل فہرست شائع کر دی ہے ان پر دو سو ارب روپے واجب الادا ہیں اس فہرست میں بارہا اپنے قرضے معاف کروا لینے اور پھر مزید قرضے لے لینے والے نامی گرامی افراد بھی شامل ہیں مگر یہ سب کے سب بالائی استحصالی طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہی ہیں نچلے اور درمیانے درجے اور طبقوں کے ضرورت مند کاروباری لوگوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ کہا جا رہا تھا کہ ان نادہندگان کے نام طشت ازبام کرنا بینکوں کے اس قانون رازداری کی خلاف ورزی ہوگی جو بین الاقوامی سطح پر نافذ و مروج ہے مگر پھر نہ معلوم مصلحتوں کے تحت یہ کہنا سننا ختم کر کے وہ کارنامہ سرانجام دے ہی دیا گیا جو پاکستان کے اب تک منتخب حکمران نہیں دے سکے تھے بلکہ ہم تو ان حکمرانوں کے یہ بیانات بھی پڑھنے اور سننے کے گنہگار و سزاوار ہیں کہ سارے مخالف حکمران ایک دوسرے کو یہ دھمکیاں دیا کرتے تھے کہ "باز آجاؤ' حد سے آگے نہ بڑھو ورنہ ہم قرضہ جات معاف کرانے والوں کے نام شائع کر دیں گے" خیر ہم نے تو بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ "نصف سچائی' مکمل جھوٹ سے بدتر ہوتی ہے۔" لہٰذا نگران حکومت سے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ قیام پاکستان سے لے کر مذکورہ تاریخ تک کی مدت پر کس مصلحت کے تحت توجہ نہیں کی گئی؟ ساتھ ہی ساتھ یہ حکومت اس کھلے راز سے بھی پردہ اٹھائے کہ ان قرضہ جات کی رقم دس لاکھ اور اس سے اوپر کیوں مقرر کی گئی؟ اور اس بنیادی سوال کا جواب بھی دینا اسی حکومت پر واجب ہے کہ یہ قرضے کس نے دلائے اور کس نے معاف کرائے تھے؟؟؟ جب پنڈورا بکس کھل گیا تو ڈر یا احتیاط کیا معنی؟

ہمیں فخر ہے کہ ماضی میں ہم نے ہر خلیفہ وقت کو للکارا' برملا کہا کہ اقتدار کے حمام میں سب ننگے ہیں' بروقت کہا کہ چور کو چور کہئے اور یہ کہہ کر بھاگنے والے مقتدر خود بھی چور ہیں مگر کسی کے کان پر جوں نہ رینگی آج اس مظلوم قوم کے جسم سے جب خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا گیا ہے' اس کی ہڈیاں تک نچوڑ لی گئی ہیں اور مردار کھانے والے حکمران گدھوں اور بے حس' بے وقعت و بیہل انسانوں کی جب ان کی اپنی لوٹ کھسوٹ کی معیشت بھی چرا چرا کر رہ گئی ہے تو نگران حکومت کا نسخہ استعمال کیا جا رہا ہے' غیر جانبدار بننے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ظالموں' ٹھگوں' ڈاکوؤں' لٹیروں' چوروں' حرامخوروں' کھلے وطن دشمنوں اور عوام کے غداروں کے ساتھ غیر جانبداری کیا مطلب' مفہوم اور معنی رکھتی ہے "خالی" خزانہ بھرنے کے لئے ٹیکس پر ٹیکس لگانے' بنیادی ضروریات زندگی کی اشیاء کی قیمتیں مسلسل بڑھانے' علم و ادب و ثقافت کے لئے ترسنے والوں کو مزید ترسانے' علاج معالجے' پڑھنے پڑھانے' روٹی روزگار کی خاطر آنے جانے کے وسائل' ذرائع اور مواقع کو محدود سے محدود تر کرنے کو غیر جانبداری نہیں کہتے' جن کے پاس ملک و قوم اور عوام کی اربوں کھربوں کی رقومات چڑھی ہوئی ہوں' ان کو انتخابات میں محض منتخب ہونے سے روکنے کو غیر جانبداری قرار نہیں دیا جا سکتا' وہ خود نہیں آسکیں گے تو اپنے بھائی بند یا پیارے کو آگے چلوا دیں گے یہ بھی نہیں کر پائیں گے تو منتخب ہو کر آنے والوں کو خرید لیں گے اور تو اور خود منتخب پارٹیوں کی بولی لگا دیں گے۔ انہیں کیا فرق پڑے گا' "الہ دین کا چراغ" تو ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ قوت خرید تو ان سے کوئی لی ہی نہیں گئی۔ ایک دم روشنی پھیلا کر اور آنکھیں چندھیانے سے بات نہیں بنے گی۔ ڈگڈگی بجانے سے کام نہیں چلے گا۔ حرام مال کی تعزیر لگانی پڑے گی' اگلانی پڑے گی' غضب خدا کا' کس کے یہ بھاری بھرکم ڈکار لیتے عوام کا پورا کا پورا' سارا کا سارا مال کھائے بیٹھے ہیں اور پھر بھی دندناتے پھر



رہے ہیں۔ کوئی ڈھکا چھپا نہیں، کوئی بازپرس نہیں، وصولیابی کے لئے کوئی مہم اور خیر خبر نہیں۔ ستم تو یہ ہے مزدور معمولی قرض کی ادائیگی نہیں کرپاتے تو ان کے ہل بیل بلکہ گھربار اور نسلوں کی نسلیں رہن اور غلام بنالی جاتی ہیں، اسمبلی میں حالانکہ ان کی آزادی اور بازیابی کا قانون بھی پاس ہوچکا ہے مگر عملاً لاگو نہیں ہوپاتا، وہ جب بھی بیگار کرتے تھے اب بھی زندہ درگور ہیں مگر بڑے بڑے ناسور بلاوجہ اب بھی اس سلطنت خداداد کے عملی اور حقیقی رکھوالے بنے ہوئے ہیں۔ ہم اور آپ، سب کے سب اور ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ نگراں حکومت نے ان کے نام شائع کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے مگر جن معصوم عوام کا ان بے غیرتوں نے مال ہڑپ کیا ہے ان کو تو صحیح معنوں میں پتہ ہی نہیں ہے کہ کالے چور کون کون ہیں، ناخواندگی کی شرح تو خیر کوئی ڈھکی چھپی نہیں، خود خواندہ لوگوں میں سے کتنے لوگ اخبارات اور رسالے خرید اور پڑھ پاتے ہیں، پھر کس کو کس کا نام معلوم ہے، ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان تمام کے تمام قومی مجرموں کا منہ کالا کرنے کے لئے قومی سطح پر اخبارات، رسائل اور ٹی وی پر بھی صاف ستھری تصاویر مسلسل اور لگاتار چھاپی جائیں، بچوں کو بتایا جائے، اسکولوں میں بے نقاب کیا جائے، برسرعام ان کی شناختی پریڈ کروائی جائے تاکہ وہ جاگرتی، وہ شعور پیدا ہو جو کسی بیدار قوم کی لازمی خصوصیت ہوا کرتی ہے اور ہر ایک کو معلوم ہوجائے کہ انسانوں کو صرف چیل کوے، گدھ اور سور جیسے چرند پرند ہی نہیں ان کی اپنے جیسے ہاتھ پاؤں رکھنے والے انسان نما حیوان بھی کھا جاتے ہیں، یہی لٹیرے، انسانی معاشرے کو طبقاتی طور پر تقسیم کرتے ہیں، یہی اونچ نیچ کے قائل ہیں، یہی جبر و ستم اور ظلم و تشدد مسلط کرتے اور روا رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی رعایت، رحم و عافیت خود جرم ہے، بدوں کے ساتھ نیکی بھی نیکوں کے ساتھ بدی ہے۔ موجودہ نگراں حکومت کی ڈگمگاہٹ اور ہچکچاہٹ، ٹال مٹول اور ابتداء میں ناموں کی عام اشاعت سے صاف انکار اپنی جگہ خود ستم ظریفی ہے۔ انتقالی قواعد کی پیچیدگی اور صحافیوں کے دباؤ کی وجہ سے یہ کام اب ہو ہی گیا ہے تو اپنے منطقی نتیجے تک اسے پہنچانا ہی چاہئے۔ خالی خولی فہرستیں چھپوا دینا کوئی معنی نہیں رکھتا اس سے پہلے بھی قرطاس ابیض چھاپے گئے تھے، بڑے بڑے جغادریوں کی نگرانی میں کمیشن قائم کئے گئے تھے اور تو اور عدالتوں نے بھی وقت گزرنے کے بعد ریکارڈ UP TO DATE کرلئے تھے، سو بات اس طرح نہیں بنے گی، قوم کا مال آج اگر سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے تو ٹیڑھی انگلیوں سے نکالا جانا چاہئے

بے نظیر اور نواز شریف نے عمرو عیار کی زنبیل کی طرح اس طول طویل زنجیر نما فہرست کی اشاعت پر خیر مقدم کا فرض تو ادا کردیا مگر سوال یہ ابھرتا ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور اقتدار میں یہ کارنامہ انجام دیکر خود شاباشی کیوں نہیں لی؟ اب بے نظیر معترض ہیں اور پوچھ رہی ہیں کہ سامو سے جام صادق کے زمانے میں 20 کروڑ روپے کے قرضے لینے والوں کے نام کیوں نہیں دیئے گئے مگر پہلے وہ خود بتائیں کہ مساوات کے لئے حاصل کیا جانے والا دس لاکھ روپے کا قرضہ انہوں نے کیوں معاف کروایا؟ زانی کو وہی پہلا پتھر مار سکتا ہے جس نے خود کوئی زنا نہ کیا ہو۔ ضیاء الحق کے آمرانہ مظالم کے خلاف جہاد کرنا خود ایک اعزاز تھا مگر اس طرح قرضے معاف کرنا کرانا کوئی شان نہیں، یہ تو قیمت چکانے والی بات ہوگی۔ پھر معاملہ قرضوں تک ہی محدود نہیں، پلاٹوں کے الاٹمنٹ کا دھندہ بھی درمیان میں ہے، سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کو قربانی کے صلے میں داد و دہش اور جرات و بیباکی کے اظہار پر گل و خار گری کے داؤ پیچ اور ہتھکنڈے اجتماعی فلاح و بہبود اور عوامی سیاست سے تعلق نہیں رکھتے، یہ ذاتی وفاداری کی نفسیات عام کرنے اور سیاسی مشغلوں کی پرورش کے طور طریقے ہیں یہ پورے کے پورے معاشرے کو CORRUPT کرنے کے روایتی اور جدید ترین اصول و حربے ہیں، دوسرے ملکوں میں کوئی ایک فرد یا کچھ لوگوں کا کوئی GANG تو رسوائے زمانہ اسکینڈلز میں ضرور ملوث ہوتے دیکھا اور سنا ہے مگر اپنے

پاکستان میں اس طرح اونچی اونچی دستار والوں' کلف لگی ہوئی خاکی اور سفید وردی پوشوں' معیشت کے کلیدی نگرانوں' صحافت کے مرکزی اجارہ داروں' سیاست' سماجی خدمت اور مذہب کے روشن میناروں' انتظامیہ' عدلیہ اور مقننہ کے صاف شفاف ستونوں کے اس طرح اس گندگی میں لت پت ہونے اور منہ مارنے کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا کہ ان میں سے کبھی وہ عمرے کرنے جا رہے ہیں اور کبھی یہ مزارات پر چادریں چڑھاتے دکھائی دے رہے ہیں مگر خدائے بزرگ و برتر کو اچھی طرح علم و خبر ہے کہ حقوق العباد غصب کرنے والے قابل معافی ہیں یا گردن زدنی؟!

بچپن میں ایک کھیل کھیلا کرتے تھے چھپو چھپو کتنا پانی؟ یہاں تو نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ بتانے والا' سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ڈراؤنا اور بدنما کھیل کھیلنے والوں نے کس دل گردے کے ساتھ اتنے دنوں تک کیونکر یہ کھیل کھیلا؟ اب جبکہ یہ کھیل کھلا ہی جا چکا ہے تو پہلی فرصت میں پوری سخت گیری کیساتھ اسے ختم کیا جانا چاہئے۔ ان سارے پلاٹوں کو اصل مارکیٹ قیمت کے حساب سے از سرنو فروخت ہونا چاہئے اور ہر طرح کے شعبہ میں اتنے بڑے بڑے ہر نادہندہ کے ساتھ کوئی ہمدردی' یا ترجیحی سلوک کئے بغیر تمام اثاثے ضبط کئے جانے چاہئیں سب سے پہلے بینکوں کا پورا نظام درست کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مالیاتی ادارے آج کے دور میں ہر قوم کی شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں اگر یہی مفلوج کردیئے جائیں' اگر انہیں کو کاٹ ڈالا جائے تو کوئی کیونکر زندہ رہ سکے گا؟ ڈاکو تو چوکیداروں اور پولیس والوں کو مارنے اور خود مرنے کی ہمت کر کے بینکوں پر ڈاکہ مارنے آتے ہیں' اگر پکڑ لیئے جائیں۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ کر سلاخوں کے پیچھے رکھ کر پھانسی کے پھندے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں اور اس دوران انہیں عدالتوں میں بھی گھسیٹا جاتا ہے اور ابلاغ عامہ میں بھی مشتہر کر کے ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی مگر ہمارے یہ مہذب اور یہ شرفاء' یہ نادہندہ اور یہ قومی چور کس شان سے گلچھرے اڑانے اور داد عیش و عشرت دینے میں ہمہ تن مصروف و مشغول ہیں پھر بنکوں میں اندر بیٹھ کر اور منظوری لے کر ڈاکہ مارنے والوں کو کیا ڈاکو نہیں کہا جائیگا؟

عموماً کہا جاتا ہے کہ قوم بچت ہی نہیں کرتی' کفایت شعاری کی عادی نہیں ہے' ہماری درآمد سے برآمد زیادہ ہے' بتانے والے بتائیں کہ جب بینکوں کی کارکردگی مشتبہ ہو' قرضہ دینے اور معاف کرنے میں کمیشن کے جلوے صاف نظر آ رہے ہوں' لوگ علی الاعلان کہتے ہوں کہ بینکوں کے چھوٹے یا بڑے قرضے ادا کرنے کے لئے تھوڑی لئے جاتے ہیں تو بچت کیوں کر ہو؟ کون کرے؟؟ اور بچت کنندگان کو کیا ملے گا؟؟؟ پھر کوآپریٹو اداروں تاج کمپنی جیسی مالیاتی کمپنیوں' ڈرگ مافیا کی فہرست اور رقومات الگ ہیں۔ ہماری ٹیکسوں کے معاملات جدا ہیں۔ ان سب میں بدعنوانی بدانتظامی اور جعلسازی کے ذمہ داروں نے معیشت' سیاست اور معاشرت کے کیا کیا گل نہ کھلائے ہوں گے۔

قوم کے ان کپوتوں کے سارے کرتوت سامنے ہیں' گندگی اور نجاست سطح آب پر تیر رہی ہے۔ ضرورت ہمت مردانہ کی ہے' جھاڑو دینے اور صفائی کرنے کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نگران حکومت کو انتخابات کروانے کا مینڈیٹ (؟) دیا گیا مگر ہمیں معلوم ہے کہ انتخابات کے بعد بننے والی حکومتیں یہ کام نہیں کریں گی اور نہ کرنے دیں گی اس لئے انتخابات کے ساتھ ہی ساتھ' انتخابات سے زیادہ ضروری کام بہرحال اور بہرصورت کر لینے چاہئیں۔

شیرشاہ سوری سے جان بچا لینے پر مغل بادشاہ ہمایوں نے نظام سقہ کو اپنے دوبارہ تخت نشین ہونے پر ایک دن کی بادشاہت کا موقع عنایت کیا تھا تو اس نے چام کے دام چلا کر تاریخ میں اپنا نام محفوظ کرلیا پاکستان کی فوج' حزب اقتدار' حزب اختلاف اور ان سب کے اندرونی و بیرونی اتحادیوں نے معین قریشی صاحب کو خود اپنے تمام تنازعات سے بچنے بچانے کے لئے' منصفانہ' غیر جانبدارانہ' آزادانہ اور صاف و شفاف انتخابات کرانے کی ذمہ داری متفقہ طور پر سونپتے ہوئے تین ماہ کی عبوری حکومت کا موقع دیا ہے' انہیں چاہئے کہ وہ تنہم الثانی کیوں اور سارے

معترضین کی ان ترانیوں کو ایک ۔ سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیں اور صرف اپنے اس ضمیر کی آواز سنیں جس نے انہیں سٹیٹ بینک کو آزاد و خود مختار ادارہ بنانے ' بغیر زر مبادلہ کے دھڑا دھڑ نوٹ چھاپنے کی ممانعت کرنے ' زرعی ٹیکس لگانے ' نادھندگان کی فہرست چھاپنے ' مفت اور اونے پونے سرکاری اراضی اور پلاٹ الاٹ کرنے کرانے والوں کو بے نقاب کرنے اور تین مہینوں کے اندر اندر انتخابات کروا کر واپس چلے جانے کی تلقین کی ہے۔ جب وہ یہ آواز ذرا اور غور سے سنیں گے تو انہیں یہ بھی سنائی دے گا کہ قومی دولت میں خیانت کرنے والوں سے مطلوبہ وصولیابی کئے یا انہیں کیفر کردار تک پہنچائے بغیر مذکورہ سارے کام بیکار اور لاحاصل ہیں اور بین الاقوامی سطح کا ان جیسا ماہر معیشت بحسن و خوبی سمجھتا ہے کہ اصل مرض کے علاج کے بغیر یہ سارے بیکار اور لاحاصل کام ان کی ذات ' صحت ' ساکھ اور تجارت کے لئے کتنے نقصان دہ ہوں گے ؟

نگراں کابینہ کے علاوہ موجودہ فوجی سربراہوں سے بھی ہمارا یہ کہنا ہے کہ بلاشبہ آج کل تو وہ سرحدوں کے تحفظ کی اصل ' بنیادی اور مرکزی ذمہ داری ہی نبھا رہے ہیں مگر نگراں کابینہ کا وجود اور بھرم بھی دراصل انہیں کے دم سے ہے ' ملک کے اندرونی مسائل کی ذمہ داری براہ راست تو وہ نہیں سنبھال رہے مگر در پردہ وہ یقیناً ایک ایک بات سے باخبر بلکہ ہر بات کے ذمہ دار ہیں۔ سو انہیں بھی تاریخ برصغیر کے وہ اسباق ضرور ذہن میں رکھنے چاہئیں جو یہ بتاتے ہیں کہ ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ جیسے محب وطن اور باصلاحیت حکمران ' جعفر و صادق جیسے اندرونی غداروں کی وجہ سے بیرونی سامراجیوں سے مات کھا گئے تھے !

(منشور، اگست ۹۳ء)



اداریہ

یہ تو ہاتھ کی صفائی ہے



لیجئے بلخ شیر مزاری نہیں تو معین قریشی صاحب کی نگران حکومت سے متنازعہ انتخابات کروا کر مطلوبہ نتائج حاصل کر لئے گئے ہیں۔ غلام اسحاق، اجلال حیدر زیدی اور روئیداد خاں وغیرہ کی خواہش پوری ہو گئی ہے لانگ مارچ اور ٹرین مارچ کامیاب ہو گئے ہیں، این۔ ڈی اے اور اے۔ پی۔ سی کو ان کی تشکیل کا مقصد پورا کر کے توڑا اور غیر موثر کیا جا چکا ہے اور کمانڈر انچیف کی بھاگ دوڑ ٹھکانے لگ گئی ہے دائیں کے قاتلوں کی تلاش بدستور سرگرمی سے جاری ہے۔ بلدیاتی اداروں کو توڑنے کی ترکیب کارگر ثابت ہو گئی ہے، اب احمد صادق محض سندھ کے چیف سیکرٹری نہیں رہے، وفاق کے پرنسپل سیکرٹری بنا دیئے گئے ہیں سندھ میں، آپریشن کلین اپ کا تسلسل قائم ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات کی مبینہ دھاندلی "ثابت" ہو گئی ہے یہ سب صدفی صد درست تسلیم کر لینے کے باوجود بنیادی طور پر یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا مدت سے زیر بحث بحران ختم ہو گیا یا اب شروع ہوا ہے؟

وفاقی اور صوبائی منتخب ایوانوں کے مقتدر اور غیر مقتدر نئے رہنمایان گرام نے تعاون و اشتراک کے رسمی اور روایتی اعلانات ضرور کئے ہیں مگر یہ سب منافقت اور دوغلے پن کے مظہر ہیں۔ جو کچھ بھی ہوا، ہماری توقعات اور تجزیے کے عین مطابق ہوا ہے۔ ہم ان صفحات پر بہت پہلے ہی عرض کر چکے تھے کہ :

"تاریخ وطن نے یہ کوئی نئی کروٹ نہیں لی جو کھیل ۱۹۵۳ء میں غلام محمد نے ناظم الدین کے ساتھ کھیلا تھا، وہی اب ۱۹۹۳ء میں غلام اسحاق نے نواز شریف کے ساتھ کھیلا ہے اور یہ گھٹیا کھیل پاکستان کے تقریباً تمام ہی حکمرانوں کا بڑا محبوب و مرغوب کھیل ہے، چالیس سالہ تاریخ میں اسکندر مرزا، ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو، ضیاء الحق، محمد خان جونیجو، بے نظیر بھٹو، نواز شریف اور غلام اسحاق خان دراصل غلام محمد کے ہی اولتے بدلتے سائے بنے رہے ہیں۔ آپ پاکستان کے بڑے بڑے جاگیرداروں، گماشتہ سرمایہ داروں، اعلیٰ فوجی کمانداروں، کشور بیورو کریٹوں، عیار و شاطر ٹیکنو کریٹوں، پیشہ ور قانون دانوں، بازاری سیاستدانوں اور مثالی ضمیر فروشوں کی ایک فہرست بنانے کی کوشش کریں گے تو پاکستان کے حکمرانوں کے اگلے پچھلے تمام ٹولے آپ کے سامنے آجائیں گے، ان میں سے بیشتر ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار بھی ہوں گے کچھ بعض اوقات بظاہر اصولی اور نظریاتی اختلاف کرتے نظر آئیں گے۔ مگر عملاً یہ سب ایک خاندان ——— استحصالی طبقہ ——— کے فرد ہوں گے۔ ان میں کس وقت کون کس کو مغلوب کرے۔ ان میں یہ لڑائی عملی بالادستی کے حصول کی خاطر ہی ہے۔ یہ سب کے سب اہل وطن کو معاشی، سیاسی، اور معاشرتی طور پر لوٹنے کھسوٹنے پر متحد و متفق رہے ہیں اور ان سب کے سارے تانے بانے عالمی سطح پر بیرونی سامراجیوں اور ان کے سرغنہ امریکہ سے جڑے ہوئے ہیں مختصراً یہ کہنا چاہئے کہ اقتدار کے بدنام زمانہ حمام میں یہ سارے حکمران مادر زاد ننگے ہیں!" ——— "ہاں اس دفعہ ایک خاص پہلو زیادہ نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آیا ہے جس کا اعتراف، میکہ اور سسرال دونوں طرف سے بڑے جاگیردار خاندانوں سے تعلق رکھنے والی سیاستدان بے نظیر بھٹو نے بھی کیا ہے، وہ یہ کہ ۱۸ اپریل کو ایک تاجر سیاستدان بن گیا، علاوہ ازیں یہ فرد اسٹیبلشمنٹ کا ہی لے پالک تھا، جنرل جیلانی، جنرل ضیاء الحق اور غلام اسحاق کا لاڈلا تھا مگر اب اس نے تاجروں اور صنعتکاروں کے سیاستدان کا روپ دھار لیا" ——— "حالانکہ بے نظیر کا یہ کہنا تھا کہ صدر اور وزیر اعظم کی یہ چپقلش تو محض نورا کشتی ہے!" ——— "اسی لئے ایک موثر سوچ یہ بھی

ہے کہ آثار و قرائین سے (میر شیر مزاری کی نگراں حکومت کے تحت) انتخابات ہوتے نظر نہیں آتے اور کابینہ کی یہ ہیئت ترکیبی' روز افزوں بڑھتی ہوئی یہ جسامت اور مختلف نکات پر اس کے اراکین کا یہ اختلاف رائے یا متنازعہ رویہ جلد یا بدیر اسے لے ڈوبے گا اور صدر اسحاق اپنے چنیدہ کمانڈر انچیف کو صدر ایوب کی طرح اقتدار اعلیٰ سونپ کر خیر وعافیت سے ایک طرف ہوجائیں گے۔ یا وسیم سجاد کو آگے لاکر خود پیچھے چلے جائیں گے؟ ——— "اگر نواز شریف وقت کی آواز سنتے' ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نہ اڑا دیتے' مزدوروں اور کسانوں کے لئے بھی ڈھنگ سے کوئی ٹھوس کام کرجاتے تو وہ بھی اب آگے بڑھ کر انہیں لبیک کہتے' انہوں نے تاجر اور صنعتکار طبقے کے لئے تھوڑا بہت کیا تو وہ آج ان کی پذیرائی کے لئے باہر آگئے۔ انہوں نے پیر پگاڑا کے کہنے کے مطابق ابھی سندھ میں وڈیروں کی پگڑی اچھالنے کے لئے صرف کچے کی زمین ہی ہاریوں کو دی تھی تو وڈیرہ شاہی نے پلٹ کر ان پر وار کر ڈالا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا وہ موجودہ عوامی اجتماعات میں برملا اعلان تو کریں کہ جاگیرداری کا خاتمہ کیا جائیگا زرعی آمدنی پر بھی ٹیکس لگایا جائیگا پھر دیکھیں دما دم مست قلندر کیا ہوتا ہے!" ——— "یہ سوچنا کہ اکتوبر انتخابات میں وہ دو تہائی اکثریت سے جیت کر آٹھویں ترمیم کا خاتمہ کردیا جائیگا خیال خام ہے کیونکہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی' پاکستان کی موجودہ ناخواندگی میں لسانی' صوبائی' فرقہ وارانہ اور طبقاتی تضادات کے ہوتے ہوئے کوئی بھی فریق نہ تو دو تہائی اکثریت لے پائیگا اور نہ ہی مرکز اور تمام صوبوں میں اپنی اور صرف اپنی حکومتیں بنا پائے گا!" ——— "نواز شریف نے بعد کے اس پورے عرصہ میں ۱۸ اپریل والی پوزیشن سے پسپائی ضرور اختیار کی ہے!" ——— "ہوا یہ کہ چاروں صوبوں میں وزراء اعلیٰ کے عدم تعاون' پنجاب اسمبلی کے دوبارہ توڑے جانے کے بعد' پنجاب میں خاص الخاص اپنے گورنر' چیف سیکریٹری اور آئی جی کی تقرری میں رینجرز کے عدم اشتراک یا غیر موثر کردار' پنجاب اسمبلی کے تمام حمایتی اراکین کی بے عملی اور اسلام آباد کے ہوٹل میں عیاشانہ قیام (نظر بندی؟) کے دوران میں پنجاب سے صد فی صد عدم رابطہ' پارلیمنٹ میں دفعہ ۲۳۴ کی رو سے منظور کردہ قرارداد کے عملی شکل اختیار نہ کرسکنے کی وجہ سے وہ پے درپے غیر موثر ہوتے چلے گئے اور پھر آخر میں افواج کی واضح' ٹھوس' اور کھلی مداخلت کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ میں رضاکارانہ طور پر مستعفی ہورہا ہوں' صاف صاف بتارہا ہے کہ ہوا کا رخ کس طرف تھا' ہے اور ہوگا!" ——— "نواز شریف عملاً بازی جیت چکے تھے مگر منظور وٹو ان کی جڑوں میں بیٹھ گئے اور پھر سرحد' سندھ و بلوچستان کے وزراء اعلیٰ نے بھی گرگٹوں کی طرح رنگ بدل لیا' بنیادی طور پر پنجاب کی حکومت ہی ان کی طاقت تھی' عملاً وہ ان کے ہاتھ سے نکل گئی تو سب کچھ نکل گیا اور وہ اسلام آباد میں بمعہ اراکین پنجاب اسمبلی محصور ہوکر رہ گئے' اس انداز میں (ظاہر ہے) وہ نومبر تک آخر کیونکر ٹکتے؟" ——— "اب جب دیوالیہ قومی معیشت کے تھنوں سے دودھ کی بجائے خون پینے لگا تو فوجی اور انتظامی بجٹ اور بیرونی سامراجی قرضوں اور ان پر سود کی ادائیگی کے بھی لالے پڑ گئے اور نہ صرف امریکہ' اس کے بین الاقوامی مالیاتی اداروں بلکہ خود افواج پاکستان سے حاصل کردہ ہمت و توانائی اور ذہانت و دانائی کے بل بوتے پر کرنے والے نے صرف ایک مہینے میں ہی اس ناممکن کو ممکن بنا ڈالا اور مجبوراً جاگیرداروں پر چوٹ ماردی لیکن ان کے آنسو بھی پونچھ دیئے گئے ہیں' معین قریشی صاحب نے دودھ بھی دیا ہے تو مینگنیوں بھرا دیا ہے' جس تاریخی مہنگائی کی واقعی ہوئی بھٹی میں انہوں نے عوام الناس کو جھونکا ہے وہ ناقابل معافی ہے!" ——— "موجودہ صورتحال میں عوام کی بہت بڑی اور بھاری اکثریت جیتے جی موت کے منہ میں دھکیل دی گئی ہے' پاکستان

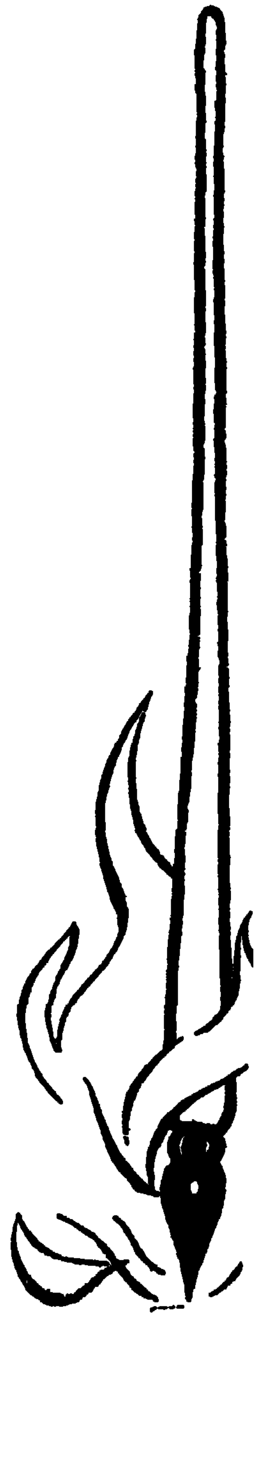


اور پاکستانی عوام کی موجودہ ناگفتہ بہ درگت بنانے والے اگلے پچھلے سارے چور اچکے' ڈکیت' لٹیرے' جمہوری حقوق اور بالغ رائے دہندگی کے تحت منتخب ہونے اور منتخب کرنے کرانے کے مزے لوٹتے رہیں تو کیا فرق پڑے گا؟" ——— "دراصل موجودہ صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے اراکین کی واضح ترین اکثریت جاگیرداروں' نوکرشاہی کے کارندوں' گماشتہ سرمایہ داروں اور ڈرگ مافیہ کے ہرکاروں پر مشتمل ہے' زمانہ حال کے استحصالی' ریاستی ڈھانچے' غیر منصفانہ سیاسی ماحول' جاگیردارانہ قبائلی اور سرمایہ دارانہ چوکھٹے نیز پسماندہ' ناخواندہ اور منتشر معاشرتی گورکھ دھندے میں آپ موجودہ انتخابی قواعد و قوانین کے تحت جب بھی کوئی الیکشن کروائیں گے اور کتنے ہی مثالی ایماندار لوگ کتنی ہی ایمانداری سے کرائیں گے (حالانکہ یہ ابھی تحقیق و تصفیہ طلب ہے) لامحالہ انہی ضمیر فروشوں کی اکثریت منتخب ہوکر آتی رہے گی۔ اس طرح کے انتخابات میں قیدی اپنے جیلر منتخب کیا کرتے ہیں' یہ ہمارا مطالعہ' مشاہدہ' تجربہ' تجزیہ' دعویٰ' اور چیلنج ہے۔ ماضی گواہ ہے یہی نتیجہ نکلے گا' آزمائش شرط ہے!" ——— "جن کے پاس ملک و قوم اور عوام کی اربوں کھربوں کی رقومات چڑھی ہوئی ہوں' ان کو انتخابات میں محض منتخب ہونے سے روکنے کو غیر جانبداری قرار نہیں دیا جاسکتا' وہ خود نہیں آسکیں گے تو اپنے بھائی بند یا پیارے کو آگے بڑھاویں گے' یہ بھی نہیں کرپائیں گے تو منتخب ہوکر آنے والوں کو خرید لیں گے اور تو اور خود منتخب پارٹیوں کی بولی لگادیں گے۔ انھیں کیا فرق پڑے گا' الہ دین کا چراغ تو ان ہی کے ہاتھ میں ہے' قوت خرید تو ان سے چھنی ہی نہیں گئی ایک دم روشنی پھیلا کر اور آنکھیں چندھیانے سے بات نہیں بنے گی۔ ڈگڈگی بجانے سے کام نہیں چلے گا' حرام مال کی تقسیر مٹانا پڑے گی' ڈھانا پڑے گی!" ——— "بڑے بڑے نامور ناوھندے اب بھی اس سلطنت خداداد کے عملی اور حقیقی رکھوالے بنے ہوئے ہیں!" ——— "قومی دولت میں خیانت کرنے والوں سے مطلوبہ وصولیابی کئے یا انہیں کیفر کردار تک پہنچائے بغیر مذکورہ سارے کام بیکار اور لاحاصل ہیں ——!"

یہ معروضات تھیں جو ہم ابھی ماضی قریب میں آپ کے گوش گزار کرچکے ہیں اس سے قبل ماضی بعید میں بھی ہم نے جو کہا تھا صداقت و حقانیت نے ان پراپنی مہرثبت کردی ہے (اس اداریہ کو ہم اقتباسات کے پے درپے حوالوں سے مزید طویل اور بوجھل نہیں بنانا چاہتے دوسرے صفحات پر "ریکارڈ آن فائل" کے عنوان کے تحت متعلقہ تین دستاویزات الگ سے پیش خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے)

آیئے اب انتخابی نتائج کی روشنی میں متشکل ہونے والی ملکی سیاست کا مزید جائزہ بھی لئے لیتے ہیں۔

دونوں بڑی منتخب سیاسی پارٹیوں کی ماہئیت قلب ہوتی نظر آرہی ہے ادھر ادھر ہر طرف سیٹوں کی مجموعی تعداد' پیپلز پارٹی اور اس کے حواریوں کی زیادہ ہے مگر مجموعی پاپولر ووٹ مسلم لیگ "ن" کو زیادہ ملے ہیں' مزید تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ جونیجو اور مختلف لیگوں کی توڑ پھوڑ کے باوجود مسلم لیگ' قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ اس انداز میں سنگل پارٹی کے طور پر ابھر کر آئی ہے۔ اور اب تک قائم سارے ریاستی' فوجی' انتظامی' امدادی سہاروں اور تمنے بازوں کو توڑ کر' کاٹ کر آئی ہے' خود پیپلز پارٹی کے مضبوط ترین ووٹ بینک چھین کر آئی ہے' پھر سب سے بڑی بات یہ کہ جنوبی پنجاب کے محفوظ ترین جاگیردارانہ علاقوں کے ریشمی دولوں کے بغیر آئی ہے اور تو اور جماعت اسلامی کے قائم کردہ پاکستان اسلامی محاذ کے ہاتھوں کم از کم بارہ سیٹیں پیپلز پارٹی کی طرف لڑھکانے کے بعد آئی ہے اس کے برعکس پیپلز پارٹی کو جہاں تعداد و شمار میں برتری ملی ہے وہاں اس کی پرانی تنظیمی اور سیاسی' شخصی اور اجتماعی آن بان شان میں کمزوری بھی صاف جھلکتی نظر آرہی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ بے نظیر کا دوبارہ برسراقتدار آجانا ان کے لئے فخر و اعزاز کی بات نہیں



بلاشبہ پاکستان جیسے دقیانوسی معاشرے میں ایک عورت ہوتے ہوئے ' نجی ' خاندانی ' جماعتی ' معاشرتی اور سیاسی پھندوں کے باوجود جس انداز میں انہوں نے پتے بازی کی ہے اور دوبارہ پالا مارا ہے اس کا سارا کریڈٹ ان کو جاتا ہے اور جانا چاہئے مگر یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ جو قیمت وہ اب تک دے چکی ہیں اور وہ دام جو انہیں ابھی مزید چکانے ہیں ان کے مدِنظر یہ کامیابی اور سرخروئی کہیں انہیں مہنگی نہ پڑ جائے ' وہ بالکل دیوار سے نہ جا لگیں ساری اسمبلیاں معلق ہیں ' لٹکی ہوئی ہیں پی پی اور ہیوا ' دونوں ہی اپنی سیاسی پارٹیوں کی بہتری کے لئے ضروری اچھل کود نہیں کر سکتے کہ ان کی اپنی ڈوریاں محدود ہیں اور ان دونوں کے بابا جان ' اسلام آباد میں بیٹھ کر کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں ہلانے میں سدا کے اور بلا کے ماہر و مشاق ہیں ' انتخابات کے بعد حکومت سازی کے دوران موصوف اسلام آباد میں ہی تھے ' انہوں نے پنیر کا ٹکڑا لگا کر جس طرح مچھلی کے حلق میں کانٹا اٹکایا تھا وہ عالم آشکارہ ہے یہ جملے ہمیں پھر اس لئے لکھنے پڑ رہے ہیں کہ پنجاب میں انہوں نے پاکستان کی موجودہ سیاست کے سب سے بڑے لوٹے اور بدترین ممو کو ترپ کا پتہ بنا ڈالا ' حالانکہ سب کو ہی علم و تجربہ ہے کہ اس قماش کے لوگوں کے متعلق رائے عامہ کیا ہوا کرتی ہے۔ کیا میاں منظور وٹو ' پنجاب کے جام صادق نہیں ہیں؟ بے نظیر بھٹو نے اب پھر جس طرح بالمشافہ ملاقاتوں یا ٹیلیفون پر رابطوں کے ذریعے مولانا سمیع الحق ' چوہدری سالک ' قاضی حسین احمد ' نصر اللہ ' اکبر بگٹی ' جتوئی وغیرہ کو پذیرائی بخشی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پھونک پھونک کے قدم رکھ رہی ہیں آئندہ بھی اسی طرح انہیں محتاط ' ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہئے کہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اشخاص مثلاً امین فہیم ' ممتاز بھٹو ' بیگم نسیم ولی ' جی ایم سید ابھی اور ہیں ' ان کے سسر بھائی ' شوہر اور والدہ بھی ' بہرحال ایک مسئلہ ہی ہیں ' پھر ایم کیو ایم کا کٹھن مرحلہ تو ابھی باقی ہے عالمی سیاست میں بھی عراق و فلسطین کیساتھ ساتھ صومالیہ سے آنے والی ' ہموطن فوجیوں کی لاشیں اور خود وہیں پر گھسیٹی جانے والی امریکی فوجی کی لاش کا سارا پس منظر بھی ایک سوالیہ نشان ہے اس کا ممکنہ تسلسل بھی ان کے خلاف ہی جائیگا۔ کشمیر کے سلسلے میں بھی امریکہ نے بھارت کو اسرائیل اور پاکستان کو پاسر عرفات بنانا ہی بنانا ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انفرادی طور پر افراد کی ہینڈ لنگ HANDLING اور غیر معمولی بھاگ دوڑ الگ مسئلہ ہے اور قومی و بین الاقوامی سطح پر ماضی ' حال اور مستقبل کے سنگین ترین معاشی ' سیاسی اور معاشرتی تضادات کو سائنسی اور عوامی انداز میں حل کرنا قطعی دوسرا مسئلہ ہے یوں اقتدار کسے اچھا نہیں لگتا ' سب اس کے دیوانے ہیں مگر حصول اقتدار کے لئے FOUL GAME کھیلنا اچھا نہیں لگتا ' غیر موثر اور بے ثمر اقتدار حاصل کر لینا زیب نہیں دیتا! محض اقتدار برائے اقتدار کو ٹھوکر کا مستحق بھی ہونا چاہیے ' کب ؟ یہ تو وہی بتا سکیں گی!

پاکستان اسلامی فرنٹ اور دیگر مذہبی محاذوں کا تجربہ بھی تھیوکریسی ' کو ملائیت اور جاگیرداریت کی علمبردار جماعتوں کی طرف سے کیا گیا تھا جو کم از کم ایک جماعت کو بہت مہنگا پڑا ہے۔ اس کے ۷۰ فیصد کارکنوں نے تو گھر بیٹھ کر ان انتخابات کی عملی سرگرمیوں میں حصہ لیا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۰۷ سیٹوں پر جو ۱۴۳ امیدوار کھڑے کئے گئے تھے ان میں سے صرف ۳ کامیاب ہوسکے جب کہ پہلے جس حلقہ انتخاب میں ۳۷۰۰۰ ووٹ ملا کرتے تھے وہاں سے اب صرف ۵۰۰۰ ہزار ہی ملے ' ماضی میں ریکارڈ اس سے تو بہتر تھا کہ ۱۹۷۰ میں ۲ ' پھر ۱۹۸۸ میں ۵ اور ۱۹۹۰ میں ۸ امیدوار کسی نہ کسی طرح بہرحال منتخب تو ہو ہی گئے تھے ' عملی طور پر تو شاید یہ بتایا گیا ہے کہ جماعت نے انتخابی مہم پر ۹۰۲ ملین روپے خرچ کئے جبکہ اندازہ لگانے والوں نے غیر سرکاری طور پر ۳۰۰ ملین روپے کے اخراجات بتائے ہیں ' PIF کے پلیٹ فارم سے جو پروگرام دیا گیا اور جو نعرے بیچے گئے ' ان سے تو عوام کے دکھ درد کا احساس جھلکتا تھا ' امریکہ دشمنی بھی حرز جاں تھی لیکن الیکشن میں حاصل ہونے والے ووٹ اتنے کم ہیں کہ اب پوچھنے والے یہ پوچھتے پھر رہے ہیں کہ جب عوام نے نہ ووٹ دیئے نہ دام دیئے تو اتنے خطیر اخراجات کیونکر ہوئے اور کہاں سے آئے؟



ایک اور بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ کہ قاضی حسین احمد صاحب کی ذاتی آمدنی ۳۰، ۴۰ ہزار روپے ماہانہ ہے' ان کے صاحبزادے کی بوسٹن امریکہ میں پڑھائی وغیرہ کے جملہ اخراجات ہی بارہ لاکھ روپے سالانہ ہیں اس طرز بود و باش کے ساتھ اعلیٰ عوامی قدروں سے وابستگی کے یہ بلند و بانگ نعرے اور وعدے کیا ایک ایسا کھوکھلا ڈھونگ نہیں تھا جو قطعی طور پر ناکام رہا اور عوام کی نظروں میں EXPOSE ہو کر رہ گیا۔

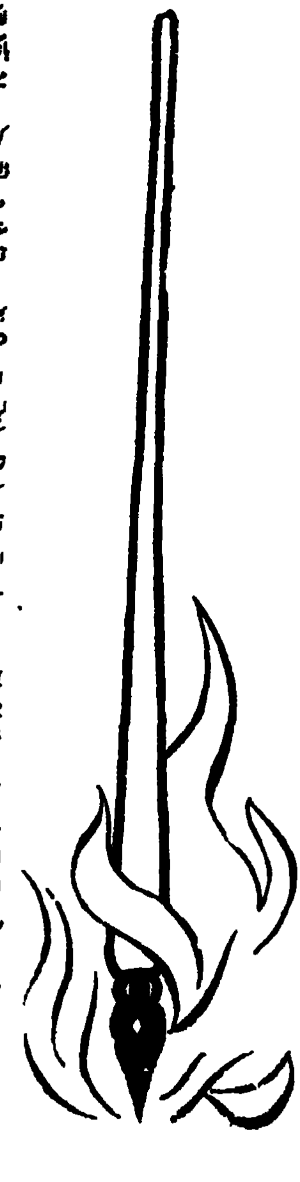
آخر میں علامہ اقبال' مفکر پاکستان کے حوالے سے یہ بات کہی جائے کہ جمہوریت میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے' کل رجسٹرڈ ووٹروں میں سے تقریباً چالیس فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے تھے ان میں سے جیتنے والی بڑی پارٹیوں کو بیس بیس فیصد ووٹ بھی نہیں پڑے ہیں اور جیتنے والی ہی چھوٹی پارٹیوں' اقلیتی و آزاد امیدواروں کے ہاتھوں میں اقتدار کا توازن آگیا ہے۔ ذرا مقام عبرت کا ادراک و احساس کیجئے کہ پاکستان جیسی نظریاتی مملکت اور بارہ کروڑ مسلمانوں کی قسمت کا دارومدار ان لوگوں پر ہے؟!

ووٹ کے اہل جن لوگوں کے نام فہرست رائے دہندگان میں شامل نہیں ہیں اگر ان لوگوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ساٹھ فیصد سے بھی زیادہ لوگوں نے ان انتخابات میں کسی قسم کا کوئی حصہ ہی نہیں لیا۔ یہ بورژوا بلکہ جاگیردارانہ اور قبائلی سیاست کے اصل خدوخال اور اعداد و شمار ہیں۔ اس پہلو پر نہ مبصرین نے کوئی تبصرہ کیا' نہ ماہرین نے ان حالات کا کوئی جائزہ لیا' حالانکہ اصل دکھتی رگ ہی یہ ہے۔ اس پر کسی معالج نے ہاتھ نہیں رکھا' مرض کی تشخیص کرنے کے لئے نبض تو دیکھنا چاہئے نا؟ رائے دہندگان کی الٹی سیدھی ووٹنگ' برادری سسٹم' تعصبات' خرید و فروخت' جعلسازی' پروپیگنڈہ' دیہی مزارعوں کی مجبوریاں اور نہ جانے کیا کیا کچھ خارج از بحث کر بھی دیں تو ووٹنگ میں حصہ نہ لینے والوں کی اتنی کثیر اور واضح تعداد کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہئے یہ عدم شرکت' یہ عدم دلچسپی ایک طرح سے اس طرز جہانبانی پر عدم اعتماد ہے۔ یہ ایک طرح کا غیر اعلان شدہ بائیکاٹ ہے۔ روایتی اظہار بیزاری ہے۔ جو فی الحال بے عملی کی شکل میں ہے' PASSIVE ہے۔ مگر اندازہ لگا لیجئے کہ۔

ابھی تو خیر سلامت ہیں ایک دو دامن
چمن کو رسم جنوں بہا گئی تو کیا ہوگا

پھر عوام دشمن سارے ہی حکمراں بھی اسے ختم کرنے کی کوششیں ہی نہیں کرتے اتنی بڑی تعداد میں عوام الناس کو لاتعلق رکھنے والا نظام زرگری' جھوٹ و مکاری' جہالت و غلاظت' محرومی و غربت' پسماندگی و بیگانگی مسلط کرکے کیسے کیسے مظالم توڑتا ہے' یہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں سے پوچھئے' خود اپنی آنکھوں سے دیکھئے' اپنے دلوں کو ٹٹولیے اور پھر یہ اندازہ لگائیے کہ ہمارے گرد کتنے جالے ہیں' ایک کو توڑیں تو دوسرا موجود' دوسرے کو توڑیں تو تیسرا موجود' ایک لامتناہی سلسلہ ہے ان کا' اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے نہ تو مابعد الطبیعاتی سوچ سے کام چلے گا اور نہ ہی مابعد الانتخابی عمل سے بات بنے گی۔ ذرا غور سے تو دیکھئے کہ یہ سارا کھیل کود' یہ سارا انتخابی عمل جس کے متعلق دعویٰ کیا جارہا ہے کہ آزادانہ' غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہے' صاف و شفاف ہے' دراصل صدیوں سے قائم شدہ استحصالی نظام کو قائم رکھنے کا دلچسپ کرتب اور سوچا سمجھا ڈھونگ ہے' آنکھوں سے کاجل چرانے اور مکھن سے بال نکال لینے والے ہاتھ کی صفائی ہے اور صاحب مانتا ہے گا کہ کمال کی صفائی ہے۔

(منشور، ستمبر ۱۹۹۳ء) محمد سعید عباسی



رشید احمد جالندھری

اکتوبر ۱۹۹۳ء کے انتخابات اور ہمارے مسائل

پاکستان کو اپنی مختصر سی تاریخ میں کئی بار سیاسی بحرانوں کا شکار بننا پڑا۔ ان میں سے ۱۹۷۱ء کا بحران ایک خوف ناک المیہ پر منتج ہوا اور نصف ملک وفاق سے الگ ہو کر بنگلہ دیش کے نام سے وجود میں آگیا۔ خیال تھا کہ ہمارے ارباب اقتدار اس المیہ سے سبق لے کر اپنے سیاسی اور اجتماعی نظام کا جائزہ لیں گے اور گہری نظر سے اپنی ناکامیوں کا کھوج لگا کر پاکستان کو صحیح معنی میں ایک اخلاقی، جمہوری اور فلاحی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن صد افسوس۔ ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ سیاست اور اقتدار پر ان لوگوں کا قبضہ رہا جو جمہوریت کی اخلاقی اقدار پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ یا وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ روح عصر یا فطرت کے تازیانہ عبرت کو سمجھنے کی کوشش کریں، یا ایک نئے اخلاقی اور جمہوری انسان کے روپ میں دوسرا جنم لے سکیں، چنانچہ ہم نے دیکھا کہ سیاست میں وہی آمرانہ مزاج، معیشت میں وہی ظالمانہ روش کام کر رہی ہے، جس کے ہاتھوں اخلاق، عدل و انصاف اور قانون کی برابر بے حرمتی ہوتی رہی اور ہماری اجتماعی زندگی، رشوت، سفارش اور لوٹ مار کی علامت بن کر رہ گئی۔ غرضیکہ اس المیے کے بعد بھی ہماری سیاسی زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی، جس پر ۱۹۷۱ء سے پہلے چل رہی تھی۔ چنانچہ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا اور نیا پاکستان ایک بار پھر سیاسی بحرانوں کا شکار ہوا، اس سلسلے کی آخری کڑی جولائی ۱۹۹۳ء کا ڈرامہ ہے۔ جس میں مرکز اور صوبے ایک بار پھر سیاسی حریف کی حیثیت سے ایک دوسرے کے سامنے آئے۔ اور کروڑوں عوام اپنے مستقبل کے بارے میں قلق و اضطراب کا شکار ہوئے۔ مقام شکر ہے کہ ایک غیر سیاسی منظم قومی ادارے نے اس بحران پر قابو پانے کی راہ ہموار کی اور نئے انتخابات کے لیے نگران حکومت وجود میں آئی اور لوگوں

نے سکھ کا سانس لیا۔ لیکن اہل درد نے اس قلق کا اظہار بھی کیا کہ کیا جدید انتخابات ہمارے مسائل کا مداوا ہیں؟ بے شبہ یہ قلق اور یہ اضطراب جائز اور فطری ہے، کیوں کہ انہیں ڈر ہے کہ ان انتخابات کی راہ سے پھر وہی لوگ اقتدار میں آئیں گے، جو ادھر کئی سال سے تخت سلطانی پر تسلط جمائے بیٹھے رہے ہیں اور جنھوں نے اپنے اقتدار کو ذاتی مفاد کا زینہ بنائے رکھا ہے۔ انہیں کبھی بھی بہ وجوہ قومی مسائل اور اس کی مشکلات سے کوئی سروکار نہیں رہا۔

قومی مسائل سے ارباب اقتدار کی غفلت و بے رخی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قومی دولت پر برابر سالہاسال سے یورش ہوتی رہی۔ لیکن "منتخب حکومت" نے نہ صرف اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، بلکہ اہل ہوس نے انہی کے زیر سایہ قومی دولت کو دونو ہاتھوں سے لوٹا، اس لوٹ مار میں بنکوں سے لیے گئے بھاری قرضے اور مال دار لوگوں کو دیے گئے پلاٹ بھی شامل ہیں، کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۲ء تک پاکستانی حکومت نے ترقیاتی منصوبوں کے لیے جو بیرونی امداد وصول کی تھی اس کا چوراسی (۸۴) فی صد حصہ سرکاری رپورٹوں کے مطابق ۲۲ خاندانوں میں چلا گیا۔ چنانچہ یہ برابر کہا گیا، کہ پاکستان میں دو قومیں پہلو بہ پہلو زندگی بسر کر رہی ہیں، ایک طرف خانماں برباد کروڑوں عوام ہیں، جن کے دکھ درد نے اقبال اور جناح کی ساری توانائیاں جذب کر کے پاکستان کو جنم دیا تھا۔ دوسری طرف چند "خاندان" ہیں جو عوام کے نام پر مسند اقتدار پر براجمان ہیں۔ لیکن عوام سے دور، چنانچہ زندگی کے ان تلخ حقائق کی بنا پر بجا طور پر کہا گیا کہ جو لوگ انتخابات کی موجودہ شکل کو اپنے مسائل کا حل تصور کرتے ہیں، وہ تمناؤں میں الجھائے گئے ہیں۔ کیوں کہ یہ انتخابات ہی ہیں جنھوں نے اب تک ان لوگوں کے سروں پر "خواجگی" کا تاج رکھا ہے۔ جنھیں جز نہیں روش بندہ پروری لیا ہے، عوام اور اہل درد اسی کشمکش میں تھے کہ نگران حکومت نے آئندہ آنے والے انتخابات کو موثر اور بامقصد بنانے کے لیے اعلان کیا کہ جن

لوگوں کا دامن مندرجہ بالا خرابیوں سے داغ دار ہے وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں گے ایسے ہی حکومت نے بیمار معیشت کو سہارا دینے کے لیے دوسرے جرات مندانہ فیصلے کیے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ غیر سیاسی نگران حکومت قومی اسمبلی میں ایسے لوگوں کو لانا چاہتی ہے، جن کا دامن بدعنوانی کے ہر دھبے سے صاف ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اقدامات پر بہت سے لوگوں کو خوش گوار حیرت ہوئی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ جو کام بہت پہلے "منتخب حکومت" کو کرنا چاہیے تھا، اسے ایک غیر سیاسی حکومت سرانجام دے رہی ہے۔ عرفی نے سچ کہا ہے۔

سر خدا کہ عارف و زاہد بہ کس نہ گفت

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

جہاں حکومت اپنے طور پر اصلاح احوال کے لیے بڑی ہمت پامردی اور اخلاص سے کام کر رہی ہے، وہاں موجودہ نازک حالات نے عوام الناس کے کندھوں پر بھی بھاری ذمہ داریاں ڈال دی ہیں۔ عوام کا اخلاقی، جمہوری اور مذہبی فرض ہے کہ وہ ملک و قوم کو درپیش سنگین مسائل کا شدت سے احساس کریں اور ان لوگوں کو ووٹ دیں جو صحیح معنی میں نہ صرف قومی و ملی مشکلات سے آگاہ ہیں بلکہ اپنے مذہب، تاریخ اور روایات کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں اور پوری قوم کو حالیہ مادی اور معنوی زبوں حالی سے نکالنے کا درد رکھتے ہیں۔ آج ہم تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں اگر ہم نے ووٹ کا صحیح استعمال نہ کیا تو پھر ہمیں وقت کے خلاف زبان پر حرف شکایت لانے کا کوئی حق نہ ہو گا واقعہ یہ ہے کہ ووٹ ایک مقدس امانت ہے اور اس امانت میں خیانت کرنے کا شرعی طور پر کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ کسی نالائق یا بدعنوان امیدوار کو ووٹ دینے کا معنی یہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر امانت میں خیانت کی ہے اور ملک و قوم کے مستقبل سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ، "(مسلمانو) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہے

وہ اس کے حوالے کر دیا کرو، (ایسا نہ ہو کہ کسی حق دار اور اہل کے حق سے انکار کرو) جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو چاہیے کہ انصاف کے ساتھ کرو۔" (النساء ۵۸)

یہ آیت کریمہ دین و شرع کے بنیادی احکام سے تعلق رکھتی ہے، جس نے معاشرے کے ہر گروہ کو اس امر کا پابند بنایا ہے کہ امانت کو اس کے اہل تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ جہاں ارباب حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام، ظلم و ستم کے خاتمے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے کام کریں، وہاں عام لوگوں کا بھی فرض ہے کہ وہ حقوق الناس کو ادا کریں۔ چنانچہ امانت کو واپس کرنا، یا عدالت میں سچی گواہی دینا یہ سب باتیں حق کو حق دار تک پہنچانے کے حکم میں آتی ہیں، جس طرح لوگوں پر اپنے بھائیوں کے حقوق پورے کرنا فرض ہے، اسی طرح اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت کرنا بھی اللہ کی امانت ہے، جس کا ادا کرنا انسان کے ذمہ واجب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق پرستی اور انسان دوستی کو اختیار کر کے ہی ہم صحیح معنوں میں ادائے امانت کے فریضہ سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔

(المعارف جولائی ۱۹۹۲ء)

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن المقداد بن معد یکرب قال قال رسول اللہ ﷺ ما اکل احد طعاماً قط خیراً من ان یاکل من عمل یدیہ وان بنی اللہ داؤد علیہ السلام کان یا کل من عمل یدیہ- (صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل و عملہ بیدہ)

حضرت مقداد بن معد یکربؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمایا ہوا رزق ہے۔ بے شک اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی محنت سے روزی کماتے تھے۔

اس حدیث کو انسان کے عمل و حرکت، جدوجہد اور سعی و کوشش کے سلسلے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں ہر شخص کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی تاکید کی گئی ہے اور کسبِ مال و طلبِ رزق کے لیے تگ ودو کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

اسلام لوگوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ بے کار نہ رہو اور کسی پر بوجھ نہ بنو، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا اور دوسرے سے توقع رکھنا کہ وہ اسے کچھ دے اور اس کی مالی مدد کرے، اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ اس سے انسانی شرف مجروح ہوتا ہے اور خودداریِ نفس کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ رزق جو انسان خود کما کر نہیں کھاتا اور محنت اور مشقت سے حاصل نہیں کرتا، وہ انسان کو ناکارہ بنا دیتا ہے اور اس کی تگ و تازِ فکر و عمل کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے سے سخت الفاظ میں منع کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم گھوڑے پر سوار ہو اور ہاتھ سے چابک گر جائے، تب بھی کسی سے یہ نہ کہو کہ وہ زمین سے چابک اُٹھا کر تمھارے ہاتھ میں تھما دے۔

اس حدیث کا مطلب درحقیقت کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے اور کسی کا محتاج ہونے سے روکنا ہے۔ احتیاج اور سوال وہ فعل ہے جو انسان میں بُزدلی اور جُبن کے جراثیم پیدا کرتا ہے، سخاوت اور علو ہمت کو ختم کرنے کا باعث بنتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو نبی اکرم ﷺ نے ان کو محنت مزدوری سے رزق حاصل کرنے کا حکم دیا، حالاں کہ مدینے کے لوگ نہایت نرم خو اور رحم دل تھے اور مہاجرین کی ہر قسم کی مدد کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے، لیکن نبی ﷺ نے مہاجرین مکہ کو انصار مدینہ کی امداد پر انحصار کرنے کی اجازت نہیں دی، خود مہاجرین نے بھی اس کو پسند نہیں کیا اور انصار مدینہ کی مخلصانہ پیش کش کو قبول کرنا خودداریٔ نفس کے منافی قرار دیا۔ اپنا کام آپ کرنا اور اپنے ہاتھ سے کما کر روزی حاصل کرنا ہی ان کے نزدیک ضروری ٹھہرا۔

جو لوگ دوسروں کے دستِ نگر ہوتے ہیں اور حصولِ رزق کے ایسے ذرائع تلاش کرتے ہیں جن میں محنت و مشقت نہ کرنا پڑے، ان کو معاشرے میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہر شخص ان کی تحقیر کرتا اور ان سے دُور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ عزت و احترام کا مستحق اسی شخص کو سمجھا جاتا ہے جو حصولِ رزق کے لیے محنت کرتا ہے اور کسبِ حلال سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالتا ہے۔

اس سلسلے میں ہادی برحق ﷺ کا یہ فرمان کس درجے رفعت و عظمت کا حامل ہے۔

اليد العليا خير من اليد السفلى۔

اُونچا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے کہیں بہتر ہے۔

ہاتھ کی اُونچائی اور بلندی خیر و برکت کا بہترین پیمانہ ہے۔ اُونچے ہاتھ سے صدورِ خیرات کا تسلسل جاری رہتا ہے، لہذا وہ ہاتھ اس ہاتھ سے بہر حال بہتر ہے، جس میں خیرات کا مال گرتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ان الفاظ میں فلسفہ یہ پنہاں ہے کہ سوال کرنے والا اور محنت سے جی چرانے والا شخص ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے اپنے آپ کو حقیر اور کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس مشقت سے کمانے اور اپنے ہاتھ سے روزی حاصل کرنے والا شخص معاشرے میں گردن اُونچی کرکے چلتا ہے اور اسے ہر حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اس حدیث میں حضرت داوٗد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے محنت کرکے روزی کماتے تھے۔

صحیح بخاری کے نامور شارح شیخ بدرالدین عینی اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت داوٗد علیہ السلام دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! ایسی صورت پیدا فرما دے کہ میرے لیے اپنے ہاتھ سے کمائی کرنا آسان ہو جائے۔ میں اپنی معاشی ضروریات کا بوجھ بیت المال پر نہیں ڈالنا چاہتا۔ چنانچہ ان کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح شرفِ قبول بخشا کہ ان کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی مانند نرم کر دیا گیا۔ جب وہ زرہ بناتے تو لوہے کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے، وہ ان کے ہاتھ کی گرفت میں آکر آسانی سے ہر قسم کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔

حضرت داوٗد علیہ السلام دنیا کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایسی زرہیں ایجاد کیں جو باریک اور نرم زنجیروں کے حلقوں سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی پھلکی ہونے کی وجہ سے میدانِ جنگ میں سپاہی انہیں پہن کر آسانی سے نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ دشمن کے وار سے محفوظ رہنے کا وہ بہترین ذریعہ تھیں۔

صحیح بخاری کے ایک اور ممتاز شارح حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس حدیث کی شرح کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ خلیفۃ المسلمین کو اگرچہ بیت المال سے بقدرِ ضرورت وظیفہ لینا جائز ہے، تاہم افضلیت اس میں ہے کہ وہ بیت المال پر اپنا معاشی بار نہ ڈالے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات کے وقت وہ تمام رقم واپس کر دی تھی جو انہوں نے اپنے

زمانہ خلافت میں بیت المال سے وظیفے کی شکل میں وصول کی تھی۔

ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ جن لوگوں نے قوتِ بازو سے کام لیا اور اپنے ہاتھ سے کما کر رزق حاصل کرنے کی جدوجہد کی انہیں اگرچہ کتنے ہی ناسازگار اور ناموافق حالات سے گزرنا پڑا لیکن وہ زندگی میں کامیاب رہے اور مشکلات کی منزلوں کو طے کر کے اپنے مقصود کو پا گئے۔

اس کے برعکس جو لوگ ہمت ہار کر بیٹھ گئے، دوسروں پر غلط طور سے اعتماد کیا اور خود آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ناکام رہے اور معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہ کر پائے۔ لوگوں نے ان کو بے کار اور نکمے قرار دیا اور کسی نے ان کو قابلِ التفات نہ گردانا۔

بہتر اور اچھے لوگ وہ ہیں جو دنیا میں محنت اور جدوجہد کرتے ہیں، ناموافق حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے خود آگے بڑھنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔

(المعارف جولائی ۱۹۹۳ء)

فکرونظر
محمد اسماعیل ذبیح

یتیم پوتوں کی وراثت

قرآنِ کریم کی سورۃ نساء میں اولاد ذکور و اناث کی وراثت کا مسئلہ ان سب کے حصص کے ساتھ "یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ اَولَادِکُم" سے "فَلَھُمَا النِّصفُ" تک کمال جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، جس میں کسی قسم کا ابہام یا پیچیدگی نہیں۔ اور خون اور نطفہ کے تسلسل کے ساتھ خطِ مستقیم کی صورت میں یہ سلسلہ جتنا بھی نیچے تک چلا جائے، متفقہ طور پر تمام علما اور فقہا کے نزدیک وہ اولاد ہی کہلاتا ہے۔ اس اعتبار سے یتیم پوتوں کے اولاد ہونے میں بھی کسی کو اختلاف نہیں۔

جو فقہا ان یتیموں کو محجوب الارث قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک بھی یتیم اولاد کی محرومی کی یہ وجہ نہیں کہ وہ انھیں اولاد نہیں سمجھتے، بلکہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک یتیموں کا چچا ان سے اقرب ہے، جس نے یتیم اولاد کو محجوب الارث قرار دے دیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا فی الواقعہ چچا اقرب ہے؟ اور وہ یتیم اولاد کو محجوب الارث ٹھہرا سکتا ہے؟

۱۔ اس سلسلہ میں جب ہم قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اولاد جزءِ المیت ہے، اقرب نہیں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ قرآنِ حکیم میں فرماتے ہیں، وَجَعَلُوا لَہٗ مِن عِبَادِہٖ جُزءًا (الزخرف ۴۳ : ۱۵)۔ یہ آیت مشرکینِ مکہ، یہود اور نصاریٰ کے اس غلط اور مشرکانہ عقیدہ کی نفی کرتی ہے کہ خدا کا کوئی بندہ اللہ کا بیٹا ہے یا فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں۔

اس آیت کی رو سے اولاد کا ہر فرد جزءُ المیت ہے، اقرب نہیں، کیونکہ جزو ذات کے کسی حصّے کا نام نہیں ہے۔ اور اقرب تو وہ ہے، جو ذات کا حصہ نہ ہو، بلکہ علیحدہ وجود رکھتا ہو، البتہ اس میں قرب کا تعلق تفضیل کے ساتھ پایا جاتا ہو۔ اس اعتبار سے یتیموں کا چچا، جو میت کا بیٹا ہے، جزءِ المیت قرار پاتا ہے، اقرب نہیں۔ اور جب صورت یہ ہے کہ وہ اقرب ہی نہیں تو وہ اقرب کی بنیاد پر یتیم بھتیجوں کا حجب کیسے کر سکتا ہے؟

۲۔ ایک دوسری آیت جو لِلرِّجَالِ نَصِیبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ " (النساء ۴:۷) کے الفاظ میں ہے۔ اس میں 'الاقربون' کو 'الوالدان' پر عطف کیا گیا ہے۔ اور اصولِ کلام کی رو سے عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین اقربون میں شامل نہیں اور جب والدین اقربون میں شامل نہیں، تو والدین کا کوئی جزو یعنی اولاد بھی اقربون میں شامل نہیں۔ اور اقرباء وہ ہوئے، جو والدین اور اولاد کے سوا دوسرے رشتہ دار ہوں۔ ان دونوں آیتوں کی رو سے میت کا کوئی بیٹا بیٹی اقرب نہیں، بلکہ جزء المیت ہے۔ اور جب یتیموں کا چچا، جو میت کا بیٹا ہے، خود اقرب نہیں، تو وہ اقربیت کی بنیاد پر یتیموں کا حجب کیسے کر سکتا ہے؟

۳۔ ہمارے علمائے فرائض کے نزدیک بھی اولاد کا جزء المیت ہونا مسلم بات ہے۔ علمِ فرائض کی مشہور کتاب "السراجی" جو ہمارے مدارسِ اسلامیہ میں، بالعموم، داخلِ نصاب رہی ہے، اس کے باب 'العصبات عصبہ بنفسہ' کی بحث میں مصنفِ کتاب علامہ عبدالرشید سجاوندی فرماتے ہیں:

وھم اربعة اصناف جزء الميت واصله وجزء ابنه وجزء جده۔	"اس کی چار قسمیں ہیں: جزوِ میت، میت کی اصل، جزوِ ابن اور جزوِ جد۔"

اور پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعنی اولھم بالميراث جزء الميت اي البنون ثم بنوهم وان سفلوا ثم اصله اي الاب ثم الجد اي اب الاب۔ (السراجی، باب الوصیات)	"مطلب یہ کہ میراث کا سب سے پہلا حق دار جزوِ میت، یعنی بیٹے ہیں اور اس کے بعد ان کے بیٹے، اور اگر نیچے جائیں، تو پھر اصل، یعنی باپ، اور پھر دادا، یعنی باپ کا باپ۔"

تعجب ہے کہ جس اولاد کو وہ جزء المیت قرار دیتے ہیں، اسی جزء المیت، یعنی یتیموں کے چچا کو، جو میت کا بیٹا ہے، اسے اقرب بھی قرار دیتے ہیں، اور اسی اقربیت کی بنیاد پر یتیم پوتوں کو اس کی موجودگی میں محجوب الارث ٹھہراتے ہیں، حالانکہ جب یہ جزء المیت ہیں، تو اقرب نہیں۔ اور اگر اقرب ہیں، تو جزء المیت نہیں، چونکہ جزو، ذات کے حصے کا نام ہے اور اقرب اس وجود کا جو ذات سے الگ ہو اور اس کے ساتھ قرب کا تعلق تفضیلی صورت میں ہو۔ ایسے ورثا جو کسی دوسرے وارث کے ہوتے ہوئے محجوب الارث ہوتے ہیں، اور اس کے نہ ہونے کی

صورت میں وارث، علماے فرائض نے ان کے لیے جو تفریعی قانون مرتب فرمایا ہے، وہ حجب حرمان کہلاتا ہے۔ یہ دو ضابطوں پر مشتمل ہے جنھیں میراث کے شہرۂ آفاق عالم عبدالرشید سجاوندی نے اپنی کتاب "السراجی" میں ان لفظوں میں بیان کیا ہے :

وھو مبنی علی اصلین. احدھا کل یدلی الی المیت بشخص لا یرث مع وجود ذلک الشخص. والثانی الاقرب فالاقرب.	"اور یہ (حجب حرمان) دو ضابطوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ جو شخص میت کے ساتھ کسی دوسرے آدمی کی نسبت سے رشتہ رکھتا ہو، وہ اس شخص کی موجودگی میں وارث نہیں ہوگا۔ اور دوسرا ضابطہ ہے 'الاقرب فالاقرب' یعنی پہلے وراثت اقرب کو ملے گی، وہ نہ ہو تو اسے جو اس کے بعد اقرب بنے گا۔"

گویا خون اور نطفہ کے تسلسل میں، یکے بعد دیگرے، جو اقرب آتے جائیں گے، وہ وارث ہوں گے۔ اور الاقرب وارث، ثم الاقرب وارث کا سلسلہ جاری رہے گا۔

ان دونوں ضابطوں پر نظر ڈالی جائے، تو ان دونوں کی رو سے یتیم پوتے چچاؤں کے ہوتے وارث قرار پاتے ہیں، کیونکہ پوتے اپنے دادا کے ساتھ اپنے باپ کی نسبت اور واسطہ سے رشتہ رکھتے ہیں، چچاؤں کے واسطہ سے نہیں۔ اور قاعدۂ اول کی رو سے خالی اقربیت محجوب الارث بنانے کے لیے کافی نہیں، بلکہ شخصِ حاجب کا واسطہ ہونا ضروری ہے، اس لیے باپ کی موجودگی میں پوتے محجوب الارث ہیں، لیکن جب باپ موجود نہ رہے، تو وارث قرار پاتے ہیں، کیونکہ باپ، جو حاجب تھا، موجود نہیں رہا۔ جہاں تک ان کے چچاؤں کا تعلق ہے تو وہ یتیم پوتوں کے لیے حاجب نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ اس قانون کی رو سے حجب کے لیے صرف اقربیت کافی نہیں، بلکہ واسطہ اور نسبت بھی ضروری ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یتیم اولاد چچاؤں کے واسطے سے اپنے دادا کے ساتھ رشتہ نہیں رکھتے، بلکہ اپنے باپ کے واسطہ سے رکھتے ہیں۔ اگر چچاؤں کو اقرب مان بھی لیا جائے، تو بھی وہ، چونکہ یتیم اولاد کے لیے واسطہ کی حیثیت نہیں رکھتے، اس وجہ سے ان کا حجب نہیں کر سکتے۔

ہم جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اولاد جزء المیت ہے، اقرب نہیں، اس لیے اس قاعدہ کا اطلاق ہی اولاد پر نہیں ہو سکتا۔ اس کا دائرۂ کار اولاد اور والدین کے سوا دوسرے رشتہ داروں تک محدود ہوگا۔ تاہم، اگر اس کا اطلاق اولاد اور والدین پر بھی مان لیا جائے، تو چونکہ

اصول و فروع کے ان رشتہ داروں میں باہمی نسبت اور واسطہ کا تسلسل ہے۔ اس لیے الاقرب فالاقرب کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے باپ، پھر دادا اور پہلے ماں، پھر نانی۔ اور اسی طرح، پہلے بیٹا پھر اس کا بیٹا یعنی پوتا، درجہ بدرجہ وارث قرار پائیں گے۔

۵۔ علامہ السید الشریف علی الجرجانی علم میراث میں امام فن کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "الشریفیہ، شرح السراجی" میں دونوں قاعدوں پر بحث کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ دونوں قاعدے یتیم اولاد کو چچاؤں کی وجہ سے محروم نہیں کر سکتے۔ اُن کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف "السراجی" نے قاعدۂ اوّل پر اکتفا نہیں کیا کہ یہ خیال نہ کیا جا سکے کہ یتیم اولاد چچا کے ہوتے وارث ہے، کیونکہ چچا ان کے لیے واسطہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ (جب کہ قاعدۂ اوّل کی رو سے کسی کو محجوب الارث قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ حاجب واسطہ کی حیثیت رکھتا ہو۔)

اور دوسرے قاعدے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "الاقرب فالاقرب کا یہ قاعدہ مطلق معنوں میں باپ کے ہوتے ہوئے ثانی کو محروم الوراثت قرار دیتا ہے (جو صحیح نہیں) اور مطلق نہ مانیں تو یہ قاعدۂ اوّل بن جاتا ہے۔ اور یتیم اولاد چچاؤں کے ہوتے ہوئے وارث قرار پاتی ہے۔ اور یہ قاعدۂ ثانی بعینہٖ قاعدۂ اوّل بن کر رہ جاتا ہے۔" (الشریفیہ، باب الحجب)

۶۔ ہمارے وہ علما جو اولاد کو اقرب قرار دیتے ہیں، انھوں نے اس بات کی طرف توجہ نہیں فرمائی کہ اقرب اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اور تفضیل کا اطلاق ہمیشہ ایک ہی ذات پر ہوتا ہے، جیسے 'اللہ اکبر' میں لفظِ اکبر۔ 'افضل الرسل' میں لفظِ افضل۔ 'احکم الحاکمین' میں لفظِ احکم ایک ہی ذات کے لیے ہے۔ اب غور فرمایا جائے کہ جب کسی وفات یافتہ شخص کے ایک سے زیادہ بیٹے ہوں تو اُن میں اقرب کسے قرار دیا جائے؟ اگر کسی ایک کو اقرب قرار دیں، تو یہ ترجیح بلا مرجح ہے۔ اور اگر سب کو اقرب قرار دیں، تو یہ کس اصول و قاعدہ کی بات ہوگی؟ ایسی صورت میں تفضیل، تفضیل نہیں رہے گی، کیونکہ یہ سب بیٹے مساوی الدرجہ ہیں، چنانچہ ان سب کو اقرب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معلوم نہیں، ہمارے علما اولاد کو اقرب قرار دینے پر کیوں بضد ہیں، اور اس بنیاد پر یتیم پوتوں کو کیوں محروم قرار دے رہے ہیں؟ بہرحال، اس عاجز کی تحقیق اور جتنا کچھ شعور قدرت کی طرف سے ملا ہے، اس کے مطابق یتیم اولاد چچاؤں کی موجودگی میں وارث ہے۔ چچا اُن کا حجب نہیں کر سکتے، اور اس عاجز کو کتاب و سنت اور اصول میراث کی کوئی دلیل اب تک نہیں ملی جس کے مطابق سمجھ سکوں کہ یتیم اولاد چچاؤں کی وجہ سے محجوب الارث ہیں۔ اگر کسی کی بالغ نظر میں کتاب و سنت کی کوئی مضبوط اور واضح دلیل موجود ہو تو ضرور رہنمائی فرمائیں۔

(اشراق، اکتوبر ۹۳ء)

فیروز بخت

مولانا آزاد اور انکے دوست



قومی تہواروں پر فرزندانِ قوم کی بیساختہ یاد آجاتی ہے جو جنگ آزادی ہند کے ہیرو تھے جن کا احساس بھی باقی ہے کیونکہ صرف انہیں بے تحاشہ لوگوں نے قربانیاں دی ہیں بلکہ یہ قومی یکجہتی کی علمبردار بھی ہیں۔ بہرحال اکثر ان قومی تہواروں پر چاہے وہ پندرہ اگست ہو یا چھبیس جنوری ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا انگریزوں سے حاصل کی گئی اس قیمتی آزادی کا احترام کر رہے ہیں؟ کیا گاندھی، نہرو اور آزاد کی باتوں پر ہم نے کبھی دھیان دیا یا کبھی یہ سوچا ہے کہ وراثت میں وہ ہمارے لیے کیا چھوڑ گئے ہیں؟

مولانا آزاد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ دنیا کی تقلید نہیں کرتے تھے مگر دنیا اُن کی تقلید کرتی تھی۔ میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے لوگوں کو انہوں نے یہ بتایا کہ مذہب کی دو سطح ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو تفرقہ پیدا کرتی ہے۔ یعنی مذہب کے جھنڈا ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے، جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے، وہ چھوٹی سطح ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہر مذہب کی روح ملانے والی ہے یعنی ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے۔

مذہب کی یہ روح وحدت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لیے خود کو مٹانے کی روح ہے۔ یہ ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور ان تمام لوگوں کو سیکھنا چاہیے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان یا صوبے کی بنیاد پر یا کسی ذات پات پر یا کسی مذہب کی بنیاد پر ٹکڑیاں بنا کر جو لوگ زندگی کو منقسم بنانا چاہتے ہیں انہیں جان لینا چاہیے کہ مذہب پیار کا دوسرا نام ہے نفرت کا نہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں، تنگ وفاداریاں ہیں، وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں ختم کر دی جائیں۔ کسی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے۔ لیکن اس کو سب سے پہلے اپنے دیس کا پھر تمام انسانیت کا غلام بننا چاہیے۔ جب وہ سچا مسلمان ہے تب وہ سچا ہندوستانی ہو سکتا ہے۔ یہی سبق جس طرح ہمیں مولانا آزاد کی زندگی سے ملتا ہے ٹھیک اسی طرح گاندھی جی اور نہرو جی نے یہی پیغامِ انسانیت ہمیں دیا تھا۔ مولانا نے کہا تھا ہماری

ذہن کی حیثیتیں یورپ کی طرح مادہ پرستی کے پالکوں نے نہیں پیدا کیں بلکہ مذہب کے پالکوں نے پیدا کی ہیں۔ اگر ہم اس حالت سے اپنے کو نکالنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ مذہبی تعلیم کو آج کل کے حالات کے رحم پر چھوڑ دیں۔ اس طرح اس کی رونق ختم کر دیں کہ مذہب اپنے غلط رعب میں آ کر نوجوانوں کے دماغ کو بگاڑ دینے کا موقع نہ پائے۔"

گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو ایسی نادر روزگار ہستیوں کے نام ہیں جن کی زندگی کی تمام تر توانائیاں، فکر و عمل کی بلندیاں اور آرزوؤں اور جستجوؤں کی دلکشیاں ہندوستان کی متحدہ قومیت، سالمیت اور وحدت کے لیے وقف تھیں لیکن اس مثلث (گاندھی، نہرو، آزاد) میں مولانا آزاد کی اہمیت خود کانگریس کے وجود کو ایک جماعت کی حیثیت سے باقی اور قائم رکھنے کے لیے خاص معنی رکھتی ہے جس سے گاندھی جی اور پنڈت جی دونوں ہی بخوبی واقف تھے اور ان دونوں تاریخ ساز انسانوں کی نظر میں مولانا آزاد کی بصارت اور بصیرت، حب الوطنی اور انسانیت نوازی، ان کے علم و عمل کی تاجداری اور ذہنی ظلمت سے بیزاری باعث صد افتخار تھیں۔ اس مثلث کے دو زاویوں اور ضلعوں (آزاد، نہرو) کے آپسی تعلقات اور معاملات تاریخ کے حوالے سے غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے جس کی چند جھلکیاں اس مضمون میں ملیں گی۔

نئی نسل مولانا کی تہہ دار گراں مایگی کا اندازہ نہیں کر سکتی لیکن تاریخ ان واقعات کو سینے میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ایک مرتبہ جواہر لال نہرو کا فون آیا جسے مولانا کے ہمدم اجمل خاں نے سنا اور اندر جا کر مولانا کو خبر دی کہ پنڈت نہرو ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ فون پر کہہ دو "اس وقت نہیں۔" اجمل خاں پنڈت جی سے یہ نہ کہہ سکے اور کہہ دیا کہ مولانا صاحب کی آنکھ لگ گئی ہے۔ اگر بہت اہم بات ہو تو اٹھا دیا جائے۔ نہرو جی نے جواب دیا: "نہیں، تکلیف نہ دیجیے، صبح سہی۔" ٹھیک اسی طرح مولانا نے ایک دفعہ گاندھی جی کو واپس کر دیا تھا اور پھر وہ دوسرے دن تشریف لائے تھے۔ وجہ تھی کہ مولانا صاحب اپنی کسی ضروری تصنیف میں مصروف تھے اور مکمل ذہنی سکون کی خواہش رکھتے تھے۔ بڑا رعب تھا مولانا صاحب کا مگر اس بات کا کوئی دوسرا مطلب نہیں نکالنا چاہیے کیونکہ گاندھی جی کو وہ سیاست میں اپنا رفیق و استاد مان کر چلتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد کو جواہر لال نہرو سے دلی وابستگی اور سچی محبت تھی۔ دونوں نے احمد نگر قلعے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی ایک ساتھ اٹھائی تھیں اور ہر موقع پر جواہر لال کی قدر و قیمت و قابلیت کا انہیں صحیح اندازہ تھا۔ اسی طرح نہرو کو بھی مولانا کی مدبرانہ قابلیت اور جاذب شخصیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کانگریس کو کوئی بہترین مشورہ دے سکتا ہے تو وہ مولانا صاحب ہیں۔ مذہب اور سیاست دونوں ہی میدانوں میں مولانا کی صحافت نے تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ سیاست کی طرف آئے تو مسلمانوں کی سیاست کا رخ ہی بدل دیا اور سرسید کی بے جان پالیسی کو ختم کر کے ایک نئی جاندار تحریک کی بنیاد ڈالی۔ برطانوی سازشوں کا جو جال مشرق وسطی اور ہندوستان میں بچھا ہوا تھا اس کے پردے چاک کر کے رکھ دیئے۔ مسلمانوں کو عالم سیاست سے روشناس کرایا اور ہند کی جنگ آزادی میں سر بکف لا کھڑا کیا۔ پھر طرح طرح کے طوفان اٹھے، مخالفتوں کے زلزلے آئے مگر مولانا قطب کی طرح ڈٹے رہے، اٹل رہے۔ مولانا نہ صرف ہندوستان جدید کے معماروں میں ہیں بلکہ تمام عالم اسلامی میں جو آزادی کی تحریکیں اٹھی ہیں اور آج ایشیا کی سرزمین جس طرح بیرونی تسلط سے آزاد ہوئی ہے اس میں مولانا کے علم و عمل اور تبلیغ کا بڑا دخل ہے۔ وہ صحیح معنوں میں موجودہ ایشیا کے عظیم معماروں میں ہیں۔ دو قومی نظریہ کی تحریک کے زمانے میں مولانا کی دل آزاری کا کوئی طریقہ باقی نہیں رکھا گیا اور ان کے دل و دماغ پر اپنے اصولیوں، کم ظرفوں اور شناسیوں کے گہرے زخم لگائے لیکن مولانا پہاڑوں کا تحمل اور سکوت سینے میں چھپائے رہے اور کسی سے [illegible] کی۔ البتہ اس راستے سے بالکل نہیں ہٹے جو بچپن میں اختیار کر لیا تھا۔ اب ان اقدار کے مالک کہاں ملتے ہیں؟

جہاں تک گاندھی جی اور مولانا آزاد کا تعلق ہے دونوں حضرات ایک دوسرے کی رائے سے سیاسی امور انجام دیا کرتے تھے۔ گاندھی جی نے ہندو مسلم یکجہتی کے لیے اور لوگوں کو ہندو مسلم فسادات سے باز رکھنے کے لیے مرن برت رکھ لیا تھا جو بارہ جنوری انیس سو اڑتالیس کی رات کو شروع کیا گیا تھا۔ گاندھی جی کے پاس تمام دلی امڈ آئی اور ان سے کہا کہ فسادات روکنے کے لیے ان کے عقیدت مند سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں اور یہ کہ گاندھی جی اپنا مرن برت ترک کر دیں۔ مگر گاندھی جی کی شرط یہ تھی کہ وہ اپنا مرن برت جبھی توڑیں گے جب لوگ فسادات سے باز آئیں گے۔ تب مولانا نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی آ گئی ہے اور یہ کہ وہ برت توڑ دیں۔ گاندھی جی ہندوؤں اور مسلمانوں کی بحالی کے لیے جس شد و مد سے کوشاں تھے اور دلی کے مسلمانوں کی خاطر مرن برت رکھ کر انہوں نے جو معرکہ سر کیا تھا اس سے سنگھٹن اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے لوگ بدظن ہو گئے تھے مگر گاندھی جی نے ان کی پرواہ نہ کی۔ یہ ہندو مسلم یکجہتی کی بہترین مثال تھی۔

مولانا آزاد گاندھی جی کی بے پناہ عزت کرتے تھے مگر گاندھی وادی نہ تھے۔ کانگریس کے کچھ معاملات میں ان کا گاندھی جی سے اکثر اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ اپنی تصنیف "ہماری آزادی" میں اس کی نظیریں موجود ہیں کہ سوراج پارٹی سے لے کر تقسیم ہندوستان تک 1925 تا 1947 مولانا نے بعض بڑے بڑے مسائل میں گاندھی جی سے اختلاف کیا اور یہ



بات صاف تھی کہ کانگریس میں رہ کر گاندھی جی سے اختلاف کوئی معمولی بات نہ تھی مگر یہ اختلافات کبھی دشمنی میں تبدیل نہ ہوتے تھے بلکہ کوئی نہ کوئی حل یہ دونوں رہنما نکال لیا کرتے تھے خاص طور سے جب محمد علی جناح ایک دو قومی تحریک کی بات کیا کرتے تھے۔ مولانا کے خلاف مسلم لیگ تو خیر آگ بگولہ تھی وہ مسلمان بھی مولانا کے بارے میں تعصب برتتے تھے جو ان سے مختلف معاملات میں متفق نہ تھے مثلاً نیشنلسٹ مسلمان جو ضرورت سے زیادہ نیشنلسٹ ہو کر صرف ہندوستانی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے، سوشلسٹ یا کمیونسٹ مسلمان جنھیں مذہب سے دلچسپی نہیں تھی

مولانا تقسیم کو ہولناک خیال کرتے تھے ان کے نزدیک تقسیم ہندوستان کا زیاں تھا اور مسلمانوں کے مسئلے کا حل بھی نہ تھا کیوں کہ پاکستان سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا گھر نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلم لیگ نے اپنی جارحانہ سیاست کی بدولت ان سب کے ووٹ لیے تھے۔ علاوہ ازیں پاکستان و ہندوستان بٹوارے کے بعد آپس میں دوست نہیں ہو سکتے تھے۔ مولانا کے نزدیک اصل مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں معاشی تھا اور اختلافات جماعتوں کے درمیان نہیں طبقوں کے درمیان تھے مولانا نے اپنے ساتھیوں پر زور دیا کہ اس کا آخری نتیجہ مفید نہ ہوگا، مضرت بالآخر باہمی جنگ کا سر آغاز ہوگی جو چیز نفرت پر بن رہی ہو اس کے متعلق کوئی مثبت رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انجام کیا ہوگا۔ دونوں کے مابین ہمیشہ ذہنی لڑائی رہے گی۔ مولانا لکھتے ہیں: "میں تقسیم کے ہمیشہ خلاف تھا کیونکہ میرے خیال میں مسلمانوں کے لیے اس میں ہر اعتبار سے نقصان تھا۔ بلکہ ان کا وجود خطرے میں پڑتا تھا اور میں پچیس سال کے اندر اندر تقسیم کے مٹ جانے کا امکان تھا۔" میں تقسیم کے قریب جب مولانا نے گاندھی جی سے رجوع کیا تو انھوں نے مولانا کو یقین دلایا: "تقسیم میری لاش پر ہوگی اور کانگریس میری لاش پر ہی تقسیم کر سکتی ہے۔" اس پیچ گاندھی جی اور مولانا آزاد نا واقف تھے

پیش سے پہلے مگر وہ مقدر تھا۔ لیگ کا مطالبہ ہی تقسیم تھا۔ مولانا سے پاس ہے جب ملک خضر حیات ٹوانہ نے مولانا سے تقسیم کے بارے میں دریافت کیا تو مولانا نے کہا: "کیا کبھی پانی کے دھارے کو تلوار کی دھار تقسیم کر سکتی ہے؟" ایسی ایک اور تقریر میں تقسیم کے سلسلے میں انھوں نے کہا: "پانی پر چھڑی رکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے لیکن پانی جوں کا توں رہتا ہے اور چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم غائب ہو جاتی ہے۔" مولانا تقسیم کے بعد پاکستان و ہندوستان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں چاہتے تھے لیکن لیگ کا ذہن ان سے متعلق کھلا ہی نہ تھا ایک روایت کے مطابق مولانا نے حالات کی برہمی کا اندازہ کر کے لیاقت علی خان کو ایک طویل خط لکھا کہ دونوں ملکوں کے تنازعہ امور باہمی افہام و تفہیم سے طے ہو سکتے ہیں مگر جواب نہ ملا۔ مولانا یورپ جاتے ہوئے ایک دن کے لیے کراچی میں ٹھہرے۔ میٹروپول ہوٹل میں قیام کیا اور محمد علی جناح کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ لیکن لیگ کی لیڈرشپ کا انقباض دور نہ ہوا۔ ملک غلام محمد کے زمانے میں محمد علی بوگرہ وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے دہلی گئے تو مولانا نے ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ اس میں ہندوستان کے صدر، وزیر اعظم اور ارکان کابینہ کے علاوہ مختلف ملکوں کے سفرا بھی شریک تھے۔ مسٹر بوگرہ نے کسی مثبت جذبے کے تحت مولانا سے استفسار کیا: "مولانا! اب پاکستان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟" مولانا مسکرائے اور کہا: "پاکستان ایک سیاسی تجربہ ہے اسے کامیاب کیجیے۔" اور اسی کا نام ابوالکلام تھا کہ ان کا ہر کلمہ جامع الکلمات ہوتا ان کے چند الفاظ بہت سی کتابوں کا نچوڑ ہوتے۔ کوئی فقرہ ادھورا نہ ہوتا اور نہ کسی خیال میں کوئی تشنگی ہوتی ہر بات ابہام سے پاک ہوتی اور ہر خیال مربوط و مکمل ہوتا

ہندوستان سے محبت، اس کی سالمیت کی حفاظت، ہندو مسلم اتحاد اور حق گوئی مولانا آزاد کی متاع گراں تھی جس

وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔ انڈیا ونس فریڈم کے آخری چند صفحات کے کھلنے پر جو غلط فہمی پیدا ہوئی یا پھیلائی گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت کی بلندی اور ان کے قول و عمل کی یکسانیت آج کی نسل کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ان کے اعتراضات کسی کی خدمات کی نفی نہیں کرتے ہیں بلکہ خود ان کے خلوص کے آئینہ دار ہیں جیسے جواہر لال نہرو کے لیے انھوں نے ان متنازعہ صفحات میں یہ بھی لکھا ہے:

"سولہ اگست انیس سو چھیالیس کا دن نہ صرف کلکتہ کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے لیے یوم سیاہ تھا۔ حالات نے جس طرح سے کروٹ لی تھی اس نے حکومت کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت کرانے کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا۔ یہ ہندوستانی تاریخ کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی اور مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس تبدیلی کی ذمہ داری بڑی حد تک جواہر لال نہرو پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے اس بیان نے کہ کیبنٹ مشن پلان میں تبدیلی یا اصلاح کرنے میں آزاد ہوگی، سیاسی اور فرقہ وارانہ مصالحت کے سوال کو از سر نو کھڑا کر دیا۔ مسٹر جناح نے اس غلطی سے پورا فائدہ اٹھایا اور مسلم لیگ کی جانب سے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کو واپس لے لیا۔" ان تمام باتوں کے باوجود مولانا آزاد کی شفقت نہرو جی کے لیے اور پنڈت جی کا ادب و احترام مولانا آزاد کے لیے اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ قائم رہا۔ جس اختلاف کو تحریری شکل میں مولانا کے ان متنازعہ صفحات میں عام لوگوں سے نقاب جاتا، یہ نہرو جی اور مولانا آزاد اپنی زندگی میں ایک دوسرے کو بتا چکے تھے یہ کوئی راز نہ تھا اور نہ ہی اس کی وجہ سے دونوں کی دوستی میں کوئی فرق آیا...

ایک دن پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی مولانا آزاد کی کوٹھی پر ان سے ملنے آئے تو مولانا آزاد اس وقت کھدر کا جو کرتہ پہنے ہوئے تھے وہ مونڈھے کے اوپر سے پھٹا ہوا تھا۔ ان دونوں حضرات کو دیکھ کر مولانا نے مونڈھے کے اوپر چادر ڈال لی۔ ان حضرات نے مولانا سے کہا کہ انھیں معلوم ہوا ہے کہ وہ (مولانا) ان دنوں مالی مشکلات سے دوچار ہیں۔ اس ضمن میں وہ ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا وہ کسی قسم کا تعاون نہیں چاہتے اور باوجود سخت اصرار کے انھوں نے کسی قسم کی امداد قبول نہیں کی۔ الغرض ان کی بے نیازی اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ خود تکلیف اٹھاتے تھے لیکن کسی کا احسان کبھی بھی قبول نہ کیا۔ یہی خاصیت ان کے مرحوم بھتیجے نور الدین احمد (والد راقم) میں تھی۔ ان کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کے متعلق ان کی زبان سے کوئی گلہ یا شکوہ و شکایت کا جملہ نہ سنا گیا۔

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی دوستی کا بہترین دور احمد نگر قلعہ کی جیل میں گزرا۔ بقول مولانا آزاد 'اردو جواہر لال کی زبان تھی جسے انھوں نے ہمیشہ اپنی مادری زبان جانا۔ انگریزی ان کی اکتسابی زبان تھی جسے انھوں نے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ وہ سمجھتے انگریزی میں تھے محاورہ کی کوشش

یہ ہوئی تھی کہ کتاب کے چھپتے ہی اس کا اردو ترجمہ بھی بازار میں آ گیا۔ جواہر لال کی چائے پینے کی عادت کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں: "جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں۔ خواص یورپ کی عام شرابی کے ذوق میں بغیر دودھ کی چائے۔" جدوجہد آزادی کے دوران ایک دفعہ انگریزوں کے بارے میں مولانا نے کہا تھا: "مسلمانوں کے لیے آسان ہے کہ وہ بچھوؤں اور سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں۔ پہاڑوں کے غاروں اور جنگلوں میں چلے جائیں۔ وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں۔" ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں نہرو نے "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" (GLIMPSES OF WORLD HISTORY) میں لکھا ہے: "مذہب کا مقصد آپس کو نفاق نہیں اتفاق ہے۔ دل میں تمام مذہبوں کا احترام ہونا چاہیے۔"

مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں لکھا ہے: "اگر آج ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا کیونکہ اگر سوراج میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔" شروع سے ہی جب مولانا آزاد کی رہائش کلکتہ میں تھی تحریک آزادی کا جوش و ولولہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ کچھ کٹر جیالے بنگالی لوگ جنھوں نے تحریک آزادی ہند کی علیحدہ کوشش شروع کر رکھی تھی مولانا ان سے ملے اور ان کو



"یہ ہندوستانی تاریخ کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی اور مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس تبدیلی کی ذمہ داری بڑی حد تک جواہر لال نہرو پر عائد ہوتی ہے۔"

دعوت دی کہ بنگالی مسلمانوں کے ساتھ مل کر وہ لوگ اس تحریک کو لے کر چلیں۔ اس میں تحریک کے لیڈر شیام سندر چکرورتی پہلے تو تھوڑا شکوک رہے مگر جب دو ملاقاتیں آزاد سے ہو گئیں تو ان کے قدردانوں میں سے ایک ہو گئے اور اس طرح سے ہندو مسلم ایکتا کا یہ سبق انگریزی سامراج کے خلاف کافی پہلے سے ہی مولانا نے نہ صرف خود پڑھا تھا بلکہ دوسروں کو بھی پڑھاتے تھے اور جن لوگوں کو انھوں نے درس دیا تھا وہ ان کے گرویدہ ہو گئے تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دیش بندھو چترنجن داس کی زندگی کا کافی اثر مولانا پر پڑا تھا اور ان سے آزاد نے بہت کچھ سیکھا تھا

مہاتما گاندھی نے مولانا کی ایک تقریر کو جو فرقہ واریت کے زہر کے خلاف تھی بہت سراہا تھا۔ مولانا نے کہا تھا: جہاں تک فرقہ پرستی کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ فرقہ پرستی ایک دروازے سے نہیں آئی بلکہ کئی دروازوں سے آئی ہے تو یہ سب دروازے بند ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان جس کی آزادی کا ہم ستر برس سے خواب دیکھ رہے تھے برباد نہ ہو اور بربادی کے کسی دروازے میں نہ گھس جائے تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ جس دروازے سے یہ فرقہ پرستی آتی ہے اس دروازے کو بند کر دیں بلکہ ختم ہی کر دیں اس لیے آپ کو فرقہ پرستی کو ختم کرنا ہوگا۔ بقول عبدالرزاق ملیح آبادی: ہندوستان میں ہندو مسلم یکجہتی کا ایسا فرشتہ آج تک پیدا نہیں ہوا ہے جیسا کہ مولانا آزاد، وہ دوبارہ نہیں پیدا ہوگا۔ یہی تو جواہر لال نہرو نے مولانا کی وفات پر کہا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ مولانا آزاد کے بعد ہندوستان میں عظیم انسان پیدا ہی نہ ہوں گے۔ یقیناً پیدا ہوں گے۔۔ لیکن جو عجیب و غریب اور مخصوص عظمت مولانا آزاد کو حاصل تھی، وہ اب نہ تو ہندوستان میں کسی کو نصیب ہوگی اور نہ ہندوستان کے باہر کسی کے حصے میں آئے گی۔ وطن کا کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گا لیکن مولانا آزاد جو امیر کارواں تھے ہم سے جدا ہو گئے۔ اچھا ہو ہم ان کی تقلید کر لیں۔"

کیا ہم مولانا آزاد، گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی تقلید کر رہے ہیں یا ان کی روحوں کو اذیت پہنچا رہے ہیں؟ اس سوال پر ہر ہندوستانی کو غور کرنا چاہیے

جمشید قمر

مولانا آزاد کی رانچی میں آمد کا قصہ

(ایک خفیہ فائل کی روشنی میں)

البلاغ کے آخری شمارے (بابت ۱۷، ۲۴ و ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء) میں مولانا آزاد نے یہ خبر شائع کی:

"۲۸ مارچ کو گورنمنٹ بنگال کا حکم زیر دفعہ ۳۔ ڈیفنس ایکٹ پہنچا کہ میں چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دوں اور حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں۔ بعد کو یہ مدت ایک ہفتے تک بڑھا دی گئی۔ اس سے پہلے گورنمنٹ دہلی، پنجاب اور متحدہ اپنے اپنے صوبوں میں آنے سے روک چکی ہیں۔"

یہ خبر کلکتہ کے دوسرے اخبارات[1] میں بھی شائع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ صوبجات متحدہ[2]، پنجاب اور دہلی کی صوبائی حکومتوں کے لیے پریشانی کا سبب نہیں بن سکتی تھی کہ وہ پہلے ہی اپنے صوبوں کے حدود میں مولانا آزاد کے داخلے پر پابندی عائد کر چکی تھیں البتہ دیگر صوبائی حکومتوں مثلاً بمبئی، مدراس اور بہار و اڑیسہ کے لیے یہ تشویش اور اندیشے کا سبب ضرور بن سکتی تھی۔

صوبۂ بنگال کے پڑوس میں واقع بہار و اڑیسہ کی صوبائی حکومت کے لیے، مولانا آزاد کے اخراج کی خبر فوری طور پر توجہ کا مرکز بن گئی۔ جس اخبار میں یہ شائع ہوئی اس کا تراشہ[3] یکم اپریل ۱۹۱۶ء کو ایک نوٹ شیٹ پر چسپاں کیا گیا اور اس طرح حکومتِ بہار و اڑیسہ کی جانب سے مولانا آزاد پر ایک فائل کی ابتدا ہو گئی۔

خبر میں دو اطلاعات درج ہیں۔ پہلی اطلاع کے مطابق، [illegible] کو مولانا آزاد پر حکومت بنگال نے ایک حکم جاری کیا ہے۔ دوسری اطلاع کے مطابق، اسی طرح کے احکامات پہلے ہی پنجاب، صوبجات متحدہ اور دہلی کی حکومتیں جاری کر چکی ہیں۔ ایک طویل پیراگراف جس میں سرکاری حکم کا متن شامل ہے، اسے آخر میں درج کیا گیا، جس کے مطابق:

"۔۔۔گورنر با اجلاس کی رائے میں (یہ) یقین کرنے کے لیے معقول اسباب (موجود) ہیں کہ لال کنواں (دہلی) کے محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے، وہ عوامی سلامتی کے لیے مضرت رساں ہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ (مستقبل قریب میں بھی) وہ ایسا طرزِ عمل اختیار کریں۔ اب اسی وجہ سے گورنر با اجلاس اس اختیار کے استعمال میں، جو انھیں قانون (ضمیمہ) تحفظ ہند ۱۹۱۵ء (حکومتِ ہند کے اعلان نمبر ۸۶، مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۱۵ء میں شائع شدہ) کے دفعہ ۳۔ اے کے تحت مرحمت کیا گیا ہے (اس کے مطابق) یہ ہدایت دیتے ہیں کہ موصوف محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد صوبۂ بنگال کے حدود میں کسی مقام پر نہ داخل ہوں گے، نہ رہائش اختیار کریں گے اور نہ موجود ہوں گے۔ انھیں صوبۂ بنگال چھوڑنے کے لیے اس حکم کی وصولیابی سے چار دن کا وقت دیا جاتا ہے موصوف محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد خبردار کیے جاتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس حکم کی کسی ہدایت کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کی تو وہ قانون تحفظ ہند ۱۹۱۵ء کے ضابطہ میں تجویز کردہ سزا کے مستحق ہوں گے۔ اس حکم نامے سے ضابطہ کی ایک نقل منسلک کی جاتی ہے۔"

خبر میں جو اطلاعات درج تھیں ان سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ مولانا آزاد درحقیقت کس صوبے کے باشندے ہیں گو سرکاری حکم نامے میں انھیں 'لال کنواں (دہلی) کے محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد' کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا مگر حکم نامے سے ہی، صوبۂ بنگال سے اخراج کی بجائے، اس کے حدود کے کسی مقام پر داخل ہونے، رہائش اختیار کرنے اور موجود ہونے کی ممانعت ظاہر ہوتی تھی۔ خبر میں تین صوبائی حکومتوں کی جانب سے اسی طرح کے احکامات کے اجرا کی بات بھی کہی گئی تھی۔ ان اطلاعات سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ

تین صوبائی حکومتوں کی طرح اب بنگال کی حکومت نے بھی اپنے حدود میں ان کے داخلے پر پابندی لگا دی ہے۔ اپنی پیدائش کے اعتبار سے مولانا آزاد مذکورہ چار صوبوں میں سے کس صوبے کے باشندے ہیں، اس کا صحیح اندازہ چیف سکریٹری (حکومت بہار و اڑیسہ) بھی نہیں لگا پاتے ہیں جب ۲ر اپریل کو اخبار کا تراشہ ان کے سامنے لایا جاتا ہے اور وہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

چیف سکریٹری کے بعد ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے پاس اخبار کا تراشہ، اس توقع کے ساتھ بھیجا جاتا ہے کہ وہ اس کی نسبت کچھ بتانے کے اہل ہوں گے۔ ڈی۔ آئی۔ جی (پولیس) چونکہ بیمار تھے لہٰذا، ان کی غیر حاضری کے سبب ۴ر اپریل کو ان کے قائم مقام پولیس افسر نے اخبار کے تراشے اور چیف سکریٹری کی تحریر کا مطالعہ کیا۔ مولانا آزاد کے وطن کی نسبت صحیح جانکاری کے لیے، اُس نے اسی روز حکومت بنگال کے نام ایک تار ارسال کیا۔

۵ر اپریل کو مولانا آزاد کے متعلق دو اہم اطلاعات موصول ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد ہی مولانا آزاد کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت اس اندیشے، ساتھ ہی تشویش کا لازمی نتیجہ تھی جس کا سامنا یکم اپریل کو حکومت بہار و اڑیسہ نے اخراج کی خبر کی وصولیابی کے فوراً بعد کیا۔ مذکورہ پولیس افسر، جس نے مولانا آزاد کے متعلق اطلاعات وصول کی تھیں، اس نے اسی روز چیف سکریٹری کو یہ اطلاع دی کہ وہ بنگال سے مولانا آزاد کی خفیہ سرگزشت کو حاصل کر رہا ہے۔

ڈی۔ آئی۔ جی (پولیس) کے قائم مقام افسر کو مولانا آزاد کے متعلق جو دو اطلاعات ملی تھیں اور جن کو وصول کرنے کے بعد اس نے بنگال سے رابطہ قائم کیا تھا، ان میں سے ایک اطلاع کلکتہ سے مولانا آزاد کی روانگی سے متعلق تھی۔ اس کے مطابق مولانا آزاد ۳ر اپریل کو کلکتہ سے روانہ ہوتے ہیں اور اگلی صبح یعنی ۴ر اپریل کو پنجاب ٹرین سے بمبئی (کی جانب) جاتے ہوتے، بانکی پور (پٹنہ) سے گزرے ہیں، وہ اس لیے کہ وہ مدراس بھی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ اطلاع مقامی طور پر ۵ر اپریل کو حاصل ہوئی تھی، اس پر توجہ دی گئی۔ سبب یہ تھا کہ یہ مولانا آزاد کی روانگی اور اس صوبے کے حدود میں ان کی آمد سے متعلق تھی۔ دھیان میں رہے کہ ابھی تک حکومت بنگال کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں آئی تھی اور صوبائی حکام ایک غیر مصدقہ اطلاع کا سامنا کر رہے تھے۔

مولانا آزاد کی نقل و حرکت اور ان کی سرگرمیوں پر بنگال پولیس کی نظر پہلے ہی سے تھی جو سرکاری حکم کے جاری ہوتے ہی پوری طرح حرکت میں آ گئی۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ مولانا آزاد ۴ر اپریل کی رات میں، ٹرین سے رانچی کے لیے روانہ ہوتے ہیں، اس نے بذریعہ تار حکومت بہار و اڑیسہ کو مطلع کر دیا۔ تار ۵ر اپریل کو دن میں ۲ بجکر ۴۰ منٹ پر روانہ کیا گیا۔ یہ اسی دن رانچی سکریٹریٹ میں دن کے ۳ بجکر ۳۵ منٹ پر وصول کیا گیا۔ اس سے پہلے صوبائی حکام کے پیش نظر، مولانا آزاد کی کلکتہ سے روانگی، ان کے سفر کی سمت اور ممکنہ جائے قیام کے بارے میں ایک غیر مصدقہ اطلاع تھی۔ تار پر نظر پڑتے ہی، ان کے لیے رانچی کی مقامی پولیس سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ اسی وقت آئی۔ جی۔ پولیس نے ایس پی (رانچی) سے فون پر رابطہ قائم کر کے، انھیں اس امر کی اطلاع دی اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کہ وہ مولانا آزاد کو رانچی میں تلاش کریں، ان کا پتہ لگائیں۔ ۶ر اپریل کی شام تک مقامی پولیس کو رانچی میں مولانا آزاد کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ آئی۔ جی (پولیس) کی ہدایت پر ایس۔ پی نے اس کی اطلاع بذریعہ تار حکومت بنگال کو بھیج دی۔

۶ر اپریل کو کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار 'بنگالی' میں ایک خبر شائع ہوئی۔ اس کے مطابق محی الدین احمد (سابق ایڈیٹر، الہلال) جنھیں حالیہ سرکاری حکم کے ذریعے بنگال سے خارج کر دیا گیا ہے، وہ منگل کو کلکتہ سے کہا جاتا ہے کہ بمبئی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ صوبائی حکام اس خبر کی جانب ۷ر اپریل کو متوجہ ہوتے کہ یہ کلکتہ پولیس کی ارسال کردہ روانگی کی تاریخ (۴ر اپریل مطابق منگل) کی تصدیق کرتی تھی۔ انھیں کلکتہ پولیس کی اطلاع پر یقین تھا کہ مولانا آزاد رانچی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ اخبار میں بمبئی کے لیے روانگی کی اطلاع دی گئی تھی، اس بارے میں انھیں کوئی خوش گمانی نہیں تھی۔

۷ر اپریل کو بھی رانچی کی مقامی پولیس مولانا آزاد کو دریافت کرنے میں ناکام رہی۔ ناکامی کی خبر محکمہ پولیس کے اعلیٰ افسران تک پہنچی۔ ڈی۔ آئی۔ جی کا یہ بیان ملاحظہ ہو جس میں گزشتہ اطلاع کی تصحیح بلکہ تردید کی گئی ہے ساتھ ہی موجودہ صورت حال کے نتیجے میں قیاس آرائی کا یہ انداز اپنایا گیا ہے:

"اب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو، مسٹر مظہر الحق سے ملاقات کی خاطر، بمبئی کے لیے جاتے ہوئے بانکی پور (پٹنہ) سے گزرنا تھا، لیکن جیسا کہ موخر الذکر بانکی پور سے باہر گئے ہوئے ہیں، لہٰذا یہ ملاقات ملتوی کر دی گئی اور یہ اطلاع کردہ (مولانا آزاد) ۴ر اپریل کی صبح میں بانکی پور سے گزرے ہیں، درست نہیں ہے۔ کلکتہ کے پولیس کمشنر کے ذریعے ان کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ ۴ر اپریل کی شب میں وہ رانچی کے لیے روانہ ہوتے ہیں لیکن رانچی کے ایس پی جنھیں (اس اطلاع کی نسبت) فون کیا گیا ہے، وہ ابھی تک وہاں پر ان کا پتہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ یقین کرنے کی وجہ یہ بھی دکھائی دیتی ہے کہ اس شریف آدمی نے اپنی حقیقی منزل کے بارے میں کچھ بھی ظاہر نہیں کیا۔ اگر رانچی میں اس کا پتہ نہیں چل پایا تو یہ بالکل ممکن ہے کہ راہ میں کسی اسٹیشن

ا اُتر گیا ہوگا اس کے بعد کہیں اور چلا گیا ہوگا۔"

صوبائی حکام کو مولانا آزاد کی روانگی کے بارے میں جو اطلاعات
ہاتھیں، ان کے تئیں ان کی کارروائیوں سے ان کی مستعدی کا
ں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روانگی کے متعلق
ہیں ابتدائی اطلاعات نے انھیں متوحش اور نہایت پریشان
ا تھا، جبکہ رانچی میں ان کی موجودگی کی تصدیق اور ان کے
میں تفصیلی معلومات کی فراہمی کے مراحل ابھی باقی تھے۔

یکم اپریل کو بنگال سے مولانا آزاد کے اخراج کی خبر سامنے
۵ اپریل کو کلکتہ سے ان کی روانگی کی اطلاع وصول کی گئی۔ ان
دنوں میں صوبائی حکام کو مولانا آزاد کے بارے میں محض یہ معلوم
ا کر وہ بمبئی کے مولوی ابوالخیر الدین کے اکلوتے صاحبزادے
جنھوں نے کلکتہ میں رہائش اختیار کرنے سے پہلے دہلی میں
لیا۔ ۶ اپریل کو انھیں اور دو معلومات فراہم ہوئیں ان کے
ق:

"۱۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو اس وقت کے الہلال کے مدیر ـــــ
آزاد، مسٹر مظہر الحق کے ساتھ پٹنہ میں ٹھہرے ہوتے تھے۔
ا ایسی ملاقات کا مقصد معلوم نہیں ہو سکا۔"

"۲۵ فروری ۱۹۱۴ء کو انجمن اسلامیہ (پٹنہ) کے ایک جلسے میں
آزاد شریک ہوئے۔ اس میں ترکی پارلیامنٹ کے ایک رکن توفیق
ی موجود تھے۔ مولانا آزاد نے کوئی تقریر نہیں کی۔"

صوبائی انتظامیہ کے حکام کو یہ معلومات محکمۂ پولیس کی وساطت
صل ہوئیں۔ یہ ناکافی اور ادھوری تھیں۔ ان سے تھوڑا بہت مولانا
کے خاندانی پس منظر اور کسی حد تک اس صوبہ کی ایک سیاسی
بت سے ان کے تعلق اور یہاں کی ایک سیاسی سرگرمی سے ان کے
و سمجھا جاسکتا تھا۔ حکومت کے اپنے ریکارڈس میں مولانا آزاد سے
ی متفرق طور پر کافی معلومات درج تھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ
وہ نہیں تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکام، مولانا آزاد کے بارے میں
مربوط معلومات کے طلبگار تھے، جن سے ان کو بخوبی جانا اور سمجھا
ا ہو۔ انھیں معلوم تھا کہ محکمۂ پولیس نے ۵ اپریل کو ہی بنگال
ں کے نام معلومات کی فراہمی کے لیے ایک درخواست بھیج رکھی ہے۔

صوبائی محکمۂ پولیس کی درخواست پر بنگال پولیس نے مولانا
سے متعلق اپنا خفیہ نوٹ ارسال کر دیا۔ اسے یہاں کے ڈی۔ آئی۔
پولیس) نے ۷ اپریل کو وصول کیا۔ یہ مہر بند لفافے میں پولیس
ن کو اس تاکید کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ اسے انتہائی خفیہ طریقے
ونظر رکھیں۔ اس سے ضروری اقتباسات فائل کے تین صفحات پر
لیے گئے۔ یہ ملاحظہ ہوں:

"(مولانا ابوالکلام آزاد) اُردو ہفتہ وار اخبار "الہلال" کے
اور مدیر ہیں۔ یہ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی ابتدائی
تعلیم اپنے والد مولانا خیر الدین (مرحوم) سے حاصل کی۔ ان کے والد
ابوالکلامی، در حقیقت دہلی کے باشندے تھے مگر وہ مکہ چلے گئے اور
وہیں انھوں نے رہائش اختیار کرلی خیرالدین جوان ہوئے اور وہیں
انھیں تعلیم دی گئی وہ پچاس سال پہلے ہندستان آئے اور بمبئی میں
رہنے لگے جہاں ان کے بہت سے مرید تھے آخرکار وہ کلکتہ کے لیے
روانہ ہوگئے۔ جہاں ۱۸۹۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش
ہوئی ۱۹۰۱ء میں ان کے والد کی موت ہوئی۔ ابوالکلام نے کلکتہ،
لکھنؤ اور دہلی میں تعلیم حاصل کی اپنے والد کے مریدوں کے ذریعے
جمع کی گئی رقم سے انھوں نے "الہلال" اخبار جاری کیا۔ وہ عربی کے
ایک اچھے عالم اور فارسی و اُردو کے اچھے واقف کار ہیں۔ وہ شائستہ
خطیب اور ادیب ہیں اور اپنے کردار میں تقویٰ و استقامت
کے سبب اپنے ہم مذہب افراد کے درمیان قابلِ احترام سمجھے
جاتے ہیں۔ ان کا اخبار، مسلمانوں اور بالخصوص ان کے پیروکاروں
(مریدوں)، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں
میں ہے ان کے درمیان بہ نظر تحسین دیکھا جاتا ہے۔ وہ ان سے مالی
عطیات وصول کرتے ہیں۔

وہ انتہا پسند اور شورش پسند ہیں۔ بلقان کی جنگ پر ان
کی تقریریں اور الہلال کا عمومی لہجہ یہ دونوں برطانیہ مخالف میلان
کو آشکار کرتے ہیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے سلسلے میں
ایک نشست منعقد ہوئی جس میں انھوں نے کہا کہ عیسائی اقوام
ترکی کو مستقل طور پر اکھاڑ پھینکنے کی درپے ہیں اس سے پہلے جولائی
۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے سلسلے میں یو۔ پی کی حکومت کی طرف
سے اُٹھائے گئے اقدامات کی یہ کہتے ہوئے انھوں نے سخت مذمت
کی کہ یہ (اقدامات) مذہبی آزادی پر براہِ راست مداخلت کی طرح
ہیں۔ ایڈریانوپل کے بارے میں برطانوی وزیر اعظم کی دھمکی پر
سات کروڑ مسلمانوں نے ناراضگی ظاہر کی اور انھوں (مولانا آزاد)
نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وزیر اعظم نے صاف طور پر اسلام پر
غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے حزب اللہ
سوسائٹی قائم کی جو چاہتی ہے کہ ہر مسلمان کو جو قرآن کے حرف و معنی
سے آشنا ہے، اسے اپنی زندگی اسلام پر قربان کرنے کے لیے تیار
رکھنی چاہیے۔ انھوں نے انجمن خدام کعبہ کی حمایت کی ہے اور وہ اتحاد
اسلامی کے ایک خطرناک حامی ہیں۔ ان کے خصوصی معاونین کے نام
ذیل میں درج ہیں:

(i) مولوی نجم الدین احمد، ایک ریٹائرڈ ڈپٹی مجسٹریٹ
(ii) کامریڈ کے۔ محمد علی
(iii) شوکت علی (نمبر ۲ کے بھائی)
(iv) دہلی کے حکیم اجمل خاں
(v) بانکی پور کے مظہر الحق

نمبر ۵ سے گفت و شنید کے لیے بڑی بے باکی سے وہ بانکی پور جاچکے ہیں۔ اور بعد میں وہ دو بار رانچی بھی جاچکے ہیں۔ اپنے اخبار الہلال کے برطانیہ مخالف لہجے کے سبب پریس ایکٹ کے تحت انھیں کلکتہ میں دو ہزار روپے کی رقم بطور ضمانت بھی جمع کرنی پڑی اور یہ رقم قابلِ اعتراض مضمون کی اشاعت کے سبب حال ہی میں ضبط کرلی گئی ہے۔ اپنے اتحاد اسلامی کے کافی نمایاں خیالات سمیت وہ بے حد قابل اور نہایت خطرناک آدمی سمجھے جاتے ہیں۔"

وہ تمام اہم معلومات، جن سے مولانا آزاد کو بہ خوبی جانا اور سمجھا جاسکتا تھا، ان اقتباسات میں مربوط طور پر موجود تھیں۔ مولانا آزاد کے خاندانی احوال، ان کے خیالات، ان کی سرگرمیوں کے میلانات، نیم سیاسی و نیم مذہبی تنظیموں سے ان کے روابط، حکومت کی نظر میں مشتبہ اور ناپسندیدہ افراد سے ان کے تعلقات، حکومت کی جانب سے ان کے خلاف کی گئی کارروائیاں، یہ سبھی اہم امور ان میں درج تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان سے ان کی مختصر سوانح حیات اور ان کی سابقہ سرگرمیوں کے نمایاں اور اہم احوال ظاہر ہوجاتے تھے۔ ساتھ ہی ان کے مطالعے سے ایک ایسی شخصیت کا تعارف ممکن ہوجاتا تھا، جو نہ صرف اپنے ہم مذہب افراد کے درمیان قابلِ احترام تھی بلکہ اپنی سرگرمیوں کے سبب حکومتِ وقت کی نظر میں نہایت خطرناک بھی واقع ہوئی تھی۔

۷، اپریل تک صوبائی حکام کو مولانا آزاد کے بارے میں کافی معلومات فراہم ہوچکی تھیں کلکتہ سے ان کی روانگی کی اطلاع ۵، اپریل کو ہی وصول کی جاچکی تھی اسی کے مطابق ان کو رانچی میں تلاش کرنے کا کام بھی شروع ہوچکا تھا۔ تین دن تلاش و تفتیش کی نذر ہوگئے اور ان کا پتہ کہیں پر نہیں چلا۔ اس مرحلے پر حکومت کی پوری مشنری مستعد اور چاق و چوبند نظر آتی ہے۔ اس درمیان میں انتظامیہ کے حکام نے کلکتہ پولیس کے افسران سے اور افسران نے مقامی پولیس سے برابر رابطہ قائم رکھا۔ مولانا آزاد کے متعلق اب تک کی دستیاب معلومات کے پیشِ نظر، رانچی میں ان کی موجودگی کا پتہ چلانا ان سب کے لیے بے حد ضروری ہوگیا تھا۔

۸، اپریل کو کئی اطلاعات وقفے وقفے سے صوبائی حکام کو موصول ہوتی ہیں۔ ان میں سے پہلی اطلاع بڑی اہم ہے۔ اہم اس لیے کہ پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ جب کلکتہ سے مولانا آزاد روانہ ہوتے تو وہاں کے ایس پی مسٹر البرٹ سیموئیل نے ان کا تعاقب کیا۔ غالباً احتیاط کے طور پر اس خیال سے یہ تعاقب ضروری سمجھا گیا کہ ختم سفر کے بعد ان جائے قیام کا پتہ معلوم رہے۔

۵، اپریل کو دن میں دس بجے کے قریب کلکتہ سے آنے والی ٹرین رانچی کے پھاٹک سے دور والے اسٹیشن پر رکتی ہے۔ اس کے ایک ڈبے سے دوسرے مسافروں کی طرح مولانا آزاد بھی پلیٹ فارم پر اترتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے مسٹر سیموئیل بھی اتر پڑے۔ انھوں نے پلیٹ فارم پر ایک بھیڑ کا مشاہدہ کیا، ما نو لوگ کسی کے استقبال کے لیے آئے ہوئے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد جب ریل چھوڑ دیا کے چھوڑ دیا گئی تو بھیڑ چھٹ گئی۔ اور اسی درمیان میں مولانا آزاد مسٹر سیموئیل کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اس موقعے پر ایس۔ پی موصوف کی جو حالت ہوئی ہوگی اس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہر حال انھوں نے اپنے طور پر مولانا آزاد کا سراغ پانے کی ہر ممکنہ کوشش کی مگر وہ ناکام رہے۔ آخر کار چوتھے دن یعنی ۸، اپریل کو انھوں نے محکمۂ پولیس کے آئی۔ جی سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ آئی جی اس وقت آفس میں موجود نہیں تھے۔ انھوں نے آئی۔ جی کے پرسنل اسٹنٹ سے ملاقات کی اور اس سے مولانا آزاد کی بابت دریافت کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے واقعے کو بھی بیان کیا۔ پی اے نے آئی جی کی اطلاع کے لیے اس واقعے کو فائل میں درج کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر سیموئیل کے بیان کا یہ اثر تھا کہ پی۔ اے نے ایک بار پھر مقامی پولیس سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ ایس۔ پی (رانچی) اس وقت آفس میں نہیں تھے۔ لہٰذا، پی۔ اے نے آئی۔ جی کی جانب سے ڈی۔ ایس۔ پی (رانچی) کو ہدایت دی کہ وہ رانچی میں مولانا آزاد کا پتہ لگائیں۔

مولانا آزاد سے متعلق فائل میں مذکورہ واقعہ درج تو ہے مگر تفصیل سے نہیں۔ اسی طرح اس میں یہ بھی درج نہیں کہ مقامی پولیس نے مولانا آزاد کا پتہ لگانے میں کن دشوار گزار مراحل کا سامنا کیا۔ مولانا آزاد کی شکل و شبیہ کی جانکاری پولیس کو مہیا تھی کہ نہیں۔ اس کا بھی پتہ فائل سے نہیں چلتا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نو واردانِ شہر پر پولیس نے یقیناً نظر رکھی ہوگی۔ شہر میں نئے چہروں کی تلاش اسے ضرور رہی ہوگی۔ فائل میں اطلاعات کی شکل میں جو تحریر درج ہے۔ اس سے واقعات کی ایک تصویر ضرور مرتب ہوسکتی ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مقامی پولیس محکمے کو مولانا آزاد کی رانچی میں آمد کی کوئی بھنک نہیں ملی۔ ملتی بھی کیسے؟ صوبائی پولیس افسران کو ان کے بارے میں جس وقت اطلاع ملی اور انھوں نے مقامی پولیس کو انھیں تلاش کرنے پر مامور کیا اس وقت تک مولانا آزاد سفر تمام کرکے مقیم ہوچکے تھے۔ ظاہر ہے اب پولیس کے پاس آنے والے رستوں پر نظر رکھنے کا سوال ہی نہیں تھا بلکہ رانچی میں ان کی موجودگی کا پتہ لگانا ان کے لیے ضروری امر تھا۔ رانچی اس وقت تک کوئی بڑا شہر تو تھا نہیں کہ وہ اس کی بڑی آبادی میں گم ہوجاتے اور ان کا پتہ لگانا بہت ہی دشوار ہوتا۔ اس حقیقت کے باوجود، واقعہ یہ ہے کہ پولیس تین دنوں تک شہر میں ناکام پھرتی رہی۔ ان تمام ممکنہ مقامات پر، جہاں پر ان کی موجودگی کا امکان تھا، پولیس وہاں تک

ضرورگی ہوگی۔ تلاش و تفتیش کے اسی مرحلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ رونما ہوتا ہے۔

پولیس مولانا آزاد کو تلاش کرتے سرکاری ڈاک بنگلے پہنچتی ہے۔ وہاں پر مقیم لوگوں میں مولانا آزاد کے نام سے کوئی شخص ہے اس بابت اس نے ڈاک بنگلے کے ملازمین سے پوچھ تاچھ کی۔ ملازمین نے یہاں پر اس نام کے کسی شخص کی موجودگی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پولیس اس وقت لوٹ آئی۔

۸، اپریل کو شام کے وقت مقامی تھانے کے افسر انچارج نے ڈی۔ ایس۔ پی کو یہ اطلاع دی کہ ڈاک بنگلے کے آس پاس ایک مشتبہ شخص کو دیکھا گیا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی ڈی۔ ایس۔ پی نے شام کے ساڑھے چھ بجے صوبائی پولیس ہیڈ کوارٹر کو اس امر کی اطلاع دی۔ اِدھر سے یہ خبر کرنے کی "کہ مولانا آزاد کو گرفت میں لے لیا گیا ہے" ہدایت آئی' علاوہ ازیں' یہ بھی کہ وہ دریافت کر لیے گئے ہیں۔ اس کی اطلاع ۹، بجے رات تک سی۔ آئی۔ ڈی کو دے دی جاتی ہے۔ ان ہدایات کے ملتے ہی ڈی۔ ایس۔ پی نے ڈاک بنگلے میں خود ہی جا کر پتہ لگانا مناسب خیال کیا جس شخص کی نشاندہی کی گئی تھی' وہ وہیں پر مقیم تھا۔ لہٰذا اس کے کمرے کے نزدیک جانا انھوں نے ضروری خیال کیا۔ وہاں پر موجود اس شخص کے ملازم نے اپنے مالک کے نام کو افشا کرنے سے انکار کیا۔ اس پر ڈی۔ ایس۔ پی نے کمرے میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ غالباً دیکھ لیے جانے سے بچنے کی خاطر اس شخص نے غسل خانے میں پناہ لی۔ ڈی۔ ایس۔ پی کا شبہ یقین میں بدل گیا اور اس طرح اس شخص کی شناخت مولانا آزاد کی حیثیت سے کی گئی۔ ایس۔ پی کی خفیہ ڈائری میں درج رپورٹ تلاش و تفتیش کے درمیان رونما واقعات کی تصویر کو اور بھی واضح کرتی ہے۔

رپورٹ ملاحظہ ہو:

"محی الدین احمد عرف مولوی ابوالکلام آزاد' ضبط شدہ اخبار الہلال کے سابق ایڈیٹر' جو بنگال سے' قانون تحفظ ہند کے تحت خارج کیے گئے ہیں' وہ ۵، اپریل ۱۹۱۶ء کو رانچی پہنچ گئے۔ ان کی آمد کی خبر ۷، اپریل تک جب وہ ڈاک بنگلہ میں پائے گئے انہیں ہوئی تھی۔ ڈاک بنگلہ کے ملازموں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ یہاں ۲۸، اکتوبر ۱۹۱۵ء کو (بھی) آئے اور ۳۰، اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کلکتہ واپس روانہ ہوئے۔ ڈاک بنگلہ کی بہی' انھیں تاریخوں میں محی الدین کا اس (ڈاک بنگلہ) میں داخلہ بتاتی ہے۔ یہ نام معلوم نہیں تھا' اسی لیے اس کے لاپتہ ہونے کی خبر ابوالکلام آزاد کی حیثیت سے دی گئی۔ گرچہ انھوں نے مقامی پولیس انسپکٹر کو بتایا ہے کہ وہ یہاں کچھ دنوں تک قیام کا ارادہ رکھتے ہیں مگر وہ یہاں آنے کے بعد کسی مناسب گھر کو تلاش کر رہے ہیں۔ دو دنوں سے انھوں نے کسی سے ملاقات نہیں کی ہے اور نہ کوئی مقامی شخص ان سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ خاموشی سے ان کی نگرانی کی جا رہی ہے۔"

رانچی کی مقامی پولیس کو تلاش و تفتیش کے پہلے مرحلے میں ناکامی کا سامنا اسی سبب سے کرنا پڑا تھا کہ ڈاک بنگلے کے ملازمین مولانا آزاد کو محی الدین کے نام سے جانتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس شہر کے لیے نووارد نہیں تھے۔ ڈاک بنگلے میں ۲۸، اکتوبر ۱۹۱۵ء کو اپنی پہلی آمد سے ایک ماہ پہلے بھی وہ رانچی آئے تھے۔ اس وقت ان کے ہمراہ قاضی نورالانعام بھی تھے۔ اس بار انھوں نے ۲۷، ستمبر سے ۲، اکتوبر ۱۹۱۵ء تک کلکتہ کے اپنے بزرگ رفیق کار' مولوی عبدالکریم (ریٹائرڈ' انسپکٹر آف اسکول گورنمنٹ آف بنگال) کے مکان میں قیام کیا۔ کہنا چاہیے کہ رانچی میں مولانا آزاد کی یہ آمد تیسری بار ہوئی تھی۔ پہلی بار ۶، دن اور دوسری بار تین دن تک کے اپنے قیام میں یہاں پر ان کی سرگرمیاں کیا رہیں؟ ان کا پتہ نہیں چلتا۔

رانچی پولیس نے اب مولانا آزاد کی نقل و حرکت پر نگرانی شروع کر دی۔ ان سے ملاقات کرنے والوں پر بھی نگاہ رکھی جانے لگی۔ رانچی میں ان کی موجودگی کی تصدیق کے بعد تو یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔

حواشی و توضیحات

۱ File No 1255/1/16 Bihar State Archives, Patna
فائل کے بیشتر صفحات ضائع ہو گئے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کے ابتدائی صفحات محفوظ رہ گئے ان میں درج احوال کی روشنی میں مضمون تیار کیا گیا ہے۔

۲ دینک بھارت مترا (۳۱، مارچ ۱۹۱۶ء)' ادیب (۳۱، مارچ ۱۹۱۶ء) اور صداقت (یکم اپریل ۱۹۱۶ء)، بحوالہ:
Bengal News papers Selections Pages 489, 9490

۳ صوبجات متحدہ کی حکومت' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق مولانا آزاد کی تحریروں اور اس سلسلے میں' اپنے صوبے کے حدود میں ان کی سرگرمیوں سے سخت نالاں اور متوحش تھی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی دو الگ الگ رپورٹوں (موصولہ ۹، نومبر ۱۹۱۵ء) میں درج ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا حسرت موہانی نے ایک لیفلٹ (بہ عنوان مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن) اور ایک پمفلٹ (بہ عنوان تنقید و تردید) بالترتیب اپنے ناموں سے شائع کیے۔ ان میں مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے گزشتہ اجلاس (منعقدہ ۱۵، اکتوبر ۱۹۱۵ء) کی کارروائیوں کی بلاواسطہ تنقید کی گئی تھی مگر یہ تنقید بالواسطہ طور پر مسلم یونیورسٹی سے متعلق صوبجات متحدہ کے موقف اور اس کی حکمت

عملی کے خلاف جاتی تھی۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ یو۔پی کی حکومت نے مولانا حسرت موہانی کے خلاف اس پمفلٹ کی اشاعت پر کیا کارروائی کی، البتہ مذکورہ بالا رپورٹوں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لیفلٹ کی وصولیابی کے چوتھے دن یعنی ۹ نومبر ۱۹۱۵ء کو اپنے یہاں مولانا آزاد کے داخلے پر پابندی کا حکم جاری کر دیا۔ صوبجات متحدہ کی ایک سی۔آئی۔ڈی رپورٹ (مورخہ ۹ نومبر ۱۹۱۵ء) کے مطابق:

"مقامی حکومت نے قانونِ تحفظ کے دفعہ ۳ کے تحت ایک حکم جاری کیا ہے اس میں ابوالکلام آزاد (ضبط شدہ الہلال کے سابق ایڈیٹر) کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ صوبجات متحدہ (آگرہ اور اودھ) کے حدود میں نہ داخل ہوں گے نہ رہائش اختیار کریں گے اور نہ ہی وہ یہاں پر موجود ہوں گے۔ انھیں وارننگ دی گئی ہے کہ وہ اگر جان بوجھ کر اس حکم کی کسی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو وہ اس کے ضابطہ ۴ میں تجویز کردہ سزا کے مستحق ہوں گے۔"

(U P Intelligence Abstracts 1915, Pages-693-695)

قرینِ قیاس امر یہ ہے کہ مولانا آزاد کے خلاف اس حکم کا فوری سبب لیفلٹ میں درج تحریر ہو سکتی ہے اس کے بعد ہی دہلی اور پنجاب کی صوبائی حکومتوں نے اپنے اپنے صوبوں میں ان کے داخلے پر پابندی کے احکامات جاری کیے۔ صوبجات متحدہ کے حدود میں داخلے پر پابندی کے متعلق مسلم یونیورسٹی کے حوالے سے مولانا آزاد کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"یہ سچ ہے کہ صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے پچھلے اجلاس ایسوسی ایشن کی شرکت کے بعد ہی مجھ کو اپنے صوبے میں داخل ہونے سے روک دیا ہے اور اس لیے میں اس جلسے میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

(البلاغ شمارہ ۱۷، ۲۴۔۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء: ہمہ یونیٹی ص ۳۱۶، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ)

جس پچھلے اجلاس ایسوسی ایشن کی بات کہی گئی ہے، وہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو منعقد ہوا تھا اور جس جلسے میں شریک نہ ہو سکنے کی بات کہی گئی ہے، وہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا اس کا اہتمام مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔

ئه تراشے سے اخبار کے نام اور اس کی اشاعت کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ اس میں عنوانات دو سطری سرخیوں میں درج ہیں۔ (پہلی سطر۔ بنگال سے اخراج، دوسری سطر۔ گورنمنٹ کا حکم نامہ)

شه مثال کے طور پر حکم اخراج کے اجرا کے دوسرے دن یعنی ۲۹ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال کے انٹیلی جینس برانچ نے ... بھر کی روداد پر مشتمل جو رپورٹ تیار کی، اس میں حسب ... اہم اطلاعات درج ہیں:

(i) ۲۱ مارچ کو پٹنہ سے مولانا آزاد کے ہمراہ مولانا موہانی آئے تھے وہ ۲۳ مارچ کی شام کے وقت کلکتہ روانہ ہو گئے۔

(ii) ۲۷ مارچ کو مولانا آزاد نے دارالارشاد میں ایک تقریر کی جس میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں سے ... کرنے کے لیے کہا۔

(iii) ۲۹ مارچ کو انھوں نے دو پنجابیوں اور ... افراد نے جو یوروپین لباس پہنے ہوئے تھے، ملاقات کی ... ان لوگوں کا استقبال انھوں نے اپنے نجی کمرہ، واقع نمبر ۵ ... رپن لین میں کیا۔ یہ شک کیا جاتا ہے کہ ان کے مابین چند خفیہ مشورے ہوئے جیسا کہ دارالارشاد کے طلبا تک کو بھی اس موقعے پر موجود رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔"

(بحوالہ: ...ile No. 428/16 Page 32, ...engal Archives, Calcutta)

لـه حکومتِ بہار و اڑیسہ کے پاس ریکارڈس کی شکل میں مولانا آزاد پر مختلف عنوانات سے کئی فائلیں رہی ہیں۔ ان میں بیشتر فائلیں، انٹیلی جنس برانچ کی رپورٹوں کی بنیاد پر تیار کی گئیں۔ ۱۶-۱۹۱۴ء میں تیار ہونے والی فائلوں کے عنوانات اور نمبر حسب ذیل ہیں:

1 Speech by Maulana Abul Kalam Azad ...ditor, of Alhilal File No 1-6

2. Objectionable articles in Al-Islam ...ead by Mohammadans in Patna and ...probably elsewhere File No. 201

3. Objectionable articles published ...in Alhilal of Calcutta on present ...risis File No 210

... Meeting of the Anjuman Islamia at ...which Mazharul Haque, 3, Turkish ...delegates, Kalam Azad and other spoke ...File No. 295

5. Issue of 2nd September of Alhilal ...containing special branch report, ...File No. 302

6. Articles in Alhilal, entitled ...(Importance of) War & Islam File No. ...315

7. Abul Kalam Azad Editor of Alhilal

according to the rumour in Patna city vide secret Abstract Bihar & Orissa of 25th Sept. 1914, applied to Mr. Mazharul Haque for a portion of money collected Cownpore, Mosque Case File No 326

8 Hazbullah Association and duties of its member File No 363

9 Regarding Alhilal, An Urdu weekly paper printed published in Calcutta File No 616

10 Report of a meeting of Maulana Kalam of Calcutta Abul Subhan of Delhi, M Hasrat of Lucknow, Muazzam Ali Khan of Aligarh and Dr Ansar Ali of Delhi, met by Mr Mazharul Haque at Bankipore, at the house of Mr Hassan Imam to discuss the Mohammadan University question File No 1232

افسوس ناک امر یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام فائلیں ضائع ہوگئیں۔ بہار اسٹیٹ آرکائیوز کے انڈکس بک نمبر۳ (پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ، گورنمنٹ آف بہار و اڑیسہ) میں ان فائلوں کا اندراج موجود ہے۔ آخر الذکر فائل انٹیلی جنس برانچ کی جن دو رپورٹوں کی بنیاد پر تیار کی گئی تھیں، ان کا اندراج انٹیلی جنس ابسٹرکٹس میں موجود ہے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۱۶ء کی پہلی رپورٹ کے مطابق:

"کلکتہ کے مولانا ابوالکلام آزاد، دہلی کے عبدالسبحان (غالباً کان پور کے مولوی عبدالقادر آزاد سبحانی۔ ج۔ق) لکھنؤ کے ایم حسرت (علی گڑھ کے مولانا حسرت موہانی ہونا چاہیے۔ ج۔ق) ۱۹ مارچ کو بانکی پور (پٹنہ) پہنچے اور اسٹیشن پر ان کی ملاقات جناب مظہر الحق سے ہوئی، جن کے ساتھ وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اسی شام کو مسلم یونیورسٹی کے سوال پر بحث کرنے کے لیے انھوں نے مسٹر حسن امام کے مکان پر ایک نشست میں شرکت کی۔۔۔"

۲۲ مارچ ۱۹۱۶ء کی دوسری رپورٹ کے مطابق:

"مولانا آزاد کلکتہ کے لیے بانکی پور سے ۲۰ مارچ کو روانہ ہوئے۔"

بہ حوالہ: (Bihar & Orissa Intelligence Abstracts 1916 P.132)

مندرجہ بالا رپورٹس کی تصدیق بنگال آرکائیوز کی ایک فائل (No 428/16 pages 27 & 32) میں درج دو اطلاعات کرتی ہیں۔ ان کے مطابق:

(۱) مولانا آزاد ۱۷ مارچ ۱۹۱۶ء کو کلکتہ سے بانکی پور کے لیے روانہ ہوئے، اور ۲۱ مارچ کو کلکتہ واپس ہوئے۔

(۲) مولانا آزاد جب پٹنہ سے واپس لوٹے تو ان کے ہمراہ علی گڑھ کے مولانا فضل الرحمٰن (سید فضل الحسن عرف مولانا حسرت موہانی ہونا چاہیے۔ ج۔ق) بھی تھے۔

محولہ رپورٹس میں ایک امر قابل توجہ ہے۔ ۱۷ مارچ کو کلکتہ سے روانہ ہوتے مگر ان کی آمد پٹنہ میں ۱۹ مارچ کو ہوئی۔ ۱۸ مارچ کا دن انھوں نے کس مقام پر بتایا، اس بارے میں انٹیلی جنس رپورٹ کچھ نہیں بتاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دن کے لیے کسی مقام پر ٹھہر گئے اور انھوں نے مذکورہ نشست کے مدعوین کا وہاں پر انتظار کیا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ تمام افراد بشمول مولانا آزاد ایک ہی وقت پر پٹنہ کے ریلوے اسٹیشن پر وارد ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی کے سوال پر مذکورہ نشست کی غرض و غایت اور صوبۂ بہار میں ہی اس کے انعقاد کے سبب سے یہاں پر بحث نہیں، البتہ اس حقیقت کی نشاندہی یہاں پر مقصود ہے کہ بہار و اڑیسہ کی حکومت کے پاس مولانا آزاد سے متعلق غیر مربوط اور متفرق معلومات پہلے سے موجود تھیں۔ محولہ رپورٹس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ بنگال اور بہار و اڑیسہ کی حکومتیں مولانا آزاد کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں پر نظر رکھتی تھیں ساتھ ہی ان کے متعلق اطلاعات کی فراہمی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی کرتی تھیں۔

ے یہ محض اتفاق ہے کہ ٹھیک اسی وقت رانچی کے مسلمانوں کی ایک جماعت اپنے بزرگ مولانا عبدالقادر صاحب سہسرامی کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھی۔ مولانا آزاد جس ٹرین سے پلیٹ فارم پر آئے، اسی سے مولانا موصوف پورولیا جانے والے تھے۔ واقعہ نویسوں نے لکھا ہے کہ موصوف نے مولانا آزاد کو پہچان لیا اور بڑی عزت و تکریم کے ساتھ ان سے ملاقات کی۔ مولانا موصوف کو رخصت کرنے والوں نے کسی نو وارد شخص کے ساتھ اپنے بزرگ کا ایسا سلوک دیکھا تو انھوں نے مولانا آزاد کو گھیر لیا اور باری باری ان سے مصافحہ بھی کیا (دیکھیے: (i) مولانا آزاد رانچی میں، ابوالحسام نعمانی، ہفتہ وار الکلام، پٹنہ، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۱۱ (ii) سووینیر، ایڈیٹر ثمر الحق، منجانب اراکین کمیٹی ۸۵ ویں سالگرہ مولانا ابوالکلام آزاد، رانچی، ۱۷ ستمبر ۱۹۷۲ء، ص ۱، ۲ اور ۲۷)۔ غالباً مسٹر سیموئیل، رخصت کرنے والوں کو دیکھ کر بھرم کا شکار ہوگئے کہ مانو ایک بھیڑ جو کسی آنے والے شخص کے انتظار میں استقبال کے لیے کھڑی ہے۔

شہ ۱۹۱۱ء میں رانچی شہر کی کل آبادی ۳۲۹۹۴ شمار کی گئی تھی۔

۲۱۵

۱۹۱۱ء سے یہ شہر حکومتِ بہار و اُڑیسہ کا عارضی ہیڈ کوارٹر بن گیا اور اس کے ساتھ ہی شہر کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ اضافہ سکریٹریٹ میں کام کرنے والے عہدے داروں محرروں اور خدمت گاروں نیز دوسرے مقامات سے آکر بسنے والے تاجروں اور سوداگروں کی آمد کے سبب سے ہوا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۱۶ء میں شہر کی آبادی اپنے اضلاع سمیت لگ بھگ ۴۰ ہزار کے قریب ہوگی۔ ۱۹۱۷ء میں کیے گئے ایک سرکاری اندازے کے مطابق ۱۷۰۰۰ ہندو، ۷۵۰۰ مسلمان، ۵۳۰۰ عیسائی اور دیگر مذاہب اور عقائد کے لوگ اس شہر میں بستے تھے۔ بہ حوالہ:

Bihar & Orissa District Gazetteer (Ranchi) 1917 By M G Hallet P256)

۹ Bengal Intelligence Abstracts 1916 P 163

Bihar & Orissa Intelligence Abstracts 1916 P 36

حکومتِ بنگال کی جانب سے فراہم کردہ مولانا آزاد کے متعلق خفیہ نوٹ میں درج ہے کہ وہ دو بار رانچی جاچکے ہیں۔

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی نومبر ۱۹۹۳ء

۳۰۰

اُن کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ اور اُن سب کی یاد آج بھی تازہ ہے۔

علی گڑھ کی زندگی میں اچھا بُرا جو کچھ کیا ہے اُس کی مختصر داستان اوپر عرض کردی گئی۔ اب تو بارگاہِ الٰہی میں یہی دعا ہے کہ :-

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۔

---

① الٰہ ڈگی کے نام سے خود دوستوں کی دوستی یاد آئی۔ وہاں ولایت حسین صاحب نے (جو راجہ ماکی کے کھلاڑی اسعود دیدی کے بزرگ تھے) اپنی کوٹھی کا نام اپنے دوست کے نام پر حبیب اللہ منزل رکھا اور حبیب اللہ صاحب نے اپنی کوٹھی کا نام ولایت منزل رکھا۔ اسے ہم لوگ ENGLAND MANZIL کہا کرتے تھے۔ اسی کے قریب بعد میں PICTUARS GALLERY تعمیر ہوئی تھی۔

② یہ حکیم صاحب بعد میں کراچی آگئے تھے اور وہاں بنس روڈ پر مطب کرتے تھے۔

[العلم (کراچی) اکتوبر۔ دسمبر ۹۳ء]

بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری

ہم سفر

۱

بیگم حمیدہ ـــــ مشہور جاسوسی ناول "نیلی چھتری" کے مصنف جناب ظفر عمر کی صاحبزادی اور ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری کی اہلیہ ہیں۔ سالِ گزشتہ ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری کی جدائی کے بہت سے دن گزر گئے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی پہلے انھیں کسی طور آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی تقریباً ساٹھ سالہ متاہلانہ زندگی کی یادیں لکھ ڈالیں اور انھیں قلم بند کر کے انھیں اسلام آباد بھیج دیں تاکہ وہ ایک نظر انھیں دیکھ لیں اور پھر "افکار" میں ان کی اشاعت ممکن ہو سکے۔ چنانچہ بیگم حمیدہ اختر حسین صاحب رائے پوری نے چار قسطیں اب تک لکھ ڈالی ہیں اور پہلی قسط جسٹس کے ملاحظات (؟) قارئینِ افکار کی نذر ہے۔

واضح رہے کہ بیگم حمیدہ زندگی بھر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں مصروف رہیں اور کبھی کوئی تحریر نہیں لکھی ـــــ افکار ـــــ بعد فخر و مسرت بیگم حمیدہ کی یادوں کو شائع کرتے ہوئے یہ اعلان کرنا چاہتا ہے کہ بطور ادیبہ بیگم حمیدہ پہلی بار اردو ادب سے متعارف ہو رہی ہیں۔ ان کی سادہ و پرکار تحریر ہمیں یقین ہے کہ اہلِ نظر سے داد و تحسین حاصل کر سکے گی۔

ـــــ صہبا لکھنوی

صہبا لکھنوی صاحب نے اختر حسین رائے پوری سے بڑے ہی جتن کر کے "گردِ راہ" اردو ادب کو ایک عظیم ادبی شہ پارہ دلوا کر ایک اہم کارنامہ سر انجام دیا۔

اختر "گردِ راہ" کے حرفِ آغاز میں لکھتے ہیں "ستم ظریفی دیکھیے کہ نوجوانی میں پیری کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا تھا اب

قلم سے کہہ رہا ہوں رہیے دلوں کی داستان مرقوم کر۔ معلوم نہیں یہ روٹھا ہوا دوست کس حد تک میرا ساتھ دیتا ہے۔ وہ اُکتا ہے تو دلاسا دیتا ہوں کہ میرے حافظے کا ساتھ دے۔ البتہ خود فیصلہ کر کہ کیا گفتنی ہے اور کیا ناگفتنی ہے۔

ہمارے جمیل جالبی صاحب نے بارہ عدد قلم اور چار رجسٹر بھیج کر مجھ بہتر سالہ بڑھیا سے خواہش ظاہر کی کہ اس پیری میں غم کے پہاڑ کو ڈھلتے ہوئے جاتی کی کہانی قلم بند کرنے بیٹھ جاؤں۔ بھلا میں آپ کے ان قلموں سے کیا کہہ سکتی ہوں کہ میرا ساتھ دو۔ میں نے تو زندگی بھر اپنا قلم پکڑا ہی نہ تھا۔ ہاں آپ کی فرمائش پر جوانی سے اب تک کی کہانی سنانے بیٹھ گئی۔ اب آپ کے قلم اگر اس کو قلمبند کر لیں تو یہ آپ کی کرامات ہوگی، لیکن بعد میں آپ کو اگر شرمساری کا طوق زیبِ گلو کرنا پڑا تو اس کی ذمہ داری آپ کی اپنی ہوگی۔

ہماری ملاقات اختر حسین رائے پوری سے ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف کے گھر ہوئی جو آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے پہلے جنرل سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر اشرف چوتھی کلاس سے میرے بھائی شوکت عمر کے ساتھ علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی پڑھائی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جس صاحب کے بچے کے ساتھ کھیلنے اور ان صاحب کا حقہ بھرنے کے لیے ملازم رکھا گیا تھا، میاں اشرف صاحب نے خود اپنی تعلیم کا آغاز کر دیا۔ جب بچے کو پڑھایا جاتا تو اشرف صاحب کی یادداشت میں سب محفوظ ہو جاتا۔ راتوں کو جب کروہ کتابوں کی نقل اپنی کاپی پر کیا کرتے اور اس طرح اپنی اتالیقی خود کرتے رہے۔ اس لڑکے کی ذہانت اور شوق کو دیکھ کر اشرف کو اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میرے بھائی شوکت عمر یہاں سے ان کے ہم جماعت بنے۔ دوستی کا ایک ایسا بیج بو دیا گیا جس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔ جب اشرف صاحب کی کفالت کرنے والے صاحب کا تبادلہ ہونے لگا تو اشرف کے لیے مسئلہ پیدا ہوا کہ اب تو ان کو اپنے گاؤں متھرا ہی جانا پڑے گا اور تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اب وہ اپنے دوست سے مشورہ کرتے ہیں کہ ان حالات میں آخر وہ اپنی تعلیم کو کیوں کر جاری رکھ سکتے ہیں۔ میرے بھائی نے اپنے دوست کو دلاسہ دیا اور کہا چند روز بعد وہ بتا سکیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ شوکت عمر نے اماں کو خط لکھا۔ یہ پانچ چھ سطروں کا خط اب تک میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

شوکت عمر نے لکھا تھا "ہماری اماں بچپن میں جو کہانیاں سناتی تھیں ان میں سے ایک کہانی میں کوئی بادشاہ کسی لڑکے کو بھائی بنا لیتا ہے اور ساری عمر اس کا ہاتھ پکڑے زندگی کی سیدھی سڑک پر چلتا چلا جاتا ہے۔ میں نے بھی کسی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ اشرف نامی لڑکے کو اماں میرے توسط سے خوب جانتی ہیں۔ انھوں نے کئی بار فرمایا کہ گویا اللہ میاں نے ان کو چھٹا بیٹا دے دیا ہے۔ اب آپ کو صرف کرنا یہ ہے کہ میری بورڈنگ کی فیس کے ساتھ ساتھ اشرف کے اخراجات اور فیس کے روپے بھیج دیا کیجیے ورنہ ایک عظیم دماغ مشقت کے گرد و غبار کی تہوں میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔ جواب دینے سے پہلے میرے والد نے اماں سے بات کی اور دونوں نے نادیدہ اشرف کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ ظفر عمر صاحب نے بیٹے کو تار کے ذریعے "GO-AHEAD" کے الفاظ کے ساتھ اشرف کی ذمہ داری اٹھانے کی حامی بھر لی۔ گرمی کی چھٹیوں میں اشرف صاحب، شوکت عمر کے ساتھ متھرا جانے سے پہلے ہمارے گھر آئے۔ اس طرح ان کو ڈھیر سارے نئے بہن بھائی مل گئے۔

میٹرک تک یہ حال تھا کہ کلاس میں کبھی اشرف صاحب اوّل تو کبھی شوکت عمر۔ میٹرک میں دونوں نے پوزیشن حاصل کی۔ اشرف اوّل اور شوکت عمر دوئم آئے۔ کالج کے زمانے میں جو ہر سال الہ آباد میں آل انڈیا مباحثوں کا مقابلہ ہوتا تھا اس کی ٹرافی ہر سال کبھی

شوکت عمر اور کسی سال اشرف جیت کر پہلے ہمارے گھر آتے یعنی جہاں بھی والد کی تعیناتی ہوتی۔ پھر یہ ٹرافی علی گڑھ یونیورسٹی پہنچا دی جاتی تھی۔ ٹرافی ایک شیشے کے کیس میں قفل بہ مہر تھی۔ علم کی مورتی ایک ہنس کے اوپر بیٹھی ہے۔ نیچے پانی میں ایک کھلا ہوا کنول کا پھول اس پر اس کا ایک پاؤں رکھا ہوا مسکرا رہی ہے۔ چاندی پر یہاں وہاں سونے کا پانی پھرا ہوا ہے اس وقت بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ بی اے میں اشرف نے اوّل پوزیشن اور شوکت عمر نے دوم پوزیشن حاصل کی۔

اب والد صاحب نے شوکت عمر کو بجلی کی انجینئرنگ پڑھنے کے لیے ولایت بھیجنے کا انتظام شروع کر دیا۔ وہ بار بار والد صاحب سے یہ اصرار کرنے لگے کہ ولایت جا کر آگے تعلیم حاصل کرنے کا حق پہلے تو اشرف کا ہے ان کا نہیں۔ جب دیکھا کہ والد صاحب کسی ان کی نہیں سن رہے ہیں تو اتنا کہا کہ منہ بولا بیٹا بھلا کیسے اپنے بیٹے کی طرح آپ کو لگ سکتا ہے۔ یہ لوگ اور ایسی دوستی بھلا اب کہاں نظر آ سکتی ہے۔ والد صاحب پر بیٹے کے اس جملے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً یہ فیصلہ ہوا کہ اشرف کو بھی باہر بھیجنا ہے تاکہ دونوں دوست ساتھ ساتھ رہ کر آگے کی تعلیم حاصل کریں۔ ریاست ریوا کے مہاراجہ اور بیگم بھوپال والد کے بڑے قدر دانوں میں تھے۔ مجھے جہاں تک یاد ہے شاید مہاراجہ ریوا نے اسکالرشپ کی حامی بھری۔ یہ دونوں دوست اور ان کے تیسرے دوست ذکا اللہ خاں جو (ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر محمود الظفر کے کزن تھے) اکٹھے ولایت کے لیے روانہ ہوئے۔ ذکن بھی پانچویں جماعت سے میرے بھائی شوکت عمر کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ ذکن (ذکا اللہ خاں) کا لڑکپن سے ہمارے گھر آنا جانا یوں تھا کہ ان کے والد ممتاز اللہ خاں صاحب والد کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ بڑے ہی روشن خیال تھے کہ اپنی دو بیٹیوں زہرہ اور عذرا کو اودے شنکر کے ساتھ کام کرنے کی اجازت خوشی خوشی دے دی کہ جب قدرت نے ان کو ناچ اور ایکٹنگ کے لیے صلاحیت دی ہے تو کیوں نہ استعمال کریں جمیل بھائی! سوچیے تو آج سے ساٹھ سال پہلے مسلمان لڑکیوں کے لیے سرعام اسٹیج پر آ کر ناچنا اور ایکٹ کرنا کیا معنی رکھتا ہوگا۔ خاندان والوں اور دوستوں کی لعن طعن کی بوچھار ان پر ہوتی مگر انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ بعد میں زہرہ کی شادی سہگل نامی ایک ہندو سے ہوئی اس طرح وہ زہرہ سہگل کے نام سے مشہور ہوئیں اور لندن میں بودوباش اختیار کر کے وہاں اپنا ایک ڈانسنگ اسکول کھول لیا۔ لندن میں بہت سے اسٹیج کے ڈراموں اور فلموں میں بھی کام کیا اور اب دو دو سال سے دہلی میں قیام پذیر ہیں، ایک اکیڈمی کی سربراہ ہیں۔ عذرا کی شادی حمید بٹ سے ہوئی اور وہ بمبئی میں رہنے لگیں بہت سی فلموں میں کام بھی کیا۔ گاہے گاہے ٹی وی میں ڈرامے کرتی رہیں۔ پھر پاکستان آ گئیں۔ بیوہ ہونے پر پنڈی سے لاہور میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ اسی طرح اب تک تھیٹر اور ڈراموں میں حصہ لیا کرتی ہیں۔ چند ماہ قبل زہرہ سہگل تین ہفتے کے لیے پاکستان آئیں تو دونوں بہنوں نے اپنی بھتیجی (زارا ممتاز اور کمال ممتاز زہرہ کے بھتیجے ہیں) ان کی لڑکی تہمینہ ممتاز کے ساتھ مل کر ایک اسٹیج شو لاہور میں اور پھر کراچی میں کیا۔ اس طرح ایک ہی خاندان کی چار نسلیں ایک ساتھ اداکاری کر رہی تھیں۔ ایک تھی نانی " جس نے وہاں اور یہاں دیکھا ہے وہ کچھ ایسا تھا کہ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

اشرف صاحب کے والد متھرا کے پاس ایک گاؤں میں رہتے تھے اور کھیتی باڑی کر کے کنبہ پال رہے تھے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا ولایت پڑھنے کے لیے جا رہا ہے تو جانے کی اجازت اس شرط پر دی کہ وہ شادی کر کے جائیں ورنہ تو کوئی نہ کوئی میم ان کو دبوچ لے گی اور پھر وہ کبھی گاؤں واپس نہ آئیں گے۔ ولایت جانے کے شوق کی حامی بھر دی اور کسی کسان کی لڑکی کے ساتھ ان کا بیاہ رچا دیا گیا۔

کی لڑکی کے ساتھ ان کا بیاہ رچا دیا گیا۔

تینوں دوست شوکت، اشرف اور ذکاء اللہ علی گڑھ پہنچ کر اپنی اپنی پڑھائیوں میں لگ گئے۔ اب شوکت عمر کو یکایک یہ خیال آیا کہ غضب ہو تو ہو گیا، اشرف چار سال یہاں رہ کر جب گھر واپس پلٹیں گے تو اس بیچاری کلثوم کا جو جاہل مطلق ہے تو ان کا دل و دماغ ایک ایسی لڑکی کو کیوں کر قبول کرے گا؟ بہت سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے اور والدہ صاحبہ کو یہ خط لکھا۔

والدہ محترمہ۔ آداب

خدا کرے گھر پر سب بخیر ہوں۔ میری، اشرف اور ذکی کی پڑھائی اطمینان بخش ہے۔ پر میرے دل و دماغ کا سکون غائب ہے کہ میں نے ایک دوست اور بھائی جن کر اشرف کے ساتھ ظلم کر دیا وہ یہ کہ جب وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر متھرا واپس اپنے گھر لوٹیں گے تو بیچاری کلثوم کو کس طور قبول کریں گے۔ میری اماں، آپ میرے اور اشرف کی خاطر یہ کریں کہ بھابی کو اپنے ساتھ متھرا لے جائیں اور اشرف کے والد اور والدہ سے یوں بات کریں کہ کلثوم کی سسرال آپ کا گھر بھی ہے۔ آپ ان سے اجازت لیں کہ اس عرصے میں کلثوم علی گڑھ آپ کے پاس رہ کر اور سب لڑکیوں کے ساتھ کلثوم کی تعلیم اور تربیت کریں۔ مجھے امید کہ جس قدر ان دونوں کے دلوں میں آپ کا اور اماں کا احترام ہے وہ انکار نہ کریں گے۔ معافیاں کے دنوں میں بھی دیکھا پریشانی ہو جو میرے دل میں ہے۔ یوں کلثوم "نیلی چھتری" آ کر اماں آپ کے سامنے رہ کر کچھ پڑھ لکھ جائیں گی اور نشست و برخاست کے طور طریقوں کو اس چار سال کے عرصے میں بہت کچھ سیکھ لیں گی۔

آپ کا بیٹا

شوکت[1]

اس طور کلثوم بھابی ہمارے گھر آ گئیں۔ ہمارے تو کسی بھائی کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ہم سب بہنوں اور اماں نے بڑے لاڈ کیے۔ صبح ماسٹر اور شام کو مولوی صاحب پڑھانے آتے۔ دن میں والدہ سلائی سکھاتیں۔ جب ہم لوگ اسکول سے واپس آ جاتے تو باری باری پڑھاتے اور لکھاتے۔ ان کا دماغ تھک سا جاتا، کبھی کبھی کاپی یا کتاب ہمارے منہ پر دے مارتیں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ کل سے کچھ نہ پڑھوں گی۔ قدرت نے ان کو ذرا کا ذرا سا دماغ دیا تھا۔ ہاں کھانا پکانا اور سلائی جلد سیکھ گئیں۔ گرمی کی چھٹیوں میں کلثوم متھرا پہنچا دی جاتیں اور ہم سب والد کے پاس جس جگہ بھی ان کی تعیناتی ہوتی چلے جاتے۔

وقت ہوا کے گھوڑے پر بھاگتا چلا گیا اور دیکھتے دیکھتے چار سال گزر گئے۔ اللہ کا کرنا دیکھیے کہ تینوں دوستوں کو اپنی پہلی ملازمت علی گڑھ یونیورسٹی میں ملی۔ شوکت عمر بجلی کے اور ذکاء اللہ خاں سول انجینئر کالج میں لگے اور اشرف بھائی ہسٹری کے لکچرار ہو گئے۔

"نیلی چھتری" (والد نے اپنے پہلے جاسوسی ناول کے نام پر گھر کا نام رکھا تھا) کوٹھی کے ساتھ کئی ایکڑ زمین تھی جس پر پھلوں اور

---

[1] والد صاحب کی عادت تھی کہ اپنے بچوں کے خطوط کی فائل بنا کر رکھتے تھے۔ اس طرح بہت سے خطوط عرصہ دراز کے بعد مجھے پڑھنے کو ملے۔

سبزیوں کے باغ۔ ایک کاٹیج کافی سال پہلے اس نے بنائی تھی جس میں ریاضی کے پروفیسر بھٹاچاریہ صاحب کرائے پر رہ رہے تھے۔ جب ان کو کاٹیج خالی کرنے کو کہا تو ان کا جواب یہ تھا ”آپ اپنی کوٹھی خالی کریں۔ آپ کو تو کرایہ بھی نہیں دینا، میں کرایہ دیتا ہوں۔ ہرگز خالی نہیں کروں گا۔“ یہ اس صلح پر چپ ہو گئے اور ایک نئی کاٹیج بیٹے کے واپس آنے سے پہلے بنا کر اس کو نہایت سجا دیا گیا۔ ان کو یقین کامل تھا کہ پہلی ملازمت بیٹے کو علی گڑھ ہی میں ملے گی۔ بھائی جان کی خوشی کی حد نہ تھی کہ والدین نے کس پیار سے ان کے لیے کاٹیج بنا کر سجا دیا ہے۔ کپڑے اور کتابیں اور خود ”نیلی چھتری“ میں۔ کالج سے واپسی کے بعد کا وقت والد صاحب اور ان کے دوستوں میں گزارتے۔ جب اماں کے پاس زنان خانے میں آتے تو پاس بیٹھ کر ولایت کے قصے سناتے۔ ہم چھوٹی بہنیں اور بھائی لوگ ان کو ایک ہیرو کی طرح سمجھتے۔ ڈرتے بھی تھے اور بے انتہا چاہتے بھی تھے اور جب والد صاحب اپنی پوسٹنگ پر چلے گئے تو ہم سب بہت خوش ہوئے کہ اب بھائی جان زیادہ وقت اندر ہم سب کے ساتھ گزارا کریں گے۔

اس طرح ایک ماہ ان کو ملازمت کرتے گزر گیا۔ اپنی پہلی تنخواہ اماں کے ہاتھ میں لا کر دی۔ انھوں نے اس میں سے پچاس روپے رکھ کر پھر بیٹے کے ہاتھ میں دے دی اور دس روپے کا نوٹ ان کے سر سے گھما کر صدقہ اتارا۔ ہمیں یہ تماشا دیکھنے میں پہلی بار مزا آیا تھا۔ پھر وہ ہم سب کو باری باری بلا کر دس دس روپے دیتے گئے۔ ہم سوچا رہے تھے کہ اتنے ڈھیروں روپیوں سے ہم کیا کریں گے؟ اماں ایک بار بول پڑیں ”شوکت مجھے تو تمہارے چہرے پر کچھ اداسی اور پریشانی نظر آ رہی ہے۔ آخر بات کیا ہے۔“ اب لاڈلا بیٹا کہتا ہے ”کل اشرف اور ذکوں نے مل کر ایک گھر ’امیر منزل‘ کرائے پر لیا ہے۔ جب گھر آیا تھا تو پہلے ان دونوں کے ساتھ گیا۔ صرف تین بان کی کھاٹیں اور چند برتن۔ مجھے شرم سی آئی اپنے کاٹیج کے خیال پر۔ اماں کیا آپ اپنے دوسرے بیٹے کے گھر کے لیے کچھ نہ کریں گی؟“ ”مگر وہ دونوں تو ہوسٹل میں کرسنے کر رہ رہے تھے۔“ ——— ”اماں میری! آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ کلثوم کب تک گاؤں میں رہیں گی؟“ ——— اماں نے کہا ——— ”تو تم جو مناسب سمجھو اور ان کی ضرورت کا سامان بھجوا دو۔“ ———

دوسرے دن بھابی کلثوم متھرا سے آ گئیں۔ ’امیر منزل‘ ”نیلی چھتری“ سے بس ایک فرلانگ پر تھی۔ بھائی جان سامان بھجوا کر ہم تین بہنوں کو ساتھ لے کر ’امیر منزل‘ گئے۔ بھابی کلثوم کو ہم نے اپنے ساتھ لگا کر غلے تا مہمرے بیٹھنے کا کمرہ، کھانے کا کمرہ اور پلنگ وغیرہ کمرے میں سجائے۔ باورچی خانے میں پتیلیاں برتن وغیرہ رکھے۔ اشرف بھائی انتہائی خوش مزاج انسان تھے۔ برابر ہم سے لڑتے جھگڑتے رہے کہ یہ چیز کہاں سے اور وہ کیوں گڑ رہے۔ ساتھ ساتھ کہتے جاتے کہ میری بہنیں کس قدر بے ڈھنگی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ”کہ ہم برابر کہے جاتے ارے بابا! امیر تو کریں کچھ کل پر بھی تو چھوڑی جا سکتی ہے۔ ذکوں خاموش لیٹ فرید لگے پر جب اور جو بھی بولتے روکھا سا منہ بنا کر بڑی مزے دار بات کرتے۔ بھابی کلثوم پکار پکار کہے جاتیں ——— ”شوکت بھائی سب کھانا کھا کر جائیں گے ———“ مگر بغیر اماں کی اجازت کے وہ ایسا کیسے کر سکتے تھے اور پھر ہم سب گھر آ گئے۔

ان دنوں لڑکیوں کا آنا جانا دوسرے گھروں میں صرف میلاد شریف یا کسی شادی پر والدہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھابی کلثوم اکثر ”نیلی چھتری“ آ جایا کرتیں۔ بے حد خوش رہ کر کٹی میں ساتی ہیں۔ شوہر ولایت پلٹے ہیں اور پروفیسر ہیں۔ انھوں نے اشرف بھائی کو لیکچرار سے پروفیسر بنا دیا تھا، لیکن بیچاری کے ایک بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ لفی ڈاکٹر ہو کر کسی کا علاج کرنا کیسا نہیں جانتے۔ بہت سمجھانے کی کوشش کرتے کہ کچھ ڈاکٹر ایسے بھی ہوتے ہیں جو پڑھا کر پاگلوں کا علاج کرتے ہیں تب وہ کہہ سی جاتیں کہ کیا اشرف یونیورسٹی میں پاگلوں کا علاج کرتے ہیں یا پھر ان کو پڑھاتے ہیں۔

"امیر منزل" کی بناوٹ کچھ یوں تھی کہ پہلے آپ دس سیڑھیاں چڑھیں تو چھوٹا سا برآمدہ، اس کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا بیڈروم اور غسلخانہ۔ برآمدے کے دوسرے سرے پر باورچی خانہ۔ اندر دو بیڈروم، باتھ روم اور بیٹھنے کا خوبصورت سا ہال پھر ساتھ ہی بڑا سا کھانے کا کمرہ اور کوٹھی کے سامنے بڑا سا باغ۔

ہمارے والد نے کبھی اماں سے پردہ کرایا اور نہ ہی کسی لڑکی کو پردے میں رکھا جو بھی گھر پر ابا کے دوست آتے، ہماری اماں ان کے ساتھ بیٹھتیں اور ہر قسم کی بات چیت میں حصہ بھی لیتیں۔ ہم لڑکیوں کو اجازت تھی کہ ان کے سامنے آئیں، آداب کریں مہمانوں کی خاطر مدارات کر کے خاموشی سے واپس چلے جائیں۔ خاندان کے بہت سے لوگوں کو اس پر اعتراض ہوتا مگر ہمارے والدین نے کبھی برا نہ مانا صرف مسکرا دیتے۔ کہتے تعلیم کا یہ بھی ایک بڑا حصہ ہے۔

اکثر بھائی جان ہمیں "امیر منزل" سے لے جاتے۔ مرد بیٹھنے کے کمرے میں جمع ہوتے۔ ہم بھابی کلثوم کے پاس رہتے۔ جب کچھ اور دوست بھی آجاتے تو گرما گرم بحثوں کی آوازیں ہم سنا کرتے۔ ایک دن بھابی کلثوم کی زبانی معلوم ہوا کہ برآمدے والے کمرے میں کسی اور کو مہمان کے طور پر یوں رکھنا پڑا کہ اشرف اور ذکی کی تنخواہ کرائے اور گھر کے اخراجات کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔

ہم گرلس کالج کی بس پر اسکول آیا جایا کرتے تھے۔ ہمارے لڑکپن میں ایسا دستور نہ تھا کہ لڑکیاں جو ہاتھ لگ جائے اس کو پڑھیں۔ ہمیشہ والدین کی نظر رہتی کہ کون سا رسالہ اور کون سی کتاب پڑھنے کو دی جائے۔ کبھی کبھار مجاز کی بہن صفیہ اپنے شاعر اور لاابالی بھائی کے کمرے سے کوئی رسالہ، کبھی کوئی ناول چپکے سے لے آتیں مگر صرف دن بھر کے لیے۔ ہم چند سہیلیاں مزے لے لے کے پڑھتے اور پھر وہ گھر جاتے وقت اپنے ساتھ لے جا کر اس کو پھر وہیں رکھ دیتیں۔ ایک بار وہ رسالہ "نگار" جو صرف مردوں کے پڑھنے کے لیے سمجھا جاتا تھا لے آئیں اس میں ایک افسانہ "زبان بے زبانی" تھا۔ اس کو ایک نہیں دو تین بار پڑھا۔ یہ افسانہ ڈگر سے ہٹ کر تھا اور ایسا محسوس ہوا کہ لکھنے والے نے اپنی تمام تر دل کی گہرائیوں کے ساتھ خون جگر سے لکھا ہے۔ اس کی اپنی زندگی تنہائیوں میں گزری ہے۔ محبت اور خوشیوں کی محرومیوں سے لبالب بھری ہوئی ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے پر کوئی سننے والا نہیں۔ محبت کا بھوکا اتنا کہ امر بیل تک پہ مرا مٹا جاتا ہے۔

پتا نہیں کہ سکھی کہ سعیدہ اور صفیہ نے بھی ایسا سوچا تھا یا نہیں۔ مگر دونوں کو بے حد پسند ضرور آیا۔ یہ خیال ہم تینوں کے دلوں میں یکساں رہا کہ کاش یہ رسالہ ہمارا اپنا ہوتا تو کئی بار اسے پڑھتے یا پھر اس کے لکھنے والے کا کوئی اور افسانہ ہاتھ لگ جاتا۔ میری خوشیوں سے بھرپور زندگی چونکہ سکون اور چین سے گزر رہی تھی شاید اسی وجہ سے مجھے شدت سے ایک انسان کا، برگد کے پیڑ کی طرح تن تنہا رہ کر اطراف کی چہل پہل اور لوگوں کی خوشیوں کو حسرت سے دیکھنا اور سوچنا، بار بار یوں سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ ایسے لوگوں کی زندگی میں جو بھی ہمدردی اور محبت کی رنگ آمیزی کرے گا تو وہ صرف اس کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی ذات کے لیے خوشیاں بٹورے گا۔ کاش کچھ اور بھی اس شخص کا لکھا ہوا افسانہ ہاتھ لگ جائے۔ کاش "نگار" کا یہ پرچہ پھر سے مل جائے۔ کیا خبر تھی یہ افسانہ میری اپنی زندگی یوں موڑ کر رکھ دے گا کہ ساری عمر اسی برگد کے پیڑ تلے ساری زندگی گزار دوں گی۔ یہ تنا اونچا پیڑ ہمیشہ اونچا اور گھنا ہوتا رہے گا اور میں اس کو گردن اٹھا کر بس یہیں بیٹھ کر دیکھا کروں گی۔ اس کی گھنیری چھاؤں، پت جھڑ، موسم گرما اور شدت کا جاڑا مجھے سب ہی عزیز رہیں گے۔ گویا میں ایک امر بیل بن جاؤں گی جس سے چھٹکارا صرف "موت" ہی کے ذریعے ممکن ہوگا۔

ادھر بھابی کلثوم کو یہ بتانا کہ جانے کس خوشی میں لڑکے کو اپنے گھر کا کمرہ دے دیا ہے۔ ذکی، اشرف اور شوکت کہاں پروفیسر اور انجینئر اور کہاں یہ کالج میں پڑھنے والا لڑکا۔ عمر اور رتبے کا اتنا فرق۔ مگر اس سے ایسے ڈرتے ہوں۔ وہ بڑا بولتا چلا جاتا، بحثیں کرتا۔ اور غضب تو یہ کہ سب مل کر اس کی باتیں سنتے رہتے۔ یہ تینوں تو ولایت سے پڑھے ہوئے تھے مگر یہ کرسی کو گردانتے ہوں۔ وہ روز کا بڑا غصے والا تھا۔ مجھے تو وہ کچھ خبطی لگتا تھا۔ اپنا کمرہ بند کر کے کنجی سے اخباروں کا پھر تالا لگا کر کمرے سے نکل جاتا۔ یوں کمرے کی صفائی کا سوال ہی نہیں تھا۔ ایک دن تالا کھلا رہ گیا اور میں نے جھاڑو جھڑوا کر اخباروں کے کٹے پھٹے تمام کاغذ پھنکوا دیے۔ نہ پوچھو کیسا شیر کی طرح غراتا پھرا کہ کون میرے کمرے میں آیا اور کس نے میرے کاغذ پھینکے۔ کدھر ہیں وہ سب اخبار؟ مجھے بھی پھر غصہ آ گیا اور صاف صاف کہہ دیا "اب آپ اگر کل تقریر بھی پڑھ کر رہے تو میں ہرگز کمرے کی صفائی کروانے کی نہیں اور آپ بھی کبھی میرے پکائے ہوئے کھانے میں سو سو طرح کی برائیاں کو نشر دیا کریں۔ میرا کلیجہ پک گیا سن کر کہ یہ سالن ایسا ہے۔ سبزی ایسی ہے۔ مرچ کم ہے۔ نمک زیادہ ہے۔ کبھی یہ کہ؟ لڑکے کی تعلیم، یہ انگلینڈ، لمبا بھرا سر پر بال، موٹے ہونٹ۔ علی گڑھ میں میاں صاحب پڑھتے ہیں مگر شیروانی نہیں پہنتے روز وہ آئے نائی سے کھجوریں لاتے ہیں۔ بڑے نواب کا بچہ بنتے ہیں۔ یہ تینوں جو ولایت میں چار سال رہے اور ڈگریاں لیں، بھلا سادے کپڑے پہنتے ہیں اور ان حضرت کی قمیض جانے کس طرح کی ہے۔ چپا چپا کالر، ایک کالی ڈوری چاروں طرف بندھی ایسے ہی آستینوں کے کف ہیں۔

بھابی کلثوم کو جیسے اس لڑکے سے چڑھ اور نفرت سی تھی۔ ایک دن میں پوچھ بیٹھی۔ بھابی اس لڑکے کا آخر کوئی نام تو ہوگا؟ آپ ہمیشہ "وہ لڑکا" کیوں کہتی ہیں؟ "توبہ توبہ جیسا خود ہے ویسا نام بھی ہے اختر! نام پکارو۔ میں تو کہتی کہ وہ بگھوری بھی اپنے نام کے ساتھ نائک لگا لے تو زیادہ بہتر ہوگا ہم سب ہنس پڑے۔ مگر مجھے "وہ لڑکا" دیکھنے کی خواہش شدید ہوگئی اور یکایک دماغ میں ایک خیال گزرا کہ کہیں اختر حسین رائے پوری کو تو یہ نام پکارا نہیں سمجھ بیٹھی ہیں۔ پوچھا بھابی ذرا سوچ کر بتائیں کہ اختر رائے پوری تو نام نہیں؟ کچھ دیر چپ رہ کر بولیں "ہاں، ہاں شاید یہی نام ہے" تو ہم بہت خوش ہوئے کہ اب بھابی کے ذریعے "نگار" کا پرچہ حاصل کر لیں گے۔ جب ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تو ایک بڑا لکھنے والا ہے ہم کو ان سے "نگار" رسالہ مانگ کر دلادیں۔ تو صاف انکار کر دیا "میں تو اس سر پھرے کے منہ نہیں لگوں گی۔ میں نے دل میں سوچ لیا کہ اگر کبھی ان صاحب سے آمنا سامنا ہو گیا تو جھٹ سے فرمائش کر دیں گے۔ اور شاید کچھ اور مضمون بھی پڑھنے کو مل جائیں۔

ایک دن شوکت بھائی کے ساتھ جوہی کا توڑنے کے لیے ہم سیڑھیاں چڑھ گئے۔ میں پیچھے چنبیلی کی بیل سے جو ان صاحب کے کمرے کی کھڑکی کو ڈھانپتی ہوئی اوپر چھت پر چڑھ گئی تھی۔ پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ کچھ پھول توڑنے لگ گئی۔ جب مٹھی بھر پھول توڑ کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو سامنے "وہ لڑکا" کھڑا پیچھے اتر رہا تھا۔ حیرت اور خوف سے سر اٹھا کر دیکھتی کی کہ ہاں یہ تو بھابی کے بتائے ہوئے بکھرے بال، لمبی ٹانگیں، موٹے ہونٹ، وہی کٹ کی قمیض سب ہو بہو۔ بے ساختہ ہنسی آنے لگی۔ وہ مجھے یوں گھورتا اور حیرت زدہ محسوس کر کے آہستہ آہستہ رک رک کر نیچے اترنے لگا۔ جب ایک سیڑھی رہ گئی تو میں نے ہمت کر کے کہا "مہربانی کر کے مجھے "نگار" کا وہ پرچہ دے دیجیے جس میں آپ کا افسانہ "لبالب بے زبانی" چھپا ہے۔ اختر

کے جلنے میں موٹے ہونٹ اور بھی موٹے لگنے لگے۔ یہ کہتے ہوئے آخری سیڑھی اترے "خوب! یہاں پہلے ہمارے پھول جوری جڑی توڑے، اب ریوڑیوں سے "نگار" مانگ رہی ہیں!" یہ کہا اور یہ جا وہ جا۔ بڑی خفّت ہوئی اور کچھ غصہ بھی آیا۔ سوچا کلثوم بھابی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں، لیکن کچھ ضد بھی آ گئی کہ ضرور ان سے رسالہ وصول کرنا ہے۔ صفیہ سے سر کھپانا نہیں۔ واپسی پر دو باتیں لکھ کر دروازے کے نیچے کھسکا آؤں گی کہ "مہربانی کر کے رسالہ دے دیجیے۔ وعدہ بعد واپس کر دوں گی۔"

کئی روز ہمارا تو وہاں جانا نہ ہوا اور بھابی کلثوم بھی نہ آئیں۔ پھر ایک دن جو وہ آئیں تو "نگار" کا پرچہ ہاتھ میں لیے ہوئے۔ یہ کہہ کر دے دیا: "اس لڑکی نے پڑھنے کے لیے بھیجا ہے۔" بیچاری بھابی نے اس کو کھول کر دیکھا بھی نہیں۔ اس میں اپنے افسانے کے اوپر ایک پرچہ لکھ کر پن سے اٹکا دیا تھا: "آپ کی ہمت اور جسارت داد طلب تھی۔ وہ ایک ہندوستانی مسلمان لڑکی کسی غیر مرد سے بات کرے اور کوئی شے مانگے۔ میں نے اب تک ایسا سنا نہ دیکھا۔ واپس نہ کیا تو جرمانہ لینا ہم خوب جانتے ہیں۔ آپ کی جسارت اور خوش مزاجی کی داد دیے بنا نہ رہا گیا۔ اس لیے مجبوراً صاحبِ خدمت ہے۔" لکھائی کچھ ایسی جیسے بہن کی کی بہن یا بھائی بہ مشکل سے پڑھی گئی۔ دل ہی دل میں اپنی فتح پر اترائی اور خوش ہوئی۔ یہ خبر نہ تھی کہ زندگی بھر ان صاحب کی فتح ہوتی رہے گی اور میں تا حیات جرمانے بھرتی رہوں گی۔

اگلے روز صفیہ اور سعیدہ کو دوسرے رسالہ دکھایا اور جب تک میرے روبرو شرط کے وصول نہ کر لیے، ان کو نہ دیا۔ اس افسانے کو بار بار پڑھا ہی نہیں بلکہ باری باری نقل بھی کر لیا۔ پھر ہم تینوں سے نقل لے کر اور بھی بہت سی لڑکیوں نے اس کی نقل اتار لی۔ اب ان دونوں کا حکم کہ جواب لکھ کر نیچے لگا کر واپس کرو گی۔ میرا انکار اور ان کا اصرار اور نہ بہ کیا سا کر کار بھیجتے ڈرتے رضامند ہو گئی اور چند سطری جواب جس پر تینوں نے اتفاق کیا: "سدی حضور کی خدمت میں شکریہ پیش کر کے امیدوار ہے کہ کل جب کہ آپ ہم کو ہر وہ رسالہ جس میں آپ کا افسانہ شائع ہو عنایت فرماتے رہیں گے۔ شکریے کے ساتھ آپ کی امانت اس دعا کے ساتھ واپس کر رہی ہوں: اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔"

(افکار، اگست ۹۳ء)

۲

جمیل بھائی آپ نے بڑا غضب کیا کہ دوجی بھر قلم بھیج کر اصرار کیا کہ جو کچھ سوچ رہی ہوں بس اس کو قلم بند کرتی جاؤں۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ اختر انصاری جمال ناصر بوڑھے برگد کی کہانی لکھ گئے اور میں غم سے چور چور بڑھاپے میں حال کی کہانی سناؤں۔ آپ نے نعمت صدیقی سے زیادہ مجھے بیچ دھکیل دیا ہے۔ آپ کے قلم مزدور ہیں پہلا تو نہیں۔ کہاں آپ اور کہاں میں؟ ایک زنگ خوردہ گاڑی جس کے کچھ کل پرزے جا چکے ہیں ہاتھوں کا تانا بانا ٹوٹ چکا ہے باقی کل پرزے زنگ خوردہ! اب آپ کا ایسی گاڑی سے تقاضا ہے کہ "چلا چل مسافر چلا چل"۔

کل ہمارا ایک ماہ اختر کو اپنے آخری سفر پر گئے ہو گیا۔ وہ ہزاروں بار سفر پر گئے اور ہنستے ہوئے واپس آئے۔ پچاس برس سفر ہم ساتھ کرتے رہے۔ میں نے اختر ان سے پوچھا کہ پہلے خط کے پہنچنے میں آپ نے مجھے دھمکی دی تھی کہ جرمانہ وصول کیا جائے گا میں خوب جانتا ہوں پر وہ کبھی وصول نہیں کیا۔ بولے خیر نہ ہوا۔ ہنستے اور کہتے وہ میں بھولنے والا بشر نہیں۔ جرمانہ وصول ضرور کروں گا اس طرح ایک بار جس کو آپ تا حیات یاد رکھیں گی۔ کچھ یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ان کو یقین رہا ہو کہ وہ اپنے آخری سفر پر پہلے روانہ ہوں گے اور مجھ بد نصیب سے باقی کی زندگی جرمانہ وصول کرتے رہیں گے۔

ہاں تو پھر گاڑی کو دھکے دے کر آگے چلانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کیا سوچ رہی تھی؟ اسی زمانے میں اختر اسد حسن کا "میر منزل" لاتے تھے اور بھائی شوکت سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وہ بیٹھے کہ ہمارے گھر بھیجے گئے اور اماں ابا اور ہم سب کا ان سے ملاقات ہوگی ماں جی دلوں "امیر منزل" کے اشتراکی گروپ میں ایک اور نوجوان شامل ہو گیا۔ غرض اختر علی سے والد صاحب کے ادب سے بیٹھے تھے۔

اکثر "امیر منزل" جانے پر بیٹھے کوئی دھیمے سُر سے گنگناتا کبھی "ساقی" کبھی "نگار" کا پرچہ ہاتھ میں اٹھا کر پڑھتے ہیں پھر غائب ہو جاتا۔ نیا کوئی افسانہ ہوتا اور کبھی کبھی ہنس کا رسالہ سے ملا جاتا۔ وہ چاہا کہتیں بطور تحفے ان کا کیسے ساتھ کر دیکی قرار دیا۔ "منزل نا تمام" ... کے "چند اوراق" پڑھ کر میرے دل میں بڑی ہی کسک اٹھی کہ یہ شخص بظاہر بڑی اکڑ فوں کرتا ہے۔ افسانے کتنا اچھا لکھتا ہے مگر اس کا کوئی نہیں، کیا اس کو سمجھنے والا کوئی کبھی مل جائے گی۔ پھر خدا کرے ایسی ہی ہو جو اس کو سمجھ سکے "میرا کیسی"

اس کی نگاہ میں رہے۔

ادھر "اوری" (یہ شہر یوپی میں ہمالیہ کی ترائی کے نزدیک ہے) جہاں ان دنوں والد صاحب کی پوسٹنگ تھی سلمان کے نام تار آیا کہ دونوں بہنیں کچھ عرصے کو آجائیں۔ کلثوم "نیلی چھتری" آکر رہ لیں۔ شوکت تو موجود ہی ہیں۔

اماں کی پابندیوں سے رہا ہو کر بھابھی کلثوم ہم پر پابندیاں عائد کرتیں۔۔ خود اپنے گھر جاتیں، نہ ہم وہاں جا سکتے تھے ہاں یہ بتانا تو بھول گئی کہ شوکت عمر کی شادی میرے ماموں زماں بہادر سید حامد حسین کی بیٹی اور جنرل شاہد حامد کی بہن سے ہو چکی تھی۔ بھابھی حمیدہ بڑی آزاد خیال اور روشن دماغ تھیں۔ سیاست، اشتراکیت اور سوشلزم پر بے دھڑک گروپ میں بیٹھ کر باتیں کرتیں۔ پارٹی کی سرگرم رکن بھی تھیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں سے گہری دوستی کی شاید یہی وجہ ہو۔ اشرف کے چھوٹے بھائی نے ایم۔ حمیدہ مرتضیٰ۔ بی ہو چکی تھی۔ وہ شوکت بھائی کے گھر آ کر رہ رہے تھے۔ ان کی دیکھ ریکھ، غذا اور علاج کا تن من دھن سے خیال رکھتیں۔ حیدر آٹھ سال میرے بھائی کے گھر رہے۔ علی گڑھ سے رڑکی اور وہاں سے امرتسر ان کے ساتھ ساتھ گئے (ان سب کا ذکر "امیر منزل" اور "بھائی جان کی کاٹیج پر جتنا سا کتر باتوں باتوں میں" اس لڑکے" یعنی اختر کی شعلہ کلامی، بحث مباحثہ اور روشن دماغی پر جب وہ بھائی جان سے تبصرے کرتیں تو ہم کان لگا کر سمجھنے کی کوشش کرتے مگر سب سر سے گزر جاتا۔

ان ہی دنوں یونیورسٹی کے ہال میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، ساغر نظامی، مجاز اور جذبی جیسے نامور شاعر آئے۔ ہم بہنیں تڑپ اٹھیں کہ کاش ہمیں بھی جانے کی اجازت ہوتی۔ بھابھی حمیدہ ایک مرد درویش صفت شخصیت کی مالک تھیں۔ دل میں کچھ ٹھان لیں تو پوری کوشش کرتیں کہ وہ یہاں "نیلی چھتری" میں ایک مشاعرہ کرا دیں گی۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اماں یہاں ہیں نہیں، بغیر ان کی اجازت یہ کیسے ممکن ہے۔ مشاعرے سے آکر خوشی خوشی ہم کو یہ خوشخبری دی کہ انھوں نے شوکت کو راضی کر کے چند شاعروں کو کل رات کے کھانے پر بلا لیا ہے بعد میں ہم ان کا کلام سن سکیں گے۔ دعا کو ان بہنوں نے پڑھنے کے لیے مستقل "نیلی چھتری" میں رہتی ہی تھیں۔ چند اور دوستوں کو بھی بلا لیا۔ ہماری سب کی عید ہو گئی۔

کھانے کے بعد ہال میں قالینوں پر شاعروں اور مردوں کی بیٹھک ہو گئی۔ ہم لڑکیاں کافی دور کھانے والے حصے میں کھانے کی میز کے قریب قالینوں پر بیٹھ گئے۔ ہماری پشت پر دروازہ تھا۔ اس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ۔ اس کے ایک طرف پینٹری تھی جس میں کھانے کے برتن، گلاس، پیالیاں اور پانی کے گھڑے رکھے تھے۔ کھانا پکنے کے بعد وہاں پتیلیاں رکھ دی جاتیں۔ یہاں سے کھانا نکال کر پہلے زنان خانے کے کھانے کی میز پر چھوٹی پود کے لیے رکھ دیا جاتا۔ بعد میں کھانا ڈونگوں اور طشتریوں میں نکال کر مردانے میں بھیجا جاتا۔ یہ دستور ہمارے گھر کا تھا کہ جو دو سال سے اوپر کے لڑکیاں لڑکے باہر کھانا کھاتے۔ کھانے کی یہ میز جو بیس لوگوں کے لیے تھی "نیلی چھتری" درحقیقت ایک چھوٹا سا محلہ تھا۔ اس میں صرف ان کی اپنی اولاد ہی نہ رہتی تھی، دس بارہ چچا، ماموں اور خالاؤں اور والدین کے دوستوں کے لڑکے جن کو ہوسٹل سے ان کی شرارتوں یا نالائقیوں کی وجہ سے نکال دیا جاتا۔ وہ "نیلی چھتری" کے بورڈنگ ہاؤس میں جگہ پا لیتے۔ دو سال کے یہ مولانا محمد علی کے نواسے خالد علی اور مولانا شوکت علی کے پوتے اور مولانا محمد علی کے نواسے طارق علی جانے کس جرم کی پاداش میں بورڈنگ سے نکل کر ہمارے ہاں پہنچ گئے تھے۔ گو ہم کو ان دنوں کبھی یہ نہ لگا کہ یہ کوئی بے قاعدگی برتنے پر نکالے گئے ہوں گے۔ خالد علی بے حد ذہین، حاضر جواب اور خوش مزاج اور طارق بیچارے ہر وقت سر نیوڑھائے خاموش اور سکڑے سمٹے رہتے۔

ہاں تو ذکر مشاعرے کا ہو رہا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں خوب تیز روشنیاں تھیں۔ کھانے والا حصہ تاریکی میں تھا پیچھے کے برآمدے کی تھوڑی بہت روشنی ہم سب لڑکیوں پر پڑ رہی تھی۔ ہم سب اس طور سے بیٹھی ہوئی تھیں کہ ہمارا دروازہ ہماری پشت پر تھا۔ اس لیے اتنا گھس کر بیٹھ گئے کہ اگر کوئی پانی یا پان پتہ وغیرہ لینے پینٹری میں جائے تو اس کی گزر آسانی سے ہو سکے۔ میری پشت دروازے کے پاس تھی۔ ہم نے کبھی نہ کوئی مشاعرہ یوں سنا تھا، نہ کسی مشاعرے کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ سب سے پہلے مجاز کی باری آئی۔ شاید "رات اور ریل" سے شروع کیا۔ ایک دبلا پتلا سا، چھریرا، لمبے لمبے الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ کس خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ کمرے کی ہم سب لڑکیاں تو حیرت زدہ ہو کر، جادو کی کیفیت میں تھیں۔ اتنے میں کوئی بیرا ہے وہ گلاس پانی ہاتھ میں لیے گزرا تو کچھ پانی میرے سر پر گرا گیا۔ لطف بھی کچھ لیا۔ اس وقت سر اٹھا کر بھلا کیا دیکھتے نگاہیں تو مجاز پر تھیں۔ پھر ان سے فرمائش کر کے ایک اور نظم سنی گئی۔ یہ نظم جس بے اعتمادی سے انھوں نے لکھی تھی، اسی جوش اور جذبے سے انھوں نے پڑھا تو ہمارے آنسو نکل پڑے۔ مجاز کی یہ نظم آگے چل کر علی گڑھ یونیورسٹی اور گرلس کالج کا ترانہ بن گئی اور آج تک وہاں اس کو ہر موقع پر جوش اور جذبے کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ مجاز علی گڑھ کے ساتھ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے اور ان کا ترانہ فضاؤں میں گونجتا رہے گا۔ مجاز کے بعد ساغر نظامی سنانے آئے۔ صاف و شفاف۔ سڈول جسم، مناسب قد و قامت، چکنے چپڑے، بال جمے ہوئے۔ پھر کوئی پاس سے گزرتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ واپسی پر جب قریب سے گزرا تو پھر سر پر گلاس سے پانی گرا گئے۔ اب سر اٹھا کر دیکھا تو حضرت اختر حسین رائے پوری تھے۔ غصہ دل کے اندر ہی رہ گیا کہ ساغر جس انداز سے پڑھ رہے تھے ان کو سنیں یا ان صاحب کو کچھ سنا دیں۔ دل سے پھر پانی خشک کر لیا اور محو ہو کر سننے لگے۔ میں صفیہ سے اور چپک کر بیٹھ گئی پر ایک ہاتھ جہاں کا تہاں رہا۔ اب جاں نثار اختر (جن کو صفیہ جان و دل سے پسند کرتی تھیں اور یہ راز خود عیاں کر چکی تھیں) کوئی خوبصورت رومانی غزل سنانے لگے اور صفیہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے ہاتھ کو کسی نے بڑے جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے کہا، "باہر جانے کا راستہ کیوں روک دیا؟" بے ساختہ منہ سے نکل گیا، "اف کتنا سرد ہاتھ ہے؟" جواب دیا "ہمارا دل جو گرم ہے۔" بڑی ندامت ہوئی۔ یہ مشاعرہ نہ خود سن رہے ہیں نہ سننے دیتے ہیں۔ بس پانی پر پانی بڑی تہذیب سے پیش کیے جا رہے ہیں۔ پھر جگر مراد آبادی کی باری آ گئی۔ دبلے پتلے انسان کے گلے سے بڑے دلکش انداز میں سریلے اشعار نکل رہے تھے۔ دل چاہا یہ بیٹھے پڑھتے رہیں اور ہم سنا کریں۔ فرمائش پر ایک اور غزل سنائی اور پھر جب جوش صاحب گدے پر پہنچے، ننت بھر کا چمکتا چہرہ تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں بلب جیسی چمک تھی جو ہم سب اتنی دور سے بھی دیکھ سکتے تھے۔ اختر شیرانی ان کے سامنے اپنی ساقی گری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جوش صاحب نے ڈپٹ کر کہا، "میاں آپ سامنے سے ہٹ جائیے، پیچھے کچھ خواتین بھی بیٹھی ہیں۔ لیجیے جتنا کہیے ہم بالکل باہر ہی چلے جاتے ہیں۔" اپنے جھنڈا بھر بالوں کو طیش میں لہراتے ہوئے پھر برآمدے میں آ گئے۔ ہم سب تو جوش صاحب کی گھن گرج، پاٹ دار مگر موسیقی سے پُر آواز اور ان کے رعب و دبدبے کے سنگم میں محو تھے۔ جوش صاحب اپنا کلام پڑھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ اور اونچے اور چوڑے ہو گئے ہیں۔ واہ واہ کا شور ہال میں گونج رہا تھا۔ اختر اس کا لا منہ اٹھائے ہوئے پاس سے گزرے اور ذرا جھک کر کہتے ہوئے باہر والوں پر ایک شعر لکھا ہے ذرا دیکھ لیجیے گا کا سلیقہ ہے اور کسی نے نہ سنا۔ میں تو سہم سی گئی۔ جوش صاحب ٹھک ٹھک کر

پڑھ رہے تھے۔ میں چپکے سے برآمدے میں سرک گئی۔ موٹے موٹے حرفوں میں کونے سے یہ شعر لکھا ہوا تھا :

اتنی کسے پڑی تھی کہ پتھر کو پوجتا
سجدوں سے میرے رونقِ بت خانہ ہوگئی

ڈوپٹہ گیلا کرکے جلدی جلدی اس کو مٹایا مبادا کوئی اور نہ دیکھ لے۔

محفل ختم ہوگئی۔ میں رات کو دیر تک اس شخص کے متعلق سوچتی رہی کہ بے شک یہ انسان بہت ڈھیٹ، منہ زور اور بے باک ہے۔ اس سے ڈر اور بچ کر رہنا چاہیے۔ ان صاحب کا تو مذاق ہوگا اور میں بری طرح ماری جاؤں گی اگر ماں، ابا کو ذرا بھی بھنک پڑ گئی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس شخص کے ساتھ میری زندگی کا بندھن بندھنا تھا اور میری پوری عمر دل ہی دل میں سجدے کرتے گزر جائے گی اور مجھے اپنی قسمت پہ ناز ہوگا۔ آج جب وہ نہیں ہیں تو ایک کٹی پتنگ کی طرح ہوا میں اڑ رہی ہوں۔ دل میں رہ رہ کر یہ آرزو کرتی ہوں کہ کسی ستارے سے ٹکرا کر میں فضاؤں میں بکھر جاؤں۔

ہاں کیا بتا رہی تھی آپ کو؟ تیسرے دن بھائی جان کے ہاں محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں آئے۔ کھانے پہ "امیر منزل" کے مکین سبط حسن، شرف اطہر علی اور مجاز بھی آئے۔ بھابی جمیلہ نے مجھے، خدیجہ اور رشیدہ کو بھی بلا لیا۔ ان سب کی گفتگو اتنے اعلیٰ قسم کی تھی۔ ہم سب بور ہونے لگے۔ چپکے سے کھسک جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اختر ہمارے قریب آکر یوں بیٹھ گئے جیسے کوئی بالکل اپنا ہی ہو۔ ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگے "یہ گڑ کا پیڑا تو بول نہیں سکتا مگر انسان تو بول سکتے ہیں۔ آپ سب خاموش ٹک ٹک، ہم سب کو گھورے جاتی ہیں۔ منہ میں زبان ہے یا نہیں؟ مجھے تو یہ شک ہو رہا ہے۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا "تو کیا آپ ہم سب کو گونگا سمجھ رہے ہیں؟" "کوئی ہم سے کیوں سیکھے، ہم کسی سے؟" "ارے بات کہیں تو نکلی۔" "یہ کیوں نہیں مان لیتیں کہ آپ نے ہی کچھ نہیں پڑھا۔ اخبار پڑھیے، کچھ سیریس کتابیں پڑھیے۔ افسانوں اور ناولوں کی دنیا سے باہر آئیے۔ آپ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس وقت یونیورسٹی میں کمیونزم نامی ایک مرض کے جراثیم بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں اور ہم سب کی کوشش ہے کہ جلد سے جلد اور تیزی سے اس مرض کو پھیلایا جائے۔ ملک کو آزاد کرانے کی کوشش ہر جگہ سے کر رہے ہیں۔ آپ خواتین کو بھی اس نیک کام میں شریک ہونا چاہیے۔ پرسوں میں اور سبط حسن، جواہر لال نہرو کو دہلی سے علی گڑھ لا رہے ہیں۔ پروفیسر حبیب صاحب کے یہاں ٹھہرائیں گے۔ وہاں آپ سب کا آنا جانا ہے۔ جمیلہ کے ساتھ وہاں آئیے۔ شاید ان کی باتیں سن کر آپ لوگ بھی جاگ جائیں۔ یہ مٹی کی مورتیاں بن کر اگر ملک کی آدھی آبادی بیٹھی رہے گی تو کام کیسے چلے گا؟ قطرہ قطرہ دریا می شود، جو بھی اور جب بھی اس نیک کام میں شامل ہوگا۔ گاڑی آگے بڑھے گی اور انگریز کی غلامی کا طوق ہمارے ملک کے گلے سے اتر سکے گا۔" بے شک یہ باتیں ہم سمجھے بھی اور ایک نیا سا جذبہ دل میں جگہ پانے لگا تھا۔ میرے ہاتھ میں ساقی کا پرچہ اختر نے تھما دیا۔ اس میں ان کا افسانہ "اندھا بھکاری" چھپا تھا۔

تیسرا دن آیا تو سنا کہ جواہر لال نہرو وائس چانسلر کے مہمان ہیں۔ پروفیسر حبیب کے نہیں۔ اسی شام اسٹریچی ہال میں ان کی تقریر ہے مگر وہاں ہم لوگ کیسے جا سکتے تھے۔ تقریر ختم ہوتے ہی ڈائس کے پاس پیچھے کی کھڑکی سے اختر، جواہر لال نہرو کو یہ کہہ کر لے گئے کہ رات اسی طرح حبیب صاحب کے ہاں لے جایا جا سکتا ہے۔ وہاں پر ہم خیال چیدہ چیدہ حضرات آجائیں گے اور یہاں آپ سے بے تکلفی سے خیالات کا تبادلہ ہو سکے گا۔ اس پر وہ جانے پر راضی ہوگئے۔ کھڑکی کے قریب پروفیسر شریف نے اپنی موٹر پارک

کر رکھی تھی وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ بقول ان کی بیٹی منصورہ کے کہ ایک جھبرے بالوں اور لمبی قلموں والے لڑکے نے پیچھے کا دروازہ کھول کر کہا "ڈرائیور جواہر لال جی کو حبیب صاحب کی کوٹھی لے چلو۔" انھوں نے اس وقت اپنے کو بڑا محفوظ قائم کرتے ہوئے موٹر اسٹارٹ کر کے حبیب صاحب کی کوٹھی پر جا کر گاڑی روکی اور جب ان کی نظر بگھی میں بیٹھے فقیر شریف کو دیکھتی ہے تو لپکتے ہوئے برآمدے اور پھر کمرے میں چلے گئے۔ جواہر لال آہستہ آہستہ اسی رخ ہو لیے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ یہ کون ہو سکتا ہے

دوسرے دن شوکت بھائی کے پاس خط آتا ہے کہ رڑکی میں بجلی کے انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں سرکاری ملازمت کے لیے ان کو منتخب کر لیا گیا ہے اور پھر اماں کا خط آتا ہے کہ وہ فی الحال علی گڑھ واپس نہیں آئیں گی کہ ابا بہت کمزور ہو گئے ہیں حمیدہ، خدیجہ اور سعیدہ کو بورڈنگ میں چھوڑ کر وہ رڑکی چلے جائیں۔ چھوٹے بھائی اور ذکیہ تو پہلے ہی ان کے ہمراہ جا چکے تھے محمودہ ٹی۔ اے کالج لکھنؤ جا چکی تھیں۔ یوں "نیلی چھتری" کچھ عرصے کے لیے سونی ہو گئی۔ باقی مکین بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر روانہ کر دیے گئے

بورڈنگ سے "امیر منزل" جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ ساری فکر لاحق تھی کہ اب اختر رائے پوری کی کوئی چیز پڑھنے کو نہ ملے گی۔ راتوں کو اشرف، رتن، اسپیلے، مجاز اور اختر کی ٹولی "نیلی چھتری" کے آگے سڑک پر عجیب و غریب قسم کے گانے ایک نرالے انداز میں گاتے گزرتی تھی۔ وہ اب تو کبھی سننے میں نہ آئیں گے۔ یہ کیا خبر تھی کہ ایسے ہی گیت جیلانی کرمانی کے گھر تک جب بے تکلف دوستوں کی دعوت کی اور جب ذکی کا ساتھ برسوں کراچی میں رہا اور میرے بھائی آغا جان شوکت شریک ہوتے تھے کھانے کے بعد ان کی فرمائش پر وہ خوب مل کر بلا تکلف اسی انداز کر اسی طرح گاتے سہیل بھائی کیا آپ بھی سنیں گے؟ تو لیجیے دو چار گانے آپ کو بھی سنا دوں:

"گاڑی جھاڑی میں کو آئی
گاڑی سرا را را ہو کے
اس میں بیٹھے ہیں شوقین
کپڑے پہنے ہیں مہین
ان کی جیبوں میں ہے کوکین
چوری نابو نے کرائی
چوری اوروں پہ لگائی
گاڑی جھاڑی میں کو آئی

کھڑکیاں کھول دے بابر
ہمیں گرمی ستاتی ہے
کھڑکیاں نہ کھلیں ری
ہلا چھم سے آتی ہے"

آگ لادے پانی لادے
حقہ کردے تازہ
میاں جمن جمن۔ میاں جمن جمن
تیری ایسی تیسی
کرائی نسب کروایا
میاں جمن جمن
حقہ جیسے حضور ملا کے ہاتھ میں
کھکھاں ہو جیسے شرنگ کے ہاتھ میں

اللہ میاں خوب ہی تیری شان
سب بہنوں میں کچھ بی بی سے بی بی فاطمہ
سب کتابن میں ایکو کتاب بھائی
اللہ میاں وہ بھی کتاب قرآن
ساری چھتریں میں کچھ چھتر چھوایا
اللہ میاں تو نے نیلا آسمان
سب برتن میں یکو برتن بنایا
وہ بھی برتن پاندان
سارے خاندانوں میں ایک ہی خاندان
اللہ میاں تو نے بنایا عمر خاندان

عجیب نرالی دھن۔ انوکھے سُر تال۔ ہم سب بھاگ کر زنان خانے کے صحن والی سیڑھیوں پر چڑھ بیٹھتے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ گانے والوں اور سننے والوں میں فاصلہ اتنا ہوتا کہ کسی کی شکل کی پہچان کرنا ناممکن تھا۔ "نیلی چھتری" آخری کوشش تھی۔ آگے جا کر ایک قلعے کے کھنڈر تھے جن میں لوگ دن میں جاتے ڈرتے تھے رات تو پھر رات تھی۔ ہم سب کا خیال تھا کہ کسی بھانڈوں کی ٹولی نے قلعے میں بسیرا کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی لوگ تھے جو گاتے بجاتے قلعے میں جاتے اور وہیں سو جاتے۔ ساری بڑی خاموشی سے بجنی شادی کے بعد اختر سے معلوم ہوا کہ یہ ان کی ہی اختراع تھی۔

ہوسٹل کی زندگی چند سال پہلے بھی لکھنؤ میں گزار چکی تھی اس کا اپنا الگ مزا تھا۔ وہاں کی پابندیاں اور بے مزہ کھانے یاد تھے۔ اس لیے بورڈنگ میں رہنا زیادہ شاق گزرا پھر بھی کچھ یاد نہ کبھی کبھی دل میں چٹکیاں سی نہ لیتیں۔ کبھی سوچتی کہ امیر مرزا صاحب دیوانے کیا کیا ہوتا ہو گا۔ بھابھی کلثوم ستھرا کے کاندھے لیپ اماں کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ وہ بھی تو ملنے آتی ہوں گی اور اس گھر کی اونچی اونچی دیواروں کے باہر کی کوئی خبر نہیں مل سکے گی۔

ـــ (افکار، ستمبر ۱۹۹۳ء)

۳

"نیلی چھتری" کے زنان خانے کے لق و دق صحن کی پشت پر آٹھ نو کروں کے کوارٹر تھے۔ دو میں سکھو رنا کی ہماما دھوبی کے بیوی بچے، دو میں ممدا و مٹھو اور اس کا کنبہ۔ دو کوارٹروں میں دو جعدنیاں اپنے ٹبر سمیت، دو میں ان سب کی گائے بکریوں کا چارہ دانہ بھرا رہتا۔ صحن کی دوسری طرف دیوار کے ساتھ ابا کے سہرے کا چھوٹا منا سا گھر، پھر خانساماں کا کوارٹر، ساتھ رجی خالہ، اس کے بعد ڈرائیور عنایت کا کوارٹر۔ ہم سب تو پاکستان بنتے ہی یہاں چلے آئے، مگر شاباش ہے کہ وہ سب ٹک کر اور دیانتداری کا ثبوت دینے کے لیے آج بھی اسی طرح جمے بیٹھے ہیں۔ وہ خود نہ رہے تو ان کی اولادیں ہیں۔ ہم میں سے جب کوئی گیا، اور ہمیشہ ہی بے اطلاع گئے تو صاف ستھرے کمرے میں اماں ابا کی بڑی سی تصویروں پر تازے بیلا چنبیلی کے پھولوں کے گجرے دیکھ کر رو پڑے۔ "نیلی چھتری" خود تو آثار قدیمہ کی شکل اختیار کر چکی ہے، مگر ان سب کے کوارٹر درست حالت میں ہیں۔ سارے باغ کے اونچے گھنے پیڑ کٹ پٹ کر چولہوں کی لکڑی کی شکل اختیار کر کے ختم ہو چکے۔ پھلوں کے درختوں کا نام و نشان نہ رہا۔ نہ کسی طرف کسی جگہ پھول اور بیلے کی جھاڑیاں ہیں نہ ہی لان، مگر پیچھے نوکروں نے سبزیوں کے کھیت اور بیلے کے پھول لگا رکھے ہیں تاکہ موتیا اور چنبیلی کی کمی نہ ہو کیوں کہ گجرا ابھی تو بنانا ہے اور تصویر پر ڈالنا ہے۔ اس لیے کہ بیگم صاحبہ کو موتیا، چنبیلی سے عشق تھا۔ ان کا پورا وجود ان کی خوشبوؤں سے بسا رہتا۔ سبزیاں یوں ضروری ہیں کہ یونیورسٹی کے کسی نہ کسی ہوسٹل کے باورچی خانے کے لیے وہ ہمیشہ بھیجا کرتی تھیں۔ والدہ کی قبر یونیورسٹی کے قبرستان میں ایک شاہی قبر ہے۔ سنگ مرمر پر بنا سا حجرہ کٹاؤ دار جالی سے بنا ہوا ہے۔ انار کے پیڑ اور موتیا کی ڈالیاں اس لیے شاداب و تر و تازہ ہیں کہ ان کی دیکھ ریکھ کرنے والے اب بھی "نیلی چھتری" کے صحن کی پشت پر آباد ہیں اور پشت در پشت آباد رہیں گے اور اس عظیم خاتون کی قبر کو وہ مزار رکھتے اور سمجھتے ہیں۔ جانے کب تک اسی طرح اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہیں گے۔

ہمارے کپڑے سکھو دھوبی کی بیوی دھو کر ہوسٹل پہنچا آتی تھی۔ دوسرے ہفتے کپڑے رکھتے ہوئے میری نظر ایک لفافے پر پڑی۔ "بنام حمیدہ عمر، بذریعہ سکھو، آدھوبن۔" لکھائی جانی پہچانی تھی۔ دل بری طرح دھڑکا کہ کوئی یہ دیکھ نہ لے۔ شکر کہ اس وقت رشیدہ، خدیجہ اور صوفی روم میٹ کمرے میں نہ تھیں۔ جلدی سے چھپا دیا۔ دوپہر کو باغ میں ایک پیڑ تلے بیٹھ کر پڑھا اور دیکھ

پڑھا۔ پھاڑ کر پھینک دینے کو دل نہ چاہا۔ پھر الماری میں چھپا کر رکھ دیا۔ رات گئے نیند آئی کہ الٰہی اب میں کیا کروں؟ کیسے اس انسان کو منع کروں کہ آئندہ ایسی حرکت ہرگز ہرگز نہ کریں۔ کسی کو معلوم ہو گیا، پرنسپل خاتون آپا کو خبر ہو گئی تو بورڈنگ سے نکال مل جائے گا۔ خدا نہ کرے اگر بھیج دیا جائے گا اور پھر کیا ہوگا؟ کئی رات تک میں جاگا کی اور گردش میں رہتی رہی۔ پھر ایک ترکیب سوجھی کہ فوراً بھابی جمیلہ کو رڈ کی خط لکھوں کہ وہ اختر کو خط لکھ کر اچھی طرح فہمائش کریں اور آئندہ ایسی حرکت سے منع کریں۔ فوراً خط لکھا اور جانے والی ڈاک کے ڈبے میں رکھ دیا۔ اس کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ سفکو کو نامہ بر بنانے کے بجائے صفیہ، رمجاز کی بہن، کبھی ساقی، کبھی نگار رسالے جو ان کو دیے جاتے اور جن میں ایک خط ضرور ہوتا، مجھ تک پہنچ جاتے ہر بار جان سی نکل جاتی۔ میٹرک کے امتحان کی تیاری تھی اور منتشر سا دماغ، خوف اور دہشت طاری۔ کبھی صفیہ یا سعیدہ کی زبانی معلوم ہوتا کہ اختر حسین رائے پوری نے یونیورسٹی میں ایک اودھم سا مچا رکھا ہے۔ ایک ہفتہ وار اشتراکی قسم کا اخبار تھا، ہاتھ سے لکھ کر ہوسٹل کی دیوار پر چسپاں کر دیتے ہیں جس کی نقل تیزی سے ہر ہوسٹل کی دیوار پر لگا دی جاتی ہے۔ اس کی خبریں ساری ہی تو اشتراکی اور آزادی کے لیے جدوجہد کی ترغیب، ہندو مسلم اتحاد (یونٹی) کے لیے کام کرو۔ انگریزوں کی مخالفت کرو۔ نماز ظہر کی حاضری رجسٹر پر لگائی جاتی تھی۔ اختر ایک ہزار دانوں والی تسبیح ہاتھ میں لیے عربی جبہ پہن کر نماز کے لیے جاتے۔ اس پر بیچارے زبیری صاحب گرفت بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اور لڑکوں کی ہنسی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اختر "امیر منزل" سے اٹھ کر واپس ہوسٹل میں اس لیے آ گئے تھے کہ بھابی کلثوم اختر کو اور جھیل نہ سکتی تھیں اور یہ خود ان بیچاری کی بھولی بھالی باتوں کو جہالت گردان کر مزید برداشت نہ کر سکتے تھے۔

میں سوچا کرتی کہ ایم۔ اے کا امتحان سر پہ ہے اور یہ لاابالی پڑھائی پر دھیان دینے کے بجائے کیسے کیسے چکروں میں ہیں؟ ان کی ذات سے میری ہمدردی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ خطوط سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ انھیں ہر طرح کی محرومیت کا احساس ہے کہ وہ دنیا میں اکیلے ہیں۔ ماں باپ کی شفقت اور محبت سے ناآسودہ۔ ملک کی غلامی کے احساس سے دبلے ہوا، انقلاب برپا کرنے کی فکر میں ہر وقت، ہر انسان سے ٹکر لینے کے درپے۔ میری دنیا میں خوشیوں اور محبتوں کا خزانہ تھے۔ زندگی بھر اپنے چاروں طرف یہی بکھری پائی تھیں۔ پھر ایک ایسے شخص کے لیے ان سب کی غیر موجودگی کس طرح اطراف سے سمیٹ سماٹ کر اس کے حصے میں ڈال دوں؟ یوں اس کے خلوص دل سے ملک اور قوم کی خدمت کی چنگاری کو مدھم کرنے کے بجائے تیز تر کر دوں۔ یہ شخص تو عام انسانوں سے کس قدر مختلف ہے۔ ایسا سوچنے پر شاید میں اس لیے مجبور تھی کہ میں تو واقف نہ تھی کہ دل کا اندھیرا، تنہائی، اپنوں کی کمی، راحت و آرام کا نہ ہونا کیا ہوتا ہے۔ میں تو کسی بھی ایسی شے سے آشنا نہ تھی۔ ایک چھوٹے سے شہر رائے پور سے نکل کر کلکتہ جیسے غدار شہر میں سولہ سال کی عمر میں پڑھ بھی رہا ہو اور ساتھ ہی ملازمت کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا بھی ہو گیا ہو۔ کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کا ہندی، سنسکرت اور بنگلہ جاننا ایک عجیب و غریب سی بات لگتی تھی اور پھر اتنی کم عمری میں اتنے بڑے ہندی اخبار میں کام کرنا اور لکھنا۔ اردو فارسی اور گجراتی سے واقفیت!! قدرت نے اس کو ایک طرف ہر محرومی دے کر کس کس طور سے نوازا بھی ہے۔ آخر یہ معمّا کیا ہے؟ جانے کیا کیا الٹے سیدھے خیال دل میں آتے، پڑھائی خاک نہ ہو سکتی تھی۔ اور اپنے فیل ہونے کا یقین پختہ ہوتا گیا تھا۔

امتحان ختم ہو گئے۔ کالج بند ہوا۔ میں پہلے میرٹھ اپنے چچا آفتاب عمر کے ہاں چلی گئی اور رشیدہ اور خدیجہ کے پاس اور سال۔ اور یہ دہلی، لاہور ہوتے ہوئے بمبئی اور وہاں سے پھر علی گڑھ پہنچ گئے اور یہاں سے سعود اختر کو اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے۔ میں تین ہفتے میرٹھ میں رہ کر واپس آ گئی۔ خط پہلے روز کی جاتا۔ بھائی جمیل روز میں بند کر کے مجھے بھیج دیا کرتیں۔ جانی پہچانی لکھائی کا خط مجھے کھلا مل جاتا۔

اب مجھ کو حیدرآباد پہنچ کر یہ خبر دیتے ہیں کہ مولوی صاحب ان سے ڈکشنری پر جو کام کروانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جہاں جہاں سنسکرت، ہندی، بنگلہ اور گجراتی کے الفاظ آئے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط۔ "رسالہ اردو" کی ادارت کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہے اور وہ مقالہ "ادب اور انقلاب" حیدرآباد جانے سے پہلے "رسالہ اردو" چھپ چکا تھا۔ اسی مقالے سے مولوی صاحب کو اختر جیسے شخص کا انتخاب کرنے اور ان کو ہر حال میں انجمن کے نہایت موزوں و مناسب شخص سمجھا۔ جب پروفیسر رشید صاحب کے گھر پر انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وعدہ لیا کہ وہ مزید کچھ نہ کریں، ان کے ساتھ حیدرآباد چلے جائیں۔ اختر کا اصرار تھا کہ ان کو تو ایک اخبار نکالنے کے اور کچھ نہیں کرنا تو مولوی صاحب نے ان سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی ڈکشنری کا کام ختم ہو جائے گا معاف کر دیں گا۔ اجازت ہی نہ دیں گے بلکہ ایک سال اخبار نکالنے کا کل خرچہ بھی برداشت کریں گے۔ اخبار تب تک اپنا خرچہ برداشت کرنے لگے گا۔ اختر نے ساتھ جانے کی حامی بھر لی کہ یوں ان کی زندگی بھر کی تمنا پوری ہو جائے گی۔ "ادب اور انقلاب" کا چرچا ہر طرف ہو رہا تھا۔ میں سوچتی کہ الٰہی یہ انقلاب کس قسم کا ہے جو ادب میں آنا چاہتا ہے۔ کچھ سمجھ میں آیا، نہ آیا۔

میری بڑی بہن محمودہ لکھنؤ آئی۔ٹی کالج سے بی۔اے کر رہی تھیں۔ اب ان کی معرفت کچھ کتابیں بھی میرے پاس آنے لگیں۔

جمیل بھائی میری زندگی کا سب سے قیمتی اور عزیز ترین سرمایہ اختر کے وہ سب خطوط ہیں۔ ان کی کوشش یہ رہی کہ ان کے ہاتھ لگ جائیں تو یہ ان کو پھاڑ کر پھینک دیں۔ بھلا میں یہ انمول علم و ادب کے شہ پارے کیسے ان کے لگنے دیتی۔

آپ کا اصرار ہے کہ اس کہانی کو آگے بڑھاؤں۔ یہ ادھر ادھر کی کیا باتیں لے بیٹھی ہوں۔ ہاں تو پھر یوں ہوا کہ حیدرآباد سے اختر نے ایک خط خود ابا کو پیغام کا لکھ ڈالا۔ (یہ میں نے ابا کی کسی فائل میں "انیلا چھتری" کی لائبریری میں دیکھا تو جس جس کو میرا برا حال ہوا اور اس تصور سے کہ ابا پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ اس قسم کے خط سے ان کو طیش ضرور آیا ہوگا۔ بھلا بزرگوں کو اپنے معاملے میں کوئی خط لکھا کرتا ہے۔

یہ خط القاب کے بعد یوں شروع ہوتا ہے:۔

پردوں میں شکوے ہیں یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ایک بندۂ ناچیز جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو، پر علم کی دولت کے خزانے کی چابی [illegible]

تھامے ہوئے مزید اس کو حاصل کرنے کے عزم کے ساتھ اس کی سمت رواں دواں
ہے۔ آپ کی صاحبزادی حمیدہ عمر کے لیے خواستگار ہے۔ اگر قبول کر لیں تو زہے نصیب
اور قبول نہ فرمائیں تو شکوہ آپ سے نہیں بلکہ اس خدا سے ہوگا جو بڑا رحیم و کریم ہے!

اب آپ خود سوچ لیں کہ اس انداز کے خط سے والد صاحب کیسے چراغ پا ہوئے ہوں گے۔ ابا نے اس کی نقل شوکت بھائی کو بھیجی، اصل کو فائل میں لگا دیا اور ان کا جواب بھی فائل میں دیکھئے کو ملا۔ میری یادداشت میں کچھ یوں تھا۔

"اس لڑکے کو میں اور جمیلہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اختر نام ہی کا اختر نہیں بلکہ وقت کے ساتھ درحقیقت ایک روشن ستارہ اور بخت کا اختر بن کر رہے گا۔ یہ مولانا عبدالحق کے ساتھ رہ کر چھ ماہ سے کام کر رہے ہیں ان سے دریافت کر لیں کہ ان کی ذاتی رائے کیا ہے اور پھر فیصلہ جو بھی آپ اور اماں کریں گی "

والد صاحب نے اپنے اس بیٹے کی بات کبھی ٹالی نہیں تھی۔ انھوں نے مولوی صاحب کو خط لکھا۔ خط انگریزی میں تھا۔ مولوی صاحب اور والد صاحب کے یہ خطوط میرے پاس اسی طرح موجود ہیں کہ ایک روز نہ جانے کس ترنگ میں تھے کہ مجھ سے پوچھا "یہ تو بتاؤ تم نے میرے خط دیکھے تھے جو میں نے ظفر عمر کو لکھے تھے؟" میرا جواب یہ تھا کہ بھلا ابا مجھے کیوں دکھاتے، کچھ دیر سوچ کر بولے "اچھا تو میں تم کو دکھاتا ہوں"۔ اٹھے اور اپنی لوہے کی کیبنٹ کی خانے دار الماری میں سے فوٹو اسٹیٹ نکال کر یہ چند خط میرے ہاتھ میں دے دیے۔ یہ خود انھوں نے انگریزی میں اپنے قلم سے لکھ کر، ٹائپ کرا کر دستخط کر کے ابا کو بھیجے تھے، میں ہنسنے لگی۔ ذرا غرا کر پوچھا "لڑکی ہنستی کیوں ہو؟" میں نے کہا یہ دیکھ کر کہ آپ اور خط انگریزی میں لکھیں" ہنس کر بولے "اس لیے کہ تمہارے ابا پر رعب ڈالنا منظور تھا کہ حضرت یہ نہ سمجھیں کہ سچ مچ کے مولوی کے گھر اپنی بیٹی کیسے دے دیں نہ کچھ دیا۔ بلکہ ہی صاحب ہمارا اور روشن خیال ہوتے ہیں"

جمیں بھائی ان خطوں کو پڑھ کر آپ ایمان سے بتائیں کہ بابائے اردو کے قلم سے کسی بھی شخص کے لیے اس قدر تعریف کے الفاظ آپ کی نظر سے گزرے۔ فوٹو کاپی ساتھ میں ہے۔ اب اس کا ترجمہ آپ خود کر لیں۔ ان کے معیار کی کسوٹی پر اختر پورے اترے نا۔

لیجیے یوں اس خط کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے والد اختر کے خاندان یا ان کے حالات کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں کرنا چاہتے اور ہاں کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

والدہ صاحبہ گھبرا رہی تھیں۔ وہ لڑکی کا ہاتھ اس طور کسی معلومات کے بغیر، تھما دینے کے خلاف تھیں ساتھ مولوی صاحب کے خط سے اتنا ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ اختر کا کوئی تعلق اپنے والد سے نہیں ہے۔ شوکت بھائی اور حمیدہ بھابھی سو فی صد اس رشتے کی موافقت میں ہیں۔

اماں کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ وہ مجھ سے تحریری انکار لے کر ابا کو دے دیں۔ شروع جولائی کا مہینہ ہے۔ رات گھپ اندھیری، سیاہ بادلوں نے رات کی سیاہی کو تاریک تر کر دیا ہے۔ گاہے گاہے بجلی کی چمک، بادل کی گرج سے میں ڈر کے مارے تکیہ سر پر رکھ کر کان بند کر لینے کی ترکیب کر رہی ہوں کہ اماں کے قدموں کی چاپ میرے پلنگ کے پاس آ کر رک جاتی ہے۔ میں سخت حیران ہوئی کہ اس وقت یہ کیوں آ گئیں اور پھر خاموش کیوں کھڑی ہیں۔ کچھ دیر کی خاموشی

کے بعد آہستہ سے پوچھتی ہیں "حمیدہ جاگ رہی ہو نا؟" "تم آخر بجلی کی کڑک اور چمک سے اتنا کیوں ڈرتی ہو۔ میں خود
کہ آج اماں کو میرے ڈر کا خیال آیا (ہماری اماں دوسری ماؤں سے بہت مختلف تھیں۔ اولاد کے ساتھ
لاڈ اور چاؤ چونچلے نہ کرتی تھیں۔ لفظ ڈر سے ان کو نفرت تھی)

اب اماں میرے پلنگ پر سرہانے کی طرف بیٹھ گئیں۔ رعد کی بجلی چمکی تو ان کا چہرہ صاف دیکھ سکی
صاف عیاں تھی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پھر بولیں۔ "آج میں تم سے ایک بہت سنجیدہ بات کرنا چاہتی ہوں" میں
نے گھبرا کر کہا "جی" بولیں "تم اب بڑی ہو چکی ہو۔ ماشاءاللہ جوان ہو۔ بھولی اور سیدھی بہت ہو مگر اتنی بھی
بات کو سمجھ نہ سکو" رعد کی گرج اور چمک پر میں اماں سے چمٹ گئی۔ وہ آہستہ سے مجھے پرے ہٹا کر سوال کرتی
"حمیدہ اگر ایسی ایسی بجلیاں رات دن تم پر گریں اور گرتی ہی رہیں تو تم کو کیسا لگے گا؟" میں حیران کہ آخر اماں کہہ
رہی ہیں "میری بات کا جواب دو"

اماں اس کا کوئی جواب ہی نہیں کیونکہ جب بجلی کسی پر گرتی ہے تو اسی وقت اس کو بھسم کر دیتی ہے۔
جس پر گرے تو اس کو بھلا کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

اماں "اے بے وقوف لڑکی وہ بجلیاں جو بار بار کسی ایک ہی انسان پر گر سکتی ہیں وہ اس آسمانی بجلی کی طرح نہیں
ہوتیں۔ وہ بجلیاں کسی کے الفاظ کی، کردار کی، طور طریق کی، بے حسی کی اور بے پرواہی کی ہوتی ہیں"

میں کچھ بھی نہ سمجھ پائی۔ ان سے بس اتنا کہا "اماں آخر آپ مجھ سے کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"تو سنو۔ تمہارے ابا نے تمہاری شادی ایک "اختر حسین" نامی لڑکے سے کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں نے ان
کو بہت سمجھایا کہ پہلے اس شخص کے متعلق معلومات کر لینی چاہئیں کس خاندان کا ہے اور باپ سے تعلق کیوں نہیں؟ مگر
وہ کسی طور میری بات سننے کو تیار نہیں۔ کہتے ہیں "جب مولوی عبدالحق جیسے شریفوں کے پل باندھ رہے ہیں اور شریک
اور کفیل اس رشتے کے حق میں ہیں تو یہ معلومات کی کیا ضرورت ہے۔" بہت کہا کہ تم لڑکے کو ملا کر بلا لیجئے تو۔ اس کی بھی
کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ مولانا کی رائے اس کے متعلق اس قدر اچھی ہے تو ان کو نہ ملنے کی ضرورت ہے نہ معلومات حاصل
کرنے کی۔ لڑکی کا ہاتھ تھامتے وقت سب باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ اب میری سمجھ میں صرف ایک ہی بات آ رہی ہے کہ تم کاغذ پر خود
یہ لکھ دو کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ پھر وہ کچھ نہ کر سکیں گے" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "مگر کیوں؟"

"تو سنو یہ لڑکا ایک رائٹر ہے۔ میرے خیال میں ہر شاعر، ہر رائٹر، ہر مصنف اپنی شریک حیات سے یہ چاہتا ہے کہ میری آنکھ
سے دیکھو، اور میرے دماغ سے سوچو۔ جو ممکن نہیں ہوتا کہ ہر شخص اپنی آنکھ رکھتا ہے اور اپنا دماغ۔ ہر ایک کی زندگی میں
اونچ نیچ آتی ہے۔ مگر ایسے لوگوں کے ساتھ نباہ اور سمندر پار کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر تم جیسی سیدھی لڑکی کے بس کی یہ
بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے یہ میل منڈھے نہ چڑھ پائے گی"

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج سے بے پروا ہو کر ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی
عادت اور جسارت عمر بھر ہم میں سے کسی کو نہ ہوئی تھی۔ مگر خدا جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ ان کی طرف دیکھتی رہی، بجلی کی چمک
تھا جو اداسی سے بھری ہوئی تھی۔ دل کڑا کر کے جواب دیا "اماں آپ نے ہم سب کو ہمیشہ یہ سبق پڑھایا کہ میری ڈکشنری

میں لفظ ناممکن نہیں۔ اگر انسان خدا پر بھروسہ کرکے، ہمت اور ولولے کے ساتھ جو بھی کام کرے گا اس کو کر ہی لے گا۔ ہو سکتا ہے محنت بہت کرنا پڑے، کبھی ناکامی بھی ہو، مگر حوصلہ اس کو کامیاب ضرور کراتا ہے (ان کی اپنی زندگی کا ہمیشہ یہ فلسفہ رہا۔) کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی بیٹی ہو کر میں کبھی ہمت ہار دوں یا آگے بڑھا کر قدم روک لوں۔ لو! اچھا رات بھر سوچو، صبح مجھے جواب دینا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

واقعی میں صبح چار بجے تک جاگتی رہی۔ کبھی خوشی سے بے حال، کہ ابا نے فیصلہ کرلیا ہے، کبھی گھبراہٹ، کہ دن کی روشنی میں اماں کی نظروں سے نظر ملا کر میں کیسے اور کیا کہوں گی؟ اماں کی گفتگو اور کا بھی کلثوم کے سارے وہ الفاظ "وہ لڑکا ہے کہ کہ بیان کرتا کہ بڑا جلالی ہے، خود سر ہے، غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کسی پروفیسر کو بھی اپنے آگے کچھ سمجھتا نہیں، اپنی ہی بات پر اڑا رہتا ہے اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس کا مشغلہ ہے وغیرہ وغیرہ، مسلسل گونجتے رہے۔ مجھے کیا کہنا ہے اماں سے؟ دل نے کہا چلو اختر کے خط پھر سے پڑھو ایک بار۔ سوچا کیا جب اس خط کو پڑھا جس میں لکھتے ہیں، "تمہیں حاصل کرنے کے لیے نہ اپنی خودداری کو سرنگوں ہونے دوں گا اور نہ ضمیر فروشی کروں گا۔ میں آزاد ہوں اور یونہی رہوں گا۔ آج نہیں تو کل جیل جانے کے لیے کمربستہ رہوں گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے لیے۔ میں تمہیں عیش سے نہ رکھ سکتا ہوں نہ اس کی کوشش کروں گا۔ اب تم خود اپنے دل سے پوچھو کہ اس کے باوجود ایسے آدمی کا ساتھ دے سکتی ہو یا نہیں؟ میں نہ کوئی وعدہ کرتا ہوں نہ ترغیب دیتا ہوں۔ اتنا ادھا نہیں کہ اپنے لیے کوئی قربانی کرنے کو کہوں۔ یہ تو میرے اثاث پر مبنی ہے۔ میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہے گی کہ جس سے محبت کی ہے انھیں راحت سے دیکھوں۔ میں نے تو اغراض و مقاصد کی یکانگت کا ذکر صرف اس لیے کیا تھا کہ تم میری شورش طلب زندگی دیکھو اور سمجھ لو اور یہ جان لو کہ ایسے آدمی سے صرف تب ہی نبھ سکتی ہے جب اس کی ذات سے نہیں بلکہ ان چیزوں سے ہمدردی ہو جن کے لیے وہ زندہ ہے۔ بابا۔ تمام مردوں کے معیار سے مجھے کیوں جانچتی ہو، جو گھر بار سے بے نیاز، نہ نام اور نمود کا خواہاں، نہ دولت اور غرض کا بندہ۔ آخر دوسروں سے وہ کچھ تو مختلف ہے۔"

یہ خط پڑھتے ہی باقی بے پڑھے بند کر کے رکھ دیے۔ پلنگ پر آ کر بیٹھی تو تازہ دم، حوصلے اور ولولے سے سرشار تھی کہ جس کے خیالات اتنے بلند ہوں، جو زندگی سے لڑ کر آگے بڑھ رہا ہو، جو ملک اور قوم کی خاطر جیل بھی جانے کو خوش بختی سمجھے، جس کی دنیا میں تنہائی سی تنہائی رہی ہو، جس نے بچپن سے کوئی خوشی نہ دیکھی ہو اور پھر بھی اتنی صاف گوئی کہ خوشیاں حاصل کرلینے کے لیے ذرا سا جھکاؤ بھی برداشت کرنے سے صاف منکر ہو، ہاں یہ ہے اس انسان کی عظمت۔ یہ ایک عظیم انسان ہے اور میں کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں۔ بس ساری عمر، محبت، سکون اور آرام حاصل کرتی رہی۔ خوشیاں قہقہے اور مسرتیں بٹورا کی۔ اختر جو ہمت کے ساتھ علم کی دولت سے آراستہ ہیں۔ ان کا ساتھی بن جانا میرے لیے باعث فخر ہوگا اور جو اماں کہہ رہی تھیں۔ بجلیاں، سمندر، پہاڑ توڑیں ایسے ہم سفر کے ساتھ رہ کر سب کو پار کرلوں گی۔ ایک پرچے پر بس اتنا لکھا "ابا کا فیصلہ مجھے منظور ہے۔" اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر غافل سو گئی۔

صبح بہت دیر سے اٹھی جیسے کوئی لمبا سفر کر کے تھکن سے چور چور ہو کر جاگے۔ صحن میں اماں بیٹھی سبزیاں کاٹ رہی تھیں۔ آداب کہہ کر وہ پرچہ ان کے سامنے رکھا اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔ دوسرے کمرے کا پردہ ہٹا کر آڑ سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

انھوں نے یہ پہلی بار اچھا سا ان کا چہرہ اور اس سال تک میں سارا دن ان کے ساتھ رہ گئی۔ اب ان کو کچھ اطمینان ہوا
میری بیٹی بہن محمودہ آئی ٹی کالج لکھنؤ میں پڑھ رہی تھی۔ تین دن بعد بھائی اور بہنیں خیر کر، رشیدہ
کو لیس اسکول بھیج دی گئیں۔

اب اماں میری شادی کے کپڑے وغیرہ سینے اور سلوانے کی تیاری میں لگ گئیں۔ میں ان سے دور دور
جب میرا ان سے آمنا سامنا ہوتا تو میں ان کے چہرے پر اداسی محسوس کرتی۔ کچھ میری وجہ سے اور کچھ سب سے بڑ
محمود بیگم کی وجہ سے، جن کو ہم سب آپا کہتے تھے وہ ٹی بی کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ آپا کے دو ننھے ننھے بیٹے خورش
اور جمشید علی گڑھ میں ہی رہتے تھے۔ نسیم تقویم میں ایک سال کے قریب رہ کر گھر واپس آگئی تھیں کہ ڈاکٹروں نے
دے دیا تھا۔ ان کی طرف سے اماں کی پریشانی جائز تھی اور پھر ان کو میں نے پریشان کر دیا تھا۔ میں زیادہ
ان دو بچے بچیوں کے ساتھ گزارتی کہ بچے آپا کے کمرے میں جا نہیں سکتے تھے۔ پھر میری بھی ذرا تو تھی۔ جب
میں آپا کے کمرے میں چلی جاتی۔ کس ہمت اور حوصلے کی خاتون تھیں۔ کبھی اپنی بیماری یا مایوسی کی باتیں نہ کرتیں۔ بس
آنے والی زندگی کے اونچ نیچ بتایا کرتیں کہ کس قسم کی لڑکیاں کامیاب زندگی گزارتی ہیں۔ اس کے لیے کیسے جتن کر
ہوتے ہیں۔ انھوں نے مجھے مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق بہت کچھ بتایا کہ ان کی شخصیت کتنی عظیم ہے۔ ان کی زندگ
علم ادب اور اردو زبان کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے شادی کبھی نہیں کی۔ ان کی کوئی آل اولاد نہیں۔ کبھی کبھی کہ
تم بیاہ کر اپنے گھر جاؤ گی تو ہر طرف کتابوں کے ڈھیر اور اخباروں کے انبار پاؤ گی۔ اس گھر میں صرف دو شخص ہوں گے۔ اختر
صاحب بڑی ذہین قسم کی گفتگو ہوگی جو شاید تمہاری سمجھ سے باہر ہو، مگر دیکھو کبھی اپنے چہرے سے عیاں نہ ہونے دینا کہ
سمجھ نہیں رہی ہو۔ غور سے سنو گی تو آہستہ آہستہ دماغ کو جلا ملتی ہی جائے گی۔ رفتہ رفتہ تنہائی کا احساس ہو بھی تو کبھی اپنے
پر نہ لانا بے شک تم ایک اتنے بڑے کنبے سے نکل کر ایک اور ہی ماحول میں پہنچ جاؤ گی۔ مگر اپنے کو وہاں کے ماحول کے مط
ڈھال لینا تاکہ زندگی بھر خوش رہو اور ہاں دیکھو کبھی بات بات پر ہمارے گھر کا، ہمارے گھر والوں کا، ہرگز ذکر نہ کرنا کیو
درحقیقت چند ماہ بعد تمہارا یہ گھر نہیں رہے گا۔ اصل گھر وہ ہوگا۔ میں سوچتی، اللہ وہ کیسا گھر ہوگا؟ وہاں کیا وہاں اختر
ہوں گے۔ پھر بھی ایک دہشت سی طاری تھی۔

یہ چند ماہ تیزی سے گزر گئے، دسمبر آگیا۔ سو دسمبر ۱۹۳۶ء کی صبح برات آجانے کی، شام کو نکاح اور رخصت کو کہا تھا۔
بھائی شوکت عمر اور سعید بھائی بھی ایک ہفتہ پہلے آگئے۔ مولانا عبدالحق برات لے کر آرہے ہیں ان کے شایان شان انتظام ہو
چاہیے۔ وہ انتظامات کے ماہر تھے۔ مولوی صاحب نے پہلے سے لکھ دیا تھا کہ نکاح کے دوسرے روز "کاپی" ضرور کھانے کے کنارے پر
کھانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہاں کا ریسٹ ہاؤس بھی سجا دیا گیا۔

ہر ضلع میں اس وقت تین بہت باحیثیت شخصیتیں ہوتی تھیں جو عام طور سے انگریز ہوتے۔ کبھی اکا دکا آپ کو کوئی ہندوستانی
مل سکتا تھا۔ اور ... میں میرے والد مسلمان سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ باقی دونوں انگریز ڈسٹرکٹ جج اور کلکٹر تھے۔ انگریزوں
نے اپنے افسروں کے لیے ہر ضلع میں کئی کئی ایکڑ زمین پر کوٹھیاں بنوائی ہوئی تھیں۔ یہ شہر سے ہٹ کر چھاؤنی کے قریب ہوتیں
یہ شاندار بڑے بڑے کمرے بے حد اونچی چھتیں یا تو کھپریل کی یا ڈاٹ کر دو دو فٹ موٹی ہوتیں۔ بڑے لان وسیع ہال اور

…کے کمرے تاکہ بوقت ضرورت ان کو مہمان خانے کی طرح استعمال میں لایا جا سکے۔ گھر کی دیواریں بے تحاشا اونچی تاکہ گرمی کا اثر کم ہو۔ …کے چونے سے بنا کمرے۔ کوٹھی کے چاروں طرف جانے کیوں؟ ہر کوٹھی گولائی میں بنائی گئی تھی۔ چاروں طرف ان کے باغات کئی ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے۔ سرکاری چاچا سالی دو کو دیکھ سکنے کے لیے۔ آموں، امرودوں اور سنگتروں کے گھنے باغات، جن کے تلے لڑکیاں اور بچیاں کبھی آنکھ مچولی کھیلتیں۔ یہاں صحن کا سوال ہی نہ تھا۔ کوٹھی سے آدھ فرلانگ ہٹ کر باورچی خانہ اور ملازمین کے کوارٹر۔ دوسری طرف موٹر گاڑی کے گیراج تک۔ ان تینوں کوٹھیوں پر بارہ پولیس کی نفری تعینات رہتی۔ مجھے سب ہی دن بدن رات میں دو دو کوٹھی کا طواف پہرہ دار رسے یہ شہر سے بالکل باہر ہونے کی وجہ سے رات بھر گیدڑ شور لاکرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا چیتا اپنے شکار کے تعاقب میں بنگلے کے باغ سے گزر جاتا اور سپاہیوں کی بلند آوازیں ہم کو سوتے سے جگا دیتیں۔

بنگلے کے عین سامنے لق ودق لان اور چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں۔ ایک طرف ٹینس کورٹ کا وجود ضروری ہوتا۔ ان چند ماہ میں اپنی پیاری آپا کے دو چھوٹے بچوں، تین چھوٹے بھائیوں اور ایک پانچ سالہ بہن ذکیہ کے ساتھ رہی۔ کوئی ہم عمر بہن نہ تھی۔ آپا کو میرے اکیلے پن کا خیال آیا تو شام کو کلب کے لیڈیز کوچ کو بلا کر میرے ٹینس کھیلنے کا انتظام کر دیا۔ بیڈمنٹن تو پہلے کھیلا کرتی تھی۔ خاصی جلدی مجھے اس کھیل میں بھی مہارت حاصل ہو گئی اور دو گھنٹے کھیلنے کے بعد گہری نیند آ جاتی۔

سونے سے پہلے اپنی آپا کے کمرے میں جا کر ان کے پلنگ کی پٹی سے لگ دری پر بیٹھ جاتی اور وہ اپنے محبت بھرے ہاتھ میرے سر پر پھیر پھیر کر بڑے خوب صورت طریقے سے جینے کے گُر بتایا کرتیں۔ ایک اچھی بیوی کے فرائض ذہن نشین کراتیں۔ ایک بار خوب ہنس ہنس کر کہا "حمیدہ! تم کو خبر نہیں اس گھر میں پہنچ کر تمہیں دو بچے، ایک بڑھا اور ایک جوان ملیں گے" "آپا میری آخر یہ کیوں کر؟" بولیں "ایک بچہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہا اور دوسرا جس نے طبابت اور اردو کے عشق میں سرشار رہ کر اپنے گھر بار سے بے نیاز کر لیا۔ پہلی بار ایک گھر میں ایک لڑکی کی موجودگی کا احساس جاگے گا۔ دونوں من چلے ضدی بچوں کی طرح تم جیسی الہڑ لڑکی پر اپنا حق جتا کر فخر کریں گے۔ بڑی عقلمندی برتنا پڑے گی۔ اگر ڈوری کو ڈھیل دے کر رکھ سکیں تو چین سے زندگی گزارو گی۔ چلو بھاگو یہاں سے، آرام سے جا کر سو جاؤ۔ کل ہماری چھوٹی سی بہن کی برات آ رہی ہے۔"

ان تمام مہینوں میں خاص کر کل کی رات مجھے اپنے نرالے شوہر کی جو ہمارے سب سے چہیتے اور لاڈلے بھائی تھے، یاد بے طرح ستا رہی کہ ان سے میں بے تکلف تھی اور ہر بات ان سے بہت کچھ کہہ سکتی تھی، مگر وہ تو ہم سے ہزاروں میل دور جنت میں جا سوئے تھے۔ میرا دل آپا کی آدھ ناصحانہ باتوں سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بار بار سوچتی کہ آپا آخر یہ کیا کہہ رہی تھیں کہ میرا واسطہ ایک جوان اور ایک بڑھے بچے سے پڑے گا۔ مگر سمجھ نہ پائی!!

میرے سسرے میرے ماموں اور خالو، چچا آفتاب احمد اور پھوپی جو [illegible] تھیں اور ان کے بچے۔ لکھنؤ سے بہنیں، ماموں آپا، جنرل صاحب [illegible] اور رشتہ دار [illegible] وغیرہ پہنچ چکے تھے۔ سب سو رہے تھے اور میں پلنگ پر لیٹی جاگ رہی تھی۔

(افکار، اکتوبر ۹۳ء)

(۴)

۳۰ دسمبر ۱۹۴۳ء کو گیارہ بجے وہاں ٹرین پہنچی۔ پلیٹ فارم پر فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے لال قالین بچھے تھے۔ دوبن، عراقت پولیس کے بینڈ والے کھڑے ہلکی دھنوں میں شادی کے گانوں کی دھن بجا رہے تھے۔ قالین کے دونوں طرف ست ہرے معزز لوگ اور خاندان والے برات کی پیشوائی کے لیے کھڑے تھے۔ ریل چھک چھک کرکے رک گئی۔ سب سے پہلے گردکر مولوی صاحب پھر ان کے پیچھے اختر وارد ہوئے اور پھر یکے بعد دیگرے ڈاکٹر اشرف، سبط حسن، مجاز، ذکا والله خان ترب۔ اکبر علی البیر صاحب (علی گڑھ یونیورسٹی کے لائبریرین) اختر کے دو بنگالی دوست، مہندر اور رام لعل برآمد ہوئے۔

مولوی صاحب سب سے آگے تھے اور ساتھ میں دولہا میاں اختر اور سارے براتی با آواز بلند گا رہے تھے

"لالہ رو پتیا لایا ہو، لالہ کی شادی کردیں گے، کبھی کردیں گے، ابھی کردیں گے

(زوردار سب کی تالیاں) لائق دولہا لائیوں ہیں

آن پڑھ لڑکی سے لیں گے

کبھی سے لیں گے۔ ابھی سے لیں گے (پھر تالیوں کی گونج)

بینڈ والے ایک منٹ کی خاموشی کے بعد اسی دھن کو بجانے لگے!! ابا، چچا، ماموں کی گردنیں جھک سی گئیں۔ مگر شوکت عمر بھائی مسکرا رہے تھے۔ باقی لوگ حق حیران، ان لوگوں کے براتیوں کو دیکھ رہے تھے۔ برات کے ساتھ کوئی خاتون نہ تھیں۔

اشرف بھائی اور اختر کو شوکت بھائی نے اپنے ساتھ موٹر میں بٹھایا، بیٹھتے ہی پوچھا کہ یہ کیا لوگو اور نرالی حرکت تم سب نے کی؟ اور مولانا کو کیا ہوگیا تھا؟ بتایا گیا کہ گاڑی رکنے سے چند منٹ پہلے مولوی صاحب نے خود ہی تک بندی کی، ذکی اور مجاز نے دھن نکالی، پھر ان ہی کی رائے ہوئی کہ سب گاتے ہوئے اتریں اور ذرا فاکی اور دوسری والے صاحب یعنی (والد صاحب) کا پیچ و تاب دیکھا جائے۔

یہ تو ان کی اپنی خوشی کا اظہار تھا۔ باغ میں ہر براتی کے لیے بڑے خوبصورت خیمے لگائے گئے تھے۔ مولوی صاحب اور اختر کے خیمے زیادہ بڑے تھے۔ ہر غسل خانے میں گرم پانی رکھا ہوا تھا۔ نہا دھو، تیار ہو کر کھانے بنگلے میں آنے کے سب نے باغ کا منظر

گیا۔ ڈرائنگ روم کے بلغ میں ہلکی سی گانے کی آواز سن کر شوکت بھائی لپکتے ہوئے وہاں پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ اختر اور لوگ کسی گانے کی دھن نکال رہے ہیں اور مولوی صاحب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو کر اس کی طرز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں! شوکت بھائی کو آتا دیکھ کر سب کے سب چپ ہو گئے۔ شوکت بھائی سب کو گھیر کر اندر لاتے ہوئے کہتے جاتے تھے کہ "اب کوئی اور گل نہ کھلانا۔ ابا پہلے ہی اسٹیشن پر سب کے سامنے شرمندہ ہو چکے ہیں۔

اور کسی کو تو ہمت نہ ہوئی کہ اماں کو اسٹیشن پر براتیوں کے اترنے اور گانے کا حال سناتا مگر ماموں ابا بہن کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور بہت مسکرا کر سارا سین بیان کیا۔ اماں اپنے بھائی جان سے لپٹ کر آب دیدہ ہو کر بولیں "خدارا بھائی جان آپ شوکت کے ابا کو سمجھائیں ابھی وقت اپنے ہاتھ میں ہے۔ میرا ماتھا تو جب ہی ٹھنکا تھا جب پچھلے ماہ مولوی صاحب کو ہزار روپے کا چیک یہ لکھ کر کہ اختر سے کہیے کہ اس میں سے ایک شیروانی، کرتا پاجامہ اور ایک سوٹ اور جوتے وغیرہ لے لیں (اس وقت کے ہزار روپے آج کے دس ہزار روپے کے برابر تو ضرور ہوں گے) تو ان حضرت مولانا نے چیک کے چار ٹکڑے کر کے یہ لکھ کر کہ "تم نے مجھے اختر سے شرمسار کرایا۔ کیا سمجھا ہے؟ کہ ان کے پاس اپنے کپڑے جوتوں کے لیے روپے نہیں؟" چیک کے ٹکڑوں کے ساتھ خط بھیجا۔ ماموں ابا نے ہنس کر کہا "تو یہ اسٹیشن پر گانا ان کا ظفر کو شرمندہ کرنے کی ترکیب تھی۔ مولانا کے مذاق کے طریقے، سنا تھا کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دیکھو اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ مالک ہے اس لڑکی کا۔"

بہت بڑے کھانے کے ہال میں چھ میٹر لمبی لوگوں کی میز پر لنچ (جو سب انگلش کھانا تھا۔ اس کے ساتھ ہر ایک کے سامنے ایک ایک ٹماٹر سوس کی بوتل تھی) سفید کپڑوں میں بیرے اونچی کلاہ کے صافے باندھے مؤدب کھڑے تھے۔ لال وردی میں بینڈ کے بیک پائپر اسٹیچو کی طرح منتظر کھڑے تھے کہ مہمان کرسیوں پر بیٹھ جائیں تو یہ میز کے چاروں طرف گھوم گھوم کر کوئی دھن بجانا شروع کریں۔ شوکت بھائی نے ہر ایک کو خاص انداز سے بٹھایا۔ بیرے گرم گرم کھانے کی ڈشیں لا کر کھانا پیش کرنے لگے اور دھن شروع ہو گئی۔ سب نے کھانا لے لیا۔ مولوی صاحب براتیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "یہ بھی اس توں، توں، پی، پی میں کھانا کیوں کر کھایا جا سکتا ہے؟ چلو تو پھر پی ہی لیں۔" یہ کہہ کر ٹماٹر سوس کی بوتل منہ سے لگا کر غٹ غٹ پینے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہر براتی اور اختر نے بھی یہی حرکت کی۔ ابا نے ہاتھ کے اشارے سے بیک پائپر کو باہر جانے کو کہا۔ تب ٹماٹر سوس کی بوتلیں میز پر رکھ دی گئیں اور مہمانوں کے سامنے ابا کو پھر کیسی شرمساری ہوئی۔ بہنیں دوسرے کمرے کے پردوں کی آڑ سے یہ تماشا دیکھ کر ہنسی سے بے حال میرے کمرے میں دوڑی آئیں اور سارا ماجرا بیان کیا۔ میری تو جان نکلے جا رہی تھی کہ الٰہی یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ آگے کیا ہو گا؟

کھانا ختم کر کے مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے اٹھے "چلو چلو اپنے اپنے خیموں میں۔ ہم سب کو تو بنجارا سمجھا گیا ہے" ان کے پیچھے سب چل پڑے۔ باقی مہمان حق دق ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

خیر شام آ ہی گئی۔ مہمان آنا شروع ہو گئے۔ قاضی صاحب بھی آ گئے۔ تب یہ نہ ہوتا تھا کہ مہر پہلے سے طے کر لیا جائے بلکہ اسی وقت خاموشی سے سرجوڑ کر بات چیت کر کے مہر طے پاتا تھا۔ نہ نکاح کے چھپے ہوئے فارم ہوتے تھے۔ قاضی صاحب اپنے قلم سے لکھتے۔ لڑکے اور لڑکی کی طرف والے دستخط کر دیتے۔ سید حامد حسین میرے ماموں مولوی صاحب کے

پاس آکر متذبذب ہو کر جھک کر بڑی آہستہ آواز میں سوالات کرتے ہیں " مولانا صاحب آپ مہر کتنا مقرر کر دیں گے
صاحب اچھل سا پڑتے ہیں اور باآواز بلند بڑی معصومیت سے کہتے ہیں " خالہ تم یہ مہر کا کیا نام لے رہے ہو۔ ہم تو
کی شادی حمیدہ سے کر رہے ہیں؟" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ کر پھر آگے بڑھتے ہیں یہ کہتے ہوئے " جی وہ مہر کیا
نہیں ہے۔ یہ تو شادی کے وقت وہ رقم بطور مہر طے کی جاتی ہے میں تو اس کی بات کر رہا ہوں" تو مولوی صاحب
ساختہ اور کس غصے سے کہتے ہیں " اچھا تو تم لڑکی کو بیچ رہے ہو سنا لوگو!" سب حق حیران کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں
بولو بولو، کیا بولی تم سب نے اس بیچاری لڑکی کی لگائی ہے؟"

" جو بڑی بہن اور گھر کی بہو کا ہے یعنی پچیس ہزار، وہی مہر رکھیں گے" مولوی صاحب نے جھٹ جیب سے چیک نکال اتنی رقم کا چیک لکھ کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ پہلے قاضی صاحب کے کان میں کچھ کہہ کر، چیک لے کر اماں کے پاس اندر آئے اور ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میری والدہ کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ چیک کے چار ٹکڑے کر کے جیسے والد صاحب کے چیک کے چار ٹکڑے کر کے مولوی صاحب نے ان کو واپس کیے تھے)، ایک چاندی کی تھالی میں رکھ کر اپنے بھائی کے ہاتھ میں دی اور بولیں، بھائی جان یہ آپ ان بزرگوار کو دے آئیں۔ انھوں نے سمجھا کیا ہے کہ مہر لینے کے لیے لکھوایا جاتا ہے۔ یہ تو مجھے انتہائی بدنیت لوگ لگ رہے ہیں۔" ماموں ابا انکار کیے جاتے کہ بابا میں تو ٹکڑے جا کر ان کو دے کر بھری محفل میں مولانا کی الٹی سیدھی بات سننے والا نہیں۔

اماں نے بھائی کو قسم دی کہ آپ یہ ان کو دے آئیں۔ آخر کو وہ باہر گئے اور خاموشی سے چاندی کی طشتری ان کے ہاتھ میں دے کر جلدی سے وہاں سے ہٹ گئے۔ مولوی صاحب چیک کے ٹکڑے دیکھ کر خوب ہنسے اور ایک ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ کر پھونک مار کر ادھر ادھر اڑا دیا۔ اندر آکر پہلے مجھ سے پوچھا گیا پھر باہر جا کر "حمیدہ بنت ظفر ..... وغیرہ وغیرہ آپ کو قبول ؟" مولوی صاحب بول اٹھے "یہ قبول نہ ہوتی تو ہم حیدرآباد سے اٹھ کر آتے ہی کیوں؟" قاضی صاحب، مولوی صاحب کی حیثیت اور دبدبے سے نا واقف تھا بگڑ کر بولے " اس کا جواب دولہا میاں خود دیں گے۔ آپ خاموش رہیں" تو جھٹ ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خاموش ہو بیٹھے۔ چلیے یہ مرحلہ ختم ہوا۔ اب جو صاحب سہرا لکھ کر لائے تھے، وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے کہ " ایک سہرا بندہ لکھ کر لایا ہے وہ پیش خدمت ہے" مولوی صاحب جھٹ سے کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ " جناب آپ کس خوشی میں سہرا پڑھیں گے۔ خوشی کا موقع تو ہمارے لیے ہے کہ ہم دلہن بیاہ کر لے جا رہے ہیں" مجاز کی طرف دیکھ کر کہا میاں جھپٹ آپ ادھر آجائیں۔" قریب بیٹھے لوگ سمجھے کہ میاں جوش کہا۔ ادھر ادھر دیکھ کر آپس میں کہا مگر جوش صاحب یہاں تو نظر نہیں آئے۔ آخر مجاز سے اٹھ کر مولوی صاحب کے پاس آگئے۔ باقی بھائی تو پہلے ہی سے ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے مولوی صاحب کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی باقی کھڑے ہو گئے۔ ابا، چچا، آفتاب عمر، ماموں حامد حسین صاحب اور شوکت عمر کے چہرے پہ ہوائیاں سی اڑنے لگیں کہ اب کیا اودھم ہوگا یہ سب مل کر کھلائیں گے اور سہرا کبھی گائیں۔ جمیل بھائی ذرا مہر سے کے بول تو سنیے۔ بھلا آپ اس قدر ہنس کیوں رہے ہیں۔ یہ تو بابا سے ادب سے فرمود تو ذکر کے کیا ہے سہ

ایک سیار بہا سا پھرتا تھا یوں مارا مارا
جیسے تھا ایک مرغ بیچارا

ڈھونڈے سہارا ڈبے کا، ڈھبے کا
یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
مشٹنڈر کی، بھگا منڈر کی
بہن کھلونا بھائی تماشا
آگے تانگا پیچھے گھوڑا
پہنے خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا بابا

جمیل بھائی آپ ایمان لگتی کہیں کہ اگر اس نئے زمانے میں بھی براتی ایسی حرکات کریں تو کیا ڈنڈے لگا کر برات اسی وقت بھگا نہ دی جائے۔ مگر یہاں واسطہ تو مولوی عبدالحق صاحب سے تھا جن کے اس وقت سارے ہندوستان میں ڈنکے بج رہے تھے۔ بزرگوں کا حال بس یہ تھا "تک تک دیدم دم نہ کشیدم"۔

کھانا میز پر لگ گیا۔ پہلے براتیوں کو لے کر شوکت عمر آگے آگے چلے اور پیچھے سے سبیطے اور اشرف نے کہا "کھانے کے لیے اب کوئی اور نیا گل نہ کھلاتا۔ آپا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔" "ٹھیک ہے ٹھیک ہے" اب مولوی صاحب اپنے بچکانہ موڈ سے نکل چکے تھے۔ مختلف لوگوں سے سنجیدہ ہو کر بات چیت کرتے رہے۔

کھانے کے بعد مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے۔ جانے بھائی جان کو کیا سوجھی جو مولوی صاحب سے کہا "ذرا اندر تشریف لے چلیں اور ایک نظر جہیز دیکھ لیں تاکہ جہیز بند کر دیا جائے۔" کالپی اصل شہر سے دس میل پرے ہے، یہ کالپی نام دریا بڑے حسین مقام سے گزرتا ہے۔ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، ڈھلان پر پہلے پھلوں کے باغات اور اس کے بعد ہرے بھرے کھیت دور دور تک پھیلے گئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں جب گزرتیں تو دسمبر کے مہینے میں وہ لاکھوں پرندے جو برفانی علاقوں سے پناہ لینے آ جایا کرتے تھے۔ پرے کے پرے اڑ کر ادھر سے ادھر ہو جاتے۔ ٹیلوں پر سے کبھی کبھار ہرنوں کی ٹولیاں کھیتوں کا رخ کرتیں، نیچے کی طرف چھلانگیں لگاتی دکھائی دیتیں اور کبھی بارہ سنگوں کا غول نظر آتا۔ اس علاقے میں چیتوں کی کمی نہ تھی۔ ریسٹ ہاؤس جو خاصی بلندی پر تھا وہاں سے چیتے کو ہرن یا بارہ سنگھے کے شکار کے تعاقب میں زناٹے بھرتے بھی دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے لوگ بس ریسٹ ہاؤس کے کنارے سے دریا اور ان جانوروں کا نظارہ کرنے پر اکتفا کرتے۔

ہاں تو شوکت عمر مولوی صاحب کو لے کر اس کمرے میں گئے جہاں جہیز سجا کر رکھا گیا تھا۔ ان کی نظر سب سے پہلے ان کرسی کی طرف گئی جہاں پتیلیاں ایک دوسرے پر رکھی ایک چھوٹے سے مینار کی شکل میں تھیں۔ اپنی چھڑی سے ان کو ٹھک ٹھک کیا۔ وہ دھڑام سے نیچے ڈھلک کر گرنے لگیں۔ بولے "بھئی یہ سب کیا ہے۔ کیا ہمارے گھر میں پکانے کو برتن نہیں ہیں؟"

---

۱ اختر کا ایک افسانہ "میرے خوابوں کا منڈوہ" ہے اشارہ اسی کی طرف ہے۔

میز پر سب سے پہلے ان کو چاندی کا پاندان اور خاصدان نظر آیا۔ اس کو بھی چھڑی سے نیچے گرایا۔ "چھی چھی یہ اور ہمارے
پھر ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا "یہ! تم قلم کچھ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا؟ صرف حمیدہ کے اپنے پہننے کے کپڑے ا
استعمال کی دو چار چیزیں اور یہ بستروں کا ڈھیر! کیا ہمارے گھر میں بستر نہیں؟" بھائی جان نے ڈرتے ڈرتے آپ
بہا "مگر یہ سب چیزیں تو ہر لڑکی کو دی ہی جاتی ہیں" "تمہارے گھر میں اور جو دسیوں لڑکیاں ہیں ان کے لیے رکھ لو!"
یہ کہہ کر سب سے زارے نکل گئے۔ پل پل کی خبریں چھوٹے بہن بھائی آکر دے رہے تھے۔ اپنی بڑی بہن محمودہ کی بڑی
کی کو سوٹ کیس میں کپڑے کم کر کے میرے دونوں تکیے ضرور رکھ دیں کہ میں بنا ان کے سو نہیں سکتی تھی اور یہ م
عادت آج تک نہ گئی۔ رات کو کئی گھنٹے آتشبازی چھٹتی رہی اور وہ سب گم ہو کر دیکھا کیے۔

صبح ناشتے کے بعد وہ سب اور ہم پکنک کا سامان لے کر کالپی روانہ ہوگئے۔ ریسٹ ہاؤس میں پہلے اطلاع کی جا چکی تھی ہر طرح کا انتظام تھا۔ بھائی جان نے اپنے ساتھ اختر، اشرف اور سبطے کو بٹھا لیا۔ مولوی صاحب آپا اور اماں کے ساتھ موٹر میں بیٹھے۔ ہم سب اور باقی براتی پانچ موٹروں میں روانہ ہوئے۔ اب آپا کی مولوی صاحب سے کیا بات چیت ہوئی۔ وہ مجھے یوں معلوم نہیں کہ مولوی صاحب نے نہ خود ذکر کیا اور نہ میں نے پوچھا۔ اختر نے کبھی ہنس ہنس کر کہ بھائی جان نے تینوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ تم سب کی حرکات بڑی شرمساری کا باعث بنیں، موقع محل تو دیکھنا تھا۔ جس پر اشرف بھائی نے کہا "ہم سب کو موقع محل ہی تو مد نظر تھا، کیوں کہ مولوی صاحب نے کہہ دیا تھا کہ آپ سب بہت خوش خوش ایک بڑی خوشی پر جا رہے ہیں۔ ہر صورت میں ہماری طرف سے خوشی اور مسرت کا اظہار ہونا چاہیے تاکہ لوگ مرتے دم تک اس شادی کے براتیوں کو یاد رکھیں۔ پھر انھوں نے خود سب کے ساتھ مل کر تک بندی کی اس میں اختر کا بھی ہاتھ تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم لوگ ذرے بد مذاق ہو، سمجھنے اور محظوظ ہونے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ یا گردنیں جھکی ہوئی تھیں یا چہرے ہونق تھے۔ شادی کی محفل تھی۔ خوشی کا موقع تھا، کوئی مجلس تو نہ تھی جو ہم سب ماتم کرتے ہوئے اترتے!" "کالپی میں تو خدا را انسانیت کا دامن پکڑے رہنا!" اختر نے کہا "شوکت تم انسانیت کہیں سے اگر ہم کو لا دو تو ہم صرف دامن ہی نہیں اس کا گریبان بھی پکڑ لیں گے۔"

موٹروں سے جب سب اتر گئے تو شوکت بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر مولوی صاحب کے پاس لے گئے "لو یہ حمیدہ ہیں۔" میں نے جھک کر آداب کیا۔ میرا سر ضرورت سے زیادہ ہی شاید جھکا ہوا تھا اور دوپٹہ اس طرح کھینچ کر اوڑھے ہوئی تھی کہ منہ نہ دیکھ سکیں۔ اس وقت میرے دلہاپے کا ایک عالم تھا۔ ان کو شاید میں بہت ہی چھوٹی سی لگی۔ خود کو خوب جھکا کر میرا منہ دیکھا اور اپنا سر اونچا کرنے کے بعد کہا "بھئی ہم کو تو ڈر ہے کہ کہیں "شاردا ایکٹ"[1] میں ہم لوگ دھر نہ لیے جائیں۔ یہ تو ذرا سی بچی ہے" پھر میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور ایک ڈبیہ میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس میں بے حد خوب صورت ہیرے کے لمبے لمبے جھمکے تھے۔ جو اب میں نے اپنی سب سے چھوٹی بہو کو دے دیے۔ میرا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اختر کے پاس لائے اور بولے "بیٹی ان کو تم سلام کرو، ان کا نام اختر حسین رائے پوری ہے مگر یہ ہیں بڑی توپ چیز، ذرا سی بات پہ بگڑ جاتے ہیں۔ چھوٹی سی بات پر خوش

---

[1] انگریزی گورنمنٹ نے ایک شاردا ایکٹ بنایا تھا کہ چودہ سال سے کم عمر کی لڑکی سے شادی کرنے پر جیل کی سزا ملتی تھی۔

بھی ہو جاتے ہیں۔" دل بے حد چاہا کہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھوں کہ بگڑنے کے موڈ میں ہیں یا خوش ہونے کے۔ پھر اتنی ہمت کیسے کرتی؟

اختر نے ایک ڈبیہ اپنی جیب سے نکالی اور میرا الٹا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنانے کی کوشش کی۔ انگوٹھی فیروزے کی تھی مگر اتنی چھوٹی کہ میری چھوٹی انگلی میں آئی! اب مولوی صاحب اماں کی طرف بڑھے، انھوں نے تسلیم کرنے کے بعد پوچھا۔ "آپ کے مزاج حال ٹھیک ہیں نا؟ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں۔ حمیدہ ایک بہت بڑے کنبے سے نکل کر آپ کے ساتھ بہت دور جا رہی ہے۔ سیدھی اور معصوم بہت ہے۔ اس کے ساتھ آپ اور اختر میاں بس اتنا مذاق روا رکھیے گا جتنا اس کا کچا دماغ سمجھ سکے۔ ہو سکتا ہے اس کو آپ کے گھر میں تنہائی کا احساس ہو، اور اس کا اظہار بھی کبھی کبھار کر دے تو آپ درگزر کیجیے گا۔" اماں کا انداز تکلم ان کو کچھ اس قدر دل دار لگا کہ بغیر جواب دیے میرے پاس آئے میرا ہاتھ پکڑا، پھر اختر تک جا کر ایک ہاتھ ان کا پکڑا اور گردن موڑ کر کہا: "ہم دریا کے کنارے سیر کو جا رہے ہیں۔ کھانے کے وقت تک لوٹ آئیں گے اور تم سب بھی تو سیر کر آؤ۔" میں نے گردن موڑ کر اماں کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ انھوں نے سر سے اشارہ کر دیا گویا اجازت دے رہی ہیں۔

جب ہم ریسٹ ہاؤس سے ڈھلان پر اترنے لگے تو مالی بھاگا ہوا آیا: "نیچے زیادہ نہ جائیے گا، آج کل کئی چیتوں کے جوڑے اس علاقے میں آئے ہوئے ہیں۔" تو مولوی صاحب بولے: "یہ تو بہت اچھا ہے ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی پھر جانے کبھی یہاں آنا ہو بھی یا نہیں!" اور تیز تیز قدم بڑھاتے باغوں میں سے گزرنے لگے۔ سامنے جب لہلہاتے ہوئے کھیت اور بل کھاتا ہوا دریا اندھیرے میں تیرتے ہوئے لاکھوں پرندے نظر آئے تو بہت خوش ہوئے۔ بلا تکلف مجھ سے باتیں کرتے جاتے۔ "اگر چیتا سامنے آ گیا تو تم ڈر کر کیا کرو گی؟" میں نے جواب دیا: "میں کیوں ڈروں گی۔ چیتے تو ہزار بار میں نے بھاگتے ہوئے دیکھے ہیں۔ ہاں شیر کی اور بات ہے، جب وہ دھاڑتا ہے تو اس کی آواز سے ڈر کر پتے کی طرح کانپ اٹھتی ہوں۔" ہمارے والد، ماموں اور بھائیوں کو شکار کا بے حد شوق تھا۔ کئی بار والد کی پوسٹنگ ہمالیہ کی ترائی والے ضلعوں میں ہو چکی تھی۔ بچپن سے ان کے ساتھ شکار پر جاتے۔ شیر کے شکار میں پیڑوں پر بنے مچانوں پر بیٹھتے، گو وہ شیر کی گرفت سے بہت اونچی ہوتیں، لیکن جب بھی شیر کی چنگھاڑ سنتی سارا جسم کانپ اٹھتا تھا۔ شکار کے چکر میں والد کی ایک ٹانگ شیر کی نذر ہو چکی تھی۔ ایک بھائی کے ہاتھ پر گولی لگ چکی تھی مگر ان کا شوق اسی طرح رہا اور نہ ہماری والدہ ہی ان حادثوں سے ڈریں۔ اکثر جب والد ہم سب کو اپنے ساتھ لے جاتے تو وہ خود بھی جاتیں۔

اب میری باری تھی کہ مولوی صاحب کو ذرا غور سے دیکھا جائے۔ میرے ایک ہاتھ کو مولوی صاحب بڑی آہستگی سے پکڑے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ کو اختر بہت مضبوطی سے۔ ایک بول رہے تھے اور دوسرے خاموش۔ میں نے ایک منٹ کے لیے قدم روکے لیے تو ان دونوں کو رکنا پڑا۔ میں مولوی صاحب کی طرف گردن موڑ کر ان کی آنکھوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی، ان کی نظریں میری اس جسارت پر حیران ہو کر لمحہ بھر کو مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔ ساتھ ہی ماتھے پر دو بل بھی نمودار ہوئے۔ کتنی صاف شفاف اور محبت، شفقت سے لبریز نگاہیں تھیں۔ نظر جھکا کر وہ بھی میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہ کی گہرائی کا احساس ہوا کہ جیسے یہ مجھے پڑھ رہے ہیں۔ مجھے تو یوں لگا جیسے میرا ایکسرے لیا انھوں نے۔ اس عمر

یہ کیسی روشن اور موتی جیسی چمک ۔ ہلکا سا مسکرا کے بولے لو بس دیکھ لیا ۔ کیا لگا میں تم کو بہکا تو نہیں رہا ہوں ؟ میرا یہ خیال نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، مجھے تو لگا کہ آپ کی شفقت بھی ملے گی اور دوستی بھی ؟ خوب ہنسے کہا ‘‘ابھی اختر یہ تو! اچھی بات ہے کہ لڑکی بولنا جانتی ہے اور نہ ہم سے ڈرتی ہے اور نہ جھجکتی ہے ؟ اب اختر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے ‘‘آپ خوش فہمی میں نہ رہیے گا ۔ یہ حضرت گھڑی میں مہربان اور پل میں ‘قہرمان’ ہو جاتے ہیں ۔ پھر کچھ خفا کی باتیں شروع کر دیں اختر سے کہنے لگے ‘‘کیا خیال ہے اگر ہم یہاں کا پچھیں اس دریا کے کنارے ایک زمین خرید کر چھوٹا سا کاٹیج بنا لیں ۔ سال دو بار ایک دو ماہ یہاں آکر رہا کریں سادہ رنگ آباد کا حسن انسانوں کے ہاتھ کی سجاوٹ کے ساتھ ہے اور یہاں حسن قدرت کی کرشمہ گری ہے ؟ ایک کھیت میں سے گزرتے ہوئے ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا جس کی جڑ کے ساتھ ایک پکا چبوترہ اور اس پر ایک مورتی بیٹھی ہوئی تھی، کچھ دیے جو کبھی جلائے گئے ہوں گے رکھے تھے ۔ ادھر ادھر کچھ سیندور اور سوکھے گیندے کے پھول بکھرے ہوئے تھے ۔ مولوی صاحب یہاں رک گئے اور جھک کر حیدرآبادی طریقے کی سلام کیے اختر نے کہا ‘‘دوست مولوی صاحب دیوی کو سلام نہیں نمسکار کی جاتی ہے ؟ ہنسے اور بولے ‘‘جناب میں تو زبان بہ زبانی سے (اختر کا یہ پہلا افسانہ میں نے پڑھا، دل پر بے حد اس کا اثر تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس افسانے ہی نے ہم دونوں کو یکجا کر) بر لڈ کو سلام کر رہا تھا جس کے طفیل ہم کو ایک بیٹی بھی مل گئی ۔ اچھا اب تم دونوں دریا کے کنارے تک سیر کر آؤ ۔ میں تو چبوترے پر لیٹ کر لطف اٹھاؤں گا ۔

مجھے اب مولوی صاحب ذرا بھی اجنبی انسان نہ لگے اور نہ ان سے ڈر لگا، جیسے ہمیشہ سے ان کو جانتی ہوں ۔ میں نے کہا ‘‘جی نہیں، ہم آپ کو اکیلے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے ۔ آپ کے ہاتھ میں تو چھڑی ہے ۔ کوئی چیتا آ گیا تو آپ اس کو چھڑی سے ماریں گے اور وہ ہم پر ہی پڑے گا ؟ خوب ہنسے اور بولے ‘‘پھر تم دونوں بھی دس منٹ یہاں بیٹھ جاؤ پھر واپس چل پڑیں گے ۔ ورنہ ظفر عمر کے سپاہی ہماری تلاش میں نکل پڑیں گے ؟ کچھ دیر بعد ہماری واپسی شروع ہو گئی ۔

لان پر بڑی سی لال اور نیلی دھاری کی دری بچھی ہوئی تھی ۔ اس کے درمیان ایک سفید براق دسترخوان سلیقے سے برتن اور گلاس رکھے ہوئے، درمیان میں اچار چٹنیاں چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں، اور بڑے بڑے تھالوں میں ملے جلے پھل ۔ جیسے ہم تینوں کے انتظار میں سب لوگ تھے ۔ فوراً ہی تو کھانا لگنا شروع ہو گیا ۔ مولوی صاحب ابا کے پاس بیٹھے ‘‘کالی’’ کی خوب صورتی کی باتیں کرنے کے بعد اردو کے متعلق باتیں کرنے لگے کہ ‘‘اردو’’ ضلع میں جو اسکول ہیں ان میں کتنوں میں اردو زبان ہے ؟ کتنوں میں ہندی ؟ ان کی معلومات رکھنا ہر مسلمان افسر کا فرض ہے ۔ میرے والد ایک باخبر انسان تھے تفصیل سے ان کو بتایا تو مولوی صاحب نے بڑے افسوس کے لہجے میں کہا ۔ جب اس ضلع کی مسلمان آبادی زیادہ ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہر اسکول میں ہندی کے ساتھ ‘‘اردو’’ شامل نہ ہو ۔ تمہاری یہ لاپرواہی مگر اپنے افسروں سے گورنمنٹ کی توجہ دلانے کے لیے کوشاں ہو جانا چاہیے ۔ یہ ہر شخص کا فرض ہے ۔ وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے ۔ غفلت برتنا تباہی کے غار میں گرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ پھر بہت سارے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کیا جن کے اورنگ آباد کے معتبر کہلانے والے اور دوست تھے ۔ آخر میں پوچھا کہ پھر ان یوسف الزماں[1] کی بیٹیوں کا کیا بنا جن کو وہ خدا کو پیارے ہوتے

---

[1] یوسف الزماں لکھنؤ کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے (خلیق الزماں کے سب سے چھوٹے بھائی)

وقت تمہارے سپرد کر گئے تھے۔ ہم سب بیٹے کان کھڑے ہو گئے کہ مس یوسف اسلام کی بات سے ہم سب کا واسطہ پڑا تھا وہ لندن میں ہمارے داور عمر بھائی کا مس یوسف سے اسی وقت جب وہ لندن میں پڑھتے تھے۔ ستر برس ان صاحب کے گھر یہ قصہ وہاں پہنچنے کے بعد سے ان کا ہر خط مس یوسف سے خاندان کے قصوں سے بھرا ہوتا تھا۔ یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ وقت میرے پاس کم ہے اس کو لکھنے بیٹھ گئی تو اصل کہانی خواہ مخواہ ادھوری ہی رہ جائے گی۔

ہاں تو شام کی چائے پلا کر کالج سے واپسی ہوئی ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے حیدرآباد روانہ ہونا تھی۔ اب شدت سے احساس ہوا کہ اپنے سب سے ہزاروں میل دور جا رہی ہوں۔ بار بار رونا آتا۔ اپنی آپا کے کمرے میں آ کر رونا شروع کر دیا وہ بستر پر وقت لیٹی رہتی تھیں۔ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور بہت ہنس کر پیار سے کہا وہ بے وقوف لڑکی یہ کوئی رونے کی بات ہے تم تو اب اپنے نئے گھر جا رہی ہو جاؤ اختر کو تو بلا کر لے آؤ۔ میں کم تو ذرا ان سے ملوں۔ آنسو پونچھ کر کرن جان سے کہا اختر کو بلا دیں کہ وہ آپا کو سلام کر لیں۔ آپ کو تو خود یہ خیال آنا چاہیے تھا کہ اختر ان کے پاس سے جا کر ملا لاتے۔ واقعی وہ شرمندہ سے ہو کر رہ گئے۔ اختر، مولوی صاحب کے پاس بیٹھے تھے، بلا لائے اور مجھ سے کہا جاؤ اب تم خود ہی اختر کو ان سے ملا دو۔ اندر کے کمرے پار کر کے پیچھے کے برآمدے میں اختر کو اس احساس کے کونے والے بڑے کمرے میں لے گئی۔ آپا ایک ہاتھ کو اپنی ٹھوڑی پر رکھے ہوئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ لیمپ کی روشنی ان کے چہرے پر سب سے زیادہ پڑ رہی تھی۔ کس قدر رعب صورت لگ رہی تھیں۔ بے حد صاف رنگ، بڑے تیکھے نقوش، سیاہ لمبے بال، ان کی بڑی بڑی آنکھیں اور چہرہ کا رنگ تمتماہٹ سے دمک سا رہا تھا۔ اس موذی ٹی۔بی کے مریض کو شام سے ہی بخار چڑھ جاتا ہے۔ قدموں کی چاپ سن کر چہرہ دروازے کی طرف موڑا، مسکرائیں اور بولیں "آئیے، میاں اختر آئیے، اس کرسی کو ذرا لیمپ کی طرف کھینچ کر دو گھڑی بیٹھ جائیں کہ میں اچھی طرح آپ کو دیکھ سکوں۔ پرسوں سے لڑکیوں کی زبانی مزے دار باتیں آپ سب کی سنتی رہی ہوں۔ بڑا اشتیاق تھا آپ کو قریب سے دیکھنے اور کچھ باتیں کرنے کا۔ قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی سی آتی ہے کہ جو ہماری بہن سب سے زیادہ بدھو ہے، وہ آپ جیسے علم کے رسیا کے پلے پڑ رہی ہے۔ شاید اللہ میاں توازن کو ایسے ہی طریقوں سے قائم رکھتے ہیں۔

اختر کی نظریں ان کے چہرے پر یوں جمی ہوئی تھیں۔ جیسے یہ مرقع چغتائی کو ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن کے کینوس پر اتار رہے ہیں۔ اختر کے پورے وجود پر مجھے یوں لگا کہ جیسے غم کا سایہ پھیل گیا ہو۔ پھر بولیں: "ہماری یہ بہن ایسی ہے کہ جتنے کا سب کچھ دے کر واپس مانگنا نہیں جانتی۔ اس کا آپ اگر تھوڑا سا بھی خیال رکھیں گے اور بڑی کنجوسی سے محبت دے سکے تو خود آپ عمر بھر بہت کچھ اس سے حاصل کریں گے۔ میری ایک ہی نصیحت دونوں کے لیے ہے کہ خوش رہیں اور خوش رکھیں، ورنہ اس زندگی میں دھرا ہی کیا ہے؟" ہم دونوں کو اپنے پاس بلا کر اپنا نازک لمبی لمبی انگلیوں والا ہاتھ پھیرا "خدا تم دونوں کا محافظ ہے۔ اچھا اب جاؤ۔" میں روپڑی تو ذرا ڈپٹ کر بولیں "دیکھو یہ بورواپن نہ اماں کو پسند ہے نہ مجھے۔ ہاں وہ سامنے سلائی کی گٹھری تمہارے لیے تیار کر کے رکھی ہے اٹھا لو وہ تو ہر زمانے گھر میں تم کو نہ سوئی ملے گی نہ بٹن دھاگا۔ اس گٹھری کی یہ تاریخ ہے کہ اماں کی نانی کی تھی۔ بیٹیوں کو ملتی رہی۔ اسی طرح تم بھی کسی بیٹی کو دے دینا۔ سوچو کہ یہ چار پشتوں کے ہاتھوں سے گزر کر تم کو مل رہی ہے۔ بھلا بتاؤ کہ اس کی عمر کتنا ہو چکی ہے؟" میں وہ گٹھری ہاتھ میں اٹھا کر ان کو مڑ مڑ کر دیکھتی اختر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔ بولے: "تمہاری یہ بہن کتنی دلکش شکل ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ مرقع چغتائی سے کوئی تصویر

حل کر پلنگ پر بیٹھ گئی ہے" اور ملی گہری سی سانس بھر لی۔ اختر نے اپنی اتنی کم عمری کے باوجود دنیا بہت دیکھ لی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کی زندگی کی شمع بس بجھنے والی ہے۔ میں ان کے اتنے پاس رہ کر بہن ہو کر بھی نہ سمجھ سکی۔

اسٹیشن کے لیے روانگی کا وقت آ چکا تھا۔ سامان اسٹیشن پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ میں ایک ایک سے ملی تو اختر خود بھی رو پڑے۔

اماں نے مجھے ذرا سا پہلے جا کر میرا چہرہ اونچا کر کے کہا: "شوہر تو ہو نہیں مجھے یہ بہت ناپسند ہیں۔ یہ یاد رکھنا گھر اینٹ پتھر سے نہیں بنا کرتے۔ بلکہ دل میں بنتے ہیں۔ کبھی دل و دماغ میں اختر کا اپنے بھائیوں سے مقابلہ نہ کرنا۔ نہ کبھی اپنے ابا کے گھر سے اپنے گھر کا مقابلہ کرنا۔ تمہارے ابا اپنی زندگی کے آخری سرے پر آ گئے ہیں اور اختر زندگی شروع کر رہے ہیں۔ کبھی کسی کا زیور، رنگ برنگے پہننا اور ادھار پر گھر چلانا۔ جو روپے تم کو گھر کے خرچ کے لیے دیے جائیں ان کا حساب ہر روز لکھنا۔ اس کو یوں سمجھنا کہ یہ امانت تمہارے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ مولوی صاحب کا ادب اپنے ابا کی طرح کرنا اور ہر کوشش میں لگی رہنا کہ اختر اپنے والد سے مل جائیں تب ہی تم میری بیٹی ہوگی۔ اچھا اب تم سوار ہو۔" جس طرح امّاں نے باتیں کیں۔ مگر ان کی آواز یا آنکھوں سے مجھے یہ معلوم نہ ہونے پایا کہ غمگین ہو رہی ہیں تو لامحالہ مجھے اپنے کو رونے سے باز رکھنا پڑا۔ ابا نے دو قدم آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا، خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے کے اندر چلے گئے۔

بھائی جان، چچا ابا، چھوٹے بہن بھائی اور بہت سے رشتے دار اسٹیشن پر ہم کو سوار کرانے آئے۔ ریل کھڑی ہوئی تھی۔ ڈبہ مولوی صاحب حیدرآباد سے ریزرو کرا چکے تھے۔ اس میں سامان رکھا جا چکا تھا۔ یہ چار سیٹ والا کوپہ نہ تھا بلکہ چھ سیٹ والا تھا۔ ایک بنگالی صاحب ان کی بیگم اور دو بچوں کے پہلے سے موجود تھے۔ مولوی صاحب کا ارادہ ایک وہ … کرنے کو چار برتھ کرایے کرا لیا تھا۔ خیر ہم خود ہی رستے میں ان صاحب اور صاحبہ سے نمٹ لیں گے۔

ہم تینوں ڈبے میں چڑھے۔ ریل نے سیٹی بجائی، گارڈ نے جھنڈی دکھائی اور ریل چل پڑی۔ نیچے کی تین سیٹیں ہماری تھیں۔ ایک پر وہ بنگالی بچے اور اوپر کی دو سیٹوں پر ان کے والدین بستر بچھائے براجمان تھے۔ اختر کا موڈ بھی ان کی موجودگی سے خراب سا ہو گیا۔ ریل نے جب اسپیڈ پکڑی تو مولوی صاحب نے اختر کے کان میں آ کر کچھ کہا۔ اختر ہنس کر بولے "بہت خوب بہت خوب"۔ ہم دونوں ایک سیٹ پر پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب ایک اخبار لے کر سیٹ پر لیٹ گئے۔ میں نے اختر سے پوچھا مولوی صاحب نے آپ کے کان میں کیا کہا تھا۔ ہنسے اور کہا کچھ دیر میں خود دیکھ لینا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ وہ ان بچوں کو کہیں باہر نہ پھینک دیں۔ کہہ تو رہے تھے کہ ہم خود نمٹ لیں گے۔ "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔" میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اب یہ کیا کرنے والے ہیں، کہ اتنے میں دونوں بچے ڈر کر زور زور سے چیخنے اور بنگالی میں کچھ کہنے لگے۔ میں اور مولوی صاحب بنگالی نہ سمجھ سکے۔ اختر سمجھ گئے اور خوب زور زور سے ہنسے۔ میں نے بہت پوچھا، کچھ بتائیں یہ کیا ہوا۔ بولے کچھ بھی تو نہیں، بچے بنگالی کہانیاں پڑھ رہے تھے، اور پھر بھی خوب روتے اور ڈرتے ہیں۔ میں بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ بھوتوں کا نام سے ڈر کر رونا اور بنگالی میں کہنا۔ اب بنگالی باپ نے مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر بگڑ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا "بڑا صاحب آپ بچوں کو ڈرا کیوں رہا ہے؟" مولوی صاحب جھٹ بول اٹھے ہمارا تو منہ ہی ایسا ہے اور مجبور … کے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بھاگنے لگے۔ بچے پھر چلا کر رونے۔ اب ان کی نظریں

اختر کی طرف تھیں۔ میں نے جلدی سے گردن موڑ کر اختر کی طرف دیکھا تو وہ بھی ٹیڑھا منہ کیے، ہاتھوں کی چونچ بنائے ان کو شاست گھورے جا رہے تھے۔ میں ڈر کر ذرا پرے کو سرک گئی اور پوچھا الٰہی خیر یہ آپ دونوں کیا کر رہے ہیں۔ تو کہا ان حضرات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش۔ اوپر سے بنگالی بابو اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے "تم دونوں صاحب پاگل ہے کیا؟" بولے: "تو اور کیا پاگل تو ہے ہم، تم نے باہر لکھا پڑھا نہیں کہ اس ڈبے میں دو پاگل بھی سفر کر رہا ہے!" بنگالی بابو نے بیوی سے کچھ کہا۔ دونوں نے جلدی جلدی اپنے بستر لپیٹ لیے نیچے اترے بچوں کے بستر یک جا کر کے ایک بستر بند میں باندھ دیا اور نیچے سیٹ کے رکھے ہوئے دو تھیلوں کے بکسے کھینچ کر دروازے کے قریب لگا کر پیٹھ ہماری طرف کر کے بچوں کو گود میں دبکا کر آنے والے اسٹیشن کا انتظار کرنے لگے۔ اب مولوی صاحب کسی کسی وقت ہولناک آوازیں نکالنے لگے۔ بچے چیخ کر ماں باپ سے بندروں کی طرح چپک جاتے اور ایسا لگتا جیسے ڈر کر لرز رہے ہیں۔ ماں باپ بھی پاگلوں کے خوف سے کانپ کانپ اٹھتے۔ میں حق دق یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور خود بھی سہمی ہوئی تھی۔ گو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان سب کو ڈبے سے بھگانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ آخر اسٹیشن آیا۔ ریل رکی اور یہ بڑی جلدی سے نیچے اتر گئے تو مولوی صاحب کے قہقہے اس قدر زوردار تھے کہ ڈبہ گونج اٹھا۔ کہنے لگے: "پاگل بن جانے میں کس قدر مزا آیا، ورنہ حیدرآباد تک ان کا ساتھ سچ مچ ہم کو پاگل بنا دیتا۔"

اب مولوی صاحب اطمینان کا سانس لے کر اپنی سیٹ پر دراز ہو گئے۔ کہنے لگے: "اس وقت تو حقہ بہت یاد آ رہا ہے۔" شاید حقے کی تمنا کو تصور کر رہے ہوں گے مگر ناک میں کسی اور قسم کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے ناک کو چڑھا، بھنویں سکیڑ، نظریں مجھ پر جا کر پوچھتے ہیں: "یہ کھانے جیسی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟" میں نے بتا دیا کہ اماں نے کل کے لیے کچھ کھانا ساتھ کیا ہے۔ پتیلیاں سیٹ کے نیچے رکھی ہیں۔ ایسے جھٹکے سے اٹھے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ بولے اب اس سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ جیسے ہی ریل ہلکی ہوئی جلدی جلدی پتیلیاں گھسیٹ کر دروازے کے پاس کر لیں۔ ریل رکی تو بہ آواز بلند پکارنے لگے: "کسی کو کھانا چاہیے۔" کوئی نہیں آیا تو ایک قلی سے کہا کہ جلدی سے یہ سامان اتار دو۔ جب تینوں پتیلیاں اتار لی گئیں تو جھٹ سے دروازے کی کنڈی لگا کر کھڑکی میں سے کہا: "جاؤ یہ گھر لے جاؤ۔ موج کرو۔"

اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ ریل زنّاٹے بھرتی ہوئی چل پڑی۔ میرے دل نے شکر کیا کہ اگر مجھے اتار دیتے تو میں کیا کر لیتی۔ دل پھر سہم گیا کہ آخر یہ لوگ ایسے کیوں ہیں۔ پھر ایک خیال دل میں آیا کہ شاید یہ سوچ کر آئے ہوں کہ "گربہ کشتن روز اول" مجھے اچھی طرح سہما ڈال رہے ہیں کہ سوچ لو بی بی، ہم یوں بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے فوراً ہی تو سوچ لیا کہ اگر میں ان دونوں سے بھی اور ڈری تو زندگی حرام ہو جائے گی۔ اس لیے مجھے ڈٹ کر جینے پر دہلا ڈالنا ہی پڑے گا۔ میں جا کر اپنی سیٹ پر لیٹ گئی۔ تب سب سے جدائی کا احساس ابھر آیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اختر نے ہاتھ بڑھا کر میری طرف کی لائٹ بند کر دی۔ مولوی صاحب کے پاس ان کی سیٹ پر بیٹھ گئے "وہ کسی کانفرنس میں مدراس جا رہا ہے" اس کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ میں یہ سوچتے ہوئے سو گئی کہ پھر میرا کیا بنے گا؟

صبح کو میرے لیے خود سے اٹھنے کا سوال ساری عمر رہا۔ جب تک کوئی جھنجھوڑ کر نہ اٹھا دے۔ صبح پانچ بجے مولوی صاحب خود اٹھ گئے ہوں گے اور اختر کو آواز دے کر اٹھایا ہو گا یا وہ خود ہی جاگ گئے ہوں گے۔ دونوں بے چین ہو کر

آدھا دن پراؤں اڑے ٹانگتے رہے بھلا مجھ پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ آٹھ بجے بیرا ناشتے کی ٹرے دے گیا جو کا صاحب تو نو بجے مولوی صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دونوں ناشتہ کر چکے۔ میری چائے ٹھنڈی پانی جیسی ہو گئی۔ دونوں میں یہ ہمت نہ تھی کہ ہاتھ سے جھنجھوڑ دیں۔ آخر مولوی صاحب کو ترکیب سوجھ گئی، وہ کھڑے ہو کر اپنی چھڑی سے تکیوں کو کونچنے لگے۔ میں گھبرا کر اٹھی اور ایک منٹ کے لیے یہ بھول گئی کہ میں ہوں کہاں اور یہ ہو کیا رہا ہے؟ بوجھل آنکھیں ہاتھ سے مل کر کھولیں تو دیکھا کہ مولوی صاحب بھی اپنی سیٹ پر چھڑی سمیت لیٹ گئے۔ "یہ لے یہاں نہیں چلے گا کہ لوگ نو نو بجے تک سوتے رہیں۔ ہمارے گھر میں سب پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں۔ سو سو کر سارا مزا کرکرا کر دیا۔ بھوپال کی پہاڑیوں کے پیچھے سورج خاں کس شان سے نکل رہے تھے۔" میں سمجھی کس صاحب کا ذکر کر رہے ہیں۔ "جی" کہہ کر چپ ہو گئی۔ "اب جلدی سے اٹھ کر ٹھنڈا ناشتہ کرو اور ٹھنڈی چائے پیو۔"

اب دن کی چکا چوند روشنی میں دو انجان مردوں سے دوبدو سارے دن سامنا کرنا ہے۔ خطوط اور افسانوں اختر کو تو خوب جانتی تھی مگر ان صاحب کو نہ جاننے کے برابر تھا اور یہ مولوی صاحب سارے دن اتنے قریب بیٹھ کر جانے کیا فقرے بازی کریں گے۔ اختر سے بے شک مجھے بہت سی باتیں پوچھنا تھیں کہ مجھے ان کے گھر جا کر کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، مگر وہ تو اب اجنبیوں کا اظہار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جیسے میرا وجود ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا ہو۔ اخبار پڑھ رہے ہیں؛ مولوی صاحب سے سیاست پر باتیں ہو رہی ہیں۔ گھوم پھر کر ڈکشنری پہ تان ٹوٹتی۔ ناشتہ کر کے میں نے بھی ایک اخبار ہی پکڑ لیا۔ اب تک اخبار پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ ہم سے مطلب کہ سارے جہاں میں کیا ہو رہا ہے۔ پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اختر کہنے لگے آپ نے ٹھیک ہی کیا کہ اخبار رکھ دیا، کیوں کہ پہلے تو کچھ نہ پڑھا ہوگا۔ ہاں ہرے بھرے جنگل دیکھیے۔ کبھی کبھی ہرن بھاگتے بھی نظر آئیں گے تو شکار یاد آئے گا اور بھی بہت کچھ۔

مولوی صاحب کو جیسے کچھ یاد سا آ گیا "ہاں، یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ابا اور بھائی لوگ ان معصوم حسین جانوروں کے پیچھے کیوں لگے رہتے ہیں۔ ان بیچاروں نے آخر ان کا کیا بگاڑا ہے" "یہ بات تو آپ کو ان ہی سے پوچھنا تھی" بس پھر مسکرا کر چپ ہو گئے۔

آخر دن گزر ہی گیا۔ ہر بڑے اسٹیشن پر مولوی صاحب کے ملنے والے جن کو اطلاع دی جا چکی تھی ملنے آتے اور ڈبے میں ڈھیروں پھولوں کے ہار جمع ہو گئے تو مجھے اپنی اماں کے وجود کی خوشبو سی آتی محسوس ہونے لگی۔ ان کو بیلے چنبیلی کا بے حد شوق تھا۔ عطر شمیم سارے پھول وہ اپنی کپڑوں کی الماری کے ہر خانے میں ڈال دیا کرتیں۔ پھر رات آ گئی اور خیر سے گزر گئی۔ صبح نو بجے حیدرآباد اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ شکر کیا کہ یہ ایک مرحلہ بخوبی طے ہو گیا۔ اسٹیشن پر مولوی صاحب اور اختر کے بہت سے دوست چنبیلی اور بیلے کے موٹے موٹے ہار اور گلدستے لیے کھڑے تھے۔ نیچے اترے اور اپنے حصے کے ہار تو پہنا چکی تھی۔ اختر نے اپنے والے اور مولوی صاحب کے بھی میرے گلے میں ڈال دیے۔ بوجھ سے جھکی جا رہی تھی اور نیچی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ شاید اب کوئی خاتون نظر آ جائیں مگر اس کا کیا سوال تھا۔ اسٹیشن سے باہر آئے ایک موٹر پہلے ہی سے کھڑی تھی اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ رستے میں پھلوں کی دکانوں پر جو نظر پڑی تو کیا ہی بڑے بڑے شریفے دکھائی دیے۔ میری جان شریفے پر جاتی تھی۔ دل کرے کہ موٹر رکوا کر کچھ خرید لوں، مگر یہ ممکن نہ تھا۔

(افکار، نومبر ۹۳ء)

۵

لیجیے ہم اب آ پہنچ گئے، "ماہ منزل"۔ ایک پہاڑی سی ٹیکری پر دور سے دکھائی دی۔ اختر نے ادھر اشارہ کرکے بتایا کہ وہ رہی "ماہ منزل"۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ گھبراہٹ اور وحشت سی شروع ہوگئی۔ آج سال کا پہلا دن یعنی ۱۹۳۲ء تھا گویا زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ موٹر پھاٹک کے اندر داخل ہوئی اور سیدھے ہاتھ پر بہت بڑے لان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف گھنے پیڑ اور ساتھ ہی ڈھلان کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جس پر بڑی گنجان جھاڑیاں تھیں۔ لان کے ایک طرف ایک بہت ہی اونچا اور ایک ہی پیڑ تھا اور وہ بھی "برگد" کا، جس کے چاروں طرف بہت ہی اونچا اور چوڑا چڑیوں کے لیے پنجرہ تھا جس کو چار حصوں میں تقسیم کرکے چار طرح کی خوب صورت رنگا رنگ چڑیاں اڑ رہی تھیں اور کچھ بیٹھی ہوئی چہچہا رہی تھیں۔ لان اور کوٹھی کے درمیان پورچ تھا جس میں موٹر آکر رک گئی۔ برآمدے میں چار ملازم ہاتھوں میں ہار لیے ادب سے کھڑے تھے۔ ہم تینوں اترے۔ انھوں نے سلام کرنے کے بعد میرے اور اختر کے گلے میں ہار ڈالے۔ مولوی صاحب بڑی شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر برآمدے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں لائے۔ اس کے بعد ہم بہت بڑے ہال سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹے کمرے میں سے گزرے جہاں لکھنے کی میز اور دو کتابوں کی الماریاں تھیں جن میں موٹی موٹی ڈکشنریز نظر آئیں تو سوچا یہ شاید مولوی صاحب کا اپنا دفتر ہوگا۔ لو بے چاری اب گھر میں چلو، ادھر سب دفتر اور مہمان خانہ ہے۔

اب ہم ایک بہت بڑے چوڑے اور لمبے برآمدے میں داخل ہوئے۔ اس کے ایک کونے والے کمرے کے قریب ایک چھوٹی سی میز اور چار کھانے کی کرسیاں رکھی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر چند مونڈھے، ایک آرام دہ لمبی کرسی۔ قریب ہی ایک عجیب قسم کا حقہ، ایک چمکدار تھالی میں رکھا ہوا۔ اس حقے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی بہت لمبے سانپ نے چاروں طرف کنڈلی ڈال رکھی ہو، چاندی کی منہ نال لگی ہوئی تھی۔ برآمدے کی دو سیڑھیاں اتر کر کیا دیکھا جیسے نئی چوڑی جگہ پر سرخ بجری پڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سلامی لیتے ہوئے ڈھلان شروع ہوگئی۔ اس جگہ ہری ہری گھونک گھاس پھر چھوٹی چھوٹی پھولوں کی کیاریاں، جن میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے آگے پھر سپاٹ بہت بڑی جگہ تھی، آگے پھر ڈھلان شروع

ہو جاتی جو بہت گھنی سبز جھاڑیوں سے یوں ڈھکی ہوئی جیسے کسی جنگل کا حصہ ہو، بیچ بیچ میں اُگے گھنے درخت
تھے۔ میں چند منٹ رک کر ادھر دیکھا کی اور سوچتی تھی کہ مولوی صاحب کا ذوق بہت اچھا ہے۔ اختر نے
"چلیں اپنا کمرہ دیکھ لیں۔ نہا دھو لیں" میں نے کہا، "پہلے میں مولوی صاحب کا کمرہ تو دیکھ لوں جو برآمدے کے ایک سرے
تھا اور دوسری طرف ہمارا۔ مولوی صاحب کا کمرہ نہ بہت بڑا نہ چھوٹا، اس کے ساتھ ایک ڈریسنگ روم اور غسل
پہلے یہ اختر کو دے رکھا تھا، مگر اوری" آنے سے پہلے بڑی منت کر کے اپنا بڑا سا کمرہ، ساتھ ڈریسنگ روم اور غسلخانہ ہم دونوں
خالی کر کے خود ادھر والے کمرے میں منتقل ہو گئے۔ اس کمرے میں معرفت کتابوں کی الماریاں، بیچ میں مسہری کچھ ہٹ کر
لکھنے کی میز اور کرسی، اس کے ساتھ ہی ایک لوہے کی کیبنٹ، اس پر کچھ برتنوں میں خشک میوہ اور چند دوائیں۔ اختر کہتے
کے پاس بھی ساری عمر خشک میوے کی بوتلیں رہیں، ان میں سے نکال کر بچوں کو اپنے ہاتھ سے پیار سے دیتے۔ بچے سب
ہو گئے تو ان کے بچوں کو دیا کرتے۔)

اب وہ خود تو اپنے کمرے میں رہ گئے، اختر مجھے برآمدے میں لے کر چلے۔ میری نظر اس چھوٹی لمبی میز پر پڑی جو مولوی صاحب
کے کمرے کی دیوار سے ملی ہوئی رکھی تھی۔ جس پر چار پانچ طرح کی چائے کے ڈبے اور ایک سماوار رکھا دیکھا۔ سماوار میں سے
اُبلتے پانی کی بھاپ نکلتی دکھائی دی۔ ایک طرف چند پیالیاں اور چائے دان بھی تھا۔ برآمدے کی دوسری طرف ہمارا کمرہ
تھا۔ اس کے دو دروازے برآمدے میں کھلتے تھے، ایک برآمدے میں، دوسرا باغ کی طرف۔ ان پر چقیں پڑی تھیں۔
کمرہ بڑا کشادہ، دو مسہریاں درمیان میں۔ ادھر کی مسہری کے قریب ایک چھوٹا ڈیسک اور کرسی۔ دوسری طرف دو نیچی
نیچی کتابوں کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی، ایک پھول دان اس پر رکھا تھا جس میں گلاب کے تازہ سرخ پھول لگے
ایک پھول دان ڈیسک پر بھی تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں دو آرام دہ کرسیاں اور سامنے کی میز پر ایک 555
سگریٹ کا ٹن اور ایش ٹرے (راکھ دان)، سارا فرنیچر عمدہ قسم کی ٹیک کی لکڑی کا، وکس پالش کیا ہوا جھل مل کر رہا تھا۔
ڈریسنگ روم میں دو بڑی بڑی کپڑوں کی الماریاں، ایک سنگھار میز، اس کے سامنے اسٹول۔ کمرے میں نیلے رنگ کا بڑا سا
قالین تھا۔ اس میں بھی ایک چھوٹا سرمئی رنگ کا قالین۔ ایک طرف کو میرے کیبن ٹرنک اور اختر اور میرے سوٹ کیس ایک پر
ایک رکھے ہوئے۔

پہلے اختر نہانے چلے گئے۔ میں نے جلدی جلدی اٹیچی کیس سے سامان نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر لگا دیا۔ سوٹ کیس سے
اپنے دو نرم تکیے جلدی سے نکال کر اپنے پلنگ پر رکھے اور وہ گدا سا موٹا روئی کا تکیہ پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ اپنے
کپڑے نکال چکی تو اختر نہا کر باہر نکل آئے۔ میں نے اختر کو سفید کرتے پاجامے میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ جھٹول سے بال دھونے کے
بعد عجیب سے لگے، کریہ سمٹ کر اچھے خاصے ہو گئے۔ کن انکھیوں سے اختر کو دیکھتی ہوئی اپنے کپڑے لیے غسلخانے میں چلی گئی۔ تھوڑی
ہی دیر بعد اختر آوازیں دے رہے تھے، "جلدی آئیے چائے تیار ہے۔ مولوی صاحب زیادہ دیر انتظار کرنے کے عادی نہیں۔"
اپنے گیلے بال پیچھے کر کے دوپٹہ اوڑھ کر برآمدے میں آئی تو دیکھا پیالیاں میز پر رکھی ہوئی ہیں۔ شکر دان اور دودھ دان
بھی۔ اب وہ خود کھڑے ہو کر مختلف ڈبوں میں سے کسی حساب کے ساتھ پتی چائے دان میں ڈال رہے تھے۔ پھر سماوار
کی ٹونٹی کھول کر چائے دان میں کھولتا ہوا پانی ڈالا اور میز پر چائے دان رکھ کر ایک چھوٹا سا تریہ ڈھانک دیا کہ چائے کچھ

دم کھائے۔ میں نے نہایت غور سے سب دیکھا کہ شام کی چائے میں دم کروں گی۔

مجھے تو گھر میں اماں نے یہ سکھا دیا تھا کہ لڑکی یا کوئی خاتون ہو تو چائے پیالیوں میں اس کو ڈالنا چاہیے۔ میں نے جیسے ہی ہاتھ سے تولیہ ہٹا کر چائے بنانے کا قصد کیا۔ مولوی صاحب نے اپنی تحکمانہ آواز میں کہا "بائیں بائیں یہ کیا کرتی ہو۔ چائے ہم خود بنائیں گے۔" میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب انھوں نے آہستہ سے پہلے تولیہ ہٹا کر مجھ سے پوچھا کہ "تم ہلکی چائے پیتی ہو یا تیز؟" میرے منہ سے ملکے یہ کیسے نکل گیا کہ "چائے اور چاہے جیسی بھی مل جائے۔" مولوی صاحب ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ اختر بھی ہنس پڑے۔ بس میں تو کھسیانی سی ہو گئی۔ مولوی صاحب چائے بناتے جاتے اور کہتے جاتے [illegible] چٹ پٹی۔" چائے کی پیالی ختم کر کے کہا "چلو تم کو باہر کا دفتر وغیرہ بھی دکھا دیں۔ یہ صرف آج کے لیے تم کو ادھر آنے دیا جا رہا ہے پھر ہمیشہ کے لیے تمہارا اس طرف داخلہ ممنوع رہے گا۔ آج جمعہ ہے دفتر میں کام نہیں ہو رہا ہے۔" ایک بہت بڑا ہال جس میں چاروں طرف بہت سی اونچی اونچی الماریاں موٹی موٹی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہال کے بیچ میں ایک چوکی سی تھی جس پر طرح طرح کے رسالے، اخبار رکھے ——— کچھ کرسیاں ادھر ادھر رکھی ہوئی۔ میں نے دل میں سوچا یہ اس کوٹھی کا اصلی ڈرائنگ روم ہوا کرتا ہوگا۔ صاحب وہ دوسرے قدرے چھوٹے ہال میں لے کر گئے۔ اس میں بھی چاروں طرف الماریاں اور خستہ بوسیدہ حال تھیں۔ ان الماریوں میں تالے لگے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا ڈیسک جس کے دونوں طرف درازیں تھیں ان میں بھی تالے لٹک رہے تھے۔ ایک لمبی پتلی میز پر ویسا ہی سامان رکھا جیسا بڑے کمرے میں تھا۔ کئی قسم کی چائے کے ڈبے، چائے دان، شکر دان رکھا تھا۔ مجھے بتایا کہ ان سب الماریوں میں نہایت قیمتی قلمی نسخے اور بہت انمول قیمتی کتابیں ہیں اور یہ ان کا اپنا آفس ہے۔ میں نے سوچا یہ میز کبھی خالی نہ رہتی ہوگی۔ اس کے پیچھے چار پانچ الماریاں کھڑی تھیں۔ ایک کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا یہ آفس عابد حسین کا ہے اور وہ کمرہ پنڈت کیفی کا۔ شیرا جفت کیا نام لیا اور جب چھتے کمرے کے سامنے آئے تو اس کا دروازہ بند تھا۔ پٹ کھلا ہوا تھا۔ یہاں ایک دری پر جا نماز بچھی ہوئی تھی اس پر نیچا سا ڈیسک، ادھر ادھر پیلے پیلے رنگ کے بے لمبے کاغذ جیسے ان میں کلف لگا دی گئی ہو۔ بستر کھلے اور بچی ترشی ہوئی رکھے ہوئے تھے۔ کاغذوں پہ بہت کاٹا پیٹی، لال سبز رنگ کے قلموں سے کی ہوئی دور سے نظر آ رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ یہ صاحب بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ پر اس قدر لکیریں کس کے ساتھ کچھ گڑے کی شکل اور بھی کئی طرح گھور کے منہ سے کیوں بناتے ہیں؟ کہ مولوی صاحب ناراضگی کے انداز میں بولے "احتشام الحق کمرہ کھلا چھوڑ کر لاکھ منتیں کی تین بجے ملاقات کو خود نکل گئے اور دروازہ بھی بند نہ کیا۔" اس نام پر میرے کان کھڑے ہوئے کہ ابا نے آتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ اپنے تین دوستوں کو وہ خط لکھ چکے ہیں اور یہ تینوں میرا خیال ضرور رکھیں گے۔ ان میں سے ایک نام احتشام الحق لیا تھا۔ اشارہ کر کے بتایا۔ ادھر والے تین کمرے کاتبوں اور پروف ریڈرس کے ہیں۔ کوٹھی کے پیچھے اور پہلو میں باورچی خانہ اور خادمین کے لیے کوارٹر ہیں۔ اور یہاں کوٹھی کی پشت پر جو کھلا بڑا سا میدان ہے اس میں "راجہ" اور "رانی"[1] نے اپنا ڈیرہ جما رکھا ہے۔ دیکھ کر بتانا کہ تمہاری رانی زیادہ اچھی ہے یا ہماری؟" میں بغیر دیکھے ہی بتا سکتی ہوں کہ آپ کی رانی زیادہ اچھی ہوگی

---

[1] میں نے کسی خط میں اختر کو اپنی رانی ہرن کے متعلق لکھا تھا۔ مولوی صاحب سے انھوں نے اس کا ذکر کیا تو کہا کہ ہم ایک ہرن اور ہرنی پالے ہوئے ہیں۔ ایک راجہ اور ایک رانی۔

کہ اس کا راجہ اس کے ساتھ ہے اور میری ساس کی اداس اداس بڑی بڑی آنکھیں اپنے راجہ کا انتظار کر رہی ہیں؟ خوش ہو کر بولے "یہ بات تو تم سچ کہہ رہی ہو گی"

واپسی کے وقت اختر سے کہا "بہت وقت ضائع ہو چکا بس اب کل سے اوقات میں باقاعدگی ہونا چاہیے" جس کمرے میں سے ہو کر ہم برآمدے میں داخل ہوئے۔ بتایا کہ یہ اختر کا آفس ہے۔ اس کی میز پر بھی کاغذات لگا ہوا تھا مگر سب قاعدے سے رکھے ہوئے تھے۔ قریب ہی دو نیچی نیچی الماریوں میں موٹی موٹی کتابیں! ذرا دیکھا تو جیسے کچھ اور زمانوں کی ہیں، شاید ہندی، جنگ وغیرہ کی ہوں۔ کہا "یہاں بھی آپ کی تشریف کا ذکر نہیں آ" برآمدے میں آ کر جب وہ لمبی کرسی پر دراز ہو گئے تو محبوب نے حقہ لا کر خاصے فاصلے پر رکھ کر اس کے گرد لپٹے کو کھولنا شروع کیا۔ یہ کم از کم دو گز لمبی ہو گی۔ دریافت کیا۔ خوب اچھی طرح کئی بار روپچھوں سے نرم کیا تھا۔ اب سمجھ آیا کہ یہ پیچوان ہے۔ یہ بھی پوچھا گیا۔ لکھنؤ سے تمباکو کا پارسل آ گیا تھا؟ "جی سرکار"

یہ دونوں آپس میں کاپی کی خوب صورتی کا ذکر کرنے لگے۔ پھر ڈکشنری کی بات چیت۔ میرا دم جیسے گھول گئے ہیں اکتا سی گئی اور چپکے سے وہاں سے سرک کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ جلدی جلدی اپنے کپڑے نکال کر الماری میں لگائے کڑھی ہوئی چیزیں ادھر ادھر رکھا پھر سوچا چلو اب اختر کے کپڑے نکال کر ان کی الماری میں رکھ دوں تاکہ یہ سب بہت ٹرنک بیچ سے ہٹا دوں۔ ایسا ہی کیا۔ قاعدے سے جوتے کے اسٹینڈ پر اپنے جوتے، چپلیں رکھنے کے بعد اب اختر کے جوتے رکھ رہی تھی کہ اختر آ گئے۔ میرے ہاتھ میں ان کے جوتے تھے۔ گھبرا کر کہا "ہائیں ہائیں یہ کیا کر رہی ہیں؟" میرے ہاتھ سے جوتے گر گئے۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولے، "دیکھیے اب کبھی میرے جوتوں کو ہاتھ نہ لگائیے گا!" رخصت کے بعد سے دو سال تک ہر روز ان کے جوتے کو اس طرح ہاتھ لگا سکی کہ اختر جوتے کی ڈوری میں ڈبل بوا باندھنا نہیں پائے۔ میں ہر دفعہ ان کا ایک پاؤں کرسی یا اسٹول پر رکھ کر ڈبل بوا باندھنا سکھاتی مگر وہ نہ سیکھ پائے۔ ہر بار بحث کرتے کہ آخر ڈوری اتنی لمبی کیوں بنائی گئی ہے۔ آدھی ڈوری کو انگلی سے جوتے میں ٹھونس لیتے۔ آخر کار میں نے تنگ آ کر سکھانا چھوڑ دیا اور ہار مان لی۔

دوپہر کو ہلکا پھلکا کھانا ہوا۔ بعد میں محبوب نے پھل لا کر رکھ دیے۔ سبز اور کتھئی رنگ کے بے حد بڑے بڑے بیر گویا یہ پھل ہیں۔ مجھے یہ بھی کچھ بہت عجیب سی بات لگی۔ دریافت کیا دہلی سے نواب لوہارو کے باغ سے بیروں کا پارسل آ گیا تھا "جی جناب" چھری سے بیر تراش کر مزا لے کر کھاتے رہے۔ میں نے ہاتھ سے اٹھا کر بیر کھانا شروع کیا۔ کچھ بڑی ناگواری سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ان کو کھانے کا طریقہ یہ نہیں۔

شام کی چائے پھر مولوی صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے دم کی اور پیالیوں میں ڈالی۔ میں نے سوچا کل سے میں خود چائے دم کر کے پیالیوں میں ڈالوں گی۔ یہ تو بہت بری بات ہو گی کہ میری موجودگی میں مولوی صاحب یہ زحمت کریں —— چائے کے بعد اپنے کمرے میں گئے۔ اپنی الماری کی ایک دراز کنجی لگا کر کھولی اور ایک گڈی نوٹوں کی لا کر میرے ہاتھ میں دی "یہ رکھو کل سے تم بشیر خانساماں کو بتا دیا کرو کیا پکے اور سب کی تنخواہیں بھی دے دینا۔ میرے فرشتوں کو کیا خبر کہ کس کو کیا دینا ہے، اور یہ دونوں کیا کھانا پسند کرتے ہیں" بولے "یہ لو چابیاں تمہارے ڈریسر کے خانوں کی ہیں۔ مطلب یہ کہ میں ان کو بند کر کے رکھ لوں۔

دیر میں ان کا منہ تکتی رہی۔ اختر نما بھی میری مدد کو نہ آئے۔ کھڑے مسکراتے رہے۔ کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر نوٹوں کو تکتی رہی۔ میں نے تو ابھی زندگی میں اتنے ڈھیر سارے نوٹ اپنے ہاتھ میں نہ لیے تھے۔ ایک پریشانی کی کیفیت تھی۔ ایسا لگا جیسے امتحان کا پرچہ سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ نوٹ بند کرکے کرسی پہ بیٹھ کر سوچنے لگی کہ کل صبح دھوبی پوچھے گا تو سو کو کیا شاہ چاہیے۔ ارے اختر سے پوچھ لوں گی۔ جب ان سے پوچھا تو جواب ملا: "تم کیا مرد ہو سب کچھ بتا دینا!"

رات کا کھانا ختم ہوتے ہی یہی مسرت کے وقت پر آمرے کی میز پہنچ گیا۔ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ یہ وقت تو بچوں کے کھانے کا ہوتا ہے۔ بڑے تو دیر سے کھاتے ہیں۔ کھانا کھاتے جائیں۔ اب اختر صاحب کے دفتر کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ اور میں؟ ظاہر ہے مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ اس فکر میں مجھے اکیلا تو نہ چھوڑیں گے کہ کھانے کے بعد اختر نے کہا موسم بڑا سرگرمی ہے۔ تم دونوں حسین ساگر ہو آؤ۔ ہم دونوں چل دیے۔ جب وہاں پہنچے تو دل خوش ہو گیا۔ کس قدر پیارا تالاب تھا۔ جیسے کوئی جھیل ہو۔ جہاں حسین ساگر ختم ہوتا تھا اس کے بعد چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا سلسلہ تین طرف۔ پہاڑ لگتا جیسے یہ اس حسین جھیل کو ہاتھ پھیلائے اپنی گود میں لیے ہوئے ہیں۔ چاند نکل چکا تھا۔ پہاڑیوں پر کوٹھیاں، ان کی بتیاں یوں لگیں۔ جیسے کہ ہزاروں جگنو جگمگ کر رہے ہوں۔ کنارے پر بیٹھتے ہی اختر نے کہا: "یہ آپ، احباب بہت ہو گیا مجھ سے تم کرکے بات کیا کرو۔ اور ہاں ایک بات اپنے پلّے میں باندھ لیں کہ کبھی مجھ سے میرے خاندان کے متعلق سوال جواب نہ کرنا یعنی ایک ایسی لکیر کھینچ دی جس کو مجھے پار کرنے کی اجازت نہیں۔

مجھے بتائی خدا گواہ ہے کہ میں نے ساری عمر ان سے خاندان کے متعلق کوئی بات ہی نہ کی یعنی وہ لکیر جو پہلے دن کھینچ گئی۔ اس کے قریب جاکر تو نہ کبھی جھانکا۔ ہاں دوسرے دوسرے کس کس طرح کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کر لیا جس کا لب لباب یہ تھا اور یہ تو معلوم ہی ہے۔ اختر دو بھائی تھے، دونوں بچے ہو گئے۔ اس شخص نے بچپن میں ہی اپنے بھائیوں کے ساتھ، ان کی اپنی والدہ کی طرف سے ملنے والی جائیداد۔ سولہ سال کی عمر میں علامت پڑھتے تھے سکے ہیں ایک ہی جیسے رد یہ۔ والد کے لیے زیورات اتنے کہ ایک چھوٹے ٹرنک کو ایک مرد مشکل اٹھا سکے۔ شہر میں دو تین مکانات الگ کاؤنٹ۔ یہی لڑکا اپنی سولہ سال کی عمر میں جب یہ سنا ہے کہ ایک گاؤں اور اس مکان کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر آگے پڑھنا ہے تو خود کماؤ اور اپنے کو پڑھاؤ۔ وہ اب ایک چھوٹے سے شہر سے پورے نکل کر بے سروسامانی میں کلکتہ جیسے بڑے شہر میں علم کی جستجو میں خالی ہاتھ پہنچ کر روزی کماتا ہے اور علم حاصل کرتا ہے۔

ہاں تو پھر رات آئی اور گزر گئی۔ صبح کو یا تو اختر خود اٹھ گئے ہوں گے یا مولوی صاحب نے آواز دی اور ہمیشہ کی طرح سیر کو نکل گئے۔ ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جاتا، پھر ناشتہ کرکے اخبار پڑھ کر دفتر چلے جاتا۔ اس گھر کا روز کا معمول تھا اختر واپس پر نہانے چلے گئے۔ میں سو رہی ہوتی۔ مولوی صاحب کمرے میں جھانک کر دیکھتے۔ یہ بے قاعدگی ہر روز ناگوار گزری ہوگی۔ اب مجھے اٹھانے کی ترکیب یہ کی کہ ڈھیر ساری موٹی موٹی کتابیں میرے اوپر لاد دیں۔ مجھے اوندھا ہو کر سونے کی عادت تھی۔ میں پھر بھی نہ جاگی تو ایک مسند بچہ کمر پر رکھ دیا۔ پھر بھی نہ اٹھی تو ڈرائنگ ٹیبل کے ساتھ کی کرسی بڑی احتیاط سے رکھی ہوگی خود تو غائب ہو گئے۔ میں تو لیٹی ہوئی تھی مجھے تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ مگر سانس جیسے رک جاتی، نہ ہاتھ ہے نہ پاؤں۔ اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔ اختر اپنے پلنگ پر تھے۔ ان سے ہنسی روکنے کی آواز آ رہی تھی۔ بڑا غصہ آیا کہ یہ کس قسم کا بیہودہ مذاق ہے۔ اختر صاحب

نہار بیٹھے۔ بڑا زور لگا کر سیدھے ہونے کی کوشش کی۔ معلوم ہے منہ دھو لیا۔ تمام پھیل گیا۔ وہ جھپٹے کرسی اور گری۔ چیخ کر کہنے جا رہے تھے "وحید بیگم" آپ کیا توڑ رہی ہیں؟ بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر میں اتنا ہی بگڑا کہ بعد آپ کتا ہیں، منہ دھو، کرسی میرے اوپر پھینکتے ہیں ان کو مار رہی ہوں۔ یہ کس قسم کا بیہودہ مذاق ہے سوتے ہوئے کے ساتھ؟

اختر حسن نے چیخ کر کہا "خیر ہو! کچھ دماغ تو ٹھیک ہے میں کیا آپ پر لاد گیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" غسل خانہ کر کے ڈریسنگ روم میں گئے۔ ادھر ادھر گری ہوئی چیزیں نظر آئیں۔ حیرت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے برآمدے سے نکل کر صاحب کے کمرے کی طرف گئے۔ جانے کہاں سے اتنی عقل آ گئی۔ بال ہاتھ سے برابر کرتی، دوپٹہ ہاتھ میں پکڑا، پیچھے مولوی صاحب کے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ ابھی غسل خانے میں تھے۔ اختر دروازے پر بہت بگڑے ہوئے غصہ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اختر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا زور سے کہا "آپ حد کرتے ہیں کہ مجھ بیٹھے کو یہ سب صاحب سے کہا تھا۔ میں نے تو آپ سے مذاق کیا تھا۔ خود آپ لوگ تو مہینوں تک میں اتنے سیدھے مذاق کریں تو وہ ٹھیک اور جائز، ذرا سا میں نے مذاق کیا کہ دیکھوں آپ کتنے پانی میں ہیں، کس قدر بہادر ہیں؟ بس اتنے سے مذاق پر بھاگ کر مولوی صاحب سے میری شکایت کرنے آ گئے۔" اب مولوی صاحب دروازہ کھول کر باہر آئے۔ میری بات سن ہی ا بولنے لگے "ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔ ہم سب نے بھی تو کوئی حد نہ چھوڑی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب آپس میں لڑو جھگڑو شکایت میرے پاس مت لانا۔" اس قدر معصومانہ انداز سے مجھے دیکھا جس میں بڑے معنی پنہاں تھے "ہم تم دوست ہیں"۔ میں نے کہا "مولوی صاحب بالکل یہی ہماری اماں بھی ہم سے کہا کرتی تھیں کہ مجھ سے پوچھ کر کھیلیں نہ مجھ سے شکایت کریں۔" "جو اختر یہی منع کرتے ان کے پیچھے پیچھے اتنی صبح آپ کے کمرے تک آ گئی تھی؟" اختر نے پہلے مجھے سر سے پا تک دیکھا، پھر مولوی صاحب کی طرف دیکھ کر گویا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی، مگر ان کا روکھا سا چہرہ دیکھ کر کچھ بھی نہ نکال سکے۔

جالبی بھائی! سنی آپ نے یہ انوکھی واردات۔ ساری عمر جب کبھی میں نے کسی نئی دلہن کے ناشتے کی تیاری کو دیکھا کہ کس کس اہتمام سے تیار کر کے گھر والی خواتین دلہن کے اٹھنے کی بے تابی سے منتظر ہیں تو اپنی پہلی صبح یاد آ جاتی اور بے اختیار ہنسی آتی۔ ہر کسی سے کیا کہتی کہ میری خاطر کس طور ہوئی۔ مگر دل ہی دل میں ایک طرح کا فخر محسوس کرتی کہ یہ کیسا انوکھا طریقہ تو دیکھتی ہے، جو میرے ساتھ ہوا وہ کبھی کسی دلہن کے ساتھ ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔

ناشتے پر مولوی صاحب سر پیس سوز بیٹھے رہے، مگر جب میری طرف دیکھتے تو مجھے لگتا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں اور مروۃ اٹھنے پر جب اختر سامنے نہ تھے، تو کہنے لگے "بیٹی تم نے بڑے مزے سے مجھے بچا لیا، ورنہ وہ بگڑا ہوا تو میری جان کو آ جاتا۔" اختر کو وہ پیار میں مجھ سے جب اکیلے میں بات کرتے تو بابا ہی کہتے۔ ناشتے پر مجھ سے پوچھا کہ یہ تو بتاؤ تم لوگ شام کو اپنے گھر پر کیا کرتی تھیں؟ میری شامت جو بتا دیا کہ جب تک اندھیرا نہ ہوتا ہم سب بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔ کھانے کے بعد کبھی تاش کھیل لیے، کبھی کیرم۔ "تو پھر تم یہاں بھی یہی کرنا" پوچھا کس کے ساتھ؟ بولے "میرے اور اختر کے ساتھ۔"

ناشتے کے بعد دونوں اخبار پڑھتے رہے۔ پونے ۹ بجے دونوں اپنے اپنے دفتروں جا بیٹھے جو میرے لیے علاقہ ممنوعہ تھا۔ میں وہیں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے کہ اتنے میں بشیر خانساماں نے آکر دریافت کیا "دلہن پاشا آج رات کے لیے کیا پکنا ہے۔" پہلے تو دن کے کھانے کی بات کرو۔ میں نے کہا۔ وہ حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا "ہمارے گھر میں دن کا کھانا نہیں کھایا جاتا، اس لیے وہ پکتا ہی نہیں ہے۔" "کیا؟" میں حیرت کہ یہ کیسی بات ہے تکنے لگا کر "شاید آپ کو اختر میاں نے بتایا نہیں؟" میں "نہیں" کہہ کر کچھ دیر چپ رہ کر بولی "مگر کل تو دن کا کھانا ہم سب نے کھایا تھا۔" اس پر اس نے بتایا کہ جمعہ کا دن تھا، چھٹی ہوتی ہے بس اس دن مولوی صاحب کے دوست آتے ہیں اور بہت سے لوگ ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔" تو پھر یوں کرو کہ پرسوں رات پکایا تھا وہی پکا لو۔" بشیر اس پر ہنس پڑا کہ "پرسوں رات آپ لوگ یہاں کب تھے؟" "اچھا تو پھر یوں کرو کہ جو ہمارے گھر میں پکتا ہے وہ پکا لو۔" بشیر حیران سا مجھے دیکھ رہا تھا بولا "دلہن پاشا مجھے کیا خبر کہ آپ کے ہاں کیا پکایا جاتا ہے؟" "دیکھو بشیر اسی طرح مجھے بھی کچھ ابھی معلوم نہیں کہ مولوی صاحب کس طرح کا کھانا پسند کرتے ہیں اور اختر صاحب کی پسند کیا ہے۔ تم خود ہی سوچ کر ان کی مرضی کے مطابق پکا لیا کرو۔ بس اتنا کرنا کہ ایک کاپی لیتے آنا، روز مجھے حساب لکھوا دیا کرنا۔" بشیر خوش ہو کر ... چلا ... ایک عورت کے آ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جب جانے لگا تو میں نے یہ بھی کہا کہ "ہاں مجھے تر لیجے ضرور لیتے آنا۔" اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھ کر کہا "دلہن پاشا مولوی صاحب کے گھر تر لیجے تو ہرگز نہیں بن سکتے۔ میری تو چھٹی ہی کر دی جائے گی۔ اور اختر صاحب کو بھی بہت ناپسند ہیں۔" میں نے کہا "تو بے شک وہ دونوں نہ کھائیں میں تو سب خود کھا لوں گی۔ دوپہر کو تم کھانا تو دیتے نہیں ہو، گر تربت اور کوئی پھل تو ملے گا۔" بشیر اچھا کہہ کر ... "یہ بتائیے کہ تر لیجے میں آخر برائی ہے کیا؟ اور کیوں اس کو اس قدر ناپسند کرتے ہیں؟" "یہ آپ خود ہی ان سے پوچھ لیجیے گا۔" "مگر تم آج تو خرید ہی لے آنا۔" وہ چلا گیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ہیر تو ان مزے سے کھا رہے تھے جیسے کہ کوئی بڑی نعمت ہو اور تر لیجے کے خلاف۔

دوپہر تک مجھے کیا کرنا ہے۔ یہاں ایک ٹی کوزی سی ڈالوں کہ چلئے وہاں تو لیا سے مڑھا لگا جائے۔ میرے سامان میں وہ گٹھری میری آپا نے دی تھی، اس کو کھولا تو اس میں سے سب ہی کچھ نکلا۔ سوئی تاگے، ٹیپ، قینچی، بٹن، اس میں بہت سے مختلف رنگوں کے سلک کے ٹکڑے بھی تھے۔ اس گٹھری کی اہمیت نے مجھے یہ ہسٹری بتائی تھی کہ والدہ کی نانی کی تھی۔ تھوڑی دیر سوچا کی کہ یہ بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ چوتھی پشت کے ہاتھوں میں پہنچ گئی اب میں نے اس کو سنبھال کر آپا کی پوتی کو اسی طرح سب سلائی کا سامان رکھ کر اس کو شادی پر دی، پر ٹی کوزی تو سوتی کپڑے سے بناتا ہے۔ پلنگ کی چادر میں سے تھے گرد کپڑا پھاڑ کر ہاتھ سے سی کر اور پلنگ پر جو گدا سا موٹا تکیہ تھا جس کو دن میں پلنگ کے نیچے ڈال دیا تھا۔ اس میں سے روئی نکال کر بھری کڑھے ہوئے حصے سے ٹی کوزی کا کور دیا، پھر جا کر مولوی صاحب کے چائے دان کو اڑھا آئی۔ واپس آتے آتے اختر کے دفتر کی چق ذرا سی ہٹا کر اندر جھانکا۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی۔ بڑے انہماک سے کام کر رہے تھے میں کھڑی کچھ دیر سوچا کی کہ اختر قریب بھی اور پھر دور بھی ہیں۔ پھر جلدی سے وہاں سے کھسک آئی کہ یہ تو میرے لیے ممنوعہ علاقہ ہے اور یہ دونوں بڑے ہی مختلف لوگ ہیں۔

بشیر نے ایک پلیٹ لا کر دی جس میں سنترے کا جوس اور ایک کیلا تھا ساتھ ہی ایک چھوٹی سی شریفے کی
یہ کہہ کر "کھانے کے بعد چھلکے اور بیج اسی تھیلی میں ڈال کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیجیے گا" میں شریفے دیکھ کر ایسی
کر دروازہ بند کرنا بھول ہی گئی۔ فرصت پا کر اطمینان سے پلنگ پر بیٹھ کر پالتی مار کر بیٹھی شریفہ کھا رہی تھی تو
اپنے کمرے میں کسی کام سے جانے کے لیے برآمدے میں آئے ہوں گے۔ کہیں میری موجودگی اور ایسی صبح حالی حرکت کا خ
آیا ہو۔ میرے کمرے کی چق اٹھا کر جھانکے تو یہ دیکھ کر کہ میں شریفہ کھا رہی ہوں، اچھل پڑے۔ "ارے ارے یہ کیا کر
کس نے لا کر دیے؟" "بشیر نے۔ کیوں کہ میں نے اس سے منگائے تھے۔" "خبردار اب کبھی نہ یہ کھانا۔" "آخر کیوں؟ مجھے تو
بہت پسند ہیں، ایسے تو میں نے کبھی دیکھے نہ کھائے، آپ بشیر کو تو کچھ نہ کہیں۔ وہ تو لانے سے انکار کر رہا تھا۔ میں
کہا کہ کیا تم میری پہلی فرمائش کو پورا نہ کرو گے۔ تو بیچارا لے آیا۔ آخر اس کے کھانے پر آپ کو اور اختر کو اعتراض کیا
"ہم بتائیں کیوں ہے؟" جھٹ سے اپنا منہ خوب ایک طرف کو ٹیڑھا کر لیا کہ منہ یوں ہو جاتا ہے۔ میں حیرت زدہ ہو کر
"پھر میرا بھی منہ ٹیڑھا ہو گا۔ آپ یا اختر کا تو نہیں ہوا؟" تو کہا "ہم ایک ٹیڑھے منہ والی لڑکی کو اپنے گھر رکھ ر
اس وقت ٹھیک کتنا کر ظفر عمر کے پاس واپس کر دیں گے۔" یہ کہہ کر کھاتے پر بل ڈالے عینک ٹھیک کرتے ہوئے چلے گئے۔
ایک دم مجھے ان دو ہرنوں کا خیال آیا جو پہلے گئے تھے، جن کا ذکر اختر نے میرے نام اپنے کسی خط میں کیا
میاں نے اندر ہی میں ایک ہرنی پالی تھی اس کا نام رانی رکھا تھا۔ جب مولوی صاحب سے اختر نے بتایا تو بولے ہم تم
اور راجہ؟ کیوں نہ پال لیں۔ دوسرے ہی دن ایک ہرن کا جوڑا منگا لیا تھا۔ صبح شام دونوں کھڑے ہو کر ان کو دیکھ کر خ
ہوا کرتے تھے۔ میں برآمدے سے اتر کر کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جا کر رانی اور راجہ کو چوکڑیاں بھرتے دیکھ رہی تھی۔ سا
سے کوئی بزرگوار کمر اتنی جھکی ہوئی جیسے یہ دوہرے ہوتے جا رہے ہوں۔ بہت ہی گورا چٹا رنگ، ہاتھوں میں باریک سی چھڑی۔
طرف بڑھ کر قریب آ کر کہتے ہیں "بمبئی میں ظفر عمر کا دوست ہوں، ان کا خط مجھے کل ملا کہ میں تمہاری خیر خبر لیا کروں، تم ٹھیک
تھا۔ جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو کوئی شکایت ہو تو بلا تکلف مجھ سے کہہ دیا کرنا۔ میں تو تمہارا چچا ہوں۔" آداب کر کے ان
"کہیں ٹھیک ٹھاک ہوں کوئی تکلیف نہیں سوائے اس کے کہ شریفے اس گھر میں نہیں آ سکتے۔ بس آپ کبھی کبھار چند شریفے میرے
لیے لیتے آیا کریں۔" "مگر آپ مجھے دیں گے کس طرح کیوں کہ کوئی اندر سے باہر کے حصے میں جا نہیں سکتا اور کوئی باہر سے اد
قدم نہیں رکھ سکتا۔" بولے "تم اس کی فکر نہ کرو، میں کاغذ میں لپیٹ کر پھولوں کی کیاری میں رکھ دیا کروں گا۔" یہ صاحب
شان الحق حقی کے والد تھے۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو سوچ رہی کہ زندہ تو مشکل ہی ہے چلو تو یہ بیچارے البتہ تو جائیں گے۔ ط
میں خوش کہ چلو کوئی میرا اپنا اس دیار غیر میں موجود ہے۔
اپنے کمرے میں آ کر سو گئی۔ اختر نے اگر کسی وقت اندر آ کر میری خیر خبر لینے کی زحمت کی ہو تو وہ مجھے کیا معلوم ہو سکتا تھا
۵ بجے ہوں گے کہ اختر نے مجھے ہلا کر اٹھایا کہ "جلدی اٹھیں۔ مولوی صاحب چائے بنانے والے ہیں۔ منہ دھو کر جلدی سے
باہر آ جائیں۔ آپ کے شریفے کھانے سے ان کا پارہ بہت چڑھا ہوا ہے۔" میں جلدی جلدی منہ دھو کر باہر کے برآمدے
میں آئی سیدھا مولوی صاحب کی گودی ہاتھ میں پکڑے کبھی چائے دان پر رکھتے اور کبھی اٹھا لیتے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور
بولے "آج تو حد ہو گئی کہ ہمارے چائے دان کو کسی نے ٹوپی پہنا دی۔ یہ بات تو بہت اچھی کی جس نے بھی کی۔ اب چائے دیر تک

مگر اکرم رہا کرے گی۔ مگر بات سمجھ سے ہے ہیں کہ میں نے سنا ہے مگر یار بار کیسے جاتے کوئی بالغ ہیں سے برآمدے میں آیا چلنے والی کو ٹوپی اتر رہا اور چلتا بنا۔ مگر ہم سے مل کر جاتا تو اس کا بہت شکریہ ادا کرتے۔" میں دل میں بہت خوش ہوئی۔ جلدی سے میز کی طرف بڑھی کہ آج چائے میں دم کر دوں گی۔ چائے کے ڈبے کا جوں ہی ڈھکن کھینچنے لگی تو "ارے ارے یہ کیا کرتی ہو۔ ہم کسی بھی بدنیت کے ہاتھ کی بنائی چائے پیا ہی نہیں کرتے۔" میں نے مڑ کر کہا "بھلا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بدنیت ہوں۔ اگر یہی بات ہے کہوں تو؟" کسی کے کہنے سے کوئی میں بدنیت ہو جاؤں گی۔ مگر وہ مسکراتے رہے۔ آنکھوں سے جیسے شفقت ٹپک پڑے گی۔ میرا ترشے جواب حاضر کر دینے پر جیسے ان کا جی اٹک رہا تھا۔ وہ کہاں عادی تھے کہ ان کے رعب کے مارے کوئی جواب دینے کی جسارت کرے۔ مگر ہم نے تو رہیں ہی میں یہ فیصلہ دل میں کر لیا تھا کہ بی حمیدہ ہوشیار رہنا ورنہ بری طرح ماری جاؤ گی۔ تمہارا پالا پڑا ہے بہت بکٹ قسم کے لوگوں سے۔ بڑی ہمت کر کے ہوشیاری کے ساتھ نبٹنے پر دھلا ڈالنا ہوگا۔

مولوی صاحب نے جب چلنے بھالی تو میں نے کہا "اگر پانچ منٹ کی کڑی کو ڈھکا رہنے دیا جائے تو چائے اچھی طرح دم کھا جائے گی۔ چلنے والی ڈھک تو دیا مگر پاس کل بچوں کی طرح گھڑی پر نظر جا کر ہر منٹ کے گزرنے کا اعلان ہوتا رہا۔ لو ہو گئے پانچ منٹ۔ ایک۔ دو تین کہہ کر چائے پیالیوں میں ڈالی۔ حوادان کو زیادہ مزے دار لگی۔ "یہ لڑکی کبھی کبھی بات ٹھیک بھی کہتی ہے۔"

اختر نے مولوی صاحب سے پوچھا ہم دونوں آج جا کر نسا بابا اور مہرجنی نائیڈو سے مل آئیں۔ بولے "ہاں ہاں ضرور مل آؤ۔ مگر ہماری لڑکی کو ان کے کتے سے نہ کٹوا دینا۔ بڑا خوفناک ہے۔" میں کتوں سے بے حد ڈرتی تھی "اگر وہاں ایسا کتا ہے تو میں وہاں ہرگز نہ جاؤں گی۔" "آپ کس کی باتوں میں آتی ہیں۔ ان کو تو لوگوں کو ڈرانے اور بہکانے میں مزا آتا ہے کتا وہاں ضرور ہے اور بھی بہت سے جانور ہیں۔ سب کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔" مجھے اطمینان ہو گیا۔ چائے ختم ہوئی تیار ہوئی۔ خوش ہو رہی تھی اس گھر سے باہر کی دنیا تھوڑی دیر کو دیکھنے میں آئے گی اور ان لوگوں سے ملاقات ہوگی جن کا ذکر اختر اپنے خطوں میں کچھ اس طرح سے کیا کرتے کہ ایسا لگ رہا تھا کہ جانے پہچانے ہی بزرگوں سے ملنا ہوگا۔ چلتے چلتے اختر نے کہا "اگر بابا نے بہت اصرار کیا تو شاید ہم دونوں کھانا وہاں کھا لیں۔ آپ وقت پر کھانا کھا لیجیے گا۔" "جی نہیں سیدھے سیدھے ٹھیک وقت پر آ جائیں۔ آج تو پہلے روز حمیدہ کا پکایا ہوا کھانا کھانے کا۔" میرا دل گھبرایا مگر خاک میں نے کچھ پکایا۔ بشیر نے جو بھی پکایا ہو۔ کرتے ہی چل دی کہ کہیں پوچھ نہ بیٹھیں کہ کیا پکایا ہے۔ جلدی سے ایک ساری پہنی۔ جوڑا لپیٹ باہر آئی۔ دونوں وہیں برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زہرہ سے ہنسے اور کہا "لو بھئی یہ تو ایک بنگالن بن گئی۔" اختر نے خود بھی مجھے آج پہلی بار ساری میں دیکھا۔ بولے "آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" میں جیسے جل بھن سی گئی۔

—

(افکار، دسمبر ۹۳ء)

ذکا صدیقی

تذکرۂ غوثیہ کا حقیقی مصنف ـــ اسمٰعیل میرٹھی

تذکرۂ غوثیہ کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ یہ مولانا گل حسن شاہ صاحب کی تصنیف ہے۔ اس خیال کی وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ اس پر بطور مولف انہیں کا نام چھپا ہوا ہے ـــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب ملفوظات کے محض ناقل تھے، انہیں تحریر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے قلم نے کیا تھا ـــ ملفوظات اولیاء و صوفیہ کی صنف ہی میں نہیں، ہمارے پورے ادبی و علمی سرمائے میں نثر کا یہ سحر کار اردوئے معلیٰ، محاورہ بندی اور روزمرہ بامحاورگی کے ماسوا انشائے کا اعلیٰ نمونہ کا حکم رکھتا ہے۔ یاد پڑتا ہے جس زمانے میں تدریس کے پیشے سے وابستہ تھا، ایم۔ اے (اردو) کے طلبہ کے لیے میں نے تذکرۂ غوثیہ کا مطالعہ بطور لازمی قرار دے رکھا تھا گو نصاب میں یہ کتاب نہیں تھی۔

اس واقعے کے متعدد شواہد و دلیل ہیں کہ تذکرۂ غوثیہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے تحریر کیا تھا۔ سب سے اہم شہادت خطی نسخے کے وہ اوراق ہیں جو خان... مولانا محمد اسلم سیفی مرحوم (خلف اکبر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی) نے اپنے والد مرحوم سے ورثے میں پائے تھے۔ یہ اجزا متعدد اہل علم، مثلاً مرحوم مالک رام صاحب کے علاوہ خاکسار کو بھی مولانا اسلم سیفی نے اپنے دولت خانے واقع اسمٰعیل نگر، محلہ مشائخان، میرٹھ پر دکھائے اور پڑھوائے اور پڑھوا کر سنے تھے۔ قیاس ہے کہ جناب ابو سلمان شاہ جہاں پوری کی بھی ملاحظہ فرمائے ہیں۔ یہ اجزا مولوی اسمٰعیل کے اپنے ہاتھ کے تحریر کردہ ہیں۔ اس امر کی تصدیق تزک... اور مقدمۂ قرآن السعدین کے خطی نسخوں نیز متعدد عبارتوں، مکتوبات، ملفوظوں اور وصیتوں کے ملاحظہ سے ہوتی ہے ـــ کلیات اسمٰعیل میں مولانا اسلم سیفی نے مولوی محمد اسمٰعیل کے خطی نسخوں کے فوٹو بھی چھاپے ـــ مالک رام صاحب مرحوم نے بھی رسالہ آجکل دہلی میں تذکرۂ غوثیہ سے متعلق صفحات کے فوٹو چھاپے تھے۔

مولانا گل حسن شاہ صاحب نے اپنی عمر کے اکیس بائیس سال سرحد اور پشاور میں گزارے۔ بقدر کفایت علم سفینہ حاصل کرلینے کے بعد انہیں علم سینہ کی طلب ہوئی تو ایک انگریز کی ملازمت چھوڑ چھاڑ چپ چاپ نکل پڑے۔ شہر شہر قریہ قریہ گئے، کہیں شرح صدر نہ ہوا، لیکن طلب چونکہ صادق تھی اس لیے ایک رات خواب میں حضرت سلطان باہو نے بشارت دی کہ تم ہندوستان کو جاؤ، وہاں تمہارے سب مقاصد پورے ہوں گے۔ مولانا مرشد کی تلاش میں ملتان سے روانہ ہوئے اور پنجاب ہوتے، اہل اللہ کے پتے ٹھکانے ڈھونڈتے، خانقاہوں اور مزاروں پر حاضریاں دیتے چلے گئے۔ آخرکار پانی پت پہنچے۔ یہاں حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتی کے مزار پر اپنے خواب کی تعبیر پائی، یعنی حضرت غوث علی شاہ قلندر قادری کی جناب میں نیاز حاصل ہوا۔ مولانا گل حسن شاہ صاحب ہر طرح قابل تھے ہی۔ مرشد کامل کی نگاہ کیمیا اثر نے جلد ہی ذرے کو آفتاب بنا دیا تا آنکہ حضرت قلندر صاحب کے وصال کے بعد ان کے تمام جانشینوں اور دور و نزدیک کے مریدوں نے انہیں مرشد کا خلیفۂ مجاز تسلیم کرلیا۔

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی بھی حضرت قلندر صاحب کے ایک باختصاص مرید تھے۔ اپنی سرکاری ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے مرشد کی خدمت میں حاضری کے مواقع انہیں نسبتاً کم نصیب ہوتے تھے ـــ ویسے بھی یہاں تو مرشد کے خلیفہ کی خوشنودی مقصود تھی۔ چنانچہ کتاب پر بطور مولف مولانا گل حسن شاہ صاحب ہی کا نام لکھا گیا، ملفوظات کے راوی و ناقل وہی تھے۔ اہل علم و نظر تاسّف سے آپ واقف رکھتے ہوئے یہ بھی جانتے ہیں کہ سادہ و پرکار نثر نگاری کا یہ جوہر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے ماسوا پورے ہندوستان میں باستثنائے مولانا محمد حسین آزاد و مولانا حالی کسی کے قلم کو ودیعت نہیں ہوا ـــ مولانا گل حسن شاہ صاحب

ڈاکٹر اے بی اشرف



اردو کا پہلا ترک پروفیسر

پروفیسر ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ پاک و ہند کے علمی و ادبی

اب وہاں سے ماسٹر ڈگری کا امتحان پاس کیا۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مولانا روم سے عشق ہونے کی وجہ سے

سلجوق یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا قیام ڈاکٹر ترکمان کی مساعی جمیلہ کا ہی نتیجہ ہے

حلقوں میں ان کو بھی طرح جانا پہچانا جاتا ہے۔ ان کا علمی اور تحقیقی کام بڑا وسیع ہے اور یہی کام ان کی شناخت کا وسیلہ بھی ہے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا اصل کارنامہ سلجوق یونیورسٹی قونیہ میں شعبۂ اردو کے قیام و دوام کی مساعی جمیلہ ہے۔ حقیقتاً اس شعبے کے اجراء و ارتقاء کا سہرا صرف اور صرف ڈاکٹر ایرکن ترکمان کے سر جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہاں اردو زبان و ادب کی تدریس کا سلسلہ آج سے پانچ سال پہلے شروع کیا۔ اب اس شعبے میں گریجویشن تک کی چار کلاسوں کے علاوہ ایم اے اردو کی تدریس بھی ہو رہی ہے۔ شعبے میں طالب علموں کی تعداد ساٹھ سے متجاوز ہے۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ جب اس شعبے کا آغاز ہوا تو پروفیسر ایرکن ترکمان نے اپنی کوشش سے شعبے کے لیے صرف دو ریسرچ سکالر اور منظور کرائے بلکہ ایک پاکستانی استاد کی خدمات بھی حاصل کیں۔ اس طرح اب اردو زبان و ادب کے اس شعبے میں انقرہ یونیورسٹی کی طرف سے چیئر بھی موجود ہے، اردو زبان کی تدریس محض ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے ہو رہی ہے۔ اس سے ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بغیر کسی بیرونی امداد کے خود اس شعبے کو کس طرح قائم کرایا اور اس کی توسیع میں کوشاں رہے۔

پروفیسر ایرکن ترکمان کے آباؤ اجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔ والد گرامی سکندر بے کا زیادہ تر وقت پشاور (پاکستان) میں گزرا۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ محترمہ پاکستانی خاتون تھیں۔ ایرکن ترکمان بھی پشاور میں پیدا [illegible]

قونیہ کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ مولانا روم پر ان کی ضخیم اور جامع کتاب (The essenoe of Rumi Masnvi) نہ صرف ترکی میں بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے اور بہت مقبول ہوئی ہے۔

ڈاکٹر ایرکن ترکمان ہمہ زبان ہیں ترکی کے علاوہ اردو، انگریزی، فارسی، عربی، پنجابی اور پشتو وغیرہ اس روانی اور قدرت سے بولتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ بن غازی یونیورسٹی لیبیا میں انگریزی زبان کے استاد رہ چکے ہیں اور ترکی کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی گزشتہ ۳۰ برس سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو کے چیئرمین اور مشرقی زبان و ادب کے شعبہ جات کے سربراہ تھے۔ سال گزشتہ کے اواخر میں ان کے علمی و تحقیقی کام، ماہرین کی مثبت آراء اور جیوری کے متفقہ فیصلے کے مطابق انہیں اردو پروفیسر کے طور پر ترقی دے دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے وہ پورے ترکی میں پہلے اور واحد ترک ہیں جو اردو پروفیسر ہیں۔ ان کا یہ اعزاز نہ صرف سلجوق یونیورسٹی قونیہ کے لیے بلکہ خود ہمارے لیے بھی باعث مسرت و صد افتخار ہے۔ سفیر پاکستان جناب انعام الحق نے ان کے اس اعزاز پر انہیں پیغام تہنیت بھجوایا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ایرکن ترکمان کے تنقیدی اور تحقیقی مقالات ترکی، پاکستان اور ہندوستان کے مختلف جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ دنیا کی کئی یونیورسٹیوں میں توسیعی لیکچر بھی دے چکے ہیں۔ اور کانفرنسوں میں مقالات بھی پیش کر چکے ہیں۔ ●●

تحریر: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ

بحیثیت شاگرد امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

حضرت قاضی صاحب کو قدرت نے بہت سی سعادتوں سے بہرہ اندوز کیا تھا: وہ اپنے جدی سے بتیس واسطوں کے ساتھ حضرت عثمان ذی النورین کی اور ننھیالی جانب سے چالیس پشتوں کے ذر حضرت ابو ایوب انصاری میزبان نبوی کی اولاد ہیں۔ ان کی ددھیال چشتیہ سلسلے کے قطب الاقطا حضرت مخدوم جلال الدین عثمانی پانی پتی (م ۷۶۵ھ ، ۱۳۶۳ء) سے اور ننھیالی خاندان شیخ الاسلا عبداللہ انصاری المعروف بہ پیر ہرات (م ۴۸۱ھ ، ۱۰۸۸ء) کے ذکر سے معطر و مزین ہے۔ قاضی صاحب کے خاندان میں تقریباً بارہ پشتوں سے "علم دین" کا سلسلہ متوارث ہوتا ہوا ان کی ذات تک پہنچا اور ان کی اولاد بھی کئی نسلوں تک علم دین کی وارث و حامل رہی۔ قاضی صاحب کے دادا قاضی ہدایت اللہ عہد مغلیہ میں پانی پت کے قاضی اور ایک نامور عالم دین تھے۔ شیخ محمد عابد سنامی (۱۱۶۰ھ ، ۱۷۴۷ء) سا مرشد کامل ان کے زیر درس رہ چکا تھا اور قاضی صاحب کے والد قاضی محمد حبیب اللہ کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ ان کے مرشد کامل نے خرقہ خلافت دینے کے بعد ان کی تربیت کا آغاز کیا تھا۔ دوسری طرف ان کے نانا نواب لطف اللہ خان شمس الدولہ بہادر تہور جنگ دربار مغلیہ کے چھ ہزاری منصب دار تھے۔ اسطرح قاضی صاحب کی ذات دین و دنیا کا ایک حسین امتزاج تھی۔

قاضی صاحب مشہور مردم خیز قصبے "پانی پت" میں تخمیناً ۱۱۴۰ھ / ۱۷۲۷ء اور ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء کے مابین پیدا ہوئے۔ یہیں انھوں نے شہر کے علماء و فضلاء سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے محض سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور سولہ سترہ سال کی عمر میں کتب درسیہ سے فراغت حاصل کرلی تھی۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس سولہ سترہ برس کی عمر میں اپنی پہلی کتاب "احقاق حق" تصنیف فرمائی۔ جو حضرت مجدد الف ثانی پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے اعتراضات کے مدلل جوابات پر مشتمل ہے۔

تحصیل علم میں بھی قدرت نے انھیں بہت سی سعادتوں سے بہرہ ور کیا تھا: انھوں نے بیک وقت ہندوستان کے تین نامور محدثین سے حدیث کا علم حاصل کیا، جن میں، امام العصر شاہ ولی اللہ محدث

دہلوی (م ۱۱۷۶ھ، ۱۷۶۲ء) شاہ فخر الدین الہ آبادی محدث (م ۱۱۶۴ھ، ۱۷۵۰ء) اور مرزا مظہر جانجاناں دہلوی (م ۱۱۹۵ھ، ۱۷۸۰ء) جیسے اکابر حضرات شامل ہیں، مرزا مظہر جانجاناں جو قاضی صاحب کے خصوصی مربی و سرپرست بھی تھے ۔ بہت بڑے صوفی کامل ہونے کے ساتھ اونچے درجے کے محدث بھی تھے ۔ اور اپنی خانقاہ میں باقاعدہ درس حدیث دیا کرتے تھے ۔ اور جو شیخ محمد افضل سیالکوٹی (م ۱۱۴۶ھ، ۱۷۳۳ء) تلمیذ شیخ عبداللہ سالم مکی کے شاگرد اور امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہم سبق تھے ۔

امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مرزا مظہر جانجاناں شہید کے مابین نہایت خوشگوار مراسم قائم تھے ۔ بعض مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے درمیان شاگردوں اور مستفیدین کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا ۔ حضرت شاہ صاحب اپنے خطوط میں مرزا صاحب کو بجا طور پر " مقیم طریقہ احمدیہ " اور " راعی سنت نبویہ " لکھتے تھے اور حضرت مرزا صاحب بھی حضرت شاہ صاحب کا غایت درجہ ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے، قاضی صاحب کا تعلق ابتداء حضرت مظہر سے ہی قائم ہوا تھا، اس لئے یہ قیاس ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے ہی قاضی صاحب کو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بغرض استفادہ علم حدیث ارسال کیا تھا : بہر یہ قاضی صاحب کی بھی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ انہیں شیخ ملا تو حضرت مظہر جانجاناں شہید سا اور استاد حدیث ملا تو امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسا ۔

امام العصر شاہ ولی اللہ کی زندگی کا یہ وہ دور تھا کہ جب ان کی حجاز مقدس سے واپسی ہو چکی تھیں (۱۱۴۵ھ) اور وہ اس وقت اپنے علم و فکر کی اس انتہا کو پہنچ چکے تھے جو ان کی عظیم الشان کتب حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیمات الٰہیہ وغیرہ میں نظر آتی ہے ۔ اس وقت " اکبرے دالان ' تین دروالی صندوق نما لداو والی مسجد اور ایک کٹہرے " پر مشتمل " مدرسہ رحیمیہ " کی شہرت کا آفتاب عالمتاب عین نصف النہار پر تھا ۔ اس دور میں تاریخ اسلام کا یہ مامور معمار قوم نونہالان وطن میں مستقبل کے ایسے گوہر نادار تلاش کرنے اور انہیں تراش خراش کو عظیم مقاصد کے لئے تیار کرنے میں مصروف تھا، جو اس کے مشن اور پروگرام کو اقصائے عالم تک پہنچا سکیں اور یہ اس درسگاہ کی بھی خوش قسمتی تھی کہ انہیں ایسے جواہرات تلاش کرنے میں مایوسی نہیں ہوئی ۔ خود قاضی صاحب بھی ایسے ہی بیش قیمت جواہرات میں شامل تھے ۔

حضرت قاضی صاحب جن ایام میں امام العصر شاہ ولی اللہ کے ہاں زیر تعلیم تھے (ابتداءً ۱۱۴۰ھ، ۱۷۲۶ء) ان دنوں میں مرزا صاحب کے ہاں بھی کئی کئی روز تک حاضر نہ ہو سکتے تھے ۔ مرزا مظہر جانجاناں شہید کو قاضی صاحب سے غایت درجہ محبت تھی جس میں عقیدت کا رنگ بھی جھلکتا تھا اس لئے انہیں قاضی صاحب کی غیر حاضری نہایت شاق گزرتی تھی ۔ چنانچہ مرزا صاحب نے امام العصر

کو ایک مکتوب میں لکھا ' جس میں ان سے چند مسائل بھی پوچھے اور قاضی صاحب کے بارے میں استفسار کیا کہ وہ کب تک امام العصر کے ہاں زیر تعلیم رہیں گے ۔ اس کے جواب میں شاہ صاحب نے رقم فرمایا :

" مولوی ثناء اللہ مصابیح و صحیحین اسماع نمودند مستعد کتب ستہ بلکہ عشرہ متداولہ اند ۔
ہمیں توجہ ہمت سامی توقع است کہ آنکہ بظہور رسد و بعد ازاں احرام صحبت شریف بندند"

مولوی ثناء اللہ مصابیح اور صحیحین (صحیح بخاری مسلم) پڑھ چکے ہیں اور اب صحاح ستہ بلکہ عشرہ متداولہ پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ آپ کی مبارک توجہ کے باعث امید ہے کہ ان کا مقصد پورا ہوگا ۔ پھر وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا احرام باندھیں گے ۔

امام العصر شاہ ولی اللہ کے خط سے ان دونوں اکابرین امت کے ہاں قاضی صاحب کے مقام و مرتبے کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے ' علاوہ ازیں اس سے قاضی صاحب کی تحصیل علم کے لئے مستعدی اور اس میں گہرے انہماک کا تاثر بھی ملتا ہے ۔

تحصیل علم حدیث سے فراغت ہو جانے کے بعد بھی قاضی صاحب ' امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہاں آتے جاتے رہتے اور ان سے استفادہ علمی کرتے رہتے تھے ۔ چنانچہ امام العصر کے وصال سے چند سال پیشتر کے ایک خط میں بھی قاضی صاحب کا ذکر ملتا ہے ' امام العصر تحریر فرماتے ہیں :

بعد سلام واضح باد کہ مولوی ثناء اللہ بار قیمہ کریمہ رسیدند موجب مسرت گردید...... توقع آنست کہ در اوقات موجودہ دعاے سلامت از آفات ظاہرہ و باطنہ در حق بندہ ضعیف و فرزندان و متعلقان بوجود می آمدہ باشد ' والسلام ۔

سلام کے بعد واضح ہو کہ مولوی ثناء اللہ مکتوب گرامی کے ساتھ پہنچے (اس یاد آوری) پر بے حد خوشی ہوئی ...... امید ہے کہ مخصوص اوقات میں میرے لئے ' اور میرے فرزندان اور متعلقین کے لیے ظاہری و باطنی آفتوں سے سلامتی کی دعا کا سلسلہ جاری رکھیں گے ' والسلام ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فراغت کے بعد بھی قاضی صاحب نے امام العصر کے ہاں آمد و رفت کا باقاعدہ سلسلہ جاری رکھا ۔

۲۔ عملی زندگی ۔

یہاں تک تو قاضی صاحب کے امام العصر سے استفادہ علمی کا ذکر تھا ۔ اب قاضی صاحب کی عملی زندگی میں ولی اللہی اثرات پر بھی چند اشارات پیش کیے جاتے ہیں ۔

امام العصر جب ۱۱۴۵ ھ ، ۱۷۳۳ ء میں حجاز اقدس کے سفر سے واپس تشریف لائے تو ان کے

سامنے " امت " کی اصلاح کا ایک واضح نصب العین تھا ۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان واپسی کے ساتھ ہی اپنے اس پروگرام پر عمل درآمد شروع کردیا ۔ امام العصر شاہ ولی اللہ کا نصب العین زندگی کے محض ایک دو پہلوؤں کی اصلاح نہ تھا بلکہ ان کا نصب العین یہ تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کا ہر گوشہ اپنی اصلی آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آجائے ۔

قدرت نے امام العصر کو ایک ایسے زمانے میں بھیجا تھا جب فی الواقع امت کو ان جیسے رہنما کی اشد ضرورت تھی ۔ دنیائے اسلام اس وقت اختلاف و انتشار کے آخری نقطے کو پہنچ رہی تھی ہندوستان میں مسلمانوں کی صدیوں کی حکومت کا سایہ اب برائے نام باقی تھا ۔ ہندوستان کے طول و عرض میں غیر مسلم طاقتیں ہندو جاٹوں ' مرہٹوں اور سکھوں کی صورت میں منظم ہو رہی تھیں ۔ یورپین طاقتوں نے بھی ہندوستان کے ساحل پر مکر و فریب اور سازشوں کے ذریعے اپنی اپنی طاقتوں کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا ۔ عالمی سطح پر بھی مسلمان زوال و انتشار کا شکار تھے ۔ سلطنت عثمانیہ اندرونی خلفشار میں مبتلا تھی اوریورپین ممالک سے اس کی پسپائی کا عمل اس صدی سے شروع ہوچکا تھا ۔ الغرض دنیائے اسلام کو اس وقت فی الواقع ایک ایسے امام و قائد کی ضرورت تھی جو زندگی کے ہر پہلو میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ان کی رہنمائی کرسکے ۔

اس پس منظر میں امام العصر نے اپنے تجدیدی کام کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا (۱) ان کے تجدیدی کام کا مرحلہ اول یہ تھا کہ امت کی فکری و علمی رہنمائی کی جائے ' اس دور کا مسلمان طرح طرح کے رسم و رواج میں مبتلا ہو کر اپنا دین و مذہب گم کر بیٹھا تھا ۔ اور رسوم و رواج ہی کو دین و شریعت کا مقام دیا جا رہا تھا ادھر دینی درسگاہوں میں منطق و فلسفہ نے حدیث و تفسیر کی جگہ حاصل کرلی تھی اور علماء و فضلا زندگیوں کا بیشتر حصہ انہی علم کی تحصیل و تعلیم میں صرف کر دیا کرتے تھے ۔ امام العصر نے حدیث اور تفسیر کو ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں اپنا مقام دلایا ۔ آج دنیا بھر میں حدیث پڑھنے پڑھانے کے لئے ان سے عملی ۔ ان سے بہتر اور ان سے کثیرالاشاعت اور کوئی سند ہے ہی نہیں ۔

حدیث کی طرح امت قرآن سے بھی واجبی سا تعلق قائم رکھے ہوئے تھی ' امام العصر نے اس تعلق کو بھی از سر نو مستحکم کیا اور ترجمہ فارسی ترجمہ و تفسیر فتح الرحمان لکھ کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک بہت بڑی تحریک کا آغاز کیا ۔

فقہ کی دنیا میں امام العصر نے گرانقدر خدمات انجام دیں ۔ مسالک کے مابین فقہی اختلافات کو کم کیا ۔ دور جدید کے تقاضوں کے مطابق آٹھ شرائط پر پورا اترنے والے فقہا کو اجتہاد کرنے کی ترغیب دی ، اور اجتہاد کو ہر دور کے لئے فرض کفایہ قرار دیا ۔ الغرض فکری و علمی دنیا میں ان کے بے شمار

کارہائے نمایاں ہیں ۔ جن کا ذکر موجب طوالت ہوگا ۔

(۲) جبکہ اس کا دوسرا مرحلہ اسلام کے غلبے کے لئے سیاسی کوششوں کا آغاز ہے ۔ وہ ہندوستان کی تاریخ کے پہلے شخص تھے ' جنہوں نے " درویش " ہوتے ہوئے بھی بادشاہوں جیسا کردار ادا فرمایا اور ایک ایسی عظیم سیاسی و مذہبی تحریک کی بنیاد رکھی جس کے اثرات علماء دیوبند کی جدوجہد کی صورت میں اس وقت بھی باقی ہیں اور شاید قیامت تک باقی رہیں گے ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی اپنے بلند مرتبہ استاد سے بہت زیادہ متاثر تھے ' اس لئے اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ انھوں نے بھی اپنی پوری زندگی اپنے عظیم المرتبت استاد کے نصب العین کی تعمیل و تکمیل میں صرف کر دی ۔

قاضی صاحب نے امام العصر سے " عشرہ متداولہ " (حدیث کی دس بڑی کتابیں) کیا پڑھی تھیں کہ اس سے ان کی زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا ۔ قاضی صاحب نے مختلف علوم وفنون پر کم و بیش ۳۰ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں ۔ ان میں سے آپ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں اس میں آپ کو حدیث کا رنگ غالب نظر آئے گا ۔ ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنا مناسب ہوگا ۔

قاضی صاحب نے علم ضرورت کے مسائل پر ایک چھوٹی سی فارسی کتاب " مالا بد منہ " (جس کے بغیر چارہ نہ ہو) لکھی ہے بظاہر تو یہ ایک عام سی کتاب ہے اور مبتدی طلباء کے لئے لکھی گئی ہے ۔ مگر اس میں بھی حیرت انگیز طور پر حدیث اور مسالک اربعہ کے جمع و تطبیق کا رنگ غالب ہے ' مثلاً ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں :

" در فجر قراءت طویل خواند ـــ ابوبکر صدیق

ـــ در نماز فجر در یک رکعت ـ سورہ بقرہ خواندہ و پیغمبر در دو رکعت مغرب سورہ اعراف خواندہ و عثمان در نماز فجر اکثر سورہ یوسف میخواند لیکن رعایت حال مقتدیان ضرور است

حضرت ابوبکر صدیقؓ نماز فجر کی ایک رکعت میں سورہ بقرہ پڑھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز میں سورہ اعراف پڑھتے تھے ۔ حضرت عثمانؓ فجر میں اکثر سورہ یوسف تلاوت فرماتے تھے ۔ لیکن مقتدیوں کے حال کی رعایت رکھنا ضروری ہے ۔

اس طرح دیہات میں نماز جمعہ کے بارے میں فرماتے ہیں :

" پس نزد امام اعظم در دیہات جمعہ جائز نیست و نزد شافعی و اکثر ائمہ جمعہ جائز است

امام اعظم کے نزدیک دیہات میں جمعہ جائز نہیں ۔ مگر امام شافعی اور اکثر ائمہ کے نزدیک جائز ہے ۔

اسی طرح انھوں نے قرآنی علوم کے عام کرنے کے لئے عربی زبان میں " تفسیر مظہری " تصنیف فرمائی ۔ راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالے میں ۔۔ واضح کیا ۔۔ ۲۰۔۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔

ستان بھر میں پہلی باقاعدہ مکمل تفسیر ہے۔ اس سے پہلے جو تفاسیر لکھی گئی ہیں انہیں مکمل تفاسیر ہرگز
قرار دیا جاسکتا۔ اور یہ تفسیر امام العصر شاہ ولی اللہ کے معارف قرآنیہ کو عام کرنے کے مشن کا
حصہ ہے۔

قاضی صاحب نے اپنے بلند پایہ استاد کے تصور فقہ و اجتہاد کو مکمل طور پر اختیار کیا۔ انہوں نے
تفسیر میں اور بعض دیگر کتابوں میں اس موضوع پر اتنا مفصل اور جامع کام کیا ہے کہ ہندوستان بھر
مسلم تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ اپنے استاد و مربی امام العصر شاہ ولی اللہ سے اس
ے میں پوری طرح ہم آہنگ ہیں، کہ حدیث پر کسی کے قول و قیاس کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔
پنے اس اصول کے تحت انہوں نے کس جگہ شوافع اور دوسرے اہل مسالک کی خبر لی ہے۔ تو خود
ناف کو بھی معاف نہیں کیا۔ وہ خود ایک مقام پر امام ابو حنیفہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں:

ن عبداللّٰہ بن المبارک قال سمعت ابا حنیفہ یقول اذا جاء عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم فعلی الراس
العین ...... و نقل انہ قال اذا اصح الحدیث فھو مذہبی (۴۳) .....

بداللہ بن مبارک بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ کو کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی آنحضرت
لی اللہ علی وآلہ وسلم کی حدیث ملے تو وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ اور اس طرح ان سے یہ نقل کیا
یا ہے کہ جب کوئی صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مسلک ہے۔

علاوہ ازیں، تصوف کے میدان میں بھی انہوں نے بہت کچھ لکھا اور تصنیف کیا اور اپنے استاد
ترم کی تعلیمات کے مطابق وہ تصوف کو احسان قرار دیتے ہیں، انہوں نے "احسان" کے باب کو اپنی
فقہ کی کتاب "مالا بدمنہ" میں بھی شامل کیا ہے، حالانکہ فقہاء اپنی کتابوں میں تصوف کو قریب بھی
ہیں پھٹکنے دیتے، مزید برآں انہوں نے تفسیر مظہری میں صوفیانہ معارف و نکات کو ہر جگہ نمایاں طور پر
یش کیا ہے۔ تاکہ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کی بھی اصلاح ہوسکے، وہ اپنی تفسیر میں اصلاح کے نقطہ
ظر سے ہی فقرا کے دامن سے وابستہ ہونے کو فرض و واجب قرار دیتے ہیں۔

عملی زندگی میں "روزگار" کے طور پر انہوں نے منصب قضا کو اختیار فرمایا۔ حالانکہ بظاہر دنیوی
کاموں اور سرکاری مناصب میں انہماک و صوفیاء کے منصب کے خلاف ہے۔ لیکن جیسا کہ راقم
الحروف نے اپنے تحقیقی مطالعے میں ثابت کیا ہے کہ قاضی صاحب کا عہدہ قضا کو قبول کرنا اور کم و
یش نصف صدی تک اس کے ذریعے اہل علاقہ کی خدمت کرنا اپنے استاد و مربی کے مشورہ کے عین
مطابق تھا۔ اور قاضی صاحب کا یہ اقدام امام العصر کی سیاسی پالیسی کا ہی حصہ ہے۔ کیوں کہ وہ دور
طوائف الملوکی اور انتشار کا دور تھا۔ غیر مسلم طاقتیں اپنی اپنی جگہ منظم ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں

شاگردوں اور فیض یافتگان کو مختلف علاقوں، مختلف لشکروں اور مختلف دفاتر میں مامور فرمایا۔ ان
ان شاگردوں کے ذریعے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ لوگوں کو صالح قیادت میسر آئی اور دوسرا فائدہ یہ ہوا
ان افراد کے ذریعے مختلف عمال اور گورنروں کے ساتھ قریبی رابطہ اور تعلق پیدا ہوا۔ ان دو
بزرگوں نے اس تعلق کو مسلمانوں کی تنظیم اور وحدت پیدا کرنے کے لئے بھرپور طریقے سے استعمال
۔ چنانچہ بطور قاضی، قاضی صاحب کو، دہلی، پانی پت اور بعض دیگر نواحی علاقوں میں کام کرنے
موقع ملا۔ اور وہ غازی الدین عماد الملک (موجود ١٧٥٩ء)، نواب نجیب الدولہ (م ١١٨٤ھ ر ١٧٧٠ء
)، نواب افضل الدولہ (برادر نواب نجیب الدولہ) نواب ضابطہ خان (م ١١٩٩ھ ر ١٧٨٤ء)، نوا
ابوالقاسم (م ١٧٧٦ء) ملا رحیم داد روہیلہ اور نواب مہرالدولہ کے ساتھ منسلک رہ کر کام کرتے ر
۔ یہ تمام لوگ وہ ہیں جو اس زمانے کی مسلم سیاست کے اہم ستون تھے۔ اور جیسا کہ تاریخی شہا
سے ثابت ہے کہ ان میں سے چند ایک ایسے ہیں جن سے امام العصر شاہ ولی اللہ نے بھی ہندوستان
مسلم دنیا کو بچانے کا کام لیا۔"

جب امام العصر کے ایما پر ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹہ طاقت کو ہمیشہ کے لئے چلا
بلامبالغہ اس میدان میں لاکھوں مرہٹے کام آئے، اس وقت بھی قاضی صاحب پانی پت میں موجود
اور علاقے کے حاکم تھے۔ قاضی صاحب کی انہی خدمات کے پیش نظر ان کو پانی پت کا قلعہ دار بنا
نے بھی تجویز ہوئی۔ حضرت مظہر جانجاناں چاہتے تھے کہ قاضی صاحب یہ عہدہ قبول کرلیں۔ لیکن قا
صاحب نے اس کو اپنی ذات کے لئے پسند نہ فرمایا۔ الغرض قاضی صاحب کا یہ عہدہ بھی ان بزرگ
کی منشا کے عین مطابق تھا اور ان کی وجہ سے علاقے میں ایسا امن و امان دیکھنے میں آیا جو اس
میں کسی جگہ دیکھنے میں نہ آیا۔ مولوی نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں:

فقیر کاتب گوید کہ ایں چنیں اجرای و نفاذ احکام شریعت از برکت وجود شریف ایشاں کہ در قصبہ پانی
پ باوجود غلبہ کفار مرہٹہ موجود است در ممالک دیگر اسلام بالفعل یافتہ نمیشود۔

فقیر کاتب یہ کہتا ہے کہ ان کی وجہ سے قصبہ پانی پت میں احکام شریعت کا نفاذ باوجود کفار مرہٹہ
کی فیصلہ کے ہوتے ہوئے ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ فی الوقت دوسرے کسی اسلامی ملک میں بھی
نفاذ شریعت موجود نہیں ہے۔

(الحق، جولائی ١٣

سید مصطفیٰ علی بریلوی

پروفیسر پنڈت حبیب الرحمٰن

پنڈت حبیب الرحمٰن ضلع کھیری اودھ کے رہنے والے۔ عربی، فارسی، اردو کے فاضل۔ سنسکرت کے عالم اور بہار اینڈ اڑیسہ سنسکرت ایسوسی ایشن آرا (بہار بھارت) سے شاستری کی سند حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۵۶ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سنسکرت کے لیکچرر رہے۔

آپ کی دو کتابیں بہت مقبول ہوئیں جن کے نام — فلسفۂ انبساط مطبوعہ مسلم یونیورسٹی ۱۹۳۰ء (شاعری و ڈرامہ سے متعلق سنسکرت کی اصطلاحات پر فلسفیانہ بحث) اور — ایش اپنشد کی تفسیر — تتو پرکاش۔

ہندوستان کے قدیم براہمین دور کے عالم ڈاکٹر بھگوان داس نے پنڈت حبیب الرحمٰن کی آخر الذکر کتاب پر اظہار رائے کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ کی لامحدود علمیت پر تعجب ہوا، فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی چار مشکل زبانوں پر آپ کو ملکہ ہے"

انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز میں پنڈت جی کی تقریر پر اخبار ہندوستان ٹائمز دہلی نے اپنی اشاعت جولائی ۱۸ میں لکھا کہ:

"حبیب الرحمٰن شاستری نے ان کتابوں کی روشنی میں کچھ تخلیقی نظریات پیش کر کے بعض مشہور پنڈتوں کے مقابل میدان میں آگئے ہیں۔"

پنڈت حبیب الرحمٰن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شدھی سنگھٹن کی تحریک کے زمانہ میں متعدد مواقع پر جلسے، اجتماعات میں غیر مسلم پنڈتوں کو علمی انداز میں مغلوب کیا۔ مزید تفصیلات کے واسطے ملاحظہ کیجئے کتابچہ "کلام الٰہی اپنے خطوط کے آئینے میں" مرتبہ جناب حبیب الرحمٰن۔

پنڈت حبیب الرحمٰن کی توجہ سے درجنوں سنسکرت کے عالم پیدا ہوئے۔ جن میں قاری بشیر الدین پنڈت بدایونی ثم شاہجہاں پوری نے بڑا نام پیدا کیا۔

العلم کراچی جولائی تا ستمبر ۹۳ء

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

پچاس سال قبل حیدرآباد میں اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سشن

نمائندہ شخصیتوں کی سرپرستی اور وابستگی

پچاس سال قبل نومبر ۱۹۴۳ء میں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سشن شہر حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا۔ اس سشن کے بارے میں اسٹیٹ آرکائیوز سے اہم اور کارآمد مواد دستیاب ہوا ہے جس میں سشن کی تفصیلی روئداد یعنی راز کی رپورٹ بھی شامل ہے۔ اس سے ایک سال قبل بھی اس نوعیت کے کنونشن کا ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو انعقاد عمل میں آ چکا تھا لیکن اس میں شرکا کی تعداد کم تھی۔ صدر استقبالیہ کے شریک نہ ہونے کی وجہ سے خطبۂ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت ملتوی کر دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ریاست کی کوئی اہم اور ممتاز شخصیت اس میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ نومبر ۱۹۴۳ء میں منعقد ہونے والے سشن کو آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سشن کہا گیا۔ آرکائیوز سے دستیاب شدہ مواد کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ پچاس سال قبل حیدرآباد کے باشعور نوجوان کن رجحانات کے حامل تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے حیدرآباد میں نئی نسل کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے والی شخصیتیں کون سی تھیں۔ اس زمانے کے حالات کیا تھے اور ان کی جانب طلبا اور نوجوانوں کا رویہ کیا تھا؟ اس بات سے بھی آگاہی ہوتی ہے کہ تعلیم یافتہ اور زیر تعلیم نئی نسل پر بائیں بازو کے خیالات کی چھاپ گہری تھی جو چند سال بعد نمایاں طور پر ابھری۔ اس کے علاوہ حکومت وقت کی جانب سے تحریر و تقریر کی آزادیوں اور دیگر بنیادی حقوق پر جس قسم کی تحدیدات اس زمانہ میں موجود تھیں اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کے پہلے سشن کے راز کی رپورٹ جسے اس وقت کے کوتوال بلدہ حیدرآباد رحمت یار جنگ نے معتمد تعلیمات و امور عامہ کو پیش کی تھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے نہ صرف منعقدہ کنونشن کی تفصیلات منظر عام پر آتی ہیں بلکہ حیدرآباد میں طلبا کی ابتدائی سیاسی سرگرمیوں کا ایک دھندلا خاکہ بھی ابھر آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ طلبا کی سرگرمیوں سے حیدرآباد کی چند نامور شخصیتوں کی دلچسپی اور تعلق کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں سے اکثر نے کل ہند یا بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں جیسے سروجنی نائیڈو، پدمجا نائیڈو، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید عبداللطیف، ڈاکٹر البشر، ناظمہ ثریا، علی اختر، اکبر وفاقانی، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، صاحب زادہ میکش اور سلیمان اریب وغیرہ۔

کوتوال بلدہ حیدرآباد کے راز کی رپورٹ کے مطابق سشن کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں:

آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سیشن ، آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین کے زیر اہتمام خانگی طور پر ۱۰ تا ۱۲ نومبر ۱۹۴۳ء کو منعقد ہوا ۔ تقریباً تین ہزار طلبا اور دیگر افراد کو دعوت نامے جاری کیے گئے تھے ۔ لیکن شرکت کرنے والوں کی تعداد حوصلہ افزا نہیں تھی اور کسی بھی نشست میں چار سو سے زیادہ طلبا موجود نہیں تھے ۔ یہ سیشن حسب ذیل پروگرام پر مشتمل تھا ۔

۱ ۔ اصل اجلاس (Paper Session) بصدارت قاضی عبدالغفار ایڈیٹر پیام

۲ ۔ مشاعرہ زیر صدارت سید محمد اکبر وفا قانی

۳ ۔ کلچرل کانفرنس سیشن کی آخری نشست بصدارت ڈاکٹر سید عبداللطیف ۔

اصل اجلاس (Proper Session) کا آغاز سینٹ جارجس جمنازیم میں ۱۲ نومبر کو نو بجے پرچم کشائی کی تقریب سے ہوا ۔ مس پدمجا نائیڈو نے ایک بڑا سرخ پرچم سالہا طلبا کے اجتماع میں لہرایا جس پر آزادی ، امن اور ترقی کے الفاظ تحریر تھے ۔ پرچم کشائی کے بعد پدمجا نائیڈو نے مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے طلبا سے اپنے آپ کو اس رول کے لیے تیار کرنے کے لیے کہا جو انھیں مستقبل میں ادا کرنا ہے ۔ انھوں نے موجودہ نازک دور میں دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے باخبر رہنے کی تاکید کی لیکن عملی سیاست میں داخل نہ ہونے کا مشورہ دیا ۔ اس کے بعد مسز سروجنی نائیڈو کا پیام پڑھ کر سنایا گیا ۔ مسز سروجنی نائیڈو نے اپنے پیام میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا ہے کہ وہ امور جو طلبا سے متعلق ہیں ان کے علاوہ ایسے بھی امور جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً غذائی مسئلہ وغیرہ اس سیشن کے پروگرام میں شامل کیے گئے ہیں ۔ اپنے پیام کے آخر میں انھوں نے طلبا کو ان کے مختلف فرائض کی جانب ان الفاظ میں توجہ دلائی ۔ اگرچہ طلبا کی پہلی ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ تعلیم کے لیے وقف کر دیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی تعلیم کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے کہ طلبا دنیا کی تاریخ پر اثر انداز ہونے والی تحریکوں میں بھی اپنی ذہانت کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ وسیع تر دلچسپی لیں اور ترقی کے متعلق تمام عصری خیالات و نظریات سے بھی آگاہ رہیں ۔ ریاست حیدرآباد کے نوجوانوں کا وقت اور حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ مشن یہ بھی ہوگا کہ وہ ریاست کے تمام طبقات میں جو ریاست کے جزو لاینفک ہیں اتحاد و اشتراک باہم کو فروغ دیں ۔

کوکب قدسی ، ایل ایل ۔ بی کے طالب علم اور صدر نشین استقبالیہ کمیٹی نے ایک طویل خطبۂ استقبالیہ پڑھا جس میں انھوں نے وہ تمام باتیں کہیں جو کہ کمیونسٹ طلبا جلسہ عام کو مخاطب کرنے کا موقع ملنے پر بیان کرتے ہیں مثلاً فسطائیت کی مخالفت ، ہندوستان کے خلاف جاپانی جارحیت کی مزاحمت ، کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت کی حمایت ، قومی حکومت کا قیام ، غذا کے مسئلے کا حل وغیرہ ۔ اپنے خطبے کے آخر میں کوکب قدسی نے حیدرآباد کے تعلیمی نظام پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ نظام صرف دفتر کے اہلکار پیدا کر رہا ہے ۔ اس سے اچھے محب وطن شہری پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو کہ قوم کے لیے اثاثہ ہوتے ہیں ۔

قاضی عبدالغفار ایڈیٹر پیام کے مختصر صدارتی خطبہ کی نوعیت کم و بیش پدرانہ نصیحت کی تھی جس میں طلبا کو کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے کی ہدایت دی گئی تھی ۔ انھوں نے طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ پہلے اپنی پڑھائی کی جانب توجہ دیں اور اس کے بعد بچے ہوئے وقت کو تعلیم کی اشاعت اور دیہی بازتعمیری کاموں کے لیے صرف کریں ۔ انھوں نے کہا کہ طلبا کو یقیناً سیاسیات کا مطالعہ کرنا چاہیے لیکن سیاست میں سرگرمیوں کے ساتھ حصہ لینے کے خلاف انھوں نے سخت انتباہ دیا اور کہا کہ طلبا اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں ۔ آخر میں انھوں نے طلبا کو غیر ذمہ دار سیاسی قائدین سے جو طلبا کی قوت اور جوش و جذبہ کا استعمال کر کے اپنے مقاصد

اس کے بعد اورنگ آباد، نانڈیڑ، پربھنی، ورنگل اور گلبرگہ کے نمائندوں نے اپنی اپنی شاخوں کی سالانہ رپورٹیں پڑھیں۔ ان رپورٹوں کی پیشکشی کے بعد راج بہادر گوڑ، صدر کامریڈ اسوسی ایشن اور آل اسٹوڈنٹس یونین کے سرکردہ کارکن نے مرکزی یونین کی سالانہ رپورٹ سنائی۔ راج بہادر گوڑ نے اپنے خطبہ کی ابتدا میں ان حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا جن کی وجہ سے یونین کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے یونین کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اسٹوڈنٹس یونین نے اتحاد اور عمل کا پیام دیتے ہوئے طلبا کا پیام دیتے ہوئے طلب برادری کے جمود کو توڑا، طلبا کو ان کے اہم حقوق اور فرائض کا احساس دلایا اس کے علاوہ یونین نے طلبا کو اپنے مسائل سے خود نمٹنے اور مشکلات میں ٹھوس بنیادوں پر متحد اور منظم ہونے پر زور دیا۔ مختصر یہ کہ آزادی، امن اور ترقی کے پرچم تلے یونین نے حیدرآباد کی طلبا برادری کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔

اس کے بعد راج بہادر گوڑ نے اضلاع میں قائم کی گئی شاخوں کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ مرکزی یونین کی جانب سے طلبا کی شکایات دور کرنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے تھے اس پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی۔ بعد ازاں انھوں نے یونین کی دیگر سرگرمیوں جیسے کتب خانوں، مطالعہ گھروں اور فرسٹ ایڈ جماعتوں کے انعقاد کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ راج بہادر گوڑ نے بتایا کہ یونین کی سرگرمیوں میں سب سے اہم سرگرمی دیواری اخبار کا اجرا ہے۔ اس اخبار کے اجرا کا مقصد یونین کی سرگرمیوں کی تفصیلات شائع کرنے کے علاوہ موجودہ سیاسی، معاشی، سائنسی اور سماجی مسائل کو مختصر اور سریع الفہم انداز میں طلبا کی معلومات کے لیے پیش کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یونین کے اراکین کو چاہیے کہ وہ یونین کی سرگرمیوں کے تعلق سے جو بھی رائے دینا چاہتے ہوں یا تنقید کرنا چاہتے ہوں دیواری اخبار پر تحریر کردیں۔

اس کے بعد صبح کی نشست اختتام کو پہنچی۔ سہ پہر کی نشست میں حسب ذیل چار قراردادیں متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔

۱) پہلی قرارداد میں طلبا سے آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین میں شامل ہونے پر زور دیتے ہوئے کہا گیا کہ ایک غیر سیاسی اور ایک غیر طبقاتی جماعت ہے اور جو طلبا کے حقوق کے لیے جد و جہد کر رہی ہے۔

۲) دوسری قرارداد میں طلبا سے اپنے مدرسوں میں یونین تشکیل دینے کی اپیل کی گئی اور ارباب ذمہ دار سے درخواست کی گئی کہ وہ طلبا کے یونین تشکیل دینے کے حق کو تسلیم کریں۔

۳۔ تیسری قرارداد میں جامعہ عثمانیہ کے ناقص نتائج پر احتجاج کرتے ہوئے جامعہ کے تمام امتحانات سال میں دو مرتبہ منعقد کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

۴۔ چوتھی قرارداد میں جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کے بارے میں ضابطہ اخلاق کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ قراردادوں کے مکمل متن کا انگریزی ترجمہ کوتوال بلدہ حیدرآباد کی رپورٹ کے ساتھ منسلک کیا گیا۔

۱۳ر نومبر کو ریڈی ہاسٹل میں مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت سید محمد اکبر وفا قانی نے کی۔ اس مشاعرے میں مخدوم محی الدین، علی اختر، کامریڈ سلیمان (سلیمان اریب) صاحبزادہ محمد علی خاں میکش اور دوسرے شعرا نے کلام سنایا۔

تیسری اور آخری نشست ۱۴ر نومبر کو ریڈی ہاسٹل میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللطیف نے کی۔ حاضرین کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی۔ ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا، لیکچرر عثمانیہ یونیورسٹی نے ہندوستانی تہذیب کے عنوان پر تقریر کی۔ اس نشست میں یہی ایک تقریر ہوئی۔ مقرر نے ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو مسلم مسئلہ موجودہ دور کے خود غرض قائدین کے دماغ کی اختراع ہے۔ اگر یہ کوئی بنیادی سوال ہوتا تو اس وقت ہی اٹھتا جب کہ ہندوستان پر مسلمان حکمراں تھے اور ان کی رعایا میں ہندو

اکثریت میں تھے۔ مقررنے پاکستان کے مطالبہ کا بھی حوالہ دیا۔ انھوں نے اس مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان اور ہندو تہذیبی اکائیاں نہیں ہیں کہ ان کے لیے علاحدہ ہندوستان اور پاکستان بنایا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنے صدارتی کلمات میں پاکستان کے تعلق سے ڈاکٹر ثریا کے خیالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر لطیف کی پاکستان اسکیم کا مقصد ہندوستان کے حصے بخرے کرنا نہیں۔ اس طرح ڈاکٹر ثریا کے اعتراضات بے بنیاد ہیں۔

رپورٹ کے آخر میں کوتوال بلدہ حیدرآباد نے لکھا کہ یہ بات تعجب خیز تھی کہ سامعین کی اکثریت نے پاکستان کے تعلق سے ڈاکٹر ثریا کے نقطۂ نظر کی تائید کی حالاں کہ سامعین میں بیشتر نیشنلسٹ تھے اور کمیونسٹوں نے مختلف دیگر موقعوں پر مطالبۂ پاکستان کی تائید کا موقف اختیار کیا تھا۔

کوتوال بلدہ حیدرآباد کی مذکورۂ بالا رپورٹ وصول ہونے پر حکومت کی جانب سے جو کارروائی کی گئی تھی اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

علی یاور جنگ معتمد تعلیمات نے ایک راز کا مراسلہ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۳ء سید محمد اعظم ناظم تعلیمات کو روانہ کیا۔ جس میں انھوں نے آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن نام کی تنظیم کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی خواہش کی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دریافت کیا کہ آیا اس تنظیم کو مسلمہ حیثیت حاصل ہے اور کیا محکمۂ تعلیمات کے اسٹاف کو اس تنظیم کی سرگرمیوں میں شرکت اور جلسوں کو مخاطب کرنے کی اجازت حاصل ہے؟

سید محمد اعظم ناظم تعلیمات نے اپنے مراسلہ مورخہ ۳ جنوری ۱۹۴۴ء میں جواباً تحریر کیا کہ ان کے ہاں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کے بارے میں کوئی معلومات موجود نہیں ہیں لیکن یہ آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین ہی ہے تو اس کی پیشتر سرگرمیوں کے بارے میں کافی معلومات دستیاب ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایک سابقہ مراسلے کا حوالہ دیا اور طلبا کو سیاسی سرگرمیوں سے باز رکھنے کے لیے جو سرکیولر نظامت تعلیمات کی جانب سے جاری کیا گیا تھا اس کی اس کی ایک نقل اپنے مراسلے کے ساتھ منسلک کی اور یہ لکھا کہ محکمۂ تعلیمات کے اساتذہ اور عہدیدار اس تنظیم کی سرگرمیوں میں نہ تو حصہ لے سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے جلسوں کو خطاب کرسکتے ہیں۔

علی یاور جنگ معتمد تعلیمات نے ایک اور راز کا مراسلہ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۴ء قاضی محمد حسین پرو وائس چانسلر کو لکھا جس میں انھوں نے تحریر کیا کہ حیدرآباد میں طلبہ کی چند غیر مسلمہ اور قابل اعتراض تنظیمیں موجود ہیں۔ جیسے آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن۔ اس محکمہ کو مصدقہ حلقوں سے ملنے والی رپورٹوں سے اس بات کا علم ہوا ہے کہ آپ کے ایک اسٹاف ممبر ڈاکٹر ثریا نے حال ہی میں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کے ایک جلسہ میں شرکت کی تھی۔ چوں کہ یہ بات مناسب نہیں ہے اس لیے مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ آپ ڈاکٹر ثریا سے ذاتی طور پر یہ بات کہیں اور کسی میٹنگ میں دیگر اسٹاف ممبران سے بھی کہہ دیں۔ اس بارے میں سرکیولر جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قاضی محمد حسین پرو وائس چانسلر نے اپنے جوابی مراسلہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۴ء میں یہ اطلاع دی کہ اس بارے میں وہ ڈاکٹر ثریا سے گفتگو کرچکے ہیں اور اس گفتگو کے دوران انھیں ڈاکٹر ثریا نے بتایا کہ تقریباً دو ماہ قبل چند طلبا تین بار ان کے پاس یہ درخواست لے کر آئے تھے کہ وہ کسی بھی موضوع پر سالانہ میٹنگ میں تقریر کریں۔ انھوں نے یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ ان کی اسوسی ایشن کون سی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں۔ وہ آئندہ احتیاط برتیں گے۔ پرو وائس چانسلر نے یہ بھی لکھا کہ چوں کہ اس وقت جامعہ میں امتحانات ہورہے ہیں اس لیے اسٹاف ممبران کی میٹنگ طلب کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ بعد میں جب موقع ملے گا تو اسٹاف کو اس بارے میں مطلع کردیا جائے گا۔

سیاست (حیدرآباد)، ستمبر ۹۳ء

سہا مجددی

دیکھا خرامِ ناز سہا جا رہے ہیں وہ
ہستی کو سوئے عالمِ بالا لیے ہوئے

سہا صاحب نے یہ شعر کہا ہے جس برو قامت کے خرامِ ناز سے متاثر ہو کر کہا ہو۔ صادق انھیں پر آتا نہ۔ اس کا قد مشکل سے ساڑھے تین فٹ ہو گا۔ لیکن اس کوتاہ قامتی کے ساتھ جب وہ اپنی شاعرانہ فرتحیں لیے چلتے تو نظر آتا کہ ہستی بلندی کی طرف پرواز کر رہی ہے۔

سید ممتاز احمد سہا جنھیں دنیائے ادب نے احترام سے ہمیشہ مولانا سہا کہہ کر یاد کیا۔ ۹ فروری [illegible] کو بھوپال میں پیدا ہوئے اور زندگی کے کم و بیش پچپن سالہ خوش و ناخوش گزار کر اسی خاک کا پیوند ہو گئے۔

مولانا سہا کے شعر نے روئے زمین قدم لیا ہو یا نہ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اٹھارہ بیس سال تک ان کے اشعار کا یا نکھین کمان ابروئے غزل بنا رہا۔ صاف محسوس دے رہا تھا کہ حسرت، فانی، اصغر، جگر اور یگانہ کے ساتھ ایک اور منفرد آواز ایوانِ غزل میں گونج رہی ہے لیکن جس تیزی سے یہ آواز بلند ہوئی تھی اسی سرعت سے کھو گئی اور مولانا سہا کا نام مخصوص ادبی حلقوں کے سوا ادب دوستوں کے ذہن سے اتر گیا۔ اس فراموش کاری کا الزام زمانے کی عام روش پر بھی ہے اور خود مولانا کی شانِ بے نیازی پر بھی کہ وہ اپنی قدر و قیمت سے بے خبر تھے۔ لیکن ان کا خمیر بھوپال کی مٹی سے اٹھا تھا جس کا خاصہ یہ ہے

کہ اس میں نمود و نمائش کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی۔ مولانا نے نہ اپنے دیوان کی اشاعت سے دلچسپی لی نہ پابندی سے ادبی رسائل کے ذریعے اپنے شعری وزن و وقار کا پڑھنے والوں کو احساس دلاتے رہے تاہم مولانا کا جس قدر کلام وقتاً فوقتاً ادبی جرائد میں شائع ہو چکا تھا اور خاصے کی چیز سمجھا جاتا تھا اس کے پیشِ نظر اربابِ نقد و نظر سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ مولانا سہا کے ادبی مرتبہ کا تعین کرنے میں غفلت سے کام نہ لیں گے۔ لیکن

کھلا سہا کو بھی تری بیداد ناز نے
کن خوبیوں کا شخص کہ پیدا نہ ہو کہیں

ادبی شخصیات کے ذکر میں مولانا سہا کی پست قدی ایسا واقعہ ہے جس کی نظیر ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ اتنے چھوٹے سے قد کا انسان اتنے بڑے ذہن کا مالک ہو

از اختر سعید خاں

سکتا ہے اس کا اندازہ مولانا سہا کو دیکھے اور ملے بغیر ممکن نہ تھا۔ مولانا غیر معمولی طور پر پست قد تھے لیکن بدوضع نہ تھے ان کے اعضائے جسمانی ان کے قد کے لحاظ سے حد درجہ متناسب تھے۔ ان کے چھریرے بدن، کھلتے ہوئے گندمی رنگ اور چہرے پر شوخی و متانت کی آمیزش نے انھیں کچھ ایسا بنا دیا تھا

کہ دیکھو تو دیکھتے گئے تھے۔ ان کی کوتاہ قامتی پر پیار آتا تھا جسے کوئی نہ چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قد آور سے قد آور شخصیتوں کی محفل میں بھی سہا کی جلوہ گری ماند نہیں پڑی۔

وہ سرو قامت حسینوں کی انجمن میں بھی بار یاب رہے اور دراز قامت ادیبوں سے بھی لوہا لیتے رہے لیکن ان کی پست قدی کو نہ تمسخر کا نشانہ بنایا گیا نہ طنز و تضحیک کا۔

مولانا سہا کے والد سید یحییٰ حسن صاحب شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال کے عہد میں نائب ناظم (ڈپٹی کلکٹر) کے عہدے پر فائز تھے۔ یحییٰ حسن صاحب کے بڑے بھائی سید محمود صاحب جو فن تجوید و قرأت میں کامل تھے بھوپال میں ملازم تھے۔ سید محمود صاحب کے پوتے رشید الحسن صاحب حال ہی میں آئی۔ سی۔۔۔۔۔۔۔ کے عہدے سے سبکدوش ہو کر بھوپال میں سکونت پذیر ہیں اور اس طرح مولانا سہا کا تعلق بھوپال سے قائم ہے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھوپال میں ہوئی۔ وہ مدرسۂ سلیمانیہ اور جہانگیریہ اسکول کے طالب علم رہے لیکن [illegible] میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو وہ بلند شہر چلے گئے جہاں ان کا ننھیال تھا۔ بلند شہر کے قیام میں انھوں نے فارسی اور عربی کا درس لیا۔ پھر علی گڑھ کالج میں داخل ہو گئے۔ کالج میں مولانا کی تقریر کی بڑی دھوم تھی اور اسی خصوصیت کی بنا پر انھیں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت

...انہیں ان کی طرف سے رنگون بھیجا گیا۔ ان کی ...کے پیش نظر نواب وقار الملک نے ان کا ... مقرر کر دیا تھا۔ مولانا سہا نے علی گڑھ کالج میں ...انٹرنس تک تعلیم حاصل کی۔

۱۹۲۱ء میں بھوپال آگئے اور دیوان غالب کی شرح مطالب الغالب لکھی جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس شرح میں مولانا نے اپنے ذہن کی رسائی سے غالب کے اشعار کے کچھ ایسے مطالب بیان کیے اور کچھ ایسے معانی تلاش کیے جن معانی اور مطالب تک غالب کے شارحین کی نظر نہیں پہنچی تھی۔ مولانا سہا کے بیان کردہ مطلب سے اتفاق کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن ان کی ذہانت اور طباعی کا ضرور قائل ہونا پڑتا ہے۔ مطالب الغالب کا ایک زمانے میں بڑا شہرہ تھا اور ادبی دنیا میں مولانا سہا کا نام ادب و احترام سے لیا جاتا تھا۔ غالبیات کے مباحث میں اس شرح کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

۱۹۳۲ء میں مولانا سہا حکیم احمد شجاع کی دعوت پر لاہور چلے گئے اور ماہنامہ ہزار داستان سے منسلک ہو گئے۔ مطالب الغالب کی اشاعت سے پہلے مولانا سہا کی غزل کی انفرادیت نے انہیں ادبی حلقوں میں امتیازی حیثیت عطا کر دی تھی اور صاحبان فکر و نظر ان کے کلام کو توجہ سے پڑھتے تھے۔ والد مرحوم (حامد سعید خاں صاحب حامد) فرماتے تھے کہ انہیں لاہور میں ایک بار مولانا سہا کے ساتھ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

علامہ نے دوران گفتگو فرمایا: "مولانا جب ہزار داستان آتا ہے تو پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ کہیں سہا کی غزل ہے یا نہیں۔" ہزار داستان سے تعلق کے کچھ دن بعد مولانا سہا ریاست خیرپور میں نواب کے پرائیویٹ سیکریٹری ہو گئے۔ نواب خیرپور خود بھی شاعر تھے اور مولانا کی بے حد قدر کرتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی فارغ البالی اور مکمل آسودگی کا تھا۔ والد مرحوم کا کہنا ہے کہ "جن دنوں مولانا سہا خیرپور میں تھے مجھے ایک خاص امر میں نواب زادہ سعید الظفر خان صاحب مرحوم (نواب صاحب بھوپال کے بھتیجے) کی جانب سے نواب خیرپور کے پاس بھیجا گیا۔ مجھے وہاں کئی دن ریاست کا مہمان رہنا پڑا۔ مولانا سہا ایک شاندار کوٹھی میں جس کا نام انہوں نے لطافت رکھا تھا مقیم تھے اور رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے۔" یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا کی سفارش پر حفیظ جالندھری خیرپور کے شاعر دربار مقرر ہوئے تھے۔ لیکن اپنی نظم "رقاصہ" کی بنا پر معتوب ہوئے اور انہیں خیرپور چھوڑنا پڑا۔ مولانا ۱۹۳۵ء تک خیرپور میں رہے پھر کسی وجہ سے لاہور واپس آ کر ادبی رسائل خصوصاً "نیرنگ خیال" سے منسلک ہو گئے۔ وہ ۱۹۳۹ء میں پھر بھوپال آ گئے۔

ان دنوں بھوپال میں ملکی اور غیر ملکی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اہل بھوپال کا مطالبہ تھا کہ انہیں سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھا جاتا ہے اور غیر بھوپالیوں کو ان پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اہل بھوپال کا حق ہے کہ وہ ملازمتوں اور عہدوں پر فائز ہوں۔ مولانا سہا نے بھی ایک بھوپالی ہونے کے رشتے سے اس تحریک کا ساتھ دیا لیکن حکومت سے تصادم کا نتیجہ ان کی معاشی پریشانیوں کے سوا کچھ نہ نکلا اور وہ بھوپال کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ چلے گئے جہاں کسی بیمہ کمپنی میں آرگنائزر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ وہ لال باغ میں رہتے تھے۔ اس عرصے میں مولانا کی مصروفیات اور ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی یادوں سے کچھ سراغ ملتا ہے لیکن وہ ان کی زندگی کی ایک جھلک ہے اور بس۔

مولانا کی زندگی میں لاہور اور لکھنؤ کا قیام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ لاہور میں مولانا کے ادبی مشاغل اور وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ان کے تعلقات کا تو کسی حد تک پتہ چلتا ہے لیکن لکھنؤ میں ایک طویل عرصہ تک قیام کے باوجود جوش صاحب کے سوا نہ ان کے کسی ادبی رفیق کا پتہ چلتا۔ اس کی تخلیقی سرگرمیوں کا وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوران مولانا نے کون کون سی غزلیں کہیں اور دبستان لکھنؤ سے کس حد تک اثر قبول کیا۔

ستمبر ۱۹۴۰ء تک مولانا بھوپال سے بے تعلق رہے لیکن جنوری ۱۹۴۱ء کے ایک کل ہند مشاعرے میں شرکت کے لیے وہ آ گئے۔ یہی وہ مشاعرہ ہے جس میں حضرت جوش، فانی، جگر، سیماب اور دوسرے چوٹی کے شعرا شریک تھے۔ مشاعرے کا ہنگامہ تو چند روز میں ختم ہو گیا لیکن مولانا سہا کے قدموں کو سرزمین وطن نے مضبوطی سے پکڑ لیا انہوں نے دوبارہ بھوپال میں سکونت اختیار کر لی اور کچھ عرصہ بعد بھوپال کے ایک قدیم گھرانے میں شادی کر لی۔ مولانا جب بھوپال میں پھر سے آباد ہوئے تو دوسری جنگ عظیم پورے زور پر تھی۔ ریاست کے معاشی وسائل زیادہ تر دفاع کے لیے وقف تھے۔ معاش کا سوال مولانا کے لیے پھر ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا۔

بھوپال میں جنگی قیدیوں کے کیمپ تیار ہو رہے تھے اور برطانوی سرکار کو ہر طرح کی چیزیں درکار تھیں۔ باربرداری کے لیے گاڑیاں سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مولانا کو مل گیا۔ کچھ دن اچھے گزرے لیکن وقت پر گاڑیاں سپلائی نہ کیے جا سکنے کے سبب ٹھیکہ منسوخ ہو گیا۔ مولانا نے جو سرمایہ ادھر ادھر سے فراہم کر کے اس تجارت میں لگایا تھا وہ بھی واپس نہ ہو سکا اور زندگی کے باقی دن پریشان حالی اور درماندگی کی نذر ہو گئے۔ فکر معاش اور امراض سے لڑتے لڑتے مولانا سہا ہار گئے۔

نمونیہ کے شدید حملے نے ان کی جان لے لی اور ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ایک چھوٹی سی قبر میں اپنی ساری تخیلات کو سمیٹے ہوئے سو گئے۔ کچھ ہی دنوں میں ان کی تربت کا نشان بھی مٹ گیا اور اب کسی کو نہیں معلوم کہ بھوپال کا یہ مایہ ناز شاعر کس جگہ آسودہ خاک ہے۔

میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا سہا کو پہلی بار جنوری ۱۹۴۱ء میں دیکھا تھا۔ لیکن بچپن کی خوابناک فضا کا تصور کرتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ ہر روز سہ پہر کو ایک طفل صورت شخص شیروانی پہنے کالے بالوں کی گول ٹوپی لگائے انگلیوں میں سگریٹ دبائے تانگے سے اترتا اور میرے والد کی بیٹھک میں جو رہائشی مکان کے عین مقابل تھی، چلا جاتا۔ مجھے اپنی وہ حیرت بھی یاد ہے جو اتنے چھوٹے سے آدمی کو سگریٹ پیتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ خدا جانے کس نے بتایا کہ یہ چھوٹا سا آدمی بہت بڑا شاعر ہے۔

جب میں خود کچھ بڑا ہوا تو اس بڑے شاعر کی باتیں کچھ اپنے باپ کی زبانی سنیں، کچھ ادھر ادھر سے ان کے اشعار لوگوں سے سنے، کچھ پرانے رسالوں میں پڑھے اور بچپن ہی سے ایک ذہنی رشتہ مولانا سے قائم ہو گیا۔

سن رکھا تھا کہ وہ بے حد خود پسند آدمی ہیں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، عزت نفس کا اس قدر پاس ہے کہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لیتے ہوئے نہیں ہچکچاتے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ واقعہ بہت مشہور تھا کہ ایک بار کسی اسٹیشن پر گاڑی بدلنے کے انتظار میں مولانا فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں گئے وہاں ایک انگریز میز پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ مولانا سامنے کی خالی کرسی پر بیٹھ گئے اس کے باوجود انگریز نے ٹانگیں نہیں کھینچیں۔ مولانا نے کچھ دیر تامل کیا پھر اس انگریز کے مقابل میز پر پاؤں پھیلا دیے۔

...ت حال کی تحسین ہو کر اس اگرچہ نے اپنے ...
...کے لیے تو مولانا نے بھی اپنے پاؤں کھینچ لیے۔
مولانا کی عشق بازی اور رند مشربی کے قصے بھی
...مشہور تھے۔ لیکن جب وہ ۱۹۴۲ء میں بھوپال
...بس گئے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو
...محسوس ہوا کہ مولانا اپنے ماضی سے تقریباً دست
...بردار ہو چکے ہیں۔ شاعری سے بھی بس یوں ہی سا
...تعلق رہ گیا تھا۔ میں نے انھیں ۵-۶ سال کے
...عرصے میں صرف تین یا چار مشاعروں میں شریک
...ہوتے دیکھا۔ وہ بے حد اصرار کے بعد اپنا کلام
...سناتے تھے جس میں کمتری تکلف یا تصنع کو دخل نہ
...تھا۔ انھیں شعر سنانے سے الجھن سی محسوس ہوتی
...تھی۔ ایک مشاعرے میں مولانا شریک تھے لیکن کچھ
...سنانے کے لیے تیار نہ تھے، لوگوں نے کہا کہ میں
...ان سے استدعا کروں۔ میری درخواست پر وہ مسکرا
...مسکرائے اور فرمایا:
"جنوں کی درخواست ٹھکرائی جا سکتی ہے لیکن
...جنوں کا حکم نہیں ٹالا جا سکتا۔" اس فقرے سے
...مولانا کی مزاجی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
...یہ واقعہ ہے کہ وہ اہل ناز سے بھی نیاز مندانہ
...ملتے لیکن اہل نیاز سے ناز بھی نہیں کیا۔ ان کی
...مزاجی کو غرور و تکبر سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ
...خلیق، بذلہ سنج اور بے نیاز انسان تھے۔ انھیں
...اپنی زندگی کے ابتدائی دس برسوں میں جو شہرت
...حاصل ہو گئی تھی وہ اچھے اچھے شاعروں کو ایک عمر میں
...نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن نہ وہ اپنی شاعری پر نازاں
...تھے نہ شہرت پر۔ میں نے کبھی انھیں اپنے بارے میں
...بات کرتے نہیں سنا۔ وہ ہر صاحب کمال کے مداح
...تھے۔ لیکن اپنے عہد کے بعض اہل سخن کو خاطر میں
...نہیں لاتے تھے۔ وہ چٹکلوں کے وسیلے جتاتے
...تھے۔ شاگردی استادی کی روایت سے انھیں سروکار
...نہیں تھا لیکن کوئی نو آموز ان کی توجہ سے محروم نہیں
...رہتا تھا۔ وہ مشرقی تہذیب اور شائستگی کا نمونہ تھے
...دوستوں سے مختلف احباب کی محفلوں میں ان کی
...گلکاریاں ان کی کتاب زندگی کا ایک روشن باب
...ہیں۔ مولانا کی مزاجی کیفیت کا اندازہ غالب کے اس
...شعر سے کیا جا سکتا ہے

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

...مولانا سہا صوفی نہیں تھے لیکن تصوف سے انھیں
...لگاؤ تھا اور وہ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب
...رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور اسی تعلق سے خود کو
بھی سمجھتے تھے۔ وہ سالک نہیں تھے لیکن سلوک کے رمز آشنا تھے، یہی وجہ ہے کہ عہد شباب کی رندی اور ہوسناکی کے باوصف ان کے مزاج میں ایک توازن تھا جس نے انھیں رند اور صوفی دونوں کا پسندیدہ کردار بنا دیا تھا۔

مولانا سہا اپنی آزاد منشی کے باوجود سماجی رشتوں سے منحرف نہیں تھے۔ وہ دوبار رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ان کی پہلی شادی جوانی میں ہوئی لیکن یہ رشتہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا۔ دوسری شادی اس وقت ہوئی جب وہ زندگی کے پچاس سال پورے کر چکے تھے۔ مولانا کے ہم زلف جناب غلام اللہ صاحب افسر مرحوم کے بیان کے مطابق مولانا کے پیہم اصرار پر انھوں نے اپنی سالی سے ان کا نکاح کرا دیا تھا اور اول اول مولانا اس شادی سے بے حد خوش تھے لیکن تنگ دستی اور اختلاف مزاج کے باعث آگے چل کر تعلقات میں وہ شگفتہ انگیزی باقی نہیں رہی جو ابتدا میں نظر آئی تھی۔ افسر صاحب کا کہنا تھا کہ اس عقد نے جہاں مولانا کی زندگی میں ایک خوشگوار باب کا اضافہ کیا تھا وہیں یہ شادی ان کے مصائب کا سبب بن گئی۔ مولانا کی کوئی آمدنی نہیں تھی اور وہ اس درجہ گوشہ نشیں ہو گئے تھے کہ گھر سے باہر نکلنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ضرورت مند ہونے کے باوجود ایسے مشاعروں کی شرکت کو بھی ٹال دیا کرتے تھے جن سے انھیں کافی معاوضہ ملنے کی امید ہوتی۔ افسر صاحب کہتے تھے کہ مولانا نے شادی سے پہلے فرمایا تھا کہ میری آئندہ زندگی اپنی بیوی کے لیے وقف ہوگی اور اس قول کو انھوں نے ایسا نبھایا کہ مرنے کے بعد ہی گھر سے نکلے۔ سہا صاحب نے طویل عمر نہیں پائی لیکن ان کی عمر کے پچپن سالوں میں سے صرف پانچ سال ہی ایسے نظر آتے ہیں جو انھوں نے سماجی ذمہ داریوں کے ساتھ گزارے۔ اوائل عمری کا زمانہ چھوڑ کر باقی زندگی وہ تنہا اور آزادانہ جیا کیے۔ ۱۹۲۳ء میں جب ان کی شرح دیوان غالب "مطالب الغالب" کے نام سے شائع ہوئی تو ان کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی اور ان کی علمی اور ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ریاست [illegible] کے توسل نے ان کو معاش سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن انھوں نے رہنے کے لیے گھر بار نہ مادی اسباب فراہم کیے ان کے بعد ان کے گھر سے تصویر بتاں اور حسینوں کے خطوط بھی نہ نکلے۔ بے سروسامانی جو صاحبان کمال کا ورثہ ہے اسی ورثہ کو چھوڑ کر وہ دنیا سے اٹھ گئے۔ توقع تھی کہ مولانا سہا نے کم از کم ایک ضخیم دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہوگا لیکن وہ بھی سو سوا سو غزلوں پر مشتمل نکلا۔ مولانا سے ان کے آخری ایام میں اہل کرم اور ارباب ہمم کی بے تعلقی کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ایک ناہموار معاشرے سے اس کے علاوہ توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی لیکن ان کے مرنے کے بعد اردو ادب خفا اور صاحبان نظر آنکھیں چرا گئے اور ان کی حیات و شاعری کے بارے میں کسی نے کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھوپال میں سہا صاحب کو مرزا میر خان سحر کے بعد سرآمد شعرا تسلیم کیا جاتا تھا اور ان کے اشعار زبان زد خاص و عام تھے لیکن ان کے جن اشعار کا سکہ چل رہا تھا۔ وہ ۱۹۳۰ء تک کے ہوئے تھے۔ بھوپال سے دس برس کی مکمل بے تعلقی کے بعد جب وہ بھوپال واپس آکر پھر سے بس گئے تو اس وقت بھی اہل ذوق کا ذہنی تعلق مولانا سہا کے ان ہی اشعار سے قائم تھا جو انھوں نے بھوپال سے بے تعلق ہونے سے پہلے کہے تھے ان درمیانی دس برسوں میں کہے ہوئے اشعار کی نہ مولانا سہا نے خود تشہیر کی نہ وہ عام ہوئے۔ ان کے معاصرین سے جب بھی میں نے مولانا سہا کے اشعار سنے تو وہی سنے جو اپنے لڑکپن میں ہزاروں داستان، نگار، محسن الملک یا نیرنگ خیال کے پرانے شماروں میں پڑھ چکا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا تو صحیح نہ ہوگا کہ ۱۹۳۰ء کے بعد مولانا سہا نے کچھ کہا ہی نہیں یا ان کی شاعری اپنی تاثیر اور کیفیت کھو چکی تھی کہ ان کے بعد کے اشعار لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے لیکن ہمارے لیے یہ دشواری ضرور پیدا ہو گئی کہ ہم مولانا کے ذہنی ارتقاء اور مدارج کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ امید تھی کہ ان کی بیاض سے کچھ سراغ مل سکے گا لیکن ان کا مجموعہ کلام پورے پینتیس برس پردۂ اخفا میں رہا اور جب دستیاب ہوا تو غزلوں کی ترتیب سے یہ اندازہ لگانا ناممکن ہو گیا کہ کون سی غزل عمر کی کس منزل پر کہی گئی تھی۔

مولانا سہا کے انتقال کے بعد اتنی بات تو سب کے علم میں تھی کہ ان کی بیاض ان کی بیوہ اور ہم زلف جناب افسر کی تحویل میں ہے۔ خود جناب افسر نے ۱۹۵۱ء میں بھوپال کے مقامی اخبار کے ذریعہ اپیل کی تھی کہ اگر کسی کے پاس مولانا سہا کا کلام محفوظ ہو تو ان تک پہنچا دیا جائے تاکہ اسے مولانا کے دیوان میں شامل کیا جائے۔ افسر صاحب کا خیال تھا کہ مولانا سہا کا جو کلام ان کی بیاض میں محفوظ ہے

ان کا کل سرمایہ نہیں ہے۔ اس اپیل کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور مولانا سما کے کلام میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ ہرچند کہ ۳۰ سال تک مولانا سما کے کلام کا ایک حصہ تاریکی میں پڑا رہتا' دنیائے شعر و ادب کے ساتھ ناانصافی کے مترادف تھا۔ شمس الحسن صاحب کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے کہ انہوں نے اس قیمتی سرمایہ کو تلف ہونے سے بچایا۔

مولانا سما کی بیاض کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے اشعار پر وقتاً فوقتاً نظرثانی کرتے رہتے تھے۔ ان کے بعض اشعار جس طرح لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں یا پرانے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں وہ ان کے بیاض میں کسی قدر فرق کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا کہ بعض اشعار کی جو تبدیلی الفاظ رسائل میں شائع ہو چکے ہیں یا زبان زد عوام ہیں یہاں نقل کر دی جائے تاکہ پیش نظر مجموعہ کی صحت کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ مولانا سما کا مشہور مطلع ہے

چلی ہی آتی ہیں شوق میں یاں زباں پہ بے اختیار باتیں
سکوت فرقت بھی سنترا دے بنے جو رواں دار باتیں

اس مطلع کے پہلے مصرعہ میں 'یاں' کا لفظ حذف کر کے شوق دل سے بنا دیا گیا ہے جو پہلے سے یقیناً بہتر شکل ہے۔ اسی غزل کا مقطع پہلے اس طرح شائع ہو چکا ہے اور زبانوں پر چڑھا ہوا ہے

سما رہائی ہے اپنی ہستی' سما خیالی ہے اپنی دنیا
لگائے یاد خرام کو کر سنائے تصویر یار باتیں

اس مقطع کے پہلے مصرعہ کی ترتیب بدل کر اسے یوں کر دیا گیا ہے

سما خیالی ہے اپنی ہستی سما رہائی ہے اپنی دنیا' اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ بدلی ہوئی شکل سے شعری معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

ایک اور شعر اس طرح زبان زد ہے

کچھ نہ پاؤں سے تو دامن پہ چڑھے ہاتھ
صورت ہے جو قاتل کی تو اک نقش پہ جبیں اور

اسے مطلع کی شکل دے دی گئی ہے جو ابتدائی شکل سے کہیں بہتر ہے۔

دامن کو سما تھام کے جو کچھ میں ہے کہہ دو
بیکار دلی ہے تو بس اک نقش پہ جبیں اور

ایک دوسری غزل کا مطلع مشہور ہے

جذبہ سعی طلب اضطراب ہو گیا
تمنا کے کھیل میں دل خراب ہو گیا

پہلے مصرعہ میں جذبہ سعی طلب کے بجائے 'شوق اس قدر بڑھا دیا گیا ہے جو بہتر صورت ہے۔ ہم نے صرف نمونہ کے طور پر چند اشعار پر اکتفا کیا ہے ورنہ ترمیم و تنسیخ کا یہ سلسلہ کافی طویل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو تبدیلیاں کی گئی ہیں ان کے نتیجے میں اشعار کی صوری اور معنوی حیثیت میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔

پیش نظر مجموعہ میں غزلوں کی ترتیب وہی رکھی گئی ہے جو ماہنامہ سما کی دی ہوئی ہے' البتہ وہ غزلیں جو بعد میں دستیاب ہو گئیں ماہنامہ ... اور محسن الملک میں شائع ہو چکی تھیں ان کو آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔

مولانا سما اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی اردو رسائل سے منسلک تھے جن میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے' ان کی نثر میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے' ہرچند کہ ان کی تحریریں عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب سے پر محل ہیں لیکن افکار مطالب میں کوئی الجھاؤ نہیں پایا جاتا اور ان کا فیصلہ دو ٹوک ہوتا ہے۔

مولانا سما کا نثری سرمایہ پرانے رسائل میں محفوظ ہے' خیال تھا کہ ان کی تحریروں کو جمع کر کے کتابی شکل میں پیش کیا جائے لیکن فی الحال وہ رسالے ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ مولانا کی شرح مطالب الغالب بھی نایاب ہے' صرف ایک نسخہ سیفیہ کالج لائبریری میں محفوظ ہے۔ اکادمی کے منصوبوں میں مطالب الغالب کی دوبارہ اشاعت بھی شامل ہے' مولانا سما کی غزلیات' مضامین اور مطالب الغالب کی اشاعت کے بعد کہا جا سکے گا کہ بھوپال نے اپنے جلیل القدر فرزند کو از سر نو دریافت کر کے اپنے ادبی اثاثہ میں اضافہ کر لیا ہے۔

ہمیں اس اعتراف میں تامل نہیں ہے کہ مولانا سما کا کلام اس وقت شائع ہو رہا ہے جب زمانے کا مذاق یکسر بدل چکا ہے اور وہ محفلیں اجڑ چکی ہیں جن سے ہمارے بیشتر بزرگ شعرا کی دنیائے دل آباد تھی۔ شعری اسالیب اور موضوعات میں انقلاب آ چکا ہے۔ اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ مولانا سما کی شاعری آج بھی دلوں میں اس طرح گھر کر سکے گی جس طرح آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ان کے معاصرین کے دلوں میں گھر کر چکی تھی' یہ ٹھیک ہے کہ اچھا شعر قدیم و جدید کی حد بندیوں سے مقید نہیں کیا جا سکتا۔ ماہ و سال کی گردش اس پر اثر انداز ہو گی تاہم شعری روایوں اور عظمتوں کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب اس عہد کو سامنے رکھا جائے جس نے اسے جنم دیا۔ مولانا سما انیسویں صدی کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے تھے اور قیاس غالب ہے کہ ۱۵/۱۸ سال کی عمر میں انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا ہو گا کیونکہ ۲۰۔۲۵ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہو چکے تھے۔ یہ وہ عہد تھا جب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی کوشش کو ناکام ہوئے پچاس سال سے اوپر ہو چکے تھے اور برطانوی سامراج کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اس دھوپ میں ایک طرف ہندوستان کا زوال پذیر جاگیرداری نظام اپنے پیروں پر دم توڑ رہا تھا اور دوسری طرف وطنیت' قومیت اور جذبہ آزادی کی کرنیں ذہن و شعور کو جگمگا رہی تھیں۔

ہماری سیاسی' اصلاحی' سماجی' معاشرتی اور ادبی تحریکیں سب انیسویں صدی کے آخری پچاس سالوں اور بیسویں صدی کے آغاز کی دین ہیں۔ یہ ساری تحریکیں عہد نو کی بشارت تھیں۔ اسی دور میں سرسید کی تحریک نے اردو زبان و ادب کو ایک نیا موڑ عطا کیا اور حالی نے روایتی غزل گوئی کے خلاف آواز بلند کی۔ حالی کی صدائے احتجاج کا اپنے وقت میں خوش دلی سے استقبال کیا گیا ہو یا نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے عہد کا شعری مزاج اسی آشفتہ نوائی کا ساختہ پرداختہ ہے۔ حالی' آزاد اور ان کے متبعین کی انتہائے سعی و [illegible] بیداری کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اردو کے شعر و ادب پر غزل کی حکومت تھی اور حکومت کی باگ امیر و داغ کے ہاتھوں میں تھی حالی کی مسدس اصلاحی درس کے طور پر سماعت ادب سے پڑھی جاتی تھی اور پڑھنے والے کبھی کبھی اپنی حالت پر دو چار آنسو بھی بہا لیتے تھے لیکن وہ شاعری جس کا جادو خواص و عوام کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ امیر و داغ اور ان کے شاگردوں کی غزل تھی۔ یہ داستان عبرت ناک بھی ہے اور طویل بھی کہ غزل کی دنیا میں میر کے سوز دروں' غم' غالب کی خلاق فکر اور مومن کی نازک خیالیوں نے جو معیار قائم کیا تھا اسے چھوڑ کر رنگ داغ' امیر اور ان کے تلامذہ کے اسی رنگ تغزل پر کیوں سر دھنتے تھے جو عیش کوشی اور لذت پرستی سے عبارت تھا۔ ہمارے اس استفسار کے لیے جواب' اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ مغل سلطنت کا زوال ایک عظیم الشان تہذیب کا زوال تھا اور زوال آمادہ سماج میں مفلس انسان کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے' انہیں وہی باتیں اچھی لگتی ہیں جو سفلی جذبات کی تسکین کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ اگرچہ رات ڈھل چکی تھی لیکن

سوں سے بادہ شانہ کا خمار دور نہیں ہوا تھا۔ بابر نے ہندوستان کی حکومت حاصل کر کے یہ جیش کوش کا مرو ستانہ بلند کیا تھا لیکن اس کے جانشینوں نے سلطنت کھو کر اس کی نوائے شاعرانہ کو حرزجاں بنا لیا۔ موسیقی اور شاعری کی تمدنی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن دیوتاؤں کو وجد میں لانے والا سنگیت، نفسانی خواہشات کو بیدار کرنے والی ٹھمریوں، گجریوں اور دادروں میں بدل گیا اور شاعری تہذیب نفس کے فریضے سے دستکش ہو کر ظاہری بناؤ سنگار، عامیانہ معاملات عشق، رکیک خیالات، بتذل جذبات، رندی و ہوسناکی اور بازاری معشوق کے ناز و ادا کے لیے عام طور پر وقف ہو گئی۔ یہ تمام موضوعات غزل کا سرمایہ تھے اور غزل کا ڈنکا سارے ہندوستان میں بج رہا تھا۔

یہ کہنا پوری سچائی نہیں ہے کہ حالی صنف غزل کے مخالف تھے، ہاں یہ سچ ہے کہ حالی اور ان کے ہم نواؤں نے غزل کے اس سانچے پر پوری قوت کے ساتھ وار کیا جس سانچے میں غزل کو داغ و امیر نے ڈھال دیا تھا اور اس کا کسی حد تک نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ لیکن حقیقی مطلب براری اس وقت ہوئی جب حالات نے کروٹ لی، سوسائٹی کا مزاج بدلا۔ شعر کا مفہوم از سر نو متعین ہوا۔ اور شاعری کو زندگی کی عکاسی اور صورت گری کا فن قرار دیا گیا۔

غزل کی رگوں میں نیا خون دوڑانے کا سہرا حسرت کے سر ہے جن کی زندگی غم دوراں اور شاعری غم جاناں سے عبارت ہے۔ حسرت کی زندگی کو نہ ان کی شاعری سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے نہ شاعری کو زندگی سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ ایسی طرفہ شخصیت اردو کے شعری ادب میں کہیں اور نظر نہیں آئی۔ حسرت نے غزل کی عاشقانہ شاعری کی از سر نو تجدید کی اور اس کا دامن زندگی کے ساتھ باندھ دیا۔ یہاں حسرت کی شاعری سے بحث مقصود نہیں ہے لیکن حسرت کا نام لیے بغیر ہمارے عہد کی غزل کا تذکرہ چھیڑا ہی نہیں جا سکتا۔ حسرت کے ساتھ غزل کی نئی صورت گری میں فانی، اصغر، جگر کا نام ایک ساتھ لیے جاتے ہیں۔ ان میں ہر ایک طرز میں منفرد اور اپنے رنگ سخن کا موجد قرار دیا گیا ہے۔ ان چار ناموں کے ساتھ غزل کا ایک منفرد شاعر اور ہے جس کی شدید انفرادیت کے سبب ہیں لیکن اس کی رنگ نوائی خود اس کی شہرت و مقبولیت کو لے ڈوبی۔ میری مراد یاس یگانہ سے ہے۔ ان حضرات نے غزل کو نئی رفعتوں سے آشنا کیا، جذبات و احساسات کی تطہیر کی، حیات و کائنات پر حکیمانہ نگاہ ڈالی، حسن کی جلوہ گری اور عشق کی سرشاری کا از سر نو جائزہ لیا اور غزل کو ایک مہذب سوسائٹی کا مہذب فن بنا کر پیش کیا۔ فانی اور اصغر تو اپنے مستقل فکری میلانات کے اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ غزل کی تشکیل جدید میں ان ہی دنوں ایک اور ذہن کارفرما تھا جو ایک ربع صدی تک شعری ادب کے افق پر جلوہ گر رہنے کے بعد گمنامی کی تاریکی میں کھو گیا۔ اس شعلہ مستعجل کو تاریخ ادب مولانا سہا کے نام سے جانتی ہے۔ سہا جب ایوان غزل میں داخل ہوئے تو ان کے ایک ہاتھ میں دیوان غالب تھا اور دوسرے میں گلزار داغ۔ وہ حسرت، فانی، یگانہ اور اصغر کے کچھ بعد اور جگر سے اک ذرا پہلے آئے تھے۔ وہ حسرت کی وارداتی غزل کے معترف تھے لیکن فانی کی غم پرستی کے خلاف تھے۔ انہیں جگر کا والہانہ انداز پسند تھا لیکن اصغر کی جسمانیت سے منزہ حسن کے قائل نہ تھے۔ ان کے سامنے عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی اور حسرت موہانی کی غزل کے قابل قدر نمونے تھے لیکن وہ اپنی طرز کے خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم، وہ ہمیشہ اپنے منفرد اسلوب سے پہچانے گئے۔ سہا غزل کی کلاسیکی روایات کے پاسدار ہیں ان کے تغزل کی دنیا میں بھی محبوب کی ستم گری، اپنی مجبوری و ناکامی، رقیب کی خوش خصالی، رشک، طعن، شکوہ و شکایت اور آرزومندی سے آباد ہے لیکن بڑے رکھ رکھاؤ اور وقار کے ساتھ۔ ان کی غزل میں اسلوب کی جدت کے ساتھ نئی توانائی، وضع داری اور خود اعتمادی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ معاملات حسن و عشق میں داغ و حسرت کی طرف دیکھ لیتے ہیں لیکن جہاں انہیں بے تکلف پاتے ہیں، ان سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ وہ حسن کی ایک ایک ادا کے رازدار ہیں لیکن بڑی بڑی تحریک پر حد سے نہیں گزرتے اور دامن کو سہا تھام کے جوتی میں ہے کہ حد سے آگے نہیں بڑھتے، ان کے اشعار میں عاقلانہ دیوانگی اور جنوں پرور خود مندی کا ایسا رچاؤ ہے کہ مضمون اگر پست بھی ہو تو فکری کرشمہ نظر آنے لگتا ہے۔

چلی ہی آتی ہے شوق دل سے زباں پہ بے اختیار باتیں
سکوت نخوت بھی مسکرا دے سنے جو دیوانہ وار باتیں
ادھر طلسم حسن عالم آرا ادھر قیامت جنوں رسوا
ہوا ہے کس کس طرح سے چرچا ہزار منہ ہیں ہزار باتیں
تمہاری محفل میں رات گزری مگر خدا جانے ہم کہاں تھے
وہی تکلف آشنا نگاہیں وہی جنوں آشکار باتیں

یہ مجھیں شعر عشق کی دیوانہ مزاجی کے ثمن مر ہیں۔

مزاجی کی تصویریں اردو شاعری میں جس کثرت سے نظر آتی ہیں ان کے تصور سے بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ غزل نام ہی دیوانگی کا ہے اور جنون عشق کے لفظ سے الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن سہا کے ان اشعار میں دیوانگی کی جو فضا ہے جذبات کا جو تموج ہے اور سچائی کا جو حسن ہے اس کی مثالیں شاذ ہی نظر آئیں گی۔ سہا کے یہاں حکایت یار، گفتنی ہو تو اس، لطیف، متانت اور شکر کی سی لے ہے وہ ان کی غزل کی امتیازی خصوصیت ہے۔ محبوب سے گفتگو کا یہ پیرایہ سہا کے کسی ہم عصر کے یہاں نظر آتا ہے تو وہ حسرت ہیں، لیکن حسرت کی باتوں میں سادگی اور کبھی کبھی معصومانہ حیرت ہوتی ہے اور سہا کے یہاں ایک پختہ کار ذہن کا رچاؤ، حسرت باتیں کرتے وقت اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ایسی باتوں سے وہ کافر گراں ہو جائے گا لیکن سہا ادا شناس ہیں اور محبوب کی مزاجی کیفیت کو سامنے رکھ کر اس طرح بات کرتے ہیں کہ اپنی سی کہہ بھی جائیں اور کافر کو بدگمانی بھی نہ ہو۔

میں فریب کیا کہتا تم کو آرزو دشمن
ورنہ تم جو کرتے ہو آشنا نہیں کرتے
کوئی تم کو کیا جانے اور ہاں مقابر تم
باخدا نہیں کہتے ناخدا نہیں کرتے
ہمیں تو دل کے بہلانے سے مطلب ہو نہ ہو ایفا
کہ جا بیٹھے وعدے ہی میں آئے پھر کر جانا
تری انوائش حسن و ادا کو یاں تو کیا کہنا
مگر دنیا کو جو بہار کر دے اس قدر کیوں ہو

O☆O

تجھے کس نے کہا ہے ناشناس جور بے الفت
فقط میرا وہ ایک انداز ہے پروا نہیں جاتا

O☆O

خون اسباب وفائی کوئی تہمت نہ سہی
تم مگر کچھ تو پشیماں خفا ہو جانا

مولانا سہا غالب کے شارحین میں سے ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ انہوں نے غالب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اسی مطالعہ کا اثر ہے کہ غالب کے انداز بیاں اور اس کی پرچھائیں جا بجا ان کے اسلوب میں نظر آتی ہے اور کبھی کبھی معاملات عشق میں وہ غالب کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ وحدت وجود کے فلسفیانہ پہلو کو

بھی انہوں نے غالب کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھے اور غالب کی اڑھرتا ہوا ذرہ وسیع کائنات سے جو تعلق رہتا ہے۔ وہ غزل کے حسن و عشق کے بیان سے ہٹ کر دیکھنا نہیں چاہتے اور تصوف ان کی شاعری میں موضوعاتی نہیں ہے۔ میر کے واسطے تھوڑی سی فضا ہے۔ وہ زندگی پر غالب کی طرح نگہبانہ نگاہ نہیں اٹھاتے نہ حیات و کائنات کی گم شدہ کڑیوں کو تلاش کرتے' نہ غالب کی طرح پوچھتے کہ تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے اور یہ ہنگامہ اسے خدا کیا ہے۔ انہیں غالب کی پر شکل طرز دلبری پسند ہے اور جب وہ کہتے ہیں۔

رقیب کو بزم میں لانا کسی کو کیا امتحان کی جا
کہ ترا التفات ختم کر دی بار بار ابھی

O☆O

کرتا اسے جانے سے کہ لیجیے رہے ہاں
خدایا یہ نہ کہہ ظالم کہ وہ دشمن کا گھر کیوں ہو
محبت ہو رہا کا پاس ہو خود تم کو الفت ہو
یہ تم چاہو تو کیا کچھ ہو نہیں سکتا مگر کیوں ہو
ہو ہوا تھا' ہوا' پھر کیوں نہ جاؤں سامنے اس کے
ہوا کیا ہے جو پوچھے کی ادا سے دوستاں مجھ سے

O☆O

نہیں کو اعتبار جذب' پاس تسکین ہے اتنی
یہ نسبت دوسروں کے ظلم اب ہم پر فزوں تو ہے
وہ بزم ابھی ہے لیکن خواہش غالب ہوتی ہے
مرا غم خانۂ ویراں ہی سہی دل کو سکوں تو ہے
کرنے سے سا امیدہ زلف کہیں نہ جانے کا
نہ دوستہ ہو کے شب کو پھر واسی نالہ کریں تو ہے

O☆O

سب علم مسطور ہیں لیکن حلال چاہیے
یہ تو تیغ ہے تو بے شک پھر غم ہجراں بھی ہو

O☆O

کمال ہے ناز کی ہے ایک آزادی طبیعت کی
ستم ہم پر سہی لیکن ستم ہی کیوں نہ کیوں ہے

O☆O

کھلا سا کر بھی پھر بہار و نالہ سے
کن خوبوں کا عکس کہ پیدا نہ ہو کہیں
تو انہیں دور سے غالب کی صدا سنائی دیتی ہے۔

گیا تم سے کہ کیوں ہے غیر کے ملنے سے رسوائی
ہو گئے ہو تا گئے ہو پھر کہو کہ پاس کیوں ہو

O☆O

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں
لللہ ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے نہ
کہو کہ تم اپنے کو کھلائی درمیاں کیوں ہے

O☆O

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

O☆O

تو دوست کس کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

کیا ہے آزاد تو ستا کس کو کہتے ہیں
ہو گئے ہو تم جب تم تو مرا امتحاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

تاراج کاوش غم ہجراں ہوا' اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

ان اشعار کے حوالوں سے ہمارا مقصد محض الیہاں مضامین یا ہم مفہوم اشعار کی تلاش نہیں ہے۔ نہ ایسی سعی ناشکور سے سا کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ ممکن ہے۔ ہم نے غالب کے اس پیرایۂ بیان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے جس کی پرچھائیں سا کے اشعار پر پڑ رہی ہے اور بس۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا سا نے مسئلہ وحدت الوجود سے اپنے شعر کے لیے ایک فضائے ابعد پیدا کرلی انہوں نے غالب کے موضوعاتی وحدت وجود کو بطور کلیہ کے قبول تو کر لیا ہے اور کہیں کہیں خالص فلسفیانہ انداز میں اسے دہرا بھی گئے ہیں لیکن ان کی شاعری کا بیشتر حصہ جمالیاتی تصوف سے مزین ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

غالب کی فکری اساس ہے اور وحدت وجود کی فلسفیانہ تعبیر' یہ فکر غالب کی اہم متاع نہیں ہے۔ یہ وجود حقیقی اور کائنات موجود کے رشتہ کی توجیہ ہے جو قدیم زمانہ سے کی جاتی رہی ہے اور اہل تصوف نے اسے حرز جاں بنا لیا ہے۔ سا بھی اسی فکر کے قائل

ہیں۔ کہتے ہیں

حد ایک ہی ہے کو حسن جمال تک لے
کا سب ہیں کہ آئینے جا رہے ہیں کے

زندگی' یعنی سا حسن کا لطف نہیں
کھلا لالا ہے سرخوں کو دام میں

وہ حقیقت کے جلوہ راز کو عاشق کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ٹھہر کر سوچنے لگتے ہیں۔

دل ملنے میں پاک تھا نہ ہو کیوں
آیا ہی وہم الجھن آیا نہ کیوں

لیکن موجودات کے جمال اور اس کے ابدی رنگ کے سامنے سپر ڈال دیتے ہیں' لہاتے ہیں

بلکہ اس قدر حسن سے رنگے ہیں مظاہر کائنات اس نے ہر ایک صورت پا لی ہے مری حقیقت مجاز' یہی ہے

سا حسن کے ماورا تصور میں اپنے لطف جمال کو' تسکین نہیں پاتے وہ حسن کی جسمانیت کے طالب ہیں اور اسے سامنے بٹھا کر لطافت کی تکمیل اور مجاز کی ساری رنگینیاں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

یہ بتا کر جلوت دل میں تو ہے ہزار رنگ سے جلوہ گر
مگر آکے سامنے بیٹھ جا کہ نظر کو فرصت مجاز ہو

قصہ وہ ازل کا تھا اب یار کے ہوا
اک بار یہاں ہوئی پھر الجھن کمال

مجاز میں حقیقت کی جلوہ گری کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے' لیکن حقیقت میں مجاز کو دیکھنا ایک نئی کیفیت سے آشنا کرتا ہے۔

کہیں کہہ کر مجاز ہم عشق ہی حسین کو نہ کہو حقیقہ
چھپا اب جلوہ ریزیوں کو عرف وسعت دراز کیوں ہو

جلوہ خود کو دیکھا جلوہ عرش کو نزاد
نہ کہہ مجاز ہی کو یہ لباس جسمانی تلی ہے

تصوف کا دار و مدار عشق پر ہے اور عشق کی سرشاری سا کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کا پیغام حسن ازل کے جلووں سے زمین و آسمان کو معمور دیکھ چکے ہیں' سا کی نگاہ عشق بھی جب الفت ہے تو ہر جگہ اسی حسن کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔

ہر نظر اللہ تو سامنے وہی ایک تیرا ہی ہے
یہ طلسم حسن خیال ہے کہ وہ علم کہہ ہی ہے

عشق کا نقش نظر رہا ہے تم میں ہر حال
وہ دل کش بھی ہو گی، خوش بھی ہو

حسن سے تو قریب ہے مگر بھی امکاں سا ہے
وہ سائے کس طرح تو مشکل جہاں میں

اس سے انکار نہیں کہ سبا کا تصوف رسمیات سے مبرا نہیں ہے لیکن جہاں تصوف ان کا اپنا ہے، بیان کی ندرت سبا کا امتیازی وصف ہے اور اسی صنف نے اس راہ کو جو سنائی، عطار اور رومی کے عہد سے آج تک صدیوں کی روندی ہوئی ہے کچھ کچھ جگمگا دیا ہے۔

تصوف کی وسیع تر دنیا میں زندگی——
رشتوں کی تہذیب خاصا اہم موضوع ہے۔ اہل دل نے اسے بھی عشق کے دائرے میں لے لیا ہے، لیکن اہل فکر نے اس کی اساس وجدان سے زیادہ بصیرت پر رکھی ہے۔

سبا اپنے خاص انداز میں کہتے ہیں

بجز کشاکش عشق وفا جہاں کیا ہے
حیات کچھ نہیں ہے بیکار مرنے والوں میں

کچھ عشق جانتا ہے اس وضع زندگی کو
ہے ہم پہ نیند طاری خوابوں میں جا رہے ہیں

اوروں کی طرح سبا بھی زندگی کو طلسم وہم سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی بے ثباتی کے گلہ مند ہیں۔

ہے ایک طلسم وہم جہاں یہ اصل عالم خواب سی ہے
ڈھونڈنے جو جاتے ہیں کوئی مقصد ہے اور نایاب سی ہے

تو کے آغوش میں ہے اصل جہاں کیا بہار گل
چراغ تو جل رہے ہیں لیکن ہوا کے جھونکوں میں جل رہے ہیں

سبا مشکل ہی سے اپنے موضوعات سے دستکش ہوتے ہیں تاہم ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ

یا شکوہ تیغ جفا ہے یا قاتل نگاہ
ہم ہے سر اس دیار میں گلفت رسیدہ ہے

وہ اس حقیقت کو بھی محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کو عظمت سے آشنا کرنا اہل جاہ کے بس کا نہیں ہے

یہ اہل جاہ و جلال کیا قسمت کی باتوں سے
کریں گے پرواز اماں تک تو ہم سے بے بال و پر کریں گے

لیکن سچ یہ ہے کہ مولانا سبا کا یہ میدان نہیں ہے۔ ہاں ان کا مسلک وسیع المشربی سے ضرور عبارت ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

نہیں دیر و حرم کی قید کوئی، وضع داری ہے کہ
ہم جس آستاں پر جا پڑے اٹھا نہیں جاتا

جمود داغ اور ان کے تلامذہ کی بے کیف واقعہ نگاری سے تائب ہو کر غزل جب حسرت اور ان کے معاصرین تک پہنچی تو اس نے گھریلو زندگی اختیار کر لی۔ حسرت ضرور اس سے بے تکلف تھے اور کھل کر گفتگو کرتے رہے لیکن دوسروں کے لیے اس کا پیرایہ اظہار رموز و علائم بن گیا۔ جام و سبو، گلستاں و بیاباں، قفس و آشیاں، صیاد و باغباں، موج و طوفاں، ساحل و دریا، بہار و خزاں اور ان کے تلازموں سے شعری اسالیب مرتب ہونے لگے۔ اس سے اتنا ضرور ہوا کہ غزل کے چہرے پر تہذیب کے غازے سے نکھار آگیا لیکن سادہ بیانی کا یارا کم... لیکن منظور تھا۔ جب غزل ان تشبیہات کے گرد گھومنے لگی تو ایک طرف اکتاہٹ کا احساس بڑھنے لگا دوسری طرف معاصرین کی آوازیں اس درجہ خلط ملط ہو گئیں کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ سبا کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ان تراکیب اور تشبیہات سے اپنے شعری پیکر نہیں تراشے۔ ان کے مجموعہ کلام میں مشکل سے دو چار جگہ بہار و خزاں، صحرا و گلستاں کے الفاظ ملیں گے۔ موج و طوفان، ساحل و دریا، قفس و آشیاں اور جام و سبو کا تو ذکر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین کی آوازوں میں خود ان کی آواز صاف پہچانی جاتی رہی۔

سبا کی غزل جمالیاتی اظہار ہے جو ان کے نئے وجدان کا نتیجہ ہے۔ ان کی تمام تر شاعری میں ایک ہی احساس کارفرما ہے جسے ہم حسن کی تلاش کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔ سبا کا جمالیاتی مشاہدہ حقیقی اور غیر حقیقی میں کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھتا۔

وہ جسمانی حسن کے بھی عاشق ہیں اور ماورائے حسن کے بھی اور ان میں کوئی حد فاصل نہیں کھینچتے۔ ہر چند کہ ان کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب محبوب کے خارجی حسن اور اعضائے جسمانی کا بیان مزے لے لے کر کیا جاتا تھا لیکن سبا کے احساس جمال کی نزاکت اسے قبول نہیں کر سکی۔ وہ محبوب کے عارض و لب اور چشم و گیسو میں حسن کی تلاش نہیں کرتے وہ حسن کی جلوہ گری سے پیدا ہونے والے ارتعاشات اور کیفیات کی تصویر کھینچتے ہیں اور ایسی جلوہ گری سے کہ رنگینی ہی کی نہیں معانی کی بھی قطروں میں بھر جاتی ہے۔

ہم اس کو ڈھونڈتے ہیں جلوہ ہائے کائنات
خواب جس سے طرح ہے شراب جس سے مست

حسن ہے ہر طرف ستم یعنی اب اس کو کیا کہ
ذرا سی کچھ تو جھجک اور وہ نظر اٹھی تو

قرابوں کی سی خوشیں ہیں تیم کی سی ادائیں ہیں
جیسے قیامت کے ہیں یہ لمحے جو ان کے قدموں میں پلے تم
تھے

کسی نے بھی نہ انہوں نگاہ تک کر جانا
انہیں کس نے سکھایا اس طرح دل میں اتر جانا

یہاں برداشت ستم کچھ نہیں۔ ہے کم نہیں
خاموشی سے اور وہ بیتاب ہو گیا

کچھ دگرگوں ساغر (؟) ہے پیمانوں کا رنگ
گیا اڑائے جو اپنی آنکھوں سے پیمانوں کا رنگ

ہجوم حسن، وارفتہ نسبت، کیا قیامت ہے
اٹھانا اک نظر کا اور اک افسانہ ہو گیا

اور پھر یہ شعر کہ

اگر سبا کچھ اور نہ کہتے تو بھی
انہیں زندہ رہنے کے لیے کافی تھا

مشہور ہو چلا نہ اس بزم کا افسانہ باز
دیکھ کر آئے ہیں بدلے کا خدا ہو جانا

سبا کی شعری جہات کا جائزہ لیجیے تو ان کا مطلع سر دیوان ان کی شاعری کا دستور العمل معلوم ہوتا ہے۔

اٹھئے تو کہاں جائیے جو کچھ ہے یہیں ہے
سجدے تیرے گھر کے تو نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

زندگی کی بے رحمی نے سیماب کو دربار سے اٹھا دیا ہو تو اٹھا دیا ہو لیکن شاعری میں وہ اس کوچے سے باہر نہیں نکلے۔ اتنا ہی نہیں کہ دربار کے باہر ان کے نزدیک کوئی دنیا نہ تھی، انہوں نے درد عشق کو رگ و پے میں اس طرح بسا لیا تھا کہ جسم کا ہر حصہ درد بن گیا تھا

وہ درد دل جسم میں یوں پھیل گیا ہے
چھوتا ہوں جہاں ہاتھ سمجھتا ہوں یہیں ہے

درد عشق کا سارے جسم میں اس طرح پھیل جانا کہ جس جگہ ہاتھ پڑ جائے درد کا احساس ہونے لگے اظہار درد کا نادرہ کا پیرایہ ہے۔ جس کی مثالیں اردو کی عشقیہ شاعری میں کم ہی ملتی ہیں اور یہ اس معیار کے دوسرے اشعار جو سیماب کی شاعری میں نظر آتے ہیں ان کی اہمیت مسلم لیکن ان کے وہاں عشق کی داخلی کیفیات کا سراغ نہیں ملتا، نہ غم عشق کی اس آنچ کا پتہ چلتا ہے جو انسانی زندگی کی تہذیب ہے۔

عشق بجائے خود غم ہے اس لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ سیماب اس کے لذت آشنا نہیں تھے لیکن وہ محسوس کیفیت جو دل کی تڑپ سے پیدا ہوتی ہے اور سننے والوں کے دل میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے سیماب کے سر میں نہیں پائی جاتی۔ شاید اس لیے کہ زندگی اور عشق کو انہوں نے نہ وبال سر بنایا نہ وبال دل۔ سیماب صاحب کی زندگی کے نشیب و فراز کا تو ہمیں تھوڑا بہت علم ہے، انہوں نے اچھے دن بھی دیکھے اور برے دن بھی گزارے لیکن ان کی حیات معاشقہ کا ورق گم شدہ ہے۔ جوش صاحب کی یہ شہادت کہ وہ لکھنؤ کی ایک خوش گلو مغنیہ پر فریفتہ تھے، واقعہ کو عشق کی منزل تک نہیں لے جاتی۔ پھر ایسا ہی مغالطہ جوش صاحب کو خود اپنی حیات معاشقہ کے بارے میں بھی ہوا ہے۔ اس قسم کے واقعات کو ہیجان وقتی کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا اگر اصطلاحاً" اسے عشق مان بھی لیا جائے تو سیماب کے کلام میں ان رشتوں کو ڈھونڈنا بیکار ہے جو دو دلوں کے اتصال اور وصل یا فرقت سے وجود میں آتے ہیں اور غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں نشوونما پاتے ہیں۔ شاید سیماب کی زندگی کا یہ ورق سادہ رہا۔

وجہ یہ ہے کہ عشق کو جسمانیت سے علیحدہ کر دیجئے تو تصوف کا مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ مولانا سیماب اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے صنف مخالف کے لیے باعث کشش نہیں ہو سکتے تھے اس لیے ان کا عشق صرف ان کے دل کی پکار تھا اور ان کے دل کی دنیا ان قسموں سے روشن تھی جو قسمیں محفلوں میں ہوتی ہیں، یہ تو نہیں ہے کہ حسن سیماب ذہن انسانی کی رفعت آشنا نہیں کر سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ عشق کے لطیف، پاکیزہ، نازک سے جذبات اسی وقت وجود میں آتے ہیں اور دردمندی، جاں سوزی، محویت اور کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اسیری یکطرفہ ہو یا کم از کم۔ یاد کے صید ہو جانے کے امکانات ہوں، سیماب اسیر زلف تو ہو سکتے تھے لیکن کسی زلف کا ان کے لیے بکھر جانا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہمیں حسن کی جلوہ ریزیاں اور عشق کی جنوں خیزیاں تو ملتی ہیں لیکن عشق کی برنائیاں نہیں ملتیں نہ غم عشق کی وہ توانائی نظر آتی ہے جسے قوت حیات کہا جاتا ہے۔ ہرچند کہ سیماب کا عشق یکطرفہ ہے لیکن وہ اپنے احترام اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

محبت پر کبھی اکثر نثار ان کے اٹھ نہیں سکتے
سیماب ہم طور طبیعت اپنی جداگانہ رکھتے ہیں

کیا بہت ہی زبوں ہے حال سیماب
آپ کیوں گھبرائے جاتے ہیں

وہیں کی یاد سیماب ٹھوکریں قسمت کی
جس آستاں پہ گرے کامیاب ہو کے اٹھے

ہر تازہ مصیبت پہ اک عید مناتے ہیں
دل کو تری الفت کے انداز سکھاتے ہیں

سیماب کے کلام کا بیشتر حصہ زبان اور انداز بیان کی برجستگی، ندرت و تازگی اور نادرہ کاری سے مزین و مرصع ہے، ان کی فارسی تراکیب غالب، مومن اور حسرت کی یاد دلاتی ہیں، ان کے وہاں سادگی کے بجائے ایک طرح کا [illegible] ہے لیکن کہیں کہیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ادائے حسن اور واردات قلبی کا اظہار ایسے بھولے بھالے انداز میں کیا گیا ہے کہ سیماب کے تغزل کی معصومیت پر پیار آنے لگتا ہے۔

یہ حسن دوامی کی کشش ہے کہ کوئی دل کرتا ہے
یہ مستی سے تم چلتے ہو کہ ہم پہ جادو چلتا ہے
ہاں درد تو آتا ہے غم کی شدت پہ ہم کو
تم خون تمنا ہی نہ کرو جب شعروں سے پی جاتا ہے

ہے عشق بہت بے دل مگن، کچھ ان کا قصور وار نہیں
جب اس کی خاطر ہوتی ہے تو ظالم اور جفا ہے

کیسے سنبھلتا دل اپنا ہم سر تھے تو آب کے
بننے والے جتنے تھے رونے والے ہو کے

رندانہ بے باکیاں اور بادہ شباب کی سرمستیاں غزل کی روایات کا حصہ بن چکی ہیں۔ سیماب تو بادہ شباب کے لذت آشنا بھی تھے، پھر کیسے ممکن تھا کہ سیماب کا کلام اس موضوع سے خالی ہوتا لیکن حیرت ہے کہ ان کے وہاں بادہ و ساغر کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم اس سلسلے میں وہ جب بھی کچھ کہتے ہیں اپنے انفرادی رنگ میں کہتے ہیں اور ایک پامال مضمون کو بھی کیفیت بخش دیتے ہیں۔

ابھی تک نے سحر میں وہ نشہ لطف ساقی کی
وہ توبہ کا شکار گردش پیمانہ ہو جاتا

عطائے عیش و سرخوشی، تصور حسن میکشی
ہزار جام لگ گئے صبوحی آفتاب میں

وسعت دے کر لیا ہے ابھی سے مجھے ہجوم
ساقی مدد کہ گوشہ دامن بھی تر نہیں

سیماب کی شاعری جمالیات کا فنکارانہ اظہار ہے اور ان کی غزل ان کے ذوق جمال کا آئینہ ہے، ان کی شاعری رنگ و روشنی کی شاعری ہے اور ان کی دنیا حسن و عشق کی دنیا ہے جس کے باہر وہ قدم رکھنا پسند نہیں کرتے ان کا بیان تصوف بھی حسن و عشق کی جلوہ گری ہے وہ زبردست صناع تھے اور شدت سے انفرادیت پسند۔ انہوں نے اپنی صناعی اور انفرادیت سے ان مضامین کو جنہیں ہزاروں بار دہرایا جا چکا ہے نئی تابناکی عطا کی، انہوں نے غزل کو تہذیب اور تہذیب کو نئی سمت بخشی۔ انہوں نے نواسنجان حسن و عشق کو جو ایک ہی راگ الاپتے الاپتے اپنی آواز کھو چکے تھے نئی لے میں نغمہ سرا ہونا سکھایا۔ یہ لے سیماب کے ساتھ ساتھ فضاؤں میں گونجی تھی اور ان ہی کے ساتھ فضاؤں میں تحلیل ہو گئی۔

کھویا سیماب کو بھی تری پہلو نواز نے
کن خوبیوں کا شخص کہ پیدا نہ ہو سکیں

محمد مثنیٰ رضوی

عطا محمد شعلہ — ایک شعلہ مستعجل

[محمود ایاز کے نام جن کے ایک اداریہ
نے (سوغات ۲) میرے اندر اس تاثراتی
مضمون کے لکھنے کی تحریک پیدا کی۔]

عطا محمد کے نام سے میں پہلے پہل اس وقت واقف ہوا جب میں الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا یہ بات (۱۹۴۵ء - ۴۶ء) کے آس پاس کی ہے میں استادِ محترم پروفیسر اعجاز حسین کے کمرہ سے ان کا لیکچر سن کر نکل رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ان کی میز پر رکھے ہوئے ایک اردو ہفتہ وار پر پڑی یہ بمبئی سے شائع ہونے والا رسالہ "نظام" تھا ایک مضمون نے خاص طور پر متوجہ کیا یہ دراصل ایک طویل اور جامع تبصرہ تھا جو عطا محمد نے کرشن چندر کی مرتب کی ہوئی کتاب "نئے زاویے" پر کیا تھا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تبصرے کا لب و لہجہ خاصا سخت تھا مگر اس میں جو تازگی اور شگفتگی تھی اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ لکھنے والے کا نام ذہن پر نقش ہو گیا کچھ دنوں بعد اپنے ہوسٹل کے ایک کمرہ میں ایک دوست کے پلنگ پر "نیا ادب" کا ایک شمارہ پڑا دیکھا ادھر ادھر سے پلٹ کر دیکھا بڑے بڑے نام نظر آئے عطا محمد کا ایک مقالہ بھی شامل تھا جس میں "جدید غزل" کے مزاج اور امکانات سے بحث کی گئی تھی پھر سے ندرت اور جدتِ فکر کا احساس ہوا۔ میں نے ایک ہی نشست میں پورا مقالہ پڑھ ڈالا اس بار نقش کچھ زیادہ ہی گہرا تھا شاید یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہو کہ اسی ہوسٹل کے ایک دوسرے کمرہ میں ضمیر الدین احمد سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی وہ مجھ سے ایک سال آگے تھے ابھی تک اس ملاقات کا تاثر محو نہیں ہو سکا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے علاوہ اردو کے نئے نقادوں پر بڑی لمبی گفتگو ہوئی۔ مجنوں گورکھپوری کے طالب علم رہ چکے تھے اور ان کی تنقیدی نظر کے بڑے معترف تھے۔ ضمیر الدین احمد نے آگے چل کر افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی لیکن ان دنوں وہ افسانے لکھتے تھے یا نہیں مجھے اس

علم نہیں اس ملاقات میں اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہیں اور ان کا مطالعہ وسیع ہے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر تھا عطا محمد کا اور ذکر چھڑ گیا ظہیر الدین احمد کا۔

جب میں ایم۔ اے کرنے کے لئے خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایما پر علی گڑھ پہنچا تو "نیا دور" (بنگلور) میں نئے نقادوں پر بڑے تیکھے مگر غیر جانبدارانہ انداز میں لکھے ہوئے مضامین کا ایک سلسلہ نظر سے گذرا یہ سارے مضامین عطا محمد کے زور قلم کا نتیجہ تھے ان میں کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کی تنقید نگاری پر بڑی سخت باتیں کہی گئی تھی۔ کلیم الدین احمد جیسی جارحانہ انداز میں اردو شعراء کی تنقید کی تھی عطا محمد نے اس سے بھی زیادہ کڑے لب و لہجہ میں کلیم الدین احمد کی خبر لی تھی۔ لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا تھا اس میں منطق اور استدلال کی قوت بھرپور موجود تھی۔ انتہائی فکر انگیز اسلوب میں عطا محمد نے کلیم الدین احمد کی تنقیدی ڈھانچا کی پوری بنیاد اکھاڑ پھینکی تھی اس مضمون کے تیکھے پن اور نئے فن کا لطف اور مزہ آج بھی یاد ہے ان کی نظر میں کلیم الدین احمد شعری ذوق اور ادبی حس سے عاری تھے۔ سرور صاحب پر ان کا مضمون کم جارحانہ نہیں تھا ان کے خیال میں سرور صاحب شعر و ادب کے متعلق اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی کے اسلوب نثر کا چربہ اتارنے کی کوشش میں ان کی تنقید نگاری اور بھی ہلکی پڑ گئی۔ مجھے عطا محمد کی یہ رائے قطعیت کا شکار نظر آئی۔ غالباً اس تاثر کا سبب یہ تھا کہ ان دنوں دوسرے نوجوان طالب علموں کی طرح آل احمد سرور کی تنقید مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔ مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں میٹھی میٹھی شیریں تنقید۔

کچھ دنوں بعد باقر مہدی کے ساتھ سرور صاحب سے ملنے کے لئے بیرو روڈ والے مکان پر گیا وہ ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے۔ ان کے سامنے "نیا دور" کا شمارہ پڑا ہوا تھا باتوں ہی باتوں میں میں پوچھ بیٹھا کہ عطا محمد کے اس مضمون کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ عطا محمد نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ میں نے انہیں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ عطا محمد ہیں کون صاحب، سرور صاحب کو تھوڑی سی واقفیت تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اتر پردیش کے کسی ضلع میں نائب تحصیلدار ہیں پڑھنے لکھنے کے شوقین ہیں۔ ایک بار محمد حسن عسکری کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے اور کسی ادبی جلسے میں ایک مختصر سا مقالہ بھی پڑھا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اور ایک مدت تک ان کا خیال بھی نہیں آیا۔ اچانک ایک دن جب میں برادر محترم سبط محمد نقوی کے یہاں اکبر پور میں ٹھہرا ہوا تھا عطا محمد کا ذکر نکل آیا۔ باتیں کرتے کرتے سبط بھائی نے مجھ سے پوچھا کہ عطا محمد کے نام سے میں واقف ہوں یا نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے کئی مضامین پڑھ چکا ہوں جنہوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے [illegible] مجھے سبط بھائی نے بتایا کہ عطا محمد اکبر پور کے تحصیلدار ہو کر آئے ہیں آج شام کو ان سے ملوں گا ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا میں سوچا بھی نہیں تھا کہ عطا محمد سے ملاقات ہو گی وہ بھی اپنے ہی ضلع میں۔

شام کو میں جب سبط بھائی کے ساتھ تحصیلدار کے سرکاری بنگلے کی جانب روانہ ہوا تو خوشی کے احساس کے ساتھ تھوڑی سی جھجھک بھی تھی۔ اس دن یا ایک دو دن پہلے "قومی آواز" کے میگزین والے حصے میں آل احمد سرور پر میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جو کچھ زیادہ ہی تحسین آمیز تھا۔ دراصل مجھے عطا محمد صاحب کے اس مضمون کا خیال آگیا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اتنے میں ہم لوگ ان کے مکان پر پہنچ گئے جہاں پہلے ہی سے محفل سجی ہوئی تھی۔ ان سے باقاعدہ تعارف ہوا، ادب، سیاست، صحافت، اور نہ جانے کن کن موضوعات پر کھل کر باتیں ہوئیں۔ بڑے دلچسپ اور صاف گو آدمی تھے۔ میں گھبرا رہا تھا کہ کہیں میرے اس مضمون کا ذکر نہ نکل آئے جو قومی آواز میں شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ حادثہ پیش نہیں آیا۔ اور میں بہت خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

دو تین دن بعد پھر شام کے وقت ان سے پھر

ملنے گیا۔ بڑے تپاک اور محبت سے ملے ایک بڑی سی آرام
کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے ملنے والوں کی اچھی خاصی
تعداد موجود تھی، خاصے وجیہہ آدمی تھے۔ سرخ و سفید
نیچے قد کے اور بھاری بھرکم جسم والے مسکراتا ہوا چہرہ
غرض کہ بیک وقت باوقار اور دل آویز شخصیت کے
مالک تھے لوگوں سے پتہ چلا کہ جب اپنے دفتر میں ہوتے
ہیں تو نظم و ضبط کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں
تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے لیکن میرا ان کے سرکاری معاملات
سے کیا لینا دینا۔ دوسری ملاقات میں شعر و سخن کی محفل گرم
ہوا تھی، انہوں نے تحت اللفظ میں اپنی کئی غزلیں بعض
دوستوں کی فرمائش پر سنائی۔ مجھے پہلی بار ان کے
اچھے شاعر ہونے کا علم ہوا ابھی تک میں ان کو ایک
بانکے تیکھے اور طبع نقادی حیثیت سے جانتا تھا اب مجھ
پر ان کی شخصیت کا ایک نیا گوشہ روشن ہوا اپنے
سرکاری حیثیت میں وہ جس قدر سخت اور بارعب
شخص رہے ہوں لیکن نجی محفل میں بہت خوش اخلاق
نرم گفتار اور دلچسپ اللسان تھا وہ۔ ان کے ماتحت
اہل کار بھی ملاقاتیوں میں شامل تھے اور وہ ان کے ساتھ
بھی بڑی بے تکلفی کے، خوش آرہے تھے اسی طرح
کے ذہنی تحفظات کے بغیر اس بار انہوں نے مجھ سے شاد
عظیم آبادی پر
وہ شاد عظیم آبادی پہچان نہ سے ایک طویل مقالہ لکھنا
چاہتے تھے لیکن ان کے پاس شاد کا مجموعہ کلام "۔۔۔ خمخانہ ابہام"
موجود نہیں تھا انہیں اس کی تلاش تھی جب میں چھٹیاں گزار
کے بہار واپس پہنچا تو ایک لائبریری سے کتاب حاصل کرکے
ان کے پاس بھیج دیا بعد میں بات چیت کے دوران اندازہ
ہوا کہ انہوں نے "میخانۂ ابہام" کا مطالعہ تنقیدی نظروں سے
کیا تھا اور کئی نئے اور دلچسپ نکتے ان کے ذہن میں تھے
مگر دفتری کاموں کی مشغولیت نے انہیں شاد پر تنقیدی
مضمون لکھنے کا موقع ہی نہیں دیا اگر وہ یہ مضمون لکھ
سکتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ شاد عظیم آبادی پر عزیز احمد
کے تنقیدی مقالہ سے کم اہمیت کا حامل نہ ہوتا جہاں تک

مجھے علم ہے شاد پر وہ اپنا مضمون نہیں لکھ سکے
پر ان کا لکھا ہوا کوئی مضمون میری نظروں سے نہ
اکبرپور جب بھی جانا ہوتا ان سے ضرور
یاران کے ساتھ۔ قونصل ندی میں بوٹنگ کرنے کا
اور دیگر واقعات اور لطیفوں کے ساتھ ساتھ
ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بڑی پرلطف
معلوم ہوئی۔ کشتی میں ان کے ماتحت کام کرنے والے
حضرات بھی موجود تھے مگر وہ کسی جھجک اور ہچکچاہٹ
کے بغیر لطیفے بھی سناتے رہے اور مذاق بھی کرتے رہے
جب قربت کچھ اور بڑھی تو انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی
اور تعلیم کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ایسی باتیں
جن سے ان کے لئے جذبۂ احترام اور بڑھتا گیا وہ مغربی
اتر پردیش کے رہنے والے تھے میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل
کرکے ڈاکٹر بننا چاہتے تھے اس لئے انٹرمیڈیٹ کا امتحان
انہوں نے سائنس کے مضامین کے ساتھ پاس کیا تھا۔
چونکہ ان کے معاشی حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کر
کہ میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنا تو درکنار وہ اپنے
یونیورسٹی کی تعلیم بھی جاری نہ رکھ سکے نامساعد حالات
سے مجبور ہوکر انہوں نے نائب تحصیل داری کے مقابلے
امتحان دیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی ملازمت کرتے
ہوئے۔ انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کی ڈاکٹر
بننے کا جو شوق ان کو بچپن سے تھا اس نے کبھی ان کا
ساتھ نہیں چھوڑا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کرنے
کا تو سوال ہی نہیں تھا لیکن اپنی ذاتی لگن اور مطالعہ سے
انہوں نے "ہومیوپیتھک" میں خاص مہارت حاصل کرلی
تھی۔ لوگوں کا مفت علاج کیا کرتے تھے اور ان کے بیان
کے مطابق فیل پاؤں اور کھیگھا ایک بیماری جس میں گھٹنا غیر
معمولی طور پر سوج جاتا ہے کہ بہت سے مریضوں نے ان
کے علاج سے شفا پائی۔ اکبرپور سے ان کا تبادلہ ہوگیا
اور اب صرف ان کی یاد باقی رہ گئی۔
ایک عرصہ بعد اچانک ایک دن یہ خبر معلوم ہوئی
کہ مطاہر صاحب تحصیل ٹانڈہ کے تحصیل دار ہوکر آگئے ہیں

یہ بات مجھے میرے ایک دوست عزیز نے بتائی جن کا تعلق ٹانڈہ کے سلسلے میں تحصیل سے اکثر واسطہ رہتا تھا۔ میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی ٹانڈہ اکبر پور سے ۲۰ میل ہے اور بیشتر آبادی گاؤں سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ جیسا کہ میں ان سے خاص طور پر ملنے کے لئے ٹانڈہ گیا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بہت محبت سے ملے بڑی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت انہوں نے مجھے "نقوش" کے شخصیات نمبر کا دوسرا حصہ پڑھنے کو دیا جسے میں اپنے چھٹیوں کے بعد بہار لیتا گیا "ٹانڈہ میں انہوں نے بڑی محنت اور جد و جہد کر کے ایک کل ہند مشاعرہ کروایا تھا جس کی صدارت اختر انصاری نے کی تھی وہ اختر انصاری کے پرستاروں میں تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ اردو ادب میں ان کو جو مقام ملنا چاہیئے تھا وہ نہیں ملا۔ اس طرح ادب میں اختر انصاری کی جو حق تلفی ہوئی تھی عطا محمد اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے مگر یہ سودا انہیں بہت مہنگا پڑا کیونکہ ٹانڈہ کے کچھ مفاد پرست سیاسی کارکنوں نے ان کے خلاف پروپیگنڈہ کی ایک مہم چلائی اردو کے ایک جاں نثار خادم اور محبت کرنے والے کی حیثیت سے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ عطا محمد بڑے کھرے اور صاف گو انسان تھے اور اصول کے معاملے میں بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے افسر کی موجودگی میں تنگ نظر اور موقع پرست نیتاؤں کو غلط اور ناجائز کام کروانے کا موقع نہیں ملتا تھا اس سے وہ برابر ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ چنانچہ اب وہ گھڑی آ پہنچی تھی کہ وہ اپنا کھیل کھل کر کھیل سکیں۔ عطا محمد ڈرنے والے آدمی تھے نہیں سپر ڈال دینا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ ان کا تبادلہ کر دیا ٹانڈہ کی جنتا کو بڑا صدمہ پہنچا لیکن بدنیت نیتاؤں نے اطمینان کی سانس لی۔

میں پچھلے کئی ماہ سے باہر تھا اس لئے مجھے ان سرگرمیوں کا علم نہیں تھا جن میں مفاد پرست حضرات مصروف تھے ایک دن میں خاتمۂ زمینداری کے BONDS لینے کے لئے تحصیل گیا۔ عطا محمد صاحب سے گھر پر ملا مگر ان کو اپنی غرض نہیں بتلائی میں بے حد پریشان اور متفکر تھا کیونکہ سنیچر کا دن تھا جب خزانہ دوپہر میں ہی بند ہو جاتا ہے لگتا تھا کہ دوپہر تک مجھے BONDS نہیں مل سکیں گے کیونکہ ان کے ساتھ نقد رقم جمع ہونے والی تھی۔ جیب میں جتنے پیسے تھے وہ کاغذات کے لئے STAMP خریدنے میں خرچ ہو گئے اگلا دن اتوار کا دن تھا شام کی گاڑی سے مجھے بہار کے لئے روانہ ہونا تھا چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں کچھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں اسی کشمکش میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا کہ عطا محمد صاحب کا چپراسی تلاش کرتا ہوا پہنچا وہ دن کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے کھانے کے دوران انہوں نے بار بار پوچھا کہ کس بات کی پریشانی ہے میں بار بار ٹالتا رہا لیکن انہوں نے کہا کہ میں کسی نہ کسی سلسلے میں یقیناً کافی متفکر ہوں جب میں نے انہیں اپنی پریشانی کی وجہ بتائی تو بڑے زور سے ہنسے۔ کہنے لگے بس اتنی سی بات ہے انہوں نے قریب کی ایک میز پر سے ایک مسودہ اٹھایا اور مجھے پڑھنے کے لئے دیا۔ احتشام صاحب کی تنقید نگاری پر ان کا تازہ ترین مقالہ تھا جو بعد میں "نقوش" کے کسی شمارے میں شائع ہوا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احتشام صاحب پر اس سے بہتر مضمون نہیں لکھا گیا خود احتشام صاحب اس کے معترف تھے نظام صدیقی نے اپنے ایک طویل مقالے میں جو "احتشام حسین ایک عہد ساز نقاد" کے عنوان سے "آہنگ" کے احتشام حسین نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس بات کا ذکر کیا۔ میں نے کہا جناب والا میری دشواری یہ ہے کہ دوپہر تک خزانہ بند ہو جائے گا۔ کہنے لگے حضرت آپ کے سامنے جو شخص بیٹھا ہوا ہے وہ تحصیل کا بادشاہ ہے خزانہ میرے حکم سے شام تک کھلا رہے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا مجھے اپنے

معاوضے کی رقم اور BONDS تقریباً ۱۲ بجے رات
کو ملے۔ رات کافی ہو چکی تھی اس لئے ان کو زحمت نہیں
دینا چاہتا تھا انہیں اطلاع دیئے بغیر اپنی قیام گاہ پر
چلا آیا۔ صبح سویرے اٹھ کر سیدھے ان کے بنگلے کا رخ
کیا وہ ضلع کانگریس کے صدر سے مصروف گفتگو تھے بلکہ
یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کو کھری کھری سنا رہے تھے۔
وزیر صاحبان سرکاری دورے کرتے ہیں اور ان کے کھانے
پینے کے اخراجات ہمارے حکام کو برداشت کرنے پڑتے
ہیں ملک کبھی نہیں پوچھتا کہ بھیا یہ پیسے کہاں سے آتے
کہنے لگے کہ وزیر اعلیٰ ہو تو نمبودری پد جیسا ہو تم لوگوں
کو اس کی زندگی اور اس کے کردار سے سبق لینا چاہئے اپنے
دفتر سائیکل پر جاتا ہے اور صرف ۰۰ھ روپے تنخواہ لیتا

ہے اگر وہ اتنے میں گزر کر سکتا ہے تو تمہارے وزیر ک
نہیں کر سکتے پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ
رات بھر اس خیال سے پریشان رہا کہ پتہ نہیں آپ کو معا
کے BONDS ملے یا نہیں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا ا
فوراً ان کو اطلاع نہ کرسکنے کی وجہ بتلائی تب انہوں نے
بحیثیت تحصیل دار کے نمائندہ میں یہ ان کا آخری دن تھا ا
تبادلہ پر کسی اور ضلع میں جا رہے ہیں ایک لمبے عرصہ کے ب
معلوم ہوا کہ وہ ترقی پاکر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ہیں کبھی کبھی ان ک
خوشی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دن کسی دوست نے بتایا کہ
معاً محمد شعلہ کا انتقال ہو گیا ایسا لگا جیسے زندگی میں کوا
کمی واقع ہو گئی۔ [illegible]

[سہیل ۵۳ (۱۲) دسمبر ۱۹۹۳ء]

۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
حیدرآباد (سندھ)

میرا علی گڑھ

طالب علمی کا زمانہ اور وہ بھی علی گڑھ کا زمانہ کون بھول سکتا ہے، اس زمانے کی باتیں قارئین کے لئے دلچسپ نہ سہی لیکن لکھنے والے کے لئے بہت دلچسپ ہیں۔ یہ اس کی زندگی کی تاریخ ہے اور اس سے اس کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ میں نے علی گڑھ ۱۹۳۶ء میں چھوڑا تھا۔ بکثرت واقعات فراموش ہو چکے ہیں۔ جو یاد ہیں ان میں اور ان کے سنین میں بھی سہو کا امکان ہے۔ یہ واقعات کچھ بھی ہوں، تاہم قارئین کو راقم الحروف کی خامیوں کے مطالعے کے اجتناب کی راہ ضرور مل سکتی ہے۔

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست لیکن پیشِ خلق
بازی پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم (سعدی)

ویں جماعت کا زمانہ

میں جبل پور (سی۔پی) میں ۱۳۳۰ھ، ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ گھر میں قرآن پاک کا ناظرہ ل کیا۔ پھر پرائمری اسکول میں داخل ہوا۔ اس کے آخری سال کے امتحان میں بفضلہ تعالیٰ پورے شہر کے اسکولوں میں اول قرار دیا اور چار سال تک چار روپے ماہانہ وظیفہ پاتا رہا۔ انجمن اسلامیہ ہائی اسکول سے آٹھویں جماعت کا امتحان بورڈ سے پاس کیا نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پھر ۱۹۲۸ء میں نویں جماعت کے امتحان میں بھی بہت اچھے نمبر حاصل کئے۔ والد صاحب کا انتقال ۱۹۲۴ء ہو چکا تھا لیکن بڑے بھائی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بڑا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔ وہ پورے گھر کی کفالت کرتے تھے۔ انہوں نے محدود تنخواہ کے باوجود مجھے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں اُس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کالج میں نویں۔ دسویں۔ گیارہویں اور بارہویں چار یں تھیں۔ طلبہ کا قیام منٹو سرکل اور نیو سرکل کے چار چار ہوسٹلوں میں تھا۔ (قریب ہی ایک قبرستان تھا اسے منڈوای کہا کرتے تھے) ف منڈوائے میں دسویں جماعت والوں کی پڑھائی ہوا کرتی تھی اور منٹو ہال میں دوسری کلاسیں ہوا کرتی تھیں اور وہ دو منزلہ عمارت ، اس کے ایک سرے پر محترم پرنسپل عبدالمجید قریشی کا دفتر تھا۔ ان کے سیکرٹری بشیر احمد صاحب تھے اور وائس پرنسپل سید ولی محمد احب تھے۔ یہ سب کے سب بڑے باوقار بزرگ تھے ا... ت ذمہ داری کے ساتھ اپنے کام انجام دیا کرتے تھے۔ ایک لہ رحمت اللہ تھے۔ ان کو لڑکے بہت ستایا کرتے تھے۔ میں وہاں پہنچا اور اپنے سرٹیفیکٹ وغیرہ پیش کئے تو میرا داخلہ دسویں عت میں ہو گیا۔ میرا انرولمنٹ نمبر ۲۸۹۲ تھا جو پوری تعلیم تک رہا۔ نیو سرکل جسے سارون سرکل بھی کہتے ہیں اس کے جوبلی ہوسٹل

کے کمرہ نمبر ۳۵ میں مجھے قیام کی جگہ دی گئی۔ اس کمرے میں پونا کے محمد اسمٰعیل اور بمبئی کے منیر الدین جن دلاوی میرے ساتھی تھے میرے کمرے کے ساتھ ہی شمس الہدیٰ صاحب وارڈن کا کمرہ تھا۔ وہ ریاضی پڑھاتے تھے۔ اس ہوسٹل کے دوسرے کمرے میں شیخ علی [illegible] صاحب رہتے تھے۔ وہ دینیات پڑھاتے تھے۔ دسویں جماعت کی کلاسیں جو منٹو لائن میں ہوا کرتی تھیں ان کے سات سیکشن تھے میں الف سیکشن میں تھا۔ اور سعید الزماں صاحب ہم لوگوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ بہت نفیس طبیعت والے تھے۔ والد علی شیدا صاحب فارسی پڑھاتے تھے (ان کے صاحبزادے ممتاز علی کراچی میں ہیں)۔ ان کے عزیز صبیح الدین حیدر صاحب جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ ان کو سب لڑکے چچا صبیح الدین کہا کرتے تھے۔ چہرہ رعب دار تھا اور اگر کبھی اتفاق سے وہ مسکرا دیتے تھے تو لڑکے کہتے تھے کہ آج بارش ہو جائے گی۔ بی سیکشن میں معین الحق صاحب انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ بعد میں یونیورسٹی کی جماعتوں میں تاریخ پڑھانے لگے تھے اور پی ایچ ڈی بھی ہو گئے تھے۔ بی سیکشن کا ایک شریر طالب علم ناصر تھا۔ وہ بیچارہ کراچی میں معذور سا ہو گیا ہے۔ وکالت کرنے لگا تھا۔

چند ماہ کے قیام کے بعد مجھے یرقان ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی ہسپتال کے ڈاکٹر عبداللہ بٹ نے ہوسٹل کا دورہ کیا تو مجھے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہاں رائے پور (سی پی) کے حبیب اللہ صاحب بھی داخل تھے۔ یرقان کی وجہ سے مجھے توری کا ساگ اور روٹی دونوں وقت کھلائی گئی۔ ۲-۳ دن تو میں نے برداشت کی۔ پھر قریب ہی ملّا مٹھائی والے کے یہاں جا کر سیر ہو کر مٹھائی کھائی۔ وہ بہت اچھی مٹھائی بناتا تھا تو اچھی مٹھائی کیوں نہ کھائی جائے۔ بہرحال اس مٹھائی نے مجھ پر بہت اچھا اثر کیا اور میں دوسرے دن واپس اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں اپنے وطن سے نویں جماعت پاس کرکے علی گڑھ گیا تھا لیکن وہاں نویں اور دسویں دونوں جماعتوں کا نصاب ایک ہی سال میں پورا کرنا تھا۔ ان دونوں جماعتوں کے نصاب میں انگریزی کے لئے گیارہ کتابیں تھیں (نثر، نظم، سرسری مطالعہ کے لئے) حساب میں چکرورتی مشہور کتاب تھی۔ الجبرا K. B. BASU والا تھا۔ جیومیٹری کے لیے HALL STEVENS کے پانچ حصے۔ تاریخ کے لیے برطانیہ اور ہندوستان سے متعلق کتابیں۔ جغرافیہ پوری دنیا کا۔ اردو، دینیات اور ایک اختیاری مضمون۔ اور سوائے اردو اور دینیات کے، ہر مضمون کے لیے جواب انگریزی میں دینا تھا۔ (آج کل کے لڑکے تو اس قدر نصاب کے متحمل نہیں ہو سکتے) [illegible] کے جوبلی ہوسٹل کے ہال میں ظہر کے بعد نصاب کی تیاری کے لیے طلبہ کو جمع ہونا پڑتا تھا اور عصر تک وہاں بیٹھنا ضروری تھا، بعض اساتذہ مدد کے لیے موجود رہتے تھے۔ اس ہوسٹل سے ملا ہوا نصر اللہ ہوسٹل تھا۔ اس کے ہال میں ڈائننگ کا انتظام تھا۔ اس ہوسٹل میں زیادہ تر بارہ بنکی والے طلبہ رہتے تھے جن کو یار لوگ جیٹی والے کہا کرتے تھے۔ کچھ بھوپال کے طلبہ بھی وہاں رہتے تھے کیونکہ والیٔ نواب نصر اللہ خان مرحوم نے وہ ہوسٹل تعمیر کرایا تھا۔ تیسرا ہوسٹل نواب مزمل اللہ خان مرحوم (رئیس بھیکم پور) نے بنوایا تھا جس کا نام مزمل ہوسٹل تھا۔ اس کے ہال میں پانچوں نمازیں ہوا کرتی تھیں۔ چوتھا ہوسٹل ماریس MARRIS HOSTEL تھا۔ جس کے ہال میں انٹرمیڈیٹ کالج کی تمام تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ کل ہند مشاعرہ بھی وہاں منعقد ہوتا تھا۔

علی گڑھ کی روایات میں سے ایک روایت یہ تھی کہ پرانے طلبا نئے نئے بھائیوں سے ملنے کے لیے ایک رات انٹروڈکشن پارٹی منعقد کرتے تھے۔ تمام ہوسٹلوں کا دورہ کرتے تھے اور نئے طلبہ سے سرسید کی فاتحہ کے لیے چندہ وصول کرتے تھے۔ پھر ایک رات سب پرانے اور نئے طلبہ جمع ہو کر سرسید کی فاتحہ پڑھ کر مٹھائیاں کھاتے تھے۔ یہ رات بہت دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ اور نئے طلبہ کی بعض خامیوں کا اس طرح مذاق اڑایا جاتا تھا کہ وہ ان خامیوں کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ پانچوں نمازوں میں شرکت بھی ضروری تھی اور حاضری بھی لی جاتی تھی۔

شہر جانے کے لیے اِکّے کی سواری تھی۔ کالج اور یونیورسٹی کے کسی گوشے سے شہر جانے کا کرایہ صرف تین آنہ تھا۔ اِکّے میں تین لڑکے بیٹھ جاتے تھے اور ایک ایک آنہ ہی دینا پڑتا تھا۔

بہت سستا زمانہ تھا۔ ۱۰ آنے میں ایک سیر بہترین گوشت اور چار آنے سے لے کر چھ آنے تک میں ایک سیر [illegible] مل جاتا تھا اور چار آنے کی سیر [illegible] تھی۔ دودھ دو آنے سیر تھا۔ بلکہ [illegible] میں جو [illegible] کے مشرق میں ایک گاؤں تھا وہاں سے [illegible]

ں کا انعام ہے وہ دو چار پیسے میں بھی مل جاتا تھا۔ مٹی بہت زرخیز تھی کہ ایک سال میں کئی کئی فصلیں تیار ہو جاتی تھیں۔ اوپر کے پودے ۸۔ ایک کے ہو جاتے تھے۔ شہر کے مشہور درزی علاؤالدین، تلسی اور پرشاد ہی تھے۔ پھر عبدالغفار اور اُس کا بھائی عبدالستار رہتا جو بیلا کا بعد رہتا ہوا۔ ابراہیم بھی ان کا ہمدردی تھا۔ یہ لوگ ٹھنڈی کی شیروانی کی سلائی کے دو روپے لیتے تھے۔ گرم شیروانی کے تین روپے اور جیسے سوٹ کے کوٹ (پانچ روپے لیتے تھے۔ ۲ آنے گز عمدہ لٹھا D-ONE مل جاتا تھا بلکہ ایک سستا کپڑا دو آنے گز بھی تھا۔ ہوسٹل میں رہنے، کھانے اور پڑھائی کی کل فیس ۲۵ روپے ۱۰ آنے تھی۔ دھوبی ایک آنہ فی کپڑا لیتا تھا۔ حجام چھ آنے لیتا تھا۔ باغوں کی طرف ہم لوگ چلے جاتے تھے تو امرود بیر کی قیمت وہاں کے لوگ نہیں لیتے تھے۔ بڑا عمدہ گنا ایک آنے میں مل جاتا تھا۔ مٹر کی پھلیاں توڑنا "جائز" مشغلہ تھا۔ ہوسٹل میں بسکٹ اور وغیرہ فروخت کرنے والے وینڈر آتے تھے۔ ایک صوفی صاحب عمدہ بسکٹ بلکہ گھر کی بعض مٹھائیاں وغیرہ بھی ہم لوگوں کے لیے لاتے تھے۔ مکرجی ملنے کا پان بیچنے والا کمہاری (ہندو) بھی آتا تھا۔ بہت کمزور تھا لیکن پان BETEL کی آواز لگاتا تھا۔ اُسی زمانے کا ممتاز فیرنی والا تھا۔ بہت بوڑھا تھا۔ دُبلا پتلا۔ شیروانی اور سفید پگڑی کے ساتھ بہت تیزی سے چلتا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکا ہوتا تھا جس کے سر پر خوان میں تین قسم کی فیرنی کی پیالیاں ہوتی تھیں۔ ایک کا نام انٹرمیڈیٹ، دوسری کا بی اے اور تیسری قسم کا نام ایم اے تھا۔ اُن کی قیمتیں علی الترتیب ایک آنے، دو آنے اور چھ آنے ہوا کرتی تھیں۔ بریلی کے بانس والی مضبوط چارپائی صرف دو روپے میں مل جاتی تھی۔ پھل اور مٹھائی بہت سستی تھی۔ شعر کی گزک۔ صابن بھی بہت سستی تھی۔ تالے بہت مشہور تھے اور متعدد فروخت ہوتے تھے۔ سڑکوں پر صنوبری پتھر سنگ جل (جبل پور) تھا جو ایک قسم کی مشین سے تیار کیا جاتا تھا۔

طلبہ میں ہنسی مذاق، فطری چیز ہے لیکن ایک دوسرے کی مٹھائی غائب کرنا ضروری مشغلہ تھا۔ کہتے تھے کہ چوری کی مٹھائی کھانے سے مزہ دوگنا ہے۔ لیکن آپس میں ہمدردی بہت تھی۔ کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کے احباب بڑی خدمت کرتے تھے۔ سر کی مالش کرنا۔ دوا لانا۔ پھل وغیرہ دینا ان کی شرافت کا تقاضا تھا۔ ہنسی مذاق میں کبھی بیہودگی نہیں تھی۔ البتہ بعض طلبہ کی اصلاح کے لیے رات کو ان پر پانی یا رنگ پھینکنا بھی ایک مشغلہ تھا جسے ACTIVITY کہتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ بارش کے زمانے میں MID RIOT ہوتا تھا یعنی طلبہ ایک دوسرے پر مٹی اچھالتے تھے۔ سال میں تھانہ بنا ٹیری کے پاس سالانہ نمائش کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ دُور دُور سے مختلف اشیاء کی دکانیں آتی تھیں لیکن طلبہ کی دلچسپی پشاور چابر پراٹھے کی دکان تھی جہاں عموماً سبھی لڑکے شام کے وقت ایک دوسرے کی ضیافت کیا کرتے تھے۔

سالانہ مشاعرے اور مباحثے DEBATES وغیرہ بھی بہت دلچسپ مشغلے۔ یونین کے انتخابات ELECTIONS میں امیدواروں کے لیے کارکن حضرات بہت وقت صرف کرتے تھے۔ تمام ہوسٹلوں میں جا جا کر اُن کی حمایت میں تقریر کرتے تھے۔ پھر جو امیدوار ہار جاتا تھا اُس کے جون کا ماتم کیا جاتا تھا اور اُن کا مرثیہ پڑھا جاتا تھا۔ پھر بھی احتیاط کی جاتی تھی کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

طلبہ میں پڑھنے کا شوق تھا۔ رات کو دیر تک پڑھا کرتے تھے۔ لیکن قریب دس بجے رات تک گپیں لگاتے تھے۔ پھر چائے پی کر نیند بھگائی جاتی ۔ لیکن مجھ جیسے بہت کم لوگ تھے جو عشاء کے فوراً بعد سو جاتے تھے اور تین بجے رات سے اُٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ بعض ایسے رئیس طلبہ بھی تھے جو اکثر میں دیر تک قیام کرنے کو اپنا مقصدِ حیات جانتے تھے اور پاس ہونا نہیں چاہتے تھے۔

میں دسویں جماعت میں تھا تو مجھے سہ ماہی امتحان میں بہت اچھے نمبر ملے اور جغرافیہ کے پرچے میں سب سے زیادہ نمبر ملے۔ چچا بدیع الدین حیدر صاحب میری کاپی کلاس میں لائے اور پوچھنے لگے کہ ? WHO'S ANSWER BOOK IS THIS ۔ میں ڈر گیا کہ شاید کوئی غلطی یا گستاخی مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔ لیکن جب انہوں نے تیسری بار وہی سوال کیا تو میں ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ IT IS MINE چچا بدیع الدین صاحب بہت خوش ہوئے اور بہت تعریف فرمائی۔ بات دراصل یہ تھی کہ جبل پور کے اسکول میں سخت محنت کرائی جاتی تھی۔ کوئی مضمون ایسا نہیں تھا جس میں چھٹی سے آٹھویں جماعت تک وہاں کے طلبہ انگریزی گرامر میں بہت پختگی پیدا کر لیتے تھے۔ یعنی ANALYSIS اور PARSING بہت آسانی سے کر لیتے تھے اور شہر کے دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں بہت ممتاز تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں بھی بہت محنت کرائی جاتی تھی۔ نویں جماعت کے استاد رفیع الدین صاحب مرحوم نے اس قدر محنت کرائی تھی کہ مجھے علی گڑھ کی بارہویں جماعت کے جغرافیہ تک میں سہولت پیدا ہو گئی تھی۔ گیہوں، چاول

کپاس وغیرہ کی کاشت کے لیے مٹی کیسی ہو؟ درجۂ حرارت کیا ہو؟ بارش کتنے انچ تک مفید ہو سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر نقشے بنانے کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔ میں نے مائی امتحان کی کاپی میں یہ سب باتیں لکھی تھیں اور FERREL'S LAW بھی لکھ دیا تھا۔ یعنی :

WINDS BLOWING IN THE NORTHREN HEMISPHERE ARE DEFLECTED TO THEIR LEFT AND WINDS BLOWING IN THE SOUTHERN HEMISPHERE DEFLECTED TO THEIR RIGHT

ممتحن ایسے جوابات سے بہت خوش ہوئے اور میرا بہت خیال کرنے لگے۔

علی گڑھ میں دسویں جماعت، پھر انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک دینیات بھی ایک لازمی مضمون تھا۔ یعنی اگر کوئی طالب علم اس مضمون میں فیل ہو جاتا تھا تو آئندہ سال نہ صرف اس مضمون میں بلکہ تمام مضامین میں اُسے دوبارہ شرکت کرنا لازمی تھا۔ اُس زمانے میں کسی طالب کو کوئی رعایت نہیں تھی اور کبھی کوئی SUPPLEMENTRY EXAMINATION نہیں ہوتا تھا بلکہ پاکستان بننے کے چند سالوں تک بھی یہی قاعدہ تھا۔ دینیات کے اُستاد شیخ علی جواد صاحب تھے جو اُس وقت تو داڑھی منڈوا تے تھے (بعد میں داڑھی رکھ لی تھی) لیکن اپنے معاملات میں بہت متقی اور صداترس تھے۔ طلبہ نے بہت سے فرضی قصّے اُن کی ذاتی زندگی سے متعلق بنا لیے تھے۔ شیخ صاحب فقہی مسائل بہت خوبی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ اُن کی دو باتیں اب تک خوب یاد ہیں کہ پوری بُخاری شریف میں رفع سبابہ کا کہیں ذکر نہیں ہے اور یہ کہ احناف کے نزدیک جمعہ کا خطبہ غیر زبان عربی میں جائز ہے۔ شیخ صاحب عید بقرعید میں معانقہ نہیں کرتے تھے لیکن ہم لوگ اُن سے زبردستی معانقہ کر لیتے تھے۔ وہ اور دوسرے اساتذہ بہت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور اُن سے دن رات میں کسی وقت بھی استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

دہلی کی سیر
درگاہ نظام الدین کی برکات

دسویں جماعت کے زمانے میں دہلی کی سیر کا ارادہ ہوا۔ میرے ہم جماعت محی الدین جمالی (ٹیڈرونا۔ گورکھپور) نے رہبری کی۔ اُس زمانے میں علی گڑھ سے دہلی کا (واپسی کا) ٹکٹ ایک روپے پانچ آنے میں ملتا تھا۔ جمعہ کو جا کر منگل تک واپس آسکتے تھے۔ ہم دونوں غالباً ہفتے کے دن دہلی کو روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر جامع مسجد، لال قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے تک تمام مقامات اور مزارات پیدل ہی دیکھے۔ پھر حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ کے یہاں حاضر ہوا۔ فاتحہ خوانی کے بعد بیٹھ گیا تو آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ انعامات عطا ہوئے جو تحریر میں نہیں آسکتے۔ میرے وہ دوست کئی مقامات پر حاضری کے بعد آئے تو مجھے زور زور سے ہلا کر اُٹھانے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ جائیے میں ذرا دیر اور بیٹھوں گا۔ چنانچہ دوبارہ وہی انعامات عطا ہوئے جو پہلے ہوئے تھے۔ زبان میں طاقت نہیں کہ شکر ادا کر سکوں۔ الحمدللہ۔ الحمدللہ

اپریل ۱۹۳۶ء میں دسویں کا امتحان اسٹریچی ہال میں ہوا۔ اور ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد نتیجہ آیا۔ بحمداللہ بہت اچھے نمبروں سے مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ امتحان کے بعد موسم گرما کی تعطیل میں وطن واپس ہوا تو دو لطیفے پیش آئے۔ وطن میں اور دوسرے مقامات میں بھی عموماً یہ خیال تھا کہ جو لڑکے انگریزی پڑھتے ہیں وہ عیسائی ہو جاتے ہیں اور بہت نازک بن جاتے ہیں۔ وطن میں ایک بزرگ آدمی ملے۔ ازراہِ دینداری فرمانے لگے کہ "اپنے بزرگوں نے جو کچھ قرآن کے بارے میں کہا ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا" یعنی تم قرآن کو مت چھوڑنا جو اپنے بزرگوں نے لکھ دیا ہے)۔ میں سوائے خاموش ہو جانے کے، اور اُن سے کیا کہتا! ایک اور لطیفہ بعد میں یہ ہوا کہ ایک حاجی صاحب جو میرے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ حج کر چکے تھے وہ کسی دوسرے شہر سے ملاقات کے لیے تشریف لے آئے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ اس شہر میں کوئی مقام تفریح کے لیے ہو تو مجھے لے چلو۔ لیکن دیکھو، پیدل چلنا پڑے گا۔ (اُن کا خیال تھا کہ انگریزی پڑھنے کی وجہ سے میں نازک ہو گیا ہوں) میں نے عرض کیا، کہ ضرور چلیے اور پیدل ہی چلیے۔ میرے مکان سے مدن محل قریب ۲ میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا ایک دوست ظہور بڑا مسخرہ تھا۔ اُس سے میں نے کہا کہ حاجی صاحب کو مدن محل کی سیر کرانا ہے۔ دن مقرر ہوا۔ ظہور نے حاجی صاحب سے کہا کہ راستہ میں کوڑے ہو جائیے۔ میں کہوں گا، ایک، دو، تین۔ جب تین کہوں تو آپ چل پڑیے گا۔ چنانچہ تین کہتے ہی حاجی صاحب اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ ظہور نے مجھ سے کہا کہ ہم دونوں بہت تیزی سے چلیں اور قریب ایک فرلانگ چل کر بیٹھ جائیں۔ حاجی صاحب جب ہمارے قریب پہنچیں گے تو ہم لوگ پھر تیزی سے چل کر آگے بیٹھ جائیں گے۔ بہرحال وہ ۲ میل کا فاصلہ اسی طرح طے ہوا۔ پھر جب پہاڑی علاقہ شروع ہوا تو حاجی صاحب بسم اللہ بسم اللہ کہتے ہوئے قدم اُٹھانے لگے۔ ظہور نے ۸۸۸ — ۸۹، کہنا شروع کیا۔ حاجی صاحب مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا کہتا ہے؟ — ظہور بولا

کہا حاجی صاحب میرا قصور نہیں ہے اس لیے میں بسم اللہ کے بجائے ۷۸۶ کہہ رہا ہوں۔ حاجی صاحب چپ ہو گئے لیکن ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد حاجی صاحب نے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد ہے؟ وہاں مسجد کے سامنے بہت سے درخت لگے ہوئے تھے۔ ظہور کہنے لگا کہ دیکھیا جھاڑ فانوس لگے ہوئے ہیں۔ یہیں تو مسجد ہے۔ غرض کہ اس طویل پیدل سفر سے حاجی صاحب کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ انگریزی پڑھنے والے نازک ہوتے ہیں۔ حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ فلاں شخص کی لڑکی کی شادی ہوئی تو میں نے بہت سے تحفے دیے۔ لیکن جب میری لڑکی کی شادی ہوئی تو اس نے کچھ نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ حاجی صاحب مجھے اس شخص کا پتا بتائیے۔ میں اُسے خط لکھوں گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور اُس نے ہمارے حاجی صاحب کو کیا سمجھا ہے! حاجی صاحب کہنے لگے کہ نہیں نہیں، ایسا مت کرنا۔ لیکن میں دریافت کرتا ہی رہا اور وہ نہیں نہیں کہتے رہے۔ بہرحال حاجی صاحب جتنے دن رہے ہم لڑکوں کی تفریح کا سامان بنے رہے۔ یہاں تک تو دسویں جماعت کے زمانے سے متعلق حالات تھے۔ اب گیارھویں بارھویں کے زمانے کے حالات عرض ہیں۔

انٹرمیڈیئٹ کا زمانہ میں نے گیارھویں جماعت میں داخلہ لیا تو مزمل ہوسٹل کا انتخاب کیا۔ اس کے کمرہ نمبر ۳۳ میں میرا قیام تھا تو جبل پور کے مشہور کھلاڑی اور میرے پرانے دوست عبدالحی بھی اسی کمرے میں آ گئے۔ پھر اُن کے عزیز سراج الحق بھی ساتھ ہو گئے۔ عبدالحی نے ہاکی، دوڑ اور لانگ جمپ میں بڑا نام پیدا کیا۔ سراج الحق کے دوست علی جواد (جو کراچی میں جج ہو گئے تھے) اور اس وقت جوبلی ہوسٹل میں تھے، اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت شہرت رکھتے تھے۔ اُن کے ایک دوست بدیع الدین تھے جو سیلون سے آئے ہوئے تھے (اور بعد میں وہاں وزیر تعلیم ہوئے) وہ انگریزی کی قابلیت کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ایک قلمی انگریزی اخبار بھی وقتاً فوقتاً شائع کیا کرتے تھے۔ بہار کے اختر امام بھی جوبلی ہوسٹل سے مزمل ہوسٹل آ گئے تھے۔ وہ عربی اور اردو شعر و شاعری میں نمایاں صلاحیت کے مالک تھے۔ نسخ خط بہت خوبصورت لکھتے تھے۔ میں شرارت سے کوئی مہمل شعر سنا کر اُن سے کہتا تھا کہ بھائی اس شعر کا مطلب سمجھا دو۔ وہ بہت غور کرتے اور کچھ نہ کچھ مطلب نکال لیتے۔ سیکنڈ ایر کے زمانے میں وہ الیکشن کے چکر میں پھنس گئے اور لائبریرین کی جگہ کے لیے منتخب ہو گئے لیکن خواہ مخواہ ایک سال ضائع کر دیا۔ ہم سب کو اُن کے اس نقصان کا بڑا افسوس ہوا۔ قریب ہی کے کمرے میں بہار کے شفیق الحسن تھے۔ بہت خلوص والے تھے (غالباً ۱۹۵۰ء میں اُن کو پٹنہ کے پتے پر میں نے خط لکھا تھا۔ خط پہنچنے سے ایک دو دن پہلے ہی اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُن کے عزیز پروفیسر عبدالمجید صاحب نے جواب دیا تھا) اسی ہوسٹل میں بہار کے معین تھی تھے جنہیں بریگیڈیئر بننے کا بہت شوق تھا۔ طلبہ اُن کو مذاق میں بریگیڈیئر ہی کہا کرتے تھے۔ بہار کے ایک دوست شمس الھدیٰ بھی تھے۔ وہ کراچی آ گئے تھے۔ اللہ اللہ۔ کتنے احباب تھے جن کا اب کوئی پتا نہیں۔ البتہ اختر امام ابھی چند سال پہلے تک سیلون میں عربی کے پروفیسر تھے اور انہوں نے ماہر سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی تھی۔ میں اس ہوسٹل میں دو سال تک نماز کا مانیٹر تھا تو سندھ کے ایک طالب علم کے خالص سندھی نام گُنگھرو گُشین خاں دھیگو خاں پر چونکہ پڑا تھا۔ سندھ کے عرفان کرکٹ کے اچھے کھلاڑی تھے اور شیخ غلام حسن (جو سندھ میں سشن جج وغیرہ کے عہدوں پر فائز ہوئے) میرے خاص دوستوں میں تھے۔ وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کی صاحبزادی خالدہ سندھ یونیورسٹی میں اُستاد ہیں۔ اسی زمانے میں مراد آباد کے سید محمد صاحب، علی گڑھ شہر کے انتظام الدین صاحب اور اُجین کے عبدالغنی صاحب بڑے مخلص دوست رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اچھا رکھے۔ آمین۔

عبدالحی جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے (وہ جبل پور میں ۱۹۸۱ء میں فوت ہو گئے) ایک سال کے قیام کے بعد واپس وطن چلے گئے اور اُن کے عزیز سراج الحق صاحب دوسرے کمرے میں چلے گئے تو میرے کمرے میں حبیب اللہ (دہلی والے) آ گئے۔ وہ پڑھنے سے کم تعلق رکھتے تھے۔ باتیں بہت کرتے تھے اور بار بار پبلک کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اس لیے اُن کا نام ہی پبلک مشہور ہو گیا تھا۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں حج کے موقع پر جدہ میں اُن سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہیں وہ دل کے عارضے میں فوت ہوئے۔

انٹرمیڈیئٹ میں ضروری مضامین کے علاوہ میرے اختیاری مضامین فارسی، تاریخ اور جغرافیہ تھے۔ فارسی جناب محمد صادق صاحب اور محترم ضیاء احمد بدایونی صاحب پڑھاتے تھے۔ تاریخ جناب ابرار احمد قادری صاحب اور عبدالعزیز لاری صاحب پڑھاتے تھے اور جغرافیہ محمد حنیف صاحب پڑھاتے تھے۔ تاریخ کی نصابی کتابوں کے علاوہ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کی تاریخ امیہ و عباسیہ۔ پروفیسر وازش علی صاحب کی تاریخ ترکیہ۔ مکرجی کی تاریخ ہند اور مورین لال کا جغرافیہ مجھے زیادہ پسند تھا۔ دینیات جناب شیخ علی جواد صاحب اور "مولوی گھٹکا" پڑھاتے تھے جن کی توند کی وجہ سے اُن کا یہ نام زیادہ مشہور تھا۔ اُسی توند کی وجہ سے پڑھاتے تھے کہ گنتی کی کوں کہ پڑھائی ختم ہو جاتی تھی۔ ابھی ۴-۵ سال ہوئے اُن کے صاحبزادے مجھ سے ملنے آئے تو انہوں

نے اپنی شناخت اسی مشہور نام سے کرائی۔ انگریزی ایک چھوٹے قد والے استاد پڑھاتے تھے جن کے نام کا انگریزی ترجمہ یعنی COURAGE ALI مشہور تھا۔ لیکن سید ولی محمد صاحب (وائس پرنسپل) اور اشفاق صاحب (نواب وقار الملک کے صاحبزادے) بہت شفقت اور محبت سے انگریزی پڑھاتے۔ عبدالشکور صاحب بھی انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ بعد میں افریقہ چلے گئے تھے۔ (میری عادت تھی کہ استادوں کی تقریر کا ہر لفظ لکھ لیتا تھا۔ اس لیے مجھے امتحان کے وقت بڑی آسانی ہو جاتی تھی اور بہت سے طلبا اسی لیے مجھے گھیرے رہتے تھے)۔ اُردو جناب خاورس صاحب اور مولانا احسن مارہروی پڑھاتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ اپنی قابلیت، الفاظ پسندی اور بذلہ سنجی میں بے مثل تھے۔ اور مولانا احسن ہی کا فیض تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج میں کُل ہند مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں پورے ملک کے مشہور شعرا شرکت کرتے تھے بلکہ بعض کو اسی شرکت کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ مولانا نے رام پور کا ایک تمثیلی مشاعرہ منعقد کیا تھا اور اُن شعرا کے ایسے حالات لکھے تھے جو وہی لکھ سکتے تھے۔ مولانا نے طلبہ میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا کرنے کے لیے طرحی مشاعرے بھی شروع کیے تھے، وہ کوئی مصرع دے دیتے تھے جس کے مطابق طلبہ غزلیں تیار کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا نے ایک مصرع دیا تھا: ؏ افسانہ سنا دو جو تمہیں یاد زبانی ہو۔ ایک شریر طالب علم نے ایک غزل ایسی لکھی جس کے ایک شعر میں مجنوں کو لیلیٰ کا شیرخوار بیٹا بنا دیا۔ شعر یہ تھا:۔

مجنوں کو رلے کے ...... لیلیٰ نے یوں کہا
لے پی لے ...... جو تو نے پیا نہ ہو

مولانا اس شعر پر خاموش، خاموش ہی کہہ سکتے تھے۔ لیکن پورا ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

ایسے مشاعروں کی وجہ سے شعر گوئی کا ذوق عام ہو گیا تھا۔ نیو سرکل کے دواخانے میں ایک کمپاؤنڈر تھے۔ اُن کا قد چھوٹا تھا۔ لڑکے ان کو ڈاکٹر ٹنی (TINY) کہا کرتے تھے۔ وہ بھی شاعری فرمانے لگے تھے۔ میرے کمرے میں کبھی کبھی آ کر اپنے بے تکے اشعار سنانے لگتے تھے۔ لڑکے انہیں گھیر لیتے تھے بڑی تفریح رہتی تھی۔ میں اُن سے کہتا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے اشعار میں کیا خوب سکتہ ہے۔ وہ خوش ہو جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ سکتہ کوئی خوبی ہے۔ مزمل ہوسٹل کے جنوب میں کسی کالونی کے کھنڈر تھے۔ پانی بھرا رہتا تھا۔ تیتر وغیرہ پرند وہاں آ بیٹھتے تھے۔ ہمارے دوست سردار خاں (گنڈاپور) بہرائچ والے) اکثر پرندوں کا شکار کر کے ہم لوگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اُس جگہ اب ہی بنگلے بن گئے تھے۔ ہمارے استاد ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا بنگلہ بھی وہیں بن گیا تھا۔

اس ہوسٹل سے مغرب کی جانب (قریب ایک میل پر) دولت راؤ سندھیا کا قلعہ تھا جو ۱۸۰۳ء میں GENERAL LAKE نے فتح کیا تھا۔ ہمارے زمانے میں اُجاڑ تھا۔ بڑی بڑی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ببول کے درختوں میں فاختہ کے گھونسلے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں مورنی کے دو انڈے ملے تھے۔ سیاہ سانپ اور دو مُنہ کے سانپ بھی وہاں تھے۔ خار پُشت جانور کے بل بھی تھے۔ اُس سے کچھ آگے ایک جگہ پانی بھرا رہتا تھا جہاں سنگھاڑے کی کاشت تھی۔ احباب کا مشورہ ہوا کہ وہاں چلو۔ سنگھاڑے کھائیں گے۔ سنگھاڑے کھا کر واپس ہوئے تو ایک بہت بڑا سیاہ سانپ اپنے بِل سے نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ سب لڑکے بھاگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی۔ میں اُسے گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ بھی تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر واپس چلا گیا۔

علی گڑھ میں ۱۹۳۰ء میں بجلی شروع ہوئی۔ لیکن پنکھے وغیرہ نہیں لگے تھے۔ ہم لوگ اس سے پہلے لالٹین استعمال کرتے تھے اور منٹو سرکل اور نیو سرکل کے بیچوں بیچ باغ کے اندر فانوس لگے ہوئے تھے۔

اُس زمانے میں مٹھائی کی چوری کا ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ ایک طالب علم نے داخلہ لیا اور کمرے میں وہ اپنا سامان سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس کی مٹھائی کی ٹوکری غائب ہو گئی۔ وہ دوڑتا ہوا وارڈن صاحب کے پاس شکایت کرنے گیا۔ انہوں نے فرمایا "لڑکے کتنے نالائق ہیں کہ سب مٹھائی کھا گئے اور مجھے بھی شریک نہیں کیا"۔ وہ بیچارہ یہ جواب سُن کر اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا۔ اُسے اُس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ علی گڑھ کی زندگی میں مٹھائی کا غائب کرنا ایک مروجہ تفریح ہے۔ اپریل ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان میرس ہوسٹل کے ہال میں منعقد ہوا۔ ۹ بجے امتحان شروع ہوا اور صرف ۵ منٹ کے بعد ایک ساتھی چیخ اُٹھا۔ میں آرٹس میں تھا اور مغربی پاکستان کے گورنر اختر حسین کا چھوٹا بھائی عاشق حسین سائنس میں تھا۔ بہت ذہین اور محنتی تھا۔ وہ غالباً دوات یا قلم اُٹھانے کے لیے جُھکا ہی تھا کہ HEAD INVIGILATOR صاحب گرج کر فرمایا۔ WHAT'S THERE؟ بس تین سال کے لیے اس بیچارے کو تعلیم سے خارج کر دیا۔ ہر شخص کو افسوس ہوا لیکن ڈسپلن ایسا تھا کہ کوئی احتجاج نہ ہو سکا۔ یہ HEAD INVIGILATOR اسی طرح کے کارنامے انجام دینے میں شہرت رکھتے تھے۔ وہ اسٹیج پر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے چہرے کے سامنے اخبار کھول لیتے تھے اور اخبار میں تھوڑا سا سوراخ کر کے اس میں سے چاروں

بال کو دیکھتے رہتے تھے۔ گویا وہ طلبہ کو موقع دیتے تھے کہ وہ کچھ کریں اور میں اُن کو نکالوں۔ متعدد طلبہ کی سرگرمیاں ایسی نہ تھیں کہ ... آخر اُن کا
اور اُن کی اولاد کا جو انجام ہوا وہ یونیورسٹی والوں سے پوشیدہ نہیں۔

بی اے کا زمانہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ۱۹۳۶ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور یونیورسٹی میں بی اے کلاس میں داخلہ لیا۔ سید محمد صاحب(1) میرے ہم عمر تھے۔ اُن کے ساتھ S.S. WEST ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۶۸ میں میرا قیام تھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے اور اکثر ہاکی میچ کھیلنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ دوڑ لگانے میں بھی اُن جیسے لوگ شاذ و نادر ہوں گے۔ ایک مرتبہ اُن کے ساتھ میں نے بھی علی گڑھ سے ... گڑھی سٹیشن تک (۹-۱۰ میل) دوڑ لگائی تھی۔ فارسی اور انگریزی کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں اُستاد مختار حامد علی صاحب کی وجہ سے THOMAS HARDY کے ناولوں اور افسانوں سے طلبہ کو زیادہ دلچسپی تھی۔ سید محمد صاحب ہر ہفتے ہارڈی کی ایک کتاب پڑھ کر اُس کا خلاصہ مجھے سناتے تھے۔ میں بھی اسی طرح اُن کو سناتا تھا۔ G.K. CHESTERTON - A G GARDINER - WILLIAM LEQUE - F W BAIN — STEVENSON وغیرہ بکثرت مصنفین کی کتابیں ہم دونوں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ اسی لیے ہم لوگوں کی انگریزی آج کل کے ایم اے (انگریزی) کے مقابلے میں بہت غنیمت ہے۔

علی گڑھ میں بی اے انگریزی کا نصاب بھی مشکل تھا۔ پہلے سال اُردو، دینیات کے علاوہ انگریزی زبان کا بھی ایک پرچہ لازمی تھا جس میں

(۱) سید محمد صاحب پبلک پولیس کے بہت اعلیٰ افسر تھے۔ ریٹائر ہو کر اب اسلام آباد میں ہیں۔ اُن سے چھوٹے بھائی کرنل سید مصطفیٰ صاحب ہندوستان میں ہیں اور سب سے چھوٹے سید ... صاحب۔ کمشنر، سکریٹری، پھر علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو سلامت با کرامت رکھے۔ آمین۔ سید محمد صاحب کی شادی علی گڑھ میں ۱۹۳۷ء کے اواخر میں ہوئی تھی۔ شرم کی وجہ سے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن بلبل شاہد صاحب ... تھے اس لیے اندازہ ہو گیا تھا۔ سید محمد صاحب اپنے گھر سے اکثر کھانا لایا کرتے تھے۔ خود بھی حلوہ وغیرہ پکا لیتے تھے۔ اُن کی اہلیہ صاحبہ بہت خوش مزاج ہیں۔ ہمیشہ اُن کو چھیڑتی رہتی ہیں۔ پروفیسر وقار عظیم مرحوم، سید محمد صاحب کے ہم زلف تھے۔

تین کتابیں تھیں۔ دوسرے سال شکسپیر کے دو ڈرامے۔ جدید انگریزی شعراء سے متعلق دو کتابیں۔ نثر کی کئی کتابیں۔ جدید ڈراما وغیرہ داخل نصاب تھا۔ فارسی نثر و نظم محترم ضیاء احمد بدایونی جیسے فاضل پڑھاتے تھے۔ تاریخ پروفیسر عبدالرشید پڑھاتے تھے بہت تیاری کر کے آتے تھے۔ بنگالی عبدالحلیم صاحب (جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے) تاریخ کا تمام TUTORIAL CLASSES لیا کرتے تھے(1)۔ تاریخ کے نصاب میں A SHORT HISTORY OF MUSLIM RULE IN INDIA ایشوری پرشاد کی تھی جو پہلے بچوں کے لیے تاریخ لکھا کرتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اورنگ زیب چار وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے (ایسی غلطیاں اس کتاب میں کئی جگہ ہیں)۔ تاریخ میں ROBERTS کی برٹش پیریڈ۔ LANE POOL کی OTTOMAN EMPIRE۔ جسٹس امیر علی کی HISTORY OF SARACENS وغیرہ داخل نصاب تھیں۔ تاریخ کی ان تمام کتابوں کے خلاصے میں نے اور مدراس کے حبیب اللہ بیگ نے مل کر تیار کر لیے تھے۔ تاریخ کے لیے دوسری کتابیں بھی تھیں جو غیر نصابی تھیں لیکن بہت مفید تھیں۔ ہر سال ... کے لیے مرزا ابو بکر محمد شیث صاحب اور مولانا سید سلیمان اشرف صاحب جیسے بزرگوں سے بھی رجوع کیا جاتا تھا۔

انگریزی میں مختار حامد علی صاحب ہم لوگوں کے ساتھ بڑی محنت کرتے تھے۔ TUTORIAL CLASSES بھی وہ لیتے تھے۔ بہت سنجیدہ اور باوقار اور دُبلے پتلے تھے اور ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے۔ پڑھاتے وقت اُن کے منہ میں ایک طرف جھاگ بھی جمع ہو جاتا تھا۔ لیکن کبھی تھکاوٹ ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے اُستاد محمود حسین صاحب تھے۔ وہ بعض حروف حلق سے ادا کرتے تھے تو یار لوگ اُن کو قاری محمود حسین کہتے تھے۔ وہ عموماً GOLDEN TREASURY پڑھاتے تھے۔ ایک اور اُستاد پارسی تھے۔ دُراب جی نام تھا۔ بڑے با اخلاق اور محنتی تھے GALSWORTHY کا ڈراما بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ انگریزی کی ایک کتاب JOHN BUCHAN کی THE PATH OF THE KING تھی جو اسلوب اور انداز بیان کے لحاظ سے بہت مشکل تھی۔ لڑکے پریشان تھے۔ بفضلہ تعالیٰ میں نے اُس کا خلاصہ بنا لیا تھا جس سے طلبہ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ سید محمد صاحب کے ساتھ S.S. WEST ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۶۸ میں میرا بھی قیام تھا۔ وہ کمرہ ایسا تھا کہ اُس کی پُشت

(1) اُن کو کرکٹ کا بہت شوق تھا۔ یہاں کے اُستاد وحید الحق صدیقی صاحب کے مکان پر شام کو اپنا شوق پورا کرتے تھے۔ بعد میں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اُستاد مقرر ہوئے۔ اتفاق سے تاریخ کے ایک مقالے کا اُن کے ساتھ ایک ممتحن میں بھی تھا۔

کھیل کے میدان سے کرکٹ اور ہاکی وغیرہ کے میچ بیٹھے بیٹھے دیکھے جا سکتے تھے، کرکٹ کے کرم ہاشمی WICKET KEEPER تھے اور بھاری بھرکم تھے۔ وہ BURGO MASTER کہلائے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی دلچسپی کی خاطر، وارڈن صاحب کو کہہ کر جا کر وہ خالی کرا لیا اور ہم لڑکوں کو TOWER GATE کے قریب کا ایک کمرہ نمبر ۳۲ دلوا دیا۔ سید محمد صاحب اُس کمرے میں چلے گئے اور میں عثمانیہ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۔۔ میں منتقل ہو گیا۔ وہاں جبل پور کے منا من علی اور افضال علی تھے۔ افضال علی چند ماہ کے بعد تعلیم چھوڑ کر ملازمت کے لیے چلے گئے تو ضیاء الحسن اُن کی جگہ آ گئے۔ عثمانیہ ہوسٹل آتے ہی ایک لطیفہ درپیش ہوا۔ ایک صاحب بہت موٹے تھے۔ یار لوگ انہیں FILTER کہا کرتے تھے۔ وہ ایک دن فرمانے لگے کہ اس (عثمانیہ ہوسٹل) میں میری اجازت کے بغیر کوئی ACTIVITY نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنے سید محمد صاحب سے کہا کہ آج ان صاحب کی اجازت کے بغیر انہی پر ACTIVITY کی جائے۔ سید محمد صاحب عمدہ پختہ سُرخ رنگ بازار سے لائے۔ اُسے پانی میں خوب پکاتے رہے۔ پھر رات کو فلٹر صاحب کو اُس رنگ سے غسل دلا دیا۔ سید محمد صاحب رنگ پھینک کر کمپاؤنڈ کے مشرقی دروازے سے باہر کود کر چلے گئے۔ ہم لوگ فلٹر صاحب سے ہمدردی کرنے کے لیے جمع ہو گئے کہ اُن کی اجازت کے بغیر کس نے انہیں رنگین غسل دلا دیا۔ ہم لڑکے کس کی خبر لیں گے۔ ایک اور لطیفہ بلاوجہ وجود میں آ گیا۔ ہمارے چند کمروں کے لیے عبدالمجید خدمت گزار تھا۔ رمضان شریف کا زمانہ آیا تو سحری کے وقت فرنی بھی آنے لگی۔ کمرے میں ایک الماری تھی۔ اُس میں کھانا اور فرنی رکھی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ عبدالمجید فرنی کے ساتھ شوق فرما رہے تھے۔ منہ اور ہاتھ دونوں مصروف تھے۔ عبدالمجید کی پیٹھ میری طرف تھی۔ چنانچہ اُس کی پیٹھ کا ڈھول بجا دیا گیا۔ پھر تو وہ مجھ سے اس قدر خائف رہنے لگا کہ جن طلبہ کا کام وہ ٹال دیا کرتا تھا میرے کہنے پر مجبوراً کرنے لگا۔

عثمانیہ ہوسٹل میں آتے ہی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو انعام حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ جامع مسجد میں (جو ساتھ ہی تھی) بعد عصر کے، مولانا سلیمان اشرف صاحب کے درسِ تفسیر میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور دوسرا انعام یہ ملا کہ اسی زمانے میں (۱۹۳۲ء) اُستاذ القراء قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادی کا تقرر تجوید و قرأت پڑھانے کے لیے ہوا تو مغرب کے بعد اُن کے مدرسہ میں حاضری ہونے لگی۔ اُن کا کمرہ جامع مسجد کے مشرقی حصے میں تھا۔ بفضلہ تعالیٰ جلد ہی تکمیل نصیب ہوئی (اگرچہ شاطبیہ شریف بعد میں اُن سے پڑھی)۔

اسی زمانے میں (یعنی بی اے کلاس میں) دو ساتھی غلام احمد خان نام کے تھے۔ ایک تو نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کے صاحبزادے تھے۔ جنہوں نے کچھ عرصے کے بعد اپنے نام میں "مدنی" کا اضافہ کر لیا تھا۔ دوسرے حیدرآباد (دکن) کے تھے۔ مدنی صاحب شرافت اور دیانت کا مجسمہ تھے اور انہوں نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ نواب صاحب کے بیٹے ہیں۔ البتہ عثمانیہ ہوسٹل میں اُن کا کمرہ پوری نوابی شان کا تھا جس کا فرنیچر بعد میں ایک وارڈن صاحب نے اُن سے مانگ لیا تھا۔

عثمانیہ ہوسٹل کے خاص احباب میں محمد ممتاز (گورکھپوری)، نبی احمد (بہاری) اور عبدالقادر تھے۔ عبدالقادر بہت خوش الحان تھے۔ اور دینی مدرسوں کی اکثر تقریبات میں وہی تلاوت کرتے تھے۔ لیکن سونے میں بھی بہت مہارت رکھتے تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ فلاں کتاب میرے ساتھ پڑھو۔ میں کتاب شروع کرتا اور وہ سونا شروع کرتے۔ بار بار اُن کو جگاتا تھا لیکن سونے سے باز نہیں آتے تھے۔ حبیب اللہ بیگ (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) مدراس کے رہنے والے تھے۔ بہت ذہین اور محنتی تھے۔ میرے ساتھی منا من علی اُن کی شان میں کہا کرتے تھے: — حبیب اللہ بیگ۔ پکائی دیگ۔ دیگ میں نکلا ناگا — حبیب اللہ مدراس کو بھاگا۔

مدراس کے ایک طالب علم Y. MUHAMMAD تھے۔ بہت سیدھے سادے بھولے تھے۔ اُردو بہت کم جانتے تھے۔ یار لوگ اُن کو بہت چھیڑتے تھے۔ ایک صاحب بکثرت لحاف اوڑھ کر پڑے رہتے تھے۔ اُن کا نام "مولانا فی اللحاف" ہو گیا تھا۔ ایک لیمو مرزا زرتی تھے (جو اکثر اوپر مرزا صاحب کے عزیز تھے)۔ اُن کو مرزا چپیا (پپیا) کہا جاتا تھا۔ وہ فزکس ایم ایس سی PHYSICS کے واحد صاحب علم تھے۔ بعد میں مجبوراً اس کے لیے "تھرڈ کلاس فرسٹ" ہوئے۔ ایک صاحب مولانا امین حیدرآباد (دکن) کے تھے۔ مجھ سے بڑی محبت تھی۔ بہت پڑھتے تھے کیونکہ کمبخت کتابیں "بہت مشکل سے انہیں" یاد ہوتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ میری بیوی (وطن میں) مجھ سے ناراض ہے۔ اُس سے میری سفارش کر دو، چنانچہ میں نے اُن کی بیوی کو ایک منظوم خط اس طرح لکھا :—

دوست میرے ہیں جو منظور الامین — خود کو عاجز کرتے ہیں آمدہ گیں
خوب کھایا کرتے ہیں زردہ پلاؤ — مجھ سے کہتے ہیں کہ آؤ تم بھی کھاؤ
ناشتے میں پوریاں کھاتے ہیں چار — کھانے میں سب مان لیتے ہیں اُن سے ہار
ماش کی دال اُن کو بس مرغوب ہے — خود پکا لینے کی عادت خوب ہے
ہے کسی کا ایک شعر اِن کے لیے — سُن لیں بھائی جان اس فن کے لیے

"فراق یار میں گُھل گُھل کے ہو گئے ہاتھی
ہزار فکر کی قد پاؤں تک نہیں آتی"

معلوم نہیں اس خط کے پہنچنے پر بھائی منظور الامین کو کیا ڈانٹ پڑی۔ وہ کچھ عرصے تک خاموش ہی رہے اور ہم ان کو چھیڑتے ہی رہے — "چو کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی" — پھر کئی سال کے بعد حیدر آباد (دکن) میں اُن کے در دولت پر بھی حاضر ہوا تھا۔

ایک جگت دوست "مختار جمیل" مداروں کے رہنے والے تھے۔ ہر محفل میں خوش باش اور حافظ ماش تھے۔ بڑی داڑھی تھی۔ نماز کے سخت پابند تھے۔ ہاکی کے کھلاڑی تھے۔ کبھی کبھی کرکٹ بھی کھیل لیتے تھے۔ کبھی کوئی گیند روک لیتے تھے تو ہر طرف سے "تھینک یو میاں فیلڈ" کی آوازیں آتی تھیں۔ گانے کے شوقین تھے۔ داغ کی یہ غزل ہل ہل کر سناتے تھے: پیامی کام یاب آئے نہ آئے — مرے خط کا جواب آئے نہ آئے

اسی زمانے میں مجھ سے ایک کام شیخی کا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ بعض احباب کے ساتھ دولت راؤ سندھیا کے قلعے کی طرف جانا ہوا۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ اس قلعے کی دیوار سے کون کود سکتا ہے؟ میں نے شیخی میں کہہ دیا کہ میں کود سکتا ہوں۔ میں نے صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا اور میں کود گیا۔ شکر ہے کہ ہاتھ پاؤں سلامت رہے لیکن کمر میں اس زور کا جھٹکا لگا کہ میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ بڑی ہمت کر کے اٹھا اور سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر اسی جگہ دیر تک ڈنڈ بیٹھک لگاتا رہا اور بعد میں قریب تین میل کی دوڑ لگائی۔ لیکن ۱۵ — ۲۰ دن تک کمر میں درد رہا۔ شرم کی وجہ سے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا اور ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گیا۔ بحمد اللہ آرام ہو گیا۔ اسی زمانے میں میری آنکھیں بھی کمزور ہو گئیں تو ایک دوست کے مشورے پر میں نے سونف بہت کھائی جس سے بفضلہ تعالیٰ میری آنکھیں اب تک اچھی ہیں۔

علی گڑھ میں اب سر راس مسعود صاحب وائس چانسلر ہوئے۔ انہوں نے اکثر شعبوں میں جرمنی کے اُستادوں کو رکھ لیا۔ حتیٰ کہ عربی کے شعبہ میں DR. OTTO SPICE کو لے لیا، حالانکہ اُن سے زیادہ قابل لوگ اس شعبے میں موجود تھے۔ البتہ جغرافیہ کے شعبے میں قاضی جلال صاحب کی جگہ ڈاکٹر عبادالرحمٰن صاحب کو لے لیا۔ اُن کی وجہ سے شعبے کو بہت ترقی ہوئی۔ قاضی جلال صاحب بہت خوش مزاج تھے۔ بہت سے انگریزی الفاظ کو وہ اردو کا رہین منت کہا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں ایک شخص عصا ٹیک کر جا رہا تھا تو اس سے STICK بن گیا۔ "دیکھو رے شان" سے DECORATION بنا ہے۔ "ٹالو رے شان" سے TOLORATION بنا ہے۔ CORPORATION دراصل "کار پریشاں" سے ہے۔ غرض کہ ان کو خوب سوجھتی تھی۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

میں بی اے فائنل میں پہنچا تو مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ میری عادت تھی کہ ہر کلاس میں اُستادوں کا ایک ایک لفظ اپنی کاپی میں لکھ لیتا تھا۔ اس لیے مجھے امتحان کی تیاری میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی اور اکثر طلبہ مجھے گھیرے رہتے تھے۔ چنانچہ صبح کو نماز اور تلاوت سے فارغ ہوتا تھا تو کچھ طلبہ آ جاتے تھے۔ اُن سے فارغ ہوتا تھا تو ۸ بجے سے ایک بجے تک یونی ورسٹی کی کلاسوں میں مصروف رہتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھتا تھا۔ ظہر کے بعد کچھ احباب (بالخصوص بی احمد اور شیخ غلام حسن) فارسی پڑھنے آ جاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد تفسیر کے درس میں شریک ہو جاتا تھا۔ میرے ایک دوست انتظام الدین، ریلوے اسٹیشن کے قریب محلہ شاہ کمال میں رہتے تھے۔ انہوں نے انگلش کی تیاری نہیں کی تھی۔ اس لیے مغرب سے عشاء تک اُن کی تیاری میں مصروف رہتا تھا۔ پھر اپنے کمرے کو واپس آتا تھا۔ [illegible] سے مجھے اُن تھک زندگی کا حوصلہ ملا۔ اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر کروں کم ہے۔

۱۹۳۲ء میں کتاب "انگارے" شائع ہوئی تو علی گڑھ شہر سے ایک ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اخبار اُس کے خلاف شائع ہوا۔ مدیر کا نام تو یاد نہیں لیکن اخبار کا نام "خشخاش" یاد ہے جو خان بہادر شمس العلماء مولانا ابوالفضل کے ہر جملے کا مجموعہ تھا۔ اس میں ایک مستقل کالم "کھائیں انگارے . . ." ہوا کرتا تھا۔ مدیر ت کے لیے جو نیا نیا فرق پیدا ہوا تھا اور صرف بھائی بہنوں کے قصوں کو شائع کرتا A LLIMA ② کیا گیا تھا اُس کے خلاف اس اخبار میں برابر مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں فلسفے کے صدر ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب اس نئے ترقی سخت خلاف تھے اور طلبہ کو بھی اس کی مخالفت پر آمادہ کیا کرتے تھے۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں بی اے (فائنل) کا امتحان ہوا میرا رول نمبر ۱۴ تھا۔ مجھے بھی اچھے نمبر ملے۔ لیکن غلام احمد مدنی سب سے اوّل رہے۔ اُن کا رول نمبر ۱۳ تھا۔ وہ پہلے بھی ہمیشہ ہر کلاس میں اوّل پاس ہوتے رہے۔ میرٹھ سے میٹرک اور انٹر پاس کیا تھا اور دونوں میں اوّل آئے تھے۔

ایم اے کا زمانہ | بی اے پاس کرنے کے بعد محمد ممتاز (کھرپ پور والے) اور چودھری عبد الحمید (جالندھر والے) کے ساتھ میں نے بھی ایم اے (فارسی) کلاس میں داخلہ لے لیا۔ غلام احمد مدنی صاحب نے بھی (غالباً) داخلہ لیا تھا لیکن وہ کلاس میں نہیں آتے تھے اور انڈین سول سروس کے امتحان کی تیاری میں مشغول رہتے تھے۔ شعبہ فارسی کے صدر جناب ڈاکٹر ہادی حسن صاحب تھے۔ نہایت حسین و جمیل، خوش پوشاک، خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے۔ ایرانی ماں کے سپوت تھے۔ بے حد ذہین اور محنت مند تھے، فرماتے تھے کہ کیمبرج میں بی اے آنرز اور بی ایس سی آنرز کے زمانے میں جارج پنجم کا بیٹا ایڈورڈ (جو صرف شادی کی خاطر تخت سے دستبردار ہوا اور بعد میں ڈیوک آف ونڈسر DUKE OF WINDSOR کہلایا) میرے ساتھ تھا۔ میں نے ایک سخت مشکل کتاب شروع سے آخر تک رٹ ڈالی تھی لیکن امتحان میں اُس کو اوّل قرار دیا گیا اور مجھے دوم۔

ڈاکٹر صاحب نے بعد میں لندن سے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ فارسی اور انگریزی اُن کے قدم چومتی تھی۔ تقریر اس قدر دلپذیر ہوتی تھی کہ ان زبانوں کے نہ جاننے والے بھی ہمہ تن گوش بن جاتے تھے۔ PERSIAN NAVIGATION اُن کی پہلی کتاب تھی جو کئی مقالوں پر بھاری تھی۔

① اُس زمانے میں انگریزی کے ایسے جملے بنانے کا شوق تھا:-

پھر متعدد کتابیں لکھیں۔ انگریزی ایسی لکھتے تھے کہ انگریز بھی شرما جاتے تھے۔ پونا کے پرنسپل F. W. BAIN (FERGUSON COLLEGE) جو FUGURATIVE STYLE کے لیے مشہور تھے اُن کی کتابوں کے جملے کے جملے ڈاکٹر صاحب کو ازبر تھے۔ اور اپنی تقریر میں اُن کو اس خوبی کے ساتھ شامل کر لیتے تھے کہ کسی کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ جملے کسی اور کے ہیں۔ انداز بیان میں اس قدر دلکشی تھی کہ اگر کئی مقرر ایک وقت میں بولنے والے ہوتے تھے تو حاضرین کو صرف ڈاکٹر صاحب کی تقریر سننے کا اشتیاق غالب رہتا تھا۔ بی ٹی کالج کے پرنسپل غلام السیدین صاحب (جو خود بھی بہت ذہین تھے) ڈاکٹر صاحب کو STAGE DRAMATIST کہا کرتے تھے۔ جدید فارسی میں پورے ملک میں اُن کی طرح شاید کوئی ماہر رہا تھا۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ تم بھی بہت سی تحریریں رٹ لیا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ قرآن پاک کیوں حفظ نہیں کر لیتے؟ انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ میں ایک تہائی قرآن حفظ کر چکا ہوں (خدا کرے کہ مکمل کر لیا ہو)۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمانے لگے کہ تم تذکرہ دولت شاہ کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالو۔ میں نے اُن کے حکم کی تعمیل میں تقریباً نصف کتاب کا ترجمہ کیا۔ اور جو اشعار اُس میں تھے اُن کا انگریزی اشعار میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور مرتے دم تک وہ ترجمہ اپنے پاس رکھا۔ اُن کا انگریزی خط اور نستعلیق خاص طرز کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت با اخلاق اور بہت بامروت تھے۔ اس کا ثبوت اُن کی اہلیہ تھیں جن کے متعلق لوگ عجیب قصے بیان کیا کرتے تھے۔ مگر ہم لوگوں نے اُن کے بنگلے میں یا باہر کبھی نہیں دیکھا۔

شعبے کے دوسرے اُستاد لفٹننٹ حاجی حمید الدین صاحب تھے۔ وقت کے سخت پابند۔ پڑھائی کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی فوراً پڑھائی

---

(1) ROUND AND ROUND THE RUGGED ROCKY RAMPARTS THE RIDING RULEVRAN

(2) DOWN DID HE DWELL IN THE DEPTHS OF DESPAIR AND DESPONDENCY

(3) POOR, PRECIOUS POVERTY PREDICTED PERDITION TO THE PUBLIC.

② اس نئے شوق کا مظاہرہ علی گڑھ کی بعض فلمی شاعرات اور بنام زمانہ سلمان گیلانی کے خاندان میں جلد ہوا تھا۔

ـــ غالباً مولانا وحید الدین انصاری تھا (مؤلف)

شروع کر دیتے تھے اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی فوراً پڑھائی ختم کر دیتے تھے بلکہ جملہ بھی ادھورا چھوڑ دیتے تھے۔ ایک بار تو مجھ سے فرمایا کہ تم فلاں جگہ (غالباً) نو بج کر دس منٹ پر مجھ سے ملنا۔ مجھے ۲-۳ منٹ کی دیر ہو گئی تو وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لیکن بہت ہمدرد اور سخت کوش تھے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ تم لیڈر بننا۔ ۱۹۳۵ء میں جب کہ ہم لوگوں کا فاضل کا امتحان ہونے والا تھا وہ ریٹائر ہو گئے اور رونے لگے کہ مجھے اپنے مضمون (علم) سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت محنت اور دیانت کے ساتھ پڑھاتے تھے۔

تیسرے اُستاد فاضل یگانہ ضیاء احمد بدایونی صاحب تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں اور اُن کے ادب پر اتنا عبور حاصل تھا کہ خود ان مضامین کے پڑھانے والے اُن کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ بخار کی حالت میں بھی وہ پڑھانے کے لیے تشریف لاتے تھے اور اس فراغت سے پڑھاتے تھے اور ایسے نکات بیان فرماتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شعر و شاعری اُن کے گھر کی لونڈی تھی اور مخطوطات کی قرات اُن کے لیے ذرا بھی مشکل نہ تھی۔ اُن کی اس صلاحیت کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا جب کہ بعض عربی اشعار (جن کی تصحیح ہمارے ملک کے بعض بڑے علماء نہ کر سکے تھے) قبلہ ضیاء احمد صاحب نے فوراً سمجھا دیے اور تصحیح کر دی۔ اسی زمانے میں نیویارک (امریکہ) سے بہائیوں کی طرف سے ایک مقالہ لکھنے کی دعوت آئی۔ موضوع تھا :- HOW CAN YOUTH CONTRIBUTE TO THE REALISATION OF A UNIVERSAL RELIGION
میں نے فارسی میں مقالہ لکھا اور بہائیوں کی خوب خبر لی۔ قبلہ ضیاء احمد صاحب نے پسند فرمایا۔ پھر بہائیوں نے بھی میرے مقالے کی بہت تعریف کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا مقالہ اُن کے خلاف تھا اس لیے انعام مجھے وہ کب دے سکتے تھے؟

اسی زمانے میں CALIFORNIA یونیورسٹی سے ایک خط آیا کہ اگر کوئی تحقیقی مقالہ پرائیویٹ طور پر بھی کوئی طالب علم تیار کرے گا تو ہم اُسے ڈگری دے سکتے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ فارسی میں مقالہ لکھوں لیکن بعض حضرات سے رائے نہیں ہوئی، کیونکہ اُس زمانے میں مولانا کے خاطر بیمار کر کے وقت نہیں تھا
قبلہ ضیاء احمد صاحب کا نستعلیق اور انگریزی خط بہت پاکیزہ تھا اور جلد جلد لکھنے پر بھی اُن خطوں کے حسن میں کوئی فرق پیدا نہ ہوتا تھا۔

اُسی زمانے میں ایم اے کے ساتھ ایل ایل بی کلاس میں بھی داخلہ لیا جا سکتا تھا جو صبح کے وقت ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس کلاس میں بھی داخلہ لے لیا۔ مولانا عبدالحق صاحب شعبے کے صدر تھے۔ بیرسٹر اسحٰق خسرو اور بیرسٹر اسحٰق خواجہ بھی استاد تھے۔ میں اکثر نادار خان (1) صاحب کے ساتھ بالکل اگلی صف میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے کچھ دیر ہو گئی تو میں آخری صف میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک فیلٹ کیپ میرے ڈیسک پر آ گئی۔ بات یہ تھی کہ ہندو طلبہ اگر ترکی ٹوپی نہ پہننا چاہتے تو انہیں فیلٹ کیپ پہننے کی اجازت تھی۔ ایک ہندو طالب علم نے اپنی ٹوپی ڈیسک پر رکھ دی تھی تو ایک طالب علم نے شرارت سے اُسے اُٹھا کر پیچھے کے ڈیسک پر پہنچا دیا تھا۔ وہاں سے اور پیچھے کے ڈیسک پر آئی اور مختلف ڈیسکوں سے ہوتی ہوئی میرے پاس آ گئی تھی۔ میں اُسے لے کر باہر چلا آیا تو یار لوگوں نے اُس کی فٹ بال کھیل ڈالی اور اُس کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ دوسرے دن اُن چیتھڑوں کو لے کر کلاس میں پہنچا اور ایک پرچہ لکھا کہ "پنڈت جی، بہت افسوس ہے کہ آپ کی ٹوپی کی میرے دوستوں نے فٹ بال کھیل ڈالی اب جو کچھ بچی ہے آپ کی خدمت میں واپس کرتا ہوں۔" نادار خان نے وہ رقعہ اور وہ چیتھڑے (لے جا کر) بیرسٹر اسحٰق خسرو صاحب کی میز پر رکھ دی۔ وہ بہت گراں گوش تھے۔ انہوں نے وہ رقعہ دیکھا تو پڑھ کر طلبہ کو سُنایا۔ پوری کلاس میں قہقہے لگنے لگے۔ وہ پنڈت جی (جن کی ٹوپی تھی) کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے کہ وہ ٹوپی میری ہے اور میں وائس چانسلر کو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب نے کچھ سُنا نہیں۔ لیکن فرمایا کہ کلاس سے فارغ ہو کر میرے پاس آؤ۔ کلاس ختم ہوئی تو پنڈت جی نے وہی بات کہی کہ میں وائس چانسلر کو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب بالکل نہ سُن سکے انہوں نے قریب کے طالب علم سے پوچھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ طالب علم نے کہا کہ یہ فرماتے ہیں کہ میری ٹوپی ایک روپے کی تھی۔ روپیہ دلوا دیجئے۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں نے ایسا نہیں کہا۔ میں تو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب پھر نہ سُن سکے تو قریب والے طالب علم نے کہا کہ آپ فرماتے ہیں کہ روپیہ نہیں تو اٹھنی دلوا دیجئے۔ بیرسٹر صاحب نے پھر بھی کچھ نہ سُنا تو اُسی طالب علم نے کہا کہ آپ فرماتے ہیں کہ کم از کم چار آنے تو دلوا دیجئے۔

(1) نادار خان نے بی کام کرنے کے بعد ایم اے (ریاضیات) پاس کر لیا تھا لیکن اپنی بہن مہر النساء کو فرسٹ ایئر کلاس میں گرلز کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا اس لیے دو سال کا وقت گزارنے کے لیے انہوں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا تھا۔ بہت ذہین تھے۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر گنگا نگر (سی۔ پی) میں وکالت کرتے رہے۔ پھر پاکستان بننے کے بعد حیدرآباد (سندھ) میں بہت نامور وکیل تھے۔ وہ ۱۹۶۶ء میں انتقال ہوا۔ اُن کے صاحبزادے جمیل آج کل انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔

بیٹر صاحب نے فرمایا کہ I SHALL PAY YOU FOUR ANNAS - لیکن اندازہ لگائیے کہ اس پورے مکالمے میں طلبہ کا قہقہوں کی وجہ کیا حال ہوگا۔ پنڈت جی پریشان ہو کر چلے گئے اور طلبہ بڑی دیر تک قہقہوں سے اُن کی پذیرائی کرتے رہے۔

اسی زمانے میں A EMSBOTHAM پرو وائس چانسلر تھے۔ ایک DEBATE (رام پور حامد ہال میں) اُن کی صدارت میں ہوئی تھی۔ عنایت اللہ، کانگرل (ناگ پور) کے تھے۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے جوش میں آکر کہنے لگے :-

IESE DOGS OF CHRISTIANS HAVE GOT BIBLE IN THEIR LIPS AND DEVIL IN THEIR HEARTS.

ہم سب لوگ گھبرا گئے کہ وہی پرو وائس چانسلر ناراض ہو کر کوئی کارروائی نہ کریں۔ لیکن شکر ہے کہ اُن کی ایسی عادت نہ ہوسکی۔ یہ طالب علم خلاف DISCIPLINE تہذیب کا ایک تحت واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک پروفیسر صاحب کے بنگلے میں بجلی کی چوری کا ثبوت ملنے پر انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

اسی زمانے میں قادیانیوں نے (قادیانی اُستادوں اور قادیانی طلبہ نے) مرزا بشیر احمد کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔ کچھ مسلم طلبہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری (ناظم دینیات) کی طرف سے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کو تار دے دیے کہ آپ لوگ جلد تشریف لائیں۔ (پھر مولانا ابوبکر صاحب نے معذرت کر لی۔ لیکن وہ بہت خوش ہوئے)۔ مرزا بشیر احمد علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پہنچ چکا تھا لیکن ان دو بزرگوں کی آمد کی خبر سنتے ہی واپس چلا گیا۔ ان دو بزرگوں نے پھر ایسی دھواں دھار تقریریں کیں کہ مرتے دم تک کے لیے قادیانیوں کی ہمت پست ہو گئی۔

اسی سال دسمبر ۱۹۳۳ء میں جب ALL INDIA ENGLISH DEBATE کا انعقاد ہوا تو رام پور حامد ہال کی گیلری میں ایک حصے میں کالج کی لڑکیوں کے لیے پردہ لگوا دیا گیا۔ ایک لڑکی بہت شریر تھی۔ پردے کے قریب بیٹھ کر ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس لڑکی نے بڑی چابک دستی سے اُن کی ٹوپی کھینچ لی۔ دوسرے دن وائس چانسلر صاحب کا عتاب نامہ آیا کہ جن لڑکوں نے ہال میں شرارت کی ہے اُن کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ یعنی شرارت تو لڑکی نے کی تھی لیکن لڑکیوں کی پرنسپل صاحبہ نے لڑکوں کو غلط ڈانٹ دلوا دی۔ لڑکے بہت چراغ پا ہوئے لیکن قہر درویش برجانِ درویش۔ بے چارے صبر کر کے رہ گئے۔ اسی زمانے میں حفیظ جالندھری آئے تھے۔ شاہنامۂ اسلام کے اشعار اپنے مخصوص انداز میں سُناتے رہے۔ اساتذہ اور طلبہ بہت محظوظ ہوئے اور اُن کے کمال کا اعتراف مرتے دم تک کرتے رہے۔

اسی زمانے میں قاہرہ سے KHALID SHELDRAKE آئے تھے۔ انہوں نے ابا حلیم (A.B.A. HALIM کو ہم لوگ ابا حلیم کہتے تھے) کے ذریعے اپنی مالی امداد کے لیے درخواست کرائی۔ ابا حلیم اب پرو وائس چانسلر تھے اور بہت باوقار تھے، طلبہ نے حتی الامکان اُن صاحب کی مدد کی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ قاہرہ جا کر MINARET اخبار، طلبہ کو بھیجا کریں گے۔ لیکن انہوں نے نہیں بھیجا۔ میں نے انہیں قاہرہ بھی خط لکھا تھا۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جس زمانے میں علی گڑھ آئے تھے تو رمضان المبارک کا مہینا تھا۔ دن میں سگریٹ پی رہے تھے کہ اُن کے علمار کا اسی طرح کا فتویٰ تھا۔ علی گڑھ میں ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے ایسے لوگ آتے رہتے تھے۔ امریکہ سے ایک بار کوئی آیا۔ اشتہار تھا۔ A MAN WITH THOUSAND FACES - اسٹریچی ہال میں مظاہرہ ہوا۔ ٹکٹ خرید کر داخلہ ملا۔ وہ شخص مُنہ بنا بنا کر ہنستا تھا۔ اور کچھ نہ تھا۔ امریکہ سے ایک صاحبہ بھی آئیں۔ شکل واجبی سی تھی۔ حامد ہال میں تقریریں کیں اور اپنا ذاتی مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ گویا اپنی سکینت کے لیے ایسی کرامت دکھلائی تھی۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں اسٹریچی ہال میں امتحانات شروع ہوئے تو ایک لطیفہ ہو گیا۔ پہلے دن ایم اے (فارسی) کے فائنل کا امتحان تھا اور بی اے کی فارسی کا امتحان بھی اسی دن تھا۔ دونوں کے امتحانی پرچوں میں نظامی عروضی کے چہار مقالہ کے اقتباسات تھے۔ ایم اے کے پرچے کا عنوان نمایاں ہوتا تھا اسی لیے کاپی کا سبز ہوتا تھا۔ منظور حسین شور صاحب (جو بعد میں سی پی میں پروفیسر ہوئے اور مشہور شاعر بھی ہیں) مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ ایم اے کا امتحان دینے گئے تو تین گھنٹے تک بی اے کا پرچہ حل کرتے رہے۔ امتحان ختم ہوا تو ضیاء احمد مدنی صاحب کے ساتھ میں بھی کیفیت دریافت کرنے کے لیے گیا تو دیکھا کہ اُن کے ہاتھ میں بی اے کا پرچہ تھا۔ ہم سب کو پریشانی ہوئی۔ مدنی صاحب فوراً اپنے والد نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کے پاس گئے اور سب حال بتایا۔ نواب صاحب بنفسِ نفیس تشریف لائے اور منظور حسین صاحب کو ہال میں بٹھا کر ایم اے کا پرچہ پہنچایا۔ تسلی دی اور پھر کہا نہ

اور شربت پیتے۔ اس طرح اُن کا بچپن کا پایا گیا۔

۱۹۳۳-۳۴ء کا تعلیمی سال میں نے اور میرے بعض احباب نے ایس کورٹ میں گزارا۔ وہاں کا وارڈن قدیانی تھا۔ اُس سے ہم لوگوں کی بنتی نہیں تھی۔ مشورہ ہوا کہ اب یعنی ۱۹۳۴ء کے آخر سے مزمل ہوسٹل میں رہیں گے۔ غلام علی خاں نے کہا کہ وارڈن صاحب کی کچھ خدمت کر کے چلیں۔ چنانچہ تھوڑا رنگ پانی میں گھول کر خوب بھگایا گیا اور اُن کے کمرے کی کھڑکی دفعتہً کھول کر اُن کو اچھی طرح سے سرخ غسل دیا گیا۔ پھر ہم لوگ سائیکلوں میں بیٹھ کر فرار ہوگئے۔ مزمل ہوسٹل میں جا کر سکون تھا۔ اُس کے ہال میں ہوتی تھی۔ INTRODCTION PARTY آئی۔ اُس کے سربراہ کلیم الرحمٰن شیروانی تھے۔ میں کمرے کے باہر (گرمی کی وجہ سے) چارپائی ڈال کر رہا تھا۔ شیروانی صاحب کچھ چھیڑ کرنا چاہتے تھے لیکن جونہی میری شکل دیکھی بہت ادب اور محبت سے معافی مانگی۔ اُن کے اخلاق سے علی گڑھ میں اور بعد میں کراچی کی ملاقاتوں میں دل بہت متاثر ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور اُن کے بچوں پر رحم فرمائے۔ آمین۔

اس ہوسٹل میں ایم اے فارسی اور ایل ایل بی کے امتحانات کی تیاری ہوئی۔ غلام علی خاں، بی ایس سی فائنل کی تیاری کرنے لگے۔ مذاق صاحب کی طرح وہ بھی کبھی اوّل پوزیشن سے کم میں پاس نہیں ہوئے۔ بی ایس سی۔ پھر ایم ایس سی (ریاضیات) میں بھی وہ اوّل آئے۔ بعد میں جب وہ کراچی آئے تو انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے حبیب بینک کے لیے ایسے قاعدے بنائے کہ اُن کی وفات کے بعد آج بھی وہاں کے دستور العمل میں شامل ہیں۔ بڑی ہمت اور حوصلے والے تھے اور فنِ نثر میں بھی ماہر تھے۔ اس ہوسٹل کے قیام کے زمانے میں بھائی عبدالحمید صاحب جالندھری کی خصوصی محبت میرے لیے بڑی نعمت تھی۔ وہ خانیہ ہوسٹل سے برابر ملاقات تشریف لاتے تھے۔ RIDING SQUAD میں تھے گھوڑے سے پھسلنے کی حالت میں بھی آجاتے تھے اور آج تک دل کے آئینے میں ہیں۔ فضل کریم۔ سمیع اللہ خان (حیدرآباد۔ اُترولہ۔ گونڈہ)۔ رضا علی خاں (جے پور) اور بھائی انتظام علی (علی گڑھ۔ محلہ شاہ جمال) خصوصی کرم فرما تھے۔ میرے کمرے میں ممتاز علی (رحیم پور) تھے اور ساتھ والے کمرے میں محمد الحی (گھوگی۔ ساگر) اور شوکت حسین انصاری (بھوپال) بہت تعلق رکھتے تھے۔ موسمِ گرما میں ہم لوگ تھانہ بنا دیری کی طرف چلے جاتے تھے۔ وہاں خربوزے کی گاڑیاں آتی تھیں۔ شاید دو پیسے میں ایک گاڑی مل جاتی تھی۔ وہاں کھیت کے لوگ ہمارے لیے چارپائی بچھا دیتے تھے اور خربوزے کے بیج کے لالچ میں ہمارے خربوزے دھو کر اور کاٹ کر ہم کو دیتے جاتے تھے۔ ۶-۷ لڑکے ایک گاڑی کے خربوزے کھا لیتے تھے گاڑی کا اوسط دو چار کی ہوتی تھی۔

امتحانات سے فراغت ہوئی تو رضا علی خاں نے مشورہ دیا کہ آپ اُردو میں بھی ایم اے کر لیں۔ چنانچہ موسمِ گرما کی تعطیل کے بعد جون ۱۹۳۵ء میں وطن سے واپسی ہوئی تو میرے ساتھ ممتاز علی۔ سراج الحق اور (اس مرتبہ) صالح بھائی بھی تھے۔ جب ٹونڈلا جنکشن آیا تو میں نے سراج الحق سے کہا کہ اسٹیشن پر اپنے کوئی احباب ہوں تو ہمیں بُلا لو۔ یہ کہہ کر میں ظہر کی نماز ڈبے میں ہی پڑھنے لگا۔ سراج الحق ڈبے سے باہر گئے تو ایک ہندو کوتوال۔ اُس کا بیٹا اور ایک مسلح سپاہی ڈبے میں داخل ہوا۔ کوتوال کا بیٹا سراج الحق کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ کوتوال اور سپاہی ذرا فاصلے پر بیٹھ گئے۔ سراج الحق واپس آئے اور مجھ سے کہا کہ کوئی احباب نہیں ملے اور پھر انہوں نے کوتوال کے لڑکے سے کہا کہ میری جگہ سے اُٹھو۔ لیکن وہ اپنے باپ کی وجہ سے اکڑ میں تھا اور سوٹ پہننے کی شان میں بھی تھا۔ وہ ایک دم سراج الحق سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نماز میں تھا۔ جلد سلام پھیرا اور کوتوال کے بیٹے کی چھاتی پر ایسا گھونسہ رسید کیا کہ وہ ڈھیلا پڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن میرا آخری گھونسا اُس کے باپ نے دیکھ لیا تو وہ مجھ پر لپکا۔ میں نے پوری قوت سے ایک گھونسا اُس کے جبڑے پر رسید کیا تو وہ چکرا کر گر پڑا۔ خود میرا پنجہ مُڑ گیا۔ میں نے جلدی سے دوسرے ہاتھ سے اپنا پنجہ سہلایا۔ اتنے میں سپاہی نے میری طرف اپنی بندوق تان لی۔ میں نے اُس سے بندوق چھڑا لی۔ پھر تو وہ کانپنے لگا۔ ڈبے کے لوگ بھی گھبرا گئے۔ لیکن پھر ریلوے کے لوگ آ گئے اور بیچ بچاؤ کر دیا۔ لیکن کوتوال صاحب کو جو گھونسا رسید ہوا تھا وہ انہیں برسوں یاد آتا رہا ہوگا۔

اسی سال غلام احمد مدنی صاحب کے I.C.S. کے امتحان کا نتیجہ آیا۔ وہ پورے ملک میں دوسری پوزیشن لائے۔ دلی مبارکباد

کا خط میرٹھ کے پتے پر اُن کو لکھا۔(۱) انہوں نے بھی شکریہ کا خط مجھے فوراً بھیجا۔ سب احباب بہت خوش ہوئے۔

اسی سال بعض خاص باتیں ظہور میں آئیں۔ شعبۂ انگریزی کے قریب سے میں جا رہا تھا تو دیکھا کہ انگریزی کے اُستاد غلام سرور صاحب ایک تقریر سعدی اور SOUTHEY کے تقابلی مطالعے پر سنانا چاہتے تھے۔ لیکن سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ محترم اُستاد مختار حامد علی صاحب نے مجھے دیکھا تو فرمایا کچھ لڑکوں کو پکڑ لاؤ تاکہ تقریر شروع ہو سکے۔ میں عثمانیہ ہوسٹل کے احباب کے پاس گیا اور بڑی تعداد میں اُن کو وہاں جمع کیا۔ غلام سرور صاحب جب تقریر ختم کر چکے تو صدر شعبہ NADOW HARIS تبصرہ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مختار حامد علی صاحب اُن کے ہر جملے پر قہقہہ لگاتے تھے اور اس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ میں نے مختار حامد علی صاحب کو پہلی بار قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں مجنوں گورکھپوری بی اے کے لڑکوں کو انگریزی پڑھانے کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ وہ ایک کلاس میں داخل ہوئے تو میں قریب سے گزرا۔ لڑکوں نے اُن کے تخلص کی وجہ سے جملے کسنے شروع کیے اور وہ شور مچایا کہ اُن کی ایک بات بھی نہ سُنی۔ آخر بیچارے وہاں سے مایوس ہو کر یونیورسٹی کے کسی اور کام پر لگ گئے۔

اسی زمانے میں ایک عجیب چیز دیکھنے میں آئی۔ وہ یہ کہ یونیورسٹی اسکول کے سامنے چوراہے کے قریب نیم کے ایک درخت کی جڑ سے اس قدر پانی بہنا شروع ہوا کہ ایک نالا بن گیا۔ اس پانی کو مصفّی خون سمجھ کر دُور دُور سے لوگ آتے تھے اور اپنے برتن بھر کر لے جاتے تھے۔

ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ ہمارے ملنے والوں میں ایک صاحب بہت کنجوس تھے۔ ہم لوگوں کے پاس آ کر کھاتے تھے لیکن کبھی کھلانے کے روادار نہیں تھے۔ ایک دن اُن کی زبانِ سعادت مآب سے بے خیالی میں یہ جملہ نکل گیا کہ اگر کوئی شخص چار روٹیاں ایک ساتھ کھالے تو اُسے ایک روپیہ دوں گا۔ میں نے ممتاز علی سے کہا کہ ہمت کر ڈالو۔ ورنہ کنجوس کا مال پھر نہیں ملے گا۔ ممتاز علی نے چاروں روٹیاں مُنہ میں بھر لیں۔ میں ہمت افزائی کرتا رہا۔ آخر وہ کامیاب ہو گئے اور چاروں روٹیاں کھا ڈالیں۔ اب تو کنجوس صاحب بہت گھبرائے۔ فرمانے لگے کہ اس روپے کی مٹھائی میں مجھے بھی شریک کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ آپ نے پہلے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ لیکن وہ بار بار وہی بات کہنے لگے تو میں نے کہا اچھا بھائی اسی کو تسلیم کر لو۔ ورنہ روپیہ بھی جائے گا۔ خیر۔ وہ مجبور ہو گئے اور اُن کے روپیہ نے اُنہیں داغِ مفارقت دیا۔ لیکن مٹھائی آئی اُس میں انہوں نے بڑھ بڑھ کر حصہ لیا۔

ایک دن احباب میں مشورہ ہوا کہ ریل سے آگرہ کئی بار ہو آئے ہیں اب سائیکلوں پر چلیں۔ چنانچہ شنبہ ۹ نومبر اور ۱۰ نومبر ۱۹۳۵ء کی درمیانی شب میں (۱۱ بجے) میرے ساتھ ممتاز علی اور صالح بھائی (جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے) آگرہ کو روانہ ہوئے۔ اپنے ساتھ گپتی اور لاٹھیاں بھی رکھ لی تھیں، کیونکہ راستہ ڈاکوؤں کی وجہ سے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگوں نے ۵۳ میل کا راستہ طے کر کے فجر کی نماز اعتماد الدولہ کے مزار کے قریب ایک مسجد میں ادا کی۔ آگرہ کی جامع مسجد کے سامنے جنتی ستارہ ہوٹل میں قیام کیا۔ ۳½ بجے سکندرہ گئے۔ رات کو تاج محل دیکھا دوسرے دن فتح پور سیکری گئے اور رات کو ۱۲ بجے کے قریب واپس علی گڑھ کو روانہ ہوئے اور فجر میں پہنچ گئے۔

۱۹۳۶ء کے شروع ہوتے ہی کئی واقعات رونما ہوئے۔ بھائی غلام علی خان کے والد صاحب متھرا سے لوٹے مٹھائیاں لاتے رہتے تھے بھائی موصوف مجھے ضرور کھلاتے تھے لیکن سب لوگوں کو کیونکر کھلا سکتے تھے؟ احباب بار بار کھانے کا تقاضا کرتے رہے۔ لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ ان احباب نے اندازہ کیا کہ غلام علی خان میرا (راقم الحروف کا) بہت ادب کرتے ہیں تو اس ادب کا فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ ایک دن غلام علی خان اپنے کمرے کے دروازے پر تالا لگا کر کہیں جانا چاہتے تھے کہ یار لوگوں نے مجھے پکڑ کر برآمدے میں کھڑا کر دیا۔ غلام علی خان نے مجھے سلام کیا اور میرے ادب کی وجہ سے انہوں نے دروازے پر تالا نہیں لگایا۔ احباب یہی چاہتے تھے۔ غلام علی خان جونہی کہیں کے لیے روانہ ہوئے کہ احباب نے اُن کے

---

(۱) مبارکباد کا خط علی گڑھ اسٹیشن کے لیٹر بکس میں ڈالنے گیا تھا۔ ایک صاحب سائیکل پر آئے اور سائیکل وہاں رکھی تو کسی نے غائب کر دی لیکن میں نے اُن صاحب کو اس کا بدل پیش کر دیا تھا۔

ے میں داخل ہو کر اُن کا صندوق اُٹھایا اور پیش امام صاحب (مزمل ہوسٹل والے) کے کمرے میں رکھ دیا۔ پھر میرے پاس آئے کہ "خان صاحب چلو، مٹھائی کھائیں گے"۔ میں نے کہا کہ میں نہیں جاؤں گا اور چوری کی مٹھائی نہیں کھاؤں گا۔ وہ لوگ مایوس ہو کر اپنے کمروں میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آئے کہ "خان صاحب چلو۔ مٹھائی انتظار کر رہی ہے"۔ اُن کے اصرار پر مجھے جانا پڑا۔ پیش امام صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے۔ صندوق میں تالا لگا ہوا تھا۔ پیش امام صاحب کہنے لگے کہ میرے پاس ریتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ریتی نکال کر دی۔ تالا کاٹا گیا۔ مٹھائی نکالی گئی اور پیش امام صاحب نے طلبہ سے زیادہ ہی داد دی۔ پھر وہ صندوق پھر میرے کمرے میں لایا گیا۔ میں بازار سے تالا خرید کر لایا اور صندوق میں تالا لگا کر (چابیوں کے ساتھ) بھائی غلام علی خاں کے کمرے کے دروازے پر رکھ آیا۔ علی گڑھ کے طلبہ مٹھائی کی چوری محض تفریح کے لیے کیا کرتے تھے لیکن کوئی دوسری چیز چھونا بھی حرام سمجھتے تھے۔ چنانچہ بھائی غلام علی خاں کے پیسے وغیرہ سب چیزیں بالکل محفوظ رہیں۔ یہ الگ بات کہ بھائی موصوف نے نہ کبھی مجھ سے پوچھا اور نہ میں نے کبھی اُن کو بتایا۔

اِس سال کا دوسرا دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۲ء کو سہسرام (بہار) کے ایک نوجوان سید شاہ سبحان احمد صاحب علی گڑھ سے گزرے تھے۔ وہ حج کے لیے پیدل جا رہے تھے۔ صرف رات کو سفر کرتے تھے اور ہر پانچ قدم کے بعد دو نفل پڑھتے تھے۔ بھائی عبد الحمید خالد مجھے ساتھ ہی اُن سے ملنے کے لیے لے گیا۔ اُس دن اُن کی طبیعت ناساز تھی اور وہ دوا کے لیے کسی حکیم کے پاس جانے والے تھے۔ ہم لوگوں نے شرف ملاقات حاصل کیا۔ انہوں نے میری ڈائری پر علامہ اقبال کا یہ مصرع لکھ دیا۔ ع جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

وہ کئی سال میں یہاں تک پہنچے تھے۔ بتاتے تھے کہ میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میرے مکان کے قریب سے ایک بڑھیا گزری۔ اُس نے کہا کہ بیٹا مجھے راستہ نظر نہیں آ رہا ہے، میری رہنمائی کر دو۔ میں لالٹین لے کر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ تو میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دنیا کے سفر میں اس بڑھیا کو میری رہبری کی ضرورت ہے تو میرے آخرت کے سفر میں [illegible] میں کیوں رہ جاؤں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] حاصل کرنے کے لیے اُسی وقت عزم سفر کر لیا۔ میرے عزیزوں کو معلوم ہوا تو وہ آئے اور کہا کہ تم کو ہم کسی سواری سے مدینہ منورہ بھیج دیں گے لیکن میں [illegible] اُن کی بات کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور چلتا ہی رہا اور چلتے چلتے یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔

تیسرا واقعہ یہ تھا کہ مئی ۱۹۳۲ء میں وائسرائے LORD WILLINGDON علی گڑھ آ رہا تھا۔ اُس کی حفاظت کے لیے بڑا اہتمام تھا۔ مجھے بھی والنٹیرز میں شامل کیا گیا۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نظام دکن ہماری یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ وہ پہلے تشریف لائے۔ پھر میزبان کی حیثیت سے وائسرائے کو لینے کے لیے اسٹیشن گئے۔ لال ڈگی کی طرف سے جو پہلا دروازہ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لیے ہے وہاں میری ڈیوٹی تھی۔ میر عثمان علی خاں جب [illegible] وائسرائے کو [illegible] تو [illegible] PASS, PLEASE [illegible] یونیورسٹی کے [illegible] اور مجھے ایک سرٹیفکیٹ بھی دیا گیا۔

لیکن خوشیوں کے ساتھ اس سال ایک دردناک سانحہ بھی ہوا۔ ہوا یہ کہ نیو ہوسٹل میں ایک رات احباب نے رتجگے کا انتظام کیا یعنی مٹھائی کھانے کی تقریب منعقد ہوئی۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ احباب نے ارادہ کیا کہ سب پیدل [illegible] اسٹیشن تک چلیں۔ وہاں آم کھائیں گے۔ مجھ سے بھی چلنے کو کہا۔ میں نے معذرت کر لی۔ بہرحال یہ لوگ ریل سے روانہ ہوئے۔ ۹۔۱۰ میل کا فاصلہ تھا۔ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔ احباب کا مشورہ یہ ہوا کہ گرمی کا زمانہ ہے۔ چلو وہاں کی نہر میں تیراکی کریں۔ بھوپال کے سلطان محمود بھی ساتھ تھے۔ بہت نیک، نمازی اور خوبصورت شخص تھے۔ انہوں نے بھی نہر میں غوطہ لگایا۔ اتفاق سے وہاں ایک بھنور تھا جس نے اُن کو پکڑ لیا۔ انہوں نے ہاتھ ہلا کر اپنی بے بسی کا اشارہ کیا۔ افسوس کہ پھر اُن کا پتہ نہ چلا۔ پوری یونیورسٹی میں صف ماتم بچھ گئی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب (وائس چانسلر) اور بہت سے اساتذہ وہاں پہنچے۔ غوطہ خوروں کی مدد لی گئی۔ لیکن سب بے سود رہا۔ مرحوم کے والد حکیم سلطان محمود صاحب دوسرے دن بھوپال سے آ گئے۔ لیکن سوائے گریہ و زاری کے کیا کر سکتا تھا! ع ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

[illegible] بھائی غلام الدین کی وجہ سے اُن کے والد صاحب اور والدہ نے جس شفقت کا برتاؤ میرے ساتھ کیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ [illegible] علی گڑھ میرے لیے دوسرا وطن بن گیا تھا۔ علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد اور پاکستان بننے سے پہلے بارہا

اُن کی خدمت میں حاضری رہی ہے۔ اور اُن سے کچھ پایا، آج بھی نازاں ہوں۔

ملا کی مشکل زندگی میں جو کچھ بُرا جو کچھ کیا ہے کسی کی آخر دُو استدعا ہے جو عرض کر رہا ہوں۔ سب خدا کی بارگاہ الٰہی میں یہ دعا ہے کہ :-

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۔

---

① علامہ اقبال کے نام سے منسوب کوستر ہویں کوٹھی بنوائی۔ وہ والد صاحب حسین صاحب نے دو بھائی کے کہا کہ اس عمارت کا نام مسعود منزل رکھا تھا۔ اپنے بیٹے کے نام حبیب اللہ منزل رکھا اور حبیب اللہ صاحب نے اپنی کوٹھی کا نام والدہ منزل رکھا۔ ایم ایم AND MANZIL کہا کرتے تھے۔ اسی کوٹھی کے قریب بعد میں PICTURES GALLERY تعمیر ہوئی تھی۔

② حکیم صاحب بعد میں کراچی آ گئے تھے اور وہاں بندر روڈ پر مطب کرتے تھے۔

[العلم (کراچی) اکتوبر۔ دسمبر ۹۳ء

۲۰۱

وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی

صفدر ملوچ

جناب وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی (متوفی ۱۹۲۳ء) حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے معاصرین میں سے تھے۔ آپ نے صحافت و ادب کے میدان میں یکساں نیک نامی حاصل کی۔ لیکن افسوس کہ ان کے اٹھ جانے کے بعد قوم نے ان سے بھی سنگدلانہ فراموشی کا رویہ اختیار کیا۔

جناب وجاہت صدیقی جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد مولوی محمد مخدوم لاہور میں فنانشل کمشنر پنجاب کے دفتر میں محافظ دفتری تھے۔ جناب وجاہت ابھی چار ہی سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ نے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ فروری ۱۸۹۲ء میں انھوں نے جھنجھانہ کے اُردو مڈل اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال ان کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب انھوں نے نوکری کرنے کا فیصلہ کیا اور تحصیل دیوبند میں مستقل طور پر نقل نویس ہو گئے۔ لیکن چار سال بعد انھوں نے یہ نوکری بوجوہ چھوڑ دی۔ ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی ہوئی۔ ۳ مئی ۱۹۰۳ء کو جھنجھانہ کا خانگی کاروبار اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کر کے وہ لاہور آگئے اور ادارت و تصنیف و تالیف کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ کچھ عرصہ سید ممتاز علی (شمس العلماء) کے ساتھ بطورِ معاون کام کیا۔ ۱۹ء میں اپنا ماہنامہ "اصلاحِ سخن" جاری کیا جس میں اکبر الہ آبادی اور حضرت علامہ اقبال کی طرحی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء سے آپ روزنامہ "زمیندار" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ مولانا ظفر علی خاں ولایت تشریف لے گئے تو زمیندار کے ادارت کے فرائض مولانا وجاہت حسین ہی انجام دیتے رہے۔ پھر انھوں نے "ستارۂ صبح" میں بھی کام کیا۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے اپنا روزنامہ "آفتاب" جاری کیا۔ مولانا سید حبیب مدیر "سیاست" کی قید کے زمانہ میں "سیاست" کا بارِ ادارت وجاہت صاحب نے اٹھایا۔ لیکن اس دوران میں ان کی صحت خراب ہو گئی۔ وہ اپنے وطن جھنجھانہ چلے گئے اور وہیں ۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو واصل بحق ہوئے۔

جناب وجاہت حسین صدیقی کی تصنیفات و تالیفات میں فتوح عبد الحمید خاں (۱۸۹۹ء) اختلاف اللسان (۱۹۰۴ء) انور پاشا (۱۹۲۱ء) مصطفیٰ کمال پاشا (۱۹۲۱ء) جنگِ ترکی و یونان (۱۹۲۳ء) سیرتِ بلالؓ (س ن) اور مقدمہ سید حبیب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ سرسید احمد خاں کی وفات پر کہے جانے والے مرثیوں، قطعات اور نظموں وغیرہ کو انھوں نے بروایت جناب عبداللہ قریشی "سرسید کا ماتم" کے نام سے مرتب کیا اور سفر نامہ "بمبئی" میں ان اہلِ قلم حضرات کے حالات قلم بند کیے جن سے اس سفرِ بمبئی کے دوران میں ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔

جناب وجاہت بہت خوش گو شاعر بھی تھے اور حضرت داغ سے تلمذ رکھتے تھے۔ لیکن ان کا کوئی مجموعہ کلام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اسی طرح تاریخی و ادبی موضوعات پر لکھے ہوئے ان کے متعدد قابل قدر مضامین بھی ابھی تک زیور اشاعت سے منتظر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جناب وجاہت حسین صدیقی اور مولانا ظفر علی خاں میں صحافتی سیاسی اور ادبی حوالے سے قربتیں تھیں۔ مثلاً وجاہت صاحب کے ماہنامہ "اصلاح سخن" کے جنوری ۱۹۰۹ء کے شمارے میں مولانا ظفر علی خاں کی مشہور نظم "فریاد المعروف بہ شور محشر" پر وجاہت صاحب کے قلم سے، ایک تبصرہ ہمیں ملتا ہے۔ موسیٰ ندی، حیدرآباد دکن کی ایک بہت خطرناک ندی تھی اس ندی میں وقتوں وقتوں سے بعض نہایت تباہ کن سیلاب آئے جن کی تفصیلات حیدرآباد دکن کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ مولانا کی نظم میں جس طغیانی کا ذکر ہے وہ غالباً ۱۹۰۸ء میں آئی تھی۔ مولانا کی نظم حیدرآباد کے ایک عظیم الشان جلسۂ عام میں پڑھی گئی تھی اور پھر اسے کتابچہ کی شکل میں چھاپا گیا تھا۔ جناب وجاہت نے اس معرکہ آرا نظم پر ذیل کا تبصرہ کیا۔ موسیٰ ندی کی طغیانی حیدرآباد دکن میں غضب ڈھا گئی اس کے صدمے سے کم و بیش ہر شخص متاثر ہوا۔ شعراء حیدرآباد نے خصوصیت سے بحر طبع کی روانی دکھائی اور اس حادثہ پر خوب خوب نظمیں موزوں کیں۔ فریاد ظفر منشی ظفر علی خاں صاحب بی اے اڈیٹر دکن ریویو کی قابل قدر و موثر نظم ہے۔ یعنی اس کی شاعری بھی اچھی ہے اور واقعات بھی وضاحت سے قلم بند کیے ہیں۔

۱۹۱۷ء میں مولانا ظفر علی خاں کا "ستارۂ صبح" خاص اہتمام سے چھپنے لگا تو مولانا نے ۸ اگست ۱۹۱۷ء کے ایک شمارہ میں اپنے حلقۂ ادارت کا تفاخر آمیز ذکر بھی کیا۔ حلقۂ ادارت چھ مددگاروں اور ایک مددگار خاص پر مشتمل تھا۔ چھ مددگاروں کے نام ترتیب وار یہ تھے۔

علامہ عبداللہ العمادی، سید وحید الدین سلیم، مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی، مولوی خواجہ عبدالحق سابق مدیر "الامام"، مرزا امان اللہ خاں اور مرزا سعید بیگ مدیر "پنجاب"۔ مددگار خاص جناب اختر علی خاں کو قرار دیا گیا تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی سے یہ حلقہ بہت جلد منتشر ہو گیا بلکہ عبداللہ العمادی اور مولانا ظفر علی خاں میں تو نہایت ناگوار قسم کا قلمی محاربہ بھی شروع ہو گیا لیکن ان حالات میں جناب وجاہت کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی وہ مسلسل مولانا کے ساتھ رہے۔ "ستارۂ صبح" کے اجرا پر وجاہت صاحب نے جو نظم کہی تھی وہ حسن بیان اور زور کلام کے لحاظ سے خود مولانا ظفر علی خاں کے رنگ سخن کی یاد دلاتی ہے۔ جس اشاعت کی یہ نظم ۲۸ اگست کے "ستارۂ صبح" میں شائع ہوئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نئی ادا سے ہوا جلوہ گر ستارۂ صبح
بنے ظفر ہے نشان ظفر ستارۂ صبح
چمک دمک ہے کچھ ایسی کہ لوگ کہتے ہیں
بنا ہے روکش شمس و قمر ستارۂ صبح
ستارے اور بھی ہیں آسمان پہ لیکن
ہوا طلوع برنگ دگر ستارۂ صبح
حریم ملت بیضا کی اس سے رونق ہے

بنا ہے روشنیٔ بام و در ستارۂ صبح
ہے نورِ ارض و سماوات کی جھلک اس میں
ہے نقشِ نعلِ خیر البشر ستارۂ صبح
ہے گا اُٹھ کے رہبرِ شب کو بجھتے ہیں
چمک رہا ہے مرے کھیت پر ستارۂ صبح
ہے اشتیاق ترا دیدۂ بصیرت کو
ابھر ابھر ابھی کچھ اور ابھر ستارۂ صبح
جھلک جھلک کہ ہے قدسیوں کی تاب سے
ہماری قوم کا تو نامہ بر ستارۂ صبح
خدائے حق و علا سے یہ ہے دُعا اپنی
کہ روز نکلے سعد گروہ ستارۂ صبح

۲ مئی ۱۹۱۸ء کو پہلی جنگِ عظیم کے سلسلے میں پنجاب سے فوجی بھرتی کرنے کے لیے پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے زیرِ صدارت ایک جلسہ لاہور یونیورسٹی ہال میں ہوا تھا۔ اس جلسہ میں حضرت علامہ اقبال کو بھی مجبوراً شریک ہونا پڑا تھا اور وہاں انھوں نے وہ نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقر قبول ہو

حضرت اقبال کی یہ مکمل نظم باقیاتِ اقبال، میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ سر مائیکل اوڈوائر اگرچہ مولانا کے قیامِ دکن کے زمانہ سے مولانا کا مخالف و معاند چلا آ رہا تھا لیکن ان دنوں وہ مولانا کے نرم سیاسی رویہ کی وجہ سے مولانا پر کچھ مہربان تھا بلکہ "ستارۂ صبح" کے اجرا کی اجازت بھی اسی کی مرہونِ منت تھی۔ چنانچہ "ستارۂ صبح" نے ایک نوٹ میں اس تقریر کو سراہا جو سر مائیکل نے متذکرہ بالا جلسہ میں کی تھی۔ اور ۸ مئی ۱۹۱۸ء کے ایک اداریٔ نوٹ میں لکھا گیا۔

"ہز آنر لفٹننٹ گورنر پنجاب کی تقریر بہ لحاظ خیالات و معلومات ایک معرکہ آرا تقریر ہے جس نے جنگ کے تمام پہلوؤں پر نہایت عمدگی و صفائی سے پوری روشنی ڈال دی۔ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم سلطنتِ برطانیہ کی فصاحت و بلاغت کا خاص شہرہ ہے لیکن ہز آنر کی یہ تازہ ترین تقریر بھی غیر معمولی وقعت و اہمیت رکھتی ہے اور ہم بلا خوفِ تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہز ایکسیلنسی وائسرائے نے پچھلے دنوں دہلی کانفرنس میں جو تقریر فرمائی تھی اس سے ہز آنر کی تقریر زیادہ مبسوط و مشرح ہے۔"

فوجی بھرتی کے موضوع پر "ستارۂ صبح" کے ۸ مئی کے شمارہ میں جناب وجاہت کی بھی ایک نظم شائع ہوئی تھی اور اس میں بھی سر مائیکل کی متذکرہ بالا تقریر کی طرف تحسین آمیز اشارہ ملتا ہے۔ ممکن ہے سر مائیکل اوڈوائر کی تقریر کے بارے میں "ستارۂ صبح" کا متذکرہ بالا نوٹ بھی خود وجاہت صاحب نے لکھا ہو۔ وجاہت صاحب کی اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اپنے خُطبے میں نمایاں کیے جوہر اچھے
وائسرائے سے تو لفٹننٹ گورنر اچھے

ظلم بھولے سے کسی پر نہیں ہونے پاتا
واقعی بات ہے انگریز ہیں افسر اچھے
بر خلاف اس کے ہیں جرمن بڑے وحشی ظالم
ان کے بے رحم دلوں سے تو ہیں پتھر اچھے
روس کی صلح سے دشمن نے یہ موقع پایا
ایشیا میں بھی رہے اس کے نہ تیور اچھے
ہند نے جنگ میں معقول اعانت کی ہے
ہر جگہ بھیج دیے لڑنے کو لشکر اچھے
ان کی قوت نے بڑا کام بڑا نام کیا
سب یہ کہتے ہیں کہ ہندی ہیں دلاور اچھے
امتحاں گہِ شجاعت میں ہوئے دھوم سے پاس
جنگِ یورپ میں بھی حاصل کیے نمبر اچھے
اب ہے سرکار کو درکار زیادہ امداد
مثلِ سابق نہیں حالات برابر اچھے
اُٹھتی ہیں جانب پنجاب نگاہیں سب کی
یہی صوبہ تو جواں رکھتا ہے اکثر اچھے
شیر دل کہتے ہیں پنجاب کے باشندوں کو
زور و قوت کے انھیں میں تو ہیں جوہر اچھے

جناب وجاہت اور مولانا ظفر علی خاں کے مراسم کے ضمن میں یہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ ایک بار وجاہت صاحب کی ایک نظم جس سے سر مائیکل اوڈوائر کے بارے میں شاید تعریض کا کوئی پہلو نکلتا تھا، سنسر کی زد میں آگئی اور شائع نہ ہو سکی۔ نظم کے سنسر ہونے کا یہ واقعہ جب وجاہت صاحب نے حضرت مولانا کو سنایا تو انھوں نے اس واقعہ کو وجاہت صاحب کی طرف سے نظم کر دیا اور ایک توضیحی نوٹ کے ساتھ ۱۵ اپریل ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں بعنوان "آفتاب، بکوریٔ چشمِ سنسر" شائع کر دیا۔ اب یہ نظم مولانا کے مجموعہ کلام "بہارستان" کی زینت ہے۔ مولانا کا نوٹ اور نظم درج ذیل ہیں:

"عزیز مکرم مولوی وجاہت حسین صدیقی صاحب ایڈیٹر "آفتاب" بھی ایک عرصہ تک جناب حضرت سنسر کے ناوک بیداد و جفا کا تختۂ مشق رہ چکے ہیں۔ آپ کی جو شامت آئے، آپ نے ہز آنر سر ایڈورڈ میکلیگن کی شان میں ایک بہاریہ قصیدہ لکھا۔ میکلیگن کے ساتھ ایک قافیہ گلشن بھی بندھ گیا تھا۔ نظم جب سنسر کے پاس پہنچی تو ان لال بجھکڑ نے یہ سمجھ کر کہ اس سے سر مائیکل اوڈوائر کا باغ خارستان ہوا جاتا ہے بیچارے ایڈیٹر "آفتاب" کی نظم کی اشاعت روک دی۔ ہم نے ان سے یہ واقعہ سن کر انھیں کی طرف سے اسے نظم کر ڈالا۔ ملاحظہ ہو۔

دل ہو تو ایک اور حکایت نئی سنو

آزادی میاں کے عہدِ عذاب کی
سرمائیکل سے عارضہ جب سے یہ گیا
جس وقت ختم ہو گئی مدت حساب کی
ہم سمجھے آگئی چمنِ علم میں بہار
چھائی ہوئی تھی جس پہ خزاں محتسب کی
لیکن خمارِ نشہ ٹوٹا نہ تھا ہنوز
بوتل میں بند تھی ابھی مستی شراب کی
سرور کے ہاتھ سے ابھی چھوٹا نہ تھا قلم
جس سے ادب کی روح ہی مٹی خراب کی
پنجاب کی سمت مسکیں وکس میرین
شاکی تھی آپ کے ستم بے حساب کی
اک روز میں نے مدح سر ایڈورڈ میں کہی
اک نظم جو ہے جان بجا کی کتاب کی
اس کو بھی کردیا نظری دیکھنے کے ساتھ
کیا بات ہے جناب رقابت مآب کی
گلشن کے ساتھ قاعدِ میکلیگن آگیا
سب سے بڑی عطا تھی یہی آفتاب کی
لڑسکے رفیق جوار تھے عہدِ قدیم کے
مجھ کو دکھائی شان پرانے عتاب کی
کہنے لگے کہ لکھ کے قصیدہ یہ آپ نے
پاداش میں تلافی کریں آفتاب کی
سر پیٹ کردیا انھیں میں نے بس یہ جواب
سچی بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

ادارہ "زمیندار" نے جناب وجاہت کی وفات پر اظہارِ غم کرتے ہوئے ۱۱ اپریل ۱۹۲۳ء کو لکھا:

"ہمیں مولانا وجاہت حسین صدیقی صاحب کی وفات حسرت آیات کا دوگونہ رنج ہے۔ ایک تو اس لیے کہ مدت تک ان کا زمیندار کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ دوسرے اس لیے کہ انھوں نے ادبی اور سیاسی دُنیا میں نمایاں خدمات انجام دیں اور ان کے انتقال سے ملک و قوم کے خادموں کی صف میں ایک قابلِ افسوس کمی واقع ہو گئی۔"

جناب وجاہت کی نگارشاتِ نظم و نثر ان کے اپنے جاری کردہ جرائد کے علاوہ ملک کے دیگر موقر جرائد مثلاً [illegible] دہلی، مخزن

بہار، کیل دہلی، ستارۂ صبح وغیرہ میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ ان کی نظموں میں اپنے زمانے کے سیاسی و معاشرتی حالات کا رنگ اور قومی و ملی جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ فطرت نگاری اور ظریفانہ رنگ سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ غزل میں وہ زیادہ تر اپنے استاد حضرت داغ کے زیر سایہ رہے۔ ان کی زبان میں روزمرہ اور محاورہ کا چٹخارہ ہے اور ان کے مضامین غزل میں شوخی، نکتہ آفرینی اور بانکپن کے عناصر جدت آفرینی کرتے ہیں۔ نمونہ کلام کے طور پر ان کی چند غزلوں کے منتخب اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

مہرباں غیر پہ تو ہو جائے
وہ ادھر سے ادھر نہ ہو جائے
دیکھتا ہوں انھیں تو کہتے ہیں
دیکھ مجھ کو نظر نہ ہو جائے

(زبان دہلی۔ جنوری ۱۸۹۴ء)

سن کر سوال وصل کہو کچھ تو ہاں، نہیں
چپ کیوں ہو گیا، تمھارے دہن میں زبان نہیں
ایمان کی کہیں گے وجاہت حسین ہم
دہلی سے رہ کے اور کہیں کی زبان نہیں

(زبان دہلی مئی ۱۸۹۴ء)

روز ازل سے مست ہیں کیف شراب میں
پیتے ہیں سر کے ہم قدح آفتاب میں
شیرازہ دل کا عشق بتاں میں بکھر گیا
ثابت نہیں ہے ایک ورق اس کتاب میں

(زبان دہلی جولائی ۱۸۹۵ء)

عجب ادا سے ادا میں ادا نکلتی ہے
ستم میں لطف و کرم میں جفا نکلتی ہے
ہماری آنکھ سے دیکھے تجھے کوئی اے بت
کہ تجھ میں نام خدا بات کیا نکلتی ہے
مری تو جان نکلتی ہے تو بتا شب غم
نہیں نکلتی ہے کم بخت یا نکلتی ہے
ہماری منزل ہستی سے نیستی دراصل
اسی سڑک سے تو راہ فنا نکلتی ہے
تمھاری چال، قیامت، ہیں دونوں چیزیں ایک
مگر یہ کم ہے وہ اس سے ذرا نکلتی ہے

رہے گا دل میں وجاہت خیالِ زلفِ سیہ
کہیں نکالے سے لب پہ نالا نکلتی ہے؟

(اصلاح سخن، جنوری ۱۹۰۹ء)

یہ حوب معجزِ چھانٹ ہے جب میں سے آہ کی
اس کے جواب میں تپِ کافر سے دلو کی
میں جانتا ہوں اصل ہے جو مہر و ماہ کی
دونوں یہ ٹوپیاں ہیں کسی کی نئے کلاہ کی
محشر میں دل بھی اس کا طرفدار ہوگیا
بیت مل گئی ہے سامنے گواہ کی

(کمال دہلی، اکتوبر ۱۹۱۰ء)

جہاں تک جناب وجاہت کی نثری نگارشات کا تعلق ہے، لسانیات کے موضوع پر ان کی تحریریں مرورِ وقت کے ساتھ بہی اہمیت بہت کچھ کھوچکی ہیں۔ ملکہ ان کی کتاب، احتلاف اللسان توان کے اپنے زمانہ میں بھی متنازعہ ہوگئی تھی۔ چنانچہ ایک صاحب، نقاد لکھنوی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہنامہ "زمانہ" (شمارہ اکتوبر و نومبر ۱۹۱۰ء) میں لکھا تھا:

"دہلی و لکھنؤ کی زبان اب کوئی جُدا گانہ زبان نہیں ہے اور مدت ہوئی کہ یہ سب بجھم کا ناگوار فرق مٹ چکا ہے۔ تاہم منشی وجاہت حسین صاحب صدیقی نے اس بحث کو تازہ کرنا ضروری خیال فرمایا ہے .... صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولف کتاب دل والوں کے طرفدار ہیں۔ اور اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ چونکہ مولف صاحب کو زبانِ لکھنؤ سے ادنیٰ واقفیت بھی نہیں لہذا جتنے محاورات لکھنؤ سے منسوب کیے گئے ہیں، ان میں بیشتر غلط اور عدیم الوجود ہیں۔ جن محاورات کی شعرائے لکھنؤ کے کلام سے سند دی گئی ہے، انھیں متروک ہونے مدت ہوچکی۔ اس طرح تو قدیم شعرائے دہلی کے کلام سے بھی بہت مہمل محاورات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مگر بحث صرف زبانِ حال سے ہونا چاہیے۔"

جناب وجاہت کی دیگر نثری تصانیف میں ادب و تاریخ کے طالب علم کے لیے دلچسپی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور موجود ہے اور ان کی کتاب "سیرتِ بلالؓ" تو مستقل اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب وجاہت اپنے لوازمے کو فنکارانہ سلیقہ مندی کے ساتھ مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کی تحریر عموماً سادہ اور موثر ہوتی ہے ہم کہیں کہیں ان کے یہاں خطیبانہ انداز بھی پیدا ہوجاتا ہے جس سے نثر کے انضباط کو نقصان پہنچتا ہے۔

وجاہت کے اسلوبِ نثر نگاری کا کچھ اندازہ ہوسکے گا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی سطوت و جلالت مشہور ہے۔ مگر حضرت بلالؓ کے متعلق ان کے کیا خیالات تھے، اس باب میں صاحب اسد الغابہ کا حسب ذیل قول ملاحظہ طلب ہے، "حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ابوبکرؓ ہمارے سردار تھے اور انھوں نے ہمارے سردار

یعنی بلالؓ کو آزاد کیا۔

جب حضرت عمرؓ جیسا معروف خلیفہ حضرت بلالؓ کو سردار کہتے تھے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ بلالؓ صرف ایک غلام تھے ۔ وہ حقیقت میں کتنے بلند رتبہ تھے۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جنہوں نے اسلام میں سب سے پہلے اذان دینے کا شرف حاصل کیا۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جنہوں نے راہ خدا میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جو سفر و حضر میں ہمیشہ حضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جنہوں نے اسلام اور خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے ہی زندگی وقف کر دی تھی۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جن کی صدائے اذان سے صحابہؓ کے قلوب میں گداز و سوز کی کیفیت پیدا ہو جاتا تھا۔ بلالؓ وہ موذن تھے جو محض مومن شخص پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ سر بکف اور شمشیر بدست ہو کر غزوے اور معرکے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جن کو اسلام کی بدولت غلامی سے آزادی حاصل ہوئی اور انجام کار مسلمانوں کے سردار بن گئے۔ سبحان اللہ حضرت بلالؓ رسول ﷺ خدا کی غلامی کس درجہ شرف و اعزاز کا باعث ہے۔

مسلم غلام غلام تو یا رسول اللہ
دلم فدائے نام تو یا رسول اللہ

(سیرت بلالؓ، ص۱۰۶-۷)

کم معروف مگر اہم اہل قلم کے حالات حیات اور آثار قلم کی تحقیق و تنقید اور تالیف و تدوین میں ہمارے لیے برکت و سعادت کے متعدد پہلو ہیں۔ اس طرز عمل سے اگر ایک طرف ہمیں مختلف ادوار کے علمی و ادبی ارتقا کو ان کے صحیح اور معروضی انداز میں پرکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے تو دوسری طرف ان اکابر کے قیمتی ترکہ کا استفادہ و استحسان قومی سطح پر ہمارے فکری و وجدانی سانچے میں ڈھالنے کا باعث بھی بنتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے جناب وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی اور ان کے دیگر نستار معاصرین کے احوال و آثار بھی ہماری نظر سے التفات و اعتنا کے متقاضی ہیں۔

قومی زبان (۵۶) دسمبر ۱۹۹۳ء

کتابیات

(۱) اخبار نویسوں کے حالات مرتبہ منشی محمد الدین فوق
(۲) فرہنگ عامرہ مرتبہ عبداللہ خاں خویشگی
(۳) پنجاب میں اردو اخبار نویسی از مسکین علی حجازی (پروفیسر) مقالہ برائے پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔
(۴) باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۷۸ء
(۵) سیرت بلالؓ از وجاہت حسین صدیقی (س ن)
(۶) اختلاف اللسان۔ از وجاہت حسین صدیقی (۱۹۰۳ء)
(۷) ماہنامہ اصلاح سخن لاہور۔ بابت جنوری ۱۹۰۹ء
(۸) ستارۂ صبح۔ لاہور مختلف شمارے
(۹) ماہنامہ زبان دہلی۔ مختلف شمارے
(۱۰) ماہنامہ کمال دہلی بابت اکتوبر ۱۹۱۰ء

عالیہ خان

[illegible] جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

وطن

ڈاکٹر یوسف حسین خاں ماہر تاریخ اور اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد تھے۔ ان کا آبائی وطن قائم گنج تھا جسے ۱۷۲۲ء میں محمد خاں بنگش نے اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام سے بسایا تھا۔ قائم گنج ڈھائی تین سو سال سے ایک منڈی کی حیثیت سے بہت مشہور رہا ہے۔ اسی خاندان کے زمانے میں سرحدی قبائل کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور اس علاقے میں زیادہ تر خلیل اور آفریدی پٹھانوں کے قبائل آئے۔ ان آفریدیوں نے بستیاں الگ الگ قائم گنج میں بسائیں۔ چنانچہ آج بھی وہ محلے اپنے قبیلوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

خاندان

۱۷۵۱ء کے لگ بھگ دو بھائی حسن خاں اور حسین خاں اپنے خاندانوں کے ساتھ وارد ہندوستان ہوئے۔ ان کی اولاد آج تک اپنے ناموں میں حسن خاں اور حسین خاں کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔ حسین خاں کا لقب مشغلہ درس و تدریس کی وجہ سے مدرس آخون تھا اور ہندوستان آنے سے پہلے ہی یہ لقب انہیں مل چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ تقریباً ایک سو بیس سال کی عمر کو پہنچے اور آخری عمر تک پڑھنے اور پڑھانے میں مشغول رہے۔ انھوں نے مرتے دم تک پٹھانوں کی کئی پشتوں کو تعلیم دی۔ وہ استاد اور عالم ہونے کے علاوہ صوفی بھی تھے کئی لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ قائم گنج کے قدیم قبرستان میں آج بھی ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ انہی مدرس آخون کی اولاد میں یوسف حسین خاں کے دادا غلام حسین خاں ہوئے ہیں جو اپنی حق پسندی، صاف گوئی، شجاعت اور سخاوت میں مشہور رہے۔ دشمنوں کے لیے طبعاً سخت، غمگسار، دوستوں کے ہمدرد اور سرپرست۔ ان کے مزاج میں شعلہ و شبنم یک جان ہو گئے تھے۔ وہ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ حیدرآباد کی ریاستی فوج میں ملازم تھے اور افسر الملک کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ترکِ موالات کے بعد قائم گنج آگئے۔ خصوصیت سے درویشوں اللہ اللہ والوں سے بہت محبت تھی۔ ایک طرف انھیں زمانے کے مقبول درویش کریم علی شاہ میاں سے ارادت تھی تو دوسری طرف [illegible] سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ غلام حسین خاں کا خاندان ان ہی درویشی صفت لوگوں کی دعاؤں سے پھولا پھلا۔ یوسف حسین خاں کے نانا بھی دادا کی طرح پیشہ تو سپہ گری کا رکھتے تھے لیکن طبیعت میں بے حد انکسار اور بُردباری تھی۔ انھوں نے کبھی کا نہ [illegible] کمایا اور نہ کوئی ان کا دشمن تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دادا کی ہیبت کا جلال نانا کے مزاج کا جمال ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ان کے بھائیوں کی ذات میں ملا۔

والد

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے والد فدا حسین خاں، غلام حسین خاں کے بیٹے تھے قائم گنج کے تحصیلی اسکول میں پڑھنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد چلے آئے۔ ان کو پڑھنے لکھنے کا شوق بھی تھا۔ طبیعت میں خوش ذوقی اور نفاست تھی۔ بہت کم گو اور سنجیدہ انسان

تھے۔ حیدرآباد آکر مرادآبادی برتنوں کا کاروبار کرنے لگے مگر دل کتابوں میں رہا۔ جہاں پر بیگم بازار میں ان کے گھر کے قریب تھا کے ایک وکیل رہتے تھے ان کے کتب خانے سے استفادہ کرنے لگے۔ قانونی امور سے دلچسپی ہوئی تو وکالت کا امتحان دیا۔ بڑی م اور دیانت سے وکالت کی۔ وکالت چل نکلی تو اسے اور چلانے کی خاطر اورنگ آباد چلے گئے۔ جہاں قائم گنج کے کچھ کے خاند، تھے۔ انھوں نے "آئینِ دکن" کے نام سے ایک قانونی رسالہ جاری کیا جس کی جلدیں ہر وکیل کے کتب خانے کی زینت تھیں۔ شہرت کافی پھیل گئی اور قدم جم گئے تو وہ حیدرآباد آگئے۔ بیگم بازار میں ایک دو منزلہ مکان بنایا جہاں نیچے دفتر، کتب خانہ اور رہائش بھی تھی۔ "آئینِ دکن" کے لیے ایک سلسلہ بھی قائم کیا۔ قانونی کتابوں کی فروخت سے کافی فائدہ ہونے لگا۔ [illegible] ملی کی۔ قائم گنج میں بھی پکا مکان بنوایا تھا اور بڑی کامیاب زندگی گزار رہے تھے کہ ۴۴ سال کی عمر میں دق کے موذی مرض نے آ آرام اور علاج کی خاطر قائم گنج آگئے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

بھائی

یوسف حسین صاحب کے کل سات بھائی تھے اور ان کی والدہ ست پوتی کہلاتی تھیں۔ ایسی عورتیں بڑی خوش قسمت سمجھی جاتی ہیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے انھیں ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ سات بیٹے ایک سے ایک خوبصورت دیدارو۔ مگر ہونا وہ جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ سب سے سوائے تین کے عمر طبعی کو کوئی نہ پہنچا۔ سات بھائیوں کے نام ترتیب وار یہ ہیں۔

مظفر حسین خاں، عابد حسین خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، زاہد حسین خاں، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جعفر حسین خاں اور ڈاکٹر محمود حسین خاں۔ ان میں سے جعفر حسین خاں ماں کے ساتھ طاعون کی نذر ہو گئے۔ عابد حسین خاں عین جوانی میں رخصت ہو گئے۔ زاہد حسین خاں جو سب سے خوبصورت و تندرست تھے اٹھارہ سال کی عمر میں چل بسے۔ مظفر حسین خاں چالیس تک نہ پہنچ پائے اپنے پیچھے آل اولاد چھوڑ گئے۔ جن کی پانچ اولادوں میں سے تین نے زندگی پائی۔ ان کے بڑے بیٹے اعجاز حسین خاں میرے والد تھے۔ جو عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد اور شعبۂ کامرس کے بانی تھے۔ وظیفے پر سبکدوش ہونے سے پہلے ہی چل بسے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۶۶ء کو جب وہ سکندرآباد کالج کے پرنسپل تھے کالج ہی میں دل کا دورہ پڑا اور انتقال ہو گیا۔ پھوپی خدیجہ، زوجہ احمد شاہ خاں وہ بھی اب مرحوم ہو گئی ہیں۔ صرف چچا ڈاکٹر مسعود حسین خاں پروفیسر ایمریطس لسانیات اور سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) بقیدِ حیات ہیں۔ جو اپنی تصانیف اور تالیفات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدرِ جمہوریہ ۷۲ سال تک پہنچے۔ ۱۹۶۹ء میں وفات پائی۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی نے تقریباً ۷۰ سال کی عمر پائی اور ان کا انتقال ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ اور فدا حسین خاں کی آخری یادگار ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ۷۷ سال کی عمر پائی۔ ان کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ فخرِ خاندان ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی تعلیمی اور سیاسی خدمات کی وجہ سے بہت نام کمایا اور صدرِ جمہوریۂ ہند بنے اور قصرِ جمہوریت میں ہی داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

والدہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی والدہ کا نام نازنین بیگم تھا جو دولہو کہلاتی تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہ تھا۔ بس تین بہنیں تھیں۔ والدہ کی طبیعت میں بے حد نرمی تھی۔ بچوں سے غیر معمولی محبت رکھتی تھیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد تو ان کی ساری محبت اور توجہ کا مرکز صرف بچے رہ گئے تھے۔ انہیں اپنے بیٹوں پر ناز بھی تھا اور ٹوٹ کر محبت کیا کرتی تھیں مگر بچوں کی تربیت سے غافل بھی نہ تھیں۔ چھٹیوں میں جب بچے گھر آتے تو انہیں خاندان کے بزرگوں کے پاس اصرار سے بھیجتیں کہ انہیں سلام کر آؤ اور کہتیں کہ بزرگوں کی دعا سے بچوں پر برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

بچپن

یوسف حسین خاں ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد کے بیگم بازار والے مکان میں پیدا ہوئے۔ یہ اپنے ماں باپ کی پانچویں اولاد تھے۔ والد کی علالت کی وجہ سے چار پانچ سال کی عمر ہی میں قائم گنج آگئے۔ مولوی صاحب سے گھر پر قرآن شریف اور اردو پڑھنے لگے اور نو سال کی عمر ہی میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ بچپن میں فٹبال بھی کھیلا، پتنگ

بھی اٹھاتا اور گلی ڈنڈے سے بھی دل بہلایا مگر دماغ میں علم کی جو حس بھی تھی وہ درست طرح پایا تھا۔ گھر کے چاروں طرف آموں کے باغ ہی باغ تھے۔ جہاں انھوں نے خالص خاموشی سے کی مسابقت، روشنی و تاریکی کی طلسمی فضا کو محسوس کیا تھا۔ خود لکھتے ہیں:

"میں کبھی مغرب کے کچھ دیر بعد کوٹھی کے باہر چبوترے پر تنہا نکلتا تھا اور تاریکی جا کر طلسمی فضا پیدا کر دیتی جس میں طبیعت گھبراتی نہیں تھی۔ بلکہ اس میں دل لگتا تھا۔ قائم گنج کے مکمل سکوت اور مکمل تاریکی کا احساس مجھے کبھی نہیں ہوا بعد میں تنہا نہیں رہا جو وہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دور سے آنے والی کوئی آواز سنائی دیتی ہو یا چھوٹا سا ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہو جاتی ہے۔"[۱۰]

یہ ابھی اٹاوے کے اسکول میں داخل ہوئے ہی تھے اور انھیں پوری طرح پڑھ رہیں یہ اندازہ نہ تھا کہ ایک دن ہیڈ ماسٹر الطاف حسین نے بلا کر ادھر ادھر کی کچھ باتیں کیں اور پھر ماں سے محرومی کی روح فرسا خبر سنائی وہ سن کر رونے لگے یہاں تک کہ ہچکی بند ہو گئی، اور پھر بورڈنگ ہاؤس جا کر بیٹ گئے اور چادر میں سر چھپائے دیر تک روتے رہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد تنہائی کے احساس نے ان کے دل میں دردمندی پیدا کر دی۔ گھر والوں سے جو تعلق ہے۔ جب گھر میں مجبوری کا عالم ہو تو دل دوسرے مشغلوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی یوسف صاحب نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈی اور سیر و سیاحت سے دل بہلایا۔ لڑکپن کے یہ چھوٹے چھوٹے سفر بھی ان کے مشاہدے کی حس کو سان پر چڑھاتے رہے۔

تعلیم

اٹاوے سے جب بڑے بھائی آگے تعلیم کے لیے علی گڑھ آ گئے تو یوسف صاحب بھی وہیں منتقل ہو گئے یہ علی گڑھ کے اسکول میں داخل ہو گئے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ایف۔ اے۔ کو پر وعید باب فوجی تھے اس لیے اسکول کا نظم و ضبط عمدہ تھا اور کھیلوں کا بھی خاص اہتمام تھا۔ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ بھائیوں کی نگرانی بھی تھی۔ جہاں جیسا ماحول تھا یہ قیام سے فیض ہی اٹھایا گرنے نہیں۔ بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر آدمی سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنی تنہائی کی حفاظت کرنا سیکھ جاتا ہے۔

۱۹۲۸ء میں یوسف صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی محمود صاحب علی گڑھ سے دوبارہ اٹاوہ آ گئے۔ وہ علی گڑھ اور اٹاوے کے استادوں میں شاید سب سے زیادہ سید الطاف حسین صاحب سے متاثر ہوئے چنانچہ لکھتے ہیں:

"سید الطاف حسین ایک نیک سرشت انسان تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی شخصیت کے اندر سے نیکی کی شعاعیں باہر نکل رہی ہوں اور ان بچوں کے دل و دماغ کو روشن کر رہی ہوں جو کسی حیثیت سے کچھ ان سے تعلق رکھتے تھے ان کی نیکی اور شرافت ان کے سب شاگردوں کو یاد ہے۔"[۱۱]

ایک سال بعد یوسف صاحب کی صحت خراب ہو گئی۔ انھیں واپس قائم گنج آرام اور علاج کے لیے آنا پڑا۔ کہنے کو تو دو سال بیماری میں گزرے مگر قائم گنج اور قائم گنج والوں کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹروں حکیموں کے علاج کے ساتھ ساتھ اپنے ایک بزرگ عزیز محمد حسین خاں سے ورزش سیکھی جس سے بہت فائدہ ہوا اور اس سے کہیں زیادہ فیض اس اعلیٰ انسان کی صحبت سے پہنچا۔ اس کا اثر ان کی شخصیت پر ہمیشہ باقی رہا۔ قائم گنج ہی کے زمانے میں انھیں عام مطالعے کا چسکا لگا۔ چنانچہ خود اعتراف کرتے ہیں: "اس عرصہ میں جتنا پڑھا پہلے کبھی نہیں پڑھا تھا۔"[۱۲]

جب صحت ٹھیک ہوئی تو وہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایما پر جولائی ۱۹۲۱ء میں جامعہ میں داخل ہوئے جہاں ذاکر صاحب پہلے سے موجود تھے۔ جامعہ کا داخلہ گویا ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ صبح کی ہوا خوری اور ہلکی کسرت یہاں بھی جاری رہی لیکن قائم گنج کی سی عمدہ اور صحت بخش غذا یہاں کیسے ملتی۔ صحت پھر خراب ہوئی ویسے تین بڑے بھائیوں کے بعد دیگرے دق میں انتقال ہو چکا تھا اس لیے گھبرانا ضروری تھا۔ ذاکر صاحب نے ڈاکٹر انصاری کے پاس تشخیص کے لیے بھیجا۔ ڈاکٹر انصاری مسیحائے

۱۰؎ یوسف حسین خاں ڈاکٹر "یادوں کی دنیا" ص ۵۰، ۵۱

۱۱؎ یوسف حسین خاں، ڈاکٹر یادوں کی دنیا ص ۶۲ ۱۲؎ یوسف حسین خاں ڈاکٹر یادوں کی دنیا ص ۶۷

وقت بچے جاتے تھے۔ انھوں نے طاقت کی کچھ دوائیں دیں اور اطمینان دلایا کہ صحت بالکل ٹھیک ہو جائے گی جس کا اثر بہت اچھا ہوا۔ جامعہ کے دوران تعلیم مختلف اساتذہ اور ساتھی طالب علم سے ربط ضبط نے صاحبِ ذوق یوسف صاحب کی [illegible] کو بنانے میں نمایاں رول رہا ہے۔

یوسف صاحب جامعہ میں تقریباً پانچ سال رہے۔ ذاکر صاحب برلن گئے تھے جب ۱۹۲۶ء میں وہ جرمنی تو یوسف صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس روانہ ہو گئے۔ ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے فرانسیسی سیکھی پیرس جاکر اور زیادہ محنت کرنا پڑی۔ جامعہ کی طالب علمی کے دوران وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ یورپ کے کسی یونیورسٹی میں جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں۔

اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ان کا داخلہ پیرس یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے ہوا اور یونیورسٹی کے قریب ہی ایک [illegible] کر رہنے لگے۔ وہ ڈاکٹریٹ کر رہے تھے تاریخ میں مگر کبھی کبھی ادب، تنقید اور فلسفے کے لکچروں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد سوربون یونیورسٹی انسانی روح کا زبردست مرکز بن گئی تھی۔ اس لیے سارے یورپ سے طالب یہاں کھنچے چلے آتے۔ اس ماحول کا بھی ان کی شخصیت پر بہت اچھا اثر ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور جنوری میں ہندوستان واپس آگئے۔ دوران قیام فرانس کو اچھی طرح سے دیکھا۔ فرانسیسی ادب کا غائر نظر سے مطالعہ کیا۔ وہاں کے پروفیسروں سے استفادہ کیا۔ فطری اور انسانی حسن کے نظارے دیکھے، وہاں کی روشن خیالی سے متاثر ہوئے۔ وہاں اور ادبی تحریکوں کا سرمایہ حاصل کیا۔ ان کے نئے نئے ادبی اور سیاسی تجربوں کو اچھی طرح سمجھا اور پرکھا اور بہت سی دلچسپ شخصیتوں سے ملاقات کی۔ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سری نواس آئنگر سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی۔ وہ اٹلی بھی گئے۔ ایک تاریخ کے طالب علم کے لیے وہاں کشش بھی بہت تھی۔

ملازمت

یورپ کے دوران قیام ہی میں ان کی ملاقات مہاراجہ بڑودہ سے ہوئی اور انھوں نے اپنی ریاست میں ملازمت کی ترغیب بھی دی۔ ۱۹۳۰ء میں جب وہ ہندوستان آئے تو ذاکر صاحب نے رائے دی کہ وہ حیدرآباد جائیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے خاندان کا تعلق حیدرآباد سے رہا تھا اور یوسف صاحب کی پیدائش خود حیدرآباد کی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو تھا اور ذاکر صاحب کی جوہر شناس نظر نے بھانپ لیا تھا کہ یوسف صاحب کا مزاج اردو ادب اور شاعری سے ہم آہنگ ہے اس لیے انھوں نے یہ رائے دی تھی۔

"ذاکر صاحب کی بھی رائے تھی کہ یہ ایک نیا تجربہ ہے عثمانیہ یونیورسٹی کا۔ اردو زبان میں تعلیم کا، اور تمہیں اردو ادب سے دلچسپی ہے۔" عه

یوسف صاحب حیدرآباد آگئے۔ اتفاق سے پروفیسر ابن حسن صاحب جو تاریخ سے تعلق رکھتے تھے ان دنوں لندن گئے ہوئے تھے ان کی جگہ عارضی طور پر یوسف صاحب کا تقرر ہوا [illegible] تو بیمار ہو گئے اور پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ یوسف صاحب کی عارضی ملازمت مستقل ہو گئی۔ اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے ہر شعبہ میں بڑے قدآور اساتذہ تھے۔ یوسف صاحب نے ان کے درمیان اپنے آپ کو بہت اچھی طرح منوا لیا۔ درس و تدریس کے علاوہ وہ تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کرتے رہے۔ تقریباً ۲۸ سال کام کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ انھوں نے حیدرآباد کے شاندار [illegible] اتنا [illegible] ہے آیا۔ وظیفہ کے بعد [illegible] تصنیف و تالیف میں لگے رہے۔ [illegible]

[illegible]

کرنا مشکل تھا کیونکہ دونوں جگہیں ان کی قابلیت کے مناسب تھیں۔ مگر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تعلیم ہی کو ترجیح دینی چاہیے اور انھوں نے علی گڑھ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ۱۹۵۷ء میں وہ پرو وائس چانسلر ہو کر ... پانچ سال ... اور تین وائس چانسلروں یعنی بشیر حسین زیدی، بدرالدین طیب جی اور نواب علی یاور جنگ کے ساتھ کام کیا۔ لیکن ... دور میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ وہ ۱۹۶۵ء میں علی گڑھ سے مستعفی ہو کر دہلی چلے آئے۔ دو سال گھر میں بیٹھ کر ... تصنیف و تالیف کا شوق پورا کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں چار سال کے لیے انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز میں کام کرتے رہے۔ جہاں انھوں نے INDO MUSLIM POLICY کے نام سے ایک تحقیقی تصنیف مکمل کی۔

شملے سے واپس آکر دہلی میں غالب کی اردو اور فارسی غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ غرض آخری دم تک ان کے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہا۔

شادی

عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر کے چند ماہ بعد یوسف صاحب کی شادی ۱۳ دسمبر ۱۹۳۰ء کو قائم گنج کے رئیس جان عالم خاں کی صاحبزادی اور بڑی سجادہ کی بہن ... بیگم سے ہوئی۔

اولاد

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے پانچ بچے ہوئے۔ ایک لڑکا اور چار لڑکیاں۔ دو لڑکیاں بچپن میں ہی فوت ہو گئیں۔ ان کے لڑکے اجمل حسین خاں کی شادی اختیار حسین خاں (ان کے بھتیجے) کی صاحبزادی ڈاکٹر عاصمہ سے ہوئی۔ ڈاکٹر عاصمہ آج کل جامعہ ملیہ میں ... اور دلی میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کی منجھلی لڑکی ... بیگم کی شادی سلیم الدین ... سے اور دوسری لڑکی ... بیگم کی شادی انور حسین خاں (ڈاکٹر محمود حسین خاں کے لڑکے) کے ساتھ ہوئی۔

تصنیف و تالیف

ڈاکٹر یوسف حسین خاں بنیادی طور پر تاریخ کے طالب علم اور محقق تھے اور پیشے کے لحاظ سے بھی آپ کا موضوع تاریخ ہی تھا لیکن فطری رجحان ادب کی طرف تھا لہٰذا دونوں میدانوں میں اپنا ... جوہر دکھایا اور بڑی مہارت کا ثبوت دیا۔ ان کی ہندوستانی تاریخ پر جو کتابیں ہیں وہ بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کو انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور اردو زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ اردو اور انگریزی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی اپنی تصنیف میں انھوں نے وسیع علم، عمیق مطالعے اور گہرے مشاہدے کے دریا بہائے ہیں۔

اردو تصانیف

(۱) روح اقبال (۲) غالب اور آہنگ غالب (۳) حسرت کی شاعری (۴) حافظ اور اقبال (۵) یہی الاقوامی غالب سمینار (مقالات)
(۶) غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات (۷) اردو غزل (۸) فرانسیسی ادب (۹) کاروان فکر (۱۰) تاریخ دستور ہند
(۱۱) تاریخ دکن (عہد عالمیہ) (۱۲) یادوں کی دنیا (۱۳) گارساں دتاسی کے چند خطبات کا ترجمہ

فرانسیسی

L'Inde mystique au moyen âge

(۱۴) انگریزی کتب

The life and times of Nizamul Mulk Asif Jah I
1. The first Nizam
2. Glimses of Medieval Indian Culture
3. Indo-Muslim Policy (Turko. Afgan Periods)
4. Two studies in early Mughal History.

Diplomatic Correspondence between The Nizam Ali Khan and E India Campany (Ed)

. News letters 1767-1799, Nawab Mir Nizam Ali Khan's reign (Ed)

. Selected documents from The Aligarh archieves (Ed)

8. Selected documents of Aurangzeb's reign 1659 (Ed)

9. Ghalib Persian and Urdu Ghazals of Ghalib (Tr)

10 Mughal Documents with Persian text and notes translated in English (Six volumes) (Ed) ۔

اعزاز اور انعامات

ان کی علمی اور ادبی خدمات کو اہل علم نے سراہا اور ملک و قوم کی طرف سے بطور قدر دانی مختلف اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔

ان کی تصنیف حافظ اور اقبال پر انھیں ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ۱۹۶۹ء میں عطا کیا گیا۔ اردو اکیڈمی لکھنؤ اور ساہتیہ کلا پریشد دہلی کی طرف سے بھی انعامات دیئے گئے۔

ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں حکومت ہند کی طرف سے پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا گیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں علمی اداروں میں غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) سے ان کا بہت پرانا تعلق تھا۔ انتقال کے وقت وہ انجمن کے نائب صدر تھے اور غالب اکیڈمی کے بھی نائب صدر اور غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔

انتقال

ڈاکٹر یوسف حسین خاں سدا بہار شخصیت کے مالک تھے جو علمی و ادبی کاموں کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ ان کا یہ جوش جوانی ہی میں نہیں بلکہ ضعیفی میں بھی اسی رفتار سے چلتا رہا۔ انتقال سے پندرہ دن قبل تک یہ شغل جاری رہا۔ فروری ۱۹۷۹ء کو ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ ہولی فیملی اسپتال دہلی میں شریک کروایا گیا۔ جہاں ۲۱ فروری ۱۹۷۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی موت خون میں زہریلا مادہ مل جانے سے واقع ہوئی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ان کے انتقال کی خبر نشر کی۔

۲۲ فروری کو ظہر کی نماز کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مزار کے قریب شفیق الرحمن قدوائی، بریگیڈیر عثمان، خواجہ غلام السیدین اور سید عابد ظہیر کے مزارات کے قریب ان کے جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا۔ اسی خاک سے آدم کا خمیر تیار ہوا تھا، اور اولاد آدم کی قسمت بھی ہے کہ آخر میں اسی خاک میں مل جائے۔ کیونکہ یہی حیات سفر کی بھی آخری منزل ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کے انتقال پر اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی، نائب صدر بی۔ ڈی۔ جتی اور وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی، اندرا گاندھی نے تعزیتی پیامات بھیجے۔ ہندوستان کے مختلف اداروں نے بھی تعزیتی جلسے کرکے اردو کے اس مصنف، ادیب، نقاد، ماہر غالبیات اور اقبالیات کے انتقال کو اردو ادب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور بے شمار لوگوں نے فرداً فرداً اظہار تعزیت کیا۔ منظوم اور نثری کلام روانہ کیے۔

۱۔ یوسف صاحب نے اپنی کتابوں کی فہرست اور Bio-Data خود اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا جو راقم الحروف کی درخواست پر ان کی بہو ڈاکٹر عاصمہ حسین نے عنایت کی۔

[سب رس (حیدرآباد) ستمبر ۱۹۹۲ء]

وفیات "فنون" نمبر ۹۲ کی اشاعت کے بعد اس شمارے نمبر ۹۳ کی اشاعت تک کے درمیانی عرصے میں ادب و ثقافت کی چند اہم شخصیات سے محروم ہونا پڑا ہے جن کے انتقال سے ہمارے ہاں کی ادبی فضا بے حد سوگوار ہو گئی ہے۔

پروفیسر احمد علی کا شمار علم و ادب کی نہایت اہم شخصیات میں ہوتا تھا۔ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں شامل تھے اور مختصر افسانہ نگاری اور ناول نویسی میں ان کا مرتبہ و مقام مسلّمہ ہے۔ بعد میں انھوں نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کا کام کیا جسے عالمی شہرت کے بعض بڑے علماء نے سراہا [illegible]۔ [illegible]

ڈاکٹر محمد اجمل ماہرین اور دانشوروں کے اس محدود حلقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے علمی تبحر کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ ان کا مخصوص موضوع نفسیات اور فلسفہ تھے۔ شخصی طور سے اتنی بڑی محبوبیت تھی کہ جو کوئی ان سے ملتا، ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ سائنس دانوں میں ایک منفرد شخصیت تھے۔

امیر حمزہ شنواری پشتو کے ایک محترم و مقبول شاعر تھے۔ پشتو شاعری کے موضوعات جب انھوں نے منفرد و صلے کئے اور اس موضوع کی شاعرانہ عبادت سے اپنی شاعری کو نوازا۔

تنویر سپرا اردو اور پنجابی کے چند اہم شعراء میں سے تھے۔ انھوں نے عمر بھر مزدوری کی [illegible] ان کی حس تیز تر محنت کش تھے تمام ان کی تمنائیں اور محرومیاں بڑی بھرپور سنائی دیں۔ انھوں نے اپنی زور دار شاعری کی کلیوں کی خوشبو [illegible] وہ ایک بڑی حقیقت پسندی اور فن شعر کے کمال احترام کے ساتھ کیا۔ وہ اپنے اسلوب کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے۔

صوفی محمد افضل فقیر سادگی کی حد تک ایک درویش شخصیت اور ایک ہمہ گیر شاعر تھے۔ ان کا پنجابی کلام مقبول ہے اور پنجابی کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی کئی کتابیں ہیں۔ ان کی نعتیں اور جذبے [illegible] تشنگی کو بجھاتے ہوئے کا ایک بڑا حلقہ ان کے ارادت مندوں میں شامل تھا۔ **سید فیاض محمود** نے مسلمانوں کے متوسط طبقے کے افراد اور کرداروں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ بعد میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہند و پاک و بنگلہ دیش کی تاریخ مرتب کی۔ **محمد آصف خاں** نے پنجابی زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ **ابن الحسن** نے ابتدائی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا پھر انھوں نے صحافت کا رخ کر لیا۔

احسن احمد اشک بنگلہ دیش کے قادر الکلام اردو شاعر مانے جاتے تھے۔ **مولانا کوثر نیازی** سیاسی رہنما اور مذہبی ادیب کے علاوہ شاعر تھے۔ ان کی خطابت بھی بے مثال تھی۔ **کرم حیدری** نے پوٹھوہار کے شعر و ادب کی تمام خصوصیات کو قلمبند کیا۔ **محسن طاہر** اردو کے ایک خوبصورت ترقی پسند شاعر تھے۔ **سید احمد ہمدانی** نے عمر بھر اردو شاعری کا ایک نہایت خوبصورت دیا۔ **گل ناصر زیدی** کا افسانوی مجموعوں کو اردو میں منتقل کرنے کا فریضہ نہایت ہی سلاست کے ساتھ ادا کیا۔ **ڈاکٹر نذیر حسنین زیدی** نے مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت اور شاعری پر قابل قدر کام کیا۔ **ڈاکٹر احسن زیدی** فیصل آباد کے ایک مقبول استاد اور شاعر تھے۔ **شائق زیدی** نے سیاسی اور طنزیہ مزاحیہ شاعری میں نام پیدا کیا۔ **علامہ حیدر عباس عابدی** دین کے ایک عالم دین تھے۔ قرآن کا انداز خطابت اور طرز تفسیر ان کا خاصہ رہا۔

ظہیر شوکت ملک ایک سیاسی کارکن کے علاوہ قلم پرور شاعر بھی تھے۔ **ندائے اسلام** کے کالموں کی بدولت کالم نگاری میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ **قلندر** نے بھی اس شعبہ میں یادگار فلموں کا اضافہ کیا۔ **حامد جلال** ایک ماہر صحافی تھے۔ **علامہ فرید صابری قوال** نے اپنے فن سے برسوں پاکستان اور بیرون پاکستان کی محفلوں کو گرمایا۔ **محبوب عالم** نے ٹی وی سیریل اور فلموں میں اداکاری کا ایسا معیار قائم کر لیا کہ ابھی تک بہت اداکار اس معیار تک پہنچ پائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمت کرے۔

(فنون، جولائی، دسمبر ۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر فؤاد سیزگین
ترجمہ: ڈاکٹر خورشید رضوی

عربی و اسلامی علوم کا یورپ کی تحریک احیائے علوم پر اثر

یہ موضوع جو میں آج کے خطبے میں آپ کے سامنے رکھوں گا، بہت سی تحقیقات کا موضوع بن چکا ہے اور اس پر آراء میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں بعض یورپین علماء نے جب مختلف میدانوں میں علوم کی تاریخ قلم بند کرنی شروع کی تو اس موضوع پر توجہ دی۔ عربی و اسلامی علوم کے بارے میں اولین تبصرے منفی نوعیت کے تھے۔ یورپین علماء کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ ان کو اپنی اپنی زبانوں میں "عربی علوم" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اور یہ اصطلاح ان کے ہاں آج تک مستعمل ہے۔ پھر انیسویں صدی کے وسط میں عربی و اسلامی علوم کے بارے میں ایک نئے زاویہ نگاہ کا آغاز ہوا جس میں ان کا دفاع، ان کی اہمیت کا اظہار نیز مغربی دنیا میں جدید علوم کی نشوونما پر ان کے اثر کی قدر و قیمت کا احساس شامل تھا۔ اس طرز فکر کا امام جرمن مستشرق Johann Reiske تھا پھر انیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک بہت سے منصف مزاج علماء نے اس کی حمایت کی۔ ان انصاف پسندوں میں ایک نہایت مشہور شخصیت شہرہ آفاق جرمن ادیب گوئٹے (J. W. V. Goethe) کی ہے جس کی طرف سے علوم اسلامیہ کا قابل تعریف دفاع کیا گیا۔ پھر عربی سے متعلق تحقیقات میں اہل یورپ کے متخصصین نے عربی کی بہت سی علمی کتابوں کی تحقیق، اشاعت، ان کے مشمولات پر بحث، تاریخ علوم میں ان کی اہمیت اور مغربی دنیا پر ان کا اثر بیان کرنے کا کام کیا۔ اس لائق ستائش دفاع اور ان علمی کوششوں کے علی الرغم یہ آواز اتنی قوی ثابت نہ ہو سکی کہ تاریخ علوم کے ماہرین خصوصی کی نگاہ کو اس مقام کی طرف ملتفت کر سکتی جو از روئے حقیقت تہذیب انسانی میں علوم کی تاریخ عام

کے تناظر میں عربی و اسلامی علوم کو حاصل ہے۔ اس مسئلے کی وضاحت کے سلسلے میں افادیت سے خالی نہ ہو گا اگر یہاں ـــ برسبیل تذکرہ ــ گزشتہ سال کے ایک علمی اجلاس کا واقعہ آپ کو سناتا چلوں۔ مذکورہ بالا تحقیقات کی تمام تر وضاحتوں کے علی الرغم میرے ایک جرمن رفیق کار نے' جو علم طب کے مورخ ہیں' اس بات پر شک کا اظہار کیا کہ یورپ کی تحریک احیاء کے زمانے میں طب کی اٹھان پر عربوں کے علم طب کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ لازم ہے کہ یہاں میں یہ ذکر بھی کروں کہ ایک اور جرمن ساتھی نے ـــ جو یہ لیکچر سن رہے تھے ــ مناسب علمی جواب بھی دیا۔

بعض لوگوں کو اس پر تعجب ہو گا کہ یہ مسئلہ پیش ہی کیوں کیا جا رہا ہے جبکہ سبھی کو معلوم ہے کہ مسلمانوں نے بہت کچھ دریافت کیا اور اس کے بارے میں آپ نے پڑھ بھی رکھا ہو گا لیکن یہ معاملہ بہت گہرا ہے۔ وہ ماخذ کیا ہیں جن پر ان معلومات کا انحصار ہے جو آپ کو عرب اور مسلمان علماء کے کاموں نیز یورپ کی تحریک احیاء پر ان کے اثر سے متعلق حاصل ہیں؟ کیا آپ نے ان سب مسائل یا ان میں سے بعض کا بذات خود مطالعہ کیا ہے؟ کیا یہ معلومات آپ تک ایک یا ایک سے زائد عربی تحقیقات کے ذریعے پہنچی ہیں۔ یا یہ معلومات آپ کو مستشرقین کی تحقیقات سے بالواسطہ یا بلا واسطہ واقفیت کے ذریعے حاصل ہوئی ہیں۔ ان تحقیقات کی نوعیت ایسی ہے کہ یہ ــ لازماً ــ مثبت نتائج پیدا نہیں کرتیں۔ اور ان کے بعض احکام سلبی و منفی نوعیت کے ہیں کیونکہ وہ اسی پرانے حتمی طرز خیال کے پابند ہیں۔

<u>سامعین کرام</u>

امید ہے آپ یہ خیال دل میں نہ لائیں گے کہ میں اس مسئلے پر قنوطیت کا شکار ہو رہا ہوں۔ یہاں اسی قدر کافی ہو گا کہ ــ آگے چلنے سے پیشتر ــ میں دو ٹوک انداز میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کر دوں کہ علوم کی عام تاریخ میں عربی و اسلامی علوم کا حقیقی مقام اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو آج تک کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے اور اس مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اگر ہم اپنے پیشروؤں یا اپنے علاوہ دوسروں کی مساعی کا اعتراف بھی کریں۔ کیونکہ تاریخ علوم میں عربی و اسلامی علوم کا مقام دیگر اقوام کے ہاں علوم کے مقام سے ــ جن کی اہمیت

کو تسلیم کیا جا چکا ہے ۔۔ کسی طرح کم نہیں اور یورپ کی تحریک احیاء کے دور پر عربی و اسلامی علوم کا اثر اس قدر وسیع اور عمیق ہے کہ اس کا تصور کرنا بھی آسان نہیں ۔ یہ رائے محض ایک خیال یا تاثر پر مبنی نہیں بلکہ ان علوم پر تیس برس کے مسلسل مطالعے اور تحقیق کا نتیجہ ہے جن میں میری کوشش یہ بھی رہی ہے کہ مختلف میدانوں میں عربی و اسلامی علوم کے مغرب پر اثرات کے مسئلے کا جائزہ لوں۔

لیکن مورخین علوم پر یہ حقائق بیشتر واضح نہیں ہو سکے اور ان کی کتابوں میں ان کے اظہار کے لئے ابھی بہت وقت چاہئے کیونکہ انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ یہ سب مطالعہ خود کریں اور جب علوم کی تاریخ عام پیش کریں تو اس میں اس کا اظہار ہو ۔ چنانچہ جو اہل علم' زبان اور دین کے حوالے سے اس ورثے سے وابستہ ہیں ان پر اس مسئلے کی وضاحت لازم ہے ۔ ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا چلوں کہ یہ علمی فریضہ ادا کرنے کے لئے ایک طرف عربی ورثے سے وسیع اور گہری واقفیت درکار ہے اور دوسری طرف جدید علوم اور ان کے مناہج سے ضروری مناسبت ۔ ایک اہم نقطہ جس پر زور دینا ضروری ہے یہ ہے کہ مسلمان اور عرب علماء کے کاموں پر سنجیدہ تحقیق پہلے مکمل ہونی چاہئے اور یورپ کی تحریک احیاء کے دور پر ان کے اثرات کی بحث بعد میں اٹھائی جانی چاہیے۔ بالفاظ دیگر دوسرا موضوع پہلے پر منحصر ہے ۔ اور یہ فطری سی بات ہے ۔ کیونکہ ہم مسلمان علماء کی تصانیف اور ان کی دریافتوں پر دقیق تحقیقات انجام دیئے بغیر تاثیر و تاثر کے مسئلے کا جائزہ ہی نہیں لے سکتے ۔ ہاں ان تحقیقات کے بعد یہ درست ہوگا کہ ایک طرف ان تصانیف اور دریافتوں کو رکھا جائے اور دوسری طرف وہ چیزیں پیش نظر ہوں جن کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ تحریک احیاء کے دور کے یورپین علماء کے ہاں عمومی طور پر معروف تھیں ۔ اور پھر دونوں کا موازنہ کیا جائے ۔ مزید برآں عربی و اسلامی علوم اور زمانہ تحریک احیاء کے علوم کے نتائج میں ہم آہنگی اور مشابہت کی صورتیں ثابت کر دینا بھی اس امر کے ثبوت کے لئے کافی نہ ہوگا کہ جس کا زمانہ بعد کا ہے اس نے لازماً اس سے اخذ کیا ہے جس کا زمانہ قدیم تر ہے ۔ کیونکہ یہاں اس معترضانہ رائے کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ تاریخ میں ایک متوازی عمل کا وجود ممکن ہے یا ' بالفاظ دیگر' یہ کہ مسلمان اور مغربی علماء ایک ہی جیسے نتائج تک ایک دوسرے سے کچھ اخذ کئے بغیر ہی اپنے طور پر پہنچ گئے ۔ یہ وضاحت بعض

صورتوں میں درست بھی ہو سکتی ہے۔ تاریخ علوم میں اسے بہت برتا گیا ہے۔ یہ استعمال بیشتر تو زیادتی و بے انصافی کا موجب ہوا ہے ہاں کہیں کہیں صائب و برحق بھی رہا ہے۔ محقق اگر کوئی نظریہ یا کسی مسئلے کا حل کسی مسلمان عالم کے ہاں دریافت کر بھی لے اور یہی نظریہ تاریخ علوم کی کتابوں میں کسی مغربی عالم سے منسوب کیا جا چکا ہو تو ضروری نہیں کہ وہ اس عمومی ثابت شدہ حقیقت کا [دوسروں کو بھی] قائل کر سکے جس کی رو سے متمدن لاطینی حلقوں میں سائنس نے عربی و اسلامی علوم سے اثر قبول کیا اور مطلقاً اس اثر کے تابع ہوئی۔ یہ کس حد تک شعر موسیقی اور فن نے بھی اثر قبول کیا۔ میرا خیال ہے کہ اس اثر کا جائزہ لینے اور اسے واضح کرنے کا مثالی طریقہ وہ ہو گا جس کا اہتمام اسلامی ثقافت سے منسوب لوگوں کو کرنا چاہئے۔ یہ موازنے کا طریقہ ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ مسلمان علماء کے نکالے ہوئے نتائج کا موازنہ دسویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی تک کی مغربی دنیا کی کتابوں سے کریں یعنی علم کی تمام فروع سے متعلق کتابیں جو لاطینی' ہسپانوی' اطالوی یا دیگر زبانوں میں لکھی گئیں۔ یہاں میں یہ کہہ گزرنے کی جسارت میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ نتائج بہت عظیم اور حیرت انگیز ہوں گے۔ یہ رائے محض قیاس نہیں بلکہ ایک ایسا تصور ہے جس کی تشکیل محققین کے نکالے ہوئے نتائج نیز اس موازنے کی روشنی میں ہوئی ہے جو دونوں طرف کی کتابوں کے درمیان ذاتی طور پر میرے لئے ممکن ہو سکا ہے۔

اب میں اس سلسلے میں ایک عام تصور پیش کرنا چاہوں گا کہ یورپ کی تحریک احیائے علوم پر عربی و اسلامی علوم نے کس حد تک اثر چھوڑا اور اس اثر کی نوعیت کیا تھی۔

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری کے زمانے سے ان علوم کو اخذ کرنا شروع کر دیا تھا جو اسلامی سلطنت کے دائرے میں داخل ہو جانے والی غیر اقوام کے متمدن حلقوں میں معروف تھے۔ ان کے اولین اساتذہ یہی غیر اقوام کے لوگ تھے۔ اور مسلمانوں نے ان اقوام کے علوم و معارف کو کسی قسم کی نفسیاتی الجھن یا کسی بھی دینی رکاوٹ کے بغیر قبول کیا۔ پہلی صدی ہجری میں فلکیات کا بطلیموسی نظام ان تک پہنچا۔ اس نظام کے مطابق زمین کی شکل کروی تھی اور یہ بات قبل از اسلام' عربوں کے اس تصور کے خلاف تھی کہ زمین چپٹی ہے اور آسمان اس پر ایک گنبد کی طرح دھرا ہے۔ انھوں نے بطلیموس کی پیش کردہ صورت قبول کر لی اور اس میں اور دین اور

عقیدے میں کوئی تعارض محسوس نہیں کیا۔ اخذ و اکتساب کے اس مرحلے کو مسلمانوں نے بہت مختصر سے وقت میں طے کر لیا۔ چنانچہ جونہی ہم تیسری صدی ہجری کے اواسط میں پہنچتے ہیں کہ مسلمان خالص طبع زاد نتائج پیش کرنے کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ طبع زادگی کی یہ جھلک تیزی سے' اور گہرائی تک' تمام علوم میں سرایت کر گئی اور میری رائے میں تسلسل کے ساتھ آٹھویں صدی ہجری تک چلتی رہی جبکہ اسلامی علوم اور ثقافت میں جمود کا آغاز ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اواسط میں مسلمان اس قابل ہو گئے کہ اہل یونان' اہل بابل' اہل ہند اور اہل ایران سے جو ورثہ انہیں ملا تھا اسے ترقی دیں اور اس میں اصلاح کریں۔ نئے قوانین اور نئے طریقوں کو جنم دیں' اپنے تجربات اور پیمائشوں میں نئے آلات کو استعمال کریں اور نئے علوم وضع کریں جو اگلوں کے علم میں نہ تھے۔

یہ علوم جو اسلامی تمدن کے دائرے میں پھلے پھولے' دیگر اقوام کی طرف ان کے منتقل ہونے کا آغاز ہمیں تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ملتا ہے۔ چنانچہ کیمیاء' طب اور احکام النجوم کی بعض کتابوں کا سلطنت بیزنطیہ [Byzantine Empire] کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں عربی سے یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ لیکن سلطنت بیزنطیہ کی علمی سطح اس امر کے لئے سازگار نہ تھی کہ یہ ترجمے مطلوبہ نتائج پیدا کر سکیں۔ اسلامی علوم کے مغربی عیسائی دنیا میں منتقل ہونے کا دوسرا راستہ اندلس سے ہو کر گزرا۔ یہاں باہمی میل جول کا تسلسل پیدا ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغرب کی مسیحی دنیا نے مسلمانوں سے علم صرف ترجمے کے ذریعے اخذ نہیں کیا بلکہ یہ ایک مضبوط اور براہ راست انسانی رابطے کی صورت تھی۔

عربی سے لاطینی زبان میں قدیم ترین تراجم جو ہمارے علم میں ہیں چوتھی صدی ہجری کے نصف ثانی میں کئے گئے۔ اور سب سے قدیم چیز جس کا وہاں ترجمہ ہوا' علم فلک کی ایک کتاب تھی۔ فطری سی بات ہے کہ اس ابتدائی مرحلے میں ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کتابوں کا ترجمہ کر لیں جن کی نوعیت نظری تھی اور جو پیچیدہ مسائل پر مشتمل تھیں۔ چنانچہ ان کے قدیم ترین تراجم اسطرلاب اور عملی ہندسہ سے متعلق تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر حالات میں مترجمین کو عربی اصطلاحات کے مقابلے میں لاطینی اصطلاحات نہیں مل سکیں چنانچہ وہ عربی اصطلاحات کو جوں کا توں مستعار لینے پر مجبور ہوئے۔

اس سلسلے میں ایک اہم منظر اور ہے وہ یہ کہ ان موضوعات پر اولین لاطینی تالیفات ترجمے کے چند ہی سال بعد کے زمانے میں سامنے آئیں۔ اور ان لاطینی کتابوں پر علمی تحقیق سے' خصوصاً ان تحقیقات سے جو بیسویں صدی میں ہوئیں' یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لاطینی کتابیں عربی کتابوں کی نقل محض ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتابیں درحقیقت لاطینی تصنیفات نہیں ہیں بلکہ لاطینی زبان میں ایسے اقتباسات پر مشتمل ہیں جن کی اصل عربی زبان میں ہے۔ یونانی وغیرہ سے عربی میں ہونے والے اولین تراجم اور عربی سے لاطینی میں ترجمہ کی جانے والی کتابوں کے مابین مشابہت کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں ہمیں فن ترجمہ کی عدم مہارت نیز اصطلاحات ایجاد کرنے کی عدم استطاعت کا احساس ہوتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ لاطینیوں نے آغاز سرقے سے کیا ان کے ہاں یہ اصول موجود نہ تھا کہ تصنیف کو ان کے اصل لکھنے والوں سے منسوب کرنا ضروری سمجھا جائے جبکہ اسلامی تمدن میں یہ اصول واضح تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اقوال کی سند اصحاب اقوال سے ملانے کا اسلامی رویہ' جس کی حیثیت دینی تھی' اس رجحان کا باعث بنا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لاطینیوں کے اس احساس نے کہ وہ اپنے دینی و سیاسی حریفوں سے علم اخذ کرنے پر مجبور ہیں' انھیں بیشتر صورتوں میں سرقے کی راہ پر ڈال دیا ہو' تاکہ اصل مصنفین پر پردہ ڈالا جا سکے۔ مسلمانوں کی روش اس کے برخلاف تھی چنانچہ وہ اپنے ہم مذہبوں نیز دولت اسلامیہ میں رہنے والے غیر مذہب لوگوں سے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے استفادہ کرتے تھے۔

پانچویں صدی ہجری میں' یعنی اولین تراجم پر نصف صدی گزر جانے کے بعد' اسطرلابوں کے بارے میں بعض کتابیں تالیف کی گئیں جن میں سابقہ تراجم اور مسروقہ کتب کی واضح تقلید ملتی ہے۔ اس طرح عربی اسلامی علوم کے اکتساب کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے اواسط سے لے کر پانچویں صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا۔ اس دور میں طلیطلہ کو علمی تحریک میں سب سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔

چھٹی صدی ہجری میں اکتساب کا عمل پیرس' تور (Tours) اور تولوز (Toulouse) جیسے دیگر شہروں تک پھیل گیا۔ اور اس صدی میں ایسے مترجمین کا ظہور ہوا جنھوں نے بھرپور دسترس اور قدرت کے ساتھ ایسی ضخیم عربی کتابوں کا ترجمہ کر لیا جن کے ترجمے کے لئے منصفانہ علمی

معلومات کا احاطہ دو کار تھا۔ یہاں سے ہمیں مرحلہ اکتساب کا آغاز دکھائی دیتا ہے کیونکہ لاطینیوں نے چھٹی صدی ہجری کے دوران جو کتابیں تالیف کیں وہ عربی کی اصل کتابوں کی تقلید تھیں۔ تاہم ان سے مرحلہ اکتساب کے آغاز کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ ان لاطینی مولفین کو ارسطو اور بطلیموس جیسے یونانی علماء کے نام ضرور معلوم تھے۔ مگر یہ معمولی سی واقفیت بھی انہیں عربی ماخذ کے وسیلے کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ چھٹی صدی ہجری ہی میں فلکیات، ریاضیات، فلسفہ، موسیقی اور کیمیاء کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ یہ ہسپانیہ کے راستے منتقل ہوئیں اور ان میں ہمیں عربی سے لاطینی ترجمے کے علاوہ کئی ایک تراجم عربی سے عبرانی میں بھی ملتے ہیں۔

فن ترجمہ کا بھرپور ریلا چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں رونما ہوا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جیرارڈ کرمونی (Gerhard Von Cremona) عربی کتب کا ماہر ترین اور مشہور ترین مترجم تھا۔ جیرارڈ نے نوے سے زائد کتابوں کا عربی سے ترجمہ کیا، ان میں سے بعض اہل یونان کی تالیف تھیں جو عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں اور اس نے عربی سے انہیں لاطینی میں منتقل کیا۔ جیرارڈ نے ـــ جو اپنے زمانے کا ماہر ترین مترجم تھا اور اپنے ہم وطنوں میں عربی علوم کا سب سے بڑا ماہر تھا ـــ صرف ترجمے پر اکتفا نہ کیا بلکہ یہ بھی چاہا کہ خود مولف کے طور پر امتیاز پائے۔ چنانچہ اس نے "ہمارے علم کی حد تک" لاطینی زبان میں نظری فلکیات پر اولین کتاب ترتیب دی۔ اور یہ کتاب وہ ہے جس کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ الفرغانی اور البتانی کی کتابوں کے اقتباسات سے عبارت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولف نے جو فلکی حسابات عربی ماخذ سے لئے ہیں انہیں ٹھیک ٹھیک پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ بہرحال یہ کتاب ـــ عربی سے ہونے والے تراجم کے پہلو بہ پہلو ـــ علماء کی کئی نسلوں کے لئے حوالے کی حیثیت اختیار کئے رہی اور بعض علماء نے اس کی تقلید میں کچھ اور کتابیں بھی لکھیں۔

چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی کے اوائل میں عربی علوم کے اخذ و اکتساب کے مراکز تبدیل ہو کر انگلستان اور شمالی اٹلی کی جانب منتقل ہو گئے۔ ایک اور رو وہ تھی جو اٹلی کے جنوب سے شمال کی طرف جاری ہوئی۔

آپ کو معلوم ہے کہ سسلی تیسری صدی کے اوائل سے لے کر پانچویں صدی کے

اواسط تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا۔ چنانچہ شہر پالرمو [Palermo] میں ایک اونچی سطح کا علمی حلقہ وجود میں آیا۔ آج جو کچھ ہمیں معلوم ہے اس کے مطابق سسلی کے اس علمی حلقے نے اٹلی پر کچھ زیادہ اثر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اٹلی میں عربی علوم اخذ کرنے کا مرحلہ ایک اور صورت میں اور ایک عجیب طریقے سے طے ہوا۔

۱۰۶۵ء میں ایک عرب تاجر الجزائر سے جنوبی اٹلی کے شہر سالرنو [Salerno] آیا اور وہاں پر طب اور دواسازی کے پست معیار کو دیکھ کر یہ عہد کیا کہ وہ اپنے وطن جا کر طب کی تعلیم حاصل کرے گا اور پھر اٹلی والوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے واپس آئے گا۔ یہ وہی طبیب ہے جو اہل یورپ کے ہاں قسطنطین افریقی [Constantine the African] کے نام سے مشہور ہے اور اس کے حالات محققین کو معلوم ہیں۔ ہمیں یہ ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ وہ عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا یا اس نے خود عیسائیت اختیار کر لی تھی تاہم ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ اس نے تین برس تک علم طب سیکھا اور پھر بہت سی کتابیں ساتھ لے کر سالرنو واپس آیا۔ پھر ایک خانقاہ میں بعض راہبوں کے ساتھ گوشہ نشین ہو گیا۔ اس محنتی اور فعال شخص نے ستر سے زائد عربی کتابوں کے مشمولات کا ترجمہ کیا اور اس کی مدد کچھ اور ساتھیوں نے کی جو لاطینی زبان پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ قسطنطین نے خود کو علم کے ایک اونچے مرتبے پر فائز پایا جبکہ اس کے آس پاس لوگوں کا معیار بہت پست تھا۔ چنانچہ اس نے عربی کی بہت سی اہم طبی کتابوں کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ چھوٹے موٹے رسالے خود سے منسوب کر لیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اہم مواد پر مشتمل ضخیم کتب کو اپنی ذات سے منسوب کر لیتا تھا۔ میں اس کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہوں۔ علی بن موسی المجوسی کی کتاب "کامل الصناعہ الطبیہ" لاطینی اطباء کے ہاں تقریباً دو سو سال تک اس حیثیت سے متداول رہی کہ وہ قسطنطین کی تصنیف ہے۔ تاآنکہ کسی مترجم نے اصل کتاب کا ترجمہ کیا تو لوگوں کی نگاہیں حقیقت کی طرف ملتفت ہوئیں (یہاں ـــــ برسبیل تذکرہ ـــــ مجھے ایک افسوس ناک حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کی اجازت دیجئے۔ گزشتہ کچھ سالوں سے یہ کوئی عجیب بات نہیں رہی کہ ہمارے بعض طالب علم یورپ یا امریکہ میں تعلیم پانے کے بعد جب واپس آتے ہیں تو بعض کتابوں کا عربی ترجمہ کتاب کے اصل مولف کا ذکر کئے بغیر پیش کر دیتے ہیں ـــ ان لوگوں کو "جدید قسطنطین" کہا جا سکتا ہے)۔ بہرحال قسطنطین

افریقی کے تراجم نے یورپ میں علم طب کے دروازے کھول دیئے۔ جبکہ اس سے قبل وہاں عوامی لوگوں کا دور دورہ تھا جو خرافات کا مجموعہ تھے اور طب یونانی کو یکسر فراموش کیا جا چکا تھا۔ اٹلی میں ترجمے کی رو جنوب سے داخل ہوئی اور عرب کے کچھ علمی عناصر شمال کی جانب سے بھی آئے۔ اس طرح اٹلی میں علم کے مختلف شعبوں میں عربی کتابوں کے ترجمے کے لئے سازگار فضا پیدا ہو گئی اور سسلی کا عربی کتب گھر پہلے سے بڑھ کر اثر ڈالنے کے لائق ہو سکا۔

اس طرح عربی و اسلامی علوم بیزنطہ' اندلس اور صقلیہ کے راستے یورپ میں منتقل ہوئے۔ علوم کے بعض مورخین یورپ میں آغاز تحریک احیاء پر اسلامی علوم کے تیز بہت اثرات کا اعتراف کرنے کا میلان رکھتے ہیں مگر وہ ان علوم کے منتقل ہونے کے راستوں پر توجہ نہیں دیتے۔ وہ صلیبی جنگوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان جنگوں میں فریقین کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا جو موقع ملا اس کی بدولت لاطینی دنیا کو مسلمانوں کے کچھ علمی کارناموں سے تعارف حاصل ہوا۔ اس نظریے کو تاریخ علوم میں "نظریہ مصائب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض اوقات جنگوں جیسے مصائب بھی کچھ فوائد کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی معروف ہے کیونکہ ایک تمدنی فضا کے دوسری تمدنی فضا سے متاثر ہونے کے لئے طویل وقت اور خاص توجہ درکار ہے۔

ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کی طرف آئیں تو یورپ میں سب سے اہم علمی منظر جو سامنے آتا ہے وہ یونیورسٹیوں کا قیام ہے۔ یورپ کے جو جو شہر عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے مرکز تھے انہی میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ مورخین نے بارہا ان جامعات کے قیام کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ یہ جس انداز میں قائم ہوئیں اس کی کوئی مثال یورپ میں موجود نہ تھی۔ ان کا تصور نہ یونانیوں کے ہاں معروف تھا نہ یورپ کی قرون وسطی میں موجود تھا اور اسی زمانے میں [اسلامی دنیا کی] صورت حال آج سب کے علم میں ہے۔ یہ یونیورسٹیاں اپنے اصول و فروع نیز منصوبوں میں صرف اور صرف اسلامی یونیورسٹیوں کی تقلید پر قائم تھیں۔ یہ خیال محض ایک گمان نہیں بلکہ ایک ایسا (علمی) نتیجہ ہے جس تک ایک جرمن ساتھی نے رسائی حاصل کی ہے اور تقریباً دس سال قبل وہ اپنی تحقیق شائع کر چکا ہے۔

اب ہم عربی و اسلامی علوم اور ان پر مشتمل کتب سے اخذ و اکتساب کے مسئلے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری/ تیرہویں صدی عیسوی میں ترجمہ کتب کی تحریک جاری رہی۔ چنانچہ کچھ اور اہم کتابوں کا ترجمہ ہوا نیز بعض کتب کا از سر نو ترجمہ کیا گیا۔ اسی زمانے میں علمی فضا بمت سے لوگوں کے لئے مختلف علوم کے فروغ پر خود کتابیں تالیف کرنے کے لئے بھی سازگار ہوئی۔ ان تالیفات کا عربی کتب سے موازنہ کیا جائے تو ان کے مولفین کو بگاہ عربوں کی تقلید اور شاگردی پر انحصار کرتے نظر آتے ہیں۔ عربی کتب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کتابوں میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اور اہل تحقیق سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ ان کا معیار اصل عربی ماخذ سے کم تر ہے۔ میرا اشارہ موضوع کے فہم' بیان کے اسلوب' مضمون کی ترتیب' انحصار اور دیانت کے معیار کی طرف ہے یہی حکم چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کی تحریک علمی پر صادق آتا ہے۔

یہاں اس صدی کے ایک واضح امتیاز کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ بہت سی یونانی کتابیں' عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئیں اور ان میں سے بیشتر کا ان کی عربی شروح سمیت ترجمہ کیا گیا۔ اس صدی کی کتابوں میں ہمیں بطلیوس کا نام کثرت سے ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہو گا کہ ان علماء کو اس کی کتاب سے واقفیت تھی اور انہوں نے اس کتاب سے علم حاصل کر کے اسی کی اساس پر بات کو آگے بڑھایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انہوں نے بطلیوس کے کام سے واقفیت عربی کتابوں کے ذریعے حاصل کی تھی جن میں علم الفلک بطلیوس کی کتاب سے برتر سطح تک پہنچ چکا تھا۔ اسی صدی میں میں نے ارسطو کے پیرووں کا ایک علمی مکتب فکر بھی پایا جن میں مشہور ترین شخصیت "عظیم البرٹس" (Albertus Magnus) کی ہے۔ لیکن اب ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ یونانی زبان سے ناواقف تھا اور ارسطو کی کتابوں سے اس کی واقفیت محض ابن سینا اور ابن رشد کی شروح کے واسطے سے تھی۔ یہ البرٹس یورپ کی تحریک احیاء کے زمانے میں بہت سے علوم مثلاً حیوانیات' نباتات' تجربات' آثار علویہ اور کیمیا کا بانی سمجھا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس ضمن میں اس کا انحصار یونانی ماخذ پر رہا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے اس نے یہ اور ایسے ہی دوسرے خیالات' ابن سینا' ابن رشد اور جابر بن حیان کی کتابوں میں پائے جانے والے مواد سے اخذ کئے تھے۔

راجر بیکن (Roger Bacon) اور رابرٹ گروسٹسٹے (Robert Grosseteste) کا بھی یہی حال ہے۔ گروسٹسٹے کا انحصار الکندی، ابن سینا، ابن رشد اور بعض اور عرب مؤلفین پر رہا۔ اور بیکن کو تو عربوں کا شاگرد کہنا چاہئے۔ انکی شہرت بعض ایسی اہم دریافتوں کے حوالے سے ہوئی جو سب کی سب اس نے عربوں سے اخذ کیں۔ اس کی یہ شہرت کہ وہ پہلا عالم ہے جس نے خدمت علم کے لئے تجربے سے استفادہ کیا، بے سوچے سمجھے قبول نہ کر لینی چاہئے کیونکہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہونے والی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ البیرونی اور ابن الہیثم جیسے علماء کو [اس سلسلے میں] سبقت زمانی حاصل ہے اور بیکن گویا ان کا شاگرد تھا جو اپنے اساتذہ کی سطح تک پہنچنے سے قاصر رہا۔

اسی صدی کا ایک منظر اور ہے۔ اور وہ ہے عربی کتب کے سرقے میں اضافہ۔ مستزاد یہ کہ ان کتابوں کو یونانی علماء سے منسوب کر دیا گیا۔ تصور کیجئے کہ اس صدی کے ایک مشہور مترجم، مائیکل سکاٹ (Michael Scot) نے فلکیات پر نور الدین البطروجی کی ایک کتاب نیز ارسطو کی کتاب "مابعد الطبیعۃ" [Metaphysics] اور کتاب السماء [On the Heavens] پر ابن رشد کی شروح کا ترجمہ کیا اور البطروجی اور ابن رشد کے افکار — جو بارہویں صدی عیسوی سے قبل معروف نہ تھے — اخذ کر کے ایک نئی کتاب مرتب کی جس میں ان افکار کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور پھر اس کتاب کو اس نے نیکولاوس دمشقی (Nicolaus Damascenus) سے منسوب کر دیا جو پہلی صدی قبل مسیح میں ارسطو کی کتاب کا شارح ہو گزرا ہے۔ غلط طور پر منسوب شدہ یہ کتاب علماء کے ہاں اسی حیثیت سے متداول رہی کہ یہ نیکولاوس دمشقی کی کتاب ہے اور کسی نے اس بات پر توجہ نہ دی کہ یہ افکار بہت جدید ہیں اور نیکولاوس دمشقی کے عہد میں ان کا معروف ہونا ممکن نہیں۔

اسی قبیل سے آنکھ سے متعلق حنین بن اسحاق کی کتاب ہے جسے جالینوس یونانی سے منسوب کر دیا گیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں آ کر کہیں یہ حقیقت منکشف ہوئی۔ ایسا ہی معاملہ مالیخولیا پر اسحاق بن عمران کی کتاب کے ساتھ ہوا۔ اسے روفوس یونانی (Rufus of Ephesus) سے منسوب کر دیا گیا۔ ابن سینا کی کتاب الآثار ارسطو سے منسوب ہو گئی

وغیرہ اور ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

فلکیات پر البطروجی کی کتاب کا ترجمہ ایک ہمہ گیر علمی تحریک کا نقطہ آغاز ثابت ہوا، جس نے تحریک احیاء کے زمانے میں جدید علوم کے قیام پر بہت اثر ڈالا۔ البطروجی نے بطلیموسی نظام سے مختلف ایک جدید نظام پیش کیا تھا۔ یہاں ہم اس نئے نظام کی تفصیلات میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ بس اتنا اشارہ کافی ہے کہ لاطینی دنیا میں اس نئے نظام کے پہنچنے سے علم الفلک، علم طبیعیات نیز فلسفیانہ افکار کے معیار کو بلند کرنے کے سلسلے میں بہت اثر پڑا۔ یہ مسئلہ مکمل ایک صدی تک مغربی یورپ کے علمی حلقوں میں زیر بحث رہا۔ ایک گروہ نے بطلیموس کی رائے کا دفاع کیا اور دوسرے نے البطروجی کے نظریے کی حمایت کی۔ جبکہ ایک اور گروہ دونوں نظریوں کے درمیان متردد رہا۔ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل تک صورت حال اسی طرح چلتی رہی جبکہ ابن الہیثم کا نظریہ سامنے آیا جس میں بطلیموسی نظام کو درست قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ غیر بطلیموسی یعنی البطروجی نظام کو ترک کرنا ممکن ہوا۔ یہ بحث مغربی یورپ سے ختم ہوئی تھی کہ اٹلی میں چھڑ گئی اور سولہویں صدی عیسوی کے اواسط تک جاری رہی۔

چودھویں صدی عیسوی میں ایسے علماء کی تعداد میں اضافہ ہوا جو عربی سے ترجمہ شدہ علوم میں مشغول ہوئے۔ ان میں سے بہت سوں کے ہاں حوالے کی ایسی ضخیم کتب ترتیب دینے کا رجحان پیدا ہو گیا جن میں عربی سے ترجمہ شدہ کتابوں کی تلخیص ہوتی تھی۔ تاہم ان مرتبوں اور تلخیص نگاروں کا دستور یہ رہا کہ وہ عرب علماء کے نام حذف کر کے ان کی جگہ ایسے یونانی علماء کے نام درج کر دیتے تھے جن کا ذکر عربی ماخذ میں آیا ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بطلیموس اور فلکیات پر اس کی کتاب کا تذکرہ کیا۔ حالانکہ ان کا ماخذ البتانی کی کتاب تھی۔ یہ درست ہے کہ البتانی نے بطلیموسی نظام کو اختیار کیا لیکن اس کی کتاب میں بہت سے اہم انکشافات ایسے بھی تھے جو بطلیموس سے موازنہ و مقابلہ کے بعد ہی سامنے آ سکتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا یہ انداز چودھویں صدی عیسوی میں بھی غالب رہا اور عربی کے تراجم سے براہ راست استفادہ ایک عام بات ہو گئی۔ تاہم عرب علماء کا تذکرہ بہت کم نظر آتا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی سے عرب علماء کو فراموش کرنے کا یہ رواج دو اور اہم عوامل پر مبنی ہے:

پہلا عامل عربی کی مخالفت کی وہ رو تھی جو تیرہویں صدی عیسوی کے آخر اور چودہویں صدی کے اوائل میں بڑی خونخوار شدت کے ساتھ سامنے آئی عرب علماء کے نام لینے کے سلسلے میں نفسیاتی گرہ پڑی تھی ۔ عربی کے خلاف اس رو کا اولین علم بردار رائمنڈس لولوس (Raymundus Lullus) تھا۔ اس کی بیس سے زائد کتابیں ہم تک پہنچی ہیں جن پر تحقیق سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ سب کی سب عربی تالیفات ہیں۔ عربی کے خلاف یہ رو سولہویں صدی عیسوی کے اواسط تک چلتی رہی اور اس دور تک آتے آتے تاریخ علوم میں عرب علماء کا ذکر یکسر فراموش ہو چکا تھا۔

دوسرا عامل تہذیبی برتری کا ذوق و شوق تھا۔ چنانچہ مسلمان علماء کی اہم ایجادات ہمارے زمانے تک تیرہویں' چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے یورپین علماء سے منسوب چلتی رہی تھیں۔ مثلاً بصریات کے میدان میں حجرہ تاریک [Camera Obscura] کی ایجاد' مثلثات کرویہ [Spherical Triangles] نیز فلکیات کے میدان میں عصائے یعقوب [Jacob's Staff] کے نام سے موسوم آلے کی دریافت اور تجربی طریق کار کی داغ بیل' ایسے انکشافات ہیں جنہیں ناحق لیوی بن گرسون (Levi Ben Gerson) سے منسوب کر دیا گیا اور یہ اسی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ کسی محقق نے خود سے یہ سوال نہیں کیا کہ ایک شخص کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ یہ سب اہم دریافتیں تنہا اسی نے کر لی ہوں۔ آج ہمیں عرب اور مسلمان علماء میں ان ایجادات کے حقیقی موجدوں کے نام معلوم ہو چکے ہیں۔

معروف ترجمہ شدہ کتابوں کے علاوہ عالم اسلام کے علمی کارناموں پر پردہ ڈالنے کے لئے بعض اور وسائل بھی بروئے کار لائے گئے۔ اہل یورپ میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوئے کہ جب انہیں مسلمانوں کے علوم کی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے مشرق کی طرف رخت سفر باندھا' سالہا سال وہاں قیام کیا' عربی زبان سیکھی' علوم کا مطالعہ کیا اور پھر کتابیں اور علم ساتھ لے کر واپس گئے۔ اطالوی عالم لیونارڈو فیبوناچی (Leonardo Fibonacci) نے جو لاطینی دنیا میں پہلا ماہر ریاضیات تھا' عربی سیکھی اور شام اور تونس میں ریاضی کا مطالعہ کیا۔ تاریخ ریاضیات میں کئی اہم انکشافات اس سے منسوب ہیں مگر ان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عربی کتابوں کے اقتباسات ہیں۔ عربی علوم اخذ کرنے کا ایک ذریعہ اور بھی تھا۔ یہ زبانی نقل کرنے کا طریقہ تھا۔ بارہویں صدی عیسوی سے لاطینی علماء جو عربی نہیں سمجھتے تھے مسلمان علماء کے نتائج علمی سے زبانی ترجمے کے ذریعے واقفیت حاصل کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان کتابوں کے یورپ میں ترجمے کے بغیر ہی ان

سے استفادہ کرتے تھے یا ایسی کتب سے مستفید ہوتے تھے جن کا ترجمہ تو ہو چکا تھا لیکن عام لوگوں سے مخفی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس صورت حال کا علم تھا چنانچہ احتساب کی کتابوں کی رو سے ان پر قانوناً یہ لازم تھا کہ وہ علمی کتب کو یہود و نصاریٰ کے ہاتھ فروخت کرنے سے احتراز کریں۔ بجز ایسی کتابوں کے جو ان کی شریعت سے تعلق رکھتی ہوں۔ کیونکہ وہ علمی کتابوں کا ترجمہ کر کے انہیں اپنے لوگوں اور اپنے پادریوں سے منسوب کر لیتے ہیں حالانکہ وہ مسلمانوں کی تالیف ہوتی ہیں"۔

اور آخر میں میں انتہائی اختصار کے ساتھ اس چوتھے راستے کا ذکر کروں گا جس پر سے — مغربی دنیا کی طرف جاتے ہوئے — مسلمانوں کے علوم کو گزرنا پڑا۔ ۱۹۵۶ء سے اب تک میں نے کئی ایسی تحقیقات کا اعادہ کیا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوپرنیکس نے سیاروں کی گردش سے متعلق اپنے نظریات ان مسلمان فلک شناسوں سے اخذ کئے تھے جو تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہو گزرے ہیں۔ محققین کے لئے اس امر کی وضاحت میں بڑی دشواری رہی کہ ان فلک شناسوں کی کتابیں کوپرنیکس تک کیونکر پہنچیں۔ لیکن اب ہمیں قطعی دلیل کی بنیاد پر یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عربی فارسی سے کتابوں کے یونانی ترجمے کے لئے بحر اسود کے ساحل پر ایک مدرسہ تو طرابزون [Trabzon] میں قائم ہوا تھا اور دوسرا چودھویں صدی میں قسطنطنیہ میں قائم ہوا۔ ان دونوں مدرسوں کے لوگ ان کتابوں کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور تازہ ترین کتب کا یونانی میں ترجمہ کرکے اپنی مغربی برادری کو بھجواتے رہتے تھے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اس مسئلے کا ایک عام تصور مہیا کر سکوں کہ قرون وسطیٰ سے قرون جدیدہ کی طرف آتے ہوئے عربی علوم نے ارتقائے علوم پر کیا اثر ڈالا یہ عرصہ اس مرحلے سے عبارت ہے جسے اہل یورپ نے یورپ میں تحریک احیاء کا دور یا یونانی علوم کے نئے جنم کا دور قرار دیا۔ لیکن کیا ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ یہ اصطلاح کس قدر باطل ہے اور یہ تعریف کس حد تک من گھڑت ہے۔ یہ کام یورپ کے بعض نام نہاد مورخین علوم کا ہے۔ اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے علوم پر تخصص رکھنے والے محققین امر واقع کی وضاحت میں حصہ لیں۔ یہ کام بہت بڑا ہے اور ژرف بینی، صبر و استقلال اور جہد مسلسل کا تقاضا کرتا ہے۔

(فکر و نظر (پاک) جولائی ستمبر ۱۹۹۳ء)

ترجمہ :- ذوالفقار علی فلاحی

کتاب الفہرست

ایک مختصر تعارف

تاریخ علوم کے اولین مصادر و مراجع میں ابن ندیم کی کتاب الفہرست کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں اور ان کے مؤلفین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت ببلیوگرافی کی بھی ہے اور بایوگرافی کی بھی۔

ابن ندیم سے نقل کرنے والوں اور اس کے سوانح نگاروں کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس کا نام محمد بن اسحاق تھا۔ البتہ بعض لوگ اس کا نام محمد بن الندیم بتاتے ہیں۔ سوانح نگاروں نے اس کی کنیت کے سلسلے میں بھی اختلاف کیا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی کنیت ابوالفتح تھی اور بعض کے نزدیک ابوالفرج۔ اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ نہ جانے پیدائش اور انتقال کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ صرف اندازے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے ربع اول میں اس کی پیدائش ہوئی کیونکہ خود اس نے ذکر کیا ہے کہ ۳۴۰ھ میں اس کی ملاقات ایک عالم سے ہوئی جس کی کنیت ابوبکر البردعی تھی۔ ابن حجر عسقلانیؒ نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ اس کی وفات ۳۸۵ھ میں ہوئی۔ اور ابن النجارؒ نے ذیل تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ اس کا انتقال شعبان ۳۸۰ھ میں ہوا۔ دوسری طرف الفہرست میں ان مؤلفین کا نام بھی شامل ہے جن کی وفات اس تاریخ کے بعد ہوئی ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ابن ندیم کی وفات مابعد زمانے میں ہوئی ہے۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان مؤلفین کی سنین وفات کا اضافہ بعد کا ہے۔ ابن ندیم نے خالی جگہ چھوڑ دی تھی جسے بعد میں پُر کر دیا گیا۔

ابن ندیم کو بغدادی کہا جاتا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ بغداد میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا وہاں طول اقامت کی وجہ سے۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ وہ طویل عرصہ تک بغداد میں مقیم رہا۔ جہاں ابو عبداللہ بن محمد بن عمران بن موسی بن سعید مرزبانی اور قاضی معافی نہروانی جو ابوجعفر طبری کے مسلک کے ایک بہت بڑے فقیہ تھے کی خدمت میں حاضری دی۔ سلیمان المنطقی سے درس لیا۔ وہ ابوالخیر خمار جو اپنے وقت کے ایک بڑے فلسفی تھے اور یحیی بن عدی کے دوستوں میں سے تھا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اپنے زمانہ میں ایک اہم ترین خدمت انجام دینے کے باوجود، جس کی وجہ سے مابعد زمانوں میں اسے بہت شہرت ملی کتب سوانح میں اس کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

ثلاً ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہی حال دیگر کتب کا ہے۔
اقوت الحموی نے اپنی کتاب معجم الادباء میں اس کا ذکر کیا بھی ہے تو نہایت مختصر انداز میں،
بس سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے شیعہ اور معتزلی ہونے کے
بہ سے اکثر سوانح نگاروں نے اسے نظرانداز کر دیا ہے۔

ابن ندیم اپنے والد کی طرح کاغذ سازی اور کتاب سازی کرتا تھا۔ الفہرست کے
ریعہ اس کے اس پیشے کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ وہ اس کتاب میں اپنے وقت
ے بہت سے کاتبوں اور کتب خانوں کے نگرانوں سے نقل کرتا ہے۔ مثلاً ابو علی بن سوار کے بارے
ں لکھتا ہے کہ بصرہ میں اس نے ایک طویل عرصے تک کتب خانۂ وقف میں کام کیا ہے۔ بعض
انوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ندیم کاتب بھی تھا۔ ان دونوں پیشوں نے وسعتِ معلومات اور
ابوں سے محبت میں کافی اضافہ کیا۔

ابن ندیم کا تعلق تیسرے عباسی دور یا عباسی حکومت کی تیسری صدی سے تھا۔ مورخین
س دور کو اسلام کا سنہری علمی دور قرار دیتے ہیں۔ اس زمانے میں مختلف علوم و فنون میں خوب
رقی ہوئی اور بہت سی کتابیں وجود میں آئیں خاص طور سے لغت، تاریخ، جغرافیہ، ادب، طب
ور فلسفہ میں کافی پختگی اور ترقی ہوئی۔ بغداد اس زمانے میں علم کا کعبہ اور اہلِ علم کے لئے
یارت گاہ بنا ہوا تھا۔

ابن ندیم کی کتاب الفهرست کے نام سے شائع ہوئی ہے لیکن مورخین نے اس کا ذکر
ختلف ناموں سے کیا ہے۔ مثلاً یاقوت الحموی نے اس کا نام فہرست الکتب، ابن حجر عسقلانی نے فہرست العلماء
صاحب کشف الظنون نے فہرس العلوم اور اسماعیل بغدادی نے فورالعلوم بتایا ہے۔ بظاہر
علوم ہوتا ہے کہ اسماعیل بغدادی سے کشف الظنون میں درج نام میں تحریف ہوگئی ہے۔
ور وہ فہرس العلوم سے فورالعلوم ہوگیا ہے۔

ابن ندیم نے اصل کتاب میں مختلف مواقع پر ذکر کیا ہے کہ اس نے اس کی تالیف
۳۷۷ھ/۹۸۷ء میں کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس کی عمر تقریباً پچاس سال
ی۔ کتاب کی ابتداء ایک مختصر مقدمے سے ہوتی ہے جس میں مؤلف نے کتاب کے دائرۂ کار
ور حدود کی تعیین کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس میں ان کتابوں کا تذکرہ ہے جو زمانۂ قدیم
سے لے کر اس کے زمانے یعنی دسویں صدی عیسوی تک تصنیف کی گئیں۔ اس میں ان تمام کتابوں
احاطہ کر لیا گیا ہے جو مشرقی مسلم ممالک اور عراق اور خاص طور سے بغداد میں جہاں ابن ندیم
قیم تھا، پائی جاتی تھیں۔ نیز اس میں عرب و غیر عرب مؤلفین کی ان تمام کتابوں کا تذکرہ کیا
یا ہے جو روم، چین اور دوسرے ممالک میں پائی جاتی تھیں مگر ان کا عربی میں ترجمہ ہوگیا
ھا۔ اس کتاب میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کر لیا گیا ہے جو مؤلف کے دور میں رائج تھے
واہ وہ دینی ہوں یا غیر دینی۔ گویا اس سے ابن ندیم کا مقصود صرف ایک ببلیوگرافی تیار کرنا تھا
س میں مختلف علوم و فنون کی وہ تمام کتابیں شامل ہوں جو ۳۷۷ھ تک عربی میں لکھی گئیں

کتاب کا موضوع متعین کرنے کے بعد وہ اس کے مشتملات اور اس کی ترتیب کا ذکر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ترتیب اچھی نہیں ہے۔ اس کتاب کو ابنِ ندیم نے دس مقالات (یا ابواب) میں تقسیم کیا ہے جن میں لغات اور علماءِ نحو و لغت، اخبار و سیر، اشعر و شعراء، علمِ کلام اور متکلمین، فقہ اور فقہاء، محدثین، فلسفہ اور قدیم علوم، اسمار، خرافات، ٹونے ٹوٹکے منتر اور سحر، مذاہب و اعتقادات، ماہرینِ کیمیا و صنعت شامل ہیں۔

ہر باب یا مقالہ کو متعدد فنون میں اور ہر فن کو متعدد موضوعات میں تقسیم کیا ہے۔ وہ ہر موضوع کے تحت مؤلفین کا تذکرہ کیا ہے اور ہر مؤلف کے نام کے تحت اس کی تصانیف کو درج کیا ہے۔ مؤلفین یا ان کی تصانیف ذکر کرنے میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی ہے۔

ہر مقالہ کے شروع میں وہ اس موضوع کی تاریخ کا مختصر جائزہ لیتا ہے اور اس پر سب سے پہلے کتاب تصنیف کرنے والے شخص کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کا نام ذکر کرتا ہے۔ اس نے جن موضوعات پر کام کیا ہے اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اور اس کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتا ہے جس سے اس کی علمی صلاحیت، تاریخِ پیدائش، تاریخِ وفات وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ پھر اس مؤلف کی تالیفات کو سلسلہ وار ذکر کرتا ہے۔ کبھی صرف نام اور کبھی اس کے مشتملات کا اجمالی ذکر کرتا ہے۔ بسا اوقات وہ کتاب کا اصل نام ذکر کرنے کے بجائے مشہور نام کے ذکر پر ہی اکتفا کرتا ہے۔

ابنِ ندیم ان تمام کتابوں کا احاطہ کرتا ہے جنھیں اس نے خود دیکھا یا جن کے بارے میں پڑھا یا سنا۔ جن کتابوں کو اس نے خود دیکھا ان کے حجم اور نمایاں خصوصیات کو بیان کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے مقام و مرتبہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور ان مصادر کا بھی ذکر کرتا ہے جن سے اس کتاب میں استفادہ کیا گیا ہے۔ اگر وہ کسی شخص کے بارے میں دو جگہ تذکرہ کرتا ہے تو ایک جگہ یہ درج کر دیتا ہے کہ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے یا آئندہ آنے والا ہے۔ ایک قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ وہ کسی رائے کو دوسری رائے پر بغیر دلیل کے ترجیح نہیں دیتا۔ اس طرح ببلیوگرافی نوعیت کے اس عمل میں اس کی دقتِ نظر، بیدار مغزی اور ذہانت نظر آتی ہے۔ البتہ کتاب میں بعض خامیاں بھی ہیں مثلاً اس نے بعض ایسے اشخاص کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اصحابِ تصانیف نہیں ہیں۔ اسی طرح اس نے بعض کتابوں کا نام ذکر کرنے کے بجائے انھیں ان کے مؤلفین کی طرف منسوب کر کے ذکر کیا ہے۔ ابن ندیم نے اپنے کتاب میں مؤلفین کے حالاتِ زندگی بھی بیان کئے ہیں۔ اسی بنا پر اس کی اس کتاب کے موضوع کے بارے میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ بعض لوگ اسے ببلیوگرافی مانتے ہیں اور بعض اسے سوانح کی کتاب قرار دیتے ہیں۔

کتاب الفہرست سب سے قدیم دستاویز ہے جو اسلامی عہدِ زریں یعنی عہدِ عباسی میں اسلامی علمی ترقی کو آشکارا کرتی ہے۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو اسلامی علمی ورثہ کی بہت سی کتابوں کے نام ضائع ہو جاتے جس طرح کہ خود وہ کتابیں بیرونی حملوں کے نتیجے میں ضائع ہو گئیں اور اسلامی فکر و تہذیب کی تاریخ پر کام کرنے والا ایک اطمینان بخش اور دستاویزی کتاب

سے محروم ہو جاتا۔ بلکہ کتاب الفہرست وہ بنیادی کتاب ہے جس کا بعد کے تمام فہرست سازوں نے سہارا لیا ہے۔ یقیناً یہ کتاب انسانی تاریخ میں اولیں ببلیوگرافی ہے۔

مغرب کو سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس کتاب سے واقفیت ہوئی جب اس کے مخطوطات مصر سے پیرس اور قسطنطنیہ سے لیدن منتقل ہوئے۔ جرمن مستشرق گستاف فلوجل Gustav Flugel نے اس پر تحقیق کا بیڑا اٹھایا۔ ویانا، پیرس اور لیدن سے اس کے مخطوطات جمع کرنے کے بعد اس کی اشاعت میں اسے پچیس سال لگے۔ لیکن اس کی طباعت مکمل ہونے سے قبل ہی ۱۸۷۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کام کو Roedig اور Mueller نے انجام دیا اور ۷۲-۱۸۷۱ء میں یہ کتاب درج ذیل نام سے شائع ہوئی

Kitab Al Fihrist + Anmerkungen hersg

von Gustav Flugel nach dessen Tode besorget

von Johannes Roedins and August Mueller

Leipzig F C W Vogel 1871 72 2u in t

بلاشبہ انیسویں صدی میں یہ بہت ہی عظیم کام تھا۔ لیکن مستشرق H.Ritter کو کتب کوپریلی آستانہ میں وہ اصل مخطوطات مل گئے جن سے وہ مخطوطات نقل کئے گئے تھے جن پر Flugel نے اس کتاب کی تحقیق میں اعتماد کیا تھا۔ اور اس نے یہ ثابت کیا کہ وہ مخطوطات جن پر فلوجل نے اعتماد کیا تھا، اس کتاب کی اشاعت کے لئے کمزور بنیاد فراہم کرتے ہیں اور ان اصل مخطوطات سے جن کا اس نے پتہ لگایا ہے رجوع کرنا ضروری ہے۔ فلوجل نے جن مخطوطات پر اعتماد کیا تھا ان میں سے اہم درج ذیل تھے۔

۱۔ مخطوطہ ویانا م ۳۳ (Wien 33)   ۳۔ مخطوطہ پیرس م ۱۴۰۰ (Paris 1400)

۲۔ مخطوطہ ویانا م ۳۴ (Wien 34)   ۴۔ مخطوطہ لیڈن م ۲۰ (Leyden XX)

Ritter نے ثابت کیا کہ مخطوطہ ویانا م ۳۳، مخطوطہ کوپریلی م ۱۱۳۴ سے منقول ہے۔ مخطوطہ ویانا م ۳۴ مخطوطہ کوپریلی م ۱۱۳۴ کے ایک جزء سے منقول ہے اور مخطوطہ لیدن م ۲۰ ویانا کے مخطوطہ م ۳۴ کی فوٹو کاپی ہے جیسا کہ فلوجل نے بھی اس کی وضاحت کی ہے۔ مخطوطہ کوپریلی م ۱۱۳۵ کی کتابت یوسف بن منصور نے ربیع الثانی ۶۰۰ھ میں کی تھی۔ یہ مخطوطہ الفہرست کے صرف آخری چار مقالات پر مشتمل ہے۔

رائٹر Ritter نے مخطوطہ شہید علی پاشا م ۱۹۳۴ کا پتہ لگایا اور مخطوطہ کوپریلی م ۱۱۳۴ سے جو مخطوطہ ویانا م ۳۳ کی بنیاد ہے، اس کا موازنہ کرکے بتایا کہ مخطوطہ کوپریلی مخطوطہ شہید علی پاشا م ۱۹۳۴ کی ہی نقل ہے۔ گویا مخطوطہ شہید علی اصل ہے۔ اور چونکہ مخطوطہ ویانا م ۳۴ بھی مخطوطہ کوپریلی م ۱۱۳۴ کی نقل ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصل مخطوطے صرف دو ہیں۔ ایک مخطوطہ شہید علی پاشا م ۱۹۳۴ اور دوسرا مخطوطہ کوپریلی م ۱۱۳۵ ہے۔ ان دونوں کی روشنی میں رائٹر نے فلوجل کے محقق ایڈیشن کا موازنہ کیا تو بہت سی غلطیاں پائیں۔

مصر سے اس کتاب کا ایک ایڈیشن ۱۳۴۸ھ میں المکتبۃ التجاریۃ الکبری نے شائع کیا۔

سے شروع میں جامعۂ مصر کے ایک استاد کے قلم سے ابن ندیم کی سوانح حیات اور الفہرست کی اہمیت پر ایک فاضلانہ مقالہ بھی شامل ہے لیکن ناشر نے یہ نہیں بتلایا ہے کہ اس نے کن مخطوطات کو تحقیق کے لیے بنیاد بنایا ہے۔ کتاب کے آخر میں اس حصہ کا اضافہ ہے جسے ہوتسمہ Houtsma نے شائع کیا تھا جبکہ اسے پانچویں مقالہ کے شروع میں ہونا چاہئے تھا۔

المکتبۃ التجاریہ سے شائع شدہ ایڈیشن کے مقدمہ میں تذکرہ ہے کہ فلوجل نے الفہرست کی تحقیق میں مخطوطۂ پیرس، مخطوطہ کوپریلی، ویانا کے دو مخطوطوں اور مخطوطۂ لیڈن پر اعتماد کیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فلوجل نے مخطوطۂ کوپریلی سے مطلق استفادہ نہیں کیا ہے۔ مکتبۂ خیاط، بیروت نے فلوجل کے محقق ایڈیشن کو ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس کی دوسری طباعت ۱۹۷۱ء میں تہران میں ہوئی جس کی تحقیق رضا تجدد نے کی تھی اس سلسلے میں اس نے چسٹر بیٹی کے مخطوطہ ۳۳۱۵ جو جنوبی آئرلینڈ کے صدر مقام ڈبلن میں محفوظ ہے اور مخطوطہ شہید علی پاشا ۱۹۳۴ جو کتب خانہ سلیمانیہ استنبول میں ہے، کو بنیاد بنایا ہے۔ یہ دونوں نسخے سائز، تحریر اور دیگر اوصاف میں یکساں ہیں اور دونوں کو ملا کر کتاب مکمل ہوتی ہے۔ چسٹر بیٹی کے مخطوطہ میں چار مکمل مقالے اور پانچویں مقالے کا ابتدائی حصہ ہے جو اب تک نہیں چھپ سکا ہے۔

شہید علی پاشا کا مخطوطہ ابوعبداللہ محمد بن زید الواسطی کی سوانح سے شروع ہوتا ہے (یعنی پانچویں مقالہ کے فن اول سے) اور اس کا خاتمہ دسویں مقالہ کے اختتام پر ہوتا ہے۔ رضا تجدد نے فلوجل کے ایڈیشن کو مقابلہ کرنے اور غلطیوں کی اصلاح کے لئے بنیاد بنایا پھر ۱۹۷۳ء میں رضا تجدد نے خود ہی اس ایڈیشن کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

ڈاکٹر بایارد دودج پرنسپل امریکن کالج بیروت نے اس کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے جو دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ موصوف نے اس نسخے کی تحقیق بھی کی ہے اور اس میں چسٹر بیٹی کے مخطوطہ ۳۳۱۵ اور شہید علی پاشا کے مخطوطہ ۱۹۳۴ سے مدد لی ہے۔ یہ ایڈیشن اب علماء مغرب کا بنیادی ماخذ ہے۔ اس کو امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔

●●

آیات جلد چہارم شمارہ سوم
ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۳ء

ماخذ:-
مجلہ المسلم المعاصر کویت
جلد ۱۵۔ شمارہ ۵۶
جنوری تا جون ۱۹۹۰ء

مولانا ظفر احمد اعظمی (ایم اے، فاضل دیوبند)

علوم قرآن منزل بہ منزل

علوم قرآن سے مراد وہ تمام علوم ہیں جن کا تعلق قرآن کریم سے ہے جیسے علم تفسیر علم قرأت، اسباب نزول و شانِ نزول کی معرفت۔ ناسخ و منسوخ کا علم۔ مکی و مدنی سورتیں، نزولِ قرآن میں سورتوں و آیتوں کی ترتیب۔ جمع قرآن اور اس کی کتابت اعجازِ قرآن وغیرہ وغیرہ، اور موجودہ زمانہ میں مستشرقین کے اعتراضات جو وحی اور قرآن پر ہیں ان کے جوابات، یہ سب بھی علوم قرآن کے اندر داخل ہوں گے۔ اس طرح علوم قرآن کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا۔

لیکن یہ علم کب وجود میں آیا اور کن مراحل سے گذرتا ہوا ہم تک پہنچا اس کو جاننے کے لیے نزولِ قرآن کے وقت سے اب تک کے تمام ادوار کا مطالعہ بہت ضروری ہے، اس پورے زمانے کو پہلے ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) دورِ تمہید (۲) دورِ تدوین اور اس کے مختلف مراحل۔

دورِ تمہید قرآن کریم رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے جمع کرنے اور بیان کرنے کی ذمہ داری لے لی گئی۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ
فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ
(قیامہ پ ۲۹)

بے شک ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کر دینا
اور اس کا پڑھوانا، تو جب ہم اسے پڑھنے لگیں تو آپ
اس کے تابع ہو جایا کیجئے پھر اس کا بیان کرا دینا
بھی ہمارے ذمہ ہے۔

صحابۂ کرام صحیح عربیت کا ذوق رکھنے کی وجہ سے قرآن کے مطلب، اوامر و نواہی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آیت کا شان نزول کیا ہے اور کس واقعہ پر قرآن کی کون سی آیت نازل ہوئی، انہیں جب کسی آیت کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تو وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے اور آپؐ سے اس کی تفسیر معلوم کرتے چنانچہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم
اولئك لهم الامن وهم مهتدون (انعام)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو
ظلم سے مخلوط نہیں کیا۔ ایسوں ہی کے لیے امن ہے

تو صحابہ کرامؓ کو تشویش ہوئی اور کہا ایّنا لم یظلم نفسہ ہم میں کون ہے جس نے اپنے اوپر ظلم نہیں کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ظلم سے مراد شرک باللہ ہے، چنانچہ قرآن کی دوسری آیت میں ہے اِنّ الشرک لظلم عظیم بلا شبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اس طرح عہد رسالت اور عہد صحابہ میں علوم قرآن کی تدوین کی کوئی حاجت نہیں تھی، پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت ناخواندہ تھی، کہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور ان کے علم کا سارا دارومدار قوت حافظہ پر تھا، نیز یہ بات بھی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو قرآن کے علاوہ دوسری چیزوں کے لکھنے سے منع کر دیا تھا کہ مبادا قرآن کے ساتھ کسی دوسری چیز کا اختلاط ہو جائے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علیّ متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔ میری طرف سے قرآن کے علاوہ دوسری چیزوں کو مت لکھو جس نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ لکھا ہے تو اس کو مٹا دے، میری طرف سے بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے قصداً میری طرف سے جھوٹ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔

اسی طرح عہد رسالت میں علوم قرآن کا دارومدار ایک دوسرے سے تلقی اور سماع پر رہا، ابتدائی تدوین قرآن عہد صدیقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے ہوا۔ پھر جب حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں عرب عجم کا اختلاط زیادہ ہوا تو انہوں نے اسی مصحف صدیقی کی مختلف نقلیں کرا کر مختلف ملکوں کو روانہ کر دیں، اور یہ حکم بھی جاری فرما دیا کہ اس کے علاوہ جو قرآن کے نسخے ہوں انہیں جلا دیا جائے۔ مبادا امت میں اس کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو، یہ حضرت عثمانؓ کی فراست ایمانی تھی جو کہ انہوں نے یہ حکم دیا۔

ہمارے موضوع سے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کتابت کے سلسلے میں بعض بنیادی چیزیں بتائیں، جنہیں بعد میں چل کر علم رسم قرآن یا علم رسم عثمانی کے نام سے موسوم کیا گیا، اسی طرح پر حضرت عثمانؓ کو علم رسم قرآن کا مؤسس یا واضع کہا جا سکتا ہے۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابو الاسود الدؤلی (متوفی ۶۹ھ) کو عربی زبان کی سلامت وصحت کے لیے بعض قواعد کو مرتب کرنے کو کہا تو اس بنا پر حضرت علیؓ کو علم اعراب قرآن کا مؤسس کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ علوم قرآن کے واضعین اور مؤسسین میں مندرجہ ذیل حضرات ہیں۔

(۱) خلفائے اربعہ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، ابی بن کعبؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، صحابہ کرام میں سے۔

(۲) مجاہد، عطاء بن یسار، عکرمہ، قتادہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، اور زید بن اسلم رحمہم اللہ یہ سب تابعین میں سے ہیں۔
(۳) اور تبع تابعین میں سے حضرت مالک بن انس کو کہا جاسکتا ہے، جنہوں نے حضرت زید بن اسلم سے یہ علم حاصل کیا۔

یہ تمام حضرات ان علوم کے بانی اور مؤسس ہیں جنہیں اب ہم علم تفسیر، علم اسباب نزول، علم مکی و مدنی، علم ناسخ و منسوخ، علم غریب القرآن کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یا مجموعی طور پر علوم قرآن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۲- دورِ تدوین

دورِ تدوین کو ہم نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور دوسری صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے اس دور میں علم تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم قرآن شروع نہیں ہوئے تھے۔ دوسرا دور: تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے، جب تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم قرآن کی بھی تدوین شروع ہوئی، یہ دور آٹھویں صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ہر صدی کی مشہور کتابوں کا ذکر ہے جو اس موضوع پر لکھی گئیں۔ تیسرا دور، آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہو کر نویں صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں علوم قرآن میں بہت سے جدید علوم داخل ہوئے جیسے امثال القرآن اور جدل القرآن وغیرہ۔ چوتھا دور: دسویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور موجودہ زمانہ کو بھی شامل ہے، یہ دور اخیر ہے۔

الف: پہلا دور

جب علوم کی تدوین کا دور شروع ہوا تو سب سے پہلے علم تفسیر کو مدوّن کیا گیا کہ وہ تمام علوم قرآنیہ کی اصل اور بنیاد ہے، دوسری صدی ہجری کے جن علماء کرام نے اس فن کی طرف توجہ کی اور اس میں کتابیں تصنیف کیں، ان میں سرفہرست شعبہ بن الحجاج، محدث بصرہ، سفیان عیینہ جو اہل حجاز کے تفسیر و حدیث میں امام کہلاتے ہیں، اور وکیل بن الجراح جو عبداللہ بن المبارکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے استاد ہیں۔ ان حضرات نے علم تفسیر سے شغل رکھا، ان کی تفسیرات صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کے اقوال و آراء کی جامع ہیں، پھر انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے اپنی تفسیر لکھی، جس میں احادیث صحیحہ، اعراب، استنباط، مسائل کا ذکر کیا وہ نہج جس کو ابن جریر طبری اور اس سے پہلے کے مفسرین نے اختیار کیا یعنی صحابۂ کرام اور تابعین کے اقوال و آراء اکتفا کیا تفسیر کے اس طرز کو تفسیر بالماثور کہا جاتا ہے، اسی دور میں تفسیر کا دوسرا نہج بھی شروع ہوا جس کو تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے، پھر قرآن کی مختلف تفسیریں لکھی گئیں، کسی نے مکمل قرآن کی تفسیر لکھی، کسی نے ایک جزء ایک سورہ کی اور کسی نے خاص خاص آیتوں کی مثلاً تفسیر آیات الاحکام جس کو تفسیر موضوعی بھی کہا جاتا ہے۔

ب: دوسرا دور

اس دور میں تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم قرآن کی تصنیف و تالیف ہوئی اور علماء کرام نے خاص طور پر اس کی طرف توجہ کی۔

(۱) چنانچہ تیسری صدی ہجری میں علی بن المدینی جو امام بخاری کے شیخ ہیں انہوں نے اسباب نزول پر اور ابوعبید القاسم بن سلام نے ناسخ و منسوخ اور قرأت و فضائلِ قرآن پر لکھا اور محمد بن ایوب الضریس (م ۲۹۴ھ) نے مکی و مدنی سورتوں کے بارے میں لکھا، اور محمد بن خلف بن المرزبان (م ۳۰۹ھ) نے اپنی کتاب الحاوی فی علوم القرآن تصنیف کی۔ ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا ذکر کیا ہے کہ "۲۷" اجزاء پر مشتمل ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کے متعلق سارے علوم کے لیے "علوم القرآن" کا لفظ بطور اصطلاح کے سب سے پہلے محمد بن خلف بن المرزبان نے اپنی کتاب "الحاوی فی علوم القرآن" میں استعمال کیا ہے۔

(۲) چوتھی صدی ہجری میں ابوبکر محمد بن القاسم الانباری (۳۲۸ھ) نے "عجائب علوم القرآن" تالیف کی جس میں فضائل قرآن، قرآن کا سات حرفوں پر نزول، مصاحف کی کتابت سورتوں اور آیتوں کی تعداد نیز کلمات قرآنی کی تعداد پر بحث لکھی، ابوالحسن اشعری نے ایک عمدہ کتاب المختزن فی علوم القرآن کے نام سے لکھی، ابوبکر السجستانی نے فی غریب القرآن اور ابومحمد القصاب محمد بن علی الکرخی نے نکت القرآن الدالۃ علی البیان فی انواع العلوم والاحکام المنبئۃ عن اختلاف الانام۔ لکھی اور محمد بن علی الادفوی (م ۳۸۸ھ) نے الاستغناء یا الاستغناء فی علوم القرآن "بیس جلدوں میں لکھی۔

(۳) پانچویں صدی ہجری میں علی بن ابراہیم بن سعید الحوفی نے البرھان فی علوم القرآن" اور اعراب القرآن" دو کتابیں تصنیف کی ہیں، ابوعمرو الدانی (م ۴۴۴ھ) نے التیسیر فی القراءات السبع" اور المحکم فی النقط لکھی۔

(۴) چھٹی صدی ہجری میں ابوالقاسم عبدالرحمن جو السہیلی کے نام سے مشہور ہیں، انہوں نے ایک کتاب "مبہمات القرآن" لکھی، حاجی خلیفہ نے اپنی کتاب کشف الظنون میں اس کا نام التعریف والاعلام بما ابہم فی القرآن من الاسماء والاعلام بتایا ہے، نام سے کتاب کی غرض وغایت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ علامہ ابن الجوزی نے بھی دو کتابیں فنون الافنان فی عجائب القرآن اور المجتبیٰ فی علوم متعلق بالقرآن لکھیں۔

(۵) ساتویں صدی ہجری میں ابن عبدالسلام المعز (م ۶۶۰ھ) نے مجاز القرآن کے متعلق ایک کتاب لکھی اور علم الدین سخاوی (م ۶۴۳ھ) نے جمال القراء و کمال الاقراء، ابوشامہ (۶۶۵ھ) نے المرشد الوجیز فیما یتعلق بالقرآن العزیز لکھی۔

ج) تیسرا دور

اس دور میں سابقہ علوم قرآن کے ساتھ ساتھ علوم قرآن سے متعلق کچھ نئے گوشے رونما ہوئے جیسے بدائع القرآن، حجج القرآن اقسام القرآن اور امثال القرآن وغیرہ بدیع کے جو انواع قرآن کریم [...]ں وارد ہوئے ہیں اس موضوع پر ابن ابی الاصبع نے ایک مستقل کتاب لکھی۔ حجج القرآن یا علم جدل القرآن یعنی قرآن [...]ں براہین اور ادلہ کے جو انواع مذکور ہیں اس موضوع پر نجم الدین طوفی (۷۱۶ھ) نے ایک کتاب لکھی۔ اقسام القرآن [...]متقدمین علماء میں سے ابن القیم نے اور متاخرین علماء میں سے مولانا حمید الدین فراہی نے اپنی کتاب امعان فی اقسام

القرآن لکھی، امثال القرآن کی بہت سی مثالیں الاتقان فی علوم القرآن جو علامہ سیوطی کی ہے اس کی ۶۰ ویں نوع میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری میں بدرالدین زرکشی (۷۹۴ھ) نے البرہان فی علوم القرآن لکھی جو استاذ محمد ابوالفضل ابراہیم کی تحقیق کے ساتھ چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

نویں صدی ہجری میں جلال الدین البلقینی نے مواقع العلوم فی مواقع النجوم تصنیف کی، پھر جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نے التحبیر فی علوم التفسیر اور الاتقان فی علوم القرآن لکھی، مؤخر الذکر کتاب میں البرہان فی علوم القرآن للزرکشی سے بڑی حد تک مدد لی گئی ہے۔

(د) چوتھا دور — نویں صدی ہجری کے بعد سے شروع ہوتا ہے پھر بہت سے علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور مختلف تصنیفات اس موضوع پر دنیا کے سامنے آئیں، کسی نے تاریخ قرآن پر لکھا اور کسی نے علوم القرآن اور متعلقات قرآن پر، شیخ طاہر الجزائری نے البیان لبعض المباحث المتعلقۃ بالقرآن، شیخ محمد جمال الدین القاسمی نے محاسن التاویل، شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی نے مناہل العرفان فی علوم القرآن، اور شیخ محمد علی سلامہ نے منہج الفرقان فی علوم القرآن اور عربی زبان و ادب کے استاذ کبیر مصطفیٰ صادق الرافعی نے اعجاز القرآن اور استاذ سید قطب نے التصویر الفنی فی القرآن، استاذ مالک بن نبی نے الظاہرۃ القرآنیۃ لکھی جس میں مسئلہ وحی پر بہت عمدہ بحث کی ہے۔

علامہ رشید رضا مصری تفسیر القرآن الحکیم جو تفسیر منار کے نام سے جانی جاتی ہے اس میں بھی علوم قرآن پر بہت کچھ مواد موجود ہے، جدید کتابوں میں ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز کی دو کتابیں النبأ العظیم اور نظرات جدیدۃ فی القرآن محمد الغزالی کی کتاب نظرات فی القرآن اور استاذ محمد المبارک عمید کلیۃ الشریعہ جامعہ دمشق کی کتاب المنہل الخالد، ڈاکٹر مناع القطان کی کتاب مباحث فی علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی الصالح کی کتاب مباحث فی علوم القرآن، شیخ محمد علی الصابونی کی کتاب التبیان فی علوم القرآن قابل ذکر ہیں۔

امت اسلامیہ کا دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی اس موضوع پر کتابیں وجود میں آئیں، ہمارے ہندوستانی علماء میں سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب الفوز الکبیر جو اصلاً فارسی زبان میں لکھی گئی ہے وہ علوم قرآن ہی کے موضوع پر ہے، ابھی چند سال ہوئے اس کی عربی زبان میں مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند نے العون الکبیر کے نام سے بہت عمدہ شرح لکھی ہے۔

موجودہ زمانہ میں علوم قرآن کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے، سائنس و ٹکنالوجی کی وجہ سے بہت سی چیزوں کا انکشاف اور مختلف چیزوں کی تسخیر دنیا کے سامنے آئی تو بہت سے لوگوں نے قرآن اور تسخیر کائنات کے

موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان ساری بحثوں کو علوم قرآن ہی کے دامن میں جگہ ملنی چاہیئے، ایسے ہی اعدائے اسلام نے جو قرآن کے اوپر اعتراضات کئے ہیں اور علمائے اسلام نے ان کے مختلف زمانوں میں جوابات دیئے ہیں۔ یہ ساری بحثیں بھی علوم قرآن سے متعلق سمجھی جائیں گی۔ اس طرح علوم قرآن کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔

یہ علوم قرآن کے متعلق چند سطریں ہیں، اس کا مقصود اس موضوع پر لکھی گئی ساری کتابوں کا استقصاء یا احاطہ نہیں ہے، اور یہ اس جیسے چھوٹے مضمون میں ممکن بھی نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ علم ہم تک کن مراحل سے گذرتا ہوا پہنچا ہے اور علمائے اسلام نے اس ایک موضوع پر کس طرح کتابیں لکھی ہیں، اور امت اسلامیہ کبھی بھی ایسے علماء کرام سے خالی نہیں رہی ہے۔

(الحق، اکتوبر ۹۳ء)

ڈاکٹر برنارڈ لویس

انگلستان اور عربی علوم و فنون-۱

پروفیسر برنارڈ لویس بزرگ مستشرق ہیں۔ وہ کافی عرصہ یونیورسٹی آف لندن میں "مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ" کے استاد رہنے کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی سے منسلک رہے ہیں۔ انھوں نے اسلام، اسلامی تاریخ اور اسماعیلی شیعیت کے ساتھ ترکی اور مشرقِ وسطیٰ پر متعدد کتب اور مقالات لکھے ہیں۔ "کیمبرج ہسٹری آف اسلام" کے مرتبین میں شامل ہیں، تاہم وہ مستشرقین کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اسلام اور مشرق کے بارے میں وسیع القلبی پیدا نہیں کر سکا۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ انھوں نے بی - بی - سی (لندن) کے عربی پروگرام میں "انگلستان اور عربی علوم و فنون" کے موضوع پر چھ تقریریں نشر کی تھیں۔ اُسی زمانے میں انگریزی متن British Contributions to Arabic Studies [لندن: لانگ مینز (۱۹۴۱ء)] اور عربی ترجمہ شائع ہو گیا تھا۔ شعبۂ اطلاعات حکومتِ ہند نے اردو ترجمہ جید برقی پریس (دہلی) سے شائع کیا تھا جو اب شاذ ہی نظر آتا ہے۔ یہ کمیاب کتابچہ جہاں اس لحاظ سے اہم ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں برطانوی ذرائع ابلاغ اور اُن کی پالیسیوں کو سمجھنے میں اِس سے مدد ملتی ہے، وہیں اِس سے مؤلف پروفیسر لویس کی علمی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے جس موضوع پر نشری تقاریر لکھیں، وہی ۱۹۸۲ء میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اُن کی تالیف The Muslim Discovery of Europe [نیویارک: ڈبلیو- ڈبلیو- نارٹن] میں زیرِ بحث آیا ہے۔

"عالمِ اسلام اور عیسائیت" کی ضخامت اِس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کتابچہ — "انگلستان اور عربی علوم و فنون" — ایک ہی اشاعت میں پیش کر دیا جائے، لہٰذا زیرِ نظر شمارے میں اِس کا ابتدائی نصف حصّہ پیش کیا جاتا ہے۔ مدیر

قرونِ وسطیٰ

ایک مدت تک محققین کا یہ خیال رہا کہ اسلامی اور فرنگی تہذیبیں پہلے پہل ایک دوسرے سے خاص طور پر صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ میں روشناس ہوئیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہی پہلا موقع تھا جب عربی مشرق اور عیسائی مغرب میں گہرا تعلق پیدا ہوا اور یقیناً دونوں ایک دوسرے کی تہذیب سے مستفید بھی

ہوئے، مگر زمانۂ حال کی تاریخی تحقیقات سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ باہمی استفادہ اثر و وسعت کے لحاظ سے بہت محدود تھا جیسا کہ اس واقعہ کی نمایاں فوجی نوعیت پر نظر کرتے ہوئے اسے ہونا بھی چاہیئے تھا۔ مغرب میں عموماً اور انگلستان میں خصوصاً عربی علوم وافکار کے پہنچنے کا ایک دوسرا ہی ذریعہ تھا۔

شمالی افریقہ کو فتح کرنے کے بعد فاتح عرب نصرت وکامرانی کے پرچم اڑاتے ہوئے یورپ تک نکل آئے اور ایک عرصہ تک ان کی نوآبادیاں بحیرۂ روم کے خطہ کے دو اہم علاقوں میں قائم رہیں۔ عربوں نے اسپین اور صقلیہ (سسلی) میں ایک ایسی شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی جو اس وقت کے تمام عیسائی ممالک کی تہذیب سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ یہ تہذیب اپنی ہم عصر عیسائی تہذیب پر اثر انداز ہو کر رہی۔ اس وقت بھی جب کہ یہ علاقے پھر عیسائیوں کے ہاتھ آ گئے، کچھ عرصہ تک وہاں عربی علوم و فنون کا ویسا ہی چرچا رہا۔ عیسائی بادشاہ خود عربی زبان بولتے اور عرب علماء کی امداد کرتے تھے۔ ابتدا ہی سے عربوں کی برتر و اعلیٰ تہذیب کے اثرات فرنگی ممالک میں پہنچنے لگے۔ اسپین کے عربی بولنے والے عیسائی اس اثر کو آگے بڑھانے کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے اور اسپین اور سسلی کے عربی بولنے والے یہودیوں نے بھی جن کی زبان ان کے ہم مذہب فرنگیوں کی طرح عبرانی تھی، مغرب میں عربی علوم و فنون کو پھیلانے میں بہت مدد دی۔ ہم اس سلسلہ میں ایک ہسپانوی یہودی فلسفی و عالم ابراہام بن عزرا کا خاص طور پر ذکر کریں گے۔ یہ شہر طولیدو کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۵۹-۱۱۵۸ء میں لندن کا سفر کیا اور کچھ دنوں وہاں تعلیم و تدریس کا کام بھی انجام دیا۔ اسی طرح ایک انگریز ٹامس براؤن (Thomas Brown) کا ذکر بھی کر سکتے ہیں جو سسلی میں قاضی تھا اور عربی دستاویزات میں اسے "قاضی براون" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

بارہویں صدی میں شمالی ممالک خصوصاً انگلستان کے علماء طلب علم کی غرض سے اسپین کی عرب یونیورسٹیوں میں آنے لگے۔ ان علماء میں پہلا اور بزرگ ترین عالم شہر باتھ (Bath) کا رہنے والا انگریز ایڈیلارڈ (Adelard) تھا۔ یہی شخص تھا جس نے مغرب میں عربی علوم و فنون کے پھیلانے میں پہل کی۔ بارہویں صدی کے ربع اول میں ایڈیلارڈ نے عربی زبان اور عربی علوم حاصل کرنے کی غرض سے طویل طویل سفر کیے۔ اس نے اپنے ہم عصر عیسائیوں کے لیے بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور واپسی پر انگلستان کے ہونے والے بادشاہ ہنری ثانی کے اتالیق کی حیثیت سے خدمت انجام دی بلکہ اس نے اپنی ایک کتاب بھی شاہ ہنری کے نام معنون کی۔ اس کی اہم ترین تصنیف Natural Questions (مسائل طبیعیہ) ایڈیلارڈ اور اس کے بھتیجے کے درمیان ایک مکالمہ کی صورت میں ہے۔ بھتیجے نے فرنگیوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور ایڈیلارڈ نے عربوں کے یہاں۔ اس مکالمہ کے ذریعہ انھیں دو مختلف اصولوں اور نظریوں میں باہم مقابلہ کیا گیا ہے۔ ایڈیلارڈ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ "میں عربوں کے نظریہ کی حمایت کروں گا۔ خود اپنی شخصی رائے

پیش نہ کروں گا۔" پھر اُس نے نہایت تفصیل کے ساتھ "عرب طریقہ" کی برتری بیان کی اور اپنے اثر کو کام میں لا کر مغرب میں اسی طریقہ کے پھیلانے میں بہت مدد دی۔ اس نے علمِ ہیئت اور ریاضی کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اس طرح یورپ میں اِن علوم کو ترقی دی۔

ایڈیلارڈ کے بعد بہت سے دوسرے انگریز علماء اسپین گئے۔ شہر چسٹر (Chester) کے ایک شخص رابرٹ (Robert) نے بھی بارہویں صدی میں علمِ ریاضی حاصل کیا اور عربی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ڈینیل آف مورلے (Daniel of Morley) بھی اُس زمانہ کی قابلِ ذکر شخصیتوں میں سے تھا جیسا کہ وہ خود اپنے متعلق بیان کرتا ہے۔ اسے فرنگی یونیورسٹیاں پسند نہ تھیں اس لیے وہ "دنیا کے زیادہ بالغ نظر حکماء کی تلاش میں" اسپین گیا۔ یہاں سے وہ کتابوں کا ایک ذخیرہ ساتھ لے کر واپس آیا جسے پڑھنے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تیرہویں صدی میں میکائیل اسکاٹ (Michael Scot) نے سِسلی میں تعلیم پائی اور عربی اور عبرانی زبانوں میں دستگاہ حاصل کی۔ اُس نے ارسطو کی تصنیفات کا عربی سے ترجمہ کیا اور اس طرح ان میں سے بہت سی کتابوں سے مغرب پہلے پہل روشناس ہوا۔ اُس نے ارسطو کی تصنیفات کی عربی شرحوں کا بھی ترجمہ کیا اور خود علمِ ہیئت اور علمِ کیمیا پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

ان علماء اور اِن کے علاوہ ان دوسرے حوصلہ مند انگریزوں کی تصنیفات کا جنھوں نے تحصیلِ علم کی خاطر مصائب برداشت کر کے عربی ممالک کا سفر اختیار کیا، تہذیب پر بہت اثر پڑا۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انگلستان ہی نہیں بلکہ سارا مغرب علوم و فنون کے اِن کارناموں سے واقف ہوا جو عربوں نے انجام دیے۔ یہ ایک اہم قدم تھا جس نے یورپ کی تہذیب کو آگے بڑھایا۔ ان تراجم اور تصانیف کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ عربی علوم سے جو لوگ بہت زیادہ متاثر ہوئے، ان میں انگلستان کے بلند پایہ فلسفی راجر بیکن (Roger Bacon) اور مشہور شعراء چاسر (Chaucer) اور لڈگیٹ (Lydgate) بھی تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ (Dicts And Sayings of the Philosophers) جو اس سلسلے میں انگلستان میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے اور ۱۴۷۷ء میں طبع ہوئی تھی، ایک عربی تالیف "کتاب مختار الحکم و محاسن الکلم" سے ماخوذ تھی جسے مصر کے امیر مبشر بن فاتک نے ۱۰۵۳ء میں تالیف کیا تھا۔ یہ عربی کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے مگر اس کا قلمی نسخہ ہالینڈ میں موجود ہے۔ یہ کتاب فلسفیانہ اقوال و امثال پر مشتمل ہے اور ایک زمانہ میں مشرق میں بہت مقبول تھی۔ اس کا ترجمہ یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہوا۔

قرونِ وسطیٰ کے یورپ پر عرب ہم عصروں اور ان کے مغربی ترجمانوں کا دو گونہ احسان ہے۔ پہلا احسان تو یہ کہ یورپ کو یونانی علوم و افکار کے اس گراں مایہ ترکہ کا بڑا حصہ عربوں ہی کے ہاتھوں پہنچا جسے مغرب تو گنوا چکا تھا مگر عربوں نے محفوظ رکھا اور بڑھایا۔ دوسرا احسان یہ ہے کہ یورپ نے عربوں سے تحقیق کا ایک نیا طریقہ سیکھا جس نے عقل (Reason) کو سند (Authority) پر ترجیح دے کر

آزادانہ تحقیق و تجربہ کی اہمیت پر زور دیا۔ یہی وہ دو سبق تھے جنھیں سیکھ لینے کی وجہ سے بہت جلد ہی ملک قرونِ وسطیٰ کے دور کا خاتمہ ہو گیا اور دورِ احیاءِ علوم (Renaissance) کا آغاز ہوا اور جدید یورپ عالمِ وجود میں آیا۔ انگریز علماء نے ان سبقوں کو دوسروں تک پہنچانے کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ یہ ایک تاریخی حادثہ ہے کہ ٹھیک اس زمانہ میں عربوں نے وہ باتیں جو انھوں نے یورپ کو سکھائی تھیں، خود بھلانی شروع کر دیں اور کئی صدیوں بعد انہیں پھر سیکھنی پڑیں۔

آئیے اس تقریر کے خاتمہ پر شہر باتھ کے ایڈیلارڈ سے سنیں کہ وہ اپنے بھتیجے سے اس نئے طریق کے متعلق جو اس نے اسپین میں سیکھا تھا، کیا کہتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ تحریر آٹھ سو برس پرانی ہے۔

> "میں نے عقل کو اپنا رہبر بنا کر اپنے عرب اُستادوں سے کچھ اور سیکھا ہے مگر تمھیں کچھ اور سکھایا گیا ہے۔ تمھاری آنکھیں سند کی ظاہری عظمت سے خیرہ ہو جاتی ہیں اور تم اپنے منہ پر دہانہ چڑھا لیتے ہو۔ آخر سند کو دہانہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ جس طرح وحشی درندوں کے منہ پر دہانہ چڑھا کر جہاں چاہتے ہیں، لے جاتے ہیں، اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں کہاں اور کیوں لے جایا جا رہا ہے کیونکہ وہ تو اسی اُس ڈوری سے جس میں وہ بندھے ہوتے ہیں، کھچے چلے جاتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح تم میں سے بہت سے ضعیف الاعتقاد لوگ اپنے بھولے پن اور اندھی تقلید کی وجہ سے مصنفین کی سند سے مرعوب ہو کر ٹھوکریں کھاتے ہیں --- افراد کو اسی لیے تو عقل عطا کی گئی ہے کہ وہ اسے حکم قرار دے کر حق و باطل میں امتیاز کر سکیں --- ہمیں سب سے پہلے عقل و خرد کی تلاش کرنی چاہیے اور جس وقت وہ دستیاب ہو جائے (صرف اسی وقت اس سے پہلے نہیں) اس کی تائید میں اگر مل جائے تو سند بھی قبول کر لینی چاہیے۔ سند بذات خود فلسفی کے اعتماد کے لیے کافی نہیں اور نہ اسے اس غرض سے استعمال کرنا چاہیے۔"

جو لوگ عربوں کی تحریروں سے واقف ہیں اور ایڈیلارڈ کے اس سبق کے ماخذوں کو اور جو لوگ مغربی علوم کا کچھ علم رکھتے ہیں وہ اس کی اہمیت کو فوراً تاڑ لیں گے۔

استشراق کی ابتداء

پہلی تقریر میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح قرونِ وسطیٰ میں انگریز علماء عربوں سے علم حاصل کرنے اسپین اور سسلی گئے اور کس طرح انھوں نے اپنے حاصل کردہ علم کو انگلستان واپس آکر پھیلایا۔ اب ہم ایک نئی ترقی کا ذکر کرتے ہیں جو تحصیلِ علومِ عربیہ کے سلسلے میں رونما ہوئی یعنی فن علماء کا ظہور

جنھیں حال کی اصطلاح کے مطابق اوّلین مستشرقین کہا جا سکتا ہے۔ جس دور کا ہم نے پچھلی صحبت میں مطالعہ کیا ہے اور جس دور سے اس وقت بحث ہے ان دونوں کے درمیان جو عرصہ گزرا، اس میں بہت سے تغیرات پیش آئے۔ اس عرصہ میں یورپ نے تو علوم و فنون میں بہت ترقی کر لی مگر عرب اپنا پچھلا تفوق بھی کھو بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یورپ کے طلباء کو اس کی ضرورت نہ رہی کہ وہ عربی علوم و فنون کی تحصیل کے لیے عرب اساتذہ کی جستجو کریں۔ اس طرح استشراق کی ایک نئی قسم ظاہر ہوئی جس نے علوم مشرقیہ کی جدید تحقیقات کا دروازہ کھولا۔ آج انگریز طلبہ اس غرض سے عربی نہیں پڑھتے کہ وہ عربی علماء سے علوم و فلسفہ میں سبق لیں بلکہ محض عربی زبان حاصل کرنے کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ اب انگریزوں نے پہلے پہل سنجیدگی کے ساتھ عربی زبان و ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ عربوں اور فرنگیوں دونوں کے لیے اسی طرح سودمند ثابت ہوئیں جس طرح حال کے مستشرقین کی خدمات۔ عربی لغات اور کتب صرف و نحو تالیف کی گئیں۔ عربی کتابوں کے قلمی نسخے مشرق میں طبع ہونے سے بہت پہلے آراستہ و پیراستہ کر کے طبع کیے گئے۔ عرب کی تاریخ اور عربی ادب کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی طرح کے دوسرے کام انجام دیے گئے۔ یہ تحریک سترہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ اسی صدی میں انگلستان کی دو بڑی یونیورسٹیوں یعنی کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا خاص انتظام کیا گیا اور اس غرض سے انگریز پروفیسر مقرر ہوئے کہ وہ شوقین طلبہ کو عربی زبان سکھائیں۔ اُس زمانہ میں پہلے پہل انگلستان میں عربی کتابیں طبع ہوئیں۔ ہم اس موقع پر اُن شخصیتوں کا ذرا زیادہ تفصیل سے ذکر کریں گے جنھوں نے سب سے پہلے اس کام میں حصہ لیا۔

وہ شخص جسے عام طور پر انگلستان میں "تحصیل علوم مشرقیہ کا باوا آدم" مانا جاتا ہے، ولیم بڈول (William Bedwell) تھا۔ یہ ۱۵۶۱ء سے ۱۶۳۲ء تک زندہ رہا۔ اس کا ایک دلچسپ مقالہ آج بھی موجود ہے جس میں اس نے عربی زبان کی اہمیت اور اُس کے حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس نے عربی زبان کے متعلق لکھا ہے۔ "یہی ایک زبان ہے جسے دینی تقدس حاصل ہے اور جو جزائر کینیری (الجزائر السعیدہ) سے ملک چین تک سیاسی معاملات اور کاروبار کی خاص زبان سمجھی جاتی ہے۔" بڈول کو اپنے زمانے میں کافی شہرت حاصل تھی اور وہ تمام یورپ میں علوم عربیہ کے ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کی خاص تالیف ایک ضخیم عربی لغت ہے جو سات جلدوں میں ہے اور بدقسمتی سے ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کی مطبوعہ کتابوں میں بعض عربی نسخے ہیں جو لندن میں طبع ہوئے اور بعض علوم قرآنی کے متعلق تحقیقی رسالے ہیں۔ اس نے ان عربی الفاظ کی ایک لغت بھی تیار کی جو بیزنطینی زمانہ سے خود اس کے زمانے تک مغربی زبانوں میں مستعمل چلے آ رہے تھے۔

اُس زمانے کی ایک اور نمایاں شخصیت اڈمینڈ کیسٹل (Edmund Castell) ہے جو کیمبرج

نیورسٹی کے اولین عربی اساتذہ میں سے تھا اور ۱۶۰۶ء سے ۱۶۸۵ء تک زندہ رہا۔ اس کی زندگی کا اہم
ین کارنامہ سامی زبانوں کی ایک مشترکہ لغت ہے جس کی تالیف میں اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ
ل صرف کیے۔ یہ لغت پہلے پہل ۱۶۶۹ء میں شائع ہوئی۔ مؤلف نے اس لغت کے دیباچہ میں خود
پنے متعلق لکھا ہے۔ "کم از کم ۱۶ یا ۱۸ گھنٹے روزانہ کام کر کے اور جسمانی تکالیف اور مالی نقصانات اٹھا کر
ئی اٹھارہ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد" اس نے یہ لغت تالیف کی۔ یہ لغت جو اپنی نوعیت کی پہلی
ت تھی، بہت اہمیت رکھتی تھی اور انگلستان اور یورپ میں متعدد بار طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ کیسٹل کی
سری کتابوں میں تحصیل علوم عربیہ کی قدر و قیمت کے متعلق ایک رسالہ، ابن سینا کی شرح اور عربی
ع زاد نظموں کا ایک مجموعہ ہے جو انگلستان کے شاہ چارلس ثانی کے نام معنون ہے۔

جان گریوز (John Greaves) جو ۱۶۰۲ء سے ۱۶۵۲ء تک زندہ رہا، ایک مشہور ریاضی داں تھا
۔ ایک زمانے میں آکسفورڈ میں علم ہیئت کا پروفیسر تھا۔ اس نے مشرق قریب اور خاص کر مصر کی کافی
یاحت کی تھی اور عربی اور فارسی زبانوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے عربی اور فارسی کی بہت سی
ی کتابوں، سکوں اور جواہرات کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کیا اور فارسی صرف و نحو پر ایک مختصر سی کتاب
ئع کی۔ اسے فن ریاضی کے متعلق مسلمانوں کی تصنیفات سے خاص دلچسپی تھی اور اس نے اس موضوع
بہت سے پرانے نسخے اور تحقیقی رسالے شائع کیے۔ اس کا بھائی ٹامس گریوز (Thomas
Greave) بھی عربی و فارسی جانتا تھا۔ اس نے بھی چند مضامین شائع کیے۔ سترہویں صدی میں علوم
ربیہ کے ماہرین کی فہرست میں حسب ذیل علماء کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ابراہیم وہیلاک (Abraham Wheelock) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پہلا پروفیسر
ا۔ سیموئل کلارک (Samual Clarke) جس نے عربی عروض پر ایک مقالہ لکھا اور مشہور مقامات
کے عربی ناموں کی ایک لغت تالیف کی۔ برائن والٹن (Brian Walton) جس نے بہت سی مشرقی
بانوں میں توریت شائع کی۔ ڈوڈلی لوفٹس (Dudley Loftus) جو آئرستانی عالم اور مقنن تھا۔ جان
لڈن (John Selden) جو ۱۵۸۴ء سے ۱۶۵۴ء تک زندہ رہا۔ اس نے ایک مقنن اور مدبر کی
یثیت سے اس دور کے انگلستان کی زندگی میں بہت اہم اور نمایاں حصہ لیا۔ جان سلڈن دوسرے علوم
کے علاوہ عربی اور دوسری بہت سی مشرقی زبانوں سے واقف تھا۔ اُس نے عربی کی ایک تاریخی کتاب
کے نسخے کو مرتب کر کے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا اور مرنے کے وقت مشرقی زبانوں کی کتابوں کے قلمی
نخوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا۔

علوم عربیہ کے جو ماہرین سترہویں صدی میں گزرے ہیں، اُن میں سب سے بلند مرتبہ شخص
یڈورڈ پوکاک (Edward Pococke) تھا جو ۱۶۰۴ء سے ۱۶۹۱ء تک زندہ رہا۔ یہ پہلا شخص تھا جسے
کسفورڈ میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ یہی یورپ کا وہ پہلا مستشرق ہے جس نے حقیقتاً نہایت اعلیٰ

درجہ کی خدمات انجام دیں۔ پوکاک نے بچپن ہی میں عربی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ اسے ولیم بنڈویل جیسے شخص کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ اُس نے کچھ دنوں آکسفورڈ میں میتھوپیسر Mathew Pasor سے بھی تعلیم حاصل کی جو مظالم سے تنگ آکر جرمنی سے بھاگ آیا تھا۔ ۱۶۳۰ء میں وہ حلب گیا اور وہاں پانچ برس رہا۔ اس عرصہ میں اُس نے عربی تحریر اور روزمرّہ میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ وہ عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے ساتھ آکسفورڈ لایا اور اس طرح ان نسخوں کو تلف ہونے سے بچایا۔ اس نے حلب کے بہت سے لوگوں سے دوستی پیدا کر لی تھی جن میں خاص کر ایک شیخ فتح اللہ نامی عالم و فاضل تھا جس نے اسے عربی پڑھائی تھی۔ شیخ فتح اللہ کے ساتھ تمام عمر اس کے دوستانہ تعلقات رہے۔

۱۶۳۶ء میں انگلستان واپس آنے کے بعد پوکاک کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی پروفیسر کی نئی جگہ پر مقرّر کر دیا گیا جہاں وہ عربی ادب اور صرف و نحو کی تعلیم دیتا رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی تقریروں کو سننے کے لیے تمام طلبہ کو شرکت پر مجبور کیا گیا۔ نئے پروفیسر نے ابتدائی تقریر میں عربی زبان اور ادب کی اہمیت پر بحث کی اور اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اقوال پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

۱۶۳۷ء میں اُس نے دوبارہ مشرق کا سفر کیا تاکہ نئی معلومات اور کچھ اور قلمی نسخے حاصل کرے۔ اس نے اپنے پُرانے دوست فتح اللہ سے ایک بار پھر ملاقات کی۔ وہ ۱۶۴۱ء میں آکسفورڈ واپس آیا اور باقی عمر انگلستان ہی میں علمی کاموں میں صرف کر دی اور دوسرے سفر میں مشہور ریاضی دان جان گریوز John Greaves بھی اس کا ہم سفر تھا۔

اس طویل مدّت میں جو اُس نے آکسفورڈ میں گزاری جہاں انجیر کے مشہور درخت کے نیچے بیٹھ کر جسے وہ ملک شام سے لایا تھا اور جواب بھی موجود ہے اور غالباً انگلستان میں سب سے پُرانا انجیر کا درخت ہے، پوکاک نے بہت قابلِ ذکر کتابیں لکھیں جن میں سے چند کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

۱۔ "عربوں کی تاریخ کا نمونہ" جو ابوالفرج کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ اس کے آخر میں عربی تاریخ، علوم و فنون، ادب اور مذہب پر مختلف حیثیتوں سے نہایت تحقیق کے ساتھ سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب مستشرقین کی ادبیات میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور ایک زمانے تک اس کی بلند پایہ حیثیت کو عام طور پر تسلیم بھی کیا گیا۔ یہ آکسفورڈ میں پہلے پہل ۱۶۴۹ء میں اور پھر ۱۸۰۶ء میں طبع ہوئی۔

۲۔ لامیتہ العجم، یہ طغرائی کی مشہور عربی نظم ہے جسے ترجمہ، نقد و تبصرہ اور مفصل تشریحات کے ساتھ شائع کیا گیا۔ یہ ۱۶۶۱ء میں آکسفورڈ میں طبع ہوئی۔

۳۔ المختصر فی الدول، ابوالفرج کی تاریخ کا عربی متن ترجمہ کے ساتھ

پوکاک کی علمی زندگی اور اُس کے کارناموں نے یورپ میں علوم مشرقیہ کی تحقیقات کا نیا باب کھولا۔ اپنے زمانہ ہی میں اسے کافی شہرت حاصل تھی اور بعد کے مغربی علماء تو سب کے سب اس کے مرہونِ احسان ہیں۔ یورپ کے گوشہ گوشہ سے اہلِ علم اس سے امداد و مشورہ طلب کرتے تھے اور بہت سے ملکوں حتیٰ کہ رومانیہ تک کے طلبہ یورپ کے اس مسلم الثبوت استاد سے عربی پڑھنے آکسفورڈ آیا کرتے تھے۔ یورپ میں علومِ عربیہ کا دوسرا قریب قریب اسی پایہ کا ماہر ایک ڈچ تھا جس کا نام گولیس (Golius) تھا اور جو لیڈن (Leyden) یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ پوکاک کے متعلق اس کا بیان ہے کہ جہاں تک علومِ مشرقیہ کا تعلق ہے، پوکاک کے پایہ کا دوسرا عالم نہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ جن کے نام اوپر دیے گئے ہیں، اُس نے بہت سے تحقیقی رسالے اور قلمی نسخے چھوڑے جو اس کے مرنے کے بعد آکسفورڈ کی باڈلین (Bodlcian) لائبریری نے حاصل کر لیے اور آج تک موجود ہیں۔ یہ اس کتب خانہ کے شعبۂ عربی کا قابلِ قدر جزو ہے۔

اس نے اپنے بعد چھ لڑکے چھوڑے جن میں سے سب سے بڑے لڑکے کا نام بھی ایڈورڈ پوکاک تھا یہ ۱۶۴۸ء سے ۱۷۲۷ء تک زندہ رہا اور اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر تحصیلِ علومِ مشرقیہ میں مصروف رہا۔ اس کی شائع شدہ کتابوں میں عبداللطیف کی "تاریخ مصر" کا ناتمام نسخہ اور اس کا ترجمہ اور ابنِ طفیل کی ایک مشہور فلسفیانہ تالیف کا ترجمہ ہے۔

اسی طرح سترہویں صدی عیسوی میں انگلستان میں تحصیلِ علومِ عربیہ کے سلسلے میں بہت نمایاں ترقی ہوئی۔ علومِ مشرقیہ کے اس تازہ ذوق و شوق کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مذہبی سبب بھی ایک اہم سبب تھا۔ اس زمانہ میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ عربی اور عبرانی میں بہت قریبی تعلق ہے، اس لیے یہ توقع تھی کہ عربی زبان حاصل کر لینے سے عہد نامۂ قدیم (توریت) کے متعلق مزید تحقیقات میں مدد ملے گی۔ اس سے بھی زیادہ اہم سبب عربی زبان اور عربی تاریخ کی عام تمدنی اہمیت کا روز افزوں احساس تھا۔ ایک صدی پہلے یورپ میں احیائے علوم کا وسیع معنوں میں دور دورہ تھا۔ اس سلسلے میں قدیم زبانوں اور ان کے متعلق تحقیقات سے نئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ ایک فطری امر تھا کہ بنی نوعِ انسان کی تاریخ اور تمدن کا مطالعہ کرنے والوں کو عربی دنیا کی اس غیر معمولی اہمیت و حیثیت کا احساس ہوا جو اسے تاریخِ انسانی میں حاصل ہے اور انھوں نے اس تاریخی ذخیرے سے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ بیڈویل (Bedwell)، کیسٹل (Castell) اور پوکاک (Pococke) ان سب نے عربی زبان کی عام اہمیت پر مضامین لکھے جن میں یہ بتایا کہ محققین کے لیے اس زبان کا حاصل کرنا کس قدر ضروری ہے۔

آخر میں ہمیں ان تجارتی اور سیاسی تعلقات کا جو انگلستان اور مشرقِ قریب کے درمیان از سرِ نو قائم

سے اور ان نئے مفادات اور مواقع کا جو اس طرح پیدا ہوئے ذکر کرنا چاہیے۔ یہی اسباب تو تھے جن کی بنا پر پوکاک دو مرتبہ مشرق کے پُر مشقت سفر کامیابی کے ساتھ انجام دے سکا۔ علوم مشرقیہ سے یہ نئی دلچسپی عام اور ہمہ گیر تھی۔ آرچ بشپ لاڈ (Archbishop Laud) جیسی بلند مرتبہ شخصیت نے بھی انگلستان میں تحصیلِ علوم عربیہ کی توسیع و ترقی میں بہت کوشش کی اور آکسفورڈ میں عربی تعلیمات کی پہلی کرسی قائم کرنے کے لیے مالی امداد بھی دی۔

اس طرح سترہویں صدی میں اس انتشار کے باوجود جو خانہ جنگی کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا نمایاں علمی کارنامے انجام پائے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں تحصیلِ علوم عربیہ کے مرکز قائم کیے گئے۔ بہت سی کتابیں شائع ہوئیں اور ایک نیا علم پیدا ہوا جس کے جاننے والے بہت سے نامور علماء نے جو بعد کی صدی میں ظاہر ہوئے، عربوں اور یورپ دونوں کے تمدنی ترکہ کو اپنی تحقیقات سے مالا مال کر دیا۔ ان کے متعلق ہم اگلی تقریر میں بحث کریں گے۔

اٹھارہویں صدی

انگلستان میں مشرقی علوم کا جو بیج سترہویں صدی میں بویا گیا تھا وہ چار سال بعد بار آور ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں آکسفورڈ اور کیمبرج میں پروفیسری کی دو نئی اسامیاں قائم کی گئیں اور اس طرح اب انگلستان کی ان دونوں یونیورسٹیوں کو عربی کی دو دو کرسیوں کی موجودگی پر فخر کرنے کا موقع حاصل ہو گیا۔ اس زمانہ کے نامور ماہرین علوم عربیہ کی تعداد اتنی زائد ہے کہ ہر ایک کا جدا جدا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ ہنٹ (Hunt)، وھائٹ (White)، ہائڈ (Hyde)، گیگنیئر (Gagnier)، براؤن (Brown)، والس (Wallis) اور فورڈ (Ford) جیسے اٹھارہویں صدی کے چند علماء کا ذکر کر دیں۔ یہ سب کے سب اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ اور محققین شمار کیے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں چند علماء کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پریدو (Prideaux) نے جو ۱۶۴۸ء سے ۱۷۶۸ء تک زندہ رہا، سیرت محمد ﷺ پر ایک کتاب تالیف کی۔ چاپلو (Chappelow) نے جو ۱۶۸۳ء سے ۱۷۶۸ء تک زندہ رہا، عربی صرف و نحو کی ایک کتاب تالیف کی۔ لامیتہ العجم اور عربی ادب کی سب سے زیادہ دقیق کتاب "مقاماتِ حریری" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کارلائل (Carlyle) نے ایک بغدادی سیاح سے کیمبرج میں عربی پڑھی اور بہت سی عربی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ انگلستان میں اٹھارہویں صدی کے ماہرین علوم عربیہ میں سے چار علماء کی علمی خدمات خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ وہ انگریزی تمدن کے ترکہ کا وہ خاص حصہ ہے جس نے انگریزی ادیبوں کو عام طور پر بہت متاثر کیا۔

ان میں کا پہلا شخص سائمن اوکلے (Simon Oakley) تھا جو ۱۶۷۸ء سے ۱۷۲۰ء تک زندہ

رہا۔ اس نے کیمبرج اور آکسفورڈ دونوں جگہ عربی کی تعلیم حاصل کی اور نوجوانی ہی میں غیر معمولی ذہانت رکھنے والے طالب علم کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ آکسفورڈ کے مشہور ماہرِ علوم عربیہ ایڈورڈ پوکاک کا شاگرد تھا جس کا ذکر پچھلی تقریر میں کیا جا چکا ہے۔

اوکلے اپنی ایک کتاب کے دیباچہ میں نہایت عزت واحترام کے ساتھ اپنے اُستاد کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "فاضل و محترم ڈاکٹر پوکاک جن کی ذاتِ گرامی اس عہد اور اس قوم کے لیے باعثِ فخر و زینت ہے اور جن کی یاد میرے لیے قابلِ احترام ہے۔" اوکلے جو بالآخر کیمبرج میں عربی کا پروفیسر ہو گیا تھا، علوم عربیہ سے والہانہ شغف رکھتا تھا بلکہ اس نے مادی چیزوں سے غفلت برتنے کی وجہ سے اپنے اور اپنے بہت سے بچوں کو سخت غربت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہت سے مصائب اور ذاتی مشکلات کے باوجود اوکلے نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنی کوششوں میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ تحصیل السنہ مشرقیہ کے لیے ایک عام مقدمہ اور ابنِ طفیل کی کتاب حی بن یقظان کے انگریزی ترجمہ کے علاوہ اوکلے کا خاص کارنامہ اسلام کی سیاسی و تمدنی تاریخ ہے جو اُس نے تین جلدوں میں انگریزی زبان میں تالیف کی۔ اس کتاب کے ذریعہ پہلے پہل اس امر کی کوشش کی گئی کہ انگریزوں کو عام پسند اور عام فہم زبان میں عربی تہذیب کے کارناموں سے روشناس کیا جائے۔ اس سے پہلے زمانے میں جو چند خاص ماہرین علوم عربیہ گزرے تھے، ان کی تالیفات سے صرف مخصوص ماہرین ہی واقف ہوتے تھے لیکن اوکلے نے پہلی بار علوم مشرقیہ کے سلسلے میں اپنی تحقیقات کے ثمرات انگلستان کے پڑھے لکھے لوگوں کے زیادہ وسیع حلقے کے سامنے پیش کیے جسے اس طرح اسلامی دنیا کے شاندار کارناموں سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہو گئی۔ گو اوکلے کی یہ تاریخ حال کی تحقیقات کے پیشِ نظر بعض حیثیتوں سے غلط اور فرسودہ ہے، تاہم اُسے اپنے زمانہ میں ایک قابلِ قدر کارنامہ شمار کیا جاتا تھا اور یورپ کے اہلِ علم اور مؤرخین جن میں انگلستان کا مؤرخِ اعظم گبن (Gibbon) بھی شامل ہے جس کی تاریخ "سلطنت روما کا زوال و خاتمہ" (Decline and fall of the Roman Empire) عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہے، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس تالیف کی وجہ سے مؤلف کو انگریزی ادب میں مرتبہ دوام حاصل ہو گیا۔

اس زمانے کی ایک اور بڑی شخصیت جارج سیل (George Sale) کی ہے جو ۱۶۹۷ء سے ۱۷۳۶ء تک زندہ رہا۔ اسلام سے اُسے اس قدر دلچسپی تھی کہ گبن نے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اُسے "نیم مسلم" بتایا ہے۔ گو یہ بیان شاید مبالغہ آمیز ہے، تاہم اس سے کسی حد تک یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ سیل کے بارے میں اُس کے معاصرین کی کیا رائے تھی۔ سیل کا پیشہ وکالت تھا۔ اُس نے فرصت کے اوقات میں عربی پڑھی اور عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ اس کا خاص علمی کارنامہ جو اس کی سب سے بڑی یادگار ہے، قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ ہے جو ۱۷۳۴ء میں شائع ہوا۔ یہ تمام یورپی زبانوں میں قرآن کا سب سے پہلا مکمل ترجمہ ہے۔ مسلمان اس کام کی عظمت کو ابھی

طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس سخت اور دشوار کام میں سیل کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ بہت سے ماہرین کا آج بھی یہ خیال ہے کہ قرآن کا اس سے بہتر ترجمہ موجود نہیں۔ یہ اب تک لاتعداد بار طبع ہو چکا ہے اور آج بھی کثرت سے مستعمل ہے۔ فرانسیسی، جرمن اور پولستانی زبانوں میں قرآن پاک کے جو ترجمے ہوئے وہ سیل ہی کے انگریزی ترجمہ پر مبنی ہیں۔

سیل نے محض ترجمہ ہی پر اکتفا نہیں کی حالانکہ صرف اس کام کے لیے بھی بڑی علمی قابلیت کی ضرورت تھی۔ اس نے انگریزوں کے استفادہ کے لیے اپنے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مفصل حاشیے اور شرحیں اضافہ کر دیں تاکہ بعض مشکل عبارتیں اُن کی مدد سے صاف اور آسان ہو جائیں۔ اس ترجمہ کے ساتھ جو مفصل دیباچہ شامل ہے وہ اصل مذہب اسلام پر ایک مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے ادیبوں نے سیل کے ترجمے سے بہت کام لیا ہے کیونکہ ان کے پاس اسلام کی اس مقدس کتاب اور پیغمبر اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ایک یہی ذریعہ تھا۔ یورپ میں بھی اس کا بہت وسیع مطالعہ کیا گیا۔

والٹیر نے اپنی "لغت فلسفہ (Philosophic Dictionary) میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

سیل کی دوسری تصنیفات کے سلسلے میں بیل (Baylc) کی انسائیکلوپیڈیا کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو دورِ جدید میں یورپ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا خیال کی جاتی ہے اور جس کی تالیف میں سیل نے بھی ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ تمام مضامین جو اس کتاب میں عربوں کے متعلق ہیں اُسی کے لکھے ہوئے ہیں۔

تیسرا اہل علم سر ولیم جونس (Sir William Joncs) ہے جو ۱۷۴۶ء سے ۱۷۹۴ء تک زندہ رہا۔ جونس علوم عربیہ کے مقابلے میں ہندوستانی علوم کے ماہر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک یورپ میں ہندوستانی علوم کی تحصیل کا تعلق ہے، اسے اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ جیسے جیسے یورپی ممالک کے قدم مشرق میں آگے بڑھتے گئے۔ انگلستان اور فرانس میں روز بروز ہندوستانی چیزوں سے دلچسپی بڑھتی گئی اور یک بہ یک علمی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ ہندوستان اور انگلستان میں انگریز اہل علم نے سنسکرت کی پُرانی کتابوں کا مطالعہ کیا اور سنسکرت زبان کے قواعد مدوّن کیے۔ اسی طرح انھوں نے علوم مشرقیہ کی ایک جدید شاخ کی بنا ڈالی جس نے ایک صدی بعد جرمنی اور دوسرے مقامات میں بہت فروغ پایا۔ اگرچہ سر ولیم جونس کا خاص کام ہندوستان سے متعلق تھا، وہ علوم عربیہ میں خاص قابلیت رکھتا تھا بلکہ سنسکرت سے بہت پہلے اس نے عربی شروع کی تھی۔ شاید اس کا ہندوستان کا سفر بھی کسی حد تک اسی دلچسپی کی بنا پر تھا جو اسے عربی زبان اور اسلام سے تھی۔ اسے بچپن ہی میں عربی سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنے طور پر اسے سیکھتا رہا۔ اُس نے آکسفورڈ آ کر عربی اور فارسی کا گہرا مطالعہ کیا اور وہ ایک شامی مسلمان کو اپنی تعلیم کے لیے لایا۔ عربی زبان کے متعلق اُس کی خاص تالیف معلقات کا انگریزی میں کامل ترجمہ ہے جو زمانۂ جاہلیت کے سات مشہور عربی قصائد پر مشتمل ہے

۔ اس طرح جونس نے انگلستان کے اہلِ علم کی بڑی خدمت انجام دی کہ انھیں قدیم عربی ادب کے جواہر ریزوں سے روشناس کیا۔ ہندوستان کے قیام کے زمانے میں بھی نہیں کہ اُسے شرعِ اسلامی، متعدد کتابیں شائع کرنے کا موقع ملا بلکہ اُس نے ہندوستان کے متعلق بھی بہت سے تحقیقی رسالے شائع کیے۔

آخر میں ہم بہت اختصار کے ساتھ جے۔ ایل۔ برک ہارٹ (J. L. Burckhardt) کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں جو ۱۷۸۴ء سے ۱۸۱۷ء تک زندہ رہا۔ برک ہارٹ اصلاً سوئٹزرلینڈ کا باشندہ تھا۔ مگر اس نے انگلستان میں تعلیم پائی اور پھر یہیں سکونت اختیار کرلی۔ چند سال یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرکے وہ حلب گیا جہاں رہ کر اُس نے عربی زبان میں کافی ملکہ حاصل کرلیا۔ اُس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ شام، مصر اور عرب کی سیاحت میں گزارا۔ وہ محمد علی پاشا کی خاص حمایت میں مکہ مکرمہ کی زیارت کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کی خاص تالیفات وہ سفرنامے ہیں جو مشرقِ قریب میں اس کی سیاحت کے متعلق ہیں۔ اس کی کتاب "بدوی عرب اور وہابی" (Beduins And Wahabis) جو ذاتی تجربات پر مبنی ہے، اُس اہم ترین تحریک کا صحیح اور مفصل بیان ہے جو کچھ ہی پہلے اپنی طاقت و وسعت کے پہلے دور میں اوجِ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے ان عربی ضرب الامثال کا ایک بڑا ذخیرہ مدوّن کیا جو اس نے اپنی سیاحت کے دوران میں جمع کی تھیں اور عربی متن کے ساتھ ساتھ ان کا انگریزی ترجمہ مع شرح کے شائع کیا۔ اس کی کتابیں دور دور پڑھی اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہوا۔ ۱۸۱۷ء میں مصر میں اس کا انتقال ہوگیا۔

اٹھارہویں صدی کا آخری حصہ وہ دور ہے جس میں مشرقی تہذیب کے متعلق مغرب میں بہت دلچسپی پائی جاتی تھی۔ ایشیا میں روز بروز یورپی اثر کے بڑھنے اور ان ترجموں کی وجہ سے جو ان علماء کے علاوہ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، بہت سے دوسرے علماء نے عربی اور فارسی زبانوں سے کیے۔ انگلستان کے اکثر ادیب عربی ادبیات سے واقف ہوگئے۔ الف لیلیٰ کے اس ترجمہ کا بھی کافی اثر پڑا جو یورپی زبان میں پہلے پہل ہوا اور اس صدی کے آغاز میں شائع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی ادب میں مستشرقیت (Orientalism) کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انگریز شاعر اور مصنفین نے عربی و فارسی ماخذوں کو پیش نظر رکھ کر مشرقی موضوع پر قصے کہانیاں تیار کرنی شروع کردیں۔ یہ تحریک انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گئی اور وہاں اس کی وجہ سے رومانیت کا احیاء (Romantic Revival) عمل میں آیا۔ جرمن شاعرِ اعظم گیٹے (Goethe) مشرقی کتابوں کے انگریزی اور فرانسیسی ترجموں سے بہت متاثر ہوا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں فرانسیسیوں نے نپولین کی سر کردگی میں مصر پر حملہ کیا تھا اور اس طرح مغربی تمدن رکھنے والے ایک ملک سے اُن کا براہِ راست تعلق ہو گیا۔ اس کے علاوہ تحصیل علوم مغربی کی تحریک میں اس وجہ سے بھی نیا زور پیدا ہو گیا کہ چند سال بعد محمد علی پاشا کی قیادت میں مصر ایک طاقتور اور عملاً مستقل حکومت کی حیثیت سے نمودار ہوا اور یورپی سیاسیات میں اہم حصہ لینے لگا۔ اس طرح ہم انیسویں صدی میں پہنچ جاتے ہیں جو ہماری آئندہ تقریر کا موضوع ہوگا۔

(عالم اسلام اور عیسائیت، ستمبر ۹۰ء)

(۲)

انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کے تمام بڑے بڑے ممالک میں تحصیل علوم عربیہ کے سلسلے میں نمایاں ترقیاں ہوئیں۔ مصر پر نپولین کے حملے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مشرق قریب کے عرب ممالک یورپی سیاسیات میں پیش پیش رہنے لگے اور کئی صدیوں کے بعد عربوں اور فرنگیوں میں پھر براہ راست رابطہ قائم ہو گیا۔ بہت سے یورپی سیاح مشرق کا سفر اختیار کرنے لگے اور مصری طلبہ کی روز افزوں تعداد مغربی یورپ کی یونیورسٹیوں میں داخل ہونے لگی۔ انھوں نے مغربی تمدن اور طریقہ کا مطالعہ کیا اور اہل مغرب میں عربی تمدن کے متعلق نیا ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ یورپ کے استشراق میں جو نئی علمی تحریک پیدا ہوئی اُس کا سہرا اُن فرانسیسی اہل علم کے سر ہے جو نپولین کے ہم رکاب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے اوائل میں ماہرین علوم عربیہ کی حیثیت سے فرانسیسی اہل علم سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے تھے۔ سلوستر دی ساسی (Silvestre de Sacy) نے جو فرانس کے ماہرین علوم عربیہ میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہے، اپنے زمانہ میں قریب قریب ہر ملک و قوم کے اہل علم کو تعلیم دی۔

انگلستان میں بھی علوم عربیہ کے ماہرین کی ایک خاصی بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ نئی قائم شدہ لندن یونیورسٹی میں عربی کی ایک نئی کرسی قائم کی گئی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام سے (جو انگریز مستشرقین کی ایک انجمن ہے) علوم شرقیہ کے لیے نیا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا۔ انگلستان کے اُن اہل علم نے جو ہندوستان میں ہندی مسلمانوں کی زبانوں اور ان کی تہذیب کا مطالعہ کر رہے تھے یہ محسوس کیا کہ اس قسم کی علمی تحقیقات کے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان سیکھی جائے جو تمام اسلامی تمدن کا خواہ وہ کسی زبان میں ہو سرچشمہ ہے۔ خود عربوں میں جو ترقیاں رونما ہوئیں ان کی بنا پر انیسویں صدی کے ماہرین علوم عربیہ کی خدمات کو نئی قدر و قیمت اور اہمیت حاصل ہو گئی۔ انیسویں صدی میں عربی زبان بولنے والی اقوام کے قومی اور تمدنی احیاء کا نیا دور شروع ہوا۔ ابتداء میں انھیں عربی زبان میں مطبوعہ کتابوں کے نہ ملنے بلکہ سرے سے چھاپہ خانوں ہی کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت دقتیں اور رکاوٹیں پیش آئیں۔ اس طرح عربی کی پرانی مشہور کتابوں کے وہ متعدد عمدہ نسخے جو یورپ میں شائع ہوئے اور

جن میں سے بہت سے انگلستان ہی میں طبع ہوئے، عرب قارئین کی نئی نسل کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے اور ان کے ذریعے ان کو وہ مواد فراہم ہوگیا جو کہیں اور دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ کچھ دنوں بعد جب مشرق میں بھی مطابع قائم ہوگئے اور کتابوں کے نسخے مقامی طور پر طبع ہونے لگے تو یہ نسخے زیادہ تر یورپ کے مطبوعہ نسخوں پر مبنی ہوتے تھے۔ اس طرح مستشرقین نے عربوں کو خود ان کی اپنی تہذیب سے دوبارہ روشناس کرانے اور اُسے زندہ رکھنے میں اہم خدمات انجام دیں اور اب وہ احسان جو قرونِ وسطیٰ کے عربوں نے کتبِ یونانی کو مغرب میں پہنچا کر کیا تھا، یوں ادا ہو رہا تھا۔

اس تھوڑے سے وقت میں ہم صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ اس دور کے متعدد انگریز ماہرین علوم عربیہ میں سے صرف چند بہت ہی نمایاں شخصیتوں کا ذکر کر دیں۔ عربی، فارسی کے عالم متبحر جے۔ ایچ۔ ہنڈلے (J. H. Hindley) (جن کی تالیفات میں زبان انگریزی میں مشہور عرب شاعر ابوطیب المتنبی کی تاریخ حیات اور اس پر بحث و نظر شامل ہے) اور ایم۔ لمسڈن (M. Lumsden) (جو ہندوستان میں فورٹ ولیم کالج میں عربی و فارسی کا پروفیسر تھا اور جس نے عربی صرف و نحو پر ایک کتاب تالیف کی جو انیسویں صدی میں یورپ اور ہندوستان میں بہت مستعمل تھی) کے پایہ کے علماء کا بھی اس سلسلے میں محض نام ہی لیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے تعلیم کی تنظیم کے سلسلے میں ابتداءً جو کوششیں کیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے عربی تعلیم کا انتظام کیا۔ ان بہت سے انگریزوں میں سے جنھوں نے اس کام میں مدد دی ایک لمسڈن بھی تھا۔ فورٹ ولیم میں جو ہندوستان میں پہلا انگریزی کالج تھا، عربی و فارسی کی دو کرسیاں تھیں۔

انیسویں صدی کے اوائل میں انگلستان ہی نہیں بلکہ یورپ میں سب سے بڑی شخصیت جو اپنے معاصرین سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی، ای۔ ڈبلیو۔ لین (E. W. Lane) کی تھی جو ۱۸۰۱ء سے ۱۸۷۶ء تک زندہ رہا۔ کم سنی ہی میں لین (Lane) کو علوم مشرقیہ اور خصوصاً مصر سے والہانہ شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جولائی ۱۸۲۵ء میں وہ اسکندریہ روانہ ہوا۔ یہ اس کا مصر کا پہلا سفر تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں بحیرۂ روم کا سفر یوں ہی پُرخطر ہوتا تھا اس کا یہ سفر بھی خطرات سے خالی نہ تھا۔ ایک موقع پر اُس کا جہاز طوفانی ہوا میں گھر گیا اور کپتان کے کیے دھرے کچھ نہ ہو سکا۔ وہاں کوئی دوسرا ایسا موجود نہ تھا جو جہاز رانی کے متعلق کچھ بھی جانتا ہو۔ باوجود اس کے کہ لین (Lane) نے کبھی جہاز نہیں چلایا تھا وہ اسے خود ہی کھینے لگا اور محض ریاضی کی معلومات کی بناء پر اُس نے جہاز کو تباہی سے بچا لیا۔ اسی سفر میں بعد کو بغاوت کی وجہ سے بھی اُس کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ غرض دو مہینے کے سفر کے بعد لین (Lane) مصر پہنچا جہاں اُس نے ۱۸۲۸ء کے موسم سرما تک قیام کیا۔ اس نے زیادہ وقت قاہرہ میں گزارا مگر دوسرے مقامات کا بھی سفر کیا۔ گو اس کی اصل غرض یہ تھی کہ وہ قدیم مصریوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے مگر اُس نے فوراً ہی یہ محسوس کیا کہ ان کے موجودہ اخلاف کہیں زیادہ قابلِ التفات ہیں۔ اپنے قیام

کی ابتدا ہی سے اس نے عربی زبان کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا اور بہت جلد عربی اور روز مرہ دونوں زبانوں میں دستگاہ حاصل کر لی۔ مشرق کے اس پہلے سفر میں جس کا وہ ایک عرصہ سے مشتاق تھا معنوی حیثیت سے اسے بہت اہم تجربات حاصل ہوئے۔ اس نے اپنے روز ناموں میں لکھا ہے۔ "جب میں نے پہلے پہل اس سرزمین میں قدم رکھا تو میں اس طرح جذبات سے بھرا ہوا تھا جس طرح کہ ایک مشرقی شوہر جو اپنی نادیدہ عروس کے منہ سے نقاب الٹ رہا ہو۔" لین (Lane) نے جو کچھ دیکھا اس سے وہ بہت متاثر ہوا اور اسلامی چیزوں کا شیدائی بن گیا۔

انگلستان واپس آنے تک اس نے مصر، اس کے باشندوں اور ان کی زبان کا گہرا مطالعہ کر لیا تھا اور مصری زندگی کے متعلق تفصیلی معلومات قلم بند کر لی تھیں۔ انگلستان واپس آنے پر اس سے خواہش کی گئی کہ جو کچھ اس نے وہاں دیکھا تھا، اسے شائع کرے مگر چونکہ اسے علمی صحت و دقت نظر کا غیر معمولی پاس و لحاظ تھا جو اس کی تمام تالیفات کی خصوصیت ہے اُس نے اس کتاب کے شائع کرنے سے پہلے مصر کا دوسرا سفر اختیار کرنا ضروری خیال کیا۔ وہ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۵ء تک مصر میں رہا اور قاہرہ کی زندگی کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کرتا رہا۔ جب تک وہ مصر میں رہا اس نے مصریوں ہی کا لباس پہنا اور مصری مسلمانوں کے سوا اُس نے کسی سے میل جول نہیں رکھا۔ اُس نے مصر میں اپنا ایک ذاتی مکان لے رکھا تھا اور وہ ہر حیثیت سے ایک مصری ادیب کی طرح رہتا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ وہ صحت و روانی کے ساتھ عربی بول سکتا تھا اور اس کے خدوخال میں عربوں کی سی جھلک پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ بآسانی مصریوں کی طرح رہ سکا اور قاہرہ کے مختلف مصری طبقوں کے ساتھ دوستانہ اور مساوی حیثیت سے میل جول رکھ سکا۔ اُس کے اکثر مصری دوست اُسے منصور آفندی کہا کرتے تھے۔

دوسری بار انگلستان واپس آنے پر اُس نے ۱۸۳۶ء میں اپنی کتاب "عہد حاضر کے مصریوں کے عادات و اطوار" (An Account of the Manners and Customs of the Modern Egyptians) دو جلدوں میں شائع کی جس نے بہت شہرت پائی۔ یہ کتاب ایک شاہکار کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ چنانچہ پہلی اشاعت دو ہی ہفتوں میں ختم ہو گئی۔ یہ کتاب متعدد بار شائع ہوئی۔ کئی بار جرمنی اور امریکہ میں بھی طبع ہوئی۔ انگریزی ادب میں اسے ایک سرمایہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں قاہرہ کی زندگی اور وہ رسم و رواج تفصیل کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جو قاہرہ میں ان تبدیلیوں سے پہلے پائے جاتے تھے جنھوں نے اسے جدید طرز کا ایک شہر بنا دیا۔ اس بناء پر اسے عہد رفتہ کی ایک سچی اور جیتی جاگتی تصویر کہہ سکتے ہیں۔ یہ تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے اور آج بھی اُن لوگوں کے لیے جو مصر کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اُس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

انگلستان واپس آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد لین (Lane) الف لیلےٰ کا انگریزی ترجمہ کرنے میں لگ گیا۔ اس سے پہلے بھی اس کتاب کے ترجمے ہو چکے تھے جو بہت مقبول ہوئے تھے۔ لیکن وہ

علمی اور فنی حیثیت سے صحیح نہ تھے۔ لین (Lane) نے اس امر کی کوشش کی کہ وہ اپنے ترجمہ میں اصل مفہوم اور ماحول کا پورا پورا لحاظ رکھے۔ اُس نے ترجمہ کے ساتھ ساتھ قرونِ وسطیٰ کے اسلامی رسم و رواج کے متعلق تفصیل کے ساتھ تحریری حواشی کا اضافہ کیا جو بعد میں "قرونِ وسطیٰ میں عربوں کی زندگی" (Arabian Life in the Middle Ages) کے نام سے علیٰحدہ کتابی شکل میں شائع ہوئے۔
اس اثناء میں لین (Lane) کو ایک عرصہ تک ایک مبسوط عربی انگریزی لغت کی تیاری کا خیال رہا۔ اس سے پہلے یورپی زبانوں میں عربی کی جو لغتیں گولیس (Golius)، فریتاغ (Freytag) وغیرہ نے تالیف کی تھیں۔ وہ اگرچہ اپنے اپنے مقام پر کچھ نہ کچھ مفید ضرور تھیں مگر چونکہ ان کے لیے کافی مواد مہیا نہ ہو سکا تھا اس لیے متعدد حیثیتوں سے ناقص و تشنہ تھیں۔ لین کا خیال یہ تھا کہ وہ عربی کی مستند پرانی لغتوں مثلاً تاج العروس وغیرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد خود ایک مبسوط لغت مرتب کرے۔ جولائی ۱۸۴۲ء میں وہ اس خیال سے تیسری بار مصر گیا۔ وہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۴ء تک قاہرہ میں بارہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا اور اپنے گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔ آخر کار جب اُس نے عربی لغات سے تمام ضروری مواد فراہم کر لیا تو اس نے انگلستان واپس آ کر اپنی زندگی کے باقی پچیس سال اس لغت کی تکمیل میں صرف کر دیے۔ یہ واضح رہے کہ جو مواد اُس نے جمع کیا تھا وہ مطبوعہ یا باسانی دستیاب ہونے والا نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کس قدر دشوار تھا۔ عربی لغتوں کا مطالعہ جو بذات خود کچھ کم دشوار کام نہ تھا اس سلسلے کا پہلا قدم تھا کیونکہ ابھی چھان بین نظم و ترتیب اور وہ بھی منتشر مواد کو یورپی طرز پر منظم و مرتب کر کے ایک مبسوط لغت کی شکل میں پیش کرنے کا کام باقی تھا۔ ۱۸۷۶ء میں اس کے انتقال کے وقت تک یہ کام پورا نہیں ہو پایا تھا لیکن وہ متعدد جلدیں جو اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں علومِ مشرقیہ میں ایک مفید اور قابلِ قدر اضافہ تھیں۔ آج بھی دنیا کو تسلیم ہے کہ ہر اُس شخص کے لیے جو عربی زبان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے یہ لغت ایک ناگزیر چیز ہے۔ اُس وقت سے آج تک یہی وہ بہترین لغت ہے جو دستیاب ہو سکتی ہے اور اسی سے یورپی زبانوں کی وہ بہت سی عربی لغتیں جو بعد میں شائع ہوئیں، ماخوذ ہیں۔

لین (Lane) اپنی آخری عمر میں ہر جگہ علوم عربیہ کا استاد اعظم مانا جاتا تھا جیسا کہ جرمنی کے ایک مشہور شاعر علوم عربیہ نے اپنے ایک خط میں اُسے لکھا بھی تھا۔ یورپی ممالک کے متعدد مقامات کی اکثر علمی انجمنوں نے اس کو اعزاز دے کر اس کے نام کو غیر فانی بنا دیا۔

اس عہد کا سب سے زیادہ ممتاز انگریز اہلِ علم اڈورڈ ہنری پامر (Edward Henry Palmer) ہے جو مشرق میں شاید شیخ عبداللہ کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ پامر ۱۸۴۰ء میں کیمبرج میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۲ء میں مصر میں فوت ہوا۔ یہ وہی سال ہے جس میں عرابی پاشا کی تحریک اُٹھی تھی۔

پامر میں بچپن ہی سے دوسری زبانوں کے سیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی تھی اور اس نے اسی زمانے میں فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں اتنی مہارت حاصل کرلی تھی کہ ان زبانوں کو روانی کے ساتھ استعمال کر سکتا تھا بیس برس کی عمر میں اس کی ملاقات ایک ہندوستانی مسلمان سید عبداللہ سے ہوئی جو کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی زبان کا لکچرر تھا۔ اسے سید عبداللہ ہی کی وجہ سے علوم شرقیہ سے پہلے پہل دلچسپی پیدا ہوئی۔ پامر نے اس غیر معمولی عزم و ہمت کی بنا پر جو اس کی خصوصیت تھی بیک وقت عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانیں سیکھنا شروع کر دیں اور تھوڑے ہی دنوں میں یہی نہیں کہ وہ انگریزی اشعار کا اپنی محبوب عربی زبان میں ترجمہ کرنے لگا بلکہ خود بھی عربی زبان میں شعر کہنے لگا۔
آخر پامر نے یہ طے کرلیا کہ عربی میں مہارت حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ یہ زبان براہ راست عربوں ہی سے سیکھی جائے چنانچہ اس نے ان عربوں سے جو اس وقت انگلستان میں موجود تھے گہرے تعلقات پیدا کیے ان میں سے ایک طلب کا رہنے والا حاجی تھا جس کا نام رزق اللہ حسن حلبی تھا۔ اس سے پامر کے پینگ بہت بڑھ گئے اور پامر کی شخصیت اور تحریر پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ پامر نے رزق اللہ سے بہت کچھ تعلیم حاصل کی اور اس کا بہت مداح تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد پامر کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گیا اور زیادہ باضابطہ طور پر علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ ایک عرصہ سے اس کی یہ خواہش تھی کہ عربی ممالک کی سیاحت کرے اور اس قوم سے بذات خود تعارف حاصل کرے جس کی زبان اور ادبی سرمایہ کو وہ اتنا پسند کرتا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں حسن اتفاق سے اسے اس کا موقع مل گیا۔ اس نے اسی سال اور اس کے ایک سال بعد فلسطین کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کرنے والی ایک انجمن کی جانب سے دو مرتبہ مشرق قریب کا سفر کیا۔ اس طرح اسے مختلف مقامات کے عربی روزمرہ اور عربی تمدن کے متعلق زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کا پہلا موقع ملا اور اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگلستان واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد وہ کیمبرج میں عربی کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ اب چند سال تک اس کا کچھ وقت تعلیم و تدریس میں اور کچھ صحافتی کاموں میں صرف ہونے لگا۔ اس نے اس زمانے میں بہت سی اہم کتابیں تیار کیں۔ ۱۸۸۲ء میں اس نے پھر مصر کا سفر کیا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر جزیرہ نما سینا کی پُر خطر سیاحت اختیار کی۔ وہ اپنے پہلے تحقیقاتی دورے کے سلسلے میں اس علاقہ سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ شیخ عبداللہ کی صحرا نوردی کی داستان آج تک زبانوں پر ہے۔ اس کی موت بھی ایک دردناک واقعہ ہے۔ مشرق قریب میں یہ زمانہ شورشوں اور ہنگاموں کا تھا اس لیے اس زمانے میں سفر غیر معمولی طور پر پُر خطر ہوتے تھے۔ پامر صحرا سے واپس آرہا تھا کہ اسے چند لٹیرے بدوؤں نے قتل کر ڈالا اور اس طرح ۴۲ برس کی ابتدائی عمر میں ایک شاندار زندگی ختم ہو گئی۔
یورپ کے مستشرقین میں پامر اس حیثیت سے شاید انفرادی حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی کہ عربی زبان کو علمی حیثیت سے حاصل کرے بلکہ اس نے عرب قوم اور عربی زبان کی

روح کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس کا شمار یورپ کے ان چند انے گنے اہل علم میں ہے جو مشرقی زبانوں کو صحت وروانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ اس کی اردو کی کچھ تحریریں بھی شائع ہو کر ہندوستان میں بہت مقبول ہوئیں۔ اس نے انگلستان میں شاہ ایران کی سیاحت پر مضمون اردو زبان میں لکھا، وہ اردو ادب میں غیر فانی خیال کیا جاتا ہے۔ پامر عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ اکثر دوسرے ماہرین علوم عربیہ کو انگریزی میں نجی خطوط لکھتے وقت یہ محسوس کر کے کہ وہ انگریزی میں اپنے خیالات کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتا یک بیک عربی زبان میں لکھنے لگتا تھا۔ اس کے ایک دوست اور رفیق کار جی۔ ایف۔ نکل (G. F. Nicholl) نے جو آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر تھا اس کے متعلق لکھا ہے "اس کے ان خطوں سے جو اس نے مجھے انگریزی میں لکھے، اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے انگریزی میں اظہار خیال کرنے میں کچھ الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ فوری جذبات سے متاثر ہو کر یا نقد و تبصرہ کے وقت یک بیک عربی یا فارسی نظم یا نثر پر اتر آتا تھا۔" مثال کے طور پر پامر کے حسب ذیل طبع زاد اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔

لیت شعری هل کفیٰ ماقد جریٰ　　　مُذ جریٰ ماقد کفیٰ من مقلتی
قد بریٰ اعظم حزنٍ اعظمی　　　وفنی جسمی ماشا اصغری

[کاش! مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ آنسو جو اب تک بہہ چکے ہیں، نیز جن کی اس وقت جھڑی لگی ہوئی ہے، اب کافی ہوں گے۔ اس بھاری غم نے میری ہڈیاں گھلا دیں ہیں اور میرے جسم کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ ہاں! ایک چھوٹی سی شے دل (یا زبان؟) باقی رہ گئی ہے۔]

پامر نے اپنی اس مختصر سی زندگی میں اپنی مطبوعہ کتابوں کی ایک بڑی تعداد چھوڑی ان میں سے شاید اہم ترین کتابیں حسب ذیل ہیں۔

اپنی موت سے کچھ پہلے اس نے بہاءالدین زہیر مشہور مصری شاعر کا پورا کلام عربی متن اور انگریزی منظوم ترجمہ کے ساتھ شائع کیا اور اس میں حواشی اور مقدمہ کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کی اشاعت عربوں کے تمدنی ترکہ کو نئی زندگی بخشنے کے سلسلہ میں ایک اہم اقدام تھا۔ اس کے ایک سال بعد اس نے انگریزی میں عربی صرف و نحو پر ایک کتاب شائع کی جو دوسری کتابوں کے برخلاف عرب علما نے صرف و نحو کے قدیم روایتی طرز پر ترتیب دی گئی تھی۔ اس طرح اس نے یہ کوشش کی کہ انگریز طلبہ کے سامنے عربی صرف و نحو اسی شکل میں پیش کی جائے جس شکل میں خود عرب طلبہ اسے پڑھا کرتے ہیں۔

اس کی موت سے ایک سال پہلے یہ کتاب اضافہ کے ساتھ دوسری بار شائع ہوئی۔ موضوع کے

اعتبار سے حیات ہارون الرشید اس سے کسی حد تک بہتی ہے۔ اس میں پامر نے اس وقت کے بغداد کی ایک رنگین تصویر کھینچی ہے جب کہ وہ خلفائے عباسیہ میں سب سے بڑے خلیفہ کا پایہ تخت تھا۔ اس نے فارسی اور عربی کی اکثر نظموں کے منظوم ترجمے شائع کیے۔ ایک فارسی کی لغت تالیف کی۔ مشرقی علوم کے ان قلمی نسخوں کی ایک فہرست نہایت تحقیق کے ساتھ مرتب کی جو کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود تھے اور جزیرہ نمائے سینا کی سیاحت کے حالات بطور سفر نامہ شائع کیے۔ پامر کی موت کی خبر نے اس کے بے شمار دوستوں اور قدردانوں کو جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے سوگوار بنا دیا۔ اس کے مرثیے تقریباً ۱۵ مختلف زبانوں میں جن میں عربی بھی شامل ہے شائع ہوئے۔

ایک دوسرا اہل علم جو اول درجہ کی اہمیت رکھتا ہے ولیم رائٹ (William Wright) تھا جو ١٨٣٠ء سے ١٨٨٩ء تک زندہ رہا۔ رائٹ (Wright) ہندوستان کے ایک برطانوی افسر کا لڑکا تھا اور ہندوستان ہی میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں نے جو خود متعدد مشرقی زبانوں میں مہارت رکھتی تھی اپنے لڑکے کو بچپن ہی میں علوم مشرقیہ کی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اس نے عربی زبان کی تعلیم انگریزی اور یورپی یونیورسٹیوں میں حاصل کی اور کچھ دنوں لیڈن (Leyden) یونیورسٹی میں ہالینڈ کے بلند پایہ مستشرق رین ہارٹ ڈوزی (Reinhart Dozy) کے تحت کام کیا۔ وہ یکے بعد دیگرے لندن، ڈبلن اور کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر رہا۔ وہ ابھی ۲۲ ہی برس کا تھا کہ اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنی آئندہ زندگی کا جو اس نے عربی زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی ایک نہایت حوصلہ مندانہ خاکہ پیش کیا تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس نے باقی عمر اس خاکہ پر عمل کرنے میں کس حد تک کامیابی حاصل کر لی۔ اس کی دو کتابوں یعنی سفر نامہ ابن جبیر اور الکامل للمبرد کی اشاعت نے عربی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اس نے المقری کی تاریخ الاندلس کی اشاعت میں ڈوزی کا ہاتھ بٹایا اور دوسری بہت سی پرانی عربی کتابیں شائع کیں۔ عربی صرف و نحو پر اس کی وہ کتاب جو دو جلدوں میں ہے آج بھی اپنی نوعیت کی بہترین کتاب خیال کی جاتی ہے اور اس سے انگریزی زبان بولنے والے ملکوں کے منتہی طلبہ استفادہ کرتے ہیں۔

عربی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے کیمبرج میں رائٹ (William Wright) کا جانشین رابرٹسن اسمتھ (Robertson Smith) تھا جو ١٨۴٦ء سے ١٨٩۴ء تک زندہ رہا۔ یہ اسکاٹ لینڈ کے شہر ابرڈین (Aberdeen) کا رہنے والا تھا۔ پہلے پہل وہیں کی یونیورسٹی میں پھر یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں میں اس نے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے ابتداء ہی میں شہرت حاصل کر لی، یہاں تک کہ اڈنبرا میں اس کے قدردانوں کی ایک جماعت نے ١٨٨١ء میں ایک عام جلسہ میں اس کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے عربی کتابوں اور قلمی مسودوں کا ایک ذخیرہ اس کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا۔ ١٨٧٩ء سے ١٨٨١ء تک اس نے متعدد بار مشرق قریب کا سفر کیا۔ اس اثنا میں اس نے

مصر، فلسطین اور شام کی سیاحت کی بلکہ عرب میں جدہ اور طائف تک پہنچ گیا۔ اس کی مطبوعات میں قدیم زمانے کے عربوں میں شادی و قرابت داری (Kinship and Marriage in Early Arabia) اور زمانہ جاہلیت کے تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ کتابیں ہیں۔ یہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (Encyclopaedia Britannica) کا مدیر اعلیٰ (رئیس مجلس واضعین) تھا اور غالباً یہی ایک شخص تھا جو اس کا دعویٰ کر سکتا تھا کہ اس نے ابتداء سے آخر تک یہ کتاب پڑھی ہے۔ اس کے علم و مطالعہ کی وسعت پر تعجب ہوتا تھا اور خود اس کے دوست و رفیق ہر موضوع پر اس کی وسیع اور عمیق معلومات سن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے بسترِ مرگ پر نیم بے ہوشی کی حالت میں قرونِ وسطیٰ کے انگلستان کی تاریخ پر ایک مبسوط تقریر کر ڈالی۔

آخر میں ہمیں سر ولیم میور (Sir William Muir) کا ذکر کرنا چاہیے جو ۱۸۱۹ء سے ۱۹۰۵ء تک زندہ رہا۔ یہ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ علوم عربیہ کے ماہر ہونے کے علاوہ اس نے ہندوستان میں ایک حاکم کی حیثیت سے بھی نام پیدا کیا۔ وہ ایڈنبرا یونیورسٹی کا ایک نامور اہل علم (اسکالر) تھا۔ اس نے انگریزی میں پیغمبرِ اسلام اور اسلامی تاریخ پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں آج بھی انگلستان اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ سیرتِ رسول پر اس نے جو مبسوط کتاب تالیف کی وہ خاص اہمیت رکھتی ہے اور نمایاں طور پر تعصب سے پاک ہے۔ اس کی "تاریخِ خلافت" جو ان عربی ماخذوں پر مبنی ہے جن میں سے اکثر اس وقت تک غیر مطبوعہ حالت میں تھے، اپنے موضوع پر آج بھی انگریزی زبان میں بہترین کتاب خیال کی جاتی ہے۔

(عالم اسلام اور عیسائیت، اکتوبر ۹۳ء)

مسیحی اہلِ قلم کے اردو تراجم و تفاسیرِ قرآن

اردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر کا وسیع ذخیرہ ہے جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے سب ہی فقہی و کلامی مکاتبِ فکر نے اپنی اپنی استعداد و کار اور دلچسپیوں کے تحت اس ذخیرے کی ثروت میں اضافہ کیا ہے، تاہم کم ہی تراجم و تفاسیرِ قرآن ایسی ہیں جو استدادِ زمانہ کے باوجود مسلسل شائع ہو رہی ہیں اور ان کے قارئین میں کمی نہیں آئی۔ بہت سے تراجم اور تفاسیر صرف ایک دو بار شائع ہوئیں اور قصۂ ماضی بن گئیں۔ آج ان کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور کسی ایک آدھ کتب خانے میں بھی یہ نایاب تراجم و تفاسیر یک جا نہیں۔ اس طرز کے تراجم و تفاسیر قرآن میں مسیحی اہلِ قلم کی کاوشوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

مسیحی اہلِ قلم کو قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا یہ اسلام سے ان کی محبت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ترجمہ و تفسیر قرآن کے لیے اپنا وقت صرف کیا؟ یا محض اشتیاقِ علم تھا اور غیر جانب دارانہ طور پر اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے کی خواہش رکھتے تھے؟ یا یہ سب کچھ ان کی تبشیری سرگرمیوں کا حصہ تھا؟ ان سوالات کا جواب مسیحی اہلِ قلم کے تراجم و تفاسیر کے تفصیلی تجزیے کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے اور اب تک ہمارے سامنے کوئی ایسا خصوصی مطالعہ نہیں آیا جس میں ایک ایک کر کے ہر مسیحی مترجم و مفسّر کے کام کا جائزہ لیا گیا ہو۔ قرآن مجید کے اردو تراجم کے عمومی جائزے میں البتہ بطور تکملہ مسیحی مترجمین کا ذکر کیا گیا ہے اور بحیثیت مجموعی رائے دی گئی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے ایک مضمون ـــــ "ابتدائی دور کے ہندوستانی مسلمان اور قرآنِ پاک کے تراجم" ـــــ کے آخر میں لکھا ہے:[1]

> قرآن کریم کے مطالعہ، ترجمہ اور تفسیر کا کام صرف مسلمانوں نے ہی نہیں کیا ہے۔ اس نیک کام میں غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا ہے۔ جن عیسائی پادریوں اور عالموں نے ترجمہ مکمل کیا، ان میں ریورنڈ احمد شاہ پادری، علی بخش پادری وغیرہ کے نام قابلِ توجہ ہیں۔ عیسائی پادریوں کا شائع کردہ پہلا قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر غالباً وہ ہے جو مطبع پیغام، دہلی سے ۱۸۸۴ء میں چھپا تھا۔ جو پادری اس کام کو مکمل نہیں کر سکے یا جنھوں

نے محض کسی جزو کا ترجمہ کیا، ان میں سے علی بخش پادری اور سلطان محمد خان پادری کا نام آتا ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ کے مذکورہ مقالے پر جناب نورالحسن راشد نے محاکمہ لکھتے ہوئے ان کی متعدد اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ مسیحی مترجمین و مفسرین کے حوالے سے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، من و عن نقل کیا جاتا ہے۔[2]

انصار اللہ صاحب کے مضمون میں عیسائیوں کے شائع کیے ہوئے تراجم کے تحت ایک ترجمہ کا مطبع پیغام دہلی کی اشاعت ۱۸۸۴ء کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اطلاع بھی شایانِ قبول نہیں ہے۔[3] یہ ترجمہ الہ آباد سے چھپا تھا۔[4] اس ترجمہ کے متعلق قدیم ترین دریافت و اطلاع گارساں دتاسی کی ہے، وہ اپنے پہلے خطبے میں کہتا ہے۔

اس قسم کی مطبوعات میں سب سے دلچسپ قرآن کا ایک ایڈیشن ہے جسے ایک پرسبی ٹیرین امریکن نے ۱۸۴۴ء میں الہ آباد میں طبع کرایا، اس کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں مسلمانوں کی غلطیوں اور عیسائی مذہب کے خلاف ان کے اعتراضوں کی تردید کی گئی ہے۔۔۔۔[5]

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں پادریوں نے قرآن کریم کے متعدد ترجمے کیے ہیں، شاہ عبدالقادر کی موضح قرآن کو رومن میں چھاپا ہے۔ ان ترجموں اور اشاعتوں کا تاریخی معلومات کی تکمیل کے لیے تذکرہ کرنا ضروری ہے مگر ان کی اس کارگزاری کو نیک کام کہنا کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ عیسائیوں نے قرآنِ کریم کے حوالے سے جو قلمی تحریری کام کیا ہے، اس کا مقصد قرآن پاک کے صحیح مترجمین و مفسرین کے مقاصد سے بہت مختلف تھا اور خاصی حد تک نازیبا اور پست مقصد تھا۔ پادریوں کی ان کاوشوں کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ قرآنِ کریم کے منزل من اللہ کتابِ ہدایت اور خدا کے آخری پیغام ہونے کی بہر صورت (معاذ اللہ!) تردید کی جائے، اس کی صداقت و تعلیمات پر یقین و عقیدہ کو مسلسل کمزور کیا جائے اور اس کوشش کے نتیجے میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے کی جدوجہد عام ہو سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ مشنریوں کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا اور ان کے چھاپے ہوئے ترجموں اور تفاسیر قرآن کو مسلمانوں میں کبھی بھی پذیرائی اور قبولِ عام حاصل نہیں ہوا، تاہم اس میں شک نہیں کہ قرآنِ پاک کے ان تراجم و تفاسیر کی تالیف و طباعت میں جو ہندوستان میں مشنریز اور پادریوں کے ذریعہ شائع ہوئے، مسلمانوں کی بھلائی اور خدمت قرآن کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ اس لیے ان تراجم و تفاسیر کو نیک کام یا خدمتِ قرآن کریم لکھنا، قرآن

پاک کے بیچ تراجم اور تفاسیر کی گویا توہین اور حق تلفی ہے، جس کو کسی صورت گوارا نہیں کیا جا سکتا۔
اگر میرے محترم ڈاکٹر انصار اللہ صاحب، پادری سلطان محمد پال یا پادری جے علی بخش کے تراجم قرآن خصوصاً موخر الذکر کی صرف تمہید ملاحظہ فرما لیتے تو شاید ان کا تذکرہ بھی مناسب خیال نہ کرتے، ان کو نیک خدمات قرار دینا تو بہت دور ہے۔

مسیحی اہلِ قلم کے تراجم و تفاسیرِ قرآن کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ پادری عماد الدین لاہز (م اگست ۱۹۰۰ء) اور پادری ریورنڈ احمد شاہ نے پورے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ پادری عماد الدین کا ترجمہ "القرآن بزبان اردو" نیشنل پریس امرتسر سے ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا اور پادری احمد شاہ کا ترجمہ "القرآن" ۱۹۱۵ء میں نامی پریس کانپور سے طبع ہوا۔

مذکورہ صدر پادریوں کے بعد پادری سلطان محمد پال نے مسیحی جریدہ "المائدہ" (لاہور) میں تفسیر قرآن کا سلسلہ "سلطان التفاسیر" کے نام سے شروع کیا، بعد میں یہ سلسلۂ تفسیر ایک دوسرے مسیحی ہفت روزہ "النہار" (لاہور) میں جاری رہا، تاہم پادری سلطان محمد پال صرف پہلے پارے کی تفسیر کر سکے۔[۹] (تالیف ما بین ۱۹۳۲ء-۱۹۳۳ء)

جب پادری سلطان محمد پال تفسیر لکھ رہے تھے، ان کے ساتھ ساتھ پادری جے۔علی بخش ترتیب نزولی کے مطابق قرآن کی تفسیر شروع کر چکے تھے، ان کی تفسیر کا ایک حصہ جو صرف مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۵ء میں متنِ قرآن کے ساتھ شائع ہوا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۹۴۸ء)[۸] "اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے، زبان اور قلم سے اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا، اس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے [پہلے] آگے بڑھتا وہ وہی تھے۔" چنانچہ انہوں نے پادری سلطان محمد پال کی "سلطان التفاسیر" کا محاکمہ ہفت روزہ اہل حدیث (امرتسر) میں "برہان التفاسیر" کے نام سے شروع کیا [۶ مئی ۱۹۳۲ء] جو تین برس تک چلتا رہا۔

پادری جے۔علی بخش کی تفسیر پر بھی مولانا امرتسری نے قلم اٹھایا۔ ان کے تبصرے کا اقتباس دیکھیے۔

> عیسائیوں کی طرف سے قرآن شریف کے متعلق جتنی تصانیف ہندوستان میں پادری فنڈر کے زمانہ سے کچھ عرصہ پہلے تک شائع ہوئیں، سب صورتاً و معناً مخالف تھیں۔ چند روز سے عیسائی پادریوں (جو اسلام چھوڑ کر ادھر گئے ہیں۔) کی طرف سے جو تصنیف نکلتی ہے، وہ صورتاً موافق و معناً مخالف ہوتی ہے۔ جس کی مثال میں بصورت آخری حملہ کے ہم وہ کتاب پیش کرتے ہیں جس کا نام ہے "عدم ضرورتِ قرآن" اس

کے مصنف پادری ٹھاکر داس تھے۔ اس کا جواب ہم نے کتاب "تقابلِ ثلاثہ (تورات، انجیل اور قرآن کا مقابلہ)" کی صورت میں دیا۔ اس کتاب میں قرآن کی کھلی مخالفت اور واضح تردید تھی۔ اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا جو صورتاً مخالف نہیں مگر معناً سخت مضر ہے۔ اس کی مثال پادری سلطان محمد خان کی تصانیف "ہمارا قرآن" وغیرہ ہیں۔ جن میں اپنا بن کر دکھایا گیا ہے کہ قرآن شریف کے سارے مضامین کتبِ سابقہ سے ماخوذ ہیں، اس لیے اس کی ضرورت نہیں —

آج جس کتاب کا نام زیبِ عنوان ہے، یہ بھی قسم دوم سے ہے جو پادری جے علی بخش صاحب نے لکھی ہے۔ اس میں قرآن شریف کی سورتوں کی تقسیم مکی اور مدنی میں کر کے ساری مکی سورتوں کو ایک جلد میں جمع کر کے یک جا کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں شاید مدنی ہوں گی۔ ان میں سے ایک ایک سورۃ کو لے کر کتبِ سابقہ کے حوالوں سے موافق بتایا ہے۔ اس سے بھی یہی غرض ہے کہ قرآن شریف ان کتب سے ماخوذ ہے۔ مگر جو مسئلہ قرآن اور انجیل (بلکہ بقول مسیحیاں ساری بائبل) میں اختلافی ہے، جہاں اس کا ذکر آیا ہے، وہاں سے پادری صاحب بڑی عقل مندی سے خاموش نکل گئے ہیں۔ ہم پادری صاحب کی اس عقل مندی کی داد دیتے ہیں۔ مثلاً سورہ مریم میں حضرت مسیح کی پیدائش اور تعلیم کا مختصر مگر دوسری جگہ اس کی نسبت مفصل ذکر آیا ہے۔ — پارہ ۱۶۔ رکوع ۵

—— ان آیات میں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر کرنا محض اس غرض سے ہے کہ مسیح کی الوہیت کا ابطال ہو اور مسیحیوں کے عقیدہ متضمن بہ الوہیتِ مسیح کی اصلاح ہو۔ پادری جے۔ علی بخش صاحب اپنی تفسیر میں ان آیات کے پاس بعزت و احترام گزر گئے ہیں۔ نہ مسیحی عقیدے کی تائید کی اور نہ قرآنی فرمان کی تصدیق۔

رموزِ عاشقاں عاشق بداند

اسی طرح اور بھی کئی جگہ ایسا ہی کیا ہے۔ پادری صاحب کی نیت تو عیاں ہے کہ قرآن شریف کو کتبِ سابقہ سے ماخوذ ثابت کر کے ان کا رہینِ منت بتایا جائے، تاہم ہم اس کو بھی قرآنی خدمت جانتے ہیں اور پادری صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کی دوسری جلد بھی شائع کریں —"

مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پادری جے۔ علی بخش کے کام کو "قرآنی خدمت" سے تعبیر کیا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ مدنی سورتوں کی تفسیر بھی شائع کر دیں، جو کبھی شائع نہیں ہو سکی۔ اس کا سبب تفسیر میں پادری صاحب کا اختیار کردہ مناسب لہجہ اور متین اندازِ بیان ہے۔ پادری صاحب

نے قرآن مجید کے بارے میں دوسرے مسیحی اہلِ قلم سے مختلف اندازِ فکر اختیار کیا ہے۔ گو وہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا اقرار تو نہیں کرتے تاہم وہ اسے حضرت نبی اکرم ﷺ کی تصنیف بھی نہیں سمجھتے بلکہ قرآن کو اس انداز کا مکاشفہ خیال کرتے ہیں جیسا انبیائے بنی اسرائیل کو حاصل ہوتا رہا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ "

اگر عیسائی علماء اسی طرح کھلے دل کے ساتھ نیک نیتی سے قرآن کا مطالعہ کریں تو شاید اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی امر مانع نہ ہو گا کہ قرآن مجید تمام پچھلی کتبِ آسمانی کا مصدق اور مہیمن ہے اور اسی پیغام کو باطل کی تمام آمیزشوں سے پاک کر کے پیش کر رہا ہے جسے اللہ کے نبی ہر زمانے میں پیش کرتے رہے ہیں۔

پادری عماد الدین سے لے کر پادری سلطان محمد پال تک نے جو تراجم و تفاسیرِ قرآن لکھی ہیں، حقیقتاً یہ مسلمانوں کے لیے نہیں لکھی گئیں بلکہ مسیحی مشنریوں اور مبشروں کو ان کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان بہتر طور پر کام کرنے کے قابل بنانا تھا۔ اگر مسیحی سادہ مسلمانوں کے تراجم و تفاسیر کا مطالعہ کرتے تو یقیناً یہ تبشیری مقصد حاصل نہ ہو پاتا۔ البتہ پادری جے۔ علی بخش نے نسبتاً بہتر رویہ اختیار کیا اور بعض مناظرانہ موضوعات پر خاموشی اختیار کی۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ شاید ان کی خواہش تھی کہ ان کی تفسیر مسلمانوں کے علمی حلقوں میں پڑھی جائے مگر انھوں نے تفسیر کے لیے ترتیبِ رسمی ترک کر کے ترتیبِ نزولی کا راستہ اختیار کیا جو قطعاً ناقابلِ اعتبار تھا۔

مستشرقین نے ترتیبِ نزولی طے کرنے کی کوششیں کی تھیں اور ان کے زیرِ اثر برصغیر میں ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل نے اس ترتیب کے ساتھ متنِ قرآن مع انگریزی ترجمہ شائع کیا تھا جس پر سخت احتجاج ہوا اور اس کے بعد کم از کم کسی مسلمان کو ترتیبِ نزولی کے مطابق قرآن مجید شائع کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مسلمانوں کے درمیان جے۔ علی بخش کی تفسیر کو کیا مقبولیت حاصل ہوتا تھا، خود مسیحی برادری میں چنداں بار نہ پا سکی اور شاید یہی سبب ہے کہ مدنی سورتوں پر پادری صاحب کچھ شائع نہ کر سکے تھے۔

تبشیری مقاصد کے تحت قرآن کے ترجمہ و تفسیر کے جو اکا دکا حصے شائع کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک "سورۂ فاتحہ" [لدھیانہ: کرسچن لٹریچر سوسائٹی (۱۹۰۰ء)] پیشِ نظر ہے۔ اس میں سورۂ فاتحہ کا لفظی ترجمہ اور عام فہم تشریح کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کی تعلیم بہت خوب ہے۔ جب آپ دعا میں اس کو دہراتے ہیں تو اس کے معنی کو سمجھ کر دعا مانگیں تاکہ وہ آپ کو راہِ مستقیم پر چلا دے۔ "آخر میں "مالک یوم الدین" کے تحت حضرت مسیح کی تصلیب بطور کفارہ اور مسیحی نقطۂ نظر کے مطابق بخشش کا تصور پیش کیا گیا ہے۔

آج انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کا مناظرانہ دور ختم ہو چکا ہے اور ان
ش کو تازہ کرنے سے چنداں کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر مسیحی۔ مسلم تعلقات کے متخصصین کو اس سے
ے نظر نہ کرنا چاہیے کہ وہ اس دور کے مباحث سے پورے طور پر واقف ہوں۔ مسیحی اہلِ قلم میں اس
ساس صفت سے موجود ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی متعدد کتابوں میں سے ایک، اورپل این
ں کی تالیف Muslim and Missionaries in Pre-Mutiny India اسی سلسلے کی
ی ہے۔

شی

تطر حواشی "ادارہ" کی جانب سے ہیں البتہ حواشی ۴ اور ۵ جو جناب نور
سن راشد کے مضمون سے لیے گئے اقتباس سے متعلق ہیں، ان ہی کے لکھے
ے ہیں۔ ان میں ضرورت کے مطابق جو اضافہ ناگزیر تھا، [ ] میں درج کیا گیا
.

ہ ماہی "خدابخش لائبریری جرنل" (پٹنہ)، جنوری تا جون ۱۹۹۱ء، ص ۶۱۱
ایضاً، اشاعت ۱۹۹۲ء، ص ۴۷۱-۴۷۲
عیسائی پادریوں کا شائع کردہ زیرِ بحث ترجمہ شاید ڈاکٹر انصار اللہ کی نظر سے نہیں گزرا۔ انہوں نے
زہ تراجم قرآنی" کی بیان کردہ معلومات نقل کر دی ہیں۔ دیکھیے: محمد سالم قاسمی، سیّد عبدالرؤف عالی،
مجیب رضوی (مرتبین)، جائزہ تراجم قرآنی، دیوبند: مجلس معارف القرآن (۱۹۶۸)، ص ۶۷
ڈاکٹر احمد خان نے الہ آباد کے مطبوعہ اس ترجمہ کا تین الگ الگ جگہوں پر ذکر کیا ہے۔ [دیکھیے:
ن کریم کے اردو تراجم (کتابیات)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان (۱۹۸۷ء)]، ص ۱۳۴، اندراج
۴، ص ۱۶۳، اندراج ۵۶۴، ص ۱۹۰، اندراج ۶۶۵، ان میں سب سے پہلا درست ہے مگر اسی کو
ار اللہ صاحب نے نظر انداز کیا ہے۔ [یعنی جناب نورالحسن راشد کی تحقیق کے مطابق درست
بیاتی معلومات یہ ہیں۔
قرآن (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)، الہ آباد: پریسبی ٹیرین مشن پریس، ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ، ۵۶۰۴
[۔
گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی، اورنگ آباد (۱۹۳۵ء)
تفصیل کے لیے دیکھیے: اختر راہی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مطالعہ عیسائیت، ماہنامہ "عالم اسلام
عیسائیت" (اسلام آباد)، مارچ ۱۹۹۲ء، ص ۵-۱۶، مئی ۱۹۹۲ء، ص ۱۰-۱۴

۷۔ ڈاکٹر احمد خان نے پادری سے۔ علی بخش کی "تفسیر قرآن" کو ایک جگہ قرآن مجید کی "تحریفی" اور دوسری جگہ "مکمل۔ تفسیر" قرار دیا ہے۔ دیکھیے، حوالہ مذکورہ ص ۲۹ اور ص ۱۳۷، اول الذکر اطلاع درست ہے۔

۸۔ سید سلیمان ندوی، یادِ رفتگاں، کراچی، مکتبۃ الشرق (۱۹۵۵ء)، ص ۳۳۱

۹۔ دیکھیے، اختر راہی، حوالہ مذکورہ مئی ۱۹۹۲ء، ص ۱۲-۱۳

۱۰۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، ادبیاتِ مودودی [مرتبہ خورشید احمد]، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز (۱۹۷۲ء)، ص ۳۷۳

(عالمِ اسلام اور عیسائیت، دسمبر ۹۳ء)

عہد اکبر کے مغربی زبان دان

[پروفیسر سید محمد سلیم صاحب ان دنوں "مغربی زبانوں اور مغربی علوم کے ماہر ـــ قیام علی گڑھ سے قبل" کے زیر عنوان ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ "عالم اسلام اور عیسائیت" کے شمارہ جون ۱۹۹۳ء میں جناب سلیم الدین قریشی کی تحریر پڑھ کر انھوں نے اپنی کتاب کا وہ حصہ مرحمت فرمایا ہے جس میں جلال الدین اکبر کے عہد کے مغربی زبان دانوں کا تذکرہ ہے۔ "مراۃ القدس" کے مترجم عبدالستار بن قاسم لاہوری کی تالیف "ثمرۃ الفلاسفہ" کے نسخوں کے بارے میں مزید معلومات سامنے آئی ہیں۔ ذیل میں پروفیسر صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب کا محولہ بالا حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ مدیر]

پرتگال کے جو لوگ ہندوستان میں آئے، ان کے اندر یسوعی (JESUIT) فرقے کے لوگ زیادہ سرگرم عمل تھے۔ تحریک اصلاحِ دین (Reformation) کے جواب میں پوپ نے ردِ تحریکِ اصلاح (Counter-Reformation Movement) جاری کی تھی۔ اس کی سرگرم شاخ یہ یسوعی فرقہ تھا۔ اس کے مبلغین یورپ اور ایشیا میں سب جگہ پھیل گئے۔ گوا میں یہ فرقہ طاقت ور تھا۔

جس زمانے میں اکبر بادشاہ مذہبی امور کی تحقیقات میں دلچسپی لے رہا تھا اور اس نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو جمع کر رکھا تھا، اس نے گوا کے مسیحی پادریوں کو بھی بلایا تھا۔ اس کی دعوت پر دو پادری لاہور میں اس کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ فادر ایڈورڈ لیٹن اور کرسٹوفر دی ویگا[۱]۔ بادشاہ نے ان کے ساتھ بڑی مہربانی کا برتاؤ کیا اور ان کے قیام و طعام کا معقول بندوبست کیا۔[۲]

فرنگی اسکول

اکبر بادشاہ کی ترغیب پر انھوں نے لاہور میں فرنگی زبان کی تعلیم کا اسکول قائم کیا جس میں امراء اور نوابین کے بچوں کو داخلہ دلایا گیا۔ بادشاہ نے اپنے لڑکے مراد کو بھی اس میں داخل کرایا تھا۔ ان طلبہ کو لاطینی اور پرتگالی زبانوں میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا، لیکن پادریوں کو مسیحیت کی اشاعت، خاص طور پر بادشاہ کو مسیحی بنانے سے اصل دلچسپی تھی، اس لیے اسکول کے معاملے میں انھوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ بہر کیف مغربی زبان سکھانے والا یہ پہلا مدرسہ تھا جو ہندوستان کی سرزمین پر قائم ہوا اور ایک

مسلمان بادشاہ کی ترغیب سے کام ہوا۔

ابوالفضل

ابوالفضل اکبر بادشاہ کا وزیر اعظم تھا۔ بادشاہ کے حکم پر اس نے انجیل مقدس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ (۹۸۶ھ /۱۵۷۸ء)۔ ترجمہ اس نے پادریوں سے پوچھ پوچھ کر کیا تھا۔ [3] اس نے خود فرنگی زبان نہیں سیکھی تھی۔ ترجمہ کے آغاز پر بسم اللہ کی بجائے ابوالفضل نے یہ شعر لکھا تھا

ای نامے وے ژوژو کرستو   سبحانک ماسواک یا ہو

ژوژو کرستو Jesus Christ کی تحریف ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ پہلا مصرعہ ابوالفضل کا ہے اور دوسرا فیضی کا ہے۔

عبدالرحیم خان خاناں

اکبر بادشاہ نے خانِ خاناں کو مامور کیا کہ وہ فرنگیوں کی زبان سیکھے۔ اس نے کئی فرنگی زبانیں سیکھ لیں۔ جن میں وہ بے تکلف لکھتا پڑھتا تھا۔ گوا کے پادریوں نے خانِ خاناں کو XANACANE لکھا ہے۔ اس کی زبان دانی کی سب نے تعریف کی ہے۔ فرید بھکری لکھتا ہے۔ [4]

در ہر زبان کہ در عالم رائج است ماہر بود حرف می زد (دنیا میں جو بھی زبان رائج ہے، وہ سب جانتا تھا اور سب میں گفتگو کرتا تھا۔)

"مآثر رحیمی" کے مصنف عبدالباقی نہاوندی نے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ [5]

چونکہ ہندوستان کے اکثر ساحل عیسائیوں کے تصرف میں ہیں، اور فرنگی سلاطین اور فرماں روایانِ ہند کے درمیان اکثر خط و کتابت کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ ظل اللہ اکبر بادشاہ نے اس سپہ سالار (خانِ خاناں) کو حکم دیا کہ عیسائیوں کی زبان اور اس کا رسم الخط سیکھے۔ چنانچہ یا نے تخت شاہی میں مقیم سیکی رؤساء، تاجروں اور سیاحوں سے تھوڑا سا ربط و ضبط پیدا کیا۔ اور باقاعدہ عیسائیوں کی زبان اور رسم الخط کی مشق کر لی۔ اور اب بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ خانِ خاناں عیسائیوں سے زیادہ عیسائیوں کی زبان کا ماہر ہے۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عبدالرحیم خانِ خاناں پہلا ہندوستانی مسلمان تھا جو مغربی زبان - پرتگالی زبان - جانتا تھا اور بالکلف بولتا تھا۔

عبدالستار بن قاسم

عبدالستار مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کا فرزند تھا۔ وہ اکبر کے دربار کا ایک امیر تھا۔ اکبر کے حکم

اس نے پرتگالی اور لاطینی زبانیں سیکھی تھیں۔ عبدالستار نے چھ ماہ کی مدت میں پادری جیروم زیور سے یہ زبانیں سیکھ لیں تھی۔ وہ آسانی سے یہ زبانیں پڑھتا تھا۔ اس نے "مشاہیر یونان و روما" کے حالات پر ایک کتاب کا ترجمہ "ثمرۃ الفلاسفہ" کے نام سے کیا تھا۔ اس میں یونان اور روما کے فلسفیوں کے حالات تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد محمد حسین آزاد حکومت کی داروگیر سے چھپتے پھرتے تھے۔ کچھ زمانہ انھوں نے اپنے ہم درس خلیفہ محمد حسین وزیر اعظم پٹیالہ کے پاس گزارا تھا۔ ان کے کتب خانے میں انھوں نے "ثمرۃ الفلاسفہ" دیکھی تھی، "دربار اکبری" میں انھوں نے کتاب کے دیباچے سے چند سطریں نقل کی ہیں اور لکھا ہے کہ یہ کتاب ۴۸ جلوسِ اکبری (۱۰۱۱ھ/۱۶۰۳ء) میں ترجمہ کی گئی۔[۶]

"دربارِ اکبری" کے بیان پر مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔[۷] "کاش پنجاب کے کوئی بزرگ خلیفہ محمد حسین کے کتب خانہ کی اس پہلی مغربی زبانوں سے ترجمہ شدہ کتاب کا سراغ لگائیں اور اس کے مضامین سے آگاہی بخشیں۔"

سہ روزہ اخبار Radiance (دہلی) کی اشاعت ۲۶-۳۰ مئی ۱۹۹۰ء میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ثمرۃ الفلاسفہ از عبدالستار بن قاسم کا قلمی نسخہ National Archives Of India, Delhi نے حاصل کیا ہے۔

عبدالستار بن قاسم نے ایک اور کتاب "داستانِ احوالِ حواریاں" کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ مزید ایک اور کتاب "داستانِ مسیح" کا پرتگالی سے فارسی ترجمہ پادری زیروم زیور کی اعانت سے کیا تھا۔ زیور نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

مولانا عبدالستار بن قاسم لاہوری باتفاق ایں بندہ در ہماں دارالخلافہ آگرہ ترجمہ کرد سن ہزار و شش و صد ودو (۱۶۰۲ء) از ولادت حضرت ایشوع چہل و ہفت الٰہی از جلوس مقدس شاہنشاہی (۴۷ جلوس) انجام یافت[۸]

اس کا ایک باتصویر نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔[۹] اس کتاب کے چار حصے ہیں (۱) پیدائش و طفولیت (۲) تعلیمات و معجزات (۳) موت و تعذیب (۴) احیاء و رفعت اسی انداز پر شہنشاہ جہانگیر اور شاہجہان کے واقعات بھی جمع کیے ہیں۔

حواشی

1. Rev. Father Flex, Mughal Farmans, Parwanahs and Sanads, Agra (1913) p.11
2. V.D. Mahajan, History of India after 1526, Vol. II, Delhi (1962), p. 2.

ہاشمی، برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، لاہور (١٩٧٠ء)، ص ١٦٥

٣۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ (١٨٦٩ء)، جلد ٢، ص ٢٦٠، عبدالحی راسنے بریلوی، نزہۃ الخواطر، حیدرآباد دکن (١٩٥٧ء)، جلد ٦، ص ٣٦

٤۔ فرید بھکری، ذخیرۃ الخوانین، کراچی (١٩٦١ء)، جلد ١، ص ٦٠

٥۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، بحوالہ مآثر رحیمی، ص ١٣١

٦۔ محمد حسین آزاد، دربار اکبری، لاہور (١٩١٠ء)، ص ١١٨

٧۔ مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، دہلی (١٩٤٤ء)، جلد ١، ص ٥٠ (حاشیہ)

٨۔ سلیم الدین قریشی، فارسی کی پہلی کتاب، ماہنامہ "کتاب" (لاہور)، نومبر ١٩٨٥ء

٩۔ ذکاء اللہ دہلوی، تاریخ ہندوستان، عہد اکبر بادشاہ، ص ٨٦

(عالم اسلام اور عیسائیت، اگست ٩٣ء)

سفینۃ النیل فرعون

ڈاکٹر اے ۔ بی اشرف

میں اور نیاز احمد صاحب دوسرے مسافروں کے ساتھ استنبول ائیرپورٹ کے لاؤنج ۱۰۸ میں بیٹھے جہاز میں داخل ہونے کے اعلان کے منتظر تھے ۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک دلکش نسوانی آواز میں اعلان سنائی دیا ، پہلے ترکی زبان میں اور پھر انگریزی میں ، کہ مسافر گیٹ ۱۰۸ کے ذریعے جہاز کی طرف بڑھیں ۔ دروازے پر حسین و جمیل نیلی آنکھوں والی ترکی دوشیزہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ مسافروں کا استقبال کر رہی تھی اور ٹکٹ کا ایک ایک حصہ بڑی نزاکت سے کتر کر دوسرا مسافروں کے ہاتھ میں دیتی جاتی تھی ۔ مسافر ایک ایک کر کے لمبی گیلری میں سے ہوتے ہوئے مصری ائیرلائن کے چھوٹے سے جہاز میں داخل ہو رہے تھے ۔ جہاز کے دروازے پر سانولی سلونی مصری ہوائی میزبان مسافروں کو بلا و سہلا کہہ رہی تھی ہماری نشستیں جہاز کی دم میں تھیں سب سے پیچھے --- باقی نشستیں تو تین تین تھیں لیکن ہماری صرف دو تھیں ۔ کھڑکی کی طرف نیاز صاحب براجمان ہوئے اور گوری ڈور والی سیٹ میں نے سنبھالی ۔ جہاز میں مصری بھی تھے ۔ زیادہ تر کالے اور گھنگھریالے بالوں والے ۔ ترکی بھی تھے ۔ --- سرخ و سفید اور خوبصورت ، جاپانی بھی تھے ---- چپکی ہوئی ناکوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے لیکن چاک و چوبند -- چپٹی چوڑی والے جرمن اور انگریز بھی تھے دلکشی سے کوسوں دور -- اور ہم دو پاکستانی بھی -- سانولے اور سال خوردہ --- جہاز چھوٹا سا تھا جس میں سو سوا سو مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی ۔ کچھ نشستیں خالی بھی پڑی تھیں ۔ قاہرہ کی فلائیٹ کا اعلان سنتے ہی ایک دم پی آئی اے کی پہلی بوئینگ فلائیٹ کا خیال آیا جو قاہرہ پہنچنے سے پہلے ہی حادثے کا شکار ہو گئی تھی ۔ دل میں ایک ہول سا اٹھا لیکن پائلٹ کی گھمبیر اور باوقار آواز آئی "بسم اللہ الرحمن الرحیم" -- تو دل کو فوراً تقویت حاصل ہوئی ۔ جہاز مائل پرواز ہوا اور ہم بہت جلد چرخ پر تیرنے لگے ۔

نیاز صاحب کو ترکی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا ۔ یہ ان کا ترکی کا تیسرا پھیرا تھا ۔ پہلی بار ۱۹۸۸ کی سردیوں میں آئے جب میں خود بھی ترکی میں نووارد تھا ۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کے چھوٹے صاحبزادے افضل احمد تھے ۔ دوسری بار ۱۹۹۱ء کی گرمیوں میں خانم مہ و شاہ کے ساتھ آئے اور ان بھاری بھر کم ہم وطنوں میں اسلام‌ندیم سید ، ڈاکٹر سعادت سعید ، مرزا یاسین اور افتخار جنجوعہ شامل تھے ۔ لیکن اب کے تنہا آئے تھے بلاشرکت غیرے ۔ آنے سے پہلے ان کا خط بھی آیا اور تاکیدی فون بھی کہ میں مصر کا ویزہ لگوا کر رکھوں ۔ نیاز احمد صاحب

سنگ میل پبلی کیشنز کے بانی مبانی اور روح رواں ہی نہیں پاکستان بھر کے ادیبوں اور شاعروں کے مرکز نگاہ اور مربی و سرپرست بھی ہیں ۔ وہ واحد پبلشر ہیں جو ادیبوں کی نگارشات کو نہ صرف خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں شائع کرتے ہیں بلکہ ان کو باقاعدہ رائلٹی بھی ادا کرتے ہیں ۔ کاش کہ غالب کو ان کی زندگی میں نیاز احمد جیسا پبلشر ہاتھ آجاتا تو کچھ دن اور جی لیتے ۔ نیاز صاحب کی اخلاقی خوبیوں میں ان کی سادگی ، راست گوئی ، اخلاص اور دوستوں سے دوستی نبھانا ہے ۔ دنیا بھر کے ملکوں سے کوئی ادیب لاہور پہنچے ایک دعوت نیاز صاحب کے ہاں بھی ہوتی ہے ۔ ان کے ڈرائنگ روم میں دوپہر کے کھانے پر خاص رونق رہتی ہے ۔ لیکن کھانے کے وہ عادی نہیں ۔ خود کم کھاتے ہیں لیکن دوستوں کو کھلا کر خوش ہوتے ہیں ۔ قسم قسم کے لذیذ کھانے پکوا کر میز کو سجانے اور دوستوں کو کھلا کر خوشی محسوس کرنا ان کا مشغلہ ہے ۔ ان کے ہاں کا ناشتہ تو بہت مشہور ہے جس میں سری پائے اور نہاری سے لیکر تلی ہوئی مچھلی ، حلوے مانڈے ، قیمہ بھرے پراٹھے ، گاجر کا حلوہ اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں موجود ہوتی ہیں ۔ یہ ناشتہ سال میں ایک دو بار ہوتا ہے جس میں لاہور کے کم و بیش تمام ادیب و شاعر شرکت کرتے ہیں اور اس ناشتے کا انتظار اور تصور سال بھر باندھتے ہیں ۔

نیاز صاحب انقرہ پہنچے تو قدرت نے ان کو زبردست برف باری کے ذریعے نوازا اور ان کے ساتھ ساتھ انقرہ والوں کو بھی نہال کیا کیونکہ بارش اور برف ترکی کے لئے باعث زحمت نہیں رحمت کا سبب بنتے ہیں ۔ اگر کچھ عرصہ برف نہ پڑے یا بارش نہ ہو تو پانی کا قحط پڑنے لگتا ہے ۔ اس دفعہ برف اتنی پڑی کہ میرے تین سالہ قیام کے دوران پہلے کبھی نہیں پڑی تھی ۔ ۔ میری اہلیہ ، چھوٹا بھائی احمد نواز اور دو بیٹیاں طاہرہ اور ہما بھی میرے پاس انقرہ آئی ہوئی ہیں ۔ ہم سب نیاز صاحب کی معیت میں برف باری کا لطف اٹھانے باہر نکلے ۔ پارک میں چاروں طرف برف کے ڈھیر لگے تھے ۔ درختوں کی ٹہنیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور برف کی سلاخیں شاخوں سے لٹک رہی تھیں ۔ چھوٹے چھوٹے پودوں اور گھاس پر بھی برف جمی تھی ۔ گویا پورا منظر برف آلود تھا ۔ برف کے گولے ایک دوسرے پر پھینکے گئے ۔ ترکوں کا بھی یہ پسندیدہ مشغلہ ہے ۔ جونہی برف پڑے بچے باہر نکل کر ایک دوسرے پر برف باری شروع کر دیتے ہیں ۔

نیاز صاحب مصر کا ویزہ لگوا کر اور ٹکٹ بنوا کر آئے تھے ۔ مجھے مصر کے سفارت خانے سے ایک دن میں ویزہ مل گیا ۔ فلائیٹ استنبول سے تھی ۔ ہم ایک روز پہلے انقرہ ایکسپریس کے ذریعے استنبول روانہ ہوئے ۔ اس ٹرین کو Yatakli Tren یعنی بستر والی گاڑی کہتے ہیں ۔ ہر ایک کے لئے الگ الگ چھوٹا سا کمرہ ہوتا ہے جس میں صاف ستھرا بچھا ہوا بستر لگا ہوتا ہے ۔ کپڑے لٹکانے کے لئے الماری اور اس میں ہینگر ، ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور گلاس ، ہاتھ منہ دھونے کے لئے بیسن اور صاف ستھرا تولیہ موجود ہوتا ہے ۔ جہاں تک کہ سفید پلاسٹک کے پیکٹ میں نازک سے سلیپر تک رکھے ہوتے ہیں ۔ خدمتگار کے لئے " خدمت چی " یعنی خدمتگار حاضر ہوتا ہے ۔ جونہی گھنٹی بجائیں چراغ الہ دین کے جن کی مانند حاضر ... لیکن جن کی طرح ڈراؤنی ہیئت اور کالی مخلوق نہیں بلکہ سرخ و سفید اور خوبصورت ترک ، پتلون کوٹ میں ملبوس ٹائی لگی ہوئی .. نہایت مؤدب اور چاک و چوبند ..... رات کو آرام کی نیند سوئے ... صبح سات بجے گھنٹی کی آواز نے جگایا ... استنبول کا اسٹیشن حیدر پاشا آنے والا تھا اور گارڈ گھنٹی بجا بجا کر لوگوں کو خبردار کر رہا تھا ۔ ہم نے جلدی جلدی شیو کی ۔ ہاتھ منہ دھویا کپڑے تبدیل کئے اور ناشتے کے لئے کھانے والے ڈبے میں پہنچے ... بڑی بڑی صاف ستھری میزوں کے ارد گرد مرد ، عورتیں ، لڑکے لڑکیاں ،

بھی ناشتہ کر رہی تھیں ۔ ناشتے میں ڈبل روٹی اور چائے ، کافی کے ساتھ پنیر ، زیتون ، مکھن ، انڈا ، جام اور جوس ہر شے موجود ۔ خرچہ بارہ ہزار لیرے فی کس یعنی ساٹھ روپے پاکستانی ۔

حیدر پاشا سے کارا کوئی تک واپور (بحری جہاز) کے ذریعے سمندر پار کیا اور وہاں سے ٹیکسی لے کر م ۔ کمال اوکے سے ملنے بریٹی لیونت روانہ ہوئے ۔ م ۔ کمال اوکے پہلے استنبول یونیورسٹی میں تھے اب یوڈا پچی یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں ۔ خاصے مشہور آدمی ہیں ۔ پندرہ کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ترکی ٹی وی اور ریڈیو کے مشیر بھی ہیں ۔ تحریک خلافت پر انہوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ پاکستان سفارت خانے کے ترجمان ڈاکٹر احمد اسرار نے کیا ہے اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے ۔ اور یہ کتاب نیاز صاحب نے شائع کی ہے ۔ م ۔ کمال اوکے نوجوان اور چاک و چوبند آدمی ہیں ۔ ایک سٹوڈیو بنا رکھا ہے جس میں ڈاکومنٹریز تیار کرتے اور ٹی وی وغیرہ کو بیچتے ہیں ان کے ساتھ ان کے سٹوڈیو میں کافی پی اور اپنا سامان وہاں چھوڑ کر " دولما باہچے محل دیکھنے ساحل سمندر پر گئے ۔

دولما باہچے محل استنبول میں سلطانوں کا مسکن رہا ہے ۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے اپنی زندگی کے آخری ایام یہیں پر گزارے اور اس محل میں فوت ہوئے ۔ یہ محل ہر وقت مرجع خاص و عام بنا رہتا ہے کہ نہ صرف اپنی وسعت اور سمندری فضا کے لحاظ سے بلکہ حسن و رہائش کے اعتبار سے بھی قابل دید ہے ۔ اس تاریخی عمارت میں نقاشی ، کاشی گری ، ظروف سازی اور خطاطی وغیرہ کے بے مثل نمونے موجود ہیں ۔ میں نے یہ محل پہلے بھی دیکھ رکھا تھا ۔ لیکن اس بار ترک گائیڈ کی وجہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوئیں ۔ لڑکی نے رواں دواں انگریزی میں محل کے مختلف حصوں کا تعارف کرایا اور چیزوں کی تشریح کی ۔ محل کے ساز و فانوس ، ظروف و لباس ، قالین ، فرنیچر ، سازو سامان اور شان و عظمت دیکھ کر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ عثمانی سلاطین ، جن کی سلطنت شاید دنیا بھر کی عظیم ترین اور وسیع ترین سلطنت رہی ہے ۔ کس شان و شکوہ کے مالک تھے ۔ فرانس ، اطالیہ ، برطانیہ ، جرمنی ، آسٹریا ، روس اور نہ جانے کہاں کہاں سے بادشاہ اور حکمران ان کو تحفے تحائف بھجواتے اور خوش نودی حاصل کرتے تھے ۔ کتنے حکمرانوں نے یہاں سلاطین کی دعوت کھانے کا اعزاز حاصل کیا ۔ قسم قسم کے عجائبات اس محل میں جمع ہیں ۔ حرم اور خوابگاہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔ مرمریں غسل خانے اور ان کے لوازمات دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ دنیا جہاں سے آئی ہوئی حسین ترین نازک اندام دوشیزاؤں کو لونڈیاں اور کنیزیں جب نہلا دھلا کر لباس مکلف پہنا کر ، عطرو خوشبویات میں بسا کر سلطان کی خوابگاہ میں بھجواتی ہونگی تو اس وقت یہ نازنینیں اور دوشیزائیں سلطان کا دل بہلانے کی خاطر کیا کیا ادائیں نہ دکھاتی ہونگی ۔ (بادل نخواستہ ہی) اس محل کی تعمیر پر کس قدر محنت اور کس قدر روپیہ خرچ آیا ہو گا یہ سوچ کر انسان گھبرا جاتا ہے ۔ خلیج کی جنگ کے بعد جارج بش یہاں آیا تو اسی محل میں اسے ضیافت دی گئی ۔ دولما باہچے کی سیر کے بعد م ۔ کمال اوکے کے سٹوڈیو سے سامان لیا اور سیدھے ائیر پورٹ پہنچے ۔

تین گھنٹے کی فلائیٹ تھی اور مصری ہوائی میزبانوں کی تعداد بھی تین تھی ۔ دو لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا ۔ تینوں کے رنگ سانولے اور جسم بھرے بھرے تھے ۔ ہوائی میزبان لڑکیاں معمولی شکل و صورت کی تھیں ۔ لیکن تھیں دونوں بہت کم سن ۔ پی آئی اے کی ہوائی میزبانوں کے برعکس جو خود پی آئی اے کی ہم عصر ہیں اور پی آئی اے کے جہازوں کی طرح پرانی لیکن پائیدار ہیں ۔ ان کے ہنسنے کھیلنے کے دن گزر چکے ہیں اس لئے بے حد سنجیدہ اور باوقار

ہیں ۔ مصری میزبانوں نے میزبانی کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا اور اس کی سبب یہ تھا کہ کھانا مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے کمتر درجے کا تھا ۔ جرمنوں اور جاپانیوں کی تشفی کے ۔ تو شاید کافی ثابت ہوا کہ وہ خود زیادہ تر سنیکس پر گزارا کرتے ہیں ۔ لیکن ترکوں اور پاکستانیوں کے لئے اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھا ۔

کھانے کے بعد قہوے کے چند گھونٹ پئے تو تازگی کا احساس ہوا اور دل میں خیالات کا ہجوم ہلچل اور ہیجان برپا کرنے لگا ۔ مصر کی سرزمین کیسی پراسرار اور طلسمی سرزمین ہے ۔ مصر کا نام آتے ہی قدیم ترین تہذیب کی تصویر دل و دماغ میں کھلنے لگتی ہیں ۔ ہزاروں سال سے یہ تہذیب اپنی تمام تر شان و شکوہ اور آثار و عجائبات کے ساتھ درخشاں اور تابندہ ہے ۔ سیاحوں کے لئے اس کے آثار عجیب کشش رکھتے ہیں جس زمانے میں ابھی دنیا دوسری جنگلوں سے باہر نہیں تھی مصر کی سرزمین میں زوسر ، خوفو ، خافری ، منکاورع اور ایکسس اعظم جیسے فرعون ایسی ایسی یادگاریں تعمیر کرا رہے تھے جو آج بھی دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی ہیں ۔ مصر کا سب سے حسین تحفہ اساطیری دریا نیل ہے جو افریقی جھیلوں سے نکل کر بحیرہ روم تک چھ ہزار کلو میٹر سے زیادہ کا فاصلہ طے کرتا ہے اور سرزمین مصر کو شاداب آباد کرتا ہے ۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں پیغمبروں نے حکومت کی ۔ جہاں اوسرس دیوتا کی قدیم ترین اسطورہ وجود میں آئی ۔ جہاں فرعونوں اور بڑے بڑے شہنشاہوں نے ہمیشگی کے حصول کی خاطر دیوتاؤں کا روپ اختیار کیا اور اہرام کے علاوہ دیوی دیوتاؤں کے مجسمے اور عظیم مندروں کی صورت میں عبادت گاہیں تعمیر کرائیں ۔ سکندر اعظم جیسے مہم جو نے اس سرزمین کو نہ صرف فتح کیا بلکہ اپنے فن کے لئے بھی منتخب کیا ۔ سکندریہ شہر اسی کی یادگار ہے ۔ جہاں دلکش نسوانی کردار قلو پترا نے اپنی ذہانت اور حسن کے بل بوتے پر جولیس سیزر اور پھر مارک انتھونی کو مسحور کر کے بیس سال تک حکومت کی ۔ کبھی یہ سرزمین رومیوں اور بازنطینیوں کے زیر نگیں رہی ۔ اور پھر حضرت عمر ابن الخطاب کے دور خلافت میں حضرت عمرو بن العاص نے کفر و باطل کا نشان مٹا کر اسلام کا ایسا نقش اس سرزمین پر بٹھایا کہ جسے آج تک مٹایا نہیں جا سکا ۔ جہاں فاطمیوں ، مملوک اور عثمانیوں نے صدیوں تک اپنی اپنی حکومتیں قائم رکھیں ۔ نپولین بونا پارٹ فرانسیسی فوجوں کے ساتھ اس سرزمین میں داخل ہوا ۔ پھر برطانیہ نے جہاں ایک تسلط قائم کیا اور آخر جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر مصر آزاد ہوا لیکن اپنے سابقہ شاہی نظام کے ساتھ ۔ شاہ فاروق کی کوتاہیوں کی بدولت ۱۹۵۲ء میں جہاں فوجی انقلاب آیا اور صدارتی نظام کا آغاز ہوا ۔ جمال عبدالناصر جیسے قوم پرست لیڈر نے مصر کا تشخص ابھارا اور سادات نے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کر کے مصر کو عربوں میں متنازعہ فی ملک بنایا موجودہ صدر حسنی مبارک کے عہد میں عراق کے خلاف مصر نے امریکی افواج کے شانہ بشانہ جنگ کر کے امریکہ سے اسرائیل کے بعد سب سے زیادہ امداد حاصل کی ۔ میں انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اعلان ہوا جہاز قاہرہ کے ائیرپورٹ پر اترنے والا ہے ۔

قاہرہ ائیرپورٹ اچھا خاصا ہے ۔ یورپ کے ائیرپورٹوں کے مقابلے کا تو نہیں پھر بھی ماڈرن اور وسیع ہے ۔ اس کے چار ٹرمینل ہیں ۔ ایک مقامی اور تین بین الاقوامی ۔۔۔ جن میں کیفے ، ریسٹورنٹ ، سنیکس بار ، بنک ، ڈیوٹی فری شاپس اور گفٹ سنٹر وغیرہ موجود ہیں ۔ پہلے ایک بیرونی حصہ ہے جس میں مختلف ائیرلائنز کے دفاتر ہیں ۔ اندر داخل ہوں تو بریفنگ کاؤنٹرز ہیں ۔ بریفنگ کے بعد اندر جائیں تو ایک بہت بڑی ہال نما نشست گاہ ہے جس کے دونوں طرف ڈیوٹی فری شاپس اور ان میں قسم قسم کی شرابیں اور سگریٹ رکھے ہیں ۔ کیفے اور بار ہیں ۔ جہاں

سے مختلف پروازوں کے لئے الگ الگ دروازے ہیں ۔ ہر دروازے کے قریب مسافروں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں رکھی ہیں ۔ ٹیلی ویژن جگہ جگہ نصب ہیں جو مختلف پروازوں کے اوقات دکھاتے رہتے ہیں ۔ ہم پاسپورٹوں پر " دخول " مہریں لگوا کر سوٹ کیس لینے کے لئے لاؤنج میں پہنچے ہی تھے کہ کس ٹورازم کمپنی کا کارندہ مسٹر حامدی ہمارے پاس آیا اور آتے ہیں باتوں میں ایسا الجھایا کہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا ۔ یار صاحب تو اس سے مرعوب نہ ہوئے کیونکہ وہ عموماً اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ " ہرو آہستہ کہ آہستہ و پیوستہ رود " ۔۔ اس لئے ہر معاملے میں آہستہ و پیوستہ روی ، غور و فکر ، چیزوں کے بھاؤ تاؤ ناپ تول اور جانچ پڑتال میں انہماک اور لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں خاصے محتاط ہوتے ہیں لیکن میرا معاملہ الٹ ہے ۔ میں جلدی متاثر ہو جاتا ہوں اس لئے میں اس کی چستی پھرتی اور تیری طراری سے خاصا متاثر ہوا ۔ سب سے پہلے تو اس نے ہمیں تسلی دی کہ ہم کسی قسم کی کوئی فکر نہ کریں وہ سب سنبھال لے گا (حالانکہ ہمارے چہروں سے کوئی فکر یا وحشت ہمیں ٹپک رہی تھی) اور جب اس نے ہمارا سوٹ کیس بغیر کھلوائے کسٹم سے پار کرا دیا تو یار صاحب بھی کچھ کچھ متاثر دکھائی دیئے کیونکہ دوسرے ملکوں کی طرح مصر میں بھی پاکستانیوں کی خاص طور پر اچھی تلاشی کی جاتی ہے ۔ اس کے بعد وہ ہمیں اپنے چھوٹے سے دفتر میں لے گیا اور ایک کاغذ پر ہمارے ایک ہفتے کا پروگرام بنانے میں مشغول ہو گیا ۔ جب ایک روز کی سیر کا خرچ ۳۰۰ سے ۴۰۰ ڈالر کے قریب بیان کیا تو ہمارے ہوش اڑ گئے ۔ ہم نے بڑی لجاجت سے کہا کہ آپ سب سے پہلے ہمارے رہائش کے لئے فون پر پاکستان سفارت خانے کے فیکس آپریٹر مسٹر زاہد علی سے فون پر رابطہ کرا دیں کیونکہ انقرہ کے سفارت خانے سے ہمارے دوست اکرام اللہ صاحب نے انہیں اس بندوبست کے لئے کہہ رکھا ہے ۔ ان کے گھر کا نمبر ہمارے پاس تھا ۔ اس نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے زاہد علی صاحب سے رابطہ کرا دیا ۔ ان سے جب فون پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ہم سیدھے " فندق الامان " چلے جائیں وہاں کمرے کی بکنگ کرا دی گئی ہے ۔ کرایہ ڈبل بیڈ کا ۵۰ ڈالر روزانہ ہے ۔ اب کچھ حوصلہ ہوا ۔ ہم نے حامدی سے کہا کہ از راہ کرم صرف ایک دن بلکہ آدھے دن کا پروگرام بنا کر ہمیں اہرام دکھا دیں باقی پروگرام بعد میں طے کر لیا جائے گا ۔ چنانچہ اس نے اہرام کی سیر اور لنچ کے ۲۵ ڈالر فی کس مانگے جو ہم نے غنیمت سمجھ کر فوراً ادا کر دیئے ۔ دوسرے دن سیر کے بعد اندازہ لگایا کہ اگر ہم خود ٹیکسی کرائے پر لے کر اہرام وغیرہ دیکھتے اور لنچ کرتے تو ۱۵ ڈالر فی کس سے زیادہ بل نہ آتا ۔ خیر پہلا تجربہ تھا ۔ ہفتے بھر کے پروگرام سے محفوظ رہے اور مسٹر حامدی کے چنگل سے صرف ۹۰ ڈالر میں چھٹکارا پانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا اور ٹیکسی لیکر ہوٹل پہنچے ۔ کمرہ اچھا خاصا تھا ۔ باتھ بھی ٹھیک ٹھاک ۔ ٹی وی اور ٹیلیفون کی سہولت بھی میسر تھی ۔ رات آرام کی نیند سوئے نیاز صاحب بہت سویرے اٹھنے کے عادی ہیں ۔ غسل کر کے فوراً نماز " نیت " لیتے ہیں ۔ میری بھی کچھ ایسی ہی عادت ہے پانچ سویرے اٹھ کر کمرے کی گیلری سے باہر جھانکا تو سامنے شیریٹان ہوٹل کی بلند و بالا اور خوبصورت عمارت نظر آئی اس کے عقب میں دریائے نیل خراماں خراماں بہہ رہا تھا ۔ اور اس کے پرسکون سینے پر چند کشتیاں رواں دواں تھیں ۔ کھجور اور پام کے درخت ۔ ہلکی ہلکی دھند میں عجیب پراسرار منظر پیش کر رہے تھے ۔ نیچے شاہراہ جیزہ پر بسیں ویگنیں اور کاریں اور بھاری ٹرک چنگھاڑتی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑنے میں مصروف ہو چکی تھیں ۔

ناشتہ کرائے میں شامل تھا ۔ مصر کی مخصوص ڈبل روٹی چھوٹے گول کیک کی طرح کی جو بہت نرم ہوتی ہے مکھن ، جام ، پنیر اور زیتون کے ساتھ چائے یا کافی جو آپ چاہیں لے سکتے ہیں ۔ ناشتہ اوپر ہال میں جا کر کیا اور پھر

کلاتر کے پاس ننگے صحراؤں پر آکر لوازم والوں کا انتظار کرنے لگے ۔ ہم نے سوچا تھا کہ کوئی خوبصورت کوہ ہو گی اور اس میں کئی ملکوں کے سیاح ہوں گے لیکن وہی ہے کے قریب ایک ٹیکسی نما کار ہوٹل کے سامنے آکر رکی ایک بلا کا قوی ہمارے پاس آیا اور ساتھ چلنے کی دعوت دی ۔ یہ ہمارا گائیڈ کم علی تھا ۔ وہ بہت باتونی لیکن بحیثیت مجموعی اچھا قوی ثابت ہوا ۔ ٹیکسی کافی بڑی تھی لیکن سیاح ہم صرف دو ہی تھے ۔ ایک ڈرائیور اور ایک گائیڈ ہمارے علاوہ ۔ چلیئے یہ بھی اچھا ہوا کہ اپنی مرضی سے جہاں جتنی دیر ٹھہرے ٹھہرے پھر آگے بڑھ گئے ۔ کوچ میں ہوتے تو پھر سب کے ساتھ چلنا پڑتا ۔

قاہرہ سے ۱۹ کلو میٹر کے فاصلے پر دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہونے والے اہرام موجود تھے ۔ اس شہر کو جیزہ کہتے ہیں جو قاہرہ کے مضافات میں واقع ہے ۔ جیزہ گویا ایک گاؤں ہے اور اس کے قریب اہرام موجود ہیں ۔ یہ سارا علاقہ صحرائی ہے اور اہرام کے ارد گرد گرد اڑتی ہے ۔ ایک مصری قول کے مطابق "ہر شے وقت سے ڈرتی ہے لیکن وقت اہرام سے ڈرتا ہے ۔ " ہزاروں سال سے اہرام کی موجودگی اس قول کی صداقت کا یقین تو دلاتی ہے لیکن پھر بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ وقت کی سعی مسلسل کارگر ضرور ہوتی ہے اور صفحہ ہستی کی ہر چیز پر زوال کی کیفیت ضروری طاری ہوتی ہے ۔ آج یہ اہرام عبرت کا نمونہ ہیں ۔ کئی ایک چھوٹے چھوٹے اہرام تو اب مٹی کے تودے بن کر رہ گئے ہیں ۔ البتہ فرعون خوفو ، خافری اور منکاؤ رع کے تین اہرام آج بھی سیاحوں کے لئے دلکشی اور دلچسپی کا باعث بنے ہوئے ہیں ۔ خوفو کا اہرام تینوں میں بڑا ہے ۔ اس قوی الجثہ اہرام کی اصل بلندی تو ۱۴۶ میٹر تھی لیکن اب ۱۳۷ میٹر رہ گئی ہے ۔ اس اہرام کا بیرونی حصہ اب اپنا حسن کھو چکا ہے کیونکہ اس کا رنگ روغن اکھڑ چکا ہے ۔ دوسرا اہرام یعنی اہرام ثانی خوفو کے بیٹے فرعون خافری کا ہے جو ۲۶۳۰ ق م میں تعمیر ہوا ۔ اس میں اندر جانے کے لئے ایک سرنگ بنائی گئی ہے جس میں سر جھکا کر بلکہ دو چند ہو کر جانا پڑتا ہے ۔ آگے آگے گائیڈ تھا ۔ پیچھے میں اور میرے پیچھے نیاز صاحب ۔ غار میں کافی روشنی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا بلکہ ٹمٹماتے چراغ کی طرح کا ایک قمقمہ روشن تھا جس کی روشنی ناکافی تھی ۔ سیڑھیاں بھی باقاعدہ نہیں تھیں ، اس پر بھی قدم رکھنے کے لئے لکڑی کے ٹکڑے رکھے تھے ۔ غار بہت تنگ و تاریک تھا اور خاصا لمبا تھا ۔ شروع میں یہ ڈھلوان کی طرف جاتا ہے تقریباً آدھے راستے کے بعد فراز شروع ہوتا ہے ۔ ہم کچھ راستہ طے تو کر گئے لیکن بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔ ایک دم خوف سا آنے لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے ہم زندہ درگور ہونے جا رہے ہیں ۔ اتنے میں نیاز صاحب کی آواز آئی کہ وہ تو واپس جا رہے ہیں کیونکہ ان کا دم گھٹنے لگا تھا ۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا ۔ وہ مڑے تو میں بھی فوراً لوٹا ۔ باہر نکل کر جان میں جان آئی ۔ چاہیئے تھا کہ اندر جانے کے لئے کوئی مناسب سا راستہ بنایا جاتا ۔ جیسے الاقصر (Luxor) میں " وادی ملوک " کے مقبروں کے لئے بنایا گیا ہے ۔ لگتا ہے اہرام کی حفاظت کے لئے کوئی خاص مساعی نہیں کی جا رہی ۔ مجھے عراق میں بابل کے مقام پر آثار دیکھنے کا موقع ملا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ صدام حسین نے کروڑوں خرچ کر کے ان آثار کو محفوظ رکھنے کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ قابل تحسین ہیں ۔ جیزہ اور سقارہ کے اہراموں کو محفوظ کرنے کے لئے زیادہ محنت نہیں کی جا رہی ۔ البتہ وہاں تک رسائی کے لئے سڑکیں ضرور تعمیر کی گئی ہیں ۔ منکاؤ رع کے اہرام کے سامنے تین چھوٹے چھوٹے اہرام ہیں ۔ مشرق کی طرف والا شاید فرعون خرمرنحت (Kharmer Nehty) کی بیوی کے لئے بنایا گیا تھا ۔

خوفو کے اہرام سے ۳۵۰ میٹر کے فاصلے پر ابوالہول کا عظیم مجسمہ ہے ۔ ابوالہول یعنی " خوف کا باپ " جس کا

دھڑ شیر کا ہے اور سر انسان کا ۔ بعض روایات کے مطابق یہ فرعون خافری کی شبیہ ہے جو اپنے مقبرے کا پہرہ خود دے رہی ہے ۔ بعض کے نزدیک یہ مصری تہذیب کا سب سے بڑا چیستان ہے کہ انسان واقعی انسان ہے یا حیوان انسان اور حیوان کی کشمکش جاری ہے اور یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ حیوان اور انسان میں سے کون غالب آیا ۔ شروع میں اسے Horem Akhat کہتے تھے جس کا مطلب ہے "ہورس جو افق پر ہے" وقت کے ساتھ ساتھ اس پر ریت جمتی گئی اور یہ صرف پانچ میٹر رہ گیا ۔ باقی حصہ دب گیا ۔ پھر لوگوں نے ریت کھود کھود کر اسے نکالنے کی کوشش جاری رکھی ۔ اس کا چہرہ بھدا اور ناک ٹوٹی ہوئی ہے ۔ اس کا سبب کچھ تو فطرت کی ستم ظریفی یعنی ہواؤں کی شدت اور کچھ مملوک کی توپوں کی نشانہ بازی کی مشق ہے ۔ اس کے بالکل سامنے ایک کیفے ہے جس کے لان میں بیٹھ کر غیر ملکی سیاح گھنٹوں "خوف کے باپ" کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں ۔ ان اہراموں کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کرنے والا سسلی کا مورخ ڈایو ڈورس تھا جو ایک صدی قبل از مسیح مصر میں آیا تھا ۔ ہیرو ڈوٹس کے بعد یہ دوسرا بڑا سیاح تھا جو مصر کی سر زمین میں اہرام دیکھنے آیا ۔ مشہور یونانی سیاح ، صحافی اور فلسفی ہیروڈوٹس نے کہا تھا "فرعون خوفو نے اپنے پیچھے عظیم اہرام چھوڑا جو فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے" اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے ۔ ہمارا گائیڈ محمد علی انگریزی زبان میں ان اہرام کی تاریخ تعمیر ، مدت تعمیر اور مصرف تعمیر وغیرہ کے بارے میں بہت سی معلومات دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ معلومات ہمیں پہلے ہی سے حاصل تھیں ۔ اس لئے ہم نے زیادہ توجہ اس کی ان باتوں کی طرف دی جو مصر کے موجودہ سیاسی حالات اور انفرادی اور اجتماعی روز مرہ زندگی کے بارے میں تھیں ۔ محمد علی کے مطابق صدر سادات اور حسنی مبارک کی امن پالیسی ٹھیک تھی ۔ لوگ خوش ہیں کہ جو رقم جنگ پر خرچ ہوتی تھی وہ لوگوں کی بہبود پر خرچ ہوتی ہے (اگرچہ ہمیں سوائے سڑکوں کے کہیں یہ رقم خرچ ہوتی نظر نہ آئی) اس کے خیال میں اسرائیل سے جنگ کرنے کا کیا فائدہ ۔ خواہ مخواہ امریکہ کی مخالفت لینے میں کوئی عقل مندی نہیں ہے ۔

(تجدید نو، نومبر ۱۹۹۳ء)

صومالیہ کی بگڑتی صورتِ حال

نو آبادیاتی نظام کی دین !

—— عادل صدیقی ——

صومالیہ کی حالیہ تباہی و بربادی کے خوفناک مناظر بیان سے باہر ہیں، صرف گزشتہ ایک سال میں جنگ اور بھوک سے ساڑھے تین لاکھ بے گناہ انسان جاں بحق ہو چکے ہیں، یہ ملک قحط سالی کا شکار ہے، اقوام متحدہ کی یک رپورٹ کے مطابق دو ہزار افراد جن میں زیادہ تر خواتین اور بچے شامل ہیں، روزانہ بھوک سے مر رہے ہیں۔ ین الاقوامی برادری کے لیے یہ ایک زبردست چیلنج ہے، صومالیہ کے عوام نے "آپریشن ریسٹور ہوپ" کے نام سے اس امریکی اسکیم کا خیر مقدم کیا ہے جو اس نے وہاں کے لوگوں کی امداد کے لیے شروع کی ہے۔

صومالیہ کی تازہ ترین صورت حال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاید حالات میں بہتری آئے اب لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا سلسلہ کچھ کم ہے، امریکی فوجوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا ہے اور اقوام متحدہ کی افواج کی بر دگی کے لیے راستہ ہموار ہوا ہے، صومالیہ میں جنگ بندی پر رضامندی ہو گئی ہے۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں عدیس ابابا میں اقوام متحدہ کے زیر نگرانی مصالحتی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آئے گا لیکن صومالیہ کا بحران ابھی حل ہیں ہو پایا ہے۔

…منظر: صومالیہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ یہاں سے عرب ممالک کی طرف جایا جا سکتا ہے، بحر قلزم میں آنے کے لیے بھی اس سے راستہ مل جاتا ہے۔ عرب ممالک جو اپنی تیل کی پیداوار یلے مشہور ہیں اور خلیجی ممالک جو تیل اور قدرتی وسائل کی یافت کا ذریعہ ہیں، ان سے صومالیہ کا قریبی اہے ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے کھل جانے کے بعد صومالیہ یوروپی طاقتوں کے لیے بے حد اہمیت اختیار ۱۸۸۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیانی عرصے میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے صومالیہ کے طویل ساحل کو آپس انٹ لیا اور اپنی اپنی نو آبادیاں قائم کر ڈالیں، اس کے ساتھ ہی ایتھوپیا (حبش) کا شہنشاہ اپنی سرحدوں سیع کا خواہشمند تھا، ان حالات میں ان یوروپی مملکتوں کی سرحدیں آپس میں وجہ نزاع بن گئیں اور ان سے آپس میں رنجش پیدا ہو گیا، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ایتھوپیا پر حملہ کر دیا ۱۹۴۱ء میں دوسری

تقسیم کے بعد برطانیہ نے ایک تجویز رکھی کہ صومالیہ کا تمام تر رقبہ اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ میں دے دیا جائے روس اور امریکہ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، صرف اٹلی کے زیر نگیں صومالی رقبہ اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ رہا۔ یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو ری پبلک آف صومالیہ آزاد ہوئی مگر اس میں صومالیہ کے پانچ حصوں میں سے صرف دو حصے شامل رہے، ان دو کے نام ہیں برطانیہ کے زیر نگیں صومالیہ اور اطالوی ٹرسٹ کے ماتحت صومالیہ کا علاقہ باقی تین حصے یہ ہیں فرانس کے زیر نگیں صومالی رقبہ (جبوتی)، ایتھوپیا کا اوگا دن خطہ اور کینیا میں شمالی سرحدی ضلع (این ایف ڈی) یہ تینوں غیر ملکی نگرانی میں رہے، صومالی باشندوں کا کہنا ہے کہ صومالی قوم نوآبادیاتی نظام سے بھی پہلے کی ہے، یہ سچ بھی ہے۔ صومالی قوم ایک سے طرز کے عوام پر مشتمل ہے یہ سب کے سب کھیتی باڑی کرتے ہیں، مویشی چراتے ہیں ایک ہی زبان بولتے ہیں اور سب کے سب مسلمان ہیں، ان کے رسم و رواج اور ثقافت کا انداز ایک ہی سے ہیں، ۱۹۸۱ء میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے ایک اہم سیاسی شخصیت سید باری نے بجا طور پر کہا تھا کہ صومالیہ کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری نوآبادیاتی نظام پر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ملک پانچ حصوں میں تقسیم ہوا، دو حصے برطانیہ کے پاس ہیں ایک حصہ اٹلی کے پاس، ایک فرانس کے پاس اور ایک ایتھوپیا کے پاس ہے، صومالیہ کے نقطۂ نظر سے نئی جمہوریہ نے آزادی ضرور حاصل کر لی مگر یہ آزادی کی نصف لڑائی تھی جس پر فتح حاصل کر لی گئی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر آزاد صومالیہ کی خارجہ پالیسی نے ملحقہ خطوں کو آزاد کرانے پر زور دیا ہے یہ سب مل کر متحدہ ریاست بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، صومالیہ کے جھنڈے پر پانچ کونے والا ستارہ اس ملک کے پانچ حصوں کی نشاندہی کرتا ہے، اور اس بات کی علامت ہے کہ یہ سب متحد ہونا چاہتے ہیں۔

تباہی کا پس منظر : آزادی کے بعد صومالیہ میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک جمہوری نظام رہا اور ۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۱ء تک مطلق العنانہ نظام تھا، ان دونوں نظاموں کے تحت ایتھوپیا کے اوگا دن اور کینیا کے شمالی سرحدی ضلع میں چل رہی علیحدگی پسندانہ تحریکوں کی حمایت کی جاتی رہی، صومالیہ کو ایک بنا دینے کی تحریک نے جنگ جویانہ صورت اختیار کر لی، صومالیہ کو ایتھوپیا کے ساتھ ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۷ء میں جنگ کرنی پڑی، ۱۹۸۰ء کے بعد تقریباً دس سال تک بھی ان دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کی سی صورت حال چلتی رہی، ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان صومالیہ کو کینیا سے بھی جنگ کرنی پڑی، اس کے بعد دونوں میں عارضی طور پر صلح ہو گئی، صومالیہ کو سب سے زیادہ نقصان اوگادن کی جنگ سے پہنچا، اوگادن سے تقریباً دس لاکھ پناہ گزیں ۱۹۸۱ء تک صومالیہ میں داخل ہو گئے، اس سے صومالیہ کی شکست خوردہ معیشت پر اور اقتصادی بوجھ پڑ گیا، ۱۹۸۱ء صومالی قومی تحریک (ایس این ایم) نامی ایک تنظیم قائم ہوئی اس نے ۱۹۸۱ء کے بعد فوجی کارروائیاں تیز کر دیں، ان فوجی کارروائیوں کی وجہ سے ہزار ہا شہری مارے گئے۔

گاؤں جل کر راکھ ہو گئے، مویشی ہلاک ہو گئے اور چشمے کے پانی کے ذخیروں میں زہر کا اثر آگیا، ۱۹۸۸ء میں ش جنگ شروع ہوئی اس سے ہرگیشا نامی شہر تباہ ہو گیا۔

مابعد سرد جنگ : صومالیہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ اس پر بڑی طاقتوں کی ہمیشہ سے نظر رہی۔ صومالیہ کا ملحقہ خطوں سے جھگڑا بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا سبب بنا، ہر کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہا، صومالیہ کو دونوں بڑی طاقتیں بڑے پیمانے پر اسلحہ فراہم کرتی رہیں، سے ۱۹۷۵ء تک گویا کہ آزادی ملنے کے پہلے پندرہ برسوں میں روس سے ہتھیار آئے، ۱۹۶۹ء میں سید باری نے صومالیہ کو سوشلسٹ ملک بنا دیا، لیکن ۱۹۷۴ء میں ایتھوپیا کے انقلاب نے صورت حال بدل دی، امریکہ نے ایتھوپیا کو چھوڑ دیا اور صومالیہ کی سرپرستی شروع کر دی، اس طرح یہ ملک اسلحہ کی ذخیرہ گاہ بن گیا، صومالیہ سرکار نے بڑے پیمانے پر یہ اسلحہ تقسیم کیا اس طرح سے وہ پڑوسی خطوں سے بزور آزما ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا تھا، سب سے پہلے وہ ایتھوپیا سے لڑنا چاہتا تھا چنانچہ جنوری ۱۹۹۱ء میں صومالیہ کی راجدھانی موگادیشو میں لڑائی زور پکڑ گئی اور صورت حال حکومت کے قابو سے باہر ہو گئی، ایک ماہ کی لڑائی کے بعد سید باری کو دست بردار ہونا پڑا، اس وقت ملک افراتفری کا شکار رہا، ۲۱ جنوری ۱۹۹۱ء کے بعد جب کہ صدر مملکت سید باری حکومت کی ذمہ داریوں سے الگ کر دیئے گئے صومالیہ میں خانہ جنگی کی کیفیت ہے، ۲۹ جنوری ۱۹۹۱ء کو ایک باغی لیڈر علی مہدی نے اقتدار سنبھالا مگر دیگر باقی رہنماؤں نے ان کی مخالفت کی، ان کے سب سے زیادہ مخالف محمد فرح عدید ہے حالانکہ ان دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلے سے ہے لیکن نومبر ۱۹۹۱ء میں دونوں کے درمیان مکمل جنگ کا آغاز ہوا اس جنگ کے پہلے چھ ماہ موگادیشو میں ۱۴ ہزار افراد مارے گئے اور ۲۷ ہزار زخمی ہوئے، سید باری کے الگ ہو جانے کے بعد اس خانہ جنگی نے وہاں کے لوگوں کو بے حد مایوس کر دیا، صومالی قومی تحریک کی حمایت خاص طور پر اسحق نامی قبیلے نے کی تھی اور سید باری کو الگ کرایا تھا، مگر بعد کے حالات سے اس نے مرکزی سرکار سے علیحدہ ہونے کی آواز اٹھائی، اس نے شمالی صومالیہ میں الگ سے جمہوریہ صومالی لینڈ کے قیام کا مطالبہ کیا، چنانچہ ۱۸ مئی ۱۹۹۱ء کو یہ جمہوریہ قائم ہو گئی اگرچہ اسے نہ تو کسی ملک نے اور نہ ہی کسی بین الاقوامی تنظیم نے تسلیم کیا مگر اس سے صومالیہ کا بحران اور گہرا ہو گیا۔

امن کا راستہ کیا ہو؟ : اس بحران کا حل آسان نہیں ہے، البتہ خوش آئند بات یہ ہے کہ متحارب گروپ بین الاقوامی دباؤ سے مارچ ۱۹۹۳ء میں عدیس ابابا میں ہونے والی امن کانفرنس میں شرکت کے لیے تیار ہیں، لیکن محض جنگ سے باز رہنا ہی تو امن کی ضمانت نہیں بن سکتا، ملک میں خوشحالی کے پروگرام شروع کیے بغیر اس بھیانک صورت حال سے باہر نکلنا دشوار ہے۔

(الحق، جولائی ۹۳ء)

بوسنیا کے متعلق پروفیسر اکبر احمد کی رپورٹ

(پروفیسر اکبر احمد صاحب کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ بی بی سی کی ایک ٹیم کے ساتھ وہ بوسنیا کے حالات کا جائزہ لینے گئے تھے۔ ان کی یہ رپورٹ چشم دید واقعات پر مشتمل ہے۔)

بوسنیا ہرزیگووینا میں انسانی نسل کشی اور مسلمانوں پر مظالم کا قصہ دراز ہے۔ کربناک اور لرزہ خیز ہے۔ اس سلسلہ کی ایک رپورٹ امپیکٹ انٹرنیشنل مارچ کے شمارہ میں آئی ہے۔ ان وحشت ناک اور انسانیت سوز مظالم کے ساتھ مسلمانوں کی ہمت، غیرت اور اسلام پسندی بھی قابل دید ہے۔ اس کی جھلک اس رپورٹ میں ملتی ہے۔ امپیکٹ کے شمارہ اپریل کے شکریہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں رپورٹ پیش کی جا رہی ہے۔

پروفیسر اکبر احمد لکھتے ہیں

"بوسنیا کی صورت حال کے بارے میں مختلف داستانیں لوگوں کی زبان پر ہیں۔ جہاں تک سربوں کی وحشیانہ بربریت اور سفاکی اور درندگی سے متعلق مشہور افواہوں کا تعلق ہے تو بدقسمتی سے وہ سب صحیح ہیں۔ سربیائی فوجوں کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ ایک مسلم گاؤں کو گھیر لیتی ہیں۔ وہاں کے باشندوں کو ایک الٹی میٹم دیتی ہیں۔ اگر گاؤں والے اپنے کو ان کے حوالے نہیں کرتے تو ایک ایک شخص کو مار دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہتھیار ڈال دیتے ہیں تو چن چن کر تمام جوانوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ جوان عورتوں کو اجتماعی آبروریزی کے لیے سب کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور بوڑھی عورتوں کو بالکل خالی ہاتھ کسی سمت میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ پناہ گزینوں کے کیمپوں میں ایسے بوڑھے لوگوں سے میں خود ملا ہوں جو بالکل تنہا اور سخت پریشانی کے عالم میں سرد اور دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزر کر ۳۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے کسی نہ کسی طرح ان کیمپوں تک پہنچے۔

عورتوں اور لڑکیوں کی آبروریزی کے لیے خصوصی طور پر لگائے گئے کیمپوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، کم از کم مجھے تو اس کی نظیر تاریخ کی کسی کتاب میں اب تک نہیں ملی۔ اس جنگ کی یہ بالکل نرالی خصوصیت ہے۔ بوسنیا میں ہونے والے مظالم کے یہ منظر اتنے خوفناک اور دہشت انگیز ہیں کہ حساس انسان کی نگاہ ان میں سے کچھ بھی دیکھ جائے تو وہ چیخ اٹھے گا کہ خدایا یہ کون سی مخلوق ہے جس سے سابقہ پڑا ہے۔۔۔ وہاں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہیں۔ اس لیے کہ ان ظالموں نے ہیجانی جنسی جوش میں ان کے منہ میں (جی ہاں ان کے منہ میں) اس طرح بار بار پیشاب کیا ہے کہ ان کے صوتی اعضاء تک کے پرخچے اڑ گئے۔ ایسی حاملہ عورتیں ہیں جن کے پیٹ چیر کر معدے میں سور کا گوشت بھر دیا گیا ہے۔ ایسے جوان مرد اور جوان عورتیں ہیں جنھیں مادرزاد برہنہ کر کے کتوں کی طرح ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال دی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ اسی حالت میں بدفعلی کی جاتی ہے۔ اور کتوں کی طرح انھیں باندھ کر رکھا جاتا ہے۔ انھیں جو کچھ کھانے کو دیا جاتا ہے اسی حالت میں یعنی (دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں پر چوپایہ کی طرح کھڑے کھڑے ہی) دیا جاتا ہے اور اسی حالت میں پیشاب پاخانہ کرنے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔

میں نے ایسی کئی بوڑھی عورتوں کو دیکھا، جنھیں دیکھ کر مجھے اپنی ماں یاد آ گئیں۔ جن کے خاندان کا کوئی فرد نہیں بچا ہے۔ ان کے پاس نہ ایک پیسہ تھا اور نہ کوئی چیز ہی تھی۔ ایک کونے میں بیٹھی وہ چپکے چپکے رو رہی تھیں۔ میں ایسے بوڑھے مردوں سے بھی ملا جن کی آنکھیں وحشت، شرم اور ذلت و بیچارگی کی پوری پوری داستانیں سنا رہی تھیں۔ مگر زبان سے کہنے کو ان کے پاس ایک لفظ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ جوانوں کا حال یہ ہے کہ غیظ و غضب اور نفرت کی چنگاریاں بجلی کی طرح ان کی آنکھوں میں چمک رہی ہیں۔ ان کی صرف ایک تمنا ہے، انتقام ہے، صرف انتقام، لیکن بے بس۔۔۔۔ ان کا انجام اچھا نہیں نظر آتا۔ میرا یہ خیال شاید صحیح اور ناخوشگوار ہے۔ اور میری دعا ہے کہ خدا کرے یہ غلط ثابت ہو جائے۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ بوسنیا ہی میں آگ اور خون کا یہ طوفان رکنے والا نہیں ہے۔ بلکہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک سلسلہ وار عمل کا آغاز ہے۔ کوسووو، مقدونیہ اور مشرق کے کچھ اور علاقوں میں بھی مسلمان ہیں۔ وہ بھی بالکل نہتے اور بے یار و مددگار ہیں۔ اور ان کا اعتماد حکومتی ذمہ داروں سے بھی اٹھ گیا ہے وہ بہت مضطرب اور فوج اور پولیس سے بے بس ہیں۔ دنیائے اسلام کو یہ پوری صورت حال ٹھیک سے جاننی چاہئے تاکہ وہ طے کر سکے کہ وہ کیا کیا کر سکتی ہے اور اسے کیا کیا کرنا چاہئے۔

بوسنیا کے لوگوں کی اس پوری بپتا کا ایک بہت اہم اور خوشگوار پہلو قابل

سرکاری حکومت کی کمزوری اور ان کی [illegible] برداشت ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا ہوں کہ کسی شخص نے کچھ نہیں مانگا۔ کسی چیز کا سوال نہیں کیا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم خود اپنا دفاع کرنے کے لائق ہو جائیں۔ ہمیں صرف ہتھیار اور گولہ بارود [illegible] کرنا چاہتے ہیں۔ جان و مال کی اتنی بربادی کے باوجود انھوں نے اپنی لڑائی کو جس طرح منظم کیا ہے وہ [illegible] غیر معمولی بات ہے۔ [illegible] کئی شہروں میں [illegible] بازل جانے [illegible] عمر کے بچے اور [illegible] بھی [illegible] تھے مگر اس حال میں بھی [illegible] کی وجہ سے ذاتی طاقت محسوس کرتے تھے۔ انہیں یہ احساس بہت فخر [illegible] کر رہا تھا کہ وہ ایک [illegible] کے آگے ہار نہیں مان رہے ہیں۔

[illegible] سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک چھوٹے سے خوبصورت گاؤں میں میرا جانا ہوا۔ [illegible] کی بلندی پر ایک مسجد نظر آئی۔ میں بڑھ کر وہاں گیا۔ یہ مسجد [illegible] ترکی کے [illegible] تعمیر پر [illegible] تھی اور بڑے اہتمام سے اس کی دیکھ ریکھ کی جاتی تھی۔ نوجوان [illegible] سے مسجد [illegible] ہوئی تھی۔ میں نے امام صاحب کے پاس [illegible] اور ملاقات کی درخواست کی [illegible] وہ باہر تشریف لائے اور [illegible] ہوئے [illegible] انہوں نے خوشی سے [illegible] ایک پاکستانی مسلمان سے مل کر بہت خوش تھے [illegible] آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک [illegible] پہاڑوں کے درمیان اس [illegible] کو دیکھ کر میں [illegible] ہوا۔ مگر جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو [illegible] ذہن و دماغ پر چھایا ہوا تھا کہ جب سربیائی اس چھوٹے سے گاؤں کو مسلمانوں سے "پاک" کرنے کی مہم [illegible] آئیں گے تو شاید سب سے پہلا نشانہ یہی امام صاحب ہوں گے اور ان کی یہ چھوٹی سی مسجد۔

بوسنیا والوں کی کیفیت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اخوت اسلامی کے [illegible] سے سرشار اور اپنے مسلمان بھائیوں کو دیکھنے کیلئے ترس رہے ہیں۔ میرے بارے میں یہ جان کر کہ میں ایک پاکستانی مسلمان ہوں ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے تھے۔ اس منظر کی تصویر کشی میں کیسے کروں جو میرے دل کی گہرائیوں کو چھو رہا تھا [illegible] اس کیفیت کو بھی کیسے بیان کروں کہ میرے پاس انہیں پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ نوجوان [illegible] ہاتھ ملانے کے لیے [illegible] آتے تھے۔ خوشی اور محبت کے [illegible] ان کے دل میں [illegible] کرتے تھے۔ کاش کہ میں ان سے [illegible] کہہ سکتا کہ ان کے [illegible] پاکستانی [illegible] ہیں۔ کاش کہ میں ان سے کوئی وعدہ کر سکتا۔ [illegible] بوسنیا کے [illegible] ہو گیا ہے۔ [illegible] نہیں ہے کہ بوسنیا کے مسلمان [illegible]

سے حالت [illegible] قوم و ملت کی [illegible] رنگ [illegible] ہے [illegible] اعتراف کرنا چاہیے کہ مساجد کے ائمہ حضرات نے اپنے جمعہ کے خطبوں میں بوسنیا کشمیر اور فلسطین کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی طرف عام مسلمانوں کی توجہ بار بار مبذول کی ہے لیکن شاید حقیقت [illegible] بالکل درست ہے کہ ان مظلوموں کی یاد تازہ کرنے کے سوا اور کوئی خاص [illegible] نہیں نکلا ہے [illegible] ہے۔ مسلمان آخر کہاں ہیں؟ تیل کی دولت کہاں ہے؟ مسلمانوں کی وہ طاقت کہاں ہے جو سربیائیوں [illegible] سکتی تھی [illegible] اگر ہر مسلم ملک سے صرف [illegible] بوسنیا بھیجے جائیں تو [illegible] بوسنیا والوں کا [illegible] بدل سکتا ہے بلکہ [illegible] کو ایک واضح شکل بھی دی جا سکے گی [illegible] اس نسل کشی کو انہوں نے [illegible] تو عالم اسلام اسے برداشت نہیں کرے گا۔ مگر [illegible] افسوس کہ دنیا کو ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ تھوڑے سے نوجوان [illegible] بوسنیا پہنچے [illegible] ان کے پاس جو سامان [illegible] معمولی سا ہے [illegible] کی موجودگی کو سربیائی لوگ [illegible] طریقہ [illegible] استعمال کر رہے ہیں۔

اصل میں سب سے اہم مسئلہ یہی ہے [illegible] دنیائے اسلام کی طرف سے اب تک جو ردعمل سامنے آیا ہے وہ انتہائی [illegible] ہے [illegible] کسی مسلم ملک کے [illegible] بالکل [illegible] O.I.C کا [illegible] سیاسی لیڈروں کی [illegible] باتیں بھی ہم نے بہت سنی ہیں مگر بوسنیا میں ان میں سے کسی چیز کا [illegible] اثر ہمیں نہیں نظر آیا۔ سربیائی لوگ [illegible] کر رہے ہیں [illegible]

سربیائی اپنے کو [illegible] سمجھتے ہیں جو ایک خاص مذہبی جنگ میں مسلمانوں کا [illegible] ماضی کا [illegible] رہی ہے۔ سربیائی لوگوں کا [illegible] کے اصل [illegible] کو ظاہر کرنے کیلئے بالکل کافی ہے۔ سب سے پہلی چیز جو کسی گاؤں میں [illegible] کی جاتی ہے وہ مسجد ہے۔ اس کے تمام نشانات [illegible] اہتمام سے بالکل مٹا دیے جاتے ہیں [illegible] تاکہ مسجد کی یاد بھی ذہن سے محو ہو جائے۔ مسجد کے بعد باری آتی ہے اس شخص کی جو "اسلام" کے [illegible] کہا جاتا ہے [illegible] گاؤں کا کوئی [illegible] شخص [illegible] "ترتیب" [illegible] مسلمان [illegible] میں ختم ہو گئے ہیں [illegible] عورتوں سے شادی بھی کر لیتے ہیں [illegible] اسلام کی [illegible] ہے۔

پروفیسر اکبر نے بوسنیا میں جو کچھ دیکھا اس سے ان کے ذہن میں دو سوال پیدا ہوئے، ایک تو وہ جو انھوں نے بی بی سی کے اس ٹی وی پروگرام میں جو یہاں [illegible] صفائی کے کچھ مناظر دکھانے کے بعد دنیا بھر کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے دنیا بھر کے لوگوں کے سامنے ان لفظوں میں رکھا تھا:

"To me these people are fellow Muslims. And from Muslim point of view they can be seen as victims of struggle that is happening, not just here in former Yugoslavia in many countries and in many different forms. And I ask is this another Crusade. The last Crusade?"

یہ سب میرے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور ایک مسلمان کی نظر میں یہ سب ایک ایسی جدوجہد کا شکار ہو رہے ہیں، جو صرف یہیں سابق یوگوسلاویہ ہی میں نہیں، بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں میں شکلوں کے تنوع(?) سے بہت فرق کے ساتھ رونما ہو رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ ایک نئی صلیبی جنگ ہے؟ آخری صلیبی جنگ؟

دوسرا سوال انھوں نے امت مسلمہ کے ضمیر کے سامنے رکھا ہے، وہ ضمیر ہے انھوں نے پہلے اپنے احساسات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ

"اس ادارے(?) المیہ میں امت کے طرز عمل کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھے ماضی کا یہ واقعہ بھی یاد آیا کہ ہماری سپین(?) کے اندر جو بعض عیسائی ملکوں میں رہنے والے [illegible] مسلمانوں نے اپنے ظلم و ستم کا جب کچھ اظہار کرنا چاہا تو وہاں کی عرب حکومتوں نے انہیں ہی گرفتار کرکے اور ان کے وعدے ختم(?) کرکے انہیں [illegible] تک بند کر دیا ___ مجھے چند دن پہلے کی ہوئی یہ بات بھی یاد آئی کہ ایک عرب شہزادے نے صرف ایک دن اور ایک رات کے عوض فرانس کی ایک پیشہ ور عورت کو تقریباً ایک لاکھ پونڈ کا نذرانہ پیش کیا۔ اس وقت مجھے یہ خیال آیا تھا کہ صرف اسی رقم سے بوسنیائی مسلمانوں کی جان بچائی جا سکتی تھی"

اور یہ سب سوچ کر جو سوال میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ

"قرآن آگاہ کر چکا ہے کہ اگر مسلمانوں نے اب مسلمانی کو بالکل ہی بھلا دیا تو وہ ان کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا ___ میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم اس حد تک پہنچ گئے ہیں، کیا واقعتاً ہم مسلمان کی حیثیت سے سوچنے اور اسی حیثیت سے کچھ قدم اٹھانے کی صلاحیت بالکل ہی کھو بیٹھے ہیں؟"

بانگ درا لکھنؤ، جولائی ۱۹۹۳ء

اختر راہی

وسطی ایشیا اور علامہ اقبال

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند[1]

عالم اسلام کی بدلتی ہوئی صورت حال پر نظر رکھنے والے علامہ اقبال کا مندرجہ بالا شعر اس حقیقت پر دال ہے کہ وہ اپنے پیغام کو برصغیر کی جغرافیائی حد بندیوں تک محدود نہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ان تمام خطوں نے ان کے پیغام سے ولولۂ تازہ حاصل کیا تھا، جو ان کے ذریعۂ اظہار — اردو و فارسی — سے آگاہ تھے۔ بخارا اور سمرقند جو کبھی تہذیب اسلامی کے اہم مرکز تھے، اپنی مرکزی حیثیت کی بدولت اپنے ہمسایہ خطوں — ایران، افغانستان اور برصغیر — کی علمی و ثقافتی زبان فارسی کے جاننے والوں سے کسی دور میں خالی نہ رہے۔ ان دنوں یہ شہر ازبکستان میں شامل ہیں اور گزشتہ ستر سال کے اشتراکی نظام کے تحت یہاں روسی زبان کو پروان چڑھایا گیا یا مقامی زبان کو ترقی دی گئی مگر آج بھی ان شہروں میں فارسی بولنے والے مل جاتے ہیں۔ تاہم وسطی ایشیا کی ریاست جو فارسی زبان و ادب کے حوالے سے سب سے اہم ہے، وہ تاجکستان ہے۔

ازبکستان اور تاجکستان میں فارسی زبان کے حوالے سے مطالعۂ اقبال سے دلچسپی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ آمرانہ دور اقتدار میں تو اس بات کی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ احیائے اسلام کے داعی اقبال کے پیغام کو من و عن عوام تک پہنچنے دیا جاتا یا پورے کلام اقبال کے تراجم شائع ہوتے۔ تاہم ازبک اور تاجک زبانوں کو وسطی ایشیا کی دوسری زبانوں پر فوقیت حاصل ہے کہ ان میں کلام اقبال کے منتخب حصوں کے ترجمے موجود ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں میر سعید میر شکر نے منتخب کلام اقبال کو تاجک زبان کا جامہ پہنایا اور چند سال بعد ۱۹۷۳ء میں منتخب اشعار اقبال کو ازبک زبان میں منتقل کیا گیا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ کلام اقبال کو وسطی ایشیا کی ریاستوں میں عام کیا جائے اور یہ پاکستان، ایران، افغانستان اور ان ریاستوں کے درمیان ثقافتی اور علمی رشتوں کو مضبوط کرنے کا باعث بنے گا۔ اقبالیات کے عالموں اور وسطی ایشیا کی زبانیں جاننے والوں اور اقبال دوستوں کو اس جانب توجہ دی جانی چاہیے۔

---

[1] علامہ اقبال کے افکار و خیالات کے حوالے سے یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ روس اور

وسطی ایشیا سے اقبال کی اولین دلچسپی ادب کے حوالے سے پیدا ہوئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ کے تعلیمی سفر کے دوران میں ان کی ملاقات ایک فرانسیسی پادری سے ہوئی جو بہت سی زبانیں جانتا تھا اور روسی زبان خوب بولتا تھا۔ علامہ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں۔[2]

"میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے میرے سوال پر نہایت حیرانی ظاہر کی اور پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کون ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ یہ شخص روسی زبان جانتا ہے اور کونٹ کے مشہور نام سے واقف نہیں ہے۔"

علامہ اقبال نے اپنے تشکیلی دور میں ادب و شعر اور فلسفہ کے حوالے سے مطالعہ کیا اور کونٹ ٹالسٹائی (۱۸۲۸ء۔۔۱۹۰۰ء) ان کی دلچسپی کا مرکز رہے۔

یورپ کے تعلیمی سفر سے واپسی کے بعد علامہ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، اس میں برصغیر اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی و علمی ترقی کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ وہ ایسی انجمنوں سے [illegible] رہے اور ان میں فعال کردار ادا کیا جو مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے لانے کے لیے کام کر رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسرارِ خودی نظم کی۔ ۱۹۱۵ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی تو تصوف کے حوالے سے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ علامہ نے اس عرصے میں تصوف پر غور و فکر اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا اور تصوف بالخصوص نقشبندی سلسلے کے مرکز وسطی ایشیا کے اہل علم و [illegible]ش سے ان کی دلچسپی پیدا ہوئی۔[3]

اس عرصے میں پہلی عالمی جنگ نے برصغیر کے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ ایک طرف اپنی سیاسی حیثیت میں وہ اس امر کے پابند تھے کہ برطانوی حکمرانوں کی تائید کریں مگر دینی حیثیت سے اُن کے دل ترک مسلمانوں کے ساتھ تھے، جنہیں وہ کسی صورت میں زک اٹھاتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ مسلمانانِ برصغیر نے یادداشتوں، بیانات اور تقریروں کے ذریعے اپنے حکمرانوں پر واضح کیا کہ ترکی کی خلافت اسلامیہ ان کے تصورِ زندگی میں ایک مقام رکھتی ہے اس لیے خلافت کے ادارے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ برطانوی حکمران زبانی طور پر اہل برصغیر سے وعدہ کر رہے تھے کہ ترکی کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور خلافت کا "مقدس" ادارہ محفوظ رہے گا مگر درپردہ برطانیہ نے اپنی حلیف استعماری طاقتوں کے ساتھ خفیہ معاہدات کر رکھے تھے کہ شکست کے بعد ترکی کا انجام کیا ہوگا اور ترکی کے کن حصوں پر کون قابض ہوگا۔

ابھی جنگ جاری تھی کہ روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہو گیا۔ انقلابیوں نے امن اور مجبور و مقہور قوموں کی خیر خواہی کا تاثر دیتے ہوئے استعماری روس کی پالیسیاں ترک کرنے کا اعلان کیا۔ زارِ روس

نے ایران کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا، وہ ایران کو واپس کر دیے گئے۔ استنبول پر ترکی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا اور ان خفیہ معاہدوں کو خفیہ نہ رہنے دیا گیا جو روس اور یورپ کی دوسری ترکی مخالف قوموں کے درمیان طے پائے تھے۔

مذکورہ بالا پس منظر میں استعمار مخالف مسلمانوں میں روسی کمیونسٹوں کے لیے کچھ اچھے جذبات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ علامہ اقبال نے بھی کمیونسٹوں کی بعض پالیسیوں اور کمیونزم کے بعض پہلوؤں کی تعریف کر دی تو کچھ لوگوں کے ہاں یہ مشہور ہو گیا کہ اقبال سوشلسٹ ہیں تاہم اقبال نے اپنی تحریروں اور اخباری بیانات کے ذریعے یہ تاثر ختم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کمیونسٹ / بالشویک ہیں۔ انھوں نے زور دے کر بتایا کہ وہ کسی "ازم" پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک بالشوزم کفر ہے۔

اشتراکی انقلاب سے پہلے مسلم وسطی ایشیا کی سیاسی صورت حال یہ تھی کہ روس نے ۱۸۶۰ء میں چار آزاد اور باہم دگر جنگ آزما ریاستوں — خیوا، فرغانہ، بخارا اور قازق — پر شدید حملے کر کے انھیں سرنگوں کر لیا تھا۔ قازق اور فرغانہ کو روس کا صوبہ بنا دیا گیا تاہم استعماری مصلحتوں کی خاطر بخارا اور خیوا کو زیر حمایت علاقوں کی حیثیت سے محدود خود مختاری دے دی گئی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں میں جدیدیت کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کا مقصد وسطی ایشیا (ترکستان) کی ثقافت اور معاشرتی زندگی کو از سر نو استوار کرنا تھا۔ اس تحریک نے وسطی ایشیا کے عوام میں اجتماعی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جدیدیت پسند رہنماؤں اور کارکنوں کا ایک طرف کمیونسٹ تحریک سے ربط و تعلق تھا جو روس میں زار کی استبدادی حکومت کے خاتمے کے لیے کوشاں تھی۔ دوسری طرف جدیدیت پسندوں کی سرگرمیوں کا ہدف فرغانہ اور قازق میں براہ راست روسی زار کی حکومت تھی اور خیوا و بخارا کے امیر جو زارِ روس کے حامی تھے۔ جدیدیت پسندوں اور روسی حکمرانوں اور ان کے حامیوں کے درمیان کشمکش جاری رہی جس میں جدیدیت پسندوں نے جانی ومالی قربانیاں دیں اور ایک حد تک عوامی سطح پر اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔

اشتراکی رہنماؤں — لینن اور سٹالن — کے دستخطوں سے "روسی انقلاب کا اعلان" جاری کیا گیا جس میں روس کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ان کا دین و ایمان، رسوم اور روایات محفوظ ہوں گی، اسی طرح ان کے دینی و ثقافتی اداروں کو کام کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ وہ قومی زندگی کی تعمیر اپنی روایات کے مطابق کر سکیں گے اور سوویت ریاست ان کی حفاظت اور تعظیم و تکریم کرے گی۔ تمام روسی اقوام کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ روسی قوموں کو حق خود اختیاری حاصل ہوگا اور اگر ان میں سے کوئی روس سے الگ ہو کر آزاد و خود مختار ریاست قائم کرنا چاہے تو اسے اس کی بھی آزادی حاصل ہوگی۔

روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد ایک طرف اشتراکی خیوا اور بخارا کی امارتوں کے مخالف تھے

اور دوسری طرف جدیدیت پسند پرانے نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ اس صورت میں پہلے کوکند کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور پھر امیر بخارا کو جو خزانہ سمیٹ کر افغانستان چلا گیا۔ بخارا کے سقوط کے بعد خیوا بھی اشتراکی فوج کے کنٹرول میں آگیا۔ اس کے بعد تاجکستان میں اشتراکی فوج اور مقامی آبادی کے درمیان ٹکراؤ جاری رہا جو بڑی حد تک ۱۹۲۴ء میں ختم ہوا۔ اگرچہ اس کے سات آٹھ سال بعد تک ٹکراؤ کی اکا دکا خبریں آتی رہی تھیں۔

انقلاب کے بعد اشتراکی قیادت اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے درمیان تصادم اور تعاون کا جو سلسلہ جاری تھا، اس میں مختلف گروہ اپنے اپنے مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ وسطی ایشیا کی سابق مسلمان قیادت اپنے طرز عمل کی وجہ سے جدیدیت پسندوں کے لیے قابل قبول نہ تھی، جدیدیت پسند اس سے تعاون کرنے کو تیار نہ تھے اور جب اشتراکی فوج نے خیوا اور بخارا کے خلاف اقدام کیا تو جدیدیت پسند اشتراکی فوج کے خیر خواہ تھے۔ روایت پسند مسلمان قیادت کے لیے اشتراکیوں کے خلاف لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، مگر اس کے لیے بہت زیادہ عرصہ مزاحمت کرنا مشکل تھا۔ بہرحال جدیدیت پسند اشتراکی فوج کی اس لیے حمایت نہیں کر رہے تھے کہ وہ اشتراکیت پر ایمان لائے ہوئے تھے بلکہ وہ تو انقلاب روس کے اعلان کے سہرے الفاظ کے تحت اپنی آزادی اور جدید معاشرے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جب اشتراکی قدیم رسم قیادت کی مزاحمت ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو جدیدیت پسند اس پوزیشن میں نہ تھے کہ اشتراکیوں کو دیس نکالا دے سکتے اور یوں اعلیٰ آدرش کے خواب کے باوجود انہیں نہایت بھیانک تعبیر دیکھنی پڑی۔

۱۰ جون ۱۹۲۰ء کے ایک خط میں اقبال نے وسطی ایشیا کی صورت حال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا۔[۵]

وسطِ ایشیا کی ہانڈی ابل رہی ہے۔ خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے۔

تا روید لالۂ آتش نژاد از خاکِ شام
باز سیرابش زخونابِ مسلماں کردہ اند

کونٹ ٹالسٹائی — کا خیال تھا کہ لالۂ آتش نژاد منگولین قوم سے پیدا ہو گا اور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس کا عروج یا ظہور کب ہو گا اور وہ اس وقت روس میں ہے یا وسط ایشیا میں یا شام میں

بحرانی کیفیت میں اقبال کسی مردے از غیب کے ظاہر ہونے کی بات کر رہے تھے۔ مگر اس لالۂ آتش نژاد کا حوالہ انھوں نے ٹالسٹائی سے لیا جس سے وہ اپنے ابتدائی دورِ زندگی میں واقف ہوئے تھے۔

اشتراکی انقلاب سے جن مسلمان رہنماؤں نے بہت زیادہ توقعات وابستہ[۷] کی تھیں، ان میں
ے ایک مفتی عالم جان بارودی بھی تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ان کا انتقال ہوا تو مسلم اوٹ لُک (لندن) نے ان
ے کچھ حالات شائع کیے۔ علامہ اقبال ان کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش رکھتے تھے مگر اس سے
ر کہ وہ سید سلیمان ندوی جیسے اہل علم و قلم سے درخواست کرتے کہ وہ مفتی عالم جان بارودی کے بارے
ں کوئی مقالہ لکھیں، انہیں ماہ مئی ۱۹۲۲ء کا "معارف" موصول ہوا جس میں سید سلیمان ندوی کا مقالہ
ماۓ روس"[۹] شامل تھا۔ اس مقالے کے پڑھنے پر انھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ"

"آج کے "معارف" میں میری آرزو سے بڑھ کر مضمون لکھا گیا (جزاک اللہ) معارف کا
ایڈیٹر صاحب کشف نہ ہوگا تو اور کون ہوگا۔ حال کے روسی علماء کی بعض تصانیف اسلام
کے متعلق اگر دستیاب ہو جائیں تو ان کا ترجمہ ہندوستان میں شائع ہونا چاہیے۔"

ا ۱۹۲۲ء[۸] میں علامہ نے پروفیسر محمد اکبر منیر کو (جو ایران میں مقیم تھے) وسطی ایشیا کے حوالے
ے لکھا۔[۹]

"مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے
اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے۔ مسلمانانِ ایشیا اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ میرا
مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلالِ اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔"

علمائے روس اور بالخصوص مفتی عالم جان بارودی کے افکار سے علامہ اقبال کی دلچسپی کافی دیر قائم
ہی۔ تقریباً دو سال بعد ایک اور خط میں انھوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا۔[۱۰]

"کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کے حالات کی اشاعت
ہوئی تھی اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے۔ مفتی عالم جان کا حال میں انتقال
ہو گیا ہے، ان کی تحریک کی غایت کیا تھی؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس
کا مقصد ایک مذہبی انقلاب بھی تھا؟"

۱۹۲۴ء اور اس کے بعد "خطبات" کے سلسلے میں علامہ کو مسلم مصلحین کے افکار جاننے کی مسلسل
ش رہی تاہم ۱۹۳۱ء میں انہیں دوسری گول میز کانفرنس (لندن) [illegible] دسمبر ۱۹۳۱ء) میں شرکت
ے لیے لندن کا سفر کرنا پڑا۔ واپسی پر فلسطین میں مؤتمر عالم اسلامی میں شریک ہوئے۔ اس سفر میں
ی وسطی ایشیا کے مسلمان رہنماؤں سے ملاقات کا بھی موقع ملا۔ جن دنوں لندن میں مقیم تھے، رؤف
، اور سعید شامل ملاقات کے لیے آتے رہے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو پہلی ملاقات ہوئی جس کے بعد دو
ا تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔

غازی رؤف بے (۱۸۸۱ء - ۱۹۶۰ء) ترکی کی بحریہ سے متعلق افسر تھے۔ انھوں نے جنگ
بلس (۱۹۱۲ء) کے دوران میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ پہلی عالمی جنگ میں مصطفیٰ کمال

اتاترک کے قریبی ساتھی کی حیثیت سے کام کیا تھا مگر قومی حکومت بننے پر مصطفیٰ کمال سے ان کے اختلافات پیدا ہوگئے اور وہ ملک چھوڑ کر فرانس چلے گئے تھے۔ اوائل ۱۹۳۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں لیکچرز کے لیے آئے تھے۔ جب مصطفیٰ کمال نے جملہ جلاوطن ترک رہنماؤں کو وطن واپس آنے کی دعوت دی تو وہ بھی ترکی چلے گئے تھے۔ غازی رؤف یوں تو ترکی میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کے اجداد کا تعلق شمالی قفقاز سے تھا۔

علامہ اقبال کے دوسرے ملاقاتی سعید شامل، قفقاز کے معروف مجاہد امام شامل کے پوتے تھے اور اشتراکی انقلاب کے بعد اپنے وطن کی آزادی کے لیے یورپ میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے برطانیہ، فرانس اور دوسرے ملکوں کے دارالحکومتوں میں اہم افراد سے ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔

علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں میں سعید شامل نے شمالی قفقاز کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی پر روشنی ڈالی اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ انھوں نے اشتراکی قیادت پر اعتماد کر کے غلطی کی۔ اشتراکی قیادت نے ابتداء میں وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی آزادی کے حق میں ہے مگر جب اشتراکی قوت پکڑ گئے تو انھوں نے مسلمان علاقوں کو سوویت جمہوریتوں کی شکل دے دی۔

دوران گفتگو میں اشتراکیت زیر بحث آگئی۔ سعید شامل نے اس طرز زندگی کی شدید مخالفت کی مگر علامہ اقبال کو اس میں یورپی امپریلزم کی تباہی کا ایک عنصر محسوس ہوتا تھا۔"

یورپ سے واپسی پر اقبال موتمر عالم اسلامی کے اجلاس منعقدہ بیت المقدس (۶ دسمبر-۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء) میں شریک ہوئے۔ موتمر میں روس اور وسطی ایشیا کے مسلمان نمائندوں میں سعید شامل، علامہ موسیٰ جاراللہ اور حیاض اسحاقی شامل تھے۔ ان حضرات نے "

"بالشویک حکومت کے ظلم و ستم کی داستانیں سنائیں اور موتمر کے نمائندوں کو بتایا کہ مسلمان کس طرح اشتراکیت کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ ان کی بستیوں کا صفایا کیا جا رہا تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے ہر ہر نقش کو مٹو کیا جا رہا تھا۔ مسجدوں میں تالے ڈال دیے گئے تھے۔ مدرسوں کی بڑی تعداد بند ہو چکی تھی۔ غرض روسی مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت کو مختلف قومیتوں میں تقسیم کر کے انھیں کچلا جا رہا تھا۔"

موتمر عالم اسلامی میں شرکت سے علامہ اقبال کو وسطی ایشیا کے مسلمان رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا جو وسطی ایشیا سے ان کی دلچسپی میں اضافہ کا باعث بنا۔

مارچ ۱۹۳۳ء میں جب غازی رؤف بے جامعہ ملیہ دہلی تشریف لائے تو ان کی ایک تقریر کے موقع پر علامہ اقبال صدر جلسہ تھے۔ علامہ کے قیام دہلی کے دوران میں اسد ملتانی (م ۱۹۵۹ء) ان سے ملے۔ اسد ملتانی نے علامہ کی مجلس میں جو گفتگو ہوئی، اس کے نوٹس تیار کیے ہیں۔ علامہ نے ایک موقع

پر کھا کہ پچھلی چند صدیوں میں اسلام کا زمانۂ انحطاط رہا ہے اس لیے اعلیٰ شخصیتیں بہت وقفے کے بعد پیدا ہوئیں مگر کچھ عرصے سے رنگ بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اعلیٰ ہستیاں پے در پے پیدا ہو رہی ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں جن ہستیوں کا نام لیا ہے، ان میں مفتی عالم جان بارودی شامل تھے۔[۱۳]

جنوری ۱۹۳۵ء میں "بالِ جبریل" شائع ہوئی تو اس میں روس اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار اور ان کی خواہشات کو "تاتاری کا خواب" میں یوں پیش کیا گیا۔[۱۴]

کہیں سجادہ و عمامہ رہزن   کہیں ترسا بچوں کی چشم بے باک
ردائے دین و ملت پارہ پارہ   قبائے ملک و دولت چاک در چاک
مرا ایماں تو ہے باقی، و لیکن   نہ کھا جائے کہیں شعلے کو خاشاک
ہوائے تند کی موجوں میں محصور   سمرقند و بخارا کی کفِ خاک

بگردا گرد خود چندانکہ بینم
بلا انگشتری و من نگینم

یکایک ہل گئی خاکِ سمرقند   اٹھا تیمور کی تربت سے اک نور
شفق آمیز تھی اس کی سفیدی   صدا آئی کہ "میں ہوں روحِ تیمور
اگر محصور ہیں مردانِ تاتار   نہیں اللہ کی تقدیر محصور
تقاضا زندگی کا کیا یہی ہے   کہ تورانی ہو تورانی سے مہجور؟

خودی را سوز و تابے دیگرے دہ
جہاں را انقلابے دیگرے دہ"

موتمر عالم اسلامی کے دوران میں علامہ اقبال کے ساتھ علامہ موسیٰ جار اللہ بھی شریک تھے۔ ۱۹۳۶ء میں علامہ کو ان کی تالیف "الوشیعہ" دیکھنے کا موقع ملا۔ سید سلیمان ندوی کو اس کی اطلاع یوں دی ہے۔[۱۵]

"موسیٰ جار اللہ کو آپ کو جانتے ہوں گے۔ انھوں نے حال میں ایک کتاب عقائدِ شیعہ پر شائع کی ہے۔ اس میں بعض لطائف ہیں جو بہت جاذبِ توجہ ہیں۔"

دوسرے خط میں موسیٰ جار اللہ کی کتاب کے ناشر کا پتہ لکھا ہے اور کتاب پر دوبارہ مختصراً تبصرہ کیا ہے کہ[۱۶]

"موسیٰ جار اللہ کی کتاب نہایت عمدہ ہے۔"

علامہ جن دنوں یہ خطوط لکھ رہے تھے ان کی خرابیٔ صحت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ مطالعہ چھوٹتا جا رہا تھا اور لکھنے پڑھنے کا کام کم ہوتا جا رہا تھا۔ تاہم یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو انھوں نے سالِ نو کا جو پیغام دیا، کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ پیغام میں وہ لکھتے ہیں۔[۱۷]

ب زمان و مکان کی تمام پہنایاں سمٹ رہی ہیں ـــــ لیکن تمام ترقی کے باوجود ... زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ ہمیں نئے سال کی ابتدا اس دعا کے ساتھ کرنی چاہیے کہ خداوند کریم حاکموں کو انسانیت اور نوعِ انسان کی محبت عطا فرمائے۔"

حواشی

۱۔ اقبال، ضربِ کلیم، لاہور: شیخ مبارک علی تاجر کتب (۱۹۴۴ء)، ص ۱۵

۲۔ سید عبدالواحد معینی، مقالاتِ اقبال، لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب (۱۹۶۳ء)، ص ۴۷

۳۔ علامہ اقبال اس دور میں تصوفِ اسلام پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے جو مکمل نہ ہو سکی تاہم اس کتاب کے خاکے اور اشارات میں علاء الدولہ سمنانی اور خواجہ محمد [پارسا] کے حوالے موجود ہیں۔ دیکھیے: صابر کلوروی (مرتب)، تاریخِ تصوف، لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت (۱۹۸۵ء)، ص ۷۲ اور ص ۳۱

۴۔ ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ زمیندار (لاہور) میں علامہ کا ایک خط شائع ہوا جس میں انھوں نے مدیر کو لکھا کہ

"میں نے ابھی ایک اور دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے، اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔" [محمد رفیق افضل، گفتارِ اقبال، لاہور: ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہ پنجاب (۱۹۶۹ء)، ص ۶]

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوعِ انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے ـــــ" [مکتوب بنام آل احمد سرور مکتوبہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء، شیخ عطاءاللہ، اقبال نامہ، لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب (۱۹۵۱ء)، جلد دوم، ص ۳۱۴]

اشتراکیت اور علامہ اقبال کے حوالے سے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے: نعیم صدیقی، اقبال، مغربی مادیت اور سوشلزم، لاہور: دارالفکر (۱۹۶۹ء)، ڈاکٹر ایس اے رحمان، Iqbaland Socialism، کراچی: ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (۱۹۷۴ء)

۵- اقبال، مکاتیبِ اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، لاہور: بزمِ اقبال (۱۹۵۴ء)، ص ۳۳

۶- زیرِ نظر شمارے میں یہ مقالہ بن و عن نقل کیا جا رہا ہے۔

۷- اختر راہی، اقبال: سید سلیمان ندوی کی نظر میں، لاہور: بزمِ اقبال (۱۹۷۸ء)، ص ۱۲۳-۱۲۴

۸- علامہ کے اس مکتوب پر کوئی تاریخ درج نہیں مگر اس میں "خضرِ راہ" کی تکمیل اور "پیامِ مشرق" کے قریب الاختتام ہونے کا ذکر ہے۔ "خضرِ راہ" انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ (۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء) میں پڑھی گئی تھی اور "پیامِ مشرق" اس وقت زیرِ تالیف تھی۔ اس لیے یہ مکتوب وسط ۱۹۲۲ء میں کسی وقت لکھا گیا ہوگا۔

۹- شیخ عطاء اللہ (مرتب)، اقبال نامہ، حوالہ مذکورہ، ص ۱۲۳

۱۰- اختر راہی، حوالہ مذکورہ، ص ۱۷۱-۱۷۲

۱۱- تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد حمزہ فاروقی، سفرنامۂ اقبال، کراچی: مکتبہ معیار (۱۹۷۳ء)، ص ۳۴-۳۵

۱۲- ایضاً، ص ۱۷۰-۱۷۱

۱۳- اختر راہی، اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق، سہ ماہی "اقبال" (لاہور)، اپریل ۱۹۷۶ء، ص ۸۲

۱۴- اقبال، بالِ جبریل، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز (س-ن)، ص ۳۹

بالِ جبریل کی اشاعت پر پروفیسر آل احمد سرور (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے علامہ اقبال کو ایک خط ارسال کیا جس میں "اشتراکیت اور فاشزم کے متعلق ان کی رائے دریافت کی تھی۔ دوسرے بعض نظموں میں جو تضاد نظر آتا تھا، اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ تیسرے خاص طور پر بالِ جبریل میں سولینی پر جو نظم ہے، اس پر اعتراض کیا تھا اور اس کا مقابلہ ضربِ کلیم کی نظموں سے کر کے دونوں کا فرق ظاہر کیا تھا۔ اس سلسلے میں تیموریت، چنگیزیت اور خمینی کے تصورات پر کچھ بحث تھی۔" [آل احمد سرور، اقبال کا ایک خط، ماہنامہ ماہِ نو (کراچی)، اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۳۴]۔ "تیموریت" کے حوالے سے بالِ جبریل کی نظم "تاتاری کا خواب" کی جانب اشارہ ہے۔

علامہ نے واضح کیا:

> "آپ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیکچرر ہیں۔ اس واسطے مجھے یقین ہے کہ لٹریچر کے اسالیبِ بیان سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ تیمور کی روح کو اپیل کرنے سے تیموریت کا زندہ کرنا مقصود نہیں بلکہ وسط ایشیا کے ترکوں کو بیدار کرنا مقصود ہے۔ تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوبِ بیان ہے۔" [شیخ عطاء اللہ، حوالہ مذکورہ، ص ۳۱۵]

۱۵- اختر راہی، اقبال: سید سلیمان ندوی کی نظر میں، حوالہ مذکورہ، ص ۲۲۸

۱۶- ایضاً، ص ۲۳۰

۱۷- نقوش (لاہور)، اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۴

(اقبال، لاہور، جولائی ۱۹۹۳ء)

کٹر بشیر سیفی

نئے پاکستانی افسانہ نگار

نئے پاکستانی افسانے سے صرف وہی افسانہ مراد نہیں جسے بالعموم علامتی افسانے سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ میری رائے میں ۱۹۶۰ء کے بعد لکھے جانے والے وہ سب افسانے نئے افسانے کے ذیل میں آتے ہیں جو نئے معاشرتی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل کو فنی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کیونکہ نیاپن محض علامت و تجرید سے مخصوص نہیں کہ علامت و تجرید کا اظہار ایک وسیلہ ہیں مقصود بالذات نہیں۔

اردو ادب اور بالخصوص افسانے میں علامت کی ترویج کا ایک سبب ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء بتایا جاتا ہے جب سیاست و صحافت کے میدان میں آزادیٔ اظہار پر قدغنیں لگا دی گئی تھیں مگر میرے خیال میں یہ درست نہیں کیونکہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے سیاستدانوں اور صحافیوں پر تو پابندیاں عائد کیں مگر خالص ادب اور ادیبوں سے کوئی تعرض نہیں کیا اولاً شاید اس لئے کہ ایوب خان کو ادب کی محدودیت کا علم تھا اور ثانیاً اس لئے کہ قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی اور ابن انشاء وغیرہ نے تقریباً تمام قابل ذکر اہل قلم کو "رائٹرز گلڈ" کی تنظیم میں شامل کر لیا تھا البتہ یہ ان چند ادیبوں کا مسئلہ ہو سکتا ہے جو رائٹرز گلڈ سے متفق نہیں تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس نمایاں ہونے والے بیشتر لکھنے والے علامتی انداز اختیار کئے ہوئے تھے نیز جس دور میں پاکستان میں علامتی افسانے کا آغاز ہوا تقریباً اسی زمانے میں بھارت میں بھی علامتی افسانے کا چرچا ہوا حالانکہ وہاں مارشل لاء جیسے حالات نہیں تھے لہذا علامت کو مارشل لاء سے منسلک کرنا ایک ایسا مغالطہ ہے جسے اب دور ہو جانا چاہیئے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ علامتی افسانہ ترقی پسندوں کی راست حقیقت نگاری اور مقصدیت کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ اس خیال میں جزوی صداقت تو ہے مگر کلیتاً اسے قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جب علامت نگاری کا رجحان پیدا ہوا اس وقت ادبی منظر نامے پر سماجی حقیقت نگار مثلاً کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے ساتھ ساتھ ممتاز مفتی، آغا بابر، غلام عباس، میرزا ادیب، بلونت سنگھ اور اشفاق احمد جیسے افسانہ نگار بھی موجود تھے لہذا یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہو گا کہ اردو افسانہ میں علامت کا استعمال دراصل مغربی ادب کی علامتی تحریک سے آگاہی کے علاوہ، اظہار و بیان کے نئے امکانات دریافت کرنے کی خواہش کا نتیجہ تھا کیونکہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی

احمد ندیم قاسمی اور ممتاز مفتی ایسے افسانہ نگاروں کی موجودگی میں مروجہ افسانے کے حصار کو توڑ کر تجریدی افسانے میں نام پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ یوں نئی نسل کے افسانہ نگار راست انداز بیان کے بجائے علامتی انداز اپنانے کی طرف مائل ہوئے اور بعض تو اس رو میں اتنا آگے نکل گئے کہ قاری سے ان کا رشتہ ہی منقطع ہو گیا اور علامت ایسا گورکھ دھندا بن گئی جس کی توضیح و تعبیر قاری تو قاری ناقد کے بس کی بات بھی نہ رہی۔ ان کی دیکھا دیکھی بعض ایسے نوواردان ادب نے جو نہ صرف افسانے کی فنی روایت سے نابلد تھے بلکہ علامت و تجرید کے فرق سے بھی آگاہ نہ تھے، افسانے کے نام پر بے معنویت کی گرد بھی اڑائی مگر ایسا تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اس لئے سارے علامتی افسانے کو مطعون کرنا مناسب نہیں۔

اردو ادب میں علامت کے استعمال کا سراغ بہت دور تک لگایا جا سکتا ہے کیونکہ استعارہ کے علاوہ تمثیل ALLEGORY بھی علامت کی ابتدائی صورتیں ہیں اور اردو کے قدیم ادب کا دامن استعارہ و تمثیل کی دولت سے مالا مال ہے لیکن دور جدید میں علامت کا جو مفہوم متعین ہوا ہے اس کے مطابق احمد علی اور کرشن چندر کو علامتی افسانے کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے آخری دور کے دو ایک افسانوں میں بھی علامتی انداز موجود ہے لہٰذا یہ مفروضہ بھی باطل ہو جاتا ہے کہ علامت محض نئی نسل کا طرۂ امتیاز ہے تاہم پاکستان میں علامتی افسانے کا باقاعدہ آغاز انتظار حسین اور انور سجاد سے منسوب ہے جبکہ بھارت میں بلراج مینرا اور سریندر پرکاش علامتی افسانہ نگاروں کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں۔

انتظار حسین کا تعلق چونکہ افسانے کی کلاسیکی روایت سے ہے اس لئے انہوں نے اپنی علامات قدیم داستانوں اور تاریخی و تہذیبی اساطیر سے اخذ کیں جو نامانوس اور ناقابل فہم نہیں چنانچہ انہیں اس ردعمل کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس سے انور سجاد اور بعض دوسرے علامتی افسانہ نگار دوچار ہوئے۔ ان کے موضوعات کا دائرہ اگرچہ وسیع ہے جس میں تصوف تک شامل ہے مگر ماضی کی بازیافت ان کی خصوصی پہچان ہے چنانچہ ہجرت سے پیدا ہونے والی ذہنی بے چینی اور ایک خاص تہذیب سے انقطاع کا دکھ ان کا بنیادی المیہ بنتا ہے۔ 'بشیر انور' نے ان کے افسانوں میں ابھرنے والے کرب کو دوسری ہجرت کے ساتھ منسلک کر کے اس المیے کو بطرز دگر نمایاں کیا ہے۔ ان کے افسانوں کو جو چیز اردو ادب سے منسلک کرتی ہے وہ خوف، مایوسی اور تشکیک کے وہ عناصر ہیں جو عہد حاضر کی علامتیں ہیں۔ ان کے افسانے آخری آدمی، زرد کتا، کایا کلپ، [illegible] لوگ اور وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے وغیرہ جدید کلاسیک کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اسلوب، ہیئت اور موضوعات کے تنوع کے سبب وہ بلاشبہ دور جدید کے نمائندہ افسانہ نگار قرار پاتے ہیں۔

انور سجاد کا نام بھی انتظار حسین کے ساتھ ہی لیا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ علامتی انداز انتظار حسین کے بعد انہی کے افسانوں سے عام ہوا ورنہ موضوع اور پیش کش کے لحاظ سے وہ انتظار حسین سے خاصے مختلف ہیں۔ ان کے موضوعات ماضی کے بجائے حال سے تعلق رکھتے ہیں اور غالباً اسی لئے انہوں نے اپنے ایک مجموعے کا نام ہی "آج" رکھا ہے نیز ان کی علامات بھی مختلف اور پیچیدہ ہیں جن کی تفہیم میں خاصی دشواری پیش آتی ہے اور بعض اوقات حقیقت شناسی کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "گائے" ان کے ابتدائی دور کا افسانہ ہونے کے باوجود ان کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتا ہے کہ اس میں کہانی علامت و تجرید کے جنگل میں گم نہیں ہوتی بلکہ قاری کو اپنی ذہنی استعداد کے مطابق نتیجہ اخذ کرنے پر مائل کرتی ہے۔ مجموعی طور پر انور سجاد نے کہانی سے زیادہ خیال اور تاثر کو اہمیت دی ہے اور ہیئت و اسلوب کے نت نئے تجربوں کے علاوہ جنسی امیجز کے استعمال کی طرف [illegible] یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے موضوع، پیش کش اور اسلوب ہر لحاظ سے تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ یوسف کھو اور "کونپل" ان کے کامیاب

افسانوں میں سے ہیں۔

انتظار حسین اور انور سجاد کے بعد جن لوگوں نے علامتی افسانے میں نام پیدا کیا ان میں خالدہ حسین، مسعود اشعر، رشید امجد، منشا یاد، احمد ہمیش، سعید محمد خان اور سلطان الاسلام کے علاوہ آغا سہیل، مرزا حامد بیگ، مرتضیٰ صدیقی اور ابراہیم عطیٰ کے نام شامل ہیں۔ اعجاز راہی، سمیع آہوجہ، عابدہ حنا، نیلم درانی، طاہرہ ذکا الرحمٰن، سعیدہ گزدر، افسر آذر، شمس نغمان اور نجم الحسن رضوی وغیرہ کا تعلق بھی تھوڑے سے بہت فرق کے ساتھ اسی گروپ سے رہا ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں کی پراسرار فضا اول سے آخر تک قاری کی توجہ جذب کئے رکھتی ہے لیکن ان کا افسانہ داستانوی عہد سے بھی جڑا ہوا ہے مگر حزنیت اور علامتی اسلوب کے حوالے سے ان کے افسانے روح عصر سے منسلک رہے ہیں۔ ان کی یہ خوبی بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی کہانیاں بظاہر سماجی حقیقت نگاری سے شروع ہوتی ہیں مگر جوں جوں پرتیں کھلتی ہیں ان میں ماورائیت اور تہہ داری آتی چلی جاتی ہے اور چونکہ وہ کہانی کا بنیادی مواد اردگرد کی زندگی سے حاصل کرتی ہیں اس لئے ان کی کہانیاں سماجی و سیاسی حقائق ہی کی نئی معنوی تعبیر پیش کرتی ہیں۔ سایہ، گجر بار، مکڑا اور ابہام وجود وغیرہ اس انداز کی مثالیں ہیں۔ ہزار پایہ، سواری اور ایک دلچسپ ناشتہ ان کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

نئے علامتی افسانے میں شعری اسلوب کی مثالیں یوں تو انور سجاد، خالدہ حسین اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی ملتی ہیں مگر رشید امجد نے شعری اسلوب کے استعمال میں جس تخلیقی ایچ کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف انہی سے مخصوص ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت اتنی منفرد اور انوکھی ہے کہ دور سے پہچانی جاتی ہے۔ حزنیت کے علاوہ ان کے افسانوں کا وصف خاص تجسیم ہے۔ ان کے افسانوں کی اشیاء ہی نہیں بلکہ حسیات تک سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے اگرچہ جنسی تشنگی اور معاشی آسودگی کے لیے تخلیقی اظہار ہیں مگر بعد کے افسانوں میں ابھرنے والے حیات و کائنات کے مسائل کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "دھوپ چھاؤں ہوا" اور "سمندر مجھے بلاتا ہے" میں بھی یہ رویہ نمایاں ہے۔ ان کا مجموعہ "سہ پہر کی خزاں" ایک خاص دور کے سیاسی مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رشید امجد کا افسانہ نگاری اپنے دور کے سیاسی و سماجی اور معاشی صورت حال کی ہی صورت گری کی ہے اور نئے رجحانات کا نقیب بھی۔ نیز وہ ایک ایسے صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ بیپ پوسٹ، قطرہ سمندر قطرہ، تماشا عکس تماشا، گملے میں اُگا شہر، اور دھوپ چھاؤں ہوا ان کے اہم افسانوں میں سے ہیں۔

منشا یاد ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ایک مدت تک علامتی اسلوب کو قابل اعتنا نہیں کہا اور جب علامت کی طرف مائل ہوئے تو بھی کہانی کا دامن نہ چھوڑا نتیجہ ان کے قارئین کا حلقہ وسیع رہا ہے۔ ان کے افسانے پنجاب کے اس دیہاتی کلچر کی عکاسی کرتے ہیں جو پھیلتے ہوئے شہروں کی وسعت میں دھیرے دھیرے اپنی پہچان کھو رہا ہے شاید اسی لئے وہ ایسے افسانوں میں مخصوص دیہاتی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں اس مقصد کے لیے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں جو اس مخصوص کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یوں ان کی کہانی کی جڑیں زمین ہی میں پیوست رہتی ہیں اور بظاہر انہونی باتیں بھی حقیقت معلوم ہونے لگتی ہیں یہی ان کا تخلیقی معجزہ ہے۔ منشا یاد کی بیشتر کہانیاں اگرچہ دیہاتی پس منظر میں ہیں مگر انہوں نے خود کو دیہات تک محدود نہیں رہنے دیا اور شہری زندگی بالخصوص ملازم پیشہ حضرات کی ذہنی کیفیات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے "افقد ظالم" اس انداز کا بھرپور افسانہ ہے۔ یوں ان کے اسلوب کی طرح ان کے موضوعات بھی محدود نہیں کہ انہوں نے زندگی کو ایک اکائی کے طور پر دیکھا اور دکھایا ہے۔

اور جیش ہے جو افسانے میں اپنا نظریہ گزرے ہیں ان کی کاوشیں ہیں۔ وہ ایسے افسانہ نگار نظر آتے ہیں جو زندگی کے حقائق کو کہہ سی حد تک غیر تخلیقی انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کہانی پڑھتے ہوئے ایک شعوری تجابل عارفانہ پیدا ہوتا ہے۔ بلاؤ کا اندر ۔ ی کی نمایاں مثال ہے جس میں ملکی کی خلافت کے حوالے بات کی گئی ہے۔ ان کی زبان بھی کچھ اکھڑی اکھڑی سی ہے علاوہ ازیں شاعرانہ ۔ ری اسلوب کی توقع سب جانتے تھے چنانچہ ان کے افسانے پڑھتے ہوئے قاری ان جمالیاتی عناصر سے محروم رہتا ہے جو فن پارے کے مطالعے سے حا ہونا چاہیئے شاید اسی لئے ان کے قارئین کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں اور ذکی کے طرز پر ان کی افسانہ نگاری کا نقاد بھی نہیں ہے۔

رشید امجد کی طرح مظہر الاسلام کا اسلوب بھی شعریت سے مملو ہے لیکن انہوں نے جو شعوری استعاراتی نظام خلق کیا ہے وہ خاص ان کا اپنا ہے بلکہ انہوں نے محض شعریت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تشبیہ و استعارہ کے تخلیقی امکانات دریافت کرنے کی سعی بھی کی ہے جس سے ان کا وہ اسلوب ابھر سکا جو انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے موضوعات معاصر سیاسی، سماجی اور معاشی اخلاقی جبر کا تخلیقی اظہار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا المیہ کا عنصر خاصا قوی ہے حتی کہ ان کی رومانی کہانیوں کا کرب کا آغاز بھی خوشی کے لمحات میں ہوتا ہے، زندگی کے ستم جبر سے فکر کر یہ نتیجہ ہوتی ہیں تاہم اس کے باوجود ان کے ہاں زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے کا رویہ نظر آتا ہے جو ان کی تخلیقی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ گوندنی شہر میں ایک آدمی، گھوڑوں کے خواب، لمحات کنارا وغیرہ ان کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔

اسد محمد خان کا شمار بھی منفرد افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے گو کہ کم افسانے لکھے ہیں مگر اس کے باوجود ان کا بیت مسلم ہے انہوں نے تاریخی تلمیحات کو جدید عصری مسائل کے اظہار کے لئے بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا ہے۔ موجودہ صورتحال سے عدم اطمینان نے ان کے ہاں طنز کو بھی ابھارا ہے جو ناگوار کو بجز ماحول کا اظہار کرنے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن در حقیقت اسی خواہش کا تخلیقی روپ ہے جس کا تعلق معاشرے کی صحت مند اقدار کے فروغ سے ہے۔ باسودے کی مریم اور مئی دادا ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

آغا سہیل، فرحت صدیقی اور فہیم اعظمی اگرچہ نسبتاً سینئر لکھنے والے ہیں مگر چونکہ افسانے کے حوالے سے ان کی شناخت ۱۹۶۰ء کے بعد کی بات ہے اس لئے انہیں اسی دور کے افسانہ نگار سمجھنا چاہیئے۔

آغا سہیل چونکہ حقیقت نگاری کے بعد علامت کی طرف مائل ہوئے اور افسانے کی روایت سے بخوبی واقف ہیں اس لئے ان کی علامت متوازن اور قابل فہم ہیں۔ انہوں نے داستانی تلمیحات، بائبل اور اسلامی استعاروں کے حوالے سے اپنے دور کے جبر کی موثر عکاسی کی ہے ن الملک الیوم۔ دابۃ الارض اور تیسرا اس انداز کی کامیاب مثالیں ہیں۔ "ذلیخا بچہ کو" بھی ان کے تاریخی و تہذیبی شعور کا مظہر ہے۔ ان کے دو تین افسانوی مجموعے "تل بابا آسمان" کے بیشتر افسانے اس کرب کو نمایاں کرتے ہیں جو منافقت زدہ معاشرے میں رہنے والے بے لوث کر سادہ آدمی استعداد ہوتے ہیں۔

فرحت صدیقی کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے بیانیہ کے تخلیقی امکانات کو روشن کے بغیر علامتی اسلوب سے بھی کام لیا انہوں نے کامیاب بیانیہ افسانے بھی لکھے اور "باہر کھوئے پاؤں" میں علامت کو بھی بخوبی برتا بلکہ میری رائے میں تو "باہر کھوئے پاؤں" اردو کے چند اہم علامتی افسانوں میں سے ایک ہے۔ ان کے افسانے ان کے گہرے مطالعہ اور تہذیبی شعور کے بھی آئینہ دار ہیں۔ اسی سلسلے میں سوسکے پاؤں قابل ذکر ہے جس میں اپنی مٹی سے وابستگی اور طبقاتی استحصال کو فنکارانہ مہارت سے اجاگر کیا گیا ہے۔ فرحت صدیقی کا مطالعہ چونکہ وسیع ہے اس لئے کہیں کہیں ان کا اسلوب علمی انداز بھی اختیار کر جاتا ہے۔ "ہم نشیں کا عذاب" اس اسلوب کی واضح مثال ہے۔ شاید ایسا اس لئے بھی ہوا کہ یہ افسانہ

بنیادی طور پر کرداروں کے نفسیاتی مطالعہ پر مبنی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانے کرداری ہیں اور انہوں نے کرداروں کی نفسیات اور جنسی میلانات کو بڑی مشاقی اور ہنرمندی سے بیان کیا ہے اور یہی ان کی کامیابی ہے۔

نیلم احمد اگرچہ بطور افسانہ نگار خاصی دیر میں متعارف ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصے میں دو افسانوی مجموعوں کی اشاعت سے انہوں نے جدید افسانہ نگاروں میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے "پھر کیا ہوا" میں بیانیہ کہانیاں بھی تھیں اور علامتی و تجریدی بھی مگر دوسرے مجموعے "[illegible]" کی تقریباً سبھی کہانیاں علامتی و تجریدی ہیں چنانچہ یہ کہانیاں گہری معنویت اور تہہ داری کے باعث "پھر کیا ہوا" کی کہانیوں سے کئی قدم آگے ہیں۔ یہ الگ بات کہ افسانے کے عام قارئین کے نزدیک ان کا پہلا مجموعہ ہی زیادہ اہم ٹھہرے گا کہ اس میں کہانی پن کا عنصر نسبتاً زیادہ ہے۔ نیلم احمد کی کہانیوں کا خام مواد محض برصغیر کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی زندگی تک محدود نہیں بلکہ تیسری دنیا اور یورپی ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ شایان اور لا یموت ایسی اہم کہانیاں اسی تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ مذکورۃ الذکر کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ معاشی جبر صرف تیسری دنیا ہی کا المیہ نہیں بلکہ ترقی یافتہ ممالک کے عوام بھی اس کی لپیٹ میں ہیں۔ انسانی نفسیات اور جنسیات پر بھی نیلم احمد کو خاصا عبور حاصل ہے اور انہوں نے اپنے افسانوں میں اس موضوع کو بڑی ہنرمندی سے برتا ہے۔ "کنواں" اس کی عمدہ ترین مثال ہے۔ جنس کے علاوہ سیاست کے پل صراط کو بھی انہوں نے مشاقی سے عبور کیا ہے۔ شایان، لا یموت، پل بکاؤلی، اشار برگر، کنواں، کچرا اور کتے ان کی قابل ذکر کہانیاں ہیں۔

۱۹۹۰ء کے عشرے میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں کی اکثریت اگرچہ علامتی افسانے کی دلدادہ تھی مگر اس دور میں کچھ ایسے افسانہ نگار بھی سامنے آئے جنہوں نے علامت کے سکہ رائج الوقت ہونے کے باوجود بیانیہ کو اہمیت دی اور ایک ایسے دور میں جب افسانے سے کہانی غائب ہوتی جا رہی تھی، کہانی سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ میری مراد فرخندہ لودھی، عذرا اصغر، سائرہ ہاشمی، سلطان جمیل نسیم، منیر احمد شیخ، سلیم اختر، مستنصر حسین تارڑ وغیرہ سے ہے۔ ان میں سے بعض افسانہ نگاروں نے اگرچہ علامت کا استعمال بھی کیا ہے تو اسے حاوی نہیں ہونے دیا۔ اسی لیے میں انہیں بیانیہ روایت ہی کی کڑی سمجھتا ہوں۔

فرخندہ لودھی کی بیشتر کہانیوں کا خمیر اگرچہ محبت کے جذبے سے اٹھا ہے لیکن یہ محض رومانی کہانیاں نہیں بلکہ معاشرتی رویوں کی عکاس بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں نسوانی کرداروں کی ذہنی ساخت و پرداخت اور جنسی حالات کو جس ہنرمندی سے آشکار کیا ہے وہ قابل دید ہے۔ مثلاً فیک کی مس نفیسہ ہو یا پاربتی کی پارو، شرابی کی ڈیگما اور دلما ہو یا تیسرے لوگ کی بانو، میگی کی مس مارگریٹ ہو یا آدمی کی صفیہ، ان سب کرداروں کی فطرت کو بڑی جرأت اور فنکارانہ مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ وطن اور اہل وطن سے محبت بھی ان کے افسانوں کا ایک اہم جزو ہے جو ان کے پہلے افسانوی مجموعے "شہر کے لوگ" سے تیسرے مجموعے "خوابوں کے کھیت" تک کہیں بین السطور اور کہیں نمایاں انداز میں موجود ہے۔ پاربتی، میگی، شباب گھر کے راستے پر، بوٹیاں اور مجرہ ایسے افسانے اسی ذیل میں آتے ہیں۔

عذرا اصغر کو بھی وطن سے شدید جذباتی لگاؤ ہے اور وطنِ عزیز کی نظریاتی و جغرافیائی حدود کے اندر رونما ہونے والے واقعات و حادثات پر اپنے ردعمل کو اپنے فن کا حصہ بنانے پر خود کو مجبور پاتی ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے ان کا افسانہ "گھس بیٹھئے" قابل ذکر ہے۔ "عافیت کی سرزمین" میں انہوں نے ان مہاجرین کے حوالے سے قیام پاکستان کے وقت بھارت سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے المیے کو جدید عصری حسیت کے تناظر میں اجاگر کیا ہے۔ ان کے بعض دوسرے افسانوں میں بھی وطن پرستی کا جذبہ موجزن ہے اور میں اسے ان کا اختصاص سمجھتا ہوں۔ عذرا اصغر کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے معاشرے میں ہونے والی مادی تبدیلیوں

نو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور انہیں اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وقت اس بات کی پروا نہیں کی کہ ان کا آہنگ بہت ہی بے رحم مشکلیں بلانے کا موجب بھی ہو سکتا ہے مگر ایسا ہوتا تو وہ "تیاپانچا" اور "طوفان" جیسے افسانے نہ لکھ پاتیں۔ انہوں نے تو کم عمری سے ابلاغ میں بھی جو کچھ محسوس نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں ہمیں اپنی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ چند کہانیاں "تیاپانچا" "گھر کا دکھ" "رابطہ" وغیرہ ان کے فن کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں۔

منیر احمد شیخ کے افسانوں میں تہذیبی شناخت اور روایتوں کی تلاش کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ پرانی تہذیب کے مٹنے اور نئے کے وجود میں آنے سے معاشرے میں جو شکست و ریخت ہوئی ہے ان کے افسانے اس کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سوانحی عنصر اتنا حاوی ہے کہ ان کے اکثر افسانوں پر آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔ "اوورسیز پاکستانی" جو ان کا نمائندہ افسانہ کہا جاتا ہے آپ بیتی ہی ہے۔ بہت سے دوسرے افسانے بھی ان کے تجربات ہی کا اظہار ہیں۔ شاید اسی لئے ان کے افسانوں میں افسانے کے بنیادی عناصر کا فقدان نظر آتا ہے۔

سائرہ ہاشمی کے ابتدائی افسانوں میں محبت اور جنس کا موضوع نمایاں ہے اور غالباً اسی لئے ان کے اکثر افسانے عورت ہی کے گرد گھومتے ہیں "زرد رنگ کا ٹکڑا" لیکن آہستہ آہستہ ان کے موضوعات میں وسعت آگئی ہے۔ اگرچہ اس مجموعہ میں ان کے پسندیدہ موضوعات پر افسانے شامل ہیں مگر یہ مجموعہ ان کے ایسے افسانوں کی بنا پر اہم ہے جن کا تار و پود عصری سیاسی و سماجی مسائل کے خام مواد سے بنایا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے بھی ان کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں بالخصوص "سمندر کا دکھ" میں جس المیہ کو موضوع بنایا گیا ہے اکثر لکھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہا۔

سلطان جمیل نسیم نے بھی بالعموم زندگی کے حقائق ہی کو افسانوی روپ دیا ہے اور اسی مقصد کے لئے انہوں نے شہری زندگی کی تباہ حالی، بے ڈھنگے پن کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ہماری تہذیبی اقدار کو مادیت پسندی کے نتیجے میں جس شکست و ریخت کا سامنا ہے سلطان جمیل نسیم نے اسے بالخصوص محسوس کیا اور اپنے متعدد افسانوں میں اس کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ "فیصلے کی گھڑی" اس ضمن میں قابل ذکر ہے مگر وہ صرف تصویر کا ایک رخ ہی نہیں دکھاتے بلکہ "گواہی" ایسے افسانوں میں مثبت روایات کا اثبات بھی کرتے ہیں۔ "گھر کا راستہ"، "عذاب لمحہ"، "بجھی روشنی" ان کی اہم کہانیوں میں سے ہیں۔

سلیم اختر کی تنقید کی شہرت نے ان کی افسانہ نگاری کو پس منظر میں دھکیل رکھا ہے مگر حال ہی میں ان کے افسانوی مجموعوں کی اشاعت سے لوگوں کو یاد آیا ہے کہ وہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ انہیں عورت، جنس اور نفسیات سے جو شغف ہے اس کی جھلک ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے کم از کم "مٹھی بھر سانپ" کی سبھی کہانیوں کا محور و مرکز جنس ہی ہے البتہ "کڑوے بادام" کے افسانے وسیع تر تناظر رکھتے ہیں جس میں اقتصادی احتیاجات، نفسی کیفیات اور سیاسی و سماجی معاملات شامل ہیں۔ سلیم اختر اگرچہ بنیادی طور پر حقیقت نگاری اور بیانیہ اسلوب کے افسانہ نگار ہیں مگر "کڑوے بادام" کے حصہ "جبر، جنت، بلا" کے سیاسی موضوعات میں انہوں نے علامت کو بھی کامیابی سے برتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کو ادبی شہرت چونکہ سفرنامہ نگاری کی ہے اس لئے ان کے بعض افسانوں میں سفرنامے کے عناصر کی موجودگی پر حیرت نہیں ہونی چاہیئے۔ ان کے افسانے سیاسی و سماجی نظام کے جبر کی مؤثر عکاسی کرتے ہیں اور اس لمحے کی کہانی سناتے ہیں جب اندر اور باہر کا موسم ایک ہو جاتا ہے اور قید و رہائی کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ "بابا بگلوس"، "گیس چیمبر"، "کرشتراو" وغیرہ بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ آخر الذکر میں معاشرتی اور

یہ جبر کا افسانہ نہیں بلکہ ہر مستقل حیات کے منہ پر طمانچہ ہے جس کی کسک تادیر محسوس ہوتی رہتی ہے۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں لکھا جانے والا افسانہ تجریدی تھا اور اس دور میں علامت نگاروں ہی کے ناموں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اگرچہ کلاسیکی افسانہ اور نقادوں کی ایک جماعت نے علامت کے نام پر لکھی جانے والی لایعنی تحریروں کی ڈٹ کر مخالفت بھی کی مگر چونکہ بعض علامتی افسانہ نگار بحیثیت نقاد اس کا دفاع کرتے رہے اس لئے اس دور میں علامتی افسانے کا غلغلہ رہا مگر ۱۹۷۰ء کے بعد علامت کا استعمال رفتہ رفتہ اعتدال پر آ گیا اور افسانے میں کہانی کی ضرورت و اہمیت کا احساس کر لیا گیا۔ وہ ایک افسانہ نگاروں کے ہاں اگرچہ اب بھی ابہام کا استعمال موجود ہے مگر مجموعی طور پر ۱۹۷۰ء کے بعد کا دور کہانی کی بازیافت کا دور ہے چنانچہ اس دور میں ۱۹۶۰ء کے عشرے میں نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں نے بھی کہانی کی طرف مراجعت کی اور علامت و بیانیہ کے امتزاج سے افسانے کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلایا۔ ۱۹۷۰ء اور اس کے بعد نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں میں سے احمد جاوید، احمد داؤد، مرزا حامد بیگ، سلیم آغا قزلباش اور آصف فرخی کے علاوہ محمود احمد قاضی، طارق محمود اور یوسف چوہان قابل ذکر ہیں۔ علی حیدر ملک، منیر طلال، مشرف احمد، علی تنہا، محمد سعید شیخ، ممتاز احمد خان، طاہر نقوی، امراؤ طارق، شمع خالد، افضل جاسی، ضیا رشد اور شعیب خالق وغیرہ بھی اس دور میں سامنے آئے۔

احمد جاوید نے الفاظ سے صوتی آہنگ اور ان کی تکرار سے جو اسلوب وضع کیا ہے وہ ان کی بنیادی پہچان ہے۔ ان کے افسانوں کی مخصوص فضا بھی بڑی جانی پہچانی ہے اور ان کے موضوعات بھی جاتی ان سرگروں کے عکاس ہیں جنھیں زبان نہیں مل سکی۔ لیکن وہ اسی حد تک ہمیں اپنی کہانی میں شریک کرتے ہیں جتنا مناسب سمجھتے اور اتنا ہی منکشف کرتے ہیں جتنا ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ آگہی کے جس عذاب میں وہ گرفتار ہیں ہر شخص اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے بغیر کسی نعرہ بازی کے اپنے عصر کی تہذیبی و سیاسی تبدیلی کو تخلیقی کاوش دینے میں کامیابی حاصل کی اور فرد کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کو اہمیت دے کر کرب معنویت کے اندھیرے میں معنویت کی روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گشت پر نکلا ہوا سپاہی، بانجھ آنکھ، ہیولے، غیر علامتی کہانی ۲ اور کوہر کا بیل ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

احمد داؤد کے افسانوں میں معاشی بدحالی کے نتیجے میں انسان کی شخصیت میں ہونے والی شکست و ریخت کے علاوہ سیاسی جبر سے آزاد ہونے کی خواہش بھی ملتی ہے جس میں تیسری دنیا کے اکثر نو آزاد ممالک گرفتار ہیں چنانچہ ان کے افسانے ان کے سماجی شعور اور سیاسی وابستگی کا اظہار بھی ہیں کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر ایمان بھی لاتے ہیں اور اس کی گواہی بھی دیتے ہیں۔ دھکی اور پردے کا گوشت، داستان شب زوال کی اور تیج دینے والا جیسے افسانے ان کی فنی بصیرت کے گواہ ہیں۔ عروج کا زوال کا عروج اور جڑیں بھی ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔

مرزا حامد بیگ کی ماحول پرستی اور داستانوی انداز انتظار حسین کی روایت کا تسلسل ہے بلکہ مغلیہ تہذیب کی پیشکش کے حوالے سے وہ عصمت چغتائی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں مگر چونکہ انھوں نے جس مغلیہ تہذیب کو رومانی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اس لئے محض نسلی تفاخر اور مریضانہ انانیت کی ایک صورت کہی جا سکتی ہے البتہ مقامی منظر نامہ ان کے ذاتی مشاہدے کا غماز ہے۔ گمشدہ کلمات، تل اسرار کے اور ماسیے ثدکہ کا آخری کتبہ وغیرہ ان کے انداز خاص کے مظہر ہیں۔

سلیم آغا قزلباش کی جزئیات نگاری ان کے گہرے مشاہدے اور تفکر کی غماز ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ کافی غور و فکر کے بعد کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ نہ صرف افسانے کے مرکزی نقطے کو ابھارتے ہیں بلکہ زبان کی پیشکش پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ بستر نشینوں کی

کا مرکزی کردار ان کی کردار نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ انہوں نے علامتی طرز سے ہم آہنگ کر کے انسانوں کے ہجوم کا خیال کر کے اور ان کو مسائل سے اپنے منفرد تہذیبی پس منظر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ "آسیب" اس انداز کا نمونہ ہے بلکہ "مسافتوں کے درمیان" میں انہوں نے اساطیری روایت کے حوالے سے عصری صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔ یہ افسانہ بھی داستانی انداز کو کامیابی سے برتا گیا ہے۔

احمد فرنی ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں واقعہ سے زیادہ واقعہ کا بیان اور خیال اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا اظہار جذباتی اور ذہنی تموج سے اثر حاصل کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے چنانچہ ان کے ہاں خارج میں رونما ہونے والے واقعات کو ذاتی حیثیت سے پیش کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ صیغہ واحد متکلم کے استعمال سے ان کے افسانوں میں آپ بیتی کا جو انداز ابھرا ہے وہ ان کو حقیقت سے بہت قریب لے آتا ہے۔ "زمین کی نشانیاں"، "بجھتو مردار"، "ستارۂ ذہب" اور "سمندر" وغیرہ اس انداز کی نمایاں مثالیں ہیں۔ صرف اساطیری استعاروں سے استفادہ نہیں کرتے بلکہ نئی علامات سے بھی خاطر خواہ کام لیتے ہیں۔ نیز انہوں نے بچپن میں سنی ہوئی کہانی کی تخلیقی بازیافت کی ہے اور اس طرح ماضی کے حوالے سے دورِ جدید کے مسائل میں گھرے ہوئے انسان کی نفسی کیفیات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمود احمد قاضی نے اپنے افسانوں میں اس کرب کو سمیٹنے کی سعی کی ہے جو مروجہ سیاسی و معاشی نظام کا پیدا کردہ ہے۔ افسانوں میں پرانی نسل اگرچہ ہوا اور روشنی سے بے رنگ گلیوں میں زندگی گزارنے سے سمجھوتہ کر لیتی ہے مگر نئی نسل اس کو تسلیم کرتی نہیں ہوتی اور اسی سے وہ المیہ جنم لیتا ہے جو "ہوا" جیسے افسانے کی تخلیق پر منتج ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اگرچہ رجائی پہلو بھی ہے مگر یہ رجائیت ان کے کرب کو اور زیادہ نمایاں کر دیتی ہے کیونکہ ان کا ہر کردار اپنے خیالات کا قیدی بن کر رہنے پر آمادہ نہیں ہو پاتا اور یہی کا المیہ ہے جسے وہ مختلف افسانوں میں مختلف انداز سے پیش کرتے ہوئے غور کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

طارق محمود کو نئے افسانہ نگاروں میں موضوعات کے تنوع کا افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔ ان کے ہاں دیہاتی زندگی کے مسائل کا بیان بھی ہے اور شہری و دفتری زندگی کی میکانکیت اور معاشرے کی کرپشن کا اظہار بھی۔ امتزاج تہذیب کی تصویر کشی بھی ہے اور مشرق وسطیٰ میں کام کرنے والے پاکستانیوں کی جذباتی کشمکش کی عکاسی بھی اور اہم بات یہ کہ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ سنی سنائی باتیں بیان کر رہے ہیں۔ "اس قحط میں صفر سے تیز زیادہ"، "اصلی گھر" اور "سر حد" وغیرہ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے اولین افسانوی مجموعہ "سرحد" میں زیادہ تر کہانیاں بیانیہ تھیں مگر "آخری چال" میں علامتی انداز بھی موجود ہے مگر یہ علامات اتنی واضح ہیں کہ کہیں بھی عدم ابلاغ کا مسئلہ سر نہیں اٹھاتا۔

یوسف چوہدری نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی دھوکہ بازی اور خود غرض سرشت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور تیسری دنیا کے ماحول میں اس مسئلہ کو وسیع تر تناظر فراہم کیا ہے۔ معاشرتی تنقید کے حوالے سے وہ فرنگی پسندوں کی صف کے آدمی معلوم ہوتے ہیں تاہم ان کے افسانوں میں طنز کی زیریں لہر ان کی معاشرتی اور سیاسی بصیرت کا وہ تخلیقی آئینہ ہے جس میں پورے معاشرے کا المیہ منعکس ہوتا ہے۔ "نواسہ" "مینا" میں یہ طنز اپنے عروج پر ہے۔

۱۹۶۰ء سے قبل کا افسانہ سماجی تضاد اور معاشی ناہمواریوں کا تو غماز تھا مگر فرد کے بجائے معاشرے کو اہمیت دیتا تھا جبکہ ۱۹۶۰ء کے بعد کا افسانہ فرد کی انفرادیت کا علمبردار نظر آتا ہے نئے افسانہ نگاروں نے خارجی مسائل کے مستقیم اظہار کے بجائے انسان کے باطن کی خواہش کو اپنا

خارجیت اور باطن کشف کے حوالے سے ایسے سوالات اٹھائے جو قبل ازیں صرف شاعری سے مخصوص تھے۔ یہاں شعری اسلوب اور شعوری استغراق تمام کا استعمال بھی ہوا اور باطنی سفر کی روداد کے بیان میں ابہام بھی پیدا ہوا۔ ذاتی علامات کے استعمال سے لایعنیت بھی پیدا ہوئی اور ماحول سے بیانیہ سے انحراف کے سبب افسانے کے کردار بھی تنہا ہوئے۔ نفسی کیفیات اور الجھنوں کے اظہار کے پردے میں کچھ عرصے تک جنس نگاری کا بھی دور رہا مگر رفتہ رفتہ اعتدال پیدا ہوتا چلا گیا اور اردو افسانہ اس بھول بھلیاں سے نکل آیا جس میں ۱۹۶۰ء کے عشرے میں پھنس گیا تھا جس کے باعث قارئین کا شدید ردعمل بھی تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۰ء کے بعد ہمارے سیاسی و سماجی مسائل کی گھمبیرتا نے بھی ہمارے افسانہ نگاروں کو ذات کے تنگنائے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ آج کا نیا افسانہ اگرچہ ترقی پسندوں کی طرح محض خارج کا آئینہ دار نہیں مگر خارجی مسائل سے آنکھیں بھی نہیں چراتا۔ جدید علوم جس طرح زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور جدید دور کا انسان جن نفسی اور مادی تبدیلیوں سے دوچار ہے نیا افسانہ اسے بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے گویا آج کا افسانہ خارج اور باطن دونوں کو ساتھ لے کر چلتا اور پوری زندگی کی نمائندگی کر رہا ہے۔

(مریہ، نومبر ۹۳ء)

کچھ ناقدوں کا خیال ہے کہ جدید افسانے میں سماج، معاشرہ یا ماحول کا عنصر نہیں ہونا چاہیئے، لیکن اگر غور کیا جائے تو سماج، معاشرہ اور ماحول ہی میں زندگی کی حقیقتیں ملتی ہیں جو کہانی کے محرکات ہیں۔ ان کی عکاسی کے بغیر کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ ہاں اسلوب میں ضرور فرق ہوتا ہے۔ کسی خارجی حقیقت کو اپنی ذات سے الگ کر کے اگر محض سماج اور معاشرے کے سیاق و سباق میں بیان کیا جائے تو وہ یقیناً جدید افسانے کے معیار پر پوری نہ اترے گی۔ لیکن اگر خارجی حقیقتوں کو افسانہ نگار اپنی ذات کے حوالے سے بیان کرے اور اس میں اس کے داخلی تاثرات اور جذبات پوری طرح شامل ہوں تو وہ یقیناً جدید کہانی ہو گی۔ اکثر جدید افسانے میں مکان و زمان کا تعین ضروری نہیں ان کا احاطہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ ان میں آفاقیت ہوتی ہے اور اس میں آدمی اور اس کی زندگی کی عکاسی بغیر زمان و مکان کی قید کے ہوتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر افسانے میں عصری ماحول کی عکاسی ہو۔ اس میں کہانی کار کی ذات کی شمولیت ہو۔ کسی فارمولہ یا تکنیک کے تحت نہ لکھی گئی ہو۔ طرزِ بیان روایتی ڈگر سے ہٹا ہوا ہو۔ کسی ایک علاقے تک محدود نہ ہو۔ اس کا احاطہ وسیع ہو اور کسی حد تک اس میں آفاقیت ہو۔ اظہار میں برجستگی ہو اور اسے منطق یا مقصدیت کے دائرے میں محدود نہ کیا گیا ہو تو وہ جدید افسانے کے معیار پر پوری اترے گی۔ علامت اور تجریدی طرزِ بیان اسے مزید جلا بخشتے ہیں لیکن جدید افسانے کے لازمی اجزا نہیں ہیں۔

مضمون: "جدید افسانہ"
نسیم اعظمی
"قومی زبان" کراچی
اپریل ۱۹۸۵ء

عربی تحریر: سید ابوالحسن علی ندوی
ترجمہ: عبداللہ عباس ندوی

مولانا رحمت اللہ کیرانوی
اور
اُن کی تالیف "اظہار الحق"

میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ چند سطریں ایک ایسے جلیل القدر عالم دین کے بارے میں لکھوں جس کو اللہ نے قلعۂ اسلام کا محافظ بنایا تھا، جس کی ذات سے حق و صداقت کو فتح و نصرت حاصل ہوئی، جس کی عالمانہ بصیرت سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوا اور جس نے اسلام کی وکالت و حمایت کا فرض ان نازک حالات میں انجام دیا جس وقت اس طرح کا کام اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور بغیر جان کی بازی لگائے کوئی اس میدان میں ایک قدم آگے بڑھ نہیں سکتا تھا۔

میرا اشارہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی طرف ہے۔ (سن پیدائش ۱۲۳۳ھ، وفات ۱۳۰۸ھ، مدفین جنتہ المعلاۃ، مکہ مکرمہ) جنھوں نے اپنے عیسائی حریف کو مناظرہ میں شکست فاش دی اور ایسے دلائل سے کام لیا جن کی طرف عام طور پر ذہن نہیں منتقل ہوتا تھا، تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ان کی شہرت بام عروج پر تھی، وہ اپنے فن میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، جس کا اعتراف ان کے تمام معاصر علماء کو تھا اور آج تک عالم اسلام کا ہر پڑھا لکھا اور باخبر آدمی ان کے کارنامے سے واقف اور ان کی علمی عظمت اور مجاہدانہ کارنامہ کا قائل ہے۔

مولانا کیرانوی کا وہ عظیم کارنامہ جس نے ان کو علمائے سلف اور مجاہدین امت کے درمیان ممتاز مقام عطا کیا، یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی مدافعت اس طرح کی کہ حق و باطل کو آئینہ کی طرح روشن کر کے دکھا دیا، اسلام کے خلاف غلط بیانیوں، تہمتوں اور شکوک و اوہام کا طوفان دشمنوں نے کھڑا کر دیا تھا۔ مولانا نے نہ صرف یہ کہ ان تہمتوں کی حقیقت واضح کر دی بلکہ مسلمانوں کے اندر دین پر یقین و اعتماد کو پختہ سے پختہ تر کر دیا، مسلمانوں کو اپنے دین کی صداقت اور اپنے رسول کی لائی ہدایت پر از سر نو غیر متزلزل ایمان نصیب ہوا۔

حضرت کیرانوی نے یہ خدمت ایسے زمانہ میں انجام دی جو مسلمانوں کے لیے انتہائی نازک اور صبر آزما زمانہ تھا، ان کا حریف وہ تھا جس کو اس زمانہ کے سب سے بڑے فاتح گروہ کی پشت پناہی حاصل تھی، اور وہ بڑی دنیاوی طاقت اس کی سرپرست تھی جس کے قلمرو میں آفتاب نہیں غروب ہوتا تھا، اور جس کے تمدن، تہذیب، تعلیم کی پوری دنیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

دوسری طرف مولانا رحمت اللہ کیرانوی، اپنے حریف کے برعکس، ایسی قوم کے فرد تھے جو شکست خوردہ بھی تھی اور شکستہ دل بھی، اور آزمائش کے سنگین ترین وقت سے گزر رہی تھی، اس کو اپنے تابناک ماضی کا بھی ہوش نہیں تھا، اس کے نزدیک اسلاف کے مجاہدانہ کارنامے قصۂ پارینہ تھے جو اس کی سیاسی پسپائی اور اقتصادی بدحالی کا مداوا نہیں بن سکتے تھے، اور اس ذہنی پسپائی کے نتیجہ میں خود دین اسلام کی صداقت و حقانیت پر یقین میں کمزوری بلکہ کھوکھلا پن آچکا تھا، انگریز اس کو اپنا حریف اور حقیقی دشمن سمجھتے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ ایشیا اور افریقہ میں کہیں بھی ان کے دین و تہذیب کو کوئی علمی محاذ پر چیلنج کر سکتا ہے تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ اس لیے ان کا سارا زور مسلمانوں کی حوصلہ مندیوں کو مٹانے اور ان کی معنوی قوت کمزور کرنے پر صرف ہو رہا تھا، یورپ کے عیسائی مشن پوری آزادی کے ساتھ حکومت وقت کی سرپرستی اور کفالت میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں اپنے جال بچھائے ہوئے تھے، ہزاروں کی تعداد میں عیسائی مبلغین ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے، سیکڑوں ناخواندہ اور نیم تعلیم یافتہ افراد "اقبال مند فاتح قوم" کا مذہب اختیار کر رہے تھے، اور ان کی ظاہری شان و شوکت، حکومت و قوت، کمزور و ناخواندہ اشخاص کے نزدیک حقانیت کی دلیل تھی۔

عوام اور سادہ لوح لوگ تو الگ رہے، خود علمائے کرام کو عیسائیت کی پوری حقیقت نہیں معلوم تھی، ان کو بائبل کے عہد قدیم، عہد جدید ان کی شرحوں اور تفسیروں سے واقفیت نہیں تھی، ان کتابوں کی تاریخ اور ان میں جو مختلف زمانوں میں اضافے ہوتے رہے، اور کتربیونت کی جاتی رہی، بائبل سوسائٹیوں نے جو تصرفات کیے، عیسائی "انجیل مقدس انجمن" نے جس طرح بائبل کو ایڈٹ کیا، ان سب سے سطحی واقفیت بھی پڑھے لکھے مسلمانوں کو نہیں تھی، علمائے کرام کی ذہنی جولانیوں اور علمی تحقیقات کے میدان یا تو فقہی جزئیات تھے یا یونانی منطق و فلسفہ اور علم کلام کی بحثیں، یا کسی درجہ میں احادیث و تفسیر پر حواشی و تعلیقات، عیسائیوں کے ان ناروا حملوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی تیاری انھوں نے نہیں کی تھی۔ یہ حملے ان کے لیے ایسے تھے جیسے کسی نے اچانک رات کی تاریکی میں ان کے گھر پر شب خون مارا ہو ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت تھی، ہمت و جرأت کے ساتھ کتب سماویہ پر گہری نظر کی ضرورت تھی، اور اس بات کی ضرورت تھی کہ عیسائیت کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہو اور عیسائیت کو عیسائیت کے بنیادی اور علمی مراجع سے سمجھا گیا ہو جو ان پر تنقیدیں کی گئی ہیں اور ان کے تجزیے جن انداز میں کیے گئے ہیں، ان سے واقفیت بھی لازمی تھی۔ ان سب کے

لیے ایک طرف تو بھرپور غیرت ایمانی کی ضرورت تھی، دوسری طرف وسیع مطالعہ اور بصیرت مطلوب تھی، اور خاص مشکل یہ تھی کہ عیسائیت پر تحقیقی کام کرنے والے کے سامنے کوئی روشن شاہراہ نہیں تھی بلکہ ایک سُرنگ تھی جو اندر سے تاریک تھی اور اس میں پیچ در پیچ راستے تھے، کھائیاں اور کھائیاں تھیں، یعنی اس کے علمی ماخذ نہ ہونے کے قریب تھے، اور جو تھوڑے بہت تھے وہ یورپین زبانوں میں تھے، ان زبانوں میں زیادہ مانوس زبان انگریزی تھی، اہل ہند نے ابھی اس زبان کو سیکھنا شروع ہی کیا تھا۔ اکثر مسلمان اور خاص طور پر علماء اس سے متنفر تھے کیوں کہ یہ ان فاسقوں کی زبان تھی جنھوں نے ان سے حکومت چھینی تھی اور ان کی تذلیل کی تھی، دوسری طرف خود عیسائی مشن بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی کتاب مقدس پر جو جرح ہوئی ہے اور اس کے جو تجزیے کیے گئے ہیں وہ ہندوستان آئیں، کیوں کہ ان کی مصلحت تبلیغ کا تقاضا یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بے خبر رکھا جائے، لہٰذا وہ یہاں کی لائبریریوں اور علمی مراکز کو ایسی کتابیں کیوں کر فراہم کرسکتے تھے بلکہ ان کی کوشش تھی کہ اس طرح کی کتابیں اس ملک میں آنے نہ پائیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے لیے یہ صورت حال پریشان کن ضرور تھی مگر ان کی حمیت و غیرت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اور ان کے وہ رفقاء جو اسلام کی مدافعت اور اسلام پر عائد کردہ تہمتوں کی حقیقت واضح کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کرچکے تھے، اپنے مورچہ پر جم کر مقابلہ کریں، عیسائی مبلغوں نے جو اپنے آپ کو مُبشّر (جنت کا مژدہ سنانے والے) کہلانا پسند کرتے ہیں، مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا۔ جنگ اور تجربہ کار و سیاسی بازی گروں اور امور جنگ کے ماہرین کا خیال ہے کہ مقابلہ کرنے کے لیے بہترین پوزیشن حملہ آور کی ہوتی ہے۔ اپنے حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دینا بڑی مہارت کا کام ہے، یہی سیاست عیسائی مبلغوں نے اپنی طاقت کے زور پر اختیار کی تھی۔ مگر مولانا کیرانوی نے اپنی دینی بصیرت سے محسوس فرمایا کہ عیسائیوں سے دو بدو مقابلہ ضروری ہے ورنہ نہ صرف [برصغیر کے] مسلمان ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہوجائیں گے بلکہ عرب ممالک کو بھی انھی خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا، لہٰذا برصغیر میں عیسائیوں سے مقابلہ صرف یہاں کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام عرب اور اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ یہاں کے مسلمان جو سیاسی لحاظ سے پسپا ہیں اور اپنی سلطنت کھوکر شکستہ دل ہیں، اگر اس مورچہ پر بھی شکست کھا گئے اور اس زبانی مناظرہ میں اپنے حریف کا کھوکھلا پن ثابت نہ کرسکے تو عیسائیت کا سیلاب پورے عرب اور مشرقی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اور اگر یہ زخم خوردہ اور شکستہ دل مسلمان اس مناظرہ سے سربلند و سرخ رو ہوکر نکلتے ہیں تو یہ سیلاب بلا نہ صرف برصغیر سے بلکہ تمام مشرقی مسلم ممالک سے رک جائے گا۔

مولانا کیرانوی نے اللہ کا نام لے کر اس مہم کو سر کرنے کا عزم کرلیا، اور یہ طے کرلیا کہ عیسائیت کو عیسائیت کے اصلی مراجع و ماخذ سے سمجھیں گے، ان کا تجزیہ کرکے تحقیق کریں گے، ان

کے اس عزم کو اور پختہ اس بات نے کر دیا کہ اس زمانہ میں ایک مشہور عیسائی پادری، عیسائیت کا مبلغ اعظم فنڈر (Pfander) ہندوستان آیا اور علمائے دین کو للکارا، اور علانیہ مناظرہ کی دعوت دینے لگا، اور ملک کے ہر صوبہ اور ہر ضلع میں دورے کرنے لگا، بڑے بڑے جلسے کرتا اور ان میں تقریر کرتا، اپنے مذہب کی پیروی کی دعوت دیتا تھا، حضرت کیرانوی کو ایک اور مشکل کا سامنا تھا، وہ انگریزی زبان نہیں جانتے تھے، اور دوسری زبانوں کے سیکھنے کی ایک خاص عمر ہوتی ہے اس سے وہ تجاوز کر چکے تھے، زندگی بھر ان کا مشغلہ علوم دینیہ پڑھنا پڑھانا رہا، قرآن وحدیث سے سابقہ رہا یا علوم عقلیہ سے۔ دوسری طرف فنڈر صرف اپنی ہی زبان جانتا تھا، تھوڑی بہت عربی فارسی زبان سمجھ لیتا تھا، اب ضرورت تھی کہ کوئی ایسا شخص ہوتا جو ان دونوں کے درمیان واسطہ بنتا، اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جو دوسری یورپین زبانوں کے مراجع سے واقف ہوتا اور عیسائی وثائق کو پڑھ کر ترجمہ کر سکتا۔

اللہ کی مصلحت وحکمت نے حضرت مولانا کیرانوی کے لیے ایک ایسے شخص کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا جس کی ضرورت تھی۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، "وللہ جنود السموت والارض" (یعنی اللہ کے کارندے سپاہی زمین وآسمان میں پھیلے ہوئے ہیں) وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت کیرانوی کی مدد کے لیے غیب سے کھڑا کیا وہ ڈاکٹر وزیر خان اکبر آبادی تھے، جو ۱۸۳۲ء میں لندن جا کر ڈاکٹری کی اعلیٰ سند حاصل کر چکے تھے اور انگریزی کے علاوہ یونانی زبان بھی پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے عیسائیت کا اچھا مطالعہ کیا تھا اور اس کے مراجع خرید لیے تھے اور یہ کتابیں اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے، حضرت کیرانوی کے لیے یہ قوت بازو اور بہترین معاون ثابت ہوئے، اور وقت کا تقاضا جس جہاد کے لیے تھا اس میں وہ مولانا کے شریک ومددگار بن گئے۔

حضرت کیرانوی نے اس طرح پوری تیاری کر لی، اور معرکۂ حق وباطل کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ دوسری طرف فنڈر کی جولانیاں بھی شباب پر تھیں، [وہ] بڑی جرأت کے ساتھ اسلام پر ناروا حملے کر رہا تھا۔ حضرت کیرانوی نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے اس شخص کا دہانہ توڑنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے عیسائی مبلغوں کو سبق سکھا دیے جانے کی ضرورت ہے، اس طرح مسلمانوں کے اندر سے احساس کمتری کا ازالہ ہوگا اور ان کو اپنے دین کی حقانیت کا یقین حاصل ہوگا۔

حضرت کیرانوی نے محسوس فرمایا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ فنڈر سے مناظرہ کیا جائے، اور علانیہ جلسے میں یہ مناظرہ ہو جس میں مسلمان اور اہل وطن، یورپین حکام، عیسائی اور عیسائیت قبول کرنے والے ہندوستانی سب موجود ہوں، فنڈر کو اپنی کتاب "میزان الحق" پر بڑا ناز تھا اور اکثر اسی سے وہ استدلال کرتا تھا، اور اس کو وہم تھا کہ مسلمان اور ان کے علماء ان دلائل کا رد نہیں کر سکتے۔ مولانا کیرانوی نے اس پادری (فنڈر) سے مناظرہ کرنے کا تہیہ کر لیا، اس سے خط وکتابت کی اور دعوت دی کہ وہ سب کے سامنے آئے، جس میں مسلمان اور غیر مسلم سب ہوں۔ جب پادری فنڈر پر بہت زور پڑا، اور اس

نے دیکھ لیا کہ اب بغیر مناظرہ کیے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس دعوت کو چار و ناچار قبول ہی کر لیا، ا اس کو اس مناظرہ کے نتائج کا اندازہ ہوتا تو شاید وہ کبھی سامنے آ کا قبول نہ کرتا، بہرحال ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء اکبر آباد (آگرہ) میں یہ مناظرہ طے پایا۔ یہ مقام عیسائیت کے فروغ کا مرکز؛ اور اس کے ایک محلہ کا نام "محلہ عبدالمسیح" ہی پڑ گیا تھا کیونکہ وہاں عیسائیت قبول کرنے والے ہندوستانی کافی تعداد میں تھے۔

متعینہ تاریخ میں جلسہ شروع ہوا۔ ضلع کے حکام، عدالت کے جج، اور انگریزی چھاؤنی کے بہت سے عہدہ دار موجود تھے، پادری فنڈر اور پادری ولیم کلین (William Clean) اور شہر کے اعیان و سربرآوردہ اشخاص، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر محمد وزیر خان حضرت کیرانوی کے مترجم و معاون کی حیثیت سے شریک تھے، مناظرہ کے پانچ موضوع تھے۔

۱۔ عہد نامہ قدیم (اولڈ ٹیسٹامنٹ) اور عہد نامہ جدید (نیو ٹیسٹامنٹ) میں تحریف ہوئی۔
۲۔ بائبل میں کچھ احکام منسوخ قرار دیے گئے۔
۳۔ عقیدہ تثلیث
۴۔ محمد ﷺ کی نبوت
۵۔ قرآن کی صداقت و صحت

اس مناظرہ میں شرط یہ تھی کہ اگر مولانا کیرانوی نے اس مناظرہ میں بازی جیت لی تو فنڈر اسلام قبول کر لے گا، اور اگر اس کے برعکس ہوا تو مولانا کیرانوی عیسائیت کو تسلیم کر لیں گے۔ اس شرط کی وجہ سے اس مناظرہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پہلے روز کا مناظرہ ختم ہوا تو ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا، ہر مجلس میں یہی موضوع تھا جس پر تبصرے ہو رہے تھے، کیونکہ مناظرہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ پادری فنڈر نے یہ اعتراف کر لیا کہ آٹھ مقامات میں بائبل کے اندر تحریف موجود ہے۔

دوسرے روز جلسہ عام میں عیسائی، سکھ، ہندو اور مسلمانوں کی بڑی تعداد مناظرہ میں شریک ہونے کے لیے آئی۔ فنڈر نے کہا کہ انجیل میں جو غلطیاں ہیں، وہ کتابت کی غلطیاں ہیں، لیکن وہ عبارتیں جن میں عقیدہ تثلیث، حضرت عیسیٰ کی الوہیت، فداء اور شفاعت کا ذکر ہے، وہ تحریف سے محفوظ ہیں۔ پادری فنڈر کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا جس کو اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ استعمال کیا۔ حضرت کیرانوی نے جواب دیا۔

"جب تم انجیل میں تحریف کو تسلیم کرتے ہو تو پوری کتاب مشکوک ہو گئی۔"

اس پر بحث ختم ہوئی اور پادری فنڈر تیسرے روز مناظرہ کے لیے آیا ہی نہیں۔ اس کے بھاگ کھڑے ہونے سے واضح ہو گیا کہ وہ مناظرہ کے میدان میں شکست کھا گیا، اور مسلمانوں کی یہ بڑی کامیابی تھی جس سے ایمانی قوت میں اضافہ ہوا اور پادریوں کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت عام مسلمانوں نے

اپنے اندر محسوس کی۔ عیسائیت کے عقلی و علمی دبدبہ اور بلند بانگ دعووں اور اسلام پر تہمتوں کی حقیقت سب کے سمجھ آ گئی۔

اس مناظرہ کے دو سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا واقعہ پیش آیا جو ایک طرح سے مسلمانوں کی آخری کوشش تھی کہ انگریزوں کے بچھائے ہوئے جال سے نکل آئیں، لیکن اس جنگ میں مسلمان ناکام رہے، اور ان کی ناکامی کے بعد انگریز غضبناک، طاقت ور اور انتقام کے جذبہ سے بھرے ہوئے دشمن کی طرح پیش آئے، اور وہ جانتے تھے کہ اس جنگ کی قیادت مسلمان کر رہے تھے اور انہی کا یہ پلان تھا اور وہی اس کی ہمت کر سکتے تھے، اور دوسرے ہم وطن ان کے ساتھ ہو لیے تھے، اس لیے مسلمانوں کے علماء ان کے جذبۂ انتقام اور غصہ کا سب سے زیادہ شکار تھے، اور آئندہ بھی انگریز کو خطرہ انہی مسلمانوں اور ان کے علماء سے تھا، عوام میں انہی کی مقبولیت تھی لہذا انگریزوں نے ایک ایک عالم کو پکڑ پکڑ کر قتل کرنا شروع کیا، ان کو پھانسی دیتے، سولی پر چڑھاتے، ان کی گردنیں درختوں سے لٹکاتے اور طرح طرح کی تذلیل واہانت کا سلوک کرتے، اور تلاش کر کے ایسے افراد کو ڈھونڈتے جن کی مسلمانوں کے درمیان عزت و توقیر ہوتی، اور لوگ جن کی بات سنتے۔ انگریزوں کو جن افراد کی تلاش تھی ان میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی صفِ اول کے لوگوں میں تھے، کیوں کہ مذہبی مناظرہ میں وہ ان کو شکست دے چکے تھے اور ان کے خلاف جو جہاد کیا گیا، اس میں شریک تھے۔ مصلحت وقت کا تقاضا تھا کہ مولانا کچھ عرصہ کے لیے ایک گاؤں میں روپوش ہو جائیں، جب انگریز ان کی تلاش میں اس گاؤں میں بھی پہنچ گئے تو مولانا نے کلہاڑی لے کر کسانوں کے بھیس میں کھیت میں کٹائی کا کام شروع کر دیا، اور اس طرح اللہ نے ان کو بچا لیا اور انہوں نے کسی طرح سورت کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر بلادِ مقدسہ کی طرف ہجرت کر لی، یہ ۱۸۶۲ء کا واقعہ ہے یعنی جنگ آزادی کے پانچ سال بعد، ان کی جائدادیں سب کی سب ضبط کر لی گئیں جو خاصی بڑی تھیں، اور ان کو نیلام کر دیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کے خلیفہ سلطان عبدالعزیز عثمانی تھے، اور مکہ مکرمہ میں ان کے گورنر شریف عبداللہ بن عون تھے، جب ان کی علمی منزلت کا پتہ چلا تو حرم شریف میں ان کو درس دینے کی اجازت مل گئی، اور اس وقت کے سربرآوردہ علماء سے ان کے تعلقات قائم ہوئے جن میں مکہ مکرمہ کے سب سے بڑے عالم شیخ احمد زینی دحلان تھے جو مولانا کیرانوی کے خاص احباب میں تھے اور انہوں نے ہی مولانا کیرانوی کو شریف مکہ سے ملایا اور علمائے مکہ سے ان کا تعارف کرایا۔

ایک اتفاقی بات پیش آئی کہ پادری فنڈر ایک عرصہ تک یورپ کے مختلف ملکوں جرمنی، سوئزر لینڈ، انگلینڈ میں رہا۔ اس کے بعد اس کو لندن کی تبلیغی انجمن نے قسطنطنیہ بھیجا کہ مسلمانوں کے مرکزی مقام، خلافت کے پایہ تخت میں جا کر عیسائی تبلیغ کی مہم چلائے۔ اس نے سلطان عبدالعزیز سے ملاقات کی اور ہندوستان کے اس مناظرہ کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ عیسائیت کو اسلام پر فتح حاصل ہو گئی،

سلطان عبدالعزیز خلیفۃ المسلمین تھے۔ ان کو اس بیان سے سخت حیرت ہوئی۔ انھوں نے شریف مکہ کو لکھا کہ ہندوستان سے آنے والے حاجیوں سے معلوم کریں کہ اصل واقعہ کیا ہے اور کس طرح پیش آیا؟ اور اس مناظرہ اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت (۱۸۵۷ء) کی صحیح نوعیت سے مطلع کریں۔ شریف مکہ کو شیخ العلماء سید احمد دحلان سے پورا واقعہ معلوم ہو چکا تھا، انھوں نے دارالخلافہ کو مطلع کیا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور یہ کہ اس مناظرہ کے "بطل" (ہیرو) جو عالم دین ہیں وہ حسن اتفاق سے مکہ مکرمہ میں موجود ہیں۔ سلطان عبدالعزیز نے حضرت مولانا کیرانوی کو دارالخلافہ آنے کی دعوت دی، چنانچہ مولانا وہاں (۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں) تشریف لے گئے۔ جب پادری فنڈر کو معلوم ہوا کہ شیخ (مولانا کیرانوی) قسطنطنیہ آ رہے ہیں اسی وقت وہاں سے فرار ہو گیا۔ سلطان عبدالعزیز نے وہاں کے علماء کو جمع کیا، جس میں وزراء اور اعیان ملک شریک تھے، مولانا کیرانوی سے اس مناظرہ کا حال سُنا کہ کس طرح اسلام کو انھوں نے عیسائیت پر فتح یاب کیا، پھر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی داستان سنی، سلطان نے اسی وقت عیسائی مبلغوں پر پابندی لگا دی اور اس سلسلہ میں سخت قوانین نافذ کیے۔ سلطان اکثر و بیشتر نماز عشاء کے بعد مولانا کیرانوی سے ملا کرتا اور آپ کے نصائح و ارشادات سُنا کرتا۔ اس مجلس میں حکومت کے صدر اعظم خیرالدین پاشا تیونسی بھی شریک رہتے، وہاں کے شیخ الاسلام اور بڑے سربرآوردہ علماء بھی اس مجلس میں آیا کرتے تھے۔

مولانا سے جب صدر اعظم اور خلیفہ عبدالعزیز نے مناظرہ سنا اور ان کی علمی عظمت، وسعت مطالعہ اور مسیحیت پر ان کی ناقدانہ بصیرت کا اندازہ کیا تو یہ درخواست کی کہ وہ عربی زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھ دیں جس میں ان پانچوں عناوین پر سیر حاصل بحث ہو جو مناظرہ کے لیے موضوع بحث قرار پائے تھے۔ مولانا نے اس تجویز کو قبول فرمایا اور "اظہار الحق" کی تالیف وہیں قسطنطنیہ میں شروع کر دی۔ رجب ۱۲۸۰ھ میں یہ تالیف شروع کی اور ذی الحجہ میں مکمل کر لی، یعنی صرف چھ ماہ میں یہ ضخیم دستاویز تیار ہو گئی، سلطان کی خدمت میں یہ ہدیہ پیش کیا اور مقدمہ میں تحریر فرمایا کہ یہ کتاب شیخ العلماء علامہ زینی دحلان کی تجویز پر لکھی ہے۔ صدر اعظم خیرالدین پاشا نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ نے تو یہ کام امیرالمومنین کی فرمائش پر کیا ہے، مناسب یہ تھا کہ امیرالمومنین کا نام آپ لکھتے، خلیفۃ المسلمین کا اکرام اور حق و انصاف سے قریب تر بات یہی ہے۔ مولانا نے فرمایا یہ خدمت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے میں نے انجام دی ہے، اس میں کوئی دنیاوی غرض شامل نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ العلماء دحلان نے مجھ سے پہلے اس کی فرمائش کی تھی اور کہا تھا کہ اس مناظرہ کی روداد قلم بند کر لوں، اور مکہ مکرمہ میں میں نے اس کتاب کے لیے مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا اور شیخ دحلان ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مجھے شریف مکہ سے متعارف کرایا اور آج دربارِ خلافت تک میری رسائی کا سبب وہی ہیں، لہٰذا ان کے فضل و کرم کا اعتراف ضروری ہے۔

اس طرح یہ کتاب معرضِ وجود میں آئی، اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے دفاعی موقف کے بجائے حملہ آور ہونے کا موقف اختیار کیا ہے، اور یہ موقف بہت ہی کارآمد ہوتا ہے کہ حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا جائے، اور اس کو مجبور کیا جائے کہ وہ ملزم کے کٹہرے میں کھڑا ہو اور وہ اپنی صفائی پیش کرے، پہلے علماء نے اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا اور تورات و انجیل اور قرآن کو ہم پلہ سمجھ کر گفتگو کرتے تھے، اس طرح ان قدیم صحیفوں کو وہ اہمیت حاصل ہوجاتی ہے جس کے حقیقتاً وہ مستحق نہ تھے، حالانکہ خود حاملین تورات و انجیل یہ تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن کی طرح بغیر کسی تغیر و تبدل کے آسمانی صحیفوں کا امتیاز ان میں پایا جاتا ہے۔

شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ نے بہت مناسب قدم اٹھایا تھا کہ اپنی کتاب "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" میں جارحانہ موقف اختیار کیا تھا، کیوں کہ اہل تحقیق علماء کے نزدیک تورات و انجیل کی حیثیت دوسرے تیسرے درجہ کی احادیث و سیرت کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے، اور نہ ان صحیفوں کی ثابت شدہ سند ہے۔ ان صحیفوں کو حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد مختلف مرحلوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں کچھ حضرت مسیح کے اقوال ہیں اور کچھ ان کے معجزات کا بیان ہے اور کچھ ان کے اخلاق و اعمال کا ذکر ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بہت گہرائی کے ساتھ ان صحیفوں کا مطالعہ کیا تھا اور ان کی تہ کو پہنچ گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے اندازِ گفتگو سے مناظرہ کی نوعیت بدل گئی اور حریفوں کو جو پہلے بالادستی حاصل ہوجایا کرتی تھی، وہ ختم ہوگئی۔

۲۔ اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے مولانا کیرانوی نے زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کی ہے، کیوں کہ اس میں بحث و مناظرہ اور چون و چرا کی گنجائش رہتی ہے۔ مولانا نے صاف نظر آنے والی اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی باتیں ذکر کی ہیں، جن میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے بائبل میں ایک دوسرے سے متضاد باتوں کو نکال دکھایا ہے کہ کوئی الہامی کتاب جس میں تحریف نہیں ہوئی ہو، اس طرح متضاد باتوں کا مجموعہ نہیں ہوسکتی، اس طرح کی ایک سو آٹھ کھلی ہوئی غلطیوں کو انھوں نے دکھایا ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جیسے ریاضی کے فارمولے ہوتے ہیں، دو اور دو چار کی طرح جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں، دوسرے کھلی ہوئی تحریف کے نمونے ہیں جہاں الفاظ کے اضافے ہیں، کہیں کمی ہے، کہیں تحریری جملے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ایک آسمانی صحیفہ کا درجہ حاصل ہی نہیں کر سکتی۔

۳۔ عیسائیوں نے انجیل کو وحی منزل ثابت کرنے کے لیے جو عبارت آرائی کی ہے اور مغالطے میں ڈالنے کی کوششیں کی ہیں، ان کو نقل کرنے کے بعد انتہائی آسان اور قابلِ قبول اسلوب بیان میں اُن کا رد کیا ہے۔

۴۔ حضرت کیرانوی نے عقیدۂ تثلیث کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر اور اس کا علمی تجزیہ کرکے دکھایا ہے

کہ کوئی بھی صاحبِ عقل وفہم اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

۵۔ حضرت کیرانوی نے صرف یہی نہیں کیا کہ عیسائیت کے عقائد اور ان کے صحیفوں کی حقیقت کھول کر دکھا دی بلکہ قرآن کریم پر جو ان کے اعتراضات رہے ہیں، اس کا بھی تشفی بخش جواب دیا اور دکھایا کہ قرآن کریم کے کتاب اللہ ہونے میں کوئی شک کی گنجائش نہیں، اس سلسلہ میں عیسائیوں کے پیدا کردہ شبہات کا جواب دیا اور اسی سلسلہ میں رسول ﷺ کی سیرت مقدسہ اور معجزات کو بیان کیا اور آپ ﷺ کے حق میں انبیائے سابقین نے جو بشارتیں دی ہیں ان میں سے اشارہ بشارتوں کا ذکر کیا۔

ان اسباب کی بنا پر کتاب کی اہمیت بڑھ گئی اور ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی، ایک ترکی عالم نے اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام، "ابراز الحق" رکھا۔ ایک صاحبِ قلم نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو ہند و پاکستان کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

مولوی غلام محمد راندیری نے اس کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا تھا، اردو میں مولانا اکبر علی سہارن پوری مرحوم نے تین جلدوں میں اس کا ترجمہ کیا تھا، جس کا نام "بائبل سے قرآن تک" ہے۔ اس پر مولانا محمد تقی عثمانی نے مفصل مقدمہ لکھا ہے جو محققانہ اور عالمانہ ہے اور اس لائق ہے کہ علیحدہ سے شائع ہو۔

عیسائیوں کے پادریوں کا یہ معمول رہا کہ جہاں یہ کتاب بازار میں آئی اس کے تمام نسخے خرید کر جلا دیے تاکہ لوگ پڑھ نہ سکیں، اس لیے بار بار اس کی طباعت ہوتی رہی، مراکش کی وزارتِ اوقاف وامور مذہبی نے اس کو بہت آب وتاب سے شائع کیا ہے۔

شیخ عبدالرحمن بک باجہ جی زادہ نے اپنی کتاب "الفارق بین الخالق والمخلوق" میں اس کتاب کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ علامہ رشید رضا نے "انجیل برنا باس" کے عربی ترجمہ کے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

عیسائیوں کے حلقے میں اس کتاب کے بارے میں کیا تاثر ہے وہ صرف ایک جملہ سے واضح ہو جاتا ہے، جو برطانیہ کے ایک اہم اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا،

"اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائیت کو کبھی فروغ نہیں ہو سکتا۔"

(بہ شکریہ "ذکر و فکر"۔ دہلی)

اضافہ بہ سلسلہ تراجم "اظہار الحق"

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے مقالے کے آخر میں "اظہار الحق" کے تراجم کا سرسری اندازہ

میں ذکر کیا ہے۔ امداد صابری مرحوم کے الفاظ میں [1] "یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومتِ عثمانیہ کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کیے گئے جن کو پادریوں نے خاص اہتمام اور کوشش سے تلف کیا۔" یورپ کی صرف دو زبانوں - فرانسیسی اور انگریزی - میں "اظہار الحق" کے تراجم ملتے ہیں مگر ان تراجم کی اشاعت میں عدالتِ عثمانیہ کا بظاہر کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا۔ فرانسیسی ترجمہ تیونس کے ایک طالب نے کیا تھا، جس کا نام مطبوعہ نسخوں میں درج نہیں، البتہ اس ترجمے پر نظرِ ثانی کا فریضہ پی سی۔ کارلٹی نے انجام دیا تھا۔ کارلٹی لندن یونیورسٹی میں عربی زبان کا استاد تھا اور ۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۷ء کے درمیان تیونس میں مقیم رہا تھا۔ اس نے اپنا تعارف آزاد خیال (Free Thinker) کی حیثیت سے کرایا ہے۔ وہ عقلیت کے حوالے سے اسلام کو مسیحیت پر ترجیح دیتا تھا اور "اظہار الحق" کے ترجمے کی اشاعت سے اس نے اپنے ذوق کو تسکین دی۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی زندگی میں ۱۸۸۰ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔ کارلٹی نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی رائے میں [2] "ترجمہ و تصحیح کے کام میں کافی محنت اور دیانت داری" سے کام لیا ہے۔

"اظہار الحق" کو گجراتی اور انگریزی میں منتقل کرنے کا سہرا راندیر (ضلع سورت - گجرات) کے معروف عالم مولانا غلام محمد راندیری (م ۱۹۱۶ء) کے سر ہے۔ مولانا راندیری نے عربی، فارسی اور اردو کی متعدد کتابوں کو اپنی زبان کا جامہ پہنایا تھا۔ مطالعۂ مذاہب سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ [3] "مخالفینِ اسلام سے مقابلہ و مناظرہ کرنے کا آپ کو خاص شوق تھا اور اس میں آپ کو ایک خاص مہارت ہو گئی تھی، بڑے بڑے پادری اور پنڈت وغیرہ آپ کے سامنے آتے ہوئے گھبراتے اور اکثر اوقات آپ کا نام سن کر دم چرا جاتے تھے۔" اسی دلچسپی کا نتیجہ "اظہار الحق" کے تراجم تھے۔ گجراتی ترجمہ ۱۹۱۸ء میں سورت سے شائع ہوا تھا۔ انگریزی ترجمہ اس کے بعد منصۂ شہود پر آیا۔

انگریزی ترجمے کے بارے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے سوانح نگار مولانا محمد سلیم کیرانوی نے لکھا ہے کہ [4]

"ٹائمز آف لندن" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہبِ عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی۔"

اور یہ بیان مسلسل دہرایا جاتا رہا ہے۔ [5] جب ۱۹۷۱ء میں "اظہار الحق" کا دوسرا اردو ترجمہ [6] "بائبل سے قرآن تک" شائع ہوا تو ڈاکٹر حمید اللہ نے اس بیان کی تائید و تصدیق کی کوشش کی۔ ان کے الفاظ میں [7]

میں نے ۱۹۷۲ء میں لندن ٹائمز کے ایڈیٹر ہی کو ایک خط لکھ کر پوچھا کہ آیا اظہار الحق پر کوئی تنقید کبھی اس کے ہاں چھپی ہے؟ اور میں نے احتیاطاً لکھا کہ فرانسیسی ترجمہ ۱۸۸۰ء میں چھپا ہے۔ ممکن ہے کہ انگریزی ترجمہ بھی اس کے لگ بھگ زمانے میں چھپا ہو یا یہ بھی ممکن ہے

کہ فرانسیسی ترجمے ہی پر لندن ٹائمز میں تنقید چھپی ہے۔ جواب آیا کہ ان کے ہاں برسہا برس کے اخبار و جرائد کے انڈکس مرتب ہوتے ہیں لیکن تلاش پر نہ ان میں اور نہ دیگر فہارس کتب میں ایسی کتاب کا کوئی ذکر ملا۔ میں نے لکھا کہ انگریزی نہیں، فرانسیسی کتاب کی تنقید ہوئی ہو گی۔ دوسرا جواب بھی نفی ہی میں آیا۔ کسی روزنامے کے تقریباً سو سال پہلے کے نمبروں میں، جب تک ٹھیک تاریخ بھی معلوم نہ ہو کسی چند سطری تحریر کا پتہ چلانا آسان نہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے آخر میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ "لندن ٹائمز" کے تبصرے کی تلاش کے لیے "دیدہ وری" بہرحال ضروری ہے۔ مولانا غلام محمد رامپوری کا انگریزی ترجمہ زبان و بیان کے اعتبار سے خاصا پرانا ہے اور بہت عمدہ بھی نہیں۔ اس لیے ایک جدید ترجمے کی ضرورت تھی۔ مولانا محمد ولی رازی نے اس کا بیڑہ اٹھایا ہے اور لندن سے اس کے چند حصے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ محمد سلیم، ایک مجاہد معمار، مکہ معظمہ: مرکزی دفتر دارالعلوم حرم صولتیہ (۱۹۵۴ء)، ص ۲۶، امداد صابری، آثارِ رحمت، دہلی: یونین پرنٹنگ پریس (۱۹۶۷ء)، ص ۳۸۳

۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، اظہار الحق اور اس کا اردو ترجمہ، ماہنامہ "البلاغ" (کراچی)، مئی ۱۹۷۲ء ص ۲۳

۳۔ مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، گجرات کے چند برگزیدہ اور باکمال علمائے کرام، ماہنامہ "البلاغ" (بمبئی)، دسمبر ۱۹۵۴ء، جنوری و فروری ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۹

۴۔ محمد سلیم، ایک مجاہد معمار، حوالہ مذکورہ، ص ۲۶

۵۔ مثال کے طور پر دیکھیے: امداد صابری، حوالہ مذکورہ، ص ۳۸۳، محمد انیس الرحمن قاسمی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ردِ مسیحیت (مقالہ)، زبانِ حال: دارالعلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کراچی: ٹیکنیکل پرنٹرز (۱۹۸۷ء)، ص ۱۴

۶۔ "اظہار الحق" کا پہلا اردو ترجمہ مولوی سلیم اللہ نے کیا تھا جو چھپ نہ سکا۔

۷۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، حوالہ مذکورہ، ص ۲۱

(عالم اسلام اور عیسائیت، جولائی ۹۳ء)

اختر راہی

منشورِ محمدی

(مسلم - مسیحی مناظراتی ادب کا ایک نمائندہ جریدہ)

برصغیر پاکستان و ہند میں مسیحی مشنریوں کی آمد کے ساتھ دعوت و تبلیغ میں جن نئے ذرائع کا اضافہ ہوا، ان میں اخبارات و جرائد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اگرچہ برصغیر میں پرنٹنگ کی صنعت پرتگیزوں کے ساتھ آ گئی تھی اور سولھویں صدی سے یہاں چھاپہ خانوں کا وجود ملتا ہے تاہم پرنٹنگ کی صنعت سے بڑے پیمانے پر فائدہ انیسویں صدی میں اٹھایا گیا۔ بعض مشنری اداروں نے اپنے پریس قائم کیے اور ان پریسوں کے ذریعے نہ صرف مقامی زبانوں میں بائبل کے تراجم اور مسیحی کتب شائع ہوئیں بلکہ مسیحی مناددں نے مقامی زبانوں کے سیکھنے کے لیے جو محنت کی تھی، اس کے نتیجے میں زبان دانی کے حوالے سے بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔

مسیحی مشنری ادارے جن سرگرمیوں میں مصروف تھے، ان کے پروپیگنڈے کے لیے انھیں کتابوں سے زیادہ رسائل و جرائد کی ضرورت تھی۔ اس پر مستزاد "کتاب" اپنے اندر تمام خوبیاں رکھنے کے باوجود اس "کمی" سے خالی نہیں ہوتی کہ اس میں بیک وقت مختلف موضوعات پر نہیں لکھا جاسکتا جب کہ جرائد اور رسائل میں وقت کی ضرورت اور قارئین کی پسند و ناپسند کے مطابق موضوعات کا انتخاب کیا جاسکتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس پر کم و بیش لکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مسیحی اداروں کی طرف سے برصغیر کی تقریباً ہر اُس زبان میں رسائل و جرائد شائع ہوئے جس میں لکھنے پڑھنے کی روایت چلی آرہی تھی۔

انیسویں صدی میں مسیحی اداروں اور افراد کی طرف سے متعدد رسائل و جرائد شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض کے بارے میں مزید کم معلومات حاصل ہیں کیوں کہ آج ان رسائل سے دنیا کے معروف ذخائر کتب خالی ہیں تاہم ۱۸۳۶ء سے ۱۹۰۰ء تک مسیحی اداروں کی جانب سے جو اُردو رسائل جاری ہوئے۔ اُن میں حسبِ ذیل نمایاں ہیں۔

* ۱۸۳۶ء صدرالاخبار (آگرہ)
* ۱۸۳۷ء خیر خواہِ ہند (مرزاپور)

* ۱۸۵۹ء باسداد (بمبئی)
* ۱۸۶۳ء خیر خواہ خلق (سکندرہ)
* ۱۸۶۷ء مواعظِ عقبیٰ (دہلی)
* ۱۸۶۸ء حقائق عرفان (امرتسر)
  مخزنِ مسیحی (الہ آباد)
  کوکبِ عیسوی (لکھنؤ)
* ۱۸۶۹ء کوکبِ ہند (لکھنؤ)
  شمس الاخبار (لکھنؤ)
* ۱۸۷۳ء نور افشاں (لدھیانہ)

برصغیر کے مسلمان صحافیوں نے جو رسائل اور اخبارات جاری کیے، ان میں عمومی طور پر مسیحی اخبارات سے اخذ واقتباس کے ساتھ ان پر تنقید بھی ہوتی تھی۔ مسیحی مبلغین کی سرگرمیوں سے وہ چنداں خوش نہ تھے مگر وہ مسیحی اہل علم کے مقالات پر تنقید اور دینی حوالے سے اپنا نقطۂ نظر تفصیل سے بیان نہ کرتے تھے۔ تاہم علمائے کرام نے مسیحی مناظروں کے جرائد ورسائل میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب دینے کے لیے جوابی رسائل جاری کیے۔ انیسویں صدی کے ان رسائل میں نمائندہ جریدے کی حیثیت بنگلور سے شائع ہونے والے دہ روزہ "منشور محمدی" کو حاصل تھی۔

"منشور محمدی" ابتداءً ہفت روزہ "قاسم الاخبار" (بنگلور) کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوتا تھا۔ "قاسم الاخبار" بنگلور کے منشی محمد قاسم متخلص بہ قم نے ۱۸۶۱ء میں جاری کیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں یہ ہفت روزہ سے پندرہ روزہ ہوگیا۔ "تاج التواریخ" نے "قاسم الاخبار" کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔[1]

قاسم الاخبار بنگلور سے پندرہ روزہ جاری ہے جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے۔ پرانا اخبار بڑی تقطیع پر اس آب و تاب سے نکلتا ہے جیسے کہ باروانق اخبار کو نکلنا چاہیے۔ اس اخبار میں پرانا اور نیا دونوں رنگ عمدہ ہیں۔

منشی محمد قاسم شعر وادب کے ساتھ تقابل ادیان سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے مسیحیت کا بالخصوص مطالعہ کیا تھا اور مسیحی مناظروں کا توڑ کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ۲۲ مئی ۱۸۷۳ء کو ان کی کوششوں سے "انجمن اسلامیہ" (بنگلور) وجود میں آئی جس کے مقاصد میں سرفہرست مسلمانوں کو مسیحی پروپیگنڈے سے بچانا اور مسیحیوں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا تھا۔ انجمن کے صدر مولوی عبدالحی اور سیکرٹری منشی محمد قاسم قم تھے۔

۲۵ اگست ۱۸۷۳ء/ ۱ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۸ھ کو منشی محمد قاسم نے "قاسم الاخبار" کے ضمیمے کی حیثیت سے دہ روزہ "منشور محمدی"[2] جاری کیا۔ ہر مہینے کی ۵، ۱۵ اور ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ شوال

۱۳۰۴ھ/جولائی ۱۸۸۷ء میں خریداروں کی عدم سرپرستی کے باعث بند ہو گیا۔ تاہم اس کی کمی شدت سے محسوس کی گئی اور محرم ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں اس کی اشاعت از سر نو شروع ہو گئی۔

منشی محمد قاسم کے بعد "منشور محمدی" کی ادارت منشی محمد شریف کے ہاتھ میں آئی۔ چودھری شیخ مولا بخش نے "مراسلات مذہبی" میں "منشور محمدی" کے بارے میں لکھا ہے۔[3]

> اس میں لائق لائق کارسپانڈنٹوں کے مضامین عیسائیوں کے رد میں طبع ہوتے ہیں اور ہر قسم کے اعتراضوں کے جواب اس میں چھپا کرتے ہیں۔ اس فن کے شائقین کو اس کا دیکھنا بہت ضروری ہے۔ بالفعل اس کے مہتمم جناب منشی محمد شریف صاحب ہیں۔ اللہ اُن کی سعی کو مشکور کرے --- اب نہ معلوم یہ رسالہ نکلتا ہے یا نہیں۔

"منشور محمدی" (بنگلور) کے ابتدائی پرچے کریمی لائبریری بمبئی (انڈیا) میں محفوظ ہیں۔[4] جلد ۱۷ (بابت ۱۳۰۵ھ) کے ۳۴ اور جلد ۱۸ (بابت ۱۳۰۶ھ) کے ابتدائی ۲۱ شمارے پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں دیکھے جا سکتے ہیں۔[5]

"منشور محمدی" کی زبان و بیان اپنے وقت کے مناظرانہ انداز کے عین مطابق ہے۔ زیر بحث موضوع کے ساتھ مصنف یا مؤلف کی ذات بھی زیر بحث آ جاتی ہے تاہم "منشور محمدی" نے مسلم۔ مسیحی مناظراتی ادب میں وسیع اضافہ کیا۔ اس کے لکھنے والوں میں اس دور کے سب ہی مناظرین شامل تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی، مولوی چراغ علی (م ۱۸۹۵ء)، مولانا محمد علی کانپوری، شیخ رحیم بخش پٹیالوی اور کئی دوسرے اہلِ قلم کی تحریریں "منشور محمدی" کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

چودھری منشی مولا بخش مؤلف "مراسلاتِ مذہبی" نے "تردید عیسائیت" میں لکھی گئی ۱۸۸ کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی۔ اس فہرست میں ۱۸ ایسی کتابیں اکٹھے شامل ہیں جو پہلی بار "منشور محمدی" کے صفحات میں چھپے تھے، ذیل میں تفصیل دی جاتی ہے۔

* ابطال عقائد دین عیسوی (تفضل حسین معین الواعظین) [جلد ۱۶ (۱۳۰۴ھ)]
* اجلی برہان بہ تمہید القرآن

  یہ رسالہ "عدم ضرورت قرآن" (پادری ٹھاکر داس) کا جواب ہے۔ [جلد ۱۶، شمارہ ۲۰ (۱۳۰۴ھ)]
* تبصرہ

  اُن قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر ہے جن سے مسیحی اہل علم بائبل کی حقانیت ثابت کرتے ہیں [جلد ۱۳ - شمارہ ۲-۶ (۱۳۰۱ھ)]
* تحفۃ الاریب فی الرد علی اہل الصلیب (عبداللہ)

  اس رسالے کے مؤلف نے مسیحیت ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا اور ۸۲۳ھ میں یہ رسالہ

تالیف کیا تھا۔ تحفۃ العرب کا اولین ترجمہ مشکوٰۃ محمدی [جلد ۸ (۱۲۹۶ھ)] میں شائع ہوا۔ بعد میں اس رسالے کا ترجمہ قاضی شمس الدین کے قلم سے "آئینہ عیسائیت" [راولپنڈی: اسلامی مشن (۱۹۶۱ء)] کے نام سے شائع ہوا۔

- تنویر الایمان (محمد عبدالغفور عظیم آبادی)

  ایک مسیحی پمفلٹ "وجۃ الایمان" کا جواب ہے۔ [جلد ۱۶، شمارہ ۱۱ (۱۳۰۴ھ)]
- تحریر دلپذیر (الفت حسین) [جلد ۴ - شمارہ ۲۴]
- دافع الاوہام (مولانا رحمت اللہ کیرانوی)

  مولانا رحمت اللہ کی فارسی تالیف "ازالۃ الاوہام" کا اردو ترجمہ ہے جو مولوی نور محمد مہتمم مدرسہ حقانی لدھیانہ نے کیا ہے۔
- دافع الغالیط فی بحث الفارقلیط (محمد عبداللہ - مدرس کلکتہ) لفظ "فارقلیط" پر بحث کی گئی ہے۔ [جلد ۱۵، شمارہ ۲ (۱۳۰۳ھ)]
- دافع طعن نکاح زینب

  ماہنامہ "نور افشاں" (لدھیانہ) کے مضمون مطبوعہ ۱۸۸۶ء کا جواب ہے جس میں ام المومنین حضرت زینبؓ کے نکاح کے بارے میں اعتراضات کیے گئے ہیں۔ [جلد ۱۶، شمارہ ۵۵ (۱۳۰۴ھ)]
- الدلیل القوی لرد زینۃ العیسوی (محمد حفیظ بلیاوی)

  یہ رسالہ نصیر الدین عیسائی کے کتابچہ "زینۃ العیسوی" کا جواب ہے۔ [جلد ۱۶، شمارہ ۲۱ (۱۳۰۴ھ)]
- السیف المسدی علی معتقدات الکندی (محمد عبداللہ - مدرس کلکتہ) [جلد ۱۶، شمارہ ۳ (۱۳۰۴ھ)]
- صیانۃ الایمان من تراجم القرآن (محمد عبداللہ - مدرس کلکتہ)

  قرآن مجید کے ان تراجم پر تنقید و تبصرہ ہے جو غیر مسلموں نے انگریزی اور فرانسیسی وغیرہ زبانوں میں کیے ہیں۔ [جلد ۱۶ - (۱۳۰۴ھ)]
- کلمات طیبات [جلد ۶، شمارہ ۱۳ (۱۲۹۴ھ)]
- مسکت الخصیم (حبیب علی ساکن مین پوری)
- کعبہ کی جانب سجدہ کرنے اور حجر اسود کو بوسہ دینے وغیرہ کی بابت اعتراضات کا جائزہ ہے۔ [جلد ۴ (۱۲۹۴ھ)]
- معجزات محمدی (بدیع الزمان)

  معجزات نبویؐ کی صداقت پر گفتگو ہے۔ [جلد ۱۷، شمارہ ۱۳ (۱۳۰۵ھ)]
- معراج حسینی (حکیم محمد حسن امروہی) [جلد ۱۹ (۱۳۰۹ھ)]

* سیرۃ المسیح (منشی اللہ دیا لدھیانوی)
پادری عمادالدین کے رسالہ "تحقیق سیرِ عیسوی" (مطبوعہ ۱۲۹۲ھ) کا جواب ہے۔ [جلد ۸ (۱۲۹۲ھ)]
* نصرت احمدیہ (احمد حسن)
پادری عمادالدین اور مولانا محمد عمر کے مابین مذہبی گفتگو ہے۔ [جلد ۱۸ (۱۳۰۲ھ)]

حواشی

۱۔ بحوالہ امداد صابری، تاریخ صحافت اُردو، جلد دوم (حصہ اوّل)، دہلی: جدید پرنٹنگ پریس (س-ن)، ص ۱۴۳۰

۲۔ سیّد محمد الحسنی نے "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" میں لکھا ہے کہ "۱۲۸۸ھ میں اُنھوں [مولانا مونگیری] نے [رد عیسائیت کے] مقصد کے لیے کانپور سے ایک اخبار "منشور محمدی" جاری کرایا اور اس میں عیسائیت کی تردید اور اُن کے عقائد کے ابطال میں مضامین شائع کرنا شروع کیے۔" [سیّد محمد الحسنی، سیرت مولانا محمد علی مونگیری، کراچی: مجلس نشریات اسلام (س-ن) ص ۳۸]

"منشور محمدی" کانپور سے نہیں بنگلور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں مولانا محمد علی مونگیری شامل تھے مگر اس کا اجراء اُن کی کوششوں سے نہیں ہوا تھا۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۹ھ میں جب کہ "منشور محمدی" کا اجراء ہوا تو مولانا محمد علی مونگیری کی عمر بمشکل ۲۰ سال تھی۔

مولانا محمد علی مونگیری نے ۱۸۹۲ء میں ایک جریدہ "تحفہ محمدیہ" کانپور سے جاری کرایا تھا۔ تبلیغ "(جبل پور) نے تحفہ محمدیہ پر یکم دسمبر ۱۸۹۳ء کے شمارے میں حسب ذیل تبصرہ شائع کیا ہے۔

> یہ ماہواری رسالہ محض اسلام کی تائید اور مسلمانوں کی ہمدردی کے لیے شائع ہوتا ہے۔ عیسائیت کی تردید بہت زور سے کرتا ہے۔ اسلام کی حقانیت و صداقت پُر زور دلائل سے ثابت کرتا ہے۔" [بحوالہ امداد صابری، تاریخ صحافت اُردو، جلد سوم، دہلی: جدید پرنٹنگ پریس (۱۹۶۳ء)، ص ۵۸۴]

۳۔ چودھری شیخ مولا بخش، مراسلات مذہبی (حصہ اوّل)، مونگیر: مطبع رحمانیہ (۱۳۴۱ھ)، ص ۴۰

۴۔ دیکھیے امداد صابری، تاریخ صحافت اُردو جلد ۲، حوالہ مذکورہ، ص ۳۰

۵۔ ملک احمد خواں، اردو اخبارات و رسائل مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ لاہور، ماہنامہ "کتاب" (لاہور)، اکتوبر ۱۹۶۶ء، ص ۷۶

۶۔ چودھری مولا بخش، حوالہ مذکورہ، ص ۱۳-۴۰

(عالم اسلام اور عیسائیت، جولائی ۹۳ء)

تاریخی ناول "ظہیر الدین بابر"

قارئین کے لیے یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی
کہ پچھلے سال تک تاشقند میں "رادوگا" اشاعت گھر کی شاخ
اردو میں بھی کتابیں شائع کرتی رہی۔ ان میں زیادہ تر کتابیں
جدید دور کے ادیبوں کی تخلیقات ہیں۔ مثال کے طور پر
مجموعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس کا عنوان ہے "ممتاز
سوویت افسانہ نگار"۔ اس مجموعہ میں تیس برس (۱۹۲۰ء تا
۱۹۵۰ء) کے سوویت ادب کے ارتقاء کا اظہار ہوتا ہے۔
اس میں میکسم گورکی، الکسیئی تالستائی اور میخائیل شولوخو
جیسے معروف نمائندہ ادیبوں کی کہانیاں شامل ہیں۔ شاندار
ادبی اسلوب کے مالک دوسرے نثر نگار اندریئی
پلاتونوف، کنستانتین پاؤستوفسکی اور لیونید سولوئیف کی
ان کہانیاں پڑھ کر قاری کو متنوع سوویت تہذیب کے
بارے میں واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس
مجموعے کا ہر افسانہ خواہ وہ قدرت سے متعلق پاؤستوفسکی کا
افسانہ ہو، خواہ ایک محنت کش سے متعلق پلاتونوف
کا ناول افسانہ اپنے اپنے انداز سے دلچسپ ہے اور قارئین
کو متاثر کرے گا۔

ریاستی انعام یافتہ روسی ادیب بورس واسیلئیف
بہت سے ملکوں میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی
کتاب "سحر پر سکون ہے یہاں ---" پانچ نوجوان
سوویت لڑکیوں اور ایک سارجنٹ میجر کی شجاعت و
بہادری کی داستان ہے جنہوں نے نازیوں کے خلاف
جنگ میں اپنی زندگیاں قربان کیں لیکن پھر بھی ان کو
گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

تاشقند سے اردو میں ایک شائع شدہ کتاب الکسیئی
تالستائی کا ناول "دوشیزہ مریخ" ان کا ایک سائنسی حیالی
ناول ہے۔ اس میں مریخ سیارے کی طرف حسن پیداوار کا
تصور پیش کیا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم کی
قوت کا آخری اور واحد مقصد بنی نوع انسان کی بھلائی ہوتی
ہے اور اس کے برعکس جہالت اور کثر پرستی برائی و
بدی پیدا کر سکتی ہے۔

تاشقند کی شاخ میں اردو میں کئی سوویت ریپبلکوں
مثلاً ازبکستان، آذربائیجان اور آرمینیا کے ادیبوں کی
تخلیقات شائع کی گئیں۔ پریمقل قادروف نامور ازبک
سوویت ادیب ہیں جن کا تاریخی ناول "ظہیر الدین بابر"
ان کی عالیہ تصانیف میں سے ایک ہے۔ مصنف نے اس
ناول میں ظہیر الدین محمد بابر کی متاثر کن شخصیت کی
بڑے بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔ بابر سولہویں صدی
میں ماوراء النہر اور ہندوستان جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا
حکمران ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے زمانے کے بہت ہی
عالم و فاضل اور روشن خیال افراد میں بھی شمار کیا جاتا تھا۔

"اخبار اردو" جولائی ۱۹۹۳ء

ضمیمہ ۲

بعض اہم مضامین جو پیش نظر مجموعے کی ضخامت بڑھتے جانے کے سبب ضمیمہ نمبر۱ میں شامل نہیں کیے جاسکے مندرجہ ذیل ہیں۔

ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب	احسن گنوری	ابر	جولائی۔دسمبر ۱۹۹۳ء
استنبول کے کتب خانوں میں البیرونی کے مخطوطات	ڈاکٹر محمد صابر خاں	معارف	اکتوبر ۱۹۹۳ء
مفتاح الخزائن	ترجمہ، نثار احمد فاروقی	منادی	۸/۶۸
بحر المعانی اور اس کے مصنف	مسعود انور کاکوری	"	۱۲/۶۸
حضرت بابا فرید اور ان کا پنجابی کلام	ترجمہ، نثار احمد فاروقی	"	۸/۶۸
مفتی شوکت علی فہمی	آصف علی فہمی	"	۷/۶۸
شعری بھوپالی	رحمت امروہوی	گلبن	اکتوبر ۱۹۹۳ء
مولانا محی الدین احمد قصوری	محمد اسحاق بھٹی	المعارف	جولائی ۱۹۹۳ء
تاباں صاحب: ایک رند پارسا	عبداللہ ولی بخش قادری	ابر	جولائی۔دسمبر ۱۹۹۳ء
وامق جونپوری کی خود نوشت، علی گڑھ اور کلکتہ	وامق جونپوری	نشور	اکتوبر ۱۹۹۳ء
اردو پڑھ کر کیا ہوگا؟ (اداریہ)	ظفر ہاشمی	گلبن	جولائی، اگست ۱۹۹۳ء
ہندوستان میں اردو کس کی زبان ہے!	" "	"	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۳ء
آج مسلمان دنیا سے رخصت ہوتے وقت معلوم ہوتا ہے وہ مسلمان ہے۔	مولانا ابو الحسن علی ندوی	ہدایت (جے پور)	دسمبر ۱۹۹۳ء
کتاب تقلید و اجتہاد کے مسائل	مولانا رشید احمد گنگوہی	اذان بلال	ستمبر ۱۹۹۳ء
تحقیق کا اسلامی منہاج	صلاح الدین عمری	حیات نو	اکتوبر ۱۹۹۳ء
مکاتب و مدارس اسلامیہ میں ذریعۂ تعلیم کیا ہو۔	تاج محمد صدیقی	"	" "
جدید تعلیمی تجربات سے استفادہ پر غور و فکر کے لیے کمیٹی کا قیام۔	منصور عالم	"	" "

ہندوستان میں احیاء شریعت کی لہر	ممتاز احمد ندوی	البلاغ	اکتوبر ۱۹۹۳ء
ہندوستانی مسلمان کدھر؟	انقلاب مسلم کانفرنس	آل انڈیا مسلم کنونشن نمبر	دسمبر ۱۹۹۳ء
حضرت بل درگاہ کا المیہ	رشید احمد جالندھری	المعارف	اگست ستمبر ۹۳
اسلامی دانشوروں کا نظریۂ تقسیم علوم	مہدی محقق	آیات	ستمبر۔ دسمبر ۹۳
جے سنگھ کورٹ کے مسلم ماہرین فلکیات	وریندر۔ این۔ شرما	"	" "
فیض احمد فیض کا "گاؤں والے"	وشیلی شوکش مترجم فیض احمد فیض	آج (کراچی)	جولائی۔ دسمبر ۹۳
داراشکوہ	سید ابوالخیر مودودی (مرحوم)	المعارف	اکتوبر ۱۹۹۳ء
حیات سرمد پر ایک نظر (تعارف)	" " "	"	جولائی ۱۹۹۳ء

ضمیمہ ۳

"اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں"

مکمل فہرست

فہرست

تشکیل (کراچی) ۵۸
تعمیر ہریانہ (چنڈی گڑھ) ۵۹
تلاش جدید (نئی دہلی) ۶۰
تمثال (کراچی) ۶۱
توازن (مالیگاؤں) ۶۳
توحید (ایران) ۶۴
تہذیب (کراچی) ۶۸
تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) ۶۹
جامعہ (دہلی) ۷۰
جدید فروغ اردو (لکھنؤ) ۷۰
جمنانٹ (ہریانہ) ۷۱
چہار رنگ (دہلی) ۷۲
چھاؤں (دہلی) ۷۲
حجاز جدید (دہلی) ۷۳
حریم (لکھنؤ) ۷۵
حیات نو (بارہ بنکی، مئو) ۷۶
خاتون مشرق (دہلی) ۷۷
خبر نامہ (لکھنؤ) ۷۸
خدابخش لائبریری جرنل (پٹنہ) ۷۹
خیام (کانپور) ۸۴
دارالسلام (مالیرکوٹلہ) ۸۵
دارالعلوم (دیوبند) ۸۵
دانش (اسلام آباد) ۸۶

دائرے (کراچی) ۸۶
دریافت (کراچی) ۸۸
دستک (ڈھاکہ) ۸۹
دعوت صادق (پٹنہ) ۹۱
دعوت و عزیمت (دہلی) ۹۲
دوشیزہ (کراچی) ۹۳
دین دنیا (دہلی) ۹۴
ذہن جدید (دہلی) ۹۵
راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) ۹۷
راہ اسلام (دہلی) ۹۸
راہ اعتدال (عمرآباد) ۹۹
رفیق منزل (دہلی) ۱۰۰
روح ادب (کلکتہ) ۱۰۱
روشن خیال (کراچی) ۱۰۲
رہبر صنعت و تجارت (کلکتہ) ۱۰۳
رہگذر (حیدرآباد) ۱۰۳
ریاض الجنۃ (جونپور) ۱۰۴
زبان و ادب (پٹنہ) ۱۰۵
زرین شعاعیں (بنگلور) ۱۰۶
زندگی نو (نئی دہلی) ۱۰۷
سائنس کی دنیا (نئی دہلی) ۱۰۷

سب رس (حیدرآباد) ۱۰۸
سب رس (کراچی) ۱۰۹
سچی کہانیاں (کراچی) ۱۱۰
سرمایہ (کلکتہ) ۱۱۱
سنی دنیا (بریلی) ۱۱۲
سوغات (بنگلور) ۱۱۳
سہیل (گیا) ۱۱۶
شاعر (بمبئی) ۱۱۷
شان ہند (دہلی) ۱۱۸
شب خون (الٰہ آباد) ۱۱۸
شمع (نئی دہلی) ۱۱۹
شہود (کلکتہ) ۱۲۰
صحیفہ (لاہور) ۱۲۱
صدا رنگ (نئی دہلی) ۱۲۲
صریر (کراچی) ۱۲۳
صفا (حیدرآباد) ۱۲۴
ضیاء وجیہ (رامپور) ۱۲۵
طلوع افکار (کراچی) ۱۲۶
عالم اسلام اور عیسائیت ۱۲۷
علم و ادب (علی گڑھ) ۱۲۸ / ۱۲۹

علوم القرآن (علیگڑھ) ۱۳۰
غالب نامہ (نئی دہلی) ۱۳۱
فروغ ادب (بھونیشور) ۱۳۲
فکر و عمل (بہار شریف) ۱۳۳
فکر و نظر (اسلام آباد) ۱۳۳
فکر و نظر (علیگڑھ) ۱۳۶
فنون (لاہور) ۱۳۷
فیض الاسلام (راولپنڈی) ۱۴۰
قومی راج (بمبئی) ۱۴۱
قومی زبان (کراچی) ۱۴۲
کتاب نما (نئی دہلی) ۱۴۳
گفتگو (بمبئی) ۱۴۴
گلبن (احمدآباد) ۱۴۷
گلستان اردو (بنگلور) ۱۴۸
متاع آخرت (کانپور) ۱۴۹
مجرم (نئی دہلی) ۱۵۰
مجلہ الکتبہ اسلامیہ (قیم شیخ سلامی) (لاہور) ۱۵۱
مجلہ بدایوں (کراچی) ۱۵۲
مجلہ تحقیق (لاہور) ۱۵۳

رسالے جو تاخیر سے شائع ہوتے ہیں

ضمیمہ-۱

ضمیمہ - ۲

تصحیحات

اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں

صفحہ / کالم / سطر	
چار / ۱ / ۱۵	حریم (لکھنؤ)
چار / ۱ / ۱۶	حیات نو (جریا گنج، اعظم گڑھ)
چار / ۲ / ۱۰	راہ اسلام (دہلی)
پانچ / ۲ / ۶	نقوش حیات (اُبرولی بازار، بستی)
پانچ / ۲ / ۱۶	ضیاء (سر ضیاء الدین ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۱۸
پانچ / ۲ / ۱۷	عصری آگہی (دہلی)، ۲۱۹
پانچ / ۲ / ۱۸	علی گڑھ میگزین (علیگڑھ)، ۲۲۱
پانچ / ۳ / ۹ — ۱۹۴ / ۳ / ۱	فصیل (کرناٹک)، ۲۲۳
پانچ / ۳ / ۱۰ — ۱۹۴ / ۳ / ۲	فکر و تحقیق (دہلی)، ۲۲۴
پانچ / ۳ / ۱۱ — ۱۹۴ / ۳ / ۳	فن اور شخصیت (بمبئی)، ۲۲۵
پانچ / ۳ / ۱۲ — ۱۹۴ / ۳ / ۴	قومی زبان (آندھرا پردیش)، ۲۲۶
پانچ / ۳ / ۱۳ — ۱۹۴ / ۳ / ۵	کاوش (لاہور)، ۲۲۸
پانچ / ۳ / ۱۴ — ۱۹۴ / ۳ / ۹	محسن (محسن الملک ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۲۹
پانچ / ۴ / ۵ — ۱۹۴ / ۴ / ۱	معیار تحقیق (ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ) ۲۳۱
پانچ / ۴ / ۴ — ۱۹۴ / ۴ / ۲	نیا دور (کراچی)، ۲۳۶
پانچ / ۴ / ۶ — ۱۹۴ / ۴ / ۳	وقار (وقار الملک ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۳۴

اوراق پارینہ

"جامع الاخلاق"

از قاضی عبدالودود صاحب عظیم آبادی بی اے

انیسویں صدی کی ابتدا میں نثر اردو کو ترقی دینے کے لئے ڈاکٹر گلکرسٹ اور ان کے ساتھیوں نے جو کوششیں کی تھیں ان کا تذکرہ آزاد نے آب حیات میں اور مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو نے گلشن ہند کے مقدمہ میں کیا ہے، جو معلومات ان حضرات نے بہم پہونچائی ہیں قابل قدر ضرور ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس عہد کی ایک ایسی کتاب جس کا ذکر اس لحاظ سے کہ کسی قدیم مستند علمی کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی، سب سے مقدم ہونا چاہئے تھا سرے سے نظر انداز کر دیا، چونکہ اس کتاب کی اہمیت کے متعلق اختلاف رائے ناممکن ہے، اس لئے یقین ہے کہ یہ کتاب ان حضرات کی نظر سے نہیں گذری، میری مراد علم الاخلاق کی مشہور و معروف کتاب "اخلاق جلالی" کے اردو ترجمہ سے ہے جس کو [illegible] میں مولوی امانت اللہ نے کپتان جیمس موئٹ کے حکم سے مکمل کیا، اور اس کا نام "جامع الاخلاق" رکھا۔

مترجم کا نام مولوی امانت اللہ ہے، ان کے مولد و موطن کا کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا، ان کی علمی قابلیت ضرور رہی ہوگی ورنہ ایک دقیق علمی کتاب کے ترجمہ کی خدمت ان کے سپرد نہ کی جاتی، فورٹ ولیم کالج میں یہ منشی تفریق ہندی تک کے تھے، ایک کتاب "ہدایت الاسلام" بھی انہوں نے لکھی تھی جس کا ذکر وہ دیباچہ میں کرتے ہیں، شاعر بھی تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے، چنانچہ خاتمہ اور دیباچہ میں ان کی طبعزاد اور دعائیہ نظمیں موجود ہیں، پایۂ شاعری بہت ادنیٰ ہے، غالباً اسی وجہ سے کسی تذکرہ نگار نے ان کا حال نہیں لکھا بلکہ نام تک درج کرنا غیر ضروری سمجھا، یہ ترجمہ انہوں نے ۱۸۰۵ء میں جبکہ مارکوئس ولزلی گورنر جنرل تھے

کپتان ممیس مونٹ سدس مستشرق ہندی مدرسۂ عالیہ تمام اقبال کی ترکیب سے تکمیل کو پہونچایا۔ دیباچہ میں مترجم نے ان دونوں صاحب بہادروں کی علم دوستی میں بہت مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔

اصل کتاب میں کیا کچھ رد و بدل انھوں نے جائز رکھا ہے اور اصطلاحات کے متعلق کونسی روش اختیار کی ہے، اسکا بیان انھیں کے الفاظ میں مناسب ہوگا۔

"یہ کتاب نہایت مغلق اور دقیق المضمون اول سے آخر تک تمام مسائل عملی اور دقت نکات علمی سے مشحون ہے، اور ترجمہ کرنا اس کا مستلزم تحریر بیہودہ بیجا، اور اسقاط قواعد عقلانی کا ہے، بلکہ بمقتضائے تنگ حوصلگی کے صورت انتخاب کی مناسب نہ دیکھی، اور فضائل عقلی پر توکل کرکے اس میں اقدام کیا لیکن اس کے خطبے کے بعد دوسرا خطبہ جو [illegible] خیمہ اس ترجمے کا کرکے حکمت عملی کی تقسیم سے شروع کیا، اور حتی المقدور اس کی تسہیل میں کوتاہی نہیں کی مگر ان اصطلاحوں کا جنکا ترجمہ اس زبان میں ممکن نہیں ان شاء اللہ تعالی بعد اتمام کے ان اصطلاحوں کی تفسیر شناسی و کتابوں سے کرکے ہر ایک فرہنگ مختصر تخمیناً مقدار دو تین جزو کے آخر کتاب میں ملحق کیجائیگی، اور سوا اس کی زیادتی کرکے ترجمہ لفظی چھوڑ سہل ہونے کیلیے مطلب بیان کردیا ہے، ترتیب اس ترجمہ کی مطابق اصل کتاب کے باقی رہی۔"

فرہنگ جس کا ذکر انھوں نے کیا ہے یا تو وہ حسب ارادہ مرتب نہ کرسکے یا بعد میں طبع کرانے والوں نے غیر ضروری سمجھ کر حذف کردیا۔ میرے پاس اس کتاب کا جو نسخہ موجود ہے وہ مطبع احمدی کلکتہ میں اور ٹائپ میں مولوی غلام حیدر ساکن [illegible] گلی کے اہتمام سے [illegible] میں طبع ہوا تھا۔ صفحات کی تعداد ۴۹۰ ہے اور ہر صفحے میں ۲۰ سطریں ہیں۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن قرینہ ہے کہ یہ اس کتاب کا پہلا [illegible] اردو نثر کے اس ابتدائی زمانے میں ایک علمی کتاب کا ترجمہ کرنے میں کتنی دقتوں کا سامنا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہے۔ تاہم میں اپنی طرف سے یہ نہیں کہنا چاہتا کہ مترجم نے کس حد

کامیابی حاصل کی ہے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ ناظرین خود فیصلہ کرسکیں،

(۱)

حکمت طبیعی کی بحثوں سے علم نفس کی بحث میں مقرر ہوا ہے کہ نفس ناطقہ انسانی میں دو قوتیں ہیں، ایک قوت ادراکی جس کے سبب سے ہر ایک شی کو جان سکے، دوسری قوت تحریکی جس کے سبب ہر ایک طرح کا کاروبار کرسکے، پھر قوت ادراکی کے دو شعبے ہیں، پہلا عقل نظری وہ سبب ہے صور علمیہ کے قبول کرنے کا بروقت سے، دوسرا عقل عملی جس کے سبب سے ہر ایک آدمی اپنے بدن کو کاروبار میں مشغول کرتا ہے، پھر یہ شعبہ یعنی عقل عملی باعتبار علاقہ رکھنے اس کے قوت غضبی اور قوت شہوی کے ساتھ سبب ہوتا ہے فعل کا جیسا مارنا، کھانا، پینا، یا قبول فعل کا جیسے شرمندگی سے رونا، اور باعتبار اس کے کہ وہم و خیال اسے استعمال کریں سبب ہوتا ہے جزوی فکروں اور جزوی شغلوں کا، اور باعتبار نسبت کرنے عقل نظری کے ساتھ سبب ہوتا ہے اس فکر کلی کا جو سب کاموں سے علاقہ رکھے، جیسے معلوم کرنا اس کا کہ سچ کہنا اچھا، اور جھوٹ کہنا برا ہے اور مانند اس کے، پھر قوت تحریکی کے دو شعبے ہیں سے ایک قوت غضبی ہے اور وہ سبب ہے بری چیزوں کے دفع کرنے کا بطریق غلبے کے، دوسری قوت شہوی کہ وہ سبب ہے اچھی چیزوں کے لینے کا، لیکن قوت غضبی کو چاہئے کہ بدن کی سب قوتوں پر غالب رہے اس طور سے کہ ہرگز کسی سے کمزور نہ ہو بلکہ سب اس کے حکم کے تابع اور اس سے مغلوب رہیں، اور یہ قوت جس کو جس کام میں متعین کرے اس کو بخوبی انجام دیا کرے تاکہ آپس کی موافقت اور اس کی حکومت سے آفرینش انسان کی بادشاہت کا بندوبست اچھی طرح انجام پائے، اور کسی وجہ سے اس انتظام میں خلل دخل نہ ہوئے اگر اسی طرح سے ہر ایک قوت اپنے کام میں جس طور سے کہ عقل کے موافق ہو اقدام کرے تو عقل نظری کی صفائی سے جو پہلا شعبہ قوت ادراکی کا ہے حکمت حاصل ہوئے، اور عقل عملی کی صفائی سے جو دوسرا شعبہ ہے اسی قوت کا عدالت پیدا

ہوئے اور قوت غضبی کی درستی سے شجاعت، اور قوت شہوی کی صفائی سے پارسائی — اسی کا نام کمال قوت عملی ہے۔

(۲)

حکمت کی نوعوں میں سے مشہور سات نوع ہیں۔ ذکا، سرعت فہم، صفائی ذہن، سہولت تعلم، حسن تعقل، تحفظ، تذکر۔ ذکا وہ قوت ہے کہ بسبب اس کے مقدموں سے نتیجوں کو آسانی سے نکال سکے لیکن یہ موقوف ہے ان مقدموں کی مشاقی پر جو منتج ہیں۔ سرعت فہم نام ہے اس قوت کا جس کے سبب ملزومات سے ان کے لوازم کی طرف انتقال ذہن کا ہوئے بلا توقف۔ یہاں ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ پہلی سرعت حرکات فکری میں ہوتی ہے اور دوسری ان کے غیر میں جیسے ملزومات تصوریہ سے ان کے لوازم کی طرف انتقال کرنا، یا قضایا سے ان کے عکوس مستویہ یا عکس نقیض کی طرف۔ صفائی ذہن اس ملکۂ استعداد کو کہتے ہیں کہ بسبب اس کے بغیر رنج و تعب کے استخراج مطلب کر سکے۔ سہولت تعلم نام ہے استعداد کا جس کی وجہ سے توجہ کلی مطلوب کی طرف کیجئے تاکہ بخاطر جمعی آسانی سے اس کو حاصل کرے۔ حسن تعقل وہ ہے کہ بحث و مناظرے میں مطلب کی توضیح کرنے کے واسطے حد لائق کو نگاہ رکھ سکے تا بسبب غفلت کے کچھ اس پر واجب نہ ہو جائے اور نہ کسی شی زائد کو استعمال کرے۔ تذکر بے تکلیف یاد کرنا ان چیزوں کا جو قوت حافظہ میں ہیں جب چاہے۔ تحفظ اس ملکہ کا نام ہے کہ جس سے معقولات یا محسوسات کی صورتوں کو ضبط کرے۔

(۳)

عمل نے عدالت کی تمیز تین قسم پر کی ہے ایک وہ ہے کہ جس پر اقدام کرنا امر حق تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کیا جاوے کیونکہ اس کی مہربانی نے بہ صاحبۂ استحقاق کے خلعت وجود کے تئیں ہر ایک موجود کو انعام فرمایا اور بخزانہ احسان میں سے اس عالم امکان کی ہر ایک شی کو بے شمار نعمتوں سے نوازش کیا

پس مقتضاء عدالت کا یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے اور اس کے حق کے درمیان جو لازم ہے اس کے بجا
لانے میں اپنی ہمت کو لگا سکے اور اس کی بندگی کے چلن میں کسی طرح سے قصور نہ کرے۔ دوسری وہ
جو متعلق ہے اپنی نوع کے شہریان و بادشاہوں کی تعظیم یا علما اور ائمہ دین کی تکریم کرنی یا اوروں کو بیچ
معاملے میں انصاف کرنا۔ تیسری وہ ہے جو گذرے سے ان کے حق سے ادا ہوتا اس طور سے کہ ان کے
اموال میں سے ان کے قرضوں کو ادا کرے، وصیتوں کو بجا لاوے اور جو اس کی مثال سے ہو۔

(معارف: نمبر ۵ جلد ۱۱)

* هو الاول *

نام اِس کتاب سعادت انتساب کا

جامع الاخلاق ہی

وہ ترجمہ ہی لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی کا اردو زبان میں سنہ ۱۲۴۰ بارہ سو چالیس ہجری قدسی مطابق سنہ ۱۸۱۵ اٹھارہ سو پانچ عیسوی کے مولوی امانت اللہ مرحوم نے جو ورٹ ولیم کالج کے درمیان منشی تزوق ہندی کے تھے اسکو ترجمہ کیا تھا * اب سنہ ۱۲۶۴ بارہ سو چونسٹھ ہجری مطابق موافق سنہ ۱۸۴۸ اٹھارہ سو اٹھتالیس عیسوی کے

زبدۂ نوئینان عظیم الشان مشیر خاص ملکہ قمر رتبہ بارگاہ انگلستان

جمس اندرو ارل دلہوزي گورنر جنرل بہادر کے

حکومت کے وقت اور جناب معلی القاب عدل و انصاف کے باب

کرنیل استیمون دیوس ریلي بہادر کے

دور میں جو سکرتر کلکتے کے عربی مدرسے کے اور ممتحن کالج مرحوم کے اور بکمک جناب والا خطاب معدن اخلاق و آداب

میجر جارج ترنبل مارشل بہادر

سکرتر کالج مذکور کے ہیں

خادم الطلبہ احقر غلام حیدر

ساکن ہوگلی نے اس نسخے کو کلکتے کے بیچ مطبع احمدی میں،

تاکہ طالب العلموں کو اس سے فائدہ پہنچے

اور عاصی کو ثواب ملے

قطعہ

ہر ایک حکایت ہی حدیث لب شیرین

ہر ایک ورق اس کا نقاب رخ لیلی

گر خوان پہ تحسین کے سخن کی ہو مدارات

مہمان یہہ ہو اور رہوں سب اسکے طفیلی

—ooooo—

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد اُس کریم کارساز کو سزاوار ہی کہ جسنے جواہر اخلاق حمیدہ کو
اپنے دریاے کرم سے نو اسان بحر کمال کو بخشا * اور یاقوت خصائل
پسندیدہ کے تئین اپنے خزانۂ احسان سے طالبان مخزن فضائل کو
عنایت فرمایا * وہ ایسا حکیم ہی کہ اپنے فضل سے بیت المقدس
حکمت کو شیاطین جہالت سے محفوظ رکھا * سبحان اللہ کیا عادل
ہی کہ غایت انصاف سے تخت گاہ عدالت کو عدوان ظالم سے
بچایا * اور ثنا اسی پاک بے نیاز کی ہی کہ جسنے دامن عفت کو تئین

JAUMAY-OOL-UKHLAUQ

Translated

FROM PERSIAN AKHLAAUK & JULALEE INTO OORDOO

MOULVY AMAUNUT OOLLAH

UNDER THE PATRONAGE

OF

CAPTAIN J. MOUAT.

The late Professor of Hindoostanee in the College of Fort William in the year 1805

PRINTED

By

MOULVY GHULAM HYDER

SIRISHTADAR OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM

AT THE PERIOD

OF

S. D. RILEY LT. COLL.

Examiner of the College of Fort William and officiating Secy. in place of

MAJOR G. T. MARSHALL

SECY. TO THE COLLEGE OF FORT WILLIAM

CALCUTTA

1848.

مراسلات

دیوان حافظ

نسخۂ شاہان مغلیہ

عبدالرؤف خاں
اودی کلاں
سوائے مدھوپور (راجستھان)

کل دیوان حافظ نسخۂ شاہانِ مغلیہ بذریعہ وی پی موصول ہوا۔

دیوانِ حافظ کے حصۂ انگریزی ص ۳۲ پر حافظ کے سالِ وفات "خاکِ مصلیٰ" (۷۹۱ھ) کے علاوہ جو بہت بعد میں کہا گیا، ایک دوسرا قطعۂ تاریخ،

"بسال با و ضاد و دال ابجد" بھی دیا گیا ہے جس سے سالِ مطلوبہ ۷۹۲ھ کسی طرح مستفاد نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر نذیر احمد
علی گڑھ

نسخۂ شاہانِ مغلیہ کے انگریزی مقدمے کے صفحہ ۳۲ پر قطعۂ تاریخ کا مصرعۂ اوّل اس طرح چھپا ہے:

ع بسال با و ضاد و دال ابجد

اسے اس طرح ہونا چاہیے:

ع بسال با و صاد و ذال ابجد

اس طرح اس سے ۷۹۲ھ برآمد ہو سکیں گے۔

قاضی عبدالودود (مرحوم)

خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۴۳ (۱۹۸۸ء)

فہرست توصیفی مخطوطات فارسی جلد اول (انگریزی) نمبر ۱۵ صفحہ ۲۲۱ پر دیوانِ حافظ کے اُس شاہی نسخے کی تفصیل مذکور ہے جس پر ہمایوں اور جہانگیر کی خودنوشت تحریریں ہیں۔ فہرست نگار نے بر صفحہ ۲۲۰ کہا ہے کہ حافظ کے سنِ وفات ۷۹۲ھ کی دلیل میں مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ پیش کیا ہے:

بسال بآ و ضاد و دال ابجد — ز روز ہجرت میمون محمد
بسوی جنت اعلیٰ روان شد — زہد عہد شمس الدین محمد

اس قطعہ کو (بٓ + ضٓ + دٓ) ۸۰۶ مستخرج ہوتے ہیں۔ ریو نے بھی یہی غلطی کی ہے۔ جو مصرعِ اول کو جب تک اس طرح نہ پڑھا جائے ۷۹۲ مستخرج نہیں ہوں گے بسال با و صاد و ذال ابجد (بٓ + صٓ + ذٓ) مزید برآں بیت اول کا قافیہ محمد نہیں احمد ہونا چاہیے۔ اگر مصرع میں محمد موجود ہی ہے تو مصرعے موزوں بھی نہیں رہتا۔

جناب لطافت حسین شروانی
۸۲ بینی۔ فتحپور (یو۔پی)

ازبک رشتوں کی تلاش

ایک ہفتہ ہوا علی گڑھ گیا تھا' وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے آپ کی خیریت دریافت کی۔ انھوں نے فرمایا دو سال کے لیے خدا بخش لائبریری آپ کی سرپرستی میں اور رہے گی۔ دل خوش ہو گیا' حالانکہ میری دلی خواہش تھی کہ علی گڑھ میں جناب کا قیام ہوتا' اور ایک ایسا پروجکٹ ہوتا جس میں ہندستان کی قلمی کتابوں کے کاتبوں اور مصنفوں پر تفصیل سے تحقیق کے ساتھ کام ہوتا۔ میں نے ایک خط اور لکھا تھا غالباً وہ آپ کو نہیں مل سکا۔ اس کی ایک بات ضرور لکھوں گا۔ ملاحظہ فرمائیں: " ابھی علی میاں سے رائے بریلی و لکھنؤ میں ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان سے تو میں نے ان کی عمر دیکھ کر کوئی شکایت نہیں کی لیکن ان کے حلقے میں یہ ضرور شکایت کی کہ آپ لوگ اسی طرح مسلمان دانشوروں کو پریشان کرتے رہیں گے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی دینی خدمت ہے؟"

ڈاکٹر صاحب' لطف کی بات یہ ہے جو آج پہلی بار میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں' وہ یہ کہ پلاٹن نجد نیاز فتحپوری کے دوستوں کی تصاویر کا مجموعہ جو "نیاز نمبر" سالنامہ ۱۹۶۲ء' حصہ اوّل میں ہے۔ اس میں آپ دیکھیں نیاز صاحب اور خان بہادر عبدالرؤف دونوں کے چہروں پر داڑھیاں ہیں' لیکن ان علماء سو کی وجہ سے دونوں بزرگوں نے ایک ساتھ داڑھیاں منڈوائیں۔ افسوس کا مقام ہے۔ اس واقعہ کو پہلی بار تحریر میں لایا ہوں وہ انشاءاللہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ میں " دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو " کے نام سے شائع ہوگا۔ " اردو کے ہندو کاتبوں " اور " افسوس کیسے کیسے سخن ہائے گفتنی " آپ کی نظر سے تہذیب الاخلاق " جنوری' اگست ۱۹۹۲ء گذرا ہوگا۔

میرے ایک استاد ڈاکٹر محمد رفیق پروفیسر عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کی وفات پر ایک مضمون " ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی " انشاءاللہ جلد تہذیب الاخلاق میں جگہ پائے گا۔ پروفیسر رفیق صاحب کیلئے ڈاکٹر تاراچند کہا کرتے تھے Date problem ان سے زیادہ اچھا کوئی حل نہیں کر سکتا ہے۔"

سہ روزہ اخبار " دعوت " دہلی میں " ازبک رشتوں کی تلاش " خدا بخش لائبریری میں سمینار نظر سے گذرا۔ اس میں بابر پر بھی گفتگو ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے اردو اکیڈمی لکھنؤ میں ایک پروفیسر پشاور یونیورسٹی کے آئے تھے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ " بابر مغل نہیں ترک تھا۔" اس سلسلے میں دنیا میں یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ مجھے یاد

یو.پی. امکانجوزالہ آباد میں تزک بابری" ترکی زبان میں ہے جو اصل ہے۔ اس کا ترجمہ غالباً اکبر کے
ہیں فارسی میں ہوا۔

ایک صاحب احسان آوارہ ہیں جو چھاؤنی باندہ (یو.پی) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے
فسانے" نامی کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری کتاب "سویرا تو سب کے لئے ہے"
مختصر افسانوں کا اردو ترجمہ) ہے۔ ان کو اس پر ۱۹۸۶ء کا سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا ہے۔ باقی
یریت ہے۔ ان کا پتہ :

"Ehsan Awara, Mon. Cnnaoni, Banda (U.P.)."

امریکہ سے میرے پاس ایک لفافہ خلیق انجم صاحب انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی معرفت پہونچا ہے
ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے جشن امریکہ کے لیے مجھ سے ان کی شخصیت پر ایک مضمون مانگا گیا ہے۔ اس میں
رہوں ۔

●●

بیان ملکیت سہ ماہی خدابخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات
مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳،۴ پرنٹر و پبلشر کا نام : مصطفیٰ کمال ہاشمی

قومیت : ہندستانی

پتا : اسسٹنٹ لائبریرین، خدابخش لائبریری، پٹنہ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔۴

۶۔ ملکیت : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔۴

میں مصطفیٰ کمال ہاشمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں

دستخط پبلشر : مصطفیٰ کمال ہاشمی

یکم فروری ۱۹۹۴ء

50 years of age, women, the palsied, the maimed, the blind, the insane and the poor who possessed not more than 200 dirhams were entirely exempt from the payment of this tax.

Now we ask : Can a tax so light, the payment of which relieved men from the dangers of military service—the institutions of which can be traced back to Noshirvan the Just— be the object of so much hatred and the cause of so much oppression as some Europeans have imagined it to be? Would any one abandon his religion merely to gain exemption from so light a tax? Could any man think his religion worth less than so trifling an impost? If there were any such, his conversion to another faith seems hardly to be a matter of for regret. We believe that no other nation could bestow such favours as Musalmans did on those who paid them jizya. But as this point lies beyond the scope of our present subject we will not discuss it here.

The objects on which the sums of money raised by the *jizya* were spent, were (1) the equipment of the army; (2) the defence of the frontier; (3) the erection of forts; and whatever remained was spent on the building of bridges, making of roads and the promotion of education. There is no doubt that employed in this way jizya was useful to the Musalmans, as indeed was only right. The Musalmans fought the battles and sacrificed their lives to save the countries subject to them from all manner of dangers, and as non-Muslim nations benefited from the blood their rulers shed in these wars, it was not at all unjustifiable for the latter to reap some benefit from the property of the former which was thus assured to them. Besides, in the sum raised exclusively from Musalmans for alms (*sadqa*), non-Musalmans shared equally with Musalmans. Omar gave instructions to the chief officer of the State treasury to remember that in the words of God, *viz.*, "Alms are for the poor and the needy," the word "needy" included both Christians and Jews. †

The largest sum taken annually as jizya from each person was never greater than 30 francs a head. Even a millionaire had never to pay more than this. The common rates of jizya were from 9 to 4½ francs annually. Persons below 20 and above

---

† *Kitab-ul khiraj* of Imam Abu Yusuf (Egypt, A. H 1302) p. 72.

† انما الصدقات للفقراء والمساكين –

from the fact that if any non-Muslim tribe accepted military service, it was made as free from jizya as any Musalman tribe. In the reign of 'Uthman, when Habib Ibn Muslimah conquered the Jarajimah † tribe, they of their own accord elected to join the Muslim army in times of emergency, and for this reason the whole tribe was exempted from the payment of jizya. Not only the Jarajimah but many other tribes and clans of the surrounding country joined the army and thus released themselves from the payment of jizya. In the reign of the Caliph Wathiq Billah Abbasi, the Governor of these territories imposed jizya on these tribes by mistake. They accordingly laid a complaint before the Caliph, who gave a decision in their favour ‡ When it has thus been shown that jizya was taken from non-Muslims in exchange for the protection given them against their enemies, both internal and external, that when the Muslims were no longer able to give that protection they returned the money; and that tribes taking military service, thereby made themselves exempt from the payment of jizya, can any doubt remain as to the correction of the interpretation given of this word in the beginning of this essay ?

† The Jarajimah was a Christian tribe which lived in the town and district of Jurjoma, a description of which is given by Mu'ajam-ul-Baldan. Jurjoma was situated in the valley of Lukkam, near Antioch.

‡ See *Futuh ul Buldan Balazari*, Ed. de Goege, p. p. 159—161.

condition that we should protect them against their enemies, but owing to our present circumstances we are unable any longer to undertake such a charge."

Abu 'Ubaidah also addressed the Christians in the following terms :—

" The money which we took from you we return, because we have heard that a strong force is advancing against us. The agreement between us was that we should protect you from your enemies, but as we are no longer able to fulfil our part of the agreement, we return what money we took from you." *

This order was fully carried out and large sums from the State treasury were returned to the people. The enormous sums received for taxes can well be guessed from the fact that eight lakhs of rupees were raised from Hims alone. When these sums were returned the Christians called down blessings on the Muhammadans and said : " May God give you rule over our towns again. The Romans on such an occasion, instead of giving us back our money, would have robbed us of all our possession." †

Again the correctness of the assertion that *jizya* was a compensation for protection is well proved

---

* إنما رددنا عليكم أموالكم لأنه قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع و أنكم قد اشترطتم علينا أن نمنعكم و إنا لا نقدر على ذلك وقد رددنا عليكم ما أخذنا منكم۔

† *See Kitab-ul-Khiraj* of Imam Abu Yusuf, p. p. 80—83 (Bulaq, 1302).

To which the people of Mesopotamia returned the following answer :—

" We have paid the amount of jizya which was agreed upon with Khalid, on condition that if any Musalmans or the people of any other nation do us any wrong, the Musalman people with its General will be responsible for our protection." †

From these and other historical instances that might be adduced, it is clear that the institution of jizya as it is found in Muslim times rested on the very same principle as Noshirvan had laid down. If any doubts on the question yet remain, the following instance cannot but put them to rest. In the reign of Omar, when Abu ' Ubaidah Jarrah had gained several victories in Syria, the Emperor Heraclius raised an enormous army to crush the rising Muslim power. The Musalmans had to march to meet this attack without delay, and all their attention had to be directed to this campaign and the army which was to conduct it. Abu ' Ubaidah Amin, the General of the army, wrote at once to the governors of the conquered towns of Syria to the following effect :—

" Refund to the people all the money that has been collected as tribute and jizya, and tell them that all that we took in this way was taken on the

† انا قد ادينا الجزية التي عاهدنا عليها خالد على ان يمنعونا و اميرهم البغي من المسلمين وغيرهم — (تاريخ كبير طبري) ع

right to receive jizya : otherwise we have not. This was written in the month of Safar, A. H. 12." †

The following extract is from an agreement which bears the signatures of several of the companions of the Prophet, which was drawn up between the Governor of Mesopotamia and the people of that district :—

"To those who have consented to pay jizya at such and such rates and with whom Khalid Ibn Walid has made peace, this is a charter of freedom. The sum agreed upon by Khalid and the other Musalmans in the treaty has been duly received. If any other governor attempt to alter the terms of peace laid down by Khalid, do you compel him to desist, on condition that you continue to pay the jizya. To those to whom you grant quarter, we will grant quarter also ; with those with whom you make peace, we will make peace also." ‡

---

† Tabari : Annales, ed. Kosegarten, vol. II., p. 46.

† هذا كتاب من خالد بن الوليد لصلوبا بن نسطونا و
قومه اني عاهدتكم على الجزية والمنعة فلك الذمة والمنعة —
ما منعناكم فلنا الجزية والا — كتب سنة اثنتى عشرة في صفر —
(تاريخ كبير طبري) —

‡ Tabari : Annales, ed Kosegarten, vol. II. p. 64.

‡ براءة لمن كان من كذا و كذا من الجزية التي صالحهم
عليها الامير خالد بن الوليد و قد قبضت الذي صالحهم عليه
خالد والمسلمون— لكم يد على من بدل صلح خالد ما اقررتم
بالجزية — و كففتم امانكم امان و صلحكم صلح — و نحن لكم
بالوفاء —

tion of the word : they derived it from "*jaza*", (exchange or compensation), and explained it as being the tax taken in compensation for certain services rendered. However incorrect this may be from a philological point of view, yet it certainly harmonises with historical facts. Many treaties drawn up by the Prophet and the Caliphs which have been preserved to us *verbatim* in historical works show clearly that jizya was given in return for protection. The Prophet himself, in an order addressed to the Governor of Eiltah, states that "the inhabitants should be protected and defended against their enemies." * Among the admonitions given by Omar on his death bed was the principle that "non-Musalmans who are our subjects are under the protection of God and of His Prophet and it is the duty of Musalmans to resist their enemies in their defence." The translation of the following treaties will go further to prove most clearly that jizya was a tax paid in return for protection given, and that non-Musalman tribes paid it upon this very assumption ;—

"These are words of Khalid-Ibn Walid to Saloba bin Nastona and his tribe :—I have made an agreement with you in respect of jizya and protection. The responsibility of protecting you lies upon us. So long as this protection is given you, we have

* يمنعوا و يحموا —

* See *Fatuh-ul-Buldan of Balazari* p 59.

III.—According to the laws of Islam, every Musalman might at any time be called upon to serve in the army. As the burden that such service involved was very heavy, it naturally happened that attempts were often made to escape it. Such a case once occurred in the history of Sicily † when an exception had been made in favour of School Masters in that island, whereupon many persons abandoned their former occupations and adopted the scholastic profession. This being the case, and all Musalmans being looked upon as belonging *ipso facto* to the army, on this account they were exempted from the payment of jizya just as the soldiers of Noshirvan had been. Islam claimed no right to forcibly lay the burden of military service on any non-Musalman who happened to be a subject of any Musalman state and whose life and property were under its protection. Then, provided that these persons were not desirous of service in the army, it was only just that they should pay some tax for their protection, and this tax was the *jizya*. But if any non-Musalman tribe joined the army or promised to so, it was at once released from the payment of jizya, as will be seen from the historical instances quoted below.

Both in theory and practice protection was looked upon by the Musalmans as the legitimate equivalent of the jizya. This may explain why etymologists never looked to Persian for any historical explana-

† See *Mo'ajam-ul-Baldan of Yaqut Hamvi* under the description of Sicily.

country and risked their lives for its sake: it was then only right that the rest of the subjects of the crown should contribute some fixed sum in order to compensate them for their services." This account of Ibnul Athir is confirmed by the following verses of Firdousi (iv., 78) :—

"All the governors gathered themselves together and measured out the land and imposed a tax (*gazit*) in dirhams, provided that the husband man was in a prosperous condition. Six dirhams on fruitful vineyards and the same on date gardens. He who had wealth but no land, and had not to spend himself in tilling must pay a tax (*gazit*) of 10 to 4 dirhams every year. But the ministers and the courtiers were exempt"†. The difference between these two accounts is of no importance.

---

† همه پادشاهان شدند انجمن
زمین را بسنجید و بر زد رسن
گزیتی نهادند بر یک درم
گر ایدون که دهقان نبودی دژم
گزیت رز بارور شش درم
بخرماستان بر همین زد رقم
کسی کش درم بود و دهقان نبود
نبودی غم و رنج کشت و درود
گذارنده از ده درم تا چهار
بسالی ازو بستدی کار دار
دبیر و پرستندهٔ شهریار
نبودی به دیوان کسی را شمار
(شاه نامه فردوسی)

count of the rules laid down by Noshirvan respecting the tribute and the army (Tarikh-ul-Kamil, Part I., p. 203, cairo, A. H. 1301) says that "Noshirvan caused a survey to be made of all the country, fixed the rates of the revenue and imposed *jizya* * on each of his subjects with the exception of those who were serving in the army or were connected with the nobles of the Court. The various rates of this jizya were 12, 8, 6 or 4 dirhams (a dirham-about five pence) a head. † After this account of the tribute the historian adds that Omar followed the same rules. In the same author's account of jizya he mentions that Omar excepted from this tax all below the age of 20 and above that of 50. The same author states Noshirvan's reasons for this exception as follows:—" Those who served in the army were defenders of their

* The use of the word "jizya" in this connection shows that it is not a term peculiarly applicable either to Muslims or non-Muslims. Noshirvan and his subjects both belonged to the old Persian religion and the word was used continously into the Muhammadan period.

† امر الملك قباد بمسح الارضين ليضع الخراج عليها
فمات قبل الفراغ من ذلك فلما ملك انوشروان * امر باستتمام
ذلك و وضع الخراج * * والزم الناس الجزية ما خلا العظماء
و اهل البيوتات * و الجند والهرابذة والكتاب و من في خدمة
الملك — كي الناس على قدره اثنا عشر درهما و ثمانية دراهم
و ستة دراهم — و اسقطها عمر عمن لم يبلغ عشرين سنة او
جاوز خمسين سنة — (كامل ابن الاثير الجزري) —

nor act in accordance with it, that *jizya* may not be imposed upon us, as on the people of the book."†

There is not the slightest doubt that jizya is a word of Persian origin. There is strong historical proof, besides the evidence of lexicons, &c. It is certain that the word "jizya" was in use in Arabia long before the appearance of Islam, and it is also certain that in the Persian language the word "gazit" expressed just the same meaning. From historical sources (to be given later on) it may be proved that king Noshirvan first made regulations for the collection of jizya; and as the rule of Persia at that time extended also over Yaman and the surrounding country, consequently the word "gazit" came to be introduced into Arabia in its technical legal sense and in later times assumed the more Arabic form of jizya. The change was effected by the alteration of a single letter and some vowel points. The Arabic tongue has borrowed more words from Persian than from any other foreign language, and a conquered people would naturally first adopt the technical administrative terms of its conquerors.

II. The laws relating to tribute and jizya, which we meet with in Arabia and Persia under slightly altered forms can be traced back to the reign of king Noshirvan the Just Ibn-ul-Athir in his ac-

† کتاب خویش نخوانیم وزو عمل نکنیم
که تا گزیت ستانند زما چو اهل کتاب

was used as well in the *general* sense of tribute, as in the particular sense of capitation tax. According to the *Qamus* "Jizya is a tax on land and a capitation tax imposed on non-Muslim subjects". But neither the author of the *Qamus* nor *Johri* discuss the derivations. Lane (Arabic Dictionary, *sub voc.*) suggests two possible derivations: either (1) it is derived from "*Jaza*" exchange or compensation, or (2) it is the Arabic form of *gizya*". The latter derivation has been copied by Bitris in his edition of the *Mukit-ul-muhit*, though he does not consider it satisfactory. Similarly, in the Persian lexicons under the word "*gazit*," *jizya* is said to be the Arabic form.

In *Burhan-i-Qati* (*sub voc.*) "gazit" is money collected by the officers of a Government from its subjects, and is also called *Khiraj* (tribute.) Also it means money levied on non-Muslim subjects, as the poet Nizami says: "Sometimes Pekin sends him the tribute of China, and sometimes Cæsar sends him the religious tax (gazit-i-din)."† The vulgar pronunciation is *gizyat*, and the word appears in Arabic under the 'form *jizya*". In support of the second of these meanings given in *Burhan-i-Qati*, the author of *Furhang-i-Jahangiri* quotes the following verse by Hakim Sozni; "We will not read our sacred book

---

† گهی خاقان خراج چین فرستد
گهی قیصر گزیت دین فرستد

THE JIZYA OR CAPITATION TAX

BY

SHAMSUL-ULAMA MAULAVI MUHAMMAD SHIBLI NOMANI, PROFESSOR OF ARABIC, M.A.-O. COLLEGE ALIGARH.

The discussion of this question by European scholars has been attended by a considerable exhibition of ill-feeling. They suppose the institution and very word that expresses it to have originated with the Muhammadans, whose bigotry prompted them to invent it as a mark of distinction between themselves and the followers of other faiths. It is represented as a measure so oppressive, that the subject races were forced against their will to accept Islam in order to escape the burden of this tax: and to this is attributed in large measure the spread of the Muhammadan religion. That this notion is a-piece with so many other mistaken ideas about Islam, is the object of the present essay to show; and this can best be done by considering, first, the etymology and the various meanings of the word "Jizya"; secondly, the date of its institution in Persia and Arabia; and thirdly, the reasons which led the Muhammadans to adopt it.

I. The word "Jizya" has come to be generally used with a technical meaning: but originally it

THE JIZYA OR CAPITATION TAX

BY

Shamsul-Ulama. Maulavi Muhammad

Shibli Nomani, Professor

of

Arabic, M. A.-O. College,

ALIGARH.

FELLOW OF THE UNIVERSITY

of

ALLAHABAD,

Translated From Urdu into English

By one of the author's Friends

Printed at the Aligarh Institute Press,

1894

JIZYA

Capitation Tax

Reissued by

Khuda Bakhsh Library

Patna

1994

CONTENTS

1994

Price Rs.75/-

Printed by Liberty Art Press (Proprietors Maktaba Jamia Ltd.) 1528 Pataudi House, Daryaganj, New Delhi and published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna.

Khuda Bakhsh Library Journal

93-95

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna